اردو شرح

انوار الباری

صحیح البخاری

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

ودیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ تلمیذ علامہ کشمیری

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

اردو شرح

انوار الباری
صحیح البخاری

جلد ۱۴-۱۵-۱۶

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

و دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفۂ تلمیذ علامہ کشمیری

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

☎061-540513-519240



نام کتاب.........انوار الباری جلد ۱۴-۱۵-۱۶

تاریخ اشاعت..............جمادی الثانیہ ۱۴۲۵ھ

ناشر...... اِدارۂ تالیفاتِ اَشرفیہ ملتان

طباعت..............سلامت اقبال پریس ملتان

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان

ادارہ اسلامیات انارکلی، لاہور

مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار، لاہور

مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور

مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ

کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

دارالاشاعت اردو بازار کراچی

بک لینڈ اردو بازار لاہور

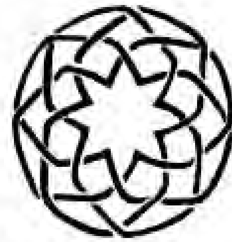
ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTRE)
119-121-HALLIWELL ROAD
BOLTON BLI 3NE. (U.K.)

ضروری وضاحت: ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کیلئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لئے پھر بھی کسی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گذارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرمادیں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

فہرست مضامین

جلد ---- ۱۵

جلد--۱۶





انوار الباری ۱۴

اردو شرح

صحیح البخاری

تقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الشفیع الکریم اما بعد

انوارالباری کی نشاۃ ثانیہ

راقم الحروف نے انوارالباری کے کام کی ابتداء نظر بہ فضل خداوندی صرف اپنے بھروسہ پر کی تھی اور محض اس کے ہی فضل وانعام سے ۱۳ حصوں تک اشاعت ہوگئی تھی، اس کے بعد یکا یک حالات کا رخ پلٹا، پاکستان کے لئے کتب ورسائل جانے پر پابندی لگ گئی، زیادہ تعداد خریداروں کی پاکستان میں تھی اور وہ بھی ایسے قدردان کہ پابندی لگنے پر بھی کچھ لوگ طلب کرتے رہے، ان پر انوارالباری منگانے کی وجہ سے مقدمے قائم ہوئے، جرمانے ہوئے، کتاب ضبط ہوئی، پھر بھی وہ حجاز وکویت وغیرہ کے ذریعے منگاتے رہے، ادھر مالی حالات اور دوسرے موانع آئندہ تالیف واشاعت کے کام میں سدراہ ہوئے کئی سال ہمت وحوصلہ کی شکستگی اور تعطل کی نذر ہوگئے، اس کے بعد پھر فضل ورحمت ایزدی نے دستگیری کی اور افریقہ کے احباب ومخلصین مولانا اسماعیل گارڈی، مولانا قاسم محمد سیما، مولانا احمد محمد گردا، مولانا عبدالقادر ملکپوری، مولانا یوسف عمرواڑی، مولانا عبدالحق عمرجی، الحاج ایم ایس ڈوکرات، الحاج ایم موسیٰ بوڈھانیہ، الحاج ابراہیم بھائی کوساڈیہ، مفتی برادرس وغیرہم نے خصوصی توجہ کی، راقم الحروف کو افریقہ بلایا اور کتاب مذکور کی آئندہ تالیف، تکمیل و اشاعت کو ضروری سمجھتے ہوئے کام کو پھر سے جاری رکھنے کی تحریک وتجویز کی، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اجر عظیم عطا فرمائے اور مجھے توفیق بخشے کہ ان حضرات کی نیک توقعات کو پورا کرسکوں، آمین۔

نوعیت کار کی تبدیلی

احباب افریقہ کی خواہش یہ بھی ہوئی کہ میں اس تالیف کو مختصر کر کے ۲۵ یا ۲۷ جلدوں میں مکمل کردوں اور عجلت کار کے خیال سے یہ بھی تجویز ہوئی کہ میں اپنے ساتھ ایک دو معاون رکھ لوں اس پر میں نے کچھ عرصہ تک دو حضرات کو ساتھ رکھا، مگر افسوس کہ وہ میرے طریق کار کا ساتھ نہ دے سکے۔ اس لئے پھر حسب سابق اس منزل کا تن تنہا سفر کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ رفیق محترم مولانا سید محمد یوسف صاحب، بنوری مرحوم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے، ان کی خواہش تھی کہ میں کراچی جا کر ان کے پاس رہوں اور انوارالباری و معارف السنن کے کام کو ہم دونوں باہمی مشورے اور تعاون سے مکمل کریں، انوارالباری کی پاکستان میں توسیع اشاعت کے لئے بھی وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے، مگر آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔

ہم دونوں نے جو حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی صحبت و معیت اور استفادات کی بدولت ایک راہ اپنائی تھی کہ احقاق حق بلا خوف لومۃ لائم کرتے رہیں گے اور محققین اکابر امت کے تفردات پر بھی بحث و نظر اور تعقبات و استدراکات کا سلسلہ دلائل و براہین کی روشنی میں علیٰ وجہ البصیرت جاری رکھیں گے، خدا کا شکر ہے کہ اس کو بڑی حد تک نباہا اور چلایا مگر اب میں اس راہ میں اکیلا رہ گیا ہوں، **واللہ المستعان و علیہ التکلان**۔

اس لئے اختصار کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ آئندہ اقساط میں متن بخاری شریف کی جگہ صرف ابواب بخاری کا حوالہ دیا جائے اور مکمل ترجمہ احادیث کی جگہ تشریح مطالب ضرور یہ پر اکتفا کی جائے اور اہم مسائل میں اعیان و اکابر امت کی تحقیقات و آراء کے ساتھ ان کے تفردات کی نشاندہی کرتے ہوئے تعقبات اور استدراکات درج کر دیئے جائیں۔ **والتوفیق من اللہ تعالیٰ جل مجدہ**۔

انوارالباری کا مقصد

جیسا کہ اب تک کی شائع شدہ جلدوں سے یہ بات پوری طرح روشنی میں آچکی ہے کہ مؤلف کا مطمح نظر مسائل مہمیہ میں اکابر علماء کی تحقیقات کو پیش کرنا ہے اور چونکہ حضرت الاستاذ المعظم شاہ صاحبؒ کی علمی و تحقیقی شان بہت ہی ارفع واعلیٰ تھی، آپ کے وسیع و عمیق مطالعہ نے علوم سلف و خلف کو آپ کے لئے کف دست کی طرح نمایاں کر دیا تھا اور بقول حضرت تھانویؒ کے آپ کسی معاملہ میں بھی ادنیٰ سی کجی یا غلطی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور یہی حقیقت بھی تھی، لہٰذا آپ کے افادات کو بھی پیش کرنا ہے۔

۱۳۴۵ھ میں حضرتؒ نے دارالعلوم دیوبند میں آخری درس مکمل بخاری و ترمذی شریف کا دیا تھا، ہونہار، ذی استعداد طلبہ حدیث سامنے تھے، ایک عالم رامپور کے جو پہلے سے فارغ التحصیل تھے اور حضرتؒ کی خدمت میں تکمیل علم حدیث کے لئے حاضر ہوئے تھے، وہ حرمین شریفین میں بھی کافی عرصہ رہ چکے تھے اور علامہ ابن تیمیہ کے علم و فضل و تبحر سے بہت زیادہ متاثر تھے، بلکہ ان کو درجۂ اجتہاد پر فائق سمجھتے تھے، ایک روز درس میں ائمہ مجتہدین کے مراتب اجتہاد پر بحث تھی اور حضرتؒ ائمہ اربعہ کے مراتب اجتہاد پر تقریر فرما رہے تھے، یہ عالم سوال کر بیٹھے کہ کیا علامہ ابن تیمیہ مجتہد نہیں تھے؟

حضرتؒ نے فرمایا کیا آپ مجتہد کا وظیفہ جانتے ہیں؟ بتلائیں، وہ خاموش ہوئے تو حضرتؒ نے فرمایا کہ مجتہد کا منصب یہ ہے کہ وہ کسی کلی

کو اس کی جزئیات پر منطبق کرے اور جزئیات کو ان کی کلی میں پہنچائے اگر وہ اپنے اس وظیفہ ومنصب میں غلطی کرتا ہے تو وہ مجتہد نہیں ہے، پھر حضرتؒ نے متواتر تین روز تک مثالوں سے ثابت وواضح کیا کہ علامہ ابن تیمیہ نے فلاں کلی کو دوسری کلی کے جزئیات پر منطبق کر کے غلطی کی اور فلاں جزئی کو بجائے اس کی اپنی کلی کے دوسری کلی میں پہنچادیا، کیا اتنی کثرت سے غلطی کرنے والے کو آپ مجتہد کا درجہ دیں گے؟ ان عالم نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے، میرے بے موقع سوال کی وجہ سے حضرتؒ کو ابن تیمیہ کے بارے میں اتنی تفصیل کی ضرورت ہوئی۔

یہ ایک ادنیٰ مثال تھی کہ حضرتؒ نے ایک فاضل طالب کے دلی شبہات کا اندازہ فرما کر اس کو پوری طرح مطمئن کرنے کی سعی فرمائی، ورنہ اکثریت تو ایسے ہی طلبہ کی ہوتی تھی جو حضرتؒ کی اونچی تحقیقات نہ سمجھ سکتے تھے، حالانکہ اس دور کے طلبۂ حدیث آج کل کے طلبۂ حدیث کی نسبت سے بہ لحاظ فہم وذکاء، استعداد ومطالعہ کہیں اعلیٰ وارفع تھے۔

کاش! حضرتؒ کے پورے درس حدیث میں حضرت علامہ عثمانیؒ یا مولانا مفتی سید مہدی حسنؒ ایسے فضلا مخاطب ہوتے اور دورہ حدیث بجائے ایک سال کے دس سال میں پورا ہوتا اور یہ حضرات آپ کے امالی درس کو قلم بند کرتے، تو لوگ یقیناً علوم وافادات انوریہ کے انوار کی روشنی ماہتاب وآفتاب کی طرح مشاہدہ کر سکتے تھے۔

راقم الحروف نے دوسال پابندی سے جامعہ ڈابھیل میں حضرت شاہ صاحبؒ کے درس بخاری شریف میں شرکت کی اور دونوں سال آپ کے درسی افادات منضبط کئے، خارج اوقات میں بھی استفادہ کرتا رہا، اس وقت اس بات کا خیال ووہم بھی نہ تھا کہ انوارالباری ایسی کوئی تالیف مرتب کر کے شائع کی جائے گی ورنہ ممکن تھا کہ مہمات میں حضرتؒ سے خارج میں اور زیادہ استفادات کرتا، کیونکہ خدا کے فضل سے حضرتؒ احقر سے بہت مانوس ہو گئے تھے اور ایک بار مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''یہ صاحب اگر ہمیں پہلے سے جڑ جاتے تو ہم بہت کام کر لیتے'' اب خدا نے یہ چیز دل میں ڈال دی کہ جو کچھ اور جیسا بھی کچھ حاصل کیا تھا، وہ پیش کردوں بقول حضرت علامہ جامیؒ۔

بیا جامی رہا کن شرمساری نہ صاف و درد پیش آر آنچہ داری

کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ میری آخرت سنوارنے کا اسی کو بہانہ بنادے۔

باب الانتقاد: مولانا بنوریؒ نے نفحۃ العنبر ص ۱۸۲ میں لکھا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ علماء وسلف کا نہایت ادب واحترام فرماتے تھے اور ان پر نقد کرنے میں بہت ہی محتاط تھے، حتیٰ کہ جب پہلی بار حافظ ابن حجرؒ سے غزوۂ ذات الرقاع کے بارے میں مناقشہ کا ارادہ فرمایا (کیونکہ انہوں نے وہی رائے اختیار کی ہے جو امام بخاری کی ہے کہ وہ غزوۂ خیبر کے بعد ہوا ہے) تو چار ماہ تک متامل رہے اور سوچتے رہے کہ میرے لئے ان پر تعقب کرنا درست ہے یا نہیں تا آنکہ آپ کا قلب اس کے لئے مطمئن ہو گیا اور اس میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے قلب میں تشویش تھی لہٰذا میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ قدس سرہ کے مزار اقدس پر حاضر ہوا اور مراقبہ میں آپ کی روح انور کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے اس بارے میں اجازت حاصل ہو گئی، پھر میں نے کئی ورق میں ان پر تعقب کیا اور اس کے بعد میری یہ عادت ہو گئی کہ تمام ہی ادعیان واکابر امت کے تفردات پر استدراک وتعقب کرنے لگا، لیکن اس طرح دلائل وبراہین کے ساتھ کہ اس کو ہر سلیم الذوق وصحیح الوجدان قبول کر لے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

واضح ہو کہ تفردات اکابر پر انتقاد وتعقب یا ان کی نشان دہی پورے ادب واحترام کے ساتھ مولانا مرحوم بنوری کی تالیفات میں بھی

ملے گی اور راقم الحروف بھی اس کا عادی ہے، جس کو کچھ لوگ تشدد کا نام دھرتے ہیں، یا اپنے کسی تعلق یا عقیدت کی وجہ سے اوپرا بھی سمجھتے ہیں لیکن اپنا گمان یہ ہے کہ اگر کسی مصلحت یا عقیدت کے تحت اس کو برا یا قابل شکایت سمجھنے کا مزاج بنتا رہا تو خدانخواستہ وہ وقت دور نہیں ہوگا کہ حق و باطل کا امتیاز اٹھ جائے گا اور صرف وہ اہل قلم قابل پذیرائی رہیں گے جو ''مصلحت بین وکارآسان کن'' پرعمل پیرا ہوں گے۔

ایک زمانہ ہمارا وہ تھا کہ مولانا بنوریؒ نے مقدمہ مشکلات القرآن میں بعض مشاہیر پر نقد کیا تھا اور راقم الحروف نے حضرت مولانا سید سلمان ندویؒ کی سیرۃ النبی کے کچھ تفردات واغلاط پر تعقب کیا تھا، پھر خدا کے فضل وانعام سے وہ وقت بھی آیا کہ سید صاحبؒ نے اپنی غلطیوں سے رجوع فرمالیا (اگرچہ اس رجوع کو دارالمصنفین والوں نے نظرانداز کردیا اور وہ رجوع شدہ غلطیاں ابھی تک چھپ رہی ہیں) اور بعد کو سید صاحب ہی نے جب کہ وہ حضرت تھانویؒ سے بیعت ومنسلک ہوکر خود بھی پختہ دیوبندی مسلک اختیار کرچکے تھے راقم الحروف کو اپنے ایک مکتوب میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ ''بڑے درد کے ساتھ پوچھتا ہوں کہ دیوبند کدھر جارہا ہے؟ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے بعض تفردات کی تائید بعض علماء دیوبند کی طرف ہوئی تھی اور سید صاحب کا منشاء یہ تھا کہ علماء دیوبند جو کبھی احقاق حق بلاخوف لومۃ لائم کا فرض ادا کرنے میں ممتاز رہے ہیں اب کسی غلطی کی تائید وہمنوائی میں پیش پیش کیوں ہیں؟ اور اس سے بھی یہ اندازہ لگایئے کہ دور سابق بلکہ قریبی زمانہ میں ہی مکتب دیوبند کے بارے میں صرف اپنوں کے ہی نہیں دوسرے لوگوں کے خیالات کیا تھے اور اس کی کتنی زیادہ وقعت وساکھ لوگوں کے دلوں میں تھی؟!

انوارالباری کی اس پیش نظر جلد میں ص ۱۵۲ پر ''لامع الدراری'' ص ۲۰۷ کا ایک تسامح نظر سے گذرے گا یہ ممکن تھا کہ اس عبارت کو ہی مرتب علام مسودہ میں سے حذف کرادیتے کہ اس مسامحت کی نسبت حضرت مرتب کے والد علام یا حضرت اقدس گنگوہیؒ کی طرف نہ ہوسکتی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اس کو باقی رکھ کر اور تسامح کا اعتراف فرماکر یہ تاثر دیا ہے کہ غلطی سے مبرا اپنے اکابر بھی نہیں تھے اور معصوم صرف انبیاء علیہم السلام تھے اور بس، واللہ تعالیٰ اعلم۔

آخر میں ناظرین کرام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ ہی میری غلطیوں پر مجھ کو بھی متنبہ فرماکر ممنون کریں میں آئندہ جلدوں میں ان کا استدرک کردوں گا، ان شاء اللہ

وانا الاحقر

سید احمد رضا عفا اللہ عنہ

بجنور نومبر ۱۹۷۷ء

باب عظة الامام الناس فی اتمام الصلوٰة و ذکر القبلة

(امام کی لوگوں کو نصیحت کہ نماز پوری طرح پڑھیں اور قبلہ کا ذکر)

(۴۰۴) حدثنا عبدالله بن یوسف قال انا مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ہریرةؓ ان رسول اللہ ﷺ قال هل ترون قبلتی ههنا فواللہ ما یخفی علی خشوعکم ولا رکوعکم انی لا راکم من ورآء ظهری.

(۴۰۵) حدثنا یحیی بن صالح قال نا فلیح بن سلیمان عن هلال بن علی عن انس ابن مالک قال صلی لنا النبی ﷺ صلوٰة ثم رقی المنبر فقال فی الصلوٰة و فی الرکوع انی لاراکم من ورآئی کما اراکم.

ترجمہ ۴۰۴: حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا یہ خیال ہے کہ میرا رخ (نماز میں) قبلہ کی طرف ہے، خدا کی قسم مجھ سے نہ تمہارا خشوع چھپتا ہے نہ رکوع میں تمہیں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

ترجمہ ۴۰۵: حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں ایک مرتبہ نماز پڑھائی پھر منبر پر تشریف لائے اور فرمایا کہ نماز میں اور رکوع میں تمہیں اسی طرح دیکھتا رہتا ہوں جیسے اب دیکھ رہا ہوں۔

تشریح، مناسبت ابواب ومطابقت ترجمۃ الباب

پہلے باب میں ادب سکھایا تھا کہ حالت نماز میں تھوک بلغم کا غلبہ ہو تو اس کو دفع کرنے کے وقت سمت قبلہ کی عظمت و ادب کو ملحوظ رکھے، اس باب میں ارکان نماز کو پوری طرح ادا کرنے کا حکم بتلایا اور اس میں بھی سمت قبلہ کی طرف رخ کرنے کا ذکر ضمناً آ گیا ہے، لہذا باب سابق سے مناسبت ظاہر ہے اور اسی توجیہ کو کلی طور سے محقق عینیؒ نے اور جزوی طور پر حافظ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے، ان دونوں اکابر کی توجیہ و مناسبت ابواب کو بعید وابعد قرار دے کر لامع الدراری کی اس توجیہ کو ہم اوجہ ماننے میں متردد ہیں کہ دونوں باب میں مسجد اور جماعت کے احکام پر متنبہ کیا گیا ہے کیونکہ نہ باب سابق "اذا بدره البزاق فلیأ خذ بطرف ثوبه" میں مسجد و جماعت کا ذکر تھا اور نہ اس باب عظۃ الامام میں اتمام صلوۃ کا حکم مسجد و جماعت کے ساتھ مخصوص ہے، اتمام صلوۃ تو ہر نماز میں ضروری ہے خواہ وہ انفرادی ہو یا جماعت کے ساتھ اور مسجد میں ہو یا غیر مسجد میں اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے جو مصالح حجۃ اللہ میں ذکر کئے ہیں وہ بھی مساجد کے ساتھ خاص نہیں، مطلق جماعت کے لئے ہیں اور خود امام بخاریؒ نے بھی یہاں ابواب المساجد کا عنوان کہاں قائم کیا ہے؟ کتاب الصلوۃ کے تحت مساجد، غیر مساجد سب ہی کے احکام مختلف عنوانات قائم کر کے بیان کئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ واضح ہو کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے رسالہ شرح تراجم ابواب البخاری میں باب عظۃ الامام اور اس سے قبل کے بھی متعدد ابواب کا ذکر نہیں ہے۔

مطابقت ترجمہ ظاہر ہے کیونکہ حدیث میں وعظ و تذکیر ہے اور ساتھ ہی تنبیہ ہے کہ حضور علیہ السلام سے توجہ قبلہ کے وقت بھی تمہارے افعال رکوع و سجود اور احوال خشوع و خضوع مخفی نہیں ہوتے کیونکہ وہ سامنے کی طرح پیچھے بھی دیکھتے ہیں۔

بحث ونظر

علامہ عینیؒ نے مزید افادہ کیا کہ یہاں علماء امت نے دو باتوں پر غور وفکر کیا ہے، ایک یہ کہ رؤیت سے کیا مراد ہے؟ کچھ حضرات نے کہا

کہ علم مراد ہے خواہ وہ بطریق وحی ہو کہ اس کے ذریعہ آپ کو مقتدی صحابہ کی کیفیت افعال بتادی جاتی ہوگی یا بطریق الہام مگر یہ رائے درست نہیں کیونکہ اس سے پیٹھ پیچھے دیکھنے کی قید بے فائدہ ہوجاتی ہے، دوسرے حضرات نے کہا کہ حضور علیہ السلام دائیں بائیں کے لوگوں کو کسی قدر التفات نظر کے ساتھ دیکھ لیتے ہوں گے، مگر یہ رائے بھی بے وزن ہے اور جمہور کی رائے جو صواب و صحیح بھی یہ ہے کہ سامنے کی طرح پیچھے بھی دیکھنا حضور علیہ السلام کے خصائص میں سے تھا اور وہی علم وادراک کا حقیقی سبب تھا، جو بطریق خرق عادت کے آپ کو حاصل تھا اور اسی لئے امام بخاریؒ نے اس حدیث کو علامات نبوت میں ذکر کیا ہے اور یہ حدیث اشاعرہ کے لئے دلیل بھی ہے جو رؤیت کے لئے مواجہت و مقابلہ کو شرط نہیں مانتے، بلکہ انہوں نے اس امر کو بھی جائز و ممکن کہا کہ چین میں بیٹھا ہوا ایک اندھا اندلس کے کھٹمل یا پسو کو دیکھ لے، میں کہتا ہوں کہ اہل سنت کے نزدیک یہی حق ہے کہ رؤیت کے لئے عقلاً نہ کسی عضو خاص کی شرط ہے نہ مقابلہ وقرب کی اور اسی لئے انہوں دارآخرت میں جواز رؤیت خداوندی کا فیصلہ کیا ہے، بخلاف معتزلہ کے وہ سرے سے رؤیت ہی کے منکر ہوگئے اور مشبہ وکرامیہ نے کہا کہ رؤیت باری چونکہ بغیر مواجہہ ومکان کے نہیں ہوسکتی لہذا وہ جہت ومکان میں واقع ہوگی، ان دونوں فرقوں کے خلاف اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ رؤیت باری تعالیٰ بلا جہت ومکان اور بلا کیف ہوگی، اور اس کو عقلی ونقلی دلائل سے ثابت کیا ہے (عمدہ ۳۳۳ ج ۲)

معتزلہ کے دلائل

انہوں نے آیات واحادیث میں تاویل کر کے رؤیت کو بمعنی علم ضروری قرار دیا، انکار رؤیت اس لئے کیا کہ اس کے واسطے مبصر ومرئی کا مقابل اور مکان وجہت میں ہونا ضروری ہے اور خدا مکان وجہت ومقابلہ سے منزہ ہے اور مرئی جسم ہوتا ہے حالانکہ باری تعالیٰ جسم نہیں ہے، نیز مرئی یا جوہر ہوتا ہے یعنی متحیز بالاستقلال یا عرض ہوتا ہے یعنی متحیز بالتبعیۃ اور خدا تحیز سے منزہ ہے، مرئی یا کل ہوگا تو محدود ہوجائے گا، یا بعض تو متبعض ہوگا اور یہ سب امور خدا کے لئے محال ہیں، بہت سے معتزلہ نے یہ بھی کہا کہ خدا اپنے آپ کو یا دوسروں کو بھی نہیں دیکھتا کیونکہ دیکھنا حواس کے ذریعہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ حواس سے منزہ ہے، انہوں نے کہا کہ خدا کو حواس کے ذریعہ یا بغیر حواس کے دوسرے بھی نہیں دیکھ سکتے کچھ معتزلہ نے کہا کہ باری تعالیٰ اپنے آپ کو تو دیکھتا ہے مگر حادث مخلوق اس کو نہیں دیکھ سکتی کیونکہ اس کی رؤیت حواس اور شعاعوں کے اتصال پر موقوف ہے جن کے لئے مرئی کا جسم ہونا ضروری ہے۔ (ص ۱۷۶ وص ۱۸۱ کتاب الارشاد لامام الحرمین الجوینی)

مجسمہ: معتزلہ کے بالکل مقابل دوسرا گروہ مجسمہ کا ہے، جو رؤیت کو تو قائل ہیں مگر انہوں نے پوری طرح حق تعالیٰ کی تشبیہ وتجسیم کردی ہے بلکہ بعض نے کہا کہ وہ گوشت پوست سے مرکب ہے، بعض نے تو بصورت انسان قرار دیا، بعض نے اس کو جہت فوق میں اور سطح اعلیٰ عرش کے ساتھ مماس بتلایا اور اس کے لئے حرکت وانتقال وتبدل جہات کو بھی جائز کہا اور کہا کہ اس کے بوجھ کے باعث عرش سے آواز نکلتی ہے اور وہ عرش سے بقدر چار انگل کے زائد ہے وغیرہ یہ سب تفصیل عقائد عضدیہ کے شارح علامہ دوانی کی ہے، پھر انہوں نے لکھا کہ اکثر مجسمہ ظاہری ہیں جو ظاہر کتاب وسنت کا اتباع کرتے ہیں، جن میں بہت سے محدثین بھی ہیں اور ابن تیمیہ اور ان کے اصحاب کا بھی بہت بڑا رجحان اثبات جہت کی طرف ہے اور وہ نفی جہت کرنے والوں پر سخت تنقید بھی کرتے ہیں اور ان کو اصحاب تعطیل قرار دیتے ہیں بلکہ ان کی بعض تصانیف میں ہے کہ بداہت عقل کے نزدیک یہ بات کہ وہ باری تعالیٰ معدوم ہے اور یہ بات کہ میں نے اس کو سب جگہ ڈھونڈا اور نہ پایا دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے (ص ۶۶ علی العقائد العضدیہ) علامہ ملا علی قاری نے ص ۱۱۶ ضوء المعانی شرح قصیدہ بدء الامالی میں لکھا:-

''کرامیہ حق تعالیٰ کے لئے جہت علو بغیر استقرار علی العرش کے ثابت کرتے ہیں اور مجسمہ حشویہ استقرار علی العرش کے بھی قائل ہیں اور ظاہر آیت (**الرحمن علی العرش استوی**) سے استدلال کرتے ہیں حالانکہ اس سے استقرار پر استدلال کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے''۔

علامہ موصوف نے ص۴۳ شرح فقہ اکبر میں لکھا:- باری تعالیٰ کسی مکان میں متمکن نہیں ہے نہ اوپر، نہ نیچے اور نہ کسی سمت میں، نہ اس پر زمانہ کا اجراء کرنا درست ہے جیسا کہ مشبہ، مجسمہ اور حلولیہ کرتے ہیں'' اور ص ۹۷ میں لکھا:- ''اہلسنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی رؤیت کسی جہت میں نہ ہوگی اور حدیث **کما ترون القمر لیلۃ البدر میں تشبیہ رؤیت بالرؤیت فی الجملہ** ہے نہ کہ تشبیہ مرئی بالمرئی من جمیع الوجوہ اور اس بارے میں شارح عقیدہ طحاویہ سے غلطی ہوئی کہ انہوں نے رؤیت بلا مقابلہ کو غیر معقول کہا''۔

شیخ محمد نووی شافعیؒ نے ص۴۰ فتح المجید میں لکھا:- حدیث مذکور میں تشبیہ رؤیت دربارۂ عدم شک وخفا ہے، تشبیہ مرئی کے لئے نہیں ہے، لہٰذا رؤیت بلا انحصار فی جہت ہوگی، کہ وہ نہ فوق میں ہوگی، نہ یمین میں، نہ شمال میں نہ سامنے وغیرہ معتزلہ جو کہتے ہیں کہ رؤیت بلا مقابلہ نہیں ہو سکتی اگر باری تعالیٰ کے لئے رؤیت جائز قرار دیں تو اس سے اس کا جہت ومکان میں ہونا لازم آئے گا اور وہ محال ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب امور بطور عادت ہیں اور جائز ہیں کہ خدا بلا مقابلہ ہی کے رؤیت کرا دے، جس طرح نبی اکرم ﷺ کو یہ خصوصیت دنیا میں ہی عنایت کردی تھی کہ آپ آگے کی طرح پیچھے بھی دیکھتے تھے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاری شریف میں فرمایا:- ''امام احمدؒ نے کما اراکم من امامی کو نبی کریم ﷺ کا معجزہ قرار دیا ہے اور اب یورپ کی تحقیق ہے کہ تمام جلد انسانی میں قوت بصارت موجود ہے، معجزہ میں یہ ضروری نہیں کہ وہ امر مستحیل ہو، بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس وقت کسی سے نہ ہو سکے مقابلہ میں، خواہ بعد کو وہ ہوا کرے''۔

ص۱۴ حاشیہ عقباوی علی عقیدۃ الشیخ احمد الدردیر میں ہے:- معتزلہ مرئی کا مقابل رائی ہونا ضروری سمجھتے ہیں جو خدا کے لئے محال ہے، لیکن یہ شرط رؤیت حادث میں ہے، رؤیت قدیم میں نہیں ہے، لہٰذا بلا کیف وانحصار ہو سکتی ہے، بلا کیف اس لئے کہ خدا کے لئے جسم کالا جسام عقیدہ یا جہت کا عقیدہ عند البعض کفر ہے اور عند البعض ابتداع ہے۔

علامہ محدث پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری ص۱۴۲ ج ۱۰ میں لکھا:- اہل سنت کے نزدیک رؤیت کا توقف صرف وجود مرئی پر ہے دوسری سب شرائط عادی ہیں اور غائب کو شاہد پر قیاس کرنا درست نہیں اور جب حق تعالیٰ اپنی مخلوقات مادی ومجردات کو بغیر مسافت وخروج شعاع کے دیکھتا ہے تو اسی کے مرئی ہونے کا انکار کیوں کیا جائے، ادھر سے بھی اس کی رؤیت بغیر عادی شرائط کے ہو سکتی ہے، اس موقع پر آپ نے حضرت مجدد صاحبؒ قدس سرہ کی عجیب وغریب تحقیق مکتوب نمبر ۱۰۰ جلد سوم مکتوبات سے نقل کی کہ جنت میں رؤیت بلا کیف کیوں کر ہوگی۔

محقق عینیؒ نے دوسری احادیث الباب کے قولہ من ورائی کے ذیل میں لکھا:- علامہ کرمانیؒ نے کہا اس حدیث اور خاص طور سے لفظ حدیث سابق کا مقتضی تو یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی رؤیت ورائی نماز وغیرہ سب ہی حالات میں تھی، لیکن سیاق حدیث سے حالت نماز کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے، علامہ عینیؒ نے فرمایا کہ حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ آپ کا یہ وصف تمام احوال میں تھا پھر قولہ کما اراکم کے تحت لکھا:- حافظ بقی[1] بن مخلد سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ تاریکی میں بھی ایسا[2] ہی دیکھتے تھے جیسا روشنی میں دیکھتے تھے (عمدہ ص۳۴۴ ج ۲)

---

[1] الامام شیخ الاسلام ابوعبدالرحمٰن بقی بن مخلد القرطبیؒ م ۲۷۶ھ، حافظ ابن ابی شیبہؒ کے نامور شاگرد اور صاحب مسند کبیر وتفسیر جلیل تھے، جس کے بارے میں حافظ ابن حزم نے کہا کہ اس جیسی تفسیر نہیں لکھی گئی، آپ نے اپنے فیضان حدیث سے سارے اندلس کو سیراب کر دیا تھا، فرماتے تھے'' میں نے اندلس میں ایسی مضبوط جڑوں کے درخت لگا دیئے ہیں جو خروج دجال سے پہلے نہ اکھڑ سکیں گے'' بڑے متواضع تھے، جنازوں پر حاضری کا التزام کرتے تھے، بعض اوقات مطالعہ کتب میں اس قدر منہمک ہو جاتے کہ کئی کئی روز تک صرف کرم کلا (سبزی) پر گذارا کرتے، امام احمدؒ کے خواص میں سے اور بخاری، مسلم ونسائی کے ہم پلہ تھے فرمایا کہ طلب علم کے لئے جس استاد کی خدمت میں گیا ہوں، پیدل ہی حاضر ہوا، مستجاب الدعوات تھے، ہر روز تہجد کی تیرہ رکعات میں قرآن مجید ختم کرتے تھے، مسلسل روزے رکھتے اور ستر غزوات میں شرکت کی تھی (تذکرۃ الحفاظ ص۶۲۹ ج ۲)

[2] فتح الباری ص۳۴۸ ج ۱ میں بھی شیخ بقی کا قول مذکور نقل کیا گیا ہے کہ مگر اس میں تقی بن مخلد غلط چھپ گیا ہے اور غالباً اسی سے فتح الملہم ص۱۳ ج ۲ میں بھی غلط نقل ہوا ہے، فلیتنبہ لہ۔ (مؤلف)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خواص اہل جنت

انبیاء کرام بنیۂ اہل جنت پر مخلوق ہوتے ہیں اور یہ بھی احادیث میں ہے کہ وہ اس دنیا میں بھی خواص جنت سے سرفراز ہوتے ہیں اور غالباً اسی سے ہے کہ (۱) حضور علیہ السلام تمام اوقات و حالات میں آگے کی طرح پیچھے بھی دیکھ سکتے تھے (۲) تاریکی میں بھی ایسا ہی دیکھتے تھے جس طرح روشنی میں دیکھتے (۳) نیند کی حالت میں آپ کی آنکھیں سوتی تھیں اور دل بیدار رہتا تھا، اور خود ارشاد فرمایا کہ اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کا حال تھا (بخاری) (۴) نماز کسوف کی حالت میں اسی دنیا میں رہتے ہوئے آپ نے جنت و دوزخ کا مشاہدہ فرمایا (بخاری ومسلم) نیز (۵) شب معراج میں بھی ان دونوں کا مشاہدہ فرمایا ہے (۶) شب معراج میں حضور علیہ السلام دیدار الٰہی کی نعمت سے بھی مشرف ہوئے ہیں جیسا کہ پوری تحقیق انوار الباری میں گذر چکی ہے (۷) غزوہ موتہ کے وقت پورا جنگ کا میدان آپ کی نظروں کے سامنے تھا اور مسجد نبوی میں بیٹھ کر سینکڑوں میل دور کے حالات و واقعات صحابہ کرام کو بتلائے کہ اب ایسا ہو رہا ہے اور پھر وہ سب باتیں صحیح ثابت ہوئیں (۸) معراج معظم کی صبح کو مسجد اقصیٰ کے ستونوں کی تعداد وغیرہ برائی العین مشاہدہ فرما کر کفار مکہ کو بتلاتے رہے (۹) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرشتوں کو دیکھتے اور ان سے ہم کلام ہوتے تھے (کمافی البخاری وغیرہ) (۱۰) حضور علیہ السلام عذاب قبر کی آواز سن لیتے تھے (کمافی مسلم) (۱۱) حضور علیہ السلام کی آواز بطور خرق عادت دور دراز جگہوں تک پہنچ جاتی تھی، چنانچہ ایک دفعہ آپ نے خطبہ میں لوگوں سے فرمایا "بیٹھ جاؤ" یہ آواز عبداللہ بن رواحہؓ کے کانوں تک پہنچ گئی جو اپنے ریوڑ کے ساتھ دور جنگل میں تھے اور حضور کی آواز سنتے ہی بیٹھ گئے یہ بھی صحابہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے منیٰ میں خطبہ دیا تو اس کی آواز ہم سب نے اپنے اپنے مقامات و منازل میں اچھی طرح سنی (۱۲) انبیاء علیہم السلام چونکہ اپنی صفات میں اہل جنت کے ساتھ مشابہ ہوتے ہیں اس لئے ان کے جسم بعد موت بھی تغیر وفنا سے محفوظ رہتے ہیں (۱۳) انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں بھی عبادت نماز وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں (۱۴) ان کو قبور میں رزق بھی دیا جاتا ہے (ابن ماجہ) (۱۵) حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہارا درود وسلام دور سے مجھے فرشتے پہنچاتے ہیں اور قریب سے میں خود سن کر جواب دیتا ہوں (ابوداؤد) ان کے علاوہ بیسیوں خصائص نبویہ ہیں جن کی تفصیل خصائص کبریٰ (علامہ محدث امام سیوطیؒ) وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے یہاں یہ دکھلانا ہے کہ جس طرح یہاں دنیا میں انبیاء علیہم السلام کو اہل جنت کے صفات و خصائص دیئے گئے، جنت میں سارے مومنوں کو وہ سب صفات حاصل ہو جائیں گی، لہٰذا وہ دیکھنے میں بھی جہت وسمت مقابل کے محتاج نہ ہوں گے نہ یہ کہ دنیا کی طرح صرف قریب کی چیز دیکھیں دور کی نہ دیکھ سکیں اور ان امور کا ثبوت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بلکہ آپ کے صدقہ میں صحابہ کرامؓ اور اولیائے امت میں بھی حاصل ہو چکا ہے۔

پھر حدیث الباب تو بخاری ومسلم کی یعنی سب سے اونچی حدیث ہے، جس میں ہے کہ میں اپنے پیچھے بھی آگے کی طرح دیکھتا ہوں، مگر اس کے باوجود بعض حضرات نے یہ رائے قائم کرلی کہ جنت میں جو دیدار خداوندی ہوگا وہ صرف مقابل کی جہت سے ہوگا اور وہ بھی صرف اوپر کی جہت سے ہوگا۔

۱؎ خیال یوں بھی ہوتا ہے واللہ اعلم کہ دنیا میں دنیا کی چیزیں دیکھنے کے لئے چونکہ عادۃً تقابل و جہت وغیرہ ضروری ہوتی ہے، اسی لئے دنیا میں دیدار الٰہی عوام کے لئے ممنوع ٹھیرا، لیکن انبیاء علیہم السلام چونکہ بنیۂ اہل جنت پر مخلوق ہوئے ہیں، اس لئے وہ اس حکم ممانعت سے مستثنیٰ ہوں گے اور شاید اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف اپنے لئے درخواست کی تھی (جبکہ قوم کا مطالبہ تو یہ تھا کہ ہمیں خدا کا دیدار کرا دیجئے!) پھر چونکہ حضور علیہ السلام کو دوسرے انبیاء علیہم السلام سے بھی زیادہ فضائل و خصائص و امتیازات حاصل تھے اور وہ دنیا کی چیزوں کو بھی بلا تقابل وجہت کے دیکھ سکتے تھے اور اندھیرے میں بھی اجالے کی طرح دیکھتے تھے، وغیرہ اس لئے کیا عجب ہے کہ دیدار خداوندی کا شرف بھی اسی امتیاز کے سبب سے حاصل ہوا ہو، یہ توجیہ اس کے سوا ہے کہ حضور علیہ السلام کو دیدار کا شرف شب معراج، اس عالم سے الگ ملاء اعلیٰ میں ہوا ہے، مگر ہمارے دل کو مذکورہ توجیہ زیادہ لگتی ہے یعنی جنت میں چونکہ سب ہی اہل جنت کو یہ وصف حاصل ہو جائے گا کہ وہ بلا تقابل و جہت کے تمام چیزوں کو دیکھیں گے اور ان کے لئے تقابل جہت و مسافت وغیرہ کی عادی شرائط باقی نہ رہیں گی، اس لئے ان کے لئے دیدار خداوندی بھی ممنوع نہ رہے گا اور حسب درجات وعدہ خداوندی اس سے مشرف بھی ہوتے رہیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم

حافظ ابن تیمیہ وابن قیم

حافظ ابن قیمؒ نے اپنے قصیدہ عقیدۂ نونیہ میں فرمایا:- **و ثالث عشر ھا اخبارہ انا نراہ فی الجنۃ وھل نراہ الا من فوقنا، اذرویۃ لا فی مقابلہ من الرائی محال لیس فی الامکان** ۔(تیرھواں عقیدہ یہ ہے کہ ہم خدا کو جنت میں دیکھیں گے، اور کیا ہم اس کو بجز اوپر کی جہت دیکھ سکیں گے جبکہ کوئی رؤیت بھی بغیر مقابلۂ رائی کے محال ہے اور اس کا امکان کسی طرح بھی درست نہیں ہوسکتا) پھر یہی بات انھوں نے شفاء العلیل ص ۱۵۹ میں بڑے دعوے کے ساتھ کہی ہے، حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے رسالہ ''الفتوی الحمویۃ الکبریٰ'' ص ۱۵۶ میں لکھا:- **کل یراہ فوقہ قبل وجھہ، کما یری الشمس و القمر** (ہر شخص اللہ تعالیٰ کو اوپر کی طرف اپنے سامنے سے دیکھے گا جس طرح سورج و چاند کو دیکھتا ہے) اس رسالہ میں موصوف نے اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستقر و متمکن ہونے کا بھی اثبات کیا ہے اور اس کے لئے جہت فوق متعین کرنے کی سعی بلیغ کی ہے جو اہل علم کے مطالعہ کی چیز ہے اس میں ص ۸۹ پر یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ کتاب وسنت، کلام صحابہ و تابعین اور کلام سائر امت سے بھی یہی بات ثابت ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ سب چیزوں سے اوپر ہے اور وہ آسمانوں پر عرش کے اوپر ہے[۲] اور اس کے ثبوت میں حدیث ادعال بھی پیش کی، جو اکابر محدثین کے نزدیک نہایت ضعیف، مضطرب، شاذ اور منکر ہے، ص ۱۱۸ میں ''باب الایمان بالکرسی'' کا عنوان قائم کر کے بحوالہ محمد بن عبداللہ نقل کیا کہ اہل سنت کا قول ہے کہ کرسی عرش کے سامنے ہے اور وہ موضع القدمین ہے، (یعنی خدا کے دونوں پاؤں رکھنے کی جگہ ہے) اور ابن عباس کا اثر ذکر کیا کہ جو کرسی آسمانوں اور زمین کو واسع ہے وہ موضع القدمین ہے، حافظ ابن تیمیہؒ نے دوسرے رسالہ ''عقیدۂ واسطیہ'' میں ذیل عنوان ''آیۃ الکرسی'' لکھا:- اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت وجلال سے خبر دی ہے اور یہ بھی کہ کرسی جو اللہ تعالیٰ کے لئے دونوں پاؤں رکھنے کی جگہ ہے، وہ آسمانوں، زمین اور مافیہا سے زیادہ وسیع ہے اور اسی نے ان دونوں کی حفاظت زوال اور تزلزل سے کی ہے،...... اور صحیح یہ ہے کہ کرسی عرش کے علاوہ ہے،...... پس اللہ سبحانہ کے لئے علو مطلق ہے تمام وجوہ سے، علو ذات بھی کیونکہ وہ تمام مخلوقات سے اوپر اور عرش پر مستوی ہے اور علو قدر بھی کہ اس کے لئے ہر صفت کمال کا اعلیٰ درجہ ہے، الخ (ص ۴۹ الکواشف الجلیہ عن معانی الواسطیہ)

حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے رسالہ تدمریہ میں لکھا:- نص شرعی میں نہ لفظ جہت کا اثبات ہے اور نہ نفی ہے...... جو شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جہت میں ہے، تو اس سے پوچھو کیا اس کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم کے اوپر ہے، اگر یہ مراد ہے بتلائے تو وہ حق پر ہے اور اگر یہ مراد

---

[۱] اگر رؤیت بلا مقابلہ ناممکن ومحال ہے تو حضور علیہ السلام کو رؤیت من وراء کیوں کر حاصل ہوگئی؟ کیا صحاح کی اس حدیث الباب سے حافظ ابن قیم واقف نہ تھے؟ یا ان کے نزدیک خوارق عادات محال و ممتنع ہونے کے باوجود انبیاء و اولیاء سے ان کا صدور ہوجاتا ہے۔ امید ہے کہ حافظ ابن تیمیہ وابن قیمؒ کے متبعین سلفی وتیمی و وہابی حضرات اس کا جواب دیں گے۔ (مؤلف)

[۲] رسالہ حمویہ ص ۱۱۳ میں فقہ اکبر امام اعظمؒ کے حوالہ سے بھی چند عبارتیں اس طرح نقل کی ہیں کہ امام اعظم بھی گویا تیمی المسلک تھے، حالانکہ یہ غلط ہے، علامہ نعمانی عم فیضہم نے مقدمہ کتاب التعلیم ص ۱۸۸ میں اس مغالطہ کا دفعیہ کیا ہے اور لکھا:- ''ابن تیمیہ نے فقہ اکبر سے جو فتاویٰ حمویہ میں حق تعالیٰ کے لئے تعیین مکان اعلیٰ علیین نقل کی ہے، وہ بے اصل ہے، کیونکہ امام اعظمؒ کے اصحاب وغیر اصحاب میں سے کسی بھی ثقہ راوی نے اس کو نقل نہیں کیا ہے، اور حقیقت میں ایسی عبارت عبداللہ انصاری نے اپنی طرف سے بطور تعلیل کلام کے بڑھائی ہے جس سے ابن تیمیہ اور ان کے متبعین کو دھوکہ ہوا ہے، علامہ ملا علی قاری حنفیؒ نے لکھا:- ''شیخ ابن عبدالسلام نے اپنی کتاب ''حل الرموز'' میں امام اعظمؒ سے نقل کیا کہ ''(جو شخص ایسا کہے کہ میں نہیں جانتا اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے یا زمین میں تو وہ کافر ہے)'' کیونکہ اس قول سے ایہام ہوتا ہے کہ قائل مذکور خدا کے لئے مکان سمجھتا ہے، لہٰذا وہ مشبہ ہے''۔ ظاہر ہے کہ ابن عبدالسلام بڑے جلیل القدر اور ثقہ عالم تھے، لہٰذا ان ہی کی نقل پر اعتماد ضروری ہے۔ علامہ کوثریؒ نے ''الفقہ الابسط'' کی تعلیق میں اس بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے''۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر ص ۴۶ میں امام اعظمؒ کا قول کتاب الوصیۃ سے نقل کیا اس میں بھی استواء بلا کیف کا اقرار اور استوا بمعنی استقرار کی صراحۃً نفی موجود ہے۔ افسوس ہے کہ حافظ ابن تیمیہ کی نقول میں غلطیاں اور مغالطے بہت ملتے ہیں، علامہ سبکیؒ نے بھی الدرۃ المضیۃ ص ۱۵ تا ۱۸ میں نقل کی کئی غلطیاں درج کی ہیں۔ (مؤلف)

بتلائے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں سے کسی چیز میں داخل ہے تو یہ باطل ہے (ص ۲۶) ائمہ سنت کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے آسمانوں پر عرش کے اوپر ہے، اور اپنی مخلوق سے جدا ہے (۲۷) تمام نصوص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے علو وفوقیت ہے تمام مخلوقات پر، اور اس کے لئے استوا بھی ہے عرش پر، پھر ایک وہم کرنے والا یوں وہم کرتا ہے کہ اس کا استواء بھی کشتی اور چوپایہ پر انسان کے استواء اور سوار ہونے کی طرح ہوگا اور وہ بھی انسان کی طرح عرش کا محتاج ہوگا، لہٰذا اس کا استواء قعود واستقرار کی صورت میں نہ ہونا چاہئے اور اس شخص نے یہ نہ سمجھا کہ احتیاج کے ساتھ تو خدا کے لئے صرف استواء کا اثبات بھی نہیں ہوسکتا، پھر استواء اور قعود واستقرار کے درمیان کیا فرق رہا، لہٰذا خدا کے لئے بلا احتیاج کے ان میں سے ہر چیز کو ثابت کر سکتے ہیں اور ایک کو ثابت کرنا، دوسرے کی نفی کرنا خلاف انصاف ہے اور عدم احتیاج کو سمجھنے کے لئے یہ مثال کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم کی بہت سی مخلوقات اوپر نیچے پیدا کی ہیں لیکن پھر بھی اوپر والی نیچے والی کی محتاج نہیں ہے، جیسے ہوا زمین کے اوپر ہے مگر وہ زمین کی محتاج نہیں، اور بادل زمین کے اوپر ہیں، پر اس کے محتاج نہیں، آسمان زمین کے اوپر ہیں مگر انہیں ضرورت نہیں کہ زمین ان کو اٹھائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے عرش کے اوپر ہونے کو سمجھنا چاہئے کہ وہ اس کو اٹھانے کا محتاج نہیں۔ (ص ۳۱،۳۳)

اس طرح علامہ نے اس استبعاد کو گویا ختم کر دیا جو استواء بمعنی استقرار وقعود وجلوس ہوسکتا ہے اور گویا ان کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے عرش وقعود وجلوس واستقرار ماننے سے اللہ تعالیٰ کے لئے جسم وحیز ومکان ماننا پڑتا ہے اور وہ جسم وحیز ومکان سے منزہ ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے خود ہی اپنے فتاویٰ ص ۴،۵ میں لکھا:- ''میرے مقابل علماء کا مجھ سے یہ مطالبہ ہے کہ میں اس امر کا اعتقاد کروں کہ اللہ تعالیٰ جہت وتحیز سے منزہ ہے اور اس سے ان کی نفی کرنی چاہئے اور میں کلام باری کے لئے یہ نہ کہوں کہ وہ حرف وصوت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے، بلکہ معنی قائم بذاتہ تعالیٰ کا عقیدہ کروں اور یہ بھی کہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف انگلیوں کے حسی اشارہ نہیں کیا جاسکتا اور یہ مطالبہ بھی مجھ سے کرتے ہیں کہ میں عوام کے سامنے آیات صفات واحادیث صفات کی تشریح نہ کروں اور نہ ان کو لکھ کر دوسرے شہروں کو بھیجوں اور نہ ان سے متعلق فتویٰ دوں۔'' تو میں نے فوراً ہی جواب لکھا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے کلام میں کہیں بھی لفظ وجہت کا اثبات اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں ہے، کیونکہ میں اس لفظ کے اطلاق نفیاً واثباتاً دونوں کو بدعت سمجھتا ہوں اور میں تو صرف وہی بات کہتا ہوں جو کتاب وسنت سے ثابت ہے اور اگر وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آسمانوں پر رب نہیں ہے اور نہ عرش کے اوپر خدا ہے اور نبی کریم ﷺ شب معراج میں اپنے رب کی طرف چڑھ کر نہیں گئے تھے اور عالم کے اوپر عدم محض ہے تو یہ سب امور باطل ومخالف اجماع امت ہیں اور اگر وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوقات احاطہ نہیں کرسکتی اور نہ وہ مخلوقات کے اندر ہے تو یہ ضرور میرے کلام میں موجود ہے اور ایسی صورت میں مجھے بتایا جائے کہ اس کی تجدید کرانے سے کیا فائدہ ہے؟!

فتاویٰ ابن تیمیہ کی پانچویں جلد میں ساری بحث عقائد ہی کی ہے اور تقریباً دوثلث میں کلام باری کے حرف وصوت ہونے کا اثبات اور جمہور سلف ومتقدمین کا رد ہے، متفرق مواضع میں تقریباً ستر صفحات مسئلہ استواء وجہت سے متعلق ہیں اور تقریباً ۳۵ صفحات میں مسئلہ رؤیت باری کی بحث ہے، ہر بحث میں ایسی ضعیف روایات وآثار ضرور ذکر کرتے ہیں، جن سے خدا کے لئے جسم وجہت ثابت ہونے کا ابہام ہوتا ہے، مثلاً ص ۸۷ میں طبرانی سے حضرت ابن عباسؓ کا اثر کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈرانا چاہتا ہے تو اپنا کچھ حصہ زمین کے لئے ظاہر کرتا ہے اور اس وقت زلزلہ آجاتا ہے، دوسرا اثر ابن عباس کہ خدا کی تجلی جبل کے لئے فقط ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے برابر ہوئی تھی جس سے پہاڑ مٹی کے برابر ہوگیا، تیسرا اثر مجاہد حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ میں، آیت وان له عندنا لزلفی و حسن مآب کی تفسیر میں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے سے قریب کرتا تھا، یہاں تک کہ وہ اس کے بعض کو مس بھی کر لیتے تھے، چوتھا اثر مجاہد عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا میں مقام محمود کی تفسیر کہ اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو اپنے پاس عرش پر بٹھائے گا۔

---

[۱] اسی طرح حافظ ابن تیمیہؒ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم من جنس المخلوقات نہیں کہہ سکتے گویا نفس جسم کا اثبات کر سکتے ہیں۔ (مؤلف)

مسلک حق پر تنقید

اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ حافظ ابن تیمیہؒ کے مقابل علماء جو جسم ولوازم جسم جہت وحیز ومکان وغیرہ کا خدا کے لئے انکار کرتے تھے ان کی اس بات کو حافظ ابن تیمیہ وابن قیم اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے بلکہ اس کو اپنے زعم میں عقیدہ صحیح کے خلاف خیال کرتے تھے چنانچہ فتاویٰ مذکورہ کا ص ۳۱۰ سے ۳۱۵ تک (الوجہ الثانی مس عشر الخ) مطالعہ کر لیجئے، ہماری یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ''سلف سے بہت سے مسائل میں معتزلہ کی موافقت ثابت ہے جبکہ تم نے ان مسائل میں بھی معتزلہ کی مخالفت کی ہے، مثلاً بعض سلف سے سماع[1] موتی کا انکار منقول ہے اور بعض سلف نے معراج جسمانی کا بھی انکار کیا ہے وغیرہ مگر تم نے ان مسائل میں سلف کے خلاف بھی معتزلہ کی مخالفت کی، پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تم نے ایسی باتوں میں معتزلہ کی موافقت کر لی جو سلف سے بھی منقول نہیں ہوئے مثلاً (۱) یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نہ داخل عالم ہے نہ خارج اور (۲) یہ کہ اللہ تعالیٰ عالم کے اوپر نہیں اور (۳) تم جو خدا سے جسم ولوازم جسم کی نفی کرتے ہو، تمہاری ان امور میں موافقت معتزلہ کے لئے سلف[2] میں سے کسی کی بھی تائید حاصل نہیں ہے۔'' (ص ۳۱۲)

''اس سے بھی زیادہ عجیب یہ ہے کہ تم نے بعض متفقہ امور سلف کا بھی انکار کر دیا، مثلاً یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے شب معراج میں خدا کو دیکھا، حالانکہ یہ مسئلہ صحابہ میں نزاعی تھا، یا تم کہتے ہو کہ حضور علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے خدا کا دیدار کیا حالانکہ اس کا قائل کوئی بھی نہیں تھا[3] پھر تم یہ بھی کہتے ہو کہ حضور علیہ السلام معراج میں خدا کی طرف[4] نہیں چڑھے، کیونکہ خدا (تمہارے نزدیک) آسمانوں پر نہیں ہے، لہٰذا تم سلف کی اتفاقی اجماعی باتوں کا تو انکار کرتے ہو اور متنازع امور کو مانتے ہو، اور ان باتوں کو جن کا قائل کوئی بھی نہیں ہوا ہے''۔

''معتزلہ نے رؤیت خداوندی کا انکار کر کے گمراہی اختیار کی، حالانکہ ان کے پاس کچھ ظاہری دلائل بھی موجود تھے، تم لوگوں نے اس مسئلہ میں تو معتزلہ کی مخالفت کی، مگر اس سے کہیں زیادہ بڑے مسائل میں معتزلہ کی موافقت کر لی، مثلاً خدا کے مخلوقات سے جدا ہونے اور اس کے عرش پر ہونے سے انکار کر دیا، حالانکہ ہر عاقل جانتا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا عرش پر[5] ہونا بہ نسبت اس کی رؤیت کے کہیں زیادہ

۱؎ اس سے حافظ ابن تیمیہؒ یہ اثر ڈالنا چاہتے ہیں کہ قبور سے استفادہ وغیرہ کو خلاف بعض سلف ہونے کی وجہ سے ممنوع سمجھا جائے۔ (مؤلف)

۲؎ ہم نے کئی جگہ پر تحقیق نقل کر دی ہے کہ سلف وجمہور امت کے نزدیک خدا کے لئے جسم ولوازم جسم، جہت، حیز ومکان وغیرہ کا اثبات کرنا درست نہیں ہے۔ (مؤلف)

۳؎ ہم نے جلد نہم انوارالباری میں حدیث معراج کے تحت سلف کے دیدار خداوندی بروٴیۃ العین کا اثبات اچھی طرح کر دیا ہے، اس کو پڑھ کر مذکور دعوے کا کھوکھلا پن واضح ہوگا۔

۴؎ یہ تعبیر غلط ہے، البتہ ہم امام مالکؒ کی طرح معراج نبوی کے وقت حضور علیہ اسلام کے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہونے اور حضرت یونس علیہ السلام کے بطن حوت و قعر بحر میں ہونے کی حالت کو برابر درجہ میں سمجھتے ہیں اور حق تعالیٰ کو دونوں صورتوں میں جہات سے منزہ یقین کرتے ہیں، امام مالکؒ نے نفی جہت کے لئے حدیث نہی عن التفضیل علی یونس علیہ السلام کو دلیل قرار دیا ہے اور قاضی عیاضؒ نے شفا میں لکھا کہ جن حضرات نے اثبات جہت کو کفر قرار دیا ہے ان کی تعداد ائمہ امت میں سے بہت ہی زیادہ ہے، ملاحظہ ہو السیف الصقیل ص ۳۶ لیکن حافظ قیمؒ نے بڑی جراءت کر کے امام الحرمین کو اسی قول کو تحریف والحاد قرار دے دیا ہے، عقیدہ نونیہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "هذا هو الالحاد حقابل هو التحريف محضا ابروا الهذيان اور فرمایا "امثال ذا التاويل افسد هذه الاديان حين سرى الى الاديان"

السیف الصقیل میں قصیدۂ نونیہ کی اس قسم کی تحقیقات عالیہ کا مدلل رد کیا گیا ہے اور راقم الحروف کا ارادہ بھی اس پر اردو میں مستقل طور سے لکھنے کا ہے، بلکہ دوسرے حضرات اہل علم وتحقیق اس طرف توجہ کریں تو بہتر ہو، میرا تو آخری وقت ہے، اگر انوارالباری ہی مکمل ہو سکے تو غنیمت ہے۔ (مؤلف)

۵؎ حافظ ابن تیمیہ وابن قیم کے نزدیک سب سے زیادہ تصریح شدہ مسئلہ حق تعالیٰ کے عرش اعظم پر مستقر ومتمکن ہونے کا ہے، جس کو وہ ایمان وکفر کا مسئلہ سمجھتے تھے اور جو لوگ عرش پر استقرار وتمکن یا خدا کے لئے جہت ومکان کے اثبات کی تعبیرات کو خلاف تنزیہ کہتے تھے، ان سب کو یہ دونوں بزرگ اور ان کے متبعین آج بھی نفاۃ الصفات کا لقب دیتے ہیں، یعنی ان کے علاوہ ساری امت کے علماء اور سواد اعظم معاذ اللہ خدا کی صفات کے منکر ہیں، کیونکہ سب سے بڑی صفت اللہ تعالیٰ کے سب سے اوپر اور الگ عرش پر مستقر ومتمکن ہونے اور اس پر بیٹھ کر دونوں پاؤں کرسی پر رکھنے ہی کی جب نفی کر دی گئی تو گویا ساری ہی صفات کی نفی کر دی گئی اور سب سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ اسی بات کی رٹ سلفی، تیمی وہابی حضرات اس زمانہ میں بھی لگا رہے ہیں جب کہ جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

واضح طور سے ثابت ہے اور اس انکار کی بنیاد صرف یہ وہم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے''۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کہ ہم زمین پر بسنے والوں کے لئے ملاءاعلیٰ کے لحاظ سے نہ کوئی جہت فوق ہے نہ تحت ہے، دن کے وقت جو جہت ہمارے لئے فوق ہوتی ہے وہی رات کے وقت تحت ہو جاتی ہے اور امریکہ والوں کے لئے برعکس ہوتا رہتا ہے کیونکہ زمین اپنی محوری گردش ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دن ورات میں پوری کرتی ہے اور سورج کے مقابل ہونے نہ ہونے سے زمین پر دن ورات کا وجود ہوتا ہے، پھر دوسری گردش زمین کی سورج کے گرد ہوتی ہے، جو ساٹھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ایک سال میں پوری ہوتی ہے، تیسری گردش زمین کی سورج اور اس کے دوسرے بڑے آٹھ سیاروں کے ساتھ اسی فضاء تحت السماء میں ہوتی رہتی ہے جس کی رفتار بیس ہزار میل فی گھنٹہ ہے، تو بھلا اس نئی تحقیق اور ریسرچ کے دور میں قرآن مجید سے ثابت شدہ سب سے بڑا مسئلہ فوق وتحت کے عقیدہ کا بنالینا کیا عقلمندی ہے اور کیا اس طرح تکذیب قرآن کی طرف دعوت دینا نہیں ہے؟ اور زمین کے کروی ہونے کا ثبوت کتاب وسنت کے تحت حافظ ابن تیمیہ سے بھی بہت پہلے سے ابن حزم کی الفصل ص ۹۷ ج ۲ میں موجود ہے۔

اس دور کے سلفی حضرات نے تو حافظ ابن تیمیہ وابن قیم کے متبوع وامام دارمی سجزی کی کتاب النقض بھی شائع کردی ہے جس میں ص ۱۰۰ پر ہے کہ ''تم میں سے کون ایسی غیر معقول بات کہہ سکتا ہے کہ پہاڑ کی چوٹی خدا سے زیادہ قریب نہیں ہے؟ جبکہ مینارہ کا اوپر کا حصہ بھی بہ نسبت اسفل کے خدا سے زیادہ اقرب ہے'' اور ص ۹۷ میں لکھا کہ ''حق تعالیٰ اپنی مخلوق سے بہت ہی دور اپنے عرش پر ہے اور درمیان میں بہت بڑا فوجہ اور خلا ہے، یعنی ساتوں آسمان اس کے اور مخلوق ارضی کے درمیان حائل ہیں'' ساری کتاب ایسے ہی عجائب وغرائب سے بھری ہے اور جب اس کتاب پر اعتراضات ہوئے تو حرمین کے سلفی حضرات نے اس کی اشاعت غیر ضروری قرار دی ہے، اسی لئے حرمین میں کم ملتی ہے اور دوسری کتابیں کتاب التوحید لابن خزیمہ اور کتاب السنہ بعبد اللہ بن الامام احمد تو تلاش سے بھی نہیں ملتیں، حالانکہ ان تینوں کتابوں میں حافظ ابن تیمیہ وابن قیم کے نظریات کی تائید ملتی ہے۔

شیخ دارمی سجزی: حافظ ابن تیمیہؒ نے فتویٰ حمویہ کبریٰ ص ۹۷ میں اپنی متبوع وامام دارمی مذکور کا تعارف کرایا کہ وہ ائمہ مشاہیر میں سے امام بخاری کے زمانہ میں تھے اور لکھا کہ ''ان کی کتاب النقض پڑھ کر عاقل ذکی سلف کے علوم کی حقیقت تک رسائی حاصل کرے گا اور ان کے طریق استدلال کی قوت اور مخالفین کی ضعف حجت معلوم کرے گا'' یہ دارمی سجزی م ۲۸۰ھ ہیں، دیکھو تذکرۃ الحفاظ ص ۶۲۱ ج ۲ اور صاحب سنن ومسند عالی حافظ حدیث، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ کے استاذ حدیث دارمی سمرقندی م ۲۵۵ھ دوسرے ہیں اور وہ دارمی سجزی سے متقدم ہیں جن کو ذہبی نے الامام شیخ الاسلام اور صاحب المسند العالی لکھا اور بہت زیادہ تعریف کی ہے یہ بھی لکھا کہ وہ غیر معمولی عقل وسمجھ اور نہایت فضل وعلم کے مالک تھے (تذکرہ ص ۵۳۴ ج ۲) صاحب الرسالۃ المطرفہ نے لکھا کہ ''ان کے یہاں اسانید عالیہ وثلاثیات ہیں بلکہ ان کی ثلاثیات .... امام بخاری سے زیادہ ہیں'' بعض محدثین نے سنن دارمی کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے (فتح الملہم ۹۵ ج ۱) دارمی سجزی کی بھی مسند ہے مگر وہ عالی نہیں ہے تاہم حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب اجتماع الجیوش الاسلامیہ'' میں لکھا:- شیخ دارمی کی کتاب النقض'' اور کتاب ''الرد علی الجہمیہ'' سنت کے بارے میں تصنیف شدہ جلیل القدر وانفع کتابوں میں سے ہے، ہر طالب سنت جو طریق صحابہ وتابعین وائمہ سے واقف ہونا چاہے اس کو ان دونوں کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ان دونوں کتابوں کے بارے میں بہت زیادہ وصیت کیا کرتے تھے اور ان کی نہایت عظمت کرتے تھے اور ان میں توحید اور اسماء وصفات باری کی تحقیق وتقریر ایسی ہے کہ دوسری کتابوں میں نہ ملے گی، (ک مقدمہ کتاب النقض)

ان دونوں شیوخ سلفیین کی اتنی بلند بانگ مدح وتوصیف کے بعد کتاب النقض کے مطبوعہ نسخہ میں سلفی کبیر ناشر کتاب محمد حامد الفقی رئیس جماعت انصار السنۃ المحمدیہ کی کتاب مذکور پر تنقیدات بھی ک مقدمہ، ص ۲۰، ص ۲۳، ص ۲۵، ص ۷۱ اور ص ۱۶۴ میں پڑھ لی جائیں تو ع ''بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا'' اور ''علامہ کوثری'' کی مکمل تنقیدات ''مقالات کوثری'' میں پڑھ لی جائیں تو واضح ہو جائے گا کہ علم کلام وعقائد پر دارمی سجزی کو کتاب مذکور لکھنے کا حق ہی نہ تھا، جس طرح محدث ابن خزیمہؒ م ۳۱۱ھ علم کلام سے عاری تھے اور اسی لئے ان کے کلامی اقوال کو محققین نے نظر انداز کیا ہے، ملاحظہ ہو امام بیہقیؒ کی کتاب الاسماء والصفات ص ۳۰۰ اور مشکلات القرآن علامہ کشمیریؒ ص ۱۴۹ وغیرہ۔

افسوس ہے کہ حافظ ابن تیمیہ وابن قیم نے اور ان کے اتباع میں اس دور کے سلفی علماء نے بھی عقائد میں ان دونوں اور ان جیسے دوسرے سلفی حضرات شیخ عبداللہ بن الامام احمد م ۲۹۰، ابن حامد بغدادی م ۴۰۳ھ، قاضی ابویعلی حنبلی م ۴۵۸ھ اور زاغونی حنبلی م ۵۲۷ھ کا اتباع کیا ہے حالانکہ محقق ابن جوزی حنبلی م ۵۹۷ھ نے ان سب کے غلط مزعومات کا رد وافر بھی کر دیا تھا اور نہایت مدلل ومفصل طریق سے ثابت کر دیا تھا کہ ان کے عقائد جمہور امت وسلف اور امام احمدؒ کے بھی خلاف ہیں اور یہ بھی کہ علم سلف وہ نہیں تھا جو ان لوگوں نے سمجھا ہے، آپ شیخ عبداللہ کی کتاب السنہ اور ابن خزیمہ کی کتاب التوحید بھی طبع ہو کر سامنے آگئی ہیں جن میں جمہور امت وسلف کے خلاف عقائد موجود ہیں، واللہ المستعان علی ما یصفون۔

یہاں حدیث ترمذی شریف بھی سامنے رہے ''**انکم لو ولیتم بحبل الی الارض السفلی لھبط علی اللہ ثم قرأ ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیء علیم**'' (رواہ احمد الترمذی) یعنی اگر تم ایک رسی زمین کے نچلے حصہ تک ڈالو گے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ تک پہنچے گی کیونکہ اس کی ذات سب سے اول وقدیم ہے، جس کی ابتدا نہیں اور وہی آخر وباقی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اور وہی ظاہر ہے باعتبار صفات کے اور باطن ہے باعتبار ذات کے، قال الترمذی وھو علی العرش کما وصف نفسہ فی کتابہ، علامہ طیبیؒ نے لکھا:- یعنی عرش پر اس کا استواء اسی طرح ہے جس طرح اس نے اپنی صفت اپنی کتاب میں بتلائی اور استواء کی پوری حقیقت وعلم صرف خدا کے پاس ہیں، امام ترمذی کا مقصد یہ ہے کہ لھبط علی اللہ میں تاویل علم وقدرت وسلطان کی کی جائے اور استواء علی العرش کا علم بھی خدا ہی کی طرف مفوض کیا جائے اور اس کی تاویل نہ کی جائے جیسا پہلے گذر چکا کہ بعض خلاف ظاہر امور تاویل کے محتاج ہوتے ہیں اور بعض امور میں غور وخوض کرنا چاہئے (مرقاۃ ص ۲۵۵ ج ۵) اس حدیث پر امام ربانی حضرت مجدد قدس سرہ نے مکتوب نمبر ۱۲۱ جلد سوم میں روشنی ڈالی ہے۔ (مؤلف)

ص۳۱۴ ج ۵ میں لکھا: - فضلا اگر غور وتدبر کریں تو یہ بات روشن ہے کہ رؤیت کے مسئلہ میں جو تم معتزلہ کی مخالفت کی ہے وہ صرف ظاہری ہے اور حقیقت میں تم نے ان کی موافقت[1] کی ہے، کیونکہ تم نے رؤیت کا اقرار ایسے طور سے کیا ہے، جو معتزلہ کے خلاف نہیں ہوتا'' کیونکہ وہ تو جہت ومکان سے بچنا چاہتے تھے، تم نے ان دونوں باتوں کا انکار کر کے بلا جہت کے رؤیت مان لی تو پھر کیا اختلاف باقی رہا؟

ص۳۲۶ میں حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا: -'' بہت ہی اہم وعظیم بات اور نہایت بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ تم لوگ اور معتزلہ بھی بہت سے اصول دین وعقائد کو ضعیف وفاسد طریقوں سے ثابت کرتے ہو، جبکہ اس سے بہت سے دوسرے اصول دین وعقائد کی تکذیب وتغلیط بھی لازم آتی ہے''۔

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ موصوف اپنی بیماری دوسروں میں دیکھتے تھے، جس طرح یرقان کا مریض ہر چیز کو ہرا دیکھتا ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، علامہ ابن جوزی حنبلی م ۵۹۷ھ کی کتاب'' دفع شبہۃ التشبیہ والرد علی المجسمہ'' دیکھی جائے جس میں حافظ ابن تیمیہؒ کے ممدوحین ومتبوعین (ابن حامد م ۴۰۳ھ وقاضی ابویعلی حنبلی م ۴۵۸ھ وزاغونی حنبلی م ۵۲۷ھ وغیرہ) کا رد کیا گیا ہے اور ساٹھ احادیث کے مطالب ومعانی واضح کئے ہیں، جن کے غلط مفہوم لے کر ان لوگوں نے مسلک جمہور ومذہب امام احمد کے خلاف الگ اپنا مذہب بنایا تھا ان احادیث میں سے شاذ ومنکر اور ضعیف روایات کی بھی نشان دہی کردی ہے اور حافظ ابن تیمیہ وابن قیم نے اپنے ان ہی متبوعین کے اتباع میں ان کے دلائل کو پھر سے دہرادیا ہے۔

دعوت مطالعہ

علامہ ابن جوزی کی کتاب مذکور اور علامہ حصنی م ۸۲۹ کی کتاب'' دفع شبہ من شبہ وتمرد ونسب ذلک الی الامام الجلیل احمد'' کا مطالعہ تمام علماء کو کرنا چاہئے، تاکہ وہ اس دور کے سلفی، تیمی ووہابی فتنہ کو علی وجہ البصیرت سمجھ سکیں خاص طور سے میں حضرت علامہ کشمیریؒ اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے تلامذہ ومسترشدین کو اس طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ اس دور کی اہم ترین علمی ودینی ضرورت کا احساس کر کے ان دونوں حضرات نے تفردات ابن تیمیہ کے رد میں غیر معمولی توجہ صرف کی تھی۔

ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ معمولی وسطحی مطالعہ سے ہرگز کام نہ چلے گا، معقول ومنقول کی پوری استعداد رکھنے کے ساتھ حافظ ابن تیمیہ وابن قیم کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا اور جتنا لٹریچر رد میں آٹھویں صدی سے اب تک لکھا گیا ہے سب ہی کو سامنے رکھ کر حقائق واضح ہوسکیں گے، کیونکہ ان دونوں حضرات کی کتابوں میں بڑے بڑے گھماؤ، پھراؤ، بچاؤ اور تناقضات واغلاط ومغالطات نقول بھی ہیں، ناقص الاستعداد اور کم مطالعہ والے دھوکہ کھا سکتے ہیں، ہمارے ان دونوں اکابر اور علامہ کوثریؒ کو اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا کرے کہ اس فتنہ کی طرف توجہ دی اور دلائی، راقم الحروف کو ان تینوں حضرات سے تلمذ کے صدقہ میں کچھ لکھنے کی توفیق ملی ہے، لیکن سر دست میری ساری توجہ شرح بخاری شریف کے کام کی طرف ہے، مجبوراً اور ضمناً کچھ لکھنا پڑتا ہے ضرورت ہے کہ صرف اس کام پر پوری توجہ صرف کر کے مستقل کتابیں کامل تحقیق کے ساتھ لکھی جائیں اور بڑے پیمانہ پر ان کی اشاعت کی جائے جس طرح سلفی حضرات کی طرف سے حافظ ابن تیمیہ وابن قیم کی کتابوں کی اشاعت بڑے اہتمام کے ساتھ اور مفت کی جارہی ہے اور ان کے عقائد ونظریات وتفردات کو بطور'' دعوت'' کے پیش کیا جارہا ہے۔

افسوس ہے کہ'' علماء دیوبند'' جن کا عظیم مقصد احقاق حق وابطال باطل ہے اس دور کے بیشتر علمی فتنوں سے بڑی حد تک غافل ہیں **ولعل الله يحدث بعد ذلک امرا۔** (علامہ فراہیؒ کی تالیفات بھی پھر سے شائع کرنے کا منصوبہ لاکھوں روپے جمع کر کے بنایا جارہا ہے، ان کی تفسیری غلطیوں کا نمونہ قصص القرآن مولانا حفظ الرحمٰن وتفہیم القرآن مولانا مودودی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

---

[1] اس طرح دوسری طرف حافظ ابن تیمیہ کو بھی الزام دے سکتے ہیں کہ آپ نے معتزلہ اور مجسمہ دونوں کی موافقت کر لی ہے اور اہل حق کی مخالفت، کیونکہ معتزلہ بغیر جہت کے رؤیت کو محال سمجھتے تھے، آپ نے بھی یہی کیا اور پھر مجسمہ کا ساتھ دے دیا کہ جہت فوق متعین کر کے اللہ تعالیٰ کو اجسام کی طرح عرش پر مستقر، جالس اور قاعد بھی ثابت کیا، اہل حق تو جس طرح حضور علیہ السلام کی حدیث الباب والی رؤیت کو بلاشرط جہت ومقابلہ یہاں درست مانتے ہیں، رؤیت خداوندی کو بھی مانتے ہیں۔ (مؤلف)

یہاں رؤیت باری کی بحث بخاری کی حدیث الباب کے تحت ضمناً آ گئی اور حافظ ابن حجر و محقق عینی کی تشریحات کی وجہ سے آ گئی، کیونکہ جب اہل حق کا مسلک واضح و معین ہو چکا اور بخاری و مسلم کی ایسی احادیث صحیحہ قویہ کی روشنی میں متحقق ہو گیا کہ رؤیت کے لئے نہ کوئی فاصلہ کی شرط ہے نہ تقابل (آمنے سامنے ہونے) کی اور حضور علیہ السلام کا بلا تقابل و جہت کے پیچھے والی چیزوں کو بھی آگے کی طرح دیکھ لینا، بلکہ اندھیرے میں بھی اجالے کی طرح دیکھنا وغیرہ امور ثابت ہو گئے تو آخرت میں دیدار خداوندی کیلئے تقابل اور فاصلہ و جہت کی شرطیں کس لئے؟ اور حافظ ابن تیمیہ و ابن قیم کا رؤیت کو جہت مقابل وفوق کے ساتھ لازم کرنا اور بلا تقابل کے رؤیت کو ناممکن و محال تک بتلا دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟!

"**الصراع بین السلام الوثنیة للقیصمی**" ص ۵۲۶ ج ا میں ہے کہ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں بہت سی جگہ اور دوسری تالیفات میں بھی لکھا کہ:- "یہ کہنا صحیح نہیں کہ خدا کسی جہت[1] میں ہے اور نہ یہ صحیح ہے کہ وہ کسی جہت میں نہیں ہے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ وہ جسم ہے یا جسم[2] نہیں ہے، ہم ان سب کی نہ نفی کر سکتے ہیں نہ اثبات، کیونکہ ان کا اثبات و نفی کتاب و سنت میں وارد نہیں ہوا اور نہ سلف امت[3] سے منقول ہوا ہے"۔

اس بڑے دعوے کے مقابلے میں یہاں صرف اتنی سی مختصر بات عرض ہے کہ کتاب و سنت میں ہزاروں باتوں کی نفی خدائے برتر کی منزہ ذات سے نہیں کی گئی، تو کیا ان کے بارے میں بھی یہی چھوٹ دے دی جائے گی؟ اور کیا **لیس کمثلہ شیء** اور **افمن یخلق کمن لا یخلق** کی تصریح کے بعد ایسی کچی بات کا دعوے درخور اعتنا ہو بھی سکتا ہے؟ اور مرقاۃ شرح مشکوۃ ص ۱۳۷ ج ۲ میں بحوالہ حافظ عراقیؒ، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، اشعری باقلانی سے نقل ہوا کہ ان سب کے نزدیک خدا کے لئے جہت کا اعتقاد[4] رکھنے والا کافر ہے۔ اور امام احمد سے نفی جہت و نفی تشبیہ و تمثیل کو محققانہ بحث علامہ ابن جوزی حنبلی و علامہ حصنی وغیرہ نے کر دی ہے جس کے بعد حافظ ابن تیمیہؒ کا دعویٰ

---

[1] پھر فتاویٰ ص ۳۵ میں جہت فوق کو خدا کے لئے کیوں ثابت کیا ہے۔؟ [2] حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ ص ۲۳۰ ج ۵ میں لکھا:- اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جس شخص نے رب کو جسم من جنس المخلوقات قرار دیا وہ ضلالت و گمراہی کے لحاظ سے اعظم المبتدء میں سے ہے یہاں جسم کے ساتھ قید لگا کر تیسری صورت نکال لی۔ ص ۲۴۴ میں نقل کیا کہ حضرت امام مالکؒ سے اہل بدعت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:- "وہ ایسے لوگ ہیں جو باری تعالیٰ کے اسماء، صفات، کلام، علم و قدرت میں کلام کرتے ہیں اور ان باتوں کے کہنے سے نہیں رکتے جن سے صحابہ و تابعین نے سکوت کیا تھا"۔ اس دور کے سلفی و تیمی انصار السنہ نے شیخ عبداللہ بن الامام احمدؒ کی کتاب السنہ بھی شائع کر دی ہے جس میں ہے ص ۵ کیا استواء بغیر جلوس کے ہو سکتا ہے؟ ص ۷۰ میں ہمارا رب کرسی پر بیٹھتا ہے تو اس سے نئے کجاوے کی طرح آواز نکلتی ہے، ص ۷۱ وہ کرسی پر بیٹھتا ہے تو اس سے صرف چار انگل کی جگہ بچتی ہے، ص ۱۴۲ شروع دن میں رحمٰن کا بوجھ حاملین عرش پر زیادہ بھاری ہوتا ہے جب مشرک عبادت کرتے ہیں، پھر جب مومنین عبادت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں تو وہ بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے وغیرہ اور حافظ ابن تیمیہ کے ممدوح امام دارمی سجزی کی کتاب النقض کے ص ۹۲ اور ص ۱۸۲ میں ہے کہ حدیث ابی داؤد میں اطیط عرش کا جو ذکر ہے وہ خدا کے عرش پر بوجھ کی وجہ سے ہے، کیونکہ اس کا بوجھ لوہے پتھروں کے ٹیلوں کی طرح ہے۔

[3] حافظ ابن قیم نے اپنے عقیدہ نونیہ میں کہا:- اللہ تعالیٰ عرش و کرسی پر ہے اور کرسی پر اس کے دونوں قدم ہیں اور وہ اوپر سے ہی مخلوق کو دیکھتا اور ان کی باتیں سنتا ہے اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن محمد ﷺ کو اپنے قریب کرے گا یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ عرش پر بیٹھے ہوئے دیکھے جائیں گے، کیا یہ یا اسی قسم کے الفاظ سلف امت سے منقول ہوئے ہیں؟ بینوا توجروا (مؤلف)

[4] تفہیم القرآن ص ۴۰۰ میں آیت ۴ ء امنتم من فی السماء کے ذیل میں لکھا:- اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر رہتا ہے الخ ص ۵۷ ج ا میں خدا کے عرش پر بیٹھے ہوئے اور اس کے لئے جسم، جہت و مقام کی نفی کی ہے، ص ۳۰۹ ج ۶ میں مخلوقات سے تشبیہ دینے کے ہر پہلو کو فاسد عقیدہ قرار دیا ہے، ص ۳۳۳ ج ۶ میں خدا کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے عقیدہ کی نفی کی ہے۔

ملا علی قاریؒ نے لکھا:- "امام رازی کا قول کتنا اچھا ہے کہ خدا کو جسم ماننے والا کبھی بھی خدا کی عبادت نہیں کرتا، کیونکہ وہ تو اپنے غلط عقیدے کی وجہ سے ہر اس چیز کی عبادت کرتا ہے جس کی صورت اس کے ذہن میں قائم ہے حالانکہ خدا ان سب مخلوقاتی تصورات سے منزہ ہے اور لکھا:- "حق تعالیٰ تمام اوصاف اجسام سے منزہ ہے اور نہ وہ کسی اوپر یا نیچے کے مکان میں متمکن ہے، نہ اس پر زمان کا اطلاق و اجراء ہو سکتا ہے، نہ وہ کسی چیز کے اندر حلول کرتا ہے یہ سب شبہ، مجسمہ اور حلولیہ کے اوہام ہیں"۔ (شرح فقہ اکبر ص ۴۳) ص ۴۴ میں لکھا:- الرحمٰن علی العرش استوی وغیرہ آیات میں صفات متشابہات بیان ہوئی ہیں، جن کی کیفیت مجہول ہے اور ان سب پر بلا کیف و تشبیہ وغیرہ کے ایمان لانا چاہئے۔ (مؤلف)

مذکور محض دعوے بلا دلیل رہ جاتا ہے اور کیا ان کے نزدیک ائمہ اربعہ اور دوسرے اکابر امت سلف امت میں داخل نہیں تھے؟ واضح ہو کہ یہ مرقاۃ شرح مشکوۃ وجلیل القدر محققانہ کتاب (ملا علی قاری حنفیؒ کی) ہے کہ اس کی محققانہ نقول پر سلفی وتیمی حضرات بھی اعتماد کرتے ہیں اور قریبی دور کے علامہ مبارکپوریؒ نے تو اپنی شرح ترمذی شریف ''تحفۃ الاحوذی'' میں سینکڑوں عبارتیں اس سے نقل کی ہیں اگر چہ بغیر حوالہ کی نقول بھی کثرت سے ہیں اور یہ بات علامہ مرحوم کے لئے مناسب نہ تھی۔

حرف آخر

ائمہ اربعہ کے دور مبارک ومیمون میں احادیث وآثار صحابہ وتابعین اور تعامل خیر القرون کو پوری طرح سامنے رکھ کر لاکھوں فروعی مسائل کے صحیح فیصلے مدون ہو چکے تھے اور تمام اسلامی ملکوں میں فقہ اسلامی کے احکام بھی جاری ہو چکے تھے اور امام بخاریؒ وغیرہ سے پہلے ایک سو ۱۰۰ کے قریب احادیث صحاح وآثار صحابہ وتابعین کے مجموعے تالیف ہو کر منظر عام پر آ گئے تھے کہ امام بخاریؒ نے اسحاق بن راہویہ کی تحریک پر صحیح مجرد کی تالیف کی اور آثار صحابہ وتابعین کو درمیان سے ہٹا دیا، جس کے نتیجہ میں عدم تقلید ائمہ اربعہ کا دروازہ کھل گیا اور صرف احادیث کو سامنے رکھ کر ہر شخص اپنے اجتہاد سے فیصلے کرنے کا مستحق بن گیا، خواہ وہ علم رجال سے بھی واقف نہ ہو، حالانکہ فن حدیث کا نصف علم رجال کی واقفیت پر مبنی ہے اور اس کی ضرورت واہمیت کسی زمانہ میں بھی کم نہیں ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی، لیکن ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ انحطاط عظیم بھی دیکھ لیا کہ اب بہت سے شیوخ حدیث اور بڑے بڑے مدارس کے بخاری پڑھانے والے بھی علم رجال سے نابلد اور شروح وکتب حدیث کے مطالعہ سے عاری ہونے لگے، اس طرح بقول ایک علامہ حدیث کے ایسے اساتذہ بخاری شریف پڑھائیں گے تو ان کے تلامذہ غیر مقلد ہی بنیں گے الا ماشاء اللہ، یہ بات تو فروعی مسائل سے متعلق تھی، علم اصول وعقائد کی تاریخ یہ ہے کہ صحابہ وتابعین وائمہ اربعہ واصحاب ائمہ کے دور تک زیادہ ضرورت پیش نہ آنے کے باعث بہت کم مسائل کی تحقیق وتنقیح ہو سکی تھی، البتہ بعد کے حضرات نے حسب ضرورت و اہمیت زیادہ توجہ کی چنانچہ امام احمدؒ کے بعد علامہ محدث محمد بن یحییٰ ذہلی م ۲۵۹ھ (تلمیذ امام اعظمؒ بیک واسطہ) نے خلق قرآن کے مسئلہ پر نہایت زور دیا وہ ارباب صحاح کے استاذ تھے اس لئے اپنے تلمیذ امام بخاریؒ کی تلفظ بالقرآن والی مسامحت بھی برداشت نہ کر سکے اور اعلان کر دیا کہ لفظی بالقرآن مخلوق کہنے والا بھی مبتدع ہے اس طرح استاذ محترم کی طرف سے اپنے وقت کے امام حدیث بلکہ امیر المومنین فی الحدیث کو ابتداع کا داغ لگ گیا کیونکہ باب عقائد میں بال کی کھال نکالی جاتی ہے اور کسی کے ساتھ ادنیٰ رعایت بھی نہیں کی جاتی، امام ذہلیؒ کے بعد اکابرین سے امام طحاوی حنفی م ۳۲۱ھ نے عقائد پر مستقل تالیف کی عقیدہ الطحاوی اور کتاب فی النحل واحکامہا ۴۰ جزو۔ پھر ابوالحسن اشعریؒ م ۳۳۰ھ نے اول الابانہ لکھی تھی بعد کو مقالات الاسلامیین، پھر علامہ ابومنصور ماتریدی م ۳۳۳ھ نے تمام مسائل اصول وعقائد پر عمدہ کتابیں لکھیں اور ان کے بعد مندرجہ ذیل حضرات کبار محدثین ومتکلمین محققین امت کی خدمات سامنے آئیں:- علامہ ابوالقاسم لالکائی م ۴۱۸ھ، شیخ ابواسحق اسفرائنی م ۴۱۸ھ، علامہ ماوردی شافعی م ۴۵۰ھ علامہ بیہقی م ۴۵۸ھ (جن کی کتاب الاسماء والصفات تعلیقات کوثری کے ساتھ بھی مصر سے شائع ہوگئی ہے) علامہ ابن عبدالبر م ۴۶۳ھ، علامہ قشیری م ۴۶۵ھ، علامہ ابوالمظفر اسفرائنی م ۴۷۱ھ (جن کی التبصیر فی الدین علامہ کوثریؒ کی تعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی اور نہایت مفید کتاب ہے) علامہ باجی م ۴۷۶ھ (استاذ امام الحرمین شافعی م ۴۷۸ھ، (استاد امام غزالیؒ) شیخ الاسلام ہروی ۴۸۱ھ، امام غزالی ۵۰۵ھ، علامہ کلوذانی م ۵۱۰ھ، علامہ ابن عقیل حنبلی م ۵۱۳ھ، قاضی عیاض م ۵۴۴ھ، علامہ ابوبکر بن العربی م ۵۴۶ھ (صاحب عارضۃ الاحوذی شرح سنن الترمذی، والعواصم والقواصم)، علامہ ابن الجوزی حنبلی م ۵۹۷ھ، علامہ موفق بن قدامہ حنبلی م ۶۲۰ھ، علامہ ابن نقطہ حنبلی م ۶۲۹ھ، علامہ عزالدین بن عبدالسلام م ۶۶۰ھ (جنہوں نے متاخرین حنابلہ کے ابتداع

حف وصوت کے خلاف احقاقِ حق کیا اور تاتاریوں کے خلاف جہاد میں بھی دادِ شجاعت دی) علامہ فضل اللہ تو ربشتی م ۶۶۱ھ، علامہ قرطبی ۶۶۵ھ، علامہ نووی م ۶۷۶ھ، علامہ نسفی ۶۸۶ھ وغیرہ۔

ان سب اکابرِ امت نے جن مسائل اصول وعقائد کے محققانہ فیصلے کر دیئے تھے، حافظ ابن تیمیہؒ م ۷۲۸ھ نے آکران سب کو الٹ پلٹ دیا اور بہت سے اہم معتقدات میں اپنی الگ رائے قائم کرلی اور اپنے تفردات پر اس قدر سختی سے جم گئے کہ کسی کی نہ سنی، ہر تفرد کے ساتھ بڑے بڑے دعوئے کئے جو ثابت نہ ہو سکے، اپنی تائید میں بڑوں کے اقوال پیش کئے تو وہ صحیح نہ نکلے، اپنے نظریات خلاف جمہور کے لئے ضعیف اور شاذ ومنکر احادیث کا سہارا لیا اور دوسروں کی حسن وضعیف حدیثوں کو باطل قرار دیا جس کے لئے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی شہادت کافی ہے کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے ردِ شیعی کے زور میں آکر احادیث جیاد (عمدہ معتبر روایات) کو بھی رد کر دیا۔ لسان المیزان ص ۳۱۹ ج ۶، ساری احادیث زیارۃ وتوسل کو موضوع وباطل کہہ دیا اور آج بھی شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز چانسلر مدینہ جیسے ذمہ دار اکابر حج وزیارت پر کتابچے لکھ کر مفت شائع کرتے ہیں تو ان میں بھی احادیث زیارۃ کو موضوع کہتے ہیں گویا ان حضرات کے دماغ حافظ ابن تیمیہ کے تفردات کی طرف سے ایک انچ بھی ہٹنے کیلئے تیار نہیں ہیں اور اس جمود وتعصب مفرط کے ساتھ مرکزِ اسلام حرمین شریفین کے بڑے بڑے علمی ودینی عہدوں پر فائز ہیں، والی اللہ المشتکی۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے امام الحرمین اور حجۃ الاسلام امام غزالی کی تکفیر کی بلکہ ان کے کفر کو یہود ونصاریٰ کے کفر سے زیادہ سخت بتلایا، تمام علماء مذہب اور سلاطین مصر وشام وغیرہ نے حافظ ابن تیمیہ سے متفقہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ آیات واحادیث صفات باری سے تعرض نہ کریں اور ان کے بارے میں اپنے متفرد نظریات لوگوں میں نہ پھیلائیں تو خود موصوف ہی کا بیان ہے کہ میں نے اس مطالبہ کے جواب میں کہہ دیا کہ قرآن وحدیث میں علم چھپانے پر سخت وعید وارد ہے، اس لئے کسی عالم کو ایسی بات کا حکم نہیں کیا جا سکتا، جس کے ارتکاب سے وہ خدا کی لعنت کا مستحق بنے، دونوں قاصد میرا جواب لے کر چلے گئے اور عرصہ تک نہ آئے پھر آئے تو کوئی کام کی بات لے کر نہ آئے اور صرف میرے بلانے اور حاضری کا مطالبہ کیا تو اس پر میں نے بہت سخت جواب دیا اور بلند آواز میں ان سے کہا:- ''اے شریعت کو بدلنے والو! اے شریعت سے ارتداد کرنے والو! اے زندیقو'' اور اسی قسم کے بہت سے سخت جملے میں نے ان کو کہے، پھر میں کھڑا ہو گیا اور دروازہ کھلوا کر اپنی جگہ لوٹ گیا، ملاحظہ ہو فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۵ ج ۵، مطبوعہ مصر ۱۹۶۶ء۔

بقول حضرت شاہ عبدالعزیزؒ حافظ ابن تیمیہ ہی کے زمانہ میں بڑے بڑے علماء شام ومصر ومغرب نے ان کے تفردات کا رد کیا تھا اور ان کے تفردات علماء اہل سنت کی نظر میں مردود تھے، تو ان کی مخالفت پر اب کیا رد وقدح کا موقع ہے؟ جب حافظ ابن تیمیہ کی نظر میں امام الحرمین و امام غزالی کے عقائد کفریہ تھے اور تمام علماء وقت کے متفقہ مطالبہ کو ٹھکرا کر ان سب کو بھی مرتد وزندیق بتلایا گیا تو کیا ہمارے واسطے اس امر کی کھوج لگانی ضروری نہیں ہو جاتی کہ حافظ ابن تیمیہ اور ان کے مقابل جمہور علماء متقدمین ومتاخرین کے مابین اختلاف اتنا شدید کیسے ہوا؟ اور بنیادی نقاط اختلاف کیا کیا ہیں؟ اور آج جو تفردات حافظ ابن تیمیہ کی طرف دعوت عام بڑے وسیع پیمانے پر دی جا رہی ہے، اس سے جمہور امت کے مسلک پر کیا کچھ اثرات پڑیں گے، ظاہر ہے ان سے غفلت برتنا سخت مضر ہوگا۔ اللّٰہ یرحمنا و ایاھم

راقم الحروف نے طرفین کی کتابوں کا پورا مطالعہ کیا ہے اس لئے حسب ضرورت کچھ لکھنا پڑتا ہے ورنہ ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح تفصیل سے ہم نے یہاں اور اس سے پہلی جلد میں زیارت وتوسل پر لکھا ہے اس طرح الگ سے کتابیں لکھی جائیں اور ان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے تاکہ اس دعوت عامہ کا تدارک وجواب ہو سکے، جو سلفی، تیمی ووہابی حضرات کی طرف سے حافظ ابن تیمیہؒ کے تفردات خلاف جمہور وسلف کی بڑے پیمانہ پر اشاعت سے برپا ہو رہی ہے۔ **واللّٰہ الموفق وھو الھادی الیٰ طریق مستقیم، نسأل اللہ تعالیٰ لنا ولجمیع المسلمین ان یوفقھم لما یحب و یرضیٰ۔**

باب هل يقال مسجد بنی فلان؟

(کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسجد فلاں لوگوں کی ہے؟)

۴۰۶. حدثنا عبداللّٰه بن یوسف قال انا مالک عن نافع عن عبدللّٰه بن عمر ان رسول اللّٰه ﷺ سابق بين الخيل التی اضمرت من الحفيآء و امدها ثنية الوداع وسابق بين الخيل التی لم تضمر من الثنية الیٰ مسجد بنی زريق و ان عبداللّٰه بن عمر كان فيمن سابق بها.

ترجمہ: ہم سے عبداللہ بن یوسف نے بیان کیا کہا کہ ہمیں مالک نے نافع کے واسطہ سے خبر پہنچائی وہ عبداللہ بن عمرؓ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان گھوڑوں کی جنہیں (جہاد کیلئے) تیار کیا گیا مقام حفیاء سے دوڑ کرائی اس دوڑ کی حد ثنیۃ الوداع تھی اور جو گھوڑے ابھی تیار نہیں ہوئے تھے، ان کی دوڑ ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک کرائی، عبداللہ بن عمر نے بھی اس گھوڑ دوڑ میں شرکت کی تھی۔

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ آں حضور ﷺ کے عہد مبارک میں کسی مسجد کی اس طرح نسبت کی جاتی تھی اگرچہ قرآن مجید میں ہے کہ مسجدیں خدا کی ہیں لیکن ان کی نسبت اس میں نماز پڑھنے والوں یا اس کے بنانے والوں کی طرف کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، جس گھوڑ دوڑ کا حدیث میں ذکر ہے اس میں شریک ہونے والے دو گھوڑے تھے جنہیں جہاد کے لئے تیار کیا گیا تھا (اس سے متعلق مفصل احادیث اور ان پر بحث کتاب الجہاد میں آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ)

حافظ نے لکھا کہ جمہور کے نزدیک اس نسبت کا جواز ہی ہے، البتہ ابراہیم نخعی اس کو مکروہ کہتے تھے **لقوله تعالیٰ وان المساجد لله**، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نسبت تمیز کے لئے ہے ملکیت بتلانے کے لئے نہیں۔ (فتح الباری ص ۳۴۸ ج ۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حجاج بھی اپنے زمانہ میں اس نسبت کو ناپسند کرتا تھا اور یہی دلیل دیتا تھا وہ اس امت کا ظالم ترین شخص ہوا ہے، امام احمدؒ سے ایک روایت اس کی تکفیر کی بھی ہے جیسا کہ انہوں نے یزید کی بھی تکفیر کی ہے، ترمذی میں ہے کہ اس نے صحابہ و تابعین میں سے ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد قتل کئے تھے۔ (فیض الباری ص ۳۸ ج ۲)

باب القسمة و تعليق القنو فی المسجد

(مسجد میں (کسی چیز کی) تقسیم اور خوشے کا لٹکانا)

قال ابوعبد الله القنوا لعذق والاثنان قنوان والجماعة ايضاً قنوان مثل صنو و صنوان وقال ابراهيم يعنی ابن طهمان عن عبد العزيز بن صهيب عن انس قال اتی النبی ﷺ بمال من البحرين فقال انثروه فی المسجد و كان اكثر مال اتی به رسول الله ﷺ فخرج رسول الله ﷺ الی الصلوٰة ولم يلتفت اليه فلما قضی الصلوٰة جآء فجلس اليه فما كان يرٰی احداً الا اعطاه اذ جاء ه العباس فقال يا رسول الله اعطنی فانی فاديت نفسی و فاديت عقيلا فقال له رسول الله ﷺ خذ فحثا فی ثوبه ثم ذهب يقله، فلم يستطع فقال يا رسول الله! مر بعضهم يرفعه الی قال لا قال فارفعه انت علی قال لا فنثر منه ثم ذهب يقله، فقال يا رسول الله ! مربعضهم يرفعه علی قال لا قال فارفعه انت علی قال لا فنثر منه ثم احتمله فالقاه علیٰ كاهله ثم انطلق فما زال رسول الله ﷺ يتبعه بصره حتی خفی علينا عجباً من حرصه فما قام رسول الله ﷺ و ثمه منها درهم.

ترجمہ: ابوعبداللہ (امام بخاری) نے کہا کہ قنو کے معنی عذق (خوشۂ کھجور) کے ہیں، دو کے لئے قنوان آتا ہے اور جمع کے لئے بھی یہی لفظ آتا ہے جیسے صنو اور صنوان، ابراہیم بن طہمان عبدالعزیز بن صہیب کے واسطے سے حضرت انس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم علیہ کے یہاں بحرین کا مال آیا، آپ نے فرمایا کہ اسے مسجد میں پھیلا دو یہ ان تمام مالوں سے زیادہ تھا جواب تک رسول اللہ علیہ کی خدمت میں آچکے تھے پھر نبی کریم علیہ نماز کے لئے تشریف لائے اور اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، جب آپ نماز پوری کر چکے تو آکر مال کے قریب تشریف فرما ہوئے آپ اس وقت جسے بھی دیکھتے اسے عطا فرماتے، اتنے میں حضرت عباسؓ تشریف لائے اور فرمایا یا رسول اللہ مجھے بھی عطا کیجئے کیونکہ میں نے اپنا بھی فدیہ دیا تھا اور عقیل کا بھی (یہ دونوں حضرات غزوہ بدر میں مسلمانوں کے قیدی تھے) رسول اللہ علیہ نے فرمایا کہ لیجئے، انہوں نے اپنے کپڑے میں لیا، پھر اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن نہ اٹھا سکے (وزن کی زیادتی کی وجہ سے) انہوں نے کہا یا رسول اللہ کسی کو حکم فرمایئے کہ اٹھانے میں میری مدد کرے، آپ نے فرمایا نہیں، انہوں نے کہا کہ پھر آپ ہی اٹھا دیجئے، آپ نے اس پر بھی انکار کیا، اس لئے حضرت عباسؓ نے اس میں سے تھوڑا سا حصہ گرا دیا اور باقی ماندہ کو اٹھانے کی کوشش کی (لیکن اب بھی نہ اٹھا سکے) پھر فرمایا یا رسول اللہ علیہ کسی کو میری مدد کرنے کا حکم دیجئے، آپ نے انکار کیا تو انہوں کہا کہ پھر آپ ہی اٹھا دیجئے، لیکن آپ نے اس سے بھی انکار کیا، اس لئے اس میں سے تھوڑا سا اور سامان گرا دیا، اب اسے اٹھا سکے اور اپنے کاندھے پر لے لیا، رسول اللہ علیہ کو ان کی حرص پر اتنا تعجب ہوا کہ آپ اس وقت تک ان کی طرف برابر دیکھتے رہے جب تک وہ ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے، رسول اللہ علیہ وہاں سے اس وقت تک نہ اٹھے جب تک ایک درہم بھی باقی رہا۔

تشریح: چونکہ احادیث میں مساجد کے اندر عبادت کے سوا دوسرے امور کی ممانعت آئی ہے، مثلاً ارشاد ہے کہ ان مساجد میں لوگوں کے لئے دوسرے کام مناسب نہیں، (لامع ص ۱۶۰ ج ۱) اور مسلم شریف میں حدیث ہے کہ جو شخص مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کر کے تلاش کرے تو اس سے کہنا چاہئے کہ خدا تیری چیز نہ لوٹائے کیونکہ مساجد اس کام کے لئے نہیں بنائی گئیں، ایک حدیث سنن میں مساجد کے اندر خرید و فروخت کی ممانعت ہے اور اشعار پڑھنے کی بھی، بخاری میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے طائف کے دو شخصوں سے کہا:- اگر تم شہری باشندے ہوتے تو میں تمہاری مرمت کرتا، تم مسجد نبوی میں بلند آواز سے بول رہے ہو، ان کے علاوہ دوسری احادیث کنز العمال میں بہ تفصیل مذکور ہیں، حتیٰ کہ یہ بھی وارد ہے کہ مسجد میں ہنسنے سے قبر میں تاریکی ہوگی اور یہ کہ مسجد میں ہر کلام لغو ہے، بجز قرآن مجید وذکر اللہ اور کسی خیر کے لین دین کے۔ (حاشیہ لامع ص ۱۶۰ ج ۱)

حافظ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے یہاں ترجمۃ الباب کے تحت کوئی حدیث ذکر نہیں کی، شاید اس لئے کہ اس کی احادیث ان کی شرط کے مطابق نہ ہونگی، لہٰذا نسائی وغیرہ کی حدیث کی طرف اشارہ کر گئے، جس میں ہے کہ حضور علیہ السلام کی اجازت سے لوگ صدقہ کے خرمائی خوشے مسجد نبوی میں لا کر لٹکا دیا کرتے تھے کہ جس طرح وہ مستحقین ومحتاجین کے لئے ہوتے تھے، یہ بحرین سے آیا ہوا مال بھی ضرورت مند لوگوں کے لئے تھا۔ (فتح الباری ص ۳۴۸ ج ۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- (۱) امام بخاریؒ نے یہاں سے ان افعال کا ذکر شروع کیا جو جنس نماز واذکار سے خارج ہیں، اور پھر بھی مسجد میں کئے گئے ہیں اور اس سے وہ اپنے وسیع مسلک کی تائید کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ اس باب میں تقسیم مال ثابت کی، جبکہ ہمارے فقہاء مسجد کے اندر کلام وطعام وغیرہ کو مکروہ فرماتے ہیں اور تقسیم اموال وغیرہ کو بھی، کیونکہ مساجد ان کاموں کے لئے موزوں نہیں ہوتیں، امام بخاری دور تک ایسی احادیث کا ذکر کریں گے، حالانکہ وہ سب خاص خاص واقعات تھے، جن کا انکار فقہا کو بھی نہیں ہے اور وہ ان امور کو صرف بطور عادت اختیار کرنے کو مکروہ قرار دیتے ہیں، اگر ایک دو بار ایسا ہو جائے تو وہ ان کے نزدیک بھی جائز ہے، لہٰذا امام بخاری اگر ان جزوی واقعات سے مسجد کے احکام میں توسع پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا، کیونکہ جو دوسرے افعال احیاناً ثابت ہوئے

ہیں، ظاہر ہے کہ مساجد ان کے لئے نہیں بنائی گئیں، پھر جبکہ نفل نمازوں کے لئے بھی مستحب یہ ہے کہ وہ گھروں میں پڑھی جائیں اور مساجد میں صرف فرائض ادا ہوں، تو دوسرے اعمال وافعال کے لئے مستقل طور سے گنجائش نکالنے کی سعی کا کیا موقع ہے؟! قضا حنفیہ کے نزدیک مسجد میں بھی جائز ہے، کیونکہ وہ عبادت کے حکم میں ہے، شافعیہ کے یہاں ممنوع ہے، تدریس میں بھی اختلاف ہے۔ حنفیہ اس کو مسجد میں بلا اجرت جائز اور اجرت کے ساتھ ناجائز قرار دیتے ہیں۔ (کیونکہ وہ عبادت کے حکم میں نہ رہی)

(۲) حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ مجھے اس امر میں بھی تردد ہے کہ تقسیم اموال بحرین وغیرہ معاملات مسجد کے اندر پیش آئے تھے، کیونکہ علامہ سمہودیؒ نے ذکر کیا ہے کہ مسجد نبوی کا قبلہ پہلے بیت المقدس کی طرف تھا پھر جب تحویل قبلہ ہوئی تو دوسری مقابل جانب میں ہو گیا اور وہ حصہ مسقف ہو گیا جبکہ پہلا حصہ صفہ کہلایا جانے لگا۔ کتب فقہ میں یہ بھی ہے کہ مسجد کے کسی حصہ کو بوقت ضرورت اس سے خارج بھی کر سکتے ہیں، لہٰذا یہ سب توسعات جو امام بخاریؒ نے ذکر کی ہیں، پہلے حصہ میں ہوئی ہوں گی جو بعد کو مسجد کے حکم میں داخل نہ رہا تھا، اگر چہ بعد کو بھی اس حصہ کو مسجد کہا جاتا رہا۔

راویوں نے بھی توسع کر کے اس کو مسجد ہی کہا اور عرفاً اس کی گنجائش بھی تھی، علامہ ذہبی نے بھی لکھا ہے کہ صفہ اجزاء مسجد میں سے تھا پھر اس سے خارج کر دیا گیا تھا، اس تحقیق پر بھی امام بخاریؒ کا مقصد پورا نہیں ہوتا اور ان کے لئے یہ اجمالی جواب ہر جگہ جاری ہوگا۔

(۳) اس کے سوا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بحرین کا مال (جو تقریباً ایک لاکھ درہم تھا) مسجد میں اس لئے بھی جمع کرنا پڑا تھا کہ اس وقت تک بیت المال نہیں بنا تھا اور اس کو کسی صحابی کے یہاں رکھنا بھی بدگمانیوں کا سبب بن سکتا تھا اور خود حضور علیہ السلام بھی اس متاع دنیوی کو اپنے گھر میں رکھنا پسند نہ کرتے تھے۔

ان سب قرائن وشواہد کے موجود ہوتے ہوئے اگر حضور اکرم ﷺ نے وہ سب مال مسجد نبوی میں ڈھیر کرا کر فوراً ہی تقسیم بھی کرا دیا تو کیا یہ بات موزوں ومناسب قرار دی جا سکتی ہے کہ اس کو قاعدہ کلیہ بنا لیا جائے؟ نہیں بلکہ اس کو بطور ایک واقعہ جزئیہ خاصہ کے سمجھنا زیادہ بہتر ہے، اور ہر انصاف پسند یہی فیصلہ کرے گا۔

فائدہ مہمہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ وضع تراجم ابواب کے بارے میں سباق غایات ہیں، یعنی ان کی یہ فضیلت ومزیت بے مثال ہے، مگر اس میں جہاں امت محمدیہ کے لئے غیر معمولی منافع وفوائد ہیں، وہاں ایک بڑی مضرت ونقصان بھی ہے، کیونکہ ایک حدیث کسی خاص حادثہ کے موقع پر وارد ہوتی ہے اور قرآئن بتلاتے ہیں کہ اس وقت آپ نے کیا حکم اور کس وجہ سے دیا تھا، مگر امام بخاری کے ترجمۃ الباب اور توسع کی وجہ سے دوسرا شخص مغالطہ میں پڑ جاتا ہے اور اس حکم نبوی کو حکم مطرد وعام سمجھنے لگتا ہے۔

حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا:- حضرت عباسؓ نے زیادہ مال کی ضرورت فدیہ دینا بتلائی کیونکہ ایسے معاملات کے لئے کثیر رقوم کی ضرورت ہوتی ہے، یہ نہیں کہ وہ اپنا افلاس وفقر بتلانا چاہتے تھے، جو بعض شارحین نے غلط طور سے سمجھا ہے کیونکہ وہ بعد تک اچھے مالدار صحابہ میں سے تھے، حضور علیہ السلام غریب مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ان سے ان کے مال کی دو دو سال کی زکوٰۃ وصول کر لیا کرتے تھے وغیرہ۔ (لامع ص ۱۶۱ ج ۱)

حدیث الباب کے آخری جملوں پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام حضرت عباسؓ کا بہت زیادہ لحاظ واحترام کرتے تھے ایک بار حضرت عمرؓ اور ان کا جھگڑا ہوا اور حضور کے پاس آئے تو آپ نے فاروق اعظم کو فرمایا کیا تم نہیں جانتے "عم الرجل صنو ابیه" (چچا کا درجہ باپ کے برابر ہے) یہ بھی ثابت ہے کہ کچھ چھوٹا موٹا کام بھی آپ حضرت عباسؓ کے یہاں جا کر کر دیا کرتے تھے۔ **والله اعلم و علمه اتم.**

سخن ہائے گفتنی

راقم الحروف کو یہاں بلا تمہید کچھ ضروری معروضات بطور حاصل مطالعہ وذاتی تاثرات پیش کرنی ہیں، واللہ الموفق والمعین :- امام

بخاریؒ نے جن حالات و ماحول میں صحیح بخاری شریف تالیف کی تھی اور خود امام بخاری کے ضروری حالات و سوانح۔ ان کی تمام تالیفات کا تعارف وغیرہ مقدمہ انوارالباری جلد دوم میں مذکور ہیں اور ان کا اپنے اذہان میں حاضر رکھنا تمام ناظرین انوارالباری کے لئے نہایت ضروری ہے، ورنہ وہ اس تالیف سے پوری طرح استفادہ نہ کرسکیں گے، یہاں اتنی بات ضرور تازہ کرلیں کہ امام بخاریؒ نے شیخ اسحٰق بن راہویہ وغیرہ اپنے خصوصی اساتذہ واصحاب کے مشورہ سے صحیح بخاری کی تالیف کا تہیہ کیا، جس میں صرف صحیح مجرد احادیث جمع کیں، گویا سابق طرز محدثین کے خلاف طریقہ اپنایا جو احادیث کے ساتھ آثار صحابہ و تابعین بھی جمع کرتے تھے، مثلاً محدث ابن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ) و محدث عبدالرزاق بن ہمام م ۲۱۱ھ) ان دونوں نے اپنے اپنے مصنف میں احادیث کے ساتھ آثار صحابہ و تابعین بھی جمع کئے تھے جن سے سنن نبویہ اور حضور علیہ السلام کے اقوال و افعال کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، ان دونوں کے مصنف نے فقہائے محدثین اور ائمہ مجتہدین کے استنباطی مسائل اور مدارک اجتہاد تک رسائی حاصل کرلینا نہایت آسان کردیا تھا اور اب کہ مصنف عبدالرزاق ۱۴ جلدوں میں ''مجلس علمی'' ڈابھیل و کراچی سے شائع ہوگئی ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ کی بھی چار جلدیں حیدرآباد سے شائع ہوگئی ہیں، ان سے ہمارے اس دعوے کی تصدیق ہوسکتی ہے، مگر جیسا کہ اسحٰق بن راہویہ'' کہا کرتے تھے کہ امام بخاریؒ نے ''التاریخ الکبیر'' لکھ کر گویا سحر کردیا ہے، مجھے بھی یہ کہنے دیجئے کہ امام بخاریؒ نے ''صحیح بخاری شریف'' تالیف کر کے بھی سحر کا ہی کام کیا تھا جس سے ان سے قبل کے تقریباً ایک سوا کابر محدثین کی حدیثی تالیفات اور پھر بعد کی کتب صحاح بھی سحر زدہ سی ہوکر رہ گئیں، حالانکہ خود امام بخاریؒ نے فرمایا تھا کہ میں نے حدیث کی ایک مختصر کتاب لکھی ہے جس میں صحیح روایات کا التزام کیا ہے، اور چھ لاکھ احادیث میں سے (ان ۲۵۱۳ غیر مکرر کا) انتخاب کیا ہے اور بہ کثرت احادیث صحاح کو طوالت کے خوف سے ترک کردیا ہے، اور یہ منتخب ذکر کردہ احادیث میرے لئے اللہ تعالیٰ اور میرے درمیان حجت کا کام دیں گی (مقدمہ صحیح بخاری ص ۴) گویا بقول خود امام بخاری کا ارادہ صرف اپنے فقہی مسلک کے مطابق احادیث یکجا کر کے پیش کرنا تھا تا کہ حق تعالیٰ کی جناب میں اپنے اختیار کردہ مسلک کے لئے حجت پیش کرسکیں، یہ مقصد نہ تھا کہ وہ دوسرے تمام فقہی مسالک کو حدیثی نقطہ نظر سے باطل قرار دیں، کیونکہ وہ یقیناً جانتے تھے کہ دوسرے مسالک کے لئے بھی صحیح احادیث اور آثار صحابہ و تابعین موجود ہیں، اسی لئے برملا اعتراف فرماتے تھے کہ میں نے بہ کثرت صحیح احادیث بوجہ طوالت ترک کردی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ایک طبقہ اسی وقت سے برابر اب تک ایسا بھی موجود رہا جو صحیح بخاری کی آڑ لے کر دوسرے فقہی مذاہب کی تغلیط کرتا رہا اور ایک جماعت اہل ظاہر محدثین کی بھی ائمہ مجتہدین کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتی رہی۔

امام بخاریؒ کے مذکور مقصد کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ وہ صرف اپنے فقہی مسلک کے موافق احادیث پیش کرتے ہیں اور دوسرے مذاہب ائمہ کی مستدل احادیث پیش نہیں کرتے، برخلاف دوسرے محدثین صحاح امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداؤد و امام نسائی وغیرہ کے کہ وہ سب ہی احادیث ماثورہ صحیحہ ذکر کردیتے ہیں خواہ وہ کسی بھی فقہی مذہب کی مؤید ہوں اور ساتھ ہی آثار صحابہ و تابعین بھی لاتے ہیں اگرچہ محدث ابن ابی شیبہ و محدث عبدالرزاقؒ کی طرح استقصاء نہیں کرتے، یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ امام بخاریؒ کا فقہی مسلک کسی دور میں بھی جاری نہ ہوسکا نہ اس کو تلقی بالقبول حاصل ہوسکی، حتیٰ کہ خود ان کے تلمیذ رشید امام ترمذی بھی جہاں دوسرے فقہی مذاہب بہ تفصیل ذکر کرتے ہیں، امام بخاری کا مسلک ذکر نہیں کرتے اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ امام اوزاعی وغیرہ ایسے جلیل القدر فقہاء کے فقہی مسلک بھی صرف تھوڑی مدت تک چل کر ختم ہوگئے تھے، جو مسلک شروع سے اب تک قائم ہیں، وہ صرف ائمہ اربعہ کے ہیں، ان میں سے امام اعظمؒ کے پیرو سب سے زیادہ (تقریباً دو تہائی افراد امت محمدیہ) رہے ہیں، پھر یہاں یہ بھی محفوظ کرلیجئے کہ چار ائمہ و مذاہب فقہیہ کو علمائے امت نے ''کاسرۃ واحدۃ'' قرار دیا ہے، یعنی سب ایک خاندان کے فرد تھے، جنہوں نے اپنے اپنے علم و فہم اور بصیرت و اجتہاد کے موافق قرآن مجید، احادیث نبویہ اور آثار و تعامل صحابہ و تابعین کی روشنی میں مسائل غیر منصوصہ کے احکام مستنبط کئے ہیں، رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ، ان کے علاوہ

جو فقہی مسالک اہل ظاہر وسلفیوں کے وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہے ان کی بنیادیں نہایت کمزور ہیں۔

مذاہب اربعہ کے تین چوتھائی مسائل میں کوئی اختلاف نہیں ہے، باقی ایک ربع میں بھی جواز یا عدم جواز یا حلت وحرمت کا اختلاف بہت تھوڑا ہے، زیادہ تر مسنون، غیر مسنون اور افضل غیر افضل کا ہے، جو زیادہ اہم نہیں ہے اور اس معمولی اختلاف کی وجہ سے باہم نزاعات کا سلسلہ ختم ہو جانا چاہئے، ہر مذہب والے کو دوسرے کا احترام کرنا چاہئے اور نہایت فراخدلی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ شیر وشکر کی طرح رہنا چاہئے، خصوصاً اس لئے بھی کہ کچھ مدت سے اس دور کے اہل ظاہر وسلفی حضرات نے مقلدین مذاہب خصوصاً مذہب حنفی کے خلاف سخت ناموزوں رویہ اور غلط پروپیگنڈے کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔

پھر یہ امر بھی لائق ذکر ہے کہ مذاہب اربعہ میں باہم کچھ فروعی مسائل میں اختلاف تو ہے بھی، مگر اصول وعقائد میں سب متفق ایک زبان ہیں جبکہ اہل حدیث وغیر مقلدین کے اصول وعقائد بھی ان سے مختلف ہیں، مثلاً ائمہ اربعہ کے یہاں تقلید جائز اور ان کے یہاں وہ شرک ہے، توسل نبوی آئمہ مجتہدین اور جمہور سلف وخلف کے نزدیک جائز ہے مگر اہل حدیث وغیر مقلدین کے یہاں وہ شرک وحرام ہے، یہ لوگ حافظ ابن تیمیہ وابن قیم وغیرہ کی تقلید میں خدا کے لئے جہت ومکان اور استقرار علی العرش وغیرہ تجویز کرتے ہیں، جبکہ جمہور سلف وخلف و ائمہ اربعہ کے نزدیک ایسے عقائد باطل اور حق تعالیٰ کی تنزیہ کے خلاف ہیں، یہ لوگ منکر وشاذ احادیث سے عقائد کا اثبات کرتے ہیں جبکہ آئمہ اربعہ کے اصول سے منکر وشاذ روایات تو کجا، ضعیف احادیث سے بھی عقائد واصول کا اثبات درست نہیں، بلکہ ضعیف احادیث سے صرف فضائل اعمال ثابت ہو سکتے ہیں، شریعت کے احکام حلال وحرام تک بھی ان سے ثابت نہیں کئے جا سکتے، پھر یہ حضرات یہاں تو ہر تعظیم غیر اللہ کو بھی شرک قرار دیتے ہیں اور سفر زیارت نبویہ ودیگر زیارت قبور کو جائز کہنے والوں کو قبوری (قبر پرست) بتلاتے ہیں، جبکہ صرف اس فعل زیارت میں کوئی بھی شائبہ شرک یا عقیدہ کی خرابی نہیں مگر خود ایک ضعیف حدیث کی وجہ سے "**عسىٰ ان يبعثك ربك مقاما محمودا**" (آیت اسراء) کی تفسیر میں مقام محمود سے مراد یہ بتلاتے ہیں کہ حق تعالیٰ روز قیامت میں حضور علیہ السلام کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا اور عرش الٰہی میں تھوڑی سی جگہ حضور کو بٹھانے کے لائق خالی رکھی گئی ہے، کیا قیامت کی توحید یہاں سے مختلف ہوگی یا خدا کی تنزیہ جسم ومکان وغیرہ سے وہاں ختم ہو جائے گی، علامہ ابن تیمیہ کے تلمیذ خصوصی حافظ ابن کثیرؒ نے مقام محمود کی تفسیر میں بہت سی روایات ذکر کی ہیں مگر اس روایت مجاہد کا کوئی ذکر نہیں کیا، جبکہ ان کے علم میں یہ بات ضرور ہوگی کہ اس کی تفسیر میں ابن تیمیہ وابن قیم اس روایت کو قبول کر چکے ہیں اور اس پر علماء نے نکیر بھی کی ہے، البتہ علامہ آلوسی نے کچھ کوشش اس امر کی کردی ہے کہ اس روایت کو بھی کوئی مقام ضرور مل جائے لیکن حیرت ہے کہ وہ اس ضمن میں حدیث طواف باری للارض کو بھی نقل کر گئے (جس کو علامہ ابن قیم نے بھی زاد المعاد میں ذکر کیا ہے اور توثیق کی سعی کی ہے) جبکہ علماء محدثین نے اس حدیث کو منکر وشاذ قرار دیا ہے، اور ابن قیم پر سخت نکیر کی ہے، ایسی احادیث ضعیفہ منکرہ وشاذہ کو ضمناً بھی ذکر کرنا اس امر کی بڑی دلیل بن سکتی ہے کہ یا تو جیسا کہا گیا ہے کہ تفسیر روح المعانی میں حذف والحاق کرا دیا گیا ہے یا صاحب روح المعانی فن حدیث ورجال میں کامل نہ تھے۔ **واللہ تعالیٰ اعلم بحال عبادہ ولا نحب ان نقول الا ما یرضی بہ ربنا تبارک وتعالیٰ.**

(مزید تفصیل کے لئے اس مقام پر روح المعانی کا مطالعہ ضروری ہے ص ۱۴۱ ج ۱۵ تا ۱۴۳ ج ۱۵) ہمارا خیال یہ بھی ہے کہ علامہ ابن کثیر نے باب عقائد میں اپنے استاذ علامہ ابن تیمیہ کا زیادہ ساتھ نہیں دیا اور پوری طرح ہر باب میں ہم نوائی صرف علامہ ابن قیم ہی نے کی ہے۔ واللہ اعلم۔

عجیب بات ہے کہ یہ حضرات "حوادث لا اول لہا" کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں، یعنی ایسی احادیث ومخلوق بھی موجود مانتے ہیں جس کی کوئی ابتدا نہیں اور اس کو خدا کے ساتھ ہمیشہ سے مانتے ہیں اور وہ حدیث بخاری سے استدلال کرتے ہیں، کتاب التوحید میں امام بخاری نے عمران سے یہ روایت کی "**کان اللہ ولم یکن شیء قبلہ وکان عرشہ علی الماء ثم خلق السمٰوت والارض**" الخ جبکہ بدء الخلق میں

امام بخاری نے عمران ہی سے کان اللہ ولم یکن شیء وغیرہ و کان عرشہ علی الماء بھی روایت کی ہے۔(ان کا استدلال اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قبل کوئی نہ تھا لہٰذا اس کے ساتھ ہوسکتا ہے) کتاب التوحید میں حافظؒ نے لکھا:- پہلے امام بخاری نے بدء الخلق میں یہ روایت بہ لفظ ولمن یکن شیء غیرہ روایت کی ہے اور روایت ابی معاویہ میں کان اللہ قبل کل شیء وارد ہے جو بمعنی کان اللہ و لا شیء غیرہ ہے اور وہ زیادہ صریح ہے ان کے رد میں جو روایت الباب سے ''حوادث لا اول لہا'' کے قائل و مثبت ہیں، اور یہ ان شنیع و قبیح مسائل میں سے ہے جو ابن تیمیہ کی طرف منسوب ہیں، میں نے ان کے اس کلام کا مطالعہ کیا ہے جو اس پر انہوں نے کیا ہے اور اس باب کی روایت کو دوسری روایات پر ترجیح دی ہے، حالانکہ جمع بین الروایتین کے قاعدہ سے اس روایت کو بدء الخلق والی روایت پر محمول کرنا چاہئے تھا، نہ کہ برعکس جو انہوں نے کیا اور یوں بھی جمع کی صورت ترجیح پر بالا تفاق مقدم ہوتی ہے۔

آخر میں حافظ نے لکھا کہ ولم یکن شیء غیرہ سے حدوث عالم پر استدلال کیا گیا ہے، کیونکہ اس سے تو ہم معیت کی نفی کی گئی ہے، لہٰذا ہر شی سوائے خدا کے عالم وجود میں آئی ہے بعد اس کے کہ وہ موجود نہ تھی۔(فتح الباری ص۳۱۹ ج ۱۳)

اس سے قبل حافظ نے قولہ و کان عرشہ علی الماء وھو رب العرش العظیم پر لکھا کہ جس نے کان اللہ ولم یکن شیء قبلہ و کان عرشہ علی الماء سے یہ سمجھا کہ عرش ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھا، اس کا مذہب باطل ہے اور ایسے ہی فلاسفہ کا قول بھی غلط تھا جو عرش کو خالق وصانع کہتے تھے، پھر لکھا کہ یہ بھی فرقہ جسمیہ کا قول باطل ہے کہ استواء کے معنی استقرار علی العرش کے ہیں، کیونکہ استقرار صفت اجسام کی ہے اور اس سے حلول وتناہی خدا کے لئے لازم آتی ہے جو اس کی ذات اقدس کے لئے محال ہے، البتہ استواء بمعنی علو صحیح ہے اور وہی مذہب حق اور قول اہل سنت کا ہے، الخ(فتح الباری ص۳۱۴)

واضح ہو کہ علامہ ابن تیمیہ اور ان کے متبعین عرش کو قدیم بالنوع کہتے ہیں اور عرش پر حق تعالیٰ کا تمکن واستقرار بھی مانتے ہیں جو عقائد جمہور سلف وخلف کے خلاف ہے۔

حافظ نے لکھا کہ ملائکہ کے صبح وشام نزول وعروج وسماوی اور حق تعالیٰ کے سوال عن العباد والی احادیث کے ظواہر کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ حق تعالیٰ جہت علو میں ہے، حالانکہ صحیح مراد علو مرتبت ہے کیونکہ جہت علو دوسری جہات سے اشرف وافضل ہے اور وہی حق تعالیٰ کے شایان شان ہے(فتح الباری ص۳۲۱ ج ۱۳ و ۳۲۴ ج ۱۳)

حافظ نے بدء الخلق والی روایت بخاری کان اللہ ولم یکن شیء غیرہ پر لکھا کہ روایت غیر بخاری میں ولم یکن شی معہ مروی ہے اور قصہ ایک ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ راوی نے روایت بالمعنی کی ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کے سوا نہ پانی تھا، نہ عرش اور نہ دوسری اشیاء کیونکہ یہ سب غیر اللہ ہیں اور و کان عرشہ علی الماء کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے پانی کو پیدا کیا پھر عرش کو پانی پر پیدا کیا۔

حفاظ نے تنبیہ کے عنوان سے یہ بھی لکھا کہ علامہ ابن تیمیہ نے روایت ''کان اللہ ولا شی معہ وھو الأن علی ما علیہ کان'' کے بارے میں لکھا کہ یہ کسی حدیث کی کتاب میں نہیں ہے، تو ان کا یہ ریمارک صرف دوسرے جملے کیلئے صحیح ہے، کیونکہ لفظ و لا شی معہ اور بخاری کی روایت کا لفظ و لا شی غیرہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، پھر اس کی نفی کیسے ہوسکتی ہے؟!

پھر حافظ نے و کان عرشہ علی الماء پر لکھا کہ دوسری احادیث صحیحہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ عرش سے پہلے پانی پیدا کیا گیا اور یہ بھی وارد ہے کہ پانی سے قبل کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی،(فتح الباری ص۱۸۱ ج ۶) گویا عرش کا قدیم اور ہمیشہ سے خدا کے ساتھ ہونا یوں بھی باطل ہے۔ واللہ اعلم۔

ہمارے حضرت شاہ ولی اللہؒ بھی علامہ ابن تیمیہ سے بہت زیادہ متاثر ہوگئے تھے اور غالباً اسی سبب سے ان کا رجحان بھی قدم عالم اور حوادث لا اول لہا کی طرف ہوگیا تھا۔(ملاحظہ ہو فیض الباری ص۱ ج ۴)

شاہ ولی اللہ اور شیخ ابراہیم کردی

بظاہر صورت ایسی ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب موصوف جب ۱۱۴۳ھ میں ہندوستان سے حجاز تشریف لے گئے تو وہاں مشائخ حرمین سے استفادہ فرمایا، ان مشائخ میں شیخ ابراہیم کردی بھی تھے جو ایک وسیع المشرب سلفی عقیدہ کے عالم تھے اور علامہ ابن تیمیہ کے زبردست حامی اور ہم خیال تھے، چنانچہ ابن آلوسی بغدادی نے بھی جلاء العینین ص ۲۶ میں ان کے متعلق لکھا کہ وہ "سلفی العقیدہ اور ابن تیمیہ کی طرف سے دفاع کرنے والے تھے"

علامہ ابن تیمیہ پر نقد

شاہ صاحب بھی ان کی صحبت میں رہ کر علامہ ابن تیمیہ کے گرویدہ ہو گئے تھے اور تفہیمات وغیرہ میں ان کی طرف سے دفاع بھی کیا ہے، بلکہ جوش عقیدت میں آ کر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "جن لوگوں نے ان پر اعتراض کیا ہے ان کو ان کے علم کا دسواں حصہ بھی نہیں ملا ہے" حالانکہ ان کا رد کرنے والے خود ان کے دور کے بھی اکابر علماء امت کی بہت بڑی تعداد تھی اور اس وقت تک ان پر تنقید کرنے والے علماء کبار کی تعداد سو۱۰۰ کے قریب پہنچ گئی ہے جو میرے پاس محفوظ ہے، پھر بقول حضرت علامہ کشمیریؒ کے شیخ تقی الدین سبکیؒ تو ان سے ہر علم میں برتر و افضل تھے اور یہاں ہم ابھی حافظ الدنیا ابن حجر کا نقد بھی فتح الباری سے نقل کر چکے ہیں اور حافظ نے فتح الباری میں متعدد جگہ ان کا رد کیا ہے اور اپنی دوسری تالیفات میں بھی سخت رد کرتے ہیں تو کیا کوئی بھی بالبصیرت ومتیقظ یہ کہہ سکتا ہے کہ ابن تیمیہ حافظ الدنیا سے بھی بڑے عالم تھے، درحقیقت اصل قیمت تبحر و وسعت علمی سے زیادہ ایک عالم کے صواب و ناصواب فیصلوں سے معلوم ہوتی ہے اور جس عالم یا علامہ کے تفردات اور جمہور امت سے ہٹ کر الگ فیصلے زیادہ ہوں اس کو ہم زیادہ تقدم دے کر شریعت حقہ کی حمایت ونصرت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

علامہ ابن تیمیہ اور شاہ عبدالعزیزؒ

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت شاہ عبدالعزیز کے سامنے علامہ ابن تیمیہ کا معاملہ پیش کیا گیا اور رائے معلوم کی گئی تو آپ نے صاف طور سے کہہ دیا کہ میں تو ان کی منہاج السنہ کا مطالعہ کر کے بہت ہی متوحش ہو گیا ہوں اور میں نے ان کی وہ کتابیں بھی مطالعہ کیں جو حضرت والد صاحبؒ کے مطالعہ میں نہیں آئی تھیں اس لئے میری ان سے خوش عقیدگی قائم نہ رہ سکی، پھر قریبی دور کے اکابر دیوبند میں سے حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ اور حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ نے بھی علامہ موصوف کو مطبوعہ ومخطوطہ تالیفات کا مطالعہ کر کے جو کچھ نقد ان پر کیا ہے، وہ بھی ہم نے پہلے لکھ دیا ہے اور آئندہ بھی حسب موقع مسائل کے ذیل میں لکھتے رہیں گے، ان شاء اللہ۔ علامہ کوثری، علامہ سبکی اور علامہ حصنیؒ وغیرہ کی تالیفات بھی اب شائع شدہ ہیں پھر بھی اگر کوئی آنکھیں بند کر کے صرف تعریفوں کے پل باندھتا رہے تو اس کو نہ کوئی روک سکتا ہے نہ اس کی ضرورت، اس علمی وضروری نقد کے ساتھ علامہ کے فضل وتبحر علمی اور خدمات جلیلہ عالیہ سے منکر ہم بھی نہیں ہیں، کاش! ان کے بارے میں مختلف الخیال جید علماء ایک جگہ بیٹھ کر کوئی معتدل صحیح فیصلہ جلد کر لیتے!! تاکہ کم علم لوگ مغالطہ میں نہ پڑتے، واللہ الموفق۔

شاہ ولی اللہ اور علامہ ابن تیمیہؒ

مدت ہوئی "الفرقان" کے شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۴۷ میں "شاہ صاحب کا ایک علمی مأخذ" کے عنوان سے مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، اس میں لکھا تھا کہ "شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مصنفات میں جا بجا علامہ ابن تیمیہ کے خیالات ملتے ہیں اور بعض جگہ تو پوری کی پوری عبارت نقل فرما دی ہیں لیکن نام نہیں لیا ہے، اس کی وجہ غالباً اہل زمانہ کا تعصب ہے، مثلاً حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۶۴ مطبوعہ بریلی کی عبارت **وقد كان فى الصحابة و من بعدهم من يقرأ البسملة و منهم من لا يقرأه و منهم من يجهر بها و منهم**

من لا یجر بھا، تا فقال کیف لا اصلی خلف الامام مالک و سعید بن المسیب ،بعینہ یہی عبارت فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۳۸۰ ج ۲ میں پائی جاتی ہے، وغیرہ۔ان تصریحات کے بعد اگر ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ شاہ صاحب کے علمی انقلاب میں علامہ ابن تیمیہ کے خیالات کو ضرور دخل ہے تو شاید بے جا نہ ہو''۔

بہت ممکن ہے حضرت شاہ صاحبؒ کے خیالات ورجحانات پر شیخ کردی کا اثر سلفیت کا بھی پڑا ہو اور اسی لئے ان کا مزاج تقلید کے خلاف بھی بن چکا تھا، جس کو وہ خود بتلاتے ہیں، فیوض الحرمین ص ۶۴، ۶۵ میں ہے کہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے تین امور کا استفادہ کیا جو میرے رجحان ومزاج کے خلاف تھیں، ان میں سے دوسری یہ ہے کہ آپ نے مجھے مذاہب اربعہ کا پابند رہنے کے لئے وصیت فرمائی کہ میں ان سے باہر نہ ہوں، اسی فیوض الحرمین کے ص ۴۸ میں یہ بھی ہے کہ ''حضور اکرم ﷺ نے مجھے سمجھایا کہ مذہب حنفی کے اندر ایسا صاف ستھرا راستہ موجود ہے جو دوسرے سب راستوں سے زیادہ سنت نبویہ کے ساتھ موافق ومطابق ہے، جس کی تدوین وتنقیح امام بخاری وغیرہ محدثین کے زمانہ میں ہوگئی ہے''۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سنن نبویہ کی تدوین وتنقیح حضور ﷺ کی نظر مبارک میں وہ پسندیدہ ہے جو نہ صرف امام بخاری بلکہ امام ترمذی وغیرہ سب محدثین کی جمع کردہ سنن کی روشنی میں حاصل ہو اور غالباً ہمارے علامہ کشمیریؒ اسی لئے فرمایا کرتے تھے کہ کبھی ایک دو متن حدیث پر فیصلہ نہ کرنا چاہئے، بلکہ ہر حدیث کے سارے طرق ومتون کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے، ہمارے سلفی واہل حدیث حضرات کے یہاں یہی کمی ہے کہ وہ اپنے خیال کے مطابق امام بخاریؒ کی طرح صرف ایک دو متن کے اوپر فیصلہ کر لیتے ہیں اور جھنڈا اٹھا کر دوسروں کو مطعون کرنے لگتے ہیں، اگر وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے نقل کردہ حضور اکرم ﷺ کے ارشاد مذکور پر عمل کریں تو بہت سے نزاعات واختلافات یکدم ختم ہوسکتے ہیں ابھی اوپر گذرا ہے کہ علامہ ابن تیمیہ نے اپنے رجحان کے مطابق بخاری کی کتاب التوحید والے متن حدیث کو لے لیا اور بدء الخلق والے متن کو نظر انداز کر دیا اور نہ دوسرے محدثین کے روایت کردہ متون پر دھیان دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جمہور امت کے خلاف ایک الگ رائے قائم کر لی، جس پر حافظ الدنیا ابن حجرؒ نے بھی ان پر سخت نقد کیا اور بات بھی کوئی معمولی افضل غیر افضل یا جائز وناجائز وغیرہ احکام کی نہ تھی بلکہ عقیدہ سے متعلق تھی، جس کے ثبوت کے لئے نص قطعی (قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع صحابہ وغیرہ) کی ضرورت تھی یعنی ''حوادث لا اول لہا'' کا عقیدہ کہ حق تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی حادث ومخلوق قدیم ہوسکتی ہے یا ہے جبکہ حدوث عالم کا عقیدہ سب جانتے ہیں کہ امت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے، بیشک علامہ ابن تیمیہ بڑے ہی جری وبہادر تھے کہ بقول حافظ ابن حجر وعلامہ ذہبی وغیرہ ایسے ایسے بڑے فیصلے کر گئے، جن کے ادنیٰ ترین تصور سے بھی ساری امت مرحومہ کے اکابر علماء امت لرز جاتے تھے، اور کسی نے بھی آج تک ایسے جراءت مندانہ فیصلے نہیں کئے تھے، اللہ رحم کرے، ہمیں اس سلسلہ میں کافی لکھنا پڑا اور بہت کچھ باقی ہے۔ وما ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم.

سحر کے اثرات

''سحر'' کے کم سے کم اثرات یہ ہوتے ہیں کہ وہ کچھ وقفہ کے لئے بعض امور سے غفلت طاری کر دیتا ہے جیسا کہ حضور اکرم ﷺ پر بھی ایسا ہی معمولی اثر ہوا تھا، ہمارے بعض اکابر امت کے اثرات بھی شاید سحر سے ہی کچھ ملتے جلتے ہوتے ہیں، جیسا کہ اسحٰق بن راہویہ نے امام بخاری کی التاریخ الکبیر کے بارے میں ''سحر'' کا ہی لفظ استعمال کیا تھا اور ہم اس سے یہی سمجھ سکے ہیں کہ جن شخصیتوں کو انہوں نے نمایاں کر دیا وہ سامنے آگئیں اور جن کو چاہا زاویہ خمول میں ڈال دیا تاکہ وہ پردے کے پیچھے چلی جائیں مثلاً امام اعظمؒ کے بارے میں لکھ دیا وہ ''مرجئی تھے اور لوگوں نے ان سے ان کی رائے سے اور ان کی حدیث روایت کرنے سے سکوت اختیار کیا''۔ (تاریخ کبیر)

یقیناً اس وقت بھی اور ایک مدت تک اس سحرؔ نے اپنا کام کیا، مگر جب امام صاحب کی فقہ اور حدیث کی اشاعت عام ہوتی چلی گئی اور شرق سے غرب تک، شمال سے جنوب تک ان کے علوم کی روشنی پھیل گئی تو اس سحر کے اثرات بھی کم ہونے لگے۔

ارجاء کا الزام

یہاں بات میں بات نکلتی چلی جارہی ہے اور میں مختصر کرنا چاہتا ہوں اس لئے عرض کرنا یہ ہے کہ امام بخاری نے امام صاحبؒ کو مرجیٔ سمجھا تھا اور یہی باور کرانے کی سعی کی اور کتاب الایمان میں بھی روئے سخن ارجاء کارد ہی ہے، جس میں تقریباً چالیس ابواب قائم کر کے حتی الامکان ہر عمل کو جزو ایمان بتلانے کی سعی کی ہے، تاکہ ارجاء کی جڑ تو کٹ ہی جائے، خواہ اس کو کاٹنے میں اعتزال کی حدود میں سے بھی بادل ناخواستہ گذرنا پڑ جائے، یہاں اس سے بحث قطعاً نہیں کہ حقیقت کیا تھی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خدانخواستہ امام صاحبؒ اوران کے متبعی مرجیٔ تھے اور نہ امام بخاریؒ کسی درجہ میں معتزلی تھے، بلکہ جو کچھ بھی افراط تفریط پیش آئی اس کے وجوہ واسباب مقدمہ انوارالباری میں ذکر ہو چکے ہیں، وہاں دیکھ لئے جائیں۔

امام بخاری اور فقہ اربعہ

یہاں امام بخاری نے چونکہ **باب القسمة و تعليق القنو في المسجد** سے شروع کر کے **باب السترہ** تک تقریباً پچاس ابواب قائم کر کے فقہاء[1] اربعہ کے ان مسائل کا رد کیا ہے جو مساجد سے متعلق ہیں، کیونکہ فقہاء مجتہدین امام اعظم، امام مالک، امام شافعی و امام احمدؒ کے نزدیک مساجد صرف عبادت کے لئے ہیں، دوسرے امور کی اجازت وقتی طور سے حسب ضرورت ہوسکتی ہے، جس کی گنجائش احادیث و آثار سے بھی ملتی ہے، مگر امام بخاریؒ چونکہ قیاس کی حجیت سے منکر ہیں اور فقہاء کے بہ کثرت مسائل مستنبطہ سے برہم ہیں، بلکہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق تو یہ ہے کہ وہ اس بارے میں ظاہری جیسے ہیں (ملاحظہ ہو فیض الباری ۵۰۷ ج ۴) اس لئے نہ صرف امام اعظمؒ بلکہ دوسرے فقہاء ثلاثہ کے مسائل کا بھی رد کر جاتے ہیں، بلکہ ان کی حدیثی روایات کو بھی اہم نہیں سمجھتے، چنانچہ امام صاحب سے تو بخاری میں روایت کرنے کا سوال ہی نہ تھا کہ امام صاحب اور ان کے اکثر متبعین کو غلط فہمی کی وجہ سے مرجیٔ سمجھتے تھے، اپنے شیخ واستاذ فن حدیث امام احمد ایسے محدث اعظم سے ساری بخاری میں صرف دو روایات لی ہیں (وہ بھی شاید کسی مجبوری سے لی ہوں گی) امام شافعیؒ سے کوئی ایک روایت بھی نہیں لی جبکہ وہ بھی امام بخاری کے شیخ الشیخ تھے، البتہ امام مالکؒ سے کچھ روایات لی ہیں۔

اب مجھے ایک بات اور ضروری عرض کرنی ہے، جو میرا حاصل مطالعہ ہے کہ امام اعظمؒ کی فقہ سب سے پہلے وجود میں آئی، مدون بھی ہوگئی اور بڑی ہی آن بان وشان سے آئی کہ اس کی روشنی ونورانیت سے بڑوں بڑوں کی آنکھیں چکاچوند ہوگئیں اور ایسی عظیم ترین کامیابی سے حاسد طبائع کا اثر لینا بھی ضروری تھا، تو اس کے توڑ کے لئے ظاہرین وعدم تقلید ائمہ مجتہدین کے جراثیم بھی اسی وقت سے پیدا ہوگئے تھے اور میں بہت ہی مختصر کر کے اس دور سے لے کر اس وقت تک کی چند عظیم شخصیات کا ذکر یہاں کئے دیتا ہوں۔ واللعلم عنداللہ۔

۱۔ حضرت امام اوزاعیؒ م ۱۵۷ھ

آپ امام اعظمؒ اور ان کی فقہ کے ایک زمانہ تک سخت مخالف رہے مگر پھر جب غلط فہمیاں دور ہوگئیں تو نادم ہوئے اور اپنی رائے سے رجوع فرمالیا تھا، حالانکہ وہ خود اپنی دور کے بہت بڑے فقیہ ومحدث تھے اور ان کی فقہ کے متبعین بھی غالباً کئی صدی تک رہے ہیں۔

۲۔ حضرت سفیان ثوریؒ ۱۶۱ھ

[1] ہر باب میں ہم یہ بھی نشان دہی کریں گے کہ کس فقیہ کے خلاف وہ باب قائم کیا گیا ہے۔ ان شاءاللہ۔

یہ بھی امام صاحب کے معاصر اور جلیل القدر محدث وفقیہ تھے، ایک عرصہ تک امام صاحب کے فقہی فیصلوں پر معترض رہے، مگر پھر انہوں بھی رجوع فر مالیا تھا اور امام صاحب کے بڑے مداحین میں سے ہو گئے تھے۔

۳۔محدث عبدالرحمٰن بن مہدی م ۱۹۸ھ

حافظ نے لکھا کہ وہ امام مالک وغیرہ کے تلمیذ حدیث تھے اور عبداللہ بن مبارک و یحییٰ بن معین نے ان سے روایت کی، اگر چہ عبداللہ بن مبارک ان کے شیوخ میں سے تھے، فقہ میں وہ بعض مذاہب اہل الحدیث اور رائے مدنیین کو اختیار کرتے تھے (تہذیب ص ۲۷۹ ج ۶) یہاں اتنی بات تو محفوظ کر ہی لیجئے کہ علامہ محدث ابن عبدالبر مالکی شافعیؒ نے فرمایا تھا کہ اہل حدیث امام ابوحنیفہؒ کے دشمن ہیں اور اس وقت بحث بھی یہی چل رہی ہے کہ اہل حدیث واصحاب ظاہر فقہاء کے مخالف ہوتے ہیں۔

یہ عبدالرحمٰن بن مہدی بھی امام صاحب کے سخت دشمن تھے اور اسحٰق بن راہویہ کو بھی انہوں نے ہی حنفی سے ظاہری بنایا تھا، پھر اسحٰق بن راہویہ نے امام بخاری پر اپنے اثرات ڈالے، اس کے لئے ایک واقعہ امام احمدؒ کی کتاب الورع سے نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، قاسم بن محمد بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے اسحٰق بن راہویہ نے کہا کہ پہلے میں صاحب رائے تھا، جب حج بیت اللہ کا ارادہ کیا تو حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتابیں مطالعہ کیں اور ان میں سے امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے موافق ومؤید احادیث نکالیں جو تقریباً تین سو تک پہنچ گئیں، میں نے اپنے دل میں کہا کہ ان کے بارے میں عبداللہ بن مبارک کے مشائخ سے سوال کروں گا جو حجاز وعراق میں ہیں اور میرا یقین یہ تھا کہ کوئی بھی امام ابوحنیفہؒ کی مخالفت کی جراءت نہ کرے گا جب میں بصرہ پہنچا تو عبدالرحمٰن بن مہدی سے ملا انہوں نے کہا، تم کہاں کے ہو؟ میں نے کہا اہل مرد سے، اس پر وہ عبداللہ بن مبارک کو یاد کر کے ان کے لئے دعائے رحمت ومغفرت کرنے لگے کہ ان کے ساتھ نہایت محبت کرتے تھے، پھر پوچھا کیا تمہیں کوئی مرثیہ بھی یاد ہے، جو ان کے لئے کہا گیا ہو؟ میں کہا یاد ہے، پھر میں نے ابوتمیلہ شاعر کا مرثیہ شروع کر دیا وہ اشعار سنتے رہے اور روتے رہے اور میں برابر پڑھتا رہا، جب میں نے یہ شعر پڑھا:- وبرأی النعمان کنت بصیرا، حین تبغی مقائس النعمان تو وہ فوراً بول پڑے کہ بس چپ ہو جاؤ، تم نے تو سارا قصیدہ ہی خراب کر دیا، میں نے کہا اس کے بعد دوسرے اشعار بہت اچھے ہیں، کہنے لگے نہیں ان کو بھی چھوڑ دو، تذکرہ روایت عبداللہ عن ابی حنیفہ تو ان کے مناقب میں داخل ہو گیا جبکہ عراق کی سرزمین میں ان کی کوئی بھی لغزش اور خطا بجز روایت عن ابی حنیفہ کے نہیں ہے اور میری بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ ان سے روایت نہ کرتے پھر میں اس کے فدیہ میں اپنے مال ودولت کا بڑا حصہ قربان کر دیتا، (یہ عبدالرحمٰن بن مہدی بڑے صاحب ثروت ومال بھی تھے) میں نے کہا اے ابوسعید! آپ ابوحنیفہ سے اتنے برہم کیوں ہیں؟ کیا یہ سب صرف اس بات کی وجہ سے ہے کہ وہ رائے سے کلام کرتے تھے، اگر یہ بات ہے تو امام مالک، اوزاعی اور سفیان بھی رائے سے کلام کرتے تھے، کہا تم ابوحنیفہ کو ان لوگوں کے ساتھ ملاتے ہو؟ علم میں ابوحنیفہ کی مثال تو اس اکیلی اونٹنی جیسی ہے جو ایک الگ سرسبز وادی میں[۱] چرتی ہو اور دوسرے سب اونٹ دوسری وادی میں۔

اسحٰق بن راہویہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے نظر کی تو دیکھا کہ لوگوں کے خیالات امام ابوحنیفہ کے بارے میں اس کے خلاف ہیں جو ہمارے خراسان میں تھے۔ (کتاب الورع عن الامام احمد بن حنبلؒ ص ۷۵،۷۶ طبع مصر)

---

[۱] محققین امت نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ سارے احکام شرع کے ذخیرہ میں بیس مسئلے بھی ایسے نہ ملیں گے جن میں امام اعظم متفرد ہوں یا ان کا کوئی قول یا امام ابو یوسف ومحمدؒ کا کوئی قول امام شافعی، امام مالک وامام احمد کے موافق موجود نہ ہو اور ہم او پر یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ تین ارباع مسائل فقہ میں چاروں ائمہ باہم متفق ہیں پھر یہ بات کتنی غلط اور بے بنیاد کہہ دی گئی کہ امام صاحب الگ وادی میں تھے اور باقی سب دوسری وادی میں، شاید بہت سے بڑے بڑے جو بڑے نہ بن سکے، اس کی وجہ ان کے ایسے ہی غلط نظریات وتنگ نظری ہو گی۔ واللہ اعلم (مؤلف)

یہ حال عراق کا تھا جہاں امام اعظم اور ان کے ۴۰ شرکاء تدوین فقہ نے فقہی مسائل کا ایسا نادر روزگار مجموعہ تیار کیا تھا، جس کی نظیر مذاہب عالم پیش کرنے سے عاجز ہیں اور جو دنیائے اسلام کے لئے رہتی دنیا تک کے لئے مکمل ترین قانونی نظام ہے، جہاں قدر کرنے والے اس عظیم ترین احسان کی صحیح قدر و قیمت پہنچاتے رہے اور تا قیامت پہنچائیں گے، خدا کی شان ہے کہ وہاں عبدالرحمٰن بن مہدی ایسے ناقدرے بھی ہوئے ہیں اور اب بھی اہل حدیث غیر مقلدین و سلفی حضرات اس غلط راہ پر چل رہے ہیں اور ہمارا مقصد یہاں صرف ایسے ہی اہل حدیث یا اہل ظاہر کا ذکر ہے جو فقہاء اربعہ یا ان کی فقہ سے بیر رکھتے ہیں یا کسی فقہی مکتب خیال کی طرف منسوب ہوتے ہوئے بھی بڑے بڑے مسائل فروع و اصول میں ان کے الگ تفردات ہیں۔

۴۔ محدث ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی م ۲۲۰ھ

ان کے بارے میں مقدمہ انوار الباری میں کافی لکھ چکا ہوں، افسوس ہے کہ امام بخاریؒ کا ذہن فقہ حنفی اور امام اعظمؒ وغیرہ کی طرف سے ہٹانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے ورنہ امام بخاریؒ کا کارنامے آج ائمہ مجتہدین سے کم درجہ میں امت مرحومہ کے لئے مفید نہ ہوتے اور اب ہمیں امام بخاریؒ کی جلالت قدر اور عظیم خدمات حدیث کی وجہ سے کوئی صحیح وضروری نقد کرنے میں بھی تامل ہوتا ہے۔

۵۔ محدث جلیل حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ م ۲۳۵ھ

آپ کی جلیل القدر حدیثی تالیف دنیائے حدیث کے لئے احسان عظیم ہے اور اگر یہ کتاب پہلے شائع ہو جاتی تو بہت سے نزاعات کی نوبت ہی نہ آتی کیونکہ آپ نے احادیث نبویہ کے ساتھ ساتھ آثار صحابہ و تابعین و تعامل امت کی روشنی بھی دکھلا دی تھی، اگر چہ امام اعظمؒ کی فقہ پر آپ نے مستقل نقد بھی کر دیا ہے، جس کا بڑا حصہ غلط فہمیوں کے سبب سے ہے، تاہم اس کا جواب بھی کافی و شافی شائع ہو چکا ہے خود بھی نقد کرتے ہیں اس لئے ہر نقد صحیح کو پسند کرتے ہیں۔

۶۔ محدث اسحٰق بن راہویہ م ۲۳۸ھ

یہ خود پہلے صاحب رائے تھے، بلکہ غالباً حنفی بھی، جیسا کہ خود ان کے بیان سے مترشح ہوتا ہے، پھر اہل حدیث بن گئے اور امام بخاری کو بھی سبق پڑھایا کہ مجرد صحیح کا مجموعہ تیار کرو، امام بخاری جو آثار صحابہ کو حجت نہیں سمجھتے، یہ بھی ممکن ہے ان ہی کا اثر ہو، بہر حال! امام بخاری نے ان کے مشورہ سے صحیح بخاری لکھی اور حدثنا کے بعد صرف حدیث مجرد اور وہ بھی صرف اپنے مسلک کے مطابق والی لاتے ہیں دوسری کا ذکر فکر کچھ نہیں، البتہ اپنے خیال کے لئے مؤید اگر کوئی صحابی کا قول و فعل ہو تو اس کو ترجمۃ الباب میں لے آتے ہیں۔

۷۔ امام بخاریؒ م ۲۵۶ھ

آپ کا مفصل تذکرہ مقدمہ انوار الباری جلد دوم میں مع تعارف تالیفات ہو چکا ہے، انوار الباری کا مطالعہ کرنے والے اس کو اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیا کریں، تو فائدہ زیادہ ہوگا، حضرت شاہ صاحبؒ نے آپ کو علماء ظاہر سے اشبہ کہا ہے اور میرے پاس بھی اس کے قرائن ہیں، ممکن ہے پھر کہیں لکھنے کا موقعہ نکلے، باقی جن مسائل میں ظاہریت اختیار کی ہے یا فقہاء و مجتہدین کے خلاف امام بخاری نے رائے قائم کی ہے، ان کی جواب دہی ہم کرتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وبہ نستعین۔

۸۔ شیخ داؤد ظاہریؒ م ۲۷۰ھ

یہ مشہور ظاہری محدث گذرے ہیں جنہوں نے فقہ اربعہ کی مخالفت میں جھنڈے گاڑے تھے۔

۹۔ محدث ابن خزیمہ م ۳۱۱ھ

یہ بھی مشہور محدث تھے، علم کلام میں حذاقت تو درکنار درک بھی نہیں تھا، اسی لئے اپنی کتاب التوحید میں بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں اور ہماری بدقسمتی کہ ان کے بہت سے اصول وعقائد کے مسائل میں علامہ ابن تیمیہ نے ان کو اپنا متبوع بنالیا ہے ان کی صحیح ابن خزیمہ نادرۂ روزگار تھی اب ۲۔۳ جلدیں شائع ہوگئی ہیں اور یہ بھی امام بخاریؒ کی طرح اپنے مسلک کی تائید اور دوسروں کی تردید کیلئے بڑے بڑے تراجم الابواب اور عنوانات قائم کرتے ہیں، دو جلدیں میرے پاس آچکی ہیں، اس لئے اب ان کا ذکر بھی مسائل کی بحث میں آئے گا۔ ان شاءاللہ

۱۰۔ علامہ ابن حزم ظاہری م ۴۵۷ھ

نہایت مشہور ومعروف محدث تھے، مگر ظاہری یا نئی اصطلاح میں سلفی ائمہ مجتہدین وکبار امت پر سخت تنقید کرنے والے بلکہ توہین کی حد تک ان کی زبان، حجاج کی تلوار کی طرح تیز تھی، پھر علامہ ابن تیمیہ کی طرح اپنی ہی کہتے ہیں دوسروں کی نہیں سنتے، ان کی ''محلی'' احادیث و آثار صحابہ وتابعین کا نہایت گراں قدر مجموعہ ہے جو دس بڑی جلدوں میں شائع شدہ ہے، کوئی محدث ان کی اس کتاب کے مطالعہ سے مستغنی نہیں ہوسکتا، وغیرہ فوائد مع نقائص ظاہریت وسب وشتم ائمہ۔

۱۱۔ علامہ تقی الدین بن تیمیہ م ۷۲۸ھ

نہایت جلیل القدر محدث اور علم وفضل کے بحر ناپیدا کنار، حتیٰ کہ بعض علماء امت نے تو یہ رائے بھی قائم کردی کہ ان کا علم ومطالعہ ان کی عقل وفہم سے بھی کوسوں آگے بڑھ گیا تھا اور شاید اسی لئے تفردات کا ایک ڈھیر لگا گئے اور وہ بھی صرف فروعی مسائل تک نہیں رکے بلکہ عقائد و اصول میں بھی داخل ہوگئے، جیسے قدم عرش استقرار عرش، اثبات جہت اللہ تعالیٰ کے لئے وغیرہ، ان کے رد میں علامہ سبکی وحصنی وغیرہ کی تالیفات قابل مطالعہ ہیں بعد عقائد اور طلاق ثلث وغیرہ مسائل میں انہوں نے امام احمد کی بھی مخالفت کی ہے، جو ان کے متبوع ومقلد بھی ہیں اور بہت سے مسائل میں ظاہریت اختیار کی ہے۔

۱۲۔ علامہ ابن القیم م ۷۵۱ھ

آپ نے اپنے استاذ محترم علامہ ابن تیمیہ کی تمام مسائل وعقائد میں مکمل پیروی کی ہے، بجز اس کے علامہ ابن تیمیہ کا رویہ حنفیہ اور فقہ حنفی کے ساتھ نرم ہے، بلکہ بہت سے مسائل میں تائید کا پہلو اختیار کیا ہے، لیکن ابن قیم نے حنفیہ کی مخالفت میں کسر اٹھا نہیں رکھی، ملاحظہ ہو اعلام الموقعین، اگرچہ دوسرے مذاہب فقہ کی بھی مخالفت اور ظاہریت کے مظاہرے کئے ہیں، سلوک وتصوف کے مسائل میں اپنے استاد سے بہت نرم ہیں۔

۱۳۔ مجدالدین فیروز آبادی ۸۱۷ھ

آپ کا میلان بھی ظاہریت کی طرف تھا اور اپنی کتاب ''سفر السعادۃ'' میں حنفیہ کے خلاف ہنگامے برپا کئے ہیں، جن کے جوابات علامہ محقق شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے شرح سفر السعادۃ میں دیئے ہیں، تفصیل فوائد جامعہ شرح عجالہ نافعہ (اردو) میں ہے اور اس میں شیخ موصوف اور شاہ ولی اللہ کے علوم وخدمات کا موازنہ بھی قابل مطالعہ ہے۔

۱۴۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی ۱۲۰۲ھ

آپ کی خدمات جلیلہ در بارہ رد و بدعت و شرک قابل مدح وستائش ہیں، مگر اس کے ساتھ جو کچھ افراط وتفریط پیدا ہوئی اور علامہ ابن تیمیہ کی تقلید، نیز ظاہریت کی تائید واشاعت وغیرہ وہ لائق نقد ہے، چونکہ اس وقت نجد وحجاز میں ان ہی کا سکہ رائج ہے، ضرورت ہے کہ اجتماع حج کے موقعہ پر علمائے اسلام جمع ہو کر حالات ومسائل کو اعتدال پر لانے کے لئے جدوجہد کیا کریں اور اتحاد کلمہ کی راہ نکالیں، غلطی بجز انبیاء علیہم السلام کے ہر ایک سے ہوسکتی ہے اور ہم میں سے کوئی بھی معصوم نہیں ہے، واللہ الموفق لما یحب ویرضی۔

۱۵۔علامہ شوکانی م ۱۲۵۰ھ

بڑے محدث وعلامہ تھے، حدیثی خدمات بھی نہایت قابل قدر ہیں، مگر عدم تقلید وظاہریت کے میلانات نے قدر وقیمت کم کردی ہے بعض مسائل میں جراءت کے ساتھ علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کے خلاف بھی لکھا ہے، ہمارے زمانہ کے اہل حدیث ان کا اتباع وتقلید کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔

۱۶۔نواب صدیق حسن خان م ۱۳۰۷ھ

یہ بھی اپنے زمانہ میں ظاہریت وعدم تقلید کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے کارہائے نمایاں انجام دے گئے ہیں، اگر چہ بعض مواقع میں جراءت کے ساتھ اپنے حزب کے خلاف کلمۂ حق بھی کہہ دیتے تھے جید عالم تھے، مفید علمی کتابیں شائع کیں، ایسے بااثر حضرت اگر اتحاد کلمہ کے لئے سعی کرتے تو کامیابی ضرور ہوتی، مگر اللہ کی مشیت کہ ایسا نہ ہوسکا۔

۱۷۔محدث نذیر حسین صاحب م ۱۳۲۰ھ

علامہ محدث نے مدتوں درس حدیث دیا اور علمی روشنی پھیلائی مگر ظاہریت وعدم تقلید پر ایسے جامد تھے کہ فقہاء کے لئے ناموزوں کلمات تک نکالنے سے بھی باک نہ تھا۔عفا اللہ عنہ

۱۸۔محدث عبدالرحمٰن مبارکپوری م ۱۳۵۳ھ

محدث جلیل صاحب تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی، آپ بھی اہل حدیث کے بڑے عالم تھے، اور حدیثی خدمات قابل قدر انجام دیں، بعض اوقات مسائل متنازعہ کے اندر بحث وکلام میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، ملا علی قاری حنفیؒ کی مرقاۃ شرح مشکوٰۃ سے بہ کثرت نقول ذکر کرتے ہیں، ہمارے اساتذہ واکابر دیوبند کی تردید میں بڑی دلچسپی لی ہے اور خلیج اختلافات کو بڑھایا ہے۔

۱۹۔محدث عبیداللہ مبارکپوری دام فیضہم

علامہ محدث، صاحب مرعاۃ شرح مشکوٰۃ بحث ونظر میں اچھی اچھی نقول ذکر کی ہیں اور شروع جلدوں کی نسبت بعد کی جلدوں میں اعتدال وسلامت روی کا رجحان زیادہ ہے جو فال نیک ہے، ۶ جلدیں شائع ہوچکی ہیں، خدا کرے کتاب مذکور باحسن اسلوب مکمل ہو کر شائع ہو اور اختلافات کی خلیج پاٹنے کا سامان زیادہ سے زیادہ میسر ہو تعصب وتنگ نظری سے دور ہو کر جو بھی حدیثی خدمت ہو وہ سب ہی اہل علم و عوام کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بن سکتی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں اور ہمیں سب ہی کو اپنی مرضیات کی توفیق دے۔

امام بخاری کے ابواب المساجد اور خلاف فقہاء مہم کی تقریب سے مذکورہ بالا حضرات اہل ظاہر کا تذکرہ ہوا ہے اور امام بخاری اگر چہ بکل معنی الکلمہ ظاہری نہیں تھے، تاہم اشبہ بالظاہری ضرور تھے اور ایسے مواقع میں جہاں وہ کسی فقیہ کے خلاف مسئلہ کا اثبات کرتے ہیں یا

صرف اپنی ہی مؤید حدیثیں ذکر کرتے ہیں، مقابل جانب کی نہیں، وہاں صحیح بخاری کے مدرس کو بہت ہی بڑے وسیع علم و مطالعہ کی ضرورت ہے جیسا کہ ہمارے دور میں علامہ کشمیری یا حضرت مدنیؒ کا تھا، مگر اب تو بیشتر مدارس میں دورہ حدیث ہونے لگا ہے اور وہاں کا شیخ الحدیث جو صحیح معنی میں درس بخاری و ترمذی کا اہل نہیں ہوتا، صحیح بخاری و ترمذی کا درس دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیشتر فضلا و فارغین نیم سلفی بن کر نکلتے ہیں اور وہ اپنے وطن جا کر سلفی عوام تک کی جواب دہی بھی پوری طرح نہیں کر سکتے۔ فیاللاسف ولضیعۃ علم الحدیث والی اللہ المشتکی۔

باب من دعى لطعام فى المسجد و من اجاب منه

(جسے مسجد میں کھانے کے لئے بلایا جائے وہ اسے قبول کر لے)

(۴۰۷) حدثنا عبدالله بن يوسف قال انا مالك عن اسحق بن عبدلله انه سمع انسا قال و جدت النبى ﷺ فى المسجد و معه ناس فقمت فقال لى ارسلك ابو طلحة فقلت نعم قال لطعام قلت نعم فقال لمن حوله قوموا فانطلق و الطلقت بين ايديهم.

ترجمہ: حضرت انسؓ نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو مسجد میں چند اصحاب کے ساتھ پایا، میں کھڑا ہو گیا تو آں حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہیں ابوطلحہ نے بھیجا ہے، میں نے کہا جی ہاں، آپ نے پوچھا کھانے کے لئے (بلایا ہے) میں نے عرض کی کہ جی ہاں (کھانے کے لئے بلایا ہے) آپ نے اپنے قریب موجود لوگوں سے فرمایا کہ چلو سب حضرات آنے لگے اور میں ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔

تشریح: حسب تحقیق حضرت شاہ ولی اللہؒ اس باب کا مقصد مسجد میں کلام مباح کا جواز بتلانا ہے، کیونکہ مسجدیں عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں اور حدیث میں کلام دنیا کی ممانعت بھی وارد ہے، اس وہم کو دفع کیا گیا۔

باب القضاء و اللعان فى المسجد بين الرجال و النساء

(مسجد میں مقدمات کے فیصلے کرنا اور مردوں اور عورتوں میں لعان کرانا)

(۴۰۸) حدثنا يحيىٰ نا عبدالرزاق نا ابن جريج انا ابن شهاب عن سهل بن سعد ان رجلاً قال يا رسول الله ارايت رجلا وجد مع امرأته رجلاً يقتله فتلاعنا فى المسجد و انا شاهد.

ترجمہ: سہل بن سعد نے بیان کیا کہ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ ایسے شخص کو آپ کیا حکم دیں گے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر کو دیکھتا ہے کیا اسے قتل کر دینا چاہئے؟ پھر اس مرد نے اپنی بیوی کے ساتھ مسجد میں لعان کیا اور اس وقت میں موجود تھا۔

تشریح: لعان اس کو کہتے کہ شوہر اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو ملوث دیکھے یا اس قسم کا کوئی یقین اسے ہو لیکن معقول شہادت اس سلسلے میں اس کے پاس کوئی نہ ہو تو شریعت نے خاص شوہر اور بیوی کے تعلقات کی رعایت سے اس کی اجازت دی کہ دونوں قاضی کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کریں اور ایک دوسرے پر جھوٹا ہونے کی صورت میں لعنت بھیجیں، تو پھر دونوں کے درمیان جدائی کرادی جائے گی، قضا مسجد میں عندالحنفیہ جائز ہے بلا کراہت اور یہی مذہب امام مالک و احمد کا ہے لیکن عندالشافعیہ مکروہ ہے۔ حافظ نے اس مسئلہ پر باب من قضى و لا عن فى المسجد (کتاب الاحکام) میں بحث و تفصیل کی ہے۔ جو فتح الباری کے ص ۱۲۵ ج ۱۳ پر ہے (اس باب میں امام بخاری نے شافعیہ کا رد کیا ہے)۔

باب اذا دخل بيتاً يصلى حيث شآء او حيث امر ولا يتجسس

(جب کسی کے گھر جائے تو کیا جس جگہ اس کا جی چاہے وہاں نماز پڑھے یا جہاں اسے نماز پڑھنے کے لئے کہا جائے وہاں پڑھےاور (اندر جاکر) تجسس نہ کرنا چاہئے)

(۴۰۹) حدثنا عبدالله بن مسلمة نا ابراهيم بن سعد عن ابن شهاب عن محمود بن الربيع عن عتبان بن مالک ان النبی ﷺ اتاه فی منزله فقال این تحب ان اصلی لک من بیتک قال فاشرت له الیٰ مکان فکبر النبی ﷺ و صففنا خلفه فصلی رکعتین.

ترجمہ: حضرت عتبان بن مالک سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے گھر تشریف لائے آپ نے پوچھا کہ تم اپنے گھر میں کہاں پسند کرتے ہو کہ میں اس جگہ تمہارے لئے نماز پڑھوں، انہوں نے بیان کیا کہ میں نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا پھر نبی کریم ﷺ نے تکبیر کہی اور ہم آپ کے پیچھے صف بستہ کھڑے ہو گئے، آپ نے دو رکعت نماز پڑھائی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شارحین بخاری نے دونوں صورتوں کو امام بخاری کا مقصد بتلایا ہے کہ جو چاہے اختیار کرلے مگر میں سمجھتا ہوں کہ مقصد ترجمہ تو حسب امر صاحب الدار ہی ہے، مگر پھر یہ خیال کر کے کہ حکم شارع کو اسی پر منحصر نہ سمجھ لیا جائے دوسری صورت بھی ذکر کر دی، احقر عرض کرتا ہے کہ شاید اسی لئے تجسس کو منع کیا، کیوں کہ جہاں چاہے کسی کے گھر میں نماز پڑھنے میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ایسی جگہ پڑھنا چاہے جہاں جانا گھر والے کو پسند نہ ہو یا پردے و حجاب کے خلاف ہو یا اسی جگہ ایسا گھریلو سامان ہو جس کو وہ اس پر ظاہر نہ کرنا چاہتا ہو وغیرہ۔ البتہ اگر صاحب بیت ہی عام اجازت دے دے کے جہاں چاہے پڑھے تو کوئی حرج نہیں۔

یہ تو عام بات ہوئی لیکن اگر کوئی شخص کسی ولی بزرگ کو بلا کر اپنے گھر کے کسی حصہ کو بابرکت بنانے کے لئے یا نماز خانگی کے لئے جگہ متعین کرانا چاہے تو بہتر یہی ہے کہ وہ بزرگ جگہ دریافت کرلے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے دریافت فرمالیا، واللہ اعلم۔

اس حدیث سے تبرک بآثار الصالحین کا ثبوت ہوا اور سلفی حضرات جو ان امور کو بے حیثیت گردانتے ہیں اس کا رد ہوا حرمین شریفین کے مآثر متبرکہ حتی کہ مولد نبوی اور بیت مبارک حضرت خدیجہؓ کو معطل و بے نشان کر دیا گیا ہے اور اس کو خالص توحید کا نام دیا جاتا ہے، یعنی ان چند لوگوں کے سوا اور ساری دنیائے اسلام کے کروڑوں مسلمان عوام اور علماء سب کی توحید ان کے مقابلہ میں ''نخالص'' ہے، مگر کیا یہی حدیث بخاری اس بات کا کامل ثبوت نہیں کہ حضور علیہ السلام کے کسی ایک جگہ پر صرف ایک نماز نفل پڑھ لینے سے صحابہ کرام اس مقام کو کتنا متبرک سمجھتے تھے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس جگہ کو حضرت عتبان بن مالک نے بت پرستوں کی طرح پرستش کی جگہ بنالیا تھا؟! پھر کیا وجہ ہے کہ جس بیت مبارک میں حضور علیہ السلام کی پیدائش ہوئی برسوں اس میں آپ نے عبادت کی، شب و روز گذارے اور بیت حضرت خدیجہؓ میں کتنی ہی بار وحی الٰہی نازل ہوئی ہوگی اور اس میں حضور نے نہ صرف سینکڑوں نوافل بلکہ فرائض بھی ادا کئے ہونگے پھر یہ کہ تیرہ سو برس تک ہر دور کے حجاج و زائرین ان مقامات متبرکہ کی زیارت کرتے رہے اور حضرت عتبانؓ کی طرح وہاں برکت حاصل کرنے کے لئے نفل نمازیں بھی پڑھتے رہے، چودھویں صدی میں آکر ان مقدس مقامات کو صرف اس خطرۂ موہوم کو آڑ بنا کر کہ لوگ وہاں شرک کریں گے، ان کے آثار تک مٹادیئے گئے، یا کچھ باقی ہیں تو ان کو مقفل کر دیا گیا ہے، کیا وہاں بھی دیگر مساجد و مقامات مدینہ طیبہ وغیرہ کی طرح سپاہیوں کا پہرہ بٹھا کر مزعوم شرک کی روک تھام نہ ہوسکتی تھی، دوسرے صحابہ کرام کے بیسیوں واقعات سے استبراک ثابت ہے، تو کیا ان سے بھی بڑھ کر یہ لوگ کسی

توحید خالص کے ماننے والے ہیں، میری عاجزانہ درخواست موجودہ علماء وامراءنجد سے ہے کہ وہ تلافی مافات کی طرف جلد توجہ فرمائیں،
علامہ ابن قیمؒ نے زادالمعاد کے شروع ہی میں حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی حدیث مسلم شریف سے نقل کی ہے کہ انہوں نے جبۂ مبارکہ نبویہ نکالا اور فرمایا کہ یہ حضرت عائشہؓ کے پاس آخر تک رہا ان کے انتقال کے بعد میرے پاس آیا، چونکہ نبی کریم علیہ السلام اس کو پہنا کرتے تھے، اس لئے ہم اس کو دھو کر مریضوں کو پانی پلاتے ہیں اور ان کو شفا ہوتی ہے اور حضرت ابوایوب انصاریؓ جن کے حضور علیہ السلام مدینہ منورہ میں سات ماہ تک مہمان رہے، حضرت ابوایوب اور زوجہ محترمہ کا معمول رہا کہ دونوں وقت حضور علیہ السلام کے لئے کھانا پیش کرتے اور جو بچتا وہ کھاتے، کوئی نجدی مزاج کہے گا کہ ایسا تو سب ہی کرتے ہیں مگر ابھی اور دیکھئے کہ حضرت ابوایوبؓ برکت حاصل کرنے کے لئے وہیں انگلیاں ڈالتے ہیں جہاں حضور اکرم علیہ السلام کی انگلیوں کا نشان پڑا ہوا دیکھتے تھے (زرقانی، وفاء الوفا، حاکم واصابہ)

افسوس ہے کہ ہمارے نجدی بھائی اور ان کے ہم خیال ایسی باتوں کو مہمل خیال کرتے ہیں، حدیث سے جماعت نوافل کا بھی ثبوت ہوا، مگر جتنا ثبوت ہے، اتنا ہی رہنا چاہئے، کیونکہ نہ اس جماعت کے لئے کوئی تداعی یا اہتمام ہوا نہ اس کا بار بار تکرار ہوا، بلکہ مسجد نبوی میں تو تراویح وکسوف کے علاوہ دوسرے نوافل کی حضور علیہ السلام نے جماعت کرائی ہی نہیں، اس لئے فقہاء نے یہ استنباط بجا کیا کہ نوافل کی جماعت تراعی واہتمام کے ساتھ خلاف سنت ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ تداعی واہتمام کی صورت اصل مذہب میں متعین نہ تھی، بعد کے مشائخ نے وضاحت کردی لہٰذا اب وہی معمول بہا رہے گی، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ نماز تہجد وغیرہ کی جماعت رمضان میں بھی مکروہ تحریمی ہے اگر چار مقتدی ہوں خواہ خود جمع ہوں یا بطلب آئیں، تین میں اختلاف ہے اور دو میں کراہت نہیں کذا فی کتب الفقہ (فتاوی رشیدیہ ص ۲۸۹ وص ۲۹۹)

باب المساجد فی البیوت وصلی البرآء بن عازب فی مسجد فی داره جماعةً

(گھروں کی مسجدیں اور براء بن عازبؓ نے اپنے گھر کی مسجد میں جماعت سے نماز پڑھی)

(۴۱۰) حدثنا سعید بن عمیر قال نا اللیث قال حدثنی عقیل عن ابن شهاب قال اخبر نی محمود بن الربیع الانصاری ان عتبان بن مالک و هو من اصحاب رسول الله ﷺ ممن شهد بدراً من الا نصار انه الی رسول الله ﷺ فقال یا رسول الله قد انکرت بصری و انا اصلے لقومی فاذا کانت الا مطار سال الوادی الذی بینی و بینهم لم استطع ان اٰتی مسجد هم فا صلی بهم و وددت یا رسول الله انک تاتینی فتصلی فی بیتی فاتخذه مصلی قال فقال له رسول الله ﷺ سا فعل ان شاء الله تعالی قال عتبان فغدا علی رسول الله ﷺ و ابوبکر حین ارتفع النهار فاستاذن رسول الله ﷺ فاذنت له فلم یجلس حین دخل البیت ثم قال این یحب ان اصلے من بیتک قال فاشرت له الی ناحیة من البیت فقام رسول الله ﷺ فکبر فقمنا فصففنا فصلے رکعتین ثم سلم قال و حبسناه علی خزیرة صنعنا ها له قال فثاب فی البیت رجال من اهل الدار ذوو عدد فاجتمعوا فقال قائل منهم این مالک بن الدخیشن فقال بعضهم ذلک منافق لا یحب الله و رسوله فقال رسول الله ﷺ لا تقل ذلک الا تراه قد قال لا اله الا الله یرید بذلک وجه الله قال الله ورسوله اعلم قال فانا نریٰ وجهه و نصیحته الی المنافقین قال رسول الله ﷺ فان الله عزو جل قد حرم علے النار من قال لآ اله الا الله یبتغی بذلک وجه الله قال ابن شهاب ثم سالت الحصین بن محمد الانصاری وهو احد بنی سالم وهو من سراتهم عن حدیث محمود بن الربیع فصدقه بذلک.

ترجمہ: حضرت محمود بن ربیع انصاری نے خبر دی کہ حضرت عتبان بن مالک انصاریؓ رسول اللہ ﷺ کے صحابی اور غزوہ بدر کے شرکاء میں تھے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ میری بینائی میں کچھ فرق آ گیا ہے اور میں اپنی قوم کے لوگوں کو نماز پڑھاتا ہوں، لیکن جب موسم برسات آتا ہے تو میرے اور میری قوم کے درمیان جو نشیبی علاقہ ہے وہ بھر جاتا ہے اور میں انہیں نماز پڑھانے کے لئے مسجد تک جانے سے معذور ہو جاتا ہوں اور یا رسول اللہ میری خواہش ہے کہ آپ میرے غریب خانہ پر تشریف لائیں اور کسی جگہ نماز ادا فرمائیں تا کہ میں اسے نماز پڑھنے کی جگہ بنالوں، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمہاری اس خواہش کو پورا کروں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ، عتبان نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیقؓ عنہ دوسرے دن جب دن چڑھا تو تشریف لائے، رسول اللہ ﷺ نے اندر آنے کی اجازت چاہی اور میں نے اجازت دی، جب آپ گھر میں تشریف لائے تو بیٹھے نہیں بلکہ پوچھا کہ تم اپنے گھر کے کس حصہ میں مجھ سے نماز پڑھنے کی خواہش رکھتے ہو، انہوں نے کہا کہ میں نے گھر میں ایک طرف اشارہ کیا، رسول اللہ ﷺ (اس جگہ) کھڑے ہوئے اور تکبیر کہی ہم بھی آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور صف بستہ ہو گئے، آپ نے دو رکعت نماز پڑھائی پھر سلام پھیرا، کہا کہ ہم نے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے روکا اور آپ کی خدمت میں حریرہ پیش کیا جو آپ ہی کے لئے تیار کیا گیا تھا، عتبان نے کہا کہ محلّہ والوں کا ایک مجمع گھر میں لگ گیا، مجمع میں سے ایک شخص بولا کہ مالک بن دخیشن یا (یہ کہا) ابن دخشن دکھائی نہیں دیتا، اس پر دوسرے نے لقمہ دیا کہ وہ تو منافق ہے جسے خدا اور رسول سے کوئی تعلق نہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، یہ نہ کہو، دیکھتے نہیں کہ اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہے اور اس سے مقصود خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہے، منافقت کا الزام لگانے والے نے (یہ سن کر) کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، ہم تو اس کی توجہات اور ہمدردیاں منافقوں کے ساتھ دیکھتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے لا الٰہ الا اللہ کہنے والے پر اگر اس کا مقصد خدا کی خوشنودی ہو، دوزخ کی آگ حرام کر دی ہے، ابن شہاب نے بیان کیا کہ پھر میں نے حصین بن محمد انصاری سے جو بنو سالم کے ایک فرد ہیں اور ان کے سرداروں میں سے ہیں محمود بن ربیع کی (اس حدیث) کے متعلق پوچھا تو انہوں نے اس کی تصدیق کی۔

تشریح: یہاں مسجد سے مراد یہ ہے کہ گھر میں نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ مخصوص کر لی جائے، اس لئے اس پر عام مساجد کے احکام نافذ نہیں ہوں گے اور جس شخص کو یہ گھر وراثت میں ملے گا مسجد بھی اسی کے ساتھ ملے گی، منیۃ المصلی میں ہے کہ کوئی شخص کسی ایسی مسجد میں جو گھر کے احاطہ میں اس نے بنائی ہے نماز باجماعت پڑھے تو وہ مسجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت سے محروم رہے گا مگر تارک جماعت نہ ہوگا، یہ مسئلہ صرف اسی میں ہے اور گھروں میں نماز جماعت کا ثبوت امراء جور کے زمانہ میں اور دوسرے اعذار کے وقت بھی ہوا ہے (فیض الباری ص ۱۴۱ ج ۲)

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عتبان نے فرمایا اصابنی فی بصری بعض الشیء جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بینائی بالکل نہیں جاتی رہی تھی، عتبان بن مالک کو آں حضور ﷺ نے جماعت چھوڑنے کی اجازت دی تھی لیکن ابن ام مکتوم کو اس کی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ یہ مادرزاد نابینا تھے، خزیرہ عرب کا ایک کھانا، گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لئے جاتے تھے، پھر پانی ڈال کر انہیں پکایا جاتا تھا جب خوب پک جاتا تو اوپر سے آٹا چھڑک دیتے، اسے عرب خزیرہ کہتے تھے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ گوشت کو رات بھر کچا چھوڑ دیتے تھے، پھر صبح کو مذکورہ صورت سے پکاتے تھے۔

حاطب بن ابی بلتعہ مومن صادق تھے لیکن اپنی بیوی اور بچوں کی محبت میں آں حضور ﷺ کی لشکر کشی کی اطلاع مکہ کے مشرکوں کو دینے کی کوشش کی، یہ ان کی ایک بہت بڑی غلطی تھی لیکن اس سے ان کے ایمان و اسلام میں کوئی فرق نہیں آیا، ممکن ہے مالک بن دخشن کی دنیاوی ہمدردیاں بھی منافقوں کے ساتھ اسی طرح کی ہوں اور عام صحابہ نے ان کی اس روش کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا ہو لیکن نبی کریم ﷺ کی اس تصریح کے بعد آپ کے مومن ہونے کی پوری طرح تصدیق ہو جاتی ہے، آپ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کے ساتھ تھے اور حضرت

ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ نے آپ کی منافقوں کے ساتھ ہمدردانہ روش پر شبہ کا اظہار کیا تو آں حضور ﷺ نے یہی فرمایا تھا کہ کیا غزوۂ بدر میں وہ شریک نہیں تھے؟!

باب التيمن في دخول المسجد وغيره وكان ابن عمر يبداء برجله اليمنى فاذاخرج بدأ برجله اليسرى

(مسجد میں داخل ہوئے اور دوسرے کاموں میں داہنی طرف سے ابتداء کرنا! ابن عمرؓ مسجد میں داخل ہونے کے لئے داہنے پاؤں سے ابتداء کرتے تھے اور نکلنے کے لئے بائیں پاؤں سے)

(۴۱۱) حدثنا سليمان بن حرب قال نا شعبة عن الا شعث بن سليم عن ابيه عن مسروق عن عائشة قالت كان النبي ﷺ يحب التيمن ما استطاع في شأنه كله في طهوره و ترجله وتنعله.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے تمام کاموں میں جہاں تک ممکن ہوتا داہنی طرف سے شروع کرنے کو پسند فرماتے تھے، طہارت کے وقت بھی، کنگھا کرنے اور جوتا پہننے میں بھی۔

تشریح: (۴۱۱) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کے یہ افعال بطور عادت تھے، بطور عبادت کے نہیں جیسا کہ شارح وقایہ نے لکھا اور نہ حضور کی مواظبت وہمیشگی سے یہ افعال مسنون ہوجاتے، کیونکہ تعبد وتعود میں فرق ہے، لہٰذا مستحب ہوں گے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تراجم میں لکھا۔

باب هل ينبش قبور مشركي الجاهلية ويتخذ مكانها مساجد لقول النبي ﷺ لعن الله اليهود اتخذوا قبور انبيائهم مساجد و ما يكره من الصلوٰة في القبور ورآى عمر بن الخطابؓ انس بن مالك يصلي عند قبر فقال القبر القبر ولم يامر بالاعادة

(کیا دور جاہلیت میں مرے ہوئے مشرکوں کی قبروں کو کھود کر ان پر مساجد کی تعمیر کی جاسکتی ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ خدا نے یہودیوں پر لعنت بھیجی کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں پر مسجدیں بنالیں اور قبروں پر نماز پڑھنا مکروہ ہے، حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت انس بن مالکؓ کو ایک قبر کے نزدیک نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا کہ قبر سے بچو، قبر سے بچو، لیکن آپ نے ان سے اعادہ کے لئے نہیں فرمایا)

(۴۱۲) حدثنا محمد بن المثنىٰ قال نا يحيىٰ عن هشام قال اخبرني ابي عن عائشة ان ام حبيبة و ام سلمة ذكر نا كنيسة راينها بالحبشة فيها تصاوير فذكر تا ذلك للنبي ﷺ فقال ان اولٰئك اذا كان فيهم الرجل الصالح فمات بنوا على قبره مسجداً و صورو فيه تلك الصور فاولٰئك شرار الخلق عند الله يوم القيٰمة.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ نے بتلایا کہ ام حبیبہ اور ام سلمہ نے ایک کلیسا کا ذکر کیا جسے انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا، اس میں تصویریں تھیں، انہوں نے اس کا تذکرہ نبی کریم ﷺ سے بھی کیا، آپ نے فرمایا کہ ان کا یہ حال تھا کہ اگر ان کا کوئی نیکوکار صالح شخص فوت ہوجاتا تو وہ لوگ اس کی قبر پر مسجد بناتے اور اس میں یہی تصویریں بنادیتے، یہ لوگ خدا کی بارگاہ میں قیامت کے دن بدترین مخلوق ہوں گے۔

تشریح: (۴۱۲) انبیاء علیہم السلام کی قبروں پر نماز پڑھنے میں ایک طرح ان کی تعظیم وتکریم کا پہلو نکلتا ہے اور کفار اور یہود اسی طرح گمراہی

میں مبتلا ہوئے اس لئے یہودیوں کے اس فعل پر لعنت ہے خدا کی کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں پر مسجدیں بنائیں اوران میں تصاویر بنا کر پرستش کی، لیکن مشرکین کی قبروں کو اکھاڑ کر ان پر مسجد کی تعمیر میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ان کی تعظیم کا خیال ہی پیدا نہیں ہوسکتا اس کے علاوہ مشرکوں کی قبروں کی اہانت جائز ہے، اس لئے آں حضور کی حدیث اور آپ کے عمل میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۴۱۳) حدثنا مسدد قال ثنا عبدالوارث عن ابی التیاح عن انس بن مالک قال قدم النبی ﷺ المدینة فنزل اعلی المدینة فی حی یقال لهم بنو عمر و بن عوف فاقام النبی ﷺ فیهم اربعاً و عشرین لیلة ثم ارسل الی بنی النجار فجاء و متقلدین السیوف فکانی انظر الی النبی ﷺ علی راحلته و ابو بکر رفه و ملأ بنی النجار حوله حتی القی بفناء ابی ایوب و کان یحب ان یصلی حیث ادرکته الصلوٰة و یصلی فی مرابض الغنم و انه امر ببناء المسجد فارسل الی ملاء بنی النجار فقال یا بنی النجار ثامنونی بحائطکم هذا، قالوا لا والله لا نطلب ثمنه الا الی الله عز و جل قال انس فکان فیه ما اقول لکم قبور المشرکین وفیه خرب و فیه نحل فامر النبی ﷺ بقبور المشرکین فنبشت ثم بالخرب فسویت و بالنخل فقطع فصفو النخل قبلة المسجد و جعلوا عضادتیه الحجارة و جعلوا ینقلون الصخر وهم یرتجزون النبی ﷺ معهم وهو یقول اللهم لا خیر الا خیر الأخره فاغفر الانصار و المهاجره.

ترجمہ: حضرت انس بن مالک نے بیان کیا کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہاں کے بالائی علاقہ میں بنوعمرو بن عوف کے یہاں (قبا میں) ٹھہرے نبی اکرم ﷺ نے یہاں چوبیس دن قیام فرمایا پھر آپ نے بنونجار کو بلا بھیجا تو وہ لوگ تلواریں لٹکائے ہوئے آئے، گویا میری نظروں کے سامنے یہ منظر ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی سواری پر تشریف فرما ہیں، ابوبکر صدیقؓ آپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہیں اور بنونجار کی جماعت آپ کے چاروں طرف ہے، اسی حال میں ابوایوب کے گھر کے سامنے آپ نے اپنا سامان اتارا اور نبی کریم ﷺ یہ پسند کرتے تھے کہ جہاں بھی نماز کا وقت آجائے فوراً نماز ادا کرلیں، آپ بکریوں کے باڑوں میں بھی نماز پڑھا کرتے تھے اور آپ نے یہاں مسجد بنانے کے لئے فرمایا، چنانچہ آپ نے بنونجار کے لوگوں کو بلوا کر فرمایا کہ اے بنونجار! تم اپنے اس باغیچہ کی قیمت لے لو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں یارسول اللہ ہم اس کی قیمت نہیں لیں گے، ہم تو صرف خداوند تعالیٰ سے اس کا اجر مانگتے ہیں۔ حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ میں جیسا کہ تمہیں بتا رہا تھا یہاں مشرکین کی قبریں تھیں اس احاطہ میں ایک ویران جگہ تھی اور کچھ کھجور کے درخت تھے نبی کریم ﷺ نے مشرکین کی قبروں کو حکم دے کر اکھڑوا دیا، ویرانہ کو صاف اور برابر کرایا اور درختوں کو کٹوا دیا، لوگوں نے ان درختوں کو مسجد کے قبلہ کی جانب نصب کردیا اور پتھروں کے ذریعہ مسجد کی دونوں جانب کو مضبوط بنادیا، صحابہ پتھر اٹھاتے ہوئے رجز پڑھتے تھے اور نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ اللہ آخرت کی بھلائی کے علاوہ اور کوئی بھلائی (قابل توجہ) نہیں، پس انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرمایئے۔

تشریح: جب عرب کسی بڑی شخصیت سے ملنے جاتے تو ان کی یہ ایک وضع تھی کہ تلوار گردن سے لٹکا لیتے تھے، بعض علماء نے لکھا ہے کہ کھجور کے ان درختوں سے قبلہ کی دیوار بنائی گئی تھی اور کھڑا کر کے اینٹ اور گارے سے انہیں استوار کردیا گیا تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چھت کا وہ حصہ جو قبلہ کی طرف تھا اس میں ان درختوں کا استعمال کیا گیا تھا، رجز شعر سے مختلف چیز ہے، یہ نام عرب جاہلیت کا رکھا ہوا ہے، اس کی صورت فقرہ بندی یا تک بندی کی سی ہوتی تھی۔

علامہ کرمانی نے لکھا کہ حدیث میں چونکہ لعنت کو قبور انبیاء علیہم السلام اکھاڑ کر مساجد بنانے کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، اس لئے جائز ہوگا کہ غیر انبیاء وصالحین کی قبور مسمار کر کے اس جگہ مساجد بنالی جائیں، جیسا کہ خود حضور علیہ السلام نے مسجد نبوی کے لئے بھی کیا ہے، علامہ

قسطلانی وحافظ نے لکھا کہ قبور مشرکین کے لئے چونکہ کوئی حرمت نہیں ہے اس لئے ان کو اکھاڑ کر مسجد بنانا جائز ہوا بخلاف قبور انبیاء اوران کے اتباع کے کہ ان کی قبور کو اکھاڑنے میں ان کی اہانت ہے، لہٰذا حضور اکرم علیہ کے ارشاد وفعل میں کوئی تعارض نہیں ہے، البتہ علامہ نے مشرکین کے ساتھ لاذمة لہم کی قید بڑھائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل ذمہ مشرکین کی قبور کو نہ اکھاڑا جائے، غالباً اس لئے کہ اہل ذمہ کے اموال واعراض بھی اہل اسلام کی طرح قابل احترام ہوتے ہیں اوران کی قبور کی اہانت درست نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ نے لعنت کی وجہ تشبیہ بعبدة الاوثان بتلائی، یعنی یہود ونصاریٰ اس لئے ملعون قرار پائے کہ پہلے انہوں نے بطور یادگار انبیاء وصالحین کی قبور پر مسجدیں بنائیں پھران میں تصاویر رکھ کر بت پرستوں کی طرح پوجا کرنے لگے تھے، گویا لعنت کی وجہ یہ تشبہ تھی، لہٰذا اگر مقابر مسلمین کی زمین ہموار کر کے مسجد بنالیں تب بھی جائز ہوگا، کیونکہ تشبہ نہ ہوگا، البتہ قبور مشرکین کو اگر بغیر نبش کے یونہی زمین ہموار کر کے مساجد بنائیں گے تو وہ درست نہ ہوگا، کیونکہ وہ محل عذاب ہے بوجہ وجود اجسام مشرکین تحت الارض البتہ مسلمانوں کی قبور اگر نماز کے وقت قدموں کے نیچے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں (جیسا کہ حطیم میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا مرقد ہے اور وہاں نماز پڑھی جاتی ہے۔ حاشیہ) پھر لکھا کہ اگر باوجود اس کے بھی مقابر میں نماز پڑھی جائے گی خواہ قبور صالحین کی ہوں یا دوسری، تو نماز کراہت تحریمی کے ساتھ ہوگی (لامع الدراری ص ۱۶۵ ج ۱) اس آخری مسئلہ میں تامل ہے، کیونکہ جامع صغیر سے حضرت علامہ کشمیریؒ نے نقل کیا تھا کہ اگر قبر اور مصلی کے درمیان سترہ ہو تو نماز بلاکراہت درست ہے اور اگر قبر کے سامنے نہ ہو بلکہ جوانب میں ہو تب بھی نماز میں کراہت نہ ہوگی، ممکن ہے حضرتؒ نے بلاسترہ والی نماز مراد لی ہو۔

علامہ نوویؒ نے فرمایا کہ علماء نے کہا کہ حضور اکرم علیہ کی ممانعت کا مقصد یہ ہے کہ کہیں تعظیم میں مبالغہ کی صورت نہ بن جائے اور لوگ عقیدہ ضعیف کر کے فتنہ میں نہ پڑ جائیں کہ پھر یہی چیز کفر وشرک تک پہنچا سکتی ہے، جیسا کہ پہلی امتوں میں ہو چکا ہے اور اسی لئے جب صحابۂ کرام نے مسجد نبوی میں توسیع کی ضرورت محسوس کی تو قبر نبوی کو بڑی بڑی دیواروں کے ساتھ گھیر دیا تاکہ قبر مبارک ظاہر نہ رہے ورنہ عوام وجہال اسی کی طرف نماز پڑھنے لگتے، محقق امت علامہ ابن عبدالبر نے فرمایا کہ ممانعت نبوی کا مقصد قبور انبیاء پر سجود سے روکنا ہے اور بعض کے نزدیک قبلہ بنانے سے روکنا ہے کہ اس کی طرف نماز نہ پڑھیں، علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا کہ سبب لعنت یا تو یہ ہے کہ یہود قبور انبیاء پر تعظیمی سجدہ کرتے تھے، جو شرک جلی تھا یا یہ تھا کہ وہ خدا کی نماز بھی مقابر انبیاء ہی میں ان کی قبور کی طرف توجہ کر کے پڑھتے تھے کہ عبادت خدا کی اور تعظیم مفرط انبیاء کی دونوں ایک ساتھ انجام دیں جو شرک خفی تھا، کیونکہ اس میں مخلوق کی تعظیم حدود واذن خداوندی سے متجاوز ہوگئی تھی اس کو ہمارے ائمہ میں سے بعض شارحین نے ذکر کیا ہے (اوجز ص ۲۱۰ ج ۲) ہم نے زیادہ تفصیل یہاں اس لئے دیدی ہے کہ اکابر کے سب اقوال کی روشنی میں وجوہ ممانعت اچھی طرح واضح ہو جائیں اور پھر جو کچھ افراط وتفریط پہلے لوگوں سے ہوگئی ہے وہ بھی سمجھ لی جائے اور خاص طور سے یہ بات بھی ذہن نشین ہو جائے کہ ہر تعظیم غیر اللہ کو شرک قرار دیدینا بھی کوئی دینی وعلمی خدمت نہیں ہے، اب حال یہ ہے کہ ایک طرف تو ہر تعظیم شرک سے کم نہیں اور دوسری طرف وہ تعظیم بھی جائز مطلق جو حدود مالم یأذن به الله میں داخل ہے، چونکہ ہمارے بعض اکابر متاخرین سے بھی کہیں بے جا تساہل اور کہیں بے جا تشدد ہوگیا ہے اوران کی وجہ سے نزاعات کی خلیج بہت بڑھی ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ متقدمین کے فیصلوں کو نظر انداز کرنے کی روش ختم ہو اور اتحاد کلمہ کے لئے راہیں ہموار ہوں۔ واللہ المیسر۔

مقصد نبوی: حضور اکرم علیہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ میری قبر پر میلہ کی طرح اجتماع نہ ہو اور نہ میری قبر کی اتنی زیادہ تعظیم کی جائے کہ یہود ونصاریٰ اور بت پرستوں کے مشابہ ہو جائے جس کو صحابہ کرام نے یحذر ما صنعوا سے تعبیر فرمایا ہے کیونکہ غایت تعظیم کا درجہ ہی عبادت ہے، جو غیر اللہ کے لئے جائز نہیں، لیکن اس درجہ سے نازل جتنے بھی درجات ہیں وہ سب درجہ بدرجہ شعائر اللہ انبیاء عظام واولیاء کرام اور

مقامات مقدسہ کے لئے نہ صرف جائز بلکہ واجب و مستحب بھی ہیں، اس کے خلاف جو بھی فیصلہ کرے وہ افراط و تفریط میں مبتلا ہے۔

مسجد بجوار صالحین

یہاں یہ مسئلہ بھی لائق ذکر ہے کہ مقابر کے اندر یا قبور صالحین کے پاس مسجد بنانا کیسا ہے؟ نجدی حضرات نے تو حرمین شریفین کے پختہ مزارات صحابہ و تابعین کا انہدام کیا تھا تو جن مزارات کے ساتھ مساجد تھیں وہ بھی منہدم کرادی تھیں، حالانکہ اکابر اہل سنت نے اگر چہ مزارات پختہ بنانے کو ناجائز قرار دیا مگر جو بن گئے تھے ان کا انہدام بھی کبھی پسند نہیں کیا تھا، کیونکہ اس سے بھی مقبورین کی توہین ہوتی ہے، اور اس اہانت سے بچنا چاہئے تھا تاہم انہدام مساجد کی تو کوئی بھی شرعی معقولیت نہ تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علماء وعوام نے ان مساجد کو مقابر کی مساجد قرار دیا، حافظ نے لکھا کہ امام احمد و اہل ظاہر مقبرہ میں نماز کو ناجائز فرماتے ہیں کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ مقبرہ حمام نماز کی جگہ نہیں ہے، امام احمد وغیرہ نے اس کے ظاہر پر عمل کیا اور دوسرے اس کی علت نکال کر اس پر مدار رکھتے ہیں، مثلاً امام شافعیؒ نے فرمایا کہ مقبرے میں اگر قبریں ٹوٹی پھوٹی یا ادھڑی پڑی ہوں اور مقبورین کے لحم و شحم خون و پیپ وہاں کی مٹی میں مل گیا ہو تو ایسے مقبرہ میں نماز نہ پڑھی جائے اور اگر پاک صاف جگہ ہو تو نماز جائز بلا کراہت ہے، امام مالک بھی مقبرے میں نماز بلا کراہت جائز فرماتے ہیں، امام ابوحنیفہ، ثوری واوزاعی کراہت کے قائل ہیں، بوجہ نجاست وغیرہ۔

علامہ بیضاوی نے لکھا کہ یہود و نصاریٰ قبور انبیاء علیہم السلام کو سجدہ تعظیمی کرتے اور ان کو قبلہ بناتے تھے کہ نماز بھی ان ہی کی طرف کو پڑھتے تھے، اس لئے ان پر لعنت کی گئی لیکن اگر کسی صالح کے قرب میں محض برکت کے خیال سے مسجد بنائی جائے تو وعید میں داخل نہ ہوگی، غرض ممانعت صرف اس ڈر سے ہے کہ قبر کو وثن و بت نہ بنالیا جائے، لیکن اس سے امن و اطمینان ہو تو کوئی ممانعت نہ ہوگی، البتہ بعض لوگوں نے سد ذرائع کے طور پر روکا ہے تو یہ بھی معقول وجہ ہے (فتح الباری بحوالہ فتح الملہم ص ۱۲۱ ج ۲) علامہ ابن حزم نے پانچ صحابہ سے **ممانعت صلوٰۃ عند القبر** نقل کی ہے اور پھر یہ بھی دعویٰ کیا کہ اس کے خلاف کسی صحابی سے ثابت نہیں ہے، حالانکہ علامہ خطابی نے معالم السنن میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے رخصت **صلوٰۃ فی المقبرہ** نقل کی ہے اور حسن بصری نے بھی مقبرہ میں نماز پڑھی ہے (فتح الملہم ص ۱۲۱ ج ۲) حضرت ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے حضرت نافع سے پوچھا کہ ابن عمر وسط قبور میں نماز کو مکروہ سمجھتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ ہم نے خود حضرت عائشہ و حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما کی نماز جنازہ بقیع کے قبرستان میں پڑھی ہے، حضرت ابوہریرہ امام تھے اور مقتدی حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ تھے (اوجز ص ۲۱۱ ج ۲ از سنن بیہقی ص ۴۳۵ ج ۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علامہ طیبیؒ نے فرمایا جو شخص کسی صالح کے جوار میں مسجد بنائے اس طرح کہ اس کی قبر مسجد سے باہر رہے اور مقصد اس کے قرب سے برکت حاصل کرنا ہو، اس کی تعظیم یا اس کی طرف رخ کرنا نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس سے نفع کی بھی امید ہے۔ (فیض الباری ص ۴۲ ج ۲)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جس طرح دہلی میں حضرت خواجہ باقی باللہ کے مقبرہ میں مسجد ہے یا حضرت شاہ ولی اللہؒ کے قبور سے متصل مسجد ہے یا سرہند شریف و دیگر مقامات میں اولیاء عظام کے قرب میں مساجد بنی ہوئی ہیں وہ سب جواز بلا کراہت کے تحت ہیں اور ان کے اندر نماز بھی بلا کراہت جائز ہے۔

کیونکہ جامع صغیر کے حوالہ سے سترہ کے ساتھ نماز میں عندالحنفیہ کسی قسم کی بھی کراہت نہیں ہے چونکہ ایک زمانہ میں علامہ ابن تیمیہ وغیرہ کے تشددات کا اثر دور دور تک پھیلا تھا، تو خیال ہوتا ہے کہ اس کے اثرات ہندوستان میں بھی آئے تھے، اور بعض مسائل میں ہمارے

اکابر کا تشدد بھی شاید اسی کے تحت ہوا ہو، چنانچہ یہ بھی نقل ہوا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جو مسجد شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے مزار پر بنوائی ہے، اس کو شاہ اسحٰق صاحب اچھا نہ جانتے تھے، کیونکہ وہ فرماتے تھے کہ قبرستان میں مسجد نہیں بنوانا چاہئے اور استدلال میں یہی بخاری والی حدیث پیش کرتے تھے جس کی یہ تشریح چل رہی ہے اور اسی لئے شاہ اسحٰق صاحب اس مسجد میں کبھی نماز نہ پڑھتے الا نادراً ایک مرتبہ قبروں پر مسجد بنانے کے متعلق کسی نے آپ سے پوچھا تو فرمایا کہ نہ چاہئے، اس نے کہا کہ پھر آپ کے نانا نے کیوں بنوائی ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ ان سے پوچھو، میرا مسلک یہی ہے (ارواح ثلاثہ ص ۹۰)

ایسا ہی ایک واقعہ ص ۳۳ پر بھی ہے وغیرہ جس سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مسلک میں توسع اور شاہ اسحٰق صاحب کے مزاج میں تشدد ثابت ہوتا ہے اور حضرت شاہ اسماعیل صاحبؒ کے مزاج میں بھی غیر معمولی تشدد تھا، حضرت شاہ اسحٰقؒ نے ''اربعین'' ''مأتہ مسائل'' میں بھی شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے خلاف رائے و تشدد مسئلہ استمداد قبور وغیرہ میں اختیار کیا ہے اور ہمارے حضرت علامہ کشمیریؒ کی رائے میں توسع اور عدم تشدد ان کے رسالہ ''تحلیل الذبائح فی حریم الضرائح'' سے ثابت ہے جو کشمیر سے شائع ہوا تھا اور احقر کے پاس ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جن مسائل میں حنفی مسلک پر گنجائش نکل سکتی ہو، ان میں تشدد مناسب نہیں اور اس بارے میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا اعتدال ہمارے لئے اسوہ بنے تو اچھا ہے۔ **واللہ المسؤل ان یوفقنا لما یحب یرضاہ**۔

ہمارے حضرت علامہ کشمیریؒ بھی بہ نسبت تشدد کے سہولت و توسع کو زیادہ پسند فرماتے تھے، ایک دفعہ امکان کذب کے بارے میں فرمایا کہ تعبیر اچھی نہیں، لوگ متوحش ہوں گے اور عوام اردو دان کیا سمجھیں گے کہ امکان ذاتی کیا ہے اور امتناع بالغیر کیا وہ تو یہی سمجھیں گے کہ خدا بھی ہماری طرح جھوٹ بول سکتا ہے اور اپنا عقیدہ خراب کرلیں گے، کچھ ایسا ہی حال مسئلہ امکان نظیر اور علم غیب کلی و جزئی وغیرہ کا بھی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قولہ اربعا و عشرین لیلۃ: -حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا اس بات سے ثابت ہوا کہ دیہات میں جمعہ جائز نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے پہلا جمعہ بنی سالم (مدینہ منورہ) میں ادا فرمایا ہے، جس کو سب ہی مانتے ہیں، حالانکہ جمعہ مکہ معظمہ میں فرض ہو چکا تھا، تو اگر جمعہ دیہات میں ہوسکتا تو آپ قبا کے ۲۴ روزہ قیام میں ضرور ادا فرماتے۔ (لامع ص ۱۶۵) حاشیہ لامع ص ۸ ج ۲ میں ہے کہ حافظ ابن قیم[1] نے جو صرف چار روز قیام کی بات لکھی وہ روایات بخاری کے خلاف ہے، کیونکہ بخاری میں **باب مقدم النبی** ﷺ مدینہ میں صرف ایک دوسری روایت ۱۴ رات کی ہے اور حافظ نے اس کی تصویب بھی کی ہے، پھر حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے فرمایا کہ میرے نزدیک اوفق بالروایات ۲۴ والی ہے کیونکہ اکثر روایات کی رو سے حضور علیہ السلام پیر کے دن قبا میں داخل ہوئے تھے اور جمعہ کے روز وہاں سے کوچ فرمایا، اس صورت میں دخول و خروج کا دن نکال دیں تو ۲۴ دن ہی بیٹھتے ہیں اور ۱۴ والی کسی طرح بھی ٹھیک نہیں ہوتی (الابواب والتراجم ص ۲۱۴ ج ۲) حافظ ابن حجر اور حضرت شاہ صاحبؒ نے ۱۴ والی روایت کی تصویب کی ہے شاید اس لئے کہ مسلم میں بھی ۱۴ کی روایت ہے (شرح المواہب ص ۳۵۲ ج ۱)

دوسری بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ خوارزمی سے دخول قبا کا دن جمعرات کا منقول ہے، لہٰذا دخول و خروج کے دو دن نکال کر ۱۴ یوم قیام کی بات بھی درست ہوگی بلکہ نقل مذکور پر ۲۴ یوم کی صورت مرجوح ہو جاتی ہے اور ممکن ہے کہ حافظ ابن حجر اور شاہ صاحب نے اس سبب سے بھی ۱۴

---

[1] زادالمعاد میں ۱۴ دن لکھے ہیں، پھر معلوم نہیں علامہ ابن قیم کی طرف چار دن کی بات کیوں منسوب ہوگئی، سیرۃ النبی ص ۲۷۵ ج ۱ میں تمام مورخین و ارباب سیر کی طرف چار دن کا قول منسوب کیا ہے، بظاہر یہ عمومی دعویٰ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ محقق مورخ ابن جریر طبری نے ذکر کیا کہ حضرت علیؓ حضور علیہ السلام کے بعد تین روز تک مکہ معظمہ میں ٹھہرے، پھر پیدل چل کر قبا پہنچے اور حضور علیہ السلام سے قبا ہی میں مل گئے اور حضرت اسماءؓ بھی آپ کی موجودگی قبا کے دوران مکہ معظمہ سے روانہ ہوکر قبا پہنچ گئیں، بظاہر حضرت زبیرؓ نے مکہ معظمہ پہنچ کران کو مدینہ منورہ کے لئے روانہ کیا ہوگا (جو حضور علیہ السلام سے شام سے واپسی میں ملے تھے) اور کچھ وقت ان کو مکہ معظمہ پہنچنے میں بھی لگا ہوگا پھر یہ سب ۳، ۴ روز میں کیونکر ممکن تھا؟ اور شرح مواہب میں بھی جو سیرت کی اہم ترین کتاب ہے ۱۴ رات کا قیام قبا کا ذکر ہے، پھر اگر کسی تاریخ یا سیرت کی کتاب میں چار کا قول بھی دوسرے اقوال کے ساتھ نقل ہوا ہے تو یہ کہہ دینا کیا مناسب ہے کہ تمام مورخین اور ارباب سیر نے چار دن لکھے ہیں۔

کی تصویب کی ہو۔ واللہ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ حضور علیہ السلام سیدھے مدینہ میں داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ اوپر کے حصے سے قبا کی طرف سے داخل ہوئے تھے اور دخول اعلی المدینہ (قبا) کی صواب تر تاریخ ۸ ربیع الاول ۱ھ ہے جو ۲۴ جون ۶۲۲ء روز جمعرات کے مطابق ہوتی ہے۔

اس طرح مکمل ۱۴ روز قیام کے بعد جمعہ ۲۳ ربیع الاول ۱ھ، جولائی ۶۲۲ء کو شہر مدینہ منورہ میں داخلہ صحیح ہوتا ہے، دخول قبا والا دن جمعرات اور دخول مدینہ طیبہ کا دن جمعہ حساب میں نہ لگے گا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ذکی الدین مصری ہیئت جدید وقدیم کا ماہر تھا، اس نے فرانسیسی میں کتاب لکھی ہے جس میں شمسی تاریخوں کو قمری کے مطابق کیا ہے اور حضور علیہ السلام کے زمانہ کے کسوف کو بھی متعین کیا ہے اس کتاب کا عربی ترجمہ "افادۃ الافہام" کے نام سے ہوا ہے اور اچھی کتاب ہے۔

حضرتؒ نے اس ضمن میں یہ بھی فرمایا کہ میں صرف حرمین میں رہا ہوں، مصر نہیں گیا، فصیح عربی بولنے میں علماء حرمین کو میرے ساتھ تکلف ہوتا تھا، البتہ بغداد کے ایک عالم اور صاحب رسالہ حمید یہ کہ وہ میرے ساتھ ایک ماہ رہے مگر وہ بھی بعض اوقات تکلف سے اور سوچ سوچ کر میری باتوں کا جواب دیتے تھے، احقر عرض کرتا ہے کہ حرمین مصر وغیرہ کے علماء کا حال ہمارے زمانہ قیام حرمین ومصر میں بھی ایسا ہی تھا، کیونکہ وہ لوگ گفتگو میں وارجہ زبان کے عادی ہو گئے ہیں، اس لئے فصیح زبان میں ان کو تکلف ہوتا ہے، تاہم لکھنے کی زبان ان لوگوں کی بہت اعلیٰ ہے، دوسری وجہ حضرتؒ کے ساتھ تکلف کی یہ بھی ہوگی کہ حضرتؒ بحر العلوم تھے، ان کا ساتھ علماء عصر نہ دے سکتے تھے اور حضرت کے آخری جملہ سے بھی یہی بات نکلتی ہے، نیز معلوم ہوا کہ حیات انور ص ۲۲۴ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کے مضمون میں جو یہ چھپ گیا ہے کہ حضرتؒ مصر گئے تھے، وہ غلط ہے، کاش! وہ مصر، ترکی اور شام وعراق گئے ہوتے اور علامہ کوثری ایسے علماء عصر سے ملتے تو بات ہی کچھ اور ہوتی اور دنیائے علم میں انقلاب عظیم آجاتا۔ واللہ غالب علی امرہ۔

افادۂ علمیہ مہمہ: قولہ وھو یقول اللّٰھم لا خیر الاخیر الآخرۃ پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- اخفش (امام نحو) کی رائے ہے کہ رجز بحور اشعار میں سے نہیں ہے، دوسرے علماء نحو اسی میں سے مانتے ہیں مگر میرے نزدیک اخفش کی رائے دقیق وقوی ہے، رجز اردو کے فقرہ بندی وتک بندی کی طرح ہے اور شعر ورجز کو مقابل سمجھا جاتا تھا، چنانچہ تبابع یمن کے ہاں راجز بھی ہوتے تھے اور شاعر بھی اور تمام شعراء کے بعد راجز سناتا تھا، لہٰذا رجز شعر کے علاوہ ہے پھر جو لوگ رجز کو شعر میں داخل مانتے ہیں وہ بھی اس میں قصد وارادہ کو ضروری سمجھتے کہتے ہیں، تو حضور اکرم ﷺ سے انشاء شعر تو کسی طرح ثابت نہیں ہے یعنی آپ نے خود شاعری نہیں کی، نہ کوئی شعر کبھی کہا کیونکہ آپ کی شان گرامی کے لئے مناسب وموزوں نہ تھا، البتہ دوسروں کے اشعار یا رجز پڑھے ہیں اور اشعار پڑھنے میں بھی جان بوجھ کر وزن توڑ دیتے تھے جن پر حضرت ابوبکر صدیقؓ فرما بھی دیا کرتے تھے کہ حضرت! اس طرح نہیں ہے، اور آپ جواب میں فرما دیتے تھے کہ میں شاعر نہیں ہوں؛ آپ سے یہ شعر بھی پڑھنا ثابت ہے، جس کے اسناد میں ائمہ نحو ہیں۔

تفاءل بما تھویٰ یکن فلقلما یقال لشیء کانا لا تحقق

اصل شعر میں تحققا الف کے ساتھ تھا جس کو آپ نے توڑ دیا۔ العرف الشذی اور فیض الباری میں تحققا چھپا ہے جو غلط[1] ہے کیونکہ سنن

---

[1] "العرف الشذی" حضرت شاہ صاحبؒ کے درس ترمذی دیوبند کی یادگار ہے، جو ایک طالب علم نے قلمبند کی تھی، اس میں سینکڑوں غلطیاں ضبط وکتابت وطباعت کی ہیں اور حضرتؒ اس سے خوش نہ تھے، مجلس علمی ڈابھیل کے زمانہ میں حضرتؒ کی زندگی میں کئی بار امالی درس بخاری شریف کی اشاعت کے لئے بھی تحریک ہوئی مگر حضرتؒ مطمئن نہ ہوئے پھر وفات کے بعد راقم الحروف نے حضرت مولانا محمد بدر عالم میرٹھی ثم مدنیؒ سے یہ کام کرایا جس کو نصب الرایہ کے ساتھ ہی فیض الباری کے نام سے مصر میں ہم لوگوں نے طبع کرا دیا تھا وہاں نصب الرایہ کے مسودات پر نظر ثانی اور تصحیح وپروف کا کام احقر کے سپرد تھا اور فیض الباری کا رفیق محترم

بیہقی ص ۴۳ج ۷ میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا حضور علیہ السلام نے کبھی پورا شعر نہیں پڑھا، مگر ایک، اور پھر یہی مذکورہ بالا شعر ذکر کیا، اس کے بعد امام بیہقی نے فرمایا کہ رجز پڑھنے کا ثبوت حضور علیہ السلام سے ضرور ہوا ہے اور پھر سندوں کے ساتھ آپ کے پڑھے ہوئے بہت سے رجزوں کا ذکر کیا، پھر یہ اختلاف ہے کہ قرآن مجید سے شعر میں اقتباس جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً

ایها الناس اتقوا ربکم-زلزلة الساعة شیء عظیم-ومن یتق الله یجعل له-و یرزقه من حیث لا یحتسب

یہاں ایک ایک لفظ کم کر کے شعر بنا دیا ہے، اس طرح شافعیہ کے یہاں جائز ہے، مگر ہمارے یہاں جائز نہیں ہے اور اس سے مجھے تو خوف ہی ہے، اگر بغیر کم کئے ہو جائے تو خیر!

باب الصلوٰة فی مرابض الغنم

(بکریوں کے باڑوں میں نماز پڑھنا)

(۴۱۴) حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا شعبة عن ابی التیاح عن انس بن مالک قال کان النبی ﷺ یصلی فی مرابض الغنم ثم سمعته بعد یقول کان یصلی فی مرابض الغنم قبل ان یبنی المسجد.

ترجمہ: حضرت ابوالتیاح کہتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ بکریوں کے باڑوں میں نماز پڑھتے تھے، پھر میں نے انہیں یہ کہتے سنا کہ نبی کریم ﷺ بکریوں کے باڑوں میں نماز مسجد کی تعمیر سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔

تشریح: عرب بکریاں اور اونٹ پالتے تھے، یہی ان کی معیشت تھی، جہاں رات کے وقت انہیں لا کر وہ باندھتے تھے ان میں ایک طرف اپنے اٹھنے بیٹھنے کی بھی جگہ بنا لیا کرتے تھے جس کی صفائی کا بھی التزام رکھتے تھے، چونکہ مساجد کی ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی اور نماز پڑھنے کے لئے اسلام میں کسی خاص جگہ کی قید نہیں تھی، اس لئے آں حضور ﷺ نے بھی اور صحابہؓ نے بھی بکریوں کے ان باڑوں میں نماز ادا فرمائی پھر یہاں کی بھی کوئی تخصیص نہیں تھی، جہاں بھی نماز کا وقت ہو جاتا آپ فوراً ادا کر لیتے، جب مسجد کی تعمیر ہو گئی تو اب عام حالات میں نماز مسجد ہی میں پڑھنا بہتر قرار پایا۔

حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری سے متعلق تھا، موصوف نے مولانا موصوف کے علم وفضل اور تالیفی محاسن کے اعتراف کے ساتھ ہی اس کی فروگذاشتوں کا بھی مقدمہ میں ذکر کر دیا تھا تا کہ العرف الشذی کی طرح حضرتؒ ماخوذ نہ ہوں، اور جتنی اصلاحات وہ کر سکے وہ کر بھی دی تھیں، لیکن افسوس ہے کہ جو لوگ مقدمہ نہیں پڑھتے وہ اب بھی غلطیوں کو حضرتؒ کی ہی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور حال ہی میں ایک مضمون بطور تبصرہ حضرت شاہ صاحبؒ کی حیات وعلمی کارناموں سے متعلق ''اسلام اور عصر جدید'' جامعہ نگر نئی دلی، (جولائی ۱۹۷۶ء) میں مولانا قاضی زین العابدین سجاد صاحب میرٹھی کا شائع ہوا ہے، اس میں ص ۱۰۹ پر آپ نے لکھا:- کہ'' آپ کے امالی میں فیض الباری جسے آپ کے ممتاز شاگرد مولانا بدر عالم میرٹھی نے آپ کی زندگی ہی میں آپ کی نظر ثانی کے بعد مرتب کیا ہے علماء وفضلا کا مرجع ہے'' ۔ دوسری جگہ ص ۱۱۲ پر لکھا:- ''فیض الباری حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر سے گذر چکی ہے اس سے زیادہ مستند مجموعہ آپ کے امالی کا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا''۔

احقر (سابق مدیر مجلس علمی ڈابھیل) نے یہ تبصرہ حیرت سے پڑھا اور محترم قاضی صاحب کو لکھا کہ ان کی یہ دونوں باتیں بے سند اور خلاف واقعہ ہیں، نہ فیض الباری حضرتؒ کی زندگی میں مرتب ہوئی تھی اور نہ حضرتؒ کی نظر ثانی سے مشرف ہو سکی، اگر ایسا ہوتا یا حضرتؒ اپنے قلم سے بخاری وترمذی پر کچھ لکھ جاتے تو حضرتؒ کے علوم سے استفادہ کرنے والوں کی انتہائی خوش نصیبی ہوتی، مگر قاضی صاحب موصوف نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ اس بے سند بات کی تردید شائع کی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہوں گے اور اس کے تسامحات وفروگذاشتوں کو بھی جو ضبط الفاظ وفہم معانی کی کمی یا حوالوں کی عدم مراجعت کی وجہ سے ہو گئی ہیں حضرتؒ کی طرف منسوب کریں گے، حالانکہ اسی سے بچانے کیلئے مولانا بنوری نے مقدمہ لکھا تھا۔

انوار الباری میں اب تک فیض الباری کے بیشتر تسامحات اور فروگذاشتوں کی اصلاح اور حوالوں کی تصحیح ہو چکی ہے، جو صاحب دونوں کو سامنے رکھ کر مقابلہ کریں گے، وہ اس کو محسوس کر لیں گے، احقر کے نزدیک اس وقت حضرتؒ کے امالی درس کے مجموعات میں سے اولویت کا شرف مولانا بنوری کی معارف السنن کو ہے، پھر انوار المحمود کو کہ اس کا کچھ حصہ حضرتؒ کے مطالعہ میں بھی آ گیا تھا اور مؤلف نے محنت بھی کافی کی تھی، ان کے بعد العرف الشذی وغیرہ ہیں، پھر بھی یہ بات حقیقت کا اظہار ہے کہ حضرتؒ کی جامعیت علوم وفنون، پورے علوم سلف وخلف کے بے نظیر وسعت مطالعہ اور آپ کی اعلیٰ تحقیق وتوفیق کا ادنیٰ ترین عکس بھی کسی امالی میں نہیں آ سکا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

باب الصلوٰة فی مواضع الابل

(اونٹوں کے رہنے کی جگہ میں نماز پڑھنا)

(۴۱۵) حدثنا صدقة بن الفضل قال حدثنا سليمان بن حيان قال حدثنا عبيد الله عن نافع قال رايت ابن عمر يصلي الیٰ بعيره وقال رايت النبی ﷺ يفعله.

ترجمہ: حضرت نافع نے کہا کہ میں نے حضرت عمرؓ کو اپنے اونٹ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے دیکھا اور حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اسی طرح پڑھتے دیکھا تھا۔

تشریح: اس باب وحدیث سے امام بخاری کو یہ بتلانا ہے کہ اونٹوں کے طویلہ میں نماز پڑھنے کی ممانعت جن احادیث میں موجود ہے وہ دوسری وجوہ سے ہے کہ بعض اونٹ شریر ہوتے ہیں، بدک جائیں تو نماز اطمینان سے پڑھنی مشکل ہو وغیرہ، ورنہ وہ اگر سدھائے ہوئے ہوں اور سواری کے ہوں جو اکثر بہت ہی زیادہ شریف مزاج ہوتے ہیں تو ان کے پاس نماز میں کوئی حرج نہیں ہے اور حدیث الباب سے یہی بات ثابت کی ہے کہ اونٹ کو سترہ بنا کر نماز پڑھی گئی ہے، اگر ان کے قرب میں فی نفسہ کوئی خرابی نماز میں آسکتی تو حضور علیہ السلام خود کیوں نماز پڑھتے، لیکن امام احمدؒ نے یہاں فقہی وقت نظر سے کام نہ لے کر ظاہری ممانعت حدیث کی وجہ سے اونٹوں کے طویلہ میں نماز کو نادرست قرار دیا ہے اور اسی کا رد امام بخاریؒ نے کیا ہے، حافظ نے یہاں لکھا کہ ممانعت والی احادیث امام بخاری کی شرط پر نہ ہوں گی، اس لئے ان کو ذکر بھی نہیں کیا، مگر میں کہتا ہوں کہ امام بخاری دوسروں کے مسلک والی احادیث روایت کرنے کا التزام ہی کب کرتے ہیں تاویل مذکور کی جائے۔ واللہ اعلم۔

باب من صلی وقدامه تنور او نار او شیء مما يعبد فارا دبه وجه الله عزو جل وقال الزهری اخبرنی انس بن مالک قال قال النبی ﷺ عرضت علی النار انا اصلی

(جس نے نماز پڑھی اور اس کے سامنے تنور، آگ یا کوئی ایسی چیز ہو جس کی عبادت کفار ومشرکین کے یہاں کی جاتی ہے اور نماز پڑھنے والے کا مقصد اس وقت صرف خدا کی عبادت ہو، زہری نے کہا کہ مجھے انس بن مالک نے خبر پہنچائی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میرے سامنے آگ (دوزخ کی) لائی گئی اور اس وقت میں نماز پڑھ رہا تھا)

(۴۱۶) حدثنا عبدالله بن مسلمة عن مالک عن زيد بن اسلم عن عطاء بن يسار عن عبدالله بن عباسؓ قال انخسفت الشمس فصلی رسول الله ﷺ ثم قال اريت النار فلم ار منظرا كاليوم قط افظع.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ سورج گہن ہوا تو نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھی اور فرمایا کہ مجھے دوزخ دکھائی گئی اور آج کے منظر سے بھیانک منظر میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ہمارے فقہاء حنفیہ اس حالت میں نماز کو مکروہ کہتے ہیں کہ جلتی ہوئی آگ یا انگارے سامنے موجود ہوں کیونکہ مجوسی ان کو پوجتے ہیں لیکن اگر چراغ وغیرہ سامنے ہو تو حرج نہیں کیونکہ مجوسی ان کو نہیں پوجتے اور ممکن ہے امام بخاری نے حنفیہ کی طرف تعریض کی ہو، لیکن ان کا استدلال "عرضت علی النار" سے نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ عالم غیب کی چیز تھی جو بحث سے خارج ہے، البتہ امام بخاری کی طرف سے یہ عذر کیا جاسکتا ہے کہ وہ چونکہ مسائل کا فیصلہ اپنے اجتہاد سے کرنا چاہتے ہیں اور احادیث کے اندر وہ متشدد ہیں تو لامحالہ اس قسم کی مناسبات بعیدہ سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہوتے ہیں، پھر یہ کہ احادیث میں مسائل فقہیہ صراحۃً کہاں مل سکتے ہیں؟

حافظ نے لکھا کہ ابن سیرین کی طرف اشارہ ہوگا، جو تنور کی طرف نماز کو مکروہ کہتے ہیں، علامہ قسطلانی نے کہا کہ حنفیہ نے تشبہ بالعبادۃ کی

وجہ سے مکروہ کہا ہے، شرح کبیر میں ہے کہ آگ کی طرف نماز پڑھنا مکروہ ہے، امام احمد نے بھی قبلہ کی جانب تنور ہوتو اس کی طرف نماز سے روکا ہے بلکہ چراغ وقندیل بھی سامنے ہوتو نماز ان کے نزدیک مکروہ ہے (حاشیہ لامع ۱۶۶ج ا والابواب والتراجم شیخ الحدیث ۲۱۵) گویا امام بخاری نے اس باب سے حنفیہ امام احمد وغیرہ سب پر تعریض کی ہے، جبکہ استدلال کمزور ہے اور کوئی صریح حدیث بھی ان کے خلاف نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

باب کراهية الصلوٰة فی المقابر

(مقبروں میں نماز پڑھنے کی کراہت)

(۴۱۷) حدثنا مسدد قال حدثنا یحییٰ عن عبید الله بن عمر قال اخبرنی نافع عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال اجعلو فی بیوتکم من صلوٰتکم ولا تتخذوها قبورا.

ترجمہ: حضرت نافع نے حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنے گھروں میں بھی نمازیں پڑھا کرو اور انہیں بالکل قبریں نہ بنالو۔

تشریح: امام بخاریؒ ترجمۃ الباب کے مطابق کوئی حدیث نہیں لائے، حافظ نے لکھا کہ امام بخاری نے گویا حدیث ترمذی وابوداؤد کی طرف اشارہ کیا، جوان کی شرط پر نہ ہوگی کہ ساری زمین نماز کی جگہ ہے سواء مقبرہ وحمام کے اور حدیث الباب کے جملہ "ولا تتخذوها قبورا" سے یہ استنباط کیا کہ قبریں محل عبادت نہیں ہیں، لہٰذا ان کے درمیان نماز مکروہ ہوگی۔

پہلے ذکر ہوا کہ امام احمد واہل ظاہر مقبرہ میں نماز کو حرام قرار دیتے ہیں، امام مالک بلا کراہت جائز اور حنفیہ کراہت کے ساتھ بلاسترہ کے اور سترہ ہوتو سامنے قبر میں بھی کراہت نہیں اور جانب قبلہ کے علاوہ قبور ہوتب بھی کراہت نہیں، پس اس باب سے بڑا رد تو امام مالک کا ہوتا ہے اور دلائل مذاہب کی تفصیل بھی گذر چکی ہے۔

افادہ انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- حدیث الباب کی شرح مختلف طور سے کی گئی ہے، ایک یہ کہ اپنی میتوں کو گھروں میں دفن نہ کرو مگر وہ یہاں مناسب نہیں کہ بیان نماز کا ہے، دفن کا نہیں ہے، دوسرے یہ کہ گھروں میں بھی نمازیں پڑھا کرو، گھروں کو مقابر کی طرح مت کرو کہ ان میں بغیر سترہ کے نماز نہیں پڑھ سکتے، ان جیسا گھروں کو مت بنادو۔

تیسرے یہ کہ گھروں کو قبور کی طرح معطل نہ کرو، کہ جیسے اہل قبور قبروں میں نماز نہیں پڑھتے تم بھی گھروں میں نہ پڑھو اس صورت میں ترجمۃ الباب سے مناسبت نہ رہے گی کیونکہ اس شرح میں مقبرہ میں جواز عدم جواز نماز کی بات نہ نکلے گی جبکہ امام بخاری نے فقہی کراہت کا ترجمہ وعنوان قائم کیا ہے، اگرچہ میرے نزدیک یہ شرح سب سے زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے، دوسرے یہ شرح میری خاص تحقیق کے بھی خلاف ہے کیونکہ میرے نزدیک قبور میں تعطل نہیں ہے، بلکہ ان میں قراءۃ قرآن مجید، نماز، اذان وغیرہ سب کچھ ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کا حج بھی ثابت ہے، شرح الصدر امام سیوطیؒ میں بھی تفصیل ہے اور اہل کشف بھی ان کے قائل ہیں، جو ہم سے زیادہ ان امور سے واقف ہوتے ہیں، لہٰذا ہم بھی ان کا انکار نہیں کر سکتے الا یہ کہ شرع میں ان کی صراحت سے انکار وارد ہوتا۔ حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ اگرچہ قبور کے اندر اصل تو تعطل ہی ہے اور مذکورہ بالا واقعات بطور مستثنیات کے ہیں، گو مستثنیات کی بھی کمی نہیں ہے، تاہم عام طور سے بھی چونکہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہاں تعطل ہے، اس لئے حدیث کا ظاہر درست ہی رہے گا۔

پھر فرمایا:- اگرچہ عالم دو ہیں (۱) عالم شہادۃ اور (۲) عالم غیب مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ (۳) شریعت عام لوگوں کے علم واحساس کو بھی واقعہ ونفس الامر کی طرح قرار دے دیتی ہے، جیسے آیت والشمس تجری لمستقر لها میں بظاہر عام ادراک واحساس کی رعایت کی

گئی ہے، پھر ہوسکتا ہے کہ نفس الامر واقعہ بھی ایسا ہی ہو یا فلک کا جریان مع اپنی جگہ ثبوت شمس کے ہو یا جیسے حدیث میں نیند کو اخ الموت کہا گیا، حالانکہ نیند میں آدمی بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے یا اموات خدا کی مشیت کے ساتھ ہماری باتیں سنتے بھی ہیں (اور حضرات انبیاء علیہم السلام تو بالاتفاق سنتے ہیں، ان کے بارے میں تو کوئی اختلاف ہے ہی نہیں)

باب الصلوٰة فی مواضع الخسف والعذاب
ویذکر ان علیاً کره الصلوٰة بخسف بابل

(عذاب کی وجہ سے دھنسی ہوئی جگہوں میں اور عذاب کے مقامات میں نماز کا حکم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے بابل کی دھنسی ہوئی جگہ میں (عذاب کی وجہ سے) نماز کو ناپسند فرمایا)

(۴۱۸) حدثنا اسمٰعیل بن عبد الله قال حدثنی مالک عن عبدالله بن دینار عن عبدالله بن عمر ان رسول الله ﷺ قال لا تدخلو علیٰ هٰؤلاء المعذبین الا ان تکونو باکین فان لم تکونو اباکین فلا تدخلو علیهم لا یصیبکم ما اصابهم.

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ان معذب قوموں کے آثار سے اگر تمہارا گذر ہو تو روتے ہوئے گذرو، اگر تم اس موقع پر رونہ سکو تو ان سے گذرو ہی نہ، ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی وہی عذاب آ جائے جس نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

تشریح: ان مقامات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، اگرچہ حدیث میں جو اس عنوان کے تحت دی گئی ہے نماز سے متعلق کوئی تصریح موجود نہیں ہے، لیکن اس میں اس بات کو بتلایا گیا ہے کہ ایک مومن کے دل میں ان مقامات سے گذرتے ہوئے کس طرح کا تاثر ہونا چاہئے، اس سے پہلے ایک حدیث گزر چکی ہے کہ ایک سفر میں جب رات کے آخری حصہ میں آں حضور ﷺ نے صحابہ کے ساتھ پڑاؤ ڈالا تو فجر کی نماز کا وقت گذر گیا اور آپ بیدار نہ ہوئے سورج نکلنے کے بعد جب آنکھ کھلی تو فوراً صحابہ سے فرمایا کہ یہاں سے نکل چلو کیونکہ یہاں شیطان کا اثر ہے اور تھوڑی دور جا کر آپ نے نماز ادا فرمائی اس لئے جن مقامات پر خدا کا عذاب نازل ہو چکا ہے وہاں بھی شیطانی اثرات ضرور ہوں گے۔

باب الصلوٰة فی البیعة وقال عمرؓ انا لا ندخل کنا ئسکم من اجل التماثیل التی فیها الصور و کان ابن عباس یصلی فی البیعة الا بیعة فیها التماثیل

(کلیسا میں نماز، حضرت عمر کلیسا میں نماز پڑھتے تھے، لیکن جن میں مجسمے رکھے ہوتے ان میں نہیں پڑھتے تھے)

(۴۱۹) حدثنا محمد بن سلام قال اخبرنا عبدة عن هشام بن عروة عن ابیه عن عائشة ان ام سلمة ذکرت لرسول الله ﷺ کنیسة راتها . رض الحبشة یقال لها ماریة فذکرت له ما رات فیها من الصور فقال رسول الله ﷺ اولٰئک قوم اذا مات فیهم العبد الصالح او الرجل الصالح بنوا علیٰ قبره مسجدا و صورو فیه تلک الصور اولٰئک شرار الخلق عند الله.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ام سلمہ نے رسول اللہ ﷺ سے ایک کلیسا کا ذکر کیا ہے جسے انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا، اسے ماریہ کہتے تھے، انہوں نے ان مجسموں کا بھی ذکر کیا جنہیں اس میں دیکھا تھا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ایسے لوگ تھے کہ اگر ان میں کوئی نیک بندہ (یا یہ فرمایا کہ) نیک شخص مرجاتا تو اس کی قبر پر مسجد بناتے اور اس میں اسی طرح کے مجسمے رکھتے یہ لوگ خدا کی بدترین مخلوق ہیں۔

تشریح: حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ کنیسہ میں نماز بلاکراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہاں تصاویر وتماثیل نہ ہوں۔ (لامع ص ۱۷۰ ج۱)

باب: (۴۲۰) حدثنا ابوالیمان قال اخبرنا شعیب عن الزھری قال اخبرنی عبید اللہ بن عتبۃ ان عائشۃ وعبداللہ بن عباس قالا لما نزل برسول اللہ ﷺ طفق یطرح خمیصۃ لہ علیٰ وجھہ فاذا اغتم بہ کشفھا عن وجھہ فقال وھو کذلک لعنۃ اللہ علی الیھود و النصاری اتخذوا قبورا انبیآئھم مساجد یحذر ما صنعوا.

(۴۲۱) حدثناء عبداللہ بن مسلمۃ عن مالک عن ابن شھاب عن سعید بن المسیب عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال قاتل اللہ الیھود واتخذوا قبور انبیاء ھم مساجد.

ترجمہ ۴۲۰: حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ مرض الوفات میں اپنی چادر کو بار بار چہرے پر ڈالتے تھے جب گھبراہٹ ہوتی یا دم گھٹتا تو چادر ہٹا دیتے آپ نے اس اضطراب و پریشانی کی حالت میں فرمایا خدا کی یہود ونصاریٰ پر لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں پر مسجدیں بنائیں یہود ونصاریٰ کی بدعات سے آپ لوگوں کو ڈرا رہے تھے۔

ترجمہ ۴۲۱: حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہودیوں پر خدا کی لعنت ہو انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنالی ہیں۔

تشریح: آپ نے اپنے مرض الوفات میں خاص طور سے یہود ونصاریٰ کی اس بدعت کا ذکر کیا اور ان پر لعنت بھیجی کیونکہ آپ بھی نبی تھے اور سابق میں انبیاء وصالحین کے ساتھ ایک معاملہ گزر چکا تھا، اس لئے آپ چاہتے تھے کہ اپنی امت کو اس بات پر خاص طور سے متنبہ کردیں۔

باب قول النبی ﷺ جعلت لی الارض مسجدا و طھوراً

(نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے کہ مجھے روئے زمین کے ہر حصہ پر نماز پڑھنے اور پاکی حاصل کرنے کی اجازت ہے)

(۴۲۲) حدثنا محمدبن سنان قال حدثنا ھشیم قال حدثنا سیار ھو ابو الحکم قال حدثنا یزید الفقیر قال حدثنا جابر بن عبداللہ قال قال رسول اللہ ﷺ اعطیت خمساً .... لم یعطھن احد من الانبیاء قبلی نصرت بالرعب مسیرۃ شھرو جعلت لی الارض مسجد و طھورا و ایمارجل من امتی ادرکتہ الصلوٰۃ فلیصل واحلت لی الغنائم و کان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ و بعثت الی الناس کافۃ و اعطیت الشفاعۃ.

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے انبیاء کو نہیں دی گئی تھیں، میرا رعب ایک مہینہ کی مسافت تک دشمنوں پر پڑتا ہے اور میرے لئے تمام زمین میں نماز پڑھنے اور پاکی حاصل کرنے کی اجازت ہے، اس لئے میری امت کے جس فرد کی نماز کا وقت (جہاں بھی) آجائے اسے وہیں نماز پڑھ لینی چاہئے اور میرے لئے غنیمت حلال کی گئی ہے، پہلے انبیاء اپنی خاص قوموں کی ہدایت کے لئے بھیجے جاتے تھے لیکن مجھے دنیا کے تمام انسانوں کی (قیامت تک) ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے اور مجھے شفاعت عطا کی گئی ہے۔

تشریح: حافظ نے لکھا کہ شاید امام بخاری اس باب اور حدیث سے اس امر کی طرف اشارہ کر گئے کہ سابقہ ابواب میں کراہت تحریم کے لئے نہ تھی کیونکہ تمام زمین کو مسجد فرما دیا گیا۔ (فتح الباری ص ۳۵۹ ج۱)

باب نوم المراة فی المسجد

(عورت کا مسجد میں سونا)

(۴۲۳) حدثنا عبید بن اسمٰعیل قال حدثنا ابو اسامة عن هشام عن ابیه عن عائشة ان ولیدة کانت سوداء لحی من العرب فاعتقوها فکانت معهم قالت فخرجت صبیة لهم علیها و شاح احمر من سیور قالت فوضعته او وقع منها فمرت به حدیاة وهو ملقی فحسبته لحما فخطفته قالت فالتمسوه فلم یجدوه قالت فاتهمونی به قالت فطفقوا یفتشونی حتیٰ فتشوا قبلها قالت والله انی لقائمة معهم اذ مرت الحدیاة فالقته قالت فوقع بینهم قالت فقلت هذا الذی اتهمتمونی به زعمتم وانا منه بریئة وهو ذا هو قالت وجاءت الی رسول الله ﷺ فاسلمت قالت عائشة فکانت لها خبا فی المسجد او حفش قالت فکانت تاتینی فتحدث عندی قالت فلا تجلس عندی مجلسا الا قالت. ویوم الوشاح من تعاجیب ربنا الا انه من بلدة الکفر انجانی. قالت عائشة فقلت لها ماشانک لا تقعدین معی مقعدا الا قلت هذا قالت فحدثتنی بهذا الحدیث.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ عرب کے کسی قبیلہ کی کسی کالے یا سانولے رنگ کی باندی تھی، انہوں نے اسے آزاد کر دیا اور وہ ان ہی کے ساتھ رہتی تھی، اس نے بیان کیا کہ ان کی ایک لڑکی کہیں باہر گئی وہ تسمے کا سرخ جڑاؤ پہنے ہوئے تھی اس باندی نے بتایا کہ یا تو لڑکی نے اسے خود کہیں چھوڑ دیا تھا یا اس سے گر گیا تھا پھر اس طرف سے ایک چیل گزری وہ سرخ جڑاؤ پڑا ہوا تھا، چیل اسے گوشت سمجھ کر جھپٹ لے گئے بعد میں قبیلہ والوں نے اسے بہت تلاش کیا لیکن ملتا کہاں سے ان لوگوں نے اس کی تہمت مجھ پر لگا دی اور میری تلاشی لینی شروع کر دی، انہوں نے اس کی شرم گاہ تک کی تلاشی لی اس نے بیان کیا کہ واللہ میں ان کے ساتھ اسی حالت میں کھڑی تھی کہ وہی چیل آئی اور اس نے ان کا زیور گرا دیا وہ ان کے سامنے ہی گرا، میں نے (اسے دیکھ کر) کہا یہی تو تھا جس کی تم مجھ پر تہمت لگاتے تھے، تم لوگوں نے مجھ پر اس کا الزام لگایا تھا حالانکہ میں اس سے بری تھی، یہی تو وہ زیور ہے، اس نے کہا کہ اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اسلام لائی حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ اس کے لئے مسجد نبوی میں ایک خیمہ لگا دیا گیا (یا یہ کہا کہ) چھوٹا سا خیمہ لگا دیا گیا، حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ وہ باندی میرے پاس آتی تھی اور مجھ سے باتیں کرتی تھی، جب بھی وہ میرے پاس آتی تو یہ ضرور کہتی، جڑاؤ کا دن ہمارے رب کی عجیب نشانیوں میں سے ایک ہے، اسی نے مجھے کفر کے شہر سے نجات دی، حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ میں نے اس سے کہا، آخر بات کیا ہے، جب بھی تم میرے پاس بیٹھتی ہو یہ بات ضرور کہتی ہو، آپ نے بیان کیا کہ پھر اس نے مجھے یہ واقعہ سنایا۔

تشریح: یہ ایک خاص واقعہ ہے اور زیادہ سے زیادہ رخصت کے درجہ میں، اس سے کوئی مسئلہ اخذ کیا جا سکتا ہے کیونکہ سوتے وقت مسجد کا جو واقعی احترام ہے وہ قائم نہیں رکھا جا سکتا حضرت عمرؓ کے عہد میں دو اجنبی بلند آواز سے گفتگو کر رہے تھے، آپ نے جب سنا تو انہیں بلا کر فرمایا کہ اگر تم مدینہ کے باشندے ہوتے تو میں تمہیں اس کی سزا دیئے بغیر نہ رہتا نبی کریم ﷺ کی مسجد میں اس طرح بلند آواز سے گفتگو کرتے ہو! جب مسجد کی حرمت وعزت اس درجہ ملحوظ ہے تو عام حالات میں سونے کی اجازت کس طرح دی جا سکتی ہے اور وہ بھی عورتوں کے لئے؟ حنفیہ کے یہاں مسافروں کا اس سے استثناء ہے ورنہ مردوں کے لئے بھی مسجد میں سونا عام حالات میں ان کے نزدیک مکروہ ہے غالباً اس نومسلم لونڈی کا خیمہ مسجد نبوی کے شمالی حصہ میں لگوایا گیا ہوگا، جو تحویل قبلہ کے بعد سے فقہی لحاظ سے داخل مسجد بھی نہ رہا تھا اور اس کا ایک حصہ اصحاب

صفہ کے لئے بھی تھا تو ایسے واقعات کو احکام مسجد ثابت کرنے کے لئے لانا ہی کیا ضروری تھا، دوسرے بقول حضرت شاہ صاحبؒ امام بخاری نے ایسے خاص ووقتی واقعات بجائے رخصت کے درجہ میں رکھنے کے عزیمت کے درجہ میں پہنچادیا، اور یہ فقہ البخاری ہے کہ جن امور کا احتمال اور نظر انداز کرنا مناسب تھا ان کو وسعت دے کر عمل کے لئے پیش کررہے ہیں جس کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ کم فہم لوگ ان امور کو بھی سنت سمجھ کر عمل کرنے لگیں گے، مثلاً امام بخاری ایک باب لائیں گے ص ۶۶ پر ادخال البعیر فی المسجد اور ص ۶۷ پر لائیں گے باب رفع الصوت فی المسجد تو بعض مسجد تو بعض لوگوں نے سنت سمجھ کر مسجد حرام میں بیت اللہ کا طواف اونٹ پر کیا تھا اور کہتے ہیں کہ مسجد نبوی میں گھوڑے بھی باندھے گئے اور ہاون دستہ بھی کوٹا اور کھڑ کھڑایا گیا تھا اور ہمارے سلفی بھائی بھی کہا کرتے ہیں کہ یہاں کیا رکھا ہے (یعنی مسجد نبوی یا مزار اقدس میں) اور مواجہ مقدسہ میں بیٹھنے کو برا سمجھتے ہیں اور اپنے زعم میں ان امور کو خالص توحید کے عقیدہ سے منافی سمجھتے ہیں، کیونکہ ایک واقعہ جزئیہ امام بخاری نے رفع الصوت فی المسجد کے جواز کا پیش کردیا تھا اگرچہ دوسرا واقعہ حضرت عمرؓ کی ممانعت کا بھی روایت کردیا ہے یہ سب افراط وتفریط ہے۔ واللہ اعلم۔

باب نوم الرجال فی المسجد وقال ابو قلابة عن انس بن مالک قدم رهط من عکل علی النبی ﷺ و کانو فی الصفة وقال عبدالرحمن بن ابی بکر کان اصحاب الصفة الفقرآء

(مسجد میں مردوں کا سونا) اور ابوقلابہ نے حضرت انس بن مالکؓ سے نقل کیا ہے کہ عکل کے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے اور صفہ میں ٹھہرے، عبدالرحمٰن ابن ابی بکر نے فرمایا کہ صفہ میں رہنے والے اصحاب فقراء تھے)

(۴۲۴) حدثنا مسدد قال حدثنا یحییٰ عن عبید الله قال حدثنی نافع قال اخبرنی عبد الله بن عمر انه کان ینام وهو شآب اعزب لا اهل له فی مسجد النبی ﷺ.

(۴۲۵) حدثنا قتیبة بن سعید قال حدثنا عبدالعزیز بن ابی حازم عن ابی حازم عن سهل بن سعد قال جآء رسول الله ﷺ بیت فاطمة فلم یجد علیا فی البیت فقال این ابن عمک کان بینی و بینه شیء فغاضبنی نخرج فلم یقل عندی فقال رسول الله ﷺ لانسان انظر این هو فجاء فقال یا رسول الله هو فی المسجد را قد فجاء رسول الله ﷺ وهو مضطجع قد سقط ردآه عن شقه و اصابه تراب فجعل رسول الله ﷺ یمسحه عند و یقول قم ابا تراب قم ابا تراب.

ترجمہ: حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ وہ اپنی جوانی کے زمانے میں جب بیوی بچے نہیں تھے نبی کریم ﷺ کی مسجد میں سوتے تھے۔

تشریح: صفہ مسجد نبوی میں ایک طرف سایہ دار جگہ تھی جہاں فقراء ومساکین رہا کرتے تھے، حضرت ابن عمرؓ نے اپنی جوانی کا جو واقعہ بیان کیا ہے اسے مسجد میں سونے کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ حضرت ابن عمر اس دور میں مدینہ میں بے وطن تھے نہ گھر تھا نہ بار اس لئے آپ مسجد میں سوتے تھے، حضرت ابن عمرؓ نے خود فرمایا کہ میں نے چاہا کہ ایک جھونپڑی ڈال لوں مگر افسوس کے مخلوق خدا میں سے کسی نے میری مدد نہ کی، لہٰذا وہ تو مسافر سے بھی زیادہ مسجد میں اقامت کے مستحق تھے اور مسافر کے لئے اجازت ہے۔

ترجمہ: ہم سے قتیبہ بن سعید نے بیان کیا کہا کہ ہم سے عبدالعزیز بن ابی حازم نے بیان کیا حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے دیکھا کہ حضرت علیؓ گھر میں موجود نہیں ہیں اس لئے آپ نے حضرت فاطمہؓ سے دریافت کیا کہ تمہارے چچا کے لڑکے کہاں ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ میرے اور ان کے درمیان کچھ ناگواری پیش آگئی اور وہ مجھ پر خفا ہو کر کہیں

باہر چلے گئے ہیں اور میرے یہاں قیلولہ بھی نہیں کیا، اس کے بعد رسول اللہ علیہ نے ایک شخص سے کہا کہ علیؓ کو تلاش کریں کہ وہ کہاں ہیں وہ آئے اور بتایا کہ مسجد میں سوئے ہوئے ہیں پھر نبی کریم علیہ تشریف لائے، حضرت علیؓ لیٹے ہوئے تھے، چادر آپ کے پہلو سے گر گئی تھی اور جسم پر مٹی لگ گئی تھی، رسول اللہ علیہ جسم سے دھول جھاڑتے جاتے تھے اور فرما رہے تھے، اٹھو ابوتراب اٹھو۔

تشریح: چونکہ آپ کے بدن پر مٹی زیادہ لگ گئی تھی اسی مناسبت سے آپ نے ابوتراب فرمایا، تراب کے معنی مٹی کے ہیں، حضرت علیؓ کو اگر بعد میں کوئی اس کنیت کے ساتھ خطاب کرتا تو آپ بہت خوش ہوتے تھے، نبی کریم علیہ چاہتے تھے کہ جو ناگواری پیش آگئی ہے وہ دور ہو جائے اس واقعہ سے اسلام میں رشتۂ مصاہرت میں مدارات کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، یہاں یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ رات کے وقت سونے اور دن کے وقت قیلولہ کے لئے لیٹ جانے میں بڑا فرق ہے اس لئے قیلولہ سے رات کے سونے کا مسئلہ حل نہ ہوگا۔

(۴۲۶) حدثنا یوسف بن عیسیٰ قال حدثنا ابن فضیل عن ابیه عن ابی حازم عن ابی هریرة قال لقد رایت سبعین من اصحاب الصفة ما منهم رجل علیه رداء اما ازار و اما کساء قدر بطوا فی اعناقهم فمنها ما یبلغ نصف الساقین و منها ما یبلغ الکعبین فیجمعه بیده کراهیة ان تریٰ عورته.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے ستر ۷۰ اصحاب صفہ کو دیکھا کہ ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جس کے پاس چادر (رداء) ہو یا تہبند ہوتا تھا یا رات کو اوڑھنے کا کپڑا جنہیں یہ اصحاب اپنی گردنوں سے باندھ لیتے تھے یہ کپڑے کسی کی آدھی پنڈلی تک آتے اور کسی کے ٹخنوں تک، یہ حضرات ان کپڑوں کو اس خیال سے کہ کہیں ستر نہ کھل جائے اپنے ہاتھوں سے تھامے رہتے تھے۔

تشریح: رداء ایسی چادر کو کہتے تھے جسے تہبند کے اوپر کرتا پہننے کے بجائے اوڑھتے تھے، اس حدیث سے اصحاب صفہ کی غربت وفلاکت کا پتہ چلتا ہے۔

باب الصلوٰة اذا قدم من سفر و قال کعب بن مالک کان النبی ﷺ اذا قدم من سفر بداء بالمسجد فصلی فیه

(سفر سے واپسی پر نماز، کعب بن مالک نے فرمایا کہ نبی کریم علیہ جب کسی سفر سے واپس تشریف لاتے تو پہلے مسجد میں جاتے اور نماز پڑھتے)

(۴۲۷) حدثنا خلاد بن یحییٰ قال حدثنا مسعر قال حدثنا محارب بن دثار عن جابر بن عبدالله قال اتیت النبی ﷺ وهو فی المسجد قال مسعر أراه قال ضحی فقال صل رکعتین و کان لی علیه دین فقضانی و زادنی.

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ نے فرمایا کہ میں نبی کریم علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے، مسعر نے کہا میرا خیال ہے کہ محارب نے چاشت کا وقت بتایا تھا، حضور اکرم علیہ نے فرمایا کہ (پہلے) دو رکعت نماز پڑھ لو، میرا آں حضور علیہ پر کچھ قرض تھا جسے آپ نے ادا کیا اور مزید بخشش کی۔

تشریح: حضرت جابرؓ سفر سے آئے تھے، مسجد نبوی میں پہنچے تو حضرت نے ان کو دو رکعت سنت مراجعت سفر کے لئے ارشاد فرمایا اس حدیث جابرؓ کو امام بخاری بیس جگہ لائے ہیں اور مسائل اخذ کئے ہیں۔ (فتح الباری ص ۳۶۱ ج ۱)

باب اذا دخل احدکم المسجد فلیر کع رکعتین قبل ان یجلس

(جب کوئی مسجد میں داخل ہوتو بیٹھنے سے پہلے دورکعت نماز پڑھنی چاہئے)

(۴۲۸) حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن عامر بن عبدالله بن الزبیر عن عمرو بن سلیم الزرقی عن ابی قتادہ السلمی ان رسول الله ﷺ قال اذا دخل احدکم المسجد فلیر کع رکعتین قبل ان یجلس.

ترجمہ ۴۲۸: حضرت ابوقتادہ سلمی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہوتو بیٹھنے سے پہلے دورکعت نماز پڑھ لے۔

تشریح: یہاں تحیۃ المسجد کا بیان ہوا ہے اور یہ نفل حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ مسجد میں داخل ہوتو بیٹھنے سے پہلے پڑھی جائیں اور فقہاء نے لکھا کہ اگر بیٹھنے سے پہلے سنتوں یا فرضوں میں مشغول ہوجائے تو ان کے ضمن میں نماز تحیۃ المسجد کا ثواب مل جاتا ہے، مگر جاہل لوگ اس کے خلاف مسجد میں داخل ہوکر پہلے بیٹھ جاتے ہیں، پھر نفل یا سنت وغیرہ پڑھتے ہیں، حضرتؒ نے فرمایا کہ اس نماز کو اہل ظاہر نے واجب کہا ہے اور بعض اہل ظاہر تہجد، چاشت وسنت فجر کو بھی واجب کہتے ہیں گویا اتنے فرض وواجب کا اضافہ ہوگیا پانچ نمازوں پر، مگر حنفیہ نے اگر وتروں کو واجب کہہ دیا تو سارے سلفی وغیر سلفی طعن کرنے لگے کہ ایک نماز زیادہ کردی ہے۔ واللہ المستعان۔

باب الحدث فی المسجد

(مسجد میں ریاح خارج کرنا)

(۴۲۹) حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال ان الملٰئکة تصلی علیٰ احدکم ما دام فی مصلاه الذی صلی فیه مالم یحدث تقول اللهم اغفرله اللهم ارحمه.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک تم اپنے مصلے پر جہاں تم نے نماز پڑھی تھی رہو اور ریاح خارج نہ کروتو ملائکہ تمہارے لئے برابر رحمت ومغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں، کہتے ہیں اے اللہ اس کی مغفرت کی کیجئے اے اللہ اس پر رحم کیجئے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے دوقول ہیں، ایک یہ کہ مسجد میں اخراج ریاح مکروہ تحریمی ہے، دوسرا قول مکروہ تنزیہی کا ہے تاہم میرے نزدیک معتکف اس حکم سے مستثنیٰ ہے، واللہ اعلم، حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ غالباً اخراج ریاح کی صورت میں اس پر بددعا کرتے ہوں گے کیونکہ بدبو سے ان کو تکلیف ہوتی ہے، لیکن یہ ضرر معنوی ہے جس طرح نوم جنب بلا وضو یا تیمم کے یا وضو بلاتسمیہ، یا طعام بلا تسمیہ (کہ شیطان کھانے میں شریک ہوجاتا ہے) یا جماع بلاتسمیہ وغیرہ مگر چونکہ ان سب کے لئے امر شرعی وارد نہیں ہوا اور نہ ترک پر وعید آئی، اس لئے ان سب جگہ صرف کراہت تنزیہی اور استحباب کا درجہ ہوگا، اس بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی خاص تحقیق اور زیادہ تفصیل انوارالباری ص۱۶۰ ج۴ (باب التسمیة علی کل حال) میں آچکی ہے۔

افادہ: حافظؒ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے اس باب سے ان لوگوں کا رد کیا ہے جو بے وضو آدمی کے لئے جنبی کی طرح دخول مسجد کو ممنوع کہتے ہیں، اس پر حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے ایراد کیا کہ یہ غرض ہوتی تو امام بخاری باب المحدث فی المسجد کا عنوان قائم کرتے اور ممکن ہے جواز حدث فی المسجد کا اثبات مقصود ہو کیونکہ وہ حدیث سے ثابت ہے، یا کراہت بتلانی ہو کیونکہ اس کی وجہ سے وہ شخص فرشتوں کی دعاء سے محروم ہوجاتا ہے۔

علامہ نووی نے شرح المذہب میں حدث کو غیر ممنوع کہا، سروجی نے کہا کہ ہمارے نزدیک مکروہ ہے، علامہ دردیر نے اس کو مسجد کے احترام کے خلاف اور ممنوع قرار دیا ابن عابدین نے بھی منع کیا، سلف میں بھی اختلاف رہا ہے، بعض نے کہا کوئی حرج نہیں، بعض نے کہا کہ ضرورت کے وقت جائز ہے ورنہ نہیں اور یہی زیادہ صحیح ہے (الابواب ص۲۱۸ ج۲)

باب بنیان المسجد وقال ابو سعید کان سقف المسجد من جرید النخل و امر عمر بناء المسجد و قال اکن الناس من المطرو ایاک ان تحمر او تصفر فتفتن الناس وقال انس یتباھون بھا ثم لا یعمرونھا الا قلیلا و قال ابن عباس لتزخر فنھا کما زخرفت الیھود والنصارٰی

(مسجد کی عمارت، حضرت ابوسعید نے فرمایا کہ مسجد نبوی کی چھت کھجور کی شاخوں سے ہموار کی گئی تھی، حضرت عمرؓ نے مسجد کی تعمیر کا حکم دیا تو فرمایا کہ میں تمہیں بارش سے بچانا چاہتا ہوں، مسجدوں پر سرخ وزرد رنگ کروانے سے بچو کہ اس سے لوگ غافل ہو جائیں گے، حضرت انسؓ نے فرمایا کہ (اس طرح پختہ بنوانے سے) لوگ مساجد پر فخر ومباہات کرنے لگیں گے اور اس کو آباد کرنے کے لئے بہت کم لوگ رہ جائیں گے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تم بھی مساجد کی اسی طرح زیبائش کرو گے جس طرح یہود ونصاریٰ نے کی)

(۴۳۰) حدثنا علی بن عبداللہ قال حدثنا یعقوب بن ابراھیم بن سعید قال ثناء ابی عن صالح بن کیسان ثنا نافع ان عبداللہ بن عمر اخبرہ ان المسجد کان علیٰ عھد رسول اللہ ﷺ مبنیاً باللبن وسقفہ الجرید و عمدہ خشب النخل فلم یزد فیہ ابو بکر شیئاً و زاد فیہ عمرو بناہ علیٰ بنیانہ فی عھد رسول اللہ ﷺ باللبن والجرید واعاد عمدہ خشبا ثم غیرہ عثمان فزاد فیہ زیادۃً کثیرۃ وبنیٰ جدارہ با الحجارۃ المنقوشۃ والقصۃ وجعل عمدہ من حجارۃ منقوشۃ وسقفہ بالساج.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے خبر دی کہ نبی کریم ﷺ کے عہد میں مسجد کچی اینٹ سے بنائی گئی تھی، اس کی چھت کھجور کی شاخوں کی تھی اور ستون اسی کے تنوں کے، حضرت ابوبکرؓ نے اس میں کسی قسم کی زیادتی نہیں کی البتہ حضرت عمرؓ نے اسے بڑھایا اور اس کی تعمیر رسول اللہ ﷺ کی بنائی ہوئی عمارت کے مطابق کچی اینٹوں اور کھجور کی شاخوں سے کی اور اس کے ستون بھی لکڑی ہی کے رکھے، پھر حضرت عثمانؓ نے اس کی عمارت کو بدل دیا اور اس میں بہت سے تغیرات کئے، اس کی دیواریں بھی منقش پتھروں اور گچھ سے بنوائیں، اس کے ستونوں کو بھی منقش پتھروں سے بنوایا اور چھت ساگوان کی کر دی۔

تشریح: ابن بطال نے کہا ہے کہ شاید حضرت عمرؓ نے یہ بات لوگوں کے غافل ہونے کی اس واقعہ سے سمجھی ہو جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابوجہم کی دھاریدار چادر واپس کردی تھی، پہلے اس میں آپ نے نماز پڑھی اور واپس کرتے وقت فرمایا کہ یہ چادر مجھے میری نماز سے غافل کردیتی، حافظ ابن حجرؒ نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس اس سلسلہ میں کوئی خاص علم رہا ہو کیونکہ ابن ماجہ میں ایک روایت میں یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کسی قوم میں جب بدعملی پھیل جاتی ہے تو وہ اپنی عبادت گاہوں کو بڑی زیب وزینت کے ساتھ سجاتے ہیں، متعدد صحیح احادیث میں بھی مساجد کے پختہ بنوانے کو قیامت کی علامت کہا گیا ہے، ان احادیث وآثار سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کو پختہ کروانا جائز ہی نہ ہونا چاہئے یہی وجہ ہے کہ جب پہلی مرتبہ حضرت عثمانؓ نے مسجد نبوی کو پختہ کرایا تو بعض صحابہ نے اس پر اعتراض کیا لیکن حضرت عثمان ان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے زیادہ دین کے رموز سے واقف تھے، چنانچہ اس واقعہ کے بعد جب ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ تشریف لائے اور آپ کو حالات کا علم ہوا تو آپ نے ایک حدیث سنائی جس میں بصراحت اس بات کی پیشین گوئی تھی کہ ایک دن آئے گا کہ میری اس مسجد کی تعمیر پختہ بنیادوں پر ہوگی، حضرت عثمانؓ نے مسجد نبوی کو اپنے دور خلافت میں ذاتی خرچ

سے پختہ کرایا تھا اور جب آپ کو یہ حدیث ابو ہریرہ نے سنائی تو خوش ہو کر اپنی جیب سے پانچ سو درہم آپ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو دیئے۔

اس کے علاوہ جب بعض صحابہ نے اعتراض کیا تو آپ نے یہ حدیث پیش کی تھی کہ جس نے ایک مسجد تعمیر کی خدا جنت میں اس کے لئے ویسا ہی مکان بنائے گا، گویا آپ کے نزدیک کیفیت تعمیرات بھی اس اجر میں مراد ہے، مساجد کی پختگی اور ان کی زیب وزینت کے سلسلے میں جس طرح کی احادیث آئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کا منصب یہ ہے کہ وہ دنیا کی طرف سے بے توجہی اور حصول آخرت کی ترغیب دیں، مساجد اور اس سے متعلقہ چیزیں اگرچہ دین سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان کی ظاہری حسن وزیبائش عموماً بنانے والوں کے لئے دنیا میں فخر و مباہات کا سبب بن جاتی ہیں، پھر دین میں مطلوب عبادت، اس میں خشوع وخضوع ہے نہ کہ تعمیر وتزئین اسی لئے آں حضور علیہ السلام خاص طور سے اس کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ظاہری زیب وزینت پر اپنی ساری توجہ صرف کر کے اصل مقصد سے غافل نہ ہو جائیں اور ہوتا بھی یہی ہے کہ لوگ بعد میں روح اور تقویٰ سے زیادہ ظاہری شان وشوکت کو اہمیت دینے لگتے ہیں، یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ورنہ بکثرت احادیث کی روشنی میں اس بات کو واضح کیا جاتا کہ آں حضور علیہ السلام نے اس طرح کے مسائل پیدا ہو جانے والی دوسری صورتوں کی تردید بڑی شدت کے ساتھ کی ہے جو مقصود ومطلوب نہیں ہوتیں اور عام طور سے ان ہی کو مقصود ومطلوب بنالیا جاتا ہے، یا جو اہم ہوتی ہیں اور لوگوں کے دل و دماغ انہیں اہمیت نہیں دیتے، مساجد کی زیبائش اگر اس کی تعظیم کے پیش نظر کی جائے اور اس میں کوئی اپنا ذاتی روپیہ لگائے، تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کی رخصت ہے، ابن المنیر نے کہا ہے کہ جب لوگ اپنے ذاتی مکان پختہ بنوانے لگے اور اس کی زیبائش وآرائش پر روپیہ خرچ کرنے لگے تو اگر انہوں نے مساجد کی تعمیر میں بھی یہی طرز عمل اختیار کیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے تاکہ مساجد کی اہانت واستخفاف نہ ہونے پائے، اس لئے اصل تو یہی ہے کہ مساجد سادہ طریقہ پر تعمیر ہوں لیکن زمانہ بدل گیا تو پختہ بنوانے میں بھی حرج نہیں، لہٰذا اس طرح کے تمام مسائل میں بنیادی بات یہ ہے کہ ظاہری ٹیپ ٹاپ، روح، تقویٰ اور دلوں کی طہارت کے لئے سب سے زیادہ مہلک ہے اور ان تمام احادیث وآثار میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں یہی بنیادی مقصد پیش نظر ہے جب یہود ونصاریٰ اپنے مذہب کی روح سے غافل ہو گئے تو سارا زور چند ظاہری رسوم ورواج پر دینے لگے (عمدۃ القاری، فتح الباری وافادات انوری)

افادہ: مسجد نبوی آں حضور علیہ السلام کے عہد میں بھی دو مرتبہ تعمیر ہوئی تھی، پہلی مرتبہ اس کا طول وعرض ساٹھ ساٹھ ہاتھ تھا، دوبارہ آپ ہی کے عہد میں اس کی تعمیر غزوہ خیبر کے بعد ہوئی، اس مرتبہ اس کا طول وعرض سو سو ہاتھ رکھا گیا، حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں اس میں مزید اضافہ کرایا تھا، حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں طول وعرض بھی بڑھوا دیا تھا اور پختہ بنیادوں پر اس کی تعمیر کرائی بعض سلاطین نے ان تمام تغیرات کو جو عہد نبوی میں ہوئے اور اس کے بعد حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے عہد میں ہوئے نشانات لگا کر ممتاز کر دیا ہے اس کے بعد متعدد سلاطین نے بھی مسجد نبوی میں اضافہ کرایا، لیکن یہ ایک دوسرے سے ممتاز نہیں ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر ممانعت عمری وفعل حضرت عثمانؓ کی توجیہ کے ذیل میں غرض شارع کی مزید وضاحت فرمائی کہ احادیث میں پختہ مکانات بنانے کی بھی ناپسندیدگی آئی ہے تاکہ اسباب دنیا میں انہماک وغلو نہ ہو، جس کی وجہ سے اکثر آخرت کی طرف سے غفلت آجاتی ہے، لیکن اگر یہ برائی پیدا نہ ہو تو علماء نے اجازت دی ہے اور اس کی طرف محقق ابن المنیر نے اشارہ کیا ہے کہ جب لوگ اپنے پختہ مکانات بنانے لگے تو مساجد ہی کو اس سے کیوں محروم کیا جائے لہٰذا اصل تو یہی ہے کہ مساجد بھی پختہ نہ بنائی جائیں مگر زمانہ کے حالات اس کے متقاضی ہوں تو پھر اس کو احادیث کے خلاف نہ شمار کیا جائے گا، پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ اگر سلاطین وامراء پہلے زمانہ میں مساجد عالی شان اور پختہ نہ بناجاتے تو آج مساجد کا خصوصاً بلاد کفر میں نام ونشان بھی نہ ہوتا (جامع قرطبہ ودیگر مساجد ومآثر اندلس اور اسی طرح مساجد و مآثر ہند اس کی مثال ہیں، لہٰذا مساجد ومدارس ودیگر مآثر اسلامیہ کے استحکام کو فوائد ومصالح سے خالی نہیں کہہ سکتے) معلوم ہوا کہ ممانعت نبویہ کا

مقصداً اپنے موضوع نبوت ورسالت کے تحت اظہار ناپسندیدگی کے لئے تھا، پھر جیسے جیسے مصالح ومنافع حضرات صحابہ وتابعین ومتاخرین اکابر امت محمدیہ کے سامنے آتے گئے، ان کے مطابق عمل بھی اتباع سنت ہی قرار دیا جائے گا اور مصالح امت کی وجہ سے وہ کراہت وناپسندیدگی ختم ہو جائے گی، اسی کے ساتھ مندرجہ ذیل امور بھی قابل لحاظ ہیں:-

(۱) اپنے رہنے کے مکانات کو پختہ کرنے کی ممانعت بھی بیان حلت وحرمت شرعی کے لئے نہیں وارد ہوئی بلکہ یہ بتلانے کے لئے ہوئی کہ انسان کو دنیا میں مسافر کی طرح رہنا چاہئے لہٰذا اس کو عالی شان عمارتوں اور اسباب عیش وتلذذ کی طرف راغب نہ ہونا چاہئے۔

(۲) اس کی دوسری مثال مشکوٰۃ کی حدیث ہے کہ اپنے ظالم بادشاہوں پر بددعا نہ کرو، بلکہ اپنے اعمال کی اصلاح کرو کیونکہ جیسے تم ہو گے ایسے ہی تم پر حاکم مسلط کئے جائیں گے، اس حدیث سے بعض لوگوں نے سمجھا کہ بادشاہوں کو بددعا دینی جائز نہیں حالانکہ غرض حدیث صرف اپنی اصلاح کی طرف توجہ دلانی ہے، جس سے آدمی اکثر غافل رہتا ہے، اور ظالم کے لئے بددعا سے خود ہی کبھی غافل نہیں ہوتا، اس لئے اہم امر کی طرف توجہ دلائی، یہ غرض نہیں ہے کہ اس کو بددعا نہ دیں، اسی لئے وہ شرعاً بالکل جائز ہے۔

(۳) اسی طرح حدیث میں ہے کہ جو شخص تہجد پڑھ کر چھوڑ دے، اس کے لئے بہتر تھا کہ وہ پڑھتا ہی نہیں، شارحین حدیث نے اس میں بحث کی کہ کبھی کبھی تہجد پڑھنے والا اچھا ہے یا بالکل نہ پڑھنے والا؟ میں کہتا ہوں کہ پہلا ہی یقیناً افضل ہے اور جنہوں نے حدیث مذکور کی وجہ سے دوسرے کو افضل سمجھا وہ غلطی پر ہیں، کیونکہ مراد نبوی کو نہ سمجھ سکے، آپ کا مقصد تو صرف ترغیب تھی مواظبت ومداومت کی اور ترک کے لئے ناپسندیدگی ظاہر کرنی تھی، کسی کے بھی تھوڑے یا بہت عمل خیر کو نظر انداز کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اور وہ بھی شارع علیہ السلام کی طرف سے، غرض کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقصود شارع علیہ السلام اس چیز میں ہوتا ہے جو آپ کی زبانی ارشاد میں نہیں آئی۔

(۴) حدیث بخاری میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے گھر میں عید کے روز لڑکیاں دف بجا رہی تھیں، حضور علیہ السلام چادر اوڑھ کر منہ ڈھانک کر لیٹ گئے (یعنی رغبت نہ تھی، اجازت تھی) حضرت ابوبکرؓ آئے اور فرمایا کہ یہ شیطان کے مزامیر کیسے؟ حضور نے فرمایا کہ رہنے دو ابوبکر! عید کا دن ہے خوشی کا، پھر حضرت عمرؓ آئے تو لڑکیاں دف کو نیچے دبا کر بیٹھ گئیں اس پر حضور نے فرمایا کہ شیطان عمر سے بھاگتا ہے، اس سے میں کہتا ہوں کہ وہ چیز تو شیطان کی ہے لیکن تھوڑے کو شریعت جواز میں رکھے گی لیکن اگر زیادہ ہو جائے تو وہ بالکل شیطانی عمل بن جائے گا، باعتبار جنس تھوڑے کو بھی شیطانی کہہ سکتے ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے اور اسی کی طرف حضرت ابوبکرؓ نے اشارہ کیا تھا، مگر حضور علیہ السلام نے شرعی مقصد کی طرف رہنمائی فرما دی کہ تھوڑا ہو اور عید جیسے دن ہو تو حد جواز میں رہے۔

(۵) مستدرک حاکم میں ہے کہ ایک سائل آیا، آپ نے کچھ دے دیا، پھر مانگا پھر دیدیا، پھر مانگا پھر دیدیا اور جب چلا گیا تو فرمایا کہ آگ کے انگارے ہیں جو اس نے لئے، صحابہ نے عرض کیا کہ پھر کیوں دیئے؟ فرمایا کہ خدا کو پسند نہیں کہ میں بخیل بنوں، مقصد یہ کہ سائل کو نہ چاہئے تھا، اور میں تو دوں گا ہی۔

فائدہ: علامہ تورپشتی حافظ حدیث حنفی المذہب ہیں، ان کی کتاب عقائد میں میرے پاس ہے، اس میں وعید کی احادیث لکھ کر چند سطریں لکھی ہیں، جن سے میں سمجھا کہ ان کو سبب نار بنایا ہے، خواہ پھر وہ اس پر مرتب ہوں یا نہ ہوں، یہ حقیقی علم ہے جو طول ممارست سے حاصل ہوتا ہے، اگر یہی مراد ہے تو احادیث وعید میں ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہے جو مواضع عدیدہ میں کام آئے گی، فافہم ولاتغفل۔

باب التعاون فی بناء المسجد و قول الله عزو جل ما کان للمشر کین ان یعمروا مسجد الله الأیة

(تعمیر مسجد میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اور خداوند تعالیٰ کا قول ہے "مشرکین خدا کی مسجدوں کی تعمیر میں حصہ نہ لیں" الآیۃ)

حدثنا مسدد قال حدثنا عبد العزیز بن مختار قال حدثنا خالد الحذ آء عن عکرمة قال قال لی ابن عباس و لا بنه علی انطلقا الیٰ ابی سعید فاسمعا من حدیثه فانطلقنا فاذا هو فی حائط یصلحه فاخذ ردآئه فاحتبی ثم انشا یحد ثنا حتیٰ اتی علیٰ ذکر بنآء المسجد فقال کنا نحمل لبنةً لبنةً و عمار لبنتین لبنتین فرآه النبی ﷺ فجعل ینقض التراب عنه ویقول ویح عمار تقتله الفئة الباغیة یدعوهم الیٰ الجنة ویدعونه الی النار قال یقول عمار اعوذ بالله من الفتن.

ترجمہ: حضرت عکرمہؒ نے بیان کیا کہ مجھ سے اور اپنے صاحبزادے علی سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جاؤ اور ان کی احادیث سنو ہم چلے۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ اپنے باغ میں کچھ درستی کر رہے تھے۔ (جب ہم حاضر خدمت ہوئے) آپ نے اپنی چادر سنبھالی اور اسے اوڑھ لیا۔ پھر ہم سے حدیث بیان کرنے لگے۔ جب مسجد نبوی کی تعمیر کا ذکر آیا تو آپ نے بتایا کہ ہم تو (مسجد کی تعمیر میں حصہ لیتے وقت) ایک ایک اینٹ اٹھا رہے تھے لیکن عمار دو دو اینٹیں اٹھاتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے انھیں دیکھا تو ان کے جسم سے مٹی جھاڑنے لگے اور فرمایا افسوس عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی جسے عمار جنت کی دعوت دیں گے اور وہ جماعت عمار کو جہنم کی دعوت دے رہی ہوگی۔ ابوسعیدؓ نے بیان کیا کہ حضرت عمارؓ کہتے تھے کہ فتنوں سے خدا کی پناہ:

تشریح: مسجد کی تعمیر کے لئے مسلمانوں سے چندہ لینا جائز ہے، لیکن کفار و مشرکین سے نہیں۔ البتہ یہ صورت ہو سکتی ہے کہ وہ کافر یا مشرک کسی مسلمان کو رقم ہبہ کر دے، پھر وہ مسلمان بناء مسجد میں صرف کر دے۔ (افادۃ الشیخ الانورؒ) حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ صاحب کنز نے بھی مسجد کے لئے کافر کے چندہ کو ناجائز کہا اور تملیک مسلم کے بعد جائز کہا۔ میں نے سنا کہ حضرت گنگوہی نے جواز کا فتویٰ دیا ہے مگر میں ہمیشہ عدم جواز کا ہی فتوے دیتا ہوں اور دلیل قولہ تعالیٰ ما کان للمشر کین ان یعمروا مساجد الله الآیه ہے۔

لامع الدراری ص۱۰۳ میں ہے کہ کافر و مشرک کے مال سے تیار شدہ مسجد میں نماز درست ہے، اور حاشیہ لامع میں ہے کہ یہ مولانا عبدالحیٰ کے خلاف ہے کیونکہ انھوں نے اس کو ناجائز کہا ہے۔ ہم نے اوپر حضرت شاہ صاحبؒ سے بھی جواز کی خاص صورت نقل کی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً جواز نہیں ہے، اور ہم نے فتاویٰ رشیدیہ میں بھی احکام المساجد میں دیکھا کہ حضرت گنگوہیؒ نے تحریر فرمایا "جس کافر کے نزدیک مسجد بنانا عمدہ عبادت کا کام ہے۔ اس کے مسجد بنانے کو حکم مسجد کا ہوگا" لہٰذا حضرتؒ نے جہاں مطلق جواب دیا ہے وہ بھی اس شرط کے ساتھ خاص ہوگا، حضرت مولانا عبدالحیٰ صاحبؒ نے یہ لکھا کہ "حسب تصریح معتبرات، مال ہنود کا تعمیر معابد خاصۂ اہل اسلام میں صرف کرنا درست نہیں ہے" اس کو نقل کر کے حضرت العلامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ نے تحریر فرمایا کہ مولاناؒ نے معتبرات کی عبارتیں اور حوالے نہیں دیئے کہ ان میں دیکھا جاتا اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے مال کفار کا مسجد میں لگانے کا جواز مصرح ہے، حضرت مفتی صاحب نے لکھا کہ اموال کفار (جزیہ، خراج، ہدیہ اور ترکۂ ذمی وغیرہ) بیت المال میں جمع ہوتے تھے اور ان سے ہر قسم کے رفاہ عام کے کام ہوتے تھے، سرحدوں کی حفاظت اور اسلامی فوج پر صرف ہوتے تھے، پل اور سڑکیں بنتی تھیں وغیرہ نیز علامہ شامی نے لکھا کہ ایسے ہی بناء مسجد و حوض و رباط وغیرہ پر بھی صرف ہوتا تھا۔ (فتاویٰ ص ۷۷ ج ۷)

حضرت مفتی صاحبؒ نے ان مصارف کی پوری تفصیل دی ہے اور اسی پر ہنود کے اموال کو بھی قیاس کیا ہے حالانکہ بیت المال میں جمع ہوکر وہ اموال کفار مسلمانوں کی ملک میں داخل ہوکر پھر ان سب مصارف میں خرچ ہوتے تھے اور پھر خود بھی ایک دوسرے سوال بابتہ چندۂ ہنود للمسجد کے جواب میں یہ تحریر فرمایا:- ''تعمیر مسجد کے لئے غیر مسلموں سے چندہ طلب کرنا جائز نہیں اور اگر غیر مسلم خود چندہ دیں یعنی بغیر مانگے خوشی سے دیدیں تو اس صورت میں قبول کرنے میں مضائقہ نہیں کہ وہ مسلمانوں کی تملیک کردیں اور مسلمان اپنی طرف سے مسجد میں خرچ کردیں، اسی طرح غیر مسلم (ہندو یا عیسائی) مسجد تعمیر کرکے مسلمانوں کو دے دیں، تو اس کے شرعاً مسجد ہونے کی صورت یہی ہے کہ وہ مسلمانوں کی ملک کردیں اور مسلمان اپنی طرف سے اس کو مسجد کے نام سے نامزد کرکے وقف کردیں، غیر مسلم کا وقف اس صورت میں صحیح ہوتا ہے کہ جس کام کے لئے وہ وقف کرتا ہے وہ کام اس کے مذہب اور اسلام کے نزدیک قربت ہو، ورنہ وقف صحیح نہیں ہوتا، یعنی قاضی اسلام ایسے وقف کی صحت کا حکم نہیں کرے گا جو واقف کے مذہب کے لحاظ سے قربت نہیں (جیسے ہندو کی بنائی ہوئی مسجد) یا اسلام کے نزدیک قربت نہیں (جیسے مسلمانوں کا بنایا ہوا بت خانہ) واللہ اعلم (کفایت المفتی ص ۱۸۱ ج ۷)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان سب حضرات میں باہم کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے اور تعمیر مساجد کی صفت خاصہ کا تعلق ہر حیثیت سے صرف ایمان والوں کے ساتھ ہے اور صرف اموال للمسجد میں بھی مومن و غیر مومن کا فرق شرعاً نا قابل انکار ہے۔ سچ اور حق ہے ''**انما یعمر مساجد الله من آمن بالله**'' اور ''**ماکان للمشرکین ان یعمروا مساجد الله**'' پھر اگر معترات میں یہ فرق نہ ہوتا تو شرطوں اور خاص صورتوں کی تقیید کیوں ہوتی؟

حضرت تھانویؒ نے بھی لکھا:- اگر کوئی ہندو اپنے اعتقاد میں اس کو (یعنی مسجد میں روپیہ لگانے یا مسجد بنانے کی قربت (یعنی عمل موجب ثواب سمجھتا ہے تو اس قاعدہ وکلیہ کے اقتضاء سے اس کا چندہ مسجد کے لئے لینا جائز ہونا چاہئے''۔ (امداد الفتاویٰ ص ۶۱۱ ج ۲)

حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب دامت فیوضہم نے مسجد و مدرسہ کے لئے امداد غیر مسلم کے سوال پر لکھا:- مسجد و مدرسہ کی عمارت کو نقصان ہوا ہو تو امداد لینے کی گنجائش ہے، جماعت خانہ یہ نماز گاہ کے علاوہ بیت الخلاء یا غسل خانے وغیرہ بنانے اور مرمت کے لئے امداد لی جائے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ص ۱۵۷ ج ۲)

حقیقت بظاہر یہ معلوم ہوئی کہ مساجد صرف خدائے واحد کی عبادت کے لئے ہیں اور جو موحد خالص نہیں ہیں یعنی مشرکین وہ صرف خدائے واحد کی عبادت کو عمدہ کام یقین کرکے مالی امداد کیسے کرسکتے ہیں؟ البتہ دوسری مصالح یا منافع دنیویہ کے خیال سے وہ ضرور مساجد بھی بنا سکتے ہیں اور مالی امداد بھی دے سکتے ہیں، لہٰذا ان کا حکم معلوم!۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہم تو ذکر آیت قرآنی سے امام بخاریؒ کا اشارہ بھی اسی طرف سمجھتے ہیں کہ مساجد کی تعمیر ظاہری میں مشرکین کو شریک نہ کیا جائے کیونکہ وہ اپنے دلوں کے کفر سے خوب واقف ہیں اور اسی لئے ان کے سب اعمال اکارت ہوئے اور ہمیشہ کے لئے دوزخ کے مستحق بنے، پھر ایسے لوگوں کی امداد خدا کی مسجدوں کے لئے کیسے قبول کی جاسکتی ہے؟ چونکہ امام بخاری کی شرط پر کوئی حدیث ممانعت نہ ہوگی، اس لئے ممانعت پر آیت سے استدلال فرمایا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

لہٰذا خدائے واحد کی خاص عبادت کے لئے قائم کی جانے والی مساجد کی تعمیر ظاہری و باطنی دونوں کا حق واستحقاق صرف مومنوں کا رہا، جن کے قلوب خشیۂ خداوندی سے معمور و منور ہیں۔ والحمد للہ اولاً وآخراً۔

خلاصۂ بحث

حضرت مولانا عبدالحئی صاحب اور حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے اصوب ہے کہ مشرکین کی مالی امداد مسجد کی خاص جائے عبادت و نماز کے لئے قبول نہ کی جائے اور یہ کہ کوئی مسلمان اپنی ملک میں لے کر پھر اس رقم کو اپنی طرف سے مسجد میں لگائے اور فتاویٰ رشیدیہ نیز کفایت المفتی میں

جہاں مطلق اجازت تحریر ہوگئی ہے وہ بھی مقید ومشروط پر محمول ہوگی۔ امداد الفتاویٰ ص ۱۱۱ ج ۲ میں مفسرین کی تفسیر کو "لکل فن رجال" کہہ کر فقہاء کے مقابلہ میں مرجوع یا ساقط گردانے کی بات بھی سمجھ میں نہ آسکی، پھر جبکہ فقہاء کا بھی وہ منشا نہیں جو سمجھا گیا، اس لئے ہمارے نزدیک اصل مسئلہ بالکل واضح ہے اور سب ہی کا متفقہ بھی ہے اور کبھی بھی کسی مشرک کی نیت قربت تعمیر مسجد کے لئے درست نہیں ہوسکتی۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

واقعۂ شہادت حضرت عمارؓ

ترجمۃ الباب کے تحت جو بحث وتشریح ضروری تھی وہ گذر گئی، اب حدیث الباب پر بھی کچھ لکھنا ہے جو نہایت اہم وضروری ہے، جس وقت حضور اکرم ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ تعمیر نبوی کررہے تھے، تو دیکھا گیا کہ اور صحابہ تو ایک ایک اینٹ یا پتھر اٹھا کر لاتے ہیں اور حضرت عمارؓ دو دو اٹھاتے ہیں یہ بھی کتب سیر میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے تعمیر مسجد نبوی کے لئے مسجد کے قریب ہی کچی اینٹیں پتھوائی تھیں (اور شاید وہ بڑی وزنی ہوں کہ عام طور سے آدمی ایک ہی اٹھا سکے، جیسی اب کراچی میں بنتی ہیں) حضور علیہ السلام بھی سب کے ساتھ اینٹیں ڈھو رہے تھے، صحابہ نے عرض کیا کہ حضرت! آپ تکلیف نہ کریں! ہم کافی ہیں، مگر آپ نے شرکت جاری رکھی، اسی دوران میں حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمارؓ سے پوچھا کہ تم دو دو کیوں لا رہے ہو؟ جواب کئی نقل ہوئے، ایک یہ کہ حضور! میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے ثواب زیادہ ملے، دوسرا یہ کہ ایک اپنے حصہ کی لاتا ہوں اور دوسری آپ کے حصہ کی، اس پر رحمت عالم ﷺ نے مسرت ورنج کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ارشاد فرمایا:- "افسوس! عمار کی شہادت ایک باغی گروہ کے ہاتھوں سے ہوگی"۔ پھر ایسا ہی ہوا کہ سالہا سال کے بعد جنگ صفین کے موقع پر حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے، حضرت معاویہؓ کے حامی لشکر کے ہاتھوں سے آپ کی شہادت ہوگئی، چونکہ حضرت عمارؓ کے بارے میں حضور علیہ السلام کا مذکورہ بالا ارشاد سارے صحابہ میں مشہور ومعروف تھا، جس کی روایت بخاری[1] مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد ومسند احمد وغیرہ میں بھی ہے، اور متعدد صحابہ وتابعین نے جو حضرت علی اور حضرت معاویہ کی جنگ میں مذبذب تھے، حضرت عمارؓ کی شہادت کو یہ معلوم کرنے کے لئے ایک علامت بھی قرار دے دیا تھا کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے؟ اور باطل پر کون؟ حافظ نے الاصابہ ص ۵۰۲ ج ۲ میں لکھا کہ قتل عمارؓ کے بعد یہ بات ظاہر ہوگئی کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اور اہل سنت اس بات پر متفق ہوگئے درانحالیکہ پہلے اس میں اختلاف تھا اور الاصابہ ص ۵۰۶ ج ۲ نیز تہذیب التہذیب ص ۴۱۰ ج ۷ میں لکھا کہ متواتر روایات وآثار سے یہ بات منقول ہے کہ حضرت عمارؓ کو باغی گروہ قتل کرے گا اور الاستیعاب ص ۴۲۴ ج ۲ میں علامہ محقق ابن عبدالبرؒ نے بھی یہی بات لکھی ہے، حافظ ابن کثیر نے بھی البدایہ ص ۲۷۰ ج ۷ میں لکھا کہ حضرت عمارؓ کی شہادت سے اس حدیث کا راز کھل گیا کہ حضرت عمارؓ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا اور اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ حضرت علیؓ حق پر تھے اور حضرت معاویہؓ باغی اور ص ۲۴۱ ج ۷ میں یہ بھی لکھا کہ جنگ جمل سے حضرت زبیرؓ کے ہٹ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کو نبی کریم ﷺ کا ارشاد بابتہ حضرت عمارؓ یاد تھا اور انہوں نے دیکھا کہ وہ حضرت علیؓ کے لشکر میں موجود ہیں۔ مگر جب جنگ صفین میں حضرت عمارؓ کے شہید ہونے کی خبر حضرت معاویہؓ کے لشکر میں پہنچی اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے اپنے والد اور حضرت معاویہؓ دونوں کو حضور علیہ السلام کا

---

[1] واضح ہو کہ حافظ ابن حجرؒ کے سامنے وہ نسخہ بخاری کا تھا جس میں جملہ تقتلک الفئة الباغیة نہیں تھا، اسی لئے اس کی مفصل وجہ بھی ان کو لکھنی پڑی اور پھر فائدہ کا عنوان دے کر یہ بھی لکھا کہ قتل عمار والے جملہ کی حدیث کو ایک جماعت صحابہ نے روایت کیا ہے اور ان میں سے اکثر طریقے صحیح یا حسن ہیں اور اس حدیث میں ایک پیش گوئی ہے جو اعلام نبوت میں سے ہے کہ اس کا ظہور بعینہ ارشاد نبوی کے مطابق ہوا اور اس میں حضرت علیؓ وحضرت عمارؓ کی کھلی ہوئی فضیلت بھی ہے اور نواصب کا رد بھی ہے، جن کا زعم یہ ہے کہ حضرت علیؓ اپنی جنگوں میں حق پر نہیں تھے (فتح الباری ص ۳۶۵ ج ۱ وعمدۃ القاری ص ۳۹۳ ج ۲)

اس وقت جو بخاری کا مطبوعہ نسخہ ہمارے پاس ہے، اس میں یہاں بھی یہ مذکورہ جملہ موجود ہے اور کتاب الجہاد، باب مسح الغبار عن الراس ص ۳۹۴ میں موجود ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے اپنے دست مبارک سے حضرت عمارؓ کے سر سے گرد وغبار بھی جھاڑا تھا واضح ہو کہ علامہ عینی کے سامنے بھی یہی نسخہ ہے۔ (مؤلف)

ارشاد یاددلایا تو حضرت معاویہؓ نے فوراً اس کی یہ تاویل کی کیا ہم نے عمار کو قتل کیا ہے؟ ان کو تو اس نے قتل کیا جو انہیں میدان جنگ میں لایا (طبری ص ۲۹ ج ۴، ابن الاثیر ص ۱۵۸ ج ۳، بدایہ ص ۲۶۸ ج ۷) علامہ ابن کثیر نے اس تاویل کو بہت مستبعد قرار دیا۔

ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں لکھا کہ حضرت علیؓ کو جب حضرت معاویہؓ کی یہ تاویل پہنچی تو فرمایا:- ''اس طرح کی تاویل سے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت حمزہؓ کے قتل خود نبی اکرم ﷺ تھے''۔ (والعیاذ باللہ)

صاحب تاریخ الخمیس نے خلاصۃ الوفا سے اس طرح نقل کیا، حضرت عمرو بن العاصؓ حضرت معاویہؓ کے وزیر تھے، جب حضرت عمارؓ شہید کردیئے گئے تو آپ جنگ سے رک گئے اور ایک بڑی تعداد بھی آپ کے اتباع میں رک گئی، اس پر حضرت معاویہؓ نے پوچھا کہ تم کیوں رک گئے؟ تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے جواب دیا کہ ہم نے اس شخص کو قتل کردیا، اور میں نے خود رسول اکرم ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ انکو باغیوں کا گروہ قتل کرے گا، حضرت معاویہؓ نے کہا چپ ہوجاؤ کیا ہم نے ان کو قتل کیا ہے؟ ان کو تو علی اور ان کے ساتھیوں نے قتل کیا ہے، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ان کو تو اس نے قتل کیا جس نے ان کو ہم سے لڑنے کے لئے بھیجا ہے، پھر جب یہ بات حضرت علیؓ کو پہنچی تو فرمایا کہ اگر میں نے ان کو قتل کیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے بھی حضرت حمزہؓ کو قتل کیا ہوگا کیونکہ آپ نے ہی ان کو قتال کفار کے لئے بھیجا تھا، مختصراً (الابواب والتراجم لشیخ الحدیث دام ظلہم ص ۲۱۹ ج ۲)

اعتراض وجواب

یہاں حدیث میں یہ جملہ بھی ہے کہ ''حضرت عمارؓ ان کو جنت کی طرف بلاتے تھے اور وہ لوگ ان کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے''۔ تو اشکال یہ ہے کہ حضرت معاویہ کے ساتھ بھی کچھ صحابہ تھے، تو اتنی بات تو درست ہوسکتی ہے کہ وہ باغیوں کے گروہ میں تھے اور اجتہادی غلطیوں کا صدور، جس طرح صحابی رسول حضرت معاویہؓ سے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت علیؓ سے قاتلین حضرت عثمانؓ کے مطالبۂ قصاص کو وجہ نزاع وقتال قرار دیا تھا، اسی طرح ان کا ساتھ دینے والے صحابہ سے بھی اجتہادی غلطی ہوئی ہوگی، مگر یہ بات تو نہیں ہوسکتی کہ ان صحابہ نے حضرت عمارؓ کو نار جہنم کی طرف بلایا ہو، تو اس کا جواب تو یہ ہے کہ ان کو خوش فہمی اور گمان تو یہی تھا کہ اس طرح حضرت علیؓ کو مجبور کرکے قاتلین حضرت عثمانؓ سے قصاص لیں گے اور یہ فعل دخول جنت کا مستحق بنادے گا، پھر یہ کہ اگرچہ خلیفۂ وقت حضرت علیؓ کی مخالفت اور ان سے قتال وجنگ سبب دخول نار تھا، مگر وہ اجتہادی غلطی کی وجہ سے عنداللہ معذور ہوں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا دوسرا جواب جو مجھے زیادہ پسند ہے، یہ ہے کہ فئۃ باغیۃ تک کلام حضرت معاویہؓ کے سلسلہ میں ہے کہ صاحب ہدایہ نے بھی کتاب القضاء میں تصریح کی ہے کہ امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ سے بغاوت کی تھی پھر یدعو ھم الی الجنۃ سے حضرت عمارؓ کی منقبت اور مکی زندگی کا حال بیان ہوا ہے کہ مکہ معظمہ میں یہ قریش کو جنت کی طرف بلاتے تھے اور وہ ان کو طرح طرح کے عذاب دے کر حالت کفر کی طرف لوٹنے کی فکر وسعی کرتے تھے، ایک جواب یہ بھی ہے کہ مراد صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت عمارؓ کو قتل کیا وہ اہل شام تھے (فتح الباری ص ۳۶۴ ج ۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا ایک جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کبھی حکم باعتبار جنس کے ہوتا ہے اگرچہ اس کا تحقق بعض انواع میں نہ ہوتا ہو، لہٰذا مطلب یہ ہوگا کہ اس قسم کی دعوت جو حضرت معاویہ اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے دی گئی اگرچہ وہ سبب نار تھی مگر وہ حضرات صحابہ کے حق میں سبب نار نہ بن سکی کیونکہ وہ لوگ مجتہد تھے اور ان کی نیت حق وصواب ہی کی تھی، جس طرح علامہ تورپشتی نے اپنی کتاب عقائد میں لکھا کہ بہت سی احادیث میں معاصی پر وعید نار آئی ہے لیکن وہ معاصی سبب نار ہوکر بھی ترتب مسبب سے خالی ہوسکتے ہیں کیونکہ مسببات کا ترتب دوسرے امور ارتفاع موانع و وجود شرائط وغیرہ پر بھی موقوف ہوتا ہے اور بسا اوقات غیر ظاہری و مخفی ہوتا ہے اور شریعت کسی امر حسی پر نار کا حکم کردیتی ہے۔ واللہ اعلم۔

خلافت حضرت علیؓ

اس حدیث بخاری سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چوتھے نمبر پر خلافت برحق ان ہی کی تھی اور ان کی مخالفت بغاوت تھی، اگر چہ امر اجتہادی ہونے کی وجہ سے حضرت معاویہ اور ان کے ساتھی ماخوذ نہ ہوں، اس کے لئے ہدایہ کا حوالہ اوپر حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشاد میں گذر چکا ہے اور فتح القدیر و شرح فقہ اکبر و احکام القرآن ابن عربی وغیرہ میں بھی اسی طرح ہے اور عملاً بھی ایک شام کے صوبے کو چھوڑ کر جزیرۃ العرب اور اس کے علاوہ تمام اسلامی مقبوضات کے مسلمانوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کو مان لیا تھا اور مدینہ طیبہ میں تو دوسرے خلفاء سابقین کی طرح اکابر مہاجرین و انصار نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کر لی تھی۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا کہ مروان کو برا کہنا خصوصاً اس سلوک کی وجہ سے جو اس نے حضرت حسینؓ و دیگر اہل بیت کے ساتھ روا رکھا، اس سے دل بیزاری رکھنا لوازم سنت و محبت اہل بیت سے ہے، جو فرائض ایمان کا مقتضیٰ ہے، لیکن حضرت معاویہؓ ایک صحابی تھے، ان کے حق میں بعض احادیث بھی وارد ہیں اور علماء اہلسنت ان کے بارے میں مختلف ہیں، علماء ماوراء النہر اور مفسرین و فقہاء ان کی تمام حرکات جنگ و جدال کو جو حضرت علیؓ سے کیں، خطاء اجتہادی پر محمول کرتے ہیں اور محققین اہل حدیث نے تتبع روایات صحیحہ کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ حرکات شائبہ نفسانی اور تعصب اموییت و قریشیت سے خالی نہ تھیں، پس ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ اور باغی ہوں گے جس سے فسق لازم ہوا، مگر فاسق پر لعنت جائز نہیں، لہٰذا ان کے لئے دعاء مغفرت و شفاعت کریں تو بہتر ہے۔ (فتاویٰ عزیزی ص ۱۷۷ ج ۱)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا کہ اس حدیث رسول ﷺ سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت امام وقت پر بغاوت کرنے کے بعد منعقد ہوگی (ازالۃ الخفاء ۵۲۹ ج ۱) اور لکھا کہ حضرت معاویہؓ خود کہتے تھے کہ میرے دل میں خلافت کی خواہش اس وقت سے ہے کہ حضور علیہ السلام سے میں نے یہ سنا تھا کہ اے معاویہ! اگر تم بادشاہ ہو جاؤ تو لوگوں کے ساتھ نیکی کرنا اور وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ میں خلیفہ نہیں ہوں بلکہ بادشاہان اسلام کا پہلا بادشاہ ہوں اور جب تم میرے بعد بادشاہوں کا تجربہ کرو گے تو اس وقت میری قدر جانو گے، الخ (ازالۃ الخفاء ص ۳۴۵ ج ۱)

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ علماء اہل سنت میں سے کوئی بھی ایسا نہیں گذرا جس نے حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کو چوتھا خلیفہ راشد تسلیم نہ کیا ہو یا ان کی بیعت کے صحیح ہونے میں شک کیا ہو، بلکہ علماء حنفیہ نے تو ان کی خلافت کے اقرار کو عقائد اہل سنت میں سے ایک عقیدہ قرار دیا ہے، اور یہ بھی سب ہی نے تسلیم کیا ہے کہ ان کے ساتھ جتنی لڑائیاں ہوئیں ان سب میں حق ان ہی کے ساتھ تھا، البتہ اس سلسلہ میں بھی علامہ ابن تیمیہؒ کا تفرد معلوم ہوتا ہے جیسا کہ منہاج السنہ کی بعض عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے، ملاحظہ ہو ترجمہ عبادات منہاج السنہ کے لئے کتاب ''امام ابن تیمیہ'' افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری مدراسی ص ۵۰۰ و ص ۵۰۹۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب الاستعانة بالنجار والصناع فی اعواد المنبر و المسجد

(بڑھائی اور کاریگر سے مسجد اور منبر کے تختوں کو بنوانے میں تعاون حاصل کرنا)

۴۳۲. حدثنا قتیبة بن سعید قال حدثنا عبدالعزیز عن ابی حازم عن سهل قال بعث رسول اللهﷺ الی امرأة مری غلامک النجار یعمل لی اعوادا اجلس علیهن.

۴۳۳. حدثنا خلاد بن یحییٰ قال حدثنا عبدالواحد ایمن عن ابیه عن جابر ابن عبدالله ان امرأة قالت یا رسول الله الا اجعل لک شیئاً تقعد علیه فان لی غلاماً نجاراً قال ان شئت فعملت المنبر.

ترجمہ۴۳۲: حضرت سہلؓ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کے یہاں آدمی بھیجا کہ وہ اپنے بڑھئی غلام سے کہیں کہ میرے لئے (منبر) لکڑیوں کے تختوں سے بنادے جس پر میں بیٹھا کروں۔

ترجمہ۴۳۳: حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک عورت نے کہا یا رسول اللہ کیا میں آپ کے لئے کوئی ایسی چیز نہ بنادوں جس پر آپ بیٹھا کریں میری ملکیت میں ایک بڑھئی غلام بھی ہے، آپ نے فرمایا کہ اگر چاہو تو منبر بنوادو، تب انہوں نے منبر بنوادیا۔

تشریح: دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ کسی بھی کار خیر میں دوسروں کی مدد حاصل کرنا مطابق سنت ہے، جس طرح یہاں حضور علیہ السلام نے ایک عورت سے مدد لی کہ وہ اپنے غلام سے منبر بنوادے، پھر یہ کہ بظاہر اس عورت نے ہی حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کش کی ہوگی کہ منبر بنوادوں گی، پھر جب بنوانے میں تاخیر محسوس کی تو حضور علیہ السلام نے یاد دہانی کی ہوگی جس کو راویوں نے اپنے اپنے طریقہ سے روایت کردیا، لہٰذا دونوں احادیث میں باہم کوئی تعارض نہیں ہے۔ (فتح الباری وعمدہ)

(نوٹ) امام بخاری اگر ترتیب بدل دیتے تو یہ صورت زیادہ واضح ہوجاتی۔

باب من بنیٰ مسجداً

(جس نے مسجد بنوائی)

۴۳۴. حدثنا یحیی بن سلیمان حدثنا ابن وهب قال اخبرنی عمر و ان بکیراً حدثه ان عاصم بن عمر بن قتادة حدثه انه سمع عبید الله الخولانی انه سمع عثمان بن عفانؓ یقول عند قول الناس فیه حین بنیٰ مسجدا الرسول اللهﷺ انکم اکثرتم وانی سمعت رسول اللهﷺ یقول من بنیٰ مسجدا قال بکیر حسبت انه قال یبتغی به وجه الله بنی الله له مثله فی الجنة.

ترجمہ: حضرت عبیداللہ خولانی نے حضرت عثمان بن عفانؓ سے سنا کہ آپ نے مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی (اپنے ذاتی خرچ سے) تعمیر کے متعلق لوگوں کے اعتراضات کو سن کر فرمایا کہ تم لوگ بہت زیادہ تنقید کرنے لگے، حالانکہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا تھا کہ جس نے مسجد بنوائی (بکیر راوی) نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے مقصود خداوند تعالیٰ کی رضا ہو تو اللہ تعالیٰ ایسا ہی ایک مکان جنت میں اس کے لئے بنائیں گے۔

تشریح: اس حدیث میں مسجد بنانے کی فضیلت بیان ہوئی اور علامہ عینیؒ نے ۲۳ صحابہ سے دوسری احادیث فضیلت بھی اس موقع پر نقل کی ہیں، ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ مسجد بنانے والے کو بطور اجر وثواب کے جنت میں یاقوت اور موتیوں سے مرصع گھر ملے گا، رہا یہ

اشکال کہ اور سب اعمال خیر کا تو دس گنا اجر ملے گا، اس کا صرف مثل یا برابر کیوں ہوگا تو اول تو مثلیت سے زیادہ کی نفی نہیں ہوتی اور بہتر جواب یہ ہے کہ ہر عمل کے اجر میں برابری تو عدل ہے اور کم و کیف میں زیادتی حق تعالیٰ کا محض فضل و انعام ہے۔ (عمدہ ص ۳۹۹)

حافظ نے لکھا کہ ایک بہتر جواب یہ بھی ہے کہ اس کی جزا میں گھر تو جنت میں ایک ہی ملے گا مگر کیفیت میں اس سے کہیں بہتر ہوگا کہ دنیا میں بھی ایک گھر ایک سو گھروں سے بھی زیادہ شاندار ہوتا ہے، علامہ نووی نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ یہ مراد ہو کہ اس ایک گھر کی فضیلت بیوت جنت پر ایسی ہوگی جیسی یہاں مسجد کی بیوت دنیا پر ہے (فتح ص ۳۶۷) (کیونکہ حدیث امام احمد سے مروی ہے کہ یہاں جو مسجد بنائے گا اس کو جنت میں اس سے افضل گھر ملے گا)

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ دنیا کی مسجدیں اسی طرح جنت میں اٹھالی جائیں گی، غالباً یہ کسی حدیث کا مضمون ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

باب یاخذ بنصول النبل اذا مر فی المسجد

(جب مسجد سے گزرے تو اپنے تیر کے پھل کو تھامے رکھے)

۴۳۵. حدثنا قتیبة بن سعید قال حدثنا سفیان قال قلت لعمرو اسمعت جابر ابن عبدالله یقول مر رجل فی المسجد ومعه سهام فقال له رسول الله ﷺ امساب بنصالها.

ترجمہ: حضرت سفیان نے بیان کیا کہ میں نے عمرو سے پوچھا کہ تم نے جابر بن عبداللہ سے سنا ہے کہ ایک شخص مسجد نبوی سے گزرا وہ تیر لئے ہوئے تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اس کے پھل کو تھامے رکھو۔

تشریح: تیروں کو تھامنے اور سنبھالنے کا حکم اس لئے دیا کہ کسی نمازی کو تکلیف نہ پہنچ جائے، یوں ضرورۃً اسلحہ کو اپنے ساتھ مسجد میں لے جانے کا جواز بھی معلوم ہوگیا، امام بخاری نے تاریخ اوسط میں حدیث نقل کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے مساجد کو بچوں سے، پاگلوں سے، بیع و شعراء سے، جھگڑوں سے، چیخ و پکار سے، اقامت حدود سے اور تلواریں میان سے باہر نکالنے اور اشعار پڑھنے سے منع فرمایا اور حکم فرمایا کہ مساجد کے دروازوں کے قریب وضو خانے اور غسل خانے بنائے جائیں اور جمعہ کے روز مساجد میں خوشبو کی دھونی بھی دی جائے (عمدہ ۴۰۰ ج ۲)

باب المرور فی المسجد

(مسجد سے گذرنا)

۴۳۶. حدثنا موسی بن اسماعیل قال حدثنا عبدالواحد قال حدثنا ابو بردة ابن عبدالله قال سمعت ابا بردة عن ابیه عن النبی ﷺ قال من مر فی شیء من مساجدنا او اسکوا تنا بنبل فلیاخذ علی نصالها لا یعقر بکفه مسلماً.

ترجمہ ۴۳۶: حضرت ابو بردہ ابن عبداللہ نے بیان کیا کہ میں نے اپنے والد سے سنا وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے تھے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ہماری مساجد یا ہمارے بازاروں سے تیر لئے ہوئے گذرے تو اسے اس کے پھل کو تھامے رکھنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ اس سے کسی مسلمان کو زخمی کردے۔

تشریح: یہاں بازاروں کے لئے بھی وہی حکم مساجد والا بیان ہوا ہے۔

باب الشعر فی المسجد

(مسجد میں اشعار پڑھنا)

۴۳۷. حدثنا ابو الیمان الحکم بن نافع قال اخبرنا شعیب عن الزهری قال اخبرنی ابوسلمة ابن عبدالرحمن بن عوف انه سمع حسان بن ثابت ن الانصاری یستشهد ابا هریرة انشدک الله هل سمعت النبی ﷺ یقول یا حسان اجب عن رسول الله اللهم ایده بروح القدس قال ابو هریرة نعم.

ترجمہ: حضرت ابوسلمہ ابن عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ سے سنا کہ وہ ابو ہریرہؓ کواس بات پر گواہ بنا رہے تھے کہ میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اے حسان رسول اللہ ﷺ کی طرف سے (مشرکوں کو اشعار میں) جواب دو، اے اللہ حسان کی روح القدس (جبریل علیہ السلام) کے ذریعے مدد کیجئے، حضرت ابو ہریرہ نے فرمایاہاں (میں گواہ ہوں)

متعلق حدیث: حدیث بخاری میں اگرچہ مسجد کا ذکر نہیں ہے مگر بخاری بدء الخلق میں حدیث لائیں گے، وہاں مسجد میں حضرت حسانؓ کے شعر پڑھنے کا ذکر ہے، مگر جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا اس سے امام بخاری عام طور سے مسجد میں اشعار پڑھنے کیلئے تو استدلال نہیں کر سکتے، یہاں تو خود حضور علیہ السلام کے حکم سے شرعی ضرورت سے پڑھوائے گئے تھے، جس سے وہ اس وقت عبادت کے حکم میں ہو گئے تھے، لہٰذا اس سے توسیع کا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا (یہ حدیث **بدء الخلق باب ذکر الملائکہ** میں ص ۴۵۶ پر، یہاں امام بخاری نے مسجد میں اشعار پڑھنے کے جواز کے لئے **باب الشعر فی المسجد** قائم کیا ہے اور حدیث الباب سے مطابقت نہیں ہے۔ (مؤلف)

تشریح: مشرکین عرب آں حضور ﷺ کی ہجو کیا کرتے تھے۔ حضرت حسانؓ خاص طور سے ان کا جواب دیتے تھے۔ آپ دربار نبوی کے بلند پایہ شاعر تھے اور مشرکوں کو خوب جواب دیتے تھے۔ آپ کے اس سلسلے میں واقعات بکثرت منقول ہیں۔ آں حضور ﷺ آپ کے جواب سے محظوظ ہوتے اور دعائیں دیتے۔ مسجد نبوی میں آپ کے لئے خاص طور سے منبر رکھ دیا جاتا اور آپ اسی پر کھڑے ہو کر صحابہؓ کے مجمع میں اشعار سناتے جس میں خود نبی کریم ﷺ بھی تشریف فرما ہوتے۔ امام بخاریؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسجد میں اشعار پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ شریعت کی حدود سے باہر نہ ہوں۔ کیونکہ خود آنحضور علیہ السلام حضرت حسان کے ذریعے مشرکین کا عرب کے خاص مزاج کے پیش نظر جواب دلواتے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام طحاویؒ نے اس پر باب باندھا ہے اور مسئلہ یہی ہے کہ اگر مسجد میں آواز زیادہ بلند نہ ہو اور اشعار میں مطالب بھی درست ہوں تو پڑھنے میں حرج نہیں ہے۔ حضرت حسانؓ کو شاہد بنانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ حضرت عمرؓ نے ان کو مسجد میں اشعار پڑھنے کی وجہ سے سزا دینی چاہی تھی، اس پر انھوں نے حدیث سے مدد لی۔ یہاں محقق عینیؒ نے لفظ نشد و انشد کی لغوی بحث بہت عمدہ کی، اور بتلایا کہ اس کا استعمال **نشدتک الله** لازمی ہی صحیح ہے اور یہ معنیً متعدی ہے لیکن فعل متعدی **انشد تک بالله** کہنا غلط ہوگا۔ (عمدہ ص ۳۰۴ ج ۲) (اس سے متعلق ایک شذرہ ص ۵۷ پر درج ہو گیا ہے)

علمی و اصولی (فائدہ)

اسی مناسبت سے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی فرمایا حق تعالیٰ کے لئے فعل لازم جیسے استوی، نزل وغیرہ آتا ہے تو ان کے مابعد متعلقات صفت خداوندی ہوتے ہیں مثلاً قول باری تعالیٰ "**استوی علی العرش**" میں معنی یہ ہوگا کہ صفت استواء کا تعلق عرش کے ساتھ ہوا اور اگر فعل متعدی ہو تو اس کا مابعد مفعول بہ ہوگا جیسے **خلق السموات والارض** میں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ استواء ونزول کو ذات خداوندی سے متعلق سمجھنا صحیح نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے (مثل ابن تیمیہ) ان کو ذات سے متعلق کر کے استواء کو بمعنی استقرار وتمکن وجلوس علے العرش مراد لیا یا نزول مثل اجسام سمجھا ہے، اس کی پوری بحث بخاری کی کتاب التوحید میں آئے گی، ان شاءاللہ۔ والامر بید اللہ (علامہ ابن تیمیہ کے تفردات جلد سابق میں بھی بیان ہوئے ہیں)

باب اصحاب الحراب فی المسجد

(نیزے والے مسجد میں)

۴۳۸. حدثنا عبدالعزیز بن عبداللہ قال حدثنا ابراھیم بن سعدعن صالح ابن کیسان عن ابن شھاب قال اخبر نی عروۃ بن الزبیر ان عائشۃ قالت لقد رایت رسول اللہ ﷺ یوماً علےٰ باب حجرتی و الحبشۃ یلعبون فی المسجد و رسول اللہ ﷺ یسترونی بر دائہ انظر الیٰ لعبھم زاد ابراھیم بن المنذر قال حدثنا ابن وھب قال اخبرنی یونس عن ابن شھاب عن عروۃ عن عائشۃ قالت رایت النبی ﷺ وسلم والحبشۃ یلعبون بحرابھم.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ کو ایک دن اپنے حجرہ کے دروازے پر دیکھا اس وقت حبشہ کے لوگ مسجد میں کھیل رہے تھے، رسول ﷺ اپنی چادر سے مجھے چھپا رہے تھے، تاکہ میں ان کے کھیل کو دیکھ سکوں، ابراہیم بن منذر سے حدیث میں یہ زیادتی منقول ہے کہ انہوں نے کہا ہم سے ابن وہب نے بیان کیا مجھے یونس نے ابن شہاب کے واسطہ سے خبر پہنچائی وہ عروہ سے وہ عائشہؓ سے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا جبکہ حبشہ کے لوگ چھوٹے نیزوں (حراب) سے مسجد میں کھیل رہے تھے۔

تشریح: بعض مالکیہ نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ لوگ مسجد میں نہیں کھیل رہے تھے بلکہ مسجد سے باہر ان کا کھیل ہو رہا تھا حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ یہ بات امام مالک سے ثابت نہیں ہے اور ان کی تصریحات کے خلاف ہے، بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کے اس کھیل پر ناگواری کا اظہار کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نیزوں سے کھیلنا صرف کھیل کود کے درجے کی چیز نہیں ہے، بلکہ اس سے جنگی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں جو دشمن کے مقابلے کے وقت کام آئیں گی۔

مہلبؒ نے فرمایا ہے کہ مسجد چونکہ دین کے اجتماعی کاموں کے لئے بنائی گئی ہے اس لئے وہ تمام کام جن سے دین کی اور مسلمانوں کی منفعتیں وابستہ ہیں مسجد میں کرنا درست ہیں اگرچہ بعض اسلاف نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسجد میں اس طرح کے کھیل قرآن وسنت سے منسوخ ہو گئے ہیں، اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ازواج مطہرات کے ساتھ کس درجہ حسن معاشرت کا لحاظ رکھتے تھے۔

علامہ عینی نے یہ بھی لکھا کہ اس سے مباح کھیل کے دیکھنے کا جواز نکلتا ہے اور عورتوں پر مردوں سے پردہ کا وجوب بھی معلوم ہوا (عمدہ ص۶۰۴ ج۲) اس حدیث سے عورتوں کا مردوں کی طرف دیکھنے کا جواز اس لئے صریح نہیں کہ مقصد کھیل دیکھنا تھا، نہ مردوں کو دیکھنا کہ وہ تبعاً تھا، پھر یہ کہ فتنہ عورتوں کے مردوں کو دیکھنے میں نسبتاً زیادہ ہے کہ وہ جلد متاثر ہوتی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حراب کا کھیل ایسا تھا جیسے ہمارے یہاں گدکا کھیلتے ہیں، پھر فرمایا کہ میرے پاس امام مالکؒ سے تصریح موجود ہے کہ یہ کھیل مسجد سے باہر حصہ میں تھا اور حضرت عائشہؓ مسجد میں تھیں اور امام مالکؒ مدینہ کے واقعات جاننے میں امام بخاری سے آگے ہیں، لہٰذا امام بخاری کا اس سے توسیع نکالنا درست نہیں۔

باب ذکر البیع والشرآء علی المنبر فی المسجد

(مسجد کے منبر پر خرید وفروخت کا ذکر)

(۴۳۹) حدثنا علی بن عبداللہ قال حدثنا سفین عن یحیی عن عمرة عن عائشة قالت اتتھا بریرة تسألھا فی کتابتھا فقالت ان شئت اعطیت اھلک ویکون الولاء لی وقال اھلھا ان شئت اعطیتھا ما بقی وقال سفین مرة ان شئت اعتقتھا ویکون الولاء لنا فلما جاء رسول اللہ ﷺ ذکرتہ ذلک فقال ابتا علیھا فاعتقیھا فانما الولاء لمن اعتق ثم قام رسول اللہ ﷺ علی المنبر وقال سفین مرة فصعد رسول اللہ ﷺ علی المنبر فقال ما بال اقوام یشترطون شروطا لیس فی کتاب اللہ من اشترط شرطاً لیس فی کتاب اللہ فلیس لہ وان اشترط مائة مرة ورواہ مالک عن یحییٰ عن عمرة ان بریرة ولم یذکر صعد المنبر.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ حضرت بریرہؓ ان سے کتابت کے بارے میں مشورہ لینے آئیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ کہ اگر تم چاہو تو میں تمہارے آقاؤں کو (تمہاری قیمت) دے دوں (اور تمہیں آزاد کردوں) اور تمہارا ولاء کا تعلق مجھ سے قائم ہو اور بریرہ کے آقاؤں نے کہا (حضرت عائشہؓ سے) کہ اگر آپ چاہیں تو جو قیمت باقی رہ گئی ہے وہ دیدیں اور ولاء کا تعلق ہم سے قائم رہے رسول اللہ ﷺ جب تشریف لائے تو میں نے ان سے تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا کہ تم بریرہ کو خرید کر آزاد کردو اور ولاء کا تعلق تو اسی کو حاصل ہوسکتا ہے جو آزاد کردے پھر رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے، سفیان نے (اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے) ایک مرتبہ کہا پھر رسول اللہ ﷺ منبر پر چڑھے اور فرمایا ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا جو ایسی شرائط کرتے ہیں جن کا کوئی تعلق کتاب اللہ سے نہیں ہے، جو شخص بھی کوئی ایسی شرط کرے گا جو کتاب اللہ میں ذکر شدہ شرائط کے مناسب نہیں ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی چاہے سو مرتبہ کرے اس حدیث کی روایت مالک نے یحیی کے واسطہ سے کی وہ عمرہ سے کہ بریرہ اور انہوں نے منبر پر چڑھنے کا ذکر نہیں کیا ہے الخ۔

تشریح: کوئی غلام اپنے آقا سے طے کرلے کہ ایک متعینہ مدت میں اتنا روپیہ یا کوئی اور چیز وہ اپنے آقا کو دے گا اگر وہ اس مدت میں وعدہ کے مطابق روپیہ آقا کے حوالہ کردے تو وہ آزاد ہوجائے گا اسی کو کتابت یا مکاتبت کہتے ہیں، غلام کی آزادی کے بعد بھی آقا اور غلام میں ایک تعلق شریعت نے باقی رکھا ہے، جسے ولاء کہتے ہیں اور اس کے کچھ حقوق بھی ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک مسجد میں خرید وفروخت کے لئے بھاؤ طے کرنا اور ایجاب وقبول جبکہ وہ سامان مسجد میں نہ ہو، معتکف کے لئے جائز ہے اور حدیث الباب ہمارے مخالف نہیں ہے، کیونکہ یہاں صرف مسئلہ بیان ہوا ہے نہ بیع ہوئی نہ شراء اور حدیث ابی داؤد وغیرہ میں عقد بیع وشراء فی المسجد کی ممانعت موجود ہے۔

مکاتب کی بیع ہمارے یہاں جائز نہیں، دوسروں کے نزدیک جائز ہے مگر ہمارے یہاں مکاتب کے بدل کتابت سے عاجز ہونیکی شکل میں جائز ہے اور یہاں جو حضور علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس کو خرید کر آزاد کردو تو بظاہر عجز ہی کی صورت میں خریدنے کو فرمایا ہوگا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ **اشترطی لھم الولاء** کہ تم ان کے لئے ولا کی شرط کرلو تو اس پر اشکال ہوا کہ جب شرط بیکار ہے اور ہر صورت ولا حضرت عائشہؓ کے لئے ہوتا تو پھر ایسی بے فائدہ شرط کرنے کو کیوں فرمایا، دوسرے یہ کہ اس میں خلف وعدہ بھی لازم ہوا کہ شرط کرکے پھر بھی ولاء کا حق ان کو نہیں دے سکتی تھیں، اس کا جواب یہ ہے کہ بخاری میں ہی دوسرے طریق سے **دعیھم لیشترطوا** آیا ہے کہ ان کو شرط کرنے دو، ولاء تو اسی کا ہوگا جو آزاد کرے گا۔ حضرت شاہ صاحبؒ

نے اس موقع پر ایک تحقیق شروط ملائمہ وغیر ملائمہ کی ذکر فرمائی جو میرے امالی درس میں بھی ہے اور فیض الباری ص ۵۶ ج ۲ میں بھی ہے، وہاں دیکھ لی جائے، بخوف طوالت ترک کرتا ہوں، عمدۃ القاری ص ۴۱۳ ج ۲ میں بھی اس کی اچھی تفصیل وتحقیق ہے، قابل مطالعہ اور حضرتؒ نے فرمایا تھا کہ ہدایہ میں کفالۃ وبیع فاسد کے بیان میں بھی ملائم وغیر ملائم کی قدرے تفصیل ہے۔

باب التقاضی والملازمة فی المسجد

(قرض کا تقاضا کرنا اور مسجد میں بھی قرضدار کا پیچھا کرنا)

(۴۴۰) حدثنا عبدالله بن محمد قال حدثنا عثمان بن عمر قال اخبرنی یونس عن الزهری عن عبدالله بن کعب بن مالک عن کعب انه تقاضی ابن ابی حدرد دینا کان له علیه فی المسجد فارتفعت اصواتهما حتیٰ سمعها رسول الله ﷺ وهو فی بیته فخرج الیهما حتیٰ کشف سجف حجرته فنادیٰ یا کعب قال لبیک یا رسول الله قال ضع من دینک هٰذا واومأ الیه ای الشطر قال لقد فعلت یا رسول الله قال قم فاقضه.

ترجمہ: حضرت کعب سے روایت ہے کہ انہوں نے مسجد نبوی میں ابن ابی حدرد سے اپنے قرض کا تقاضہ کیا (اسی دوران میں) دونوں کی گفتگو تیز ہوگئی اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے حجرۂ شریفہ سے سن لیا، آپ پردہ ہٹا کر باہر تشریف لائے اور پکارا کعب! کعبؓ، بولے لبیک یا رسول اللہ، آپ نے فرمایا کہ تم اپنے قرض میں سے اتنا کم کردو، آپ کا اشارہ تھا کہ آدھا کم کردیں، انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں نے کردیا، پھر آپ نے ابی حدرد سے فرمایا اچھا اب اٹھو اور ادا کردو۔

تشریح: یہاں تو صرف قرض کے تقاضے کا ذکر ہے، ملازمت کا نہیں، مگر باب الصلح میں امام بخاری اس حدیث کو پھر لائیں گے اور وہاں فلقیہ فلزمہ ہے کہ قرض دار سے ملے اور پھر اس کو چھوڑا نہیں، اس طرح آدھا موضع ترجمہ یہاں ہے اور آدھا وہاں ہے اس کو امام بخاری کے کمالات سے گنا گیا ہے کہ حدیث کے تمام طرق ومتون میں ذہن گھومتا رہا ہے اور یہی فن حدیث میں کمال کی نشانی ہے اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب تک کسی حدیث کے تمام متون وطرق روایت پر نظر نہ ہو، پوری طرح کسی مسئلہ کی تنقیح نہیں ہوسکتی، اللہ تعالیٰ امام اعظم پر ہزاراں ہزار رحمتیں بھیجے کہ انہوں نے تدوین فقہ کے وقت اس امر کی بہت ہی زیادہ رعایت رکھی تھی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ احادیث ناسخہ ومنسوخہ کا بھی ان کے پاس بہت بڑا علم تھا۔

قولہ وہو فی بیتہ: کہ آپ اس جھگڑے کے وقت اپنے گھر میں تھے، آگے ہے کہ آپ ان کی آواز سن کر حجرہ شریفہ سے نکلے اور حجرۂ شریفہ کا پردہ ہٹایا (سجف اس پردہ کو کہتے ہیں جس کے دو حصے ہوں ملے ہوئے دو کواڑوں کی طرح، کذا فی العمدہ ص ۴۱۶ ج ۲ غالباً جس طرح آج کل بھی کمرہ کے دروازوں پر پردے ڈالتے ہیں، جو دائیں بائیں سمٹ کر کھل جاتے ہیں) دوسری شرح بعض شارحین نے یہ کی ہے کہ حضور علیہ السلام اس وقت گھر میں نہیں بلکہ مسجد میں معتکف تھے، جو بوریوں سے بنایا گیا تھا، حافظ عینی نے یہاں کچھ وضاحت نہیں کی، مگر بیت اور سجف کے الفاظ پہلی شرح کو ترجیح دے رہے ہیں کہ بوریوں کے معتکف کی یہ شان نہیں ہوتی، یوں راویوں کے بیان میں بھی فروق ہوجاتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے اسی جھگڑے کیوجہ سے اس سال کی لیلۃ القدر کی تعیین کا علم ذہن مبارک نبوی سے نکل گیا ہو، یا وہ کوئی اور جھگڑا ہوگا۔ واللہ اعلم

قولہ فاقضہ: حضرتؒ نے فرمایا کہ بعض امور کا تعلق مروۃ وحسن معاملہ سے ہوتا ہے، مگر بعض علماء ان کو فقہی جواز عدم جواز کی طرف کھینچ لیتے ہیں، یہ اچھا نہیں اور ایک بیدار مغز عالم کو تیقظ سے کام لینا چاہئے۔

نیز فرمایا کہ شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر میں کلام فی المسجد کے لئے لکھ دیا کہ وہ نیکیوں کو کھا جاتا ہے، حالانکہ بحر میں قید لگائی ہے کہ اگر مسجد میں باتیں کرنے کے ارادے سے جائے اور باتیں کرے تو مکروہ ہے، ورنہ اگر گیا تو نماز ہی کے لئے تھا اور وہاں سے کسی سے باتیں کیں تو گناہ نہیں ہے۔

باب کنس المسجد و التقاط الخرق و القذیٰ العیدان

(مسجد میں جھاڑو دینا اور مسجد سے چیتھڑے، کوڑے کرکٹ اور لکڑیوں کو چن لینا)

(۴۴۱) حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا حماد بن زید عن ثابت عن ابی رافع عن ابی ھریرۃ ان رجلاً اسود او امرأۃ سوداء کان یقم المسجد فمات فسال النبی ﷺ عنہ فقالو مات فقال افلا کنتم اذ نتمونی بہ دلونی علی قبرہ او قال قبرھا فاتی قبرھا فصلی علیھا۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک حبشی مرد یا حبشی عورت مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی ایک دن اس کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق دریافت فرمایا لوگوں نے بتایا کہ وہ تو انتقال کر گئی آپ نے فرمایا کہ تم نے مجھے کیوں نہ بتایا اچھا اس کی قبر تک مجھے لے چلو، پھر آپ قبر پر تشریف لائے اور اس پر نماز پڑھی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری اپنی عادت کے موافق بہت سی ان جزئیات پر بھی ابواب وتراجم کو پھیلا دیتے ہیں جن کا ذکر احادیث میں آ گیا ہے اگرچہ ان پر مسائل واحکام کا دارومدار بھی نہیں ہوتا، چنانچہ یہاں مسجد میں جھاڑو دینے پر باب قائم کر دیا جبکہ وہ نہ کوئی خاص مسئلہ ہے نہ کسی کو اس سے اختلاف، صرف فضیلت مقصد بن سکتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کوڑے کرکٹ کو مسجد سے باہر کرنے کو مسجد کی کنکریاں باہر نکالنے کے حکم سے الگ سمجھا جائے کیونکہ ابوداؤد میں باب فی حصی المسجد کو باب فی کنس المسجد سے الگ باندھا ہے اور اس میں ہے کہ اگر کنکریوں کو کوئی باہر نکالے تو وہ اس کو قسم دیتی ہیں کہ مجھے خدا کے واسطے مسجد میں رہنے دے، تاکہ ان کو مسجد ایسی مبروک ومبارک جگہ میں رہنے کا شرف وفضل حاصل رہے یا اس لئے کہ نمازیوں کو ان سے آرام ملے گا۔ (بذل ص ۲۶۵ ج ۱)

حضرتؒ نے فرمایا کہ اگر ان کا مسجد میں رہنا صفائی کیخلاف ہو یا بےضرورت ہوں تو نکالنا ہی افضل ہوگا، اگرچہ وہ اپنے فضل وشرف کے لئے قسم دیتی رہیں گی، لیکن جسطرح مسجد حرام یا مسجد نبوی میں کنکریاں بچھی رہتی ہیں، ان کے متعدد فوائد ہیں، اس لئے ان کو نہ نکالنا ہی افضل ہوگا (کہ ان کی وجہ سے فرش گرم نہیں ہوتا اور بارش ہو جائے تو وہ جگہ پھر بھی نماز کے لائق رہتی ہے وغیرہ ابتداء اسلام میں اسی لئے مسجد نبوی میں کنکریاں ڈالی گئی تھیں۔ واللہ اعلم)

قولہ فصلے علیھا: حضور علیہ السلام نے اس عورت کی قبر پر تشریف لے جا کر نماز پڑھی اور آپ کے ساتھ دوسرے صحابہ نے بھی پڑھی (کذافی موطأ امام مالکؒ) اس بارے میں اختلاف مذاہب اس طرح ہے:- امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ فقط ولی[1] پڑھ سکتا ہے اور وہ دوسری اموات کی بھی پڑھ سکتا ہے اگرچہ اس کے علاوہ دوسروں نے بھی پڑھی ہو اور اس کو امام ابو یوسف نے تین روز تک جائز بتلایا ہے، امام شافعی، احمد، داؤد ظاہری اور ایک جماعت کہتی ہے کہ قبر پر ہر شخص نماز پڑھ سکتا ہے جس کی بھی رہ گئی ہو، ابن القاسم کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے کہا آپ اس حدیث مذکور کا کیا جواب دیتے ہیں؟ تو فرمایا یہ حدیث تو صحیح ہے مگر اس پر عمل نہیں ہے (امام احمد نے فرمایا کہ یہ حدیث چھ طرق

[1] حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمارے بعض مشائخ سے اس امر کا بھی جواز منقول ہے کہ ولی کے ساتھ دوسرے بھی جو رہ گئے ہوں نماز پڑھ سکتے ہیں، یہاں بھی عورت کی نماز میں دوسرے صحابہ شریک ہوئے اور حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد ولی حضرت صدیق اکبرؓ تھے اور آپ نے خلافت سنبھالنے کے بعد سب سے آخر میں حضور کی نماز پڑھی ہے اور یہ بھی روایت میں نے دیکھی ہے کہ آپ کے ساتھ بھی بعض صحابہ نے نماز پڑھی تھی۔

حسان سے ثابت ہے، علامہ ابن عبدالبر نے کہا بلکہ نو وجوہ حسان سے اور پھر تمہید میں وہ تمام طرق ذکر کئے علامہ زرقانی نے ایک کا اضافہ کیا، کل دس ہوئے) پھر علامہ ابن رشد نے لکھا کہ امام ابوحنیفہ نے غالباً ان احادیث پر اپنے قاعدہ کے موافق اخبار آحاد ہونے کی وجہ سے عمل نہیں کیا، وہ کہتے ہیں کہ ایسی اخبار آحاد جو باوجود عموم بلویٰ کے بھی مشہور و منتشر نہ ہوئی ہوں اور نہ ان پر عام طور سے عمل کیا گیا ہو، یہ ان کے ضعف کی دلیل ہے اور اس لئے ان کے صدق کا غلبۂ ظن نہیں ہوتا بلکہ منسوخ ہونے کا بھی گمان ہوتا ہے۔

ابن رشد اور حنفیہ

علامہ نے اس کے بعد یہ بھی لکھا کہ ہم مالکیہ کا اصول تعامل و عدم تعامل اہل مدینہ سے استدلال کا پہلے بتا چکے ہیں اور اس نوع استدلال کا نام حنفیہ نے عموم بلویٰ رکھا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں جنس واحد سے ہیں۔ (بدایۃ المجتہد ص ۲۰۳ ج ۱)

حنفیہ پر رد اخبار آحاد کا بڑا اعتراض ہوا ہے، یہاں علامہ ابن رشد نے بڑے کام کی بات کہی ہے اس لئے اس کو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور مذاہب کے بارے میں بھی ان کی تنقیح عمدہ اور معتمد ہوتی ہے، اس لئے ذکر کی گئی۔

افادات انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں حدیث الباب میں بھی حنفیہ نے کہا کہ حضور علیہ السلام ساری امت کے ولی تھے، لہٰذا آپ نے بھی آخر میں قبر پر جا کر پڑھی، جبکہ اس کی نماز پہلے پڑھی جا چکی تھی اور خصائص کبریٰ سیوطی میں ہے کہ حضور علیہ السلام کی شرکت ممکن ہوتے ہوئے بغیر آپ کے کسی کی نماز جنازہ درست ہی نہ تھی یہ رائے جن حضرات کی تھی، میرے نزدیک بہت ہی حق وصواب تھی اور یہ بات تتبع آثار سے بھی ثابت معلوم ہوتی ہے کہ نماز خواہ وہ وقتیہ تھی یا نماز جنازہ کی وہ بدوں حضور کے صحیح نہ تھی اور غالباً حضرت صدیق اکبرؓ نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا تھا جب مرض وفات نبوی میں حضور نے اپنی جگہ امامت کے لئے فرمایا کہ ابن ابی قحافہ کی کیا مجال ہے کہ آپ کے سامنے آگے بڑھے، مقصد یہ تھا کہ غیر نبی کو نبی کا امام بننے کا حق نہیں ہے، لیکن یہ بھی مسند احمد میں ہے کہ کسی نبی کی وفات اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ کوئی امتی اس کا امام نہ بنے اور گویا یہی قرب وفات نبوی کی نشانی ہوتی ہے کیونکہ دین مکمل ہو چکا اور امت اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بن گئی، حتیٰ کہ ایک امتی اپنے نبی کا امام بھی بننے کے لائق ہو گیا، اگر کہا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت حضرت مہدی علیہ السلام کیونکر امامت کریں گے جبکہ غیر نبی، نبی کا امام نہیں ہو سکتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف پہلی نماز پڑھیں گے اور وہ بھی باجازت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوگی اور اس لئے بھی کہ اقامت ہو چکی ہوگی، حضرت مہدی مصلائے امامت پر پہنچ چکے ہوں گے صرف تحریمہ باقی ہوگی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دفعۃً اتر کر شرکت نماز فرمائیں گے اور اس وقت حضرت مہدی کو مصلائے امامت سے پیچھے ہٹانا اس لئے بھی مناسب نہ ہوگا کہ اس سے عدم اہلیت امامت کا شبہ ہوگا اور اسی لئے بعض روایات میں حضرت عیسیٰ کا یہ فرمانا بھی منقول ہوا ہے کہ ''انما لک اقیمت'' (اقامت آپ ہی کے لئے کہی گئی ہے) اور شاید یہ الفاظ حضرت مہدی کے ارادہ تأخر ہی کو دیکھ کر آپ فرمائیں گے تاکہ پیچھے نہ ہٹیں، پھر پہلی نماز کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی مستقل طور سے امام رہیں گے۔

اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیث الباب کی وجہ سے علوۃ علی القبر کا عدم جواز اس لئے بھی نہیں ثابت ہوتا کہ حضور علیہ السلام نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ ان قبور کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور حق تعالیٰ میری نماز کی وجہ سے اہل قبور کے لئے نور عطا فرما دیتے ہیں (مسلم شریف) تو اس سے حضور کی خصوصیت معلوم ہوئی جو دوسروں کے لئے ثابت نہیں ہے اگر امام شافعی وغیرہ قائلین جواز الصلوٰۃ علی القبر اس کا ثبوت دیں تو دوسری بات ہے، ایسے ہی امام محمدؒ نے غائبانہ نماز کے بارے میں بھی خصوصیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ دوسرے حضور علیہ اسلام کی طرح نہیں ہیں۔

باب تحريم تجارة الخمر في المسجد

(مسجد میں شراب کی تجارت کی حرمت کا اعلان)

۴۴۲. حدثنا عبدان عن ابی حمزة عن الاعمش عن مسلم عن مسروق عن عائشة قالت لما انزلت الأیات من سورة البقرة فی الربوا خرج النبی ﷺ الی المسجد فقرأهن علی الناس ثم حرم تجارة الخمر.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب سورہ بقرہ کی ربا سے متعلق آیات نازل ہوئیں تو نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے اوران آیات کی لوگوں کے سامنے تلاوت کی، پھر شراب کی تجارت کو حرام قرار دیا۔

تشریح: یعنی شراب جیسی حرام وخبیث چیز کی حرمت کا مسئلہ مسجد کے اندر بیان کیا جاسکتا ہے، شراب اور ربوا کا حکم ساتھ اس لئے بیان کیا کہ سود کھانے والے اور شراب پینے والے یکساں طور سے شیطان کے زیر اثر ہوتے ہیں، حرمت ربوا کی تاریخ امام طحاوی کی مشکل الآثار میں دیکھی جائے یہ بھی اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے اصول سے دارالحرب میں ربوا حلال ہے یعنی مسلم کو کافر سے لینا (کیونکہ اموال کفار دارالحرب کے لئے عصمت موثمہ حاصل نہیں ہے، التفصیل باقی فی محلّہ، ان شاء اللہ)

باب الخدم للمسجد وقال ابن عباس نذرت لک مافی بطنی محرراً للمسجد يخدمه

(مسجد کے لئے خادم) حضرت ابن عباسؓ نے (قرآن کی اس آیت) ''جو اولاد میرے بطن میں ہے اسے تیرے لئے آزاد چھوڑ نے کی میں نے نذر مانی ہے'' کے متعلق فرمایا کہ مسجد کے لئے چھوڑ دینے کی نذر مانی تھی کہ اس کی ایک خدمت کیا کریگا)

۴۴۳. حدثنا احمد بن واقد حدثنا حماد عن ثابت عن ابی رافع عن ابی هريرة ان امرأة او رجلاً كانت تقم المسجد ولا اراه الا امرأة فذكر حديث النبی ﷺ انه صلے علی قبرها.

ترجمہ ۴۴۳: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت یا مرد مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا، ثابت نے کہا میرا خیال ہے کہ وہ عورت ہے پھر انہوں نے نبی کریم ﷺ کی حدیث نقل کی کہ آپ نے اس کی قبر پر نماز پڑھی۔

تشریح: یہ حضرت عمران کی بیوی اور حضرت مریم کی والدہ کا واقعہ ہے اور آپ نے نذر مانی تھی کہ میرا جو بچہ پیدا ہوگا اسے مسجد کی خدمت کے لئے وقف کردوں گی، امام بخاریؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ گذشتہ امتوں میں بھی مساجد کی تعظیم کے پیش نظر اپنی خدمات اس کے لئے پیش کی تھیں اور وہ اس میں اس حد تک آگے تھے کہ اپنی اولاد کو مسجد کی خدمت کے لئے وقف بھی کردیا کرتے تھے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان امتوں میں اولاد کو نذر کردینا صحیح تھا، چونکہ لڑکوں کی نذر یہ لوگ کیا کرتے تھے اور امرءۃ عمران کے لڑکی پیدا ہوئی، اس لئے آپ نے اپنے رب سے معذرت کی کہ ''میرے رب میرے تو لڑکی پیدا ہوئی، الآیہ۔

باب الاسير او الغريم يربط في المسجد

۴۴۴. حدثنا اسحاق بن ابراهيم قال انا روح و محمد بن جعفر عن شعبة عن محمد ابن زياد عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال ان عفريتا من الجن تفلت علی البارحة او كلمة نحوها ليقطع علی الصلوٰة فامكننی الله منه واردت ان اربطه الیٰ سارية من سواری المسجد حتیٰ تصبحو وتنظرو اليه كلكم فذكرت قول اخی سليمان رب هب لی ملكاً لا ينبغی لاحد من بعدی قال روح فرده خاسئاً.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا کہ گذشتہ رات ایک سرکش جن اچانک میرے پاس

آیا، یا اسی طرح کی کوئی بات آپ نے فرمائی وہ میری نماز میں خلل انداز ہونا چاہتا تھا، لیکن خداوند تعالیٰ نے مجھے اس پر قدرت دے دی اور میں نے سوچا کے مسجد کے کسی ستون سے اسے باندھ دوں تاکہ صبح کو تم سب بھی اسے دیکھو لیکن مجھے اپنے بھائی سلیمان کی یہ دعا یاد آ گئی ''اے رب مجھے ایسا ملک عطا کیجئے جو میرے بعد کسی کو حاصل نہ ہو'' راوی حدیث روح نے بیان کیا کہ آں حضور نے اس شیطان کو نامراد واپس کر دیا۔

تشریح: عہد نبوت میں جیل خانہ نہ تھا، بلکہ مسجد میں بٹھلا دیتے تھے اور وہاں سے کہیں کو جانے نہ دیتے تھے، پہلا جیل خانہ حضرت عمر نے مکہ معظمہ میں ایک گھر خرید کر بنایا تھا (افادہ الشیخ الانورؒ)

عفریت:- سرکش، طاغی، تفلت علی:- منصف عبدالرزاق میں ہے کہ جن یا شیطان بلی کی شکل میں آیا تھا اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی میں ہے کہ وہ آپ کی طرف آگ کا شعلہ لے کر بڑھا تا کہ آپ گھبرا کر نماز توڑ دیں۔

قولہ لاینبغی لاحد من بعدی

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے اس دعاء سلیمانی کو ظاہر و عموم پر رکھا، ورنہ اس ایک واقعہ سے اس دعا کی حقیقی مراد پر کوئی اثر نہ پڑتا، پھر فرمایا کہ دعاؤں اور نذروں کے الفاظ و ظاہر پر ہی حکم ہوتا ہے، غرض و معنی پر نہیں، جیسا کہ مسند احمد میں ہے، ایک دفعہ حضور علیہ السلام حضرت عائشہؓ کے پاس تھے، کسی بات پر آپ نے ان کو فرمادیا، مالک قطع الله یدیک (تمہیں کیا ہوا، اللہ تمہارے ہاتھ کاٹے) پھر باہر تشریف لے گئے، واپس آئے تو حضرت عائشہؓ کے ہاتھ سے خون نکل رہا تھا، فرمایا، یہ کیا؟ کہا کہ دعا آپ کی! پھر آپ نے دعا فرمائی تو اچھا ہو گیا اور اسی لئے حدیث مشکوۃ میں ہے کہ اولاد کو بددعا نہ دو! ممکن ہے کہ وقت قبولیت ہی کا ہو، حضور نے ہاتھ کاٹنے کا ارادہ نہیں فرمایا تھا، مگر تکوین الٰہی آپ کے الفاظ ہی پر جاری ہو گئی۔

باب اغتسال اذا اسلم و ربط الا سیر ایضاً فی المسجد و کان شریح یامر الغریم ان یحبس الیٰ ساریة المسجد

(اسلام لانے کے وقت غسل کرنا اور قیدی کو مسجد میں باندھنا، قاضی شریحؒ قرضدار کے متعلق حکم دیا کرتے تھے کہ اسے مسجد کے ستون سے باندھ دیا جائے)

۴۴۵. حدثنا عبدالله بن یوسف قال حدثنا اللیث قال حدثنی سعید بن ابی سعید انه سمع ابا هریرة قال بعث النبی ﷺ خیلاً قبل نجد فجآء ت برجل من بنی حنیفة یقال له ثمامة بن اثال فربطوه بساریة من سواری المسجد فخرج الیه النبی ﷺ فقال اطلقوا ثمامة فانطلق الی نخل قریب من المسجد فاغتسل ثم دخل المسجد فقال اشهد ان لا اله الا الله و ان محمداً رسول الله.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے چند سوار نجد کی طرف بھیجے، یہ لوگ بنوحنیفہ کے ایک شخص کو جس کا نام ثمامہ بن اثال تھا پکڑ لائے، انہوں نے قیدی کو مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا، پھر نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور آپ نے فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو (رہائی کے بعد) ثمامہ مسجد نبوی سے قریب ایک باغ تک گئے اور غسل کیا پھر مسجد میں داخل ہوئے اور کہا اشہد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اسلام لانے کے لئے غسل مستحب ہے اور غسل جنابت بعد الاسلام کے لئے شرح وقایہ سے تفصیل دیکھی جائے یعنی جمہور کا مسلک یہی ہے کہ اگر اسلام قبول کرنے والا جنبی نہ ہو تو اسلام لانے کے لئے غسل واجب نہیں ہے، البتہ امام احمد واجب کہتے ہیں، لامع الدراری ص ١٨٠ ج ا میں بھی اچھی تفصیل ہے۔

باب الخيمة فى المسجد للمرضىٰ وغيرهم

(مسجد میں مریضوں وغیرہ کے لئے خیمہ)

۴۴۶. حدثنا زكريا بن يحيىٰ قال حدثنا عبدالله بن نمير قال حدثنا هشام عن ابيه عن عائشة قالت اصيب سعد يوم الخندق فى الاكحل فضرب النبى ﷺ خيمة فى المسجد ليعوده من قريب فلم يرعهم وفى المسجد خيمة من بنى غفار الا الدم يسيل اليهم فقالو يآهل الخيمة ما هذالذى ياتينا من قبلكم فاذا سعد يغذو جرحه دماً فمات منها.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ غزوہ خندق میں سعدؓ کے بازو کی ایک رگ (اکحل) میں زخم آیا تھا اس لئے نبی کریم ﷺ نے مسجد میں ایک خیمہ نصب کرادیا تھا تا کہ آپ قریب رہ کر ان کی دیکھ بھال کیا کریں، مسجد ہی میں بنی غفار کے لوگوں کا بھی ایک خیمہ تھا، سعدؓ کے زخم کا خون (جو رگ سے بکثرت نکل رہا تھا) بہہ کر جب ان کے خیمہ تک پہنچا تو وہ گھبرا گئے، انہوں نے کہا خیمہ والو؟ تمہاری طرف سے یہ کیسا خون ہمارے خیمہ تک آتا ہے، پھر انہیں معلوم ہوا کہ یہ خون سعدؓ کے زخم سے بہا ہے، حضرت سعدؓ کا انتقال اسی زخم کی وجہ سے ہوا۔

تشریح: امام بخاریؒ مسجد کے احکام میں بڑی توسع کا مسلک رکھتے ہیں، اس حدیث سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ زخمیوں اور مریضوں وغیرہ کو بھی مسجد میں رکھا جاسکتا ہے بلا کسی خاص مجبوری کے، حدیث میں جو واقعہ ذکر ہوا ہے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد نبوی سے اس کا تعلق ہے، لیکن سیرت ابن اسحاق میں یہی واقعہ جس طرح بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مسجد نبوی کا نہیں بلکہ کسی اور مسجد سے اس کا تعلق ہے پھر یہاں خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ جب غزوات وغیرہ میں تشریف لے جاتے تو نماز پڑھنے کے لئے کوئی خاص جگہ منتخب فرمالیتے اور چاروں طرف سے کسی چیز کے ذریعہ اسے گھیر دیتے تھے، اصحاب سیر ہمیشہ اس کا ذکر مسجد کے لفظ سے کرتے ہیں حالانکہ فقہی اصول کی بناء پر مسجد کا اطلاق اس پر نہیں ہوسکتا اور نہ مسجد کے احکام کے تحت ایسی مساجد آتی ہیں، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا قیام بھی اسی طرح کی مسجد میں تھا، کیونکہ غزوہ خندق سے فراغت کے فوراً بعد آں حضور ﷺ نے بنوقریظہ کا محاصرہ کیا تھا اور جیسا کہ حدیث میں ہے کہ وہ غزوہ خندق میں زخمی ہوئے تھے، اس لئے قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ جب فوراً ہی بعد آپ بنوقریظہ کے محاصرہ کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت سعدؓ کو اپنے قریب رکھ کر ان کی دیکھ بھال کے لئے آپ نے اسی مسجد میں انہیں ٹھہرایا ہوگا جو بنوقریظہ کے محاصرہ کے وقت آپ نے وقتی طور پر نماز پڑھنے کے لئے بنائی ہوگی، نماز پڑھنے کے لئے ایسی کوئی جگہ جسے اصحاب سیر مسجد لکھا کرتے ہیں، مسجد کے حکم میں نہیں ہے اور زخمی یا مریض کو بلا کسی خاص ضرورت کے ایسی مسجد میں ٹھہرانا درست ہے، مسجد نبوی بنی قریظہ سے فاصلہ پر واقع ہے اس لئے جس وقت آپ بنوقریظہ کا محاصرہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے اگر حضرت سعدؓ کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا ہوتا تو پھر انہیں قریب رکھ کر عیادت کا سوال کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔

امام بخاری کے ''باب الخیمۃ فی المسجد'' سے بظاہر یہی متبادر ہے کہ وہ خیمہ حضرت سعدؓ کو بھی مسجد نبوی سمجھے ہیں اور حافظ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے مگر حضور اکرم ﷺ کا یہ حکم کہ حضرت سعدؓ کا خیمہ مسجد میں لگادیا جائے تا کہ قریب سے ان کی دیکھ بھال فرماسکیں، بنی قریظہ سے کئی میل کے فاصلہ پر کس طرح ہوسکتا تھا، اس لئے ظاہر یہی ہے کہ ان کا الگ سے چھوٹا خیمہ آپ نے بنی قریظہ والی مسجد میں نصب کرایا ہوگا جہاں آپ غزوہ خندق سے فارغ ہوتے ہی تشریف لے گئے تھے کہ گھر آکر پوری طرح غسل بھی نہ کر پائے تھے اور حضرت جبرئیل حضرت دحیہ کلبیؓ کی صورت میں گھوڑے پر سوار باب جبریل پر آگئے اور فرمایا کہ ہم فرشتوں کی فوج نے ابھی تک ہتھیار نہیں کھولے اور حکم ربی ہے کہ فوراً بنی قریظہ کا محاصرہ کیا جائے، اس وقت حضرت جبریل کے چہرہ وغیرہ پر غزوۂ خندق کا گرد وغبار بھی موجود تھا، چنانچہ حضور علیہ السلام

نے حضرت علیؓ کو ایک دستہ فوج صحابہ کیساتھ تو فوراً ہی روانہ فرمادیا اور حکم دیا کہ ہر شخص بنی قریظہ پہنچ کر ہی نماز عصر پڑھے لیکن وہ حضرات بعد مغرب تک ہی پہنچ سکے کیونکہ فاصلہ تقریباً چار میل کا تھا مسجد قبادو میل ہے مسجد نبوی سے اور اتنا ہی فاصلہ وہاں سے بنوقریظہ تک اور ہے جیسا کہ نقشہ سے معلوم ہوگا پھر راستوں کے پیچ وخم الگ رہے کہ اس سے بھی میل سوا میل کا اضافہ ہوا ہوگا۔

اب رہا یہ کہ بظاہر رفیدہ کا خیمہ تو مسجد نبوی میں ہی رہا ہوگا تو حضرت سعدؓ کے خیمہ سے ان کے خیمہ تک خون کیونکر بہا ہوگا؟ اور اسی اشکال کی وجہ سے غالباً حافظؒ کا مذکورہ بالا رجحان ہوگا، مگر دوسری بات کے قرائن زیادہ ہیں مثلاً حضور علیہ السلام کا محاصرۂ بنی قریظہ جو تقریباً ایک ماہ رہا، ظاہر ہے کہ ۴، ۵ کلومیٹر کا فاصلہ یعودہ من قریب کے منافی ہے، دوسرے علامہ عینی نے لکھا جو بلند پایہ مورخ بھی ہیں کہ حضرت سعد کی وفات غزوہ خندق سے ایک ماہ بعد اور بنوقریظہ کے لئے فیصلہ دینے سے چند شب بعد ہوئی ہے (عمدہ ۴۲۸، ۴۵۸) تو بظاہر یہی ہے کہ حضور علیہ السلام اور صحابہ نے بھی فیصلہ کے بعد بنوقریظہ کے محلّہ سے کوچ فرمالیا ہوگا اور مسجد نبوی میں آگئے ہوں گے پھر ایک دوشب حضرت سعد کا خیمہ رفیدہ کے خیمہ سے قریب لگا ہوگا اور چونکہ اتنی مدت تک آپ کے بازو کی رگ سے خون نکلنا بند تھا، اس لئے مسجد کی تلویث کا بھی احتمال نہ رہا تھا، لیکن دوسری طرف حضرت سعد کی دعا بھی قبول ہوچکی تھی کہ ''بارالہا! اگر اس کے بعد بھی کوئی غزوہ قریش سے کرنا باقی ہے تو مجھے بھی باقی رکھ لے ورنہ اپنے پاس بلالے'' چنانچہ یہ دعا فوراً ہی قبول ہوگئی اور وہ خون کی رگ جس کو خود حضور اکرم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے داغ دے کر بند کردیا تھا، وہ پھر سے کھل گئی اور حضرت سعد جاں بر نہ ہوسکے۔ ع ''بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن''

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ لامع الدراری ص ۱۸۰ ج ۱ میں ایک احتمال یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت سعد کا خیمہ جس مسجد میں تھا وہ مسجد نبوی اور مسجد بنی قریظہ کے علاوہ بھی ہوسکتی ہے جو غزوہ خندق کے موقع پر حضور علیہ السلام کی مسجد تھی اور اس احتمال کو غیر بعید بھی فرمادیا حالانکہ یہ ابعد بعید ہے کیونکہ حضور علیہ السلام جانب شمال کے غزوہ خندق سے فارغ ہوکر مسجد نبوی پہنچ کر جانب جنوب کے بنی قریظہ کیلئے ایک ماہ کے محاصرہ کے واسطے تشریف لے جاچکے ہیں اور یہ جگہ، ....نقشہ سے معلوم ہوگا کہ غزوہ خندق والی مسجد سے تقریباً ۸، ۹ میل دور ہوجاتی ہے تو قریب سے عیادت کا کیا مطلب بنے گا جو بخاری ہی کی اسی حدیث الباب میں مذکور ہے، دوسرے یہ کہ مسجد ذباب سے یا وہاں کے جنگل غیر آباد سے اب تعلق ہی کیا رہ گیا تھا کہ حضرت سعد کا خیمہ وہاں باقی رہتا یا لگوایا جاتا۔

چونکہ ایسے احتمالات بعیدہ کا منشاء پوری طرح پر دور نبوت کا نقشہ ذہن میں نہ ہونا ہے اس لئے ہم نے کوشش کرکے مدینہ طیبہ کا اور مسجد نبوی کا بھی اسی دور کا پیش کرنے کی سعی کی ہے، جس سے بہت سے دوسرے مقامات بھی سمجھنے میں آسانی ہوگی، ان شاء اللہ

ضروری ومختصر وضاحتیں

(اس کے ساتھ دونوں نقشے ملاحظہ کریں)

حرم مدینہ: مسلم شریف میں حدیث ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا اور میں مدینہ کو حرم قرار دیتا ہوں، مدینہ کے دونوں لابوں کے درمیان حرم ہے، اس میں شکار نہ کیا جائے اور اس کے کانٹے دار درخت بھی نہ کاٹے جائیں، اس امر میں اختلاف ہے کہ حرم مدینہ کے بعینہ وہی احکام ہیں جو حرم مکہ کے ہیں یا فرق ہے، اس کی بحث بخاری باب حرم المدینہ ص ۲۵۱ میں آئے گی، ان شاء اللہ۔

مسجد نبوی: ہم نے صرف اس حصہ کا نقشہ دیدیا ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ مبارک میں مسجد تھی، حضور علیہ السلام کے زمانہ میں مسجد نبوی کے صرف تین دروازے تھے ایک جنوب کی طرف۔ دوسرا بجانب غرب جو باب الرحمہ کے محاذی تھا، تیسرا بجانب شرق جو پہلے باب آل عثمان کہلاتا تھا اور اب باب جبریل نام ہے، تحویل قبلہ کے بعد جنوبی دروازہ بند کرکے اس کے مقابل شمال میں دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ حضرت

عمرؓ نے اضافۂ مسجد نبوی کے وقت تین دروازوں کا اضافہ کر دیا تھا، ایک باب السلام، دوسرا باب النساء اور تیسرا موجودہ باب مجیدی کے مقابل پھر مہدی عباسی کے اضافہ کے وقت ۲۴ دروازے ہو گئے تھے۔

مسجد ذباب: جبل احد کے راستہ میں جبل ذباب کے قریب ہے جہاں غزوۂ خندق میں خیمۂ نبویہ نصب ہوا تھا۔ تقریباً ایک ماہ قیام فرمایا تھا۔

مسجد بنی قریظہ: ایام محاصرۂ یہود بنی قریظہ حضور علیہ السلام نے یہاں تقریباً ایک ماہ نمازیں پڑھی تھیں۔

مسجد الفضیح: عوالی کے شرق میں بلندی پر واقع ہے، یہود بنی نضیر کے محاصرہ کے وقت حضور علیہ السلام نے یہاں ۶ دن نمازیں پڑھی ہیں۔

مسجد فاطمہؓ: بقیع کے اندر ہے، کل مساجد و مشاہد متبرکہ مدینہ طیبہ اور حوالی مدینہ کی تعداد فتح القدیر وغیرہ میں تیس ۳۰ بتلائی گئی ہے۔

مصلے الجنائز: مسجد نبوی کے باہر باب جبریل سے مسجد نبوی کے مشرقی جنوبی گوشہ تک ہے۔ یہ جگہ حضور علیہ السلام اور صحابہ[1] کرام کے دور میں نماز جنازہ کے لئے تھی۔

بیوت امہات المومنینؓ: تعمیر مسجد نبوی کے ساتھ ہی دو حجرے بھی تعمیر ہوئے تھے، ایک حضرت سودہؓ کے لئے دوسرا حضرت عائشہؓ کے واسطے جواب بھی اپنی جگہ پر ہے اور حضور اکرم ﷺ حضرت ابوبکر و عمرؓ استراحت فرما ہیں اور ایک قبر کی جگہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے لئے چھوٹی ہوئی ہے یہ قرب قیامت میں نزول فرما کر اپنے کار ہائے مفوضہ انجام دے کر وصال فرمائیں گے اور اس جگہ دفن ہوں گے۔

دوسری امہات المومنینؓ کے بیوت مبارکہ باقی حصۂ مشرقی مسجد نبوی اور جانب شمال و جنوب میں تھے جو توسیع مسجد نبوی کے وقت سے مسجد نبوی کا جزو بن گئے تھے، البتہ حضرت فاطمہؓ کے بیت مبارک کی جگہ اب بھی بیت حضرت عائشہؓ کے شمال میں محفوظ ہے۔

دار حضرت ابی ایوبؓ: جس میں سات ماہ حضور اقدس ﷺ نے قیام فرمایا تھا، مسجد نبوی کے مشرق و جنوب میں تھا۔

دار حضرت ابوبکرؓ: مسجد نبوی کے غربی حصہ میں موجودہ باب السلام کے قریب شمال میں تھا۔ جس کیلئے بطور علامت اب بھی خوخہ کا کتبہ موجود ہے۔

دار حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ: حضرت ابوبکرؓ کے بیت مبارک سے شمال میں تھا یہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔

دار حضرت عمرؓ و آل عمرؓ: حجرۂ مبارکہ حضرت حفصہؓ (واقع سمت جنوب مسجد نبوی) سے متصل حضرت عمرؓ کا مکان تھا جس پر دیار ال عمر لکھا ہوا ہے اور دار عشرہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔

دار حضرت عثمانؓ: آپ کا بڑا مکان مسجد نبوی کے قریب دار ابی ایوب سے شمال میں تھا اور چھوٹا اس سے شرق میں تھا جس کے قریب حضرت ابوبکرؓ کا دوسرا مکان تھا اور حضرت ابوبکرؓ کا تیسرا مکان عوالی مدینہ کے مقام سخ میں بھی تھا، جس میں آپ وقت وفات نبوی تشریف رکھتے تھے۔

دار حضرت علیؓ: آپ کا ایک مکان بقیع کے پاس بھی تھا اور دوسرا یہی حضرت فاطمہؓ کا تھا۔

دوسرے دیار و بیوت کبار صحابہؓ: حضرت ابو ایوبؓ کے بیت مبارک کے قریب ہی حضرت سعد بن معاذ، حضرت سعد ابن عبادہ، حضرت عمارہ بن حزم وغیرہ کے مکانات تھے، اور یوں تو سارا مدینہ طیبہ ہی حضرات صحابہ سے آباد تھا اور زائرین طیبہ کے لئے انتہائی شرف میسر ہوتا ہے کہ وہ قیام مدینہ منورہ کے زمانہ میں کسی نہ کسی صحابی رسول ﷺ کے بیت مبارک و مقدس کی جگہ شب و روز گذارتے ہیں۔ قبائل مہاجرین کے منازل کی تفصیل وفاء الوفا جلد اول کی آخری فصل میں ہے۔

---

[1] اس بارے میں مکمل و مدلل تحقیق حضرت مولانا عبداللہ خان صاحب (تلمیذ رشید حضرت علامہ کشمیریؒ) نے مستقل رسالہ میں درج کر دی ہے جو شائع ہو گیا ہے اور مکتبہ نعمانیہ دیوبند، الجمعیۃ بکڈ پو دہلی اور مکتبہ ناشر العلوم بجنور سے مل سکے گا۔ ان شاء اللہ

نقشہ مدینہ منوّرہ

جبل ثور

الغابہ

جبل احد

شہدائے احد

وادی قناۃ

جبل الرماۃ

معرکہ

خندق

جبل ذباب

مسجد ذباب

یثرب

منازل بنی حارثہ

العریض

قلعہ

باب شامی

بئر ابی ایوب

بیر حاء

مسجد الاجابہ

باب الجمعہ

البقیع

باب العوالی

مسجد بنی ظفر

منازل بنی ظفر

نخلستان باغات

وادی مہزور

وادی بطحان

مسجد الجمعہ

منازل بنی قریظہ

مسجد بنی قریظہ

منازل بنی نضیر

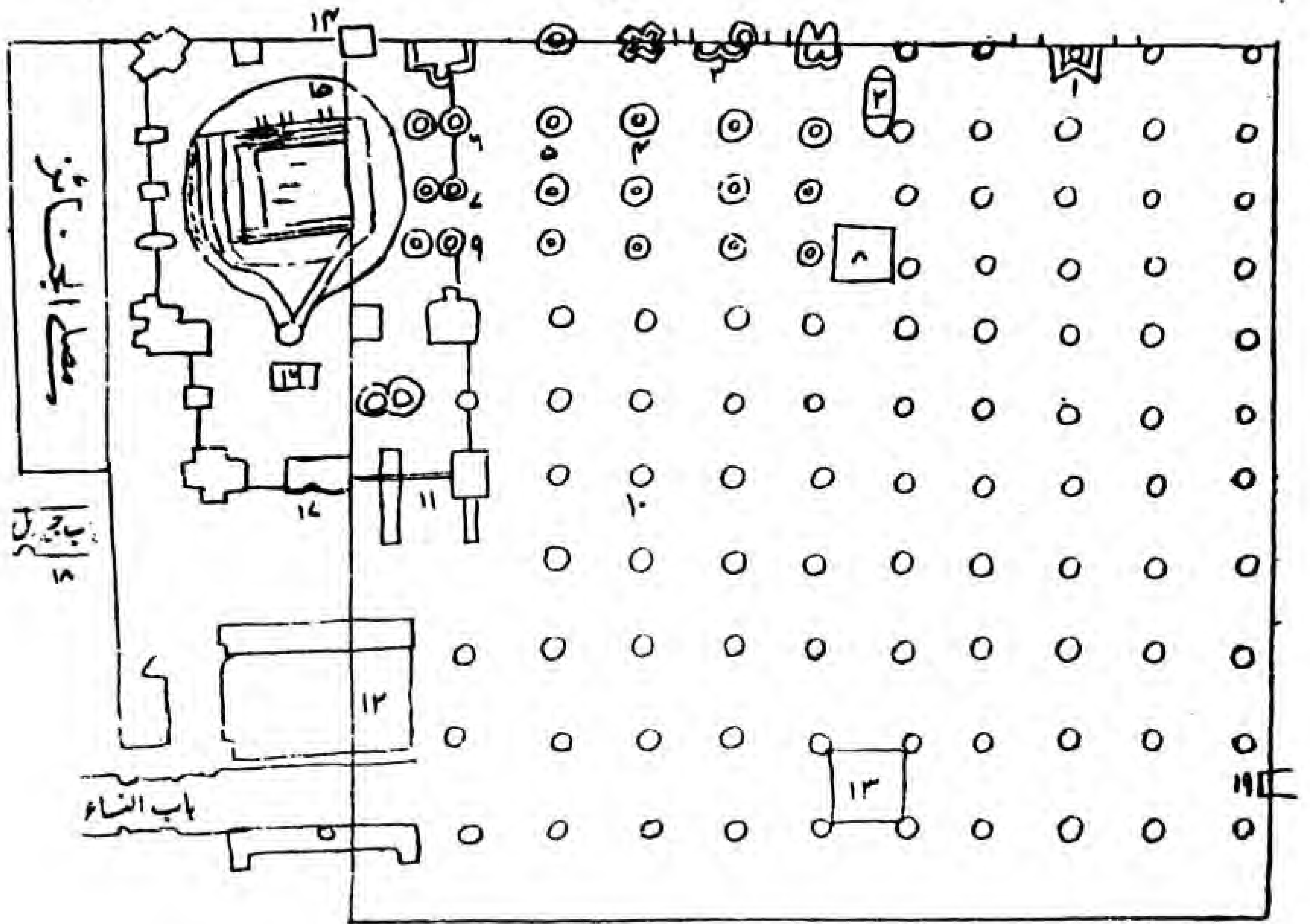
مسجد قباء

الحرۃ

جبل عیر

ذوالحلیفہ

مسجد نبوی دورِ رسالت مقدسہ کا سطحی نقشہ (سمتِ قبلہ جانب جنوب)



مسجد نبوی دور رسالت مقدمہ کا سطحی نقشہ (سمت قبلہ جانب جنوب)

(۱) محراب سلیمانی (۲) منبر نبوی (۳) محراب نبوی (۴) اسطوانۂ حضرت عائشہؓ (۵) اسطوانۂ ابولبابہ (۶) اسطوانۂ سریر نبوی (۷) اسطوانۂ حرس (۸) مکبرہ (۹) اسطوانۂ وفود (۱۰) مقام محراب نبوی بزمانہ قبلہ بیت المقدس (۱۱) باب شامی (۱۲) محل اصحاب الصفہ (۱۳) مکبرہ (۱۴) مواجہ شریفہ (۱۵) روضۂ مقدسہ نبویہ وحضرت سیدنا صدیق وحضرت سید فاروقؓ (۱۶) قبر سیدتنا فاطمہؓ (۱۷) محراب تہجد نبوی (۱۸) باب حضرت جبریل علیہ السلام (۱۹) باب الرحمۃ۔

یہ نشان عام ستون کا ہے اور ◎ کا روضۂ جنت کے ستونوں کا ہے (نوٹ) مسجد نبوی پہلی با ہجرت کے پہلے سال بنی تھی جس کا طول جنوب مشرق میں تقریباً ستر ذراع تھا اور عرض شرق وغرب میں ساٹھ ذراع تھا پھر غزوہ خیبر کے بعد ۷ھ میں دوبارہ حضور علیہ السلام اور صحابۂ کرام نے تعمیر کی تو دونوں جانب بڑھا کر ایک ایک سو ذراع مربع کردی تھی ذراع ایک ہاتھ یا دو بالشت کا یعنی ڈیڑھ فٹ ۱-۲/۱ ہوتا ہے ہم نے یہاں صرف دور نبوت کی مسجد نبوی دکھلائی اور اسی دور کے دوسرے آثار متبرکہ بھی نمایاں کئے ہیں، دوسرے نبوت کے بعد کے اضافات نہیں دکھلائے ہیں اور ان کے نقشے الگ سے مل بھی جاتے ہیں، جس طرح مدینہ طیبہ کی آبادی کا نقشہ بھی ہم نے صرف اسی دور نبوت کا دکھلانے کی سعی کی ہے تاکہ قرآن مجید، احادیث وسیر میں ذکر شدہ چیزوں کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ وللہ الحمد والمنہ۔

بئر اریس: مسجد قبا سے غربی سمت تقریباً دوسوگز فاصلہ پر ہے ایک مرتبہ حضور علیہ السلام اس کی من پر پاؤں لٹکا کر بیٹھے تھے، اور حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت صدیقؓ، حضرت فاروقؓ وحضرت عثمانؓ آپ کو تلاش کرتے ہوئے پہنچے تو آپ کے اتباع میں پاؤں لٹکا کر ساتھ بیٹھے تھے، اس کو بئر خاتم بھی کہتے ہیں اور اس میں حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے مہر نبوی کے گرنے اور پھر نہ ملنے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔

بئر عروہ: مدینہ کے غرب میں حضرت عروہ ابن زبیر کا مملوکہ تھا، اتنا شیریں، ہاضم اور ہلکا تھا کو بطور تحفہ ہارون رشید کے لئے بغداد بھیجا جاتا تھا۔

بئر بضاعہ: اس کے پانی کے بارے میں حدیث میں سوال اور جواب نبوی مشہور ہے۔ بہت بڑا کنواں ہے کہ اس کا پانی آب جاری کے حکم میں ہے۔

بئر انا: محاصرۂ بنی قریظہ کے وقت خیمۂ نبویہ اس سے متصل تھا، اب یہ کنواں معدوم ہوگیا ہے۔ (سب ابیار مطہرہ ۱۸......۲۰ ہیں)

بئر ذروان: اس کنویں میں لبید بن اعصم یہودی نے حضور علیہ السلام کے بالوں پر سحر کر کے کنگھے میں باندھ کر دفن کئے تھے، اور حضور نے معوذتین کی گیارہ آیات پڑھ کر ایک ایک آیت سے ایک ایک گرہ کھول دی تھی۔ جس سے سحر کا اثر ختم ہوگیا تھا، جو ایک سال تک رہا تھا، لیکن اس سے معمولات نبوی پر کوئی اثر نہ تھا، صرف معمولی اثر دوسرا ہوا تھا (الروض ص۲۴، ۲) یہ کنواں محلہ نخاولہ کے قریب تھا، اب بند پڑا ہے۔ بخاری ص ۴۶۳ میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے حکم سے ہی اس کو پٹوا دیا گیا تھا۔ نیز دیکھو بخاری ص ۸۵۸، ۸۵۷۔

باغات: مدینہ منورہ کے اردگرد بہ کثرت باغات تھے اور اب بھی ہیں۔ کچھ نقشہ میں بھی دکھلائے گئے ہیں۔

مقابر: سب سے بڑی زیارت گاہ خلائق تو مزار اقدس نبوی ہے، جس کی زیارت کا شرف اعظم حاصل کرنے کے لئے ابتداء اسلام سے اب تک ساری دنیا کے مسلمان سفر کرتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ پھر جنۃ البقیع کی قبور مقدسہ مطہرہ ہیں۔ اس کے بعد مزارات سیدنا حضرت حمزہ وشہدائے احد وغیرہ ہیں۔

سقیفۂ بنی ساعدہ: اسی جگہ (وفات نبوی کے بعد) حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت خلافت ہوئی تھی۔

خندق: غزوہ خندق یا غزوہ احزاب کے موقع پر یہ خندق قوی شکل میں مدینہ طیبہ کے تمام شمالی حصہ کو محفوظ کرنے کے لئے حضور علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ نے کھودی تھی۔ کیونکہ باقی اطراف قدرتی طور سے محفوظ تھے۔

جبال مدینہ: مدینہ طیبہ کے شمال میں سب سے بڑا پہاڑ جبل احد ہے جس کے بارے میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ ہم سے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ یہ پہاڑ چھ ہزار میٹر (پونے چار میل) لمبا ہے، اسی کے عقب میں جبل ثور ہے، جو حرم مدینہ کی شمالی حد ہے۔ ایک پہاڑ سلع ہے کہ اس کو پشت پر رکھ کر اور خندق کو سامنے کر کے دس ہزار کفار قریش وبنی غطفان کی کامیاب مدافعت نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے کی تھی۔

لابتان: یہ مدینہ طیبہ کے دائیں بائیں (شرق وغرب) میں لاوہ کی دو پتھریلی چٹانیں ہیں، جو حرم مدینہ کے شرقی وغربی حد بھی ہیں اور تیسرے لابۂ جنوبی کے ساتھ مل کر اس کی قدرتی محافظ ہیں۔ لابتان کا ذکر حدیث میں بھی ہے۔

وادیاں: مدینہ طیبہ کے گرد ۶ وادیاں ہیں جن میں پہاڑوں کا بارانی پانی بہہ کر زغابہ کی طرف چلا جاتا ہے اور شہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

زغابہ: مدینہ کے شمال غرب میں بڑا وسیع نشیبی میدان ہے، جہاں نواح مدینہ کی تمام وادیوں کا سیلابی پانی جمع ہوتا ہے اسی میدان میں غزوۂ خندق میں کفار قریش نے چھاؤنی ڈالی تھی اور تیر اندازی کی تھی۔

غابہ: یہ بہت بڑا طویل وعریض بن اور جنگل زغابہ سے آگے شمال میں ہے۔

منازل قبائل: مدینہ طیبہ کے مشرق میں پہلے یہودیوں کے قبائل آباد تھے وہ بھی نقشہ میں دکھائے گئے ہیں۔

ثنیۃ الوداع: حرۂ وبرہ کے جنوبی کنارے پر وہ مقام ہے جہاں قادمین کا استقبال اور تودیع کی جاتی تھی، دوسرا ثنیہ شمالی سرے پر ہے۔

مناخہ: مدینہ منورہ کا وہ میدان جس کو حضور علیہ السلام نے بطور بازار کے تجویز کیا تھا، وہاں اونٹ پر غلہ وغیرہ لاتے تھے اور بیٹھتے تھے، اسی لئے اس جگہ کا نام مناخہ پڑ گیا۔
یثرب: مدینہ کے شمال میں یہود کی قدیم بستی تھی ان کے شرقی جانب منتقل ہونے کے بعد وہاں بنوحارثہ آباد ہوئے تھے پھر سارا مدینہ ہی یثرب کہلایا جانے لگا تھا۔
محلّہ قباء: مدینہ منورہ کی جنوبی سمت ہے جہاں قبیلہ بنی عمرو بن عوف آباد تھا اور ان کی درخواست پر حضور علیہ السلام نے پہلے وہاں ہی قیام فرمایا تھا، حضرت کلثوم بن ہدم کا گھر حضور کی قیام گاہ تھی جہاں اب بیضوی قبہ ہے، مسجد قباء کے جنوب میں تقریباً ۴۰ فٹ پر، وہ اب مقام العمرہ کہلاتا ہے اور اس سے متصل ہی مسجد کی طرف دوسرا قبہ جو اب بیت فاطمہ کہلاتا ہے سعد بن خثیمہ کا گھر تھا وہ حضور کی مردانہ نشست گاہ تھی اور مسجد قبا کے صحن میں جو قبہ مبرک ناقہ کہلاتا ہے وہاں آپ کی اونٹنی مکہ سے آ کر بیٹھی تھی، مسجد قبا کی فضیلت اور دوسرے حالات مشہور ہیں۔

باب ادخال البعير في المسجد للعلة وقال ابن عباسؓ طاف النبي ﷺ على بعيره

(کسی ضرورت کی وجہ سے مسجد میں اونٹ لے جانا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اونٹ پر بیٹھ کر طواف کیا تھا)

۴۴۷. حدثنا عبدالله بن يوسف قال انا مالك عن محمد بن عبدالرحمن ابن نوفل عن عروة بن الزبير عن زينب بنت ابي سلمة قالت شكوت الىٰ رسول الله ﷺ اني اشتكي قال طوفي من ورآء الناس وانت راكبة فطفت ورسول الله ﷺ يصلي الىٰ جنب البيت يقراء بالطور و كتاب مسطور.

ترجمہ ۴۴۷: حضرت ام سلمہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے حجۃ الوداع میں) اپنی بیماری کے متعلق کہا تو آپ نے فرمایا کہ لوگوں کے پیچھے سوار ہو کر طواف کر لو پس میں نے طواف کیا اور رسول اللہ ﷺ اس وقت بیت اللہ کے قریب نماز پڑھ رہے تھے، آپ آیت **والطور و كتاب مسطور** کی تلاوت کر رہے تھے۔

تشریح: امام بخاریؒ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ بیت اللہ مسجد حرام میں ہے اس لئے اس کا طواف سوار ہو کر کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ضرورت کی بناء پر مسجد میں اونٹ وغیرہ لے جانا جائز ہے لیکن عہد نبوی میں بیت اللہ کے علاوہ اور کوئی عمارت وہاں نہیں تھی صرف اردگرد مکانات تھے بعد میں حضرت عمرؓ نے ایک احاطہ کھنچوا دیا تھا، اس لئے حضرت ام سلمہ کا اونٹ مسجد میں کہاں داخل ہوا؟ حضرت ام سلمہؓ نماز پڑھنے کی حالت میں آنحضور کے سامنے سے گذری تھیں کیونکہ وہ بھی طواف کر رہی تھی اور طواف نماز کے حکم میں ہے۔

باب: ۴۴۸. حدثنا محمد بن المثنى قال حدثنا معاذ بن هشام قال حدثني ابي عن قتادة قال حدثنا انس ان رجلين من اصحاب النبي ﷺ خرجا من عند النبي ﷺ احدهما عباد بن بشر واحسب الثاني اسيد ابن حضير في ليلة مظلمة و معهما مثل المصباحين يضيئآن بين ايديهما فلماافترقا صار مع كل واحد منهما واحد حتىٰ اتىٰ اهله

ترجمہ: حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ دو شخص نبی کریم ﷺ کی مسجد سے نکلے ایک عباد بن بشر اور دوسرے صاحب کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ اسید بن حضیر تھے، رات تاریک تھی اور دونوں اصحاب کے پاس منور چراغ کی طرح کوئی چیز تھی جس سے آگے روشنی پھیل رہی تھی، وہ دونوں اصحاب جب ایک دوسرے سے (راستے میں) جدا ہوئے تو دونوں کے ساتھ اسی طرح کی ایک ایک روشنی تھی آخر وہ اسی طرح اپنے گھر پہنچ گئے۔

تشریح: یہ دونوں اصحاب رضوان اللہ علیہما نماز عشاء کے بعد دیر تک مسجد نبوی میں آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے پھر جب یہ باہر تشریف لائے تو رات اندھیری تھی اور صحبت نبوی کی برکت سے راستہ منور کر دیا گیا تھا، حافظ نے لکھا کہ یہ باب امام بخاری نے بلا ترجمہ وعنوان کے باندھا ہے اور علامہ ابن رشید کی یہ بات بھی یہاں نہیں چل سکتی کہ امام بخاری کا باب بلا ترجمہ پہلے ہی باب کے تحت مثل فصل کے ہوا کرتا ہے، کیونکہ یہاں کوئی بھی مناسبت پہلے باب ادخال البعیر فی المسجد سے نہیں ہے، البتہ ابواب مساجد سے اتنا تعلق ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں صحابی حضور علیہ السلام کے ساتھ دیر تک انتظار صلوٰۃ کے لئے مسجد میں رکے تھے اور رات اندھیری تھی، واپسی مسجد میں بلا نور کے پریشانی

تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں صحابی کے لئے یہ کرامت عطا کی، یہ حدیث انسؓ کتاب المناقب میں بھی آئے گی اور وہاں ان دونوں صحابی کے نام اسید بن حضیر اور عباد بن بشر مذکور ہیں (فتح الباری ۴۷۳ ج ۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- من عند النبی ﷺ سے مراد چونکہ آپ کی مسجد سے نکلنا ہے تو یہی مناسبت ہوگی اور حدیث الباب سے کرامت کا ثبوت ہے، جس کا ابن حزم نے ''ملل ونحل'' میں انکار کیا ہے کہ اس سے کرامت ومعجزہ میں فرق نہیں رہتا۔ پھر ابن حزم باوجود انکار کرامت کے قبولیت دعا کے قائل ہیں میں کہتا ہوں کہ اگر دعاء خارق عادت امر کے لئے ہو تو پھر بھی فرق نہ رہے گا در مختار اور شرح عقائد میں ہے کہ کرامت ومعجزہ دونوں کا تعلق ہر چیز سے ہوسکتا ہے، لہٰذا ہر خارق عادت امر جب وہ نبی کے ذریعہ صادر ہو وہ معجزہ کہلائے گا اور وہی اگر ولی سے ہو تو کرامت کہلائے گا، لیکن صاحب رسالہ قشیریہ علامہ ابوالقاسم کی رائے یہ ہے کہ بعض چیزیں معجزہ کے ساتھ خاص بھی ہوتی ہیں جو ولی سے نہیں ہوسکتیں، اور میری بھی یہی رائے ہے کیونکہ علامہ موصوف خود بھی صاحب کرامات تھے، لہٰذا ان کی رائے زیادہ وقیع ہے، کرامت ومعجزہ میں فرق مقدمہ ابن خلدون اور شیخ اکبر کی تالیفات میں دیکھا جائے۔

پھر فرمایا کہ ولی میت کو زندہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ مجھے اس میں عرصہ تک تردد رہا پھر قائل ہوگیا کہ کرامت سے زندہ ہوسکتا ہے اور عارف جامیؒ کا واقعہ دیکھا جو شیخ عبدالغنی نابلی حنفی نے سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ان کے لئے کسی مالدار نے آزمائش کے لئے دعوت میں مردار مرغ پکوا کر سامنے رکھ دیا، عارف جامی نے اس کو قم باذن اللہ کہا تو وہ مرغ زندہ ہوگیا، اسی طرح شیخ عبدالقادر جیلیؒ کا واقعہ احیاء میت کا ذکر کرتے ہیں، واللہ اعلم سند کس درجہ کی ہے، بجنور میں بھی ایک شخص کو دیکھا تھا کہ لوگوں کے سامنے کبوتر کی گردن کاٹ دیتا تھا اور پھر ملا کر زندہ کردیتا تھا، میں نے اس سے دریافت کیا تو بتلایا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لئے ایسا کرسکتے ہیں، اگر زیادہ وقت گذر جائے تو پھر زندہ نہیں کرسکتے۔

علامہ ذہبی نے اپنی کتاب ''العلو والعرش'' میں لکھا کہ شیخ عبدالقادر جیلیؒ کی کرامات بارش کے قطروں کی طرح بہ کثرت وتواتر ثابت ہیں۔

محقق عینیؒ نے بھی کرامات اولیاء کا اثبات کیا ہے اور ایک واقعہ بھی شیخ حسام الدین رہاویؒ کا لکھا ہے (عمدہ ۴۳۱ ج ۲)

باب الخوخة والممر فی المسجد

(مسجد میں کھڑکی اور راستہ)

۴۴۹. حدثنا محمد بن سنان قال نا فليح قال نا ابو النضر عن عبيد بن حنين عن يسر بن سعيد عن ابی سعيد الخدری قال خطب النبی ﷺ فقال ان الله سبحانه خيرا عبدا بين الدنيا و بين ما عنده فاختار ما عنـد الله فبكىٰ ابو بكر فقلت فی نفسی ما يبكی هذا الشيخ ان يكن الله خير عبداً بين الدنيا و بين ما عنـده فاختار ما عند الله عزو جل فكان رسول الله ﷺ هو العبد و كان ابو بكر اعلمنا فقال يا ابا بكر لا تبک ان امـن النـاس علـے فی صحبته و ماله ابو بكر ولو كنت متخذا من امتی خليلاً لا تخذت ابا بكر ولكن اخوة الاسلام و مودته لا يبقين فی المسجد باب الا سد الا باب ابی بكر.

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے خطبہ دیا خطبہ میں آپ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے ایک بندہ کو دنیا وآخرت کے درمیان اختیار دیا کہ وہ جس کو چاہے (اختیار کرے) بندہ نے آخرت کو پسند کیا، اس پر ابوبکرؓ رونے لگے میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر خدا نے اپنے کسی بندہ کو دنیا اور آخرت میں سے کسی کو اختیار کرنے کے لئے کہا اور بندہ نے آخرت اپنے لئے پسند کرلی تو اس میں ان بزرگ (حضرت ابوبکر) کے رونے کی کیا بات ہے لیکن بات یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ ہی وہ بندہ تھے اور ابوبکر ہم سے زیادہ جاننے والے تھے، آنحضور ﷺ نے ان سے فرمایا، ابوبکر آپ روئیے مت، اپنی صحبت اور اپنی دولت کے ذریعہ تمام لوگوں سے زیادہ

مجھ پر احسان کرنے والے ابوبکر ہیں اور اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن اس کے بدلے میں اسلام کی اخوت ومودت کافی ہے، مسجد میں ابوبکر کے دروازے کے سوا تمام دروازے بند کردیئے جائیں۔

۴۵۰. حدثنا عبدالله بن محمد الجعفی قال نا وهب بن جریر قال نا ابی قال سمعت یعلی بن حکیم عن عکرمة عن ابن عباسؓ قال خرج رسول الله ﷺ فی مرضه الذی مات فیه عاصباً راسه بخرقة فقعد علی المنبر فحمد الله و اثنی علیه ثم قال انه لیس من الناس احد امن علی فی نفسه و ماله من ابی بکر بن ابی قحافة ولو کنت متخذا من الناس خلیلا لا تخذت ابا بکر خلیلا ولکن خلة السلام افضل سدو عنی کل خوخة فی هٰذا المسجد غیر خوخة ابی بکر.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے مرض وفات میں باہر تشریف لائے سر سے پٹی بندھی ہوئی تھی آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے، اللہ کی حمد وثنا کی اور فرمایا کہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس نے ابوبکر بن ابی قحافہ سے زیادہ مجھ پر اپنی جان ومال کے ذریعہ احسان کیا ہو اور اگر میں کسی کو انسانوں میں خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن اسلام کا تعلق افضل ہے ابوبکر کی طرف کی کھڑکی کو چھوڑ کر اس مسجد کی تمام کھڑکیاں بند کردی جائیں۔

تشریح: آں حضور ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا کہ اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا اس پر علماء نے بڑی طویل بحثیں کی ہیں کہ خلیل کا مفہوم کیا ہے اور حبیب اور خلیل میں کیا فرق ہے وغیرہ، اگر ان تمام بحثوں کا اختصار کیا جائے تو آخر کار یہ بات آکر ٹھہرتی ہے کہ یہاں خلت سے مراد وہ تعلق ہے جو صرف خداوند تعالیٰ اور بندے کے درمیان ہوسکتا ہے اور اسی وجہ سے آں حضور نے ایسے الفاظ فرمائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر صدیق اور آپ کے درمیان یہ تعلق ممکن ہی نہیں البتہ اسلامی اخوت ومحبت کا اعلیٰ سے اعلیٰ جو درجہ ہوسکتا ہے وہ ابوبکر صدیقؓ اور آپ کے درمیان قائم ہے۔

جب مسجد نبوی کی ابتدائی تعمیر ہوئی تو قبلہ بہ سمت شمالی بیت المقدس تھا، پھر قبلہ بیت الحرام قرار پایا جو مدینہ سے جنوب میں تھا، اس وقت مسجد نبوی کا دروازہ شمال کی طرف کردیا گیا تھا چونکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مکانات مسجد کے چاروں طرف تھے اور مسجد میں صحابہ کے آنے جانے کے لئے بہت سی کھڑکیاں اور دروازے تھے، آپ نے ان کے خصوصی دروازوں کو بند کردینے کا حکم دیا اور شمال کی طرح ایک عام دروازہ مشرق کی طرف جو باب جبریل کہلایا اور ایک عام دروازہ جو باب الرحمۃ کہلایا غرب کی طرف رہنے دیا، البتہ حضرت ابوبکرؓ کی طرف ایک کھڑکی رہنے دی تھی اور اس سے آپ کی خلافت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ جب آپ امام ہوں تو آنے جانے کی سہولت پوری طرح رہے۔

بحث ونظر: یہاں چند حقائق کا ذکر اور حدیثی بحث بھی آئے گی، فیض الباری ص۶۲ ج۲ میں جو مسامحت ضبط وتحریر میں ہوگئی ہے، وہ بھی صاف ہوجائے گی، ان شاء اللہ، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ارشاد نبوی در بارۂ سدالابواب غیر باب علی قوی سند سے ثابت ہے، لیکن محدث ابن الجوزی نے اس کو موضوع قرار دیا ہے جس کا حافظ ابن حجرؒ نے رد وافر کیا ہے اور امام طحاویؒ کی مشکل الآثار سے بھی اپنے مدعا کو قوت پہنچائی ہے (اس جگہ تم امر بسد باب علی الیفاء کی نسبت امام طحاوی کی طرف غلط ہوگئی کیونکہ مرتبؒ نے ایسے مقامات میں حوالوں کی طرف رجوع نہیں فرمایا) پھر فرمایا کہ امام طحاوی وحافظ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ باب حضرت علیؓ کا استثناء پہلے ہوچکا تھا جو ان کی خاص منقبت تھی کیونکہ ان کے گھر کا دروازہ حضور علیہ السلام ہی کی طرح مسجد نبوی کی طرف تھا ان کو حضور علیہ السلام کی طرح مسجد میں بحالت جنابت بھی گزرنا جائز تھا، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کے لئے بعض احکام مشترک تھے، اور حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تھا کہ اے علی! تم میرے لئے ایسے ہی ہو جیسے ہارون تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے۔

دوسری بار حضور علیہ السلام نے مرض وفات میں حکم فرمایا کہ سب دروازے بدستور بند ہی رہیں گے، بجز باب حضرت ابوبکرؓ کے (کہ وہ باب یا کھڑکی کی صورت میں کھلا رہے گا) کیونکہ وہ امامت وخلافت کے ذمہ دار ہوں گے اور فصل خصومات وامامت وغیرہ کیلئے مسجد نبوی میں زیادہ آمد ورفت رکھنی پڑے گی، حضرتؒ نے فرمایا کہ اسی لئے علماء نے مرض وفات کے اس حکم کو خلافت کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

یہاں ایک دوسری مسامحت یہ بھی ہوئی کہ مسجد نبوی کا صرف ایک دروازہ شمالی دکھایا گیا، حالانکہ اہل سیر نے حضور علیہ السلام کے زمانے کے تین دروازے لکھے ہیں، یعنی شرق وغرب میں بھی دروازے عام آنے جانے والوں کے لئے تھے۔ حضور علیہ السلام کے دونوں حکموں کا تعلق ان دروازوں سے تھا جو مسجد نبوی کے اطراف میں سکونت کرنے والے خاص خاص گھرانوں اور افراد نے اپنے اپنے آنے جانے کی سہولت کے لئے بنالئے تھے، کیونکہ ایسی صورت نہ صرف مسجد نبوی بلکہ کسی اور مسجد کے لئے بھی موزوں نہیں ہے، البتہ عام راستے حسب ضرورت کم وبیش ہوسکتے ہیں،[۱] دوسرے یہ کہ مسجد سے جنبی کا گزرنا ممنوع ہے، اس لحاظ سے بھی سب مخصوص دروازوں کا بند کرانا ضروری تھا اور اس حکم سے صرف حضور علیہ السلام اور حضرت علیؓ کا استثنا تھا، حضرت ابوبکر وغیرہ کے لئے بھی وہی حکم تھا جو دوسرے صحابہ کے لئے تھا۔

حافظ ابن حجرؒ نے امام طحاویؒ کی توفیق بین المحدثین کو پسند کیا اور ساتھ ہی یہ بھی اضافہ کیا کہ اس توجیہ کی تکمیل اس طرح ہوگی کہ پہلے حکم سدابواب میں باب حقیقی مراد ہو اور دوسرے میں مجازی یعنی باب بمعنی خوخہ (کھڑکی) ہو جیسا کہ بعض طرق روایات میں اس لفظ کی صراحت بھی ہے، گویا جب ان لوگوں کو دروازے بند کرنے کا حکم ہوا تو انہوں نے دروازے بند کر کے کھڑکیاں کھول لی تھیں، جو مسجد میں داخل ہونے کا قریبی راستہ تھیں، پھر اس کے بعد جب دوسرا حکم آیا تو وہ سب بھی بند کرادی گئیں، بجز خوخۂ سیدنا ابی بکر کے (فتح ص۱۲ ج ۷) حافظ نے امام طحاوی کی مشکل الآثار کے ثلث آخر کے اوائل کا حوالہ بھی دیا ہے، مگر افسوس ہے کہ حیدرآباد سے جو چار جلدیں شائع ہوئی ہیں، ان میں یہ مقام نہیں ہے، کیونکہ تقریباً آدھی کتاب نابود ہونے کی وجہ سے طباعت سے رہ گئی، البتہ ایسے مواقع میں اس کے مختصر مسمی ''المعتصر من المختصر من مشکل الاثار'' سے کام چل جاتا ہے، علامہ قاضی ابوالولید باجیؒ م ۴۷۴ھ نے یہ ایسا عجیب وغریب اختصار کیا تھا کہ اصل کتاب نہ ملنے کا غم غلط ہوجاتا ہے، جزاء اللہ خیر الجزاء اس کے ص ۳۳۲ وص ۳۳۳ ج ۲ میں پوری بات مل گئی ہے اور علامہ طحاوی نے دوسرے صحابہ کی مثالیں دے کر لکھا کہ جس طرح ان کو الگ الگ خاص خاص منقبتیں عطا کی گئی تھیں، اسی طرح حضرت علی وحضرت ابوبکر کو یہ منقبت سدابواب والی مرحمت ہوئی تھی، لہٰذا دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ دوسرے حکم سے حضرت علی کا باب بند نہیں ہوا تھا، ورنہ پھر خصوصیت ہی کیا رہتی۔

ابن جوزی کا رد: حافظ نے لکھا کہ ابن الجوزی نے حدیث سدالابواب الاباب علی کو موضع قرار دیا ہے، بوجہ اعلال بعض رواۃ کے اور حدیث صحیح سدالابواب الاباب ابی بکر کے مخالف ہونے کی وجہ سے بھی اور انہوں نے یہ بھی خیال کیا کہ اس حدیث کو روافض نے گھڑ لیا ہے حالانکہ یہ ان کی خطاء شنیع ہے، کیونکہ اس طرح انہوں نے ''احادیث صحیحہ'' کو رد کردینے والوں کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

---

[۱] افسوس کہ ایسی غلطیاں دوسرے اکابر امت سے بھی ہوئی ہیں کہ کسی ایک مجروح راوی کی وجہ سے حدیث صحیح یا حسن کو گرادیا جبکہ وہ حدیث دوسرے ثقہ راویوں سے بھی مروی ہے یا کسی کو متن کے اضطراب کی وجہ سے گرادیا، جبکہ وہ معنی کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہے یا کسی مخالف کی حدیث کو گرادیا تاکہ وہ اپنے لئے استدلال نہ کرسکے، یاد ہوگا کہ ہم نے ذکر کیا تھا کہ ان ہی حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانیؒ نے علامہ ابن تیمیہ پر بھی نقد کیا تھا کہ روافض کے رد میں اتنا زور دکھایا کہ ان کی نقل کردہ صحیح احادیث کو بھی گرادیا یہ بات انصاف سے بعید ہے، درحقیقت راہ اعتدال ہی صراط مستقیم ہے، علامہ ابن تیمیہؒ کی جلالت قدر اور ان کی گراں قدر علمی خدمات کا ہمیں ہزار بار اعتراف ہے، مگر بعض اہم اصولی وفروعی مسائل مہمہ میں ان کی افراط وتفریط موجب تاسف ہے، یا جب وہ نہایت غیظ وغضب میں اکابر امت کی شان میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں تو بڑا دکھ ہوتا ہے، ائمہ حنفیہ پر بھی بہت کچھ لے دے کی ہے اور امام محمدؒ سے بہت ہی ناراض معلوم ہوتے ہیں اور شاید اسی لئے ان سے امام شافعیؒ کے تلمذ کا انکار فرمادیا ہو۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تحفۂ اثنا عشریہ وازالۃ الخفاء

تحفہ میں جہاں دوسری بارہ احادیث کا جواب دیا ہے جن سے روافض حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل ثابت کرتے ہیں اس حدیث سدالابواب الاباب علی کا ذکر نہیں فرمایا، البتہ ازالۃ الخفاء میں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے جہاں حضرت علیؓ کے مناقب ذکر کئے ہیں، اس حدیث کا بھی ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو ص۵۰۸ ج۲ وص۵۰۹ ج۲)

حدیث ترمذی: امام ترمذی نے باب مناقب علیؓ میں حدیث "**یا علی! لا یحل لا حد ان یجنب فی ھذاالمسجد غیری و غیرک**"، نقل کر کے لکھا:- **لا نعرفہ الا من ھذا الوجہ**، پھر لکھا کہ امام بخاری کو میں نے یہ حدیث سنائی تو انہوں نے بھی اس کو غریب قرار دیا اس پر صاحب تحفۃ الاحوذی نے لکھا:- ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا اور کہا کہ اس کا ایک راوی کثیرالنواء ہے جو غالی شیعی تھا، علامہ سیوطی نے اپنی تعقبات میں اس کا رد کیا اور لکھا کہ اسی حدیث کو ترمذی وبیہقی نے بجائے کثیر کے سالم کے واسطہ سے روایت کیا ہے، لہٰذا کثیر والی تہمت ختم ہوئی پھر لکھا کہ امام ترمذی نے اس کو شواہد کی وجہ سے حسن قرار دیا ہے اور لکھا کہ یہ حدیث حضرت سعد بن ابی وقاص سے بھی مروی ہے، مسند بزار میں اور حضرت عمرؓ سے بھی مسند ابی یعلی میں، حضرت ام سلمہ سے بیہقی کی سنن میں، حضرت عائشہؓ سے تاریخ بخاری میں، حضرت جابر سے تاریخ ابن عساکر میں، (تحفۃ الاحوذی ص۳۳۰ ج۴)

سیرۃ ابن ہشام اور الروض للسہیلی میں وفات نبوی کے حالات بہت ہی اچھی تفصیل سے لکھے گئے ہیں، افسوس ہے کہ ان کا عشر عشیر بھی اردو سیرت کی کتابوں میں نقل نہیں کیا گیا۔ والامر بیداللہ

علامہ عینیؒ: آپ نے بھی وہی تحقیق لکھی جو حافظ نے لکھی ہے اور باب علی والی روایت کی اسناد قوی بتلائی، علامہ طحاوی کی مشکل الآثار کا بھی حوالہ دیا ہے اس سے یہ بھی نقل کیا کہ بیت حضرت صدیقؓ کا دوازہ خارج مسجد کو تھا اور خوخہ مسجد کی طرف، بیت حضرت علیؓ کا دروازہ صرف مسجد ہی طرف کو تھا، باہر کو نہ تھا، میں کہتا ہوں کہ شاید اسی لئے حضور علیہ السلام نے ان کو اجازت دی اور دوسروں کو نہیں دیں (عمدہ ۶۷۱ ج۱۶)

علامہ طحاوی نے یہ حدیث بھی نقل کی کہ صحابہ کے سوال پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ نہ میں نے اپنی طرف سے کوئی دروازہ بند کروایا نہ کھلوایا اور دوسری حدیث میں ہے کہ مجھے تم لوگوں کی چہ مگوئیاں پہنچیں، واللہ! میں نے اپنی طرف سے بند کرنے یا کھولنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ مجھے جس طرح حکم خداوندی ملا، اس کو نافذ کر دیا ہے (المعتصر ص۳۳۲ ج۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام محمد وغیرہ نے جو یہ تفصیل کر دی ہے کہ اجرت ممنوعہ اگر مشروط ہو تو ناجائز ہے، ورنہ جائز ہے تو اس پر ابن تیمیہ نے بڑی غیظ وغضب کا اظہار کیا ہے اور امام محمدؒ کے رد کے لئے اپنے فتاویٰ میں مستقل جز ولکھا ہے کہ ہم نہیں سمجھ سکے اس قید کا خارج میں ثمرہ کیا ہے، جبکہ وہ اجرت قبول کر لے حالانکہ حدیث میں اس کی ممانعت ہے اور اس نے حدیث کی کھلی مخالفت کی ہے، میں نے کہا کہ ابن تیمیہ کا علم ہم کو معلوم ہے اور وہ اپنے غصہ کو اپنے پاس ہی رکھیں، یہاں امام بخاریؒ نے (ص۳۰۴ میں) علامہ شعبی کا قول نقل کیا کہ معلم اگر شرط نہ کرے اور اس کو کچھ دیا جائے تو لینا جائز ہے اور ترمذی میں حدیث صحیح ہے کہ حضور نے عسب الفحل کی ممانعت فرمایا اور اس کی اجرت ہمارے یہاں بھی حرام ہے، تاہم حدیث میں یہ بھی حضرت انس سے مروی ہے کہ صحابہ نے عرض کیا ہمیں اکراماً وہدیۃً کچھ دیا جاتا ہے تو اس کی آپ نے اجازت دی۔

پس جب ایک اصل اور جنس حضور علیہ السلام کے ہی ارشاد سے ثابت ہوگئی تو اس کے تحت آنے والی جزئیات پر نکیر کیوں کر درست ہو سکتی ہے؟ غرض فقہ حنفی میں بہت سے جزئیات تعامل وتوارث کی وجہ سے جائز قرار دیئے گئے ہیں جن پر دوسرے لوگ نکتہ چینی کیا کرتے ہیں اور یہ بات شان علم وتحقیق اور انصاف سے بعید ہے۔

باب الابواب والغلق للكعبة والمساجد قال ابو عبدالله قال لی عبدالله بن محمد حدثنا سفيٰن عن ابن جريج قال قال لی ابن ابی مليكة يا عبدالملک لورأيت مساجد ابن عباس وابق ابها

(کعبہ اور مساجد میں دروازے اور چٹخنی یا قفل ابوعبداللہ (امام بخاریؒ) نے کہا کہ مجھ سے عبداللہ بن محمد نے کہا کہ ہم سے سفیان نے ابن جریج کے واسطہ سے بیان کیا انہوں نے کہا کہ مجھ سے ابن ابی ملیکہ نے کہا کہ اے عبدالملک کاش تم ابن عباسؓ کی مساجد اور ان کے دروازوں کو دیکھتے۔

۴۵۱. حدثنا ابو النعمان و قتيبة بن سعيدؒ قال ناحماد بن زيد عن ايوب عن نافع عن ابن عمر ان النبی ﷺ قدم مكة فدعا عثمان بن طلحة ففتح الباب فدخل النبی ﷺ و بلال و اسامة بن زيد و عثمان بن طلحة ثم اغلق الباب فلبث فيه ساعة ثم خرجوا قال ابن عمر فبدرت فسالت بلا لا فقال صلے فيه فقلت فی ای فقال بين الا سطوا نتين قال ابن عمر فذهب علی ان اساله كم صلے.

ترجمہ ۴۵۱: حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ تشریف لائے تو آپ نے عثمان بن طلحہ کو بلوایا انہوں نے (کعبہ کا) دروازہ کھولا تو نبی کریم ﷺ، بلال، اسامہ بن زید اور عثمان بن طلحہ اندر تشریف لے گئے، پھر دروازہ بند کر دیا گیا اور وہاں تھوڑی دیر تک ٹھہر کر باہر آئے، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر بلال سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آنحضور نے اندر نماز پڑھی تھی، میں نے پوچھا کہ کس جگہ کہا کہ دونوں ستونوں کے درمیان حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ یہ پوچھنا مجھے یاد نہ رہا کہ آپ نے کتنی رکعتیں پڑھی تھیں۔

تشریح: مسجدوں میں دروازے اور قفل لگانا چونکہ ظاہر میں اچھا معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس کو تو عبادت و نماز کے لئے کھلا ہی رہنا چاہئے تو اس خیال کا دفعیہ کیا کہ مسجدوں کی حفاظت بھی ضروری ہے تا کہ اس کا سامان ضائع نہ ہو اور کتے وغیرہ بھی داخل نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

باب دخول المشرک فی المسجد

(مشرک کا مسجد میں داخل ہونا)

۴۵۲. حدثنا قتيبة قال نا الليث عن سعيد بن ابی سعيد انه سمع ابا هريرة يقول بعث رسول الله ﷺ خيلا قبل نجد فجاء ت برجل من بنی حنيفة يقال له ثمامة بن اثال فربطوه بسارية من سواری المسجد.

ترجمہ ۴۵۲: حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے چند سواروں کو نجد کی طرف بھیجا وہ لوگ بنوحنیفہ کے ایک شخص ثمامہ بن اثال نامی کو پکڑ لائے اور مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا۔

تشریح: کسی مشرک یا غیر مسلم کے مسجد میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں، حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے گویا امام بخاری نے مسلک حنفیہ کی موافقت کی، دخول مسجد للمشرک میں اکابر امت کا اختلاف ہے، حنفیہ کے نزدیک مطلقاً جواز ہے، مالکیہ کے یہاں مطلقاً عدم جواز، شافعیہ تفصیل کرتے ہیں کہ مسجد حرام میں ممنوع دوسری مساجد میں ناجائز (عمدہ) امام محمدؒ کے نزدیک بھی شافعیہ کی طرح مسجد حرام میں دخول مشرک ناجائز ہے (کمافی السیر الکبیر والشامی) امام احمدؒ سے دو روایات ہیں ایک یہ کہ مطلقاً ہر مسجد میں ناجائز، دوسری یہ کہ باذن الامام جائز، لیکن حرم میں داخلہ کسی حال میں درست نہیں (کمافی المغنی) لہٰذا حدود حرم کی تمام مساجد میں بھی داخلہ جائز نہ ہوگا اور اسی پر اس وقت حکومت سعودیہ کا عمل بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام محمدؒ کا مذہب ہی اختیار کرنا چاہئے جو قرآن مجید کے ساتھ زیادہ موافق اور دوسرے ائمہ سے زیادہ اقرب ہے، پھر حضرتؒ نے اصول وقواعد کے تحت بھی اس مسلک کی تائید کی اور وہ گراں قدر علمی تحقیق ہے۔ جس کو ہم بوجہ طوالت ترک کرتے ہیں، فیض الباری ص ۶۴ ج ۲ میں دیکھ لی جائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی ایک خاص شان تحقیق یہ بھی تھی کہ ائمہ حنفیہ میں سے اگر وہ کسی کی رائے کو اپنی نظر میں کتاب وسنت سے زیادہ قریب اور دوسرے مذاہب ائمہ مجتہدین سے اوفق دیکھتے تھے تو اسی کو ترجیح دیا کرتے تھے، خواہ وہ امام ابوحنیفہؒ کے خلاف ہی ہو، جس طرح مسئلہ زیر بحث میں کیا اور دوسری شان بہت سے اختلافی مسائل میں یہ بھی تھی کہ امام صاحب کی رائے کو ہی ارجح قرار دیتے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کا بھی مقولہ نقل ہوا ہے کہ جس مسئلہ میں امام صاحب دوسروں سے الگ اور منفرد ہوتے ہیں وہاں ان کی رائے سب سے زیادہ وزنی اور قیمتی ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب رفع الصوت فی المسجد

(مسجد میں آواز اونچی کرنا)

۴۵۳. حدثنا علی بن عبدالله بن جعفر بن نجیح المدینی قال نا یحیی بن سعید القطان قال نالجعید بن عبدالرحمن قال حدثنی یزید بن خصیفة عن السائب ابن یزید قال کنت قائماً فی المسجد فحصبنی رجل فنظرت الیه فاذا عمر بن الخطاب فقال اذهب فأتنی بهٰذین فجئته بهما فقال ممن انتما او من این انتما قالا من اهل الطائف قال لو کنتما من اهل البلد لا وجعتکما ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول الله ﷺ.

۴۵۴. حدثنا احمد بن صالح قال نا ابن وهب قال اخبرنی یونس بن یزید عن ابن شهاب قال حدثنی عبدالله بن کعب بن مالک ان کعب بن مالک اخبره انه تقاضی ابن ابی حدرد دینا کان له علیه فی عهد رسول الله ﷺ فی المسجد فارتفعت اصواتهما حتیٰ سمعها رسول الله ﷺ وهو فی بیته فخرج الیهما رسول الله ﷺ حتیٰ کشف سجف حجرته و نادی کعب ابن مالک فقال یا کعب فقال لبیک یا رسول الله فاشار بیده ان ضع الشطر من دینک قال کعب قد فعلت یا رسول الله قال رسول الله ﷺ فاقضه.

ترجمہ ۴۵۳: حضرت سائب بن یزید نے بیان کیا کہ میں مسجد نبوی میں کھڑا تھا، کسی نے میری طرف کنکری پھینکی میں نے جو نظر اٹھائی تو حضرت عمر بن خطاب سامنے تھے، آپ نے فرمایا کہ یہ سامنے جو دو شخص ہیں، انہیں میرے پاس بلا لاؤ میں بلا لایا آپ نے پوچھا کہ تمہارا تعلق کس قبیلہ سے ہے اور کہاں رہتے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم طائف کے رہنے والے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اگر تم مدینہ کے ہوتے تو میں تمہیں سزا دیئے بغیر نہ رہتا، رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں آواز اونچی کرتے ہو۔

ترجمہ ۴۵۴: حضرت کعب بن مالک نے خبر دی کہ انہوں نے ابن ابی حدرد سے اپنے ایک قرض کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مسجد نبوی کے اندر تقاضہ کیا، دونوں کی آواز (باہمی جواب وسوال کے وقت اونچی ہوگئی اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے گھر میں سے سنا، آپ اٹھے اور حجرے پر پڑے ہوئے پردہ کو ہٹایا اور کعب بن مالک کو آواز دی یا کعب! کعب بولے، لبیک یا رسول اللہ، آپ نے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ وہ اپنا آدھا قرض معاف کر دیں، کعب نے عرض کی یا رسول اللہ میں نے معاف کر دیا، رسول اللہ ﷺ نے ابن ابی حدرد سے فرمایا اچھا اب قرض ادا کر دو۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- مرقاۃ میں ہے کہ مسجد میں بلند آواز سے ذکر اللہ بھی جائز نہیں، کہ اس سے دوسرے

ذاکرین اور نماز و وظیفہ پڑھنے والوں کی تشویش خاطر ہوتی ہے، اور رسول اکرم ﷺ کی مسجد میں تو رفع صوت اس لئے بھی مناسب نہیں کہ یہ سوء ادب بھی ہے، امام مالکؒ نے فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ کا احترام بعد وفات بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ آپ کی حیات میں تھا اور امام بیہقیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں اس روایت کی تصحیح حافظ ابن[1] حجر نے بھی فتح الباری جلد سادس میں کی ہے۔

حیات انبیاء کرام

حضرت شاہ صاحب نے بطور تحقیق مزید فرمایا:- روح تو کسی کی بھی فنا نہیں ہوتی نہ کافر کی نہ مومن کی البتہ مرنے کے بعد افعال معطل ہو جاتے ہیں (کیونکہ اجسام کی شکست و ریخت ہو جاتی ہے لیکن انبیاء کرام کے اجسام بھی پوری طرح محفوظ رہتے ہیں) پس انبیاء کرام کے بارے میں جو احادیث میں ان کی زندگی کا ذکر کیا گیا ہے وہ روح سے متعلق نہیں ہے بلکہ اجسام ہی سے متعلق ہے یعنی وہ وہاں بھی معطل نہیں ہوتے، بلکہ مشغول ہوتے ہیں، جس طرح دنیا کی زندگی میں تھے، لہٰذا وہ نمازیں پڑھتے ہیں، حج کرتے ہیں، تلاوت کرتے ہیں، زائرین کے صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں، وغیرہ افعال احیاء۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصل حیات افعال ہیں اور موت کی حقیقت تعطل ہے اور اس سے حدیث ابی داؤد کا بھی حل ہو جاتا ہے جس میں ہے کہ حضور علیہ السلام پر جب سلام عرض کیا جاتا ہے تو آپ کی روح اس کو سننے اور جواب دینے کے لئے لوٹا دی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو اس وقت روح لوٹا کر زندہ کیا جاتا ہے بلکہ آپ کی روح مبارک چونکہ ہر وقت و ہر آن حضرت ربوبیت کی طرف متوجہ رہتی ہے، اس لئے سلام زائر کے وقت اس کی توجہ ادھر سے ادھر کو ہو جاتی ہے، بس یہی ردروح کا مطلب ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں، پھر فرمایا کہ حیات کے مراتب لاتعد ولاتحصیٰ ہیں اور انبیاء کرام کی حیات سب سے اعلیٰ ارفع، اتم واکمل واقوی ہے، پھر حیات صحابہؓ کرام، پھر اولیاء عظام اور اسی طرح درجہ بدرجہ، بخلاف کافر ومشرک کے کہ اس کے لئے مرنے کے بعد تعطل محض ہے، یعنی اعمال خیر سے، اسی لئے اس کا درجہ **"لایموت فیھا ولایحیی"** قرار دیا گیا کہ نہ مردوں میں نہ زندوں میں، باقی جو تصرفات ارواح خبیثہ کے بصورت افعال خبیثہ ظاہر ہوتے ہیں وہ نظر شارع میں افعال حیاۃ نہیں ہیں کیونکہ وہ تو صرف افعال خیر واعمال بر وصلاح ہیں، اعمال فسق وفجور افعال حیاۃ نہیں ہیں (نہ ان سے دنیا کا فائدہ نہ آخرت کا)

قصہ امام مالک وخلیفہ عباسی

امام مالکؒ خاص طور سے مسجد نبوی میں رفع صوت کو حضور اکرم ﷺ کے ادب واحترام کی وجہ سے بھی منع فرماتے تھے، اور خلیفہ عباسی

---

[1] کذا فی فیض الباری ص ۶۲ ج ۲ ولم اجدہ فی الفتح الی الآن، واللہ اعلم وعلمہ اتم، علامہ سیوطیؒ نے لکھا کہ حیاۃ انبیاء علیہم السلام پر بڑی دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا ہے کیونکہ نماز جسم کی سلامتی وزندگی چاہتی ہے (حیوۃ الانبیاء سیوطی ۱۵) مظاہر حق شرح مشکوۃ ص ۳۰۷ ج ۱ میں ہے انبیاء کرام کے قبروں میں زندہ ہونے کا مسئلہ متفق علیہ ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ وہاں ان کی حیات حقیقی جسمانی دنیا کی سی ہے نہ حیات معنوی روحانی جو شہداء کو بھی حاصل ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لمعات شرح مشکوۃ میں لکھا کہ حیاۃ انبیاء کرام متفق علیہ ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور یہ حیات جسمانی دنیاوی حقیقی ہے نہ کہ معنوی روحانی۔

علامہ ملا علی قاری حنفیؒ نے ایک مدلل مبسوط بحث کے بعد لکھا:- ابن حجرؒ نے فرمایا کہ جو حیات انبیاء کرام کے لئے ثابت ہے وہ ایسی حیات ہے جس سے وہ اپنی قبور میں عبادت کرتے ہیں نمازیں پڑھتے ہیں اور کھانے پینے سے فرشتوں کی طرح مستغنی ہیں، اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور علامہ محدث بیہقی نے اس بارے میں مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے اور یہ بات ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، صحیح ابن حبان، حاکم وصحیح ابن خزیمہ سے بھی ثابت ہے۔ (مرقاۃ ص ۲۰۹ وص ۲۱۰)

شیخ نور الحق دہلوی شارح بخاری نے لکھا:- حضور علیہ السلام کا انبیاء کرام کو دیکھنا اور ان سے کلام فرمانا بتلا رہا ہے کہ آپ نے ان کو ان کی ذوات واجسام کے ساتھ دیکھا ہے اور یہ عقیدہ جمہور علماء امت کا مختار ہے کہ انبیاء کرام بعد اذاقت موت، زندہ بحیات دنیوی ہیں (تیسیر القاری شرح بخاری ص ۶۲ ج ۳) نسیم الریاض ۱۴۹ ج ۴ اور مکاتیب حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ ص ۱۳۰ ج ۱ میں بھی اسی طرح ہے۔

ابوجعفر منصور کو بھی تنبیہ فرمائی تھی وہ واقعہ مشہور ہے اور ہم نے اس کو انوارالباری جلد یازدہم میں تفصیل سے نقل کردیا ہے اور اس سلسلہ میں علامہ ابن تیمیہؒ کے نظریات پر بھی کافی روشنی ڈالی تھی، وہاں دیکھا جائے۔

باب الحلى والجلوس فى المسجد

(مسجد میں حلقہ بنا کر بیٹھنا)

۴۵۵. حدثنا مسدد قال نا بشر بن المفضل عن عبيد الله عن نافع عن ابن عمر قال سال رجل النبى ﷺ وهو على المنبر ما ترىٰ فى صلوٰة الليل قال مثنىٰ مثنىٰ فاذا خشى احدكم الصبح صلىٰ واحدة فاوترت له ما صلىٰ و انه كان يقول اجعلوا آخر صلوتكم بالليل وتراً فان النبى ﷺ امر به.

۴۵۶. حدثنا ابو النعمان حدثنا حماد بن زيد عن ايوب عن نافع عن ابن عمر ان رجلا جاء الى النبى ﷺ وهو يخطب فقال كيف صلوٰة الليل فقال مثنىٰ فاذا خشيت الصبح فاوتر بواحدة تؤتره لك ما قد صليت و قال الوليد بن كثير حدثنى عبيد الله بن عبدالله ان ابن عمر حدثهم ان رجلاً نادى النبى ﷺ وهو فى المسجد.

۴۵۷. حدثنا عبدالله بن يوسف قال انا مالك عن اسحاق بن عبدالله بن ابى طلحة ان ابا مرة مولى عقيل بن ابى طالب اخبره عن ابى واقد الليثى قال بينما رسول الله ﷺ فى المسجد فاقبل نفر ثلثة فاقبل اثنان الى رسول الله ﷺ وذهب واحد فاما احدهما فراى فرجة فى الحلقة فجلس و اما الأخر فجلس خلفهم و اما الأخر فادبر ذاهباً فلمافرغ رسول الله ﷺ قال الا اخبركم عن النفر الثلثة اما احدهم فاوىٰ الى الله فاٰواه الله واما الاخر فاستحيىٰ فاستحيى الله منه واما الأخر فاعرض فاعرض الله عنه.

ترجمہ ۴۵۵: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا اس وقت آپ منبر پر تشریف فرما تھے کہ رات کی نماز کس طرح پڑھنے کے لئے آپ فرماتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ دو دو رکعت کرکے اور جب طلوع صبح صادق قریب ہونے لگے تو ایک رکعت اور اس میں ملالینا چاہئے یہ ایک رکعت اس کی نماز کو وتر بنادے گی اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ رات کی آخری نماز کو طاق رکھا کرو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔

ترجمہ ۴۵۶: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ خطبہ دے رہے تھے، آنے والے نے پوچھا، رات کی نماز کس طرح پڑھی جائے؟ آپ نے فرمایا دو دو رکعت کرکے، پھر جب طلوع صبح صادق کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت اور ملالو تا کہ تم نے جو نماز پڑھی ہے اسے یہ ایک رکعت وتر بنادے اور ولید بن کثیر نے کہا کہ مجھ سے عبیداللہ بن عبداللہ نے حدیث بیان کی کہ حضرت ابن عمرؓ نے ان سے بیان کیا کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کو آواز دی جبکہ آپ مسجد میں تھے۔

ترجمہ ۴۵۷: حضرت واقد لیثی نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف رکھتے تھے کہ تین آدمی باہر سے آئے دو تو رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضری کی غرض سے آگے بڑھے لیکن تیسرا چلا گیا، ان دو میں سے ایک نے درمیان میں خالی جگہ دیکھی اور وہاں بیٹھ گیا، دوسرا شخص سب سے پیچھے بیٹھ گیا اور تیسرا تو واپس ہی جاچکا تھا، جب رسول اللہ ﷺ فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا کیا میں تمہیں ان تینوں کے متعلق نہ بتاؤں، ایک شخص تو خدا کی طرف بڑھا اور حلقہ میں پہنچ کر حضور علیہ السلام کے قریب بیٹھا تو خدا نے اسے اپنے سایۂ

عاطفت میں لے لیا رہا دوسرا تو اس نے خدا سے حیا کی اسلئے خدا نے بھی اس سے یہی معاملہ کیا، تیسرے نے روگردانی کی اس لئے خدا نے بھی اس کی طرف سے اپنی رحمت کا رخ موڑ دیا۔

تشریح: تینوں حدیثوں میں حضرات صحابۂ کرام کا حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر مسجد ہو کر آپ کی مجلس سے استفادہ کرنا مذکور ہے اور اس طرح کسی عالم سے استفادہ چونکہ اس کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھنے سے ہی ہوا کرتا ہے لہٰذا امام بخاری کا عنوان درست ہو گیا اور چونکہ یہ تینوں استفادے مسجد نبوی میں واقع ہوئے تھے اس لئے اس باب کا تعلق احکام مساجد سے بھی صحیح ہو گیا، ذکرہ العینی عن ابن بطال (عمدہ ۱۴۴۱ ج ۲)

امام بخاری نے یہ آخری حدیث کتاب العلم ۲۴ میں بھی بعنوان "**باب من قعد حیث ینتھی به المجلس و من رأی فرجة فی الحلقة فجلس فیھا**" ذکر کی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث میں جمعہ کے روز جو حلقے بنا کر بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کے دوسرے لوگوں کو گذرنے میں دقت ہوگی اور اگر مسجد میں وسعت ہو تو وہ بھی جائز ہے۔

باب الاستلقآء فی السمجد

(مسجد میں چت لیٹنا)

۴۵۸. حدثنا عبدالله بن مسلمة عن مالک عن ابن شھاب عن عباد بن تمیم عن عمه انه رای رسول الله ﷺ مستلقیا فی المسجد واضعا احدی رجلیه علی الاخری و عن ابن شھاب عن سعید بن المسیب کان عمرو عثمان یفعلان ذلک.

ترجمہ ۴۵۸: حضرت عباد بن تمیم اپنے چچا (عبداللہ بن زید بن عاصم مازنیؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو مسجد میں چت لیٹے ہوئے دیکھا آپ اپنا ایک پاؤں دوسرے پر رکھے ہوئے تھے ابن شہاب سے مروی ہے وہ سعید بن مسیّب سے کہ حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما بھی اس طرح لیٹتے تھے۔

تشریح: چت لیٹ کر ایک پاؤں دوسرے پر رکھنے کی احادیث میں ممانعت بھی آئی ہے اور اس حدیث میں ہے کہ آنحضور ﷺ خود اسی طرح لیٹے اور حضرت عمر و عثمانؓ بھی اس طرح لیٹا کرتے تھے، اس لئے ممانعت کے متعلق کہا جائے گا کہ یہ اس صورت میں ہے جب ستر عورت کا پوری طرح اہتمام نہ ہو سکے، لیکن اگر پورا اہتمام اس کا کوئی شخص کرتا ہے پھر اس طرح چت لیٹنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آنحضور ﷺ عام لوگوں کی موجودگی میں اس طرح نہیں لیٹتے تھے بلکہ خاص استراحت کے وقت آپ کبھی اس طرح لیٹے ہوں گے جبکہ دوسرے لوگ وہاں موجود نہیں رہے ہونگے ورنہ عام مجمعوں میں آپ جس وقار کے ساتھ تشریف فرما ہوتے تھے اس کی تفصیلات بھی احادیث میں موجود ہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس دور میں عام عرب اور خود آنحضور ﷺ تہمد باندھتے تھے جس میں ستر کھل جانے کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے، پاجاموں میں اس کا خطرہ نہیں۔

باب المسجد یکون فی الطریق من غیر ضر ربا الناس فیه وبه قال الحسن وایوب مالک

(عام گذرگاہ پر مسجد بنانا جبکہ کسی کو اس سے نقصان نہ پہنچے (جائز ہے) اور حسن (بصری) اور ایوب اور مالک رحمہم اللہ نے بھی یہی کہا ہے)

۴۵۹. حدثنا یحیی بن بکیر قال نا للیث عن عقیل عن ابن شھاب قال اخبرنی عروۃ بن الزبیر ان عائشۃ زوج النبی ﷺ قالت لم اعقل ابوی الا وھما یدینان الدین ولم یمر علینا یوم الا یاتینا فیہ رسول اللہ ﷺ طر فی النھار بکرۃ و عشیۃ ثم بدالابی بکر فابتنی مسجدا بفناء دارہ فکان یصلی فیہ و یقرو القران فیقف علیہ نساء المشرکین و ابناء ھم یعجبون منہ وینظرون الیہ و کان ابو بکر رجلا بکاء ولا یملک عینیہ اذا قرأ القرآن فافزع ذلک اشراق قریش من المشرکین.

ترجمہ ۴۵۹: حضرت عروہ بن زبیر نے خبر دی کہ نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے جب سے ہوش سنبھالا تو اپنے والدین کو دین اسلام کا متبع پایا اور ہم پر کوئی دن ایسا نہیں گذرا جس میں رسول اللہ ﷺ صبح و شام دونوں وقت ہمارے گھر تشریف نہ لائے ہوں پھر حضرت ابوبکر کی سمجھ میں ایک صورت آئی اور انہوں نے گھر کے سامنے ایک مسجد بنائی آپ اس میں نماز پڑھتے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے مشرکین کی عورتیں اور ان کے بچے وہاں تعجب سے کھڑے ہوجاتے اور آپ کی طرف دیکھتے رہتے، حضرت ابوبکر بڑے رونے والے شخص تھے، جب قرآن مجید پڑھتے تو آنسوؤں پر قابو نہ رہتا قریش کے مشرک سردار اس صورت حال سے گھبرا گئے (حدیث مفصل آئندہ آگے آئے گی)۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- فقہاء نے اس بارے میں سختی کی ہے اور لکھا کہ راستوں پر باوجود عدم ضرر و تکلیف کے بھی اذن والی یا قاضی ضروری ہے، مثل احیاء موات کے، لیکن میرے نزدیک یہ اس جگہ کے لوگوں پر موقوف ہے اگر وہ باہمی مسامحت و مروت والے ہوں تو اذن پر موقوف نہ رکھا جائے گا، اگر لڑائی جھگڑے والے ہوں تو اذن ضروری ہوگا۔

باب الصلوٰۃ فی مسجد السوق وصلے ابن عون فی مسجد فی داریغلق علیم الباب

(بازار کی مسجد میں نماز پڑھنا ابن عون نے ایک ایسے گھر میں نماز پڑھی جس کے دروازے عام لوگوں پر بند تھے)

۴۶۰. حدثنا مسدد قال نا ابو معاویۃ عن الاعمش عن ابی صالح عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال صلوٰۃ الجمیع تزید علی صلوتہ فی بیتہ وصلوتہ فی سوقہ خمسا و عشرین درجۃ فان احدکم اذا توضاء فاحسن الوضوء واتی المسجد لا یرید الاالصلوٰۃ لم یخط خطوۃ الا رفعہ اللہ درجۃ وحط عنہ بھا خطیۃ حتے یدخل المسجد وذا دخل المسجد کان فی صلوۃ ما کانت تحبسہ و تصلی الملئکۃ علیہ مادام فی مجلسہ الذی یصلی فیہ اللھم اغفرلہ اللھم ارحمہ مالم یؤذ یحدث فیہ.

ترجمہ ۴۶۰: حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے میں گھر کے اندر یا بازار میں نماز پڑھنے سے پچیس گنا ثواب ملتا ہے کیونکہ جب کوئی شخص وضو کرے اور اس کے تمام آداب کا لحاظ رکھے پھر مسجد میں صرف نماز کی

غرض سے آئے تو اس کے ہر قدم پر اللہ تعالیٰ ایک درجہ اس کا بلند فرماتا ہے اور ایک گناہ اس سے ساقط کرتا ہے اس طرح وہ مسجد کے اندر آئے گا اور مسجد میں آنے کے بعد جب تک نماز کے انتظار میں رہے گا اسے نماز ہی کی حالت میں شمار کیا جائے گا اور جب تک اس جگہ بیٹھا رہے جہاں اس نے نماز پڑھی ہے تو ملائکہ اس کے لئے رحمت خداوندی کی دعائیں کرتے ہیں ''اے اللہ اسکی مغفرت کیجئے اے اللہ اس پر رحم کیجئے'' بشرطیکہ ریاح خارج کر کے تکلیف نہ دے۔

تشریح: اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ باجماعت نماز میں بہ نسبت تنہا یا بازار میں نماز میں پڑھنے کے پچیس ۲۵ گنا زیادہ ثواب ملتا ہے درحقیقت یہاں تنہا اور باجماعت نماز کے ثواب کے تفاوت کو بیان کرنا مقصود ہے، چونکہ عہد نبوی میں بازار محلوں سے علیحدہ تھے اور بازار میں مساجد نہیں تھیں اس لئے اگر کوئی شخص وہاں نماز پڑھتا تو ظاہر ہے کہ تنہا ہی پڑھتا اس لئے اسی حیثیت سے حدیث کا یہ حکم بھی ہوگا اس زمانہ میں بازار آبادی کے اندر لگتے ہیں اور اگر بازار میں مسلمان آباد ہوں تو مساجد کا بھی اہتمام ہوتا ہے، اس لئے بازار میں مساجد کے اندر اگر کوئی نماز پڑھے تو پورے ثواب کا مستحق ہوگا، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- حدیث میں ہے بازار شر البقاع (بدتر مقامات) ہیں اور مساجد خیر البقاع (برتر مقامات) تو شبہ ہوسکتا تھا کہ بازار میں مسجد بنالی جائے تو کیا وہ حصہ خیر البقاع بن جائے گا اور کیا اس میں بھی نماز و جماعت کا ثواب دوسری جگہوں کی مساجد جیسا ہوگا، اس شبہ کو رفع کیا گیا، حضرتؒ نے شرح المنیہ (ص ۴۰۲) کے حوالہ سے یہ مسئلہ بھی بیان فرمایا کہ اگر کوئی شخص گھر میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھے تو وہ نظر شارع میں تارک جماعت نہ ہوگا، مگر اس کو مسجد کی جماعت کا ثواب نہ ملے گا، کیونکہ مسجد کی فضیلت زیادہ ہے اور وہاں تکثیر جماعت اور اظہار شعائر اسلام کا ثواب بھی ملے گا۔

(اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ بلا عذر و مجبوری کے عیدین کی نماز بجائے عیدگاہ کے بستی کی مساجد میں پڑھتے ہیں وہ بھی عیدگاہ کے ثواب، تکثیر جماعت کے ثواب، اتباع سنت نبوی کے ثواب اور اظہار شعائر اسلام کے ثواب چاروں ثوابوں سے محروم رہتے ہیں کیونکہ جس طرح گھر سے نکل کر مسجد میں جانا اظہار شعائر ہے اسی طرح بستی سے نکل کر عیدگاہ جانا بھی اظہار شعائر اسلام ہے، واللہ اعلم)

باب تشبیک الاصابع فی المسجد وغیرہ

(مسجد وغیرہ میں ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کرنا)

۴۶۱. حدثنا حامد بن عمر عن بشرنا عاصم ناواقد عن ابیه عن ابن عمر او ابن عمر وقال شبک النبی ﷺ اصابعه وقال عاصم بن محمد قال سمعت هذا الحدیث من ابی فلم احفظه فقومه بی واقد عن ابیه قال سمعت ابی وهو یقول قال عبدالله بن عمر و قال رسول الله یا عبدالله بن عمر و کیف بک اذا بقیت فی حثالة من الناس بهذا.

ترجمہ ۴۶۱: حضرت ابن عمر یا ابن عمرو سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا اور عاصم بن علی نے کہا کہ ہم سے عاصم بن محمد نے بیان کیا کہ میں نے اس حدیث کو اپنے والد سے سنا لیکن مجھے حدیث یاد نہیں رہی تھی، پھر واقد نے اپنے والد کے واسطے سے نقل کر کے مجھے بتایا، انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے والد سے سنا وہ بیان کرتے تھے کہ عبداللہ بن عمرو سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے عبداللہ بن عمرو تمہارا کیا حال ہوگا جب تم برے لوگوں میں رہ جاؤ گے اس طرح (یعنی آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے میں کر کے صورت واضح کی)۔

تشریح: اس سے روکنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ ایک بری ہیئت اور لغو حرکت ہے لیکن اگر تمثیل یا اسی طرح کے کسی صحیح مقصد کے پیش

نظر انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا جائے تو کوئی حرج نہیں چنانچہ نبی کریم ﷺ نے بعض چیزوں کی مثال بیان کرتے ہوئے انگلیاں کو اس طرح ایک دوسرے میں داخل کیا تھا لیکن بغیر کسی ضرورت ومقصد کے مسجد سے باہر بھی یہ ناپسندیدہ ہے۔

۴۶۲. حدثنا خلاد بن یحییٰ قال نا سفیٰن عن ابی بردة بن عبدالله بن ابی بردة عن جده عن ابی موسیٰ عن النبی ﷺ انه قال ان المؤمن من کالبنیان یشد بعضه بعضا و شبک اصابعه.

۴۶۳. حدثنا اسحق قال انا ابن شمیل قال انا ابن عون عن ابن سیرین عن ابی هریرة قال صلی بنا رسول الله ﷺ احدی صلوتی العشی قال ابن سیرین قد سماها ابو هریرة ولکن نسیت انا قال فصلی بنا رکعتین ثم سلم فقام الی خشبة معروضة فی المسجد فاتکا علیها کانه غضبان ووضع یده الیمنی علی الیسری و شبک بین اصابعه ووضع خده الا یمن علی ظهر کفه الیسری و خرجت السرعان من ابواب المسجد فقالو قصرت الصلوٰة و فی القوم ابو بکر و عمر فهاباه ان یکلماه و فی القوم رجل فی یدیه طول یقال له ذوالیدین قال یا رسول الله انسیت ام قصرت الصلوٰة قال لم انس ولم تقصر فقال اکما یقول ذوالیدین فقالو نعم فتقدم فصلی ما ترک ثم سلم ثم کبر و سجد مثل سجوده او اطول ثم رفع راسه و کبر ثم کبر وسجد مثل سجوده او اطول ثم رفع رأسه و کبر فربما سالوه ثم سلم فیقول بنئت ان عمران بن حصین قال ثم سلم.

ترجمہ ۴۶۲: ہم سے خلاد بن یحییٰ نے بیان کیا کہ ہم سے سفیان نے ابی بردہ بن عبداللہ بن ابی بردہ کے واسطہ سے بیان کیا وہ اپنے دادا حضرت ابوموسیٰ اشعری سے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک مومن دوسرے مومن کے حق میں مثل عمارت کے ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو تقویت پہنچاتا ہے اور آپ نے (تمثیلاً) ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیا۔

ترجمہ ۴۶۳: حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ ہمیں نبی کریم ﷺ نے زوال کے بعد دو نمازوں میں سے کوئی نماز پڑھائی ابن سیرین نے کہا کہ ابو ہریرہ نے اس کا نام لیا تھا لیکن میں بھول گیا، ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ آپ نے ہمیں دو رکعت نماز پڑھائی اور سلام پھیر دیا، اس کے بعد ایک لکڑی کے لٹھے سے جو مسجد میں رکھا ہوا تھا ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے، آپ اس کا اس طرح سہارا لئے ہوئے تھے جیسے آپ بہت ہی غصہ میں ہوں اور آپ نے اپنے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا اور ان کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا اور آپ نے اپنے داہنے رخسار مبارک کو بائیں ہاتھ کی پشت سے سہارا دیا جو لوگ مسجد سے جلدی نکل جایا کرتا تھے وہ دروازوں سے باہر جا چکے تھے، لوگ کہنے لگے کہ نماز (کی رکعتیں) کم کردی گئیں ہیں؟ حاضرین میں ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) بھی تھے لیکن انہیں بھی بولنے کی ہمت نہ ہوئی، ان ہی میں ایک شخص تھے جن کے ہاتھ لمبے تھے اور انہیں ذوالیدین کہا جاتا تھا، انہوں نے پوچھا، یارسول اللہ کیا آپ بھول گئے یا نماز (کی رکعتیں) کم کردی گئیں آں حضور نے فرمایا کہ نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز کی رکعتوں میں کوئی کمی ہوئی ہے پھر آپ نے لوگوں سے مخاطب ہوکر پوچھا کیا ذوالیدین صحیح کہہ رہے ہیں، حاضرین بولے کہ جی ہاں، آخر آپ آگے بڑھے اور باقی رکعتیں پڑھیں، پھر سلام پھیرا، تکبیر کہی اور سجدہ کیا، معمول کے مطابق یا اس سے بھی طویل سجدہ پھر سر اٹھالیا اور تکبیر کہی، پھر تکبیر کہی اور سجدہ کیا معمول کے مطابق یا اس سے بھی طویل پھر سر اٹھایا اور تکبیر کہی، تلامذہ ابن سیرین سے پوچھتے کہ کیا پھر سلام پھیرا تو وہ جواب دیتے کہ مجھے معلوم ہے کہ عمران بن حصین کہتے تھے کہ پھر سلام پھیرا۔

تشریح: یہ حدیث "حدیث ذوالیدین" کے نام سے مشہور ہے اور احناف وشوافع کے درمیان ایک اختلافی مسئلہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، تفصیلی بحث اپنے موقع پر آئے گی۔ ان شاء اللہ۔

باب المساجد التی علیٰ طرق المدینة المواضع التی صلے فیها النبی ﷺ

(مدینہ کے راستے میں وہ مساجد اور جگہیں جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز ادا فرمائی)

۴۶۴. حدثنا محمد بن ابی بکر المقدمی قال ثنا فضیل بن سلیمان قال ثنا موسی بن عقبة قال رایت سالم بن عبدالله یتحری اماکن من الطریق فیصلی فیها و یحدث ان اباه کان یصلی فیها وانه رأی النبی ﷺ یصلی فی تلک الامکنة قال وحدثنی نافع عن ابن عمر انه کان یصلی فی تلک الامکنة و سألت سالما فلا اعلمه الا وافق نافعا فی الامکنة کلها الا انهما اختلفا فی مسجد بشرف الروحآء.

۴۶۵. حدثنا ابراهیم بن المنذر الحزامی قال نا انس بن عیاض قال نا موسی بن عقبة عن نافع ان عبدالله ابن عمر اخبره ان رسول الله ﷺ کان بذی الحلیفة حین یعتمرو و فی حجة حین حج تحت سمرة فی موضع المسجد الذی بذی الحلیفة وکان اذا رجع من غزوة وکان فی تلک الطریق او حج او عمرة هبط بطن واد فاذا ظهر من بطن واد اناخ بالبطحا التی علی شفیر الوادی الشرقیة فعرس ثم حتیٰ یصبح لیس عند المسجد الذی بحجارة ولا علی الاکمة التی علیها المسجد کان ثم خلیج یصلی عبدالله عنده فی بطنه کتب کان رسول الله ﷺ ثم یصلی فدحا فیه السیل بالبطحآء حتی دفن ذلک المکان الذی کان عبدالله یصلی فیه وان عبدالله بن عمر حدثه ان النبی ﷺ صلی حیث المسجد الصغیر الذی دون المسجد الذی بشرف الروحآء و قد کان عبدالله یعلم الکان الذی کان صلی فیه النبی ﷺ یقول ثم عن یمینک حین تقوم فی المسجد تصلی و ذلک المسجد علی حافة الطریق الیمنی وانت ذاهب الیٰ مکة بینه و بین المسجد الاکبر رمیة بحجر او نحو ذلک و ان ابن عمر کان یصلی الی العرق الذی عند منصرف الروحاء و ذلک العرق انتهی طرفه علی حافة الطریق دون المسجد الذی بینه و بین المنصرف وانت ذاهب الی مکة وقد ابتنی ثم مسجد فلم یکن عبدالله بن عمر یصلی فی ذلک المسجد کان یترکه عن یساره وورآء ویصلی امامه الی العرق نفسه و کان عبدالله یروح من الروحاء فلا یصلی الظهر حتی یأتی ذلک المکان فیصلی فیه الظهر واذا اقبل من مکة فان مربه قبل الصبح بساعة او من آخر السحر عرس حتیٰ یصلی بها الصبح و ان عبدالله حدثه ان النبی ﷺ کان ینزل تحت سرحة ضخمة دون الرویثة عن یمین الطریق ووجاه الطریق فی مکان بطح سهل حتی یغض من اکمة دوین برید الرویشة بملین وقد انکسر اعلاها فاثنی فی جوفها وهی قائمة علے ساق و فی ساقها کتب کثیرة و ان عبدالله بن عمر حدثه ان النبی ﷺ صلے فی طرف تلعة من ورآء العرج وانت ذاهب الی هضبة عند ذالک المسجد قبران او ثلاة علی القبور رضم من حجارة عن یمین الطریق عند سلمات الطریق بین اولئک السلمات کان عبدالله یروح من العرج بعد ان تمیل الشمس بالهاجرة فیصلی الظهر فی ذلک المسجد و ان عبدالله بن عمر حدثه ان رسول الله ﷺ نزل عند سرحات عن یسارا الطریق فی مسیل دون هر شی ذلک المسیل لا صق بکراع هر

شي بينه و بين الطريق قريب من غلوة و كان عبدالله بن عمر يصلي الى سرحة هي اقرب السرحات الى الطريق وهي اطولهن وان عبدالله بن عمر حدثه ان النبي ﷺ كان ينزل في المسيل الذى في ادنى مر الظهران قبل المدينة حين يهبط من الصفروات تنزل في بطن ذلك المسيل عن يسار الطريق و انت ذاهب الىٰ مكة ليس بين منزل رسول الله ﷺ وبين الطريق الا رمية بحجرو ان عبدالله بن عمر حدثه ان النبي ﷺ كان ينزل بذى طوى و يبيت حتى يصبح يصلي الصبح حين يقدم مكة و مصلى رسول الله ﷺ ذلك على اكمة غليظة ليس في المسجد الذى بنى ثمه ولكن اسفل من ذلك على اكمة غليظة وان عبدالله بن عمر حدثه ان النبي ﷺ استقبل فرضي الجبل الذى بينه و بين الجبل الطويل نحو الكعبة فجعل المسجد الذى بنى ثم يسار المسجد بطرف الاكمة و مصلى النبي ﷺ اسفل منه على الاكمة السوداء تدع من الاكمة عشرة اذرع او نحوها تصلى مستقبل الفرضتين من الجبل الذى بينك و بين الكعبة.

ترجمہ ۴۶۴: حضرت موسیٰ بن عقبہ نے بیان کیا کہ میں نے سالم بن عبداللہ کو دیکھا کہ وہ (مدینہ سے مکہ تک) راستے میں بعض مخصوص جگہوں کو تلاش کر کے وہاں نماز پڑھتے تھے وہ کہتے تھے کہ ان کے والد (حضرت ابن عمرؓ) بھی ان مقامات میں نماز پڑھتے تھے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ان میں نماز پڑھتے دیکھا تھا اور موسیٰ بن عقبہ نے کہا کہ مجھ سے نافع نے ابن عمر کے متعلق بیان کیا کہ وہ ان مقامات میں نماز پڑھتے تھے اور میں نے سالم سے پوچھا تو مجھے خوب یاد ہے کہ انہوں نے بھی نافع کی حدیث کے مطابق ہی تمام مقامات کا ذکر کیا البتہ مقام شرف روحاء کی مسجد کے متعلق دونوں کا بیان مختلف تھا۔

ترجمہ ۴۶۵: حضرت عبداللہ بن عمر نے خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ جب عمرہ کے لئے تشریف لے گئے اور حج کے موقع پر جب حج کے ارادہ سے نکلے تو ذوالحلیفہ میں قیام فرمایا، ذوالحلیفہ کی مسجد سے متصل ایک ببول کے درخت کے نیچے اور جب آپ کسی غزوے سے واپس ہو رہے ہوتے اور راستہ ذوالحلیفہ سے ہو کر گزرتا یا حج یا عمرہ سے واپسی ہو رہی ہوتی تو وادی عتیق کے نشیبی علاقہ میں اترتے پھر جب وادی کے نشیب سے اوپر آتے تو وادی کے بالائی کنارے کے اس مشرقی حصہ پر پڑاؤ ہوتا جہاں کنکریوں اور ریت کا کشادہ نالا ہے، یہاں آپ رات کو صبح تک آرام فرماتے تھے، اس وقت آپ اس مسجد کے قریب نہیں ہوتے تھے جو پتھروں کی ہے، آپ اس ٹیلے پر بھی نہیں ہوتے تھے جس پر مسجد بنی ہوئی ہے، وہاں ایک گہری وادی تھی، حضرت عبداللہ وہیں نماز پڑھتے تھے، اس کے نشیب میں ریت کے ٹیلے تھے اور رسول اللہ ﷺ یہیں نماز پڑھتے تھے، کنکریوں اور ریت کے کشادہ نالہ کی طرف سیلاب نے آکر اس جگہ کے آثار ونشانات کو مٹا دیا جہاں حضرت عبداللہ بن عمر نماز پڑھا کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے اس جگہ نماز پڑھی جہاں اب شرف روحاء والی مسجد کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے، حضرت عبداللہ بن عمر اس جگہ کی نشاندہی کرتے تھے جہاں نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھی تھی کہتے تھے کہ یہاں تمہاری داہنی طرف جب تم مسجد میں (قبلہ رو) نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے ہو، جب تم مکہ جاؤ (مدینہ سے) تو یہ چھوٹی مسجد راستے کے داہنی جانب پڑتی ہے اس کے اور بڑی مسجد کے درمیان پھینکے ہوئے بہت سے پتھر یا اس جیسی کچھ چیزیں پڑی ہوئی ہیں اور حضرت ابن عمر (مشہور و معروف وادی) عرق الظبیہ میں نماز پڑھتے تھے جو مقام روحاء کے آخر میں ہے، اور اس وادی عرق الظبیہ کا کنارہ اس راستے پر جا کر ختم ہوتا ہے جو مسجد سے قریب ہے، مسجد اور روحاء کے آخری حصہ کے درمیان مکہ جاتے ہوئے اب یہاں ایک مسجد کی تعمیر ہو گئی، حضرت عبداللہ بن عمر اس مسجد میں نماز نہیں پڑھتے تھے بلکہ اس کو اپنے بائیں طرف مقابل میں چھوڑ دیتے اور آگے بڑھ کر خاص وادی عرق الظبیہ میں نماز

پڑھتے تھے، عبداللہ بن عمر روحاء سے چلتے تو ظہر کی نماز اس وقت تک نہیں پڑھتے تھے جب تک اس مقام پر نہ پہنچ جائیں، جب یہاں آ جاتے پھر ظہر پڑھتے اور اگر مکہ سے آتے ہوئے صبح صادق سے تھوڑی دیر پہلے یا سحر کے آخر میں وہاں سے گذرتے تو صبح کی نماز تک وہیں آرام کرتے اور فجر کی نماز پڑھتے اور حضرت عبداللہ بن عمر نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ راستے کے داہنی طرف مقابل میں ایک گھنے درخت کے نیچے وسیع اور نرم علاقے میں قیام فرماتے تھے جو قریہ رویثہ کے قریب تھا پھر آپ اس ٹیلہ سے جو رویثہ کے راستے سے قریب دو میل کے ہے چلتے تھے، اب اس کے اوپر کا حصہ ٹوٹ کر درمیان میں اٹک گیا ہے، درخت کا تنا اب بھی کھڑا ہے اور اس کے ارد گرد ریت کے تودے بکثرت پھیلے ہوئے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمر نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے قریہ عرج کے قریب اس نالے کے کنارے نماز پڑھی جو پہاڑ کی طرف جاتے ہوئے پڑتا ہے اس مسجد کے پاس دو یا تین قبریں ہیں ان قبروں پر پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں، راستے کے داہنی جانب درختوں کے پاس ان کے درمیان میں ہو کر نماز پڑھی، حضرت عبداللہ بن عمرؓ قریہ عرج سے سورج ڈھلنے کے بعد چلتے اور ظہر اسی مسجد میں آکر پڑھتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے راستے کے بائیں طرف ان گھنے درختوں کے پاس قیام فرمایا جو ہرشی پہاڑ کے قریب نشیب میں ہیں، یہ ڈھلوان جگہ ہرشی کے ایک کنارے سے ملی ہوئی ہے، یہاں سے عام راستہ تک پہنچنے کے لئے تقریباً تین فرلانگ کا فاصلہ پڑتا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر اس گھنے درخت کے پاس نماز پڑھتے تھے جو ان تمام درختوں میں راستے سے سب سے زیادہ قریب ہے اور سب سے لمبا درخت بھی یہی ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر نے نافع سے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ اس نشیبی جگہ میں اترتے تھے جو وادی مرالظہر ان کے قریب ہے، مدینہ کے مقابل جبکہ مقام صفرادات سے اترا جائے، نبی کریم ﷺ اس ڈھلوان کے بالکل نشیب میں قیام کرتے تھے، یہ راستے کے بائیں جانب پڑتا ہے، جب کوئی شخص مکہ جا رہا ہو، راستے اور رسول ﷺ کی منزل کے درمیان صرف پتھر کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ مقامی ذی طویٰ میں قیام فرماتے تھے، رات یہیں گذارتے اور صبح ہوتی تو نماز فجر یہیں پڑھتے، مکہ جاتے ہوئے یہاں نبی کریم ﷺ کے نماز پڑھنے کی جگہ ایک بڑے ٹیلے پر تھی، اس مسجد میں نہیں جو اب وہاں بنی ہوئی ہے بلکہ اس سے نیچے ایک بڑا ٹیلا تھا اور حضرت عبداللہ بن عمر نے حضرت نافع سے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے پہاڑ کی ان دو گھاٹیوں کا رخ کیا جو آپ کے اور جبل طویل کے درمیان کعبہ کی سمت تھیں آپ اس مسجد کو جو اب وہاں تعمیر ہوئی ہے، اپنی بائیں طرف کر لیتے تھے، ٹیلے کے کنارے اور نبی کریم ﷺ کے نماز پڑھنے کی جگہ اس سے نیچے سیاہ ٹیلے پر تھی، ٹیلے سے تقریباً دس ہاتھ چھوڑ کر اس پہاڑ کی دونوں گھاٹیوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، جو تمہارے اور کعبہ کے درمیان ہے۔

تشریح: اس طویل حدیث میں جن مقامات میں نبی کریم ﷺ کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے ان میں سے تقریباً اکثر کے آثار و نشانات اب مٹ چکے ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ اب ان میں صرف مسجد ذی الحلیفہ اور روحاء کی مساجد جن کی اس اطراف کے لوگ تعیین کر سکتے ہیں باقی رہ گئی ہیں اس کے علاوہ اس حدیث میں جن سفر کی نمازوں کا ذکر ہے وہ سات دنوں تک جاری رہا تھا اور آپ نے پینتیس ۳۵ نمازیں راستے میں پڑھی ہوں گی لیکن راویان حدیث نے اکثر کا ذکر نہیں کیا ہے، حدیث میں ہے کہ وادی روحاء میں آنحضور ﷺ نے نماز پڑھی اور پھر فرمایا کہ یہاں ستر ۷۰ انبیاء نے نمازیں پڑھی ہیں، حضرت ابن عمرؓ کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مقامات میں نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھیں وہاں پہنچ کر نماز کے لئے خاص طور سے اہتمام کرنا اور ان سے تبرک حاصل کرنا مستحب ہے، ویسے بھی حضرت ابن عمرؓ کی اتباع سنت میں انتہائی شدت مشہور ہے لیکن دوسری طرف حضرت عمرؓ کا طرز عمل ہے کہ اپنے کسی سفر میں انہوں نے دیکھا کہ لوگ ایک خاص جگہ نماز پڑھنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے، پوچھا کیا بات ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ نبی

کریم ﷺ نے یہاں نماز پڑھی تھی اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر کسی کی نماز کا وقت ہو گیا ہے تو پڑھ لے ورنہ آگے چلے، اہل کتاب اس لئے ہلاک ہو گئے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کے آثار کو تلاش کر کے ان پر عبادت گاہیں بنائیں، حافظ ابن حجرؒ نے اسے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کا فرمان ان عام لوگوں کی زیارت سے متعلق ہے جو ان مقامات کی بغیر نماز کے زیارت کو ناپسندیدہ خیال کرتے تھے، انہیں یہ خوف تھا کہ ایسے افراد کہیں ان مقامات پر نماز پڑھنا واجب نہ سمجھ بیٹھیں، حضرت ابن عمرؓ جیسے افراد سے اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا، اس کے علاوہ اس سے پہلے حضرت عتبان کی حدیث گذر چکی ہے کہ آنحضور ﷺ نے ان کے گھر ایک جگہ اس لئے نماز پڑھی تھی تاکہ عتبان وہاں نماز پڑھا کریں۔ (فتح ۳۷۹ ج ۲)

تنبیہات حافظ: آخر میں حافظؒ نے بعنوان ''تنبیہات'' لکھا:- (۱) امام بخاریؒ نے یہاں نو حدیثوں کو جمع کر دیا ہے، جن میں آخر کی وہ دو حدیث بھی ہیں جو امام مسلم نے کتاب الحج میں نقل کی ہیں (۲) اب ان مساجد میں سے صرف مسجد ذی الحلیفہ اور روحاء کی مساجد رہ گئی ہیں جن کو وہاں کے لوگ پہچانتے ہیں، اور ترمذی میں حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام نے وادی روحا میں نماز پڑھی اور فرمایا کہ اس مسجد میں ستر نبیوں نے نماز پڑھی ہے (۳) حضرت ابن عمرؓ کا تعامل یہاں بتلایا گیا ہے کہ وہ حضور علیہ السلام کے آثار وافعال کا کس قدر تتبع کرتے تھے اور ان مقامات صلوٰۃ نبویہ کو کس درجہ متبرک خیال کرتے تھے، علامہ بغوی شافعیؒ نے فرمایا کہ جن مساجد میں نبی کریم ﷺ سے نماز ثابت ہوئی ہے، ان میں سے اگر کسی مسجد کی بھی نماز پڑھنے کی نذر کر لی جائے تو وہ بھی مساجد ثلاثہ کی طرح عمل کے لئے متعین ہو جائے گی یعنی اسی مسجد میں جا کر نماز ادا کرنا واجب ہو جائے گا۔

علامہ بغوی کے اس قول سے ان سب مساجد نبویہ کی عظمت وجلالت قدر واضح ہوتی ہے، اگرچہ علاوہ مساجد ثلاثہ کے یہ نذر کا مسئلہ دوسرے اکابر مذہب کے یہاں مسلم نہیں ہے (۴) امام بخاری نے احادیث مساجد مدینہ کا ذکر نہیں کیا، اس لئے کہ وہ ان کی شرط پر نہ ہوں گی، مگر علامہ عمر بن شبہ نے اخبار مدینہ میں تمام مساجد ومقامات صلوۃ نبویہ کو بالاستیعاب ذکر کیا ہے کہ وہ مشہور مساجد ہیں، پھر حافظ نے ان کا ذکر کیا اور یہ بھی لکھا کہ ان کو پہچاننے کا فائدہ بھی وہی ہے جو علامہ بغوی نے ذکر کیا (فتح ص ۳۵۱ ج ۲)

ارشاد علامہ عینی رحمہ اللہ

آپ نے لکھا:- (۱) حدیث الباب کی مناسبت سے یہ امر بھی بحوالہ مراسیل ابی داؤد لائق ذکر ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں مسجد نبوی کے ساتھ تو مساجد مدینہ طیبہ میں دوسری بھی تھیں، جن میں وہاں کے نمازی حضرت بلالؓ کی اذان سن کر اپنی اپنی مساجد میں نمازیں پڑھا کرتے تھے، پھر علامہ نے دوسری مساجد کی بھی تفصیل کی اور آخر میں لکھا کہ اب مسجد قبا، مسجد الفضیح، مسجد بنی قریظہ وغیرہ باقی ہیں (۲) حدیث الباب سے حضرت ابن عمرؓ کا حضور علیہ السلام کے آثار وافعال کے تتبع کو محبوب سمجھنا اور ان سے برکت حاصل کرنا بھی معلوم ہوا اور مواضع صالحین سے ہمیشہ ہی لوگ برکت حاصل کرتے رہے ہیں (۳) اس سلسلہ میں اشہب کی رائے بھی نقل کی گئی ہے کہ ان سے مقامات صلوات نبویہ میں نماز پڑھنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو کہا کہ مجھے تو یہ بات پسند نہیں آتی بجز مسجد قبا کے کیونکہ حضور علیہ السلام وہاں سوار و پیدل جایا کرتے تھے اور آپ نے دوسرے مقامات کے لئے ایسا نہیں کیا (۴) علامہ بغوی کی رائے ذکر کی جو اوپر حافظ سے نقل ہو چکی ہے (عمدہ ۴۶۸ ج ۲)

ارشاد حضرت گنگوہیؒ

آپ نے فرمایا:- امام بخاری کا مقصد اس باب سے حضور اکرم ﷺ کے سفر حج کے مواضع نزول کا ذکر ہے تاکہ لوگ ان مقامات میں نماز پڑھ کر برکت حاصل کریں اور دعائیں کریں (لامع ص ۱۹۱ ج ۱)

ارشاد حضرت شیخ الحدیث دام ظلہم

آپ نے لکھا:- میرے نزدیک امام بخاری کی غرض مشاہد انبیاء علیہم السلام وصالحین سے برکت حاصل کرنے کا جواز ثابت کرنا ہے تاکہ اس وہم کا دفعیہ ہوجائے جو حضرت عمرؓ کے کلام سے عدم جواز کا ہوسکتا ہے، اور اسی کی طرف حضرت گنگوہیؒ نے بھی اپنے ارشاد "لیتبرک بالصلوۃ والدعاء فیھا" سے اشارہ فرمایا ہے، یعنی ان مقامات میں حاضر ہوکر نماز ودعا میں کوئی شرعی محذور نہیں ہے بلکہ نماز کی مزید برکت اور دعا کی قبولیت متوقع ہے، پھر حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اس کے لئے حافظ ابن حجر سے تائید پیش کی، جو انہوں نے حضرت عمرؓ کے ارشاد کی توجیہ میں لکھی ہے اور یہ بھی لکھا کہ حضرت عتبانؓ کا حضور علیہ السلام سے اپنے گھر میں نماز پڑھوانے کا سوال اور حضور کا ان کی درخواست کو قبول فرمانا اس امر کی واضح دلیل وحجت ہے کہ متبرک آثار الصالحین جائز ہے (فتح ص ۳۷۹ ج ۲)

علامہ قسطلانیؒ نے فرمایا کہ حضرت عمر وحضرت ابن عمرؓ کے اختلاف سے ہمیں دین کی بڑی اصل مل گئی کہ جہاں ایک طرف حضرت ابن عمر سے یہ سبق ملا کہ حضور اکرم ﷺ کے آثار وافعال کا تتبع واتباع مظہر تعظیم نبوی اور موجب حصول برکات ہے، وہاں حضرت عمر کی احتیاطی تنبیہ نے یہ سبق دیا کہ اتباع کو ابتداع کی حدود[1] میں داخل نہ ہونا چاہئے۔

قاضی عیاض مالکی نے شفاء میں لکھا:- حضور علیہ السلام کی تعظیم واجلال شان ہی سے یہ بھی ہے کہ آپ کے تمام اسباب کو معظم جانے، آپ کے تمام امکنہ مکہ ومدینہ ومشاہد ومعاہد کا اکرام کرے، بلکہ ان چیزوں کا بھی جن کو دست مبارک نبوی نے لمس کیا ہے، حضرت صفیہ بنت نجدہ سے مروی ہے کہ حضرت ابومحذورہؓ سر مبارک کے سامنے کے بال نہ منڈواتے تھے پوچھا گیا تو فرمایا:- ان کو کس دل سے الگ کرادوں، جبکہ ان کو دست مبارک نبوی نے مس کیا ہے اور حضرت ابن عمرؓ اپنا ہاتھ منبر نبوی کی جانشست پر رکھتے اور اس کو اپنے چہرے سے ملتے تھے (وغیرہ وغیرہ شفاء عیاض میں دیکھو)

ابوداؤد میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے وضوء کا پانی بھی صحابہ کرام زمین پر نہ گرنے دیتے تھے اور جن کے ہاتھ بھی جو قطرے لگ جاتے تھے وہ ان کو اپنے چہرہ اور بدن پر مل لیتا تھا، جیسا کہ بخاری میں بھی قصہ حدیبیہ میں آئے گا اور حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع میں اپنے بال مبارک صحابہ کرام میں تقسیم فرمائے تھے، نیز بخاری میں حضرت ابن سیرین سے گذر چکا ہے کہ انہوں نے حضرت عبیدہ سے فرمایا کہ ہمیں حضرت انسؓ کے ذریعہ حضور علیہ السلام کے بال حاصل ہوئے ہیں تو عبیدہ نے فرمایا کہ مجھے تو ایک بال بھی میسر ہوجائے تو وہ دنیا اور مافیہا سے زیادہ عزیز ومحبوب ہوگا، حضرت ام سلمہؓ کے پاس بھی حضور علیہ السلام کے بال مبارک تھے، جب کسی کو نظر لگ جاتی یا دوسری تکلیف ہوتی تو ان کے پاس پانی بھیجا جاتا تھا، آپ اس پانی میں بال مبارک ڈال کر نکال دیتیں اور وہ پانی لوگوں کے لئے شفا وصحت بن جاتا تھا، جیسا کہ بخاری باب الشیب میں آئے گا اور روایت مصافحہ مشہور ہے اور حضور علیہ السلام سے صحابۂ کرام اور بعد کے حضرات کے استبراک کے واقعات حد احصاء[2] وشمار سے زیادہ ہیں، (حاشیہ لامع الدراری از شیخ الحدیث دامت برکاتہم ص ۱۹۱ والا بواب والتراجم ص ۲۲۹ ج ۲)

افادۂ انور: حضرتؒ نے فرمایا کہ اس مقام پر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے جو امور اتفاقی طور پر صادر ہوئے ہیں، ان کی تحری وتتبع کا کیا حکم ہے؟ علامہ ابن تیمیہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بارے میں شدت وتنگی اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ایسے ہی حضور کی طرف اتفاقاً کرلے تو حرج نہیں، لیکن تحری وتلاش کر کے اتباع کرنا اچھا نہیں ہے، لیکن میرے نزدیک اتفاقیات میں بھی تحری واتباع موجب اجرو

---

[1] یہ فیصلہ نہایت صحیح ومعتدل ہے، جن لوگوں نے ہر تعظیم کو شرک بنالیا ہے وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں واللہ الموفق (مؤلف)

[2] فتح الملہم ص ۴۰۴ وص ۱۰۹ ج ۱ اور نووی ص ۲۳۳ ج ۱ میں بھی تبرک با ثار الصالحین اور نماز مقامات صلوات نبویہ کا ثبوت ملے گا اور مشکوۃ ص ۳۷۴ کتاب اللباس میں حضرت عائشہؓ کی حدیث مسلم شریف بھی لائق ذکر ہے کہ میں حضور علیہ السلام کے جبۂ مبارکہ کو دھوکر پانی مریضوں کو دیتی تھی اور اس سے ان کو شفا ہوتی تھی۔ (مؤلف)

ثواب ہے، جو حضرت ابن عمرؓ کے تعامل سے ثابت ہے، اس کے مقابلہ میں حضرت ابن عباسؓ کے طریقہ سے فائدہ اٹھانا اس لئے مناسب نہ ہوگا کہ ان کے رخص اور تسامحات مشہور ہیں، مثلاً وہ نزول محصب کو بھی مسنون نہ مانتے تھے اور طواف میں رمل کو بھی حذف کرتے تھے، حالانکہ ان کے علاوہ سب صحابہ کا اتفاق ہے کہ یہ چیزیں مسنون ہیں، البتہ بعض علماء نے جو بعض غیر مسنون چیزوں کو بھی مسنون کا درجہ دے دیا ہے وہ افراط وتفریط ہے۔

کچھ امام اشہب وابن تیمیہ کے متعلق

علامہ عینی نے اشہب کا قول نقل کیا کہ انہوں نے بھی نماز مواضع صلوات نبویہ کو پسند نہ کیا یہ بھی علامہ ابن تیمیہؒ کے مزاج کے ہوں گے، خیال ہے کہ جس طرح بعض حضرات نے حضرت ابن عباس کے طریقہ سے اپنے لئے خیالی تائید حاصل کی ہوگی، اشہب کے قول مذکور سے بھی استناد کیا ہوگا، حالانکہ ان کی دلیل نہایت کمزور ہے وہ کہتے ہیں کہ بجز قبا کے کسی مسجد میں بھی حضور علیہ السلام کے اتباع میں نماز پڑھنا مجھے پسند نہیں کیونکہ صرف قبا کے لئے آپ کا سوار و پیدل جانا ثابت ہے اور کسی مسجد کے لئے ایسا ثابت نہیں ہوا، کوئی علامہ سے دریافت کرتا کہ صحابی حضرت عتبانؓ کے یہاں حضور علیہ السلام نے کتنی بار سوار و پیدل جا کر نماز پڑھی تھی اور انہوں نے حضور کی ایک ہی بار نماز پڑھنے سے اس مقام کو کیوں متبرک سمجھ کر اپنے لئے نماز کی جگہ تجویز کر لی اور حضور علیہ السلام نے بھی ان کی اس تجویز کو پسند فرمالیا، کیا اشہب کی پسند حضور علیہ السلام اور صحابی سے بھی بڑھ کر ہے اور کیا حضرت ابن عمر صحابی جلیل القدر کے تعامل و پسندیدگی سے بھی اشہب کی پسند کا مرتبہ زیادہ ہوسکتا ہے؟ جبکہ حافظ ابن حجر ایسے محدث و محقق نے بھی حضرت عمرؓ کے قول میں توجیہ کر کے حضرت ابن عمرؓ کے تعامل کو ترجیح دی اور حضرت عتبانؓ کے فعل کو استبراک بآثار الصالحین کے لئے حجت قرار دیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی اپنے حافظہ میں تازہ کرلیں کہ یہ اشہب مالکی فقیہ مصری م ۲۰۴ھ وہی ہیں جنہوں نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے بارے میں ایک غلط بے تحقیق بات منسوب کی تھی جس سے علامہ شبلی وعلامہ سید سلیمان ندویؒ بھی مغالطہ میں پڑ گئے تھے اور اس کو سیرۃ النعمان اور حیات امام مالکؒ میں لکھ دیا تھا حالانکہ اس کی تردید حافظ ابن حجر وغیرہ سے ثابت ہو چکی تھی (تفصیل کے لئے دیکھئے امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۶۱،۱۶۲)

(نوٹ) اس سلسلہ میں اس وقت تک ہمارے علم میں اشہب مالکی اور علامہ ابن تیمیہ کے اقوال مخالفت کے آئے تھے جن کے جوابات کی طرف اشارہ کر دیا گیا، مزید بحث وتحقیق آئندہ، ان شاء اللہ۔

مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے درمیان راستہ کی مشہور مساجد

چونکہ امام بخاریؒ نے بڑے اہتمام سے مساجد طرق مدینہ کا ذکر کیا ہے اور ان کا مسلک بھی جمہور سلف وخلف کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ راستہ کی مساجد ومواضع صلوۃ وقیام نبوی کی پیروی میں نماز وقیام کا اہتمام کیا جائے اس لئے ہم الگ سے بھی ان مساجد ومواضع کی نشان دہی کئے دیتے ہیں لہٰذا اس مبارک سفر زیارۃ نبویہ میں زائرین کرام ان مقامات میں حسب سہولت قیام ونماز فرض ونفل کا اہتمام کریں اور راقم الحروف کو بھی دعاؤں میں یاد کریں۔ ولہم الشکر والمنہ

(۱) **مسجد ذی الحلیفہ**: اس کو بئر علی بھی کہتے ہیں، مدینہ منورہ سے احرام حج کی میقات ہے، مدینہ منورہ سے تقریباً تین میل ہے۔

(۲) **مسجد معرس**: اس جگہ رسول اکرم ﷺ نے آخر شب میں قیام فرمایا تھا، مدینہ منورہ سے تقریباً چھ میل ہے۔

(۳) **مسجد عرق الظبیہ**: اس مقام پر حضور علیہ السلام نے نماز پڑھی تھی، روحاء سے دو میل آگے ہے، اس جگہ ستر ۷۰ نبیوں نے نماز پڑھی ہے۔

(۴) **مسجد الغزالہ**: وادی روحاء کے آخر میں ہے، یہاں بھی حضور علیہ السلام نے نماز پڑھی ہے۔

(۵) **مسجد الصفراء**: مدینہ طیبہ سے تین روز (اونٹ کے ذریعہ سفر سے) اور بس یا کار سے چند گھنٹوں کی مسافت ہے۔

(۶) مسجد بدر: جہاں مشہور غزوۂ بدر ہوا تھا، وہاں شہداء بدر کی زیارت بھی کی جاتی ہے۔

(۷) مسجد جحفہ: وہاں تین مسجدیں ہیں، ایک جحفہ کے شروع میں، دوسری آخر میں میقات کے نشانوں کے پاس اور تیسری تین میل کے بعد راستہ سے بائیں جانب ہے۔

(۸) مسجد مراظہران: مکہ معظمہ سے قریب ایک منزل پر ہے، راستہ سے بائیں جانب، اس کو مسجد فتح بھی کہتے ہیں۔

(۹) مسجد سرف: یہاں حضرت میمونہؓ کا نکاح حضور علیہ السلام سے ہوا تھا اور وہیں ان کا مدفن بھی ہے یہ مسجد وادی فاطمہ سے تین میل جانب شمال ہے۔

(۱۰) مسجد تنعیم: جس کو مسجد عائشہ بھی کہتے ہیں، وہاں سے عمرہ کا احرام باندھتے ہیں، مکہ معظمہ سے تین میل جانب شمال ہے۔

(۱۱) مسجد ذی طویٰ: چاہ طویٰ کے قریب ہے، جہاں حضور علیہ السلام نے مکہ معظمہ جاتے وقت قیام فرمایا تھا۔

راہ مدینہ ومکہ کے مشہور کنویں

بئر فلیس، بئر قضمیہ، بئر مستورہ، بئر شیخ، بئر غار، بئر روحاء، بئر حسانی، بئر الاشہب، بئر ماشی۔

باب سترة الامام سترة من خلفه

(امام کا سترہ مقتدیوں کا سترہ ہے)

۴۶۶. حدثنا عبدالله بن يوسف قال نا مالک عن ابن شهاب عن عبيد الله بن عبدالله بن عتبة ان عبدالله بن عباس قال اقبلت راكباً على حمار اتان و انا يومئذ قل نا هزت الاحتلام و رسول الله ﷺ يصلى بالناس بمنى الى غير جدار ففررت بين يدى بعض الصف فنزلت و ارسلت الاتان ترتع و دخلت فى الصف فلم ينكر ذلک على احد.

۴۶۷. حدثنا اسحق قال نا عبدالله بن نمير قال نا عبيد الله عن نافع عن ابن عمر ان رسول الله ﷺ كان اذا خرج يوم العيد امر بالحربة فتوضع بين يديه يصلى اليها والناس ورآءه وكان يفعل ذلک فى السفر فمن ثم اتخذها الامرآء.

۴۶۸. حدثنا ابوالوليد قال نا شعبة عن عون بن ابى حجيفة قال سمعت ابى يقول ان النبى ﷺ صلى بهم بالبطحآء و بين يديه عنزة الظهر ركعتين والعصر ركعتين تمر بين يديه المرأة والحمار.

ترجمہ ۴۶۶: حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ میں ایک گدھی پر سوار ہو کر آیا، اس زمانہ میں قریب البلوغ تھا، رسول اللہ ﷺ منیٰ میں دیوار کے سوا کسی اور چیز کا سترہ کر کے لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے صف کے بعض حصے سے گذر کر میں سواری سے اترا، گدھی کو میں نے چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور صف میں آ کر شریک (نماز) ہو گیا، کسی نے اس کی وجہ سے مجھ پر اعتراض نہیں کیا۔

ترجمہ ۴۶۷: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب عید کے دن (مدینہ سے) باہر تشریف لے جاتے تو چھوٹے نیزہ (حربہ) کو گاڑنے کا حکم دیتے وہ جب گڑ جاتا تو آپ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے ہوتے تھے، یہی آپ سفر میں بھی کیا کرتے تھے، اسی لئے (مسلمانوں کے) خلفاء نے بھی اس طرز عمل کو اختیار کر لیا ہے۔

ترجمہ ۴۶۸: حضرت عون بن ابی جحیفہ نے کہا کہ میں نے اپنے والد سے سنا کہ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو بطحاء میں نماز پڑھائی، آپ کے سامنے عنزہ (ڈنڈا جس کے نیچے پھل لگا ہوا ہو) گاڑ دیا گیا تھا، ظہر کی دو رکعت اور عصر کی دو رکعت پڑھیں (مسافر ہونے کی وجہ سے) آپ کے سامنے سے عورتیں اور گدھے اس وقت گزر رہے تھے۔

تشریح: حدیث میں ہے کہ کالے کتے، گدھے یا عورتیں اگر نماز پڑھنے والے کے سامنے سے گذریں تو نماز میں خلل پڑتا ہے اور اسی وجہ سے راوی نے خاص طور پر اس کا ذکر کیا کہ عورتیں اور گدھے پر سوار لوگ نمازیوں کے سامنے سے گذر رہے تھے، حدیث میں ایک ساتھ مختلف چیزوں کو جمع کر کے بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کے سامنے سے گذرنے سے نماز میں خلل پڑتا ہے، اس کی تفصیل نہیں بتائی گئی کہ وجہ کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ سامنے سے گذریں تو توجہ بٹتی ہے اور ذہن میں وساوس پیدا ہوتے ہیں، حدیث میں عورتوں کو گدھوں کے برابر نہیں بتایا گیا بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اس صنف میں مردوں کے لئے جو کشش ہے نمازی کے سامنے سے گذرتے وقت اس کی وجہ سے نماز میں خلل پڑ سکتا ہے جو نماز کے لئے مضر ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ ان کے سامنے سے گذرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے جو اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں بلکہ صرف ان کی وجہ سے نماز میں خلل کو بتانا مقصود ہے۔

یہاں کئی اہم فوائد و ابحاث لائق ذکر ہیں، فیض الباری ص ۷۶ ج ۲ میں درج ہے کہ ترجمۃ الباب ''سترۃ الامام سترۃ من خلفہ'' یہ الفاظ حدیث ابن ماجہ کے ہیں، جس کی اسناد ساقط ہے، اسی لئے امام بخاریؒ نے اس کے حدیث ہونے کی طرف اشارہ نہیں کیا اور ترجمۃ الباب کا جو مفہوم ہے وہی جمہور کا مذہب ہے، امام مالکؒ کا مذہب دوسرا یہ ہے کہ امام کے آگے کا سترہ صرف امام کے لئے ہے اور مقتدیوں کے لئے سترہ خود امام ہے لہٰذا اگر کوئی امام و سترہ کے درمیان سے گذرے گا تو وہ ان کے نزدیک مقتدیوں کے سامنے سے گذرنے والا سمجھا جائے گا، کیونکہ ان کا سترہ امام ہے، اور گذرنے والا، مقتدیوں اور امام کے درمیان سے نہیں گذرا ہے۔

فیض الباری کی مسامحت

یہاں ضبط املاء کے وقت تسامح ہو گیا اور مراجعت کتب کے ذریعہ بھی تصحیح نہیں کی گئی، جس کی وجہ سے غلطی حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف منسوب ہو گئی (افسوس ہے کہ ایسی مسامحات بہ کثرت ہوئی ہیں فلیتنبہ لہ) حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ نے بجائے ابن ماجہ کے طبرانی فرمایا تھا، اور وہی صحیح بھی ہے، عمدہ ۷۰۴ ج ۲ میں عینی نے اور فتح الباری ص ۳۸۲ ج ۱ میں حافظ نے بھی طبرانی عن انسؓ کا حوالہ دیا ہے اور الجامع الصغیر ص ۳۲ ج ۳ میں علامہ سیوطیؒ نے اور کنوز الحقائق ص ۱۴۳ ج ۱ میں علامۂ محدث مناویؒ نے بھی طبرانی کا ہی حوالہ دیا ہے، ابن ماجہ کی طرف سے اس حدیث کو کسی نے منسوب نہیں کیا اور احقر نے بھی مراجعت کی تو اس میں یہ موجود نہیں ہے، حافظ نے سوید راوی کی وجہ سے ضعف کی صراحت کی ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ بیہقی اور حافظ ابن حجر کی رائے

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- حضرت ابن عباسؓ والی حدیث الباب سے امام بخاری نے تو سترہ کو ثابت کیا لیکن امام بیہقی نے اس سے سترہ کی نفی سمجھی، اسی لئے انہوں نے باب من صلے الی غیر سترۃ قائم کیا اور حافظ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، میں بخاری کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں۔

علامہ عینی کا نقد: علامہ عینی نے بھی امام بیہقی و حافظ پر نقد کیا اور لکھا کہ حافظ و بیہقی دونوں نے دقت نظر سے کام نہیں لیا اسی لئے وہ اس نکتہ کو نہ سمجھے جو امام بخاری کے پیش نظر تھا، حضرت ابن عباسؓ نے جو فرمایا کہ حضور علیہ السلام منیٰ میں غیر جدار کی طرف نماز پڑھ رہے تھے، تو غیر کا لفظ ہمیشہ کسی سابق کی صفت ہوا کرتا ہے، یعنی حضور علیہ السلام جدار کے سوا کسی دوسری چیز کو سترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے مثلاً ڈنڈا ہوگا، نیزہ ہوگا

وغیرہ، کیونکہ آپ کی عادت مبارکہ بغیر سترہ کے نماز پڑھنے کی تھی ہی نہیں اور اسی وجہ سے امام بخاری اس حدیث کو اثبات سترہ کے لئے یہاں لائے ہیں (عمدۃ ص ۷۰۴ ج ۳) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ نفی جدار کا فائدہ بھی جب ہی ہوگا کہ دوسری چیز سترہ ہو ورنہ یہ نفی لغو ٹھیرے گی۔

حافظ کی دوسری مسامحت

ان کا یہ لکھنا بھی درست نہیں کہ امام بخاری ذکر کردہ تین حدیثوں میں سے حدیث اول کی مناسبت ترجمۃ الباب سے نہیں ہے، اور یہ بھی لکھا کہ اس حدیث اول سے امام بخاری کا استدلال محل نظر ہے، بڑی حیرت ہے کہ حافظ ابن حجرؒ امام بخاری کے تراجم ابواب سے احادیث کی مطابقت اور صحت استدلال کے لئے بڑی کاوش کیا کرتے ہیں اور مناسبات بعیدہ تک نکالا کرتے ہیں اور یہاں چوک گئے، شاید امام بیہقی سے متاثر ہو گئے ہوں۔ واللہ اعلم۔

نطق انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- شیخ ابن الہمام کی رائے ہے کہ سترہ ربط خیال کے لئے ہے کہ نمازی کا دھیان محصور رہے اور خیالات دور دور تک نہ جائیں، اداء ارکان صلوۃ کی طرف ہی پوری توجہ ہو، لیکن میں کہتا ہوں کہ سترہ کی غرض وصلۂ مناجات کی حفاظت ہے کہ وہ قطع نہ ہو، کیونکہ نمازی خدا کے روبرو ہو کر اس سے مناجات کرتا ہے جیسا کہ ابوداؤد میں ہے کہ جب کوئی نماز پڑھے تو سترہ سے قریب ہو تاکہ شیطان اسکی نماز قطع نہ کرادے (ابوداؤد ص ۱۰۱ باب الدنو من السترۃ)

پس معلوم ہوا کہ نماز کے وقت نمازی اور قبلہ کے درمیان مناجات ومواجہہ قائم رہتا ہے، کیونکہ اس کا رب اس کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا ہے اور اسی لئے شریعت نے بتایا کہ نمازی اور سترہ کے درمیان سے گذرنے والا شیطان ہوتا ہے وہ عبد ومولیٰ کے درمیان آیا۔

لہٰذا شریعت نے اس مواجہہ کو سترہ کے ذریعے محدود ومحصور کرنا چاہا تاکہ نمازی کے آگے سے گذرنے والوں کو دقت وپریشانی بھی نہ ہو، ان کو حکم کیا کہ سترہ کے آگے سے گذریں، اندر سے نہ گذریں اور اس کے بارے میں سخت تنبیہات کیں اور نمازی کو حکم کیا کہ راستوں سے بچ کر نماز پڑھیں، پھر اگر اتنی تنبیہات وتاکیدات کے بعد بھی حدود شریعت کی نگہداشت نہ ہو تو گذرنے والا شیطان جیسا ہوگا کہ وہ عبد ومولیٰ کے رابطہ کو قطع کرنا چاہتا ہے اور نمازی کی طرف سے اگر تاکیدات کی پروانہ ہوگی تو گویا وہ خود اپنے وصلۂ خداوندی کو قطع کرنے کا موجب ہوگا اور اپنی نماز کے اجر وثواب وروحانیت میں کمی کرائے گا، حدیث ابوداؤد میں ہے کہ جہاں تک ہو سکے یہ کوشش کرنی چاہئے کہ نماز اپنے اور قبلہ کے درمیان کسی کو دراندازی نہ ہونے دے، حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ تفصیل کر کے فرمایا کہ میں اسی توجیہ کی وجہ سے احادیث قطع میں کوئی تاویل نہیں کرتا اور ان کو ظاہر پر رکھتا ہوں اور یہ بھی کہتا ہوں کہ عورت، حمار وکلب کے بارے میں بھی سب احادیث اپنے ظاہر پر ہیں کہ وہ سب وصلۂ مناجات کو قطع کرتی ہیں، جس طرح تم دو آدمی کسی خاص نجی معاملہ میں سرگوشی اور مشورہ کرتے ہو اور کوئی تیسرا غیر متعلق آدمی درمیان میں آکر بیٹھ جائے تو یہی کہو گے کہ ہماری بات کاٹ دی یا ختم کردی، اسی طرح یہاں سمجھو، لہٰذا میرے نزدیک ان احادیث میں بھی کوئی استبعاد نہیں نہ تاویل کی ضرورت۔

فرق نظر شارع ونظر فقہاء

شریعت نے ہمیں بہت سے غائب امور کی خبر دی ہے، جن کو وہ دیکھتی ہے اور ہم نہیں دیکھتے، اسی طرح وجود وقیام وصلہ کی خبر دی ہے اور مرور کے وقت اس کے قطع ہونے کی بھی خبر دی ہے، پھر ہمیں انکار تاویل کی کیا ضرورت ہے۔

ہاں! یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قطع بہ نظر شارع ہے، بہ نظر فقہاء نہیں ہے اور اس لئے وہ مرور کو قاطع صلوۃ نہیں کہتے، کیونکہ ان کے احکام کا تعلق عالم شہادت سے ہے اور اس وصلہ کا تعلق عالم غیب سے ہے اور میرے نزدیک استواء علی العرش، معیت وقرب خداوندی وغیرہ بھی اسی باب سے ہیں کہ ہم ان کی کیفیات وحقائق کا ادراک نہیں کر سکتے اور ان کے قائل ہیں بلا تاویل کے، اسی طرح میرے نزدیک یہ مواجہہ اور

وصلہ بھی ہے، بلکہ میری تحقیق میں یہ سب حق تعالیٰ کی تجلیات، تجلی کی بحث مکمل و متصل اپنے موقع پر آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تمثیل و تسہیل اور تحقیق مزید

جس طرح یہاں وصلہ عالم غیب سے ہے اور اس کا قطع بھی غیبی وغیرہ محسوس ہوتا ہے، اسی طرح حدیث **"افطر الحاجم والمحجوم"** میں میرے نزدیک نظر شرع میں حقیقت صوم ختم ہوگئی بلا تاویل، اگرچہ نظر فقیہ میں روزہ فاسد نہیں ہوا کیونکہ طہارت اگرچہ شرط صحت صوم نہیں ہے، لیکن اس کے مرغوب و مطلوب ہونے میں شک نہیں، لہٰذا خون نکلنے سے طہارت ختم ہونے اور ناقص کے ساتھ روزہ بھی نقض و نقص کا مورد ہو گیا اور فی الجملہ نظر شرع میں بھی افطار کا تحقق ہو گیا گو حکم افطار نہ ہوسکے، خصوصاً جبکہ روزہ کا مقصد بھی تحصیل تقویٰ و تشبہ بالملائکہ ہے اور وہ خون بہانے سے سخت نفرت کرتے ہیں، اسلئے **ویسفک الدماء** سے بنی آدم کی بہت بڑی برائی اور منقصت یہی ظاہر کی تھی، مگر نظر فقہی کے لئے یہ حدیث بھی ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام نے بھی ایک بار بحالت صوم احتجاج کیا۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ جو شخص حالت جنابت میں صبح کرے گا، اس کا روزہ نہیں، اس سے بتلایا کہ جنابت نے اس کے روزے میں خلل و نقص ڈال دیا اور فرشتے بھی اس گھر میں نہیں آتے جس میں جنبی ہوتا ہے، یہ نظر شرعی ہے، مگر دوسری طرف نظر فقہی کے لئے بھی گنجائش اس سے مل گئی کہ حضور علیہ السلام سے بھی ایک بار بحالت جنابت روزے میں صبح کرنا منقول ہوا ہے، احادیث میں یہ بھی وارد ہے کہ عورت کے سامنے سے گذرنے سے نماز قطع ہوجاتی ہے، یہ بھی نظر شرعی ہے (کیونکہ نماز کی حقیقت خشوع و خضوع اور توجہ الی الحق سبحانہ ہے اس میں ضرور نقص واقع ہوگا) مگر نظر فقہی کے لئے یہ بھی حدیث ہی میں وارد ہے کہ حضور علیہ السلام نماز پڑھتے تھے اور حضرت عائشہؓ سامنے لیٹی رہتی تھیں۔

احادیث سے ثابت ہے کہ کالے کتے کے سامنے سے گذرنے سے نماز قطع ہوجاتی ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ وہ شیطان ہے اور شاید اس لئے ہے کہ وہ زیادہ موذی ہوتا ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ جن اس کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اسی لئے امام احمدؒ نے تو قطعی یہ فیصلہ بھی کردیا کہ اس سے نماز فاسد و باطل ہوجاتی ہے مگر دوسرے ائمہ اور جمہور کی رائے اور نظر فقہی ایسی نہیں ہے۔

امام احمد نے اتنا تشدد گدھے کے بارے میں نہیں کیا، شاید اس لئے کہ حدیث ابن عباس وغیرہ میں گدھے پر سوار اور ویسے بھی گدھے کا نماز کے سامنے سے گذرنا مروی ہے اور نماز بدستور ہوتی رہتی ہے، ایسے ہی عورت کے بارے میں بھی امام احمد نے بوجہ حضرت عائشہؓ وغیرہ تشدد نہیں کیا ہوگا، حالانکہ حکم تینوں کے لئے بظاہر یکساں تھا اور حدیث درمنثور میں ہے کہ یہ تینوں تسبیح و ذکر سے غافل ہوتے ہیں، لہٰذا غافلوں کا ذاکروں (نمازیوں) کے سامنے آجانا ذکر و نماز کے منافی و قاطع قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] علامہ عینی نے لکھا: - اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرد عورت کی طرف رخ کرکے نماز پڑھے تو جائز ہے اور نماز قطع نہیں ہوتی، مگر بعض علماء نے حضور علیہ السلام کے علاوہ دوسروں کیلئے اس کو مکروہ کہا ہے کیونکہ عورت سامنے ہوتو اس کی طرف نظر کرنے سے فتنہ کا خوف اور قلب کے ادھر مشغول ہونے کا احتمال غالب ہے، پھر نماز کیا ہوگی؟ اور حضور علیہ السلام پر قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ آپ ان سب برائیوں سے منزہ تھے، پھر وہ رات کے نوافل کا موقع تھا، جبکہ اس وقت گھروں میں چراغ بھی نہ ہوتے تھے، یہ بھی لکھا کہ اگرچہ جمہور کا مسلک یہی ہے کہ اس طرح نماز ہوجاتی ہے اور عورت کے سامنے سے گذرنے سے بھی نماز قطع نہیں ہوتی، لیکن ظاہر ہے کہ عورت کا سامنے لیٹے ہوئے ہونا، اس کے سامنے سے گذرنے کے اعتبار سے کہیں زیادہ شدید ہے (عمدہ بحوالہ اوجز ص ۲۰۴ ج ۱) علامہ عینیؒ کی مذکورہ بالا تنقیحات نہایت اہم و قابل قدر ہیں اور صورت مسئلہ کو ان ہی کی روشنی میں دیکھنا چاہئے، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم۔ (مؤلف)

اس بارے میں علامہ محدث زرقانیؒ نے بھی اچھی بحث کی ہے اور حدیث حضرت عائشہؓ کے جوابات نقل کئے ہیں مثلاً یہ کہ (۱) حضرت عائشہ و میمونہ ازواج مطہرات میں سے تھیں، لہٰذا اجنبیہ کے لئے خوف فتنہ وغیرہ کی بات مانع رہے گی، (۲) وہ رات کے واقعات تھے، اور اس زمانہ میں چراغ وغیرہ نہ تھے (اب بجلی کا دور ہے کہ دن کی طرح روشنی دیتی ہے۔ (۳) وہ ایک وقتی واقعہ کا ذکر ہے جس میں بہت سے احتمالات نکل سکتے ہیں بخلاف حدیث ابی ذرؓ کے اس سے عام تشریعی قاعدہ بیان ہوا ہے۔ (۴) علامہ ابن بطال نے حضرت عائشہ کے واقعہ کو خصائص نبوی میں شمار کیا ہے اور حضور علیہ السلام کی طرح کون اپنے جذبات پر کنٹرول کرسکتا ہے؟ (۵) بعض حنابلہ نے کہا کہ احادیث ابی ذر وغیرہ احادیث صحیحہ صریحہ ہیں ان کا مقابلہ احادیث صحیحہ غیر صریحہ یا صریحہ غیر صحیحہ نہیں کرسکتیں (شرح الزرقانی ص ۳۱۷)

حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں اس امر کو بھی اپنے ذہنوں میں تازہ کرلو، جس کو پہلے بتلا چکا ہوں کہ بہت سی احادیث بظاہر آپس میں متعارض معلوم ہوتی ہیں کہ ایک کا مضمون دوسری سے ٹکراتا ہے، مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ شارع کا مقصد مراتب احکام کا بیان ہوتا ہے اور کبھی اختلاف ازمنہ واکمنہ وانظار کی طرف تنبیہ ہوتی ہے اور کبھی کچھ احادیث میں حکم اشیاء عالم غیب کی نسبت سے بتلایا گیا ہے اور کچھ میں عالم شہادۃ کے لحاظ سے اور یہ ضروری نہیں کہ دونوں عالموں کے احکام میں توافق ہو۔

سترہ کا مسئلہ: فرمایا: -سترہ قائم کرنا مذہب شافعی میں واجب ہے اور حنفیہ کے نزدیک مستحب ہے مگر ترک سترہ کی وعید اور دوسری تاکیدات شرع پر نظر کرتے ہوئے میری رائے ہے کہ حنفیہ اس حکم کو استحباب سے اوپر رکھتے تو اچھا ہوتا، مسئلہ سترہ بحضور کعبہ معظمہ آگے آئے گا، حضرت گنگوہی قدس سرہ نے فرمایا: -''قبرستان میں نماز پڑھے تو امام ومقتدی کے واسطے سترہ کی ضرورت ہے، سترہ امام کا مقتدی کو کافی ہونا مرور حیوان وانسان کے لئے ہے اور قبور کا حضور مشابہ بہ شرک وبت پرستی ہے، اس میں کافی نہیں ہے، اس لئے ہر ہر نمازی کے سامنے سترہ و پردہ واجب ہے'' (فتاوی رشیدیہ ص ۲۸۸)

فائدہ قیمہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شریعت نے نماز جماعت کو نماز منفرد سے الگ نوع قرار دیا ہے اور ہر ایک کے کچھ احکام الگ بھی ہیں، اس لئے ایک نوع کے احکام کو دوسری نوع پر جاری نہیں کر سکتے، جس طرح شریعت نے غیر موجود کی بیع کو ممنوع قرار دیا لیکن بیع کی ہی ایک قسم مسلم بھی ہے، جس کو جائز قرار دیا حالانکہ وہ بھی بیع غیر موجود کی ایک نوع ہے، اسی طرح نماز جماعت کا باب ونوع بھی الگ اور مستقل ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے کہ امام کی اقتداء ضروری ہے اور مقتدی کو امام کے پیچھے قراءت کا حکم نہیں دیا حالانکہ وہ نماز کا اہم رکن ہے اور اس سے بہت کم درجہ کی چیزوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، بلکہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو، لیکن جن لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات جم چکی ہے کہ نماز بغیر فاتحہ کے قائم نہیں ہوسکتی وہ اس عام بات پر جمود کر لیتے ہیں اور مقتدی کے خاص حکم کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اس طرح وہ دونوع کے احکام کو باہم مختلط کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شافعیہ کی نماز بنی اسرائیل کی طرح ہوگئی ہے کہ وہ بھی باوجود اجتماع کے منفرد رہتے ہیں اور ان میں باہم ربط وتضمن نہیں ہوتا، حالانکہ حدیث میں امام کو ضامن فرمایا گیا ہے، جو باہمی ربط وتضمن کو مقتضی ہے اور حضور علیہ السلام نے حدیث ابی داؤد میں **لقد اعجبنی ا ن تکون صلوۃ المؤمنین واحدۃ** فرمایا ہے (مجھے مسلمانوں کی نماز جماعت بہت ہی پسند ہے کہ وہ مجموعی اکائی ہے) تو حنفیہ نے اس ارشاد کی حقیقت کو سمجھا اور اپنی خوشی کو حضور علیہ السلام کی خوشی سے وابستہ کر دیا، پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں بخاری کی احادیث الباب سے بھی یہی ثابت ہوا کہ نماز جماعت واحد بالعدد یعنی مجموعی اکائی ہے، اس لئے سب کے لئے ایک ہی سترہ کافی ہوا، اگر ان سب کی نمازیں الگ الگ ہوتیں تو ظاہر ہے کہ سترہ بھی الگ الگ ہوتا۔

شافعیہ اگر **لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب** کے عموم سے استدلال کرتے ہیں تو حدیث میں **لا صلوۃ الا بخطبۃ** بھی ہے اس کے عموم سے نماز جمعہ کے لئے ہر ہر شخص کے ذمہ خطبہ کیوں لازم نہیں کرتے؟ اگر وہاں نہیں کرتے تو یہاں بھی لازم نہ کرنا چاہئے، نیز فرمایا کہ اس سے کچھ پہلے ہی حدیث بخاری ص ۶۹ میں **صلوۃ الجمیع تزید علی صلوتہ فی بیتہ الخ** بھی گذرا ہے اس سے بھی یہی مستفاد ہوا کہ نماز جماعت نظر شارع میں ''صلوۃ الجمیع'' (سب کی ایک نماز) ہے، وہ ''**صلواۃ الجمیع**'' (سب کی بہت سی نمازیں) نہیں ہیں، ایسے ہی قرآن مجید میں بھی ''**اذانودی للصلوۃ من یوم الجمعہ**'' ہے، وہاں جمعہ کی نماز کو بھی ایک مجموعی نماز فرمایا گیا ہے۔

شافعیہ سمجھتے ہیں کہ نماز جماعت میں بہت سی نمازیں لوگوں کی ہیں جو اگرچہ ایک محل میں جمع ہیں مگر ہر ایک کی نماز الگ الگ ہے اور وہ سب اپنے اپنے امیر خود ہیں، امام کا اتباع صرف افعال میں ہوتا ہے، حتیٰ کہ اگر امام کی نماز فاسد بھی ہو جائے، تب بھی مقتدی کی درست رہتی ہے اور اسی لئے ان کے یہاں ہر مقتدی کو فاتحہ بھی پڑھنی پڑتی ہے کہ بغیر اس کے نماز نہیں، ہم کہتے ہیں یہ تسلیم مگر نماز جماعت چونکہ صلوٰۃ واحد ہے، اس لئے فاتحہ واحدہ اس کے لئے کافی ہے جو امام پڑھتا ہے۔

باب قدر كم ينبغي ان يكون بين المصلي والسترة

(مصلی اورسترہ میں کتنا فاصلہ ہونا چاہئے)

۴۶۹. حدثنا عمرو بن زرارة قا لنا عبدالعزيز بن ابی حازم عن ابيه عن سهل بن سعد قال كان بين مصلىٰ رسول الله ﷺ و بين الجدار ممرا الشاة.

۴۷۰. حدثنا المكی بن ابراهيم قال نا يزيد بن ابی عبيد عن سلمة قال كان جدار المسجد عند المنبر ما كادت الشاة تجوزها.

ترجمہ ۴۶۹: حضرت سہل بن سعدؓ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ کے سجدہ کرنے کی جگہ اور دیوار کے درمیان ایک بکری کے گذر سکنے کا فاصلہ تھا۔

ترجمہ ۴۷۰: حضرت سلمہؓ نے فرمایا کہ مسجد کی دیوار اور منبر کے درمیان بکری کے گذر سکنے کا فاصلہ تھا۔

تشریح: مسجد نبوی میں اس وقت محراب نہیں تھی اور آپ منبر کی بائیں طرف کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے، لہٰذا منبر اور دیوار کا فاصلہ بعینہ وہی تھا جو آپ کے اور دیوار کے درمیان ہو سکتا تھا۔

باب الصلوٰة الى الحربة

(چھوٹے نیزہ (حربہ) کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا)

۴۷۱. حدثنا مسدد قال نا يحيىٰ عن عبيد الله قال اخبرنی نافع عن عبدالله بن عمر ان النبی ﷺ كان يركز له الحربة فيصلی اليها.

باب الصلوٰة الى العنزة

(عنزہ (وہ ڈنڈا جس کے نیچے لوہے کا پھل لگا ہوا ہو) کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا)

۴۷۲. حدثنا ادم قال نا شعبة قال ناعون بن ابی حجيفة قال سمعت ابی قال خرج علينا النبی بالهاجرة فاتی بوضوء فتوضا فصلی بنا الظهر و العصر وبين يديه عنزة والمرأة الحمار يمران من ورآء ها.

۴۷۳. حدثنا محمد بن حاتم بن بزيع قال نا شاذ ان عن شعبة عن عطاء ابن ابی ميمونة قال سمعت انس بن مالک قال كان النبی ﷺ اذا خرج لحاجته تبعته انا وغلام و معنا عكازة او عصا او عنزة و معنا اداوة فاذا فرغ من حاجة ناولناه الاداوة.

باب السترة بمكة وغيرها

(مکہ اور اس کے علاوہ دوسرے مقامات میں سترہ)

۴۷۴. حدثنا سليمان بن حرب قال نا شعبة عن الحكم عن ابی حجيفة قال خرج علينا رسول الله ﷺ بالهاجرة فصلی الظهرو العصر ركعتين ونصب بين يديه عنزة و توضأ فجعل الناس يتمسحون بوضوء ه.

ترجمہ ۴۷۱: حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے خبر دی کہ نبی کریم ﷺ کے لئے حربہ گاڑ دیا جاتا تھا اور آپ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔

ترجمہ ۴۷۲: حضرت عون بن ابی جحیفہ نے اپنے والد سے سنا کہ نبی کریم ﷺ دوپہر کے وقت تشریف لائے آپ کی خدمت میں وضو کا پانی پیش کیا گیا جس سے آپ نے وضو کیا، پھر ہمیں آپ نے ظہر کی نماز پڑھائی اور عصر کی بھی، آپ کے سامنے عنزہ گاڑ دیا گیا تھا، اور عورتیں اور گدھے اس کے پیچھے سے گذر رہے تھے۔

ترجمہ ۴۷۳: حضرت عطاء بن ابی میمونہ نے حضرت انس بن مالک سے سنا کہ نبی کریم ﷺ جب رفع حاجت کے لئے تشریف لے جاتے، میں اور ایک لڑکا آپ کے پیچھے پیچھے جاتے تھے، ہمارے ساتھ عکازہ (ڈنڈا جس کے نیچے لوہے کا پھل لگا ہوا تھا) یا چھڑی یا عنزہ ہوتا تھا اور ہمارے ساتھ ایک برتن بھی ہوتا تھا جب آنحضور ﷺ حاجت سے فارغ ہو جاتے تو ہم آپ کو وہ برتن دیتے تھے۔

ترجمہ ۴۷۴: حضرت ابوجحیفہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس دوپہر کے وقت تشریف لائے اور آپ نے بطحاء میں ظہر اور عصر کی دو رکعتیں پڑھیں، آپ کے سامنے عنزہ گاڑ دیا گیا تھا اور جب آپ نے وضو کیا تو لوگ آپ کے وضو کے پانی کو اپنے بدن پر لگانے لگے۔

تشریح: امام بخاریؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سترہ کے مسئلہ میں مکہ اور دوسرے مقامات میں کوئی فرق نہیں ہے، البتہ اس موقع پر یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ خاص بیت اللہ کے سامنے نماز اگر کوئی شخص پڑھ رہا ہے اور طواف کرنے والے اس کے سامنے سے آ جا رہے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ بیت اللہ کا طواف بھی نماز کے حکم میں ہے، یہ مسئلہ امام طحاوی نے اپنی مشکل الآثار میں ذکر کیا ہے، مسائل حج و زیارت کی کتابوں میں یہ بھی دیکھا کہ چونکہ بیت اللہ کے سامنے نماز پڑھنے میں وصلہ قوی تر ہوتا ہے اس لئے وہاں کسی کے مرور سے وصلہ قطع نہیں ہوتا لہٰذا بغیر سترہ کے وہاں نماز درست ہے اور نماز کی حالت میں سامنے سے گذر سکتا ہے اور یہ مسئلہ صرف مسجد حرام کیلئے ہے۔

مقصد امام بخاری: حافظ نے لکھا:- علامہ ابن المنیر نے کہا کہ ''امام بخاری نے خاص طور سے مکہ کا ذکر کیا مغالطہ رفع کرنے کے لئے کیا ہے کہ سترہ بمنزلہ قبلہ ہوتا ہے کہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ مناسب نہیں کہ مکہ کے لئے بجز کعبہ معظمہ کے کوئی اور قبلہ ہو، لہٰذا مکہ کے اندر سترہ کی ضرورت نہیں'' پھر حافظ نے لکھا کہ میرے نزدیک تو امام بخاری نے محدث عبدالرزاق پر تعریض کی ہے جنہوں نے اپنے مصنف میں **باب لا یقطع الصلوۃ بمکۃ شیء** قائم کر کے حدیث ابن جریج نقل کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ مسجد حرام میں نماز پڑھ رہے تھے کوئی سترہ آپ کے سامنے نہیں تھا اور لوگ آپ کے سامنے سے گذر رہے تھے، دوسرے اصحاب السنن نے بھی یہ روایت نقل کی ہے اور اس کے رجال رواۃ ثقہ ہیں، تاہم یہ روایت معلول ہے، لہٰذا امام بخاری نے اس کے ضعف پر تنبیہ کی ہے اور اپنی یہ رائے بتلانی چاہی ہے کہ مشروعیت سترہ کے مسئلہ میں مکہ اور غیر مکہ کا کوئی فرق نہیں ہے اور اپنے استدلال میں حدیث ابی جحیفہ پیش کی ہے، شافعیہ کا بھی یہی مسلک مشہور ہے کہ نمازی کے سامنے سے گذرنا مکہ اور غیر مکہ سب جگہ یکساں طور پر ممنوع ہے، البتہ بعض فقہاء نے بوجہ ضرورت طائفین کے لئے مرور کے گناہ کو مرجو المغفرت کہا ہے، دوسروں کے لئے یہ بھی نہیں، بعض حنابلہ نے مرور کو تمام مکہ میں جائز قرار دیا ہے (فتح ص ۳۸۴ ج ۱)

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ حنابلہ کے یہاں یہی راجح قول ہے بلکہ تمام حرم کا حکم یہی ہے کہ کافی المغنی اور ابن تیمیہ نے المنتقی میں باب الرخصۃ للطائفین بالبیت قائم کیا ہے، علامہ شامی نے بعض حنفیہ کا بھی یہی مسلک نقل کیا ہے (الابواب والتراجم ص ۲۳۱ ج ۲)

موفق نے کہا کہ ''مکہ معظمہ میں بلاسترہ نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، امام احمد نے فرمایا کہ مکہ معظمہ دوسرے شہروں کی طرح نہیں ہے اس کا حکم الگ ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے حرم میں نماز پڑھی ہے اور لوگ سامنے سے گذرتے رہتے تھے، معتمر نے کہا کہ میں نے طاؤس سے سنا کہ ایک شخص مکہ میں نماز پڑھتا ہے اور اس کے سامنے سے مرد عورتیں گذرتے رہتے ہیں، جواب دیا کہ کیا حرم میں نماز پڑھتے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو آمنے سامنے نہیں دیکھتے رہتے ہیں؟ یعنی اس شہر کا حال دوسرے شہروں جیسا نہیں ہے اور تمام حرم کا حکم اس بارے میں مکہ کا ہی ہے کیونکہ سارے حرم میں مشاعر و مناسک ادا کئے جاتے ہیں'' علامہ شامی نے بعض حنفیہ کا قول نقل کیا کہ مسجد حرام میں نماز پڑھنے

والے کو چاہئے کہ اپنے سامنے سے گذرنے والوں کو نہ روکے اور ان سے مراد طواف کرنے والے ہیں کیونکہ طواف بحکم صلوٰۃ ہے تو یہ ایسا ہوگا جیسے کہ ایک صف کے نماز پڑھنے والوں کے سامنے آگے کی صف والے ہوتے ہیں اور علامہ عزالدین نے امام طحاوی کی مشکل الآثار سے نقل کیا ہے کہ بحضرۃ کعبہ معظمہ نمازی کے سامنے سے گذرنا جائز ہے، علامہ شامی نے اس کو نقل کر کے لکھا کہ یہ جزئیہ نادر و غریب ہے، اس کو یاد کر لینا چاہئے (حاشیہ لامع الدراری ص ۱۹۷ ج ۱)

امام احمد وابوداؤد کی رائے امام بخاری کے خلاف

یہ حدیث مطلب مسند احمد بھی ہے اور ابوداؤد نے ''باب فی مکہ'' میں امام احمد سے ہی روایت کی ہے اور ان دونوں میں کثیر کی روایت اپنے دادا مطلب سے بعض افراد خاندان کے ذریعہ ہے، صاحب الفتح الربانی نے لکھا کہ مطلب اور ان کے والد صحابی تھے، مکہ فتح ہونے پر اسلام لائے تھے، مسند احمد میں ایک حدیث حضرت ابن عباسؓ سے حضور علیہ السلام کے بغیر سترہ کے نماز پڑھنے کی مروی ہے، صاحب الفتح الربانی نے لکھا کہ حدیث الباب سے جمہور نے عدم وجوب سترہ پر استدلال کیا ہے لیکن شوکانی نے کہا کہ حضور علیہ السلام کا فعل، آپ کے قول کا معارض نہیں ہوسکتا، لہٰذا وہ وجوب سترہ کے قائل رہے (الفتح الربانی ص ۱۴۵ ج ۳)

یہ عجیب بات ہے کہ اس جگہ مکہ میں سترہ کی بات بھی لائی تھی، جبکہ صرف مطلق وجوب سترہ کا ذکر ہوا، اسی طرح بذل المجہود ص ۱۹۶ ج ۳ میں بھی مطلق سترہ کے احکام بیان ہوئے، جبکہ امام ابوداؤد نے خاص باب مکہ کے بارے میں باندھا تھا اور مطلق سترہ کی احادیث کتاب الصلوٰۃ میں ذکر کر چکے تھے، اور مطلب کی روایت ذکر کی تھی اور یہ بھی ظاہر تھا کہ امام بخاری مستقل باب قائم کر کے سترہ کے باب میں مکہ اور غیر مکہ کو برابر قرار دے چکے ہیں اس بارے میں لکھنا ضروری تھا کیونکہ بظاہر ابوداؤد امام بخاری کے خلاف گئے ہیں اور وہ بھی مکہ میں بلاسترہ نماز کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام ابن ماجہ ونسائی کی رائے امام بخاری کے خلاف ہے

سنن ابن ماجہ میں بھی یہ حدیث ہے مگر کثیر نے وہاں اپنے بعض اہل سے نہیں بلکہ اپنے باپ کثیر کے واسطہ سے اپنے دادا مطلب سے روایت کی ہے۔ محدث ابن ماجہ نے مطلق سترہ کے احکام کی احادیث کتاب الصلوٰۃ میں ذکر کی ہیں، اور ابوداؤد کی طرح کتاب الحج میں باب الرکعتین بعد الطواف قائم کر کے یہ حدیث مطلب ذکر کی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی تصریح کر دی کہ یہ حکم بلاسترہ نماز کا صرف مکہ کے لئے ہے۔ (ابن ماجہ ص ۲۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ ان کا مسلک بھی امام بخاری کے خلاف ہے اور جمہور کے موافقت میں ہیں کہ مکہ اور غیر مکہ کا اس بارے میں فرق ہے، امام نسائی نے کتاب القبلۃ کے تحت باب التشدید فی المرور بین یدی المصلی و بین السترۃ قائم کر کے وہ احادیث ذکر کیں، جن سے ممانعت مرور ثابت ہے، پھر دوسرا باب ''الرخصۃ فی ذلک'' کا قائم کر کے یہی حدیث مطلب (عن ابیہ عن جدہ) ذکر کی ہے (نسائی ص ۱۲۳)

اس سے ثابت ہوا کہ امام نسائی بھی امام بخاری کے ہم رائے نہیں ہیں لامع الدراری ص ۱۹۷ ج ۱ میں ابویعلی و دیگر محدثین سے بھی اس روایت مطلب کا ثبوت دیا گیا ہے، آگے امام طحاوی کی مشکل الآثار سے بھی ہم پوری نقل لانے والے ہیں کہ بظاہر ان کی وجہ سے حنفیہ نے جمہور کا ساتھ دیا ہے، ان سب کبار محدثین نے مطلب والی روایت کو معتبر ٹھیرایا ہے اور بعض اہل کی وجہ سے جہالت راوی کی علت کو نظر انداز کر دیا ہے اور امام نسائی وابن ماجہ نے تو عن ابیہ عن جدہ کو راجح سمجھا ہے، اب رہی یہ بات کہ کثیر نے خود کہا کہ میں نے اپنے باپ سے نہیں بلکہ اہل سے سنا ہے تو کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ پہلے انہوں نے بعض اہل سے ہی سنا ہو اور پھر عن ابیہ عن جدہ سن کر بھی اسی طرح روایت کرتے ہوں، حضرت سفیان بن عیینہ، حضرت یزید بن ہارون وغیرہ بھی جبال محدثین میں سے تھے اور اصحاب صحاح ستہ کے اساتذہ میں تھے، انہوں

نے اطمینان کر کے ہی عن ابیہ عن جدہ کے طریقہ سے روایت کی ہوگی مگر ہوا تو یہ کہ امام بخاری کا سحر ایسا آیا کہ اس سے بڑے بڑے مسحور ہوگئے، پھر یہ کہ جمہور نے جو مسلک نماز حرم میں بلاسترہ کا اختیار کیا تو کیا وہ بالکل ہی بے دلیل کر لیا تھا، ان کو سترہ کی ضرورت شدت واہمیت معلوم نہ تھی، اور بلاسترہ نماز پڑھنے پر گذرنے والوں کے ساتھ خود نمازی کے گنہگار ہونے کی بات کیا ان سے بالکل ہی نظر انداز ہوگئے تھے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ بڑا مارے اور رونے بھی نہ دے، امام بخاری وغیرہ کا یہی حال ہے وہ اپنی ذاتی فقہی رائے قائم کر کے آگے کو ایسا بڑا بند لگا دینا چاہتے ہیں کہ کوئی عبور نہ کر سکے اور اوپر ذکر کیا گیا کہ امام احمدؒ جو امام بخاری کے استاذ حدیث بھی تھے) اس کے قائل ہیں کہ نہ صرف مسجد حرام میں اور نہ صرف مکہ معظمہ میں بلکہ سارے حرم کے طویل وعریض علاقے میں بلاسترہ نماز جائز بلا کراہت ہے نہ نمازی کو سترہ کا اہتمام کرنے کی ضرورت اور نہ سامنے سے گذرنے والوں پر کوئی گناہ، کوئی کہہ سکتا ہے کہ اتنا بڑا اقدام امام احمدؒ[1] ایسی عظیم اور جلیل شخصیت بلادلیل کر سکتی تھی اور خاص کعبہ معظمہ کے گرد مسجد حرام کے اندر تو امام طحاوی بھی جواز صلوۃ بلاسترہ کا فیصلہ حدیث مطلب ہی کی وجہ سے کر گئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے

آپ نے فرمایا کہ ایسی بات ہمارے فقہاء ومحدثین حنفیہ میں سے کسی اور نے نہیں لکھی اور یہی بات شامی نے کہی کہ یہ نادر جزئیہ ہے اس کو محفوظ کر لینا چاہئے لیکن فیض الباری کی عبارت سے یہ ابہام ہوتا ہے کہ امام طحاوی کے علاوہ مذاہب اربعہ میں سے بھی کسی نے ایسی بات نہیں کہی یہ بات حضرتؒ کی طرف غلط منسوب ہوگئی، دوسری غلطی یہ ہوئی کہ امام طحاوی کا مسئلہ صرف طائفین کے لئے بتلایا گیا حالانکہ طائفین کے لئے تو بعض فقہاء شافعیہ نے بھی اجازت ضرورت کے تحت دیدی ہے، امام طحاوی تو کعبہ کی موجودگی کی وجہ سے مطلق مرور کی اجازت سب کے لئے دے گئے ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو توجیہ وجیہ امام طحاوی نے فرمائی ہے وہ کسی اور نے نہیں کی اور اس سے امام موصوف کی غیر معمولی دقت نظر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

امام طحاوی کا ارشاد

آپ نے عنوان باب قائم کیا ''نمازی کے سامنے گذرنا بیت حرام کی موجودگی میں اس کی غیبت میں'' پھر سب سے پہلے کئی طرق سے حدیث مطلب ہی کی روایت فرمائی اور فرمایا کہ اس حدیث سے طائفین[2] کیلئے نمازی کے سامنے سے گذرنے کی اجازت حاصل ہوئی، پھر دوسری احادیث ممانعت مرور کی ذکر کیں، آگے لکھا کہ کسی نے اعتراض کیا کہ یہ احادیث تو مطلب والی کی ضد ہیں، تو ہم نے اس کا جواب خدا کی توفیق سے یہ دیا کہ مطلب والی حدیث کا محل وہ ہے کہ بیت اللہ کے معائنہ ومشہود کی صورت میں نماز پڑھ رہا ہو اور دوسری احادیث ممانعت والی اس کے لئے ہیں، جو مسجد حرام سے باہر کسی حصہ میں تحری قبلہ کے ذریعہ نماز پڑھتے ہوں۔

لہٰذا دونوں قسم کی احادیث میں کوئی تضاد نہیں ہے اور وجہ یہ ہے کہ کعبہ کے گرد نماز پڑھنے والوں کے چہرے تو ایک دوسرے کے مقابل بھی ہوتے ہیں اور اس میں ہاں کوئی کراہت بھی نہیں ہے، لیکن وہاں کے علاوہ جہاں بھی دنیا میں نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور کعبہ سامنے نہیں ہوتا تو اس طرح مقابل ہو کر نماز بھی درست نہیں ہوتی اور ممنوع ہے، اس سے ہم سمجھے کہ پہلا حکم کعبہ معظمہ کی موجودگی کے ساتھ مخصوص

---

[1] ابونعیم نے حضرت عمرؓ سے یہ روایت کی ہے کہ اگر نمازی یہ جان لے کہ کسی کے سامنے سے گذرنے کی وجہ سے اس کی نماز میں کتنا نقصان آجاتا ہے تو وہ کبھی بلاسترہ کے نماز نہ پڑھے، (بستان الاحبار مختصر نیل الاوطار شوکانی ص ۳۸۳ ج ۱) اور گزرنے والوں کے لئے جتنی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں وہ تو مشہور ہیں۔ (مؤلف)

[2] یہاں لفظ طائفین سے تخصیص کا شبہ نہ ہو کیونکہ حرم محترم میں سب طائفین ہی ہوتے ہیں، دوسرا وہاں کون ہوتا ہے اور حکم مرور کا جواز بحالت طواف وغیر طواف ہر طرح ہے جیسا کہ آگے امام طحاوی کی توجیہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے (مؤلف)

ہے اور جب ایک دوسرے کے مقابل آمنے سامنے ہو کر نماز کی اجازت بیت اللہ کے ارد گرد جائز بلا کراہت ہوگئی تو اس امر کی گنجائش بھی نکل آئی کہ بیت اللہ کی طرف اس کی موجودگی میں رخ کر کے نماز پڑھنے والوں کے سامنے سے لوگ گذر بھی سکیں، برخلاف اس کے بیت اللہ کی غیر موجودگی میں چونکہ ایک دوسرے کے مقابل ہو کر نماز جائز نہیں تو گذرنے والوں کے لئے بھی تنگی وشدت ہی قائم رہے گی۔

اس تفصیل سے صاف طور سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دونوں قسم کی احادیث میں کوئی تضاد نہیں اور دو جگہوں کے لئے حکم الگ الگ ہے، کعبہ معظمہ کے سامنے کا حکم الگ اور باقی سب جگہوں کا حکم الگ۔ واللہ نسئلہ التوفیق (مشکل الآثار ص ۲۴۹ تا ص ۲۵۲ ج ۳)

بعض حضرات نے یہ توجیہ بھی کی ہے کہ کعبہ معظمہ کے سامنے نماز ادا کرنے کی حالت میں توجہ الی اللہ اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ سامنے سے کسی کے گذرنے کا احساس وخیال بھی نہیں ہوتا، اس لئے مرور مضر نہیں اور بعض نے کہا کہ حضور بیت اللہ کی حالت میں وصلہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ وہ کسی کے گذرنے سے قطع نہیں ہوتا، اس لئے سترہ کی ضرورت نہیں نہ مرور کی ممانعت۔ واللہ تعالیٰ اعلم

باب الصلوٰة فی الاسطوانة وقال عمر المصلون احق باسواری من المتحدثین الیها ورای ابن عمر رجلا یصلی بین السطوانتین فادناه الی ساریة فقال صل الیها

(ستون کو سامنے کر کے نماز پڑھنا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نماز پڑھنے والے ستونوں کے ان لوگوں سے زیادہ مستحق ہیں جو اس پر ٹیک لگا کر باتیں کریں اور حضرت ابن عمرؓ نے ایک شخص کو دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھتے دیکھا تو اسے ایک ستون کے قریب کر دیا اور فرمایا کہ اس کو سامنے کر کے نماز پڑھو (تا کہ گذرنے والوں کو تکلیف نہ ہو)

۴۷۵. حدثنا المکی بن ابراهیم قال نا یزید بن ابی عبید قال کنت اٰتی مع سلمة بن الاکوع فیصلی عند الاسطوانة التی عند المصحف فقلت یا ابا مسلم ازا تتحری الصلوة عن هذه الاسطوانة قال فانی رایت النبی ﷺ یتحری الصلواة عندها.

۴۷۶. حدثنا قبیصة قال حدثنا سفیان عن عمرو بن عامر عن انس بن مالک قال لقد ادرکت کبار اصحاب النبی ﷺ یبتدرون السواری عند المغرب و زاد شعبة عن عمرو عن انس حتی یخرج النبی ﷺ.

ترجمہ ۴۷۵: حضرت یزید بن ابی عبید نے بیان کیا کہ میں سلمہ بن اکوع کے ساتھ (مسجد نبوی میں) حاضر ہوا کرتا تھا سلمہ ہمیشہ اس ستون کو سامنے کر کے نماز پڑھتے تھے جو مصحف کے پاس تھا میں نے ان سے کہا کہ اے ابو مسلم میں دیکھتا ہوں کہ آپ ہمیشہ اسی ستون کو سامنے کر کے نماز پڑھتے ہیں، انہوں نے اس پر فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو خاص طور سے اسی ستون کو سامنے کر کے نماز پڑھتے دیکھا تھا۔

ترجمہ ۴۷۶: حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے کبار اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھا کہ وہ مغرب کی اذان کے وقت ستونوں کے سامنے جلدی سے پہنچ جاتے تھے، شعبہ نے عمرو سے وہ انسؓ سے (اس حدیث میں) یہ زیادتی کی ہے ''یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ باہر تشریف لاتے''۔

تشریح: مغرب کی اذان اور نماز کے درمیان ہلکی پھلکی دو رکعتیں ابتداء اسلام میں پڑھ لی جاتی تھیں لیکن پھر اس پر عمل ترک کر دیا گیا کیونکہ شریعت کو مغرب کی اذان اور نماز میں زیادہ سے زیادہ اتصال مطلوب ہے، شوافع کے نزدیک یہ دو رکعتیں مستحب ہیں اور احناف اور مالکیہ کے یہاں صرف مباح ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں امام ابوحنیفہ کا مسلک نقل کیا کہ منفرد دو ستونوں کے درمیان نماز

پڑھے تو جائز بلا کراہت ہے، لیکن مقتدی ایک یا دو ہوں تو مکروہ ہے، زیادہ ہوں تو مکروہ نہیں کیونکہ وہ صف کے حکم میں ہوں گے، حضرتؒ نے فرمایا اس میں فقہی وجہ شاید یہ ہوگی کہ وہ دو صف کا جز ہوتے ہیں، ان کو صف سے الگ کھڑا نہ ہونا چاہئے اور تین یا زیادہ خود مستقل صف کا حکم رکھتے ہیں اس لئے مکروہ نہ ہوگا فرمایا کہ مجھے یہ مسئلہ کتب فقہ میں نہیں ملا، اور شوکانی نے حوالہ بھی نہیں دیا، تاہم میرا وجدان کہتا ہے کہ مسئلہ اسی طرح ہوگا، پھر فرمایا کہ میرا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ شوکانی کے پاس حنفی مذہب کا پورا علم نہیں تھا، اس لئے میں نقل مذہب میں ان پر اعتماد نہیں کرتا، حضرتؒ کی امام بخاریؒ کے بارے میں یہی رائے تھی کہ ان کے پاس پوری طرح مسلک حنفی کا علم نہ تھا، اور محدث ابن ابی شیبہؒ نے بھی بہت سے اعتراضات حنفی مسلک پر عدم علم کی وجہ سے کئے ہیں، ایسے اور حضرات بھی ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں کہ جان بوجھ کر مغالطے میں ڈالتے ہیں۔ واللہ المستعان۔

قولہ عند المصحف اور حافظ و عینی کی غلطی

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا حافظ الدنیا ابن حجرؒ سے غلطی ہوگئی[1] کہ اس اسطوانہ کو جو مصحف کے پاس تھا، اسطوانہ مہاجرین سمجھے، شاید مخلقہ ہونے کی وجہ سے مغالطہ لگا ہوگا، علامہ سمہودیؒ نے بھی اس بارے میں اپنے استاذ حافظ ابن حجر کا رد کیا ہے اور کہا کہ وہ دوسرا تھا، اسطوانہ مہاجرین نہیں تھا، پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک سمہودی کا قول اس بارے میں زیادہ معتبر ہے اب اس کی تفصیل درج کی جاتی ہے، حافظ نے فتح الباری ص ۳۸۵ ج ۱ میں اس طرح لکھا:- "مصحف شریف کے لئے ایک صندوق تھا جس میں وہ (حضرت عثمانؓ کے وقت سے) رکھا جاتا تھا، چونکہ اس کی ایک جگہ مقرر تھی تو اس سے اسطوانہ کی تعیین کی گئی اور اس اسطوانہ کے بارے میں ہمارے بعض مشائخ نے ہمیں تحقیقی طور سے بتلایا ہے کہ وہ روضۂ مکرمہ کے درمیان میں ہے اور وہ اسطوانۂ مہاجرین کے نام سے مشہور ہے، کہا کہ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں اگر لوگ اس کو پہچان لیتے تو قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا قرب ڈھونڈتے اور آپ نے حضرت ابن زبیر کو راز کے طور پر بتلا دیا تھا تو وہ اس کے قریب بہ کثرت نمازیں پڑھا کرتے تھے، پھر میں نے ابن النجار کی تاریخ مدینہ میں بھی یہی بات دیکھی، اس میں یہ بھی ہے کہ مہاجرین قریش اس اسطوانہ کے پاس جمع ہوا کرتے تھے اور اس سے قبل محمد بن الحسن نے بھی اخبار المدینہ میں ایسا ہی درج کیا ہے (فتح)

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ یہی غلطی علامہ عینی سے بھی ہوگئی ہے، انہوں نے بھی اسطوانۂ مہاجرین ہی سمجھا ہے اور فیض الباری میں جو یہ درج ہوگیا کہ حافظ نے اس کو اسطوانۂ مخلقہ قرار دیا، یہ بھی غلط ہے کیونکہ اس نام سے کوئی خاص اسطوانہ نہیں ہے، بلکہ جن ستونوں پر بھی خلوق (ایک خوشبو) لگائی جاتی تھی وہ سب ہی مخلقہ کہے جاتے تھے، چنانچہ اس لحاظ سے اسطوانۂ حضرت عائشہ بھی مخلقہ تھا اور اسطوانۂ علم المصلے شریف بھی اور یہاں حدیث بخاری میں جو مصحف شریف کے قریب والے اسطوانہ کا ذکر ہوا ہے وہ اسطوانہ علم المصلے ہی تھا، جس کی پوری تحقیق علامہ سمہودی نے ص ۲۶۲ ج ۱ سے شروع کر کے اسطوانوں کی آخر بحث ص ۳۲۱ ج ۱ تک متعدد جگہ کی ہے اور ص ۲۶۴ میں اپنے استاذ محترم حافظ ابن حجرؒ کی غلطی اور وجوہ اشتباہ بیان کر کے تصحیح کا حق ادا کیا ہے جس کی طرف استاذی و سیدی و سندی حضرت علامہ کشمیریؒ نے اشارہ فرمایا ہے، علامہ سمہودی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حافظ نے جو محمد بن الحسن بن زیاد اور ابن النجار کا حوالہ دیا ہے وہ بھی غلط ہے کیونکہ ان دونوں کے کلام سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اسطوانہ عند المصحف سے مراد اسطوانۂ مہاجرین تھا، البتہ چونکہ دونوں کو مخلقہ کہا جاتا تھا، اس سے حافظ کو دھوکہ لگ گیا ہے۔ ص ۳۱۲ ج ۱ میں بخاری کی اسی حدیث الباب سلمہ والی کو ذکر کر کے بھی یہی تعیین کی کہ اس سے مراد وہ اسطوانہ ہے جو قریب و محاذات کی وجہ سے حضور علیہ السلام کے مصلے (اور محراب) کی علامت تھا، اس کے بعد دوسرے اسطوانۂ قرعہ کا ذکر کیا اور بتلایا کہ وہ اسطوانۂ عائشہ، اسطوانہ مخلقہ اور اسطوانۂ مہاجرین کے نام سے بھی مشہور تھا۔

---

[1] فتح الملہم ص ۱۰۹ ج ۳ میں اس حدیث پر حافظ کی عبارت بلا کسی نقد و تحقیق کے ذکر ہوئی ہے۔ (مؤلف)

چونکہ اسطوانات مسجد نبوی کے بارے میں اشتباہ ہوتا رہا ہے اور امام بخاری ومسلم وابن ماجہ کے سوا اور کتب صحاح ستہ میں اس حدیث سلمہؓ کو نہیں لیا گیا اور صرف حضرت شاہ صاحبؒ نے تاریخی وعلمی بحث کو اٹھایا ہے اور حافظ وعینی ایسے اکابر امت کو بھی مغالطہ لگ چکا ہے جس کی وجہ سے ہمیں اوپر تفصیلی بحث دینی پڑی، اس لئے ہم یہاں اسطوانات کی تفصیل وتشریح پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں، اس سے دوسرا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ زائرین روضۂ مقدسہ نبویہ ان کی صحیح دینی اہمیت سمجھ کر وہاں کی برکات سے بھی متمتع ہو سکیں گے۔ واللہ الموفق:۔

یہ تفصیل ارشاد الساری الی مناسک الملاعلی قاریؒ سے نقل کی جاتی ہے:۔''مسجد نبوی میں نمازوں کا اہتمام کرنے کے ساتھ روضۂ مقدسہ نبویہ پر بہ کثرت حاضری دیتا اور سلام عرض کرتا رہے، عفو معاصی کے لئے شفاعت کی درخواست پیش کرتا رہے اور اساطین فاضلہ و دیگر مشاہد مقدسہ مثلاً محراب نبوی، منبر نبوی وغیرہ اور قبر نبوی کے قریب سنن ونوافل بہ کثرت پڑھتا رہے، ساتھ ہی اپنی نماز، تلاوت و ذکر و درود شریف وغیرہ کے لئے مسجد اول یعنی حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارکہ والی مسجد کی حدود پہچان کر اس کے حصول کو اختیار کرے'' (ہم نے مسجد اول کا نقشہ پہلے دیدیا ہے خدا کا لاکھوں لاکھ شکر ہے کہ یہ سب یادگاریں اب تک محفوظ چلی آتی ہیں اور خدا کرے کہ مکہ معظمہ کی زمانہ نبوت کی یادگاریں بھی پھر سے زندہ کردی جائیں کہ ان سب ہی سے ایمانوں کو قوت ملتی ہے۔ مؤلف

(۱) اسطوانہ علم مصلے نبوی: یہ اسطوانہ حضرت عائشہؓ سے متصل جانب غرب میں ہے اور امام بخاری کی حدیث الباب میں اسی کا ذکر ہے، حضرت سلمہؓ اسی کو تلاش کر کے اس کے پاس نمازیں پڑھا کرتے تھے (یہ حضرات صحابہ ہی کے دور مبارک میں حضور علیہ السلام کی نمازوں کی جگہ کیوں تلاش کی جارہی ہے، اس میں اماکن واشخاص کی عظمت واہمیت بظاہر کچھ زیادہ ہی مذہبی معلوم ہو رہی ہے اور ممکن ہے کسی ذکی الحس کو اس میں سے بوئے شرک بھی محسوس ہوئی ہو، کیونکہ آج کل کے دور جہالت میں ہر تعظیم کو شرک کے خانوں میں فٹ کرنے کی وبا بھی چلی ہوئی ہے اور امام بخاری کو دیکھئے کہ وہ بھی ایسے غیر معمولی محتاط محدث ہونے کے باوجود اس حدیث کی روایت کر گئے، پھر اور بھی دیکھئے کہ اس حدیث کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے کہ جب حضرت سلمہؓ سے وجہ دریافت کی گئی کہ آپ اسی جگہ کی تلاش کیوں کرتے ہیں تو فرمایا کہ میں نے حضور علیہ السلام کو بھی اس جگہ کو تلاش کرتے اور اس جگہ نماز پڑھتے دیکھا ہے، آگے محدثین نے یہ بھی کھوج نکالنے کی سعی کی ہے کہ آخر حضور علیہ السلام کیوں اس جگہ کی کھوج فرماتے تھے، مگر ساری باتوں کا صحیح علم حاصل ہو جانا بھی تو ضروری نہیں، کوئی بہت ہی برکت وعظمت اس جگہ میں ہوگی کہ وہاں حضور علیہ السلام نے بجز چند ایام کے اسی جگہ کو اپنا مصلے بنایا تھا، البتہ خیر جاری میں اتنا اور لکھا ہے کہ شاید مصحف شریف کو حضور کے بعد اسی لئے اسی جگہ رکھا گیا کہ اس مقام متبرک کی حضور علیہ السلام تحری فرماتے تھے اور عجب نہیں کہ وہ جگہ اسی لئے تحری نبوی کی مستحق ہوئی ہو کہ کلام سراپا عظمت کا مقام بننے والی تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ مؤلف)

(۲) اسطوانہ حضرت عائشہؓ: یہ روضۂ مطہرہ کے درمیان میں ہے، نقشہ میں دیکھا جائے، اس پر سنہرے حروف سے نام بھی لکھا ہوا ہے اور اسی کو اسطوانہ مہاجرین، اسطوانہ قرعہ اور اسطوانہ مخلقہ بھی کہتے ہیں، حضور علیہ السلام نے تحویل قبلہ کے بعد چند روز تک اس کے پاس نماز پڑھائی تھی، پھر اپنے مصلے پر آخر تک نماز پڑھاتے رہے، آپ اس سے ٹیک لگا کر شمال کو رخ کر کے بیٹھا کرتے تھے (غالباً صحابہ کرام کے افادہ وافاضہ کے لئے) حضرت عائشہؓ نے حضور علیہ السلام سے ارشاد نقل کیا کہ میری اس مسجد میں ایک جگہ ایسی ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے تو بغیر قرعہ ڈالے وہاں نماز نہیں پڑھ سکتے اور حضرت عائشہؓ نے اسی اسطوانہ کی طرف اشارہ فرمایا، اسی لئے اس کا نام اسطوانہ عائشہ ہوا یہ بھی روایت ہے کہ اس کے پاس دعا قبول ہوتی ہے، لہٰذا حضور علیہ السلام کے اتباع میں اس کے پاس نمازیں بھی پڑھی جائیں اور اس سے پیٹھ لگا کر بیٹھا بھی جائے۔

(۳) اسطوانہ توبہ: اسطوانہ عائشہ سے مشرق میں ہے نام لکھا ہوا ہے، یہاں بھی حضور علیہ السلام کا نماز پڑھنا اور اعتکاف کرنا اور برعکس سابق اس سے پیٹھ لگا کر قبلہ رو بیٹھنا ثابت ہے، اس اسطوانہ سے حضرت ابولبابہ نے اپنے آپ کو باندھ دیا تھا اور جب تک ان کی معافی

نازل نہ ہوئی اور خود حضور علیہ السلام نے ہی نہ کھولا، کم وبیش ایک ہفتہ تک بندھے رہے، خود ہی اپنے اختیار سے کھانا پینا بھی بند رکھا تھا، اسی سے اس کو اسطوانۂ ابی لبابہ بھی کہتے ہیں اور علماء نے لکھا ہے کہ روضۂ مقدسہ پر سلام وزیارت اور دعاؤں سے فارغ ہو کر پہلے اسی اسطوانہ پر حاضر ہو کر توبہ واستغفار کرے، تاکہ حضرت ابولبابہ کی طرح توبہ قبول ہو۔

(۴) اسطوانۂ سریر: اسطوانۂ توبہ سے شرق میں شباک حجرۂ نبوی سے ملا ہوا، اس پر بھی نام ہے، اس کے قریب بھی اعتکاف فرمایا ہے اور اس کے پاس آپ کا سریر بچھایا جاتا تھا۔

(۵) اسطوانۂ علیؓ: اس کو اسطوانۂ محرس بھی کہتے ہیں اور یہی اس پر لکھا ہوا ہے، اسطوانۂ سریر پر سے متصل شمال میں ہے، حضرت علیؓ اس کے پاس بیٹھتے، پاسبانی فرماتے اور نمازیں پڑھتے تھے، یہ اس کھڑکی کے مقابل تھا، جس سے حضور علیہ السلام نکل کر حجرۂ شریفہ سے روضہ میں تشریف لاتے تھے۔

(۶) اسطوانۂ وفود: حضور علیہ السلام اس کے پاس صحابۂ کرام کے ساتھ بیٹھتے تھے اور وفود سے بھی یہیں ملاقات فرماتے تھے اس کے اور اسطوانۂ علی کے درمیان میں جو دروازہ حضور کی آمد ورفت روضہ کا تھا، وہ اب بند ہے۔

(۷) اسطوانۂ تہجد: یہ حضرت فاطمہؓ کے گھر سے متصل شمال میں ہے، یہاں محراب بھی ہے، جس میں قبلہ رو کھڑا ہو تو اس سے بائیں جانب باب جبریل ہے۔

(۸) اسطوانۂ مربعۃ القبر: اس کو مقام جبریل علیہ السلام کہتے ہیں اب وہ حجرۂ شریفہ کے احاطہ میں اندر ہو گیا ہے، اس لئے عام لوگ اس کی زیارت وبرکت سے محروم ہو گئے ہیں اور صرف خواص وکبار ہی اندر جا سکتے ہیں۔

آخر میں لکھا:۔''مسجد نبوی کے دوسرے تمام اسطوانات کے قریب بھی نمازیں پڑھنا مستحب ہے، کیونکہ وہ مواضع حضور علیہ السلام کی نظروں میں اور صحابہ کی نمازوں سے مشرف ہو چکے ہیں (ارشادالساری ص۳۴۲ تا ۳۴۴ طبع مصر)

ضروری امور کی اہم یادداشت

(۱) نقشۂ مسجد نبوی میں محراب نبوی کی جگہ دی گئی ہے یہاں حضور علیہ السلام کا مصلے تھا، محراب کوئی نہ تھی اور عہد خلفاء میں بھی محراب نہ تھی، بعد کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے پہلی دفعہ بنائی۔ (وفاء للسمہودی ص۲۶۴ ج۱)

حضور علیہ اسلام کا مصلے پہلی بار مسجد نبوی کے شمال میں تھا جبکہ آپ نے ۱۶، ۱۷ ماہ تک بیت المقدس کی طرف کو نماز پڑھائی تھی، دوسرا مصلے اسطوانۂ عائشہ کے پاس تھا، جہاں آپ نے تحویل قبلہ کے بعد چندروز تک نماز پڑھائی، تیسرا مصلے اسطوانۂ عائشہ سے متصل غرب کے جانب اسطوانۂ علم مصلے کے پاس ہوا جو آخر عمر تک رہا (منبر نبوی اور اس مصلے ومقام نبوی کے درمیان فاصلہ ۱۴ ذراع اور ایک بالشت کا ہے (وفاء ۲۶۷ ج۱) اس سے بھی صحیح جگہ متعین ہو سکتی ہے۔

(۲) مصحف کبیر جس صندوق میں رکھا گیا تھا اور حدیث الباب بخاری میں بھی اس کا ذکر ہے اسطوانۂ علم مصلے سے داہنی جانب میں تھا۔ (وفاء ۲۶۳ ج۱)

(۳) مصلے نبوی کے محاذ میں ہی آگے قبلہ کی طرف محراب عثمانی ہے اور یہ دونوں ٹھیک وسط مسجد نبوی میں نہیں ہیں، داہنی طرف فاصلہ زیادہ ہے البتہ حضور علیہ السلام نے جو چندروز اسطوانۂ عائشہ کی طرف میں پڑھی تھی وہ روضۂ نبویہ کے وسط میں تھا پھر آپ کچھ داہنی جانب اسطوانۂ علم مصلے کے پاس پڑھنے لگے، جس سے حضور کی مسجد کا تقریباً وسط ہو گیا تھا اور شاید زیادہ اور بالکل وسط صحیح کی طرف اسی لئے نہ

بڑھے ہوں کہ یہاں قرب محل مصحف شریف تھا، جس کی عظمت خاص کی وجہ سے حضور علیہ السلام اس کی تحری فرماتے تھے اور شاید اس لئے بھی شرقی حصہ کی طرف میلان کرایا گیا ہو کہ روضۂ جنت اور روضۂ مقدسہ اور حجرات شریفہ (منازل و بیوت نبویہ بیت سیدہ طاہرہ) مقام جبریل و مواضع نزول وحی وغیرہ سب اسی بائیں جانب میں تھے اور شاید اسی لئے محراب عثمان بھی بائیں جانب رکھی گئی جبکہ غرب کی طرف توسیع ہو جانے کی وجہ سے صف کی دائیں جانب میں نمایاں طور سے جگہ زیادہ ہوگئی، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ہم نے یہ اس لئے لکھا کہ فقہی مسئلہ ہے کہ امام کا مصلے یا محراب وسط مسجد میں ہی ہونی چاہئے تا کہ امام کے دائیں اور بائیں دونوں طرف مقتدی برابر ہوں، پھر زائرین کرام مسجد نبوی میں اس کے خلاف دیکھتے تو اس کے اسباب و وجوہ کی طرف اشارہ ضروری ہوگیا۔

باب الصلوٰة بين السوارى فى غير جماعة

(نماز دوستونوں کے درمیان جب کہ تنہا پڑھ رہا ہو)

۴۷۷. حدثنا موسى بن اسمٰعيل قال نا جويرية عن نافع عن ابن عمر قال دخل النبى ﷺ البيت و اسامة بن زيد و عثمان بن طلحة و بلال فاطال ثم خرج و كنت اول الناس دخل على اثره فسالت بلا لا اين صلے فقال بين العمودين المقدمين.

۴۷۸. حدثنا عبدالله بن يوسف قال انا مالك بن انس عن نافع عن عبدالله ابن عمر ان رسول الله ﷺ دخل الكعبة واسامة بن زيد و بلال و عثمان بن طلحة الحجبى فاغلقها عليه ومكث فيها وسالت بلالا حين خرج ما منع النبى ﷺ قال جعل عمودا عن يساره عمودا عن يمينه و ثلثة اعمدة ورآءه وكان البيت يومئذ على ستة اعمدة ثم صلے و قال لنا اسمٰعيل حدثنى مالك فقال عمودين عن يمينه.

باب: ۴۷۹. حدثنا ابراهيم ابن المنذر قال نا ابو ضمرة قال نا موسى ابن عقبه عن نافع ان عبدالله كان اذا دخل الكعبة مشى قبل وجهه حين يدخل وجعل الباب قبل ظهره فمشى حتى يكون بينه وبين الجدار الذى قبل وجهه قريباً من ثلثة اذرع صلے يتوخى المكان الذى اخبره بلا ل ان النبى ﷺ صلے فيه قال وليس على احدنا باس ان صلے فى اى نواحى البيت شاء.

ترجمہ ۴۷۷: حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے، اسامہ بن زید، عثمان بن طلحہ اور بلال بھی آپ کے ساتھ تھے، آپ دیر تک اندر رہے پھر باہر آئے اور میں پہلا شخص تھا جو آپ کے بعد داخل ہوا میں نے بلال سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے کہاں نماز پڑھی تھی انہوں نے بتایا کہ سامنے والے دوستونوں کے درمیان۔

ترجمہ ۴۷۸: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے اور اسامہ، ابن زید، بلال اور عثمان بن طلحہ حجبی بھی، پھر دروازہ بند کر دیا اور اس میں ٹھہرے رہے جب بلال باہر آئے تو میں نے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے اندر کیا کیا تھا، انہوں نے کہا کہ آپ نے ایک ستون کو تو بائیں طرف چھوڑا اور ایک کو دائیں طرف اور تین کو پیچھے اور اس زمانہ میں بیت اللہ میں چھ ستون تھے، پھر آپ نے نماز پڑھی اور ہم سے اسمٰعیل نے کہا کہ مجھ سے مالک نے بیان کیا کہ دائیں طرف دوستون چھوڑے تھے۔

ترجمہ ۴۷۹: حضرت عبداللہ بن عمر جب کعبہ میں داخل ہوتے تو چند قدم آگے کی طرف بڑھتے، دروازہ پشت کی طرف ہوتا اور آپ آگے بڑھتے جب ان کے اور ان کے سامنے کی دیوار کا فاصلہ تقریباً تین ہاتھ رہ جاتا تو نماز پڑھتے اس طرح آپ اس جگہ نماز پڑھنا

چاہتے تھے جس کے متعلق حضرت بلال نے آپ کو بتایا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے یہیں نماز پڑھی تھی، آپ فرماتے تھے کہ بیت اللہ میں جس جگہ بھی ہم چاہیں نماز پڑھ سکتے ہیں، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

تشریح: یہاں حضرت ابن عمرؓ نے خود ہی وضاحت فرمادی کہ میں اس قسم کا تتبع واجب وضروری سمجھ کرنہیں کرتا بلکہ مستحب و پسندیدہ خیال کر کے کرتا ہوں اور یہی حضرت عمرؓ کی رائے بھی تھی کہ ان امور کو لازمی وواجب سمجھ کر نہ کیا جائے، باقی رہا استحباب و پسندیدگی کا درجہ اس کے خلاف جس نے کہا غلطی کی، واللہ اعلم۔

باب الصلوٰة الى الراحلة والبعير والشجر والرحل

(سواری، اونٹ، درخت اور کجاوہ کو سامنے کر کے نماز پڑھنا)

۴۸۰. حدثنا محمد بن ابی بکر المقدمی البصری قال نا معتمر بن سلیمان عن عبیداللہ بن عمر عن نافع عن ابن عمر عن النبی ﷺ انه کان یعرض راحلته فیصلی الیها قلت افرایت اذا ذهبت الرکاب قال کان یاخذ الرحل فیعدله فیصلی الی آخرته او قال موخره و کان ابن عمر یفعله.

باب الصلوٰة الى السرير

(چارپائی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا)

۴۸۱. حدثنا عثمان بن ابی شیبة قال نا جریر عن منصور عن ابراهیم عن الاسود عن عائشة قالت اعدلتمونا بالکلب والحمار لقد رایتنی مضطجعة علی السریر فیجیء النبی ﷺ فیتوسط السریر فیصلی فاکره ان اسنحه فانسل من قبل رجلی السریر حتی انسل من لحافی.

ترجمہ ۴۸۰: حضرت ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ اپنی سواری کو سامنے کر کے عرض میں کر لیتے تھے اور اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے عبیداللہ بن عمر نے نافع سے پوچھا کہ جب سواری اچھلنے کودنے لگتی تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے (آنحضور ﷺ اس وقت کیا کرتے تھے) نافع نے جواب دیا کہ آپ اس وقت کجاوے کو اپنے سامنے کر لیتے تھے اور اس کے آخری حصہ کی طرف (جس پر سوار ٹیک لگاتا ہے ایک کھڑی سی لکڑی) رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور حضرت ابن عمرؓ بھی اسی طرح کرتے تھے۔

ترجمہ ۴۸۱: حضرت عائشہؓ نے فرمایا تم لوگوں نے ہم عورتوں کو کتوں اور گدھوں کے برابر بنا دیا، حالانکہ میں چارپائی پر لیٹی ہوتی تھی اور خود نبی کریم ﷺ تشریف لاتے اور چارپائی کو اپنے سامنے کر کے نماز ادا فرماتے تھے مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا کہ میرا جسم سامنے آجائے یا میں آڑے آجاؤں، اس لئے میں چارپائی کے پایوں کی طرف سے آہستہ سے نکل کر اپنے لحاف سے باہر آجاتی تھی۔

تشریح: عرب میں چارپائی کھجور کی پتلی شاخوں اور رسی سے بنتے تھے، یہاں پر یہ بتایا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ چارپائی کو بطور سترہ استعمال کرتے تھے، حضرت عائشہؓ چارپائی پر لیٹی ہوتی تھیں اور نبی کریم ﷺ ان کے لیٹے رہنے میں کوئی حرج محسوس نہیں فرماتے تھے، امام بخاریؒ ہی کی ایک حدیث میں ہے جو چند ابواب کے بعد آئے گی کہ عورت، کتے اور گدھے کے گذرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، یہ حدیث کے ظاہری الفاظ ہیں اور حضرت عائشہؓ اس حدیث کے ظاہر سے پیدا شدہ غلطی کی تصحیح اپنے مخاطبوں سے فرما رہی ہیں۔

یہاں ترجمۃ الباب کی رعایت سے حدیث کا ترجمہ لکھا گیا ہے، ورنہ حدیث الباب میں سترہ کی شکل نہیں بنتی کیونکہ فیتوسط کا ٹھیک ترجمہ تو یہ ہے کہ حضور علیہ السلام تخت پر درمیان میں ہوتے تھے اور حضرت عائشہؓ سامنے لیٹی ہوتی تھیں، البتہ آگے دوسری روایت مسروق عن

عائشہ آ رہی ہے، وہاں یہ ہے کہ آپ کے اور قبلہ کے درمیان تخت یا چار پائی ہوتی تھی اس لئے بہتر یہ ہوتا کہ یہ ترجمہ اس حدیث پر ہوتا یا وہ حدیث یہاں پر ہوتی، علامہ کرمانی نے یہ جواب دیا کہ یہاں ترجمہ میں اے بمعنی علی ہے اور علامہ عینی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، مگر اس طرح حدیث الباب اور ترجمہ کی مطابقت ہو جائے گی تو ابواب سترہ سے تعلق نہ رہے گا، اس لئے حافظ کا جواب کارآمد ہوگا کہ فیتوسط کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نیچے کھڑے ہو کر تخت کو درمیان میں کر لیتے تھے بطور سترہ کے۔

علامہ عینی نے کہا کہ فیتوسط کا اصل معنی یہی ہے کہ خود کو وسط سریر پر کر دیا جائے اور دوسری حدیث مسروق عن عائشہ کی وجہ سے یہاں معنی بدلنا مناسب نہیں، کیونکہ دونوں عبارتوں کے معنی الگ الگ ہیں، ایک کو دوسرے کے معنی میں کرنا درست نہیں، دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ واقعات دو ہوں (عمدہ ص ۴۸۲ ج ۲)

بظاہر تعدد واقعات و حالات کی بات زیادہ دل کو لگتی ہے کیونکہ مسروق والی روایت بالکل صاف ہے کہ آپ نے نیچے فرش پر نماز پڑھی ہے اور تخت آپ کے اور قبلہ کے درمیان تھا، جس پر حضرت عائشہؓ استراحت فرما تھیں، دوسری بعض روایات میں یہ بھی ہے حضرت عائشہؓ ہی فرماتی ہیں کہ میں سامنے لیٹی ہوتی تھی اور حضور نوافل تہجد میں مشغول ہوتے تھے سجدہ کے وقت حضور میرے پاؤں چھوتے تو میں متنبہ ہو کر اپنے پاؤں سکیڑ لیتی تھی تا کہ آپ اطمینان سے سجدہ فرمالیں یہ صورت تخت پر ہی نماز کی ہوسکتی ہے، اس لئے محقق عینی کی رائے اصوب معلوم ہوتی ہے اور حافظ کے مختار پر علامہ عینی کا نقد اصولی طور سے بالکل درست ہے کہ دو مختلف عبارتوں کو ایک معنی پر کیونکر محمول کر سکتے ہیں، دوسرے یہ کہ حافظ کا مختار صحیح مان کر بھی دو حالتیں تو ضرور ہی ماننی پڑیں گی، اس لئے بھی محقق عینی کی رائے زیادہ محققانہ ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(نوٹ) تعدد حالات کی جوبات علامہ عینی نے یہاں لکھی ہے، اس کا اعتراف حافظ کو بھی آگے باب التطوع خلف المرأۃ میں کرنا پڑا ہے (ملاحظہ ہو فتح الباری ص ۳۹۲ ج ۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ نماز کے سامنے سے گذرنے کا مسئلہ تو کتابوں میں ملتا ہے مگر یہ نہیں کہ سامنے بیٹھا ہو اور پیچھے کوئی نماز پڑھنے لگے تو کیا کرے، سامنے سے دائیں بائیں کو کھسک جائے یا نہیں؟ تو سامنے سے کھسک کر ہٹ جانے کا ثبوت حضرت عائشہؓ کے انسلال (کھسک جانے) سے ملتا ہے، صحراء میں نماز پڑھنے والے کے موضع سجود یا موضع نظر کے آگے سے گذرنا درست ہے، مسجد کبیر کا حکم بھی صحرا کا ہے، چھوٹی مسجد میں سامنے کی دیوار یا ستون تک گذرنا ممنوع ہے، مسجد کبیر میرے نزدیک چالیس ذراع یا زیادہ والی ہے، حاشیہ عنایہ میں ہے کہ اگر کوئی چھت میں سے کوئی چیز لٹکا دی تو وہ بھی سترہ بن سکتی ہے، اس لئے میرے نزدیک اگر کسی کو سامنے سے گذرنا ضروری ہی ہو جائے تو اپنا رومال وغیرہ نمازی کے سامنے لٹکا کر نکل جائے امید ہے کہ گذرنے کے گناہ سے بچ جائے گا۔

ضروری فائدہ: یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ امام بخاری حضرت عائشہؓ کی حدیث گیارہ جگہ لائے ہیں، ان میں سے سات حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوسکتی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تخت یا چار پائی پر بستر نبوی پر استراحت فرما ہیں اور نبی اکرم ﷺ تخت کے نیچے فرش پر نوافل ادا فرما رہے ہیں اس طرح حضرت عائشہؓ مع تخت و بستر استراحت کے آپ کے اور قبلہ کے درمیان ہیں، یہ احادیث بخاری ص ۷۲ اسود عن عائشہؓ ص ۷۳ مسروق عن عائشہؓ ص ۷۳ اسود عن عائشہؓ ص ۷۳ عروہ عن عائشہؓ ص ۷۴ قاسم عن عائشہؓ ص ۱۳۶ ابو ہشام عن عائشہؓ اور ص ۴۲۸ پر مسروق عن عائشہؓ والی ہیں اور ان سب میں ایک حالت کا بیان ہے۔

باقی چار احادیث جن میں حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ میں حضور اکرم ﷺ کے بستر پر استراحت کرتی اور حضور شب میں اٹھ کر مشغول نوافل ہوتے تو جس وقت آپ سجدہ میں جاتے تھے تو میرے پیروں کو اشارہ دیتے۔ میں ان کو سکیڑ لیتی کہ آپ سجدہ کرلیں پھر جب اٹھ جاتے تو میں پاؤں پھیلا لیتی تھی، یہ دوسری حالت ہے اور یقیناً ایک ہی جگہ تخت یا فرش پر پیش آئی ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ تخت پر ہوتیں اور

حضور نیچے فرش پر نماز پڑھتے ہوئے آپ کے پاؤں پر اشارہ دیتے نہ اس کی ضرورت تھی۔

یہ احادیث بخاری ص ۵۶ عبدالرحمٰن عن عائشہؓ ص ۷۳ عبدالرحمٰن عن عائشہؓ ص ۷۴ قاسم عن عائشہؓ اور ص ۱۶۱ پر ابوسلمہ عن عائشہؓ والی ہیں یہ صرف بخاری کے ہیں دوسری کتب حدیث کے مرویہ الفاظ بھی قابل ملاحظہ ہیں، واضح ہو کہ حافظ نے مسروق عن عائشہؓ والی حدیث کے لئے جواشارہ تجیء (عن قریب آنے والی) سے کیا ہے وہ غالباً ص ۷۳ والی باب استقلال الرجل الرجل والی ہے اور علامہ عینی نے کتاب الاستیذان والی مسروق عن عائشہؓ والی ۹۲۸ کی حدیث کا جواب دیا ہے۔

محدثانہ شان: ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کیسی ضروری کام کی بات فرمایا کرتے تھے کہ جب تک کسی حدیث کے سارے طرق روایت اور سارے الفاظ وکلمات ماثورہ سامنے نہ ہوں صحیح اور جچا تلا فیصلہ نہیں ہوسکتا مگر یہ دردسری کون کرے اور کیسے کرے کہ اس کے لئے اسباب بھی مہیا نہیں ہیں، یورپ کے مستشرقین نے لاکھوں کروڑوں روپے صرف کر کے ایسی فہرستیں تیار کردیں کہ ایک لفظ حدیث کا یاد ہو تو فوراً معلوم کرسکتے ہیں کہ کس حدیث کی کتاب میں کس جگہ ہے، مگر وہ تیارشدہ مطبوعہ فہرستیں بھی ہمیں میسر نہیں، لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری کام جو محدثین اسلام ہی کرسکتے ہیں باقی ہے کہ ایک ایک حدیث کے سارے طرق ومتون یکجا کردیئے جائیں، یہ کام آسان نہیں تو بہت زیادہ دشوار بھی نہیں کیونکہ عرب واسلامی حکومتوں کے لئے حق تعالیٰ نے زروجواہر کی نہریں بہادی ہیں اگر اس دولت کو یورپ وامریکہ کی سیر وتفریح اور ذاتی غیر معمولی تعیشات پر صرف کرنے کی جگہ علوم حدیث وفقہ وکلام کی خدمت پر صرف کیا جائے تو وہ کام جو چودہ سو سال میں نہ ہوسکا، چودہ ماہ میں انجام پاسکتا ہے۔وما ذٰلک علی اللہ بعزیز، وھو الموفق.

باب = لیرد المصلی من مر بین یدیه ورد ابن عمر فی التشهد وفی الکعبة وقال ان ابیٰ الا ان یقاتله قاتله

(نماز پڑھنے والا اپنے سامنے سے گذرنے والے کوروک دے حضرت ابن عمرؓ نے کعبہ میں جبکہ آپ تشہد کے لئے بیٹھے ہوئے تھے روک دیا تھا اور کہا کہ اگر لڑائی پر اتر آئے تو اس سے لڑنا بھی چاہئے)

۴۸۲. حدثنا ابو معمر قال انا عبدالوارث قال نا یونس عن حمید بن هلال عن ابی صالح ان ابا سعید قال قال النبی ﷺ وحدثنا آدم بن ابی ایاس ناسلیمان بن المغیرة قال نا حمید بن هلال ن العدوی قال نا ابو صالح السمان قال رأیت ابا سعید الخدری فی یوم جمعة یصلی الی شیء یستره من الناس فاراد شاب من ابی معیط ان یجتاز بین یدیه فدفع ابو سعید فی صدره فنظر الشاب فلم یجد مساغا الا بین یدیه فعاد لیجتاز فدفعه ابو سعید اشد من الولی فنال من ابی سعید ثم دخل علی مروان فشکا الیه ما لقی من ابی سعید و دخل ابو سعید خلفه علی مروان فقال مالک ولابن اخیک یا ابا سعید قال سمعت النبی ﷺ یقول اذا صلی احدکم الی شیء یستره من الناس فاراد احد ان یجتاز بین یدیه فلیدفعه فان ابیٰ فلیقاتله فانما هو شیطان.

ترجمہ: حضرت ابوصالح سمان نے بیان کیا کہ میں نے حضرت ابوسعید خدریؓ کو جمعہ کے دن نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، آپ کسی چیز کی طرف رخ کئے ہوئے لوگوں کے لئے اسے سترہ بنائے ہوئے تھے، ابومعیط کے خاندان کے ایک جوان نے چاہا کہ آپ کے سامنے سے ہوکر گذر جائے، ابوسعیدؓ نے اس کے سینہ پر دھکا دے کر باز رکھنا چاہا جوان نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن کوئی راستہ سوائے سامنے سے

گذرنے کے نہ ملا اس لئے وہ پھر اسی طرف سے نکلنے کے لئے لوٹا، اب ابوسعیدؓ نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے دھکا دیا، اسے ابوسعیدؓ سے شکایت ہوئی اور وہ اپنی یہ شکایت مروان کے پاس لے گیا، اس کے بعد ابوسعیدؓ بھی تشریف لے گئے، مروان نے کہا، اے ابوسعیدؓ! آپ میں اور آپ کے بھائی کے بچے میں کیا معاملہ پیش آیا، آپ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے، آپ نے فرمایا تھا کہ جب کوئی شخص نماز کسی چیز کی طرف رخ کر کے پڑھے اور اس چیز کو سترہ بنا رہا ہو پھر بھی اگر کوئی سامنے سے (سترہ کے اندر سے گذرنا چاہے تو اسے دھکا دے دینا چاہئے، اگر پھر بھی اصرار ہو تو اس سے لڑنا چاہئے کیونکہ وہ شیطان ہے۔

تشریح: حنفیہ کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر جہری نماز پڑھ رہا ہو تو ذرا اور اونچی آواز کر کے گذرنے والے کو روکنے کی کوشش کرے اور اگر سری نماز ہے تو اس میں مشائخ کے مختلف اقوال ہیں، بہتر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک آیت کو زور سے پڑھ دے تا کہ گذرنے والا متنبہ ہو جائے، حضرت ابن عمرؓ نے گذرنے والے سے لڑائی (قتال) کے متعلق جو فرمایا ہے اسے حنفیہ مبالغہ پر محمول کرتے ہیں یعنی نماز کی حالت میں گذرنے والے سے مزاحمت کی اجازت نہیں دیتے، لیکن شوافع اس کی بھی اجازت دیتے ہیں۔

آنحضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ اگر پھر بھی نہ مانے تو لڑنا چاہئے اس سے مقصد دل میں اس فعل کی قباحت اور ناگواری کو راسخ کرنا ہے، نماز کی حالت میں لڑنے کا حکم نہیں ہے، گذرنے والے کو شیطان اس لئے کہا کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کر رہا ہے، تا کہ وصلۂ خداوندی کو قطع کرے جو شیطان کا کام ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ محدثین نے یہ بھی مراد لی ہے کہ اس گذرنے والے انسان پر شیطان سوار ہے کیونکہ شیطان عالم ارواح سے ہے، یعنی اس کے لئے بدن مثالی ہے جو اجسام میں تصرف کرتا ہے، جیسے جن مسخر کر کے انسانوں کی زبان میں بولتے ہیں اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ شیطان لوگوں کو نمازی کے سامنے سے گذرنے کے لئے دل میں وساوس و ضرورتیں ڈال کر آمادہ کرتا ہے تا کہ گنہگار ہو، مزید وضاحت و تفصیل فیض الباری ص ۸۴ ج ۲ میں ہے۔

باب اثم المآر بین یدی المصلے

(نمازی کے سامنے سے گذرنے پر گناہ)

۴۸۳. حدثنا عبدالله بن یوسف قال انا مالک عن ابی النضر مولیٰ عمر بن عبیدالله عن یسر بن سعید ان زید بن خالد ارسله الی ابی جهیم یسأله ماذاسمع من رسول الله ﷺ فی المآر بین یدی المصلے فقال ابو جهیم قال رسول الله ﷺ لو یعلم المآر بین یدی المصلی ماذا علیه لکان ان یقف اربعین خیرا له من ان یمر بین یدیه قال ابوالنضر لآ ادری قال اربعین یوما او شهر او سنة.

ترجمہ: حضرت بسر ابن سعید نے کہا کہ زید بن خالد نے انہیں ابوجہیم کی خدمت میں پوچھنے کے لئے بھیجا کہ انہوں نے نماز پڑھنے والے کے سامنے سے گذرنے والے کے متعلق نبی کریم ﷺ سے کیا سنا ہے، یہ ابوجہیمؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا! اگر نمازی کے سامنے سے گذرنے والا جانتا کہ اس کا گناہ کتنا بڑا ہے تو اس کے سامنے سے گذرنے پر چالیس تک وہیں کھڑے رہنے کو ترجیح دیتا، ابو النضر نے کہا مجھے یاد نہیں کہ راوی نے چالیس دن کہا یا مہینہ یا سال۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مسند بزار میں چالیس سال کی روایت یقین کے ساتھ ہے اور ایک دوسری حدیث میں ایک سو سال بھی آیا ہے، زیادہ تفصیل روایات فتح الباری اور عمدۃ القاری میں ہے۔

باب استقبال الرجل الرجل وهو يصلى وكره عثمان ان يستقبل الرجل وهو يصلى وهذا اذا شتغل به فاما اذا لم يشتغل به فقد قال زيد ابن ثابت ما باليت ان الرجل لا يقطع صلٰوة الرجل

(نماز پڑھتے میں ایک مصلی کا دوسرے شخص کی طرف رخ کرنا، حضرت عثمانؓ نے نماز پڑھنے والے کی طرف رخ کرنے کو ناپسند فرمایا اور یہ جب ہے کہ نمازی کی توجہ سامنے والے کی طرف ہو جائے لیکن اگر اس کی طرف کوئی توجہ نہ ہو تو زید بن ثابت نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں، ایک شخص دوسرے کی نماز کو نہیں توڑ سکتا)

۴۸۴. حدثنا اسمٰعيل بن خليل قال انا على بن مسهر عن الاعمش عن مسلم عن مسروق عن عائشة ان ذكر عندها ما يقطع الصلٰوة فقالو يقطعها الكلب والحمار والمرأة فقالت لقد جعلتمونا كلا بالقد رايت النبى ﷺ يصلى و انى لبينه و بين القبلة وانا مضطجعة على السرير فتكون لى الحاجة واكره ان استقبله فانسل انسک لا و عن الاعمش عن ابراهيم عن الاسود عن عآئشة نحوه.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کے سامنے تذکرہ چلا کہ نماز کو کیا چیزیں توڑ دیتی ہیں، لوگوں نے کہا کتا، گدھا اور عورت نماز کو توڑ دیتی ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ تم نے ہمیں کتوں کے برابر بنا دیا، حالانکہ میں جانتی ہوں نبی کریم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے میں آپ کے اور آپ کے قبلہ کے درمیان (سامنے چارپائی پر لیٹی ہوتی تھی مجھے ضرورت پیش آتی تھی اور یہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ خود کو آپ کے سامنے پیش کر دوں اس لئے میں آہستہ سے نکل آتی تھی، اعمش نے ابراہیم سے بھی انہوں نے اسود سے انہوں نے حضرت عائشہؓ سے اسی طرح حدیث بیان کی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ کی رائے چونکہ یہ ہے کہ نماز کو کوئی چیز قطع نہیں کر سکتی، اس لئے یہاں اشتغال کی قید ذکر کی، مگر حنفیہ کے نزدیک قید نہیں ہے، یعنی نمازی کے سامنے اگر کوئی شخص اس کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے یا کھڑا ہو تو نماز مکروہ ہوتی ہے اور یہاں حضرت عائشہؓ بھی صراحت کے ساتھ فرماتی ہیں کہ مجھے استقبال ناپسند ہوا (حالانکہ حضور علیہ السلام کے لئے اشتغال کا احتمال بہ نسبت دوسروں کے تقریباً معدوم تھا اور فتح الباری ص۳۹۲ ج۱ میں غمز نبوی فی الصلوٰۃ پر لکھا کہ حضور علیہ السلام کا اشتغال بہا آپ کے حق میں مامون تھا، معلوم ہوا کہ اشتغال کی قید ضروری نہیں ہے) امام بخاریؒ اپنے مذکورہ خیال کو اور زیادہ مضبوطی سے مستقل باب قائم کر کے بھی پیش کریں گے اور کہیں بھی وہ احادیث ذکر نہیں کریں گے جو قطع صلوٰۃ سے متعلق وارد ہیں، ان کے بارے میں تفصیلی بحث اسی باب میں ذکر ہوگی، ان شاء اللہ

محقق عینی نے لکھا:- صاحب توضیح نے فرمایا کہ انما هذا الخ امام بخاری کا کلام ہے، جس سے انہوں نے اپنا مذہب ظاہر کیا ہے (یعنی حضرت عثمانؓ سے یہ تفصیل وارد نہیں ہے جو امام بخاریؒ نے خود کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ اس صورت کو مطلقاً ناپسند کرتے تھے، امام بخاری کی طرح ان کے نزدیک قید و تفصیل نہ تھی) پھر علامہ عینی نے حضرت عمرؓ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت ابن مسعود و امام مالک سے بھی مطلقاً کراہت کو ذکر کیا اور لکھا کہ اکثر علماء کراہت استقبال کے ہی قائل ہیں (عمدہ ص۴۹۱ ج۲)

حافظ نے لکھا:- میں نے مصنف عبدالرزاق و مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں حضرت عمرؓ کا اثر تو دیکھا کہ وہ اس صورت استقبال پر زجر و تنبیہ فرمایا کرتے تھے، لیکن حضرت عثمانؓ کا اثر مجھے نہیں ملا، بلکہ حضرت عثمانؓ سے ایک قول عدم کراہت کا ملا ہے، اس لئے ممکن ہے کہ اصل میں حضرت عمرؓ کی جگہ (غلطی سے) حضرت عثمان ہو گیا ہو۔ (فتح الباری ص۳۹۱ ج۱)

باب الصلوٰۃ خلف النائم

(سوئے ہوئے شخص کے سامنے ہوتے ہوئے نماز پڑھنا)

۴۸۵. حدثنا مسدد قال نا یحیٰ قال نا ھشام قال حدثنی ابی عن عآئشة قالت کان النبی ﷺ یصلی و انارا قدة معترضة علی فراشه فاذا اراد ان یوترا یقظنی فاوترت.

ترجمہ ۴۸۵: حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ نبی کریم ﷺ نماز پڑھتے رہتے تھے اور میں سامنے اپنے بستر پر سوئی رہتی، جب وتر پڑھنا چاہتے تو مجھے جگا دیتے اور میں بھی وتر پڑھ لیتی تھی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ سونے والے کے سامنے نماز بھی عند نا مکروہ ہے، ممکن ہے وہ کچھ حرکتیں سوتے میں یا اٹھ کر کرنے لگے جس سے نمازی کا خشوع وخضوع خراب ہو، البتہ اس سے امن ہو تو حرج نہیں اور غالباً یہاں بھی امن ہی ہوگا، لہٰذا کراہت نہ ہوئی۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ صلوۃ اللیل اور نماز وتر میں فرق کرتی تھیں، بخلاف حضرت ابن عمرؓ کے کہ وہ سب کو صلوٰۃ اللیل کہتے ہیں اور حدیث سے وتروں کا تاکد بھی صلوٰۃ اللیل سے زیادہ ثابت ہوا، کیونکہ آپ نے حضرت عائشہؓ کو وتر کے لئے اٹھایا، تہجد کیلئے نہیں، لہٰذا حنفیہ کا وتر کے لئے قائل وجوب وتاکد ہونا درست ہے۔

باب التطوع خلف المرأة

(نفل نماز عورت کے سامنے ہوتے ہوئے پڑھنا)

۴۸۶. حدثنا عبدالله بن یوسف قال انا مالک عن ابی النضر مولی عمر بن عبیدالله عن ابی سلمة بن عبدالرحمن عن عآئشة زوج النبی ﷺ انها قالت کنت انام بین یدی رسول الله ﷺ و رجلای فی قبلته فاذا سجده غمزنی فقبضت رجلی فاذا قام بسطتهما قالت والبیوت یومئذ لیس فیها مصابیح.

ترجمہ ۴۸۶: حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے سوئی ہوئی تھی، میرے پاؤں آپ کے سامنے (پھیلے ہوئے) ہوتے تھے پس جب آپ سجدہ کرتے تو پاؤں کو ہلکے سے دبا دیتے اور میں انہیں سکیڑ لیتی پھر جب قیام فرماتے تو میں انہیں پھیلا لیتی تھی اس زمانہ میں گھروں کے اندر چراغ نہیں تھے۔

تشریح: حافظ نے لکھا: - علامہ کرمانیؒ نے اعتراض نقل کیا کہ لفظ ترجمۃ الباب تو چاہتا ہے کہ عورت کی پیٹھ نمازی کی طرف ہو، مگر لفظ حدیث عام ہے پھر جواب دیا کہ سنت سونے کے لئے قبلہ کا رخ ہے اور حضرت عائشہؓ بھی غالباً اسی پر عمل فرماتی ہوں گی، لہٰذا ترجمہ ثابت ہوا اس پر حافظ نے لکھا کہ اس جواب میں تکلف ہے کیونکہ سنت تو ابتداء نوم کی ہے، دوام کی نہیں اور سونے میں آدمی بلاشعور واحساس کے کروٹ بدل لیتا ہے اس لئے میرے نزدیک جواب یہ ہے کہ ترجمہ میں خلف المرأۃ ہے، خلف ظہر المرأۃ نہیں ہے، لہٰذا عورت کا سامنے ہونا کافی ہے خواہ وہ کسی حالت سے بھی لیٹی یا سوئی ہوئی ہو۔ (فتح ص ۳۹۲ ج ۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فاذا سجد غمزنی کی تاویل شافعیہ یہ کرتے ہیں کہ وہ غمز کپڑے کے اوپر تھا، بلا حائل کے نہ تھا، اس لئے ناقض وضو ومبطل صلوۃ نہ ہوا، حنفیہ جو کہتے ہیں کہ عورت کا بدن چھونے سے وضو ختم نہیں ہوتا (اگر بلاشہوت ہو) وہ اسی حدیث الباب کو پیش کرتے ہیں، کیونکہ حائل کی قید موجود نہیں ہے اور روایت نسائی کے الفاظ سے صراحت بھی مل جاتی ہے کہ وہاں حائل نہیں تھا، (مؤلف عرض کرتا ہے کہ اسی لئے امام نسائی نے باب "ترک الوضوء من مس الرجل امرأة من غیر شهوة" قائم کیا ہے اور حضرت عائشہؓ سے

متعدد روایات درج کی ہیں، ملاحظہ ہو نسائی ص ۳۸ ج ۱)

باب من قال لا یقطع الصلوٰۃ شیء

(جس نے یہ کہا کہ نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی)

۴۸۷. حدثنا عمر بن حفظ بن غیاث ثنا ابی قال نا الاعمش قال نا ابراھیم عن الاسود عن عآئشۃ ح قال الاعمش وحدثنی مسلم عن مسروق عن عائشۃ ذکر عندھا ما یقطع الصلوٰۃ الکلب والحمار و المرأۃ فقالت شبھتمونا بالحمر و الکلاب واللہ لقد رأیت النبی ﷺ یصلی و انی علی السریر بینہ و بین القبلۃ مضطجعۃ فتبدولی الحاجۃ فاکرہ ان اجلس واوذی النبی ﷺ فانسل عن عند رجلیہ.

۴۸۸. حدثنا اسحٰق بن ابراھیم قال انا یعقوب بن ابراھیم قال نا ابن اخی ابن شھاب انہ سأل عمہ عن الصلوٰۃ یقطعھا شیء قال لا یقطعھا شیء اخبرنی عروۃ بن الزبیر ان عآئشۃ زوج النبی ﷺ قالت لقد کان رسول اللہ ﷺ یقوم فیصلی من اللیل وانی لمعترضۃ بینہ و بین القبلۃ علیٰ فراش اھلہ.

ترجمہ ۴۸۷: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ان کے سامنے ان چیزوں کا ذکر چلا جو نماز کو توڑ دیتی ہیں یعنی کتا، گدھا اور عورت اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے ہمیں گدھوں اور کتوں کی طرح بنا دیا حالانکہ خود نبی کریم ﷺ اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ میں چارپائی پر آپ کے اور قبلہ کے درمیان (سامنے) لیٹی رہتی تھی مجھے کوئی ضرورت پیش آتی اور چونکہ یہ بات پسند نہ تھی کہ آپ کے سامنے (جب کہ آپ نماز پڑھ رہے ہوں) بیٹھوں اس طرح آپ کو تکلیف ہو، اس لئے میں پاؤں کی طرف سے خاموشی کے ساتھ نکل جاتی تھی۔

ترجمہ ۴۸۸: ابن شہاب نے بیان کیا کہ انہوں نے اپنے چچا سے پوچھا کیا نماز کو کوئی چیز توڑتی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں اسے کوئی چیز نہیں توڑتی، مجھے عروہ بن زبیر نے خبر دی کہ نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے اور میں آپ کے سامنے گھر کے بستر پر لیٹی رہتی تھی۔

تشریح: امام بخاریؒ اس حدیث کا جواب دینا چاہتے ہیں جس میں ہے کہ کتے، گدھے اور عورت نماز کو توڑ دیتی ہیں، یہ بھی صحیح حدیث ہے لیکن اس سے مقصد یہ بتانا تھا کہ ان کے سامنے سے گذرنے سے نماز کے خشوع وخضوع میں فرق پڑتا ہے، یہ مقصد نہیں تھا کہ واقعی ان کا سامنے سے گذرنا نماز کو توڑ دیتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- امام بخاری کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ دوسرے کے کسی عمل سے نماز نہیں ٹوٹتی، مثلاً کوئی سامنے سے گذر جائے یا کوئی حرکت منافی صلوٰۃ کرے تو اس نمازی کا کوئی نقصان نہیں، یہ مقصد نہیں کہ خود نمازی بھی کوئی حرکت منافی صلوٰۃ کرے تو اس سے بھی نماز قطع نہ ہوگی حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کے ارشاد "**وانی علی السریر**" کو امام بخاری نے مرور کی جنس سے قرار دیا اور جب اس نوع مرور سے بھی نماز قطع نہ ہوئی تو فیصلہ کر دیا کہ نماز کو کوئی چیز قطع نہیں کر سکتی اور یہ امام بخاریؒ کی خاص عادت ہے کہ جب کسی ایک جانب رائے قائم کر لیتے ہیں تو دوسری جانب کو بالکل گرا دیتے ہیں اور اسی لئے انہوں نے قطع نہ کرنے والی احادیث تو بہت جمع کر دی ہیں اور جگہ جگہ لائے ہیں، مگر قطع کرنے والی ایک حدیث بھی روایت نہیں کی، سب کو اڑا دیا ہے حالانکہ اصحاب صحاح ستہ میں سے (۱) امام مسلم نے حضرت ابوذرؓ سے مرفوع حدیث نقل کی نماز کو عورت، گدھا اور کالا کتا قطع کر دیتے ہیں، (۲) نسائی میں بھی حضرت ابوذرؓ کی یہ حدیث مروی ہے (نسائی ص ۱۲۲ ج ۱ باب **ذکر ما یقطع الصلوٰۃ و ما لایقطع**) (۳) ابوداؤد میں بھی ہے کہ حمار، عورت اور کلب نماز قطع کر دیتے ہیں،

(۴) ترمذی میں بھی باب ماجائز انه لا یقطع الصلوة الا الکلب و الحمار و المرأة ہے،(۵) ابن ماجہ میں حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ نماز کو کلب اسود اور حائض عورت قطع کر دیتی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی یقطع الصلوة المرأة والکلب و الحمار مرفوعاً مروی ہے اور عبداللہ بن مغفلؓ سے بھی ایسی ہی روایت مرفوعاً ہے، اوران صحاح کے علاوہ بھی سارے محدثین کبار روایت کرتے ہیں، پھر کوئی ایک روایت بھی اس کے برخلاف ایسی کہیں نہیں کہ یہ تینوں نماز نہیں قطع کرتے، ایسی صورت میں اپنے خیال کے خلاف ساری حدیثوں کا ذکر بھی حذف کر دینا یہ امام بخاری ہی ایسے بڑے کر سکتے ہیں، چھوٹوں کی کیا مجال ہے؟! حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ ایسے ہی مواقع پر میں کہا کرتا ہوں کہ امام بخاری ''فاعل مختار'' ہیں اور جس فاعل مختار کے متعلق معقولی مختلف ہیں وہ یہاں موجود ہے کہ بخاری جس حدیث کو چاہیں چھوڑ دیتے ہیں، ہم سے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ حدیث کو بالکل ہی چھوڑ دیں سچ یہ ہے کہ خدا کسی کو چھوٹا نہ کرے، ہم چھوٹے ہیں اس لئے مجبور ہیں، اور امام بخاری جیسے جو چاہیں کریں۔

حضرت شاہ صاحبؒ ایسے مواقع میں مختلف طریقوں پر کچھ جملے فرما دیا کرتے تھے، کبھی مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاری بہت بڑے اور جلیل القدر محدث ہیں اور بڑے کی ایک شان یہ بھی ہے کہ وہ مارے اور رونے نہ دے۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ فقہی نظر سے تو قطع ہم بھی نہیں مانتے، مگر یہ کہ کسی قسم کا نقصان نہیں آتا، اس کے ہم قائل نہیں اور قطع وصلہ کی بات پہلے گذر چکی ہے، علامہ عینی نے لکھا کہ ابونعیم نے کتاب الصلوٰۃ میں حضرت عمرؓ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ اگر نمازی کو معلوم ہو کہ اس کی نماز میں کتنا نقصان آجاتا ہے تو وہ کبھی بلاسترہ کے نماز نہ پڑھے اور محدث ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن مسعود سے نقل کیا کہ نمازی کے سامنے سے گذرنا نمازی کی آدھی نماز کو قطع کر دیتا ہے (عمدہ ۴۸۶ ج ۲) یہ دونوں اثر موقوف ہیں مگر بحکم مرفوع، کیونکہ ایسی بات کوئی صحابی اپنی رائے سے نہیں کہہ سکتا، واللہ تعالیٰ اعلم)

گذرنے کا گناہ کس پر ہے؟

علامہ ابن رشد نے لکھا:- اس امر پر جمہور کا اتفاق ہے کہ نمازی کے سامنے سے گذرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ اس پر وعید ہے اور تمام کتب شافعیہ میں مرور کی حرمت مصرح ہے اور کتب حنفیہ و مالکیہ میں بھی گذرنے والے کے گنہگار ہونے کی تصریح ہے، لیکن اس کی چار صورتیں ہیں (۱) نمازی سترہ کی طرف نماز پڑھے اور گذرنے والا سترہ کے اندر سے گذرنے پر مجبور نہ ہو، پھر بھی گذرے تو صرف وہ گناہ گار ہوگا (۲) کسی گذرگاہ پر بلا سترہ کے نماز پڑھے اور گذرنے والا سامنے سے جانے پر مجبور ہو تو صرف نمازی گنہگار ہوگا (۳) کسی گذرگاہ کے سامنے بلاسترہ کے نماز پڑھے لیکن گذرنے والا سامنے سے گذرنے پر مجبور نہ ہو، پھر بھی گذرے تو دونوں گنہگار ہوں گے (۴) سترہ کے سامنے نماز پڑھے، لیکن گذرنے والا سترہ کے اندر سے گذرنے پر مجبور ہو تو دونوں گنہگار نہ ہوں گے، حاشیہ زیلعی علی الکنز میں اسی طرح ہے، شامی میں کچھ فرق ہے۔ (اوجز ص ۹۹ ج ۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث الباب میں حفص بن غیاث بھی ہیں جو امام اعظمؒ کے اصحاب کبار اور مستفیدین امام ابو یوسفؒ میں سے ہیں، امام طحاوی ناقل ہیں کہ امام صاحب نے بارہ آدمیوں کے لئے کہا تھا کہ یہ قاضی بننے کے لائق ہیں، چنانچہ سب قاضی ہوئے اور یہ بھی ان میں سے ہیں، بہت بڑے عالم اور قاضی ہوئے ہیں (ان کا شمار شرکاء تدوین فقہ میں بھی ہے اور مقدمہ انوارالباری ص ۲۰۵ ج ا میں بھی ان کا ذکر ہے، ان کے صاحبزادے عمر بن حفص بھی بڑے محدث تھے، جن سے امام بخاری نے یہاں روایت لی ہے، اپنے والد ماجد سے حدیث پڑھی تھی۔

قولہ من عند رجلیہ: حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد کہ ''میں آپ کے پاؤں کی طرف سے خاموشی سے نکل جاتی تھی'' اس سے بظاہر مراد متعین ہے کہ وہ تخت یا چارپائی کی پائنتی کی جانب سے اتر کر چلی جاتی تھیں، لہٰذا یہاں من کو ابتدائیہ قرار دے کر سر پر کے سرہانے کی جانب سے نکل جانے کی بات ہماری ناقص رائے میں نہ آسکی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب اذا حمل جارية صغيرة على عنقه فی الصلوٰة

(نماز میں اگر کوئی اپنی گردن پر کسی چھوٹی بچی کو اٹھا لے)

۴۸۹. حدثنا عبدالله بن یوسف قال انا مالک عن عامر بن عبدالله بن الزبير عن عمر بن سليم الزرقی عن ابی قتادة الانصاری ان رسول الله ﷺ كان يصلی وهو حامل امامة بنت زينب بنت رسول الله ﷺ ولابی العاص بن ربيعة بن عبد شمس فاذا سجد وضعها واذا قام حملها.

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ امامہ بنت زینب بنت رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے وقت اٹھائے رہتے تھے، ابوالعاص بن ربیعہ بن عبد شمس کی حدیث میں ہے کہ جب وہ سجدہ میں جاتے تو اتار دیتے اور جب قیام فرماتے تو اٹھا لیتے۔

تشریح: امامہ بنت زینب خود آنحضور ﷺ کے اوپر چڑھ جاتی تھیں اور جب آنحضور ﷺ سجدہ میں جاتے تو صرف اشارہ کر دیتے اور آپ چونکہ باشعور تھیں اس لئے اشارہ پاتے ہی اتر جاتی تھیں، راوی نے اسی کو "صلی وهو حامل لها" سے تعبیر کیا ہے اور یہ عمل قلیل ہے۔ جس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، آنحضور ﷺ نے یہ عمل بھی صرف امت کی تعلیم کے لئے کیا تھا، عمل کے ذریعہ کسی بات کی تعلیم فطرت کو اپیل کرتی ہے اور جس طرح بچے زندگی کے طور وطریقے ماں باپ کے عمل سے سیکھتے ہیں، امت بھی اپنے نبی کے عمل سے دین کے طور وطریق سیکھتی ہے۔

علامہ ابن بطالؒ نے کہا کہ امام بخاریؒ نے یہ ثابت کیا کہ جب ایک بچی کے نماز کی حالت میں اترنے چڑھنے سے نماز میں کوئی خلل نہ آیا تو عورت کے سامنے سے گذرنے کا بھی کوئی حرج نہیں کہ وہ تو اس سے کم درجہ کی چیز ہے (فتح ۳۹۳ ج۱) لیکن اس میں بچی کا ذکر ہے، بڑی کے لئے قیاس کیونکر درست ہوگا؟

باب اذا صلی الی فراش فيه حائض

(ایسے بستر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا جس پر حائضہ عورت ہو)

۴۹۰. حدثنا عمرو بن زرارة قال نا هشيم عن الشيبانی عن عبدالله بن شداد بن الهاد قال اخبرتنی ميمونة بنت الحارث قالت كان فراشی حيال مصلی النبی ﷺ فربما وقع ثوبه علی وانا علی فراشی.

۴۹۱. حدثنا ابو النعمان قال نا عبدالواحد بن زياد قال نا الشيبانی سليمان قال نا عبدالله بن شداد بن الهاد قال سمعت ميمونة تقول كان النبی ﷺ يصلی و انا الی جنبه نآئمة فاذا سجد اصابنی ثوبه وانا حائض.

ترجمہ ۴۹۰: حضرت عبداللہ بن شداد بن ہاد نے کہا کہ مجھے میری خالہ میمونہ بنت الحارث نے خبر دی کہ میرا بستر نبی کریم ﷺ کے برابر میں ہوتا تھا اور اکثر آپ کا کپڑا (نماز پڑھتے میں) میرے اوپر آجاتا تھا، میں اپنے بستر پر ہی ہوتی تھی۔

ترجمہ ۴۹۱: حضرت میمونہؓ فرماتی تھی کہ نبی کریم ﷺ نماز پڑھتے ہوتے اور میں آپ کے برابر میں سوتی رہتی، جب آپ سجدہ میں جاتے تو آپ کا کپڑا مجھے چھو جاتا، حالانکہ میں حائضہ ہوتی تھی۔

تشریح: علامہ ابن بطالؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث اور سابقہ احادیث سے بھی صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ عورت سامنے ہو یا برابر وغیرہ تو قاطع نہیں، مگر اس کا سامنے سے گذرنا تو کسی سے بھی ثابت نہیں ہوتا حالانکہ امام بخاری کا مقصد مرور کا غیر قاطع صلوٰۃ ہونا ہے، حافظ نے لکھا کہ سامنے ہونے کی احادیث تو پہلے گذر چکیں، یہاں تو امام بخاری عورت کے برابر میں ہونے کی صورت میں نماز کی صحت کا مسئلہ بتلانا چاہتے ہیں (فتح ص ۳۹۵ ج۱)

اس سے معلوم ہوا کہ محاذاۃ کا مشہور اختلافی مسئلہ سامنے لانا ہے، جس سے حافظ نے بھی دلچسپی لی ہے اور وہ حنفیہ کے اس مسئلہ پر بہت معترض بھی ہیں، اس کی پوری بحث تو اپنے موقع پر آئے گی، ان شاء اللہ، یہاں اتنا عرض کرنا ہے کہ ان دونوں حدیث سے یہ ثابت نہیں

ہوتا کہ حضرت میمونہ نماز پڑھ رہی تھیں یا آپ کے ساتھ شریک نماز تھیں اور حنفیہ صرف اس صورت میں فساد صلوٰۃ کا حکم بتلاتے ہیں کہ عورت و مرد دونوں کسی ایک نماز میں کسی امام کے مقتدی ہوں اور دونوں مل کر کھڑے ہوں تو اگر امام نے عورت کی بھی نیت امامت کی ہے تو مرد کی نماز فاسد ہوگی کہ وہ خلاف حکم شرع اس کے ساتھ غلط جگہ کھڑا ہو گیا کیونکہ نماز جماعت میں اس کا مقام آگے اور عورت کا پیچھے ہے اور نیت نہیں کی تو عورت کی فاسد ہوگی کہ وہ شریک جماعت ہی نہیں بنی اور مرد کی نماز جماعت والی ہے، دونوں کی نمازیں الگ ہوگئیں اس لئے مرد کی درست ہو جائے گی، بقول علامہ عینی چونکہ دوسرے ائمہ حنفیہ کی اس دقت نظر کو نہ پا سکے، اس لئے مخالفت کی ہے، واللہ الموفق

حنفیہ کے نزدیک عورتوں کے لئے نیت امامت بھی اسی لئے ضروری ہے کہ جہاں امام کو اطمینان ہوگا کہ عورتوں کے لئے پیچھے الگ کھڑے ہونے کا انتظام ہے وہاں وہ نیت کرے گا اور جہاں ایسا نہ ہو سکے وہ نہیں کرے گا تا کہ عورتیں مردوں میں مل کر جماعت میں شریک ہوں تو مردوں کی نماز فاسد نہ کریں یہ تو اختلاف فساد صلوٰۃ کا ہے، باقی عورتوں کے مردوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا موجب کراہت سب کے نزدیک ہے کہ یہ خشوع و خضوع صلوٰۃ میں مخل تو یقیناً ہی ہے۔ واللہ تعالےٰ اعلم

آج کل حرمین شریفین میں بہتر انتظام عورتوں کے لئے الگ نماز پڑھنے کا مسجد نبوی میں ہے، اگرچہ وہاں بھی سب مردوں کی صفوف سے پیچھے نہیں ہے تاہم اختلاط کی نوبت نہیں آتی، مسجد حرام مکہ معظمہ میں انتظام بہتر نہیں ہے، خصوصاً حج کے ایام میں بوجہ اجتماع کثیر و عظیم عورتوں کی صفیں آگے اور مردوں کی پیچھے بھی ہو جاتی ہیں اور اوپر کے درجوں میں بھی دیکھا کہ مصری عورتیں مردوں کے آگے یا برابر کھڑی ہو جاتی ہیں اور ان کو روکا جاتا ہے تو ناراض ہو جاتی ہیں، شاید اس لئے کہ مذہب شافعی وغیرہ میں عورت و مرد برابر کھڑے ہو کر نماز جماعت پڑھیں تو کوئی حرج نہیں ہے اس بارے میں حنفیہ کا مسلک نماز جیسی اہم عبادت کے لئے سب سے بہتر و احوط ہے ورنہ ظاہر کہ نماز کا سکون، خشوع و خضوع اور دل جمعی وغیرہ جو نماز کے لئے نہایت ضروری ہیں صنف نازک کے پہلو میں کہاں میسر ہو سکتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث الباب میں ایک راوی عبدالواحد بن زیاد ہیں یہ بھی امام اعظمؒ سے تلمذ و استفادہ کا علاقہ رکھتے تھے، دارقطنی میں ہے کہ انہوں نے امام صاحب سے تصدق مال خبیث کے بارے میں سوال کیا اور یہ کہ اس کا جواز انہوں نے کہاں سے اخذ کیا تو فرمایا کہ حدیث عاصم بن کلیب سے، جس میں ہے کہ حضور علیہ السلام کو ایک جگہ کھانے کی دعوت دی گئی اور کھانے میں بکری کا گوشت تھا جو بغیر اجازت مالک کے ذبح کی گئی تھی تو آپ نے حکم دیا کہ یہ گوشت قیدیوں کو کھلا دیا جائے (اس بارے میں متعدد احادیث اور سوال مذکور دارقطنی ص ۲۸۶ ج ۴ طبع قاہرہ ۱۹۶۶ء میں ہے)

باب هل يغمز الرجل امرأته عند السجود لكي يسجد

(کیا سجدہ کے لئے جگہ کرنے کو مرد اپنی بیوی کو چھو سکتا ہے)

۴۹۲. حدثنا عمرو بن علی قال نا يحيىٰ قال نا عبيد الله قال نا القاسم عن عآئشة قالت بئسما عدلتمونا بالكلب والحمار لقد رايتني ورسول الله ﷺ يصلي وانا مضطجعة بينه و بين القبلة فاذا اراد ان يسجد غمز رجلي فقبضتهما.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہمیں کتوں اور گدھوں کے برابر بنا کر تم نے برا کیا، خود نبی کریم ﷺ نماز پڑھتے تھے میں آپ کے سامنے لیٹی ہوئی تھی جب سجدہ کرنا چاہتے تو میرے پاؤں کو چھو دیتے تھے اور میں انہیں سکیڑ لیتی تھی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا، ممکن ہے امام بخاری نے اس سے مس مرأۃ کے غیر ناقض وضو ہونے کا اشارہ کیا ہو جو حنفیہ کی تائید ہے، مقصد یہاں بھی عورت کے غیر قاطع صلوٰۃ ہونے کا اثبات ہے۔

باب المرأة تطرح عن المصلى شيئاً من الاذىٰ

(عورت جونماز پڑھنے والے سے گندگی کو ہٹادے)

۴۹۳. حدثنا احمد بن اسحاق اسورماری قال نا عبيد الله بن موسىٰ قال نا اسرآئيل عن ابی اسحاق عن عمرو بن ميمون عن عبدالله قال بينما رسول الله ﷺ قائم يصلی عند الكعبة وجمع قريش فی مجالسهم اذ قال قائل منهم الا تنظرون الی هذا المرء الیٰ ايكم يقوم الی جزور آل فلان فيعمد الی فرثها ودمها وسلاها فلجی به ثم يمهه حتی اذا سجد وضعه بين كتفيه فانبعث اشقاهم فلما سجد رسول الله وضعه بين كتفيه وثبت النبی ﷺ ساجدا فضحكوا حتی مال بعضهم علے بعض من الضحک فانطلق منطلق الی فاطمة وهی جويرية فاقبلت تسعیٰ وثبت النبی ﷺ ساجدا حتی القته عنه واقبلت عليهم تسبهم فلما قضی رسول الله ﷺ الصلوٰة قال اللهم عليک بقريش اللهم عليک بقريش اللهم عليک بقريش ثم سمی اللهم عليک بعمرو بن هشام و عتبة بن ربيعة وشيبة بن ربيعة والوليد بن عتبة وامية بن خلف وعقبة بن ابی معيط و عمارة بن وليد قال عبدالله فوالله لقد رأيتهم صرعی يوم بدر ثم سحبوآ الی القليب قليب بدرثم قال رسول الله ﷺ و اتبع اصحاب القليب لعنة .

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کے پاس کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، قریش اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک قریشی بولا اس ریا کار کونہیں دیکھتے؟ کیا کوئی ہے جو بنی فلاں کے ذبح کئے ہوئے اونٹ تک جانے کے لئے تیار ہو اور وہاں سے گوبر وخون سے بھری ہوئی اوجھ اٹھالائے پھر یہاں انتظار کرے، جب یہ (آنحضور ﷺ) سجدہ میں جائیں تو گردن پر رکھ دے (اس کام کو انجام دینے کے لئے) ان میں کا سب سے زیادہ بد بخت شخص اٹھا اور رسول اللہ ﷺ سجدہ میں گئے تو اس نے آپ کی گردن مبارک پر یہ غلاظتیں ڈال دیں، ان کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ سجدہ ہی کی حالت میں سرکو کئے رہے، مشرکین (یہ دیکھ کر) ہنسے اور مارے ہنسی کے ایک دوسرے پر لوٹنے پوٹنے لگے، ایک شخص (غالباً ابن مسعودؓ) حضرت فاطمہؓ کے پاس آیا آپ ابھی بچی تھیں، آپ دوڑتی ہوئی تشریف لائیں حضور اکرم ﷺ اب بھی سجدہ ہی میں تھے پھر ان غلاظتوں کو آپ کے اوپر سے ہٹایا اور مشرکین کو مخاطب کر کے انہیں برا بھلا کہا، پھر جب آنحضور ﷺ نے نماز پوری کر لی تو فرمایا'' خدایا قریش پر عذاب نازل کر، خدایا قریش پر عذاب نازل کر، خدایا قریش پر عذاب نازل کر'' پھر نام لے کر کہا، خدایا عمرو بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط اور عمارہ بن ولید کو ہلاک کردے، حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا، خدا گواہ ہے میں نے ان سب کو بدر کی لڑائی میں خاک وخون میں پایا، پھر انہیں گھسیٹ کر بدر کے کنویں میں پھینک دیا گیا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کنویں والے خدا کی رحمت سے دور کر دیئے گئے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علامہ دمیاطیؒ نے لکھا کہ یہ حضور علیہ السلام کی کفار کے حق میں سب سے پہلی بددعا تھی جو قبول ہدایت سے قطعاً مایوسی کے بعد فرمائی ہوگی، حافظؒ نے لکھا کہ عمارہ بن الولید کو یہاں قلیب بدر والوں میں شمار کرنا وجہ اشکال بنا ہے، کیونکہ اصحاب سیر نے لکھا ہے کہ اس کی موت حبشہ میں ہوئی تھی، جبکہ نجاشی نے اس کی غلط روش پر تنبیہ کرنے کے لئے ایک جادوگر سے اس پر سحر کرایا، جس سے وہ وحشی بہائم کی طرح ہوگیا تھا اور اسی حالت میں حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مرا ہے، جواب یہ ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے ان اشرار قریش میں سے اکثر کو قلیب بدر میں دیکھا ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

بسم الله الرحمن الرحیم

کتاب مواقیت الصلٰوۃ

(نماز کے اوقات کا بیان)

باب مواقیت الصلوٰۃ و فضلها وقوله تعالیٰ ان الصلواۃ کانت علی المؤمنین کتبا موقوتا وقته علیهم.

(نماز کے اوقات اور ان کی فضیلت کا بیان اور اللہ تعالیٰ کا قول کہ بے شک مسلمانوں پر نماز اوقات کے ساتھ فرض کی گئی ہے یعنی اس کا وقت ان کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے)

۴۹۴. حدثنا عبدالله بن مسلمة قال قرات علی مالک عن ابن شهاب ان عمر بن عبدالعزیز اخر الصلٰوۃ یوما فدخل علیه عروة بن الزبیر فاخبره ان المغیرة عن شعبة اخر الصلوٰۃ یوما وهو بالعراق فدخل علیه ابو مسعود الانصاری فقال ما هذا یا مغیرة الیس قد علمت ان جبریل علیه السلام نزل فصلی فصلی رسول الله ﷺ ثم صلی فصلی رسول الله ﷺ ثم صلی فصلی رسول الله ﷺ ثم صلی فصلی رسول الله ﷺ ثم صلی فصلی رسول الله ﷺ ثم قال بهذا امرت فقال عمر بعروة اعلم ما تحدث به و ان جبریل هو اقام لرسول الله ﷺ وقت الصلٰوۃ قال عروة کذلک کان بشیر بن ابی مسعود یحدث عن ابیه قال عروة ولقد حدثنی عآئشة ان رسول الله ﷺ کان یصلی العصر والشمس فی حجرتها قبل ان تظهر.

ترجمہ: ابن شہاب سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک دن نماز تاخیر سے پڑھی تو ان کے پاس عروہ بن زبیر آئے اور ان سے بیان کیا کہ مغیرہ بن شعبہ نے ایک دن جبکہ وہ عراق میں تھے، دیر سے نماز پڑھی تو ان کے پاس حضرت ابو مسعود انصاری آئے اور کہا کہ اے مغیرہ! یہ کیا بات ہے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جبریل علیہ السلام آئے اور انہوں نے نماز پڑھی تو رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی، پھر انہوں نے نماز پڑھی تو رسول اللہ ﷺ نے بھی نماز پڑھی، پھر انہوں نے نماز پڑھی تو رسول اللہ ﷺ نے بھی نماز پڑھی، پھر انہوں نے نماز پڑھی تو رسول اللہ ﷺ نے بھی نماز پڑھی، پھر انہوں نے نماز پڑھی تو رسول اللہ ﷺ نے بھی نماز پڑھی، پھر انہوں نے نماز پڑھی تو رسول اللہ ﷺ نے بھی نماز پڑھی، پھر (جبریل علیہ السلام نے) کہا کہ مجھے ایسا ہی حکم دیا گیا ہے، تو صرف عمر (بن عبدالعزیز) نے عروہ سے کہا کہ تم سمجھ لو کہ کیا بیان کر رہے ہو کیا جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کی نماز کے اوقات مقرر کئے تھے، عروہ نے کہا کہ بشیر بن ابی مسعودؓ اپنے والد سے اسی طرح حدیث بیان کرتے تھے، عروہ نے کہا کہ مجھ سے حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ عصر کی نماز اس حالت میں پڑھتے تھے جب دھوپ ان (حضرت عائشہؓ) کے حجرے میں رہتی تھی، قبل اس کے حجرۂ مبارکہ سے اوپر ہو جائے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- یہاں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قصہ اور اس کے ضمن میں حدیث امامت جبریل علیہ

السلام کا بیان ہوا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے ایک روز نماز میں تاخیر ہوگئی تھی، یہاں اگرچہ نماز کی تعیین نہیں ہے، کہ کون سی تھی مگر بخاری باب بدء الخلق (ص ۴۵۷) میں نماز عصر کی تعیین ہے اور بخاری ص ۵۷۱ میں بھی اسی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔جس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عروہ ابن زبیرؓ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ان کی امارت کے زمانہ میں حضرت مغیرہ کی تاخیر عصر کا واقعہ سنایا تھا، لہذا فیض الباری ص ۸۸ ج ۲ میں "**ولم یکن اذا ذاک امیر المومنین**" سبقت قلم ہے، ابوداؤد میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ منبر پر بیٹھے تھے اور عصر کی نماز میں تاخیر کردی تھی تب حضرت عروہ نے اعتراض کیا (بذل ص ۳۲۸ ج ۱) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ امارت کا قصہ ہے، نیز دور بنی امیہ میں چونکہ نمازوں کی تاخیر عام طور سے امراء کرنے لگے تھے، اس لئے بھی حضرت عروہ نے معمولی تاخیر کو بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے لئے ناپسند کیا ہوگا پھر اس پر بھی بحث ہوئی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت عروہ کو یہ کیوں فرمایا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، سوچ سمجھ کر کہو تو بذل وغیرہ میں کئی جواب ہیں، بہتر یہ ہے کہ حدیث رسول اکرم ﷺ کو بے سند کے بیان نہ کرنا چاہئے، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی تنبیہ پر حضرت عروہ نے پھر اس کی سند پیش کی کہ اسی طرح بشیر بن ابی مسعودؓ اپنے والد ماجد سے روایت کیا کرتے تھے، باقی دوسری توجیہات مرجوع معلوم ہوتی ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اس حدیث امامت جبریل علیہ السلام سے واقف ہی نہ تھے یا اس وقت بھول گئے تھے، یا امامت جبریل کو حضور علیہ السلام کی شان کے مناسب[1] نہ جانتے تھے، وغیرہ۔

---

[1] **حضرت ملا علی قاری کا تفرد:** یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہمارے حضرات اکابر میں سے ملا علی قاری حنفیؒ کا یہ خیال بھی درست نہیں کہ امامت جبریل کی کوئی حقیقت واقعیہ نہ تھی بلکہ وہ نسبت مجازی ہے کیونکہ حضرت جبریل اشارہ سے بتلاتے ہوں گے اور حضور اس کے مطابق صحابۂ کرام کو دونوں دن نماز پڑھاتے رہے ہوں گے، گویا امام نماز حضرت جبریل نہ ہوتے تھے، کذا نقل فی الاوجز ص ۳ ج ۱ وغیرہ، معلوم نہیں ملا علی قاریؒ نے اس میں کوئی استبعاد سمجھا یا اور کسی وجہ سے امامت جبریل سے انکار کیا، بہرحال جس وجہ سے بھی ہو، یہ ان کا تفرد معلوم ہوتا ہے، والحق احق ان یقال کیونکہ نسائی میں امامت جبریل کا تفصیلی ذکر دو جگہ ہے پہلے آخر وقت ظہر کے بیان میں ص ۸۷ ج ۱ پر حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے جو دوسری کتب ابوداؤد وغیرہ میں بھی ہے، حضرت ابن عباسؓ سے، اس کے بعد بیان آخر وقت عصر میں ۸۹ ج ۱ پر حضرت جابرؓ کی روایت لائے ہیں، جس میں تفصیل زیادہ ہے، اور اس کا حوالہ حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی دیا ہے، ملاحظہ ہو فیض الباری ص ۹۹ ج ۲، اس میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کے پاس مواقیت صلوٰۃ سکھانے کے واسطے تشریف لائے، پھر وہ آگے بڑھے اور رسول اکرم ﷺ ان کے پیچھے کھڑے ہوئے اور صحابہ کرام آپ کے پیچھے صف بستہ ہوئے اور ظہر کی نماز زوال پر پڑھائی، پھر حضرت جبریل سایہ مثل شخص ہوجانے پر تشریف لائے اور پہلے کی طرح کیا کہ حضرت جبریل خود آگے ہوئے اور حضور علیہ السلام آپ کے پیچھے اور آپ کے پیچھے صحابہ نے کھڑے ہوکر نماز عصر پڑھی، پھر حضرت جبریل علیہ السلام غروب شمس پر تشریف لائے اور آگے بڑھے حضور علیہ السلام ان کے پیچھے اور لوگوں نے آپ کے پیچھے کھڑے ہوکر نماز مغرب ادا کی، پھر شفق غائب ہونے پر حضرت جبریل تشریف لائے اور آگے ہوئے، حضور علیہ السلام ان کے پیچھے اور صحابہ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور عشا کی نماز پڑھی، پھر صبح ہوتے ہی حضرت جبریلؑ تشریف لائے اور اوپر کی طرح نماز پڑھائی، پھر پہلے دن کی طرح (ہر وقت کے لئے) تشریف لاکر دوسرے دن کی سب نمازیں اور تیسرے دن کی صبح پڑھائی، پھر فرمایا کہ ان دونوں وقتوں کے درمیان نمازوں کا وقت ہے، تعجب ہے کہ اتنی تفصیل وصراحت کے بعد بھی ملا علی قاریؒ نے ایسا خیال کیا، اگر صرف قولی تعلیم مقصود تھی تو وہ کام تو پانچ منٹ کا تھا، اس کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام کو دو تین روز تک دس بار ملاء اعلیٰ سے اترنے کی کیا ضرورت تھی، بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکتی ہے کہ میں کسی بڑے پر نقد کیوں کرتا ہوں یا ان کی کسی مسامحت وغلطی کو کیوں نمایاں کرتا ہوں حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں بھی دوسروں کی طرح اپنوں کی یا دوسروں کے بڑوں کی مسامحتوں پر متنبہ نہ کروں اور معاملہ کو گول کرتا جاؤں تو انوار الباری کا فائدہ ناقص رہے گا، پھر لوگ یہ بھی تو دیکھیں کہ میں سب ہی اکابر کا کتنا احترام کرتا ہوں اور ان کے علوم وتحقیقات کی کھلے دل سے داد دیتا ہوں اور ان کو نقل کرتا ہوں پھر اگر ان سے کوئی مسامحت بھی ہوگئی ہے کہ وہ معصوم یقیناً نہ تھے، تو اس کی نشاندہی میں حرج کیا ہے؟ خصوصاً جبکہ اس کے لئے دلائل بھی پیش کرتا ہوں اب یہاں حضرت ملا علی قاریؒ ہی کو لیجئے، کیا خدانخواستہ میں ان سے کسی ادنیٰ درجہ میں بھی منحرف ہوں؟ پھر جب ان کی جلالت قدر اور گرانقدر تحقیقات اور علمی خدمات کا سوبار اعتراف کرتا ہوں تو کیا کسی ایک دو مسامحتوں پر مجھے متنبہ کردینے کا حق نہیں ہے؟!

میں نے تو اپنے استاذ محقق علامہ کشمیریؒ اور ان کے بھی بیشتر اکابر کی یہی شان دیکھی ہے کہ غلطی پر ضرور متنبہ کرتے تھے خواہ وہ کسی بھی بڑے سے ہوئی ہو اور اس سے مستثنیٰ صرف انبیاء علیہم السلام تھے یا ان کے صحابہ کرامؓ، ان کے بعد نحن رجال وہم رجال والتحقیق العلمی سینا سجال غلطیوں اور مسامحتوں سے نہ وہ منزہ تھے نہ ہم ہیں۔ واللہ یوفقنا کما یحب و یرضاہ۔

حضرتؒ یہ بھی فرماتے تھے کہ اوقات نماز کی تعیین جس طرح حنفیہ نے کی ہے وہ احادیث وآثار صحابہ کی روشنی میں زیادہ اصوب واضح ہے اور جن گہرائیوں تک وہ گئے ہیں دوسرے اہل مذاہب کی نظریں وہاں تک نہیں جاسکیں اور حدیث امامت جبریل ہمارے لئے سب سے زیادہ مفید ہے، یہ بھی فرماتے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے دونوں دنوں میں اوقات مستحب کے اندر نماز پڑھائی ہے، اس لئے کہ مثلاً عصر کا کچھ وقت مکروہ بھی تو ہے اور مغرب میں اشتباک نجوم تک تاخیر کر دینا بھی عندالشرع مکروہ ہے، خواہ اس کو مکروہ تحریمی قرار دو یا تنزیہی، اسی لئے حضرت جبریل علیہ السلام نے مکروہ عندالحنفیہ والے اوقات میں نماز نہیں پڑھائی، یہ بھی فرمایا کہ امامت جبریل علیہ السلام والی حدیث ساری احادیث اوقات کی اصل واساس ہے، جو پوری تفصیل کے ساتھ ابوداؤد میں ہے اور بخاری ومسلم نے ان کی تخریج نہیں کی، موطأ امام مالک میں بھی اسی طرح ذکر کی ہے جس طرح امام بخاری نے پوری تفصیل کے ساتھ نہیں ہے، حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ہم نے ٹھیک حدیث جبریل پر عمل کیا ہے، علامہ نووی وغیرہ تاویل کیا کریں اور پھر تاویل بھی ایسی کہ صریح حدیث جبریل کے خلاف ہے۔

لامع الدراری کا تسامح

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ لامع الدراری ص ۲۰۷ ج ا میں جو حضرت گنگوہیؒ کی طرف نسبت ہوگئی ہے وہ سبقت قلم ہے جس پر حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے بھی حاشیہ میں تنبیہ فرمادی ہے کہ تفصیل اوقات موطأ مالک میں نہیں ہے، بلکہ اس کی کسی روایت میں بھی یہ نہیں ہے اس دوسرے جملہ کو ہم نہ سمجھ سکے کیونکہ تفصیل اوقات کی دوسری روایت موطأ امام مالک میں موجود ہے اور جس طرح امام بخاری نے حدیث امامت جبریل کی طرف **نزل فصلی وصلی رسول الله** ﷺ الخ سے اشارہ کیا ہے اسی طرح موطأ میں بھی **نزل فصلی فصلی رسول الله** ﷺ الخ سے اشارہ موجود ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ امام بخاریؒ نے تو کتاب الصلوٰۃ کے شروع میں ہی اوقات نماز کی بحث کردی ہے اور ابوداؤد، ترمذی میں بھی اسی طرح ہے، نسائی ابتداء کتاب الصلوٰۃ میں امامت جبریل والی حدیث لائے ہیں، ابن ماجہ نے اولاً حضور علیہ السلام کی مدینہ طیبہ کی امات نبویہ کا ذکر کیا، پھر امامت جبریل مکیہ کو لائے ہیں، امام مسلم نے کتاب الصلوٰۃ میں پہلے نماز کی ساری کیفیت وارکان کا ذکر کرنے کے بعد اوقات کی احادیث ذکر کی ہیں اور موطأ امام مالکؒ میں سب سے الگ راہ اختیار ہوئی کہ اوقات نماز کی احادیث کو کتاب الطہارۃ وغیرہ سے بھی مقدم کردیا، یعنی کتاب اسی سے شروع ہوئی ہے، کیونکہ نماز تو ایمان لاتے ہی یا بلوغ کے بعد ہی فوراً فرض ہوگئی جو اسلام کا سب سے اہم واقدم عملی فریضہ ہے، اب اس کے لئے طہارت بدن وثوب وموضع صلوٰۃ اور وضوء غسل وغیرہ کا درجہ بعد کا ہوگیا، کہ ان کے اوپر نماز کی صحت موقوف ہے۔

حدیث امامت جبریل مکیہ

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا بخاری ومسلم کے علاوہ تقریباً سب ہی کتابوں میں اس کی روایت نمایاں طور سے اہتمام کے ساتھ کی گئی ہے، مثلاً ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد، حاکم، ابن حبان ابن خزیمہ، اسحٰق میں، اور دو دن تک حضرت جبریل علیہ السلام نے بیت اللہ کے پاس نماز پڑھائی وہ امام تھے اور حضور علیہ السلام مع دوسرے مسلمانان مکہ کے مقتدی اور آخر میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ نمازوں کا وقت ان دونوں دنوں کی نماز کے اوقات کے درمیان ہے، یہ بھی واضح ہو کہ جس شب میں حضور علیہ السلام کو معراج کا شرف عظیم وجلیل حاصل ہوا علماء محققین نے لکھا ہے کہ جانے کے وقت جو نماز حضور اکرم ﷺ نے بیت المقدس میں پڑھی تھی وہ نفل تھی اور واپسی میں جو نماز آپ نے وہاں تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ امام ہو کر پڑھی وہ صبح کی نماز تھی اور اسی روز حضرت جبریل علیہ السلام نے ملاء اعلیٰ سے اتر کر سب سے پہلی نماز کعبہ معظمہ کے پاس ظہر کی پڑھائی اور اس سے ابتداء اس لئے کی کہ حضور اکرم ﷺ صبح کی نماز جماعت انبیاء کے ساتھ بیت المقدس

میں ادا فرما چکے تھے، پھر آپ نے تیسرے دن کی صبح کو نماز فجر پڑھا کر دس نمازیں پوری کی ہیں، کیونکہ بحکم خداوندی دس نمازوں کے اول و آخر وقت کی تعلیم مقصود تھی، اس پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ حضرت جبریل کی نماز تو نفل ہوگی، ان کے پیچھے حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام کی فرض نماز کیسے ادا ہوئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام بھی اس وقت مکلّف و مامور باداء الصلوٰۃ تھے، اس لئے ان کی نماز بھی فرض ہی تھی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں پر ہماری طرح نماز بحیثیت مجموعی فرض نہیں ہے، بلکہ وہ دوسری طرح مامور و مشغول وعبادت ہوتے ہیں، مثلاً کچھ قیام کی حالت میں تو ہمیشہ اسی حالت یک رُکنی عبادت میں وقت گذارتے ہیں، کچھ سجود میں ہیں، کچھ ذکر میں ہیں، کچھ دوسرے اعمال کے مامور ہیں، یہ نماز کی مکمل صورت مبارکہ طیبہ اور جماعت کے ساتھ یہ امت محمدیہ کے جن وانس کے ساتھ خاص ہے اور یہ نعمت عظیمہ حضور اکرم ﷺ کی معراج کمال کی یادگار ہے، اور اس کی ابتداء بیت اقدس کی جماعت انبیاء علیہم السلام سے ہوئی ہے کیونکہ اس سے پہلی امتوں پر جماعت کی نماز مشروع نہ تھی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حدیث امامۃ نبویہ مدنیہ

ایک شخص مسجد نبوی میں حاضر ہوا اور نماز کے اوقات کا سوال کیا، آپ نے حکم فرمایا کہ نمازوں میں شرکت کرو، پھر حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ سب نمازوں کے لئے اول وقت اذان دو، (اور اول وقتوں میں نماز پڑھائی) دوسرے دن حکم دیا کہ سب نمازوں کے لئے آخر وقت میں اذان دو (اور نمازیں پڑھائیں) پھر فرمایا کہ پوچھنے والا کہاں ہے، نمازوں کا وقت ان دونوں کے درمیان ہے، اس حدیث کو امام محمدؒ نے اپنی کتاب الآثار میں ذکر کیا اور صحیح مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ میں بھی ہے۔

اوقات معینہ کی عقلی حکمت

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے حاشیہ لامع الدراری اور الابواب میں اس بارے میں نہایت عمدہ بحث فرمائی ہے اور امام رازی، شارح منہاج اور حضرت تھانوی کی المصالح العقلیہ کی تحقیقات کا حوالہ دے کر اپنی طرف سے جو تحقیق درج فرمائی ہے وہ بہت قابل قدر ہے، ہم یہاں طوالت کی وجہ سے نقل نہیں کر سکتے، خلاصہ یہ ہے کہ جب مقصد پیدائش جن وانس ہی عبادت و ذکر الٰہی ہے تو چاہئے تو یہی تھا کہ سارے اوقات پر فرشتوں کی طرح ہمارے بھی مصروف عبادت ہوں، مگر چونکہ ہمارے ساتھ علائق دنیوی بھی لگے ہوئے ہیں اور زندگی گزارنے کے لئے فکر معاش اور اس کے دیگر لوازم بھی ضروری ہوگئے، اس لئے حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل وانعام سے ہماری تھوڑی سی عبادت کو پورے اوقات کی عبادت کے برابر قرار دے دیا، پھر یہ سوال کہ تقسیم اوقات صلوٰۃ میں توازن وتناسب کیوں نہیں ہے؟ کیونکہ صبح سے ظہر تک کا طویل وقت خالی ہے، پھر ظہر سے عشاء تک مسلسل نمازیں ہیں، پھر رات کا طویل وقت خالی ہے، اور صرف صبح کو نماز رکھی گئی ہے، اس کا جواب حضرت دام ظلہم نے یہ دیا تھا کہ دن کا آدھا حصہ حوائج ضروریہ کے لئے خالی کر دیا گیا اور آدھا نمازوں میں مصروف کر دیا گیا ہے، اسی طرح رات کا نصف حصہ راحت وحوائج کے لئے اور عشا تک نماز کا حصہ تھا، پھر صبح کو نماز آ گئی، اس لئے بظاہر عدم توازن وتناسب بلا مصلحت وخلاف عقل نہیں ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ایک توجیہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ دن رات کو تین حصوں میں تقسیم کر دیں ایک ثلث تقریباً ۸ آٹھ گھنٹے معاشی ضروریات کے لئے ہوئے، دوسری ثلث عشا تک نمازوں کے لئے، پھر باقی ثلث راحت واکرام کے لئے، پہلا ثلث ضرورت کے لئے کہ قضاء حوائج کے امر خداوندی ہے، دوسرا عبادت کے لئے تیسرا حق تعالیٰ کی طرف سے بطور انعام راحت وآرام کے لئے ''والثلث کثیر'' یعنی تہائی کو شریعت نے اکثر احکام میں کل کے برابر قرار دیا ہے، اس لئے گویا پورا وقت عبادت کا بھی ہوا اور پورا ہی معاشی ضرورتوں کا ہوا اور پورا ہی راحت، آرام وسکون کا بھی اسی لئے ان میں کمی بیشی نظر انداز ہوئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

یا خدا قربان احسانت شوم　　ایں چہ احسان است قربانت شوم
وان تعدو انعمة الله لا تحصوها والحمد الله رب العالمین

اوقات نماز میں اختلاف

مذاہب اربعہ فقہیہ کا فجر کے اول وآخر وقت میں اتفاق ہے کہ صبح صادق سے شروع ہو کر طلوع تک ہے، ظہر کے اول وقت میں سب متفق ہیں کہ زوال کے بعد شروع ہوتا ہے، آخر میں اختلاف ہے اور حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ بڑا اختلاف اس میں اور اول عصر میں ہی ہے، باقی اوقات میں معمولی ہے، آخر ظہر میں اختلاف کی نوعیت ہمارے حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اس طرح لکھی ہے:- امام مالک اور ایک طائفہ کے نزدیک ایک مثل ہونے پر عصر کا وقت تو شروع ہو جاتا ہے مگر ظہر کا وقت ختم نہیں ہوتا بلکہ درمیان میں بقدر چار رکعت کے ایسا وقت ہوتا ہے کہ اس میں ظہر وعصر دونوں ادا ہو سکتی ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے دوسرے دن ظہر کی نماز ایک مثل پر پڑھی جبکہ پہلے دن اسی وقت پر عصر کی پڑھی تھی جمہور کی رائے یہ ہے کہ نہ کوئی وقت مشترک ہے نہ دونوں کے وقت میں فاصلہ ہے اور بعض شافعیہ وداؤد ظاہری کے نزدیک ادنی فاصلہ ہوتا ہے جس کو روایت مسلم سے رد کیا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ظہر کا وقت عصر کے وقت کے آنے تک ہے، پھر جمہور اور امام ابو یوسف وامام محمد کی رائے ہے کہ ظہر کا وقت ایک مثل سایہ ہو جانے پر ختم ہو جاتا ہے اور عصر کا شروع ہو جاتا ہے اور امام اعظمؒ سے بھی ایک روایت میں ایسا ہی ہے اور ان سے ظاہر روایت یہ ہے کہ سایہ دو مثل ہونے تک نہ ظہر کا وقت ختم ہوتا ہے نہ عصر کا داخل ہوتا ہے۔ (اوجز ص ۱ ج ۱)

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ امام صاحب سے یہ روایت مشہور تو ہو گئی مگر اس کو مصطلح ظاہر روایت قرار دینا درست نہیں، کیونکہ یہ روایت نہ جامع صغیر میں ہے نہ کبیر میں، نہ زیادات میں ہے نہ مبسوط میں اور سیر کبیر میں بھی نہیں ہے، اور امام محمدؒ نے آخر وقت ظہر سے کہیں تعرض ہی نہیں کیا، بلکہ بدائع میں تو اس امر کی صراحت بھی ہے کہ آخر ظہر کا ذکر ''ظاہر روایت'' میں نہیں ہے، پھر معلوم نہیں کہ ظاہر روایت کی بات کس طرح چلا دی گئی؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ امام صاحب سے رائے جمہور وصاحبین کی طرف رجوع بھی ثابت ہے، جیسا کہ سید احمد وصلانی شافعی نے خزانۃ المفتیین وفتاویٰ ظہیریہ سے نقل کیا ہے، یہ دونوں معتبر کتابیں ہیں، لیکن خزانۃ الروایات میرے نزدیک معتمد نہیں ہے، باقی ہماری اکثر کتب حنفیہ میں بھی حسن بن زیاد عن الامام ابی حنیفہ نقل ہے، جس کو مبسوط سرخسی میں امام محمد سے منسوب کیا گیا ہے اور اسی قول مرجوع الیہ پر صاحب درمختار نے فتویٰ دیا ہے، علامہ شامی نے اس کو خلاف ظاہر روایت بتلا کر رد کیا اور غیر مفتیٰ بہ قرار دیا، مگر میرے نزدیک مختار صاحب درمختار ہی زیادہ راجح ہے۔

ایک روایت امام صاحب سے یہ ہے کہ دو مثل سے کچھ کم پر ظہر کا وقت ختم ہوتا ہے اور پورے دو مثل پر عصر کا شروع ہوتا ہے، کمافی عمدۃ القاری، چوتھی روایت یہ ہے کہ ظہر ایک مثل تک ہے، دوسری مثل مہمل اور تیسری پر وقت عصر ہوگا، یہ روایت اسد بن عمرو عن ابی حنیفہ ہے۔

خلاصہ بحث: حضرتؒ نے فرمایا میرے نزدیک ساری تفصیل مذکور کا ماحصل یہ ہے کہ مثل اول ظہر کے ساتھ خاص ہے، تیسری عصر کے لئے خاص ہے اور دوسری میں دونوں ادا ہو سکتی ہیں، البتہ عمل میں فاصلہ ہونا چاہئے کہ اگر ظہر جلدی مثلاً بعد زوال فوراً پڑھے تو عصر بھی جلد یعنی مثل اول پر پڑھے، اور اگر ظہر کو مؤخر کرے، مثلاً مثل پر پڑھے تو عصر کو مثل دوم پر پڑھے، جس طرح حدیث امامت جبریل اور حدیث امامت نبویہ مدنیہ سے بھی ثابت ہے، کیونکہ حدیث امامت جبریل میں اشتراک مثل دوم کی صراحت ہے کہ اگلے دن حضرت جبریل نے اسی وقت نماز ظہر پڑھی، جس وقت پہلے دن نماز عصر پڑھی تھی، اور ترمذی میں بھی تصریح ہے کہ حضرت جبریل نے اگلے دن ظہر کی نماز گذشتہ دن کے عصر کے وقت پڑھی ہے جبکہ سایہ ایک مثل ہو گیا تھا۔

(دوسری حدیث میں جس میں بعد کو مدینہ طیبہ میں حضور علیہ السلام کے دو روز تک نمازوں کے اوقات بتلانے کا ذکر ہے اسکو اکثر کتب حدیث میں مختصراً ذکر کیا گیا ہے، البتہ ابوداؤد میں وہ بھی مفصل ذکر ہوئی ہے اور اس میں اور بھی زیادہ صراحت ہے کہ حضور علیہ السلام نے دوسرے

دن ظہر کو پہلے دن کی عصر کے وقت میں قائم کیا (بذل المجہود ص۲۳۱ ج۱) اس موقع پر شارح علام صاحب بذل المجہودؒ نے لکھا یہ حدیث ظہر وعصر کے اشتراک وقت پر دلالت کرتی ہے کہ آخر وقت ظہر واول وقت ظہر مشترک ہے، مگر ہم کہیں گے کہ ممکن ہے حضور علیہ السلام نے دوسرے دن ظہر کو جس وقت پورا کیا، اس سے متصل پہلے دن عصر کو شروع کیا ہوگا اور چونکہ دونوں وقت متصل تھے، اس لئے یہ کہہ دیا گیا کہ دوسرے دن ظہر کو پہلے دن عصر کے وقت پڑھا گیا ہے لہٰذا اشتراک لازم نہ آیا، لیکن بعینہ یہی تاویل تو شافعیہ نے کی ہے، انہوں نے کہا کہ دوسرے دن حضرت جبریل ایک مثل ہونے پر نماز سے فارغ ہوگئے تھے اور پہلے دن ایک مثل ہونے پر عصر کی نماز شروع کی تھی۔ کما ادلہ النوویؒ، مؤلف)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ احادیث مذکورہ کیوجہ سے اشتراک ماننا پڑے گا اور اسی لئے امام مالک بھی اشتراک کے قائل ہوئے ہیں، البتہ یہ احادیث امام شافعیؒ کے مخالف ہیں کیونکہ وہ مثل اول پر ظہر کو بالکل ختم کردیتے ہیں اسی لئے علامہ نووی نے ان میں تاویل کی ہے لیکن نسائی کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام مثل اول ہوجانے پر اترے ہیں، تو ظاہر ہے کہ نماز ظہر مثل اول کے بعد پڑھی ہوگی جو شافعیہ کے نزدیک عصر کا وقت ہے لہٰذا نووی کی تاویل نہیں چل سکتی۔

پھر فرمایا کے دوسرے دن نماز عصر دو مثل کے بعد پڑھی ہے، جو ختم مثل ثالث سے قبل کسی وقت بھی ہوسکتی ہے کیونکہ کسور کو حذف کردیا کرتے ہیں، لہٰذا حاصل یہ ہوا کہ ظہر ایک دفعہ تو مثل کے اندر پڑھی جو اس کا وقت مخصوص ہے اور دوسری مرتبہ دوسرے مثل میں جو اس کے لئے وقت صالح ہے، اور اسی طرح عصر کی نماز ایک بار مثل اول کے بعد پڑھی ہے جو اسکے لئے وقت صالح ہے، دوسری مرتبہ مثل ثانی کے بعد اور ختم مثل ثالث سے قبل، جو اس کا وقت مخصوص ہے، اس کے ساتھ دونوں دنوں کی طرح فاصلہ کی رعایت بھی رکھنی چاہئے اور یہی ہمارا مذہب ہے، البتہ یہ فاصلہ کی قید سفر و مرض کی مجبوری سے رفع ہوسکتی ہے، لہٰذا مسافر مثل ثانی کے اندر جمع کرسکتا ہے اور مستحاضہ ظہر و عصر کو ایک غسل سے جمع کرسکتی ہے۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ سرخسی نے اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ ظہر کا وقت صاحبین کے نزدیک فقط مثل تک نہیں ہے بلکہ کچھ بعد تک رہتا ہے، لہٰذا مشہور بات درست نہیں کہ ان کے نزدیک ایک مثل پر وقت ظہر ختم ہوگیا اور وقت عصر داخل ہوگیا، اس سے غالباً حضرتؒ کا اشارہ اس طرف ہے کہ صاحبین بھی مثل ثانی کے اندر فی الجملہ اشتراک کے قائل ہیں، اور اس طرح حدیث جبریل کا صحیح ترین مصداق مذہب حنفیہ ہے، کیونکہ اس میں اول دن ہر وقت میں تعجیل اور دوسرے دن ہر وقت میں تاخیر ہے اور فاصلہ کی بھی رعایت ہے۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اشتراک کے قول کو زیادہ تعجب کی نظر سے نہ دیکھنا چاہئے کیونکہ اس کی طرف سلف کی ایک جماعت گئی ہے جیسا کہ طحاوی میں ہے کہ یہی مذہب امام مالک کا ہے اور ایک روایت امام شافعی سے بھی ہے جس کا ثبوت ان کے بعض مسائل سے بھی ہوتا ہے مثلاً یہ کہ اگر عورت آخر وقت عصر میں حیض سے پاک ہو تو اس پر نماز ظہر کی بھی قضا ہے اور آخر وقت عشاء میں ہو تو مغرب کی بھی قضا ہے، اگر اشتراک نہ مانتے تو ایسا حکم کیوں کرتے اور حافظ نے حضرت ابن عباس وعبدالرحمٰنؓ سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ اشتراک کا وجود تمام[1] مذاہب میں ہے اور حدیث مسلم میں جو وقت ظہر کو وقت عصر آنے تک بیان کیا ہے وہ بھی اشتراک کے خلاف نہیں ہے کیونکہ مراد

---

[1] اشتراک کی بحث علامہ ابن رشدؒ نے بڑی تفصیل سے لکھی ہے، جس کا حوالہ حاشیہ لامع ص۲۱۵ ج۱ میں ہے، وہ بھی اساتذہ وطلبہ حدیث کے لئے قابل مطالعہ ہے اس میں درج ہے کہ اوقات ضرورت میں امام شافعی ومالک وامام احمدؒ کا اتفاق ہے کہ ظہر وعصر میں اشتراک ہے اور مغرب وعشاء میں بھی (معارف السنن للبنوری ص۱۴ ج۱ بحوالہ بدایۃ المجتہد ص۷۷ و ۷۸ ج۱) اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق سے حنفیہ کے یہاں بھی اشتراک کا ثبوت موجود ہے لیکن اس کو جس طرح حضرتؒ نے نمایاں کرکے اور دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے کسی نے نہیں کیا، حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے یہ بھی تھی کہ بیاض کا وقت مشترک ہے، بین المغرب والعشاء، یعنی اس سے قبل مخصوص وقت مغرب ہے اور بعد میں مخصوص وقت عشا ہے، الا یہ کہ مرض یا سفر ہو تاہم فاصلہ رکھنا ضروری ہے، (احقر نے درس بخاری میں حضرتؒ میں یہی کلمات نوٹ کئے تھے مورخہ ۳۱ مئی ۳۲ء م ۲۴ محرم ۵۱ھ) حضرت العلامہ مولانا محمد یوسف البنوری دام فضلہم نے بھی اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے افادات قیمہ معارف السنن جلد دوم کے ابتداء میں باحسن اسلوب جمع کردیئے ہیں، جزاہم اللہ خیر الجزاء (مؤلف)

وقت ظہر مجموع ہے جس میں وقت مخصوص اور غیر مخصوص دونوں شامل ہیں، اور اگر اشتراک کی بات کسی بھی آیت یا حدیث کے خلاف ہوتی تو صحابہ اور ائمہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہ ہو سکتا تھا۔

آخر وقت ظہر اور اول وقت عصر میں چونکہ بڑا اختلاف تھا، اس میں تفصیل کی گئی، اس کے علاوہ دوسرے مسائل وقتیہ میں بقول حضرت شاہ صاحبؒ معمولی اختلاف استحباب وغیرہ کا ہے، مثلاً ابراد ظہر یا اسفار فجر وغیرہ تو ان پر امام بخاریؒ نے آگے مستقل عنوانات قائم کئے ہیں، لہٰذا ان پر وہیں بحث ہوگی۔ ان شاء اللہ

باب قول الله عزو جل منيبين اليه واتقوه واقيمو الصلوٰة ولا تكونوا من المشركين

(اللہ تعالیٰ کا قول کے خدا کی طرف رجوع کرو اور اس سے ڈرتے رہو، نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ)

۴۹۵. حدثنا قتيبة بن سعيد قال نا عباد وهو ابن عباد عن ابي جمرة عن ابن عباس قال قدم وفد عبدالقيس علىٰ رسول الله فقالو انا من هذا الحي من ربيعة والسنا نصل اليک الا في الشهر الحرام فمرنا بشيء ناخذه عنک وندعو اليه من ورآء نا فقال امركم باربع وانها كم عن اربع الايمان بالله ثم فسرها لهم شهادة ان لا اله الا الله واني رسول الله واقام الصلوٰة ايتاء الزكوٰة وان تودو الى خمس ما غنمتم وانها كم عن الدبآ والحنتم والمقير والنقير.

ترجمہ ۴۹۵: حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ عبدالقیس کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، ان لوگوں نے کہا کہ ہم قبیلہ ربیعہ کی ایک شاخ ہیں اور ہم آپ سے صرف حرام کے مہینے میں مل سکتے ہیں، اس لئے آپ ہمیں ایسی بات بتایئے جس پر ہم عمل کریں اور اپنے پیچھے رہنے والوں کو اس کی طرف بلائیں، تو آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں چار باتوں کا حکم دیتا ہوں اور چار باتوں سے منع کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اسکی تفسیر بیان کی کہ اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ کا دینا، اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ دینا اور میں تمہیں دباء، حنتم، مقیر اور نقیر کے استعمال سے روکتا ہوں۔

تشریح: محقق عینی نے لکھا کہ حدیث کی مناسبت ترجمہ سے ظاہر ہے کیونکہ ترجمۃ الباب کی آیت مبارکہ میں نفی شرک کو اقامۃ الصلوٰۃ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور حدیث الباب میں بھی توحید کو اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ذکر کیا ہے (نفی شرک اور توحید ہم معنی ہیں) (عمدہ ص ۵۱۰ ج ۲)

حافظؒ نے بھی یہی مناسبت درج کی ہے، لیکن حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ آیت میں ترک صلوٰۃ کو اشتراک کے درجہ میں کیا ہے اور حدیث میں نماز کو جزو ایمان کہا گیا ہے، یہ مناسبت ہوئی، جس پر حاشیہ لامع میں حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے فرمایا کہ یہ توجیہ حافظ عینی کی توجیہ سے بہتر ہے (لامع ص ۲۰۸ ج ۱) لیکن اس پر یہ ایراد ہو سکتا ہے کہ حدیث میں مامور چار چیزیں الگ الگ بیان کی گئیں، جن میں نمبر اول پر ایمان کو رکھا اور اس کی تشریح بھی شہادت توحید و رسالت سے فرما دی، نمبر دو پر اقامت صلوٰۃ کو رکھا پھر نمبر تین ۳ پر اداء زکوٰۃ کو اور چوتھے پر اداء خمس کو، پھر اس کے بعد چار ممنوعہ اشیاء بیان فرمائیں تو اس طور سے تو اقامت صلوٰۃ وغیرہ کی جزئیت کی نفی نکل رہی ہے، نہ کہ اثبات، اور شاید اسی لئے علامہ عینی و حافظ نے اس توجیہ کو ذکر نہیں فرمایا، بلکہ یہاں سے یہ بات بھی صاف حاصل ہو رہی ہے کہ ایمان کا تعلق فعل قلب ولسان سے ہے اور نماز وغیرہ کا تعلق افعال جوارح سے اور اگر چہ آیت میں اقتران شرک و ترک صلوٰۃ سے غایت درجہ کی اہمیت وعظمت و فضیلت نماز کی نکلتی ہے، مگر حدیث نے یہ بتلا دیا کہ فرض اولین ایمان کی تفسیر صرف شہادت قلب ولسان ہی ہے، باقی اشیاء سبعہ

ماموره ومنہیہ کا درجہ دوسرے نمبر پر ہے اور وہ ایمان کا جز نہیں ہیں، اسی لئے تارک صلوٰۃ کی تکفیر محققین سلف وخلف نے نہیں کی ہے اور دوسری مشہور حدیث من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر کی مراد بھی یہی متعین کی ہے کہ ایسے شخص نے کافر جیسی صورت اپنائی، یہ نہیں کہ وہ حقیقۃً کافر ہوگیا یا ایمان قلبی کے باوجود وہ ایمان سے خارج ہوگیا۔ واللہ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا آیت الباب میں صنائع بدیع میں سے صنعت طرد وعکس ہے اور شاہ عبدالقادرؒ کا ارشاد نقل فرمایا کہ ترک عبادت اگر خواہش نفسانی کے تحت ہو تو وہ بھی ایک نوع شرک ہے، اسی لئے آیت میں ولا تکونوا من المشرکین فرمایا گیا ہے، علامہ عینیؒ نے دباء غیر کی لغوی تحقیق بھی فرمائی:۔(۱) دباء سوکھا کدو کہ اس میں نبیذ بناتے ہیں، (۲) حنتم، سبز رنگ کی ٹھلیا اس میں نبیذ وشراب بناتے تھے، (۳) مقیر، روغن قار مل کر نبیذ وشراب بنانے کا برتن تیار کرتے تھے، (۴) نقیر کھجور کی جڑ کھود کر اس میں نبیذ بناتے تھے، چونکہ وفد عبدالقیس اور ان کی قوم کے لوگ شراب کے بہت عادی تھے اور یہ سب ظروف ان کے یہاں استعمال ہوتے تھے، اس لئے شراب اور اس کے برتنوں کے استعمال سے بھی منع فرمایا اور ان لوگوں سے مال غنیمت میں خیانت کا بھی خطرہ تھا، اس لئے اس کی ممانعت بھی خاص طور سے ان کو فرمادی (عمدہ ص ۵۱۰ ج ۲)

اس حدیث کی مزید تشریح و بحث انوارالباری ص ۹ ج ۳، لغایۃ ص ۱۴ ج ۳ میں گذر چکی ہے، وہاں امام بخاری کی روایت میں صیام رمضان کا بھی ذکر ہے، اس لئے وہاں چار اور پانچ کا اشکال وجواب بھی گذرا ہے اور ہم نے اوپر واضح کیا کہ یہاں حدیث الباب میں چار ہی کا ذکر ہے، جس سے اعمال کے جزو ایمان ہونے کی نفی بہ صراحت اور بلا کسی اشکال کے ثابت ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب البیعة علیٰ اقام الصلوٰة

(نماز کے قائم رکھنے پر بیعت کا بیان)

۴۹۶۔ حدثنا محمد بن المثنیٰ قال ثنا یحییٰ قال حدثنا اسمٰعیل قال ثنا قیس عن جریر بن عبداللہ قال بایعت النبی ﷺ علیٰ اقام الصلوٰة و ایتاء الزکوٰة والنصح لکل مسلم.

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر بیعت کی تھی۔

تشریح: یہ بیعت بطور معاہدہ ہوئی تھی تاکہ اسلام میں ان امور مذکورہ کی عظمت وتاکید واضح ہو اور ان کا غیر معمولی طریقہ پر التزام و اہتمام کیا جائے اسی لئے جہاں اسلام پر بیعت لی جاتی تھی، امور جزئیہ نماز وغیرہ پر بھی ہوئی ہے۔

باب الصلوة کفارة

(نماز گناہوں کا کفارہ ہے)

۴۹۷۔ حدثنا مسدد قال حدثنا یحی عن الاعمش قال حدثنی شقیق قال سمعت حذیفة قال کنا جلوسا عند عمرؓ وقال ایکم یحفظ قول رسول اللہ ﷺ فی الفتنةقلت انا کما قاله قال انک علیه او علیها بحری قلت فتنةالرجل فی اهله و ماله وولده وجاره تکفرها الصلوة والصوا والصدقة والامروالنهی قال لیس هذا ارید و لکن الفتنة التی تموج کما یموج البحر قال لیس علیک منها باس یا امیر المومنین ان بینک وبینها لبابا مغلقاًقال ایکسر ام یفتح؟قال یکسر قال اذا لا یغلق ابدا قلنا اکان عمر یعلم الباب قال نعم کما ان دون الغد اللیلة انی حدثته بحدیث لیس بالاغالیط فهبنا ان

نسال حذیفة فامرنا مسروقاً فساله فقال الباب عمر

۴۹۸۔ حدثنا قتیبة قال حدثنا یزید بن زریع عن سلیمان التیمی عن ابی عثمان النهدی عن ابن مسعود ان رجلاً اصاب من امراة قبلة فاتی النبی ﷺ فاخبره فانزل الله عزوجل اقم الصلوة طرفی النهار وزلفاً من الیل ان الحسنت یذهبن السیات فقال الرجل یا رسول الله الیٰ هذا قال لجمیع امتی کلهم

ترجمہ ۴۹۷: حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ فرمانے لگے کہ فتنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث تم میں سے کسی کو یاد ہے؟ میں نے کہا مجھے بالکل اسی طرح یاد ہے جیسا آپ نے فرمایا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم سے اس جرأت کی امید بے شک ہوسکتی ہے، میں نے کہا کہ آدمی کا وہ فتنہ جو اس کی بی بی اور اس کے مال اور اولاد میں ہوتا ہے، اس کو نماز اور روزہ صدقہ اور امر (معروف) ونہی (منکر) مٹادیتا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا میں یہ نہیں پوچھنا چاہتا، بلکہ وہ فتنہ جو دریا کی طرح جوش زن ہوگا، حذیفہ نے کہا کے اے امیر المومنین اس فتنہ سے آپ کو کچھ خوف نہیں کیونکہ آپ کے اور اس کے درمیان میں بند دروازہ ہے، حضرت عمرؓ نے کہا اچھا وہ دروازہ توڑ ڈالا جائے گا یا کھولا جائے گا؟ حذیفہؓ نے کہا، توڑ ڈالا جائے گا، حضرت عمرؓ نے کہا، تو پھر کبھی بند نہ ہوگا، ہم لوگوں نے (حذیفہ سے کہا) کیا عمرؓ دروازہ کو جانتے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں (اسی طرح جانتے تھے) جیسے (تم) کل سے پہلے رات ہونے کو جانتے ہو، میں نے ان سے وہ حدیث بیان کی، جو غلط نہ تھی (دروازہ کے متعلق) ہم لوگوں کو تو حضرت حذیفہ سے دریافت کرنے میں ان کا رعب مانع ہوا لیکن مسروق نے کہا تو انہوں نے حذیفہ سے پوچھا (کہ دروازہ کون تھا) حذیفہ نے کہا کہ دروازہ حضرت عمرؓ تھے۔

ترجمہ ۴۹۸: حضرت ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی (اجنبی) عورت کا بوسہ لے لیا، اس کے بعد وہ نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور آپ سے بیان کیا تو اللہ بزرگ و برتر نے نازل فرمایا نماز کو دن کے دونوں سروں میں اور کچھ رات گئے قائم کر (بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں) وہ شخص بولا کہ یارسول اللہ! کیا یہ میرے ہی لئے ہے، آپ نے فرمایا، میری تمام امت کے لئے ہے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فتنہ آزمائش و امتحان کو کہتے ہیں کہ اس سے نکھار ہوتا ہے اور حق و باطل والے ممتاز ہوجاتے ہیں، پہلی امتوں پر کبائر معاصی اور شرک وکفر کی وجہ سے عذاب الٰہی آجاتے تھے لیکن اس امت کو حضور علیہ السلام کی برکت سے عام عذاب سے محفوظ کردیا گیا اور موقع دیا گیا کہ وہ کبائر معاصی وشرک وغیرہ سے باز آئیں تو اس امت میں فتنے، کثرت سے ہوں گے، جن سے اہل حق و باطل کو الگ الگ کیا جائے گا اور شریعت حقہ کی روشنی میں حق کی طرف لوٹنے کی مہلتیں ملتی رہیں گی، یہاں تک کہ خود حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں بہت سے منافق تھے جو ظاہر میں مسلمان تھے اور نماز بھی سب کے ساتھ پڑھتے تھے، مگر اندر سے کافر تھے اور ان سے ابتداء اسلام کے دور میں بڑے بڑے نقصانات بھی پہنچے، مگر نہ ان پر عذاب آیا کہ یک دم ختم کردیئے جاتے نہ کوئی دوسری عام مصیبت بیماری وغیرہ اور حضور علیہ السلام ان کو جانتے بھی تھے، بلکہ صحابہ مثلاً حضرت حذیفہؓ کو آپ نے بتلا بھی دیا تھا اور وہ صاحب السر کہے جاتے تھے، جو اس حدیث الباب کے راوی بھی ہیں، اور بڑے بڑے صحابہ خدا کے خوف اور غایت ورع کی وجہ سے ان سے دریافت بھی کرلیا کرتے تھے کہ خدانخواستہ میں تو منافق نہیں ہوں۔

یہاں حضرت عمرؓ نے ان ہی صاحب السر النبویؐ سے فتنہ کا کچھ حال دریافت کیا ہے، اور پہلے آپ نے ایک عام فتنہ کا حال بیان کیا جو تقریباً ہر گھر میں ہر مسلمان مرد وعورت کو آپسی نزاعات اور دوسری خواہشات نفسانی کے تحت ایک دوسرے کی حق تلفی ایذا، یا اداء حقوق میں کوتاہی وغیرہ کی شکل میں پیش آیا کرتا ہے جس کی طرف آیت قرآنی **انما اموالکم و اولادکم فتنة**، سے بھی اشارہ کیا گیا ہے، کہ تمہاری آزمائش اموال واولاد کے ذریعہ ہوگی۔

کفارہ کی حقیقت: حضرت حذیفہ نے فرمایا کہ اہل واولاد کے فتنوں میں جو کوتاہیاں شرعی نقطہ نظر سے سرزد ہوجاتی ہیں ان کی معافی تو حق تعالیٰ نماز، روزہ اور صدقہ وغیرہ کے ذریعہ فرماتے رہتے ہیں تاکہ مومن کے چھوٹے گناہ طاعات یومیہ کی برکت سے ہی ختم

ہوتے رہیں اور وہ گناہوں کے بوجھ سے زیادہ زیربار نہ ہوجائے، اسی لئے علماء اسلام نے احادیث وآثار کی روشنی میں یہ تفصیل بھی کی ہے کہ بہت چھوٹے گناہ تو وضو میں ہی ڈھل جاتے ہیں، ان سے بڑے مسجد کی طرف جانے کی برکت سے ختم ہوجاتے ہیں، پھر ان سے بھی بڑے نماز سے اگر وہ رعایت احکام اور خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھی جائے اور ان سے بھی بڑے ہوں تو روزہ سے اور ان سے بھی بڑے ہوں تو حج وجہاد سے حتیٰ کے بعض احادیث میں یہ بھی وارد ہے کے حج مبرور کے ذریعہ حقوق العباد بھی ختم کردیئے جاتے ہیں، بشرطیکہ ان کی ادائیگی سے عاجز ہوگیا ہو اور توبہ بھی کرے، مثلاً حدیث ابن ماجہ وبیہقی میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے عرفہ کی شام میں دعا فرمائی اپنی امت کی مغفرت کے لئے، وہاں اس وقت وہ دعا مظالم وحقوق العباد کے علاوہ سب معاصی کے بارے میں قبول ہوگئی، آپ نے عرض کیا کہ بارالٰہا! آپ چاہیں تو مظلوم کو جنت کے ذریعہ خوش کرکے اور اس کے حقوق سے دستبردار کراکر ظالم کی مغفرت فرماسکتے ہیں، ایسی رحمت کی نظر ہوجائے! مگر دعا کا یہ جزو اس وقت قبول نہ ہوا، آپ نے مزدلفہ کی صبح کو پھر یہی دعا فرمائی اور وہاں حق تعالیٰ نے اس کو کامل ومکمل طور سے قبولیت سے نوازدیا، جس پر رحمت عالم علیہ السلام کو ہنسی آگئی، حضرت ابوبکر وعمرؓ نے سوال کیا کہ حضرت! اس وقت جناب والا کی ہنسی کی کوئی خاص وجہ ہے؟ فرمایا کہ ابھی جبکہ میری دعا کو حق تعالیٰ نے قبول فرمایا تو ابلیس کو بڑی مایوسی ہوئی وہ بے تاب ہوکر اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا اور بری طرح واویلا کرنے لگا، اس کے جزع فزع کی عجیب حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی (مشکوٰۃ ص ۲۳۹)

علامہ محدث شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لمعات شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث پر لکھا کہ "امت سے مراد نعمت حج سے سرفراز ہونے والے ہیں جو وادی عرفات ومزدلفہ کی حاضری سے مشرف ہوتے ہیں اور اس حدیث کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ حج سے حقوق العباد کا بھی کفارہ ہوجاتا ہے، تاہم بعض علماء نے یہ قید لگائی ہے کہ ان سے مراد وہ حقوق ہیں جن کو ادا کرنے سے عاجز ہو اور توبہ بھی کرے"۔

عاجز مؤلف عرض کرتا ہے کہ اکثر اکابر امت کی رائے یہی ہے کہ کبائر وحقوق العباد کی مغفرت توبہ اور اداء حقوق پر موقوف ہے اور حتمی طور سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بغیر توبہ وادائیگی حقوق کے عذاب سے نجات ہوسکتی ہے، برخلاف مرجۂ فرقہ کے کہ ان کے نزدیک کبائر وحقوق کا کفارہ یا ازالہ بھی عبادت سے ہوجاتا ہے۔

حافظؒ نے لکھا کہ مرجۂ نے اس باب کی دونوں حدیثوں کے ظاہر سے یہ استدلال کیا ہے کہ افعال خیر کبائر وصغائر سب معاصی کے لئے کفارہ ہوجاتے ہیں، لیکن جمہور اہل سنت کی رائے ہے کہ ان سے صرف صغائر محو ہوتے ہیں، کیونکہ یہاں اگرچہ احادیث میں اطلاق وعموم ہے مگر دوسری احادیث سے قید معلوم ہوتی ہے، مثلاً حدیث مسلم میں ہے کہ پانچ نمازیں ان کے درمیانی گناہوں کے لئے کفارہ بن جاتی ہیں اگر کبائر سے اجتناب کیا جائے وغیرہ مفصل تحقیق کے لئے دیکھیں فتح الباری ص ۸ ج ۲ وعمدہ وغیرہ۔

مرجۂ کے مقابلہ میں جمہور اہل سنت کی رائے اور اصول یقیناً راجح ہے لیکن ان احادیث صحیحہ کو بھی ضرور سامنے رکھنا ہے جن میں صراحت کے ساتھ بعض عبادات وطاعات کی فضیلت خاصہ بیان ہوئی ہے، مثلاً حج مبرور کے لئے مذکورہ بالا حدیث ابن ماجہ وبیہقی، یا جہاد کی احادیث فضیلت خاصہ، یا حدیث معراج بروایت مسلم شریف کی یہ صراحت کہ ان مبارک ساعات میں حضور علیہ السلام کو پانچ نمازیں، خواتیم سورہ بقرہ اور ہر امتی کے لئے مقحمات کی مغفرت عطا ہوئی بشرطیکہ وہ شرک کی ہر ہر چیز سے مجتنب رہے، مقحمات کی تفسیر تباہ وہلاک کردینے والے معاصی وذنوب سے کی گئی ہے جو کبائر ہیں اور دوسری حدیث معراج میں فیم یختصم الملاء الاعلیٰ کے تحت بھی کفارات کا ذکر آیا ہے، یعنی وہ اعمال جن کی وجہ سے گناہ بغیر توبہ کے معاف ہوجاتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اس موقع پر شاہ صاحبؒ نے صوم کے کفارہ ہونے کے سلسلہ میں نہایت اہم تحقیق ارشاد فرمائی جس کو ہم کتاب الصوم میں ذکر کریں گے۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔

باب فضل الصلٰوة لوقتها

(نمازاس کے وقت پر پڑھنے کی فضیلت کا بیان)

۴۹۹. حدثنا ابو الوليدهشام بن عبدالملک قال حدثنا شعبة قال الوليد ابن العيزار اخبرنی قال سمعت ابا عمرون الشيبانی يقول حدثنا صاحب هذه الدار واشار الیٰ دار عبدالله قال سالت النبی ﷺ ای العمل احب الی الله قال الصلٰوة علیٰ وقتهاقال ثم ای قال ثم بر الو الدين قال ثم ای قال الجهاد فی سبيل الله قال حد ثنی بهن ولوا ستزدته لزادنی

ترجمہ ۴۹۹: حضرت ابوعمروشیبانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم سے اس گھر کے مالک نے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اللہ کے نزدیک کون ساعمل زیادہ محبوب ہے؟ آپ نے فرمایا اپنے وقت پر نماز پڑھنا، ابن مسعودؓ نے کہا کہ اس کے بعد کون؟ آپ نے فرمایا اس کے بعد والدین کی اطاعت کرنا ابن مسعود نے کہا اس کے بعد کون؟ آپ نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا، ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آپ نے مجھ سے اسی قدر بیان فرمایا اور اگر میں آپ سے زیادہ پوچھتا تو (امید تھی کہ) آپ زیادہ بیان فرماتے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:-''اس ترجمۃ الباب سے امام بخاریؒ کا مقصد نماز جلد پڑھنا یا اول وقت میں پڑھنا نہیں ہے کیونکہ نماز وقت پر پڑھنے میں توسع ہے، لہٰذا مقصد یہ ہے کہ وقت کے اندر پڑھ لی جائے، قضانہ کردی جائے اسی کو حافظؒ نے بھی واضح کیا ہے'' حافظ نے لکھا:-امام بخاریؒ نے یہاں ترجمہ لوقتہا سے قائم کیا اور حدیث لائے علی وقتہا والی، لیکن کتاب التوحید ص ۱۱۲۴ میں حدیث لوقتہا والی ذکر کریں گے (بخاری کتاب الجہاد ص ۳۹۰ اور کتاب الادب ۸۸۶ میں علی میقاتہا اور علی وقتہا مروی ہے)

حافظؒ نے یہ بھی لکھا کہ بعض روایات میں جو فی اول وقتہا آیا ہے وہ ضعیف وساقط ہے اور بہت سے راویوں نے دونوں کا معنی ایک سمجھ کر بھی اس طرح روایت کی ہے اور بعض نے لدلوک الشمس کی طرح لوقتہا میں لام کو ابتداء کے لئے سمجھ لیا ہے مگر یہ سب کمزور باتیں ہیں (فتح الباری ص ۷ ج ۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے درس ترمذی شریف میں باب ماجاء فی الوقت الاول من الفضل من حديث الصلٰوة لا ول وقتهـــا پر فرمایا کہ امام احمد، بیہقی، نووی اور حافظ ابن حجر وغیرہم نے اس حدیث کی تمام سندوں کو ضعیف قرار دیا ہے اور ایسی ہی ''اول الوقت رضوان اللہ'' والی سب احادیث ضعیف ہیں، تفصیل زیلعی وتلخیص میں ہے اور فرمایا کہ شافعیہ کے نزدیک اول وقت میں نماز مستحب ہے، البتہ نماز عشا کی تاخیر اکثر متبعین امام شافعی کے یہاں مستحب ہے، حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی جن اوقات میں نماز کی عادت مبارکہ تھی وہی اوقات مستحب ہیں، مثلاً تعجیل مغرب تاخیر عشاوغیرہ۔

احادیث بخاری ومسلم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نمازیں اپنے اوقات کے اندر پڑھی جائیں اور اوقات نبویہ کی احادیث سے استحباب ثابت ہوتا ہے البتہ ایک حدیث صحیح مستدرک حاکم سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام نے آخر وقت تک کبھی کسی نماز کو آخر وقت میں نہیں پڑھا تو آخر وقت میں حنفیہ بھی نمازوں کو مستحب نہیں کہتے، بلکہ نماز ظہر عصر وفجر میں جو حنفیہ فی الجملہ تاخیر کے قائل ہیں وہ بھی احادیث صحیحہ منصوصہ کے سبب ہے اور عصر کی زیادہ تاخیر کو مکروہ تنزیہی وتحریمی تک کہتے ہیں۔ (معارف السنن ص ۸۴ ج ۲)

فائدہ علمیہ: حضرتؒ نے فرمایا کہ حافظ نے یہاں لفظ ''الصلٰوة اول وقتها'' کو باوجود اس کے راوی کے ثقہ ہونے کے ساقط کردیا ہے کیونکہ وہ اکثر الفاظ مرویہ کے مخالف ہے حالانکہ مشہور یوں ہے کہ زیادتی ثقہ معتبر ہوتی ہے، میں کہتا ہوں کہ زیادتی ثقہ کو ایک

جماعت نے تو بالاطلاق معتبر کہا ہے، دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ بحث وتنقیح کے بعد قبول کی جائے گی، اگر اس کا کسی مقام میں صحیح ہونا محقق ہو جائے تو قبول کرلیں گے ورنہ نہیں لہٰذا حکم کل نہیں ہے کہیں مقبول ہوگی اور کہیں نہیں، میرے نزدیک یہی دوسری رائے حق ہے اور اسی کو امام احمد، ابن معین وامام بخاری وغیرہ ماذقین علماء اصول الحدیث نے اختیار کیا ہے، کما ذکرہ الزیلعی فی بحث آمین

لیکن حضرت الاستاذ مولانا شیخ الہندؒ بالاطلاق قبول کرتے تھے، میری ایک بار گفتگو ہوئی تو مولانا خفا ہو گئے، اس کے بعد میں نے نہیں پوچھا، کیونکہ میرے نزدیک یہ قبول بالاطلاق غلط کے قریب ہے اور قاعدہ کلیہ کوئی بھی نہیں ہے، یہاں حافظؒ نے بھی زیادتی ثقہ کو ساقط کردیا ہے۔

باب الصلوة الخمس كفارة للخطايا اذا صلا هن لوقتهن فى الجماعة وغيرها

(جب کہ پانچوں نمازوں کو ان کے وقت میں جماعت سے یا تنہا پڑھے، تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں)

۵۰۰. حدثنی ابراهيم بن حمزة قال حدثنا ابن ابی حازم والدراوردی عن يزيد بن عبدالله عن محمد بن ابراهيم عن ابی سلمة بن عبدالرحمن عن ابی هريرة انه سمع رسول الله ﷺ يقول ارايتم لو ان نهراً بباب احدكم يغتسل فيه كل يوم خمسا ما تقول ذالک يبقى من دربه قالوا لا يبقى من درنه شيئاً قال فذالک مثل الصلوات الخمس يمحو الله بها الخطايا.

ترجمہ ۵۰۰: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر کسی کے دروازہ پر کوئی نہر جاری ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ نہاتا ہو تو تم کیا کہتے ہو کہ یہ (نہانا) اس کے میل کو باقی رکھے گا، صحابہ نے عرض کیا کہ اس کے جسم پر بالکل بھی میل نہ رہے گا، آپ نے فرمایا کہ پانچوں نمازوں کی بھی یہی مثال ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے گناہوں کو مٹاتا ہے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر امام بخاری وغیرہا کا لفظ نہ لاتے تو اچھا تھا، کیونکہ اس سے نماز جماعت میں توسع نکلتی ہے یعنی تاکید جماعت کا حکم کمزور پڑتا ہے، یا ممکن ہے کہ جماعت کے مسئلہ میں ان کا مسلک امام شافعیؒ والا ہو، عاجز مؤلف عرض کرتا ہے کہ یہاں حدیث الباب میں بھی جماعت کی قید نہیں ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ عفو صغائر کی فضیلت تو مطلق نماز ہی کے لئے ہے اور جماعت کی نماز کے ذریعہ ان سے بڑے گناہوں کی معافی ہوتی رہے گی اور تاکید جماعت کے لئے بھی دوسری احادیث ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

افادۂ انور: حضرتؒ کے خصوصی ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ فضائل اعمال کے سلسلہ میں وضو، نماز، روزہ وغیرہ کے کفارہ ذنوب ہونے کا ثبوت احادیث کثیرہ صحیحہ سے ہو چکا ہے، سلف کا طریقہ تفویض کا تھا کہ حق تعالیٰ کی مشیت پر ہے، جن اعمال کو چاہے جن سیئات کے لئے کفارہ بنادے، پھر متاخرین نے تمام ہی احادیث ماثورہ کو مغفرت صغائر کے ساتھ مقید کر دیا اور کبائر کو مستثنیٰ قرار دیا، میری رائے یہ ہے کہ جہاں قید وارد ہوئی ہے، وہاں مقید کریں گے، باقی کو اطلاق پر رکھیں گے، اور الفاظ حدیث کو بھی سامنے رکھیں گے، کیونکہ ذنوب، خطایا معاصی وغیرہ الفاظ مترادف نہیں ہیں، ان کے معانی میں بھی فروق ہیں۔ (العرف الشذی ص ۱۰۵ و معارف السنن ص ۲۵۹ ج ۲)

راقم الحروف نے جیسا کہ پہلے اشارہ کیا، حضرتؒ کے ارشادات خصوصی کی روشنی میں بھی حج و جہاد وغیرہ اعمال کے کفارہ ذنوب و معاصی وحقوق العباد ہونے پر پھر سے غور وفکر کی گنجائش ہے، اور سب کے لئے ایک ہی فیصلہ کافی نہیں ہے کیونکہ جہاں اطلاق ہے وہاں اطلاق ہی رہنا چاہئے اور جہاں مثلاً حقوق ومظالم تک کے لئے کفارہ ہو جانے کا ذکر احادیث صحیحہ میں آچکا ہے وہاں کے لئے تحقیق اور فیصلہ کا رخ دوسری طرح ہونا چاہئے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مالم يغش الكبائر: پانچ نمازوں کے درمیان اور جمعوں کے مابین جو گناہوں کے کفارہ ہونے کی حدیث ترمذی وغیرہ میں ہے،

اوراس میں یہ قید بھی ہے کہ اگر تمام شرعی رعایتوں کے ساتھ ان نمازوں کوادا کرتا رہے گا تو جب تک کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کرے، اس کے سارے گناہ ختم ہوتے رہیں گے اور ایسا ہمیشہ ہی ہوتا رہے گا، اس میں اگر یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ ہر نماز کے وقت مومن کی شان یہ ہے کہ سارے ہی کبیرہ وصغیرہ گناہوں سے نادم وتائب ہو اور مغفرت طلب کرے تو ان لوازم کے ساتھ نماز کی ادائیگی سے بین الصلاتین کے سارے ہی معاصی محو ہوتے رہنے کی بات درست ہوجاتی ہے۔

باب فی تصییع الصلوة عن وقتها

(نماز کے بے وقت پڑھنے کا بیان)

۵۰۱. حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل قال حدثنا مهدی عن غیلان عن انسؓ قال حدثنا مهدی عن غیلان عن انسؓ قال مآاعرف شیئا مما کان علےٰ عهد النبیﷺ قیل الصلوٰة قال الیس صنعتم ما صنعتم فیها.

۵۰۲. حدثنا عمر بن زرارة قال اخبرنا عبدالواحد بن واصل ابو عبیدة الحداد عن عثمان بن ابی رواد اخی عبدالعزیز قال سمعت الزهری یقول دخلت علیٰ انس بن مالک بدمشق وهو یبکی فقلت ما یبکیک فقال لا اعرف شیئاً مما ادرکت الا هذه الصلوٰة وهذه الصلوة قد ضیعت وقال بکر بن خلف حدثنا محمد بن بکر البر سانی قال اخبر نا عثمان بن ابی رواد نحوه.

ترجمہ۵۰۱: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ جو باتیں نبی کریم ﷺ کے زمانے میں تھیں ان میں سے اب کوئی بات نہیں پاتا، کسی نے کہا کہ نماز تو (ویسے ہی) باقی ہے، حضرت انسؓ نے کہا کہ (یہ تمہارا خیال ہے) کیا نماز میں جو کچھ تم نے کیا ہے وہ تم کو معلوم نہیں (کہ اس کے اوقات میں تم کس قدر بے پروائی کرتے ہو)

ترجمہ۵۰۲: حضرت زہری روایت کرتے ہیں کہ میں دمشق میں انس بن مالک کے پاس گیا وہ رورہے تھے میں نے کہا (خیر ہے) آپ کیوں رورہے ہیں فرمایا کہ جو باتیں میں نے رسول خدا کے زمانہ میں دیکھی ہیں، اب ان میں سے کوئی بات نہیں پاتا، صرف ایک نماز ہے (لیکن اگر دیکھا جائے) تو وہ ضائع ہوچکی ہے اور بکر بن خلف نے کہا کہ مجھ سے محمد بن بکر برسانی نے بیان کیا کہ مجھ سے عثمان بن ابی داؤد نے اسی طرح بیان کیا۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ نے دمشق جا کر حجاج کی تاخیر نماز والی بات کی شکایت ولید بن عبدالملک سے بھی کی تھی جو اس وقت خلیفہ تھے، مگر اس نے بھی کوئی تدارک نہ کیا تاہم حضرت انسؓ نے صبر کیا، کیونکہ صحابۂ کرام کی شان یہی تھی کہ آپس میں رحیم وشفیق تھے اور کفار کے مقابلہ میں شدید وجری تھے، ارشاد باری ہے **"اذلة علےٰ المؤمنین اعزة علی الکافرین"** اسی لئے قیصر وکسریٰ کی قوتوں کو پامال کیا اور جب مسلمانوں ہی کی طرف سے اذیتیں اٹھانی پڑیں تو صبر کیا۔

باب المصلی یناجی ربه

(نماز پڑھنے والا اپنے پرودگار سے سرگوشی کرتا ہے)

۵۰۳. حدثنا مسلم بن ابراهیم قال حدثنا هشام عن قتادة عن انس قال قال النبی ﷺ ان احدکم اذا صلی یناجی ربه فلا یتفلن عن یمینه ولکن تحت قدمه الیسریٰ.

۵۰۴. حدثنا حفص بن عمر قال حدثنا یزید بن ابراهیم قال حدثنا قتادة عن انس عن النبی ﷺ انه قال اعتدلو فی السجود ولا یبسط احدکم ذراعیه کالکلب واذا بزق فلا یبزقن بین یدیه ولا عن یمینه فانه یناجی ربه وقال سعید عن قتادة لا یتفل قدامه او بین یدیه ولکن عن یساره او تحت قدمه وقال شعبة لا یبزق بین یدیه ولا عن یمینه ولکن عن یساره اوتحت قدمه وقال حمید عن انس عن النبی ﷺ لا یبزق فی القلبة ولا عن یمینه ولکن عن یساره او تحت قدمه.

ترجمہ۵۰۳: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے اس وقت وہ اپنے پرودگار سے مناجات کرتا ہے، اسے چاہئے کہ اپنے داہنی جانب نہ تھوکے، بلکہ اپنے بائیں قدم کے نیچے تھوکے۔

ترجمہ۵۰۴: حضرت انسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ سجدوں میں اعتدال کرواورتم سے کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ کتے کی طرح نہ بچھادے اور جب تھوکے تو نہ اپنے آگے تھوکے اور نہ اپنے دائیں جانب، اس لئے کہ وہ اپنے پروردگار سے مناجات کرتا ہے اور سعید نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ اپنے آگے یا اپنے سامنے نہ تھوکے، بلکہ اپنی بائیں جانب یا اپنے قدم کے نیچے، اور شعبہ نے کہا ہے کہ نہ اپنے سامنے تھوکے اور نہ اپنی داہنی جانب لیکن اپنی بائیں جانب یا قدم کے نیچے اور حمید نے انسؓ سے انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے روایت کی ہے کہ قبلہ (کی جانب) میں نہ تھوکے اور نہ اپنے داہنی جانب، بلکہ اپنے بائیں جانب یا اپنے قدم کے نیچے تھوکے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- شافعیہ اگر کہیں کہ مناجاۃ کے لئے موزوں یہ ہے کہ فاتحہ پڑھی جائے، استماع اور خاموشی مناسب نہیں تو جواب یہ ہے کہ یہاں تنہا کی نماز کا بیان ہے کیونکہ ان احدکم اذا صلے فرمایا ہے اور اس میں بھی فاتحہ پڑھتے ہیں، دوسرے یہ کہ نماز جماعت بھی شریعت میں واحدہ بالعدد ہے، لہٰذا امام پڑے گا تو وہ سب ہی کی طرف سے ہے، تیسرے یہ کہ نماز جماعت میں ہر شخص کے لئے مناجاۃ مان لیں تو وہ بھی صرف سری نماز میں درست ہوسکتی ہے، کیونکہ جہری نماز میں تو وہ منازعت بن جائے گی اور حکم انصاف واستماع کے بھی خلاف ہوگی باقی سری نماز میں گنجائش ہے اور اس کا معاملہ اہون ہے کیونکہ مجھے امام صاحب سے کوئی نقل نہیں ملی جس سے ثابت ہو کہ سری میں قرأت ان کے نزدیک ناجائز ہے، ان سے صرف عدم قراءت مروی ہے اور محقق میرے نزدیک یہ ہے کہ جہریہ میں امام صاحب کے نزدیک ناجائز ہے، اور سریہ میں ناپسندیدہ ہے (پوری بحث اپنے موقع پر آئے گی، ان شاء اللہ)

سمت قبلہ کی طرف تھوکنے کے مسائل وتفصیل پہلے گذر چکی ہے اور داہنی طرف کی ممانعت فرشتے کی وجہ سے بھی ہے اور مناجات خداوندی کے لحاظ سے بھی بے محل ہے، اور بائیں طرف یا قدم کے نیچے کی اجازت بھی بوجہ ضرورت ومجبوری ہے، حضرتؒ نے یہ توجیہ بھی فرمائی ہے کہ نمازی کو بحالت نماز سب سے اچھی حالت وہیئت میں ہونا چاہئے، اس لئے اقعاء الکلب، افتراش ثعلب، بروک الجمل اور خفض راس کالحمار وغیرہ کی بھی ممانعت کی گئی ہے، اس طرح تھوکنے، سنکنے، بے ضرورت کھانسنے، کھنکارنے سے بھی روک دیا گیا ہے، غرض نماز میں ہر لحاظ سے سکون، شائستگی، ادب، خشوع وخضوع، حسن لباس وہیئت وغیرہ مطلوب ہیں۔

باب الابراد بالظهر فی شدة الحر

(گرمی کی شدت میں ظہر کو ٹھنڈا وقت کر کے پڑھنے کا بیان)

۵۰۵. حدثنا ایوب بن سلیمان قال حدثنا ابو بکر عن سلیمان قال صالح بن کیسان حدثنا الاعرج عبدالرحمن وغیرہ عن ابی ہریرة و نافع مولیٰ عبدالله بن عمر عن عبدالله بن عمر انهما حدثاه عن رسول الله ﷺ انه قال اذا اشتد الحر فابردو بالصلوٰة فان شدة الحرمین فیح جهنم.

۵۰۶. حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا غندر حدثنا شعبة عن المهاجر ابی الحسن سمع زید بن وهب عن ابی ذر قال اذن موذن النبی ﷺ الظهر فقال ابرد ابرد او قال انتظر انتظر وقال شدة الحرمن فیح جهنم فاذا اشتد الحر فابردوا عن الصلوٰة حتی راینا فی التلول.

۵۰۷. حدثنا علی بن عبدالله المدینی قال حدثنا سفیان قال حفظناه من الزهری عن سعید بن المسیب عن ابی هریرة عن النبی ﷺ انه قال اذا اشتد الحر فابردوا بالصلوٰة فان شدة الحرمین فیح جهنم واشتکت النار الی ربها فقالت یا رب اکل بعضی بعضا فاذن لها بنفسین نفس فی الشتاء و نفس فی الصیف وهو اشد ما تجدون من الحر وهو اشد ما تجدون من الزمهر.

۵۰۸. حدثنا عمر بن حفص قال حدثنا اولی قال حدثنا الاعمش قال حدثنا ابو صالح عن ابی سعید قال قال رسول الله ﷺ ابردو بالظهر فان شدة الحرمین فیح جهنم تابعه سفیان ویحییٰ و ابو عوانة عن الاعمش.

ترجمہ ۵۰۵: اعرج عبدالرحمٰن وغیرہ نے ابو ہریرہؓ سے اور عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام نافع نے عبداللہ بن عمرؓ سے اور دونوں (ابو ہریرہ اور ابن عمرؓ) نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا جب گرمی زیادہ ہو جائے تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو، اس لئے کہ گرمی کی شدت جہنم کے جوش سے ہوتی ہے۔

ترجمہ ۵۰۶: حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ گرمی میں) نبی کریم ﷺ کے مؤذن (بلال) نے ظہر کی اذان دینی چاہی تو آپ نے فرمایا کہ ہو جانے دو، ٹھنڈ ہو جانے دو یا یہ فرمایا کہ ٹھہر جاؤ، ٹھہر جاؤ، پھر فرمایا کہ گرمی کی شدت جہنم کے جوش سے ہوتی ہے لہٰذا جب گرمی کی شدت ہو تو نماز کو ٹھنڈ میں پڑھا کرو، اس وقت تک ٹھہرو کے ٹیلوں کا سایہ نظر آنے لگے۔

ترجمہ ۵۰۷: حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جب گرمی زیادہ بڑھ جائے تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھا کرو، اس لئے کہ گرمی کی شدت جہنم کے جوش سے (ہوتی) ہے اور آگ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی، عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میرے ایک حصہ نے دوسرے حصہ کو کھا لیا ہے، اللہ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دی، ایک سانس کی جاڑوں میں اور ایک سانس کی گرمی میں اور وہی سخت گرمی ہے جس کو تم محسوس کرتے ہو، اور سخت سردی ہے جو تم کو معلوم ہوتی ہے۔

ترجمہ ۵۰۸: حضرت ابو سعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:- ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھو، اس لئے کے گرمی کی شدت جہنم کے جوش سے ہوتی ہے۔

تشریح: امام بخاریؒ نے اوقات ظہر بیان کرتے ہوئے، سب سے پہلے ابراد کی حدیث ذکر فرمائی اگلے باب میں سفر کی حالت میں

بھی ابراد کی حدیث لائے، پھر اگلے باب میں وقت ظہر بتلایا اور چوتھے باب میں تاخیر ظہر کا ذکر کیا ہے اس کے بعد کتاب الاذان میں باب الاستہام فی الاذان حدیث ص ۵۸۵ لائیں گے جس میں ضمناً آیا ہے کہ نمازوں کو وقت کے اندر عجلت کے ساتھ ادا کرلینا چاہئے اور اسی حدیث کو باب فضل التہجیر میں نمبر ۶۲۰ پر لائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ نے بھی حنفیہ کے موافق ابراد کو ترجیح دی ہے، جس طرح امام ترمذی نے باوجود شافعی المسلک ہونے کے ابراد کو اختیار کیا اور حدیث ابراد فی السفر کی وجہ سے مسلک شافعیہ کو مرجوع قرار دیا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

علامہ عینی نے لکھا کہ باب فضل التہجیر کو ابراد کے خلاف نہ سمجھا جائے کیونکہ علامہ ہروی نے اس سے مراد سب نمازوں میں عجلت کرنے کی فضیلت لی ہے اور اس عام حکم کو حضور علیہ السلام کے ارشاد ابراد و اسفار کی وجہ سے خاص کرنا پڑے گا ورنہ وہ ارشادات متروک العمل ہونگے، اور اگر تہجیر ظہر کی مراد لی جائے تو لفظ ہاجرہ کا اطلاق پورے وقت ظہر تا قریب عصر پر ہوتا ہے۔ (عمدہ ص ۶۴۴ ج ۲)

یہ بھی ملحوظ رہے کہ موطأ امام مالکؒ ابواب مواقیت میں ایک باب **نهى عن الصلوٰة فى الهاجره** بھی ہے، جس سے ہاجرہ اور گرمی کے وقت میں ممانعت نماز والی بھی بخاری کی حدیث الباب روایت کی گئی ہے (اوجز ص ۳۰ ج ۱)

ابراد جمعہ: یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ نماز جمعہ کے لئے بھی ابراد کا حکم ہے یا نہیں، اس میں اختلاف ہے، علامہ عینیؒ نے تو یہ اختیار کیا کہ ابراد صرف نماز ظہر کے لئے ہے، جمعہ کے واسطے نہیں، لیکن صاحب البحر الرائق نے فرمایا کہ جمعہ کے لئے بھی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کی عادت مبارکہ جمعہ کے لئے عدم ابراد کی تھی (العرف الشذی ص ۲۳۰)

المغنی لابن قدامہ ص ۱۴۴ ج ۲ میں ہے کہ استحباب جمعہ کے لئے بعد زوال کے شدت گرمی وغیرہ کا کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ لوگ جمعہ کے لئے جمع ہوں گے، اگر ابراد کا انتظار کیا جائے تو وہ ان پر شاق ہوگا۔ (معارف السنن ص ۳۵۸ ج ۴)

حافظؒ نے لکھا: -ظہر کے لئے حکم ابراد سے ابراد جمعہ کے لئے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے اور بعض شافعیہ اس کے قائل بھی ہوئے ہیں اور امام بخاری کے طریقہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو انہوں نے باب **اذا اشتد الحر يوم الجمعه** میں اختیار کیا ہے، وہاں حدیث اذا اشتد الحر بکر بالصلوٰۃ کے آگے یعنی الجمعۃ کا اضافہ کیا ہے اس پر علامہ زین بن المنیر نے بھی فرمایا کہ امام بخاری کا رجحان ابراد جمعہ کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ (ص ۱۳ او ص ۲۶۴ ج ۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بعض شافعیہ بھی ابراد جمعہ کے قائل ہوئے ہیں، جبکہ جمہور حنفیہ وغیرہم بھی جمعہ کو ابراد سے مستثنیٰ کررہے ہیں، پھر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ بعض شافعیہ صرف جمعہ کے لئے ہی ابراد کے قائل ہوئے ہیں، یا ظہر کے بھی، بظاہر تو یہی ہے کہ امام بخاری کی طرح وہ بھی ابراد ظہر و جمعہ دونوں کے قائل ہوں گے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابراد کا مسئلہ احادیث و آثار کی روشنی میں بہت قوی ہے جس طرح اسفار فجر کا مسئلہ بھی اسی لحاظ سے نہایت قوی ہے، اس کو ہم آگے بیان کریں گے۔

یہاں سے یہ بات بھی روشنی میں آجاتی ہے کہ بہت سے مسائل جو مذاہب اربعہ کے اختلاف کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا دیا گیا ہے وہ حقیقت سے بہت دور ہے اور بقول علامہ کوثریؒ کے چاروں مذاہب کی حیثیت اور صحیح ترین پوزیشن ایک ہی کنبہ وقبیلہ کے افراد کی ہے اور تقریباً تین چوتھائی مسائل میں تو بالکلیہ اتفاق ہے، باقی میں زیادہ تر معمولی اختلافات ہیں۔

البتہ اہل ظاہر اور غیر مقلدین کے ساتھ مذہب فقہیہ کا اختلاف نہ صرف فروعی مسائل میں ہے بلکہ اصول وعقائد کے اندر بھی ہے چونکہ عام طور سے اہل علم بھی متنبہ نہیں ہیں اس لئے اس کو ہم بہ تکرار کہتے ہیں۔ واللہ الموفق

شدت حر کے اسباب

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا:۔حکم ابراد ظہر کی علت بتلائی گئی ہے کہ ٹھیک دو پہر کے موسم گرما میں جہنم کی حدت وگرمی کا اثر سورج کے اندر نمایاں ہوتا ہے جس سے دھوپ میں بھی شدت وحرارت بڑھ جاتی ہے، پھر اس سے نماز پڑھنے والوں کی تکلیف ومشقت کا لحاظ کیا گیا ہے، یا جہنم کی حرارات کے اثرات سورج میں آ جانے کو حق تعالیٰ کے غضب وغصہ کی علامت سمجھ کر نماز کو موخر کیا گیا ہے تا کہ رأفت ورحمت کا وقت آ جائے، جس کی علامت ابراد ہے اور یہ ایسا ہے کہ جس طرح حدیث شفاعۃ روز قیامت میں وارد ہے کہ سارے انبیاء علیہم السلام شفاعت کرنے سے معذرت کریں گے اپنی لغزشوں کی وجہ سے اور حق تعالیٰ کے غیر معمولی غضب وغصہ کی وجہ سے بھی، مگر چونکہ وہاں نماز ظہر کی طرح مؤخر کرنے کی بات بھی نہ ہو سکے گی کہ تمام لوگ تاخیر حساب سے بھی سخت پریشان ہوں گے، اس لئے حضور اکرم ﷺ کی شان رأفت و رحمت اور آپ کے لئے حق تعالیٰ کے خصوصی فضل وانعام کے تحت اجازت شفاعت کام آئے گی اور آپ کی پہلی شفاعت پر حساب شروع ہو جائے گا، پھر دوسرے مراحل شفاعت بھی آگے آئیں گے۔

ایک وجہ شدت حر کے وقت کراہت صلوٰۃ کی یہ بھی علماء نے بیان کی ہے کہ اس وقت نماز میں خشوع وخضوع کا حصول بھی دشوار ہوتا ہے، یعنی اگر سخت گرمی وتپش کی تکلیف اٹھا کر نماز کی جگہ تک پہنچ بھی جائیں تو ادائیگی نماز کے وقت بھی دل کی یکسوئی اور مناجات کی برتری میسر نہ ہوگی، حافظؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ گرمی کی شدت کو جو جہنم کی لپٹوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے، یہ بات حقیقت پر بھی محمول ہو سکتی ہے، جیسا کہ جہنم کے شکوہ کرنے کی بات بھی حدیث سے ثابت ہے، اور مجاز تشبیہ پر بھی محمول کر سکتے ہیں کہ اس وقت کی سخت گرمی وتپش کو جہنم کی سی گرمی بتلایا گیا ہے، اسی طرح جہنم کی شکایت پر بھی علماء کے مختلف اقوال ہیں، علامہ ابن عبدالبر، قاضی عیاض، علامہ قرطبی، علامہ نووی، محقق طور بشتی اور علامہ زین بن المنیر نے حقیقت پر محمول کیا ہے اور علامہ بیضاویؒ نے مجازی معنی کو ترجیح دی ہے۔ (فتح الباری ص ۱۲ ج ۱)

افادۂ انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: یہاں ایک عقلی سوال ہے کہ شدۃ حرارت وضعف حرارت کا سبب تو سورج کا قرب وبعد ہے، اسی لئے مثلاً ہمارے ملک میں موسم گرما میں قرب شمسی کی وجہ سے گرمی اور موسم سرما میں بعد شمسی کی وجہ سے سردی ہوتی ہے اور جنوبی افریقہ میں مثلاً اس کا برعکس ہوتا ہے، یونانی فلاسفہ تو کہتے تھے کہ اجرام اثیریہ میں حرارت وبرودت کچھ بھی نہیں ہے، مگر جدید سائنس والے کہتے ہیں کہ تمام اجرام عالم سے زیادہ حرارت سورج میں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح اشیاء عالم کے ظاہری اسباب ہیں اسی طرح ان کے لئے باطنی اسباب بھی ہیں، شریعت ان ہی کو ذکر کرتی ہے اور ظاہری اسباب کی نفی نہیں کرتی، پس شریعت نے باطنی سبب بتلا دیا کہ سورج میں گرمی جہنم سے آتی ہے جو حرارت اور مہالک وشرور کا معدن ہے جو بات ہمیں ظاہر میں نظر نہیں آتی وہ بتلا دی ہے اور یہی جواب رعد وبرق ومطہر اور نہر جیحان وسیحان کے بارے میں بھی ہے، پھر علامہ عینی کے نزدیک مدار حرارت پر ہے اور یہی رائے اوفق بالحدیث ہے، صاحب بحر نے مدار موسم گرما پر رکھا ہے اسی طرح تبکیر جمعہ میں بھی دو قول ہیں۔

یہ بھی حدیث میں ہے کہ دو پہر کے وقت جہنم کو تایا جاتا ہے اور جمعہ کا دن اس سے مستثنیٰ ہے، یعنی ایسا حضرت رب کے غضب کے باعث ہے لہٰذا تاخیر ہونی چاہئے نماز کی تا کہ اس کے رحم کے وقت حاضر ہوں۔

امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ ظہر میں ابراد اس وقت ہے کہ کسی مسجد میں لوگ دور سے آ کر نماز پڑھتے ہوں، منفرد اور اس شخص کے لئے نہیں ہے جو قریب کی مسجد میں پڑھے، لیکن ترمذی باوجود شافعی ہونے کے اس تاویل کو ناپسند کرتے تھے، انہوں نے کہا کہ حنفیہ کی رائے زیادہ بہتر اور اتباع سنت پر مبنی ہے، کیونکہ حضرت ابوذرؓ کی حدیث بتلاتی ہے کہ حضور علیہ السلام صحابہ کرام کے ساتھ سفر میں تھے اور ایک جگہ تھے،

پھر بھی آپ نے حضرت بلال کو ابراد کا حکم فرمایا تھا۔

امام طحاویؒ کی رائے یہ ہے کہ پہلے ظہر میں تعجیل ہی تھی، پھر منسوخ ہوگئی، حدیث حضرت مغیرہؓ سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے، التلخیص الجبیر میں ہے کہ امام ترمذی نے امام بخاری سے حدیث مغیرہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے تصحیح کی، حضرت ابن مسعود و حضرت انسؓ سے بھی ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام موسم سرما میں تعجیل ظہر کرتے تھے اور موسم گرما میں ابراد فرماتے تھے۔

باب الابراد بالظهر فی السفر

(سفر میں ظہر کی نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کا بیان)

۵۰۹. حدثنا آدم قال حدثنا شعبة قال حدثنا مهاجر ابو الحسن مولی لبنی تیم الله قال سمعت زید بن وهب عن ابی ذر الغفاری قال کنا رسول الله ﷺ فی سفر فاراد المؤذن ان یؤذن للظهر فقال النبی ﷺ ابرد ثم اراد ان یؤذن فقال له ابرد حتی راینا فی التلول فقال النبی ﷺ ان شدة الحر من فیح جهنم فاذا اشتد الحر فا بردو بالصلوٰة وقال ابن عباس یتفیؤ یتمیل.

ترجمہ ۵۰۹: حضرت ابوذر غفاریؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول خدا کے ہمراہ کسی سفر میں تھے، موذن نے چاہا کہ ظہر کی اذان دے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ٹھنڈ ہو جانے دو، اس نے پھر چاہا کہ اذان دے تو آپ نے اس سے فرمایا کہ ٹھنڈ ہو جانے دو یہاں تک کہ ہم کو ٹیلوں کا سایہ نظر آنے لگا تب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ گرمی کی شدت جہنم کے جوش سے ہوتی ہے، لہٰذا جب گرمی کی شدت ہو تو (ظہر کی نماز) ٹھنڈ میں پڑھو اور ابن عباسؓ نے ''یتفیأ'' کی تفسیر ''یتمیل'' بیان کی یعنی ہٹ جائے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کتاب الاذان میں "**حتی ساوی فی التلول**" بھی لائیں گے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ظہر کا وقت دو مثل تک رہتا ہے، علامہ نووی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اس سے غیر معمولی تاخیر نکلتی ہے اور انہوں نے اس کو جمع سفر پر محمول کیا ہے حالانکہ حدیث میں کہیں بھی سفر کا ذکر نہیں ہے، اگرچہ میرے نزدیک مساواۃ فی التلول سے حنفیہ کو بھی استدلال نہ کرنا چاہئے کیونکہ بظاہر راوی کا ارادہ حقیقی مساواۃ کا نہ ہوگا اور نہ مثل و مثلین کا مسئلہ ثابت کرنا تھا، بلکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض علماء کے اشعار سے استدلال کر کے بعد جاہلوں نے حضور علیہ السلام کے لئے علم غیب کلی مان لیا ہے، حالانکہ ان اشعار میں بطور مبالغہ اوصاف کے بیان میں زیادتی ہوگئی ہے، ان علماء کا قصد تعیم علم نبوی کا نہ تھا، جاہلوں نے عقیدہ اور باب مدح میں فرق نہ کیا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ احقر نے مولوی احمد رضا خان صاحب کی بعض تصانیف میں دیکھا کہ انہوں نے حضور علیہ السلام کے لئے علم غیب کلی کی نفی کی ہے اور علم ذاتی کی بھی، بلکہ اپنے مخالفوں پر یہ طعن بھی کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا ذاتی علم غیب وکلی ہم بھی نہیں مانتے اور ہمارے مخالفین بھی اور ہم دونوں ہی علم جزئی کے قائل ہیں مگر فرق یہ ہے کہ وہ علم جزئی ایسا مانتے ہیں جس سے حضور علیہ السلام کی تحقیر ہوتی ہے اور ہم ایسا علم جزئی مانتے ہیں جس سے آپ کی تعظیم ہوتی ہے، اور حق یہ ہے کہ کچھ تعبیراتی مسامحتیں ہوگئیں ہیں" **والحق قد یعتریه سوء تعبیر**" ان سے احتراز کرنا چاہئے تھا وللتفصیل محل آخر ان شاء الله تعالیٰ۔

نکتہ دقیقہ علمیہ: حضرتؒ نے فرمایا کہ ابردوا بالظہر میں باصلہ کی ہے جو مفعول بہ پر داخل ہوئی ہے جس سے فعل میں تاکید و مبالغہ مفہوم ہوتا ہے جیسے اخذت باللجام اور وامسحوا برؤسکم میں ہے اور زمخشری نے آیت کریمہ **وهزی الیک بجذع النخلة** کے تحت بھی تفسیر اسی طرح کی ہے، یعنی اچھی طرح کھجور کی شاخوں کو ہلاؤ تاکہ کھجوریں اچھی طرح گریں، اسی طرح ترجمہ یہ ہوگا کہ سروں کا مسح اچھی طرح کرو

اور میں نے گھوڑے کا لگام اچھی طرح مضبوطی سے پکڑا، لہٰذا یہاں بھی ترجمہ یہ ہوگا کہ ظہر کی نماز کے لئے اچھی طرح ٹھنڈا وقت ہوجانے دو۔

باب الظهر عند الزوال وقال جابر كان النبى ﷺ يصلى بالهاجرة

(ظہر کا وقت زوال کے وقت ہے، جابر کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ دوپہر کو نماز پڑھتے تھے)

۵۱۰. حدثنا ابو اليمان قال حدثنا شعيب عن الهرى قال اخبرنى انس بن مالك ان رسول الله ﷺ خرج حين زاغت الشمس فصلى الظهر فقام على المنبر فذكر الساعة وذكر ان فيها امورا عظاما ثم قال من احب ان يسئل عن شىء فليسئل فلا تسالونى عن شىء الا اخبرتكم مادمت فى مقامى هذا فاكثر النسا فى البكاء واكثر ان يقول سلونى فقام عبدالله بن حذافة السهمى فقال من ابى قال ابوك حذافة ثم اكثر ان يقول سلونى فبرك عمرؓ على ركبتيه فقال رضينا بالله رباو بالاسلام دينا و بحمد نبيا فسكت ثم قال عرضت على الجنة والنار انفا فى عرض هذا الحآئط فلم اركا الخيرو الشر.

۵۱۱. حدثنا حفص بن عمر قال حدثنا شعبة عن ابى المنهال عن ابى برزة قال كان النبى ﷺ يصلى الصبح واحدنا يعرف جليسه و يقرأ فيها مان بين الستين الى المائة ويصلى الظهر اذا زالت الشمس والعصر واحدنا يذهب الى اقصى المدينة رجع والشمس حية ونسيت ما قال فى المغرب ولا يبالى بتاخير العشاء الى ثلث الليل ثم قال الى شطر الليل وقال معاذ قال شعبة ثم لقيته مرة فقال او ثلث الليل.

۵۱۲. حدثنا محمد بن مقاتل قال اخبرنا عبدالله قال حدثنا خالد بن عبدالرحمن قال حدثنى غالب ن القطان عن بكر بن عبدالله المزنى عن انس بن مالك قال كنا اذا صلينا خلف رسول الله ﷺ وسلم بالظهآئر سجدنا علىٰ ثيابنا اتقاء الخر.

ترجمہ۵۱۰: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول خدا ﷺ جب آفتاب ڈھل گیا باہر تشریف لائے اور آپ نے ظہر کی نماز پڑھی، پھر آپ منبر پر تشریف لائے اور آپ نے قیامت کا ذکر شروع کیا، فرمایا کہ اس میں بڑے بڑے حوادث ہوں گے، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ جو شخص کچھ پوچھنا چاہے وہ پوچھے جب تک کہ اپنے اس مقام میں ہوں، جو شخص مجھ سے کچھ پوچھنا چاہے گا میں اسے بتاؤں گا، لوگوں نے کثرت سے رونا شروع کیا اور آپ نے اس قول کی کثرت فرمائی کہ "سلونی" پھر عبداللہ بن حذافہ سہمی کھڑے ہوگئے، انہوں نے پوچھا کہ میرا باپ کون ہے، آپ نے فرمایا کہ تمہارا باپ حذافہ ہے، آپ پھر بار بار فرمانے لگے کہ "سلونی" تب عمرؓ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور عرض کرنے لگے کہ ہم اللہ سے راضی ہیں جو (ہمارا) پروردگار ہے اور اسلام سے جو (ہمارا) دین ہے اور محمد ﷺ سے جو (ہمارے) نبی ہیں، اس وقت آپ ساکت ہوگئے اس کے بعد فرمایا کہ جنت اور دوزخ میرے سامنے ابھی اس دیوار کے گوشے میں پیش کی گئی ہے، ایسی عمدہ چیز (جیسی جنت ہے) اور ایسی بری چیز (جیسی دوزخ ہے) کبھی نہیں دیکھنے میں آئی۔

ترجمہ۵۱۱: حضرت ابوالمنہال حضرت ابو برزہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے پاس بیٹھنے والے کو پہچان لیتا تھا، اس میں ساٹھ۶۰ آیتوں اور سو۱۰۰ آیتوں کے درمیان میں قراءت کرتے تھے، ظہر کی نماز جب آفتاب ڈھل جاتا تھا، پڑھتے تھے، اور عصر کی ایسے وقت کہ ہم میں سے کوئی لوٹ کر مدینہ کے کنارہ تک چلا جاتا تھا اور آفتاب متغیر نہ ہوا ہوتا تھا (ابوالمنہال کہتے ہیں) اور مغرب کے بارے میں جو کچھ ابو برزہ نے کہا تھا، میں بھول گیا اور عشا کی تاخیر میں تہائی رات تک آپ

کچھ پروانہ کرتے تھے، بعداس کے ابو برزہ نے کہا کہ نصف شب تک اور معاذ کہتے ہیں کہ شعبہ نے بیان کیا کہ اسکے بعد ایک مرتبہ میں نے ابو منہال سے ملاقات کی، توانہوں نے کہایا تہائی شب تک۔

ترجمہ ۵۱۲: حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول خدا ﷺ کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھتے تھے تو گرمی کی تکلیف سے بچنے کے لئے اپنے کپڑوں پر سجدہ کیا کرتے تھے۔

تشریح: سابقہ احادیث جن میں گرمی کی شدت کے موقع پر ٹھنڈے وقت میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، اوراس حدیث میں بظاہر تضادنظر آتا ہے، لیکن چونکہ ہماری نظر کے سامنے ان احادیث کا موقع اور محل یاماحول نہیں اس سے الجھن واقع ہوتی ہے بظاہر ایسا ہے کہ ابتداء میں آنحضرت ﷺ کا یہی عمل ہوگا کہ زوال ہوتے ہی نماز ادا فرماتے ہوں گے، پھر جب آپ کو صحابہ کی تکلیف اور دشواری کا احساس ہوا ہوگا تو آپ نے حکم دیا کہ ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھو اس طرح یہ حدیث مقدم ہوئی اور سابقہ متاخر اور قابل عمل حدیث متاخر ہوتی ہے، یہی مسلک حنفیہ کا ہے، نیز احادیث اول قولی اور ثانی عملی ہیں، قولی حدیث عملی سے تعمیل میں مقدم ہوتی ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ پہلی حدیث الباب میں حضور علیہ السلام کے اس ارشاد سے کہ جب تک میں یہاں ہوں، تمہارے ہر سوال کا جواب دونگا، معلوم ہوا کہ یہ ایک وقتی چیز تھی، لہٰذا اس سے آپ کے علم غیب کلی کے لئے استدلال نہیں ہوسکتا کہ یہ صفت صرف حق تعالیٰ کی ہے، دوسری حدیث الباب میں "واحدنا یعرف جلیسه" سے ثابت ہوا کہ نماز فجر اسفار میں ختم ہوتی تھی کہ ایک دوسرے کو پہچان لیتا تھا، جو حنفیہ کا مسلک ہے، دوسرے ائمہ تغلیس کو افضل بتلاتے ہیں یعنی اندھیرے میں پڑھنے کو مفصل دلائل آگے آئیں گے، ان شاءاللہ

حضرتؒ نے فرمایا کہ یہی حدیث ان ہی راویوں سے ابوداؤد میں بہ لفظ "وما یعرف احدنا جلیسه" مروی ہے حالانکہ وہ اس حدیث بخاری اور حدیث مسلم کے بھی خلاف ہے، لہٰذا یہ لفظ صرف ابوداؤد میں ہیں، پھر یا تو کسی راوی کا وہم ہے یا کاتب کی غلطی ہے، بذل المجہود ص۲۲۴ ج ا میں لکھا:- نسخہ دہلویہ و کانپوریہ میں تو اسی طرح ما نافیہ کے ساتھ ہے مگر مصری نسخہ میں بغیر ما کے ہے اور اسی کو صاحب عون المعبود نے لیا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ وہی صواب ہے کہ بخاری و مسلم کے موافق ہے۔

قولہ "واحدنا فیذهبان لی اقصی المدینه" پر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ آخر مدینہ تک جا کر پھر مسجد نبوی کو لوٹ کر آنا نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز عصر پڑھ کر لوٹتا تو آخر مدینہ میں اپنے گھر پہنچ جاتا تھا، اس حالت میں کہ ابھی سورج کی روشنی میں جان باقی رہتی تھی، چنانچہ آگے باب وقت العصر میں بخاری میں ہی سیار کی حدیث (نمبر ۵۱۷) آرہی ہے، اس میں یہی بات صاف طور سے بتلائی گئی ہے، غرض معلوم ہوا کہ یہ صرف ایک طرف کی مسافت کا بیان ہے اور اس سے تعجیل نہیں بلکہ تاخیر ثابت ہوتی ہے جس کو امام طحاویؒ نے بھی کہا ہے دوسروں نے اس سے تعجیل سمجھی ہے تاہم یہ اختلاف صرف افضلیت واستحباب کا ہے، جیسا کہ ظہر میں بھی تعجیل وتاخیر کا ہے یا صبح میں اسفار و تغلیس کا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ تیسری حدیث الباب میں ہے کہ ہم نے گرمی سے بچنے کے لئے اپنے کپڑوں پر سجدہ کیا یہ حنفیہ کی دلیل ہے کہ اپنے ملبوس کپڑوں کے کناروں پر سجدہ کر سکتے ہیں، شافعیہ کے نزدیک نہیں کر سکتے، لہٰذا وہ یہاں بھی جدا کپڑوں کی تاویل کریں گے، جبکہ ظاہر ان کے خلاف ہے(کیونکہ کپڑوں کا لفظ عام ہے، بلکہ اپنے کپڑوں سے اشارہ ملبوسہ کپڑوں کی طرف ہی نکل سکتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب تاخير الظهر الى العصر

(ظہر کی نماز کوعصر کے وقت تک موخر کرنے کا بیان)

۵۱۳. حدثنا ابو النعمان قال حدثنا حماد بن زيد عن عمرو بن دينار عن جابر بن زيد عن ابن عباس ان النبی ﷺ صلیٰ بالمدينة سبعا و ثمانيا الظهر والعصر المغرب والعشاء فقال ايوب لعله فی ليلة مطيرة قال عسیٰ.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں ظہر اور عصر کی آٹھ رکعتیں اور مغرب وعشا کی سات رکعتیں (ایک ساتھ) پڑھیں تو ایوب نے (جابر سے) کہا کہ شاید بارش والی رات میں ہوا ہوگا، جابر نے کہا کہ شاید۔

تشریح: امام بخاریؒ کے نزدیک جمع تاخیر جائز ہے، جمع تقدیم جائز نہیں، اسی لئے یہاں تاخیر کا لفظ استعمال کیا ہے، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جمع حقیقی کسی عذر کے ساتھ جائز ہے، مثلاً سفر، مرض اور بارش کی وجہ سے، امام صاحب اور آپ کے اصحاب کے یہاں جمع حقیقی جائز نہیں کہ ایک کے وقت میں دوسرے وقت کی نماز پڑھی جائے، کیونکہ نمازوں کے اوقات مقرر کر دیئے گئے ہیں اور محافظۃ صلوات کا بھی حکم ہے، نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے کبھی کسی نماز کو دوسری نماز کے وقت میں نہیں پڑھا بجز عرفہ ومزدلفہ کے حج کے دن میں، لہٰذا تشریع عام یہی ہے اور جن احادیث میں جزئی واقعات اس کے خلاف وارد ہیں ان میں احتمال جمع صوری کا ہے، یعنی ایک نماز اس کے آخر میں اور دوسری کو اس کے اول وقت میں پڑھا گیا، جس سے اوقات مستحبہ کے خلاف تو کسی عذر کی وجہ سے ہوا ہوگا، باقی جواز کے اندر ہی وہ صورتیں بھی پیش آئی ہوں گی، چنانچہ آگے حدیث نمبر ۵۱۹ آرہی ہے جس کے تحت حافظ ابن حجرؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ظہر کی نماز آخر وقت میں پڑھا کرتے ہوں گے اور حضرت انسؓ نے عصر کی اول وقت میں پڑھی ہوگی، اسی لئے حضرت ابوامامہ کو حضرت انسؓ کی نماز میں شک پڑا کہ انہوں نے اس وقت ظہر کی پڑھی ہے یا عصر کی، لہٰذا جمع کی حدیثوں کو جمع وقتی حقیقی پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے اور حنفیہ کی رائے اس بارے میں نہایت درست ہے اور اصول وقواعد شرع سے اوفق بھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ارشاد حضرت شاہ ولی اللہؒ

آپ نے ''شرح تراجم ابواب البخاری'' میں لکھا کہ امام بخاری کی غرض اس باب میں یہ بتلانا ہے کہ حضور علیہ السلام کا دو نمازوں کو بلا کسی عذر کے اور بحالت اقامت بستی کے اندر جمع کرنا حقیقی طور سے نہ تھا، بلکہ ایک نماز کو مؤخر کرکے آخر وقت میں اور دوسری کو مقدم کرکے اول وقت میں پڑھا تھا، اس طرح یہ جمع بین الصلاتین صرف صورۃً وفعلاً تھی، پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی لکھا کہ اس حدیث میں صلے بالمدینۃ وہم راوی ہے، کیونکہ یہ واقعہ مدینہ کا نہیں بلکہ تبوک کا ہے، راوی نے کہا تھا کہ یہ بغیر سفر کا قصہ ہے، یعنی حالت سیر کا نہیں اقامت کا ہے، دوسرے راوی نے اس کو حضر کا واقعہ سمجھ لیا، پھر بعض نے اس کی تعبیر مدینہ سے کر دی، لیکن اس پر اعتراض ہوا کہ اس طرح تو ثقہ راویوں پر سے بھی اعتماد اٹھ جائے گا، حضرت شاہ صاحبؒ نے تو اس کا کوئی جواب نہ دیا، مگر شیخ الحدیث نے یہ جواب دیا کہ واقعہ مدینہ کا ہی ہوگا، جمع صوری ہوئی ہوگی، جس کو محققین شافعیہ و مالکیہ نے بھی راجح قرار دیا ہے، جیسے حافظ ابن حجر، قرطبی، امام الحرمین، ابن ماجشون اور ابن سیدالناس وغیرہ نے دوسرے یہ کہ اگر قصہ سفر کا ہوتا تو نماز قصر پڑھی جاتی، یعنی چار ظہر وعصر کی اور پانچ مغرب وعشا کی نہ کہ آٹھ وسات، علامہ عینی نے بھی لکھا کہ سب سے بہتر تاویل جمع صوری والی ہے الخ (لامع ص ۲۱۴ ج ۱)

ارشاد حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ

فرمایا کہ بخاریؒ کے اس ترجمۃ الباب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جمع بین الصلاتین کے مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک اختیار کیا ہے، اور ابو داؤد نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جمع تقدیم میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے، اگرچہ بعض ائمہ پھر بھی اس کے قائل ہیں، نیز فرمایا کہ مدینہ منورہ کی یہ جمع بین الصلاتین نہ سفر کی وجہ سے ہوئی نہ بارش کی وجہ سے، پھر بجز جمع فعلی وصوری کے اور کیا تھی؟ اور مسلم میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے تلمیذ حدیث جابر بن زید نے عرض کیا کہ میرا خیال ہے حضور علیہ السلام ظہر میں تاخیر اور عصر میں تعجیل فرمائی ہوگی اور مغرب وعشاء کو موخر فرمایا ہوگا، اس پر حضرت عباسؓ نے جواب دیا کہ میرا بھی یہی گمان ہے اور حدیث نسائی میں بھی تصریح ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور علیہ السلام کے ساتھ مدینہ میں آٹھ ایک ساتھ اور سات ایک ساتھ پڑھیں، آپ نے ظہر کو موخر اور عصر کو مقدم فرمایا اور مغرب کو مؤخر عشاء کو معجّل کیا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ علامہ نووی نے اس حدیث کی جمع بین الصلاتین کو مرض کے سبب سے قرار دیا ہے، لیکن اگر یہ مان بھی لیں کہ حضور علیہ السلام نے مرض کی وجہ سے ایسا کیا تو کیا سارے مقتدی صحابہ کرام بھی مریض تھے اور حافظ نے بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ جمع نظر حنفیہ کے مطابق ہے۔

راوی نے جو یہ کہا کہ شاید وہ رات بارش والی تھی، غالباً یہ احتمال کسی نیچے کے راوی نے بیان کیا ہے، کیونکہ حضرت ابن عباسؓ اور ان کے تلمیذ بلاواسطہ نے جمع صوری سمجھی تھی جو حنفیہ کا مذہب ہے اور اس کے لئے کسی عذر کی بھی ضرورت نہیں، بلکہ بعض رواۃ کا یہ کہنا بھی کہ جمع بلا سفر وخوف ہوا، اسی طرف مشیر ہے کہ کسی قسم کا عذر نہیں تھا، اور بعض راویوں نے تو بارش کی بھی نفی کی ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ نے لفظ جمع کو ترجمۃ الباب میں اختیار نہیں کیا، اس سے بھی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ جمع حقیقی کے قائل نہیں ہیں، مثل حنفیہ کے۔

حضرت ابن عباسؓ کے اس فرمانے سے بھی کہ حضور علیہ السلام نے جمع اس واسطے کیا کہ امت پر تنگی و دشواری نہ ہو، مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ترک اوقات مستحبہ کی گنجائش ہے، کوئی ان کو لازم نہ سمجھ لے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب وقت العصر

(وقت عصر کا بیان)

۵۱۴. حدثنا ابراهیم بن المنذر حدثنا انس بن عیاض عن هشام عن ابیه انا عآئشة قالت کان النبی ﷺ یصلی العصر والشمس لم تخرج من حجرتها.

۵۱۵. حدثنا قتیبة قال حدثنا اللیث عن ابن شهاب عن عروة عن عائشة ان رسول الله ﷺ صلے العصر والشمس فی حجرتها لم یظهر الفی بین حجرتها.

۵۱۶. حدثنا ابو نعیم قال حدثنا ابن عینیة عن الزهری عن عروة عن عآئشة قالت کان النبی ﷺ یصلی صلوٰة العصر الشمس طالعة فی حجرتی ولم یظهر الفیء بعد قال ابو عبدالله وقال مالک ویحیی بن سعید و شعیب و ابن ابی حفصة والشمس قبل ان تظهر.

۵۱۷. حدثنا محمد بن مقاتل قال اخبرنا عبدالله قال اخبرنا عوف عن سیار بن سلامة قال دخلت انا وابی علی ابی برزة الاسلمی فقال له ابی کیف کان رسول الله ﷺ یصلی المکتوبة فقال کان یصلی

الهجير التى تدعونها الاولىٰ حين تدحض الشمس ويصلى العصر ثم يرجع احدنا الى رحله فى اقصى المدينة والشمس حية ونسيت ما قال فى المغرب وكان يستحب ان يوخر من العشاء التى تدعونها العتمة وكان يكره النوم قبلها والحديث بعدها وكان ينفتل من صلوٰة الغداوة حين يعرف الرجل جليسه و يقرأ بالستين الى المائة.

۵۱۸. حدثنا عبدالله بن مسلمة عن مالک عن اسحاق بن عبدالله بن ابى طلحة عن انس بن مالک قال كنا نصلى العصر ثم يخرج الانسان الى بنى عمر و بن عوف فيجدهم يصلون العصر.

۵۱۹. حدثنا ابن مقاتل قال اخبرنا عبدالله قال اخبرنا ابو بكر بن عثمان ابن سهل بن حنيف قال سمعت ابا امامة يقول صلينا مع عمر بن عبدالعزيز الظهر ثم خرجنا حتى دخلنا علےٰ انس بن مالک فوجدناه يصلے العصر فقلت يا عم مٰا هذه الصلوٰة التى صليت قال العصر وهذه صلوٰة رسول الله ﷺ التى كنا تصل معه.

۵۲۰. حدثنا عبدالله بن يوسف قال اخبرنا مالک عن ابن شهاب عن انس ابن مالک قال كنا نصلى العصر ثم يذهب الذاهب منا الى قباء فياتيهم والشمس مرتفعة.

۵۲۱. حدثنا ابواليمان قال اخبرنا شعيب عن الزهرى قال حدثنى انس بن مالک قال كان رسول الله ﷺ يصلى العصر والشمس مرتفعة حية فيذهب الذاهب الى العوالى فياتيهم والشمس مرتفعة وبعض العوالى من المدينة علےٰ اربعه اميال او نحوه.

ترجمہ۵۱۴: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ آفتاب ان کے حجرے سے باہر نہ نکلا ہوتا تھا۔

ترجمہ۵۱۵: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے عصر کی نماز ایسے وقت پڑھی کہ آفتاب ان کے حجرے میں تھا اور سایہ ان کے حجرے سے بلند نہ ہوا تھا۔

ترجمہ۵۱۶: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت پڑھا کرتے تھے کہ آفتاب میرے حجرے میں ہوتا تھا اور ہنوز سایہ نہ بلند ہوا ہوتا تھا، امام بخاریؒ نے کہا کہ مالک، یحییٰ بن سعید، شعیب اور ابن ابی حفصہ نے بہ ایں لفظ روایت کیا **والشمس قبل ان تظهر** (سورج اس وقت تک حجرہ سے باہر نہ ہوتا تھا)

ترجمہ۵۱۷: حضرت سیار بن سلامہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور میرے والد ابو برزہ اسلمی کے پاس گئے ان سے میرے والد نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ فرض نماز کس طرح پڑھتے تھے، انہوں نے ہجیر (یعنی ظہر) جس کو تم اولیٰ کہتے ہو، اس وقت پڑھتے تھے، جب آفتاب ڈھل جاتا اور عصر (ایسے وقت) پڑھتے کہ اس کے بعد ہم میں سے کوئی اپنی اقامت گاہ میں جو مدینہ کے حاشیہ پر ہوتی تھی، واپس پہنچ جاتا اور آفتاب میں حیات ہوتی تھی (سیار کہتے ہیں) اور میں بھول گیا کہ مغرب کے بارے میں ابو برزہ نے کیا کہا اور آپ کو یہ پسند تھا کہ عشاء جس کو تم عتمہ کہتے ہو، دیر کر کے پڑھیں اور اس سے پہلے سونے کو اور اس کے بعد بات کرنے کو برا جانتے تھے، اور صبح کی نماز (فراغت پاکر) ایسے وقت لوٹتے تھے کہ آدمی اپنے پاس والے کو پہچان لیتا، اور (صبح کی نماز میں) آپ ساٹھ سے سو تک آیتیں پڑھتے تھے۔

ترجمہ۵۱۸: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم عصر کی نماز پڑھ چکے ہوتے تھے اس کے بعد آدمی بنی عمر بن عوف

(کے قبیلے) تک جاتا تو انہیں نماز عصر پڑھتے ہوئے پاتا۔

ترجمہ ۵۱۹: حضرت ابوامامہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم عمر بن عبدالعزیز کے ہمراہ ظہر کی نماز پڑھ کر باہر نکلے اور انس بن مالک کے پاس گئے، تو انہیں نماز عصر پڑھتے ہوئے پایا، میں نے کہا کہ اے میرے چچا، یہ کون سی نماز آپ نے پڑھی، انہوں نے کہا عصر، یہی رسول خدا ﷺ کی نماز کا وقت ہے، جو ہم آپ کے ہمراہ پڑھا کرتے تھے۔

ترجمہ ۵۲۰: حضرت انسؓ بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ عصر کی نماز پڑھ چکتے تھے، اس کے بعد ہم میں سے جانے والا (مقام) قبا تک جاتا اور اس کے پاس ایسے وقت پہنچ جاتا تھا کہ آفتاب بلند ہوتا تھا۔

ترجمہ ۵۲۱: حضرت انسؓ بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ آفتاب بلند ہوتا تھا، عوالی کے بعض مقامات مدینہ سے چار میل پر یا اس کے قریب تھے۔

تشریح: وقت عصر کے اول میں جو اہم اختلاف تھا وہ پہلے ذکر ہوا، اب وقت مستحب کا بیان ہو رہا ہے، حنفیہؒ کے نزدیک تاخیر مستحب ہے، دوسرے حضرات تعجیل کو مستحب کہتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ ظاہر قرآن مجید سے تاخیر عصر نکلتی ہے کیونکہ **فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب** وارد ہے اور قبل طلوع وغروب سے طلوع وغروب سے قریب تر ہی زمانہ مراد ہوا کرتا ہے، مثلاً آپ کسی سے وعدہ کریں کہ قبل الغروب آؤں گا تو وہ آپ کا انتظار غروب سے کچھ قبل ہی کرے گا، اسی طرح نماز عصر بھی حنفیہ گھنٹہ سوا گھنٹہ غروب سے قبل افضل بتلاتے ہیں، مگر شافعیہ وغیرہم کے مسلک پر ایک مثل پر وقت ہو جانے کے بعد تعجیل عصر کریں گے، تو کئی گھنٹے قبل نماز افضل ٹھیرے گی، جو قبلیت قریب سے بعید تر ہوگی۔

دوسرے فقہی نقطۂ نظر سے بھی حنفیہ کا مسلک ارجح ہے، کیونکہ شریعت نے بعد عصر سے غروب تک نوافل سے روک دیا ہے، اگر عصر کو چند گھنٹے قبل غروب کے پڑھ لیں گے تو نوافل کے لئے وقت تنگ ہو جائے گا۔

امام طحاویؒ نے یہ بھی فرمایا کہ عصر کے لغوی معنی نچوڑنے کے ہیں اور عصر کا وقت بھی دن کے نچوڑ کا وقت ہوتا ہے، جو آخری تھوڑا حصہ ہونا چاہئے۔

امام بخاری پہلی حدیث الباب میں لائے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایسے وقت عصر کی نماز پڑھا کرتے تھے کہ سورج حجرہ مبارکہ سے نہ نکلتا تھا، یعنی اس کی دھوپ یا روشنی ابھی حجرہ مبارکہ کے اندر ہوتی تھی، امام طحاویؒ نے فرمایا کہ حجرہ مبارکہ چھوٹا تھا، اس لئے دھوپ غروب شمس کے قریب تک رہتی تھی، کیونکہ حجرۂ مبارکہ کا دروازہ غربی جانب تھا۔

دوسری احادیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی نماز عصر ایسے وقت ہوتی تھی کہ سورج میں حیات ہوتی تھی، جس کے لئے ابوداؤد میں حضرت خیثمہ سے نقل ہوا کہ حیات سے مراد یہ کہ اس میں حرارت باقی ہوتی تھی، یہ بات بھی غروب کے قریب تر ہی ہوتی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ اس وقت نماز عصر نہ پڑھتے تھے جب تک ہم سورج کو مدینہ کے سب سے اونچے پہاڑ پر نہ دیکھ لیتے تھے، اور یہی وقت حنفیہ کا ہے۔

آخری حدیث الباب میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ نماز عصر پڑھ کر ایک شخص عوالی تک پہنچ جاتا تھا اور ابھی سورج بلند ہوتا تھا، عوالی کے بعض حصے تقریباً چار میل دور تھے، اس پر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ صورت بھی مختار حنفیہ پر منطبق ہو سکتی ہے، لہٰذا مخالف نہیں ہے، موطا امام مالکؒ میں سیر راکب کا ذکر آتا ہے اور بعض روایات میں سیر عنق بھی وارد ہے، یعنی نماز پڑھ کر سوار تیز رفتاری کے ساتھ ۲-۳ فرسخ تک غروب سے قبل پہنچ سکتا تھا، یہ حنفیہ کے خلاف نہیں کیونکہ جب دن بڑا ہوتا ہے تو تقریباً دو گھنٹے قبل عصر حنفیہ ہوتی ہے اور تیز رفتار اونٹنی اتنی مسافت آسانی سے طے کر سکتی ہے۔

ترمذی شریف میں مستقل باب تاخیر صلوٰۃ العصر قائم کر کے صرف یہ حدیث ذکر کی کہ حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا:- رسول اکرم ﷺ تمہاری نسبت سے ظہر کی نماز جلد پڑھتے تھے اور تم عصر کی نماز حضور علیہ السلام کے وقت سے پہلے پڑھتے ہو، اس سے بھی حنفیہ کی تائید ہوتی ہے۔

ساکنین عوالی کی نماز عصر

حدیث نمبر ۵۱۸ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی کی نماز عصر پڑھ کر بعض لوگ قبیلۂ بنی عمرو بن عوف میں پہنچ کر دیکھتے تھے کہ وہاں کے حضرات نماز عصر میں ہوتے تھے، علامہ عینیؒ نے لکھا کہ اس سے بھی تاخیر عصر پر دلالت ہے کہ قبا و عوالی کے رہنے والے صحابہ کرام اتنی دیر سے پڑھتے تھے کہ آدمی دو تین میل مسجد نبوی سے چل کر بھی وہاں ان کی عصر کے وقت پہنچ جاتا تھا (عمدہ ۵۴۲ ج ۲) چونکہ اطراف مدینہ کے صحابہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں وقت گزارتے تھے، ممکن ہے ان کی رعایت سے بھی آپ کچھ عجلت فرماتے ہوں کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھنے والے اطراف مدینہ کے گھروں میں شام سے پہلے پہنچ جائیں جس کی طرف اشارہ حدیث نمبر ۵۲۰ میں اور ۵۲۱ میں بھی آئے گا، اور وہاں کے رہنے والے حضور علیہ السلام کے منشاء مبارک کو جان کر زیادہ تاخیر سے نماز عصر پڑھتے ہوں گے اس کے سوا اور بہتر توجیہ ان کی تاخیر کی کیا ہوسکتی ہے؟! نمبر ۵۱۹ میں حضرت انسؓ کی تعجیل عصر کی وجہ یہ تھی کہ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں آخر وقت مکروہ میں منافقوں کی طرح ان کی نماز عصر نہ ہو جائے، جس سے حدیث میں ڈرایا گیا تھا یہ ان کی خاص اور غیر معمولی احتیاط تھی (اور اسی لئے حضرت ابوامامہ نے حیرت سے بحث کی وجہ دریافت کی) ورنہ ابھی اوپر کی حدیث میں ساکنین قبا و عوالی کا معمول کتنی تاخیر سے پڑھنے کا معلوم ہو چکا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا:- بدائع میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کے حجرۂ مبارکہ کی دیواریں چھوٹی تھیں، اس لئے سورج ان میں تغیر شمسی تک رہتا تھا، میں کہتا ہوں کہ یہ تو جب ہے کہ اندر کی روشنی مراد ہو اور اگر دروازہ سے داخل ہونے والی روشنی مراد ہو تو ان کے حجرہ مبارکہ کا دروازہ غرب کی طرف تھا، اس میں قرب غروب تک روشنی زیادہ ہی ہوتی رہتی ہوگی، اور بالکل اسی سے غروب کے قریب ہی ختم ہوتی ہوگی، لہٰذا حدیث حضرت عائشہؓ اور بھی زیادہ تاخیر عصر پر دلیل بن جاتی ہے، نیز حدیث ترمذی، بروایت الخدری بھی مشیر ہے کہ حضور علیہ السلام عصر کی نماز ہمیشہ غروب کے قریب پڑھتے تھے، جیسا کہ وہ آیت قبل طلوع الشمس و قبل الغروب کا بھی مقتضیٰ ہے اور امام محمدؒ نے حضرت ابراہیم نخعی سے کتاب الحج میں نقل کیا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحاب کو دیکھا کہ وہ عصر کی نماز آخر وقت میں پڑھا کرتے تھے اور روایات تاخیر عصر کی بہ نسبت تعجیل کے زیادہ ماثور ہیں۔ (اوجز ص ۵ ج ۱)

تدعونہا الاولیٰ: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اولیٰ ظہر کی نماز کو اس لئے کہتے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے سب سے پہلے وہی نماز پڑھائی تھی اور اسی لئے امام محمدؒ نے کتاب المواقیت کو نماز ظہر سے شروع کیا، متاخرین کے طریقہ کے خلاف کہ وہ فجر سے شروع کرتے ہیں۔

عوالی: بقول زہری مدینہ منورہ سے ۲-۳ میل پر ہیں (عمدہ ص ۵۴۳ ج ۲) یہ وہ علاقہ کہلاتا تھا جہاں مشرقی جانب صحابہ کرام کے مکانات تھے، اسی کے مقابل غربی جانب کے سوافل تھے۔

وکان یکرہ النوم: نماز عشاء سے قبل سونے کی کراہت اس لئے ہے کہ نماز فوت ہونے کا خطرہ ہے، اگر ایسا نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے۔

والحدیث بعدہا: شریعت چاہتی ہے کہ فاتحہ و خاتمہ خیر پر ہو، اسی لئے صبح کو بھی نماز کے بعد ہر کام کرنا ہے اور رات کو نماز عشاء پر ختم کر دینا ہے، کہ نماز پڑھ کر سو جائے۔

درمختار میں ہے کہ عشاء کے بعد کلام مباح مکروہ ہے اس پر حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ غیر مباح کلام مطلقاً جائز ہے اور کلام خیر، ذکر و علم وغیرہ ممانعت سے مستثنیٰ ہیں، علامہ زیلعی نے فرمایا کہ بعد عشاء باتوں کی کراہت اس لئے ہے کہ بسا اوقات لغو تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور نماز صبح بھی فوت ہوسکتی ہے یا تہجد کے عادی کی نماز تہجد فوت ہو جائے گی، لہٰذا اگر کوئی مہم ضرورت پیش آئے تو کوئی حرج نہیں، ایسے ہی قراءت، ذکر، حکایات صالحین، فقہ اور مہمان کے ساتھ باتیں کرنا بھی جائز بلا کراہت ہیں، برہان میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے

فرمایا بعد نماز عشا کے کوئی بات نہ کرے مگر دو آدمیوں کو اجازت ہے، نمازی یا مسافر اور ایک روایت عرس کے لئے بھی ہے۔ کذا فی الشامی (لامع ص۲۲۲ ج۱)

امام ترمذیؒ نے رخصت سفر بعد العشاء کے لئے باب قائم کیا اور اس میں حضرت عمرؓ کی روایت نقل کی کہ رسول اکرم ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بعد عشاء کسی امر میں امور مسلمین میں سے باتیں کیا کرتے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ سمر ممنوع نہ تھی اور اس کو درحقیقت سمر ہی کہنا صحیح نہیں، اور یہ بھی فرمایا کہ بہت امور کی نوعیت نیتوں کے بدلنے سے مختلف ہوجاتی ہے، چنانچہ فتح القدیر میں تحصیل لغت عربیہ کی نیت سے اشعار غزل وتشبیب پڑھنے کی اجازت لکھی ہے، بشرطیکہ جس عورت یا مرد کی تشبیب ہو وہ موجود نہ ہو اور علامہ شامی نے نحو، لغت وحساب وغیرہ کی تحصیل کو فرض کفایہ لکھا ہے، الخ (معارف السنن ص۸۱ ج۲)

باب اثم من فاتته العصر

(اس شخص کو کتنا گناہ ہے جس کی نماز عصر جاتی رہے)

۵۲۲. حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن نافع عن عبدالله بن عمر ان رسول الله ﷺ قال الذی تفوته صلٰوة العصر فکانما وتر اهله وماله قال ابو عبدالله یترکم وترت الرجل اذا قتلت له قتیلا او اخذت ماله.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا جس شخص کی نماز عصر جاتی رہی، ایسا ہے کہ گویا اس کے اہل ومال ضائع ہوگئے، امام بخاری کہتے ہیں یترکم، وترت الرجل سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولتے ہیں، جب تم کسی عزیز کو قتل کردو یا اس کا مال لوٹ لو۔

تشریح: نماز عصر کے فوت ہوجانے کا مطلب کیا ہے؟ بعض حضرات کی رائے ہے کہ جماعت کا فوت ہونا مراد ہے اور امام اوزاعیؒ کی تفسیر ابوداؤد میں یہ ہے کہ سورج کی دھوپ میں زردی آجائے، یعنی وقت مختار ومستحب فوت ہوجائے، علامہ عینی اور حافظ نے کہا کہ بلا کسی عذر مجبوری کے وقت جواز نکل جائے، اور امام بخاری کی مراد اس باب میں بغیر قصد وارادہ کے فوت ہوجانا معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اگلے باب میں ترک کرنے کا لفظ لائے ہیں، جو عمداً ترک کرنے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی بھی یہی رائے ہے، آپ نے فرمایا کہ حدیث سے ثابت ہے کہ پہلی امتوں نے بھی نماز عصر میں کوتاہی کی تھی (شاید اس لئے کہ کاروبار وغیرہ میں مشغولیت کا وقت ہوتا ہے اور اسی لئے غفلت وسستی کرنے پر وعید آئی ہے) واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب اثم من ترک العصر

(اس شخص کا گناہ جو نماز عصر کو چھوڑ دے)

۵۲۳. حدثنا مسلم بن ابراهیم قال حدثنا هشام قال اخبرنا یحیی بن ابی کثیر عن ابی قلابة عن ابی الملیح قال کنا مع بریدة فی غزوة فی یوم ذی غیم فقال بکروا بصلٰوة العصر فان النبی ﷺ قال من ترک صلٰوة العصر فقد حبط عمله.

ترجمہ: حضرت ابوملیح روایت کرتے ہیں کہ ہم کسی غزوہ میں ابر کے دن بریدہ کے ہمراہ تھے، تو انہوں نے کہا کہ عصر کی نماز سویرے پڑھ لو، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص عصر کی نماز چھوڑ دے، تو سمجھ لو کہ اس کا (نیک) عمل ضائع ہوگیا۔

تشریح: پہلے باب کی حدیث میں نماز عصر بہ غفلت ولا پروائی فوت ہوجانے پر وعید تھی، یہاں عمداً ترک کرنے کا بیان ہے اور صحابۂ کرام کی غایت احتیاط بتلائی ہے کہ ابر وباد کے موقع پر نماز عصر میں جلدی کرتے تھے، مبادا وقت مکروہ آجائے یا غروب ہی ہوجائے اور پتہ نہ چلے، حقیقت یہ ہے کہ غفلت ولا پروائی اور عمداً ترک کرنے میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے، اس حدیث الباب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابر وبارش کے دن صحابہ کے جلدی کرنے کی وجہ ظلمت واندھیرا ہوجاتا تھی، ورنہ وہ عام دنوں میں تاخیر ہی سے پڑھتے تھے، اور اکثر احادیث میں جو سورج کی حرارت باقی تھی وہ بلند تھا وغیرہ الفاظ آتے ہیں وہ بھی یہی بتلاتے ہیں کہ تاخیر کرتے تھے، مگر ایسی بھی نہیں کہ مکروہ وقت داخل ہوجائے اور یہی حنفیہ بھی کہتے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب فضل صلوٰة العصر

(نماز عصر کی فضیلت کا بیان)

۵۲۴. حدثنا الحميدی قال حدثنا مروان بن معاوية قال حدثنا اسماعيل عن قيس عن جرير بن عبدالله قال كنا عند النبی ﷺ فنظر الی القمر ليلة فقال انكم سترون ربكم كما ترون هذا القمر لا تضآمون فی روٴيته فان استطعتم ان لا تغلبو علی صلوٰة قبل طلوع الشمس وقبل غروبها فافعلوا ثم قرأ فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب قال اسماعيل افعلوا لا تفوتنكم.

۵۲۵. حدثنا عبدالله بن يوسف قال حدثنا مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال يتعاقبون فيک ملئكة بالليل وملئكة بالنهار و يجتمعون فی صلوٰة الفجر و صلوٰة العصر ثم يعرج الذين باتوا فيكم فيسأ لهم ربهم وهو اعلم بهم كيف تركتم عبادی فيقولون تركناهم وهم يصلون اتينا هم وهم يصلون.

ترجمہ ۵۲۴: حضرت جریر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ نے چاند کی طرف نظر فرمائی اور فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کو یقیناً اس طرح دیکھو گے، جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو، اس کے دیکھنے میں شک نہ کرو گے، لہٰذا اگر تم یہ کرسکتے ہو کہ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب سے پہلے کی نماز میں (شیطان پر غالب آکر) ادا کرلیا کرو تو (ضرور) کرو، پھر آپ نے **فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب** تلاوت فرمائی۔

ترجمہ ۵۲۵: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شب وروز میں فرشتوں کی ڈیوٹیاں بدلتی رہتی ہیں اور یہ سب فجر اور عصر کی نماز میں مجتمع ہوتے ہیں، جو فرشتے رات کو تمہارے پاس رہے ہیں (آسمان پر) چڑھ جاتے ہیں، تو ان سے ان کا پروردگار پوچھتا ہے، حالانکہ وہ خود اپنے بندوں سے خوب واقف ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں نماز پڑھتے ہوئے چھوڑا اور جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے (تب بھی) وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اکثر حضرات نے نماز عصر کو افضل الصلوٰۃ قرار دیا ہے، مگر امام بخاریؒ نے صرف فضیلت بتلائی، شاید وہ دوسرے حضرات کے ہمنوا نہیں ہیں۔

قولہ **لا تضامون** پر فرمایا کہ یہ ضم سے بھی مشتق ہوسکتا ہے کہ تم ازدحام ناظرین کی وجہ سے روٴیت باری تعالیٰ سے محروم نہ ہوگے اور ضیم سے بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی روٴیت کے وقت کوئی کسی پر ظلم کرکے اس سے محروم نہ کرسکے گا۔

تجلیات باری تعالیٰ

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر تجلی خداوندی کا بھی تفصیل سے ذکر کیا، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:- میرے نزدیک یہاں رؤیت سے مراد رؤیت تجلی ہے، رؤیت ذات نہیں ہے، جیسا کہ شیخ اکبرؒ نے اختیار کیا ہے اور اس کی تقسیم رؤیۃ شمسیہ وقمریہ سے کی ہے، (حدیث میں رویۃ قمر وشمس دونوں سے تشبیہ وارد ہے) پھر یہ ہے کہ رؤیت تجلی ہی کو رؤیت ذات بھی کہا جاتا ہے، مثلاً تم خواب میں حق تعالیٰ کا دیکھنا بیان کرو تو مراد اس کی تجلی ہی ہوتی ہے، تو جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے کوہ طور پر حضرت حق تعالیٰ کی تجلی ہوئی تھی، ایسے ہی محشر میں بندوں کے لئے ہوگی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رؤیۃ ذات باری کی درخواست کی تھی جو تجلی دکھلا کر پوری کر دی گئی کیونکہ رؤیت ذات تجلی کے ذریعہ ہوسکتی ہے اور اسی کے ضمن میں انکشاف ذات بھی کما یلیق بشأنہ ہوسکتا ہے اور ان تجلیات کے مراتب غیر متناہی ہیں، یہ تو شیخ اکبرؒ کی تحقیق ہے، پھر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے بھی اس بارے میں بہت عمدہ تحقیق فرمائی ہے نیز تجلیات اور وجہ ویدوغیرہ میں بھی فرق ہے کہ یہ مبادی ءصفات اور متعلقات ذات ہیں، اسی لئے اس سے منفصل نہیں ہے، تجلیات صور مخلوقہ وآثار افعال میں جو ذات حق سے منفصل اور جدا ہیں، امام بخاریؒ نے ان کا نام شؤن رکھا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

عورتوں کے لئے جنت میں دیدار خداوندی

حضرتؒ نے فرمایا:- اس سے معلوم ہوا کہ ان نمازوں کے اہتمام کی وجہ سے ہی رؤیت باری کا شرف نمازی مومنوں کو جنت میں حاصل ہوگا، اور شاید دار قطنی کی روایت میں جو ہے کہ عورتوں کو جنت میں عیدین کے دنوں میں رؤیت حاصل ہوا کرے گی وہ اس لئے ہے کہ ان کو عیدین میں حاضر ہونے کی اجازت دی گئی تھی (جو فتنوں کے خوف سے قابل عمل نہ رہی، مگر چونکہ وہ خود اس میں معذور ہیں، اس لئے وہ شرف ان کو ضرور حاصل ہوگا جس طرح مجبوری، بیماری یا سفر کی وجہ سے نوافل واوراد نہ ہوسکیں تو اجر وثواب ضرور ملتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

قولہ **یتعاقبون فیکم** پر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں حدیث مختصر ہے، نسائی اور صحیح ابن خزیمہ میں زیادہ تفصیل ہے، فتح الباری میں بھی حدیث کے مزید کلمات کی تخریج حافظ نے کی ہے۔

نہار شرعی وعرفی: حضرتؒ نے فرمایا کہ نہار شرعی وعرفی ہونے کا لحاظ مختلف طریقوں پر ہوا ہے، مثلاً روزہ کے لئے نہار شرعی صبح صادق سے غروب تک ہے اور نماز کے حق میں صبح سے عصر تک ہے، اسی لئے نماز عصر کے بعد نفل مکروہ ہوئے کہ دن کا دفتر بند ہو چکا۔

اجتماع ملائکہ نہار دلیل

حافظؒ اور عینی نے جو حدیث ذکر کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز فجر وعصر دونوں میں دن ورات کے فرشتے جمع ہوتے ہیں جب نماز فجر میں جمع ہوتے ہیں تو رات کے فرشتے اوپر چلے جاتے ہیں اور دن کے رہ جاتے ہیں، پھر عصر کی نماز میں جمع ہوتے ہیں تو دن کے اوپر جاتے ہیں اور رات کے ٹھہر جاتے ہیں، حق تعالیٰ صبح وشام اوپر جانے والے فرشتوں سے سوال فرماتے ہیں کہ میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو، الحدیث۔ علامہ عینی نے فرمایا کہ اس میں تصریح ہے کہ ہر گروہ سے سوال فرماتے ہیں (عمدہ ۵۵۴ ج ۲، بحوالہ خزیمہ ومسند السراج عن ابی ہریرہ) پھر یہ سوال کے وہ فرشتے انسان کے محافظ فرشتے ہیں یا دوسرے ہیں، علامہ عینی نے لکھا کہ اکثر علما کے نزدیک وہ محافظ فرشتے ہیں جو بندوں کے اعمال پر نگران ہیں اور لکھنے کے لئے بھی مامور ہیں، قاضی عیاض نے غیر محافظ فرشتوں کا احتمال ذکر کیا، اس طرح کہ حق تعالیٰ ان سے بطور توبیخ کے سوال کرے گا کیونکہ فرشتوں نے "**اتجعل فیھا من یفسد فیھا**" کہا تھا، قرطبی نے فرمایا کہ یہی حکمت

دونوں وقت فرشتوں کے اجتماع کی بھی ہوسکتی ہے، کہ وہ دونوں وقت اس دنیا میں آکر مسلمانوں کو نمازوں میں مشغول دیکھیں اور حق تعالیٰ کی جناب میں حاضر ہو کر نمازوں کی شہادت دیں، اور یہ حق تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت وشفقت بندوں کے حال پر ہے کہ ان فرشتوں کو ان کی دن و رات کی برائیوں اور معاصی پر مطلع نہ ہونے دیا اور نمازوں کے اوقات میں جمع ہونے کا حکم دیا، علامہ عینی نے لکھا کہ اس مذکورہ حکمت وتوجیہ کی بناء پر تو دوسرے پر محافظ فرشتوں ہی کی بات ٹھیک ہوتی ہے کیونکہ محافظ فرشتوں پر تو انسانوں کے سارے ہی احوال منکشف رہتے ہیں ان سے صرف دو خاص وقتوں کا حال دریافت فرمانا کیسے مناسب ہوگا، دوسرے یہ کہ بعض احادیث میں یہ بھی ہے کہ جب بندہ مرجاتا ہے تو اس کے اعمال لکھنے والے دونوں کاتب[1] فرشتے اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر استغفار کرتے ہیں اور قیامت تک اس کے لئے رحمت الٰہی کی درخواست کرتے رہتے ہیں، لہٰذا ظاہر یہی ہے کہ وہ نمازوں کے وقت جمع ہونے والے غیر محافظ اور غیر کاتب فرشتے ہی ہوں گے۔

فضیلت کس کے لئے ہے

علامہ عینیؒ نے لکھا کہ جب ان دونوں نمازوں کی بہت ہی بڑی فضیلت اجتماع ملائکہ اور رفع اعمال کی ثابت ہوگئی، تو مناسب ہوا کہ جو بندے ان دونوں نمازوں پر مداومت ومحافظت کریں گے ان کو افضل عطایا یعنی رؤیت باری جل ذکرہ سے سرفراز کیا جائے، حافظ عینیؒ[2] نے یہ بھی فرمایا کہ اگرچہ حدیث کے الفاظ تو مطلق ہیں مگر یہ فضیلت بظاہر ان مومنوں کے لئے ہے جو ان دونوں وقتوں کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں۔ (عمدہ ۵۵۳ ج ۲)

حکمت سوال: علامہ عینی نے لکھا کہ حکمت فرشتوں سے خیر کی شہادت لینی ہے، بنی آدم کے لئے اور استعطاف بھی ہے تاکہ وہ ان پر مہربان ہوں، یا ان کی اتجعل والی بات کا جواب دینا ہے اور بتلانا ہے کہ صرف تم ہی تقدیس باریؑ کرنے والے نہیں ہو، بنی آدم میں بھی تم جیسے اور تمہاری ہی شہادت سے تسبیح وتقدیس کرنے والے ہیں۔

قاضی عیاض نے فرمایا کہ یہ سوال بطریقہ تعبد ہے، جس طرح ان فرشتوں کو اعمال بنی آدم لکھنے کا حکم ہوا، حالانکہ حق تعالیٰ سب باتوں کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ (عمدہ ص ۵۵۴ ج ۲)

فوائد: علامہ عینی نے بہت سے فوائد حدیث الباب کے لکھے ہیں مثلاً (۱) نماز اعلیٰ وافضل عبادت ہے کیونکہ اس کے بارے میں سوال وجواب وارد ہوا ہے (۲) نماز فجر وعصر دونوں اعظم ترین نمازیں ہیں (۳) ان دونوں وقتوں کا خصوصی شرف بھی معلوم ہوا، اور حدیث میں ہے کہ نماز صبح کے بعد رزق تقسیم ہوتا ہے اور اعمال دن کے آخری حصہ میں اوپر اٹھائے جاتے ہیں، لہٰذا جو ان اوقات میں مشغول عبادت ہوگا اس کے رزق وعمل میں خیر وبرکت ہوگی۔ (۴) اس امت کا شرف دوسری امتوں پر ثابت ہوا (۵) فرشتے بھی اس امت سے محبت کرتے ہیں کہ ان کے اعمال خیر کو خدا کے یہاں لے جاکر پیش کرکے اس کا تقرب تلاش کرتے ہیں (۶) اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کلام فرماتے ہیں (۷) نماز عصر کو خاص طور سے اہتمام کے ساتھ ادا کرنے کی ترغیب ہے کیونکہ وہ مشغولیت کے وقت ہوتی ہے (عمدہ ۵۵۵ ج ۲)

---

[1] کتنی عظیم وجلیل نعمت ورحمت خداوندی ہے کہ جو لوگ ہر قسم کے شرک سے مجتنب رہے اور ایمان اور یقین پر ان کا حسن خاتمہ ہوجائے تو دوسرے معاصی کی مغفرت اگر زندگی میں میسر نہ بھی ہوسکے تو عالم قبر میں ان کی مغفرت کا سامان مہیا کردیا گیا تاکہ قبر سے اٹھے تو بخشا بخشایا، صاف ستھرا ہو اور یہ مغفرت کا سامان بھی ان فرشتوں کے ذریعہ کرایا گیا، جو اس بندہ کی پوری زندگی کے معاصی اور بداعمالیوں سے نہ صرف پوری طرح واقف رہے، بلکہ اس کو اس بندہ کے نامہ اعمال میں آخر دم تک لکھ کر اس کا ریکارڈ تیار کرتے رہے، اب چونکہ انہوں نے دیکھا کہ حق تعالیٰ نے اس کے لئے حسن خاتمہ مقدر فرما کر احسان عظیم فرمادیا ہے تو حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے مزید سامان مہیا کرنے کے لئے استغفار میں مشغول ہوگئے۔ (مؤلف)

[2] حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ کی رائے بھی یہی تھی کہ یہ فضیلت جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کے لئے ہے، منفرد کے لئے نہیں (مؤلف)

قولہ "تر کناھم وھم یصلون" پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے اس میں تردد ہے کہ فرشتے بھی جماعت فجر وعصر میں شریک ہو کر اقتدا کرتے ہیں یا نہیں؟ موطأ امام مالکؒ میں[1] حضرت سعید بن المسیب سے نقل ہے کہ جو شخص جنگل میں نماز پڑھے تو اس کے دائیں بائیں دو فرشتے بھی نماز پڑھتے ہیں اور اگر وہ اذان دے کر نماز قائم کرے تو اس کے پیچھے فرشتے پہاڑوں کی برابر کثرت سے اقتدا کرتے ہیں تو جب ایک نماز میں اقتدا ثابت ہوگئی تو سب نمازوں میں ثابت ہو جائے گی اور آیت "ان قرآن الفجر کان مشھودا" سے اقتدا ثابت نہ ہوگی، کیونکہ مشہود بغیر اقتدا کے بھی ہوسکتا ہے جیسے یشھدون دعوۃ المسلمین وغیرہ ہیں، لہٰذا اگر مشہود کا اطلاق حضور پر ہو تو معنی ظاہر ہیں کہ ہم نے انہیں نماز پڑھتے چھوڑا ہے اور اگر اقتداء ادا ہو تو باعتبار جنس کے مطلب یہ ہوگا کہ جن کی لہٰذا ہم نے نہیں کی ان کو نماز پڑھتے چھوڑا ہے، وہ مراد نہ ہوں گے جن کی اقتدا میں وہ فرشتے خود نماز پڑھ کر گئے ہیں کہ ان کے ساتھ تو نماز ختم کر کے اوپر گئے ہیں، یا مسبوق وغیرہ مراد ہوں گے کہ ان کو نماز پوری کرتے ہوئے چھوڑا ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھے امام بخاری کے اس طریقہ میں بھی اشکال ہے کہ انہوں نے حدیث مذکور کو صرف فضیلت عصر کے لئے خاص کر لیا جبکہ حدیث میں فجر کی بھی فضیلت موجود ہے، پھر جب فجر کی فضیلت کا باب قائم کیا تو وہاں بھی اس حدیث کو نہیں لائے اور صرف آیت ان قرآن الفجر کان مشھودا کو ذکر کیا پس ہوسکتا ہے کہ حدیث مذکور کو صرف فضیلت عصر پر محمول کیا ہو اور فجر میں ملائکہ کو طرف نہار پر محمول کیا ہو بخلاف عصر کہ اس میں حضور ملائکہ کو خود اس کی ذاتی فضیلت پر مبنی سمجھا طرف نہار کی وجہ سے نہیں کہ طرف حسی مغرب ہے اگر طرف ہونے کی وجہ سے حاضر ہوتے تو مغرب کے وقت آتے نہ کہ عصر کے وقت ایک اشکال یہ بھی ہے کہ جب فرشتوں کی آمد دونوں وقت ہوئی ہے تو آیت میں صرف فجر کی تخصیص کیوں ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ اس میں قراءت جہری ہونے کی وجہ سے فرشتوں کے حضور وشہود کا ذکر زیادہ اہم ہوگیا، کیونکہ ان میں قرآن مجید سننے کا اشتیاق وشغف بہت ہی زیادہ ہے۔

باب من ادرک رکعة من العصر قبل الغروب

(اس شخص کا بیان، جو غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پائے)

۵۲۶. حدثنا ابو نعیم قال حدثنا شبان عن یحییٰ عن ابی سلمة عن ابی ھریرة قال قال رسول الله ﷺ اذا ادرک احدکم سجدة من صلوٰة العصر قبل ان تغرب الشمس فلیتم صلوٰته واذا ادرک سجدة من صلوٰة الصبح قبل ان تطلع الشمس فلیتم صلوته.

۵۲۷. حدثنا عبدالعزیز بن عبدالله قال حدثنی ابراھیم عن ابن شھاب عن سالم بن عبدالله عن ابیه انه اخبره انه سمع رسول الله ﷺ یقول انما بقاؤکم فیما سلف قبلکم من الامم کما بین صلوٰة العصر الیٰ غروب الشمس اوتی اھل التوراة التوراة فعملوا حتیٰ اذا نتصف النھار عجزو فاعطوا قیراطاً قیراطاً ثم اوتی اھل الانجیل الانجیل فعملوا الیٰ صلوٰة العصر ثم عجزو فاعطوا قیراطاً و قیراطا ثم اوتینا القرآن فعملنا الی غروب الشمس فاعطینا قیراطین قیراطین فقال اھل الکتابین ای ربنا اعطیت ھؤلاء قیراطین قیراطین واعطیتنا قیراطا قیراطا ونحن کنا اکثر عملا قال الله عز و جل ھل ظلمتکم من اجرکم من شیء قالو الا قال وھو فضلی اوتیه من اشآء.

---

[1] یہ اثر موطأ امام مالک میں موقوفاً مروی ہے مگر مرفوع ہے، کیونکہ ایسی بات رائے سے نہیں کہی جاسکتی اور موصولاً بھی بروایت حضرت سلمان فارسیؓ بالمعنی نسائی میں ہے، بیہقی وابن ابی شیبہ وغیرہما کے یہاں حضرت سلمانؓ ہی سے موقوفاً مروی ہے۔ اوجز ص ۱۹۵)

۵۲۸۔ حدثنا ابو كريب حدثنا ابو اسامة عن بريد عن ابى بردة عن ابى موسى عن النبى ﷺ قال مثل المسلمين واليهود و النصارىٰ كمثل رجل ن الستاجر قوما يعملون له عملا الى الليل فعملوا الى نصف النهار فقالو لاحاجة لنا الى اجرک فاستاجر اٰخرين فقال اكملو بقية يومكم ولكم الذى شرطت فعملوا حتىٰ اذا كان حين صلوٰة العصر قالو لک ما عملنا فاستاجر قوما فعملو بقية يومهم حتىٰ غابت الشمس فاستكملو آ اجرا لفريقين.

ترجمہ ۵۲۶: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی شخص کو نماز عصر کی ایک رکعت آفتاب کے غروب ہونے سے پہلے مل گئی تو باقی نماز پوری کر لینی چاہئے اور جب نماز فجر کی ایک رکعت طلوع آفتاب سے پہلے مل گئی تو باقی نماز پوری کر لینی چاہئے۔

ترجمہ ۵۲۷: حضرت سالم بن عبداللہ (ابن عمرؓ) اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ تمہاری بقا ان امتوں کے مقابلہ میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسی ہے، جیسے نماز عصر سے لے کر غروب آفتاب تک، کہ توراۃ والوں کو توراۃ دی گئی اور انہوں نے (اس پر) عمل کیا، یہاں تک کہ دوپہر کا وقت آ گیا تو وہ تھک گئے اور انہیں ایک ایک قیراط دے دیا گیا، اس کے بعد انجیل والوں کو انجیل دی گئی اور انہوں نے عصر کی نماز تک کام کیا پھر وہ تھک گئے تو انہیں ایک ایک قیراط دے دیا گیا اس کے بعد ہم لوگوں کو قرآن دیا گیا اور ہم نے غروب آفتاب تک کام کیا تو ہمیں دو، دو قیراط دیئے گئے، اس پر دونوں اہل کتاب نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ان لوگوں کو دو، دو قیراط دیئے اور ہمیں ایک ہی قیراط دیا، حالانکہ ہم کام کے اعتبار سے زیادہ ہیں، اللہ عزوجل نے فرمایا کہ میں نے تمہاری مزدوری میں سے کچھ کم کیا، وہ بولے نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرا فضل ہے، جسے چاہتا ہوں زیادہ دیتا ہوں۔

ترجمہ ۵۲۸: حضرت ابوموسیٰؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، مسلمانوں کی اور یہود و نصاریٰ کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک شخص نے کچھ لوگوں کو مزدوری پر لیا ہو، تاکہ رات تک اس کا کام کریں چنانچہ انہوں نے دوپہر تک کام کیا اور کہا کہ ہمیں تیری مزدوری کی کچھ حاجت نہیں، لہٰذا اس نے دوسروں کو مزدوری پر لگا لیا اور (ان سے) کہا کہ باقی دن اپنا پورا کرو اور جو کچھ میں نے مزدوری مقرر کی ہے، تمہیں دوں گا، لہٰذا انہوں نے کام کیا، یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت آ گیا، ان لوگوں نے کہا کہ جو کچھ ہم نے کام کیا، وہ تیرے لئے اتنا ہی ہے، پھر اس نے دوسرے لوگوں کو مزدوری پر لگایا تو انہوں نے بقیہ دن کام کیا، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا اور ان لوگوں نے دونوں فریق کی (برابر) مزدوری پوری حاصل کر لی۔

تشریح: امام بخاری اس باب میں تین حدیثیں لائے ہیں پہلی سے بتلایا کہ کسی کام کے آخری حصہ میں شریک ہو جانے سے بھی اس میں پوری شرکت سمجھی جاتی ہے، جس طرح نماز عصر وغیرہ کو اگر آخر وقت میں پالیا تو گویا پوری نماز کو پالیا یا جس طرح حق تعالیٰ کی مقررہ اجرت عمل کو پہلی امتوں نے شروع اور درمیانی دن کے حصہ میں عمل کر کے پایا تو آخر دن میں عمل کرنے والے بھی اس کے مستحق بن گئے، امام بخاری پہلی حدیث کو چند ابواب کے بعد آگے لائیں گے (نمبر ۵۴۹ و ۵۵۰) اور دوسری و تیسری حدیث کو بھی اجرت وغیرہ کے ابواب میں لائیں گے۔

یہاں یہ بحث نہایت اہم اور دقیق چھڑ گئی ہے کہ حدیث اول کا اصل مطلب کیا ہے، ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر طلوع وغروب آفتاب سے قبل نماز کے ایک سجدہ یا رکعت کا وقت پالیا تو اس نماز کو پورا کرنا ضروری ہے، اس کے شروع کرنے سے نماز پڑھنے والوں میں اس کا شمار ہو گیا مگر چونکہ عمل پورا نہیں ہوا اس لئے اس کی تکمیل کرے گا، پھر چونکہ طلوع وغروب کے وقت کوئی نماز صحیح نہیں ہو سکتی جیسا کہ بخاری کی حدیث نمبر ۵۵۳ میں آئے گا کہ جب سورج نکلنا شروع ہو جائے یا ڈوبنے لگے تو نماز کو مؤخر کر دو، تو امام طحاوی تو کہتے ہیں کہ جتنی

پڑھ چکا ہے وہ باطل ہوگئی، پھر سے طلوع وغروب کے بعد پوری پڑھے، امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ صبح کی ہو تو یہی حکم ہے، غروب کے قریب والی ہو تو پوری کرلے، وہ جائز و درست ہوگی، امام ابو یوسف سے ایک شاذ روایت یہ ہے کہ صبح کی نماز کی اگر ایک رکعت پڑھی تھی اور سورج طلوع ہونے لگا تو اتنی دیر توقف کرے کہ سورج اچھی طرح نکل آئے اور کراہت کا وقت نہ رہے تو باقی رکعت پوری کرلے، اس کے فرض ادا ہو جائیں گے، امام اعظمؒ کے نزدیک ایسا کرنے سے وہ نماز نفل ہوگی، فرض پھر سے پڑھے گا، دوسری روایت امام ابو یوسف سے بھی اس کے مطابق ہے امام محمدؒ کی رائے ہے کہ ایسی نماز نہ فرض ہوگی نہ نفل، سرے سے باطل ہی ہے۔

ائمہ ثلاثہ (امام مالک، شافعی، احمد) فرماتے ہیں کہ صبح کی نماز بھی عصر کی طرح درست ہو جاتی ہے اور بخاری کی یہ حدیث اور آگے آنے والی دو حدیثیں نمبر ۵۴۹ و ۵۵۰ بظاہر ان ائمہ ثلاثہ کی موافقت کر رہی ہیں مگر زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے اور احادیث و آثار کے پورے ذخیرے پر نظر کی جائے تو امام اعظمؒ کی رائے عالی ہی زیادہ صائب ثابت ہوگی، وجہ یہ ہے کہ ابھی ہم نے ذکر کیا کہ حدیث الباب میں اشارہ وقت کی طرف ہے مگر یہ بات قطعی نہیں کیونکہ دوسری احادیث مسلم وابوداؤد وغیرہ یہ بتلاتی ہیں کہ اس نوع کی احادیث وقت سے متعلق نہیں بلکہ مسبوق یا معذور سے تعلق رکھتی ہیں اور خود حافظ ابن حجرؒ نے بھی باوجود شافعی ہونے کے حدیث نمبر ۵۴۹ کے تحت لکھا:-''ادراک کے معنی پالینے کے ہیں'' تو بظاہر جو مطلب اس سے نکلتا ہے کہ جس نے ایک رکعت فجر کی پالی تو فجر کی نماز پالی اور نماز فرض کا مطالبہ ایک ہی رکعت پڑھنے سے ختم ہو گیا، یہ مطلب تو بالاجماع غلط ہے، پھر دوسرا مطلب یہ محتمل ہے کہ ایک رکعت پالینے سے اس کو وقت مل گیا، لہٰذا دوسری رکعت بھی پڑھ لے گا تو نماز کامل ہو جائے گی، اس ثانوی احتمال کو جمہور نے اختیار کیا ہے، جس کی تائید بیہقی وغیرہ کی روایات سے بھی ہوتی ہے الخ۔ پھر حافظ نے حدیث نمبر ۵۵۰ پر پہلے تو محدث کرمانی شارح بخاری کا کلام ذکر کر کے اس کے تضاد کی طرف اشارہ کیا، پھر علامہ تیمی (شارح بخاری) کا قول ذکر کیا کہ امام بخاری کی حدیث الباب کا مطلب یہ ہے کہ اگر امام کے ساتھ ایک رکعت مل گئی تو اس کو جماعت کی فضیلت مل گئی اور لکھا کہ بعض کی رائے یہ ہے کہ نماز سے مراد جمعہ کی نماز ہے کہ اس کی ایک رکعت بھی امام کے ساتھ پالی تو جمعہ کی نماز پوری مل گئی اور لکھا کہ دوسرے اقوال بھی ہیں اس بارے میں منقول ہیں، پھر لکھا کہ یہ بات تو واضح ہے کہ ''فقد ادرک بالصلوٰۃ'' (کہ ایک رکعت مل جانے سے پوری نماز مل گئی) یہ بات اپنے ظاہری مطلب کے لحاظ سے بالاجماع غیر صحیح ہے یعنی کسی کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہو سکتی، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے لہٰذا اس کا مطلب درست کرنے کے لئے کچھ مقدر ماننا پڑے گا، مثلاً یہ کہ جس کو ایک رکعت مل گئی اس نے نماز کا وقت پالیا، یا حکم نماز کا پالیا وغیرہ اور اس کو باقی نماز کو پورا کرنا ضروری ہوگا۔ (فتح ۳۸ ج ۲)

امام طحاویؒ وغیرہ کا مسلک

اس سے معلوم ہوا کہ من ادرک رکعۃ فقد ادرک الصلوٰۃ کے مطلب میں کئی احتمال ہیں اسی لئے، ائمہ مجتہدین ومحدثین کے انظار وآراء بھی مختلف ہوگئی، امام طحاویؒ جو بظاہر سب سے الگ معلوم ہوتے ہیں ان کے ساتھ بھی بہت سے اہل علم ہیں جیسا کہ محدث ابن وہب کا بیان ہے ملاحظہ ہو مدونہ ۹۳، ان سب کی رائے یہ ہے کہ اس نوع کی تمام احادیث حائضہ عورت، نائم یا نومسلم یا مریض وغیرہ کے لئے ہیں، یعنی حائضہ عورت آخر وقت میں پاک ہوئی کہ صرف ایک رکعت کا وقت پایا، یا سونے والا ایسے آخر وقت میں بیدار ہوا، یا ایک غیر مسلم ایسے آخر وقت میں اسلام لایا، یا کوئی مریض بے ہوش تھا اور نماز کے آخرت وقت پر ہوش میں آیا تو ان سب پر اس وقت کی نماز لازم ہوگئی، اور حدیث میں صرف طلوع وغروب سے قبل والی دو نمازوں کا ذکر اس لئے ہوا ہے کہ ان وقتوں کے ختم ہونے کو ہر عامی و جاہل بھی جان لیتا ہے، اس لئے حکم سب نمازوں کے آخر وقت کا ایک ہی ہے، غرض امام طحاوی اور ان کے ہم خیال سب دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ ان احادیث سے خاص طلوع وغروب کے وقت نماز درست ہونے کا کوئی ثبوت نہیں اور اگر مان بھی لیا جائے تو دوسری احادیث متواترہ اس کے

جواز کو منسوخ کر دیتی ہیں، جن میں طلوع وغروب کے وقت میں نماز کی صریح ممانعت آگئی ہے، لہٰذا اگر نماز پوری ہونے سے قبل طلوع و غروب ہونے لگے تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔

ائمہ ثلاثہ کا مسلک

یہ دوسرا مسلک ہے کہ طلوع وغروب ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی، اگر ایک رکعت پہلے پڑھ لی ہے تو دوسری بعد طلوع یا بعد غروب کے پڑھ لے تو اس کی نماز ادا قرار پائیگی امام شافعیؒ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ پہلی رکعت ادا اور دوسری قضا شمار ہوگی، غرض ان سب حضرات نے بجائے دقت نظر کے ظاہریت کی شان دکھلائی ہے اور احتمال والی احادیث کی وجہ سے صریح وصاف احادیث سے صرف نظر کی ہے، جیسا کہ ہم اس بات کو دلائل کے ساتھ واضح کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وبہ نستعین

امام اعظمؒ کا مسلک

بظاہر امام صاحب کی رائے اس مسئلہ میں سب سے الگ ہے کہ وہ نماز عصر میں تو ائمہ ثلاثہ کے ساتھ ہیں، مگر نماز فجر میں الگ ہو گئے، اگرچہ ہم یہ بھی بتلائیں گے کہ نماز عصر کے بارے میں بھی جو ان کا مسلک بعض حنفیہ نے سمجھا ہے وہ نہیں بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق میں دوسرا ہے، امید ہے کہ حضرتؒ کی اس تحقیق وتدقیق کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے مسلک امام کی توضیح تو اس طرح فرمائی کہ عام کتب متون حنفیہ میں جو یہ لکھا ہے کہ اگر عصر کی نماز شروع کی اور ایک رکعت پڑھی تھی اور جو سورج غروب ہونے لگا تو اس کو بعد غروب کے پورا کر لے، یہ ترجمانی صحیح نہیں بلکہ جس طرح امام محمدؒ نے اپنے موطأ میں لکھا ہے وہ صحیح ہے، آپ نے باب الرجل ینسی الصلوٰۃ میں لکھا کہ حضور علیہ السلام نے لیلۃ التعریس کے بعد صبح کی نماز پڑھی اور فرمایا: - جو شخص نماز بھول جائے تو جب یاد آئے تو پڑھ لے، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے قائم کرو نماز میری یاد کے لئے، امام محمدؒ نے فرمایا کہ اسی پر عمل کرتے ہیں، الا یہ کہ کوئی ان ساعات میں یاد کرے، جن میں حضور علیہ السلام نے نماز پڑھنے سے روک دیا ہے جبکہ سورج طلوع ہو بلند اور روشن ہونے تک، نصف النہار کے وقت زوال ہونے تک اور شام کو جب سورج کی دھوپ لال پیلی ہو جائے، اس کے غروب ہونے تک، البتہ اسی دن کی عصر کی نماز پڑھے گا اگرچہ آفتاب زرد ہو جائے غروب سے پہلے تک اور یہی قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے۔

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ بڑی عجیب بات ہے کہ حنفیہ نے امام محمدؒ کے اس صریح ارشاد کی طرف توجہ نہ کی، پھر فرمایا کہ درمختار میں قنیہ سے نقل کیا کہ اگر ایک شخص غروب سے پہلے نماز شروع کرے پھر غروب تک اس کو طویل کر لے تو ہمارے نزدیک مکروہ نہ ہوگا اور یہی روایت امام شافعی سے ہے، اس کتاب کا مصنف فقہ میں تو حنفی ہے مگر اعتقاد میں معتزلی ہے، اس لئے ہم اس کے تفردات کو قبول نہ کریں گے، مگر پھر میں نے اس مسئلہ کو فخر الاسلام کی اصول البزدوی میں بھی دیکھا تو انکار کی گنجائش نہ رہی مگر تردد باقی رہا اور صاحب التوضیح نے جو اعتذار خشوع وخضوع کا پیش کیا اس سے بھی تشفی نہ ہوئی، پھر میں نے فیصلہ کیا کہ فخر الاسلام نے قول مرجوع پر تفریع کی ہے، کیونکہ صورت مذکورہ میں فقہاء حنفیہ نے اختلاف کیا ہے، بحر میں ہے کہ ایسی طوالت کا فقط فعل مکروہ ہے، نماز میں کراہت نہیں آتی، دوسرے فقہاء کی رائے ہے کہ ایسا فعل اور نماز دونوں مکروہ ہیں، اور یہی قول ارجح ہے، فخر السلام نے بھی عدم کراہت صلوٰۃ والا مرجوع قول اختیار کر لیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام صاحب کا مسلک وہی ہے جو امام محمدؒ نے بھی لکھا ہے کہ اس دن کی نماز عصر بھی صرف اصفرار شمس کے وقت پڑھی جا سکتی ہے جو غروب سے پہلے ختم ہو جائے تا کہ پوری نماز غروب سے قبل ہو جائے، حضرتؒ نے مزید وضاحت فرمائی کہ غروب دو ہیں ایک شرعی، دوسرا حسی اور حنفیہ کے یہاں جو اسی دن کی عصر ادا ہو سکتی ہے وہ غروب شرعی (اصفرار شمس) تک ہے، دوسرے ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ اگر

غروب حقیقی وحسی سے قبل بھی صرف ایک رکعت پڑھ سکے تو پڑھ لے اور غروب کے بعد باقی پڑھ لے، لہٰذا حدیث نبوی کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص ایک رکعت نمازعصر کی امام کے ساتھ اصفرار شمس سے پہلے پالے اس کو نمازعصر مل گئی اور یہ کہ اصفرار کے بعد غروب تک وقت منافق کا ہے، یہ حصہ تعلیم نبوی میں داخل ہونے کے لائق نہ تھا، اس لئے متروک ہوا، پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک کوئی بھی دلیل، اس کے لئے نہیں ہے کہ اگر ایک شخص غروب سے قبل ایک رکعت پالے تو غروب کے بعد اس کو پورا کرلے اور وہ اس نماز کا مدرک ہوجائے گا۔

بخاری کی حدیث الباب مسبوق کے لئے ہے

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علامہ نوویؒ نے حدیث **من ادرک رکعة من العصر** کے بارے میں کہا کہ یہ اس کے لئے صریح دلیل ہے کہ جو شخص ایک رکعت صبح یا عصر کی پڑھ لے، پھر وقت نکل جائے تو اس کی نماز باطل نہ ہوگی بلکہ اس کو پورا کرلے گا اور وہ صحیح ہوگی اور یہ مسئلہ عصر کے بارے میں مجمع علیہ ہے، لیکن صبح میں اس کے قائل ائمہ ثلاثہ اور سارے ہی علماء امت ہیں بجز امام ابوحنیفہؒ کے انہوں نے فرمایا کہ صبح کی نماز طلوع شمس سے باطل ہوجائے گی، کیونکہ ممانعت صلوٰۃ کا وقت داخل ہوگیا، بخلاف غروب شمس کے اور یہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔

حضرت شاہ صاحب کا افادۂ خصوصی

حضرتؒ نے فرمایا کہ بخاری کی اس حدیث الباب کو علماء حنفیہ نے بھی مواقیت پر محمول کیا ہے، جس کا مفاد یہ ہوگا کہ دوسری رکعت طلوع یا غروب کے بعد پڑھی جاسکتی ہے اور اس طرح اسی مسئلہ میں حنفیہ کا باہم اختلاف ہوگا، جو اوپر ذکر کیا گیا ہے مگر میرے نزدیک یہ حدیث بھی دوسری احادیث کی طرح مسبوق کے حق میں ہے اور مواقیت سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہے، لہٰذا باہمی اختلاف کی صورت میں یہاں سامنے آئے گی اور دلیل میری یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ والی چند جگہ اور آئی ہے اور سارے ہی حنفیہ متفق ہیں کہ وہ سب حدیثیں مسبوق کے بارے میں ہیں۔

(۱) مسلم شریف وغیرہ کی حدیث **من ادرک رکعة من الصلوٰة فقد ادرک الصلوٰة**، اس میں اور بخاری کی حدیث الباب میں کوئی فرق نہیں بجز اس کے کہ یہ سب نمازوں کے لئے عام ہے اور حدیث الباب صرف فجر وعصر کے لئے ہے اور ان کی تخصیص کا نکتہ یہ ہے کہ وہ دونوں بعض اوصاف میں مشترک ہیں، مثلاً دونوں کے التزام واہتمام پر رؤیت باری کا وعدہ ہے اور حدیث **من صلے البردین دخل الجنة** بھی ہے اور قرآن مجید کی بہی بہت سی آیات میں ایک ساتھ ذکر ہوئی جیسے **وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب** اور تمام حنفیہ متفق ہیں کہ حدیث عام قطعاً بحق مسبوق ہے، کیونکہ مسلم شریف میں دوسرے طریق سے **من ادرک رکعة من الصلوٰة مع الامام** فقد ادرک وارد ہے، اس میں تصریح مسبوق کی ہے، جبکہ ان دونوں کی سند واحد ہے، لہٰذا دونوں کے اتحاد کا دعویٰ بھی کیا جاسکتا ہے کہ کبھی راوی نے تعمیم کردی اور کبھی تخصیص اور اس کو باب اختلاف رواۃ یا اختلاف راوی میں سے بھی قرار دے سکتے ہیں، پس ایک کی قید کو دوسری میں ثابت کرسکتے ہیں اور دونوں کو مسبوق یا نصاً محمول کرسکتے ہیں، تاہم میں نے ان دو کو حدیث مان کر ہی دونوں کو بحق مسبوق قرار دیا ہے۔

(۲) (راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بخاری میں بھی حدیث نمبر ۵۵۰ مسلم شریف کی مندرجہ بالا عام حدیث کی طرح ہے بعینہ)

(۳) نسائی شریف باب **من ادرک رکعة من الصلوٰة** میں حضرت سالمؒ سے حدیث **من ادرک رکعة من صلوٰة من الصلوٰت فقد ادرکھا الا انه یقضی مافاته**، دوسری حدیث حضرت سالم عن ابیہ سے ہے **من ادرک رکعة من الجمعة او غیرھا فقد تمت صلوٰته**، یہ دونوں بحق مسبوق ہیں۔

(۴) ابوداؤد شریف **باب الرجل یدرک الامام ساجدا کیف یصنع** میں بھی حدیث ابی ہریرہؓ ہے:- **اذا جئتم الی**

الصلوة و نحن سجودنا سجد ولا تعدوها شيئا ومن ادرک رکعة فقد ادرک الصلوة.

(۵) علامہ عینی نے دارقطنی سے حدیث نقل کی من ادرک صلوة رکعة قبل ان یقیم الامام صلبه فقد ادرکها، یہ بھی صریح حکم مسبوق ہے اور حدیث ابوداؤ د پر امام بخاری نے کچھ نقد بھی کیا ہے، مگر یہ صحیح ابن خزیمہ میں بھی ہے۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ میں یہ تو دعوے نہیں کرتا کہ حدیث ایک ہی ہے، البتہ یہ کہتا ہوں کہ احادیث ماثورہ میں اختلاف لفظی ہے جوراویوں کی طرف سے آیا ہے بلکہ یہ بھی احتمال ہے کہ اس بارے میں حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس متعدد احادیث نبویہ ہوں جو ان کومختلف اوقات میں حاصل ہوئی ہوں گی اور حضور علیہ السلام نے ان کومختلف اوقات میں مختلف ارشادات کئے ہوں، مگر سب کا مفاد وحکم ایک ہی ہے، جو باوجود اختلاف تعبیرات کے بدل نہیں سکتا۔

حدیث بیہقی کی تحقیق

حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیث کے الفاظ **فقد ادرک الصلوة یا فلیصل الیها رکعة اخری یا فلیضف یا فلیتم صلوة وغیرہ** کو بلاکسی تکلیف کے مسبوق کے حق میں شمار کر سکتے ہیں لیکن حدیث بیہقی کے یہ الفاظ **من ادرک من الصبح رکعة قبل ان تطلع الشمس و رکعة بعد ما تطلع الشمس فقد ادرک الصلوة** بتلاتے ہیں کہ حدیث وقت وقت کے بارے میں ہے، مسبوق کے بارے میں نہیں اور یہ کہ رکعت طلوع شمس کے بعد پڑھی جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حافظ سے سہو ہو گیا کہ اس حدیث کو باب مواقیت میں لے آئے حالانکہ وہ فجر کی سنتوں کے بارے میں ہے اور حدیث مشارالیہ زیادہ صحیح طور پر ترمذی شریف میں ہے مرفوعاً حضرت ابو ہریرہؓ سے کہ جو شخص صبح کی دو رکعت (سنت) نہ پڑھے تو ان کو طلوع شمس کے بعد پڑھ لے، علامہ ذہبی نے بھی اس کی تصحیح کی ہے تو اصل حدیث تو یہ تھی، اس کو راویوں نے بدل دیا اور یہ حدیث میرے پاس اکیس طریقوں سے موجود ہے، ان سب کا مدار حضرت قتادہ پر ہے اور راوی صحابی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں پھر بعض نے تو مسئلہ اداء سنن فجر بعد الطلوع کی صراحت کر دی اور بعض نے مبہم طور سے ایسے الفاظ روایت کر دیئے جو حافظؒ نے نقل کئے ہیں، حالانکہ ان کی مراد بھی رکعت سے نماز ہی تھی اور رکعت قبل طلوع سے نماز صبح کے فرض مراد لئے تھے اور رکعت بعد الطلوع سے سنت فجر کا ارادہ کیا تھا، اور اس قسم کی تخلیط راویوں سے بہت ہوتی رہتی ہے، جس کو فن حدیث ورجال کے واقف جان لیتے ہیں۔

رکعتی الفجر کی دلیل

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دلیل رکعتی الفجر کے ہونے کی یہ بھی ہے کہ ان طرق میں کسی طریق میں عصر کا کوئی ذکر نہیں ہے، اگر یہ بھی اسی حدیث عام (زیر بحث) کے زمرے سے ہوتی تو اس میں بھی عصر کا ذکر ہونا چاہئے تھا۔

ادراک رکعت سے ادراک جماعت کا حکم

حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے لئے پورے غور وفکر اور کثیر مطالعہ کے بعد یہ بات منقح ہوگئی ہے کہ حدیث **من ادرک رکعة** والی باب اجتماع و جماعت میں وارد ہوئی ہے تا کہ اس امر کی تعلیم دے کہ کتنا حصہ پالینے سے جماعت کی نماز پانے والا اقرار پائے گا اور شریعت نے اس کے لئے مستقل باب قائم کیا ہے اور بتلایا کہ کم سے کم ایک رکعت امام کے ساتھ پالے تو مدرک جماعت ہوگا اور اس سے کم میں نہ ہوگا اگر چہ فضیلت جماعت حاصل ہو جائے گی۔

حقیقت ادراک: یہ ہے کہ کوئی چیز فوت ہونے کے قریب ہو اور اسے کوشش کر کے پالیا جائے، جیسے دوڑ میں کوئی آگے نکل جائے تو کوشش کر کے اس کو پکڑ لیا جائے، یہی حال مدرک صلوة امام کا ہے کہ امام کئی رکعت پڑھ کر آگے بڑھ گیا ہے اور اس نے آخری رکعت میں

شریک ہوکراس کو پالیا، شریعت نے اس کی کوشش کی وجہ سے اس کو پوری نماز میں شرکت کرنے والوں کے ساتھ شامل کر دیا، جس طرح رکوع میں شامل ہوجانے والے کو پوری رکعت پڑھنے والوں کے برابر کر دیا، اور فاتحہ بھی اس سے ساقط کردی، پس تکبیر تحریمہ تو مقام سبقت ہے، موضع آمین مقام جمع ہے، جونقطہ مرکز دائرہ بھی اور مجتمع الملائکہ والناس بھی ہے، رکوع مقام احتساب ہے، پھر اگر آمین کا مقام فوت ہوجائے تو موضع تحمید سے تلافی ہوگی کہ اس میں بھی فرشتے شرکت کرتے ہیں۔

ابتداء سمع اللہ لمن حمدہ: حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ دیر سے پہنچے اور تکبیر تحریمہ کہہ کر رکوع میں شریک ہوئے، پھر رکوع سے اٹھتے ہوئے تحمید کی، گویا نماز کا خلاصہ پیش کیا، نماز سے فارغ ہوکر حضور علیہ السلام کے پاس وحی آئی کہ خدا نے حمد کرنے والے کی آواز سن لی اور اس کے بعد سے ہی **سمع الله لمن حمده** کہنے کا حکم ہوگیا، جبکہ پہلے رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے بھی تکبیر ہی کہی جاتی تھی۔

عصر کا وقت مکروہ: اوپر کی تحقیق سے واضح ہوگیا کہ اصفرار شمس سے غروب شمس تک وقت نماز عصر کے لئے وقت مکروہ اور حضور علیہ السلام نے جو دوسرے دن آخری وقتوں میں نماز عصر پڑھ کر بتلائی تھیں، تو عصر کی نماز ختم ہوتے ہی صحابہ کا کہنا ہے کہ سورج میں سرخی آ گئی تھی اور اسی لئے حنفیہ کا راجح مسلک وہ ہے جو امام محمدؒ نے بتلایا کہ اسفرار شمس سے قبل عصر پڑھ لی جائے اور جن حضرات حنفیہ نے غروب تک کی عصر کی نماز کو بھی مکروہ قرار نہیں دیا وہ مرجوع ہے بلکہ اس کو مسلک حنفی نہ کہا جائے تو بہتر ہے اسی لئے حضرت شاہ صاحبؒ بڑے افسوس کے ساتھ فرمایا کرتے تھے، کہ کچھ حنفیہ نے امام محمدؒ کی تصریح کو نظر انداز کر دیا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ عصر میں زیادہ تاخیر کرتے ہیں وہ بھی مسلک حنفی کی صحیح رعایت نہیں کرتے، حضرت شاہ صاحبؒ نے مسجد دارالعلوم دیوبند کی نماز عصر کی زیادہ تاخیر کو بھی ناپسند کیا تھا۔

ائمہ اربعہ کا اتحاد: یہاں غالباً اس امر کا اظہار بھی بے محل نہ ہوگا کہ جن حضرات نے امام اعظمؒ کا مسلک نماز عصر کے بارے میں ائمہ ثلاثہ کے ساتھ متحد بتلایا ہے وہ ان کی مسامحت ہے کیونکہ اوپر کی تفصیل سے یہ بات نکھر جاتی ہے کہ امام صاحب کا مسلک جواز عصر یومیہ وقت مکروہ (اصفرار) میں شروع اور اسی پر ختم ہے نہ کہ وہ کچھ نماز عصر غروب سے قبل اور کچھ بعد میں جو دوسرے ائمہ کا مسلک ہے، لہٰذا اگر عصر کی نماز ختم کرنے سے قبل بھی غروب شروع ہوجائے تو نماز باطل ہوجائے گی جس طرح صبح کا حکم ہے، یعنی طلوع وغروب حقیقی کے وقت شارع علیہ السلام کی ممانعت نماز کی وجہ سے صبح وعصر دونوں نمازوں کا حکم ایک ہے، البتہ غروب شرعی (اصفرار) مبطل صلوۃ یومیہ نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قولہ انما بقاءکم: بخاری کی پہلی حدیث الباب پر کلام گذرا، اب دوسری وتیسری باقی ہے اور دونوں کا مضمون تقریباً مشترک ہے، تشریح وبحث سے قبل مختصر مطلب کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ گذشتہ امتوں کی نسبت سے تمہاری دنیا میں بقاء و رہائش اتنی ہے جتنی کہ عصر سے مغرب تک مدت ہوتی ہے، اہل توراۃ کو عمل کے لئے حکم ہوا تو دوپہر تک کام کر کے عاجز ہوگئے، لہٰذا مقررہ اجرت ایک ایک قیراط دے دی گئی، پھر اہل انجیل کو کام سپرد کیا تو انہوں نے عصر کے وقت کام چھوڑ دیا اور پورا نہ کیا، ان کو بھی ایک ایک قیراط دے کر رخصت کر دیا گیا تب ہمیں قرآن مجید دیا گیا کہ اس پر عمل کریں، اور ہم نے غروب تک عمل میں مشغول رہ کر دن پورا کر دیا، لہٰذا حق تعالیٰ نے کام کی تکمیل سے خوش ہوکر ہمیں دو دو قیراط عطا فرمادیئے، دونوں اہل کتاب نے شکایت کی کہ بارالٰہا! ہم نے تو زیادہ عمل کیا تھا (اجرت میں کمی کیوں ہوئی؟) حق تعالیٰ نے فرمایا: - کیا میں نے تمہاری مقررہ اجرت سے کچھ کم کیا (حالانکہ تم نے پورے دن کام بھی نہ کیا) وہ بولے نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پھر یہ تو میرا فضل وانعام ہے، جس کو چاہوں زیادہ دیدوں (یعنی کمی پر تو اعتراض کی گنجائش ہے، زیادہ پر نہیں)

دوسری حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تمہاری اور یہود ونصاریٰ کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے کچھ لوگوں کو صبح سے رات کے لئے کام پر لگایا لیکن انہوں نے دوپہر تک کام کر کے کہا کہ اب ہمیں کام نہیں کرنا نہ تمہاری اجرت کی ضرورت ہے، اس شخص نے دوسروں کو کام پر رکھا کہ باقی دن کام کرو تمہیں بھی مقررہ اجرت دوں گا، نماز عصر تک کام کر کے انہوں نے بھی چھوڑ دیا تو اس نے دوسرے لوگوں سے کام پورا کرانا

چاہا، انہوں نے آخر دن تک جم کر کام کیا اور پورا کر دیا، اس شخص نے خوش ہو کر ان کو ڈبل اجرت دے دی، اب سوال یہ ہے کہ تشبیہ کا مقصد کیا ہے، بعض نے کہا کہ پہلی امتوں کو مدت زیادہ ملی اور اس امت کو کم، پہلی امتوں کے لوگوں کی عمریں بڑی تھیں، ان کی تھوڑی ہیں، بعض نے کہا کہ مجموعی لحاظ سے زمانہ اور عمروں کی کمی بیشی مراد ہے اور یہی ظاہر ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ساری دنیا کو سالوں، مہینوں اور دنوں کے لحاظ سے ایک دن مان لیا جائے تو اس امت کا وقت مثل وقت عصر تا غروب ہوگا، یعنی بہ نسبت گذشتہ مدت مدید کے دنیا کی عمر بہت کم رہ گئی ہے، پھر فرمایا کہ اس امت کی ترقی کا دور ایک ہزار سال رہا، جیسا کہ شیخ اکبر، حضرت مجدد صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب اور قاضی ثناء اللہ صاحب کی رائے ہے اور اس کی تائید حدیث ابوداؤد سے بھی ہوتی ہے کہ میری امت کے لئے آدھا دن ہے اگر وہ مستقیم رہے تو باقی دن بھی استقامت کے ساتھ گذار لیں گے، ورنہ پہلوں کی طرح ہلاک ہو جائیں گے۔

مسلمانوں کے عروج کے پانچ سو ۵۰۰ سال

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ابوداؤد باب قیام الساعۃ میں حدیث ہے کہ حق تعالیٰ اس امت کو آدھے دن کے عروج سے عاجز یا محروم نہ کرے گا، دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام نے فرمایا مجھے توقع ہے کہ میری امت حق تعالیٰ کی جناب میں اتنی وجاہت ماننے سے عاجز

---

[1] فیض الباری ص ۱۲۵ ج ۲ میں سبقت قلم سے حوالہ ابن ماجہ کا غلط اندراج ہو گیا، میری یادداشت میں ابوداؤد کا حوالہ ہے اور وہی صحیح ہے اگر مؤلف فیض الباری مراجعت کر لیتے تو یہ غلطی نہ ہوتی اور افسوس ہے کہ اس قسم کی غلطیوں کو ہی حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف منسوب سمجھ کر حضرت کے فضل و تبحر کے بارے میں غلط فہمی ہو گی اور ایسی اغلاط حضرتؒ کے تمام امالی مطبوعہ میں بہ کثرت ہیں، بجز معارف السنن للبنوری کے کہ وہ پوری تحقیق و مراجعت فرماتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ حضرتؒ کی طرف غلط انتسابات نہ ہوں، ان کے بعد راقم الحروف بھی قلیل بضاعت کے موافق سعی کرتا ہے واللہ المعین، حال ہی میں ''الانور'' کے نام سے محترم جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب کوندو (کشمیری) نے حضرت شاہ صاحبؒ کے حالات پر کتاب تالیف کی ہے جو ندوۃ المصنفین سے نہایت عمدگی کے ساتھ شائع بھی ہو گئی ہے، اس میں جو مضمون مولانا عبدالعلیم چشتی کراچی کا شائع ہوا ہے وہ نہایت اہم اور تحقیقی ہے، انہوں نے یہ بات بہت ہی صحیح لکھی ہے کہ حضرتؒ کے امالی درس حدیث جن حضرات نے قلمبند کئے ہیں، وہ حضرتؒ کے علوم کی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر تھے، حتیٰ کہ مولانا گیلانی بھی باوجود اپنے وسیع و عمیق علم و فضل کے اور میں کہتا ہوں کہ حضرتؒ کے امالی قلمبند کرنے کے لئے جتنے وسیع علم و مطالعہ کی ضرورت تھی کہ ایک من علم کے لئے دس من عقل کی ضرورت تو مسلم ہی ہے، اس کے ساتھ بیس من مطالعہ کی بھی ضرورت ہے، اس کے بغیر حضرت شاہ صاحب ایسے فرید عصر، یگانہ روزگار و محدث محقق کے علوم کو ضبط تحریر میں لانا جوئے شیر لانے کے مرادف تھا، یہ بات بہت لمبی ہے اور حضرتؒ کے علوم عالیہ ضائع ہونے کے کیا کیا اسباب ہوئے، کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستان اس کی''۔

ایک بڑی وجہ فیض الباری میں غلطیوں کی یہ بھی ہوئی ہے کہ حضرتؒ کے آخری دو سالوں میں احقر اور مولانا بدر عالم صاحب دونوں درس بخاری شریف میں حاضر ہوتے تھے اور دونوں ہی حضرتؒ کے ارشادات نوٹ کرتے تھے، مگر بعد میں حضرتؒ کی اردو تقریر کے الفاظ بعینہ ضبط کرنے کی کوشش کرتا تھا اور وہ ان کی عربی بنا کر لکھتے تھے، اور سنا کہ یہی طریقہ صاحب ''العرف الشذی'' نے بھی اپنایا تھا۔

حضرتؒ چونکہ تیزی روانی کے ساتھ اردو بولتے تھے، اس لئے بہ یک وقت ضبط کرنے اور عربی بنانے کی ڈبل ذمہ داری کو پورا کرنا بہت دشوار تھا، اور میں نہ صرف درس کے بلکہ حضرت کے مجلسی ارشادات بھی قلمبند کرنے کا عادی ہو گیا تھا، پھر یہ کہ مولانا موصوف بعد کو مراجعت کتب بھی اپنے درس وغیرہ کی مشغولی کے باعث نہ کر سکے ورنہ ضبط امالی میں جو غلطیاں حوالوں کی ہو گئی ہیں وہ تو صحیح کر ہی سکتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم و تحقیقات و عالیہ کو پیش کرنا تو بڑی بات ہے، جو کتابیں آپ کی سوانح حیات پر لکھی گئی ہیں ان میں بھی غلطیاں کم نہیں ہیں، بجز نفحۃ العنبر للبنوری کے، مثلاً کسی نے لکھ دیا کہ حضرتؒ نسباً سید تھے، حالانکہ آپ کا شجرۂ نسب امام اعظمؒ کے خاندان سے متعلق ہے، کسی نے لکھ دیا کہ آپ مصر و شام گئے تھے، حالانکہ آپ صرف حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے اور کافی قیام فرما کر وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ فرمایا تھا، ہمیں تو بڑا افسوس ہے کہ اگر دارالعلوم والے حضرتؒ کو مصر و شام وترکی بھیج دیتے اور آپ سے صحاح ستہ کی شروح لکھوا لیتے تو آج علم کی دنیا ہی دوسری ہوتی۔

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ میری علمی یادداشتوں سے تین بکس بھرے ہوئے گھر پر ہیں، مگر وہ سب کیا ہوئے؟ ہمیں تو کچھ بھی نہ ملا حضرت نے نوادر کتب خریدنے پر بڑی رقوم صرف کی تھیں اور ان پر حواشی درج کئے تھے، مگر وہ بھی حضرتؒ کے انتقال کے بعد میں نہ مل سکیں اور جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ فروخت کی گئی ہیں تو جو کچھ بچی تھیں مجلس علمی ڈابھیل کے لئے خرید لیں، وہ کراچی میں موجود ہیں، مگر بہت بڑا اور گراں قدر حصہ بہت پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون (مؤلف)

نہیں ہے کہ وہ آدھے دن تک ان کو سر بلندی کا موقع میسر کرے، راوی حدیث حضرت سعد بن وقاصؓ سے پوچھا گیا کہ آدھا دن کتنا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ پانچ سو سال، حاشیہ میں صاحب فتح الودود نے محدث سہیل کا قول نقل کیا کہ اس حدیث میں زیادہ کی نفی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی مروی ہے کہ اگر میری امت کے احوال اچھے رہے تو اس کے عروج کا بقاء آخرت کے ایک دن کے برابر ہوگا ورنہ آدھے دن کے برابر رہے گا، لمعات میں ہے کہ عدم عجز کفایہ ہے حق تعالیٰ کے یہاں قرب و منزلت حاصل کرنے سے، یعنی اس کی وجہ سے امت کو پانچ سو سال تک سر بلند رہنے کا موقع میسر ہوتا رہے گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ سب علماء پر اس امر پر اتفاق ہے کہ دن سے مراد آخرت کا دن ہے، جو قرآن مجید کی رو سے ایک ہزار سال کا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ بڑا داہیہ اور فتنۂ عظیمہ تا تار والا پانچ سو سال کے بعد پیش آیا تھا جس سے دین کی بنیادیں ہل گئی تھیں، مگر حق تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا کہ ایک ہزار سال کی مدت پوری فرمادی، اس مدت میں اسلام سارے ادویان و ملل پر شرق و غرب میں غالب رہا، اور اس کی شان و شوکت باقی رہی، کسی حکومت کو سر اٹھانے کی ہمت نہ تھی، یہی دور غلبۂ امت محمدیہ کا تھا، اسکے بعد عالم اسلام پر یورپ کا تسلط ہوا اور زوال شروع ہوگیا، سرمیور نے بھی اپنی تاریخ میں ذکر کیا کہ گیارہویں صدی کے پہلے سال میں انگریزوں نے بلاد اسلام کا رخ کیا ہے، شیخ اکبر کا بھی کشف یہی تھا کہ ایک ہزار سال تک اسلام کا دبدبہ رہے گا، غالباً شیخ مجدد، شاہ عبدالعزیز اور قاضی ثناء اللہ نے بھی شیخ سے ہی لیا ہوگا۔

حاصل تشبیہیں: حدیث ابن عمرؓ اور حدیث ابی موسیٰؓ دونوں کی تشبیہوں کا حاصل یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک اعتبار مجموعہ اور خاتمہ کا ہے، جو شخص آخر دن میں داخل ہوگا وہ اول دن میں داخل ہونے والے کے برابر اس دن کا اجر پائے گا اور باب اجتماع میں یہی اصول چلتا ہے، کیونکہ جن امور میں شرکت کے لئے بہت سے لوگوں کو بلایا جاتا ہے ان میں سب کی شرکت یک دم ممکن نہیں، لہٰذا آگے پیچھے ہی داخل ہوتے ہیں، نفس دخول میں سب برابر سمجھے جاتے ہیں اگرچہ اجر و انعام میں متفاوت ہوں، اس کو یوں سمجھو کہ حق تعالیٰ نے دنیا کو پیدا کیا اور اس میں ایک ضیافت کا اہتمام فرمایا اور سب کو دعوت دی، پھر کسی نے اجابت کی، کسی نے اعراض کیا اور ہم نے آخر میں داخل ہو کر پورے دن کا اجر موعود حاصل کیا، پس ساری دنیا خدا کے نزدیک ایک دن کے برابر ہے اور اس میں آنے والوں کے ذمہ آخر دن کا کام بتلا دیا گیا ہے، جو عاجز و درماندہ ہو کر بیٹھ گیا، اس کا اجر کم ہوگیا اور جو کام میں لگا رہا وہ پورے اجر کا مستحق ہوگیا، آخر دن تک کام کرنے والوں کے لئے دو قیراط ازل سے لکھے ہوئے تھے، اور اتفاق سے ہمیں آخر دن میں بلا کر کام پر لگایا اور ہم نے کام آخر رات تک پورا کر دیا تو ہمیں پورے دو قیراط مل گئے، کیونکہ خدا کے یہاں تو مجموع عمل اور خاتموں کا اعتبار تھا، اس پوری تفصیل سے ان دونوں حدیثوں کی ترجمۃ الباب سے مناسبت بھی معلوم ہوگئی کہ نظر شارع میں رکوع کا مدرک رکعت کا مدرک ہوتا ہے اور رکعت کا مدرک نماز کا مدرک ہوتا ہے، جس طرح ایک شخص آخر دن میں شریک عمل ہونے والا ہے، اول دن میں شریک عمل ہونے والے کی طرح ہوتا ہے۔

اس تحقیق کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں ایک بحث اور باقی رہی کہ پہلی امتوں نے کیا کمی چھوڑی تھی اور ہم نے کس چیز کو مکمل کیا، اگر شریعت مراد ہو تو اس کی اطاعت میں کمی و تقصیر ہم سے بھی ہوئی ہے جیسے پہلوں سے ہوئی تھی، کہ ہم میں بھی عاصی و مطیع ہیں، پھر اگر مقابلہ اس امت کے افاضل کا سابقین کے افاضل ہو تو یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس امت کے افاضل و خیار اور برگزیدہ حضرات کی تعداد بہ نسبت سابقین افاضل کے ضرور زیادہ اور بہت زیادہ ہے اور اگر مقابلہ کمتر و ارذل سے کیا جائے تو برابری معلوم ہوتی ہے اور حضور علیہ السلام نے بھی فرمایا کہ برائیوں میں پہلوں کا بھرپور اتباع کروگے تو بہتر توجیہ یہ ہے کہ اس امت کا مقابلہ پہلی امتوں سے بحیثیت مجموعی کیا جائے کہ ان میں ان سے زیادہ، بہتر قسم کے لوگوں میں ہیں، کیونکہ اتباع والی حدیث میں بھی قلت و کثرت کا کوئی ذکر نہیں ہے، غرض کم و کیف دونوں لحاظ سے یہ امت پہلی امتوں پر خیر میں بڑھ گئی ہے۔

ظہر وعصر کا وقت: آخر میں حضرتؒ نے فرمایا کہ قاضی ابوزید دبوسیؒ جواذ کیائے امت میں سے تھے، اور سب سے پہلے انہوں نے علم الخلاف کو مدون کیا ہے (یہ فن فقہ سے اعم اور اصول فقہ سے نیچے ہے یعنی دونوں کے درمیان ہے) آپ نے حدیث مذکور انما اجلکم سے وقت ظہر کے دومثل تک رہنے پر استدلال کیا ہے اور کہا کہ اگر ظہر کو صرف ایک مثل تک مانیں اس کے بعد عصر کا شروع کردیں تو ظہر وعصر کا وقت برابر ہوجائے گا، جبکہ حدیث بتلانا چاہتی ہے کہ نصاریٰ کا وقت بھی اس امت کے زیادہ تھا اور اس امت کا کم ہے، کیونکہ دونوں اہل کتاب نے کہا کہ ہمارا کام زیادہ وقت کا ہے (ونحن اکثر علا) اس استدلال پر ابن حزم نے سخت نکتہ چینی کی ہے اور کہا کہ پہلے ہی مثل میں اتنا وقت گذر جائے گا کہ عصر کا کم رہ جائے گا، کیونکہ سایہ ٹاپیں مارتا جاتا لیجاتا ہے، اسی لئے پہلا مثل زیادہ وقت کا ہے، پھر دوسرا اس سے سریع اور تیسرا اس سے زیادہ سریع گذرتا ہے، میں کہتا ہوں کہ اعتراض درست ہے مگر اس سرعت کو ریاضی دان ہی سمجھ سکتے ہیں، تشبیہ کا موقع ہر شخص کے سمجھنے کا ہوتا ہے اس لئے ایک مثل جب کچھ زیادتی ہی مانیں گے تو وقت ظہر کی زیادتی اور عصر کی کمی محسوس ہوسکے گی، اور مثل سے کچھ اوپر تک وقت ظہر امام محمدؒ بھی کہتے ہیں اور حنفیہ کا تاخیر عصر کے لئے استدلال بھی درست ہے۔ جس کی تفصیل گذر چکی ہے، باقی علامہ دبوسی نے اس تاخر کو توقیت میں ڈال دیا یہ ان کی اپنی رائے ہے۔

آخری فیصلہ: حضرتؒ نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ دو حدیثوں[۱] میں الگ الگ مضمون بیان ہوئے ہیں، پہلی میں انما اجلکم یا انما بقاءکم سے اس امت کے لئے کمی وقت کا بیان ہوا ہے، بہ نسبت امم سابقہ کے، اور اس کو دوسری احادیث میں بھی بقدر تواتر بیان کیا گیا کہ اس امت کا وقت بہت کم ہے چنانچہ فرمایا گیا **بعثت انا و الساعه کهاتين**، یعنی اپنی بعثت اور قرب قیامت کو دو انگلیوں کے قرب سے متمثل فرمایا، چنانچہ علماء نے اس امت کے زمانہ کا اندازہ دن کے سدس سے کیا (جیسا کہ علامہ شامی نے اہل بلغاریہ کے مسئلہ میں ذکر کیا) یا بقدر خمس کے جیسا کہ فتح ۳۰۲ ج ۱۱ طبع قدیم میں ہے (فیض ص ۱۲۸ ج ۲) لہٰذا اس حدیث سے حنفیہ کا استدلال صحیح ہے اور بلاشک وقت ظہر کو ایک مثل سے زیادہ ماننا پڑے گا تاکہ وقت عصر کم رہے جو حدیث کا مقتضیٰ ہے، دوسری سے استدلال صحیح نہ ہوگا۔

جس میں اہل کتاب اور مسلمانوں کی مثال بحیثیت قبول وعدم قبول ہدایت بیان ہوئی ہے کہ دوسرے اجیروں نے کہا **لا حاجة لنا الى اجرك** اور **لك ما عملنا** (ہمیں تمہارے اجر کی ضرورت نہیں یا کردیا تمہارا کام جتنا کرنا تھا) اس مثال سے یہود ونصاریٰ کے اعراض وعدم قبول حق کی طرف اشارہ ہے اور پھر مسلمانوں کے قبول حق اور کام پورا کرنے کا حال ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ دونوں حدیثوں کے الگ الگ دو قصے اور جدا جدا مضمون ہونے کو ان کے تحت تشریح میں حافظؒ نے بھی فتح الباری ص ۲۷ ج ۲ میں ذکر کیا ہے، بلکہ حافظ نے یہ بھی لکھا کہ جس نے ان دونوں کے مضمون کو ایک قرار دینے کی سعی کی، اس نے غلطی کی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

---

[۱] بخاری کتاب الاجارہ ص ۳۰۲ میں باب الاجارة الى نصف النهار اور باب الاجارة الى الصلوة العصر اور باب الاجارة من العصر الى الليل میں تین حدیثیں بیان ہوئیں، پہلی دونوں حضرت عمرؓ اور تیسری حضرت موسیٰؓ سے اس آخری میں یہ بھی ہے کہ دوسرے اجیروں نے جب عصر تک کام کرکے چھوڑ دیا تو ان سے کہا گیا کہ اب تو دن کا حصہ تھوڑا سا ہی رہ گیا ہے اس کو پورا کردو پھر بھی انہوں نے انکار کردیا، تب عصر سے مغرب تک کام لینے کے لئے نئے اجیروں کو لینا پڑا، وہ آخری امت کی مثال ہے، اس سے بھی امت محمدیہ کے لئے وقت کم اور اجرت زیادہ کی بات ثابت ہوئی اور عصر سے مغرب تک وقت کم ہونا بھی ثابت ہوا، پھر حدیث میں **فذلك مثلهم و مثل ما قبلوا من هذا النور** سے اشارہ قبول وعدم قبول ہدایت کی طرف واضح ہے، حافظ اور عینی نے کتاب المواقیت میں بھی اور یہاں بھی کچھ کچھ لکھا ہے دیکھ لیا جائے۔ (مؤلف)

باب وقت المغرب وقال عطآء يجمع المريض بين المغرب والعشآء.

(مغرب کے وقت کا بیان، عطاء نے کہا کہ بیمار مغرب اور عشاء کی نماز ساتھ پڑھ سکتا ہے)

۵۲۹. حدثنا محمد بن مهران قال حدثنا الوليد قالحدثنا الاوزاعي قال حدثني ابو النجاشي اسمه عطاء بن صهيب مولىٰ رافع بن خديج قالسمعت رافع بن خديج يقول كنا نصلى المغرب مع النبي ﷺ فينصرف احدنا وانه ليبصر مواقع نبله.

۵۳۰. حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا محمد بن جعفر قال حدثنا شعبة عن سعد عن محمد بن عمرو بن الحزبين على قال قدم الحجاج فسألنا جابربن عبدالله فقال كان النبي ﷺ يصلى الظهر بالهاجرة والعصر الشمس نقية والمغرب اذا وجبت والعشآء احيانا و احيانا اذا راهم اجتمعو عجل واذا راهم ابطاؤا اخرو الصبح كانوا او كان النبي ﷺ يصليها بغلس.

۵۳۱. حدثنا المكى بن ابراهيم قال حدثنا يزيد بن ابى عبيد عن سلمة قال كنا نصلى مع النبي ﷺ المغرب اذا تورات بالحجاب.

۵۳۲. حدثنا ادم قال حدثنا شعبة قال حدثنا عمرو بن دينار قال سمعت جابر بن زيد عن ابن عباسؓ قال صلى النبي ﷺ سبعا جميعا و ثمانياً جميعا.

ترجمہ ۵۲۹: حضرت عطاءؒ (حضرت رافع بن خدیج کے آزاد کردہ غلام) روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت رافع بن خدیج کو کہتے ہوئے سنا کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ مغرب کی نماز پڑھتے تھے تو ہم میں سے ہر ایک (نماز پڑھ کے) ایسے وقت لوٹ آتا تھا کہ وہ اپنے تیر کے گرنے کے مقام کو دیکھ سکتا تھا۔

ترجمہ ۵۳۰: حضرت محمد بن عمرو بن حسن بن علیؓ (ابن ابی طالب) روایت کرتے ہیں کہ حجاج نماز میں بہت تاخیر کر دیتا تھا ہم نے جابر بن عبداللہ سے (اس کی بابت) پوچھا، انہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز دوپہر کو پڑھتے تھے اور عصر ایسے وقت کہ آفتاب صاف ہوتا تھا اور مغرب کی جب آفتاب غروب ہو جاتا، اور عشاء کی کبھی کسی وقت، کبھی کسی وقت، جب آپ دیکھتے کے لوگ جمع ہو گئے ہیں، جلد پڑھ لیتے اور جب آپ دیکھتے کہ لوگوں نے دیر کی، تو دیر میں پڑھتے اور صبح کی نماز وہ لوگ، یا یہ کہا کہ نبی کریم ﷺ اندھیرے میں پڑھتے تھے۔

ترجمہ ۵۳۱: حضرت سلمہ (ابن اکوعؓ) روایت کرتے ہیں کہ آفتاب غروب ہوتے ہی ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ مغرب کی نماز ادا کر لیا کرتے تھے۔

ترجمہ ۵۳۲: حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (مغرب اور عشا کی) سات رکعتیں ایک ساتھ پڑھیں، اور (ظہر وعصر) کی آٹھ رکعتیں ایک ساتھ پڑھیں۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:- نماز مغرب کا وقت اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، اس لئے اس کا وقت بتلانے کی ضرورت نہ ہوئی، امام بخاری نے قال عطاء سے مریض کے لئے جواز جمع بین الصلا تین ثابت کیا، اور آخری حدیث الباب بھی اس کیلئے لائے ہیں مگر ہم اس کو جمع صوری پر محمول کرتے ہیں، **قولہ اذا رآھم** سے بتلایا کہ مقتدیوں کی رعایت کرنی چاہئے اور بیہقی میں حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے، پھر جب دیکھتے کہ لوگ جمع نہیں ہوئے تو بیٹھ جاتے تھے اور ابوداؤد باب الصلوۃ تقام میں بھی ہے، کہ حضور علیہ

السلام اقامت نماز کے وقت اگر دیکھتے کہ لوگ کم ہیں تو بیٹھ جاتے تھے، نماز شروع نہ کرتے تھے اور جب دیکھتے کہ سب آگئے تو پڑھاتے تھے۔

باب من کره ان یقال للمغرب العشآء

(اس شخص کا بیان جس نے اس کو مکروہ سمجھا ہے کہ مغرب کو عشا کہا جائے)

۵۳۴۔ حدثنا ابو معمر هو عبدالله بن عمرو قال حدثنا عبدالوارث عن الحسين قال حدثنا عبدالله بن بريدة قال حدثني عبدالله المزني ان النبي ﷺ قال لا يغلبنكم الاعراب علےٰ اسم صلوٰتكم المغرب قال ويقول الاعراب هي العشاء.

ترجمہ ۵۳۴: حضرت عبداللہ مزنی روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اعراب مغرب کی نماز کو عشاء کہتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم پر (اس اصطلاح) میں غالب آجائیں (لہٰذا تم غروب آفتاب کے بعد والی نماز کو مغرب اور اس کے بعد والی کو عشا کہا کرو)

تشریح: حافظؒ نے علامہ ابن المنیر سے نقل کیا کہ امام بخاری نے یہاں باب من کره ان یقال لکھا اور باب کراہیۃ ان یقال جزم کے ساتھ نہ کہا، شاید اس لئے کہ حدیث الباب کو مطلق نہی کے لئے نہ سمجھا ہو، حالانکہ اس میں غلبۂ اعراب سے نہی صاف موجود ہے، پھر بھی امام بخاری نے اس کو ممانعت کے لئے کافی نہ سمجھا (فتح ص ۳۰ ج ۲) دبے ہوئے الفاظ میں یہ ابن المنیر کا نقد امام بخاری کے ترجمۃ الباب پر ہے اور حافظ کا اس کو نقل کرنا بھی اہم ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ممانعت یہاں اس لئے بھی ہے کہ اعراب نام رکھنے میں برعکس طریقہ اختیار کرتے تھے، مثلاً یہاں مغرب کو عشاء کہتے تھے، جبکہ مغرب سے غروب کا اول وقت مراد ہوتا ہے اور عشا کا اطلاق شفق غائب ہونے کے وقت پر ہوتا ہے، یعنی اول وقت کو آخر وقت کا نام دینا بڑے مغالطہ میں ڈال دیتا ہے، اس لئے شریعت نے اس کی اصلاح کی اور چونکہ اس کے برعکس نام رکھنے کے طریقہ کو جزم کے ساتھ ممنوع فرمادیا گیا ہے، اسی لئے حضور علیہ السلام سے مغرب پر عشاء کا اطلاق کسی حدیث میں نہیں ہے، (لہٰذا امام بخاری کو بھی جزم کے ساتھ اس کی کراہت کو بیان کرنا تھا، نہ کہ اس کو کمزور کرکے جو عام طور سے وہ باب من کہہ کر کیا کرتے ہیں)۔

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ عشا کا لفظ مغرب پر اطلاق کرنے سے محظور شرعی قوی یہ ہے کہ دونوں کے احکام میں التباس ہوگا، حالانکہ دونوں کے احکام بالکل، الگ الگ ہیں برخلاف عتمہ وعشاء کے کہ وہاں ایسا محظور شرعی لازم نہ آئے گا، کیونکہ عتمہ بھی عشاء ہی کے لئے بولا جاتا ہے اور حضور علیہ السلام سے بھی اس کا اطلاق ثبوت ہوا ہے۔ (حاشیہ لامع ص ۲۲۱ ج ۱)

(تنبیہ): فیض الباری ص ۱۲۹ میں یسمون العشاء العتمہ غلط ہے، صحیح یسمون المغرب العشاء ہے، پھر واعلم سے والامر بعد سہل تک کا ٹکڑا باب ذکر العشاء والعتمہ سے متعلق ہے، یہاں بے محل جڑ گیا ہے و کم فیه مثل هذه المسامحات ہم نے اب تک فیض الباری کی اغلاط کی نشاندہی ضروری نہ سمجھی تھی، مگر کچھ لوگوں نے مغالطہ دیا ہے کہ وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے امالی میں سے سب سے زیادہ معتمد ہے اور حضرتؒ کے مطالعہ سے گزر چکی ہے، جبکہ دونوں باتیں خلاف واقعہ ہیں اور اس مغالطہ کی وجہ سے اس کی اغلاط ومسامحات حضرتؒ کی طرف منسوب ہوں گی۔ اس کا تدارک ضروری معلوم ہوا۔ والله المعين.



انوار الباری ۱۵

اردو شرح

صحیح البخاری

تقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد

انوارالباری کی پندرھویں قسط پیش ہے۔اس میں آخری بحث ''رفع یدین'' پر ہے، جواختلافی مسائل میں سے معرکۃ الآراء مسئلہ سمجھا جاتا ہےاوراسی لئے اس پراکابرِ امت نے مستقل رسائل بھی لکھے ہیں،ہم نے امام بخاری اورحضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیقات بھی اختصار کے ساتھ ذکر کردی ہیں۔

قسط نمبر۱۴و۱۵۔کافی تاخیر سے شائع ہورہی ہے،اس کا سبب دوسرے نامساعد حالات کے علاوہ اپنی علالت وغیرہ بھی ہوئی،اب خدا کا شکر ہے تازہ دم ہوکر پھر سے کمرہمت باندھی ہے،اوراحباب افریقہ نے بھی حوصلہ افزائی کی ہے قسط نمبر۱۶، ۱۷کا بھی کافی موادمہیا ہو چکا ہے۔اور توقع ہے کہ اس موسم سرما میں ان دونوں کے مسودات بھی مرتب ہوکر کتابت کے مراحل طے کریں گے۔ان شاءاللہ۔

یہ بھی خیال ہوا تھا کہ آئندہ اقساط میں متن بخاری شریف اورترجمہ کا التزام نہ کیا جائے، بلکہ صرف حدیثی مباحث اوراکابرِامت کی تحقیقات عالیہ ہی پیش کردی جائیں تاکہ مزید۱۰، ۱۲جلدوں میں شرح پوری ہو جائے مگر احبابِ افریقہ نے اس خیال سے اتفاق نہ کیا لہٰذا شرح بدستور متن بخاری وترجمہ کے ساتھ ہی چلے گی۔ان شاءاللہ تعالیٰ وبہ نستعین۔

فضل الباری کا خیر مقدم

ہمارے اکابردیوبند میں سے حضرت علامہ شبیراحمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ بھی بڑے پایہ کے مفسرومحدث تھے،ان کے مشہورومعروف تفسیری فوائداورفتح الملہم شرح صحیح مسلم عرصہ سے شائع شدہ ہیں۔اب خدا کا شکر ہےان کے زمانۂ قیام ڈابھیل کے امالی درس بخاری شریف کا بھی ایک مجموعہ ''فضل الباری'' کے نام سے ادارۂ علوم شرعیہ کراچی نے شائع کرنا شروع کیا ہےاوراس کی دوجلدیں ہمارے پاس بھی آچکی ہیں،اس کے مرتب فاضل جلیل مولانا قاضی عبدالرحمٰن صاحب فاضل دیوبند مستحق مبارکباد ہیں کہ اتنے بڑے کام کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کو کامیاب فرمائے۔اوران کی مساعی جمیلہ کوقبول فرمائے۔صفحہ نمبر۴۹/۱تاصفحہ نمبر۷۳/۱میں جوانہوں نے سوانح امام بخاریؒ ذکر کئے ہیں،ان کے بارے میں ہماری کچھ معروضات ہیں،خاص طور سے تعداداحادیث بخاری پربھی کچھ لکھنا ہے واللہ الموفق:۔

تعداداحادیث بخاری

مکررات ومعلقات وغیرہ سب کی مجموعی تعدادنوہزار بیاسی (۹۰۸۲) لکھی ہے۔حالانکہ حسبِ تحقیق حافظ صحیح تعداد۹۰۷۹(نوہزار اناسی) ہےاس طرح کہ کل تعالیق۱۳۴۱اورمتابعات ۳۴۱ باقی ۷۳۹۷موصول ہیں۔

حافظ ابن حجر نے پہلے مقدمہ کی ترتیب وتالیف ۸۱۳ھ میں کی تھی،پھرتیس سال میں شرح لکھ کر۸۴۲ھ میں ختم کی تھی۔حافظ نے مقدمہ میں لکھا کہ ابن صلاح ونووی وغیرہ نے کل تعدادمع مکررات وغیرہ کے ۷۲۷۵اوربغیرمکررات کے چار ہزار لکھی ہے،یہ غلط ہے،پھرحافظ نے ہر

باب کی احادیث صحیح طور سے شمار کر کے تین صفحات میں رد واصلاح کی اور ۵۲۷ کے عدد پر ۱۲۲ کا اضافہ کیا۔ لہٰذا کل ۳۹۷ ہو گئیں، پھر ہر باب کی تعالیق ومتابعات کو بھی نہایت احتیاط سے شمار کیا اور ۲ صفحات میں رد وقدح کر کے کل تعالیق کی تعداد ۱۳۴۱ اور متابعات کی تعداد ۳۴۱ منضبط کی۔ تینوں میزانوں کا مجموعہ ۹۰۷۹ ہوتا ہے، مگر حافظ سے یہ چوک ہوگئی کہ دوجگہ مقدمہ صفحہ ص ۴۶۵/ اور فتح الباری صفحہ ۱۳/ ۴۱۹ میں مجموعی تعداد ۹۰۸۲ درج کر دی، تیسری جگہ فتح صفحہ ۶۳/ امیں مجموعی تعداد کا کچھ ذکر نہیں کیا۔

سہو حافظ: ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ بخاری شریف میں حافظ کی اسی فروگذاشت کی طرف اشارہ فرمایا تھا کہ شمار مجموع میں تین کا فرق ہو گیا۔ اور یہ ایسا تسامح ہے کہ ہر شخص ہر وقت سہولت سے معلوم کر سکتا ہے، اور بظاہر یہ کاتب کی غلطی بھی نہیں ہے نہ حضرتؒ نے اس کو کاتب کی غلطی بتلائی ہے۔

دوسری بات یہ کہ حافظ نے صفحہ ۶۳/ امیں بغیر تکرار کی کل تعداد ۲۵۱۳ لکھی ہے، اور صرف معلق ومتابع کی تعداد بغیر تکرار کے ۱۶۰ بتلائی ہے۔ اس طرح غیر مکرر موصول کی خالص تعداد ۲۳۵۳ رہ جاتی ہے اور اسی لئے حافظ نے لکھا کہ چار ہزار کی بات بھی ابن صلاح وغیرہ کی درست نہیں ہے۔

مقدمہ فیض الباری صفحہ ۱/ ۳۸ میں جو مقدمۂ فتح الباری کے حوالہ سے احادیث موصولہ کی تعداد ۲۴۶۰ لکھی ہے اور اس بارے میں مقدمۂ قسطلانی کا حوالہ بھی محل نظر ہے، کیونکہ اصل مقدمہ فتح الباری میں یہ چیز نہیں ملی، پھر اس کی تلخیص قسطلانی میں کیسے چلی گئی؟

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ مرتب سوانح نے صفحہ ۱۷ میں جو مراد حضرت شاہ صاحبؒ کی سمجھی اور اس کی تغلیط کی، وہ صحیح نہیں۔ افسوس ہے کہ حضرتؒ کے علم وفضل اور تبحر وجامعیت سے پوری طرح واقف حضرات بھی شائع شدہ امالی کی اغلاط وتسامحات کو بے تکلف حضرتؒ کی طرف منسوب کر کے اعتراض کر دیتے ہیں، راقم الحروف نے متعدد بار صراحت کی ہے کہ حضرتؒ کے درس ترمذی وبخاری کے مطبوعہ امالی میں سے کوئی بھی حضرتؒ کے ملاحظہ سے نہیں گذرے اور نہ حضرتؒ نے کسی کے مضامین کی تصویب فرما کر ان کی ذمہ داری لی ہے اور درحقیقت ضبط وفہم کی نقائص، حوالوں کی اغلاط، تعبیری مسامحات اور دوسری قسم کی کوتاہیاں خاص طور سے حضرت کے امالی لکھنے والوں سے بہ کثرت ہوئی ہیں، اور اسی لئے فیض الباری کے مقدمہ میں تو علامہ بنوریؒ امر مذکور کی وضاحت اسی لئے کر دی تھی کہ حضرتؒ کی طرف غلطیوں کا انتساب نہ ہو، مگر بہت سے لوگ مقدمہ بھی نہیں پڑھتے، اور غلطیوں کو بھی حضرتؒ کی طرف منسوب کر کے اعتراض کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی کتنی واضح بات تھی اور حضرتؒ کا اشارہ حافظ کے سہو کی طرف بالکل درست تھا، مگر کچھ بات تو فیض الباری کی تعبیری غلطیوں کی نذر ہوئی اور کچھ مرتب فضل الباری کے اعتراض وجواب سے مغالطہ میں پڑ گئی۔ اور حضرتؒ کے اصل مقصد اور مراد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

افادہ: یہاں مناسب ہے کہ دوسری مشہور کتب صحاح سابقہ کا ذکر بھی بہ ترتیب تقدم وتاخر تالیفی وزمانی اجمالاً ایک جگہ کر دیا جائے:۔

(۱) کتاب الآثار امام اعظمؒ (م ۱۵۰ھ) بروایتِ امام محمد امام ابو یوسف وامام زفر وغیرہ جو چالیس ہزار احادیث وآثار کا انتخاب ہے۔ جو بقول علامہ سیوطی شافعیؒ (دور صحابہ کے بعد کہ وہ تالیفی دور نہ تھا) احادیث کا سب سے پہلا مجموعہ ہے، اور لکھا کہ امام صاحب اس امر میں منفرد ہیں کہ آپ نے سب سے پہلے علم شریعت کو مرتب ومبوب کیا پھر ان کا اتباع امام مالک نے موطأ کی ترتیب میں کیا اور امام صاحب سے کسی نے سبقت نہیں کی (تبییض الصحیفہ فی مناقب الامام ابی حنیفہ) گویا امام صاحبؒ محدثین مولفین کے جدامجد ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ مزید تفصیل وتحقیق کیلئے ملاحظہ ہو۔

''جامع المسانید'' صفحہ ۳۴ اور ''امام ابن ماجہ وعلم حدیث'' (از مولانا عبدالرشید نعمانی) صفحہ ۱۵۸ تا ۱۷۶، جس میں حضرتؒ شاہ ولی اللہ وشاہ عبدالعزیزؒ کی عبارات سے پیدا شدہ غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا گیا ہے۔ اور مقدمہ شرح کتاب الاثار امام اعظمؒ از علامہ مفتی مہدی حسنؒ۔ یہ

کتاب اب دوبارہ مفتی صاحبؒ کی شرح کے ساتھ بھی شائع ہوگئی ہے۔
(۲) موطأ امام مالک (م ۱۷۹ھ) جس میں ۶۰۰ حدیث مسند جمع ۲۲۲ مرسل جمع ۶۱۳ موقوف + ۲۸۵ااقوال تابعین ہیں۔کل ۱۷۲۰
(۳) مصنف عبدالرزاق (م ۲۱۱ھ) احادیث وآثار کا گرانقدر مجموعہ مجلس علمی کراچی سے مکمل شائع ہوگیا ہے۔
(۴) ابی بکر بن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ) .... حیدرآباد دکن سے پانچ جلدیں شائع ہوچکی ہیں
(۵) مسند امام احمدؒ (م ۲۴۱ھ) جس میں ایک لاکھ چالیس ہزار احادیث وآثار ہیں سترہ لاکھ میں سے انتخاب۔
(۶) صحیح الامام البخاریؒ (م ۲۵۶ھ) کل تعداد مع مکررات ۹۰۷۹۔بغیر مکررات ۲۳۵۳ جو چھ لاکھ کا انتخاب ہے (مقدمہ فتح الباری صفحہ ۴۹۰،۵)
(۷) صحیح الامام مسلمؒ (م ۲۶۱ھ) کل تعداد چار ہزار جو تین لاکھ احادیث کا انتخاب ہے۔
(۸) سنن ابن ماجہؒ (م ۲۷۳ھ) کل تعداد چار ہزار (بلاتکرار) (۹) سنن ابی داؤدؒ (م ۲۷۵ھ) کل تعداد چار ہزار آٹھ سو
(۱۰) سنن امام ترمذی (م ۲۷۹ھ) (۱۱) سنن امام نسائی (م ۳۰۳ھ)
(۱۲) صحیح ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ) (۱۳) معانی الآثار امام طحاویؒ (۳۲۱ھ)

جامع سفیان کا مرتبہ اس وقت ایسا ہی ہوگا جیسے اب ہم آخر میں بخاری وترمذی وغیرہ کا درس لیتے ہیں، اور امام بخاری کو جو مالی منافع امام ابوحفص شفیق استاذ سے پہنچے تھے وہ علمی سرپرستی کے علاوہ تھے، حافظ ذہبی نے بھی اپنے رسالہ''الامصار ذوات الاثار'' میں بخارا کے جن اعیان محدثین کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے ان میں بھی عبداللہ بن محمد مسندی کے ساتھ امام ابوحفص کبیر کا ذکر موجود ہے حافظ سمعانی نے لکھا کہ ان سے بے شمار مخلوق نے روایت حدیث کی ہے، اور حقیقت یہ کہ ان کی ذات سے اقلیم ماوراء النہر میں حدیث وفقہ کی جتنی اشیا ہوئی ان کے معاصرین میں سے کسی سے نہیں ہوئی بخارا کا ایک ایک گاؤں ان کے تلامذہ سے بھرا ہوا تھا السمعانی نے یہ بھی لکھا کہ صرف خیزاخزا میں ان کے شاگردوں کی تعداد حد شمار سے باہر تھی، یہ صرف ایک قریہ کا حال تھا،

امام ابوحفص کبیر موصوف نے فقہ وحدیث کی تعلیم امام ابویوسف وامام محمدؒ سے حاصل کی تھی، اسی لئے ان کا شمار امام محمد کے کبار تلامذہ میں ہوا ہے اور بخارا کے علاقہ میں علماء احناف کی سربراہی ان پر ختم تھی۔امام موصوف کے صاحبزادے امام ابوحفص صغیر اور امام بخاری مدت تک طلب حدیث میں رفیق وہم سفر رہے ہیں اور دونوں کے خاندانوں کے تعلقات عرصہ تک قائم رہے ہیں حافظ ابن حجر نے بھی مقدمہ فتح الباری صفحہ ۴۸۲ میں امام ممدوح کو امام بخاری کے مشائخ میں شمار کیا ہے، اور ان کے حق میں ممدوح کا یہ قول بھی نقل کیا کہ ایک دن یہ لڑکا بڑا آدمی بنے گا، یعنی اس کی بڑی شہرت ہوگی ملا بن ماجہ (اردو صفحہ ۱۸۵)

جامع سفیان ثوری

فقہ میں سفیان ثوری اور امام اعظمؒ کا عموماً ایک ہی مذہب ہے، امام ترمذی اپنی جامع ترمذی میں جو مذہب ان کے نام سے نقل کرتے ہیں وہ اکثر امام ابوحنیفہؒ کے موافق ہوتا ہے، امام ابویوسف نے تو یہاں تک فرمادیا تھا کہ سفیان ثوری مجھ سے بھی زیادہ امام ابوحنیفہ کے متبع ہیں، امام ثوری اگرچہ خود بھی امام اعظمؒ کی مجلس درس حاضر ہوئے ہیں اور ان سے حدیثیں بھی روایت کی ہیں مگر امام صاحب کی فقہ کو انہوں نے علی بن سیر سے اخذ کیا ہے جو امام صاحب کے مختص تلامذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔امام ثوری نے اپنی جامع میں زیادہ تر ان ہی سے مدد لی ہے، امام حدیث یزید بن ہارون نے بھی فرمایا کہ سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ کی فقہ کو علی بن سیر سے حاصل کرتے تھے اور ان ہی کی مدد اور مذاکرہ سے انہوں نے اپنی یہ کتاب جس کا نام جامع رکھا ہے تصنیف کی ہے (ابن ماجہ اردو علامہ نعمانی عم فیضہم ص ۱۸۴)

اسی طرح امام بخاری نے اپنے علم فقہ وحدیث کی تکمیل حضرت عبداللہ بن مبارک اور وکیع کی تصنیفات پڑھ کر کی ہے، اور یہ دونوں مع امام ابوحفص کے حنفی تھے، اس لئے امام بخاری کے علمی استفادات اور تکمیل دروس کے زمانہ کو ایسے اکابر ائمہ حدیث وفقہ خصوصاً حنفی مکتب فکر علماء کے ذکر سے خالی رکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

راقم الحروف کا حاصل مطالعہ

امام بخاریؒ کی زمانہ تکمیل تک کی تعلیم وتربیت کا ماحول اوپر بتایا گیا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ سفیان ثوری خود بھی صاحب مذہب مجتہد مطلق تھے، اور ان کا مذہب چوتھی صدی تک جاری رہا، وہ امام اعظم کے مداحین بلکہ تلامذہ حدیث وفقہ میں سے تھے، عبداللہ بن مبارک کا درجہ تو ایسا ہے کہ ان کو امام بخاری وعبدالرحمن مہدی اور اسحٰق بن راہویہ سب ہی نے مسلم امام فقہ وحدیث کا مانا ہے، اور عبداللہ بن مبارک امام اعظم کے نہ صرف تلمیذ رشید بلکہ متبع اعظم ومداح کبیر تھے کہ امام صاحب کی کوئی برائی سننے کے روادار ہی نہ تھے، اسحٰق بن راہویہ بھی جب تک اپنے وطن میں رہے امام صاحب اور ان کی فقہ کے دلدادہ تھے، عراق پہنچ کر جب عبدالرحمن بن مہدی وغیرہ معاندینِ امام اعظم کی صحبت اختیار کی تو اس کا اثر لے لیا تھا، اسی لئے جو حضرات ان کو اب بھی حنفی کہتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں، وہ اگر حنفی رہتے تو امام بخاری پر ہی کیوں خلاف اثر ڈالتے۔

بہر حال! مقدرات نہیں ٹلتے، ورنہ امام بخاری بھی امام اعظم ہی کی فقہ کے دلدادہ ہوتے، مگر علامہ حمیدی، نعیم خزاعی اور عبدالرحمن بن مہدی اور اسحٰق بن راہویہ وغیرہ نے مخالف اثرات ڈالے اور حنفی قضاۃ نے بھی امام بخاری پر بے جا سختیاں کیں، ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام بخاریؒ ائمہ حنفیہ اور فقہ حنفی کے سب سے بڑے مخالف ہوگئے، اور چونکہ مزاج میں تشدد اور زود تاثری کا مادہ زیادہ تھا، اس لئے ایسی زبان اور لہجہ بھی اختیار فرمالیا جس کی ایسے عظیم المرتبت امام حدیث سے توقع نہ تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم علمہ اتم واحکم

مقدمہ فضل الباری پر معروضات

صفحہ ۵۳ میں امام بخاری کی عبداللہ بن مبارک اور وکیع پر جو وجہ تفوق تحریر کی گئی ہے، وہ اول تو محتاج حوالہ ہے۔ ایسی اہم علمی باتوں کو بغیر حوالہ کے نہیں لکھنا چاہیے تھا، پھر یہ کہ امام بخاری کے پاس وہ پانچ سو احادیث کس درجہ کی تھیں؟ کیونکہ ان کو تو لاکھوں احادیث غیر صحیح بھی یاد تھیں، اور عبداللہ بن مبارک تو امام بخاری سے بھی بڑے عالم حدیث تھے، خود امام بخاری نے بھی ان کو اپنے زمانہ کا اعلم مانا ہے، پھر ان کا زمانہ بھی امام بخاری سے مقدم تھا، اس لئے ممکن ہے، غیر صحیح احادیث ان کو بھی امام بخاری کی طرح اتنی ہی یاد ہوں یا غیر صحیح احادیث بعد کے زمانہ کی پیداوار ہوں تو اس سے تفوق کیسے ثابت ہوگا؟ اسی طرح امام وکیع بھی کبار محدثین میں سے تھے۔ کسی بے سند بات کے ذریعہ ان کو گرانا مناسب نہیں، صفحہ ۵۴ میں محدثین کرام کی طرف یہ امر مسلمہ طور سے منسوب کرنا کہ امام بخاری جس پر بھی ثقہ ہونے کا حکم لگادیں وہ ہر خطرے سے باہر ہے، احتیاط کے خلاف ہے، جبکہ ان کی تاریخ کبیر وصغیر وغیرہ سامنے ہیں اور خود صحیح بخاری میں بھی ضعیف رواۃ موجود ہیں، کیا ان سے صحیح میں روایت کرنا ان کی توثیق نہیں ہے باقی یہ بات ضرور ایسے موقع پر ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی محفوظ رکھنی چاہئے کہ صحیح بخاری کے ضعیف رواۃ کی وجہ سے کوئی روایت اس لئے نہیں گرے گی کہ اس کے متابعات اس کو صحیح وقوی ثابت کرنے کے لئے موجود ہیں۔ لیکن اس سے خود امام بخاری کے عمل روایت عن الضعاف کی توثیق تو درست نہ ہو جائے گی، پھر یہ امر بھی نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ توثیق کو اگر یہ پایہ دے دیا گیا تو جرح کو کیسے مجروح کریں گے، جو توثیق سے بھی کہیں زیادہ کہے خصوصاً ائمہ حنفیہ وغیرہ کے لئے۔ فافہم ولا تغفل۔

بہر حال مدح وذم میں مبالغہ یا بے سند کوئی بات نہ آئے تو زیادہ اچھا ہے۔ هذا ما عندی وما ابریٔ نفسی۔

ص ۵۵۔ میں فن روایت کے سلسلہ میں بے لاگ جرح وتنقید کے لئے انتہائی محتاط الفاظ استعمال کرنے کا دعوے بھی محتاج دلیل بلکہ

بے دلیل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ص ۵۹۔ میں جہاں حضرت عبداللہ بن مبارک ۱۸۱ھ تک کی خدمت تدوینِ حدیث کا بھی ذکر آ گیا، وہاں امام اعظمؒ کی مشہور ومعروف مسانید اور امام ابو یوسف وامام محمد کی موطا، کتاب الآثار، کتاب الحج وغیرہ کے ذکر کو نظرانداز کرنا بے محل معلوم ہوا۔ اگر ہم بھی ائمہ حنفیہ کی ایسی اہم حدیثی خدمات کو نظرانداز کریں گے تو دوسرے تو پہلے ہی سے ان کو زاویۂ خمول میں ڈالے ہوئے ہیں، اور اگر زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو تدوینِ فقہ کا عظیم الشان کام جو امام اعظم نے اجلۂ محدثین کے ذریعہ اپنی سرپرستی میں انجام دلایا، وہ بھی تو معنیً وحکماً تدوینِ حدیث ہی تھی، جس سے ساڑھے بارہ لاکھ شرعی مسائل مدون ہو کر ساری دنیا میں پھیل گئے، اور اس کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ کا یہ ارشاد بھی پھر سے اپنی یاد میں تازہ کرلیں کہ ابوحنیفہؒ کی رائے مت کہو، کیونکہ جو کچھ انہوں نے دین میں کہا ہے وہ سب قرآن وحدیث ہی کا مقصد ومنشا ہے اور کچھ نہیں۔

ص ۶۰۔ میں امام اعظم کے مسانید کا ذکر ہوا تو اس کر کے ساتھ کہ "وہ خود امام کے تصنیف کردہ نہیں بعد میں کسی نے جمع کئے ہیں" یہ تعبیر نہایت غیر انسب ہے جبکہ امام اعظم کی ۲۲۔۲۳ مسانید کی روایت اکابر محدثین نے کی ہے، اور سلسلۂ روایت امام اعظم تک بلا شک وریب متصل ہے۔ شاید اس بارے میں قاضی صاحب کا مطالعہ بہت ناقص ہے۔ پھر یہ کہ مسند احمد کی روایت وتبیسنیں ان کے صاحبزادے شیخ عبداللہ نے کی ہے، اور مسانید امام اعظم کی روایت شیخ عبداللہ سے کہیں زیادہ بڑے اکابر اور جلیل القدر محدثین نے کی ہے۔ پھر یہ تفوق بھی امام اعظم کی مسانید کو حاصل ہے کہ ان میں ثلاثیات بہ کثرت ہیں، اور ثنائیات بلکہ وحدانیات بھی ہیں جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور امام صاحب کے درمیان صرف ایک راوی (صحابی) کا واسطہ ہے۔ جبکہ موطا امام مالک میں وحدانیات بالکل نہیں ہیں، اور مسند امام احمد ومسند امام شافعی میں ثلاثیات ہیں، ثنائیات نہیں ہیں۔

صحیح بخاری کی کل غیر مکرر ۲۵۱۳ احادیث میں سے صرف ۲۲ ثلاثیات ہیں باقی رباعیات ہیں، مسلم کی چار ہزار احادیث میں سب رباعیات ہیں، ترمذی میں صرف ایک ثلاثی ہے، باقی سب رباعیات ہیں، ابوداؤد کی ۴۸۰۰ احادیث میں سے صرف ایک ثلاثی ہے باقی سب رباعیات ہیں، نسائی میں بھی سب رباعیات ہیں، ابن ماجہ کی چار ہزار مرویات میں سے صرف پانچ ثلاثیات ہیں باقی سب رباعیات ہیں (جن میں حضور علیہ السلام تک چار واسطے ہوتے ہیں)۔

ص ۶۲، ص ۶۳، ص ۶۴ میں امام بخاری کی تاریخ کبیر وصغیر اور رسالہ رفع یدین وفاتحہ کے ذکر میں ان کے محتویات کا تعارف نہیں کرایا گیا جو ضروری تھا۔ تاکہ طلبۂ حدیث واقف ہوتے۔

ص ۶۴ میں اسحٰق بن راہویہ کو حنفی لکھنا صحیح نہیں، وہ تلمذاً ضرور حنفی تھے مگر بعد کو وہ بھی امام بخاری وغیرہ کی طرح اصحاب الظواہر میں شامل ہو گئے تھے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ امام بخاری پر زیادہ اثر ان کا ہی پڑا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام بخاری کا اجتہاد

اسی طرح یہ لکھنا بھی تسامح ہے کہ امام بخاری ایک مجتہد کی شان رکھتے تھے، ہاں اگر یہ کہا جاتا تو درست ہوتا کہ وہ بھی ایک درجہ کا اجتہاد رکھتے تھے، باقی ان کو مجتہد مطلق قرار دینا ائمہ اربعہ کی طرح درست نہیں ہے۔ ان کے تلمیذ خاص امام ترمذیؒ نے بھی ان کے اجتہاد یا اجتہادی مسائل کو اہمیت نہیں دی جبکہ وہ دوسرے مذاہب ومسالک کی طرف تصریحاً یا اشارۃً ضرور تعرض کرتے ہیں۔ اور مقدمہ فیض الباری للشیخ محمد بدر عالمؒ ص ۵۸ میں بھی امام بخاری کو مجتہد بلا ریب جو لکھا گیا ہے وہ موہم ہے، وہاں بھی مراد ایک درجہ کا اجتہاد ہے، مجتہد مطلق مراد نہیں ہے۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ امام بخاری مجتہد مطلق نہ تھے، البتہ اتنا اجتہاد ان کو حاصل تھا کہ کسی کے مقلد ہونے کے محتاج نہ

تھے، نیز فرمایا تھا کہ امام اعظمؒ پر تو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے اجتہاد میں توسع کیا ہے، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ امام بخاری نے تو ان سے بھی زیادہ توسع اختیار کیا ہے کہ معمولی اشاروں اور عموم سے بھی استنباط کرلیا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے امام بخاری کے مجتہد ہونے نہ ہونے کے بارے میں اپنے مقدمۂ فتح الباری میں کوئی تعرض نہیں کیا، ثناء اماثل کے ذیل میں بھی بعض اماثل سے صرف حدیث وفقہ میں برتری نقل کی ہے۔ اور بعض نے حدیث وفقہ میں مثل امام مالک بھی کہا ہے (مقدمہ ص ۴۸۳)۔

دراسات اللبیب میں امام بخاری کو اہل ظاہر سے قرار دیا۔ اور مستقل فصل میں ظاہریہ واہل الظاہر میں مفصل طور سے فرق بیان کیا ہے۔ ظاہریہ میں داؤد ظاہری وغیرہ اور اصحاب الظواہر میں امام بخاری کو گنایا (ص ۳۰۰)۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ایضاح الادلہ کی تذییل ص ۷ میں داؤد ظاہری، ابن تیمیہ، ابن قیم، نواب صدیق حسن خان اور مولوی نذیر حسین وغیرہ کو عاملین علی الظاہر لکھا۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاری کے مجتہد ہونے میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

ص ۶۵۔ میں لکھا کہ کسی ایک بڑے کی حمایت میں دوسرے کی تنقیص کرنا مسلک اہل حق کے خلاف ہے الخ تو کیا ائمہ حنفیہ کی جتنی تنقیص وتحقیر شروع سے اب تک کی گئی ہے اور اب تک بھی کی جارہی ہے، جبکہ وہ سب ان بعد کے تنقیص کرنے والوں کے بڑوں کے بھی بڑے تھے، اس کے ذکر وتذکرے سے بھی پہلو تہی کرنا ہی اولی وانسب قرار پائے گا؟ اس موقع پر حضرت مجدد قدس سرہٗ کے ارشاد سے استدلال بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور امام صاحب کو صرف فنِ فقہ میں امام ماننے کے ذکر سے کیا فائدہ جبکہ وہ فن حدیث کے بھی امام اعظم تھے۔

ص ۶۵ میں امام بخاری کے بارے میں مطلق طور سے یہ لکھنا بھی خلاف تحقیق ہے کہ ان کے اقوال کو ہم سند مانتے ہیں۔ فن جرح وتعدیل میں ان کے سب اقوال سند مان لئے جائیں تو امام بخاریؒ نے اپنی تصانیف (التاریخ الکبیر، التاریخ الصغیر۔ کتاب الضعفاء الصغیر وخلق افعال العباد) میں امام اعظم کے بارے میں لکھا کہ مرجیٔ تھے اور لوگوں نے ان کی رائے اور حدیث سے سکوت اختیار کیا۔ امام ابو یوسف کو بھی متروک قرار دیا، امام محمد کو جہمی بتلایا، محدث کبیر یوسف بن خالد سمتی بصری پر بھی مسکوت عنہ کا حکم لگایا جبکہ وہ سنن ابن ماجہ کے رجال میں سے ہیں، اسد بن عمرو کو صاحب الرائی اور ضعیف فی الحدیث کہا جبکہ وہ امام احمد واحمد بن منیع ایسے محدثین کبار کے استاد ہیں اور امام احمد نے ان کو صدوق کہا اور ان سے روایت حدیث بھی کی ہے، پھر امام صاحب اور امام ابو یوسف وامام محمد کا جو مسلم درجہ حدیث ورجال میں ہے وہ ہم نے تفصیل کے ساتھ ان کے حالات میں درج کیا ہے (ملاحظہ ہو مقدمہ انوار الباری جلد اول ودوم)۔

رسالہ رفع یدین میں امام بخاری نے جیسے جیسے سخت کلمات واقوال امام اعظم کے بارے میں استعمال کئے، کیا وہ بھی ہمارے لئے سند ہیں؟ اور رسالہ فاتحہ خلف الامام میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اس مسئلہ کے ذیل میں آئے گا اور کچھ ذکر مقدمہ انوار الباری میں امام بخاری کی تصانیف کا تعارف کرانے کے ذیل میں ہو چکا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

یہ امر بھی لائق نسیان نہیں کہ جس کے مداح زیادہ ہوں اس کے بارے میں جارحین کی جرح مقبول نہیں ہوتی، خاص طور سے جب کہ وہ جرح ہم عصروں کی طرف سے ہو یا متعصبین کی طرف سے اور امام بخاری ودار قطنی وغیرہ کا شمار بھی متعصبین میں سے کیا گیا ہے۔ اور امام بخاری وغیرہ کے متعصبانہ رویہ پر نہ صرف اکابر حنفیہ نے بلکہ غیر حنفیہ نے بھی نقد کیا ہے۔ صاحب دراسات اللبیب شیخ معین سندی نے تو امام بخاری کی تہمت ارجاء پر شدید لہجہ میں جوابدہی کی ہے۔ اور لکھا کہ امام اعظم ابوحنیفہ کے لئے جو خدائے عظیم کی طرف سے علوم عقلیہ ونقلیہ کے اونچے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ تھے، امام بخاری جیسے کی طرف سے ارجاء کی تہمت کیوں کر مانی جاسکتی ہے جبکہ ارجاء کا بطلان اور خلاف کتاب وسنت واجماع ہونا ضروریات دین میں سے ہے۔ اور امام بخاری کا امام صاحب کے حق میں ''سکتوا عن رأیه و حدیثه'' کہنا تو اس لئے بھی غلط ہے کہ خود امام بخاری نے یہ اعتراف کیا ہے کہ کبار سلف میں سے عبداللہ بن مبارک، وکیع، عباد بن العوام، ہیثم، مسلم بن خالد، ابومعاویہ

مصری وغیرہ شیوخ بخاری جیسے ائمۂ حدیث نے امام صاحب سے روایت حدیث کی ہے اور دوسرے حضرات (علامہ مزی وغیرہ) نے تو سینکڑوں کی تعداد میں امام صاحب سے سماع حدیث کرنے والے گنائے ہیں، اور امام صاحب کی رائے کو اخذ کرنے والوں سے تو دنیا بھری ہوئی ہے۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ ان کی رائے سے سکوت کرنے والے کتنے نفر ہیں، بہت ہوئے تو ایک قطرہ کے برابر بہ نسبت سمندر کے۔ جو شخص ''عقد الجمان فی مناقب النعمان'' میں ان کا شمار پڑھے گا وہ ہمارے بیان کی تصدیق کرے گا (دراسات اللبیب ص۴۵۲ طبع کراچی) تہذیب المزی قلمی کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد سے ترجمۂ امام اعظمؒ کی نقل ص ۱۷۱ لغایۃ ص ۱۲۸۴ احقر کے پاس ہے جس میں ۹۷ شیوخ حدیث کے نام گنائے ہیں جو امام صاحب کے تلمیذ حدیث تھے اور ان کا ذکر علامہ سیوطی شافعی نے بھی ''تبییض الصحیفہ بمناقب الامام ابی حنیفہ'' میں کیا ہے۔

یہ شیخ معینؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تلمیذ رشید فی الحدیث کا بیان ہے، جو خود بھی اہل حدیث اور اصحاب الظواہر میں سے بڑے پایہ کے محدث وعلامہ تھے، اور جنہوں نے فقہ حنفی پر بڑے بڑے اعتراضات بھی کئے ہیں، مگر بڑی حد تک منصف تھے، دوسرے متعصب اہل حدیث حضرات کی طرح نہ تھے۔ اور یہ بھی نہیں کہ وہ امام بخاری کی جلالات قدر کے قائل نہ ہوں بلکہ ان کے نہایت درجہ کے معتقد تھے اور ان کے لئے دراسات میں امام الائمہ اور قبلۃ مشائخ الستہ جیسے القاب لکھتے ہیں، لیکن یہ ان کے انصاف، مرتبہ شناسی اور **انزلوا ان علی منازلھم** کی بات تھی کہ امام بخاریؒ کی جلالت قدر ہی کے ساتھ امام اعظم رحمہ اللہ علیہ کے اعلیٰ وارفع مقام کو بھی پہنچانتے تھے، اور اسی لئے مذکورہ زور دار طریقہ پر دفاع کو ضروری سمجھا۔

اسی طرح بعض جروح امام بخاری کا دفاع امام اعظمؒ کی طرف سے حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی کیا ہے، اور امام صاحب کی براءت ثابت کی ہے، پھر اکابر محققین حنفیہ نے بھی اس بارے میں بہت کافی ووافی لکھا ہے۔

امام بخاری کا قول امام ابو یوسف کے بارے میں ''متروک الحدیث'' ہونے کا کس طرح معتبر وسند بن سکتا ہے جبکہ امام نسائی جیسے متشدد فی الرجال نے ان کی توثیق کی ہے، اور امام احمد، علی بن المدینی وامام یحییٰ بن معین ایسے کبار شیوخ امام بخاری نے بھی ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح شیخ ابن حبان نے اپنی کتاب الثقات میں ان کو شیخ متقن لکھا۔ علامہ ذہبیؒ نے مستقل رسالہ میں امام ابو یوسفؒ کے حفظِ حدیث ودیگر کمالات کی دل کھول کر مدح کی ہے۔ متاخرین ائمہ رجال امام ابن قتیبہ وغیرہ نے امام صاحب یا امام ابو یوسف پر کسی جرح کو قابل ذکر بھی نہیں سمجھا۔ خطیب نے حسب عادت امام ابو یوسف پر جرح نقل کی مگر اثناء جرح میں جواب بھی دے دیا ہے۔ امام شافعی ایسے محدث کبیر بھی بواسطۂ امام محمدؒ ابو یوسف کے تلمیذ حدیث ہیں۔ **فکیف یصح القول فیہ انہ متروک الحدیث واللہ المستعان۔** پھر کیا امام بخاری کی یہ بات بھی کسی کے لئے حجت وسند بن سکتی ہے کہ جو راوی حدیث الایمان قول وعمل کا قائل نہ ہو اس سے حدیث کی روایت نہ لی جائے۔ حالانکہ خود امام بخاری بھی معتزلہ کی طرح الایمان قول وعمل کے قائل نہ تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سارے ہی اہل حق کا مسلک ارجاء سنت ہے، اور ارجاء بدعت کی تہمت حنفیہ پر بھی نہیں لگ سکتی۔

امام بخاری کا قول امام محمد کے بارے میں جہمی ہونے کا کیونکر صحیح وسند بنے گا جبکہ محدث صیمریؒ نے امام محمدؒ سے نقل کیا کہ ''میرا مذہب اور امام ابو حنیفہ وابو یوسف کا مذہب وہی ہے جو حضرت ابو بکر، پھر حضرت عمر، پھر حضرت عثمان اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین کا تھا''۔ ائمہ حنفیہ کے سارے عقائد ''کتاب عقیدۂ طحاوی'' میں مذکور ہیں، پھر بھی کوئی ان کو مرجیٔ یا جہمی بتلائے تو سرار غلطی ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے مجموعہ رسائل ص ۴۳۶/۱ میں خود امام محمدؒ ہی سے یہ روایت پیش کی کہ وہ جہمی عقائد والے کو خارج از ملت قرار دیتے تھے، پھر بھی ان کو جہمی بتلانا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ اور امام صاحبؒ کا جہم بن صفوان کو اپنی مجلس سے کافر کہہ کر نکلوا دینے کا قصہ تو بہت مشہور ہے۔ پھر ان ہی کے اتنے بڑے تلمیذ کبیر ونائب الامام الاعظم ...... جہمی کیسے ہوسکتے تھے؟ ہم اپنے علم ومطالعہ کی حد تک یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی بڑی شخصیت نے امام

بخاری کے سواامام محمد کوجہمی نہیں کہا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ص ۶۹ میں امام الحرمین اور امام غزالی رحمہ اللہ کے بارے میں جو قصہ بیان ہوا وہ بھی محلِ نظر اور محتاج سند ہے، ایسے اکابر ملت سے ایسے واقعات کی صحت مشکوک ہے، پھر اسی کے مثل امام ذہلی و امام بخاری کے واقعہ کو ظاہر کرنا بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ کیونکہ امام ذہلی بڑے جلیل القدر محدث وفقیہ تھے، اور امام بخاری کے اساتذۂ کبار میں سے تھے اور انہوں نے امام بخاری کی خیر خواہی کے لئے ہی ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ خلق قرآن کے بارے میں کسی کو مسئلہ نہ بتلائیں اور سکوت اختیار کریں، مگر امام صاحب نہ مانے اور پھر پریشانیوں میں مبتلا ہوئے۔ اس واقعہ کو حسد وغیرہ پر محمول کرنا خلافِ تحقیق ہے۔ اور غالباً اسی لئے امام بخاری نے اپنے استاذِ حدیث امام ذہلی سے بہت سی احادیث بخاری میں روایت کی ہیں۔ جبکہ امام مسلم نے نہ اپنے استاذ امام ذہلی سے کوئی حدیث روایت کی اور نہ اپنے ممدوح اعظم امام بخاری سے کوئی حدیث لی۔ حافظ ابن حجر نے اس کو امام مسلم کے انصاف سے تعبیر کیا ہے، مگر روایتِ حدیث ایسے مقدس ومحترم ترین امر کے بارے میں یہ انصاف کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مجھے قوی امید ہے کہ مرتب فضل الباری فاضلِ محترم مولانا قاضی عبدالرحمٰن صاحب دام فیضہم میری گذارشات سے ناراض نہ ہوں گے اور کوئی غلط ہوئی ہو یا خلافِ شان کوئی بات تو اس کو معاف فرمادیں گے۔ خدا کا شکر ہے ہم دونوں کا مقصد ایک ہے اور اس خالص علمی میدان میں ہم ایک دوسرے کے رفیق ومعاون رہیں گے۔ ان شاءاللہ۔ آخر میں میری ان سے یہ گذارش بھی ہے کہ وہ مجھے میری غلطیوں پر متنبہ فرما کر ممنون وماجور ہوں۔ وعند الله في ذاك الجزاء. وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين.

تشکر وامتنان

جیسا کہ سابق جلد کے مقدمہ میں عرض کیا گیا تھا انوارالباری کا پھر سے کام احبابِ آفریقہ کی تائید واصرار پر شروع ہوا ہے، اور یہ دونوں جلدیں ان ہی کی مالی اعانت سے شائع ہورہی ہیں۔ اس سلسلہ میں الحاج ایس ایم ڈوکرات، الحاج مولانا اسماعیل گارڈی، الحاج ایم ایم بوڈھانیہ، میاں برادرس، منتی برادرس، الحاج ابراہیم کوساڈیہ، الحاج مولانا عبدالحق عمرجی، مولانا قاسم محمد سیما، مولانا عبدالقادر، مولانا احمد محمد گردا، مولانا یوسف احمد اور دیگر حضرات ناظرینِ انوارالباری کی نیک دعاؤں اور خصوصی تشکر کے مستحق ہیں جو مالی اعانت کے علاوہ اپنے مفید مشوروں سے بھی راقم الحروف کو مستفید کرتے رہتے ہیں۔ جزاهم الله خير ما يجزى به عباده.

احقر

سیّد احمد رضاء عفا الله عنه.

بجنور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰه علی القادر المقتدر الذی بیده تتم الصالحات، والصلوٰة والسلام علیٰ سیدنا و مولانا محمد افضل المرسلین و خاتم النبین و علے آله و صحبه والائمة المجتهدین و من تبعهم الی یوم الدین

باب ذکر العشآء والعتمة و من راٰه واسعاً وقال ابوهریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم اثقل الصلوٰة علی المنافقین العشآء والفجر وقال لو یعلمون ما فی العتمة والفجر قال ابوعبدالله والاختیار ان یقول العشآء لقول الله تعالیٰ و من بعد صلوٰة العشآء ویذکر عن ابی موسیٰ قال کنا تتناوب النبی صلی الله علیه وسلم عند صلوٰة العشآء فاعتم بها وقال ابن عباس و عائشة اعتم النبی صلی الله علیه وسلم بالعشآء وقال بعضهم عن عائشة اعتم النبی صلی الله علیه وسلم بالعتمة وقال جابر کان النبی صلی الله علیه وسلم یصلی العشآء وقال ابو برزة کان النبی صلی الله علیه وسلم یؤخر العشآء وقال انس اخر النبی صلی الله علیه وسلم العشاء الاآخرة وقال ابن عمرو ابوایوب و ابن عباس صلی الله علیه وسلم العشاء الأخرة وقال ابن عمرو ابوایوب و ابن عباس صلی النبی صلے الله علیه وسلم المغرب والعشآء

(عشاء اور عتمہ کا ذکر، اور جس نے عشاء اور عتمہ دونوں کہنا جائز خیال کیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ منافقین پر عشاء اور فجر کی نماز تمام نمازوں سے زیادہ گراں ہیں اور فرمایا کہ کاش وہ جان لیں کہ عتمہ اور فجر میں کیا (ثواب) ہے، امام بخاریؒ کہتے ہیں، کہ بہتر یہ ہے کہ عشاء کہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے'' **ومن بعد صلوة العشاء** '' ابوموسیٰ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا، کہ (ہم) نبی ﷺ کے پاس عشاء کی نماز میں باری باری سے جاتے تھے، (ایک مرتبہ) آپ نے اس کو عتمہ میں پڑھا، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عشاء کی نماز عتمہ میں پڑھی، ابو برزہ کہتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ عشاء میں تاخیر کرتے تھے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک مرتبہ) پچھلی عشاء میں تاخیر فرمادی، ابن عمر اور ابوایوب اور ابن عباس نے کہا ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی)۔

۵۳۴: حدثنا عبدان قال اخبرنا عبدالله قال اخبرنا یونس عن الزهری قال سالم اخبرنی عبدالله قال صلی لنا رسول الله صلی الله علیه وسلم لیلة صلوٰة العشآء و هی التی یدعوالناس العتمة ثم انصرف فاقبل علینا فقال ارائیتکم لیلتکم هٰذه فان راس مائة سنة منها لایبقیٰ ممن هو الیوم علیٰ ظهر الارض احد.

ترجمہ: حضرت عبداللہ (ابن عمرؓ) روایت کرتے ہیں، کہ ایک شب رسولِ خدا ﷺ نے ہمیں عشاء کی نماز پڑھائی، اور یہ وہی (نماز) ہے۔ جس کو لوگ عتمہ کہتے تھے، نماز سے فارغ ہوکر ہماری طرف متوجہ ہوئے، اور فرمایا کہ میں تمہیں تمہاری اس شب کی خبر دوں جو لوگ اس وقت زمین کے اوپر ہیں آج سے ۱۰۰ برس کے شروع تک ان میں سے کوئی باقی نہ رہے گا۔

تشریح: اس باب میں امام بخاریؒ نے ایسے الفاظ واسماء کے لئے گنجائش وتوسع نکالی ہے، جن کے اطلاق سے کوئی بڑی غلط فہمی اوپر کی طرح نہ ہو، مثلاً عشاء کے لئے عتمہ کا اطلاق، حافظ نے لکھا کہ یہ پہلے کی طرح نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ السلام سے بھی ایسا ثابت ہے جبکہ مغرب پر عشاء کا اطلاق حضور علیہ السلام سے ثابت نہیں ہے، پھر سلف کا اختلاف مروی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ عتمہ کہنے والوں پر عتاب وغصہ کرتے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ وغیرہ سے جواز نقل ہوا اور بعض نے خلاف اولیٰ قرار دیا، اور یہی راجح ہے۔ (فتح ص ۲،۳۱) قال ابوہریرہؓ سے امام

بخاری نے اطرافِ احادیث مجذوفۃ الاسانید ذکر کئے ہیں، جو بقول حافظ سب صحیح ہیں اور دوسری جگہوں پر ان کی تخریج ہو چکی ہے، ان سے عتمہ وعشاء کا ایک دوسرے پر جو اطلاق کا ثبوت ہوتا ہے، حافظ نے ان کی تخریج ذکر نہیں کی، علامہ عینی نے ان کو تفصیل کے ساتھ ذکر کر دیا ہے۔

قولہ فان رأس مائۃ سنۃ الخ

اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس وقت زمین پر زندہ تھے، لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آسمان پر زندہ ہیں، اس میں داخل نہیں، پھر فرمایا کہ جس نے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جسدِ مثالی کے ساتھ نزول کریں گے، اس نے غلطی کی، کیونکہ وہ یقیناً جسدِ اصلی وعنصری کے ساتھ نزول فرمائیں گے۔ حافظ نے یہاں کچھ نہیں لکھا، محقق عینیؒ نے لکھا۔ علامہ نووی نے یہ مراد لی کہ اس رات میں زمین پر کوئی ایسا نہیں جو ایک سو سال سے زیادہ زندہ رہے گا، اس امر کی نفی نہیں ہے کہ اس کے بعد بھی کسی کی عمر ایک سو سال سے زیادہ نہ ہوگی، علامہ ابن بطال نے کہا کہ ایک سو سال کے اندر یہ قرن ختم ہو جائے گا، جس میں ہم ہیں، اور حضور علیہ السلام کا مقصد اس کے فرمانے سے اس امت کے لوگوں کی عمروں کا بہ نسبت سابقہ امم کے کم ہونے کی طرف اشارہ تھا تا کہ عبادت وخیر میں پوری سعی کریں، اور کسی نے کہا کہ ارض سے حضور علیہ السلام کی مراد ارضِ مدینہ طیبہ تھی جس طرح آیت الم تکن ارض اللّٰہ واسعۃ میں ارض سے مراد مدینہ ہے اور وجہ الارض سے ملائکہ نکل گئے کہ وہ آسمانی ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی آسمان پر زندہ ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام کی اقامت بحر میں ہے، ہاروت وماروت اگرچہ دنیا میں ہیں مگر وہ بشر نہیں ہیں، ابلیس وشیاطین وجن بھی بشر نہیں ہیں اور حدیث میں بشر مراد ہیں، نیز سیدنا حضرت عیسیٰ اور خضر علیہما السلام کے بارے میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ امت محمدیہ میں نہیں ہیں اور حدیث میں ذکر امت کا ہے کہ ان کو اعمالِ خیر کی طرف رغبت دلاتا ہے۔

حیاتِ خضر علیہ السلام

علامہ عینی نے یہاں یہ بھی لکھا کہ امام بخاری اور ان کے ہم خیال حضرات نے حدیث الباب سے حضرت خضر علیہ السلام کی موت پر استدلال کیا ہے، لیکن جمہور ان کے خلاف ہیں اور علامہ سہیلی نے محقق امت ابنِ عبدالبرؒ سے نقل کیا ہے کہ متواتر اخبار وآثار سے حضرت خضر علیہ السلام کا اجتماع حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے، لہٰذا اس سے عدم اجتماع والی بات بھی غلط ہو جاتی ہے، اور بالفرض اگر وہ حضور علیہ السلام کے پاس نہ بھی تشریف لائے ہوں تو کتنے ہی حضرات حضور علیہ السلام پر ایمان لائے ہیں مگر حاضرِ خدمت نہیں ہو سکے نہ آپ کو دیکھ سکے اس لئے عدم اتیان عدم حیات کی دلیل نہیں بن سکتی، پھر لکھا کہ حضرت ابن عباس ووہب کی رائے ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی مرسل ہیں، مقاتل و اسماعیل بن ابی زیاد شامی کی بھی یہی رائے ہے۔ بعض نے کہا کہ ولی ہیں، علامہ ابوالفرج نے کہا کہ صحیح یہ ہے کہ وہ نبی ہیں۔ (عمدہ ص۲/۵۷۲)

باب وقت العشاء اذا اجتمع الناس او تاخروا

(عشاء (کی نماز) کا وقت، جب لوگ جمع ہو جائیں، تو پڑھنا اگر دیر میں آئیں، تو دیر کر کے پڑھنا)

۵۳۵: حدثنا مسلم بن ابراهيم قال حدثنا شعبة عن سعد بن ابراهيم عن محمد بن عمرو وهو ابن الحسن بن علي، بن ابی طالبؓ قال سالنا جابر بن عبدالله عن صلوٰة النبی صلی الله عليه وسلم فقال كان النبی صلی الله عليه وسلم يصلی الظهر بالهاجرة والعصر والشمس حية والمغرب اذا وجبت والعشآء اذا كثر الناس عجل واذا اقلوا آخر والصبح بغلس

ترجمہ: (۵۳۵) حضرت محمد بن عمرو بن حسن بن علی بن ابی طالبؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے جابر بن عبداللہ نے نبی کریم ﷺ کی نماز کی

کیفیت پوچھی، انہوں نے کہا کہ ظہر کی نماز آپ دوپہر میں پڑھتے تھے، اور عصر کی ایسے وقت کہ آفتاب صاف ہوتا، اور مغرب کی جب وہ غروب ہوجاتا، اور عشاء کی نماز جب آدمی بہت ہوجاتے، جلد پڑھ لیتے، اور جب کم ہوتے تو دیر میں پڑھتے اور صبح کی نماز اندھیرے میں (پڑھتے)۔

تشریح: علامہ عینیؒ نے لکھا کہ اس باب میں عشاء کا وقت بیان ہوا ہے کہ وہ اجتماع کے وقت ہے، اول وقت جمع ہوں تو اول وقت ہے اور دیر سے جمع ہوں تو تاخیر ہے اور حدِ تاخیر میں مختلف اقوال ہیں۔ ان کو ہم حدیث نمبر ۵۴۱ کے تحت بیان کریں گے۔

باب فضل العشآء

(نمازعشاء کی فضیلت کا بیان)

۵۳۶: حدثنا یحیی بن بکیر قال حدثنا اللیث عن عقیل عن ابن شھاب عن عروة ان عآئشة اخبرته قالت اعتم رسول الله صلی الله علیه وسلم لیلة بالعشاء و ذٰلک قبل ان یفشوا الاسلام فلم یخرج حتیٰ قال عمرؓ نام النسآء والصبیان فخرج فقال لاھل المسجد ماینتظرھا احدمن اھل الارض غیرکم

۵۳۷: حدثنا محمد بن العلآء قال حدثنا ابواسامة عن برید عن ابی بردة عن ابی موسیٰ قال کنت انا واصحابی الذین قد موامعی فی السفینة نزولا فی بقیع بطحان والنبی صلی الله علیه وسلم بالمدینة فکان یتناوب النبی صلی الله علیه وسلم عند صلوٰة العشآء کل لیلة نفرمنھم فوافقنا النبی صلی الله علیه وسلم انا واصحابی وله' بعض الشغل فی بعض امره فاعتم بالصلوٰة حتیٰ ابھآر اللیل ثم خرج النبی صلی الله علیه وسلم فصلی بھم فلما قضیٰ صلوٰته قال لمن حضره' علیٰ رسلکم ابشروا ان من نعمة الله علیکم انه لیس احد من الناس یصلی ھٰذه الساعة غیرکم اوقال ما صلےٰ ھٰذه الساعة احد غیرکم لایدری ای الکلمتین قال قال ابوموسیٰ فرجعنا فرحیٰ بما سمعنا من رسول الله صلی الله علیه وسلم

ترجمہ: ۵۳۶۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک شب عشا کی نماز میں رسول خدا ﷺ نے تاخیر کردی یہ (واقعہ) اسلام کے پھیلنے سے پہلے (کا ہے) (چنانچہ) آپ اس وقت نکلے، جس وقت حضرت عمرؓ نے آپ سے آکر (کہا) کہ عورتیں اور بچے سو چکے۔ آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا، کہ زمین والوں میں سوا تمہارے کوئی اس نماز کا منتظر نہیں ہے۔

ترجمہ: ۵۳۷۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، کہ میں اور میرے وہ ساتھی جو کشتی میں میرے ہمراہ آئے تھے بقیع بطحان میں مقیم تھے۔ اور نبی کریم ﷺ مدینہ میں تھے، تو ان میں سے کئی کئی آدمی نوبت بہ نوبت نبی کریم ﷺ کے پاس جاتے تھے (ایک دن) ہم سب یعنی میں اور میرے ساتھی نبی کریم ﷺ کے پاس گئے اور آپکو اپنے (کسی) کام میں (ایسی) مصروفیت تھی، کہ (عشاء کی) نماز میں آپ نے تاخیر کردی، یہاں تک کہ رات آدھی ہوگئی، اس کے بعد نبی کریم ﷺ باہر تشریف لائے۔ اور لوگوں کو نماز پڑھائی جب آپ نماز ختم کر چکے تو جو لوگ وہاں موجود تھے، ان سے فرمایا، کہ ٹھہرو، خوش ہوجاؤ، کیونکہ تم پر اللہ کا یہ احسان ہے کہ تمہارے سوا کوئی آدمی اس وقت نماز نہیں پڑھتا، یا یہ فرمایا کہ اس وقت میں تمہارے سوا کسی نے نماز نہیں پڑھی، معلوم نہیں آپ نے (ان دو جملوں میں سے) کون سا فرمایا حضرت ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ ہم اس بات سے جو کہ رسول خدا ﷺ سے ہم نے سنی خوش ہوکر لوٹے۔

تشریح:۔ حافظؒ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے جو دو حدیثیں اس باب میں ذکر کی ہیں ان دونوں سے کوئی واضح خصوصی فضیلت نماز عشاء کی ثابت

نہیں ہوتی، البتہ انتظار عشا کی فضیلت نکلتی ہے، شاید وہی مراد ہو۔ (فتح صفحہ ۳۲۲) لیکن اگر انتظار کی فضیلت بتلانی تھی تو یہ لفظ کیوں حذف کیا اور آگے امام بخاری کتاب الاذان میں ایک باب مسجد میں انتظار صلوٰۃ کا لائیں گے تو تکرار ہو گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا کہ ظاہر یہ ہے کہ حسب ارشاد نبوی نماز کا یہ وقت اس امت کے ساتھ مخصوص ہے لہٰذا یہی نماز عشا کی فضیلت بن گئی۔ پھر شاہ صاحبؒ نے انتظار والی توجیہ کے مقابلہ میں اسی توجیہ کو ترجمۃ الباب کے مناسب بتلایا اور لکھا **کما لا یخفی علی من له طبع سلیم**. گویا انتظار والی توجیہ طبع سلیم پر گراں ہے اور علامہ عینی نے بھی حافظ کی توجیہ پر نقد کیا ہے، حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ میرے نزدیک فضل انتظار العشا ہی فضل العشا ہے۔ (الابواب ۲ صفحہ ۲۴۵) لیکن سوال یہ ہے کہ انتظار کی فضیلت تو ہر ایک نماز کے لئے یکساں ہے، اس میں عشا کی الگ کیا خصوصیت ہے، لہٰذا بہتر توجیہ وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بیان کی اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ اور آپ نے اس بارے میں پوری تحقیق و تفصیل بھی فرمائی جو قابل ذکر ہے۔

افادۂ انور: حضرتؒ نے قولہ علیہ السلام **و ما ینتظرها احد غیر کم** پر فرمایا کہ علامہ سیوطیؒ نے حصر بہ نسبت اہل کتاب کے قرار دیا اور اپنی شرح البخاری میں یہ دعویٰ کیا کہ عشا کی نماز کسی امت میں نہیں تھی بجز اس امت کے، اور امام طحاوی کے قول سے استدلال کیا کہ سب سے پہلے عشا کی نماز ہمارے نبی اکرم ﷺ نے پڑھی ہے، لیکن اس میں مجھے تامل ہے کیونکہ سب نمازیں دوسرے انبیاء علیہم السلام سے ثابت ہیں، اگرچہ ان کی امتوں پر فرض نہ تھیں، اور بنی اسرائیل پر صرف فجر و عصر کی نماز تھی جیسا کہ نسائی میں ہے۔ اس لئے علامہ سیوطیؒ کی رائے مذکور کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ عشا کی نماز بوصف فرضیت اسی امت کے ساتھ خاص ہے اور دوسروں نے اگر پڑھی ہے تو وہ نفل کے طور پر پڑھی ہے۔ لہٰذا **ما ینتظرها** کا مطلب بھی بحیثیت فرض ہونے کے ہوگا، بعض نے یہ کہا کہ ابتدا میں اسلام چونکہ اطراف مدینہ میں نہ پھیلا تھا جیسا کہ حدیث الباب میں بھی اس کا ذکر ہے لہٰذا حصر بہ نسبت اطراف کے ہوگا۔ (یہاں فیض الباری صفحہ ۲۔۱۳۱ میں بجائے اطراف کے الکفار غلط ہے) حافظ اور عینی نے لکھا:۔ مراد یہ ہے کہ اس ہیئت مخصوصہ یعنی جماعت کے ساتھ نماز نہ ہوتی تھی۔ بجز مدینہ کے، اور اسی کو داؤدی نے بھی اختیار کیا ہے۔ کیونکہ مکہ معظمہ میں تو صحابہ کرام کمزور تھے، چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے تھے، اور بجز مکہ و مدینہ کے اور شہروں میں اسلام داخل نہ ہوا تھا (فتح ۲ صفحہ ۳۴ و عمدہ ۲ صفحہ ۵۷۸) پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ حصر بہ نسبت مسجد نبوی کے ہو اور دوسری مساجد میں نماز عشا اپنے وقت پر بلا تاخیر کے ہو جاتی ہو، کیونکہ حسب روایت دار قطنی مدینہ میں ۹ مساجد تھیں، اور علامہ سمہودی نے بھی متعدد بتلائی ہیں، یعنی دوسری مساجد میں لوگ نماز عشا پڑھ کر سو چکے، اور تم میری وجہ سے تاخیر سے پڑھ رہے ہو۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بخاری صفحہ ۹۱ میں حدیث آنے والی ہے، جس میں حضور علیہ السلام کا ارشاد **صلی الناس و ارقدوا** الخ موجود ہے، جس سے حضرتؒ کے ارشاد کی تائید ہوتی ہے اور صفحہ ۱۱۹ میں **ولم یکن احد یومئذ یصلی غیر اهل المدینة** اور دوسری جگہ اسی صفحہ پر **ما ینتظرها احد غیر کم من اهل الارض، ولا تصلی یومئذ الا بالمدینة** بھی ہے، ان سب کو سامنے رکھ کر بات منقح ہو جاتی ہے۔

تحقیق مزید: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مسجد نبوی میں انتظار نماز عشا کے واقعات متعدد اوقات میں پیش آئے ہیں، یہاں حضرت عائشہ کی حدیث میں ابتداء اسلام کا واقعہ ہے پھر حضرت ابو موسیٰؓ کی حدیث بہت بعد کی ہے، کیونکہ وہ حبشہ سے ۷ھ میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے ہیں، وہ یمن سے حضور علیہ السلام کی زیارت شریفہ کے لئے نکلے تو پہلے ہی تھے، مگر راستہ میں ہوا آندھی نے ان کو حبشہ میں پھینک دیا اور وہاں وہ سات سال تک رکے رہے، پھر وہ مع اپنے اصحاب کے حضرت جعفرؓ کے ساتھ مدینہ پہنچے اور بقیع بطحان میں اترے، وہاں سے نوبت بہ نوبت ان میں سے کچھ افراد حضور اکرم ﷺ کی خدمت مبارک میں ہر رات عشاء کے وقت حاضر ہوا کرتے تھے اور اسی زمانہ کا قصہ حدیث

میں بیان ہوا ہے، اور باب النوم قبل العشاء میں جو حدیث ابن عباس آنے والی ہے، اس کا واقعہ اس سے بھی بعد کا ہے کیونکہ وہ ۸ھ میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے چشم دید حالات بعد کے ذکر فرماتے ہیں۔

حضرتؒ نے اس تفصیل کی کوئی خاص وجہ بیان نہیں فرمائی، اور حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے بھی اس کو نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے، احقر عرض کرتا ہے کہ شاید مقصد یہ ہوگا کہ ہر زمانہ کے مناسب توجیہ اختیار کر لی جائے، اور خاص طور سے مسجد نبوی والی توجیہ ہر زمانہ کے لئے موزوں ہو سکتی ہے، یعنی دوسری مساجد مدینہ میں نماز عشا میں اتنی تاخیر نہ ہوتی تھی جتنی مسجد نبوی میں ہو جاتی تھی، کیونکہ حضور اکرم علیہ السلام کی خدمت میں حضرات صحابہ کرام علوم دینیہ حاصل کرنے کے لئے مختلف اطراف سے پہنچتے تھے، اور کچھ کچھ دن قیام کر کے اپنے اپنے وطنوں کو واپس ہو جاتے تھے۔ تو حضور علیہ السلام کی ہمہ وقتی مشغولی اور شبانہ تعلیم جاری رہنے کے سبب سے نماز عشا میں تاخیر معمولی بھی اور بعض اوقات غیر معمولی بھی ہو جاتی ہوگی، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہوگا کہ آپ دن کے معمولات سے تھک کر بعد مغرب آرام فرماتے ہوں گے، اس لئے بھی نماز عشا میں زیادہ تاخیر ہو جاتی ہوگی، وغیرہ وغیرہ، ظاہر ہے کہ اتنی تاخیر کی مسجد نبوی کے علاوہ کہیں بھی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

باب ما يكره من النوم قبل العشآء

(عشاء کی نماز) سے پہلے سونا مکروہ ہے)

۵۳۸: حدثنا محمد بن سلام قال حدثنا عبدالوهاب الثقفي قال حدثنا خالدن الحذآء عن ابي المنهال عن ابي برزة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يكره النوم قبلها والحديث بعدها

ترجمہ ۵۳۸: حضرت ابو برزہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا علیہ السلام عشا سے پہلے سونے کو، اور اس کے بعد بات کرنے کو مکروہ خیال کرتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا، اگر کوئی نماز عشا کے وقت اٹھانے والا ہو، یا عادۃً نماز سے قبل اٹھ سکتا ہو تو سونے میں کوئی حرج نہیں، (بشرط یہ کہ نماز قضا نہ ہو کہ صبح تک سوتا ہی رہے) امام طحاویؒ نے فرمایا کہ رخصت صرف دخول وقت عشا سے قبل کے لئے ہے، اس کے بعد کراہت ہے۔

باب النوم قبل العشآء لمن غلب

(جس شخص پر نیند کا غلبہ ہو اس کے لئے عشاء سے پہلے سونے کا بیان)

۵۳۹: حدثنا ايوب بن سليمان قال حدثني ابوبكر عن سليمان قال صالح بن كيسان اخبرني ابن شهاب عن عروة ان عآئشه قالت اعتم رسول الله صلى الله عليه وسلم بالعشآء حتىٰ ناداه عمر الصلوٰة نام النسآء والصبيان فخرج فقال ما ينتظرها من اهل الارض احدغيركم قال ولا يصلى يومئذ الابالمدينه قال وكانوا يصلون فيما بين ان يغيب الشفق الىٰ ثلث الليل الاول

۵۴۰: حدثنا محمود قال حدثنا عبدالرزاق قال اخبر نا ابن جريج قال اخبرني نافع قال حدثنا عبدالله بن عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم شغل عنها ليلة فاخرها حتى رقد نافي المسجد ثم استيقظنا ثم رقد نا ثم استيقظنا ثم خرج علينا النبي صلى الله عليه وسلم ثم قال ليس احد من اهل الارض ينتظر الصلوٰة غيركم و كان ابن عمر لا يبالي اقدمها ام اخرها اذاكان لايخشىٰ ان يغلبه النوم عن وقتها و قد كان يرقدقبلها قال ابن جريج قلت لعطاء فقال سمعت ابن عباس يقول اعتم رسول الله صلى الله عليه

وسلم ليلة بالعشآء حتىٰ رقد الناس واستيقظوا ورقدوا واستيقظوا فقام عمر بن الخطاب فقال الصلوٰة قال عطآء قال ابن عباس فخرج نبى الله صلى الله عليه وسلم كانى انظر اليه الأن يقطر راسه' مآء واضعاً يده' علىٰ راسه فقال لولا ان اشق علىٰ امتى لامرتهم ان يصلوها هٰكذا فاستثبت عطآء كيف وضع النبى صلى الله عليه وسلم علىٰ راسه يده' كمآ انباه ابن عباسؓ فبددلى عطآء بين اصابعه شيئاً من تبديد ثم وضع اطراف اصابعه علىٰ قرن الراس ثم ضمها يمرها كذٰلك علىٰ الراس حتىٰ مست ابهامه' طرف الاذن مما يلى الوجه على الصدغ وناحية اللحية لايعصرو لا يبطش الا كذٰلك وقال لولآان اشق علىٰ امتى لامرتهم ان يصلوا هٰكذا.

ترجمہ ۵۳۹: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں، کہ (ایک مرتبہ) رسول خدا ﷺ نے عشا (کی نماز) میں تاخیر کردی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے آپ کو آواز دی، کہ نماز (تیار ہے) عورتیں اور بچے سو گئے، تب آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا، کہ اس نماز کا تمہارے سوا کوئی انتظار نہیں کرتا (ابو برزہ کہتے ہیں کہ اس وقت تک مدینہ منورہ کے سوا اور کہیں نماز نہ پڑھی جاتی تھی، وہ کہتے ہیں کہ صحابہ (عشاء کی نماز) شفق کے غائب ہو جانے کے بعد رات کی پہلی تہائی تک پڑھ لیتے تھے۔

ترجمہ ۵۴۰: حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک رات رسول خدا ﷺ کو عشا کے وقت کوئی ضرورت پیش آ گئی، اس وجہ سے آپ کو (عشا کی) نماز میں تشریف لانے میں تاخیر، ہوگئی، یہاں تک کہ ہم مسجد میں سو رہے، پھر جاگے، پھر سو رہے، اس کے بعد نبی کریم ﷺ تشریف لائے، اور فرمایا کہ اس وقت زمین والوں میں تمہارے سوا کوئی (اس) نماز کا انتظار نہیں کر رہا ہے، (اور ابن عمر کچھ پروا نہ کرتے تھے، کہ عشاء کی نماز جلد پڑھ لیں یا دیر میں پڑھیں۔ بشرط یہ کہ نماز کے فوت ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا۔ اور کبھی وہ عشاء سے پہلے سو رہتے تھے، ابن جریج کہتے ہیں میں نے عطاء سے (اس حدیث کو) بیان کیا تو انہوں نے کہا، کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے سنا وہ کہتے تھے، کہ ایک شب رسول خدا ﷺ نے عشاء کی نماز میں اس حد تک تاخیر کر دی کہ لوگ سو رہے اور پھر جاگے، اور پھر سو رہے اور پھر جاگے، تو عمر بن خطاب کھڑے ہو گئے، اور انہوں نے (جا کر آپ سے) کہا کہ نماز (تیار ہے) عطاء کہتے ہیں کہ ابن عباس نے کہا، پھر رسول خدا ﷺ باہر تشریف لائے گویا کہ میں آپ کی طرف اس وقت دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا ہے، اور آپ اپنا ہاتھ سر پر رکھے ہوئے ہیں، آپ نے فرمایا، کہ اگر میں اپنی امت پر گراں نہ سمجھتا تو یقیناً انہیں حکم دے دیتا کہ عشاء کی نماز اسی طرح (اسی وقت) پڑھا کریں (ابن جریج کہتے ہیں) پھر میں نے عطاء سے بطور تحقیق کے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر کس طرح رکھا تھا، جیسا کہ ابن عباس نے ان کو خبر دی تو عطاء نے میرے (دکھانے کے) لئے اپنی انگلیوں کے درمیان میں کچھ تفریق کر دی اس کے بعد اپنی انگلیوں کے سرے سر کے ایک جانب پر رکھ دیئے پھر ان کو ملا کر اس طرح سر پر کھینچ لائے۔ یہاں تک کہ ان کا انگوٹھا ان کے کان کی لو سے جو چہرے کے قریب ہے، داڑھی کے کنارے مل گیا، آپ جب پانی بالوں سے نچوڑتے اور جلدی کرنا چاہتے تو اسی طرح فرمایا کرتے، آپ نے فرمایا کہ اگر میں اپنی امت پر گراں نہ سمجھتا، تو بے شک انہیں حکم دے دیتا کہ وہ (عشاء کی نماز) اسی طرح (یعنی اسی وقت) پڑھا کریں۔

تشریح: حضرت نے فرمایا کہ حالات کے مطابق تقسیم ہے، اسی لئے جس پر کسی وجہ سے نیند کا زیادہ غلبہ ہو تو اس کے لئے بھی شرعاً گنجائش واجازت ہے۔ حدیث الباب میں ہے کہ عشا کی نماز غروب شفق سے تہائی شب تک پڑھائی جاتی تھی، اس لئے شفق کی تحقیق بھی ضروری ہوئی، علامہ خطابی نے لکھا:۔ کچھ حضرات کی رائے ہے کہ شفق سرخی ہوتی ہے غروب کے بعد، یہ حضرت ابن عمر وحضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اور مکحول وطاؤس کا بھی یہی قول ہے امام مالک، سفیان ثوری، ابن ابی لیلی، امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی، امام احمد واسحق نے اسی کو اختیار کیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے

شفق بیاض کو قرار دیا جو سرخی کے بعد ہوتی ہے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بھی یہی منقول ہے، اسی قول کو امام ابوحنیفہ اور اوزاعیؒ نے اختیار کیا، تیسری رائے بعض حضرات کی یہ بھی ہے کہ شفق حمرۃ و بیاض ملی جلی کا نام ہے کہ نہ خالص سرخی ہو نہ کھلی سفیدی، (معالم السنن صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۵)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے بھی یہ آخر کا قول زیادہ پسند ہے کیونکہ شفق اشفاق وشفقت سے ماخوذ ہے، جس کے معنی میں رقت ہے، اس لئے اس میں دونوں کا ہلکا رنگ وعکس ہونا چاہئے۔ پھر فرمایا کہ طلوع صبح صادق سے طلوع شمس تک جتنا وقت ہوتا ہے تقریبا اتنا ہی غروب شمس سے غروب شفق ابیض تک ہوتا ہے۔ علم ریاضی والوں نے یہی تحقیق کی ہے نیز فرمایا کہ احادیث میں جو عشا کا وقت ثلث یا نصف لیل تک آیا ہے وہ سورۂ مزمل کی آیت "قم الليل الا قليلا نصفه او انقص منه قليلا اوزد عليه" کے مطابق ہے، حق تعالے نے اوقات لیل کو نماز عشا اور نماز تہجد کے درمیان تقسیم فرمادیا ہے، اگر عشا کو نصف کے اندر پڑھ لیا تو باقی نصف تہجد کے لئے رہ گئی اور اگر نماز عشا ثلث کے اندر پڑھی تو اس رات میں باقی دو ثلث تہجد کے لئے رہ گئے۔ اور اسی کے مطابق نزول باری بھی ہوتا ہے، کہ اس کی روایات بھی عشا کی طرح کوئی نصف کی ہے کوئی ثلث کی حافظؒ نے اگر چہ ثلث آخر کو ترجیح دی ہے مگر میرے نزدیک محقق یہ ہے کہ سب روایات صحیح ہیں، اور نزول کے بھی انواع ہیں، کسی کا وقت ثلث کے لئے ہے، کسی کا نصف کے لئے اور ہم ان نزولات کی کیفیات وذوق سے ناواقف ہیں مزید تحقیق اس کے موقع پر آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

باب وقت العشآء الیٰ نصف اللیل وقال ابوبرزة كان النبی صلی الله علیه وسلم یستحب تاخیرها

۵۴۱: حدثنا عبدالرحيم المحاربی قال حدثنا زائدة عن حميد ن الطويل عن انس قال اخر النبی صلی الله عليه وسلم صلوٰة العشآء الیٰ نصف الليل ثم صلی ثم قال قد صلی الناس وقاموا اما انكم فی صلوة ما انتظر تموها وزادا بنَ مريم قال اخبرنا يحيیٰ بن ايوب قال حدثنی حميد سمع انساً كانی انظر الیٰ و بيض خاتمه ليلتئذ

ترجمہ ۵۴۱: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عشا کی نماز میں (ایک مرتبہ) نصف شب تک تاخیر فرمائی، اس کے بعد نماز پڑھی اور فرمایا کہ لوگ نماز پڑھ کر سو رہے، اور تم نماز میں رہے، جب تک کہ تم نے اس کا انتظار کیا، اور ابن ابی مریم نے اتنی بات زیادہ روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے یحیٰی بن ایوب نے کہا، وہ کہتے ہیں مجھ سے حمید نے بیان کیا، انہوں نے انسؓ سے سنا کہ گویا میں اس شب والی آپ کی انگوٹھی کی چمک کو اب بھی دیکھ رہا ہوں۔

تشریح: علامہ عینیؒ نے آخر وقت عشا کے لئے صحابہ کرام کے مختلف آثار واقوال ذکر فرما کر لکھا کہ ان ہی کے تحت ائمہ مجتہدین کا بھی اختلاف پیش آیا ہے، چنانچہ قاضی عیاض نے لکھا کہ امام مالک وشافعی (فی قول) ثلث رات تک کے قائل ہیں، اصحاب الرأی وشافعی (فی قول آخر) اور ابن حبیب (مالکیہ میں سے) نصف تک کہتے ہیں، امام نخعی ربع تک مانتے ہیں۔ بعض حضرات طلوع فجر تک کہتے ہیں، یہی قول داؤد کا ہے اور امام مالک بھی وقت ضرورت اس کے قائل ہیں۔ اس کے بعد علامہ عینی نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ کے مسلک میں تاخیر افضل ہے، مگر لیالی صیف میں شرح ہدایہ میں نصف شب تک تاخیر کو مباح لکھا ہے، بعض نے تاخیر بعد الثلث کو مکروہ بہ کراہت تحریمہ قرار دیا۔ (عمدہ ۲ صفحہ ۵۷۳)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ نماز عشا ثلث لیل تک مستحب ہے، اور نصف تک جائز بلا کراہت ہے، اس کے بعد کراہت تنزیہی ہے، جیسا

کہ محقق ابن امیر الحاج نے تحقیق کی ہے اور اسی کو امام طحاوی نے اختیار کیا ہے، پھر جن حضرات نے کراہت تحریم کہا ہے وہ بھی مسافر کو مستثنی کرتے ہیں کہ اس لئے بعد نصف بھی بلا کراہت مانتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مسافر کے لئے تاخیر مغرب میں بھی کراہت نہیں تا کہ وہ جمع صوری کر سکے، یعنی مغرب کو آخر وقت میں اور عشا کی اول وقت میں پڑھ لے (غیر مسافر کے لئے حنفیہ کے یہاں بھی مغرب میں تعجیل مسنون ہے اور تاخیر مکروہ) حافظ نے لکھا کہ یہاں تو امام بخاری نے نصف لیل تک کا باب باندھا ہے۔ مگر مسلم میں حدیث صریح ہے جس میں اول و آخر وقت عشا کا بیان ہے، علامہ نووی نے فرمایا کہ نصف لیل تک وقت اداء مختار ہے، لیکن وقت جواز طلوع فجر تک ہے، کیونکہ حضرت ابوقتادہ سے مسلم میں حدیث ہے کہ دوسری نماز تک پہلی کا وقت رہتا ہے، اور پہلی نماز میں اتنی تاخیر کرنا ممنوع نہیں ہے۔ اصطخری نے ضرور یہ کہا ہے کہ اگر آدھی رات گذر گئی تو پھر نماز عشا وقتا ہوگئی، مگر جمہور کا استدلال حدیث ابی قتادہ مذکور سے ہے۔ اس پر حافظ نے اضافہ کیا کہ عموم حدیث ابی قتادہ سے بالاجماع نماز فجر کو مستثنی کریں گے (کہ اس کا وقت دوسری نماز یعنی ظہر تک نہیں ہے) اور امام شافعی کے قول جدید پر مغرب کو بھی۔ (کہ اس قول پر مغرب کا وقت ان کے نزدیک صرف اتنا ہے کہ وضو وغیرہ کر کے تین رکعات پڑھ لے) حافظ نے یہاں یہ بھی لکھا کہ مجھے امتداد وقت عشا الی طلوع الفجر کے لئے کوئی صریح حدیث نہیں ملی (فتح ۲ صفحہ ۳۵)

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ میرے نزدیک امام بخاری نے بھی اصطخری کا مسلک اختیار کیا ہے، اور وہ ایک قول امام شافعی و مالک کا بھی ہے۔ لیکن اسی حدیث الباب بخاری میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے نماز عشا کو نصف لیل تک موخر کیا، اور پھر نماز پڑھی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے نصف کے بعد نماز پڑھی تو ظاہر ہے کہ پھر یہ وقت صبح تک کے لئے ہوگیا کیونکہ اقوال صرف تین ہی ہیں۔ ایک ثلث کا دوسرا نصف کا، تیسرا طلوع فجر تک کا، ایسا قول کسی کا بھی نہیں ہے کہ بعد نصف کے اور طلوع فجر سے پہلے ختم ہو۔ امام طحاوی نے کہا کہ تمام احادیث پر نظر کر کے یہ بات ثابت ہے کہ عشا کا وقت جائز طلوع فجر تک ہے کیونکہ حدیث حضرت عائشہ میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے نماز کو مؤخر کیا تا آنکہ بیشتر رات کا حصہ جاتا رہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پوری رات ہی نماز عشا کا وقت ہے، اور اس کی تائید کتاب حضرت عمرؓ بنام ابی موسی سے بھی ہوتی ہے، جس میں آپ نے فرمایا کہ عشا کی نماز رات کے جس حصہ میں چاہو پڑھو، اور حدیث ابی قتادہ مسلم کی اوپر گذری ہے، جس سے علامہ نووی نے بھی طلوع فجر تک کا وقت تسلیم کیا ہے، پھر امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں پوری تفصیل سے اسی کو ثابت کیا ہے اور لکھا کہ حضرت عبید بن جریج نے حضرت ابو ہریرہؓ سے سوال کیا کہ نماز عشا میں افراط کیا ہے، آپ نے جواب دیا طلوع فجر۔ (اس سے بھی وقت جواز کی انتہا معلوم ہوئی) حاشیہ لامع ۲۲۳ صفحہ ۲۲۲ اول، اوجز ا صفحہ ۲ میں ہے کہ حنفیہ کے نزدیک عشا کا وقت طلوع فجر تک ہے۔ اور مغنی میں بھی وقت ضرورت طلوع فجر ثانی تک ہے۔ ابھی امام طحاوی کے مسلک اور تحقیق کا حوالہ بھی اوپر آچکا ہے۔

انتظار صلوۃ کا مطلب: حدیث الباب میں ہے کہ جب تک تم نماز کے انتظار میں رہو گے تمہارا وقت نماز میں ہی شمار ہوگا۔ اس پر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ تو نماز جماعت سے پہلے مسجد میں جا کر وہاں انتظار صلوۃ میں بیٹھنے کی فضیلت ہے جو اور بھی بہت سی احادیث میں وارد ہے، مگر بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک نماز سے فارغ ہو کر دوسری نماز کا انتظار کرنے میں بھی بڑی فضیلت ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ اس پر تعامل بھی ہوا یا نہیں کیونکہ سلف سے یہ بات شہرت و کثرت کے ساتھ منقول نہیں ہوئی کہ وہ نمازوں کے بعد دوسری نمازوں کے لئے مساجد میں رکے رہتے تھے، حالانکہ فضیلت کی بہ کثرت احادیث کے پیش نظر عملی نظائر بھی سامنے ضرور آئے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید مراد فقط تعلق قلب ہو۔ اور اس معنی کی تائید بھی بعض احادیث سے ہوتی مثلاً حدیث ابی ہریرہؓ بخاری و مسلم میں ہے کہ سات آدمیوں کو حق تعالیٰ قیامت کے روز اپنے سایہ میں جگہ دے گا ان میں سے ایک وہ بھی ہے جس کا دل مسجد میں لٹکا ہوا ہے (کہ کب نماز کا وقت ہو اور مسجد میں جاؤں) اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مومن کی سب سے بڑی خوبی اسکے قلب کا انتظار و دھیان نماز و مسجد کی طرف ہے، اور مسجد و نماز میں

بھی اگر دل باہر کی چیزوں میں ہوتو وہ بالکل بے سود ہے۔اور اگر کسی کو دونوں باتیں میسر ہوں کہ قلب وجسم دونوں مسجد میں ہوں تو یہ ظاہر ہے نور علی نور ہے،اسی سلسلہ کی کچھ احادیث سے نماز کے بعد اسی جگہ بیٹھ کر ذکر اللہ کرنے کی بھی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب فضل صلوٰۃ الفجر والحدیث

نماز فجر کی فضیلت کا بیان اور حدیث

۵۴۲: حدثنا مسدد قال حدثنا یحییٰ عن اسماعیل قال حدثنا قیس قال قال لی جریر بن عبداللہ کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ نظر الی القمر لیلۃ البدر فقال اما انکم سترون ربکم کما ترون ھٰذا لا تضامون او لا تضاھون فی رویتہ فان استطعتم الا تغلبوا علیٰ صلوٰۃ قبل طلوع الشمس و قبل غروبھا فافعلوا ثم قال فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا قال ابوعبداللہ زاد ابن شھاب عن اسماعیل عن قیس عن جریر قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم سترون ربکم عیاناً

۵۴۳: حدثنا ھدبۃ بن خالد قال حدثنا ھمام قال حدثنی ابوجمرۃ عن ابی بکر بن ابی موسیٰ عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من صلے البردین دخل الجنۃ و قال ابن رجآء حدثنا ھمام عن ابی جمرۃ ان ابابکر بن عبداللہ ابن قیس اخبرہ بھٰذا

۵۴۴: حدثنا اسحٰق قال حدثنا حبان قال ثنا ھمام قال حدثنا ابوجمرۃ عن ابی بکر بن عبداللہ عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مثلہ

ترجمہ۵۴۲: حضرت جریر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ ہم (ایک مرتبہ) شب بدر میں نبی کریم ﷺ کے پاس تھے کہ آپ نے چاند کی طرف نظر فرمائی۔اور فرمایا،سنو! عنقریب تم لوگ اپنے پروردگار کو بے شک وشبہ اسی طرح دیکھو گے،جس طرح (اس وقت) اس چودھویں رات) چاند کو دیکھ رہے ہو،لہٰذا اگر تم یہ کرسکو کہ طلوع آفتاب سے قبل کی نماز پر (شیطان سے) مغلوب نہ ہو،تو کرو،پھر آپ نے فرمایا فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا، امام بخاری کہتے ہیں،کہ ابن شہاب نے اسمٰعیل سے انہوں نے قیس سے انہوں نے جریر سے اتنے لفظ زیادہ روایت کئے ہیں کہ عنقریب تم اپنے پروردگار کو علانیہ دیکھو گے۔

ترجمہ۵۴۳: حضرت ابوبکر بن ابی موسیٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دو ٹھنڈی نمازیں پڑھ لے گا، وہ جنت میں داخل ہوگا،اور ابن رجا نے کہا کہ ہم سے ہمام نے بواسطہ ابوجمرہ،اور ابوبکر بن عبداللہ بن قیس نے اس کو بیان کیا۔

ترجمہ۵۴۴: ہم سے اسحٰق نے بواسطہ حبان،ہمام،ابوجمرہ وابوبکر،حضرت عبداللہ نے رسول اللہ ﷺ سے اسی کے مثل روایت کیا۔

تشریح:۔اوپر ترجمۃ الباب میں ''والحدیث'' کا جو لفظ ہے،وہ صرف روایت ابی ذر میں ہے،حافظ نے لکھا کہ اس لفظ کے لئے یہاں کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی،اور کرمانی نے جو "باب فضل الفجر و باب الحدیث الوارد فی فضل صلوۃ الفجر" سے توجیہ کی ہے وہ بعید ہے،کیونکہ یہ زیادتی کسی مستخرج میں بھی نہیں ہے اور نہ کسی شارح نے اس طرف توجہ کی تو بظاہر وہ غلط اور وہم ہے،یا باب فضل صلاۃ الفجر و العصر ہوگا،عصر کی جگہ الحدیث لکھا گیا۔(فتح ۲ صفحہ ۳۵) علامہ عینی نے لکھا کہ حافظ ابن حجر کا کرمانی کی توجیہ کو رد کرنا اور خود اس زیادتی کو وہم قرار دینا دونوں باتیں نامناسب ہیں،بلکہ وہم وتحریف والی توجیہوں سے کرمانی کی توجیہ بہتر ہے،اور میرے نزدیک یہ توجیہ ہے کہ رات کو سونے کے بعد صبح کو اٹھنا نئی زندگی کا حصول ہے،اسی لئے سوکر اٹھنے کی دعا بھی الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ

النشور، وارد ہے، لہٰذا اٹھ کر بطور اداء شکر صبح کی نماز پڑھنی ہے، اور چونکہ اس کی ادائیگی کی حدیث میں فضیلت بھی نہایت عظیم ہے اس لئے اس کی طرف ترجمۃ الباب میں اشارہ کیا ہے۔ (عمدہ ۲ صفحہ ۵۸۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ لفظ مذکور کہ زیادتی پر شارحین نے بہت سی توجیہات کی ہیں لیکن کوئی شافی بات نہ ہو سکی، میری رائے یہ ہے کہ امام بخاری کی عادت تراجم ابواب کے اندر یہ بھی ہے کہ اگر کسی غیر مقامی حدیث سے بھی کوئی فائدہ لینا چاہتے ہیں تو اس کو ترجمہ کے ضمن میں ذکر کر دیتے ہیں اگر چہ وہ اس ترجمہ کے مناسب نہ ہو، اور میں اس کا نام ''انجاز'' رکھتا ہوں یہاں بھی میرے نزدیک یہی صورت ہے کہ فضیلت نماز فجر کا ذکر ہے، اور اس کی کوئی مناسبت حدیث بعد العشاء سے نہیں ہے، مگر چونکہ حدیث الباب میں اس کا ذکر ہے کہ حضور علیہ السلام سے صحابہ کرام نے فضیلت نماز فجر کو مسجد نبوی میں چاندنی رات کے اندر حاضر خدمت رہ کر سنا ہے تو اسی فائدہ کے لئے بطور ''انجاز'' امام بخاری نے ''الحدیث'' سے اشارہ حدیث بعد العشاء کی طرف کر دیا، اور بتلایا کہ کسی دینی بات کو بعد عشا بھی کر سکتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اس توجیہ کو اقرب التوجیہات فرمایا، ساتھ ہی کچھ تامل بھی اس لئے کیا کہ کوئی تصریح اس امر کی کتب حدیث میں نہ مل سکی کہ حضور علیہ اسلام کا یہ ارشاد بعد نماز عشاء کے صادر ہوا ہے، اگر چہ احتمال زیادہ اسی کا ہے کیونکہ بدر کی روشنی اسی وقت شدید وقوی ہوتی ہے جو مقام تشبیہ کے لئے زیادہ موزوں و مناسب ہے۔

حضرت گنگوہیؒ سے دو توجیہ منقول ہیں ایک یہ کہ باب کا لفظ مقدر مانیں یعنی باب فضل صلوٰۃ الفجر و باب فضل الحدیث فیہ اور تکرار باب اس حدیث کی عظیم منقبت ظاہر کرنے کے لئے ہوا، کیونکہ اس میں رؤیتِ باری تعالیٰ کی بشارت دی گئی ہے، (لیکن تکرار لفظ باب سے تو بہتر یہ ہے کہ والحدیث کو صلوۃ الفجر پر عطف کر دیں، اس سے بھی یہی فائدہ حاصل ہوگا، دوسرے یہ کہ حدیث الباب میں تو فضیلت عصر کی بھی رؤیۃ باری عزاسمہ کے ساتھ ہے، وہاں بھی باب فضل صلوۃ العصر والحدیث لانا تھا، جبکہ وہاں بھی یہی حدیث جر یر گذر چکی ہے)

دوسری توجیہ یہ ہے کہ ''الحدیث کا عطف فضل پر کیا جائے، یعنی و باب الکلام بعد الفجر کہ فجر کے بعد باتیں کرنا مکروہ ہیں، جیسا کہ آیت **فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا** کے یہاں ذکر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وقت تسبیح کا ہے۔ اور احادیث میں بھی کراہت وارد ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ آیت حکم تسبیح قبل طلوع الشمس میں تسبیح کرنے کا حکم ہے، جس کی تعمیل نمازِ فجر کے ذریعہ ہوگئی۔ پھر جس طرح قبل غروب والی نماز عصر کے بعد باتیں کرنے کی کوئی ممانعت آیت سے نہیں نکلتی اسی لئے نمازِ عصر کے بعد باتیں کرنا جائز ہے، یہاں بھی نمازِ فجر کے بعد اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ پھر بعد نماز فجر کے اگر چہ بہتر یہی ہے کہ ذکر و اذکار میں مشغول ہو، مگر باتیں کرنے کی ممانعت والی احادیث معلوم نہ ہو سکیں جیسی کہ ممانعت حدیث بعد العشاء کی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب وقت الفجر

نماز فجر کے وقت کا بیان

۵۴۵: حدثنا عمرو بن عاصم قال حدثنا ھمام عن قتادۃ عن انس ان زید بن ثابت حدثہ' انھم تسحروا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم قاموآ الی الصلوٰۃ قلت کم بینھما قال قدر خمسین او ستین یعنی ایۃ

۵۴۶: حدثنا الحسن بن الصباح سمع روح بن عبادۃ قال حدثنا سعید عن قتادۃ عن انس بن مالک ان نبی صلی اللہ علیہ وسلم وزید بن ثابت تسحرا فلما فرغا من سحورھما قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم

الی الصلوٰۃ فصلے قلنا لانس کم کان بین فراغھما من سحورھما ودخولھا فی الصلوٰۃ قال قدرما لقرؤ الرجل خمسین اٰیۃ

۵۴۷: حدثنا اسماعیل بن ابی اویس عن اخیہ عن سلیمان عن ابی حازم انہ سمع سھل بن سعد یقول کنت اتسحر فی اھلی ثم تکون سرعۃ بیّ ان ادرک صلوٰۃ الفجر مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۵۴۸: حدثنا یحیی بن بکیر قال حدثنا اللیث عن عقیل عن ابن شھاب قال اخبرنی عروۃ بن الزبیر ان عآئشۃ رضی اللہ عنھا اخبرتہ قالت کن نسآء المومنات یشھدن مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ الفجر متلفعات بمروطھن ثم ینقلبن الیٰ بیوتھن حین یقضین الصلوٰۃ لایعرفھن احد من الغلس

ترجمہ۵۴۵: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں، کہ زید بن ثابت نے مجھ سے بیان کیا کہ صحابہ نے نبی کریم ﷺ کے ہمراہ سحری کھائی اس کے بعد نماز کے لئے کھڑے ہوگئے میں نے پوچھا کہ ان دونوں میں کتنا فصل تھا، زید نے کہا، پچاس یا ساٹھ (کی تلاوت) کے اندازے پر۔

ترجمہ۵۴۶۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ اور زید بن ثابت دونوں نے سحری کھائی جب اپنی سحری سے فارغ ہوگئے تو نبی کریم ﷺ نماز کے لئے کھڑے ہوگئے، اور اپنی نماز پڑھی، ہم لوگوں نے ان سے پوچھا کہ ان دونوں کے سحری سے فراغت کرنے، اور نماز کے درمیان میں کس قدر فصل تھا، انس نے کہا اس قدر کہ آدمی پچاس آیتیں پڑھ لے۔

ترجمہ۵۴۷: حضرت ابوحازم سہل بن سعدؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اپنے گھر کے لوگوں میں (بیٹھ کر) سحری کھایا کرتا تھا، پھر مجھے اس بات کی جلدی پڑ جاتی تھی کہ کس طرح میں فجر کی نماز رسولِ خدا ﷺ کے ہمراہ پڑھ لوں۔

ترجمہ۵۴۸: حضرت عروہ بن زبیرؓ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم مسلمان عورتیں رسولِ خدا ﷺ کے ہمراہ فجر کی نماز میں اپنی چادروں میں لپٹ کر حاضر ہوتی تھیں، جب نماز ختم کر چکتیں اور اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاتیں تو کوئی شخص اندھیرے کے سبب سے ان کو پہچان نہ سکتا تھا۔

تشریح: امام بخاری نے اس باب میں چار حدیثیں ذکر فرمائی ہیں اور سب سے یہ ثابت کیا ہے کہ صبح کی نماز اندھیرے جھٹ پٹے وقت میں پڑھنی چاہئے اور یہی مذہب امام مالک، شافعی و احمدؒ کا بھی ہے، امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، سفیان ثوری وغیرہ کے نزدیک اسفار میں نماز پڑھنا بہتر ہے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ شرکت کریں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفی کتاب فقہ مبسوط میں ہے کہ ظہر میں ابراد اور صبح میں اسفار کی فضیلت حنفیہ کے یہاں اس وقت ہے کہ لوگ جمع نہ ہوں، اگر جمع ہوں تو افضل تعجیل ہی ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے عشاء میں بھی تعجیل کا حکم معلوم ہوسکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف جواز کا نہیں ہے بلکہ استحباب کا ہے۔ پھر یہ کہ آئمۂ حنفیہ میں سے ہی امام محمد اور امام طحاوی کا مسلک یہ ہے کہ غلس (اندھیرے) میں شروع کر کے اسفار (روشنی کے وقت) میں نمازِ صبح ختم کی جائے، اور ختم بھی ایسے وقت میں کر لینی چاہئے کہ اگر نماز لوٹانے کی ضرورت پڑ جائے تو مستحب طریقہ پر پھر سے پڑھی جاسکے، یعنی ۴۰ سے ۶۰ آیات تک دونوں رکعتوں میں پڑھی جاسکیں۔

بحث ونظر: سب سے اول گذارش ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے ابتدائی دور تدریس دارالعلوم دیوبند میں ابوداؤد و مسلم شریف پڑھائی تھیں جبکہ حضرت شیخ الہندؒ ترمذی و بخاری شریف پڑھایا کرتے تھے، اس وقت کے درس کی امالی مولانا محمد صدیق ساکن نجیب آباد ضلع بجنور کی ضبط کردہ ''انوار المحمود'' کے نام سے طبع شدہ موجود ہے، اور العرف الشذی معارف السنن وفیض الباری (امالی درس ترمذی و بخاری) بھی ہمارے سامنے ہیں، اور حضرتؒ نے ''کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ'' لامام محمدؒ کے حوالہ سے ایک بات پیش کی ہے، یہ کتاب بھی اب طبع شدہ موجود ہے، لیکن

حضرتؒ کے ارشاد کو پیش کرنے میں کچھ مسامحت ہوگئی ہے، اس کو بھی ہم واضح کردینا ضروری سمجھتے ہیں، امام محمدؒ نے جس مقصد سے یہ کتاب لکھی تھی وہ سب اہل علم پر روشن ہے، امام صاحب نے اپنی کتاب کا آغاز اسی مسئلہ سے کیا ہے اور بتلایا ہے کہ حنفیہ اور امام مالکؒ کے اختلاف کی نوعیت کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہؒ نے آثار کی روشنی میں اور اس لئے بھی کہ لوگ صبح کو نیند کی گرانی سے اٹھتے ہیں، یہ فیصلہ کیا کہ صبح کی نماز اسفار میں پڑھی جائے تاکہ سونے والے اور دوسرے سب ہی جماعت میں شریک ہوجائیں، دوسرا مسلک امام مالک واہل مدینہ کا ہے کہ اندھیرے میں پڑھی جائے، پھر لکھا کہ دونوں کے لئے آثار واخبار ہیں، مگر ہمارے نزدیک اسفار ہی بہتر ہے۔ کیونکہ پہلے لوگ جو اندھیرے میں پڑھتے تھے وہ قراءت طویل کرتے تھے، جس سے سونے والوں اور دوسروں کو جماعت کی نماز مل جاتی تھی، اور ختم وہ بھی اسی وقت کرتے تھے، جس وقت اسفار والے کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے منقول ہے کہ وہ صبح کی نماز میں سورۂ بقرہ پڑھتے تھے، تو معلوم ہوا کہ وہ اندھیرے سے نماز اسی لئے پڑھتے تھے (کہ کافی وقت لگے گا اور اسفار تک نماز ختم ہوگی۔) لیکن جو لوگ تھوڑی قراءت کریں اور مفصل کی سورتیں یا ان کی برابر کی قراءت قرآن مجید سے کریں ان کو اسفار میں ہی پڑھنی چاہئے۔ (کتاب الحجۃ مع حواشی محدث علامہ مولانا مفتی مہدی حسنؒ)

اس سے ثابت وواضح ہے کہ امام محمدؒ کا مسلک بھی امام ابوحنیفہ وامام ابویوسف ہی کی طرح ہے، کوئی فرق نہیں کیونکہ اگر سورۂ بقرہ جیسی طویل قراءت اب بھی کی جائے گی تو ظاہر ہے کہ اس کو اندھیرے میں شروع کرنا پڑے گا، اور جس طرح کتب فقہ حنفی میں ہے کہ صبح کی نماز میں طوال مفصل پڑھی جائیں، یعنی سورۂ حجرات (پارہ نمبر ۲۶) سے سورۂ بروج (پارہ نمبر ۳۰) تک کی سورتیں۔ اور اسی کا ارشاد حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو فرمایا تھا، ان سب سورتوں میں ۱۸ سے ۶۰ تک آیات ہیں، سورۂ نجم ورحمٰن میں زیادہ ہیں تو ان کی آیات بہت چھوٹی چھوٹی ہیں، غرض دونوں رکعتوں میں جتنی قراءت نماز صبح میں ہونی چاہئے، اس میں ۸-۱۰ منٹ صرف ہوسکتے ہیں، ظاہر ہے کہ اتنی قراءت کے لئے اندھیرے سے نماز شروع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ اور اسی کی طرف امام محمدؒ رہنمائی فرمارہے ہیں، اور اسی لئے انہوں نے اسفار کو **احب الینا** فرمایا یعنی امام صاحب وغیرہ اور اپنا مسلک ایک ہی قرار دیا، اور اندھیرے میں شروع کرنے کو ایک مخصوص حالت پر محمول کیا، برخلاف اس کے کہ امام طحاوی کا مسلک یہ ہے کہ اندھیرے میں شروع کرکے اسفار میں ختم کرے۔ یہ مسلک بالکل الگ ہے کیونکہ امام مالک شافعی واحمد کے نزدیک نماز صبح اندھیرے میں شروع کرنا اور اندھیرے میں ہی ختم کرنا افضل ہے، ائمہ حنفیہ سب ہی کے نزدیک اسفار میں شروع اور اسی میں ختم ہے، صرف امام طحاوی حنفی کا یہ مسلک سب سے الگ ہے کہ اندھیرے میں شروع کرکے اسفار میں ختم ہو۔ امام محمدؒ نے اس صورت کو غیر معمولی طوالتِ قراءت پر محمول کردیا ہے، اور یہ بھی فرمایا کہ پہلے لوگوں نے اس پر عمل کیا تھا اور ظاہر ہے کہ امام ابویوسف اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ سے الگ نہیں ہی، لہٰذا تینوں ائمہ حنفیہ کا مسلک واحد ہے اور وہی بات نقل مذہب کی کتابوں میں بھی ملتی ہے، غرض کتاب الحجہ اور دوسری کتب نقول میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور حضرتؒ کی مراد بیان کرنے میں مسامحت ہوئی ہے۔ حضرتؒ کا مقصد یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ وامام ابویوسف تو اسفار ہی کے بدایۃ ونہایۃ میں قائل ہیں امام طحاوی ہدایت فی التغلیس ونہایت فی الاسفار کے قائل ہیں یعنی قراءت خواہ طویل ہو یا قلیل نماز ایسے وقت ہو کہ غلس میں شروع کرکے اسفار پر ختم کرے، کیونکہ غلس اور اسفار کے بھی مراتب ہیں۔ امام محمدؒ نے یہ صراحت کی کہ ہم بدایۃ فی التغلیس ونہایۃ فی الاسفار کو صرف غیر معمولی تطویل قراءت پر محمول کرتے ہیں، اس کے سوا دوسری صورتوں میں بدایۃ ونہایۃ دونوں میں اسفار ہی افضل ہے اور چونکہ امام ابوحنیفہ کا منشاء سب لوگوں کا جماعت پالینا ہے، اس لئے طویل قراءت میں وہ بھی یہی کہیں گے جو امام محمد نے فرمایا ہے اور اگر امام طحاوی کے یہاں بھی اطالت قراءت کی قید بدایۃ فی التغلیس ونہایۃ فی الاسفار کے لئے مان لی جائے تو پھر چاروں ائمہ حنفیہ کا مسلک متحد ہوجاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دلائل اسفار و حافظ ابن حجرؒ:

حنفیہ کے حق میں اسفارف کے دلائل اتنے زیادہ اور قوی ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی باوجود متصلب شافعی ہونے کے اس کو اختیار کیا ہے، ملاحظہ ہو، معارف السنن ص۴۲/۲، تاہم فتح الباری وغیرہ میں حافظ نے وہی روش رکھی ہے جو دیگر شافعیہ یا وہ خود اختلافی مسائل میں اختیار کیا کرتے ہیں۔ دلائل اسفار اوجز اور معارف السنن، عمدۃ القاری وغیرہ میں دیکھے جائیں۔ ہمیں یہاں اہم بات ذکر کرنی ہے۔

حدیث ابن مسعودؓ کی بحث

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ دلائل اسفار میں ایک حدیث عبداللہ بن مسعودؓ کی بھی ہے، جس کو امام بخاری نے بھی **باب من اذن و اقام لکل واحدۃ** ص۲۲۷ میں ذکر کیا ہے، اور وہ امام شافعی وغیرہ کے مخالف ہے اس میں ہے کہ "میں نے کبھی بھی حضور علیہ السلام کو نہیں دیکھا کہ آپ نے کوئی نماز غیر وقت میں پڑھی ہو، بجز اس دن کے، یعنی یوم مزدلفہ میں صبح کی نماز اور مغرب کی نماز بھی وقت سے بدل کر مزدلفہ کی شب میں عشا کے وقت میں پڑھی"۔ کیونکہ ظاہر ہے آپ نے اس دن بھی صبح کی نماز طلوع فجر میں قبل تو پڑھی نہ ہوگی کہ وہ تو کسی طرح بھی اور کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے، لہٰذا اول وقت پر پڑھنے کو ہی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے غیر وقت اس لئے قرار دیا ہے کہ وہ حضور علیہ السلام کے عام معمول کے خلاف تھی، لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ کی عام عادت اسفار میں پڑھنے کی ہی تھی ابتداء وقت کی نہ تھی جو شافعیہ کا مسلک ہے اور صرف حج کے موقع پر دسویں ذی الحجہ کو مزدلفہ میں صبح کی نماز اول وقت ہوتے ہی آپ نے پڑھی ہے۔ نیز آپ کے قولی ارشادات سے بھی اسفار کا ہی حکم ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کے قول و فعل دونوں سے اسفار کا مستحب و افضل ہونا واضح ہو گیا۔ علامہ نووی نے فرمایا کہ حدیث عبد اللہ بن مسعود سے امام ابوحنیفہؒ جمع بین الصلاتین فی السفر کی ممانعت بھی ثابت کی ہے، مگر یہ استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مزدلفہ کی مدات میں جمع بین الصلاتین کا ذکر کر کے یہ بھی کہا کہ اس کے سوا حضور علیہ السلام نے کبھی دو نمازوں کو جمع نہیں کیا، حالانکہ جمع عرفہ سب کے نزدیک ثابت ہے، اور عبداللہ بن مسعود نے اس کو ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا ان کی حدیث قابل استدلال نہیں رہی۔ حضرتؒ نے علامہ نووی کا یہ اعتراض نقل کر کے فرمایا کہ حافظ نے بھی ان کے اعتراض کو ذکر کیا اور خاموشی سے آگے گذر گئے (جیسے اس کو تسلیم کر لیا ہو) میں کہتا ہوں کہ جمع عرفہ کا ذکر بھی حضرت ابن مسعودؓ کی روایت نسائی میں موجود ہے، ملاحظہ ہو، کتاب الحج میں باب الجمع بین الظہر والعصر بعرفۃ، نسائی ص۴۴/۲ (واضح ہو کہ بعینہ اسی عنوان سے یہ باب کتاب الصلوۃ میں بھی ص۱۰۰/۱ میں امام نسائی نے قائم کیا ہے مگر وہاں ابن مسعود کی یہ روایت ذکر نہیں فرمائی، اس لئے صرف اس کو دیکھ کر یہ سمجھا جاتا ہے کہ نسائی کا حوالہ غلط ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے علامہ نووی سے یہ روایت نسائی پوشیدہ رہی ہو، مگر حافظ ابن حجرؒ سے تو مخفی نہ ہوگی، اس لئے ان کا سکوت موجب حیرت ہے۔

حضرتؒ کے اس قسم کے محدثانہ نکات نہایت قابل قدر ہیں، احقر کا خیال ہے شاید علامہ سندیؒ محشی نسائی شریف کو بھی علامہ نووی کے اعتراض اور حافظ کے سکوت سے یہی یقین ہو گیا ہوگا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث ضرور گر جانے کے ہی لائق ہے کہ انہوں نے جمع عرفہ ایسی مشہور و متواتر بات کا بھی انکار کر دیا اور فرما دیا کہ میں نے حضور علیہ السلام کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے دو نمازوں کو جمع کیا ہو بجز مزدلفہ کے اور اسی کی صبح کو فجر کی نماز بھی وقت سے قبل پڑھی (نسائی شریف ص۱۰۰/۱ باب الجمع بین المغرب والعشاء بالمزدلفہ)

اس پر علامہ سندی نے حاشیہ میں لکھا کہ شاید حضرت ابن مسعودؓ کو جمع عرفہ کی خبر نہ پہنچی ہوگی، اس لئے حصر سے ایسی بات فرما دی۔ حیرت ہے کہ نسائی شریف ص۴۴/۲ کی حضرت ابن مسعودؓ سے مروی حدیث **کان رسول اللہ ﷺ یصلی الصلوات لوقتھا الا بجمع و عرفات**، ان سے بھی مخفی ہوگئی۔ ورنہ وہ حاشیہ میں ایسی بات نہ لکھتے۔ واللہ تعالٰے اعلم۔

قولہ ان زید بن ثابت

حضرتؒ نے فرمایا:، یہ وہی حضرت زید بن ثابتؓ ہیں جو حضور علیہ السلام کی نمازِ شبانہ میں بھی شریک ہوئے ہیں اور ان کا مذہب نماز وتر کے بارے میں وہی ہے جو حنفیہ کا ہے (تفصیل کشف الستر میں ہے)

قولہ کنت اتسحر فی اہلی

یعنی میں اپنے گھر میں سحری کھا کر جلدی کر کے حضور علیہ السلام کے ساتھ نمازِ صبح میں شرکت کرتا تھا، حضرتؒ نے فرمایا کہ بظاہر یہ تغلیس کی نماز صرف رمضان کے لئے تھی، کیونکہ آخری وقت سحری کھا کر سب کو جمع ہونا زیادہ آسان تھا، اور حنفیہ بھی جمع ہونے کی سہولت کے لئے ہی اسفار کو افضل قرار دیتے ہیں اور حضور علیہ السلام کے اسفار کے لئے ترغیبی ارشادات کو بھی اسی پر محمول کرتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ رمضان کے اندر ہمارے اکابر کا معمول بھی سحری کے بعد متصلا نمازِ فجر کی جماعت کا رہا ہے۔

احقر عرض کرتا ہے کہ نمازِ فجر پڑھ کر سونے کا جو معمول ہو گیا ہے وہ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیونکہ حدیث میں ہے **الصبحة تمنع الرزق** (جامع صغیر سیوطی ص ۲/۴۹) یعنی صبح کا سونا رزق کو کم کرتا ہے، اور **نوم الصبحة تمنع الرزق** (کنوز الحقائق مناوی ص ۲/۱۳۱ برحاشیہ جامع صغیر) اسی لئے حضرت شاہ صاحبؒ اپنے تلامذہ کو بھی صبح کے وقت سونے سے روکا کرتے تھے اور یہی حدیث سنایا کرتے تھے، لہٰذا اگر سونا ہی ہو تو طلوع شمس کے بعد سوئے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

قولہ لا یعرفہن احد من الغلس

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ اس میں "**من الغلس**" حضرت عائشہؓ کے الفاظ نہیں ہیں، بلکہ دوسرے راوی حدیث کا اپنی طرف سے اضافہ اور قیاسی اظہار خیال ہے، کیونکہ ابن ماجہ ص ۴۹ باب وقت الفجر میں اسی حدیث حضرت عائشہؓ میں اس طرح ہے **فلا یعرفهن احد، تعنی من الغلس،** یعنی نیچے کا راوی بتلانا چاہتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عدم معرفت کی بات غلس کی وجہ سے فرمائی ہے، پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ خود بخاری میں جو دوسری جگہ حضور علیہ السلام کی طرف نسبت کی گئی ہے کہ آپ **غلس** میں پڑھا کرتے تھے یعنی بطریق عادت کے ایسا کرتے تھے تو "دارمی" میں بعینہ اس متن وسند سے حدیث اس طرح ہے:۔ **کان یغلس او کانوا یغلسون،** یعنی اس میں روایت شک کے ساتھ ہے کہ حضور علیہ السلام غلس میں پڑھتے تھے، یا دوسرے حضرات پڑھتے تھے۔ لہٰذا اس سے بھی استدلال ضعیف ہے شکِ راوی کی وجہ سے۔

معرفت سے کیا مراد ہے؟

علامہ نووی نے فرمایا کہ اتنا زیادہ اندھیرا ہوتا تھا کہ مردوں کو عورتوں سے الگ نہ پہچان سکتے تھے، علامہ عینی نے فرمایا کہ معرفتِ عین مراد ہے کہ مثلا فاطمہؓ کو عائشہؓ سے ممتاز نہ کر سکتے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا میرے نزدیک علامہ نووی کی تاویل بہت مستبعد ہے، اور مراد معرفت شخص ہی ہے کہ ایک کو دوسرے سے متمیز نہ کر سکتے تھے۔ یہ نہیں کہ اندھیرا اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ عورتوں کو مردوں سے بھی متمیز نہ کر سکتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب اور علامہ عینی کی رائے واضح ہو جانے کے بعد بھی فیض الباری ص ۲/۳۲۳ سطر ۵ میں **لا یعرف الرجال من النساء** کا اندراج سبقت قلم ہے۔

فلیتنبه له :. نہایت افسوس ہے کہ سابقہ مطبوعہ امالی انور کے بیشتر مقامات میں حضرتؒ کی مراد صحیح طور سے پیش نہیں کی جا سکی ہے۔

باب من ادرک من الفجر رکعة

اس شخص کا بیان جو فجر کی ایک رکعت پائے

۵۴۹: حدثنا عبدالله بن مسلمة عن مالک عن زید بن اسلم عن عطآء بن یسار وعن بسر بن سعید و عن الاعرج یحدثونه' عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من ادرک من الصبح رکعة قبل ان تطلع الشمس فقد ادرک الصبح و من ادرک رکعة من العصر قبل ان تغرب الشمس فقد ادرک العصر

ترجمہ:۔حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص آفتاب کے نکلنے سے پہلے صبح کی ایک رکعت پالے، تو اس نے صبح کی نماز پالی، اور جو کوئی آفتاب کے غروب ہونے سے پہلے عصر کی ایک رکعت پالے، تو بے شک اس نے عصر کی نماز پالی۔

باب من ادرک من الصلوٰة رکعةً

اس شخص کا بیان جس نے نماز کی ایک رکعت پائی

۵۵۰: حدثنا عبدالله بن یوسف قال حدثنا مالک عن ابن شهاب عن ابی سلمة بن عبدالرحمٰن عن ابی هریرة ان رسول الله علیه وسلم قال من ادرک رکعةً من الصلوٰة فقد ادرک الصلوٰة

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص نماز کی ایک رکعت پالے، تو اس نے (پوری) نماز پالی:

باب الصلوٰة بعد الفجر حتیٰ ترتفع الشمس

فجر کے بعد آفتاب بلند ہونے تک نماز پڑھنے کا بیان

۵۵۱: حدثنا حفص بن عمر قال حدثنا هشام عن قتادة عن ابی العالیه عن ابن عباسؓ قال شهد عندی رجال مرضیون وارضاهم عندی عمر ان النبی صلی الله علیه وسلم نهیٰ عن الصلوٰة بعد الصبح حتیٰ تشرق الشمس و بعدالعصر حتیٰ تغرب

۵۵۲: حدثنا مسدد قال حدثنا یحییٰ عن شعبة عن قتادة سمعت اباالعالیة عن ابن عباسؓ قال حدثنی ناس بهٰذا

۵۵۳: حدثنا مسدد قال حدثنا یحیی بن سعید عن هشام قال قال اخبرنی ابی قال اخبرنی ابن عمر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لاتحروا بصلوتکم طلوع الشمس ولاغروبها قال حدثنی ابن عمر قال قال رسول الله صلے الله علیه وسلم اذا طلع حاجب الشمس فاخروالصلوٰة حتیٰ ترتفع واذا غاب حاجب الشمس فاخرواالصلوٰة حتیٰ تغیب تابعه' عبده

۵۵۴: حدثنا عبید بن اسمٰعیل عن ابی اسامة عن عبیدالله عن خبیب ابن عبدالرحمٰن عن حفص بن عاصم عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهیٰ عن بیعتین و عن لبستین و عن صلوتین نهیٰ عن الصلوة بعد الفجر حتیٰ تطلع الشمس و بعد العصر حتیٰ تغرب الشمس و عن اشتمال الصمآء وعن الاحتیآء فی ثوب واحد یفضی بفرجهٖ الی السمآء و عن المنابذة و الملامسة

ترجمہ ۵۵۱: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں، کہ میرے سامنے چند پسندیدہ لوگوں نے کہ ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ میرے نزدیک عمرؓ تھے، یہ بیان کیا کہ رسول خدا ﷺ نے صبح کی نماز کے بعد آفتاب نکلنے سے پہلے اور عصر کے بعد غروب ہونے سے پہلے نماز پڑھنے کو منع فرمایا ہے۔

ترجمہ ۵۵۲: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے چند آدمیوں نے اس حدیث کو روایت کیا۔

تشریح: ۔حضرتؒ نے فرمایا کہ امام بخاری نے پہلے ادراک صلوٰۃ کی حدیث خاص عصر کے لئے ذکر کی تھی پھر باب سابق میں خاص فجر کے لئے، پھر آپ مطلق ہر نماز کے لئے لائے ہیں۔ ممکن ہے اس سے اشارہ یہ ہو کہ پہلی حدیثیں بھی اس مطلق حدیث کی طرح مسبوق کے لئے ہیں۔ تفصیل پہلے ہو چکی۔

ترجمہ ۵۵۳: حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی نمازیں طلوع آفتاب کے وقت نہ پڑھو، اور نہ غروب آفتاب کے وقت، عروہ کہتے ہیں، مجھ سے ابن عمر نے (یہ بھی) کہا کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہے، کہ جب آفتاب کا کنارہ نکل آئے تو آفتاب بلند ہونے تک نماز موقوف کر دو اور جب آفتاب کا کنارہ چھپ جائے تو جب تک پورا نہ چھپ جائے، اس وقت تک نماز موقوف کر دو۔ عبدہ نے اس کے تابع حدیث روایت کی ہے۔

ترجمہ ۵۵۴: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے دو قسم کی بیع، اور دو قسم کے لباس اور دو نمازوں سے منع فرمایا، فجر کے بعد نماز پڑھنے سے، جب تک آفتاب اچھی طرح نہ نکل آئے اور عصر کے بعد (نماز سے) جب تک کہ (اچھی طرح) آفتاب غروب نہ ہو جائے اور ایک کپڑے میں اشتمال صماء اور احتباء سے، جو کہ پورے طور پر شرم گاہ کے لئے پردہ نہ ہو سکے، اور (بیع) منابذہ اور ملامسہ سے۔

تشریح: نماز فجر کے بعد طلوع شمس تک کوئی نماز نہ پڑھی جائے اور نماز عصر کے بعد بھی غروب شمس تک کوئی نماز نہ پڑھی جائے چنانچہ امام بخاری نے یہاں چار احادیث ذکر کیں۔ جن سے یہ حکم ثابت ہوتا ہے، مگر امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں صرف بعد فجر کا ذکر کیوں کیا؟ اس کی وجہ علامہ عینی اور حافظ ابن حجر دونوں نے یہ لکھی کہ احادیث میں اول ذکر بعد فجر کا ہے یا اس لئے کہ حضور علیہ السلام سے بعد عصر کے تو نماز پڑھنا ثابت بھی ہوا ہے، مگر بعد فجر کے نہیں ہوا۔ (عمدہ ص ۵۸۸/۲ و فتح ص ۳۹/۲)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اکابر امت نے حضور علیہ السلام کی نماز بعد العصر کو آپ کی خصوصیات میں سے شمار کیا ہے، لہٰذا اس کی وجہ سے ترجمۃ الباب میں سے اسکی صریح و متواتر ممانعت کو نظر انداز کر دینا موزوں نہ تھا اور اولاً و ثانیاً والی تاویل بھی دل کو نہیں لگتی، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس ترجمۃ الباب کا ذکر ہی چھوڑ دیا۔

علامہ ابن بطال نے فرمایا کہ نماز بعد صبح و بعد عصر دونوں کی ممانعت متواتر احادیث سے ثابت ہے، علامہ عینی نے فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی نماز آپ سے مخصوص تھی اور امت کے لئے ممنوع ہی رہی (خیر جاری در حاشیہ بخاری ص ۸۲)

ایک حدیث ترمذی شریف میں یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے جو دو رکعت بعد عصر پڑھی تھیں، وہ بعد ظہر کی دو سنت تھیں کیونکہ حضور علیہ السلام لوگوں کو مال تقسیم کرنے میں مشغول ہو گئے تھے کہ عصر کا وقت ہو گیا، اس کے بعد فرض عصر کے اور دو رکعت پڑھیں اور اس کے بعد پھر کبھی نہ پڑھیں (فتح الباری ص ۴۳/۲) حنفیہ کا مسلک یہی ہے کہ بعد عصر کے نفل نماز مکروہ ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ہمارے یہاں پانچ وقت نماز کے لئے مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں، طلوع و غروب و استواء کے اوقات جن میں کوئی نماز فرض و نفل جائز نہیں حتی کہ نماز جنازہ اور سجدۂ تلاوت بھی۔ اور بعد نماز فجر طلوع تک اور بعد نماز عصر غروب تک قضا نماز، سجدۂ تلاوت اور نماز جنازہ جائز ہیں، باقی سب مکروہ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پہلے تین اوقات میں نماز کے اندر نقص خود وقت کے نقص و خرابی کے سبب آتا ہے اور آخر کے دو وقتوں میں وقت کی وجہ سے کراہت نہیں، بلکہ اس لئے ہے کہ یہ دونوں وقت فرضوں کے لئے رکھے گئے ہیں۔ لہٰذا

کراہت لاجل الوقت نہیں، بلکہ لحق الفرض ہوئی۔ تا کہ پورا وقت فرض نماز کے لئے مشغول ہو۔ اگر وقت کی وجہ سے ہوتی تو فجر وعصر کی تاخیر طلوع وغروب سے قبل تک جائز نہ ہوتی، حالانکہ تاخیر فرض آخر وقت تک جائز ہے اور ممانعت بھی صرف بعد فرض کے لئے نہ ہوتی بلکہ قبل کے لئے بھی ہوتی، اسی لئے ہر قسم کے فرض وواجب ادا وقضا ان وقتوں میں درست ہوئے اور سجدۂ تلاوت ونماز جنازہ بھی واجب بعینہ ہونے کی وجہ سے درست ہوئے، بخلاف دورکعت بعد الطواف کے کہ وہ واجب بعینہ نہیں بلکہ واجب لغیرہ ہے۔ اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ بعض[1] شارحین ہدایہ سے یہ وجہ فرق مخفی رہی ہے۔

شیخ ابن ہمام کا اعتراض اور تحقیق انور

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفیہ نے جو پانچوں اوقات میں کراہت صلوٰۃ کا فیصلہ فرق وتخصیص کے ساتھ کیا ہے وہ بلا دلیل نہیں ہے، لیکن شیخ ابن ہمام نے اعتراض قائم کیا کہ ممانعت کا حکم آخری دو وقتوں میں بھی پہلے تین اوقات کی طرح مطلق ہے، اور نص شرعی کی تخصیص ابتداءً رائے سے کرنا جائز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ تخصیص بالرائے کا مسئلہ وہی ہے جو شیخ نے بتلایا اگرچہ خود حنفیہ کا عمل بھی اس کے خلاف ہے کیونکہ وہ اخلاق ومعاملات کی احادیث میں تخصیص بے تکلف کرتے ہیں، تاہم یہ تسلیم ہے کہ وہ احادیث عبادات میں ایسا نہیں کرتے وجہ یہ ہے کہ اول میں وجہ حکم واضح وروشن ہوتی ہے اور عبادات میں خفی ہوتی ہے، اسی لئے علامہ ابن دقیق العیدؒ نے تصریح کی ہے کہ وجہ اگر جلی ہو تو تخصیص بالرائے بلانکیر جائز ہے۔

دوسرے یہ کہ یہاں بھی تخصیص ابتداءً نہیں ہے، کیونکہ وتر کی تخصیص حدیث دار قطنی سے ہو چکی ہے، جس کی تصحیح علامہ عراقی نے شرح ترمذی میں کی ہے (یعنی جس کے وتر فوت ہوئے ہوں وہ صبح کے بعد پڑھ لے) ابوداؤد میں ہے کہ جب یاد آئے پڑھ لے، ترمذی میں ہے کہ صبح کو پڑھ لے، یہ مرسل قوی الاسناد ہے اور اس میں مرفوع حدیث بھی ہے مگر اس میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ضعیف ہے، حاصل یہ کہ نہی وممانعت صلوٰۃ اگرچہ پانچوں اوقات مذکورہ کے لئے وارد ہے، مگر امام صاحب نے ان کے حکم میں فرق شریعت ہی کے منشاء کو سمجھ کر کیا ہے دوسرے ائمہ نے ایسی دقت نظر سے کام نہیں لیا، کیونکہ شریعت نے حکم ممانعت کو ان دو وقتوں میں نماز فجر وعصر کے ساتھ وابستہ کیا ہے، وقت کے ساتھ نہیں جیسا کہ باقی تین کے ساتھ کیا ہے، پھر حضور علیہ السلام کے عمل سے بھی کہ آپ نے بعد عصر دو رکعت پڑھی ہیں۔ یہ ثابت ہوا کہ ان دونوں وقت میں نماز کے لئے صلاحیت وتوسع ضرور ہے، برخلاف باقی تین اوقات کے۔

مسلک امام مالکؒ وغیرہ

امام مالک نے استواء کو اوقات مکروہہ کی فہرست سے خارج کیا اور باقی چار میں فرائض کی اجازت دی، نوافل کی نہیں، امام شافعیؒ نے حنفیہ کی طرح اوقات مکروہہ تو پانچ ہی رکھے۔ مگر ان میں فرائض وواجبات کے علاوہ نوافل ذوات الاسباب کی بھی اجازت دی، امام مالکؒ کی طرح فرائض ونوافل میں فرق نہیں کیا۔ اور نوافل میں فرق اس لئے کیا کہ جن نوافل کی ترغیب شرع نے دی ہے، مثلاً تحیۃ المسجد وغیرہ تو گویا خود شریعت ہی نے ان کو ممانعت سے نکال دیا۔ لہٰذا وہ اوقات ممنوعہ میں بھی جائز ہونے چاہئیں، البتہ جو نوافل ایسے ہیں جن کی شریعت نے خاص طور سے ترغیب نہیں دی۔ نہ کسی سبب سے ان کو لازم کیا بلکہ بندہ کی مرضی پر رکھا کہ چاہے کرے یا نہ کرے وہ ممانعت کے تحت آسکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب احادیث ممانعت سے ساری نمازیں نکل گئیں، فرائض، واجبات اور نوافل ذوات الاسباب بھی تو اب صرف

---

[1] یہاں بھی صاحب فیض الباری سے مسامحت ہوئی کہ سب شارحین کی طرف غلط نسبت ہوگئی جبکہ صاحب عنایہ نے فرق کیا ہے اور اس جگہ عبارت میں بھی خلل ہے، ملاحظہ ہو ص ۲/۱۳۷ (مولف)

دوسرے کچھ نوافل باقی رہ گئے۔ اوراس طرح احادیث کثیرہ متواترہ کا فائدہ بہت ہی کم رہ گیا ہے۔ ان حضرات نے احادیث کثیرہ عامہ اور ضوابط کلیہ ہامہ کو چند جزوی واقعات کے سبب سے مخصوص ومحدود بنادیا برخلاف اس کے حنفیہ نے ان سب احادیث کو اپنے عموم واطلاق پر قائم رکھا اوران ہی کو اسوہ فی الباب بنایا، اور جزوی واقعات کو بطور ''واقعہ حال لاعموم لہا'' کے خصوصیت پر اتارا۔ اصحاب انصاف فیصلہ کریں گے کہ کون سی صورت اعلیٰ وافضل ہے، اکثر نمازوں کو اوقات شیطان میں داخل کردیتا یا ان کو اس سے بچالیتا؟

بعض سلف کا مسلک

ان حضرات نے بعد فجر وعصر کے ہر نماز کو جائز کہا اور حکم ممانعت کو سد ذرائع پر محمول کیا یعنی اس لئے کہ کہیں وہ نماز عین طلوع وغروب کے وقت پر نہ ہو جائے، لہٰذا ان کے نزدیک اوقات مکروہہ صرف تین ہو گئے، لیکن اس مسلک پر بعد فجر وعصر والی احادیث ممانعت کے تحت کوئی فرد ہی باقی نہ رہے گا اور احادیث مذکورہ بلا مصداق رہ جائیں گی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا شاید حضرت عمرؓ کا مسلک بھی یہی تھا، کیونکہ علامہ سیوطی نے نقل کیا کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ بعد عصر دو رکعت پڑھتے تھے، اور یہ زمانہ حضرت عمرؓ کا تھا۔ آپ نے ان کو سختی سے روکا تو انہوں نے کہا میں وہ کام نہیں چھوڑوں گا جو حضور علیہ السلام کے زمانہ میں کیا کرتا تھا، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں تمہیں سد ذرائع کے طور پر روکتا ہوں کہ مبادا غروب کے وقت پر بھی کہیں نہ پڑھ لو۔

امام بخاریؒ کا مسلک

آپ نے آگے "باب من لم یکرہ الصلوۃ الابعد العصر و الفجر" قائم کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ بھی امام مالک کی طرح استواء کو وقت مکروہ نہیں مانتے، شاید اس کی حدیث ان کی شرط پر نہ ہو، پھر انہوں نے بعد فجر وعصر کے وقت کو طلوع وغروب تک پہنچا کر عین طلوع وغروب کو بھی شامل کرلیا ہے، اس طرح ان کے نزدیک وقت مکروہ دو ہی رہ گئے اور یہی ترجمۃ الباب میں وجہ حصر بھی ہے، ورنہ عین طلوع وغروب کے وقت ان کے نزدیک بھی مکروہ ہے۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ امام بخاری نے اگرچہ استواء سے صرف نظر کرلی ہے، مگر اس کے بارے میں مسلم وابن ماجہ وغیرہ میں متعدد صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب لا تتحری الصلوٰۃ قبل غروب الشمس

(غروب آفتاب سے پہلے نماز کا قصد نہ کیا جائے)

۵۵۵: حدثنا عبداللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک عن نافع عن ابن عمران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لایتحریٰ احدکم فیصلی عند طلوع الشمس ولاعند غروبھا

۵۵۶: حدثنا عبدالعزیز بن عبداللہ قال حدثنا ابراھیم بن سعد عن صالح عن ابن شھاب قال حدثنی عطآء بن یزید الجند عی انہ سمع اباسعید الخدری یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لاصلوٰۃ بعد الصبح حتیٰ ترتفع الشمس ولاصلوٰۃ بعد العصر حتیٰ تغیب الشمس.

۵۵۷: حدثنا محمد بن ابان قال حدثنا غندر قال ثنا شعبۃ عن ابی التیاح قال سمعت حمران بن ابان یحدث عن معاویۃ رضی اللہ عنہ قال انکم تصلون صلوٰۃ لقد صحبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فمارايناه يصليهما ولقد نهىٰ عنهما يعنى الركعتين بعد العصر

۵۵۸: حدثنا محمد بن سلام قال اخبرنا عبدة عن عبيد الله عن خبيب عن حفص بن عاصم عن ابى هريرة قال نهىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صلوتين بعد الفجر حتىٰ تطلع الشمس وبعد العصر حتىٰ تغرب الشمس

ترجمہ۵۵۵: حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم میں سے کوئی شخص طلوع آفتاب کے وقت اور غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنے کا ارادہ نہ کرے۔

ترجمہ۵۵۶: حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ صبح کی نماز کے بعد کوئی نماز (جائز) نہیں جب تک کہ آفتاب بلند نہ ہو جائے اور نہ عصر کی نماز کے بعد کوئی نماز (جائز) ہے، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو جائے۔

ترجمہ۵۵۷: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا (اے لوگو!) تم ایک ایسی نماز پڑھتے ہو کہ ہم نے رسول خدا ﷺ کی صحبت اٹھانے کے باوجود آپ کو اسے پڑھتے نہیں دیکھا اور یقیناً آپ نے اس سے ممانعت فرمائی، یعنی عصر کے بعد دو رکعتیں:۔

ترجمہ۵۵۸: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے دو نمازوں سے ممانعت فرمائی ہے، فجر کے بعد آفتاب کے نکلنے تک اور عصر کے بعد آفتاب کے غروب ہونے تک۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بظاہر امام بخاریؒ تحری اور عدم تحری کے حکم میں فرق نہیں کرتے بلکہ لفظ تحری چونکہ حدیث میں آ گیا تھا، اس لئے اس کو ترجمہ میں لے لیا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دونوں جانب میں سے کسی ایک کے لئے فیصلہ کن رائے نہ دینا چاہتے ہوں، تاہم چونکہ حدیث قیس بن فہدان کی شرط پر نہ تھی، اور خود حضور علیہ السلام سے بھی بعد فرض فجر کوئی نماز ماثور نہیں ہے اس لئے اس کے جواز کو مرجوح سمجھتے ہیں، اور عصر کے بعد کی رکعتوں کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں کیونکہ ان کی شرط پر بھی حدیث رکعتین بعد العصر ثابت ہے اور فیصلہ اس کے لئے بھی اس لئے نہ کر سکے ہوں گے کہ حضرت عمرؓ سے رکعتیں بعد العصر پڑھنے والے کے لئے تعزیر کرنا بھی ثابت ہے۔ لہٰذا حکم لگانے میں نرمی اختیار کی اور تعارض کی وجہ سے توسع سے کام لیا۔ واللہ اعلم۔

باب من لم يكره الصلوٰة الا بعد العصر والفجر

رواه عمروا بن عمرو ابو سعيد وابوهريره

اس شخص کا بیان، جس نے صرف عصر اور فجر (کے فرض) کے بعد نماز کو مکروہ سمجھا ہے، اس کو عمر اور ابن عمر اور ابوسعید اور ابوہریرہؓ نے روایت کیا ہے

۵۵۹: حدثنا ابو النعمان قال حدثنا حماد بن زيد عن ايوب عن نافع عن ابن عمر قال اصلى كمارأيت اصحابى يصلون لآانهىٰ احداً يصلى بليل ونهار ماشآء غيران لاتحروا طلوع الشمس ولاغروبها

ترجمہ۵۵۹:۔ حضرت ابن عمرؓ کہا، جیسے میں نے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھتے دیکھا ہے، اسی طرح میں ادا کرتا ہوں میں کسی کو منع نہیں کرتا کہ وہ دن رات میں جس قدر چاہے، نماز پڑھے، البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ طلوع آفتاب (کے وقت نماز پڑھنے) کا قصد نہ کرو، اور نہ غروب آفتاب کے وقت اس کا قصد کرو۔

تشریح۵۵۹: اس حدیث کی تشریح پہلے گذر گئی۔

باب ما يصلى بعد العصر من الفوآئت و نحوها وقال كريب عن ام سلمة صلى النبى صلى الله عليه وسلم بعد العصر الركعتين وقال شغلنى ناس من عبدالقيس عن الركعتين بعد الظهر

٥٦٠: حدثنا ابو نعيم قال حدثنا عبدالواحد بن ايمن قال حدثنى ابى انه سمع عائشة قالت والذى ذهب به ماتركهما حتىٰ لقى الله و ما لقى الله حتى ثقل عن الصلوٰة وكان يصلى كثيراً من صلوته قاعداً تعنى الركعتين بعد العصر و كان النبى صلى الله عليه وسلم يصليهما فى المسجد مخافة ان يثقل علىٰ امته و كان يحب ما يخفف عنهم

٥٦١: حدثنا مسدد قال حدثنا يحيىٰ قال حدثنا هشام قال اخبرنى ابى قال قالت عائشة رضى الله عنها ابن اختى اما ترک النبى صلى الله عليه وسلم السجدتين بعد العصر عندى قط

٥٦٢: حدثنا موسى بن اسماعيل قال حدثنا عبدالواحد قال حدثنا الشيبانى قال ثنا عبدالرحمٰن بن الاسود عن ابيه عن عآئشة قالت ركعتان لم يكن رسول الله صلى الله عليه وسلم يدعهما سراولا علانية ركعتان قبل صلوٰة الصبح و ركعتان بعد العصر

٥٦٣: حدثنا محمدبن عرعرة قال حدثنا شعبة عن ابى اسحاق قال رايت الاسود ومسروقاً شهداعلىٰ عآئشة قالت كان النبى صلى الله عليه وسلم لاياتينى فى يوم بعد العصر الاصلىٰ ركعتين

ترجمہ ٥٦٠: حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اس کی قسم جو نبی کریم علیہ کو دنیا سے لے گیا آپ نے اپنی وفات کے وقت تک عصر کے بعد دو رکعتیں ادا فرمانا کبھی نہیں چھوڑیں، اور جب آپ اللہ سے ملے ہیں، اس وقت بوجہ ضعف عمر کے آپ کی یہ حالت تھی کہ آپ نماز سے تھک جاتے تھے، اور آپ اپنی بہت سی نمازیں بیٹھ کر پڑھتے تھے، اور نبی کریم علیہ ان دونوں کو یعنی عصر کے بعد دو رکعت (ہمیشہ) پڑھا کرتے تھے، لیکن گھر ہی میں پڑھتے تھے، اس خوف سے کہ آپ کی امت پر گراں نہ گزرے۔ کیونکہ آپ وہی بات پسند فرماتے تھے، جو آپ کی امت پر آسان ہو۔

ترجمہ ٥٦١: حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اے میرے بھتیجے! نبی کریم علیہ نے عصر کے بعد دو رکعتیں میرے ہاں کبھی ترک نہیں فرمائیں۔

ترجمہ ٥٦٢: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا علیہ دو رکعتوں کو پوشیدہ و آشکارا کبھی ترک نہ فرماتے تھے، دو رکعتیں، صبح کی نماز سے پہلے اور دو رکعتیں عصر کی نماز کے بعد:۔

ترجمہ ٥٦٣: حضرت اسود اور مسروقؓ حضرت عائشہؓ کے اس قول کی گواہی دیتے تھے کہ انہوں نے فرمایا، نبی کریم علیہ عصر کے بعد جب کسی دن میرے پاس آتے تھے، تو دو رکعتیں ضرور ادا فرمالیا کرتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ کا رجحان بعد نماز فجر کے طلوع تک لئے تو حنفیہ ہی کی طرح معلوم ہوتا ہے کہ سنت فجر بھی بعد الطلوع ہی پڑھ سکے گا، لیکن بعد العصر میں شافعیہ کے مسلک کی طرف معلوم ہوتا ہے، اسی لئے یہاں حضرت عائشہؓ کی حدیث لائے ہیں، جس سے حضور علیہ السلام کا بعد العصر دو رکعت پڑھنے کا ثبوت مداومت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے بعد العصر کے لئے متعدد تراجم وعنوانات قائم کئے ہیں۔ گویا امام بخاری نے حدیث حضرت عائشہؓ کو راجح سمجھا ہے اور امام ترمذیؒ نے باوجود شافعی ہونے کے حدیث ابن عباسؓ کو اصح قرار دیا ہے، کہ حضور علیہ السلام نے جو دو رکعت بعد عصر کے پڑھی تھیں وہ ظہر کے بعد کی متروکہ تھیں، ان کو ہی آپ نے بعد عصر پڑھا تھا، پھر کبھی نہیں پڑھیں۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا کہ یہ حدیث حسن ہے، پھر لکھا کہ چند صحابہ سے حضور علیہ السلام کا بعد

عصر دورکعت پڑھنا بھی مروی ہے، مگر یہ اس کے خلاف ہے حضور علیہ السلام نے نماز بعد العصر کی ممانعت فرمائی اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث زیادہ صحیح ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک دفعہ کے بعد پھر کبھی دورکعت عصر کے بعد نہیں پڑھیں۔ اور حضرت زید بن ثابت سے بھی حضرت ابن عباسؓ ہی کی طرح روایت ثابت ہے البتہ حضرت عائشہؓ سے متعدد روایات ایسی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بھی ان کے پاس عصر کے بعد تشریف لاتے تو دورکعت پڑھتے تھے۔ پھر حضرت عائشہؓ سے ہی روایت حضرت ام سلمہؓ کے واسطہ سے یہ بھی مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے بعد عصر و بعد فجر نماز سے ممانعت فرمائی ہے۔ اور جس بات پر اہل علم کا اجماع ہوا وہ یہی ہے کہ بعد عصر و بعد فجر کے نماز مکروہ ہے، بجز خاص استثناء کے مثلاً مکہ معظمہ میں بعد نماز عصر اور بعد نماز صبح کے طواف کے بعد والی نماز کہ اس میں حضور علیہ السلام سے رخصت مروی ہے اور اہل علم کی ایک جماعت صحابہ اور بعد کے حضرات نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ قول امام شافعی، امام احمد واسحق کا ہے لیکن دوسرے اہل علم صحابہ اور دوسرے حضرات نے مکہ معظمہ میں بھی بعد طواف کے صبح وعصر کے بعد نماز کو مکروہ ہی قرار دیا ہے۔ یہ قول سفیان ثوری، امام مالک اور بعض اہل کوفہ کا ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہاں امام شافعیؒ کا مسلک صرف مکہ معظمہ کے بارے میں جواز کا معلوم ہوتا ہے حالانکہ امام شافعی کے نزدیک دورکعت بعد عصر کا جواز مطلقاً ہے اور اسی لئے حافظ ابن حجرؒ نے بھی اس کی تائید کے لئے زور لگایا ہے دوسرے یہ کہ امام احمدؒ کا مسلک مغنی ابن قدامہ کے ذریعہ مثل مذہب امام ابوحنیفہؒ کے ثابت ہے، اس لئے امام ترمذیؒ سے یہاں دو تسامح ہو گئے، واللہ اعلم۔

اس طرح جمہور ائمہ (امام صاحب، امام مالک واحمدؒ) کا مسلک عدم جواز نماز بعد العصر کا ہوا اور صرف امام شافعی جواز کے قائل ہیں، جمہور کی بڑی دلیل ممانعت کی احادیث کثیرہ متواترہ ومشہورہ ہیں۔ اور مذکورہ حدیث ابن عباس وزید بن ثابت بھی، اور امام شافعی نے حضرت عائشہؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، حالانکہ اس میں بہت اضطراب ہے۔ کسی میں ہے کہ آپ نے اس معاملہ کی صحیح تحقیق کے لئے حضرت ام سلمہؓ کا حوالہ دیا۔ گویا وہ خود اس کی پوری ذمہ داری لینا نہیں چاہتی تھیں، اور طحاوی میں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے ان کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجا، تو فرمایا کہ میرے یہاں تو حضور علیہ السلام نے عصر کے بعد دورکعت پڑھی نہیں۔ البتہ حضرت ام سلمہؓ نے مجھے بتلایا کہ ان کے یہاں پڑھی ہے، اور حضرت ام سلمہؓ کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عائشہؓ کو معاف کرے، انہوں نے روایت میں تسامح کیا، میں نے تو یہ کہا تھا کہ حضور علیہ السلام نے بعد ظہر والی دورکعت ادا کی تھیں، اور حضرت عائشہؓ سے ہی یہ بھی مروی ہے کہ حضور علیہ السلام عصر کے بعد نماز پڑھتے تھے، مگر دوسروں کو منع فرماتے تھے، اور صوم وصال رکھتے تھے اور دوسروں کو منع فرماتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں باتیں حضور علیہ السلام کے خصائص میں سے تھیں۔

اس تفصیل سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اصل تحقیقی خبر اس بارے میں حضرت ام سلمہؓ کے پاس تھی، اسی لئے حضرت عائشہؓ بھی ان پر حوالہ کرتی تھیں، اور حضرت ام سلمہؓ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم سے بھی ظہر کی سنتیں رہ جائیں تو عصر کے بعد قضا کر لیا کریں؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں یہ روایت طحاوی کی ہے، جس کو نقل کر کے حافظ ابن حجر نے لکھا کہ یہ روایت ضعیف ہے، حجت نہیں بن سکتی (فتح ص ۲/۴۳) یہاں تو امام طحاوی کی روایت بتلا کر اس کو حافظ نے ضعیف بتلا دیا، لیکن اسی حدیث کی روایت تلخیص میں امام احمد سے نقل کر کے سکوت کر گئے۔ اور اس کو ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے، محدث ہیثمی نے ''الزوائد'' ص ۲/۲۲۴ میں لکھا کہ اس حدیث امام احمد کے رجال رجال صحیح ہیں، پھر تعجب ہے کہ فتح الباری میں صرف امام طحاوی کی طرف نسبت کر کے حدیث کو گرا دیا اور اس طرف سے صرف نظر کر لی کہ اسی حدیث کو امام احمد اور ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے اور چونکہ امام احمد کے رجال حدیث مذکور کو ضعیف نہیں کہہ سکتے تھے، اس لئے سکوت سے کام لیا۔ اس سے ان کا تعصب شدید ثابت ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ اس حدیث کے رجال میں یزید بن ہارون بہت بڑے محدث اور ثقہ حنفی ہیں، اور حماد بن سلمہ بھی ثقہ ہیں رجال مسلم میں سے ہیں۔ بلکہ امام بخاریؒ پر یہ اعتراض بھی ہوا ہے کہ انہوں نے حماد بن سلمہ

سے روایت نہیں لی اوران سے، بہت کم درجہ کے لوگوں سے لی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بعض لوگ یزید بن ہارون عن حماد بن سلمہ کوضعیف ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ مسلم شریف میں ان سے بہ کثرت احادیث مروی ہیں۔ اور امام سیوطیؒ نے خصائص کبری میں حدیث مذکور کی تصحیح کی ہے۔ اور فرمایا کہ بخاری میں حدیث عن معاویہؓ بھی ہمارے لئے حجت ہے، جس میں انہوں نے کہا کہ تم ایسی نماز پڑھتے ہو جس کو ہم نے حضور علیہ السلام کو پڑھتے نہیں دیکھا جبکہ ہم بھی حضور کی صحبت میں رہے ہیں۔ بلکہ آپ نے ان سے روکا ہے، یعنی ۲ رکعت بعد عصر سے (بخاری ص ۸۳) پھر فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث صحیحین وغیرہ میں بہت اضطراب ہے اوراسی لئے امام ترمذی نے حضرت ابن عباس کی حدیث کو حضرت عائشہؓ کی حدیث پر راجح قرار دیا ہے۔ اور ہماری دلیل مصنف عبدالرزاق کی حدیث بھی ہے جس میں ہے کہ ہم وہ کریں گے، جس کا حضور علیہ السلام نے حکم فرمایا (کہ ہمیں بعد عصر نماز سے روک دیا) اور حضور نے وہ کیا جس کا حکم ان کو ملا تھا۔ نیز حضرت عمر وابن عباس کا بعد عصر نماز پڑھنے والوں کو تعزیر وسزا دینا بھی ثابت ہے۔

فیض الباری کا تسامح: ص ۱۴۱ سطر ۸ میں **قال الحافظ و فیه جریر عن عطاء** کا تعلق حدیث عائشہؓ سے کر دیا ہے، حالانکہ حافظ کا نقد حدیث ابن عباسؓ سے متعلق ہے، اور سطر ۲۰ میں زید بن ہارون غلط چھپ گیا ہے۔ صحیح یزید ہے۔

راوی بخاری کا تسامح

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اصل مضمون حدیث کا اس طرح تھا **ما ترکھما حتی لقی الله، تعنی الرکعتین بعد العصر وما لقی الله تعالیٰ حتی ثقل عن الصلوة و کان یصلی کثیرا من صلاته قاعدا و کان النبی ﷺ** الخ راوی نے قاعدا کے ساتھ تعنی والے جملے کو جوڑ کر ترتیب ومعنی کو بگاڑ دیا۔ فتنبہ لہ

امام دارمی کا عمل

مسند دارمی میں یہ بھی ہے کہ جب ان سے حضرت عائشہؓ والی حدیث کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ میرا عمل تو اس پر ہے، جس پر حضرت عمرؓ عمل کرتے تھے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک ایک عمدہ استدلال حنفیہ وجمہور کے لئے یہ بھی ہے کہ محدث جلیل وفقیہ نبیل حضرت لیث بن سعدؒ نے طبقات میں نقل کیا کہ وہ موسم حج میں مکہ معظمہ حاضر ہوئے، کسوف شمس بعد عصر ہوا تھا، وہاں کسی نے بھی نماز کسوف نہ پڑھی، حالانکہ وہ نماز ذوات الاسباب میں بھی تھی (جس کی نماز شوافع جائز کہتے ہیں) سوال کیا گیا کہ نماز کیوں نہیں پڑھ رہے ہیں؟ تو لوگوں نے کہ کراہت وقت کی وجہ سے، یہ واقعہ ہزاروں تابعین کے سامنے پیش آیا اور صحابہ کا بھی آخری دور تھا، مگر کسی نے بھی نماز کسوف کے لئے اقدام نہیں کیا۔ اس واقعہ کو علامہ عینی نے نقل کیا ہے اور غالبا ۸۳ھ کا ہے، پھر فرمایا کہ یہ لیث حنفی ہیں (کما صرح بہ ابن خلکان فی کتاب الخراج) امام شافعیؒ نے فرمایا کہ لیث ہمارے نزدیک امام مالک سے کم نہیں ہیں، لیکن ان کے اصحاب نے ان کو ضائع کر دیا (یعنی ان کے علوم کی خدمت نہیں کی) ان کی روایت حضرت امام ابویوسفؒ سے مسئلہ قراءۃ خلف الامام میں امام طحاوی نے ذکر کی ہے۔ لیکن ان کی تقلید متقدمین کی طرح تھی۔

اصحاب صحاح کا حال

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہاں ضمناً کچھ ذکر اصحاب صحاح کا بھی کیا اور فرمایا کہ امام ابوداؤد تو دل بھر کے امام ابوحنیفہؒ کی تعظیم کرتے تھے۔ امام مسلم کا حال معلوم نہ ہو سکا اور ان کے شافعی ہونے کی بھی نقل موجود نہیں ہے، صرف ان کے ایک رسالہ سے استنباط کیا گیا ہے کہ

شافعی ہیں۔امام ترمذی امام صاحب کی نہ تعظیم کرتے ہیں نہ تحقیر معتدل ہیں۔امام بخاری بہت زیادہ مخالف ہیں،اپنی حدیثیں لاتے ہیں،امام صاحب کی نہیں لاتے۔امام نسائی بھی حنفیہ کے خلاف ہیں۔

باب التکبیر بالصلوٰة فی یوم غیم
بادل کے دنوں میں نماز سویرے پڑھنے کا بیان

۵۶۴: حدثنا معاذ بن فضالة قال حدثنا هشام عن یحییٰ هوا بن ابی کثیر عن ابی قلابة ان اباالملیح حدثه' قال کنا مع بریدة فی یوم ذی غیم فقال بکروا باً الصلوٰة فان النبی صلے الله علیه و سلم قال من ترک صلوٰة العصر حبط عمله

ترجمہ:۔حضرت ابوالملیحؒ روایت کرتے ہیں،کہ ہم ایک دن بریدہ کے ہمراہ تھے،یہ دن ابر کا تھا تو انہوں نے کہا کہ نماز سویرے پڑھ لو،کیونکہ نبی کریم علیہ نے فرمایا ہے،جس نے نماز عصر چھوڑ دی،تو سمجھ لو کہ اس کا (نیک)عمل ضائع ہو گیا۔

تشریح: ابر و بارش کے دنوں میں نماز جلد پڑھنے کا حکم اسی لئے کیا گیا کہ کہیں وقت کا اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے نماز قضا نہ ہو جائے،یا وقت مکروہ میں داخل نہ ہو جائے،جو بمنزلہ ترک صلوٰۃ ہے۔(الخیرالجاری)

پھر سوال یہ ہے کہ امام بخاری نے عنوان تو مطلق نماز کا قائم کیا اور حدیث الباب میں نماز عصر کا ذکر ہے تو مطابقت نہ ہوئی،جواب یہ ہے کہ واقعہ وقت عصر کا ہے،جس میں حضرت بریدہؓ نے نماز عصر سے متعلق حدیث پیش کی،اور قیاس سے ہر نماز کے حکم کی طرف اشارہ کیا۔

حنفیہ کے نزدیک عام طور سے تمام نمازوں میں سواء مغرب کے تاخیر مستحب ہے۔اور عصر و عشاء کی نماز صرف ابر کے دن جلد پڑھنا مستحب ہے،شافعیہ کے یہاں تمام نمازوں میں سواء عشاء کے تعجیل مستحب ہے۔

مشاجرات صحابہؓ: حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرات صحابہ کرام کے تذکرہ میں ضمناً فرمایا کہ بعض لوگ ان کے باہمی جھگڑوں کے واقعات سن کر بے دین ہو جاتے ہیں،اسی لئے علماء نے ان کے مطالعہ کو ممنوع قرار دیا ہے،اسی طرح اگر ایمان کا مدار اقوال بخاری وغیرہ پر ہوتا تو ضرور ہمارا ایمان بھی جاتا رہتا،مگر ایمان کا تعلق خدا اور اس کے رسول سے ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا اشارہ اس طرف تھا کہ امام بخاری وغیرہ نے بھی امام اعظمؒ وغیرہ کے بارے میں انصاف نہیں کیا اور سخت ریمارکس کر گئے ہیں،مگر ان کے کہنے سے کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا۔

یارسول اللہ کے لئے افادۂ انور

حضرتؒ درس بخاری میں جہاں کوئی عبارت پڑھنے والا طالب علم یارسول اللہ کے ساتھ علیہ کہتا،تو فرماتے تھے کہ جس قدر لکھا ہے اسی قدر پڑھو،راویان حدیث نبوی ہم سے زیادہ پابند احکام شرع تھے،اور ان کی عبادات و ریاضات بھی ہم سے زیادہ ہیں۔اور لڑائی بھڑائی بھی ان کے یہاں ہم سے زیادہ ہے،بلکہ وہ غیر مستحق کو برا بھلا کہتے ہیں اور ہم مستحق کو۔(اشارہ ہے جرح رواۃ و جرح ائمہ کی طرف)اس کے علاوہ وہ ہم سے ہر چیز میں زیادہ اور افضل ہیں۔

ضروری تنبیہ: جیسا کہ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا ہمیں اپنے اسلاف و اکابر امت کی پوری عظمت کرنی چاہئے کہ چند کوتاہیوں کے علاوہ کہ وہ بھی معلوم نہ تھے،وہ ہم سے ہزار جگہ برتر و افضل تھے،اور اسی کے ساتھ ہمیں چاہئے کہ جب ان کا ذکر کریں تو ان کا نام بھی ادب واحترام سے لیں۔عربی زبان میں ناموں کے ساتھ القاب و آداب لکھنے کا دستور نہ تھا۔اس کی وجہ سے ہم بھی ان کے نام ساتھ ادب نہ برتیں تو یہ ہمارے

عرف کے خلاف ہوگا کہ ہمارے یہاں باعظمت لوگوں کے تذکروں میں القاب وآداب کی رعایت نہ کرنا خلاف ادب ہے اور ہمیں اپنی عرف ورسم کے لحاظ سے مثلاً کسی صحابی رسول اکرم علیہ السلام کے نام ساتھ اول میں حضرت اور آخر میں رضی اللہ عنہ نہ لکھنا بڑی بے ادبی وناحق شناسی ہے یہ بھی واضح ہو کہ صحابہ کے لئے اور دیگر اکابر امت کے لئے رحمہ اللہ لکھنا بھی کافی ہے مگر انبیاء علیہم السلام کے لئے ص یا صلعم والی تخفیف جائز نہیں۔ افسوس ہے کہ آجکل کے علماء بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ اکابر نے اس پر نکیر کی ہے۔

باب الاذان بعدذهاب الوقت

وقت گزرجانے کے بعد نماز کے لئے اذان کہنے کا بیان

۵۶۵: حدثنا عمران بن ميسرة قال حدثنا محمد بن فضيل قال حدثنا حصين عن عبدالله بن ابی قتادة عن ابیه قال سرنا مع النبی صلی الله علیه وسلم لیلة فقال بعض القوم لوعرست بنا یا رسول الله قال اخاف ان تناموا عن الصلوٰة قال بلال انا اوقظكم فاضطجعوا واسند بلال ظهره الیٰ راحلته فذلبته عيناه فنام فاستيقظ النبی صلی الله علیه وسلم وقدطلع حاجب الشمس فقال یا بلال این ماقلت قال ماالقيت علی نومة مثلها قط قال ان الله قبض ارواحكم حين شآء وردها علیكم حين شآء یا بلال قم فاذن بالناس بالصلوٰة فتوضا فلما ارتفعت الشمس وبياضت قام فصلی

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے ایک مرتبہ نبی کریم علیہ السلام کے ہمراہ شب میں سفر کیا، تو بعض لوگوں نے کہا، کہ کاش! آپ اخیر شب میں مع ہم سب لوگوں کے آرام فرماتے (تو کتنا اچھا ہوتا) آپ نے فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم نماز (فجر) سے (غافل ہوکر) سو نہ جاؤ، بلال بولے، کہ میں تم سب کو جگادوں گا، لہٰذا سب لوگ لیٹ رہے اور بلال اپنی پیٹھ اپنے اونٹ سے ٹیک کر بیٹھ گئے، مگر ان پر بھی نیند غالب آگئی، اور وہ بھی سوگئے، (چنانچہ) نبی کریم علیہ السلام ایسے وقت بیدار ہوئے، کہ آفتاب کا کنارہ نکل آیا تھا، آپ نے فرمایا، اے بلال! تمہارا کہنا کہاں گیا؟ انہوں نے عرض کیا کہ (یارسول اللہ) ایسی نیند میرے اوپر کبھی مسلط نہ کی گئی (جیسی کہ آج مجھ پر طاری ہوگئی) آپ نے فرمایا (سچ ہے) اللہ نے تمہاری جانوں کو جس وقت چاہا قبض کرلیا اور جس وقت چاہا واپس کیا، اے بلال اٹھو۔ اور نماز کے لئے اذان دے دو، پھر آپ نے وضو فرمایا اور جب آفتاب بلند اور سفید ہوگیا، آپ کھڑے ہوگئے اور نماز پڑھی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس میں امام بخاری حدیث لیلۃ التعریس لائے ہیں اور ہمارے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ جب کئی نمازیں قضا ہوجائیں تو جماعت سے ادا کرسکتے ہیں مگر اذان شروع میں صرف ایک بار ہوگی اور اقامت ہر نماز کے ساتھ ہوگی، لیکن اذان فائتہ نماز کے لئے جب ہوگی کہ گھر میں پڑھے، مسجد میں پڑھے گا تو نہیں۔

پھر فرمایا کہ لیلۃ التعریس کا واقعہ ایک بار پیش آیا ہے، خیبر سے واپسی میں اور جن حضرات نے متعدد بتلائے ان کو تصرفات رواۃ اور تغائر الفاظ کی وجہ سے مغالطہ لگا ہے۔ حتی کہ محقق ابن سیدالناسؒ نے بھی دو واقعے سمجھے اور کوئی حدیث بخاری کو وہم راوی کہہ دے گا۔ مگر یہ سب غلط ہے۔

اگر کسی پر یہ بات گراں ہو کہ حضور اکرم علیہ السلام کی شان رفیع سے مستبعد ہے کہ ان کی نماز قضا ہوئی ہو، تو یہ کوئی بات نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے ایک شخص کو جگانے پر مامور کردیا تھا اور حضرت بلال نے پوری ذمہ داری لی تھی، اس لئے وہ لیٹے بھی نہ تھے، بلکہ اپنے اونٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے، مگر خدا کی تقدیر میں تو اسی طرح تھا کہ باوجود ان سب انتظامات کے بھی نماز قضا ہوجائے، چنانچہ وہی ہوا، اور حق یہ ہے کہ سونے کی حالت میں اگر مجبوری ویسے اختیاری کی وجہ سے نماز میں تقصیر ہو تو وہ شریعت میں معاف بھی ہے، چنانچہ نسائی شریف باب

من نام عن صلوة میں حدیث نبوی ہے کہ کوتاہی پر مواخذہ حالت بیداری کا ہوگا، نوم کی حالت کا نہ ہوگا، دوسری میں ہے کہ ایسے شخص سے مواخذہ ہوگا جو نماز نہ پڑھے اور اسی حالت میں دوسری نماز کا وقت آجائے تب بیدار ہو۔

شرح قولہ ان اللہ قبض ارواحکم

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ عام طور سے لوگ قبض روح بمعنی موت سمجھتے ہیں، لیکن اصل حقیقت وہ ہے جو علامہ محقق سہیلیؒ نے پیش کی ہے کہ قبض کے معنی دبانا، بھینچنا ہے، جیسے تم روئی وغیرہ کسی چیز کو مٹھی میں بھینچ کر بند کرلو۔ اس سے وہ پھیلی ہوئی چیز ایک جگہ سمٹ جاتی ہے۔ یہ تو قبض کی صورت ہے اور رد اس کا یہ ہے کہ پھر اس کو سابقہ حالت پر لوٹا دیا جائے۔ قبض روح کا معاملہ بھی اسی طرح ہے کہ وہ سونے کی حالت میں سمٹ جاتی ہے اور اپنے بعض افعال سے رک جاتی ہے، اسی کو قرآن مجید میں توفی وارسال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کو حدیث الباب میں قبض ورد فرمایا گیا ہے۔ پھر جب عمر ختم ہو جاتی ہے تو اس وقت کامل قبض توفی کا عمل ہوگا کہ روح کو بدن سے خارج کرلیں گے، نیند کی حالت میں وہ خارج نہیں ہوتی بلکہ وہ جسم کے اندر ہی رہ کر ایک جانب میں سمٹ جاتی جس کی وجہ بعض افعال کے لحاظ سے معطل ہو جاتی ہے۔ اگرچہ تدبیر بدن کا کام پھر بھی کرتی رہتی ہے۔

رد روح نبوی کا مطلب

حضرتؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے جو ارشاد فرمایا کہ جو میری قبر پر حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھتا ہے تو حق تعالیٰ میری روح کو لوٹا دیتے ہیں اور میں اس کو سنتا ہوں اور جواب سلام دیتا ہوں، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ حضور علیہ السلام کی روحِ مبارک مشغول بجانب قدس رہتی ہے، اور وقتِ سلام ادھر سے ادھر کو متوجہ ہو کر سلام سنتے اور جواب دیتے ہیں۔ اس سے مراد احیاء و اماتت نہیں ہے (کہ آپ کی حیات برزخی مثل حیاتِ دنیوی ہے، یہاں بھی حضور علیہ السلام نے حضرت بلالؓ کو سونے کی حالت میں معذور قرار دے کر ارشاد فرمایا ہے کہ تمہاری ارواح تو خدا کے اختیار میں ہیں کہ جب وہ چاہتا ہے ان کو سمیٹ لیتا ہے اور جب چاہے اصل حالت پر لوٹا دیتا ہے، اور حالت نوم میں قبض اور بیداری پر رد برابر ہوتا رہتا ہے۔

روح اور نفس میں فرق

حضرتؒ نے یہاں محقق سہیلیؒ ہی کے حوالہ سے یہ بھی فرمایا کہ نفس و روح دونوں ایک ہیں۔ صفات کے بدلنے سے نام بدلتا ہے، بحالت تجرد اس کو روح کہتے ہیں اور باعتبار تعلق بدن واکتساب ملکاتِ رویۂ کے نفس کہتے ہیں۔ جیسے پانی کہ جب تک وہ اصل حالت پر رہتا ہے، پانی ہے، اور وہی جب درختوں میں پیوست ہو جائے تو اس کے اوصاف واحکام بھی بدل جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر درخت سے پانی نکال کر اس سے وضو کرنا چاہیں تو وہ بھی صحیح نہ ہوگا۔

قولہ فلما ارتفعت الخ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا حضور علیہ السلام نے سورج کے بلند اور روشن ہونے کا انتظار فرمایا پھر نماز پڑھی، یہ نہیں کہ اٹھنے کے بعد فوراً ہی پڑھ لیتے، جیسا کہ حدیث **فلیصلها اذا ذکرها** سے بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔ یہ آپ کا عمل ہے اور حضور علیہ السلام سے بحدِ تواتر ممانعتِ صلوٰۃ بھی ارتفاعِ شمس سے قبل کی ثابت ہے، گویا قول و فعل دونوں سے حنفیہ کا مسلک واضح و ثابت ہے، اور دار قطنی میں **حتی اذا امکننا الصلوة** بھی مروی ہے، یعنی جب نماز ادا کرنے کی صورت میسر ہوگئی، معلوم ہوا کہ ارتفاع سے قبل صورتِ جواز ہے ہی نہیں۔ اور یہ تاویل جو کی جاتی ہے کہ وہاں شیطان کا اثر تھا، اس لئے حضور علیہ السلام نے دیر کی اور آگے بڑھ گئے تو اگر ایسا ہوتا تو کسی روایت

میں یہ الفاظ بھی تو ہوتے کہ ہم نے شیطان کی جگہ سے دور ہونے کے لئے نماز کو موخر کیا، اور یہ مسئلہ تو خود ان لوگوں کے یہاں بھی نہیں ہے کہ اگر کسی جگہ سونے میں نماز قضا ہو تو شیطان کا اثر سمجھ کر وہاں سے دور ہو کر نماز پڑھی جائے، لہٰذا یہ تاویل صرف ہمیں جواب پکڑانے کے لئے اختیار کی گئی ہے۔ پھر یہ کہ اگر جگہ میں شیطان کا اثر مان کر دوسری جگہ پڑھنے کی بات مانتے ہیں تو شیطان کے زمانۂ عبادت سے بچنے کیلئے کیوں نہیں مانتے جبکہ احادیث میں صراحت بھی آچکی کہ طلوع وغروب واستواء کے وقت نماز اس لئے نہ پڑھو کہ یہ وقت شیطانی اثر وعبادت کے ہیں۔

غرض حضرتِ حق جل ذکرہٗ کی عبادت تو اسی حالت میں اس کی کامل رضا کا موجب ہوگی کہ شیطان کے زمان ومکان دونوں سے ہی اس کو دور رکھا جائے، اگر ان ہی اوقات میں تم اپنی عبادت کرو گے، جن میں شیطان بتوں کی پرستش کراتا ہے تو وہ تو اس کی مرضی کی بات ہوگی نہ کہ خدائے برتر عزاسمہ کی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ شیطان تمہارا دشمن ہے۔ اس کو دشمن ہی سمجھو، یعنی اس کے طور طریقوں سے کامل پرہیز کرو۔

حاصل یہ ہے کہ مذکورہ تین اوقات کے بارے میں احادیثِ ممانعت مشہور ومتواتر طریقہ سے وارد ہیں اور بعد نمازِ فجر کی ممانعت لیلۃ التعریس والی حدیث الباب سے بھی ثابت ہے کہ آپ نے ارتفاعِ شمس کا انتظار فرمایا اور نماز کو مؤخر کیا۔ اور بعد عصر بھی آپ نے غزوۂ احزاب میں قبل مغرب وقتِ مکروہ میں نماز نہیں ادا کی، اور بعد غروب کے قضا فرمائی جبکہ حضرت عمرؓ نے اپنی تنہا نمازِ عصر بمشکل وقت کے اندر ادا کی تھی۔ اور حضور علیہ السلام سے ذکر کیا کہ میں نے نمازِ عصر ایسی حالت میں ادا کی کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہی تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب من صلے بالناس جماعةً بعد ذهاب الوقت

اس شخص کا بیان جو وقت گزرنے کے بعد لوگوں کو جماعت سے نماز پڑھائے

٥٦٦: حدثنا معاذ بن فضالة قال حدثنا هشام عن يحيىٰ عن ابى سلمة عن جابر بن عبدالله ان عمربن الخطاب رضي الله عنه جآء يوم الخندق بعد ماغربت الشمس فجعل يسب كفار قريش قال يارسول الله ماكدت اصلى العصر حتىٰ كادت الشمس تغرب قال النبى صلى الله عليه وسلم والله ماصليتها فقمنا الىٰ بطحان فتوضا للصلوٰة وتوضانالها فصلے العصر بعد ما غربت الشمس ثم صلى بعدها المغرب

ترجمہ: **معاذ بن فضالہ**، ہشام، یحییٰ، ابوسلمہ، جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ (غزوہ) خندق میں آفتاب غروب ہونے کے بعد حضرت عمرؓ قریش کو برا بھلا کہتے ہوئے حضور انور کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ یارسول اللہ میں نے عصر کی نماز ابھی تک) نہیں پڑھی تھی، اور سورج غروب کے قریب ہو گیا تھا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ واللہ میں نے عصر کی نماز نہیں پڑھی پھر ہم سب (مقام) بطحان کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے اور ہم سب نے (بھی) نماز کے لئے وضو کیا پھر آپ نے آفتاب غروب ہو جانے کے بعد پہلے عصر کی نماز پڑھی اس کی بعد مغرب کی ادا کی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ کاد کے معنی میں اختلاف ہوا ہے، عام طور پر یہ مشہور ہے کہ مثبت میں منفی اور منفی میں مثبت کے معنی دیتا ہے اور اسی لئے عربی شاعر کے اس شعر۔

"**اذا غير الهجر المحبين لم يكد. رسيس الهوى من حب مية يبرح.**" پر لوگوں نے اعتراض کیا تو اس نے **لم یکد** کو **لم یجد** سے بدل دیا تھا، مگر میرے نزدیک یہ بھی دوسرے افعال ہی کی طرح ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کے ارشاد **ما کدت** الخ کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے بمشکل نمازِ عصر ادا کی تھی جس کو حافظ نے بھی فتح الباری میں ذکر کیا کہ حضرت عمرؓ باوضو ہوں گے۔ اس لئے عجلت کے ساتھ نماز پڑھ لی ہوگی۔ دوسرے صحابہ اور حضور اکرم ﷺ رہ گئے، وہ نہ

پڑھ سکے۔اور حضرت عمرؓ نے وقتِ مکروہ میں پڑھی،عند الحنفیہ بھی اس دن کی عصر جائز ہے،مگر حکم نہیں دیتے،کیونکہ کراہت کے ساتھ حکم نہیں دیا جاسکتا۔فقہاءِ حنفیہ صحیح اور جائز کا لفظ لکھ دیتے ہیں جس سے لوگوں کو مغالطہ ہوتا ہے،حالانکہ وہ جواز یا صحت کراہت کے ساتھ ہوتی ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ مغرب کی نماز کو فوائت میں سے شمار کرنا مسامحت ہے،کیونکہ وہ فوت نہ ہوئی تھی۔بلکہ مغرب سے قبل ہی جنگ ختم ہوگئی تھی۔اور اتنی قبل کہ حضرت عمرؓ نے غروب سے قبل نماز عصر پڑھ لی تھی۔لیکن چونکہ ظہر وعصر کی ادائیگی وغیرہ کے باعث مغرب بھی وقتِ معتاد ومستحب سے مؤخر ہوگئی تھی۔اس لئے اس کو بھی فواءت میں شمار کردیا گیا۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب من نسی صلوٰۃ فلیصل اذا ذکر ولایعید الاتلک الصلوٰۃ وقال ابراھیم من ترک صلوٰۃ واحدۃً عشرین سنۃً لم یعد الاتلک الصلوٰۃ الواحدۃ

(اس شخص کا بیان جو کسی نماز کو بھول جائے،تو جس وقت یاد آئے پڑھ لے اور صرف اسی نماز کا اعادہ کرے،ابراہیم نے کہا ہے کہ جو شخص ایک نماز ترک کردے(اور)بیس برس تک(اس کو ادا نہ کرے،تب بھی)وہ صرف اسی نماز کا اعادہ کرے گا)

۵۶۷: حدثنا ابونعیم و موسیٰ بن اسماعیل قالا حدثنا ھمام عن قتادۃ عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من نسی صلوٰۃ فلیصل اذا ذکر لاکفارۃ لھا الاذٰلک اقم الصلوٰۃ لذکری قال موسیٰ قال ھمام سمعتہ یقول بعد اقم الصلوٰۃ لذکری وقال حبان ثنا ھمام ثنا قتادۃ قال حدثنا انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نحوہ

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا،جو شخص کسی نماز کو بھول جائے تو اسے چاہئے کہ جب یاد آئے،تو پڑھ لے،اس کا کفارہ یہی ہے،اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔اور حبان نے کہا،کہ ہم سے ہمام نے ان سے قتادہ۔نے اور ان سے انسؓ نے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اسی کے مثل روایت کیا۔

تشریح: حافظؒ نے لکھا کہ اس حدیث میں امام مسلم نے اونام عنہا کی بھی روایت کی ہے،یعنی جو بھول جائے یا سو جائے تو جب بھی یاد کرے یا بیدار ہو تو فوت شدہ نماز ادا کرے۔بعض نے اس کی دلیلِ خطاب سے یہ ثابت کیا ہے کہ عمداً اگر نماز ترک کردے تو اس کی قضا جائز نہ ہوگی،کیونکہ حدیث میں بھولنے اور سونے کی قید وشرط ہے،لہٰذا عمداً ترک کرنے والے کی قضا صحیح نہ ہوگی،حافظؒ نے اس سے اشارہ حافظ ابن تیمیہ اور ان کے پیش رو اہلِ ظاہر کی طرف کیا ہے اور پھر ان کی دلیل کا رد بھی کیا ہے۔(فتح ص ۲/۴۸)

انوار المحمود ص ۱/۱۸۷ میں ہے:۔بعض اہل الظاہر نے جمہور علماءِ امت کے خلاف یہ شاذ رائے قائم کی ہے کہ عمداً تارک صلوٰۃ پر قضا نہیں ہے،اور علامہ نوویؒ نے بھی لکھا کہ بعض اہلِ ظاہر نے شذوذ کیا کہ صلوۃِ فائتہ بغیر عذر کی قضا درست نہیں ہے۔لیکن یہ ان کی غلطی اور جہالت ہے،علامہ شوکانی نے نیل میں لکھا کہ داؤد ظاہری اور ابن حزم نے عامد کے لئے قضا کا انکار کیا،اور ابن تیمیہ سے بھی نقل ہوا کہ انہوں نے بھی اسی کو اختیار کیا۔پھر دلائل فریقین ذکر کئے ہیں۔جن کا خلاصہ انوار الباری قسط نمبر۱۳ میں ذکر کیا گیا ہے۔جہاں حافظ ابن تیمیہ کے دوسرے تفردات اور ان کا رد بھی مدلل ومکمل طور سے ہوا ہے۔

ترتیب کا مسئلہ: حضرت شاہ ولی اللہ نے "تراجم ابواب" میں لکھا کہ امام بخاریؒ کا مقصد اس باب سے وقتی اور فوت شدہ نمازوں میں عدمِ وجوب ترتیب کو ثابت کرنا اور امام ابوحنیفہ کا رد کرنا ہے،لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ ارشاد اس لئے صحیح نہیں کہ حنفیہ کے نزدیک ترتیب کا وجوب تین وجہوں سے ساقط ہوجاتا ہے،بھولنے سے،تنگی وقت کی وجہ سے اور پانچ سے زیادہ نمازوں کے قضا ہوجانے سے،جب ایسی بات

ہے تو یہاں امام بخاری نسیان والی صورت ذکر کر کے امام صاحبؒ کا رد کیسے کر سکتے تھے، اگر پھر بھی رد کیا ہے تو ان کو امام اعظمؒ کا مسلک معلوم نہ ہوگا جیسا کہ اور بھی کئی مسائل میں ان سے ایسی غلطی ہوئی ہے اور ہم نے انوار الباری میں اسکی مثالوں کی نشان دہی کی ہے۔ یا پھر حضرت شاہ ولی اللہؒ سے چوک ہوگئی کہ ان کو حنفی مذہب کا یہ جزئیہ محفوظ نہ رہا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

البتہ یہاں یہ ممکن ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنے استاذ جلیل امام احمد کا رد کیا ہو، ان کا مذہب یہ ہے کہ اگر ایک نماز قضا ہوگئی اور ایک سال تک ادا نہ کی تو جب ایک سال کے بعد اس کو ادا کرے گا تو ساتھ ہی ایک سال کی ساری نمازوں کو بھی پھر سے پڑھے گا، کیونکہ ترتیب ان کے یہاں مطلقاً واجب ہے، خواہ کتنی ہی نمازیں پڑھ لے، وہ سب واجب الاعادہ ہیں، حنفیہ کی طرح پانچ سے زیادہ قضا ہونے پر ترتیب ساقط نہیں ہوتی، اور غالباً امام بخاری نے امام احمد ہی کا رد کرنے کے لئے حضرت ابراہیم نخعی کا قول ترجمۃ الباب میں ذکر کیا ہے کہ ایک نماز قضا شدہ کو اگر بیس سال تک بھی ادا نہ کرے تو جب بھی ادا کرے گا تو صرف وہی ایک ادا کرنی پڑے گی، بیس سال کی نمازوں کا اعادہ نہ کرنا پڑے گا، جس کا حکم امام احمدؒ کرتے ہیں۔ اس بات کو حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے بھی شرح تراجم ابواب البخاری ص ۲\۲۵۱ میں لکھا ہے، مگر ایک بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ نسیان کا عذر جس طرح حنفیہ کے یہاں معتبر ہے، امام احمدؒ کے یہاں بھی ہے، لہٰذا اعتراض ورد کی صورت صرف یہ رہے گی کہ قضا شدہ نماز یاد آ جانے کے بعد بھی ادا نہ کرے اور اس کے باوجود ایک سال یا زیادہ مدت گزار دے، برخلاف حنفیہ کے کہ ان کے نزدیک اگر وہ قضا شدہ کو یاد بھی کر لے تو پانچ نمازوں سے زیادہ قضا ہو جانے پر نسیان و عمد برابر ہیں اور یاد آنے پر بھی اگر اعادۂ صلوٰۃ فائتہ نہ کرے گا تو صرف پانچ نمازوں کا اعادہ کرنا پڑے گا، امام احمد کی طرح برسوں کی نمازیں لوٹانے کی ضرورت نہ ہوگی، البتہ امام مالکؒ کے نزدیک ترتیب کا وجوب نسیان کی صورت میں بھی ہے کما فی المغنی، لیکن علامہ عینی نے لکھا کہ ان کا معتمد مذہب سقوطِ ترتیب بالنسیان ہے اور اسی کو ابن العربی نے ''العارضہ'' میں درج کیا اور حافظ نے بھی لکھا کہ اکثر کا مذہب ترتیب مع الذکر کا ہے، نسیان کے ساتھ نہیں۔ (فتح الباری ص ۲\۴۷)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ائمہ ثلاثہ وجوب ترتیب کے قائل ہیں، اور صرف امام شافعی ترتیب کے وجوب سے منکر ہوئے ہیں، ائمہ ثلاثہ کا استدلال حضور علیہ السلام کے عمل سے ہے کہ آپ نے غزوۂ خندق میں قضا شدہ نمازوں کو ترتیب کے ساتھ ادا کیا اور یہ بھی آپ کا عام ارشاد ہے کہ جس طرح تم مجھے نماز میں ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہو، اسی طرح ادا کیا کرو۔

مسئلہ وجوب ترتیب اور مولانا عبدالحی رحمہ اللہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مولانا عبدالحی صاحبؒ نے ''التعلیق الممجد'' میں مذہب امام شافعیؒ کو ترجیح دی ہے اور شیخ ابن الہمام و ابن نجیم کا قول بھی اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔ لیکن ان دونوں حضرات کا قول ایسے مسئلہ میں جس میں اکابر حنفیہ متفق الرائے ہیں، شذوذ کے درجہ میں رکھا جائے گا۔ اور معتبر نہ ہوگا۔

علامہ بنوری دامت برکاتہم نے معارف السنن ص ۲\۱۱۰ میں دلائل کے ساتھ اس مسئلہ کی تفصیل کی ہے، وہاں دیکھ لی جائے اور فیض الباری ص ۲\۱۵۱ میں بھی اچھی بحث آ سکتی ہے۔ اور یہ امر بھی کم اہم نہیں کہ وجوبِ ترتیب کے قائل صرف حنفیہ نہیں بلکہ ان کے ساتھ امام مالک و امام احمدؒ اور ان تینوں کے متبعین کبار ائمہ و محدثین و محققین ہیں، اس لئے بھی حضرت شاہ صاحبؒ کا فیصلہ مذکورہ گرانقدر ہے۔

حضرت مولانا عبدالحیؒ کی حنفی مسلک کے لئے خدماتِ جلیلہ اور خود ان کی جلالت قدر کے سامنے ہماری گردنیں جھکی ہوئی ہیں، مگر بقول علامہ کوثریؒ کے متعدد مسائل مہمہ (مسئلہ محاذاۃ وغیرہ) میں ان کا ''استسلام'' بھی دل پر گراں ہے۔ یرحمہ اللہ و ایانا بفضلہ و کرمہ.

قوله و لا يعيد الا تلك الصلوٰة

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کا اشارہ حدیثِ ابی داؤد کی طرف معلوم ہوتا ہے جس میں ہے کہ فوت شدہ نماز کو یاد آنے پر بھی پڑھے اور اگلے دن جب اس نماز کا وقت آئے، تب بھی اس کو پڑھے، گویا ایک قضا شدہ نماز کو دوبارہ پڑھے، علامہ خطابی نے اس کو استحباب پر محمول کیا ہے، حافظ نے اس کا رد کیا ہے۔ اور حدیثِ مذکور کو ضعیف اور نا قابلِ احتجاج قرار دیا ہے، یہ بھی لکھا کہ استحباب کا قائل سلف میں سے کوئی نہیں ہوا۔ بلکہ انہوں نے حدیثِ مذکورہ کو راوی کی غلطی کہا ہے، جس کو ترمذی نے بھی امام بخاری سے نقل کیا ہے۔ یا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگلے دن والی اسی جیسی نماز کو اپنے وقت پر پڑھے، حضرتؒ نے فرمایا میرے نزدیک حدیثِ ابی داؤد بھی عمل کے لائق ہے اور جاندار ہے، اس لئے اس کی تضعیف یا انکار کی ضرورت نہیں، اور ادا شدہ نماز کا اعادہ اصل وقت کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے مستحب قرار پائے گا، اور نیت بھی اسی نماز فجر یا ظہر وغیرہ فوت شدہ کی کرے گا، اگر چہ وہ نفل ہوگی کیونکہ فرض کی ادائیگی پہلے کر چکا ہے یاد آنے پر۔ حضرتؒ کے یہاں ایک مد مستحب الخواص کی بھی تھی، ممکن ہے وہی یہاں مراد ہو، جس طرح **مس الذکر و مس المرأة و اکل لحم الابل** کی وجہ سے بھی حضرتؒ وضو کو مستحب الخواص فرماتے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب قضآء الصلوات الاولیٰ فالاولیٰ

قضا نمازوں کو ترتیب کے ساتھ پڑھنے کا بیان

۵۶۸: حدثنا مسدد قال حدثنا يحيیٰ قال حدثنا هشام قال حدثنا يحيیٰ هو ابن ابی کثير عن ابی سلمة عن جابر قال جعل عمر رضی الله عنه يوم الخندق ليسب کفارهم و قال يا رسول الله مر کدت اصلی العصر حتیٰ غربت الشمس قال فنزلنا بطحان فصلی بعد ماغربت الشمس ثم صلی المغرب

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (غزوہ) خندق کے دن کفار قریش کو برا کہنے لگے اور کہا کہ یا رسول اللہ۔ میں آفتاب غروب ہونے تک (ان کی وجہ سے) عصر کی نماز نہ پڑھ سکا۔ جابر کہتے ہیں، پھر ہم لوگ (مقام) بطحان میں گئے، تب آپ نے آفتاب غروب ہو جانے کے بعد نماز پڑھی، اس کے بعد مغروب کی نماز پڑھی۔

تشریح: اس حدیث سے ترتیب صلوات فائتہ و دو قتیہ کا ثبوت ہوتا ہے، جس کی تفصیل گذر چکی۔ امام بخاری کا رجحان بھی وجوب ترتیب کی طرف ہے، جیسا کہ ترجمۃ الباب سے واضح ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ صحیحین میں تو صرف ایک نماز عصر کے فوت ہونے کا ذکر ہے، لیکن معانی الاثار امام طحاوی میں امام شافعیؒ سے مروی ہے کہ ظہر، عصر و مغرب تین نمازیں فوت ہوئی تھیں، اور اس کی سند قوی ہے۔

حافظ ابن حجر اور رجال حنفیہ

حضرتؒ نے اس موقع پر ضمناً فرمایا کہ حافظ نے رجالِ حنفیہ کو بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے، حتی کہ امام طحاویؒ کے بھی عیوب جمع کئے ہیں، حالانکہ جب تک امام طحاوی مصر میں رہے، کوئی محدث وہاں نہیں پہنچا جس نے ان سے اجازتِ حدیث نہ لی ہو، اور امام طحاوی مسلم امامِ حدیث ہیں، لیکن حافظ نے امام طحاوی سے سوداں حصہ رکھنے والوں کی تعریف کی ہے اور امام موصوف پر نکتہ چینی کی۔ پھر فرمایا کہ تعصب کی حد ہے کہ علامہ عینی کے جوتہ میں، شافعیہ نے صحابہ کے نام رکھوا دیئے۔ اور پھر بادشاہِ وقت سے شکایت کی کہ یہ رافضی ہے اور دو سال کے لئے قید کرا دیا، پھر حنفیہ نے موچی سے ہی کہلوا دیا کہ مجھے رشوت دے کر ایسا کرایا گیا تھا، تب علامہ نے جیل سے رہائی پائی۔ حافظ نے عینی سے ایک حدیث مسلم شریف کی

اور دو مسند احمد کی سن کران سے اجازت حدیث حاصل کی ہے اور وہ عمر میں بھی حافظ سے بڑے تھے اور ان کے بعد تک زندہ رہے ہیں۔

باب مایکره من السمر بعد العشآء السامر من السمر والجمیع السمار والسامر ھٰھنا فی موضع الجمیع

(عشاء کی نماز کے بعد باتیں کرنا مکروہ ہے، سامر سمر سے ماخوذ ہے اور جمع سمار ہے اور سامر یہاں جمع کے معنوں میں ہے)

۵۶۹: حدثنا مسدد قال حدثنا یحییٰ قال حدثنا عون قال حدثنا ابو المنهال قال انطلقت مع ابی الیٰ ابی برزة الاسلمی فقال له' ابی حدثنا کیف کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یصلی المکتوبة قال کان یصلی الهجیر وهی التی تدعونها الاولیٰ حین تدحض الشمس و یصلی العصر ثم یرجع احدنآ الیٰ اهله فی اقصی المدینة والشمس حیة ونسیت ماقال فی المغرب قال وکان یستحب ان یؤخر العشآء قال وکان یکره النوم قبلها والحدیث بعدها وکان ینفتل من صلوٰة الغداة حین یعرف احدنا جلیسه' ویقرأ من الستین الی المائة

ترجمہ: ابومنہال روایت کرتے ہیں کہ میں اپنے والد کے ساتھ حضرت ابو برزہ اسلمیؓ کے پاس گیا، ان سے میرے والد نے کہا، کہ ہم سے بیان کیجئے، کہ رسول اللہ ﷺ فرض نماز کس طرح پڑھتے تھے، وہ بولے، کہ ہجیر جسے تم پہلی نماز کہتے ہو، آفتاب کے ڈھلتے ہی ادا فرمالیا کرتے تھے اور عصر کی نماز (ایسے وقت) پڑھتے تھے کہ (جب) ہم میں سے کوئی شخص (حضور) کے ہمراہ نماز پڑھ کر اقصیٰ مدینہ میں اپنے گھر کو واپس جاتا، تو بھی آفتاب بالکل صاف ہوتا تھا (وابومنہال کہتے ہیں) میں بھول گیا کہ مغرب کے بارے میں انہوں نے کیا کہا) ابو برزہؓ کہتے ہیں کہ آپ عشاء کی نماز دیر میں پڑھنا پسند فرماتے تھے، اور کہا کہ عشاء سے پہلے سونا اور اس کے بعد بات کرنا مکروہ خیال فرماتے تھے، اور صبح کی نماز سے (فراغت کر کے) آپ ایسے وقت لوٹتے تھے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے پاس والے کو پہچان لیتا تھا، اور (اس میں) آپ ساٹھ آیتوں سے سو تک پڑھتے تھے۔

تشریح: حافظ نے لکھا کہ یہ حدیث پہلے باب وقت العصر (ص ۷۸) میں بھی آچکی ہے، یہاں خاص طور سے سمر بعد العشاء کی کراہت بتلانے کے لئے پھر سے لائے ہیں، عشاء سے قبل سونے کی کراہت اس لئے ہے کہ عشاء کی نماز فوت نہ ہو جائے یا وقت مستحب سے نہ نکل جائے اور بعد عشا باتیں کرنے کی ممانعت اس لئے ہوئی کہ صبح کی نماز قضا نہ ہو جائے، حضرت عمر لوگوں کو اس بات پر مارتے تھے اور فرماتے تھے کہ شروع رات میں قصہ گوئی اور باتوں میں وقت خراب کرو گے اور آخر رات میں سوؤ گے؟: پھر حافظ نے لکھا کہ اس علت کے پیش نظر کوئی بڑی اور چھوٹی راتوں میں فرق بھی کر سکتا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ دور اندیشی کے تحت یہ ممانعت مطلقاً ہی ہو، کیونکہ شریعت جب کسی چیز پر خرابی کے اندیشہ وگمان سے کوئی حکم لگا دیتی ہے تو پھر وہ سختی ہی قائم رہتی ہے (فتح ص ۲/۴۹) لہٰذا شریعت نے نماز عشا کے بعد مباح باتوں سے روک دیا ہے، مباح اس لئے کہ حرام وممنوع باتیں تو ہر وقت ممنوع ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ کی رائے بھی یہ تھی کہ سمر بعد العشا کی کراہت اسی وقت ہے کہ اس کی وجہ سے صبح کی نماز فوت ہو (لامع ص ۱/۲۳۴)۔

باب السمر فی الفقه و الخیر بعد العشآء

دین کے مسائل اور نیک باتوں سے متعلق عشاء کے بعد گفتگو کرنے کا بیان

۵۷۰:حدثنا عبداللہ بن الصباح قال حدثنا ابوعلی الحنفی قال حدثنا قرۃ بن خالد قال انتظرنا الحسن وراث علینا حتیٰ قربنا من وقت قیامہ فجآء فقال دعانا جیراننا ھٰؤلآء ثم قال قال انس بن مالک نظرنا النبی صلے اللہ علیہ وسلم ذات لیلۃ حتیٰ کان شطر اللیل یبلغہ فجآء فصلی لنا ثم خطبنا فقال الا ان الناس قدصلوا ثم رقدوا وانکم لم تزالوا فی صلوٰۃ ما انتظر الصلوٰۃ قال الحسن و ان القوم لایزالون فے خیرما انتظروا الخیر قال قرۃ ھو من حدیث انس عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم

۵۷۱:حدثنا ابوالیمان قال اخبرنا شعیب عن الزھری قال حدثنی سالم ابن عبداللہ بن عمرو ابوبکر بن ابی حثمۃ ان عبداللہ بن عمر قال صلے النبی صلے اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ العشآء فی اٰخر حیوتہ فلما سلم قام النبی صلے اللہ علیہ وسلم فقال ارایتکم لیلتکم ھٰذہ فان راس مائۃ سنۃ لایبقیٰ من ھوالیوم علیٰ ظھر الارض احد فوھل الناس فی مقالۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم الیٰ مایتحدثون فی ھٰذہ الاحادیث عن مائۃ سنۃ وانما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لایبقےٰ ممن ھوالیوم علےٰ ظھر الارض یرید بذٰلک انھا ینخرم ذٰلک القرن

ترجمہ ۵۷۰:۔حضرت قرہ بن خالد روایت کرتے ہیں کہ ہم حسن بصری کا انتظار کررہے تھے،انہوں نے آنے میں اتنی دیر کی، کہ ان کے (مسجد سے) اٹھ جانے کا وقت قریب آگیا،تب وہ آئے اور کہنے لگے کہ مجھے میرے پڑوسیوں نے بلالیا تھا،اس وجہ سے دیر ہوگئی، پھر انہوں نے بیان کیا کہ حضرت انس بن مالکؓ نے (مجھ سے) کہا کہ ہم نے ایک رات نبی کریم ﷺ کا انتظار کیا، یہاں تک کہ نصف شب ہوگئی،تب آپ تشریف لائے اور ہمیں نماز پڑھائی اس کے بعد آپ نے ہم سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ دیکھو! لوگ نماز پڑھ چکے اور سو رہے،اور تم برابر نماز میں رہے، جب تک کہ تم نے نماز کا انتظار کیا،اسی حدیث کے پیش نظر (خود) حسن بصریؒ کا قول ہے، کہ جب تک لوگ نیکی کرنے کے منتظر رہتے ہیں وہ اس نیکی کے کرنے کا ثواب پاتے رہتے ہیں،قرہ نے کہا، کہ حسن کا یہ قول حضرت انس کی حدیث میں داخل ہے۔

ترجمہ ۵۷۱:۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک مرتبہ) عشاء کی نماز اپنی اخیر زندگی میں پڑھی، جب سلام پھیرا، تو نبی کریم ﷺ کھڑے ہوگئے،اور فرمایا کہ تم اپنی اس رات کے حال کے متعلق مجھ سے سنو! سو برس کے بعد جو شخص آج زمین کے اوپر ہے،کوئی باقی نہ رہے گا۔(ابن عمرؓ کہتے ہیں، کہ) لوگوں نے نبی کریم ﷺ کے (اس) ارشاد (کے سمجھنے) میں غلطی کی (اور) سو برس کی توضیح کرنے) میں دوسری باتوں کی طرف خیال دوڑانا شروع کردیا (ان ہی خیالوں کو) وہ (حدیث کی تفسیر میں) بیان کرتے ہیں، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا تھا، کہ جو آج زمین کے اوپر ہیں، ان میں سے کوئی باقی نہ رہے گا، مراد آپ کی اس سے یہ تھی کہ سو سال پر یہ قرن گزر جائے گا۔

تشریح: پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ شریعت نے کسی چیز کے لئے انتظار کو بھی اسی کے حکم میں رکھا ہے اور حضور علیہ السلام نے یہ ارشاد نمازِ عشا کے بعد فرمایا ہے، لہٰذا بعد عشا کے کسی نیک بات میں کوئی حرج نہ ہوا، دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی سے باب السمر بالعلم (ص۲۲ کتاب العلم) میں بھی گزر چکی ہے اور حضور علیہ السلام نے یہ ارشادات بھی بعد نمازِ عشا فرمائے ہیں۔ لہٰذا کسی علمی وفقہی بات میں

کوئی مضائقہ نہیں۔ حافظ نے لکھا کہ امام ترمذی نے حضرت عمرؓ سے حدیثِ حسن روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ مسلمانوں کے معاملات میں بعد عشا کے مشورے کیا کرتے تھے اور میں بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس حدیث کے تحت حضرت خضر علیہ السلام کی حیات کا مسئلہ بھی چھڑتا ہے اور ہم اس کو پہلے لکھ چکے ہیں، یہاں حافظ نے لکھا کہ علامہ نووی وغیرہ نے کہا:۔ اس حدیث سے امام بخاری اور ان کے ہم خیال حضرات نے حضرت خضر علیہ السلام کی موت ثابت کی ہے، مگر جمہور اکابر امت اس کے خلاف ہیں اور اس کے جوابات دیئے ہیں۔ پھر حافظ نے وہ بھی درج کئے، دیکھ لئے جائیں (فتح ص ۲/۱۵۰)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ باب امام بخاری اس لئے لائے ہیں تاکہ علمی مذاکرات کو بھی عام حکم سمر بعد العشاء کے تحت نہ سمجھا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب السمر مع الاهل والضيف

(گھر والوں اور مہمانوں کے ساتھ عشاء کے بعد گفت وگو کرنے کا بیان)

۵۷۲: حدثنا ابوالنعمان قال حدثنا معتمر بن سليمان ثنا ابى قال حدثنا ابوعثمان عن عبدالرحمن بن ابى بكران اصحاب الصفة كانوا اناساً فقرآء وان النبى صلى الله عليه وسلم قال من كان عنده' طعام اثنين فليذهب بثالث وان اربع فخامس اوسادس وان ابابكر جآء بثالث وانطلق النبى صلى الله عليه وسلم بعشرة قال فهوانا و ابى و امى ولاً ادرى هل قال و امراتى و خادم بين بيتنا وبيت ابى بكرو ان ابابكر تعشى عندالنبى صلى الله عليه وسلم ثم لبث حيث صليت العشآء ثم رجع فلبث حتىٰ تعشى النبى صلى الله عليه وسلم فجآء بعد ما مضىٰ من الليل ماشآء الله قالت له' امراته ما حبسك عن اضيافك او قالت ضيفك قال اوما عشيتهم قالت ابوا حتىٰ تجىٓء قدعرضوا فابوا قال فذهبت انا فاختبات فقال يا غنثر فجدع و سب وقال كلوا لاهنيئا لكم فقال والله لااطعمه' ابداً وايم الله ماكنا ناخذمن لقمة الا ربا من اسفلها اكثر منها قال شبعوا وصارت اكثر مماكانت قبل ذٰلك فنظر اليها ابوبكر فاذا هى كما هى اواكثر فقال لامرأته ياخت بنى فراس ماهذا قالت لا وقرة عينى لهى الأن اكثر منها قبل ذٰلك بثلاث مرارفاكل منها ابوبكر وقال انما كان ذٰلك من الشيطان يعنى يمينه' ثم اكل منها لقمةً ثم حملها الى النبى صلى الله عليه وسلم فاصبحت عنده' و كان بيننا و بين قوم عقد فمضى الاجل ففرقنا اثنى عشر رجلاً مع كل رجل منهم اناس والله اعلم كم مع كل رجل فاكلوا منها اجمعون او كماقال

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ روایت کرتے ہیں کہ اصحابِ صفہ غریب لوگ تھے، اور نبی کریم ﷺ نے فرمادیا تھا کہ جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو، وہ تیسرے کو (ان میں سے) لے جائے، اور اگر چار ہوں، تو پانچواں یا چھٹا (ان میں سے لے جائے) حضرت ابوبکر تین آدمی لے آئے، اور نبی کریم ﷺ دس لے گئے، عبدالرحمٰنؓ کہتے ہیں کہ ہم تھے، اور ہمارے باپ تھے، اور ہماری ماں تھیں، اور میں نہیں جانتا، کہ آیا انہوں نے یہ بھی کہا (یا نہیں) کہ میری بی بی اور ہمارا خادم بھی تھا، جو ہمارے گھر اور ابوبکرؓ کے گھر میں مشترک تھا (ایک روز) ابوبکرؓ نے حضور اکرم ﷺ کے یہاں شام کا کھانا کھایا، اور آکر ہمارے گھر میں رہے اتنی دیر کہ عشا کی نماز بھی ہو چکی، پھر حضور کی خدمت میں گئے اور

اتنے ٹھہرے کہ آں حضرت علیہ نے کھانا بھی تناول فرمالیا، اسکے بعد (اپنے گھر میں) آئے ان سے ان کی بی بی نے کہا کہ تمہیں تمہارے مہمانوں سے کس نے روک لیا، یا یہ کہا کہ تمہارے مہمان سے، وہ بولے، کیا تم نے انہیں کھانا نہیں کھلایا، انہوں نے کہا، آپ کے آنے تک ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا کھانا ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا، مگر انہوں نے نہ مانا، عبدالرحمٰنؓ کہتے ہیں کہ میں تو (مارے خوف کے) جا کر چھپ گیا (چنانچہ) ابوبکرؓ (نے غصہ میں) یا غنثر (کہہ کر) پکارا اور بہت کچھ سخت سست مجھے کہہ ڈالا، اور کہا، تمہیں گوارہ نہ ہو کھاؤ۔ اس کے بعد کہا، کہ اللہ کی قسم! میں ہرگز نہ کھاؤں گا، کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! ہم جب کوئی لقمہ لیتے تھے تو اس کے نیچے اس سے زیادہ بڑھ جاتا تھا، عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ مہمان سب آسودہ ہو گئے۔ اور کھانا جس قدر کہ پہلا تھا اس سے زیادہ رہ گیا، تو ابوبکرؓ نے اس کی طرف دیکھا وہ اسی قدر تھا، جیسا کہ پہلے تھا، یا اس سے بھی زیادہ تو اپنی بی بی سے کہا، کہ اے بنی فراس کی بہن! یہ کیا ماجرا ہے (وہ بولیں) کہ اپنی آنکھ کی ٹھنڈک کی قسم یقیناً یہ اس وقت پہلے سے تگنا ہے، پھر اس میں سے ابوبکرؓ نے کھایا، اور کہا، یہ قسم شیطان ہی کی طرف سے تھی، بالآخر اس میں سے ایک لقمہ انہوں نے کھالیا اس کے بعد اسے نبی کریم علیہ کے پاس اٹھالے گئے، وہ صبح تک آپ کے پاس رہا، اور ہمارے اور ایک قوم کے درمیان میں کچھ عہد تھا۔ اس کی مدت گذر چکی تھی، تو ہم نے بارہ آدمی علیحدہ علیحدہ کر دیئے، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کچھ کچھ آدمی تھے۔ غرض اس کھانے سے سب نے کھالیا (یا عبدالرحمٰن نے جیسا کچھ بیان کیا ہو)

تشریح: یہ حدیث الباب طویل ہے اور اس میں راویوں سے تقدیم و تاخیر بھی ہوگئی ہے۔ مسلم شریف کتاب الاطعمہ ص ۲/۱۸۵ میں بھی یہ حدیث ہے اور اس کے ساتھ والی دوسری حدیث بھی زیر نظر رکھی جائے، ابوداؤد کتاب الایمان والنذ ور ص ۲/۱۱۵ میں بھی یہ حدیث ہے، علامہ نوویؒ نے لکھا کہ اس حدیث میں اختصار ہے اور حذف نیز تقدیم و تاخیر بھی ہے۔ جس کی وضاحت وصحت اگلی دوسری روایت سے ہوتی ہے، مسلم کی حدیث میں ثم رجع فلبث کے بعد حتی تعشی النبی علیہ کی جگہ حتی نعس النبی علیہ ہے (نبہ علیہ العینی فی العمدہ ص ۲/۶۱۴) اور وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اگرچہ ہم نے ترجمہ روایت بخاری کے مطابق کیا ہے۔ اور ضمیروں کے مراجع ہم نے عمدۃ القاری سے متعین کئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

افادات عینیؒ: (۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب لوگوں پر رزق کی تنگی ہوگئی ہو تو حاکم وقت ان کی کفالت بقدر وسعت وگنجائش دوسرے لوگوں کے ذمہ کر دے اور حضور علیہ السلام نے کم افراد والے کنبہ اور زیادہ والے کو برابر اس لئے کیا کہ زیادہ افراد والے خود ہی پہلے سے زیر بار ہوتے ہیں اور ان کو اپنے عیال کا خیال بھی زیادہ رکھنا چاہیئے، یہ ہدایت تو دوسروں کے لئے تھی، مگر خود حضور علیہ السلام جن پر دس افراد کا بوجھ پہلے سے ہی تھا، پھر بھی آپ نے ایثار کر کے دوسرے دس آدمیوں کا بوجھ اٹھایا، اور حضرت ابوبکرؓ نے تین کی ذمہ داری لی، جبکہ ہدایت نبوی صرف یہ تھی کہ ہر کنبہ والا صرف ایک ایک آدمی کو ساتھ لے جائے اور کھلائے۔ حضرت عمرؓ نے قحط کے سال ہر گھرانہ پر گھر کے افراد کے برابر لوگوں کی ذمہ داری سونپی تھی، اور فرمایا تھا کہ کوئی قوم آدھی خوراک کھانے کی وجہ سے ہلاک نہیں ہوسکتی۔ علامہ عینی نے فرمایا کہ بیشتر علماء کی رائے یہ ہے کہ زکوۃ کے سوا بھی مال میں دوسرے ناداروں کے حقوق وابستہ ہیں۔ (۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رئیس قوم کے ساتھ کھانا بہتر ہے اگرچہ گھر پر مہمان بھی ہوں، جبکہ گھر پر مہمانوں کی خدمت کرنے کرنے والا موجود ہو، جس طرح حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے گھر پر موجود تھے اور آپ نے ان کو مہمانوں کی خبر گیری کی تاکید بھی کر دی تھی۔ (۳) گھر کے لوگوں کو خود بھی چاہیے کہ وہ صاحب منزل کی طرح اس کے مہمانوں کا خیال رکھیں۔ (۴) مہمانوں کو چاہیے کہ وہ صاحب منزل کا ادب و لحاظ کریں اور کھانے پر بھی اس کا انتظار کریں، اس کے بغیر کھانے کی حرص نہ کریں، (۵) حضرت ابوبکرؓ کی خاص شان حب نبوی و مصاحبت نبوی کی معلوم ہوئی کہ وہ دن ورات کا اکثر حصہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ گذارتے تھے (۶) کوئی بابرکت چیز گھر میں آئے تو وہ اہل علم و فضل کے پاس بھیجی جائے، جس طرح حضرت ابوبکرؓ نے اس برکت

والے کھانے کو حضور علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا۔ (۷) اس حدیث سے حضرت ابوبکرؓ کی کرامت بھی ثابت ہوئی، اور معلوم ہوا کہ اولیا کی کرامات حق ہیں، یہی مذہب اہل سنت کا ہے (۸) کسی تقصیر پر خوف و ڈر کے سبب اپنے والد یا بڑے سے چھپ جانے کا جواز بھی معلوم ہوا کہ حضرت عبدالرحمٰن بھی چھپ گئے تھے (۹) اولاد کو غصہ کی حالت میں کسی تقصیر پر برا بھلا کہنے کا بھی جواز نکلا (۱۰) قسم بغیر اللہ کا جواز بھی معلوم ہوا۔ (۱۱) اگر قسم کسی نا روایات پر اٹھائی ہو تو اس کو توڑنے کا استحسان بھی معلوم ہوا۔ (۱۲) اگلے دن کے لئے کھانا رکھنے کا جواز بھی معلوم ہوا۔ (۱۳) اگر صاحب منزل نے ہدایت کردی ہو تو مہمانوں کو اس کی غیر موجودگی میں کھانا کھالینا چاہیے، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ مہمانوں کے نہ کھانے پر ناخوشی کا اظہار فرمایا۔ (۱۴) اس حدیث سے کسی عذر کے تحت ترک جماعت کا جواز بھی معلوم ہوا کیونکہ **ثم لبث** (ای فی دارہ) **حتی صلیت العشاء ثم رجع الی رسول اللہ** ﷺ وارد ہوا (عمدہ ص ۲/۶۱۶) غالباً حضرت ابوبکرؓ کا عذر یہ تھا کہ وہ مہمانوں کی دلداری یا ان سے ضروری باتوں کے لئے گھر پر ٹھیرے رہے تا آنکہ جماعت عشاء ہو چکی، تب حضور علیہ السلام کی خدمت میں پھر حاضر ہوئے، اور **ثم رجع** کی جگہ صحیح اسماعیلی میں **ثم رکع** ہے، شاید اس سے مراد عشاء کی نماز ہو جو گھر پر پڑھ کر حضرت ابوبکرؓ حضور کی خدمت میں گئے ہوں گے۔ واللہ تعالےٰ اعلم۔

افاداتِ انورؒ: (۱) فرمایا:۔ اس حدیث میں حلف بغیر اللہ ہے، حالانکہ دوسری حدیث میں اس کی ممانعت وارد ہے اس کے بارے میں سب سے بہتر تحقیق جواب صرف علامہ چلپیؒ نے مطول کے حاشیہ میں لکھا ہے، مطول کے خطبہ میں ولعمری آ گیا ہے، اس پر اسی اعتراض کے دفعیہ میں لکھا کہ ممنوع وہ ہے جو مشروع طریقہ پر ہو اور اس سے مقصود مقسم بہ کی تعظیم ہو یا عدم حنث کے لئے ہو، اور جو لغوی ہو، محض تقویتِ کلام کے لئے وہ ناجائز و ممنوع نہیں ہے۔ بشرطیکہ سامع کو مغالطہ نہ ہو، کیونکہ جہاں مغالطہ میں پڑنے کا خطرہ ہو تو وہ بھی جائز نہیں ہوگا، جیسے قرآن مجید میں صحابہ کو **راعنا** کہنے سے روک دیا گیا۔ یا جیسے دلائل الخیرات میں ہے **حتی لایبقی من علمک شیء** میرے نزدیک یہ الفاظ درست ہیں۔ مگر ابن سعودؒ نے دلائل کا داخلہ حجاز میں بند کر دیا کہ یہ شرک و کفر ہے، غالباً سلف کے اذہان میں بھی یہ لغوی یمین ہی تھی، جو بمعنی استشہاد تھی، اس لئے اگر نحوی اس کا یہی نام رکھ دیتے تو اچھا تھا تا کہ یمین شرعی و فقہی سے ممتاز ہو جاتی، لہٰذا کوتاہی نام میں ہوئی، حقیقت حلف میں نہیں، مگر کچھ لوگوں سے ذہول و غفلت ہوئی اور انہوں نے یمین لغوی پر بھی یمین شرعی کے احکام جاری کر دیئے۔ حالانکہ خود حضور علیہ السلام سے بھی چار جگہ یہ یمین لغوی یا حلف بغیر اللہ وارد ہے، (۱) قصۂ افک میں (۲) افلح وابیہ ان صدق میں، اور جو تاویلات ورب ابیہ وغیرہ سے کی گئی ہیں وہ غلط ہیں (۳) **لا ازید ولا انقص** والی حدیث میں (۴) اسی حدیث میں شوکانی نے جواب دیا کہ حضور علیہ السلام سے بطور سبقت لسانی کے ایسے کلمات قسم کے نکل گئے ہیں، میں نے کہا کہ ہاں! یہی موقع تھا سہو کا جو شرک و کفر کا مقام ہے۔

(۲) فرمایا:۔ بعض چیزیں فی نفسہ جائز ہوتی ہیں، مگر وہ اس لئے ممنوع ہو جاتی ہیں کہ ان سے دوسری غلط جانب کا ایہام و احتمال ہوتا ہے اس لئے ان کو نہ مطلقاً ممنوع ہی کہہ سکتے ہیں نہ کلیتہً جائز ہے۔ مفتی کا فرض ہے کہ وہ دیکھے، اگر ضرر شرعی پائے تو روک دے اور اگر نہ پائے تو جواز پر باقی رکھے، اس باب کی طرف قرآن مجید میں بھی تعرض کیا گیا ہے، چنانچہ **راعنا** کے فی نفسہ جائز ہونے کے باوجود یہود کے ایہام کی وجہ سے روک دیا گیا، لہٰذا جب یہ مانع نہ رہے گا تو پھر جواز علی الاطلاق کا حکم لوٹ آئے گا۔ اسی طرح کنز کے باب الحظر والاباحۃ میں ہے۔ حاصل یہ کہ جہاں مغالطہ نہ ہو وہاں جائز ہی ہوگا۔

(۳) فرمایا:۔ میرے نزدیک یا شیخ عبدالقادر جیلانی! **شیئاً للہ** کہنا اس کے لئے درست ہے جو شیخ عبدالقادر کو عالم الغیب اور قادر نہ مانتا ہو، **الا ان یشاء اللہ** کہ وہ علم بھی دے سکتا ہے اور امداد بھی کرا سکتا ہے اور یہ جائز ہی ہے، مگر عام طور سے فساد عقیدہ اور مغالطہ پڑنے کی وجہ سے روکا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ کوئی شرعی وظیفہ نہیں ہے کہ اس کی تسبیح پڑھی جائے اگر کوئی ایک ہزار بار بھی اس کا ورد کرے گا تو گھاس کے تنکے کے برابر بھی ثواب نہ ملے گا۔ اگرچہ معصیت بھی نہیں ہے اگر عقیدہ صحیح ہو۔

میں تو کہتا ہوں کہ فتاویٰ خیریہ میں مذکور ہے کہ ذکر اللہ کے سوا کوئی ذکر بھی موجب ثواب نہیں ہے، حتی کہ محمد محمد کے ورد اور تکرار میں بھی ثواب تھا آپ پر درود شریف بھیجنے میں ہے، یا آپ کے ذکر سیرت وغیرہ میں۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ حافظ ابن تیمیہ نے اللہ، اللہ کے ذکر منفرداً کو بھی بلا اجر قرار دے دیا اور یہ ان کی بڑی غلطی ہے، اس بارے میں انوارالباری کی سابق جلد میں لکھا گیا ہے)

(۴) فرمایا: ۔مورخ ابن خلکان نے محمود غزنوی کو ''امی محض'' لکھا، اور یہ بھی کہ اس کے سامنے قفال شافعی نے حنفیہ کی نماز کا ڈراما کیا۔ حنفی نماز کے لئے نبیذ سے وضو کیا م تعدیل ارکان نہ کی اور بجائے سلام کے عمداً حدث کر کے نماز ختم کر دی اس پر محمود شافعی ہو گیا، پھر کچھ عرصہ کے بعد ایک حنفی نے شافعی نماز دکھلائی، دو مٹکے پانی میں بہت سی نجاست ڈالی پھر اس سے وضو کیا اور نماز شافعی طریقہ پر پڑھی، تو وہ اس سے متنفر ہو گیا۔ ملا علی قاری وغیرہ نے جوابات لکھے ہیں حنفیہ کی طرف سے میں نے جواب دیا کہ جو باتیں حنفی نماز میں مخالفین نے دکھلائی ہیں اور ان کو نمایاں کیا ہے وہ سب فقہ حنفی میں بھی مکروہ تحریمی ہیں، لیکن فقہائے حنفیہ کی غلطی ہے کہ مکروہ کے لئے بھی جائز اور صحیح لکھ دیتے ہیں، ان کے ایسے تجوزات نے ہی اس قدر مغالطے ڈال دیئے ہیں، مثلاً ہدایہ میں لکھدیا کہ جس نے ختم نماز پر حدث عمد کیا تو نماز صحیح ہو گئی، حالانکہ وہ مکروہ تحریمی ہے، اصحاب متون صرف صحیح وجائز لکھدیتے ہیں، پھر شروح میں مکروہ تحریمی لکھا ہوا ملتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے سینکڑوں اعتراض کئے ہیں اور باقی تینوں مذاہب والے بھی اعتراض کرتے ہیں، کیونکہ ان کے یہاں فرق کیا ہے الفاظ میں۔ پس اگر فقہاء حنفیہ بھی جواز وصحت کا اطلاق کراہت پر نہ کرتے تو ہم پر بہت سے اعتراضات نہ ہو سکتے۔ ان کی اس تقصیر اور صحیح وجائز کہنے کی وجہ سے ہم پر بہت سی نصوص ممانعت کی مخالفت کا اعتراض بھی ہوا ہے، اگر مکروہ کہدیا جاتا تو وہ اعتراض نہ پڑتا۔ کیونکہ ظاہر الفاظ سے کراہت کی بھی نفی معلوم ہوتی ہے۔ دوسرا جواب میرا یہ ہے کہ طبقات شافعیہ کا درجہ گرا ہوا ہے، کیونکہ اس میں بہت ہی نادر ہے کہ کسی محدث سے کوئی نل ہو اور طبقات حنفیہ لکھنے والا محدث ہے، اس میں ہے کہ محمود غزنوی بڑا فقیہ عالم اور حنفی تھا، اس نے مسائل حنفیہ میں کتاب بھی لکھی ہے، لہٰذا اس کو جاہل وامی لکھنے والے کی غلطی ہے، اور اس کا شافعی ہو جانا بھی غلط ہے، میں نے تینوں مذاہب کے طبقات کا مطالعہ کیا ہے، اور میرے نزدیک طبقات حنفیہ سب میں زیادہ قابل وثوق اور پکی ہے، دوسری کچی ہیں۔

افادۂ علامہ کوثریؒ: آپ نے اپنی جلیل القدر تالیف تانیب الخطیب ص۸ لکھا کہ ایک عرصۂ مدید تک مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار رہے، کیونکہ ان سب کے اصول ومبادی کا سرچشمہ واحد اور اتجاہات میں یکسانیت تھی، سب کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ خلوص وللّٰہیت تھی، اس کے بعد کچھ شر پسندوں نے جن کے پیشوا حشویہ مبتدعہ رواۃ تھے، دراندازی کر کے تعلقات بگاڑے اور فسادات کرائے، عوام کو بھڑکایا اور امام ابوحنیفہ واصحاب کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کیا گیا، (جیسا کہ آج کے غیر مقلدین بھی کرتے ہیں، اس کے بعد علامہ کوثریؒ نے شیخ طریقہ عراقیہ کا ذکر کیا، پھر قفال مروزی کا ذکر کیا اور لکھا کہ اس نے اپنے فتاوی میں حنفی نماز کا غلط نقشہ کھینچا تھا، اور صاحب مغیث الخلق نے یہ بھی لکھا کہ اس نے سلطان محمود غزنوی مؤلف ''التفرید فی الفقہ الحنفی'' کے سامنے حنفی نماز بھی پڑھ کر دکھائی تھی، پس اگر یہ واقعہ صحیح مان لیا جائے تو گویا ان دونوں شیوخ نے مذہب حنفی کو بدنام کرنے کے لئے یہ سب نئے ڈھنگ اختیار کئے تھے، لیکن صحیح یہ ہے کہ قفال نے صرف اپنے فتاویٰ میں ہی حنفی نماز کی مغالطہ آمیز تصویر دکھائی تھی اور سلطان کے سامنے نماز پڑھ کر نہیں دکھائی تھی، ورنہ اس متدین عالم بادشاہ کی طرف سے اس کو کوڑوں کی سزا ضرور ملتی۔ اور اہل بلاد کے ایک مذہب سے دوسرے کی طرف منتقل ہونے کے افسانے بھی سراسر غلط ہیں، البتہ بعض اہل علم کی روش سے ضرور حیرت ہے کہ انہوں نے مناقب شافعی میں رحلت مکذوبہ اور دوسری من گھڑت وبے سند باتیں بھی امام اعظم وغیرہ کو مطعون کرنے کے لئے چلتی کر دیں، خاص طور سے ابونعیم اور علامہ محدث بیہقی جیسے حضرات کو بھی ان کے زمرہ

میں دیکھ کر بڑی روحانی کوفت بھی ہوتی ہے، باقی ابن الجوینی شافعی، امام غزالی ورازی وغیرہ جن کو نقد روایات میں کوئی درک نہیں ہے، ان کو ایک حد تک معذور سمجھا جاسکتا ہے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ وہ ابونعیم وبیہقی وغیرہ کی وجہ سے دھوکہ میں پڑے ہوں گے۔ الخ پوری کتاب قابل مطالعہ۔ جزی اللہ المؤلف عنا وعن سائر الامۃ خیر الجزاء

کتاب الاذان

(اذان کا بیان)

باب بدء الاذان وقوله تعالیٰ و اذا ناديتم الى الصلوٰة اتخذوها هزوًا ولعبا ذٰلک بانهم قوم لايعقلون و قوله تعالیٰ اذا نودی للصلوٰة من يوم الجمعة

(اذان کی ابتداء کا بیان، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اور جب تم نماز کے لئے اعلان کرتے ہو تو وہ اس سے ہنسی مذاق کرتے ہیں یہ اس سبب سے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول، جب جمعہ کے دن نماز (جمعہ) کی اذان دی جائے)

۵۷۳: حدثنا عمران بن ميسرة قال حدثنا عبدالوارث قال حدثنا خالد عن ابی قلابة عن انس قال ذكروا النار والناقوس فذكروا اليهود والنصارىٰ فامر بلال ان يشفع الاذان وان يوتر الاقامة

۵۷۴: حدثنا محمود بن غيلان قال حدثنا عبدالرزاق قال اخبرنا ابن جريج قال اخبرنی نافع ان ابن عمر كان يقول كان المسلمون حين قدموا المدينة يجتمعون فيتحينون الصلوٰة ليس ينادی لها فتكلموا يوما فی ذٰلک فقال بعضهم اتخذوا ناقوساً مثل ناقوس النصارىٰ وقال بعضهم بل بوقاً مثل قرن اليهود فقال عمر اولاتبعثون رجلاً ينادی بالصلوٰة فقال رسول الله صلے الله عليه وسلم يابلال قم فناد بالصلوٰة

ترجمہ ۵۷۳: ۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ (نماز کے اعلان کے لئے) لوگوں نے آگ اور ناقوس تجویز کیا، پھر یہود ونصاریٰ کی طرف ذہن منتقل ہوگیا (کہ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں) تب بلال کو حکم دیا گیا کہ اذان کے کلمات دودو مرتبہ کہیں اور اقامت کے ایک ایک مرتبہ:۔

ترجمہ ۵۷۴: ۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں، کہ مسلمان جب مدینہ آئے، تو نماز کے لئے، نماز کے وقت کا اندازہ کر کے جمع ہوجاتے تھے، اس وقت تک نماز کے لئے اعلان نہ ہوتا تھا، ایک دن مسلمانوں نے اس بارے میں گفتگو کی (کہ کوئی اعلان ضرور ہونا چاہیئے) بعض نے کہا، کہ نصاریٰ کے ناقوس کی طرح ناقوس بنالو، اور بعض نے کہا نہیں، بلکہ یہود کے سنکھ کی طرح ایک سنکھ بنالو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، کہ کیوں نہیں ایک آدمی کو مقرر کردیتے، کہ وہ الصلوٰۃ (الصلوٰۃ) پکار دیا کرے، پس رسول خدا ﷺ نے فرمایا، کہ اے بلال! اٹھو اور نماز کی اطلاع کردو۔

تشریح: اذان کے معنی اطلاع اور خبر دینے کے ہیں، معروف اذان بھی چونکہ وقت نماز کی خبر دیتی ہے، اس لئے اس کو اذان کہتے ہیں، نماز اگرچہ مکہ معظمہ میں پانچ وقت کی فرض ہوچکی تھی۔ مگر وہاں اذان وغیرہ کے ذریعہ تشہیر نہ ہوسکتی تھی مدینہ طیبہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد پہلے ہی سال میں زیادہ ہوگئی تو جماعت کے لئے اجتماع کی صورت کیا ہو، اس کے لئے حضور علیہ السلام نے صحابہ سے مشورہ کیا، اور ابتداء میں حضرت عمرؓ کی رائے سے حضرت بلالؓ کو "الصلوٰۃ جامعۃ" کے ذریعہ لوگوں کو خبر دینے کا حکم نبوی ملا، پھر حضرت عبداللہ بن زیدؓ کو خواب میں اذان کی موجودہ صورت اور کلمات بتلائے گئے، دوسرے صحابہ حضرت عمرؓ وغیرہ نے بھی خواب میں اسی طرح دیکھا مگر حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے سب سے پہلے حضور علیہ السلام کو خبر دی تھی، اور جب حضور علیہ السلام کے حکم سے پہلی اذان دی گئی تو حضرت عمرؓ نے اس کو سن کر بتلایا کہ میں نے بھی اسی طرح خواب دیکھا تھا۔ ایک

روایت مراسیل ابی داؤد اور مصنف عبدالرزاق کی یہ بھی ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے حضور علیہ السلام سے اپنا خواب بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلے وحی الٰہی بھی اسی کے مطابق آچکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے اذان موجودہ کا فیصلہ وحی کے ذریعہ ہوا تھا، اور امام بخاریؒ نے جو ترجمۃ الباب میں پہلے دو آیتوں کو ذکر کیا، اس سے بھی اشارہ تقدم وحی کا مل سکتا ہے، دوسرے حضرات جو حضرت عبداللہ بن زیدؓ کے خواب کو سب سے مقدم کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس خواب کی تائید وحی کے ذریعہ ہوئی اور امام بخاری نے تقدم کی وجہ سے نہیں بلکہ تبرک کے لئے آیات ذکر کی ہیں، جس طرح ان کی عادت ہے کہ تراجم میں آیات کو استدلال یا استبراک کے لئے بھی ذکر کیا کرتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حکم اذان اور مسئلہ ترجیع

اذان نماز جماعت کے لئے سنت موکدہ ہے، شیخ ابن ہمام نے جو وجوب کا درجہ سمجھا ہے، وہ صحیح نہیں، دلائل کی تفصیل فقہ کی کتاب بحر الرائق میں موجود ہے۔ اذان کے کلمات حنفیہ کے نزدیک پندرہ ہیں، امام احمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں، امام شافعی و مالکؒ کے یہاں انیس کلمات ہیں، اس طرح کہ وہ ہر کلمہ شہادت کو پہلے دوبار آہستہ آواز سے اور پھر دوبار بلند آواز سے بتلاتے ہیں، اور یہ ترجیع کہلاتی ہیں یعنی لوٹا کر پڑھنا یہ ترجیع فرشتے کی اذان میں نہیں تھی، جس نے خواب میں حضرت عبداللہ بن زیدؓ کو اذان کی تلقین کی تھی۔ اور نہ اذان بلال میں تھی جو حضور علیہ السلام کی موجودگی میں دس سال تک بلا ترجیع کے ہوتی رہی۔ البتہ حضرت ابومحذورہؓ کی اذان میں تھی؛ جس کی وجہ خاص تھی، اس لئے اس کو اذان کی صفت نہیں بنا سکتے۔ باقی اگر کوئی کرلے تو گناہ بھی نہیں، مباح ہے، نہ سنت ہے نہ مکروہ (کمافی البحر) حضرت شاہ صاحبؒ نے اسی فیصلہ کو ترجیح دی ہے، اور صاحب النہر نے ترجیع کو کراہتِ تنزیہی قرار دیا ہے جس کو مولانا عبدالحی لکھنوی نے اختیار کیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ترجیع کا انکار یا تاویل درست نہیں کیونکہ وہ مکہ معظمہ میں رہی ہے اور حضرت امام شافعیؒ کے زمانہ تک بھی باقی تھی، اسی لئے انہوں نے اس کو اختیار کیا تھا، اور اختلاف صرف افضلیت کا ہے، جواز عدم جواز کا نہیں ہے۔

مسئلہ اقامت: امام اعظمؒ کے نزدیک اقامت بھی اذان کی طرح ہے بجز اضافت قد قامت الصلوۃ کے، باقی تینوں ائمہ بجز قد قامت الصلوۃ کے ایتار (ایک ایک بار) کے قائل اور امام مالکؒ اس کلمہ میں بھی ایتار کہتے ہیں، اس طرح ہمارے یہاں اقامت کے کلمات سترہ، امام احمد و شافعی کے نزدیک گیارہ اور امام مالک کے یہاں دس ہوئے، ہماری دلیل حضرت ابومحذورہؓ کی اقامت ہے کہ وہ ہر کلمہ کو دو دو بار کہتے تھے، اور ابوداؤد میں فرشتے کی اقامت بھی دو دو بار کی ہے اور بعض طرق میں جو ایک بار کا ذکر ہے، وہ بھی معہود دو بار پر محمول ہوگا کیونکہ واقعہ ایک ہی ہے اور امام طحاویؒ نے حضرت بلالؓ سے بھی اقامت دو بار نقل کی ہے۔ جس کو محقق امت شیخ تقی الدین بن دقیق العیدؒ نے بھی قبول کیا ہے کمافی الزیلعی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک حضرت بلالؓ سے ایتار اور ثنی دونوں ثابت ہیں، اور شیخ نورالدین طرابلسیؒ نے (جو ابن الہمام سے متاخر ہیں) ایتار کو بیان جواز پر محمول کیا ہے کیونکہ اکثر تو ثنی ہی ہوگا، کبھی کبھی ایتار بھی ہوا ہوگا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ان کے علاوہ حنفیہ میں سے کسی سے میں نے جواز ایتار کی صراحت نہیں دیکھی پھر فرمایا کہ احادیث دونوں قسم کی ثابت ہیں، اس لئے میں مثنویت کو ترجیح نہیں دے سکا اور فرمایا کہ امام بخاریؒ نے حنفیہ کی اذان اور شافعیہ کی اقامت کو اختیار کیا ہے، حنفیہ کہا کرتے ہیں کہ ہم نے اذان بلالؓ کی اور اقامت ابومحذورہؓ کی لی ہے۔ میرے نزدیک یہ ٹھیک نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہر دو چیزیں نازل من السماء فرشتے کی بھی ہیں، امام ترمذیؒ نے مستقل باب الاقامہ مثنی مثنی کا بھی قائم کیا ہے اور حدیث ذکر کی ہے۔ معارف السنن ص ۱۸۸/۲ میں اس پر پوری بحث کی گئی ہے۔

شیخ نورالدین، طرابلسی کا تذکرہ موجودہ کتب طبقات حنفیہ میں نہیں ملا۔ البتہ اس ضمن میں حضرت شاہ صاحبؒ نے علامہ محدث توربشتی حنفیؒ کا بھی ذکر کیا، ان کا ذکر حدائق حنفیہ میں ہے اور مولانا عبدالحلیم چشتی دام فضلہم نے فوائد جامعہ ص ۲۰۷ میں اچھی تفصیل و تحقیق کی ہے، لیکن

ص ۲۰۹ میں جو عبارت فیض الباری سے نقل کی ہے اور اس کو حضرت علامہ کشمیریؒ کی طرف منسوب کر کے نقد کیا ہے وہاں کی شان تحقیق و وسعت مطالعہ سے بعید ہے کیونکہ "فیض الباری" حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد مرتب ہو کر شائع ہوئی ہے، جس میں بے شمار غلطیاں ہیں، جن کی حضرتؒ کی طرف نسبت صحیح نہیں، اور وہ مؤلف فیض الباری کے عدم تحقیق و تثبت اور امالی درس کے ضبط کی غلطیاں ہیں۔ اسی لئے رفیق محترم علامہ بنوری دامت برکاتہم نے مقدمہ فیض الباری میں ایسی اغلاط و تسامحات کے بارے میں تنبیہ کر دی تھی تا کہ وہ حضرتؒ کی طرف منسوب نہ ہوں، مگر بہت سے حضرات مقدمہ پر نظر نہیں کرتے، یا حضرت شاہ صاحبؒ کی جلالت قدر سے ناواقف حضرات مؤلف پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر لیتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کی غلطی متعدد اہل علم و صاحب تالیف حضرات کر چکے ہیں۔ اس لئے اب مجھے اس صراحت کے لئے مجبور ہونا پڑا، اور پہلی فیض الباری کی اغلاط سے صرف نظر کرتا تھا، اب مجبوری و ضرورت سے اہم مواضع میں نشان دہی کے ساتھ غلطیوں پر تنبیہ بھی کرنے لگا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنی وسعت علم و فضل کے لحاظ سے نمود سلف تھے، اور درس میں نہایت اختصار کے ساتھ بقدر ضرورت اور طلبہ کی محدود استعداد کے مطابق بولتے تھے اور اپنی مکمل و مدلل تحقیقات کے لئے فرمایا کرتے تھے کہ میری یادداشتوں کے تین بکس گھر پر ہیں، یقیناً درس میں جتنا وہ فرماتے تھے، وہ بھی اس دور کے ہر درس حدیث پر فائق تھا، مگر تالیف کا میدان بڑا وسیع ہے، اس کے لئے حضرتؒ کی یادداشتوں کی بھی ضرورت تھی، جو افسوس ہے کہ گھر والوں کی ناقدری کے سبب ضائع ہو گئیں۔ مقدرات میں کسی کا چارہ نہیں۔ ان یادداشتوں میں حضرتؒ کی چالیس سالہ تحقیقات عالیہ نادرہ موجود تھیں، اور اب جو کچھ ہمارے پاس ہیں اس کی حیثیت "جهد المقل دموعه" سے زیادہ نہیں ہے۔ والی اللہ المشتکی۔

باب الاذان مثنٰی مثنٰی

اذان کے الفاظ دو دو بار کہنے کا بیان

۵۷۵: حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا حماد بن زید عن سماک ابن عطیة عن ایوب عن ابی قلابة عن انسؓ قال امر بلال ان یشفع الاذان و ان یوتر الاقامة

۵۷۶: حدثنا محمد هو ابن سلام قال حدثنا عبدالوهاب الثقفی قال حدثنا خالد ن الحذآء عن ابی قلابة عن انس بن مالک قال لما کثر الناس قال ذکروا ان یعلموا وقت الصلوٰة بشیء یعرفونه فذکروا ان یوروا نارا او یضربوا ناقوسا فامر بلال ان یشفع الاذان و ان یوتر الاقامة

ترجمہ ۵۷۵: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت بلالؓ کو یہ حکم دیا گیا تھا، کی اذان (میں) جفت (کلمات) کہیں، اور اقامت (میں) سوائے قد قامت الصلوٰۃ کے طاق رکھیں۔

ترجمہ ۵۷۶: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ جب لوگ زیادہ (مسلمان) ہوئے، تو انہوں نے تجویز کی کہ نماز کے وقت کی کوئی ایسی علامت مقرر کر دیں، جس سے وہ پہچان لیا کریں (کہ اب نماز تیار ہے) لہٰذا بعض نے کہا، کہ آگ روشن کر دیں، یا ناقوس بجا دیں، تو بلالؓ کو حکم دیا گیا کہ وہ اذان (میں) جفت (کلمات) کہیں، اور اقامت میں طاق۔

تشریح: اس باب میں امام بخاریؒ نے اذان کے بارے میں حنفیہ کی موافقت کی ہے، جس کی تفصیل ہم پہلے کر چکے ہیں۔

باب الاقامة واحدة الا قوله' قدقامت الصلوٰة

۵۷۷: حدثنا علی بن عبدالله قال حدثنا اسماعیل بن ابراهیم قال حدثنا خالد الحذآء عن ابی قلابة عن انسؓ قال امر بلال ان یشفع الاذان و ان یوتر الاقامة اسمٰعیل فذکرته لایوب فقال الا الاقامة

ترجمہ: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں، کہ بلال کو حکم دیا گیا کہ وہ اذان (میں) جفت (کلمات) کہیں، اور اقامت (میں) طاق اسمٰعیل (راوی حدیث) کہتے ہیں میں نے ایوب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا (ہاں) اقامت اکہری ہونی چاہیے، البتہ قد قامت الصلوۃ (دومرتبہ کہا جائے)

تشریح: امام بخاریؒ نے اقامت کے بارے میں شافعیہ کی موافقت کی ہے، اس کی تفصیل اور دلیل بھی پہلے ذکر ہوئی۔

باب فضل التاذین

۵۷۸: حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابی الزنادعن الاعرج عن ابی هریرة ان النبی صلی الله علیه وسلم قال اذانودی للصلوٰة ادبر الشیطان له' ضراط حتیٰ لایسمع التاذین فاذا قضی الندآء اقبل حتیٰ اذاثوب بالصلوٰة ادبر حتی اذا قضی التثویب اقبل حتی یخطربین المرء و نفسه یقول اذکر کذااذکر کذالما لم یکن یتکر حتیٰ یظل الرجل لایدریٰ کم صلے

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب نماز کی اذان کہی جاتی ہے، تو شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے (اور مارے خوف کے) وہ گوز مارتا جاتا ہے، اور اس حد تک بھاگتا چلا جاتا ہے کہ، اذان کی آواز نہ سنے جب اذان ختم ہوجاتی ہے، تو پھر واپس آجاتا ہے، یہاں تک کہ جب نماز کی اقامت کہی جاتی ہے، تو پھر پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے، حتیٰ کہ جب اقامت ختم ہوجاتی ہے تو پھر واپس آجاتا ہے، تاکہ آدمی کے دل میں وسوسے ڈالے، کہتا ہے کہ فلاں بات یاد کر فلاں بات یاد کر، وہ (تمام) باتیں جو اس کو یاد نہ تھیں (یاد دلاتا ہے) یہاں تک کہ آدمی بھول جاتا ہے، کہ اس نے کس قدر نماز پڑھی:۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بظاہر اذان کی فضیلت نماز سے بھی بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، مگر واقعہ یہ کہ ہر عمل کے خواص الگ ہوتے ہیں، اذان میں چونکہ اعلان ہے شہادتین کا اور احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ موذن کی شہادت کی گواہی ہر خشک وتر چیز اور جن وانس دیں گے، شیطان کو یہ گوارا نہیں کہ کوئی بھی کسی مومن کے ایمان وشہادت کی گواہی دے، چہ جائیکہ ساری مخلوق موذن کے لئے گواہ بنے گی، اس لئے وہ اذان سن کر بری طرح خائب وخاسر اور ذلیل ورسوا ہوتا ہے، اور اس کو سننے کی تاب نہ لاکر اس سے اتنی دور بھاگتا ہے کہ آواز نہ سن سکے۔ مسلم شریف وغیرہ میں ہے کہ روحا تک چلا جاتا ہے جو مدینہ سے ۳۶ میل دور ہے۔ لیکن نماز کے اندر اگرچہ وہ افضل عبادات ہے یہ خاصہ نہیں ہے، کیونکہ وہ خدا کی مناجات وسرگوشی ہے، اس میں اعلان کی صورت نہیں، اس لئے شروع ہوتے ہی شیطان لوٹ آتا ہے اور اس میں طرح طرح سے خلل اندازی کرتا ہے، وسوسے ڈالتا ہے، خیالات کو افعال صلوۃ سے ہٹا کر ادھر ادھر کرنے کی سعی کرتا ہے، حتیٰ کہ جو بات یاد کرنے سے بھی یاد نہ آتی ہو، نماز میں اس کو بھی یاد دلا دیتا ہے، اور اسی لئے امام اعظمؒ کا واقعہ ہے کہ کوئی شخص گھر کا اپنا دفینہ بھول گیا، کسی طرح یاد نہ آتا تھا کہ کس جگہ دفن کیا ہے۔ امام صاحب سے عرض کیا، آپ نے فرمایا گھر جا کر رات بھر نفلیں پڑھ اور خیال رکھنا کہ بجز نماز کے اور کسی دنیا کی بات کی طرف دھیان ہرگز نہ ہو، اس نے اس طرح کیا تو شیطان نے یہ سوچ کر کہ یہ تو ساری نفلیں اور وہ بھی اس شان سے پڑھ کر جو امام صاحب نے بتلائی ہیں، خدا کا ایک ہی رات میں مقرب ترین بندہ بن جائے گا، اس کو جلد ہی وہ دفینہ کی جگہ یاد دلا دی، اور اس نے نماز ختم

کر کے اس جگہ کو کھودا تو وہ دفینہ نکل آیا۔ امام صاحبؒ کی اس منقبت کے واقعہ کو حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح الباری ص ۲/۵۸ میں قولہ لـمـا لـم یکن یذکر کے تحت ذکر کیا ہے، جس کو نقل کر کے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حافظ کا بھی عجیب حال ہے کہ جب مسائل فقہی کی ابحاث آتی ہیں تو حنفی مسلک کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور رجال حنفیہ کو بھی گرانے کی سعی ہمیشہ کرتے ہیں، اور امام صاحب کی بزرگی و بڑائی ثابت کرنے کے لئے ایسی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جو علوم امام اعظم کے مقابلے میں کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتیں۔

باب رفع الصوت بالندآء وقال عمر بن عبدالعزیز اذن اذاناً سمحاً والا فاعتزلنا

(اذان میں آواز بلند کرنے کا بیان' اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے (اپنے موذن سے) کہا تھا' کہ صاف اور سیدھی اذان کہو ورنہ دور ہو جاؤ)

حافظ نے اذان کی فضیلت کے بارے میں ۵۔۶ اقوال ذکر کئے ہیں اور علامہ عینیؒ نے بھی اذان و موذن کی فضیلت میں بہت سی احادیث ذکر کی ہیں۔ (فتح ص ۲/۵۸، عمدہ ص ۲/۶۳)

حافظ نے علامہ ابن الجوزی کا یہ قول بھی ذکر کیا کہ اذان کے لئے خاص ہیبت و رعب ہوتا ہے جس سے شیطان سخت ہیبت زدہ ہو کر بھاگتا ہے کیونکہ اذان ایسی عبادت ہے جس میں کوئی ریا اور غفلت نہیں ہوتی شیطان کے دور ہونے کی وجہ سے، بخلاف نماز کے کہ اس میں شیطان کی دراندازی کے سبب غفلت، ریا اور انواع واقسام کے وساوس ہجوم کرتے ہیں۔

حافظ عینیؒ نے یہ حدیث بھی نقل کی کہ جب کسی بستی میں اذان دی جاتی ہے تو اس دن میں وہ بستی عذاب الٰہی سے محفوظ رہتی ہے، آخر میں حدیث ارشاد للائمہ و مغفرت للمؤذنین ذکر کر کے لکھا کہ اس کی وجہ سے امام شافعیؒ نے اذان کو امامت سے افضل قرار دیا ہے، مگر ہمارے نزدیک امامت افضل، ہے کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کا وظیفہ ہے،

افادات شیخ الحدیث دام ظلہم

آپ نے اوجز ص ۱/۱۸۳ میں لکھا:۔ حدیث نبوی سے بعض سلف نے اذان غیر وقت صلوٰۃ بھی دفع اثرات شیاطین و جنات کے لئے ثابت کی ہے، مسلم شریف میں سہیل بن ابی صالح کی روایت ہے، جس میں انہوں نے کسی نظر نہ آنے والے کی آواز سننے کا ذکر اپنے والد ماجد سے کیا تو فرمایا کہ جب ایسی کوئی آواز سنو تو اذان کہو۔

علامہ ابن عبدالبرؒ نے امام مالکؒ سے نقل کیا کہ زید بن اسلم، معدن بنی سلیم پر عامل بنا کر بھیجے گئے، جہاں لوگوں کو جن ستاتے تھے، جب ان لوگوں نے شکایت کی تو حضرت زیدؒ نے ان کو بلند آواز سے اذان دینے کا مشورہ دیا، انہوں نے ایسا کیا تو پھر ان کو جنوں نے نہیں ستایا۔ حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھوت پریت کا ذکر کیا گیا تو آپ نے بھی اذان کا ہی مشورہ دیا۔

سعایہ میں ہے کہ اذان کی اصل وضع تو نماز ہی کے لئے تھی، پھر وہ دوسرے مواضع میں بھی مستعمل ہوئی، مثلاً ولادت مولود پر دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت مسنون ہوئی، جن، بھوت پریت کا جہاں اثر ہو وہاں بھی اذان دی جاتی ہے، جب سواری کا جانور سرکشی کرے یا کسی بدکردار، بداخلاق آدمی سے واسطہ پڑے تو اس کے کان میں اذان دی جائے، غم زدہ، مرگی کے مریض اور غضبناک آدمی کے لئے بھی اذان اس کے کان میں دینا مفید ہے، لڑائی کے میدان میں جنگ کے وقت، آگ لگ جانے پر اور جنگل میں راستہ گم ہو جانے پر بھی اذان دینی چاہیے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے دس مواقع شمار کئے ہیں۔

۵۷۹: حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن عبدالرحمٰن بن عبدالله بن عبدالرحمٰن بن ابی صعصعة الانصاری ثم المازنی عن ابیه انه' اخبره' ان اباسعید ن الخدری قال له' انی اراک تحب الغنم والبادیة فاذا کنت فی غنمک اوبادیتک فاذنت للصلوٰة فارفع صوتک بالندآء فانه' لا یسمع مدٰی صوت المؤذن جن ولا انس ولا شی الا شهد له' یوم القیمٰة قال ابوسعید سمعته' من رسول الله صلے الله علیه وسلم

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عبدالرحمٰنؒ روایت کرتے ہیں کہ ان سے ابوسعید خدریؓ نے کہا، کہ میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم بکریوں اور جنگل کو پسند کرتے ہو (تو میری ایک نصیحت کو یاد رکھو) جب تم اپنی بکریوں (کے گلہ) میں یا اپنے جنگل میں ہو، اور نماز کے لئے اذان کہو، تو اذان دیتے وقت اپنی آواز بلند کرو، اس لئے کہ مؤذن کی آواز کو جو کوئی جن یا انس یا اور کوئی سنے گا تو وہ اس کے لئے قیامت کے دن گواہی دے گا، ابو سعدی کہتے ہیں کہ میں نے یہ رسول خدا ﷺ سے سنا تھا۔

تشریح: حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سادہ اور رواں اذان کی تلقین فرمائی تا کہ اس میں تصنع اور تغنی کی کیفیت پیدا نہ ہو، جس سے خشوع و خضوع جاتا رہتا ہے۔ بلند آواز کرنے سے نہیں روکا کیونکہ وہ تو مطلوب ہے۔ اسلئے رفع صوت کا حکم جنگل کی اذان میں بھی وارد ہوا، جبکہ وہاں انسان نہ ہوں کیونکہ وہاں بھی جہاں تک آواز پہنچتی ہے، اس کو سننے والے قیامت میں گواہی دیں گے۔ اور موطأ امام مالک میں تو یہ حدیث بھی ہے جو شخص جنگل میں نماز پڑھے تو اس کے دائیں بائیں ہو کر فرشتے بھی ساتھ نماز پڑھتے ہیں، اور اگر اذان و اقامت کہہ کر نماز پڑھے تو اس کے پیچھے پہاڑوں کے برابر کثیر تعداد میں فرشتے جمع ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔ (اوجز ص ۱/۱۹۵)

علامہ باجیؒ نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا جماعت کبیرہ وصغیرہ کے ثواب میں فرق ہے، اور مالکیہ سے جو نقل ہوا کہ ایک شخص اور جماعت کثیرہ کا ثواب برابر ہے، وہ مرجوح ہے، لہٰذا ائمہ ثلاثہ کا مسلک مذکورہ بالا راجح ہے ('') حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ابوداؤد باب فضل المشی الی الصلوة میں بھی حدیث ہے کہ نماز جماعت کا ثواب پچیس گنا ہے اور اگر جنگل میں رکوع وسجود اچھی طرح کر کے پڑھے تو پچاس گنا ثواب ملے گا۔ لیکن یہ امر اتفاقی صورت کے لئے ہے کہ کسی ضرورت سے جنگل جائے یا سفر میں ہو تو ثواب زیادہ حاصل ہوگا یہ نہیں کہ بے ضرورت آبادی کی مساجد جماعت ترک کر کے زیادہ ثواب کے خیال سے جنگل کا رخ کرے اگر ایسا ہوتا تو سلف سے ضرور منقول ہوتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی یہی تحقیق کی ہے۔

باب ما یحقن بالاذان من الدمآء

(اذان سن کر قتال وخونریزی سے رک جانا)

۵۸۰: حدثنا قتبة قال ثنا اسمٰعیل بن جعفر عن حمید عن انس عن النبی صلے الله علیه وسلم انه' کان اذا غزابنا قوماً لم یکن یغیر بناحتیٰ یصبح ویتنظر فان سمع اذا ناکف عنهم وان لم یسمع اذانا اغارعلیهم قال فخرجنا الیٰ خیبر فانتهینا الیهم لیلا فلما اصبح ولم یسمع اذانارکب ورکبت خلف ابی طلحة و ان قدمی لتمس قدم النبی صلے الله علیه وسلم قال فخرجوا الینا بمکاتلهم ومساحیهم فلما راوا النبی صلے الله علیه وسلم قالوا محمد والله محمد والخمیس قال فلمارآهم رسول الله صلے الله علیه وسلم قال الله اکبر الله اکبر خربت خیبر انآ اذا نزلنا بساحة قوم فسآء صباح المنذرین

ترجمہ: حضرت انسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب آپ ہمارے ساتھ کسی قوم سے جہاد کرتے تو ہم سے لوٹ مار نہ کرواتے

تھے، یہاں تک کہ صبح ہو جاتی، اور آپ انتظار کرتے۔ اگر اذان سن لیتے، تو ان لوگوں (کے قتل) سے رک جاتے اور اگر اذان نہ سنتے تو ان پر حملہ کرتے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں، ہم خیبر کی طرف (جہاد کو) نکلے تو ہم رات کو ان کے قریب پہنچے، جب صبح ہو گئی، اور آپ نے اذان نہ سنی، تو سوار ہو گئے، اور میں ابوطلحہؓ کے پیچھے سوار ہو گیا میرا پیر نبی کریم ﷺ کے پیر کو چھو رہا تھا، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ خیبر کے لوگ اپنے تھیلے اور پھاوڑے لئے ہوئے ہماری طرف آئے اور جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا، تو کہنے لگے کہ "محمد اللہ کی قسم محمد اور اس کا لشکر" (آ گئے) حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب ان کو رسول خدا ﷺ نے دیکھا تو فرمایا، کہ اللہ اکبر! اللہ اکبر! خیبر برباد ہو گیا، بے شک جب ہم کسی قوم کے میدان میں (بقصد جنگ) اترتے ہیں، تو ان ڈرائے ہوؤں کی صبح خراب ہو جاتی ہے:۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ جس طرح اسلام کا اظہار قول اور شہادت توحید و رسالت سے ہوتا ہے، اسی طرح ہمارے نزدیک عمل سے بھی ہوتا ہے، چنانچہ کسی کافر اصلی کو اگر اذان پڑھتے سنیں گے خواہ وہ شہادتین ادا نہ کر رہا ہو تب بھی اس کو قتل کرنا جائز نہ ہوگا، پھر جب تک اس سے کوئی کفر کا عمل نہ دیکھیں گے اس کو مسلمان ہی سمجھیں گے۔ نماز کے بارے میں اختلاف ہے کہ اگر جماعت کے ساتھ پڑھتے دیکھا تو اس کو بھی قتل کرنا جائز نہ ہوگا ورنہ جائز ہوگا۔ وجہ یہ کہ اذان قولی شہادت ہے اور یہ عملی۔ لہٰذا شبہ پڑ گیا جو نماز جماعت کی وجہ سے رفع ہو گیا۔

قوله و ان قدمی لتمس قدم النبی علیه السلام

حضرتؒ نے فرمایا کہ پہلے بخاری ص۵۳ میں بجائے قدم کے فخذ روایت کیا گیا ہے، اور وہاں بحث ہو چکی ہے، انوار الباری ص۱۶۵/۹ میں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

باب ما یقول اذا سمع المنادی

(اذان سنتے وقت کیا کہنا چاہئے)

۵۸۱: حدثنا عبداللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابن شہاب عن عطآء بن یزید اللیثی عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلے اللہ علیه وسلم قال اذا سمعتم الندآء فقولوا مثل مایقول المؤذن

۵۸۲: حدثنا معاذ بن فضالة قال حدثنا هشام عن یحییٰ عن محمد بن ابراهیم ابن الحارث قال حدثنی عیسیٰ بن طلحة انه' سمع معاویة یوماً فقال بمثله الیٰ قوله و اشهد ان محمداً رسول اللہ

۵۸۳: حدثنا اسحٰق قال حدثنا وهب بن جریر قال حدثنا هشام عن یحییٰ نحوه' قال یحییٰ و حدثنی بعض اخواننا انه' قال لما قال حی علی الصلوٰة قال لاحول ولاقوة الا باللہ و قال هکذا سمعنا نبیکم صلے اللہ علیه وسلم یقول

ترجمہ۵۸۱: حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا جب تم اذان سنو تو اسی طرح کہو، جس طرح مؤذن کہہ رہا ہو

ترجمہ۵۸۲: حضرت عیسیٰ بن طلحہ روایت کرتے ہیں، کہ میں نے ایک دن حضرت معاویہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے اشهد ان محمداً رسول اللہ تک اسی طرح کہا جس طرح مؤذن نے کہا:۔

ترجمہ۵۸۳: یحییٰ اسی کی مثل روایت کرتے ہیں اور یحییٰ کا بیان ہے کہ مجھ سے میرے بعض بھائیوں نے بیان کیا، کہ مؤذن نے جب حی علی الصلوۃ کہا تو معاویہؓ نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ، کہا، اور کہا، کہ میں نے تمہارے نبی ﷺ کو اسی طرح کہتے ہوئے سنا ہے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ جواب اذان میں تین صورتیں ہیں، بعینہ وہی کلمات ادا کرے جو مؤذن کہتا ہے حی علی الصلوۃ پر لاحول پڑھے اور حی علی الفلاح پر بھی۔ باقی کلمات مؤذن کی طرح کہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح پر یہ کلمات بھی کہے اور لاحول بھی پڑھے۔ اس قول کو شیخ ابن ہمام حنفیؒ نے اختیار کیا ہے اور اس کو انہوں نے بعض مشائخ کی طرف بھی منسوب کیا ہے، غالباً مراد حضرت شیخ اکبرؒ ہیں، جن کے وہ معتقدین میں سے ہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے تقریباً پندرہ سال تک اسی پر عمل کیا، پھر مجھے اس امر کے لئے انشراح ہوا کہ شارع کا مقصد تخییر ہے، جمع نہیں، اور یہی دوسرے اذکار میں بھی سنت ہے، کہ اذکار ماثورہ میں سے کبھی کسی کو اختیار کر لے اور کبھی دوسرے کو، لہٰذا جمع کا قول صرف شیخ اکبرؒ کا ہے، جس کو ابن ہمام نے بھی اختیار کیا ہے۔ حافظؒ نے علامہ محدث ابن المنذرؒ سے نقل کیا کہ شاید یہ اختلاف اباحت کا ہو کہ کبھی حی علی الصلوۃ وحی علی الفلاح پر مؤذن کی طرح ان ہی کو دہرا دے اور کبھی ان دونوں کو سن کر لاحول پڑھے، (فتح الباری ص ۶۱/۲) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک حدیث[1] میں یہ بھی مروی ہے کہ حضور علیہ السلام مؤذن کی شہادت سن کر دانا دانا فرمایا کرتے تھے۔

ان متعدد روایاتِ مختلفہ سے حضرتؒ کا رجحان یہی ہوا کہ شارع کی طرف سے تخییر کا اشارہ ہے، اور مولانا عبدالحیؒ نے السعایہ (حاشیہ شرح وقایہ) میں حافظ ابن تیمیہؒ کی رائے بھی منہاج السنہ سے اسی کے موافق نقل کی ہے، ان کی تعبیر یہ ہے کہ جہاں احادیث میں مختلف وجوہ ماثور ہیں، وہاں کبھی تو اختلاف تضاد کا ہوتا ہے اور کبھی اختلاف تنوع کا ہوتا ہے، تنوع کی صورت میں تخییر ہوگی کہ ہر روایت پر عمل درست ہوگا، تضاد کی صورت میں ایک پر عمل جائز اور دوسرے پر نادرست۔

اختلاف تنوع میں قراءت کا اختلاف، تشہد کا تنوع، صفات استعاذہ کا تعدد، انواع ادعیہ واذکار، اور نماز نفل میں قیام وتعوذ وغیرہ ذکر کی ہیں۔ البتہ حافظ ابن تیمیہ نے ادعیہ (اذکار ماثورہ متنوعہ میں یہ تفرد کیا ہے کہ جمع بین الاذکار والادعیہ کو وہ خلاف سنت کہتے ہیں، حالانکہ جب وہ سب باوقات مختلفہ حضور اکرم ﷺ سے ماثور ہیں تو ان کو ایک جگہ اور ایک وقت میں جمع کرنا بدعت کیسے ہو جائے گا۔

بدعت وسنت کا فرق

فتح الملہم ص ۴۰۶/۳ میں حدیث "کل بدعة ضلالة" کے تحت نہایت مفید بحث درج ہوئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:۔ حضرت ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ یہاں بدعت سے مراد بدعت سیئہ ہے، کیونکہ حدیث "من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها" سے ثابت ہوا کہ نیا طریقہ حسن بھی ہوتا ہے جیسے حضرت ابوبکر وعمرؓ کا جمع قرآن وغیرہ علامہ نوویؒ نے لکھا شرعاً بدعت ہر وہ فعل ہے جس کی کوئی اصل عہد نبوت میں نہ ملتی ہو، اور کل بدعة ضلالة عام مخصوص ہے اسی لئے شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے آخر کتاب القواعد میں لکھا کہ بعض بدعت واجب ہوتی ہیں جیسے علم ونحو کا سیکھنا فہم کلام اللہ کے لئے، یا علم اصول فقہ، علم کلام، فن جرح وتعدیل کا حاصل کرنا۔ بعض بدعت حرام ہیں، جیسے جبریہ، قدریہ، مرجئہ، مجسمہ کے نظریات کہ ان کا رد بھی بدعات واجبہ میں سے ہے کیونکہ حفاظت شریعت فرض کفایہ ہے۔ بعض بدعت مستحب ہیں، جیسے سرحدات دارالاسلام یا مدارس اسلامیہ کا قائم کرنا اور دوسری وہ سب بہتر مفید چیزیں جو صدر اول میں نہ تھیں جیسے نماز تراویح عام جماعت کے ساتھ اور دقائق صوفیہ میں کلام وغیرہ بعض بدعات مکروہ ہیں جیسے مساجد کی تزیین یا مصاحف کی تزویق، عندالشافعیہ، (وہ عندالحنفیہ مباح ہیں) بعض بدعات مباح ہیں، جیسے نماز صبح وعصر کے بعد مصافحہ عندالشافعیہ (عندالحنفیہ مکروہ ہے) یا جیسے طعام ولباس و

---

[1] اس موقع پر فیض الباری ص ۲/۱۶۴ میں مسلم ص ۱۶۷ کا حوالہ حضرتؒ کی طرف غلط منسوب ہوا ہے، کیونکہ حضرتؒ نے صرف ایک حدیث کا حوالہ بغیر نام کتاب کے دیا تھا، اور وہ حدیث مسلم میں نہیں بلکہ ابوداؤد ص ۷۷/ا میں ہے۔ اگر مؤلف فیض الباری ضبط میں غلطی نہ کرتے یا پھر مراجعت کر کے حوالہ کی تخریج کر لیتے تو یہ غلطی حضرتؒ کی طرف منسوب نہ ہوتی۔ واللہ المستعان (مؤلف)

مساکن کے تکلفات وتوسعات امام شافعیؒ کا ارشاد یہ ہے کہ جونئی چیزیں کتاب، سنت، اثر واجماع کے مخالف ہیں وہ بدعت وگمراہی ہیں۔ اور جو بہتر امور ہیں اور ان کے مخالف بھی نہیں ہیں وہ مذموم نہیں ہیں۔ حضرت عمرؓ نے قیام رمضان کو "نعمت البدعۃ ہذہ" فرمایا تھا، علامہ شاطبی نے شیخ موصوف کی اس تقسیم پر ردوقدح بھی کی۔ جس کی مراجعت علماء کے لئے مفید ہے۔ تاہم علامہ عثمانیؒ نے بطور حاصل بحث کے لکھا کہ اصل الاصول بدعت وسنت کے بارے میں ارشاد نبوی "من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد" ہے، اور مراد امر سے دینی ہے، لہٰذا ہر نئی بات رد نہ ہوگی بلکہ صرف وہ امور ہوں گے جو دین میں بطور اضافہ کے ہوں گے، لہٰذا اس سے توسع مطاعم ومراکب وغیرہ امور مباحہ خارج ہوں گے، اور وہ رسول بھی جو علی وجہ التقرب وحصول ثواب نہ ہوں۔ اور مالیس منه سے ثابت ہوا کہ جن امور کے لئے کتاب، سنتِ نبوی، سنت خلفائے راشدین وتعامل سلف یا اجتہاد معتبر میں کوئی اصل نہ ہو صرف وہ بدعت شریعہ میں داخل ہوں گے الخ آگے ص ۲/۲۱۰ تک مزید تفصیل وتشریح ہے اور سب ہی لائق مطالعہ ہے۔

لہٰذا آج کل جو سلفی حضرات ہر چیز پر بلا وجہ بدعت وشرک کا حکم لگا دیتے ہیں، وہ درست نہیں، جس طرح اہل بدعت بہت سی رسوم مروجہ غیر شرعیہ کو بھی بدعت سے خارج کرتے ہیں، یہ دونوں طریقے افراط وتفریط کے ہیں۔

فرض نمازوں کے بعد دعا کا مسئلہ

علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ جلد اول میں دو جگہ اور حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس دعا کو خلاف سنت قرار دیا ہے، فرق یہ ہے کہ علامہ نے امام ومقتدی کے لئے تو دعا بعد الصلوٰۃ کو خلاف سنت کہا اور کہا کہ اصحاب امام شافعی واحمد نے امام ومقتدی کے لئے بعد نماز کے دعا کو جو لکھا ہے وہ خلاف سنت ہے۔ مگر منفرد کے لئے اس کو خلاف سنت نہیں قرار دیا بلکہ صراحت کردی کہ اگر منفرد نماز کے بعد دعا کرے گا تو یہ خلاف سنت نہ ہوگا۔ (فتاویٰ ص ۱/۲۰۴)

حافظ ابن قیم نے اگر چہ یہ لکھا ہے کہ جس طرح میرے استاذ ابن تیمیہ نے دعا قبل السلام کو ترجیح دی ہے، میں نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، مگر انہوں نے اپنے استاذ کے خلاف دعاء بعد السلام من الصلوۃ مستقبل القبله کو خواہ وہ منفرد سے ہو یا امام ومقتدی سے، سب ہی کو خلاف سنت کہا ہے، ملاحظہ ہو فتح الملہم ص ۱/۱۷۵، اس فرق کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔

حافظ کا نقد: آپ نے فتح الباری میں لکھا کہ ابن قیم کا مطلقاً نفی دعا بعد السلام کا دعوے مردود ہے، کیونکہ حضرت معاذ ابن جبلؓ کو حضور علیہ السلام نے بعد نماز دعا کی تاکید فرمائی تھی، اور خود حضور علیہ السلام سے بھی دعا بعد الصلوٰۃ مروی ہے حافظ نے ان احادیث کی تخریج وتصحیح بھی کی ہے، پھر دعا میں ہاتھ اٹھانے کو بھی ثابت کیا ہے، اور دعا کے بعد چہرہ پر ہاتھوں کے پھیرنے کو بھی احادیث سے ثابت کیا ہے اور محدث منذری ونووی کی تحقیق کا بھی حوالہ دیا ہے (فتح الملہم ص ۲/۱۷۵)

واضح ہو ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ غالباً حافظ کو علامہ ابن تیمیہ کے فتاویٰ نہیں ملے، ورنہ وہ ابن قیم کے ساتھ ان کا بھی رد کرتے، جیسا کہ دوسرے بہت سے عقائد وکلام کے مسائل میں علامہ کا نام لے کر ان کا قوی ومستحکم رد کیا ہے۔ اعلاء السنن ص ۳/۱۹۹ تا ۳/۲۱۷ میں وہ سب احادیث جمع کردی گئی جن سے اجتماعی دعاء بعد الصلوٰۃ، رفع یدین فی الدعاء، اور مسح الوجہ بعد الدعاء سب امور کا اثبات ہوتا ہے، اور کئی جگہ حافظ ابن قیمؒ کا رد کیا گیا ہے، (ابن تیمیہ کا ذکر ان سے بھی رہ گیا ہے)

افادۂ انور: حضرتؒ نے فرمایا:۔ ترمذی شریف میں نمازوں کے بعد تسبیح واذکار کا باب باندھا گیا ہے، اور علامہ جزری نے حصن حصین میں، علامہ نووی نے الاذکار میں اور محدث ابن السنی نے بھی عمل الیوم و اللیله میں بعد نماز کے اذکار جمع کئے ہیں، اور جامع صغیر میں حدیث

ہے کہ فرض نماز کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، لیکن حدیث میں ادبار الصلوۃ ہے، جس کو علامہ ابن تیمیہؒ نے بعد التشہد وقبل السلام پر محمول کیا ہے اوران کا مسلک یہ ہے کہ نماز کے اندر دعا ہو، بعد نماز کی دعا کے وہ منکر ومخالف ہیں حالانکہ احادیث تسبیح ادبار صلوۃ میں نماز کے بعد ہی کی تسبیحات مراد ہیں کہ فاذا صلیتم فقولوا سبحان الله الخ وارد ہے۔ اور بخاری کی کتاب الدعوات میں بھی دبر کل صلوۃ اور کتاب الصلوۃ میں خلف کل صلوۃ اور حدیث ابی ذر میں اثر کل صلوۃ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب نماز کے بعد کے لئے ہے، نماز کے اندر سے متعلق نہیں ہے۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ فرض نمازوں کے بعد اگر چہ بہ ہیئت اجتماعیہ، ہاتھ اٹھا کر دعا ماثور نہیں ہے، لیکن حضور علیہ السلام سے نافلہ کے بعد تو ثابت ہے، جیسے نماز استسقاء کے بعد اور بیت ام سلیم کی نماز کے بعد۔ دوسرے یہ کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کے لئے قولی ترغیبات بھی حضور علیہ السلام سے ثابت ہیں، لہٰذا اس جیسے معاملہ میں بدعت کا حکم لگا دینا صحیح نہ ہوگا۔ یعنی ہماری موجودہ ہیئت کذائی والی دعا بعد الصلوٰۃ کو اگر سنت بایں معنی نہ بھی کہیں کہ بعینہ اس کا ثبوت حضور علیہ السلام سے نہیں ہوا تب بھی اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کی اصل دین میں موجود ہے اور بدعت وہ ہے جس کی اصل دین میں موجود نہ ہو۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ اذان دینا بھی خود حضور علیہ السلام کے فعل سے ثابت نہیں ہے، البتہ اس کے لئے فضیلت وغیرہ کے ارشادات ثابت ہیں، اس لئے اس کو بھی بدعت یا خلاف سنت نہیں کہہ سکتے اور اسی طرح چاشت کی نماز کہ اس کی فضیلت بھی بکثرت احادیث سے ثابت ہے اگر چہ خود حضور علیہ السلام کے فعل سے اس کا ثبوت کم ہے اسی لئے اس کو بھی بعض لوگوں نے بدعت کہہ دیا ہے۔

لہٰذا اگر فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کا التزام بھی کیا جائے تو وہ حضور علیہ السلام کی قولی ترغیبات کے تحت آتا ہے اگر چہ خود اس کو حضور نے کثرت سے نہیں کیا ہے اس کو خوب سمجھ لو۔

ترمذی باب ما یقول اذا سلم کے تحت حضرتؒ نے فرمایا کہ شیخ ابن الہمامؒ نے فرض کے بعد متصلا سنن کی ادائیگی کو ترجیح دی ہے اور اذکار کو بعد الرواتب رکھا ہے، اور اذکار ماثورہ کے بارے میں یہ بھی لکھا کہ حضور علیہ السلام سے اذکار بعد الصلوٰۃ بہ کثرت ثابت ہیں۔ اس لئے بظاہر وہ کبھی کوئی ذکر اختیار فرماتے تھے، کبھی دوسرا، اور ایک وقت میں سب کو جمع نہ فرماتے ہوں گے۔

علامہ بنوری دام فضلہم نے لکھا کہ شیخ ابن ہمامؒ کی تحقیق نقل کرنے کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی ان ہی کی تحقیق زیادہ پسند تھی، اور فرض ورواتب کے درمیان فصل اذکار کو مرجوح سمجھتے تھے، بخلاف اس کے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ میں اذکار کثیرہ ذکر کر کے ان کو قبل رواتب کے اولی قرار دیا ہے، ان کی تحقیق دل کو نہیں لگتی۔ (معارف ص ۱۱۸/۳)

علامہ موصوف نے بھی دعا بعد الصلوٰۃ کے لئے تنبیہ والفاظ کا عنوان دے کر ۱۲۱/۳ تا ص ۱۲۵/۳ عمدہ دلائل ذکر کئے ہیں۔ اور یہ بھی لکھا کہ روایت کے بعد دعاء ثانی کا جو رواج بعض علاقوں میں ہو گیا ہے وہ ضرور بدعت ہے۔ اس سلسلہ میں اعلاء السنن ص ۱۹۹/۳ و ۲۱۶/۳ بھی مستحق مراجعت ہے۔

اکابر امت حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر میں

اوپر کی بحث میں شیخ ابن ہمامؒ کا ذکر ہوا کہ وہ شیخ اکبر محی الدین بن عربیؒ کے معتقدین میں سے تھے، اس سلسلہ میں حضرتؒ نے فرمایا:۔
حافظ ابن حجرؒ شیخ اکبر سے خوش نہیں ہیں اور علامہ ابن تیمیہ تو ان کے شدید مخالف ہیں بلکہ ان پر زندقہ کا حکم لگاتے ہیں لیکن میرے نزدیک شیخ اکبر اکابر امت میں سے ہیں اور علم حقائق میں تو ساق غایات ہیں، علامہ ابن تیمیہؒ بھی علوم کے بحر مواج ہیں، مگر انہوں نے بہت سے مسائل اصول وفروع میں جمہور امت سے تفرد وشذوذ کیا ہے یعنی ان سب سے الگ مسلک اختیار کیا ہے، حالانکہ حق جمہور ہی کے ساتھ ہے، نیز ان کے مزاج میں حدت وشدت ہے اور اپنی تحقیق کو وحی الٰہی کے برابر سمجھتے ہیں اگر چہ وہ خلاف واقع ہوتی ہے، پھر اپنے کسی بھی مخالف کی پرواہ

نہیں کرتے اگر چہ وہ حق پر ہو۔ یہ لوگوں کے طبقات و مدارج ہیں، کسی میں اعتدال وانصاف کی شان نمایاں ہوتی ہے جیسے شیخ تقی الدین بن دقیق العید، علامہ ابن عبدالبر اور زیلعی حنفی وغیرہ بعض میں انتہائی تیقظ اور بیدار مغزی ہوتی ہے مگر ساتھ ہی شدت تعصب بھی جیسے حافظ ابن حجرؒ اوران کی فتح الباری میں حوالے بھی غلط ہوتے ہیں۔ تاہم وہ بڑے محدث اور محقق ہیں، بلکہ حافظ الدنیا کہلانے کے بجا مستحق۔

علامہ سیوطی و ذہبی کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں محدث تھے مگر معقول سے عاری تھے۔ حالانکہ فلسفہ کا علم بھی ضروری ہے اور پہلے صوفیاء سب حاذق تھے فلسفہ کے۔ امام غزالی عارف محقق ہیں مگر حدیث میں کمی ہے اور فلسفی بھی کامل نہیں ہیں۔

علامہ سبکی علم عقائد واصول میں بڑا پایہ رکھتے ہیں اوران کی کتاب شرح عقائد ماتریدیہ مل جائے تو بہت ہی اچھی کتاب ہے، اس میں انہوں نے ماتریدیہ واشاعرہ کے اختلاف کو کم کیا ہے اور بعض اختلافات کو نزاع لفظی کی طرف راجع کیا ہے۔ وہ علامہ ابن تیمیہ سے ہر علم میں آگے تھے۔ (انہوں نے ابن تیمیہ کا رد بھی کیا ہے)۔

علامہ سبکی م ۷۵۶ھ مصر میں علماء کے مرکز تھے، علامہ صفدی نے کہا کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ امام غزالی کے بعد سبکی جیسا عالم پیدا نہیں ہوا، میرے نزدیک یہ کہہ کر لوگ سبکی پر ظلم کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے زمانہ میں سفیان ثوری کے درجہ میں تھے، علامہ چاروں فقہی مسالک سے یکساں باخبر تھے، آپ نے مسئلہ زیارۃ نبویہ پر علامہ ابن تیمیہ کے رد میں ''شفاء السقام'' اور نونیہ ابن قیم کے رد میں ''السیف الصیقل'' لکھ کر علم وتحقیق کی شان دوبالا کی ہے، اور بہت سے اصول وعقائد پر لاثانی کلام کیا ہے۔

فرمایا کہ ابن حزم اور شوکانی جیسے لوگوں نے امت کو بہت ضرر پہنچایا ہے، کیونکہ ان سے اغلاط فاحشہ ہوئی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان علامہ ابن قیم م ۷۵۱ھ گذرے ہیں، جنھوں نے بہت اہم مفید علمی کتابیں لکھیں، لیکن خاص طور سے ایک کتاب فقہ میں اعلام الموقعین لکھی، جس میں ائمہ مجتہدین خصوصاً امام اعظمؒ اوران کی فقہ کے خلاف نہایت مضر اور زہریلا مواد فراہم کیا، جس سے دور حاضر کے غیر مقلدین نے تفریق کلمہ مسلمین کا کام لیا، حالانکہ علامہ ابن قیم نے وہی اعتراضات نئے سرے سے اٹھائے ہیں جو محدث ابن ابی شیبہؒ نے سینکڑوں سال قبل اپنی مصنف میں ذکر کئے تھے اوران کے محدثانہ ومحققانہ جوابات بار بار دیئے جا چکے تھے، بلکہ بقول علامہ کوثریؒ کے ان اعتراضات کو جو محدث موصوف نے بڑی متانت اور ادب وتہذیب کے ساتھ پیش کئے تھے، علامہ ابن قیم نے ان کو نہایت ہولناک بلکہ رعد وبرق بنا کر انتہائی غیر مہذب لب ولہجہ میں ذکر کیا ہے، یہ درحقیقت خود ان کا اپنا خالص جذباتی اور متعصبانہ رویہ تھا یا دوسرے کے کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ بازی کی مشق تھی جس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ خصوصاً جبکہ ان میں اکثر اعتراضات ایسے تھے کہ علم حدیث کا ایک اچھا طالب علم بھی ان کا دفعیہ آسانی سے کرسکتا ہے اور صرف ان کا عشر عشیر ہی ایسا تھا کہ بڑے محدثین ان کا جواب دے سکتے تھے، اور وہ جوابات بھی اکابر محدثین دے چکے تھے، پھر علامہ کوثری نے ان جوابی تالیفات کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے (ص ۱۵۸ حاشیہ ذیل تذکرۃ الحفاظ) راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ افسوس ہے یہ کتاب بغیر کسی جوابی تالیف کو حاشیہ بنانے کے شائع کی گئی اور پھر اس کا اردو ترجمہ بھی عوام کو مغالطہ میں ڈالنے کے لئے ہندوستان میں شائع کیا گیا، جس کو مولانا آزاد کی تائید حاصل تھی، ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایسی کوئی بھی علمی خدمت مفید ہوسکتی ہے بلکہ ہمارے نزدیک ایسی چیزوں سے بجائے جمع کلمہ کے تفریق بین المسلمین کی راہیں کھلتی ہیں۔ جن کا سد باب ضروری ہے۔ واللہ الموفق۔

احقر نے پہلے کسی جگہ دو بڑوں کے فرق کے عنوان سے لکھا تھا کہ علامہ ابن تیمیہ فقہ حنفی کے لئے کم سے کم متعصب ہیں جبکہ ان کے تلمیذ خصوصی ابن قیم فقہ حنفی کے حق میں غالی متعصب اور تقلید ائمہ مجتہدین کے حد سے زیادہ مخالف ہیں۔ پھر یہ کہ انہوں نے اپنے قصیدہ نونیہ میں جمہور سلف کے عقائد سے بھی انحراف کیا ہے۔ فلیتنبہ لہ۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ ہمارے اکابر دیوبند میں نہایت عظیم وجلیل شخصیت تھے، اور علوم وحقائق کے بحر ناپیدا کنار، ہمارے

حضرت شاہ صاحبؒ بھی ان کی علمی تحقیقات بڑی عظمت واہتمام کے ساتھ بیان فرمایا کرتے تھے، مگر بعض چیزوں پر نقد فرماتے تھے، مثلاً فرمایا کہ حضرت مولانا قدس سرہٗ نے بالذات وبالعرض کو ہر کتاب میں چھیڑا ہے اور بالعرض کے علاوہ مجاز اور واسطہ فی العروض کا لفظ بھی اطلاق کیا ہے، چنانچہ صلوٰۃ مقتدین کو مجازاً اور صلوۃ امام کو بالذات کہا، نیز حضور علیہ السلام کی نبوت کو بالذات کہا اور بقیہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو بالعرض کہا ہے، اس پر کسی عالم نے اعتراض بھی کیا کہ پھر تو اور انبیاء کی نبوت ہی نہ رہی، مجھ سے حضرت الاستاذ مولانا محمود حسن صاحبؒ نے بیان کیا تو میں نے یہی کہا کہ اعتراض تو قوی ہے باقی ختم نبوت کا انکار مولاناؒ کی طرف منسوب نہیں ہوسکتا کیونکہ مولانا نے خود لکھدیا کہ ختم زمانی کا انکار مجمع علیہ ہونیکی وجہ سے کفر ہے۔ اس پر مولانا خاموش ہوگئے، غرض میری رائے ہے کہ بالذات وبالعرض کے الفاظ خواہ منطقی اصطلاح سے یا اور وجہ سے، مناسب نہیں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام سب مستقل ہیں اور ایک نوع ہے خدا کے یہاں اصطفاء کی، اور سب انبیاء اس کے افراد ہیں، باقی فرق مراتب اور فضیلت جزئی کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس عنوان کی دوسری اقساط آئندہ کسی موقع پر پیش ہوں گی۔ ان شاء اللہ

نماز چاشت: اشراق کے بعد صلوٰۃ الضحیٰ کے ثبوت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، مگر علامہ ابن تیمیہ نے اس کی احادیث میں صبح کی سنت وفرض مراد لی ہیں، جو محدثین کے خلاف ہے، کیونکہ ابوداؤد، ترمذی، دارمی وغیرہ نے تو باب بھی ضحیٰ کے نام سے باندھا ہے، اور یہ وقت لغۃً وعرفاً و شرعاً خوب دن چڑھنے کا ہوتا ہے، اس کو صبح کی نماز پر محمول کرنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟ بخاری، مسلم، مسند احمد، حاکم، ترمذی، ابن ابی شیبہ وغیرہ کی احادیث خود علامہ ابن قیم نے بھی زادالمعاد میں ذکر کی ہیں، جن میں صلوٰۃ الضحیٰ کی فضیلت بیان ہوئی ہے، پھر بھی وہ اپنی اور اپنے استاذ ابن تیمیہ کی ضعیف ترین رائے کو اونچا دکھانے کی سعی ناکام کرتے ہیں۔

پوری بحث معارف السنن ص ۲۶۶/۴ سے دیکھی جائے۔ صلوٰۃ الضحیٰ کے لئے فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱۸۵/ اطبع مصر بھی دیکھا جائے، جس میں انہوں نے صلوۃ الضحیٰ کے غیر مسنون ہونے کو اختیار کیا ہے، اور اس کو صرف جائز نفل کے درجہ میں کردیا ہے۔

جبکہ جمہور حنفیہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک وہ مندوب ومستحب کے درجہ میں اور اکثر شافعیہ کے نزدیک سنت کے درجہ میں ہے۔ (معارف ص ۲۶۷/۴)

ابن جریر طبریؒ نے لکھا کہ اس کی احادیث حدتواتر کو پہنچ گئی ہیں اور ابن العربی نے فرمایا کہ یہ نماز (چاشت والی) حضور علیہ السلام سے قبل انبیاء علیہم السلام پڑھتے تھے، صحیح ابن خزیمہ میں بھی اس کی فضیلت ہے۔ وہی ابن خزیمہ جن کی اتباع علامہ ابن تیمیہ نے بہت سے عقائد میں کی ہے، جبکہ وہ ایک بڑے محدث ضرور تھے۔ مگر علم عقائد واصول میں درک نہ رکھتے تھے اور اسی لئے غلطیاں کی ہیں۔ اور علامہ ابن تیمیہ نے ان پر اصول وعقائد کے بارے میں اعتماد کرنے کی وجہ سے بھی زیادہ غلطیاں کی ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مندوب ومسنون کا فرق

یہاں سے یہ بات بھی سمجھ لی جائے کہ مندوب بھی مسنون کا ہی کم درجہ ہے، یعنی مندوب فقہاء اس کو کہتے ہیں جو حضور علیہ السلام کی ترغیب یا احیاناً فعل سے ثابت ہو، اور جو حضور علیہ السلام کے اکثری فعل یا تاکد سے ثابت ہو وہ مسنون ہے، لہٰذا محدثین وائمہ کے نزدیک جو فعل بدرجہ ندب قرار پائی اس کو صرف تطوع جائز ومباح کے درجہ میں کردینا یہ علامہ ابن تیمیہ وابن قیم کی خصوصی رائے ہے۔ نیز انہوں نے جس طرح بدعت وسنت کا فیصلہ بہت سے مواضع میں کیا ہے، وہ جمہور سلف وخلف کے مخالف ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تحقیق مزید

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ دعاء بعد الصلوات المکتوبہ میں جو حضور علیہ السلام سے اجتماعی اور رفع یدین کے ساتھ ثبوت نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے تمامی اوقات ذکر واوراد میں مشغول تھے، اور آپ کی دعائیں آپ کے اذکار واوراد سے الگ نہ تھیں، اسی لئے آپ نے جب کسی مقصد کے لئے ہی دعا کا ارادہ فرمایا تو اس وقت آپ نے اجتماعی طور سے بھی دعا کی اور ہاتھ اٹھا کر بھی کی ہے۔ جیسے

استسقاء کی نماز کے بعد یا بیت ام سلیم میں نفل نماز جماعت کے بعد فرمائی ہے اور چونکہ آپ نے بعد نماز کے دعا کی ترغیب قولاً بھی دی ہے اور رفع یدین و مسح وجہ کی بھی ترغیب دی ہے، اس لئے اس کی اصل ثابت ہوگئی، لہٰذا پھر بھی اس کو فرض نمازوں کے بعد خلاف سنت یا بدعت قرار دینا صحیح نہ ہوگا، حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بیت ام سلیم کی نماز کا ذکر تو بخاری، مسلم وغیرہ سب میں ہے، مگر سب نے اس حدیث کو مختصراً روایت کیا جس میں دعا کا ذکر نہیں ہے، البتہ صرف مسلم میں دعا کا بھی ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے، یہ حضرتؒ کی خاص عادت تھی کہ سارے طرق و روایات پر نظر کر کے فیصلہ فرمایا کرتے تھے، اور آج کل کے حضرات خصوصاً سلفی اس کی رعایت نہیں کرتے، بلکہ ان کے اکابر نے بھی اپنی الگ رائے اسی طرح قائم کی ہے وہ دیکھتے ہیں کہ امام بخاری نے پانچ جگہ ام سلیم والی حدیث ذکر کی، اور ابوداؤد، نسائی، ترمذی نے بھی مختصراً ذکر کیا جس میں دعا بعد الصلوٰۃ کا ذکر نہیں ہے۔ تو انہوں نے مسلم والی مفصل روایت کو نظر انداز کر دیا۔

حضرتؒ نے توجہ دلائی کہ ان حضرات نے اسی حدیث کو مختصر اُلیا ہے جس کو مسلم نے تفصیل سے روایت کیا ہے، علامہ ابن تیمیہ نے بھی بہت سے مسائل میں اپنی دلیل میں کہہ دیا ہے کہ یہ حدیث صحیح (یعنی بخاری) میں نہیں ہے، اور اس طرح وہ دوسری مرویات سے قطع نظر کر لیتے ہیں، یا ان کو مرجوح کر دیتے ہیں جس طرح اقوال ائمہ میں سے کسی ضعیف و مرجوح قول کو لے کر اس کو اپنی الگ رائے کے لئے مؤید بنا لیتے ہیں۔ تنبیہ اگر حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق مذکور سے مدد نہ لیں تو فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا برفع الیدین کا طریقہ خلاف سنت یا بدعت قرار پائے گا، اور علامہ ابن تیمیہ و ابن قیم اور آج کل کے سلفی حضرات کے طریقہ کو مطابق سنت ماننا پڑے گا البتہ دعاء ثانیہ کا معمول خلاف سنت ہوگا کہ اس کی کوئی اصل ثابت نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ راقم الحروف کی رائے یہ بھی ہے کہ دعاء بعد الفریضہ کے معمول کو بھی احیاناً ترک کر دینا چاہیے تا کہ اس کو عوام سنن مؤکدہ اور واجب کی طرح قابل التزام نہ خیال کریں۔ اور مندوب و مسنون و واجب کے درجات اپنی اپنی جگہ محفوظ رہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فقہی نظریات و آراء کو بھی ہمارے حضرات پیش نظر رکھیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ بھی ان کی رعایت فرماتے تھے۔ واللہ تعالیٰ یو فقنا لما یحب و یرضیٰ۔

باب الدعآء عند النداء

(اذان کے وقت دعا کرنے کا بیان)

۵۸۴: حدثنا علیٰ بن عباسؒ قال حدثنا شعیب بن ابی حمزۃ عن محمد بن المنکدر عن جابر بن عبداللہ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال من قال حین یسمع النداء اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ و الصلوٰۃ القائمۃ اٰت محمد ن الوسیلۃ و الفضیلۃ وابعثہ مقاماً محمود ن الذی وعدتہ' حلت لہ' شفاعتی یوم القیٰمۃ

ترجمہ۵۸۴: حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اذان سنتے وقت یہ دعا پڑھے۔ **اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ و الصلوۃ القائمۃ اٰت محمد نالوسیلۃ و الفضیلۃ و ابعثۃ مقاما محمود نالذی وعدتہ،** تو اس کو قیامت کے دن میری شفاعت نصیب ہوگی۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں ہم بھی یہی کہیں گے کہ اذان کے بعد والی دعا میں ہاتھ نہ اٹھائے جائیں کیونکہ ایسا حضور علیہ السلام سے ثابت نہیں ہوا، اور دوسری عام احادیث سے جن میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کی ترغیب وارد ہے، یہاں کی دعا پر استدلال موزوں نہ ہو گا۔ اور اس کا قیاس نماز پر درست نہ ہوگا، کیونکہ وہاں تو ہم بتلا چکے ہیں کہ کئی بار حضور علیہ السلام سے مطلق نماز جماعت کے بعد اجتماعی دعا اور ہاتھ اٹھا کر بھی ثابت ہو چکی ہے اگر چہ وہ نمازیں فرض نہ تھیں جبکہ اذان کے بارے میں اس درجہ کا بھی کوئی ثبوت نہیں مل سکا ہے، راقم عرض کرتا

ہے کہ یہ اصول بہت ہی کارآمد ہے مثلاً دعا، عند القبور کے لئے بھی ہاتھ نہ اٹھائیں گے، وغیرہ۔ دعا عند القبور کے جواز پر۔۔۔ پر ہم گیارہویں جلد میں مفصل بحث کر چکے ہیں، علامہ عینیؒ نے لکھا کہ حدیث میں ہے دو وقت دعا قبول ہوتی ہے ایک اذان کے وقت دوسرے جب جہاد کے لئے صفیں آراستہ ہوں۔

باب الستهام في الاذان ويذكر ان قوماً اختلفوا في الاذان فاقرع بينهم سعد

(اذان دینے کے لئے قرعہ ڈالنے کا بیان اور بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اذان (دینے) میں جھگڑا کیا تو اس کو ختم کرنے کے لئے سعد نے قرعہ ڈالا)

۵۸۵: حدثنا عبدالله بن يوسف قال اخبرنا مالک عن سمي مولیٰ ابي بكر عن ابي صالح عن ابي هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لويعلم الناس ما في النداء والصف الاول ثم لايجدون الا ان يستهموا عليه لاستهموا ولو يعلمون ما في التهجير لاستبقوا اليه ولو يعلمون ما في العتمة والصبح لاتوهما ولوحبواً

ترجمہ ۵۸۵: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا:۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اذان اور صف اول (میں شامل) ہونے کا کتنا ثواب ہے، پھر قرعہ ڈالنے کے بغیر یہ حاصل نہ ہوں، تو ضرور قرعہ ڈالیں۔ اور اگر یہ معلوم ہو جائے، کہ اول وقت نماز پڑھنے میں کیا (ثواب) ہے، تو بڑی کوشش سے آئیں، اور اگر جان لیں، کہ عشاء اور صبح کی نماز (باجماعت ادا کرنے) میں کیا (ثواب) ہے، تو ضرور ان دونوں (کی جماعت) میں آئیں، خواہ گھٹنوں کے بل چل کر ہی آنا پڑے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ قرعہ اگرچہ حجت شرعیہ نہیں ہے، تاہم وہ قطع نزاع اور تطییب خاطر کے لئے ہمارے نزدیک بھی معتبر ہے۔

بحث ونظر: قرعہ کے مسئلہ میں امام مالک، شافعی واحمد تینوں ایک طرف ہیں کہ وہ شرعی حجت ہے اور امام اعظم آپ کے اصحاب اور بہت سے دوسرے فقہاءِ کوفہ کہتے ہیں کہ قرعہ بطور حکم شرعی منسوخ ہو گیا تھا۔ اور اب صرف حلِ مشکلات، دفعِ نزاع، اور تطییبِ خاطر ودفعِ ظنون کے لئے باقی ہے جبکہ فیصلہ کرانے والے سب برابر حقوق والے ہوں یا مشترکہ چیز کے حصے برابر کر دیئے گئے ہوں، اور حضور اکرم ﷺ جو سفر کے وقت ازواجِ مطہرات کے لئے قرعہ ڈالا کرتے تھے، وہ بھی حکم شرعی نہ تھا، بلکہ تطییبِ خاطر ودفعِ ظنون ہی کے لئے تھا، کیونکہ سفر کے وقت ساتھ لے جانے میں متفقہ طور سے سب کے ہی نزدیک شرعاً آزادی ہے، کسی بیوی کو ساتھ لے سکتے ہیں یا کسی کو بھی نہ لیں۔ اور امام بخاری کا مسلک بھی حنفی مسلک سے موافق معلوم ہوتا ہے، کیونکہ آپ نے بخاری میں جتنی جگہ قرعہ کا ذکر کیا ہے، ان میں سے کسی جگہ بھی بطور حکم شرعی نہیں ہے، بلکہ صرف تطییبِ قلب یا حلِ مشکلات کے لئے ہے۔ (کذا فی لامع الدراری ص ۱\۲۳۹)

محدث ابن ابی شیبہ کا نقد: آپ نے اپنے مصنف میں امامِ اعظمؒ کے خلاف جو ایرادات کئے ہیں، ان میں ایک قرعہ کا مسئلہ بھی ہے جس کے جواب میں علامہ کوثریؒ نے لکھا کہ امام طحاویؒ نے معانی الاثار ص ۴۲۱ ج ۲ میں اور مشکل الآثار ص ۱\۳۱۸ میں قرعہ بطور حکم کی منسوخی کے دلائل ذکر کر دیئے ہیں اور اپنی متدل احادیث کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور لکھا کہ بڑی دلیل قمار ومخاطرہ کی حرمتِ صریحہ ہے، کہ قرعہ کو حجتِ شرعیہ باقی رکھنے سے قمار کی طرح اتلافِ حقوق، اور احقاقِ حق بغیر استحقاق کی صورت بن سکتی ہے، اور حضرت علیؓ کا اثر بھی ہے کہ آپ نے حضور علیہ السلام کے بعد قرعہ کو حجتِ شرعیہ نہیں بنایا۔ وغیرہ

تشغیبِ ابن القیمؒ: علامہ کوثریؒ نے آخر بحث میں یہ بھی لکھا کہ ابن القیم نے ''اعلام الموقعین'' میں حسبِ عادت اس مسئلہ میں بھی حنفیہ کے

خلاف بڑے زور شور سے اخذِ قیاس باطل اور عراض عن السنہ کا اتہام لگایا ہے، حالانکہ ہمارا مسلک حدیثی نقطۂ نظر سے ظاہر وقوی ہے (ص ۱۳ النکت الطریفہ فی التحدث عن ردود ابن ابی شیبہ علی ابی حنیفہ۔

جو لوگ علامہ ابن القیم کی اعلام سے متاثر ہوں، ان کو ''النکت'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے، جو نہایت محققانہ ومحدثانہ کتاب ہے، وہ نہ صرف محدث ابن ابی شیبہ کا جواب ہے بلکہ علامہ موصوف کی تشغیبات کا رد بھی ہے، اور زمانۂ حاضر کے سلفیوں کے زہریلے پروپگینڈے کا تریاق بھی نیز ملاحظہ ہو العرف الشذی ص ۴۵۶ اور انوار المحمود ص ۲\۴۳۷۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ بھی قرعہ کے مسئلہ میں علامہ کی درازلسانی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ بھی فرمایا کہ ابن القیم نے قرعہ پر بڑی بحث کی ہے، مگر میں ان کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا، بحث تو حکم کی ہے اور وہ دیانت پیش کررہے ہیں، ہمارے نزدیک بھی قرعہ تطییب خاطر کے لئے ہے، اس سے حکم نہیں کیا جاسکتا۔ پھر فرمایا کہ عمل میں ہم ہیٹے ہیں لیکن صحیح فہم کے لحاظ سے زیادہ ہی ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرتؒ ابن القیم وغیرہ سے قطعاً مرعوب نہ تھے۔

یہاں سے حضرت شیخ الہندؒ کی یہ بات بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ امام اعظم کی تفقہ واجتہاد کی شانِ رفیع اس وقت اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب تینوں ائمۂ مجتہدین ایک جانب ہوں اور امام صاحب دوسری جانب جس طرح یہاں ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله الا ان يستهموا عليه

علیہ کی ضمیر مفرد کا مرجع کیا ہے؟ جبکہ ضمیر تثنیہ کی ضرورت تھی، جواب یہ ہے کہ بتاویل ''مذکور'' دونوں مراد ہوسکتے ہیں، حافظ نے لکھا کہ محدث عبدالرزاق نے ضمیر تثنیہ ہی ذکر کی ہے، للہذا علامہ ابن عبدالبرؒ کی رائے درست نہیں کہ ضمیر مفرد وصف اول کی طرف راجع ہے کیونکہ وہ قریب بھی ہے، علامہ قرطبی نے بھی ان پر اعتراض کیا کہ اس طرح تو اذان کا ذکر بے فائدہ رہے گا (فتح الباری ص ۲\۱۲۵) حیرت ہے کہ علامہ ابن عبدالبر ایسے یگانہ روزگار محدث سے یہاں چوک ہوگئی۔

باب الكلام فى الاذان و تكلم سليمان بن صرد فى اذانه وقال الحسن لاباس ان يضحک وهو يؤذن او يقيم

(اذان میں کلام کرنے کا بیان، سلیمان بن صرد نے اپنی اذان میں کلام کیا، حسن (بصری) نے کہا، کہ اذان یا اقامت کہتے وقت ہنس دینے سے ان میں خلل نہیں آتا)

۵۸۶: حدثنا مسدد قال حدثنا حماد عن ايوب و عبدالحميد صاحب الزيدى و عاصم الاحول عن عبدالله بن الحارث قال خطبنا ابن عباس فى يوم رزغ فلما بلغ المؤذن حى على الصلوٰة فامره ان ينادى الصلوٰة فى الرحال فنظر القوم بعضهم الى بعض فقال فعل هذا من هو خير منه وانها عزمة

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن حارث روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جاڑوں میں ابر کے دن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ہمارے سامنے خطبہ پڑھا (کہ اتنے میں اذان ہونے لگی) جب موذن حی علی الصلوٰۃ پر پہنچا تو انہوں نے اسے حکم دیا کہ پکار دے، لوگ اپنی اپنی فرودگاہ میں نماز پڑھ لیں (جماعت کے لئے نہ آئیں، یہ سن کر) لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، حضرت ابن عباس نے کہا کہ یہ اس شخص نے کیا ہے، جو ہم سے بہتر تھا، یعنی نبی علیہ السلام نے اور یہی افضل ہے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ اذان میں بات کرنا حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے (یعنی خلاف اولیٰ ہی کما ذکرہٗ فی الفتح ص ۲\۱۶۶) اور اتنا توسع سمجھنا کہ اس میں بات کرنا اور ہنسنا وغیرہ سب درست بلا کراہت ہو، صحیح نہیں ہوتا۔ رزغ کے معنی گارا پھر فرمایا کہ بظاہر حضرت ابن عباس کی حدیث الباب سے یہ معلوم ہوا کہ حی علی الصلوۃ پر پہنچ کر مؤذن الصلوۃ فی الرجال کہہ دے، مگر حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے پوری اذان سے فارغ ہونے کے بعد یہ کہنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا میرے نزدیک اسی پر عمل ہونا چاہئے، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ بہ نسبت حضرت ابن عباسؓ کے اثر نبوی کا اتباع زیادہ اور اجتہاد کم کرتے تھے، حدیث الباب کے دوسرے طرق میں یوم جمعہ کی تصریح بھی ہے اور فقہ حنفی میں بھی بارش گارے کو اعذار جمعہ میں گنایا گیا ہے۔ فیض الباری ص ۲\۱۶۹ میں امام محمدؒ کی کتاب الحج کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مگر راقم کو وہ حوالہ مطبوعہ کتاب الحج چار جلدوں میں نہیں ملا۔ البتہ معارف السنن ص ۴\۳۶ میں امام محمد اور اصحاب لغت سے نعل بمعنی سخت زمین ذکر ہوا ہے۔ وہاں امامؒ کی کسی کتاب کا نام نہیں ہے۔

درمختار میں بیس عذر ترک جماعت کے ذکر ہوئے ہیں، جن میں بارش کیچڑ، سخت سردی، بوڑھاپا، قصد سفر، خوف، بھوک کی حالت میں کھانے کی موجودگی وغیرہ ہیں۔

قولہ وانہا عزمۃ: حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی نماز دوسری نمازوں سے ممتاز ہے، کہ اس کی خاص اور زیادہ عظمت واہمیت ہے، اسی لئے وہ گھروں میں دانہ ہوگی، اور بجائے اس کے مجبوری میں ظہر پڑھیں گے، اور حضور علیہ السلام نے اشارہ دیا کہ لوگ باوجود بارش وکیچڑ کے بھی مسجد میں آنا چاہیں گے، لہٰذا اعلان کرادیا کہ وہ ایسی حالت میں عندالشرع معذور ہیں، گھروں میں نمازیں پڑھیں، اور آپ نے تھوڑے لوگوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرنا گوارا فرمایا۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ امام محمدؒ نے اپنی کتابوں میں بہ کثرت مشکل الفاظ حدیث کی تفسیر فرمادی ہے۔ جس سے محدث ابوعبید نے اپنی کتاب غریب الحدیث میں استفادہ کیا ہے اور دوسرے کبار محدثین اس کتاب سے استفادہ کرتے ہیں (مگر تعصب کا برا ہو کہ امام محمد کو بہت سے متعصب اصحاب حدیث کی صف میں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے، امام شافعیؒ نے برسوں ان کی خدمت میں رہ کر حدیث وفقہ حاصل کی، اور تاریخ کے اس اہم ترین واقعہ کو کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا مگر علامہ ابن تیمیہؒ ایسے محقق نے ان کے تلمذ سے صاف انکار کردیا، فیاللعجب!)۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ کسی نے دارالعجائب کہا کسی نے دارالاضداد، کسی نے دارالافتراق والاجتماع بتلایا مگر میں اس کو بیت الحمیر کہتا ہوں، کیونکہ گدھے اپنے طویلہ میں کھڑے ہوئے ایک دوسرے پر دولتی چلاتے رہتے ہیں، یہاں جس کو دیکھو ایک دوسرے کو ذلت وتکلیف پہنچانے کے درپے ہے، اسی لئے حضرتؒ کی نظر میں کسی آدمی کی بڑی تعریف و خوبی یہ تھی کہ وہ بے ضرر ہو، کہ اس سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے، اور فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص صاف سینہ ہوگا، وہ جنت میں جائے گا۔ یعنی جس کے دل میں کسی دوسرے کے لئے کینہ کپٹ عداوت وحسد وغیرہ نہ ہو۔

باب اذان الاعمیٰ اذا کان لہٗ من یخبرہٗ

جب کہ نابینا کے پاس کوئی ایسا شخص ہو جو اسے وقت بتلائے تو اس کا اذان دینا درست ہے

۵۸۷: حدثنا عبداللہ بن مسلمۃ عن مالک عن ابن شہاب عن سالم ابن عبداللہ عن ابیہ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال ان بلالاً یؤذن بلیل فکلوا واشربوا حتیٰ ینادی ابن ام مکتوم قال و کان رجل اعمیٰ لاینادی حتیٰ یقال لہٗ اصبحت اصبحت

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ بلال رات کو اذان دیتے ہیں، پس تم لوگ کھاؤ، اور پیو، یہاں تک کہ ابن ام مکتومؓ اذان دیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ابن ام مکتوم نابینا آدمی تھے، وہ اس وقت تک اذان نہ دیتے، جب تک لوگ یہ نہ کہہ دیں کہ صبح ہوگئی، صبح ہوگئی۔

باب الاذان بعد الفجر

(فجر کے (طلوع ہونے کے بعد) اذان کہنے کا بیان)

۵۸۸: حدثنا عبداللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک عن نافع عن عبداللہ ابن عمر قال اخبرتنی حفصۃ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کان اذا اعتلف المؤذن للصبح و بدا الصبح صلے رکعتین خفیفتین قبل ان تقام الصلوٰۃ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں، کہ مجھ سے حضرت حفصہؓ نے بیان کیا کہ رسول خدا ﷺ کی عادت تھی کہ جب موذن صبح کی اذان کہنے کھڑا ہوجاتا، اور صبح کی اذان ہوجاتی، تو دو رکعتیں پڑھ لیتے تھے۔

تشریح: حضرتؒ نے محیط (فقہ حنفی کی کتاب) کے حوالہ سے نابینا کی اذان کو مکروہ بتلایا اور فرمایا کہ اس کو اگر صحیح وقت بتلانے والا ہو تو کراہت بھی نہیں۔ حافظ نے لکھا کہ علامہ نووی نے امام ابوحنیفہؒ کی طرف یہ منسوب کردیا کہ ان کے نزدیک نابینا کی اذان صحیح نہیں، حالانکہ یہ نسبت غلط ہے اور سروجی حنفی نے بھی نووی پر اعتراض کر کے اس کو غلط قرار دیا ہے۔ البتہ محیط میں کراہت مذکور ہے (فتح الباری ص ۲/۶۷)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے جو علی الاطلاق غیر مکروہ لکھا، وہ بھی مرجوح ہے، کیونکہ علامہ عینی نے بھی بحوالۂ محیط کراہت کا قول ذکر کیا ہے۔ باقی اس کو بھی سب نے مانا ہے کہ کراہت کا سبب عدم مشاہدہ ہے، لہٰذا کوئی مشاہد اگر نابینا کو صحیح وقت کی خبر دے تو کراہت رفع ہو جاتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۵۸۹: حدثنا ابو نعیم قال حدثنا شیبان عن یحییٰ عن ابی سلمۃ عن عآئشۃ رضی اللہ عنھا کان النبی صلے اللہ علیہ یصلی رکعتین خفیفتین بین الندآء والاقامۃ من صلوٰۃ الصبح

۵۹۰: حدثنا عبداللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک عن عبداللہ ابن دینار عن عبداللہ بن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان بلالا ینادی بلیل فکلوا واشربوا حتیٰ ینادی ابن ام مکتوم

ترجمہ ۵۸۹: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نماز صبح کے وقت اذان واقامت کے درمیان میں دو رکعتیں ہلکی سی پڑھتے تھے۔

ترجمہ ۵۹۰: حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، کہ بلال رات کو اذان دیتے ہیں، تم لوگ کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ ابن ام مکتومؓ اذان دیں۔

تشریح: امام بخاری نے اذان بعد الفجر کا عنوان مقدم کیا حالانکہ قبل الفجر کا اول ہونا تھا، اور علامہ ابن بطال نے تو اس عنوان کے ذکر پر بھی اعتراض کردیا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اذان نماز کے لئے ہوتی ہے اور وہ ہر نماز کا وقت ہوجانے پر ہی دی جاتی ہے۔ لہٰذا طلوع فجر کے بعد اذان دینے کا عنوان ہی لاحاصل ہے، پھر اس بارے میں کوئی اختلاف بھی کسی کا نہیں ہے، مگر جواب یہ ہے کہ اس میں تو اختلاف ہے کہ اگر صبح کی اذان قبل طلوع الفجر دے دی گئی ہو تو پھر اس کا اعادہ بعد طلوع فجر ہونا چاہئے یا نہیں؟ ائمۂ ثلاثہ (امام مالک، شافعی واحمد) جو قبل الوقت اذان

فجر کو جائز و مشروع بتلاتے ہیں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وقت ہو جانے پر اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ برخلاف اس کے امام ابوحنیفہ و امام محمد، امام زفر و ثوریؒ فرماتے ہیں کہ بقیہ اوقات کی طرح فجر کی اذان بھی قبل الوقت مشروع و جائز نہیں اور اگر کہی گئی تو وقت پر اعادہ کرنا ہوگا۔ عمدہ، فتح اور شرح المہذب میں اسی طرح ہے۔ (معارف ص۲۱۳\۲)

معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری بھی اعادہ کے قائل اور حنفیہ کے ساتھ ہیں، اسی لئے اذان بعد الفجر کا باب باندھا اور اس کو مقدم بھی کیا کہ اس کی ضرورت و اہمیت واضح ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری نے الفاظ حدیث **كان اذا اعتكف المؤذن** سے بھی غالباً یہی سمجھا ہے کہ مؤذن طلوع صبح کے انتظار میں رہتا تھا کہ جب اچھی طرح صبح کا وقت ظاہر و واضح ہو جائے تو اذان دے اس کے بعد امام بخاری اذان قبل الفجر کو لائے ہیں کیونکہ فی الجملہ ثبوت سے تو اس کے بھی انکار نہیں ہو سکتا، اگرچہ وہ نماز کے لئے نہ تھا، بلکہ نماز کے لئے اٹھنا، ضروریات سے فارغ ہونا، نماز کے لئے تیاری کرنا اور تہجد و سحری کے آخری وقت پر متنبہ کرنا وغیرہ اس کے مقاصد تھے، تاہم وہ اذان قبل الفجر صرف حضور علیہ السلام کے زمانہ میں رہی، اور خلفائے راشدین کے دور میں اس پر عمل نہ رہا تھا، اور اس سے اس کی عدم سنیت معلوم ہوتی ہے۔ کما حققہ مولانا الکنگوہیؒ (لامع ص۲۴۱\۱)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اذانِ اوّل (قبل الفجر) پر اکتفاء کرنا جو شافعیہ وغیرہم کا مسلک ہے وہ صحیح نہیں، جس طرح بعض حنفیہ کا اذانِ اول کو فوائد سے خالی سمجھنا بھی درست نہیں، تاہم اصل اذان بعد الفجر والی ہی ہے اور وہی پھر جاری و ساری بھی رہی جبکہ اذانِ اول دورِ خلافت راشدہ میں باقی نہ رہی، اس سے حنفیہ ہی کا مسلک قوی تر بن جاتا ہے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کا تعامل اور ان کے آثار بھی قابلِ اقتدا ہیں حتیٰ کہ ان کی وجہ سے دورِ نبوی کے ایک معمول کو بھی ترک کیا جا سکتا ہے، اور امام بخاری اگرچہ اقوال و آثارِ صحابہ کو حجت نہیں مانتے (اور ان کا اتباع سلفی حضرات بھی کرتے ہیں) مگر یہاں امام بخاری نے بھی آثارِ صحابہ ہی کو تو حجت سمجھا ہوگا۔ ورنہ اذان بعد الفجر کو اتنی اہمیت نہ دیتے چنانچہ دوسرے ائمۂ ثلاثہ نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اذانِ اول کی مشروعیت و سنیت کے بھی قائل رہے اور اذان بعد الفجر کی ضرورت بھی نہیں مانتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب الاذان قبل الفجر

(فجر کی) اذان صبح ہنے سے پہلے کہنے کا بیان

۵۹۱: حدثنا احمد بن یونس قال حدثنا زهیر قال حدثنا سلیمان التیمی عن ابی عثمان النهدی عن عبدالله بن مسعود عن النبی صلے الله علیه وسلم قال لایمنعن احدکم اواحداً منکم اذان بلال من سحوره فانه' یؤذن اوینادی بلیل لیرجع قآئمکم ولینبه نآئمکم ولیس ان یقول الفجر اوالصبح وقال باصابعه و رفعها الیٰ فوق وطاطآ الیٓ اسفل حتیٰ یقول هٰکذاوقال زهیر بسبابتیه احدٰهما فوق الاخریٰ ثم مدهما عن یمینه وشماله

۵۹۲: حدثنی اسحاق قال اخبرنا ابواسامة قال عبیدالله حدثنا عن القاسم بن محمد عن عائشة و عن نافع عن ابن عمران رسول الله صلی الله علیه وسلم قال وحدثنی یوسف بن عیسیٰ قال حدثنا الفضل قال حدثنا عبیدالله بن عمر عن القاسم بن محمد عن عآئشة عن النبی صلے الله علیه وسلم انه' قال ان بلالایؤذن بلیل فکلوا واشربوا حتیٰ یؤذن ابن ام مکتوم

ترجمہ ۵۹۱: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رسول اللہ علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، تم میں سے کوئی شخص بلال کی اذان سن کر سحری کھانا نہ چھوڑے، اس لئے کہ وہ رات کو اذان کہہ دیتے ہیں، تا کہ تم میں سے تہجد پڑھنے والا فرغت کر لے، اور تا کہ تم میں سے سونے والے کو بیدار کر دیں، اور یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص سمجھے کہ صبح (ہوگئی) اور آپ نے اپنی انگلیوں سے اشارہ کیا اور ان کو اوپر کی طرف اٹھایا، اور پھر نیچے کی طرف جھکا دیا، کہ اس طرح (یعنی سفیدی پھیل جائے) اور حضرت زبیرؓ نے اپنی دونوں شہادت کی انگلیاں ایک دوسرے کے اوپر رکھیں، پھر دونوں کو اپنے داہنے اور بائیں جانب پھیلا دیا (یعنی اس طرح ہر طرف سفیدی پھیل جائے) تب سمجھو کہ صبح ہوگئی:۔

ترجمہ ۵۹۲: حضرت عائشہؓ رسول اللہ علیہ السلام سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا، بلالؓ رات میں اذان کہہ دیتے ہیں، للہٰذا تم ابن ام مکتومؓ کے اذان دینے تک کھایا پیا کرو:۔

تشریح: اس باب کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کی اذان فجر کے طلوع ہونے سے قبل دینا جائز ہے، حالانکہ حدیث الباب سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ اذان فجر کی نماز کے لئے ہوتی تھی، بلکہ حدیث صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ یہ اذان سحری اور تہجد کے لئے دی جاتی تھی اور فجر کی اذان ابن ام مکتومؓ دیا کرتے تھے، جو فجر کے وقت میں ہوتی تھی، چنانچہ سابقہ احادیث میں اس کی تصریح گذر چکی ہے، مناسب یہ تھا کہ اس باب کا عنوان اس طرح مقرر کیا جاتا (فجر سے قبل سحری وتہجد کی بیداری کے لئے اذان دینا، تا کہ اس کا بھی جواز معلوم ہو جاتا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ یہ ضروری نہیں کہ صبح کی دونوں اذانوں کے کلمات متمائز ہوں تا کہ سننے والوں کو اشتباہ نہ ہو کیونکہ امتیاز دو موذنوں کی آوازوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، اور اگر دونوں کے کلمات مختلف ہوتے اور کسی کو اشتباہ بھی نہ ہوتا تو حضور اکرم علیہ السلام کا ارشاد "لا یغرنکم اذان بلال" کیوں ہوتا؟!

امام محمدؒ، طحاویؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ

حضرت شاہ صاحبؒ نے احادیث اذان قبل الفجر کے بارے میں نہایت عمدہ محدثانہ تحقیق ارشاد فرمائی جو فیض الباری میں بھی ص ۲/۱۷۰ تا ص ۲/۱۷۸ درج ہوئی ہے، اور احقر کی یادداشت میں بھی اسی طرح ہے، اس میں حضرتؒ نے امام طحاوی کی تحقیق کو بہت پسند کیا ہے، للہٰذا وہ لائق مطالعہ ہے، ہم یہاں بوجہ طوالت درج کرنے سے قاصر ہیں۔ حضرتؒ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ امام طحاوی کی قدر وہ کر سکتا ہے جس کو معلوم ہو کہ پہلے کیا کچھ اعتراضات وغیرہ ہو چکے ہیں۔ پھر فرمایا کہ حنفیہ کے مذہب پر جس قدر احسانات امام طحاوی کے ہیں اور کسی کے نہیں، میں نے اکثر دیکھا کہ امام طحاوی کی تحقیق کی بنیاد امام محمدؒ کے کلام پر ہوتی ہے، اور بعض اوقات ان کے صرف ایک لفظ ہی پر بنیاد رکھ کر امام طحاوی اس کو پھیلا کر پوری تحقیق قائم کر دیتے ہیں اور اعلیٰ تحقیقات کی نشان دہی جتنی امام طحاوی نے کی ہے اور کسی نے نہیں کی، اور ان کی تقریرات وتائیدات جس قدر میں نے جمع کی ہیں اور کسی نے نہیں کیں۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام محمدؒ سلف اور امام اعظمؒ کے علوم وکمالات کے جامع تھے، امت محمدیہ کے جلیل القدر محقق و مدقق تھے، آپکے علوم کی تشریحات امام طحاویؒ نے کیں، اور امام شافعیؒ کی وساطت سے وہ علوم دوسرے ائمہ مجتہدین ومحدثین کو بھی حاصل ہوئے، پھر ایک مدت مدید کے بعد ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے جن کا سلسلۂ نسب بھی امام اعظمؒ کے خاندان سے ملتا ہے، ان علوم وتحقیقاتِ عالیہ محمدیہ و طحاویہ کو سامنے رکھ کر تیس چالیس برس تک ان کے لئے تائیدی دلائل و براہین جمع کئے، اور ان کی شانِ علم وفضل و جامعیت بھی بقول حضرت تھانویؒ ایسی تھی کہ ان کے ایک ایک جملہ پر ایک ایک رسالہ مدون ہو سکتا تھا اور بقول حضرت علامہ عثمانیؒ آپ کی گرانقدر علمی تالیفات کی قدر بھی صرف وہی کر سکتا تھا، جس کے سامنے سابقہ اعتراضات وابحاث ہوں، چنانچہ خود ہی حضرت شاہ صاحبؒ کے رسالہ "کشف الستر" کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ اس رسالہ کا مطالعہ سترہ بار کرنے کے بعد میں سمجھ سکا ہوں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے کن کن مشکلات واشکالات علمیہ کا حل فرما دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام محمد، امام طحاویؒ، اور حضرت شاہ صاحبؒ تینوں کی محدثانہ شانِ تحقیق وتدقیق علماء امت میں سے ایک نرالی

شان کی تھی، رسالۂ مذکورہ اور نیل الفرقدین، بسط الیدین و مرقاۃ الطارم کے لئے حضرتؒ نے اپنی یادداشتیں راقم الحروف ہی کو سپرد کی تھیں اور ان کو مرتب شکل میں نقل کر کے، کتابت کرا کر احقر ہی نے مجلسِ علمی ڈابھیل سے شائع کرایا تھا اور اس طرح کی یادداشتوں کے تین صندوق حضرتؒ کے گھر پر تھے جن سے سینکڑوں مسائل میں مدلل سکتی تھی، اور آج وہ سب موجود ہوتیں تو صحاح ستہ و معانی الآثار وغیرہ کی بے نظیر شروح تالیف کی جاسکتی تھیں مگر صد افسوس کہ حضرتؒ کی وفات کے بعد وہ سارا ذخیرہ گھر والوں کی ناقدری سے ضائع ہو گیا، اور حضرتؒ کی کتابیں بھی جن پر حضرتؒ کے دستِ مبارک سے لکھے ہوئے قیمتی حواشی بھی تھے، فروخت کر دیئے گئے، لہٰذا حضرتؒ کے تلامذہ مجبور ہو گئے کہ صرف املائی افادات کو بنیاد بنا کر کچھ لکھ پڑھ سکیں، میرے ساتھ ہی دو سال تک مولانا بدر عالم صاحب بھی درسِ بخاری شریف میں شرکت کرتے اور حضرتؒ کے امالی ضبط کرتے تھے، اور مجھے اس کا خیال و وہم بھی نہ تھا کہ کسی وقت میں اپنے امالی سے کچھ کام لے سکوں گا۔

احقر نے ہی حضرتؒ کے بعد مولانا موصوف سے ''فیض الباری'' مرتب کرائی تھی، مگر جب وہ سامنے آئی تو خلاف توقع ثابت ہوئی، اسی لئے انوار الباری میں حوالوں کی مراجعت اور اپنے امالی کے ذریعہ تصحیح مضامین کی سعی حسب مقدور کرتا ہوں، دوسرا کام ترمذی شریف پر مجلس علمی ڈابھیل سے ہی حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری دام فضلہم وعم فیوضہم سے شروع کرایا گیا تھا اور خدا کا شکر ہے وہ جتنا ہوا ہے۔ اس سے حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی و تحقیقی شان بڑی حد تک نمایاں ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ موصوف کی صحت و عافیت قرار رکھ کر اس عظیم خدمت کو پورا کرائے۔ آمین وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

باب کم بین الاذان والاقامۃ

(اذان و اقامت کے درمیان میں کتنا فصل ہونا چاہیے)

۵۹۳: حدثنا اسحاق الواسطی قال حدثنا خالد عن الجریری عن ابن بریدہ عن عبداللہ بن مغفل المزنی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بین کل اذانین صلوٰۃ ثلاثالمن شآء

۵۹۴: حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا غندر قال حدثنا شعبة قال سمعت عمرو بن عامر ن الانصاری عن انس بن مالک قال کان المؤذن اذا اذن قام ناس من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم یبتدرون السواری حتیٰ یخرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم و ھم کذٰلک یصلون رکعتین قبل المغرب ولم یکن بین الاذان والاقامة شی وقال عثمان بن جبلة وابو داؤد عن شعبة لم یکن بینھما الا قلیل

ترجمہ ۵۹۳: حضرت عبداللہ بن مغفل مزنیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا کہ اگر کوئی پڑھنا چاہے تو دو اذانوں کے درمیان میں ایک نماز کے برابر فصل ہونا چاہئے۔

ترجمہ ۵۹۴: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ جب مؤذن اذان کہتا تھا، تو کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کے اصحاب میں سے ستونوں کے پاس چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ تشریف لاتے اور وہ اسی طرح مغرب سے پہلے دو رکعت نماز پڑھتے ہوتے تھے، اور اذان اور اقامت کے درمیان میں کچھ فصل نہ ہوتا تھا، اور عثمان بن جبلہ اور ابوداؤد شعبہ سے ناقل ہیں کہ ان دونوں کے درمیان بہت ہی تھوڑا فصل ہوتا تھا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حنفیہ کے نزدیک اذان و اقامت کے درمیان اتنا فاصلہ ہونا چاہئے کہ ایک شخص اپنی ضرورت بول و براز کی پوری کر کے نمازِ جماعت میں شریک ہو سکے، اور ترمذی شریف میں حدیث بھی ہے اگرچہ وہ ضعیف ہے کہ اذان و اقامت میں اتنا فصل ہونا چاہئے کہ کھانے والا کھانے سے اور پینے والے اس سے اور بول و براز والا اپنی حاجت سے فارغ ہو سکے۔ البتہ مغرب کی نماز میں

عجلت بہتر ہے، اسی لئے بعض صحابہ سے جو منقول ہے کہ وہ فرض مغرب سے قبل دو رکعت پڑھتے تھے، اس کو عام کتب حنفیہ میں مکروہ کہا گیا ہے، لیکن شیخ ابن ہمام نے ان کو مباح قرار دیا ہے اور یہی بہتر و معتمد قول ہے، امام مالک کا بھی یہی مذہب ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ مختصر ہلکی دو رکعت پڑھ لے، امام احمد نے ثبوت کی رعایت سے صرف ایک بار پڑھی ہیں، کمافی العمدہ، اس میں حافظ کو غلط فہمی ہوگئی کہ امام احمد نے ایک بار پڑھی تھی پھر جب حدیث پہنچی تو مستقل طور سے پڑھنے لگے۔

روایت المعنیٰ: حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک حدیث مرفوع تو عام ہی ہے کہ ہر اذان و اقامت کے درمیان نماز کا وقت ہے، پھر دوسری روایات میں مغرب کا استثناء بھی آیا ہے، مگر راوی نے مغرب کو بھی حدیث عام کے تحت سمجھا اور حدیث کو روایت المعنیٰ کے طور پر نقل کر دیا۔ جس میں مفہوم و معنی حدیث کو راوی بیان کرتا ہے دوسری صورت روایت بالمعنیٰ کی ہوتی ہے کہ اس میں راوی الفاظ حدیث کو بھی ذہن میں رکھتا ہے، اور ان کی رعایت کر کے روایت بالمعنیٰ کرتا ہے، لہٰذا روایت المعنیٰ اور روایت بالمعنیٰ کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

حضرتؒ نے فرمایا:۔ مذہب منصور، مذہب جمہور ہی ہے، جس کو امام نووی نے بھی مان لیا ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ علامہ نووی نے اس امر کو تسلیم کر کے بھی کہ خلفائے اربعہ اور دیگر صحابہ کا عمل ترک رکعتین قبل المغرب کا تھا، امام ابوحنیفہ پر رد کیا ہے، عدل و انصاف کا طریقہ یہ نہ تھا۔

بعض حضرات نے اس کو منسوخ کہا ہے، مگر میرے نزدیک اس کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ ایک زمانہ میں صحابہ نے دو رکعت مغرب سے قبل پڑھی ہیں، لیکن پھر یہ عمل چھوٹ گیا اور ترک ہی پر تعامل ہوگیا۔ نسخ کی صورت میں اس کی مشروعیت ختم ماننی پڑتی ہے۔ عمل نہ رہا، تو یہ نسخ و عدم مشروعیت کو مستلزم نہ ہوگا۔

ہمارے حضرتؒ کی رائے "نسخ" کے لئے کم سے کم تھی، اور وہ اسی طرح بہت سے مسائل میں...... رائے رکھتے تھے یعنی مشروعیت فی نفسہا باقی رکھ کر ترک عمل کا فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ حاشیۂ لامع الدراری ص ۱\۲۴۲ میں ہے کہ حافظ نے فرمایا کہ امام بخاری نے اسناد حدیث ترمذی کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس پر شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ میرے نزدیک اوجہ یہ ہے کہ امام بخاری نے تقویۂ معنی حدیث الترمذی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

باب من انتظر الاقامة

(اس شخص کا بیان جو اقامت کا انتظار کرے)

۵۹۵: حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب عن الزهری قال اخبرنی عروة بن الزبیر ان عآئشة رضی الله عنها قالت کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا سکت المؤذن بالاولیٰ من صلوٰة الفجر قام و رکع رکعتین خفیفتین قبل صلوٰة الفجر بعد ان یستبین الفجر ثم اضطجع علیٰ شقه الایمن حتیٰ یاتیه المؤذن للاقامة

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ (کی یہ عادت تھی کہ) جب مؤذن فجر کی اذان کہہ کر چپ ہو جاتا، تو آپ فجر کے فرض سے پہلے بعد صبح ہو جانے کے دو رکعتیں ہلکی سی پڑھ لیتے تھے، پھر اپنے بائیں پہلو پر آرام فرماتے تا آنکہ مؤذن اقامت کے لئے آپ کے پاس آتا (پھر آپ اٹھ جاتے)۔

تشریح: یعنی اگر کوئی شخص گھر میں بیٹھ کر اقامت کا انتظار کرے تو یہ بھی جائز ہے۔ حافظ نے بھی لکھا کہ امام بخاری نے یہ بتلایا کہ اقامت کا انتظار امام ہی کے لئے خاص نہیں، کیونکہ مقتدی کو بھی صف اول کا ثواب حاصل کرنا ہے لہٰذا وہ بھی اگر گھر قریب ہو تو اقامت سن کر مسجد میں جا سکتا ہے۔

باب بین کل اذانین صلوٰۃ لمن شآء

(اگرکوئی چاہےتو ہراذان واقامت کے درمیان نماز پڑھ سکتا ہے)

۵۹۶ : حدثنا عبدالله بن یزید قال حدثنا کهمس بن الحسن عن عبدالله بن بریدة عن عبدالله بن مغفل قال قال النبی صلے الله علیه وسلم بین کل اذانین صلوٰۃ بین کل اذانین صلوٰۃ قال فی الثالثۃ لمن شآء

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مغفلؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:۔ دواذانوں (یعنی اذان واقامت) کے درمیان ایک نماز ہے (دومرتبہ یہی فرمایا) تیسری مرتبہ فرمایا اگرکوئی پڑھنا چاہے۔

تشریح: علامہ عینی نے لکھا کہ اس میں تکرار نہیں ہے، کیونکہ پہلے اجمالی بیان مضمون حدیث الباب کا ہوا تھا، یہاں حدیث کا مکمل مضمون درج ہوا ہے۔ شیخ الحدیث نے فرمایا کہ میرے نزدیک یہ بتلایا کہ روایت کے بارے میں قولی وفعلی روایات سے وجوب نہ سمجھا جائے، کیونکہ لمن شاء وارد ہے۔

باب من قال لیؤذن فی السفر مؤذن واحد

کیا سفر میں ایک ہی موذن کواذان دینی چاہئے (یعنی جس طرح حضر میں دوموذنوں کا اذان دینا درست ہے' کیا یہ بات سفر میں بھی درست ہوگی؟)

۵۹۷ : حدثنا معلی بن اسد قال حدثنا وهیب عن ابی ایوب عن ابی قلابة عن مالک بن الحویرث قال اتیت النبی صلی الله علیه وسلم فی نفر من قومی فاقمنا عنده' عشرین لیلة وکان رحیماً رفیقاً فلما رای شوقنا الیٰ اهلینا قال ارجعوا فکونوا فیهم وعلموهم وصلوافاذا حضرت الصلوٰۃ فلیؤذن لکم احدکم ولیؤمکم اکبرکم

ترجمہ: حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اپنی قوم کی ایک جماعت کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر بیس یوم تک مقیم رہا، ہم نے آپ کونہایت رحم دل اور مہربانی کرنے والا پایا (چنانچہ اتنا عرصہ مقیم رہنے کے بعد) جب آپ نے ہمارا) اشتیاق اپنے گھر والوں کی طرف محسوس کیا تو ارشادفرمایا کہ تم لوٹ جاؤ، اوراپنے گھر والوں میں رہو، اورانہیں (دین کی) تعلیم دو۔ اور نماز پڑھا کرو جب نماز کا وقت آجایا کرے، توتم میں سے کوئی شخص اذان دے دیا کرے اورتم سب میں بزرگ آدمی تمہاراامام ہوگا۔

تشریح: آپ کے رحم دل ہونے کی یہ دلیل ہے کہ جب آپ کو یہ محسوس ہوا کہ ہم اپنے گھروں کوواپس جانا چاہتے ہیں تو فوراً ہماری خواہش ظاہر کئے بغیرازخوداجازت دےدی۔

اس میں جہاں ترجمۃ الباب کا مضمون ثابت ہوا یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور اکرام ﷺ کتنے بڑے رحم دل تھے، جب آپ نے یہ محسوس فرمایا کہ وہ لوگ اپنے گھروں کوواپس جانا چاہتے ہیں تو فوراً ہی ان کی خواہش وطلب کے بغیرخودہی اجازت دےدی۔

باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة والاقامة وکذٰلک بعرفة وجمع وقول المؤذن الصلوٰة فی الرجال فی لیلة الباردة او المطیرة

(مسافر کے لئے اگر جماعت ہو، تو اذان واقامت کہنے کا بیان اوراسی طرح مقام عرفات اور مزدلفہ میں بھی اور سردی والی رات، یا پانی برسنے کی رات میں مؤذن کا یہ کہنا کہ الصلوٰة فی الرحال (نماز اپنی قیام گاہوں میں پڑھ لو)

۵۹۸: حدثنا مسلم بن ابراهیم قال حدثنا شعبة عن المهاجر ابی الحسن عن زید بن وهب عن ابی ذر قال کنا مع النبی صلے الله علیه وسلم فی سفر فاراد المؤذن ان یؤذن فقال له ابرد ثم اراد ان یوذن فقال له ابرد ثم اراد ان یؤذن فقال له ابرد حتیٰ ساوی الظل التلول فقال النبی صلے الله علیه وسلم ان شدة الحر من فیح جهنم

ترجمہ ۵۹۸: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، کہ ہم کسی سفر میں نبی کریم علیہ کے ہمراہ تھے مؤذن نے (ظہر کی) اذان دینی چاہی آپ نے اس سے فرمایا کہ (ابھی ذرا) ٹھنڈ ہو جانے دو، پھر اس نے چاہا کہ اذان دے آپ نے پھر اس سے فرمایا، کہ (ابھی ذرا اور) ٹھنڈ ہو جانے دو، یہاں تک کہ سایہ ٹیلوں کے برابر ہو گیا، پھر نبی کریم علیہ نے فرمایا، کہ گرمی کی شدت جہنم کی لپٹ سے ہوتی ہے۔

تشریح: حدیث نمبر ۵۹۸ مذہب حنفی کی قوی مؤید ہے کہ موسم گرما میں ٹھنڈے وقت نماز پڑھنا مستحب ہے، اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جن احادیث میں آفتاب ڈھل جانے کے فوراً بعد حضور علیہ کا ظہر کی نماز ادا فرمانے کا ذکر آیا ہے، اور یہ بھی ذکر آیا ہے کہ بعض صحابہ گرمی کی شدت کی بنا پر اپنے کپڑے کو بچھا کر سجدہ کرتے تھے، وہ احادیث ابتداءِ حالات کی ہیں، کیونکہ حدیث ہذا میں مؤذن کا اذان دینے کا ارادہ کرنا، اور حضور علیہ کا روکنا، پھر اور پھر یہ بتا رہا ہے کہ مؤذن نے مدینہ کے سابقہ عمل کے پیش نظر یہاں بھی عمل کرنا چاہا، اسی وجہ سے حضور انور نے منع فرمایا اور بہت ممکن ہے کہ اس کے بعد سے حضور کا عمل یہی ہو گیا ہو، کہ موسم سرما میں اول وقت میں ادا فرماتے ہوں اور گرمی کی شدت کے زمانہ میں ٹھنڈے وقت میں، یہ کہہ دینا کہ یہ واقعہ سفر کا ہے، اس لئے سفر کے موقعہ پر اجازت نکلتی ہے، جس طرح بعض دیگر امور سفر کے ساتھ مخصوص ہیں، یہ بھی ایک خصوصیت ہے درست نہیں، اس لئے کہ ٹھنڈے وقت میں نماز پڑھنے کی علت سفر و حضر دونوں میں یکساں ہے، اور وہ گرمی کی شدت ہے، گرمی کی شدت جس طرح سفر میں اذیت کا باعث ہے۔ اسی طرح حضر میں بھی ہے۔

۵۹۹: حدثنا محمد بن یوسف قال حدثنا سفیٰن عن خالد ن الحذآء عن ابی قلابة عن مالک بن الحویرث قال اتیٰ رجلان النبی صلی الله علیه وسلم یریدان السفر فقال النبی صلے الله علیه وسلم اذاانتما خرجتما فاذنا ثم اقیما ثم لیؤمکما اکبر کما

ترجمہ ۵۹۹: حضرت مالک بن حویرثؓ کہتے ہیں کہ دو شخص نبی کریم علیہ کے پاس سفر کے ارادے سے آئے تو ان سے نبی کریم علیہ نے فرمایا کہ جب تم نکلو (اور نماز کا وقت آ جائے) تو تم اذان دو، پھر اقامت کہو، اس کے بعد تم میں جو بزرگ ہو، وہ امام بنے۔

۶۰۰: حدثنا محمد بن المثنیٰ قال اخبرنا عبدالوهاب قال اخبرنا ایوب عن ابی قلابة قال حدثنا مالک

قال اتينا النبی صلے الله عليه وسلم و نحن شببة متقاربون فاقمنا عنده' عشرين يوماً وليلةً و كان رسول الله عليه وسلم رحيماً رفيقاً فلماظن انا قد اشتهينا اهلنا اوقداشتقنا سألنا عمن تركنا بعدنا فاخبرناه فقال ارجعوآ الیٓ اهليكم فاقيموا فيهم وعلموهم ومروهم وذكر اشيآء احفظها اولآ احفظها وصلوا كمارايتمونی اصلی فاذاحضرت الصلوٰة فليؤذن لكم احدكم وليؤمكم اكبركم

ترجمہ ۶۰۰: حضرت مالک (ابن حویرث) کہتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، اور ہم چند (تقریباً) برابر کی عمر کے جوان تھے بیش شب وروز ہم آپ کی خدمت میں رہے، اور رسول اللہ ﷺ نرم دل مہربان تھے، جب آپ نے خیال کیا کہ ہم کو اپنے گھر والوں کے پاس (پہنچنے کا) اشتیاق ستا رہا ہے، تو ہم سے ان کا حال پوچھا، جن کو ہم اپنے پیچھے چھوڑ آئے تھے ہم نے آپ کو سب کچھ بتایا۔ پس آپ نے فرمایا کہ واپس لوٹ جاؤ اور ان ہی لوگوں میں رہو اور ان کو تعلیم دو، اور (اچھی باتوں کا) حکم دو۔ اور چند باتیں آپ نے بیان فرمائیں (جن کی نسبت مالکؓ نے کہا) مجھے یاد ہیں یا یہ کہا کہ یاد نہیں رہیں اور جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے، اسی طرح نماز پڑھا کرو، اور جب نماز کا وقت آ جائے، تو تم میں سے کوئی شخص اذان دے دے، اور تم میں سے بڑا تمہارا امام بنے۔

۶۰۱: حدثنا مسدد قال حدثنا يحيیٰ عن عبيدالله بن عمر قال حدثنی نافع قال اذن ابن عمر فی ليلة باردة بضجنان ثم قال صلوا فی رحالكم واخبرنا ان رسول الله صلے الله عليه وسلم كان يامرمؤذناً يؤذن ثم يقول علیٰ اثرهٖ الاصلوافی الرحال فی الليلة الباردة اوالمطيرة فی السفر

ترجمہ ۶۰۱: حضرت نافعؒ روایت کرتے ہیں، کہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک سردی کی رات کو ضجنان (نامی پہاڑی) پر (چڑھ کر) اذان دی اذان دینے کے بعد یہ کہہ دیا کہ صلوا فی رحالکم اور ہم سے بیان کیا، کہ رسولِ خدا ﷺ سردی بارش کی شب کو بحالتِ سفر موذن کو حکم دے دیتے تھے کہ اذان کے بعد وہ یہ کہہ دے کہ الا صلوا فی الرجال (اپنی فرودگاہوں میں نماز پڑھ لو)۔

۶۰۲: حدثنا اسحٰق قال اخبرنا جعفر بن عون قال حدثنا ابوالعميس عن عون بن ابی جحيفة عن ابيه قال رأيت رسول الله صلے الله عليه وسلم بالابطح فجآءهٗ بلال فاٰذنه' بالصلوٰة خرج بلال بالعنزة حتیٰ ركزها بين يدی رسول الله صلے الله عليه وسلم باالابطح واقام الصلوٰة

ترجمہ ۶۰۲: حضرت ابوجحیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو (وادی ابطح میں دیکھا کہ آپ کے پاس بلال نے آ کر آپ کو نماز کی اطلاع دی، پھر نیزہ لے کر چلے اور اس کو رسولِ خدا ﷺ کے آگے (وادی) ابطح میں گاڑ دیا، اور آپ نے نماز پڑھائی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ مسافر اذان و اقامت دونوں کہے، اور اگر اقامت پر اکتفا کرے تو یہ بھی جائز ہے۔ اگر دونوں کو ترک کرے گا تو مکروہ ہے گناہ گار ہوگا، اور جماعت کی قید سے منفرد کے لئے توسع ثابت ہوا۔

باب هل يتتبع المؤذن فاه' هٰهنا و هٰهنا وهل يلتفت فى الاذان يذكر عن بلالؓ انه' جعل اصبعيه فى اذنيه و كان ابن عمر لايجعل اصبعيه فى اذنيه وقال ابراهيم لاباس ان يؤذن علےٰ غير وضوٓء وقال عطآء الوضوٓء حق و سنة و قالت عآئشة كان النبى صلے الله عليه وسلم يذكر الله علىٰ كل احيانه

(کیامؤذن اپنامنہ ادھرادھر پھیرے' اور کیا وہ اذان میں ادھراُدھر دیکھ سکتا ہے' بلالؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے اپنی دوانگلیاں اپنے دونوں کانوں میں ڈالیں' اور ابن عمرؓ اپنے کانوں میں انگلیاں نہیں دیتے تھے' ابراہیم کہتے ہیں کہ بغیر وضو کے اذان دینے میں کچھ مضائقہ نہیں عطاء کا قول ہے کہ (اذان کے لئے) وضو ثابت ہے اور مسنون ہے' اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتے تھے)

۶۰۳ : **حدثنا محمد بن يوسف قال حدثنا سفيٰن عن عون بن ابى جحيفة عن ابيه انه' راىٰ بلالايؤذن فجعلت اتتبع فاه هٰهنا و هٰهنا بالاذان.**

ترجمہ: حضرت ابوجحیفہؓ روایت کرتے ہیں، کہ میں نے بلالؓ کو اذان دینے میں ان کو اپنا منہ اذان دیتے وقت ادھرادھر کرتے پایا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ اذان کے وقت انگلیاں کان میں ڈالنے اور کان کے سوراخ بند کرنے کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ سانس بند ہو کر آواز میں قوت آجاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کانوں پر یوں ہی اوپر سے ہاتھ رکھ لینا کافی نہیں اور نہ اس سے سنت ادا ہوتی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کو حدیث نہ پہنچی ہوگی، یا ضروری نہ سمجھ کر اس کو ترک کیا ہوگا۔

اذان میں قبلہ کے رخ سے سینہ پھرانا نہ چاہئے، حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح کے وقت صرف منہ کو داہنے بائیں کیا جائیگا۔

امام بخاریؒ نے ابراہیم سے نقل کیا کہ بغیر وضوء کے اذان میں کوئی حرج نہیں، ہمارے حنفیہ کے دو قول ہیں، ایک مطلقاً کراہت کا ہے اور حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہی قول میرا مختار ہے، کیونکہ حدیث کے موافق ہے اگرچہ اس کی سند ضعیف ہے۔ دوسرا قول صرف اقامت کی کراہت کا ہے، امام بخاری چونکہ مسِ مصحف اور دخولِ مسجد وغیرہ میں بھی توسع کرتے ہیں، اس لئے یہاں بھی ان کے نزدیک توسع ہوگا۔

باب قول الرجل فاتتنا الصلوٰة و كره ابن سيرين ان يقول فاتتنا الصلوٰة وليقل لم ندرك وقول النبى صلے الله عليه وسلم اصح

(آدمی کا یہ کہنا کہ ہماری نماز جاتی رہی' مکروہ سمجھا ہے' اس طرح کہنا چاہئے کہ ہم نے نماز نہیں پائی' مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بہت درست ہے)

۶۰۴ : **حدثنا ابو نعيم قال حدثنا شيبان عن يحيىٰ عن عبدالله بن ابى قتادة عن ابيه قال بينما نحن نصلى مع النبى صلے الله عليه وسلم اذسمع جلبة رجال فلما صلےٰ قال ماشانكم قالوا استعجلنا الى الصلوٰة قال فلا تفعلوا اذآ اتيتم الصلوٰة فعليكم السكينة فماادركتم فصلوا وما فاتكم فاتموا**

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھ رہے تھے آپ نے کچھ لوگوں کی آواز سنی، جب آپ نماز پڑھ چکے تو فرمایا، کہ تمہارا کیا حال ہے (یعنی یہ شور کیوں ہوا) انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے نماز کے لئے عجلت کی، آپ نے فرمایا۔ اب ایسا نہ کرنا، جب تم نماز کے لئے آؤ، تو نہایت اطمینان سے آؤ، پھر جس قدر نماز پاؤ اس قدر پڑھو اور جس قدر تم سے جاتی رہے اس کو پورا کرلو۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ ابن سیرین کی ناپسندیدگی کا تعلق تہذیب الفاظ سے ہے، جس طرح شریعت نے عتمہ کا اطلاق عشا پر اور یثرب کا اطلاق مدینہ طیبہ پر ناپسند کیا ہے۔ اوراس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نظرِ شریعت میں جماعت کا فوت ہوجانا نماز کے فوت ہوجانے کے برابر ہے۔

باب مآادر کتم فصلوا و ما فاتکم فاتموا قاله' ابو قتاده عن النبی ﷺ

(اس امر کا بیان) کہ جس قدر نماز تم کو مل جائے پڑھ لو اور جس قدر تم سے چھوٹ جائے اس کو پورا کرلو۔ اس کو ابو قتادہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے

۶۰۵: حدثنا ادم قال حدثنا ابن ابی ذئب قال حدثنا الزهری عن سعید ابن المسیب عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم و عن الزهری عن ابی سلمة عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال اذا سمعتم الاقامة فامشوٓا الی الصلوٰة وعلیکم السکینة والوقار ولاتسرعوا فما ادرکتم فصلوا وما فاتکم فاتموا.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، جب تم اقامت سنو تو نماز کے لئے وقار اور اطمینان کو اختیار کئے ہوئے چلو، اور دوڑو نہیں، پھر جس قدر نماز تمہیں مل جائے پڑھ لو، اور جس قدر چھوٹ جائے، اس کو بعد میں پورا کرلو۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیث الباب کے تحت ترتیبِ صلوٰۃِ مسبوق کی بحث آجاتی ہے، حنفیہ کے یہاں یہ ہے کہ امام کے ساتھ وہ جتنی نماز پڑھتا ہے، وہ اس کے لئے بھی آخری حصہ ہے، اور امام کے بعد وہ اپنی پہلی رہی ہوئی نماز ادا کرے گا، گویا مسبوق اپنی پہلی باقی ماندہ نماز میں منفرد جیسا ہوگا۔ کیونکہ حدیث میں لفظِ فوات وارد ہے اور دوسری احادیث میں و ما فاتکم فاقضوا بھی آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلا حصہ فوت ہو چکا ہے، اور اس کو امام کے بعد قضا کرے گا۔ شیخ اکبرؒ نے بھی فرمایا کہ مسبوق باقی نماز کو قضا کرتا ہے۔ شافعیہؒ کہتے ہیں کہ امام کے ساتھ جتنی نماز ملی، وہ مسبوق کے لئے پہلا حصہ ہے، اور امام کے بعد وہ اپنی باقی کو پورا کرے گا۔ کیونکہ حدیث میں اتمام ہے، اور اتمام آخری حصہ کو ادا کرنے کا نام ہے، حضرتؒ نے فرمایا کہ تاویل دونوں کے لئے ممکن ہے، اور ہمارے لئے اس بارے میں دو حدیث اور بھی ہیں جن کو ''فصل الخطاب'' میں ذکر کیا ہے۔

باب متیٰ یقوم الناس اذارا وا الامام عندالاقامة

(تکبیر کے وقت جب امام کو دیکھ لیں، تو کس وقت کھڑے ہوں)

۶۰۶: حدثنا مسلم بن ابراهیم قال حدثنا هشام قال کتب الی یحییٰ عن عبدالله بن ابی قتادة عن ابیه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا اقیمت الصلوٰة فلاتقوموا حتی ترونی.

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ نماز کی اقامت کے وقت جب تک مجھے نہ دیکھ لو، اس وقت تک کھڑے نہ ہوا کرو۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ بعض احادیث سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرامؓ نمازِ جماعت کی اقامت پوری ہونے کے بعد کھڑے ہوتے تھے، اور بعض سے یہ کہ اقامت کے دوران کھڑے ہوتے تھے اور ہماری کتب فقہ حنفی میں بھی دونوں طرح ہے، درمختار کا حاشیہ طحطاوی دیکھا جائے، تنقیح مسئلہ یہ ہے کہ اگر امام مسجد سے باہر ہو تو اس کے مسجد میں داخل ہونے پر صفیں درست کرنے کے لئے کھڑے ہوں، اگر وہ مسجد کے اندر ہی ہے تو جب وہ اپنی جگہ سے امامت کے لئے اٹھے، اس وقت کھڑے ہوں، پھر یہ مسئلہ نفسِ صلوٰۃ سے متعلق نہیں ہے بلکہ

آدابِ صلوٰۃ کا ہے، اس لئے اگر کوئی پہلے سے کھڑا ہو جائے تب بھی گناہ گار نہ ہوگا۔ یہ بھی علماء سے مروی ہے کہ حضرت بلالؓ منتظر رہتے تھے حضور علیہ السلام کے گھر سے نکلنے پر اقامت کہتے تھے، اور دوسرے صحابۂ کرام آپ کو صف میں آجانے پر دیکھتے تھے، تو اس وقت کھڑے ہو جاتے تھے، اس طرح جب حضور علیہ السلام مصلے پر پہنچتے تھے تو اقامت پوری ہونے تک صفیں درست ہو چکی ہوتی تھیں۔ باقی آپ کو دیکھنے سے قبل کوئی کھڑا نہ ہوتا تھا کہ یہ عبث بھی تھا۔

باب لایقوم الی الصلوٰۃ مستعجلاً ولیقم الیھا بالسکینۃ والوقار

(نماز کے لئے جلدی سے نہ اُٹھے، بلکہ اطمینان اور وقار کے ساتھ اٹھے)

۶۰۷: حدثنا ابو نعیم قال حدثنا شیبان عن یحییٰ عن عبداللہ بن ابی قتادۃ عن ابیہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتیٰ ترونی و علیکم السکینۃ تابعہ علی بن المبارک

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب نماز کی اقامت کہی جائے، تو تم اس وقت تک نہ کھڑے ہو، جب تک کہ مجھے نہ دیکھ لو، اور اپنے اوپر اطمینان کو لازم سمجھو (علی بن مبارک نے اس کی متابعت کی ہے)۔

تشریح: حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا:۔ شارحین نے غرضِ ترجمۃ الباب نہیں لکھی، میرے نزدیک اشارہ ہے قولِ باری تعالیٰ **اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا** الایہ کی طرف کہ بظاہر آیتِ مذکورہ سے حدیث الباب متعارض معلوم ہوتی ہے، حافظؒ نے لکھا کہ سعی سے مراد آیت میں اس کام کے لئے آگے بڑھنا ہے اور حدیث میں دوڑنا ہے نماز کی طرف دوڑ کر جانا وقار و سکینت اور آدابِ صلوٰۃ کے خلاف ہے۔ (الابواب ص۲۵۹\۲)

باب ھل یخرج من المسجد لعلۃ

(کیا مسجد سے کسی عذر کی بنا پر نکل سکتا ہے؟)

۶۰۸: حدثنا عبدالعزیز بن عبداللہ قال حدثنا ابراھیم بن سعد عن صالح ابن کیسان عن ابن شھاب عن ابی سلمۃ عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج وقد اقیمت الصلوٰۃ وعدلت الصفوف حتیٰ اذاقام فی مصلاہ انتظرنا ان یکبر انصرف قال علیٰ مکانتکم فمکثنا علیٰ ھیئتنا حتیٰ خرج الینا ینطف راسہ مآء و قداغتسل

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ (ایک مرتبہ مسجد سے) باہر چلے گئے حالانکہ نماز کی اقامت ہو چکی تھی، اور صفیں بھی برابر کر لی گئی تھیں، جب آپ (واپس آکر) اپنے مصلے میں کھڑے ہو گئے، ہم منتظر رہے، کہ اب آپ تکبیر کہیں گے (لیکن) آپ پھر گئے (اور ہم سے) فرمایا، کہ اپنی جگہ پر رہو، ہم بحال خود کھڑے رہے (تھوڑے عرصہ میں) آپ ہمارے پاس تشریف لائے، اور آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا، آپ نے غسل کیا تھا۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے ایک شخص کو دیکھا مسجد سے بعد اذان کے نکل کر جا رہا ہے آپ نے فرمایا کہ اس شخص نے حضور اکرم ﷺ کی نافرمانی کی۔ اس لئے امام بخاریؒ نے حدیث الباب سے ثابت کیا کہ کسی ضرورت کے تحت نکلنے کی اجازت بھی ہے۔ فقہ حنفی کی کتاب بحر میں بھی ہے کہ جو شخص لوٹنے کے ارادہ سے نکلے یا اس کو کسی دوسری جگہ امامت ہی کرانی ہو تو اس کو اجازت ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عام حکم شرعی کو رائے سے خاص بھی کر سکتے ہیں اگرچہ ابتداءً ہی ہو، بشرطیکہ حکم شرعی کی وجہ جلی و واضح

ہو۔جس طرح حضرت عمرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو "من قال لا اله الا الله دخل الجنة" کے اعلان سے روک دیا تھا، اور پھر حضور علیہ السلام نے بھی اس پر رضامندی عطا فرمادی تھی، ایسا ہی فقہاء مجتہدین سے بھی ثابت ہے اس لئے اس کو عمل بالرائے سے مطعون نہیں کر سکتے۔

باب اذا قال الامام مكانكم حتىٰ يرجع انتظروه

اگر امام کہے کہ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو جب تک کہ میں لوٹ کر نہ آؤں، تو مقتدی اس کا انتظار کریں

۶۰۹: حدثنا اسحٰق قال اخبرنا محمد بن يوسف قال حدثنا الاوزاعي عن الزهري عن ابي سلمة بن عبدالرحمٰن عن ابي هريرة قال اقيمت الصلوٰة فسوى الناس صفوفهم فخرج رسول الله صلى الله عليه وسلم فتقدم و هو جلب ثم قال علىٰ مكانكم فرجع فاغتسل ثم خرج وراسه' يقطر مآء فصلے بهم

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نماز کی اقامت ہوگئی، اور لوگوں نے اپنی صفیں برابر کر لیں، اتنے میں رسول خدا ﷺ باہر نکلے اور آگے بڑھ گئے، حالانکہ آپ جب تھے (یاد آنے پر) فرمایا کہ تم لوگ اپنی جگہ پر کھڑے رہو، چنانچہ آپ لوٹ گئے، اور آپ نے غسل فرمایا، پھر باہر تشریف لائے، تو آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا، اب آپ نے نماز پڑھائی۔

تشریح: حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ جب کوئی امام کسی ضرورت سے درمیان نماز کے چلا جائے اور کسی قرینہ سے معلوم ہو کہ لوٹ کر آئے گا تو اس کا انتظار کرنا چاہئے، ورنہ دوسرا امام آگے بڑھ کر نماز پوری کرا دے گا۔ (لامع الدراری)

باب قول الرجل ما صلينا

۶۱۰: حدثنا ابو نعيم قال حدثنا شيبان عن يحيٰ قال سمعت اباسلمة يقول انا جابر عن عبدالله ان النبي صلے الله عليه وسلم جآءه عمر بن الخطاب يوم الخندق فقال يا رسول الله والله ما كدت ان اصلى حتىٰ كادت الشمس تغرب وذٰلك بعد ما افطر الصآئم فقال النبي صلے الله عليه وسلم والله ما صليتها فنزل النبي صلے الله عليه وسلم الىٰ بطحان وانا معه' فتوضأ ثم صلے العصر بعدما غربت الشمس ثم صلے بعدها المغرب

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ خندق کے دن حضرت عمر بن الخطابؓ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! واللہ میں نے اب تک عصر کی نماز نہیں پڑھی، اور آفتاب غروب ہو گیا ہے (حضرت عمرؓ کا) یہ کہنا ایسے وقت تھا، کہ روزہ دار کے افطار کا وقت ہو جاتا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ واللہ! میں نے بھی عصر کی نماز نہیں پڑھی، پس نبی کریم ﷺ بطحان میں اترے اور میں آپ کے ہمراہ تھا، آپ نے وضو فرمایا اور آفتاب غروب ہو جانے کے بعد پہلے عصر کی نماز پڑھی، اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی۔

تشریح: حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا کہ "امام بخاری اس سے تہذیب الفاظ کا سبق دینا چاہتے ہیں، لیکن استدلال اگر خود حضور علیہ السلام کے قول والله ما صليتها سے ہوتا تو زیادہ مناسب تھا"۔ (الابواب والتراجم)

باب الامام تعرض له' الحاجة بعدالآقامة

۶۱۱ : حدثنا ابو معمر عبدالله بن عمرو قال حدثنا عبدالوارث قال حدثنا عبدالعزیز هو ابن صهیب عن انس قال اقیمت الصلوٰة والنبی صلے الله علیه وسلم یناجی رجلاً فی جانب المسجد فما قام الی الصلوٰة حتیٰ نام القوم

ترجمہ: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نماز کی اقامت ہوگئی اور نبی کریم ﷺ مسجد کے ایک گوشہ میں کسی شخص سے آہستہ باتیں کررہے تھے، پس آپ نماز کے لئے کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ بعض لوگ اونگنے لگے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ درمختار وغیرہ کتب حنفیہ میں ہے کہ امام اگر کسی مصروفیت یا ضرورت کی وجہ سے اقامت کے بعد دیر تک نماز شروع نہ کرے تو اقامت کا اعادہ ہونا چاہئے، ورنہ نہیں، فاصلہ یا تاخیر کتنی ہو اس کا تعین دشوار ہے۔

باب الکلام اذااقیمت الصلوٰة

(اقامت ہوجانے کے بعد کلام کرنے کا بیان)

۶۱۲ : حدثنا عیاش بن الولید قال حدثنا عبدالاعلیٰ ثنا حمید قال سالت ثابت البنانی عن الرجل یتکلم بعد ماتقام الصلوٰة فحدثنی عن انس بن مالک قال اقیمت الصلوٰة فعرض للنبی صلے الله علیه وسلم رجل فحبسه' بعد مآ اقیمت الصلوٰة

ترجمہ: حمید روایت کرتے ہیں کہ میں نے ثابت بنانی سے اس شخص کی بابت پوچھا جو نماز کی اقامت ہوجانے کے بعد کلام کرے، انہوں نے مجھ سے حضرت انس بن مالکؓ کی حدیث بیان کی، کہ انہوں نے کہا (ایک مرتبہ) نماز کی اقامت ہو چکی تھی، اتنے میں نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص آگیا، اس نے آپ کو اقامت ہوجانے کے بعد روک لیا (اور باتیں کرتا رہا)

تشریح: حافظؒ نے فرمایا کہ غرض بخاری مطلقاً کراہتِ کلام کارد ہے، علامہ عینیؒ نے فرمایا کہ حدیث سے جوازِ کلام بعدالاقامۃ ثابت ہے، اور حنفیہ کے نزدیک بھی اقامت وتکبیر تحریمہ کے درمیان بات کرنے کی کراہت جب ہے کہ بلاضرورت ایسا کیا جائے، یعنی کسی امر شرعی و دینی کے لئے کلام ہو تو پھر کراہت نہ ہوگی۔

باب وجوب صلوٰة الجماعة وقال الحسن ان منعته امه' عن العشآء فی الجماعة شفقة لم یطعها

(نماز باجماعت کے واجب ہونے کا بیان' حسن (بصری) نے کہا ہے' کہ اگر کسی شخص کی ماں ازراہِ محبت عشاء کی نماز باجماعت پڑھنے سے منع کرے' تو وہ اس کا کہنا مانے)

۶۱۳ : حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هریرة ان رسول الله صلے الله علیه وسلم قال والذی نفسی بیده لقد هممت ان اٰمر بحطب لیحطب ثم اٰمر بالصلوٰة فیؤذن لهاثم امر رجلاً فیوم الناس ثم اخالف الیٰ رجال فاحرق علیهم بیوتهم والذی نفسی بیده لویعلم احدهم انه' یجدعرقاً سمیناً اومرماتین حسنتین لشهدالعشآء

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا، کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میرا یہ ارادہ ہوا ہے کہ (اولا) لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں (اس کے بعد) حکم دوں، کہ عشائے کی نماز کوئی دوسرا شخص پڑھائے، اور میں (خود) کچھ (لوگوں کو ہمراہ لے کر) لوگوں کے گھروں تک پہنچوں، (جو عشاء کی نماز جماعت سے نہیں پڑھتے) اور ان کے گھروں کو آگ لگادوں، قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کہ اگر ان میں سے کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فربہ ہڈی، یا دو عمدہ گوشت والی ہڈیاں پائے گا، تو یقیناً عشاء کی نماز میں آئے گا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ نے جماعت کے وجوب کا قول اختیار کیا ہے، حنفیہ کے دو قول ہیں ایک وجوب کا دوسرا سنت موکدہ کا۔ صاحب بحر نے فیصلہ کر دیا کہ ادنی وجوب اور اعلیٰ سنت موکدہ کا درجہ ایک ہے، تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ سنن موکدہ میں سے اعلیٰ درجہ کی سنت ہے، شافعیہ کے یہاں بھی دو قول ہیں، ایک فرض کفایہ کا دوسرا سنت موکدہ کا، امام احمد کا ایک قول فرض عین و شرط صحت صلوٰۃ کا ہے، دوسرا یہ کہ فرض تو ہے مگر شرط صحت صلوۃ نہیں۔ یہ اختلاف نظر معنوی پر مبنی ہے، ترک جماعت پر وعید کی احادیث پر نظر کی جائے تو فرض و واجب جیسا درجہ سمجھ میں آتا ہے' اور اگر ان احادیث پر نظر کی جائے جن میں بظاہر معمولی اعذار کے سبب بھی ترک جماعت کی گنجائش نکلتی ہے تو اس کا درجہ سنت کا ہی ماننا پڑتا ہے۔ مثلاً آتا ہے کہ کھانے کی وجہ سے اور بارش، ظلمت، سخت گرمی، سخت سردی وغیرہ کے سبب ترک جائز ہے۔ کتب فقہ حنفی میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص فتاوی اور علمی تحقیقات کے لئے مراجعت و مطالعہ کتب میں زیادہ مشغول ہو تو اس کے لئے بھی ترک جماعت عذر ہے اور جائز ہے (اس سے معلوم ہوا کہ مفتی و مصنف و مدرس کے لئے مطالعہ کتب و مراجعت ضروری ہے، اور آج کل جو سطحیت و عدم اشتغال کی صورت ہوگئی ہے، اس سے علمی و تحقیقی شان زوال پذیر ہے)

لہٰذا اس کے بارے میں خلاف اتنا زیادہ نہیں، جتنا عام طور سے سمجھ لیا گیا ہے۔ مذاہب و اعذار کی تفصیل اوجز میں دیکھی جائے' حنفیہ میں سے امام طحاوی و کرخی وغیرہ کا مختار یہ ہے کہ جماعت کی نماز فرض کفایہ ہے یعنی اگر کسی وقت نماز پر مسجد معطل ہو کہ کوئی بھی جماعت سے نہ پڑھے تو سب گناہ گار ہوں گے' اور اگر جماعت ہوتی رہے اور کوئی شخص کسی عذر سے شرکت نہ کرے اور تنہا پڑھ لے تو کوئی گناہ نہ ہوگا۔ (لامع ص ۲۴۴)

باب فضل صلوٰة الجماعة و كان الاسود اذا فاتته الجماعة ذهب الىٰ مسجد اٰخر وجآء انس بن مالک الى مسجد قد صلے فيه فاذن واقام وصلے جماعة

۶۱۴: حدثنا عبدالله بن يوسف قال اخبرنا مالک عن نافع عن عبدالله ابن عمر ان رسول الله صلے الله عليه وسلم قال صلوٰة الجماعة تفضل صلوٰة الفذبسبع و عشرين درجة

۶۱۵: حدثنا عبدالله بن يوسف قال حدثنى الليث قال حدثنى يزيدبن الهاد عن عبدالله بن خبابؓ عن ابى سعيد انه' سمع النبى صلے الله عليه وسلم يقول صلوٰة الجماعة تفضل صلوٰة الفذ وبخمس و عشرين درجةً

۶۱۶: حدثنا موسىٰ بن اسمٰعيل قال حدثنا عبدالواحد قال حدثنا الاعمش قال سمعت اباصالح يقول سمعت اباهريرة يقول قال رسول الله صلے الله عليه وسلم صلوٰة الرجل فى الجماعة تضعف علىٰ صلوٰته فى بيته وفى سوقه خمسةً و عشرين ضعفاً و ذٰلک انه اذا توضأفاحسن الوضوٓء ثم خرج الى المسجد لايخرجه' الا الصلوٰة لم يخط خطوطةً الا رفعت بها درجةً وحط عنه' بها خطيئة فاذا صلے لم تنزل الملٰئكة تصلى عليه مادام فى مصلاه اللهم صل عليه اللهم ارحمه ولايزال احدكم فى صلوة ما انتظر الصلوٰة

ترجمہ ۶۱۴: حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ جماعت کی نماز تنہا نماز پر ستائیس درجہ (ثواب میں) زیادہ ہے۔
ترجمہ ۶۱۵: حضرت ابوسعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جماعت کی نماز اکیلے شخص کی نماز سے پچیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے:۔
ترجمہ ۶۱۶: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ آدمی کا جماعت سے نماز پڑھنا، اسکے اپنے گھر میں، اور اپنے بازار میں نماز پڑھنے سے پچیس درجہ (ثواب میں) زیادہ ہے کہ جب عمدہ طور پر وضو کر کے مسجد کی طرف چلے، اور محض نماز ہی کے لئے چلے تو جو قدم رکھے گا، اسکے عوض میں اس کا ایک درجہ بلند ہوگا، اور ایک گناہ اس کا معاف ہوگا، پھر جب وہ نماز پڑھ لے گا تو برابر فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ اپنے مصلی میں رہے گا، کہ یا اللہ اس پر رحمت نازل فرما، یا اللہ اس پر مہربانی فرما، اور تم میں سے ہر شخص جب تک کہ نماز کا انتظار کرتا ہے نماز میں متصور ہوتا ہے:۔

تشریح: حضرت ابوہریرہؓ پچیس درجے زیادہ ثواب روایت کرتے ہیں، اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ستائیس درجے اور یہی روایت زیادہ قوی ہے۔

حافظ نے لکھا کہ علامہ ابن المنیرؒ نے امام بخاریؒ کے اس ترجمہ پر اعتراض کیا ہے کیونکہ اس سے پہلے باب میں وہ جماعت کا وجوب بتلا چکے ہیں تو اس کے بعد صرف فضیلت کا اثبات اس کے منافی یا بے فائدہ ہے (کیونکہ کسی امر کا حد وجوب یا فرض میں داخل ہو جانا ہی اس کے لئے ہزار فضیلتوں کا ضامن ہو جاتا ہے) پھر حافظ نے لکھا کہ علامہ نے اس کے لئے جواب دہی بھی طویل کی ہے، مگر اتنا ہی جواب کافی ہے کہ کسی شئی کا وجوب اس کے ذی فضیلت ہونے کے منافی نہیں ہے یا مقصود اظہار فضیلت بہ لحاظ منفرد کے ہے۔ اس کے بعد حافظ نے لکھا کہ امام بخاری کے اثر اسود و انس ذکر کرنے سے یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ احادیث الباب میں جو فضیلت وارد ہے وہ صرف جماعت مسجد کے لئے ہے گھر وغیرہ کی جماعت کے لئے نہیں ہے، ورنہ حضرت اسودؓ دوسری مسجد میں نہ جاتے، اور حضرت انسؓ جماعت ثانیہ مسجد میں نہ کرتے۔ (فتح ص ۲/۸۹)

حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ جس مسجد میں حضرت انسؓ نے دوسری جماعت اذان و اقامت کے ساتھ کی تھی، وہ راستہ کی مسجد تھی، لہٰذا اس سے جماعت ثانیہ کا جواز نہیں نکلے گا، علامہ عینی نے لکھا کہ کسی مسجد میں جماعت ہو چکنے کے بعد مکرر جماعت کرنے میں اختلاف ہوا ہے، حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت علقمہ و اسود کے ساتھ جماعت ثانیہ کی ہے اور یہی قول حضرت عطاء کا ہے امام احمد و اسحٰق وغیرہ نے یہی مسلک اختیار کیا (وہ ہر مسجد میں بے تکلف کئی کئی جماعت کو جائز بلا کراہت کہتے ہیں)

حضرت سالم وغیرہ اس کو مکروہ کہتے ہیں اور یہی مسلک جمہور (امام ابوحنیفہ، امام مالک، ثوری، اوزاعی وغیرہ) کا ہے امام شافعی فرماتے ہیں کہ مسجد اگر راستہ پر ہو، جس کا کوئی امام مقرر نہ ہو تو اس میں کئی جماعت درست ہیں ورنہ تنہا پڑھنی چاہیئے۔ درمختار وغیرہ کتب حنفیہ میں ہے کہ اذان و اقامت کے ساتھ مسجد محلّہ میں تکرار جماعت مکروہ ہے، اور مسجد طریق میں مکروہ نہیں اور اسی طرح جس میں کوئی امام و مؤذن مقرر نہ ہو،

افادۂ انور: حضرتؒ نے فرمایا:۔ حضرت انسؓ نے جماعت ثانیہ مسجد محلّہ میں نہیں کی تھی بلکہ مسجد بنی زریق میں کی تھی، اور کراہت کا مسئلہ مسجد محلّہ سے متعلق ہے۔ اور حنفیہ میں سے امام ابویوسفؒ کے نزدیک جماعت ثانیہ پہلے امام کی جگہ چھوڑ کر بلا اذان و اقامت کے درست بلا کراہت ہے، اور شاید ترک اذان و اقامت بھی پہلی حالت بدلنے کے لئے، اور ان کے نزدیک بھی عدم کراہت اس وقت ہے کہ اتفاقی طور سے جماعت اولی رہ گئی ہو، نہ اس وقت کہ دوسری جماعت جان بوجھ کر کرے یا اس کا عادی ہو جائے، اور حضرت انسؓ سے بھی مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ تفصیل ہے کہ انہوں نے دوسری جماعت اس طرح کی کہ خود امام ہو کر درمیان صف میں کھڑے ہوئے، جماعت اول کی طرح آگے کھڑے ہو کر امامت نہیں فرمائی، اس سے بھی پہلی حالت و ہیئت بدلنے کا اشارہ ملتا ہے، جو امام ابویوسفؒ کا مسلک ہے فرق یہ ہوا کہ حضرت انسؓ نے اذان و اقامت مکرر کر کے اپنی جگہ بدل دی اور ابویوسف بغیر اذان و اقامت کے امام کی جگہ بدلنے کے قائل ہیں۔ پھر یہ کہ

تکرار اذان واقامت کا قول کسی نے بھی اختیار نہیں کیا ہے۔ اس لئے وہ کسی کا بھی متدل نہیں ہے۔

تیسری حدیث الباب ص ۶۱۶ میں **قولہ صلوٰۃ الجماعۃ تضعف علی صلاتہ فی بیتہ** پر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں مقابلہ نماز جماعت اور نماز منفرد کا ہے، جماعت مسجد اور جماعت بیت کا نہیں ہے، کیونکہ نظر شارع میں مساجد کی جماعت ہے گھروں کی نہیں، لہٰذا گھر کی یا بازار کی نماز کا ذکر جہاں بھی حدیث میں آیا ہے وہ اسی عام نظر شارع کے تحت ہوا ہے۔ کیونکہ زمانہ سلف میں بازاروں میں بھی مساجد نہ تھیں۔ اس طرح گویا جماعت بیت کا مسئلہ بیان نہیں ہوا ہے، پھر یہ کہ جس کی نماز جماعت مسجد کی فوت ہو جائے تو وہ گھر میں جماعت کرے یہ مسئلہ کتب فقہ میں ہے، آگے یہ مسئلہ رہتا ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت مسجد کا اہتمام ہی نہ کرے اور گھر میں جماعت کرے تو وہ تارک جماعت کہلائے گا یا نہیں، اس مسئلہ کو منیہ اور اس کی شرح حلبی کبیر میں ذکر کیا گیا ہے۔

یہاں ہم اس کا مضمون نقل کرتے ہیں:۔ اگر کوئی شخص تراویح کی نماز گھر کے اندر جماعت کے ساتھ ادا کرے تو جماعت کی فضیلت حاصل کرے گا۔ اگرچہ جماعت مسجد کے برابر نہ ہوگا، کیونکہ مسجد کی فضیلت زیادہ ہے اور یہی بات فرائض میں بھی ہے کہ وہ بھی اگر گھر میں مسجد کی طرح جماعت کے ساتھ ادا کئے جائیں تو جماعت کی فضیلت حاصل ہو جائے گی ۲۷ گنا والی، مگر مسجد کے برابر نہیں کیونکہ اس میں شرف مکان، اظہار شعائر، تکثیر سوادِ مسلمین اور اسلافِ قلوب کی نوعیت بڑھی ہوئی ہے، لیکن اس میں قید یہ ہے کہ دونوں جگہ کی نماز جماعت بہ لحاظ استکمال سنن وآداب برابر ہو، اگر گھر کی نماز زیادہ کامل واکمل ہو اور امام مسجد مثلاً سنن وآداب کی رعایت نہ کرتا ہو تو گھر کی جماعت زیادہ افضل ہوگی، اور اگر امام مسجد واجبات کی رعایت بھی نہ کر سکتا ہو جیسا کہ اس زمانہ کے بہت سے امام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور گھر کا امام اعلم وافضل ہو اور واجبات وسنن کی رعایت بھی زیادہ کرے تو وہ جماعت بدرجہ اولی مسجد سے افضل ہوگی۔ (حلبی کبیر ص ۴۰۲)

امام بخاریؒ نے مستقل باب باندھا ہے اہل علم وفضل کے احق بالامامۃ ہونے کا، اور حنفیہ نے اعلم بالمسائل کو اقرأ پر ترجیح دی ہے۔ مگر اس زمانہ میں جہلاء عوام قاری کو عالم پر ترجیح دیتے ہیں۔ واللہ المستعان۔

مراقی الفلاح میں ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنا مردوں کے لئے سنت موکدہ ہے اور جماعت کا ثواب ایک مقتدی کے ساتھ بھی حاصل ہو جائے گا، خواہ وہ صبی ہو یا عورت ہو، اگرچہ گھر میں ہی ادا کرے۔ علامہ طحطاویؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں اپنی بیوی یا باندی کے ساتھ جماعت کرے تو اس کو بھی جماعت کی فضیلت حاصل ہو جائے گی اگرچہ مسجد کی فضیلت زیادہ ہوگی۔

حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا:۔ جماعت مسجد کو جماعت بیت پر کیفاً فضیلت ہوگی اگرچہ کماً دونوں برابر ہوں گی، اور دونوں کا ثواب ۲۵ یا ۲۷ گنا ہوگا، خواہ مسجد میں جماعت سے پڑھے یا گھر میں یا بازار میں۔ (لامع ص ۱/۱۸۷)

باب فضل صلوٰۃ الفجر فی جماعۃ

(فجر کی نماز جماعت سے پڑھنے کی فضیلت کا بیان)

۶۱۷: حدثنا ابوالیمان قال اخبرنا شعیب عن الزهری قال اخبرنی سعید ابن المسیب و ابو سلمة بن عبدالرحمٰن ان اباهریرة قال سمعت رسول الله صلے الله علیه وسلم یقول تفضل صلوٰة الجمیع صلوٰة احدکم وحده' بخمسة و عشرین جزءً و تجتمع ملائکة اللیل وملٰئکة النهار فی صلوٰة الفجر ثم یقول ابوهریرة واقرء وا ان شئتم ان قرآن الفجر کان مشهوداً قال شعیب وحدثنی نافع عن عبدالله بن عمر قال تفضلها بسبع و عشرین درجةً

۶۱۸: حدثنا عمر بن حفص قال حدثنا ابی قال حدثنا الاعمش قال سمعت ام الدرداء تقول دخل علی ابوالدرداء و هو مغضب فقلت مآاغضبک قال واللہ مآاعرف من امر محمد صلے اللہ علیہ وسلم شیئاً الا انهم یصلون جمیعاً۔

۶۱۹: حدثنا محمد بن العلآء قال حدثنآ ابواسامة عن برید بن عبداللہ عن ابی بردة عن ابی موسیٰ قال قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم اعظم الناس اجراً فی الصلوٰة ابعدهم فابعدهم ممشی والذی ینتظر الصلوٰة حتیٰ یصلیها مع الامام اعظم اجراً من الذی یصلی ثم ینام

ترجمہ ۶۱۷: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ تم میں سے ہر شخص کی جماعت کی نماز سے تنہا نماز پچیس درجے (ثواب میں) زیادہ ہے، اور رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے فجر کی نماز میں جمع ہوتے ہیں، اس کے بعد حضرت ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ اگر چاہو تو (اس کی دلیل میں) ان قرآن الفجر کان مشهودا پڑھ لو، شعیب کہتے ہیں، مجھ سے نافع نے عبداللہ بن عمر سے نقل کیا کہ جماعت کی نماز تنہا نماز سے ستائیس درجے (ثواب میں) زیادہ ہے:۔

ترجمہ ۶۱۸: حضرت سالم روایت کرتے ہیں کہ میں نے ام درداء کو کہتے ہوئے سنا، وہ کہتی تھیں کہ (ایک دن) ابودرداء میرے پاس غصہ میں بھرے ہوئے آئے، میں نے کہا کہ آپ کو کیوں اتنا غصہ آ گیا؟ بولے کہ اللہ کی قسم! محمد ﷺ کے دین کی کوئی بات (اب) میں نہیں دیکھتا، صرف اتنا ضرور ہے کہ وہ جماعت سے نماز پڑھ لیتے ہیں (سو اب اس میں بھی کوتاہی ہونے لگی ہے)۔

ترجمہ ۶۱۹: حضرت ابوموسیٰ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، کہ سب لوگوں سے زیادہ ثواب ان لوگوں کو ملتا ہے جن کی مسافت (مسجد سے) دور ہے پھر جن کی ان سے دور ہے، اور وہ شخص جو جماعت کا منتظر رہے، تا کہ اس کو امام کے ساتھ پڑھے، باعتبار ثواب کے اس سے زیادہ ہے (جو جلدی سے) نماز پڑھ کے سو جاتا ہے۔

تشریح: حافظؒ نے لکھا کہ یہ باب پہلے باب سے اخص ہے، اور اس میں چونکہ دن و رات کے فرشتوں کے جمع ہونے کی وجہ سے فضیلت بھی زیادہ ہے، اس لئے اس کے لئے مستقل باب لائے ہیں۔ (فتح ص ۲/۹۴)

ترجمۃ الباب سے احادیث کی غیر مطابقت

یہاں امام بخاریؒ نے باب کے تحت جو دوسری حدیث ص ۶۱۸ پیش کی ہے، اس میں جماعت نماز فجر کا کوئی ذکر نہیں ہے، صرف مطلق جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھنے کا ذکر ہے۔ لہٰذا ترجمۃ الباب سے مطابقت نہیں ہے۔

محقق عینیؒ نے لکھا کہ جزوی طور سے تو مطابقت ہو ہی گئی اور امام بخاری کی اس کتاب میں اس قسم کے تجوزات بہ کثرت ہیں۔ (عمدہ ص ۲/۶۹۳) حافظ نے ابن المنیر کا جواب بھی یہی نقل کیا کہ یصلون جمیعا میں نماز فجر بھی آ گئی، حافظ نے یہ بھی لکھا کہ ان کے علاوہ کسی شارح نے مناسبت ترجمہ نہیں بتلائی (فتح ص ۲/۹۵)

باب کی تیسری حدیث ص ۶۱۹ میں بھی جماعت نماز فجر کا کوئی ذکر نہیں ہے، علامہ عینی نے لمبی تاویل کر کے جواب دیا ہے، حافظ نے ابن المنیر کا جواب لکھا کہ زیادہ اجر کا سبب نماز کے لئے جانے میں مشقت ہوتا ہے اور یہ جماعت فجر میں زیادہ ہے، کیونکہ سو کر اٹھنے میں کسل زیادہ اور مشقت کا احساس نمایاں ہوتا ہے، اور اس میں نیند جیسی محبوب چیز چھوڑنی پڑتی ہے، عشا میں یہ بات نہیں، اگرچہ رات کی ظلمت میں چل کر جانا وہاں بھی وجہ فضیلت ضرور ہے۔ (فتح ص ۲/۹۵)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے شرح تراجم ابواب البخاری میں یہ تاویل کی کہ ''یہ باب سابق باب کا تحتی وذیلی باب ہے، لہذا آخر کی دونوں احادیث کا تعلق باب سابق سے ہے۔'' سچ ہے تاویل کا باب بہت واسع ہے۔

باب فضل التهجر الى الظهر

ظہر کی نماز اول وقت پڑھنے کی فضیلت کا بیان

۶۲۰: حدثني قتيبة عن مالك عن سمي مولىٰ ابي بكر بن عبدالرحمٰن عن ابي صالح السمان عن ابي هريرة ان رسول الله صلے الله عليه وسلم قال بينما رجل يمشي بطريق وجد غصن شوك على الطريق فاخره فشكر الله له' فغفرله' ثم قال الشهدآء خمسة المطعون والمبطون والغريق وصاحب الهدم والشهيد في سبيل الله وقال لويعلم الناس ما في الندآء والصف الاول ثم لم يجدوا الاان يستهموا عليه لاستهموا عليه ولويعلمون ما في التهجير لا استبقوآ اليه ولويعلمون ما في العتمة والصبح لاتوهما ولوحبواً

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص کسی راستہ میں چلا جا رہا تھا کہ اس نے راستے میں کانٹوں کی ایک شاخ (پڑی ہوئی) دیکھی تو اس کو ہٹا دیا، پس اللہ تعالیٰ نے اس کا ثواب اسے یہ دیا، کہ اس کو بخش دیا، پھر آپ نے فرمایا کہ شہید پانچ لوگ ہیں، جو طاعون میں مرے، اور جو پیٹ کے مرض میں مرے، اور جو ڈوب کر مرے، اور جو دب کر مرے، اور جو اللہ کی راہ میں شہید ہو، اور آپ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے، کہ اذان دینے میں اور پہلی صف میں (شامل ہونے میں) کیا (ثواب ہے؟ اور پھر یہ نیک کام قرعہ ڈالے بغیر نصیب نہ ہو، تو یقیناً وہ اس پر قرعہ ڈالیں، اور اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ سویرے نماز پڑھنے میں کیا فضیلت ہے؟ تو بیشک اس کی طرف سبقت کریں، اور اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ عشاء اور صبح کی نماز (جماعت سے پڑھنے) میں کس قدر (ثواب) ہے تو یقیناً ان میں آکر شریک ہوں، اگرچہ گھٹنوں کے بل (چلنا پڑے)۔

تشریح: یہاں امام بخاریؒ بجائے مطلق صلوۃ کے ظہر کا لفظ ترجمہ میں لائے ہیں، جبکہ حدیث الباب میں بھی ظہر کا کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ بخاری کے دوسرے نسخہ میں صلوٰۃ ہی ہے، علامہ عینی نے لکھا کہ اگر یہاں حدیث میں ظہر کی نماز مراد ہو تب بھی یہ ابراد ظہر والی حدیث کے منافی نہیں ہے، کیونکہ وہ شدت حر کے لئے ہیں، اور اصل وعزیمت وقت نماز میں تہجیر اور مبادرت ہی اول وقت کے لئے ہے، اور شدت حر کے وقت ظہر کی تاخیر بطور رخصت ہے۔ (عمدہ ص ۲/۶۹۷)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں حدیث الباب میں شہداء کی تعداد پانچ بتلائی ہے، لیکن اور احادیث میں زیادہ تعداد بھی وارد ہے اور حدیث کی اصطلاح فقہ سے زیادہ عام ہے، علامہ سیوطیؒ نے شہداء پر مستقل رسالہ لکھا ہے اور علامہ اجہوری مالکیؒ نے شہداء کی تعداد ساٹھ تک گنائی ہے۔ اس لئے میں نے احادیث سے استنباط کر کے ایک ضابطہ بنایا کہ جو بھی کسی المناک متمادی بیماری میں مرے، جیسے ہیضہ دستوں وغیرہ کی بیماری میں وہ شہید ہے، یا مہلک وخطرناک بیماری، طاعون جیسی میں مرے وہ بھی شہید ہے اور کسی اچانک بلا میں مر جائے، جیسے ڈوب کر، یا کسی دوسرے فوری حادثہ سے تو وہ بھی شہید ہے، حدیثی نقطہ نظر سے یہی تین قسم کے شہید ملیں گے۔ واللہ اعلم

باب احتساب الاٰثار

(نیک کام میں ہر قدم پر ثواب ملنے کا دھیان)

۶۲۱: حدثنا محمد بن عبدالله بن حوشب قال حدثنا عبدالوهاب قال حدثنی حمید عن انس بن مالک قال قال النبی صلی الله علیه وسلم یابنی سلمه الاتحتسبون اثارکم وزادابن ابی مریم قال اخبرنی یحیی بن ایوب قال حدثنی حمید قال حدثنی انس ان بنی سلمة ارادوآ ان یتحولوا عن منازلهم فینزلوا قریباً من النبی صلی الله علیه وسلم قال فکره النبی صلی الله علیه وسلم ان یعروا المدینة فقال الا محتسبون اثارکم قال مجاهد خطاهم اثار المشی فی الارض بارجلهم

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اے بنی سلمہ، کیا تم اپنے قدموں (سے چل کر مسجد آنے) میں ثواب نہیں سمجھتے؟ اور ابن ابی مریم نے بواسطہ یحیی کے حضرت انسؓ سے اتنی روایت اور زیادہ کی ہے کہ بنی سلمہ نے چاہا کہ اپنے مکانوں سے اٹھ کی نبی کریم ﷺ کے قریب کہیں قیام کریں تو نبی کریم ﷺ نے اس بات کو برا سمجھا کہ مدینہ کو ویران کر دیں، پس آپ نے فرمایا کہ کیا تم اپنے قدموں (سے چل کر آنے) میں ثواب نہیں سمجھتے، اور مجاہد نے کہا ہے کہ خطاہم کے معنی زمین میں اپنے پیروں سے چلنے کے نشانات ہیں۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ احتساب کا مرتبہ "علم العلم" کا ہے یعنی ذہول وغفلت کے مواقع میں حصول ثواب کی نیت وارادہ کیا جائے، چونکہ مسجد میں جانے کے وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس راہ میں چلنے اور قدم اٹھانے پر بھی اجر وثواب ہے، اور عام طور سے آدمی اس کو طاعت وباعث اجر بھی سمجھتا، اس لئے شارع نے تنبیہ کی کہ ایسے امور ثواب میں، ثواب کا استحضار ضرور کیا کرو کہ اس سے اس کی دشواری بھی رفع ہوجاتی ہے اور نیت ثواب سے اجر بھی ڈبل ہوجاتا ہے، ایک ثواب عمل کا دوسرا نیت خیر کا۔ واللہ تعالے اعلم۔

۶۲۲: حدثنا عمر بن حفص قال حدثنآ ابی قال حدثنا الاعمش قال حدثنی ابو صالح عن ابی هریرة قال قال النبی صلی الله علیه وسلم لیس صلوٰة اثقل علی المنافقین من الفجر والعشآء وبویعلمون مافیهما لاتوهما ولوحبواً لقد هممت ان اٰمر المؤذن فیقیم ثم اٰمر رجلاً یؤم الناس ثم اٰخذ شعلاً من نار فاحرق علیٰ من لا یخرج الی الصلوٰة بعد

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ فجر اور عشاء کی نماز سے زیادہ گراں منافقوں پر کوئی نماز نہیں، لیکن اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان دونوں (کے وقت پر نماز پڑھنے) میں کیا (ثواب ہے تو ضرور ان میں آئیں، اگرچہ انھیں گھٹنوں کے بل (چلنا پڑے) میں نے یہ (پختہ) ارادہ کرلیا تھا، کہ مؤذن کو اذان دینے کا حکم دوں، پھر کسی سے کہوں کہ وہ لوگوں کی امامت کرے، اور میں آگ کے شعلے لےلوں، اور جو لوگ اب تک گھر سے نماز کے لئے نہ نکلے ہوں، ان کے گھروں کو (ان کے سمیت) جلادوں (لیکن ان کے اہل وعیال کا خیال آنے سے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

تشریح: پوری حدیث کے مضمون پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے مکان جلانے کا حضور پرنور ﷺ نے ارادہ فرمایا تھا، منافق نہ تھے بلکہ مخلص تھے، صرف ان کی سستی کی بناء پر ان کو متنبہ کیا گیا، اور اس عمل کو منافق کا عمل قرار دے کر خوف دلا دیا گیا ہے۔ یہاں امام بخاریؒ نے ترجمہ میں صرف نماز عشا کا ذکر کیا جبکہ حدیث الباب میں نماز فجر وعشا دونوں کی فضیلت نکلتی ہے۔ لہذا عشا کی فضیلت بھی فی الجملہ تو ثابت ہو ہی گئی، اور بقول علامہ عینیؒ کے اس قسم کے تسامحات وتجوزات امام بخاریؒ کی کتاب میں بہ کثرت ہیں۔ فلیتنبه له

باب اثنان ومافوقهما جماعة

(دو یا دو سے زیادہ آدمی جماعت کے حکم میں داخل ہیں)

۶۲۳ : حدثنا مسدد قال حدثنا زید بن زریع قال حدثنا خالد عن ابی قلابة عن مالک بن الحویرث عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال اذاحضرت الصلوٰۃ فاذنا واقیما ثم لیؤمکما اکبر کما

ترجمہ: حضرت مالک بن حویرثؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ دو شخص آپ سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے فرمایا کہ جب نماز کا وقت آجائے تو اذان دینا اور تم دونوں میں جو بڑا ہو وہ تمہارا امام بن جائے۔

تشریح: ترجمۃ الباب میں امام بخاریؒ حدیث ابن ماجہ کو لائے ہیں۔ چونکہ اس کی سند ضعیف ہے اسی لئے اس کے ارشاد نبوی ہونے کا ذکر نہیں کیا۔

باب من جلس فے المسجد ینتظر الصلوٰۃ وفضل المساجد

(مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنے والے اور مسجدوں کی فضیلت کا بیان)

۶۲۴ : حدثنا عبداللہ بن مسلمة عن مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال الملئکة تصلی علےٰ احدکم مادام فی مصلاہ مالم یحدث اللھم اغفرلہ اللھم ارحمہ الایزال احدکم فی صلوٰۃ ماکانت الصلوٰۃ تحبسہ ان ینقلب الیٰ اھلہ الا الصلوٰۃ

۶۲۵ : حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا یحییٰ عن عبیداللہ قال حدثنی خبیب بن عبدالرحمٰن عن حفص بن عاصم عن ابی ھریرۃ عن النبیﷺ صلے اللہ علیہ وسلم قال سبعة یظلھم اللہ فی ظلہ یوم لاظل الا ظلہ الامام العادل وشآب نشأ فی عبادۃ ربہ و رجل قلبہ معلق فی المساجد ورجلان تحآبا فی اللہ اجتمعا علیہ و تفرقا علیہ ورجل طلبتہ ذات منصب وجمال فقال انی اخاف اللہ ورجل تصدق اخفآء حتی لاتعلم شمالہ ما تنفق یمینہ و رجل ذکر اللہ خالیاً ففاضت عیناہ

۶۲۶ : حدثنا قتیبة حدثنآ اسمٰعیل بن جعفر عن حمید قال سئل انس ھل اتخذرسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خاتماً فقال نعم اخر لیلة صلوٰۃ العشآء الی شطر اللیل ثم اقبل علینا بوجھہ بعد ما صلے فقال صلے الناس و رقد واولم تزالوا فی صلوٰۃ منذانتظر تموھا قال فکانی انظر الیٰ و بیص خاتمہ

ترجمہ ۶۲۴: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص باوضو اپنے مصلے پر (نماز کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے، تو فرشتے استغفار کرتے ہیں (وہ کہتے ہیں) کہ اے اللہ! اس کو بخش دے، اے اللہ، اس پر رحم کر! اور (سنو) تم میں سے ہر ایک شخص گویا نماز میں ہے، جب تک کہ واپس گھر جانے تک نماز کے علاوہ کوئی دوسرے چیز مسجد میں بیٹھنے کا سبب نہ ہو (یعنی صرف نماز ہی کے لئے بیٹھا رہا ہو)

ترجمہ ۶۲۵: حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، سات آدمیوں کو اللہ اپنے سائے میں رکھے گا، جس دن کہ سوائے اس کے سائے کے اور کوئی سایہ نہ ہوگا، حاکم عادل، اور وہ نوجوان جو اپنے پروردگار کی عبادت میں (بچپن سے) بڑا ہوا ہو، اور وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں لگا رہتا ہو، اور وہ دو شخص جو باہم صرف خدا کے لئے دوستی کریں جب جمع ہوں تو اسی کے لئے، اور جب جدا ہوں تو اسی کے لئے، اور وہ شخص جس کو کوئی منصب اور جمال والی عورت (زنا کے لئے) بلائے اور وہ یہ کہہ دے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں

(اس لئے نہیں آ سکتا) اور وہ شخص جو چھپا کر صدقہ دے، یہاں تک کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی معلوم نہ ہو کہ اس کے داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا، اور وہ شخص جو خلوت میں اللہ کو یاد کرے اور اس کی آنکھیں (آنسوؤں سے) تر ہو جائیں۔

ترجمہ ۶۲۶: حضرت انسؓ سے پوچھا گیا، کیا رسول اللہ ﷺ نے انگوٹھی بنائی تھی (یا نہیں؟) انھوں نے کہا کہ ایک رات آپ نے عشاء کی نماز میں نصف شب تک دیر کر دی پھر نماز پڑھنے کے بعد آپ نے اپنا منہ ہماری طرف کیا، اور فرمایا کہ لوگ نماز پڑھ کر سو رہے (لیکن) تم جب تک انتظار میں رہو گے، گویا نماز ہی میں رہو گے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں، گویا میں (اب بھی) آپ کی انگوٹھی کی چمک دیکھ رہا ہوں۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ احادیث میں انتظار صلوٰۃ دونوں طرح کا ذکر ہوا ہے نماز سے قبل کا بھی اور بعد کا بھی، لیکن دوسرے کا تعامل سلف سے زیادہ ثابت نہیں ہے، قولہ سبعة یظلهم الله پر فرمایا کہ بعض روایات میں چھ کا ذکر ہے، اس کے لئے مشہور قاعدہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مفہوم عدد معتبر نہیں ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف وحی آئی ہیں اور حضور علیہ السلام نے ان کو اسی طرح بیان فرما دیا۔

قولہ و رجلان قحابا فی الله پر فرمایا کہ اس کی ایک شرح یہ بھی ہے کہ وہ دونوں ملنے کے وقت پر بھی اور جدا ہونے کے وقت بھی ذکر اللہ کریں۔ اس کی تائید روایت سے بھی ہوتی ہے، لہٰذا باہمی تعلق و محبت تو بطور تمہید ہوئی اور اجتماع و افتراق کے وقت ذکر اللہ مقصود و مطلوب ٹھیرے گا۔ اور اس سے عام طور سے ملنے اور جدا ہونے کے وقت بھی ذکر اللہ کی فضیلت نکلتی ہے۔

باب فضل من خرج الی المسجد و من راح

اس شخص کی فضیلت کا بیان جو صبح و شام کے وقت مسجد جائے

۶۲۷: حدثنا علی بن عبدالله قال حدثنا یزید بن هارون قال اخبرنا محمد بن مطرف عن زید بن اسلم عن عطآء بن یسار عن ابی هریرة عن النبی صلے الله علیه وسلم قال من غدآ الی المسجد اوراح اعدالله له' نزله' من الجنة کلما غدا اوراح

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، جو شخص صبح و شام (دونوں وقت) مسجد جائے، اللہ تعالے اس کے لئے جنت سے اس کی (اسی قدر) مہمانی مہیا کرے گا، جس قدر وہ گیا ہوگا۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں متن بخاری میں من خرج ہے اور حاشیہ میں دوسرا نسخہ ہے "من غدا" اور وہی اولی ہے۔ حاصل حدیث کا یہ ہے کہ مساجد خدا کے گھر ہیں، لہٰذا جو بھی اور جتنی بار بھی ان گھروں کی حاضری دے گا، اللہ تعالیٰ بحیثیت میزبان کے اس کے لئے اتنی ہی مہمانی و ضیافت جنت سے مہیا کرے گا، اور جس طرح ہر شخص اپنے مہمان کے لئے ضیافت کا اہتمام کیا کرتا ہے۔ صبح و شام اور ہر نماز و حاضری کے وقت حق تعالیٰ بھی اس کا اہتمام فرماتے ہیں۔۔۔۔ سبحانه ما اعظم شانه و فضله

باب اذا اقیمت الصلوٰة الاالمکتوبة
جب نماز کی تکبیر ہوجائے تو سوائے فرض نماز کے اور کوئی نماز نہیں

۶۲۸: حدثنا عبدالعزیز بن عبدالله قال حدثنا ابراهیم بن سعد عن ابیه عن حفص بن عاصم عن عبدالله بن مالک بن بحینة قال مرالنبی صلی الله علیه وسلم برجدح قال وحدثنی عبدالرحمٰن قال حدثنا بهزبن اسد قال حدثنا شعبة قال اخبرنی سعد بن ابراهیم قال سمعت حفص بن عاصم قال سمعت رجلاً من الازدیقال له' مالک بن بحینة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم رای رجلاً وقد اقیمت الصلوٰة یصلی رکعتین فلما انصرف رسول الله صلی الله علیه وسلم لاث به الناس فقال له' رسول الله صلی الله علیه وسلم الصبح اربعا الصبح اربعاً تابعه' غندرومعاذ عن شعبة فی مالک وقال ابن اسحاق عن سعد عن عبدالله بن بحینة وقال حماد اخبرنا سعد عن حفص عن مالک

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مالک بن بحینہ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے ایک شخص کو دو رکعت نماز پڑھتے دیکھا حالانکہ نماز کی اقامت ہو چکی تھی، تو رسول خدا ﷺ نے اس سے فرمایا کہ صبح کی چار رکعتیں ہیں؟ کیا صبح کی چار رکعتیں ہیں؟

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ایک گروہ اہل ظاہر کا حدیث الباب کے ظاہر پر ہی عمل کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اگر جماعت شروع ہوگئی تو جو شخص اس وقت کوئی نماز پڑھ رہا ہے تو وہ باطل ہوگئی، حالانکہ ائمہ مجتہدین میں سے کسی کا بھی یہ مذہب نہیں ہے، اور وہ سب یہی کہتے ہیں کہ نماز پوری کرلے اور قطع نہ کرے۔ پھر امام شافعی کا قول جدید یہ ہوا کہ جب صبح کی نماز جماعت شروع ہوجائے تو کوئی نماز نہ پڑھی جائے نہ صبح کی سنتیں نہ کوئی اور نہ مسجد کے اندر نہ باہر۔قدیم قول ان کا بھی حنفیہ کی طرح تھا۔اور امام مالک کا بھی یہی قول ہے۔بجز اس کے کہ وہ داخل مسجد وخارج کا فرق کرتے ہیں۔یعنی اگر دونوں رکعت فرض جماعت سے مل جانے کی امید ہو تو مسجد سے باہر پڑھ لے، ورنہ نہیں۔ابن العربی نے ''الاقتراب'' میں کہا کہ قعدہ اخیرہ ملنے کی توقع ہو تب بھی پڑھ لے، لیکن یہ قول ان کی عام کتب کے خلاف ہے۔امام ابوحنیفہ کا مذہب میرے نزدیک جامع صغیر اور بدائع سے یہ محقق ہوا کہ مسجد سے باہر پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ ایک رکعت جماعت فرض کی پاسکے۔صاحب ہدایہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور دوسرے علماء شافعیہ میں سے قسطلانی نے اور ابن رشد وباجی نے مالکیہ میں سے اسی کو اختیار کیا ہے۔داخل مسجد کے جواز میں ان سے کوئی روایت نہیں ہے۔پھر امام محمد نے آکر اس میں توسع کیا کہ ادراک قعدہ تک بھی سنتوں کی اجازت دی، اور ہمارے مشائخ حنفیہ نے مزید توسع کیا کہ مسجد میں بھی اجازت دے دی، اور غالباً سب سے پہلے امام طحاوی نے ایسا کیا کہ مسجد کے ایک گوشہ میں اجازت دی۔ان دونوں کے فصل کی صورت میں۔اس طرح گویا صاحب مذہب (امام اعظمؒ) کی ایک شرط کو تو امام محمدؒ نے ختم کیا اور دوسری امام طحاوی وغیرہ کی توسیع سے ختم ہوگئی۔لیکن میں تو امام اعظمؒ ہی کے مذہب پر عمل کرتا ہوں، اور اسی پر علما فتوے بھی دیتے رہے ہیں تاہم میں مسجد کے اندر پڑھنے والے سے بھی نزاع نہیں کرتا اور سوچ لیتا ہوں شاید کہ اس نے امام محمد وطحاوی کے قول پر عمل کیا ہو۔

بحث ونظر: حضرتؒ نے فرمایا کہ امام شافعیؒ کا استدلال حدیث ترجمۃ الباب کے عموم سے ہے کہ اس میں اقامت کے بعد دوسری نماز سے مطلقاً روک دیا گیا ہے، خواہ وہ مسجد میں ہو یا باہر، لہذا صبح کی دو رکعات سنت کا جواز باقی نہیں رہا، امام طحاویؒ نے اس کا جواب یہ دیا کہ ترجمہ والی حدیث موقوف ہے، مرفوع نہیں ہے، جیسا کہ خود امام بخاریؒ کے طریقہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ترجمۃ الباب میں باب قول

النبی ﷺ اذا اقیمت الصلوۃ الخ نہیں لکھا، ورنہ وہ حسب عادت اسی طرح تعبیر کرتے۔ اگر چہ انھوں نے اپنے رسالہ قراءت[1] خلف الامام ص۵ (مطبع علیمی دہلی) میں اس کو مرفوعاً ہی ذکر کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ خارج میں ان کے طریق استدلال میں توسع ہوتا ہے جبکہ صحیح بخاری کے اندر وہ مضبوط و مستحکم رویہ اختیار کرتے ہیں۔

امام بخاری کے بدیہی البطلان دعاوی:

امام بخاری صحیح کے علاوہ دوسرے تالیفات میں تو بعض اوقات ایسی بات بھی لکھ دیتے ہیں جو بدیہی البطلان ہوتی ہے۔ مثلاً رسالہ رفع الیدین ص ۱۷ (مطبع محمدی لاہور) میں دعویٰ کیا کہ کسی ایک صحابی سے بھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ اس نے رفع یدین نہیں کیا، اسی طرح رسالہ قراءت ص ۱۷ میں یہ دعویٰ کیا کہ صحابہ قائلین قراءۃ خلف الامام کا مسلک یہ تھا کہ رکوع پالینے سے رکعت نہیں ملتی۔ حالانکہ یہ دعاوی نا قابل قبول ہیں، جیسا کہ میں نے ان کو اپنے رسائل نیل الفرقدین اور فصل الخطاب میں مفصل لکھ دیا ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام بخاری نے اول تو ادراک رکعۃ بادراک الرکوع کے مسئلہ کو قراءۃ فاتحہ خلف الامام کے ساتھ بے جوڑ لگا دیا ہے، پھر خود ہی غیر قائلین صحابہ کے نام زیادہ گنائے ہیں، اور قائلین میں صرف حضرت ابو ہریرہؓ کا ذکر کیا ہے اور ذہن کو مسئلہ قراءت کی طرف گھمانے کے لئے ان کا ارشاد "**اقرأ بها فی نفسک**" لائے ہیں، جبکہ ساتھ ہی ان کا ارشاد **حتی تدرک الامام قائما** بھی ذکر کیا، جس سے صاف واضح ہے کہ ان کا مسلک دوسرے صحابہ سے الگ صرف ادراک الامام قائماً کے لئے تھا، یعنی **انحاء الامام للرکوع** سے ایک سیکنڈ قبل بھی اگر مقتدی نے امام کے ساتھ شرکت کرلی تو رکعت پالی، اس میں یہ کہاں ہے کہ قبل الانحناء فاتحہ بھی پڑھ لے تب مدرک رکعت ہوگا؟

علامہ نوویؒ نے المجموع ص ۲۱۵/۴ میں لکھا کہ مسئلہ ادراک رکعت بادراک الرکوع ہی صحیح وصواب ہے، جس کی تصریح امام شافعیؒ نے بھی کی ہے اور جماہیر اصحاب و جماہیر علماء امت اسی کے قائل ہیں اور احادیث نبویہ سے بھی یہی ثابت ہے بلکہ سب ہی لوگوں کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے، صرف صبغی (تلمیذ ابن خزیمہ) نے ان کی مخالفت کی ہے اور تقی الدین سبکی نے اس کی تائید کی ہے۔ الخ علامہ شوکانی بھی اس کے قائل ہوئے ہیں مگر پھر انھوں نے اپنے فتاویٰ میں اس سے رجوع کر لیا تھا۔ (معارف السنن ص ۳۴۶/۲)

حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد معارف السنن ص ۲۸۰/۳ میں اور العرف الشذی ص ۱۵۳ میں ہے کہ امام بخاریؒ نے جو عدم ادراک رکعۃ بادراک الرکوع کا مسئلہ اختیار کیا ہے اور اس بارے میں حضرت ابو ہریرہؓ کو بھی اپنے موافق دکھلایا ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ موطأ امام مالک میں حضرت ابو ہریرہؓ سے اس کے خلاف موجود ہے، جس میں ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے جس کو رکعت مل گئی اس کو سجدہ بھی مل گیا، اور قراءت فاتحہ فوت ہو جانے کی وجہ سے وہ خیر کثیر سے محروم ہوا، اور دوسرے آثار سے بھی حضرت ابو ہریرہؓ کا مسلک یہی ثابت ہوا کہ وہ امام کی انحنا للرکوع سے قبل نماز میں مل جانے کو ادراک رکعت مانتے تھے، اور فاتحہ پانے کو واجب نہ قرار دیتے تھے، لہٰذا امام بخاری کا مسلک مذکورہ رسالہ قراءۃ خلف الامام نہ سلف کے موافق ہے نہ علماء مذاہب اربعہ سے مطابق ہے۔ اور صحابہ و تابعین و من بعدہم سب کے خلاف ہے، اور امام بخاری کے بعد اس کو صرف ابوبکر صبغی وغیرہ ایک دو نے اختیار کیا ہے۔ اوجز المسالک ص ۱۹/۱ میں بھی ایسی ہی تحقیق درج ہے دیکھ لی جائے۔

بخاری کی حدیث الباب میں دو غلطیاں

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا:۔ امام بخاری اپنی صحیح میں تو کف لسان کرتے ہیں، لیکن باہر خوب تیز لسانی کرتے

[1] فیض الباری ص ۱۹۸/۲ میں بھی حضرتؒ کے یہی ارشادات درج ہیں البتہ رسالہ قراءت خلف الامام کی جگہ ضبط کی غلطی اور سبقت قلم سے جزء رفع الیدین لکھ دیا ہے۔ صاحب فیض اگر مراجعت کتب کا التزام کرتے تو ایسی اغلاط حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف منسوب نہ ہوتیں (مؤلف)

ہیں یہ کیا چیز ہے؟ دیکھوان کی تالیف جزء القراءۃ اور جزء رفع الیدین، پھر فرمایا کہ امام بخاری نے حدیث الباب کی روایت مالک بن بُحینہ سے کی ہے حالانکہ وہ تو مسلمان بھی نہ ہوا تھا۔ صحیح یہ ہے کہ روایت ان کے صاحبزادے عبداللہ نے کی ہے، جو صحابی تھے، دوسری غلطی یہ ہے کہ بُحینہ کو مالک کی ماں ذکر کیا گیا، جبکہ وہ مالک کی بیوی اور عبداللہ کی ماں ہے۔

تحقیق مزید: حضرتؒ نے فرمایا:۔ میری تحقیق یہ ہے کہ بعض احادیث بطور اصول مسلمہ شائع ہوگئی تھیں۔ اور اسی لئے ان کی سندیں نہیں ملتی تھیں، حدیث الباب "اذا اقیمت الصلوۃ فلا صلوۃ الا المکتوبۃ" بھی غالباً اسی قبیل سے ہوگی، اور من کان له امام بھی اسی طرح کی ہوگی، نیز نہی عن البتیراء بھی جو حنفیہ پیش کرتے ہیں، پھر فرمایا ممکن ہے میرا یہ اصول بعض جگہ حنفیہ کو مضر بھی ہوگا۔

عزم ہجرت اور قیام دیوبند: حضرتؒ نے ضمناً فرمایا کہ میں بارادہ ہجرت وطن (کشمیر) چھوڑ کر آیا تھا، دیوبند ۱۸ سال رہا چھ سال تک مدرسہ سے کوئی وظیفہ یا تنخواہ نہیں لی، پھر نکاح ہوا تو ضرورتیں بڑھیں اور تنخواہ لی۔ شروع میں علم دین کی تحصیل کا جذبہ صرف اپنے بزرگوں کا اتباع تھا، نہ دنیا پیش نظر تھی، نہ دین کی خدمت کا ہی خالص جذبہ تھا۔

شان فنافی العلم: ہم نے علامہ کوثری اور حضرت شاہ صاحبؒ دو عالم ایسے دیکھے جن کی شان صحیح معنی میں فنافی العلم کی تھی، اور خدا نے ان دونوں کو فہم صحیح، وقت نظر اور حافظہ بھی بے نظیر عطا فرمایا تھا ہزار ہا مسائل مشکلہ کی تحقیق اس طرح کی کہ باید وشاید۔ لیکن افسوس ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم کی اشاعت اتنی بھی نہ ہوسکی جتنی علامہ کوثری کی ہوئی۔ اور یہ بہت بڑی کوتاہی ارباب اہتمام دارالعلوم دیوبند کی تھی کہ حضرتؒ سے تحقیقی وتالیفی کام نہ لئے گئے، اور صرف درس پر اکتفا کی گئی، یہ بھی ضروری تھا کہ حضرتؒ کو مصر، شام اور ترکی کے اسفار کرائے جاتے اور حضرتؒ وہاں طویل طویل قیام کر کے افادہ واستفادہ فرماتے۔ حضرتؒ کے رشتہ زواج کے لئے بھی کسی علمی گھرانہ کا انتخاب کیا جاتا کہ اس خاندان کے لوگ آپ کے علم وفضل کے صحیح قدر دان ہوتے اور آپ کے علمی افادات اور قلمی دستاویزات کی حفاظت کرتے، جس سے رہتی دنیا تک ان سے استفادہ ممکن ہوتا۔

اس کے برعکس یہ ہوا کہ پہلے حضرتؒ کی ذاتی کتابوں کو وفات کے بعد ہی فروخت کر دیا گیا جن پر حضرتؒ کے قلم سے نہایت گرانقدر حواشی تھے، پھر قلمی یادداشتوں کا بے بہا ذخیرہ، جو بقول حضرتؒ ہی تین بکسوں میں محفوظ تھا، اس سے غفلت برتی گئی جس سے وہ سب دیمک کی نظر ہو گیا۔ جبکہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ ایسے جامع معقول ومنقول کا فیصلہ یہ تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک ایک جملہ سے ایک ایک رسالہ تالیف ہوسکتا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے استاذ حدیث اور شیخ الاساتذہ دارالعلوم دیوبند حضرت شیخ الہندؒ حضرت شاہ صاحب کے علوم وکمالات ووسعت مطالعہ کے نہ صرف معترف تھے بلکہ بیسیوں مسائل مشکلہ حدیث وتفسیر وفقہ وغیرہ میں آپ سے رجوع واستفادہ کرتے تھے۔ یہ بھی حضرت تھانویؒ کا ارشاد تھا کہ حقانیت اسلام کی ایک دلیل حضرت شاہ صاحبؒ کا وجود بھی ہے، اگر اس میں کچھ بھی کجی ہوتی تو حضرتؒ اس کی نشان دہی ضرور فرماتے۔ غالباً یہ ریمارک حضرت تھانویؒ نے شاہ صاحبؒ کے حالات دور اختلاف کے پیش نظر کیا ہوگا۔ کہ علیحدگی کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کی شان گرانے کے لئے جن بے حقیقت الزامات واتہامات سے نوازا گیا، اور حضرتؒ نے ان کے مقابلہ میں کوہ استقامت ہونے کا ثبوت دیا، وہ یقیناً ایک نہایت ہی سلیم الفطرت اور فرشتہ صفت انسان ہی سے ممکن تھا، اور اگر حضرتؒ کے اندر ادنیٰ کجی بھی ہوتی، تو سلامت روی وخلق نبوی کا ایسا اعلیٰ کردار آپ سے ظاہر نہ ہوتا۔ واضح ہو کہ زمانہ اختلاف میں حضرت تھانویؒ حزب اہتمام کے ساتھ رہے ہیں، پھر آپ نے سرپرستی دارالعلوم سے استعفیٰ دے دیا تھا، اور حضرت شاہ صاحبؒ کے پہلے سے بھی زیادہ مداحین اولین میں شامل ہوگئے تھے،

امام بخاری اور رفع یدین پر دعوائے اتفاق صحابہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے نیل الفرقدین ص ۷۸ میں لکھا:۔ امام بخاری کے دعوے مذکور کے خلاف خود ان کے تلمیذ وخلیفہ امام ترمذیؒ نے فیصلہ دیا ہے، انھوں نے لکھا کہ ترک رفع کے قائل بہت سے صحابہ وتابعین تھے، اور ہمارے نزدیک ترک رفع حضرت عمر، حضرت علی، ابن مسعود، ابو ہریرہ ابن عمر، براء بن عازب اور کعب ابن عجرہ سے ثابت ہے اور تابعین میں سے اصحاب علی وابن مسعودؓ، جماہیر اہل کوفہ، بہت سے اہل مدینہ اور دوسرے اہل بلاد سے بھی ثابت ہے۔ پھر حضرتؒ نے ابن حزم اور ابن قیم کی غلطیوں کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ حضرتؒ کے دونوں رسالوں فصل الخطاب اور نیل الفرقدین مع حاشیہ کا مطالعہ ہر عالم مشتغل بالحدیث کو ضرور کرنا چاہئے۔

تحقیق مزید: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک حدیث نبوی "**اذا اقیمت الصلوۃ فلا صلوۃ الا المکتوبۃ**" کا منشاو مقصد اقامت صلوٰۃ کے بعد دوسرے کسی نماز کی ممانعت مسجد کے اندر ہے، اسی لئے امام ابوحنیفہؒ کا مذہب جواز فی الخارج کا ہے، کہ نظر شارع میں داخل مسجد وخارج کے احکام الگ الگ ہیں۔ (دیکھو فیض الباری ص ۲/۲۰۲)

امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ اقامت کے بعد کوئی دوسری نماز نہ مسجد کے اندر پڑھ سکتا ہے نہ باہر۔ حالانکہ راوی حدیث حضرت ابن عمرؓ کا فتویٰ موطأ امام مالک میں ہے اور دوسرے راوی حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ معانی الآثار طحاوی میں ہے کہ صبح کی دو رکعت خارج مسجد پڑھی جائیں اگرچہ امام نے نماز فرض شروع کر دی ہو۔ پھر یہاں ایک حدیث صحیح ابن خزیمہ کی بھی ہے جو عمدۃ القاری ص ۲/۱۱۷ میں نقل ہوئی کہ حضور علیہ السلام اقامت نماز کے وقت نکلے تو لوگوں کو دیکھا کہ جلدی جلدی دو رکعت پڑھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا کیا دو نمازیں ایک ساتھ؟ پھر آپ نے ممانعت فرمائی کہ اقامت ہو جائے تو مسجد میں دوسری نماز نہ پڑھی جائے۔

اگر اس حدیث کی نقل صحیح ہے تو اس سے واضح فیصلہ مل جاتا ہے کہ ممانعت صرف مسجد کے اندر کی ہے اور یہ چونکہ خاص طور سے صبح کی سنتوں کا واقعہ ہے تو اس بات کا بھی جواب ہو جائے گا کہ کچھ حدیثوں میں عام نمازوں کے وقت کی ممانعت آئی ہے بلکہ کسی میں فجر کو بھی ممانعت کے تحت داخل کیا گیا ہے۔ لیکن وہ احادیث ضعیف ہیں۔

لہٰذا صحیح ابن خزیمہ کی حدیث صحیح کو ترجیح ہوگی۔ مگر مجھے تردد ہے کہ کہیں حافظ عینیؒ نے یہ حوالہ سبقت قلم سے نہ دے دیا ہو، کیونکہ بہت ہی زود قلم تھے۔ ساری قدوری کو ایک دن میں نقل کر لیا تھا، لوگوں کو ان کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھنے میں دشواری ہوتی تھی، اور بعض مرتبہ خود بھی اپنی تحریر وقت سے پڑھتے تھے، دوسرے اس سے شبہ ہوا کہ حافظ نے یہاں[1] ابن خزیمہ کا حوالہ نہیں دیا، بلکہ تاریخ بخاری ومسند بزار وغیرہ کا دیا ہے۔ جس میں مسجد کا ذکر نہیں ہے۔ (فتح ص ۲/۱۰۲)

حضرتؒ نے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ "عینی کے حوالہ مذکورہ کی تصحیح وتحقیق بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ صحیح ابن خزیمہ کا قلمی نسخہ بھی دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے، البتہ سنا ہے کہ جرمن کے کتب خانہ میں ایک تہائی حصہ ہے، اس پر حافظ کے دستخط ہیں اور حافظ کے ہاتھ میں بھی اس سے زیادہ نہیں تھی۔

صحیح ابن خزیمہ شائع ہو گئی

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ حضرتؒ کے کلمات مذکورہ درس بخاری شریف مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۳۲ء کے ہیں، میری درسی بیاض ص ۷۹۵ میں

---

[1] عجیب بات ہے کہ حافظ نے فتح الباری میں تاریخ بخاری ومسند بزار کے حوالہ سے محمد بن عمار اور ابن ابی نمر ہی کی روایت کا ذکر کیا ہے، اور ممکن ہے وغیرہما میں صحیح ابن خزیمہ بھی مضمر ہو، اور ان کے پاس وہ موجود بھی تھی، اور عمدۃ القاری میں بھی اس کا حوالہ دیکھا ہوگا، پھر بھی اس کے حوالہ کی صراحت نہیں کی، کہیں ایسا تو نہیں کہ فی المسجد کی قید سامنے سے ہٹائی تھی، تاکہ شافعیہ کے مقابلہ میں حنفیہ کو فائدہ نہ پہنچ جائے، کیونکہ ایسا تو وہ فتح الباری میں کیا ہی کرتے ہیں کہ حنفیہ کے فائدہ کی حدیث مقام بحث سے ہٹا کر دوسرے مقام میں ذکر کر دیتے ہیں۔ کما اشار الیہ العلامۃ الکشمیریؒ. واللہ تعالی اعلم۔

درج اوراس طرح یادبھی جیسے اب سن رہا ہوں، خدا کی شان کریمی ورحیمی کے قربان جایئے کہ جن کتابوں کے لئے ہمارے اکابر زیارت کو ترستے تھے، وہ آج ہمارے سامنے طبع ہوکر آگئی ہیں، اگرچہ اس امر کا انتہائی رنج وملال بھی ہے کہ اب ان کتابوں کی قدر کرنے والے تو کیا مطالعہ کرنے والے بھی نہیں ہیں، صحیح بخاری شریف کے درس اور ختم بڑے اہتمام وشان سے بہ کثرت مدارس میں ہونے لگے مگر اس کے درس کا حق ادا کرنے والا ہزار میں ایک بھی مشکل سے ہوگا، فن رجال کا علم تو جیسے بالکل ہی ختم ہوگیا جو حدیث کا نصف علم ہے۔ ہمارے دور کے علماء میں سے بہت سے علماء کی حدیثی تالیفات سامنے ہیں، بجز علامہ کوثری اور علامہ کشمیریؒ کے کس کی تالیفات میں رجالی ابحاث کا حق ادا کیا گیا ہے؟ فیاللعجب ویاللاسف!!

ہمارے ایک متشدد بزرگ مولانا عبداللہ خاں صاحب کرتپوری (تلمیذ رشید علامہ کشمیریؒ) کی رائے تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ مدارس عربیہ کے شیوخ حدیث فن رجال حدیث سے بے بہرہ اور تحقیق ووسعت مطالعہ سے محروم ہیں تو ان کے درس بخاری سے بجائے فروغ حنفیت کے سلفیت وغیر مقلدیت ہی کو عروج وترقی ملے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

بات شاید دور جارہی ہے مگر خیال تو فرمایئے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر درس بخاری شریف میں تحقیق کا دریا بہاتے بہاتے کہاں تک جاتی تھی، صحیح ابن خزیمہ ہی ہمیشہ نوادر عالم میں سے رہی، تحقیق کا ستارا کس قدر دور دراز آسمان سے توڑ کر لانے کی سعی کی جارہی ہے، تا کہ حضور علیہ السلام کی ایک صحیح وقوی تر سنت کی نشان دہی کردینے میں کوئی بھی کور کیر اپنی طرف سے اٹھا کر نہ رکھ دی جائے، خوب ہی فرمایا تھا شیخ السنہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے کہ "یہ کیا بار بار کہا کرتے ہو کہ ابوحنیفہ نے یہ رائے دی، وہ رائے دی' ہرگز نہیں، وہ ان کی رائے نہیں ہے بلکہ وہ جتنے فیصلے دے چکے ہیں وہ سب بالکل معنی الکلمہ معانی حدیث نبوی ہیں" پہلے بھی کہیں لکھا تھا اور اب پھر یاد دلادوں کہ یہ شیخ السنہ وہ بلند ترین اور مایہ ناز ہستی تھے، جن کو امام بخاریؒ نے اعلمِ اہل زمانہ کا لقب دیا تھا، اگرچہ امام موصوف ہی نے نہ معلوم کس حال سے مغلوب ہوکر یہ بھی کہہ دیا تھا کہ لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مبارک ایسے اعلم اہلِ زمانہ کو چھوڑ کر جاہلوں کی تقلید کرلی، یہ اشارہ جس ذاتِ اقدس کی طرف گیا، پہلے بتلا چکا ہوں، اس وقت دہرا کر اپنی اور دوسروں کی اذیتِ قلب کا باعث بننا نہیں چاہتا۔

مرادردیست اندردل اگر گویم زباں سوزد دگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخوان سوزد

اب تصحیح حوالہ کی بات بھی سن لیجئے! مطبوعہ صحیح ابن خزیمہ کے ص۲۱۷/۲ میں حدیث نمبر ۱۱۲۶ بروایت محمد بن عمار انصاری عن شریک بن عبد اللّٰہ۔ **وھو ابن ابی نمر. عن انسؓ قال خرج النبی ﷺ حین اقیمت الصلوة، فرأی ناساً یصلون رکعتین بالعجلة، فقال: . "اصلاتان معاً؟ فنھی ان یصلی فی المسجد اذا اقیمت الصلاة.**

اس کے حاشیہ میں لکھا گیا کہ اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔ اور دوسرے محشی ناصر الدین البانی نے لکھا کہ ابن ابی ضرر جالِ شیخین میں سے ہیں، لیکن حافظ نے کہا:۔ صدوق یخطی (سچے ہیں، کبھی خطا بھی کرتے ہیں)۔

اس سے قبل حدیث نمبر ۱۱۲۴ میں سنتِ فجر بعد اقامت کی ہے، اس کے بارے میں ناصر صاحب نے حاشیہ دیا کہ اس کی اسناد ضعیف ہے، صالح بن رستم ابو عامر خزار کثیر الخطاء ہے (یعنی بہ کثرت خطا کرتا ہے، دوسرے یہ کہ حدیث نمبر ۱۱۲۴ و نمبر ۱۱۲۵ میں مسجد کے اندر کا واقعہ ہے، جو بحث سے خارج ہے۔ لہذا خارج کا جواز فی المسجد کی قید سے بخوبی ثابت ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ صحیح ابن خزیمہ کی احادیث مذکورہ پر باب کا عنوان اس طرح ہے:۔ **"باب النھی عن ان یصلی رکعتی الفجر بعد الاقامة، ضد قول من زعم انھما تصلیان والامام یصلی الفریضة"** خیال کیا جائے کہ حدیث نمبر ۱۱۲۶ میں فی المسجد کی قید امام شافعیؒ کے قول کی ضد ہے، یا امام ابوحنیفہؒ کی۔ پھر خود ممانعت کے راوی حضرت ابن عمرؓ نے بھی تو ممانعت کو مسجد ہی کے ساتھ مخصوص سمجھا تھا، اسی لئے وہ مسجد میں تو دوسروں کو روکتے تھے مگر خود عمل یہ تھا کہ جب کبھی اقامت سن لیتے تھے تو صبح کی سنتیں اپنی بہن

حضرت حفصہ کے گھر پڑھ کر مسجد میں داخل ہوا کرتے تھے، (فتح الباری ص ۲\۱۲۶) ایسا ہی علامہ بھکلی نے شرح نسائی میں لکھا ہے، اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت بھی نقل کی ہے کہ "**لا صلوٰۃ فی المسجد اذا اقیمت الصلوٰۃ**" حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شرح نسائی کا نسخہ راندیر میں موجود ہے، اور غالباً کہیں اور موجود نہیں ہے۔ نیز فرمایا میرا گمان ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ مزید تفصیل معارف السنن ص ۸۸\۷۱ جلد رابع میں دیکھی جائے۔

صحیح ابن خزیمہ کا مرتبہ

فاضلِ محترم دکتور محمد مصطفے الاعظمی عم فیضہم دنیائے اسلام کے عموماً اور اہلِ علم کے خصوصاً عظیم شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ترکی کا سفر کر کے استنبول (مکتبہ احمد الثالث) سے مخطوطہ صحیح ابن خزیمہ کا فوٹو حاصل کیا۔ اس مخطوطہ کے ۳۰۱ ورق ہیں اور ایک صفحہ کی ۲۵ سے ۳۱ تک سطریں ہیں۔ اعظمی صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ مطبوعہ دو جلدوں میں مخطوطہ کا کتنا مواد آ گیا ہے اور باقی حصہ مزید کتنی جلدوں میں آ سکے گا۔ آپ نے لکھا کہ اس مخطوطہ کے علاوہ اب تک کسی دوسرے نسخہ کا علم نہیں ہو سکا ہے اور شاید یورپ میں بھی اس کا وجود کہیں نہیں ہے۔ آپ نے یہ بھی لکھا کہ مخطوطہ کے پہلے ورق پر اس کا نام "صحیح ابن خزیمہ" لکھا ہوا ہے، لیکن کتاب کے شروع میں نام "**مختصر المختصر من المسند الصحیح**" درج ہے۔ اور یہ بات شبہ میں ڈالتی ہے۔ الخ مقدمہ ص ۲۵

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس مخطوطہ کے نام تو دونوں ہی ہوں گے، اور اسی لئے ہمیشہ لوگوں کو اشتباہ بھی رہا ہوگا، اور شاید یورپ (جرمن وغیرہ) کے نسخوں پر بھی نام کے اشتباہ کی وجہ سے یقین نہ ہوا ہوگا، جس طرح استنبول کا نسخہ بھی لوگوں کی نظر سے اوجھل رہا ہے، اور بقول ڈاکٹر صاحب کے صرف ان کو دریافت ہوا۔

محترم اعظمی صاحب نے اپنے مقدمہ میں محقق نصب الرایہ کا شکوہ کیا ہے کہ انہوں نے صحیح ابن خزیمہ کو بخاری، مسلم، ابوداؤد و نسائی سے کم مرتبہ بتلایا ہے، اور فتح المغیث کے حوالہ سے یہ بھی نقل کیا گیا کہ کتاب ابن خزیمہ میں ایسی بھی احادیث ہیں، جن کو ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا حالانکہ ان کا درجہ حسن سے زیادہ نہیں ہے۔ اعظمی صاحب نے لکھا کہ اس قول کی تقلید کی ضرورت نہیں، کیونکہ خود کتاب ہی اس کی تردید کے لئے کافی ہے۔ (ص ۲۱) لیکن ص ۲۲ میں عماد بن کثیر کا ریمارک خود بھی نقل کیا اور فتح المغیث کا نقد مذکور بھی احمد شاکر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے، پھر لکھا۔ "میں کہتا ہوں کہ صحیح ابن خزیمہ، صحیحین (بخاری و مسلم) جیسی نہیں ہے کہ یہ کہہ دینا ممکن ہو کہ جو احادیث اس میں ہیں وہ سب صحیح ہیں، بلکہ اس میں وہ بھی ہیں جو درجۂ صحیح سے کم درجہ کی اور صحیح ابن خزیمہ صرف صحیح و حسن احادیث پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں ضعیف حدیثیں بھی ہیں اگرچہ وہ بہت کم ہیں بہ نسبت صحیح و حسن کے۔ اور واہی یا شدید ضعف والی احادیث تو ملیں گی ہی نہیں الا نادراً، جیسا کہ تعلیقات سے واضح ہو جائے گا، ہم نہیں سمجھ سکے کہ محققِ نصب الرایہ کی بات اتنی بری کیوں لگی تھی کہ اس کو خاص طور سے ہدفِ ملامت بنایا گیا، جبکہ اس نے ضعیف، واہی اور شدید الضعف احادیث کا وجود تو نادراً بھی نہیں بتلایا تھا۔

کتاب التوحید لابن خزیمہ کا ذکر

صحیح مذکور سے قبل محدث ابن خزیمہ کی کتاب التوحید شائع ہو چکی ہے، جس پر پہلے امام رازی وغیرہ نے نقدِ شدید کیا تھا۔ اور اب اشاعت کے بعد علامہ کوثری وغیرہ نے تفصیلی نقد کیا ہے، ملاحظہ ہو مقالاتِ کوثری وغیرہ۔

تکملہ: صحیح ابن خزیمہ سے متعلق جبکہ وہ اب شائع ہو گئی ہے، اتنی بات اور بھی ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ وہ تصحیحِ حدیث کے بارے میں متساہل ہیں، اور انہوں نے اپنی صحیح میں زیادہ تر وہی احادیث و آثار جمع کئے ہیں، جو ان کی فقہی رائے کے مطابق تھے، مثلاً ص ۲\۱۹۲ میں کئی سطر کا

عنوان قائم کر کے یہ ثابت کرنے کی سعی کی کہ فرضِ صبح کی ایک رکعت اگر طلوعِ شمس سے قبل پڑھ لی جائے اور دوسری طلوع کی حالت میں تو نماز صحیح ادا ہو گئی۔ اور اس کے خلاف رائے والوں کو جاہل قرار دیا، پھر اسی کے لئے ایک حدیث پیش کر دی، دوسرے حضرات کا متدل ذکر نہیں کیا۔ ہم اس کی پوری بحث پہلے لکھ چکے ہیں۔ یا ص ۱۲۹۴ میں رفعِ یدین للرکوع و بعد الرکوع کا باب قائم کیا اور دو حدیث ذکر کیں۔ پھر دوسرا باب امر نبوی للرفع عند الرکوع و بعدہ قائم کیا اور اس کو بھی حضور علیہ السلام کے ایک مجمل و عام حکم سے ثابت کیا، دوسری طرف کے دلائل کے لئے دوسرے محدثین کی طرح نہ باب قائم کیا نہ ان کی احادیث پیش کیں۔ برخلاف اس کے مصنف ابن ابی شیبہ کو دیکھئے کہ ص ۱۲۳۴ میں ایک باب رفع یدین کے لئے قائم کیا اور احادیث و آثار دونوں ذکر کئے، پھر ص ۱۲۳۶ میں باب **رفع الیدین فی اول تکبیرۃ ثم لا یعود** کا قائم کر کے اس کے لئے بھی احادیث نبوی و آثارِ صحابہ کا ڈھیر لگا دیا۔ اسی لئے اس مسئلہ کو محدث ابن ابی شیبہ نے ان مسائل میں بھی داخل نہیں کیا، جن میں حنفیہ کو مخالفتِ حدیث کا الزام دیا ہے اگر چہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کو غلط فہمی ہوئی اور بیشتر مسائل میں انہوں نے حنفیہ کا مسلک ہی غلط سمجھا اور بہت سے مسائل کے دلائل بھی ان کے سامنے نہ آسکے تھے، وغیرہ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور علامہ کوثری کا رد بھی اس بارے میں قولِ فیصل کا درجہ رکھتا ہے، تاہم یہ بھی ضرورت ذہن میں رکھا جائے کہ انہوں نے تیز لسانی یا سخت الفاظ کا استعمال نہیں کیا ہے، جبکہ بقول علامہ کوثری کے ان ہی کے مسائل کو بنیاد بنا کر اور ابن حزم کی محلی وغیرہ کو سامنے رکھ کر علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں حنفیہ کے خلاف پروپیگنڈے کا طویل و عریض سلسلہ قائم کیا، اور حنفیہ و غیر مقلدینِ زمانہ کو باہم لڑانے کا نہایت خطرناک مواد چھوڑ گئے، جبکہ ان کے استاذ علامہ ابن تیمیہؒ نے فقہِ حنفی کی تائید و تعظیم میں بہت زیادہ لکھا تھا اور اسی کو میں نے ''دو بڑوں کا فرق'' عنوان دے کر پہلے کچھ لکھا تھا۔

کتاب التوحید لابن خزیمہ سے متعلق بھی اتنی بات اور لکھنی ہے کہ حدیث وضع السموات علی اصبع میں قولِ یہود پر جو حضور علیہ السلام کے ضحک کو بعض حضرات نے تائید و تقریر پر محمول کیا ہے، اس کا حافظ ابن حجرؒ نے بھی شرح بخاری میں رد کیا ہے، اور وہاں ابن خزیمہ کی بھی غلطی بتلائی ہے، اور اس کتاب کو محققین نے بابِ عقائد میں نا قابلِ اعتماد کتب میں سے شمار کیا ہے، امام رازی نے بھی آیت **لیس کمثلہ شیء** کے تحت اس کا رد وافر کیا ہے۔ (السیف الصقیل ص ۱۵۱)

السیف ص ۱۰۸ میں یہ بھی ہے کہ محدث ابن خزیمہ باوجود وسعتِ علم فقہ و حدیث کے علم اصول الدین (عقائد) سے ناواقف تھے، اور اس امر کا اعتراف خود بھی انہوں نے کیا ہے (کمافی الاسماء والصفات بیہقی ص ۲۰۰) اور امام رازی نے تو ان کی کتاب التوحید کو کتاب الشرک تک کہہ دیا ہے، پھر ص ۱۰۹ میں لکھا کہ وہ اگر کسی امر میں صواب اختیار کرتے ہیں تو معتقدات میں کتنی ہی بار غلطی بھی کرتے ہیں اسی لئے ان کی کتاب التوحید کا رد لکھنے کی ضرورت ہے۔ اور جن ابن خزیمہ سے امام طحاوی نے روایت کی ہے وہ صاحبِ کتاب التوحید نہیں بلکہ دوسرے ہیں۔ علامہ ابن الجوزی حنبلیؒ نے دفعِ شبہۃ التشبیہ ص ۱۱ میں لکھا کہ قاضی ابو یعلی حنبلی نے عین کو حق تعالیٰ کی صفتِ زائد علی الذات قرار دیا ہے اور ان سے قبل ابن خزیمہ نے بھی کہا تھا (**لربنا عینان ینظر بھما**) ہمارے رب کی دو آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتا ہے اور ابن حامد نے بھی کہا کہ اس کا ایمان رکھنا واجب ہے کہ خدا کی دو آنکھیں ہیں، لیکن یہ سب ابتداع ہے، جس پر کوئی دلیل شرعی ان سب کے پاس نہیں ہے۔ اور حدیث لیس باعور سے بطور دلیلِ خطاب استدلال کرنا ہی غلط ہے، نیز محدث ابن خزیمہ نے قولِ باری تعالیٰ **الھم ارجل یمشون بھا** (نمبر ۱۹۵ اعراف) سے خدا کے لئے پاؤں بھی ثابت کئے ہیں۔

محترم دکتور اعظمی صاحب عم فیضہم نے مقدمۂ صحیح ابن خزیمہ ص ۱۰ میں محدث ابن خزیمہ کی منقبت میں طبقات الشافعیہ اور سیر اعلام النبلاء کے حوالہ سے یہ بھی ذکر کیا کہ وہ وزن کے طریقہ سے واقف نہ تھے اور نہ دس اور بیس میں فرق کر سکتے تھے ان کے پوتے نے بیان کی کہ بسا اوقات ہم ان سے دس لے لیتے تھے اور وہ ان کو پانچ ہی سمجھتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو خود ان کا اقرار و اعتراف اصول و عقائد کے دقیق

مسائل نہ سمجھ سکنے کا بھی درست ہی سمجھنا چاہئے، اور یہ ضروری ہے بھی نہیں کہ ایک شخص اگر محدث ہو مثلاً تو وہ ضرور فقیہ بھی ہو یا متکلم واصولی بھی ہو، یہ اس لئے بھی لکھنا پڑا کہ اس دور کے ہمارے سلفی بھائی محدث ابن خزیمہ کی کتاب التوحید پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ والحق احق ان یقال، علم عقائد واصول میں محدثِ علام بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات بڑے پایہ کی گراں قدر ومعتمد تالیف ہے، جو ہندوستان میں بھی عرصہ ہوا شائع ہوئی تھی اور اب علامہ کوثری کے نہایت محققانہ محدثانہ حواشی کے ساتھ دار احیاء التراث العربی، بیروت. لبنان سے شائع ہوگئی ہے، اس کا مطالعہ ہر عالم ومحقق کو کرنا چاہئے۔ علامہ نے عقائد ورجالِ حدیث پر بے نظیر کلام کیا ہے، راقم الحروف کے پاس یہاں کا مطبوعہ نسخہ بھی تھا اور اب بیروت والا بھی آگیا ہے۔ فالحمدللہ اولاً وآخراً

بیروت سے حال ہی میں ذریعہ ہوائی پارسل ملنے والی کتابوں میں ایک اہم ترین کتاب "المعجم المفهرس لالفاظ الحديث النبوی" بھی ہے۔ جس کی پہلی جلد ضخیم طلائی سنہری ۱۹۳۶ء میں لیدن (ہالینڈ) سے شائع ہوئی تھی۔ اور ساتویں آخری جلد ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی یہ علمِ حدیث کے درس وتصنیف کا مشغلہ رکھنے والوں کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے، کیونکہ یورپ کے مستشرقین غیر مسلم علماء کی برسہا برس کی کاوش ومحنت اور صرف زر کثیر کے بعد طبع ہو کر شائع ہوئی، اس کو حروف تہجی کے ذریعہ مرتب کیا گیا ہے کہ صحاح ستہ وغیرہ نو کتبِ حدیث میں جس لفظ کو بھی تلاش کرنا ہو ذرا سی دیر میں اس کے حوالہ سے اس لفظ اور حدیث کو حاصل کرلیں گے۔ کتنی کارآمد قیمتی چیز ہے، مگر اب اس سے فائدہ اٹھانے والے ہمارے کتنے مؤلفین واساتذۂ حدیث ہیں؟ اکبر الہ آبادی نے صحیح کہا تھا ؎

نئی میں اور پرانی روشنی میں فرق اتنا ہے　　اُنھیں ساحل نہیں ملتا، انہیں کشتی نہیں ملتی

مگر اب تو ہمیں کشتی بھی مل رہی ہے، ہم اس میں سوار ہی نہ ہوں تو قصور کس کا؟

باب حدالمريض ان يشهد الجماعة

۶۲۹: حدثنا عمر بن حفص بن غياث قال حدثني ابي قال ثنا الاعمش عن ابراهيمؒ قال الاسود كنا عند عائشة فذكر نا المواظبة على الصلوٰة والتعظيم لها قالت لما مرض النبي صلے الله عليه وسلم مرضه الذي مات فيه فحضرت الصلوٰة فاذن فقال مروا ابابكر فليصل بالناس فقيل له ان ابا بكر رجل اسيف اذا اقام مقامك لم يستطع ان يصلي بالناس واعادفاعادوا له' فاعادالثالثه فقال انكن صواحب يوسف مروا ابابكر فليصل بالناس فخرج ابوبكر يصلي فوجدالنبي صلے الله عليه وسلم من نفسه خفة فخرج يهادیٰ بين رجلين كاني انظر الیٰ رجليه تخطان الارض من الوجع فارادابوبكر ان يتاخر فاومأ اليه النبي صلے الله عليه وسلم ان مكانك ثم اتی به حتیٰ جلس الیٰ جنبه فقيل للاعمش فكان النبي صلے الله عليه وسلم يصلي و ابوبكر يصلي بصلوٰته والناس يصلون بصلوٰة ابي بكر فقال براسه نعم رواه ابوداؤد عن شعبة عن الاعمش بعضه' وزادابومعاويه جلس عن يسار ابي بكر فكان ابوبكر يصلي قائماً

ترجمہ: حضرت اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس (بیٹھے ہوئے) نماز کی پابندی اور اس کی بزرگی کا بیان کر رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ جب نبی کریم ﷺ اپنے اس مرض میں جس میں آپ نے وفات پائی، مبتلا ہوئے، اور نماز کا وقت آیا۔ اور اذان ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ ابوبکر سے کہہ دو، کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں، آپ سے عرض کیا گیا کہ ابوبکرؓ نرم دل آدمی ہیں۔ جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو شدتِ غم سے) وہ نماز نہ پڑھا سکیں گے، دوبارہ پھر آپ نے فرمایا، پھر لوگوں نے وہی عرض کیا، سہ بارہ آپ نے حکم فرمایا، اور فرمایا، کہ تم یوسف کے گھیرے میں لینے والی عورتوں کی طرح معلوم ہوتی) ہو، ابوبکرؓ سے کہو، کہ وہ لوگوں کو نماز

پڑھاویں، چنانچہ (کہہ دیا گیا) ابوبکرؓ نماز پڑھانے چلے، اتنے میں نبی علیہ السلام نے اپنے آپ میں کچھ خفت (مرض کی) پائی، تو آپ دو آدمیوں کے درمیان میں سہارا لے کر نکلے، گویا میں (اب بھی) آپ کے دونوں پیروں کی طرف دیکھ رہی ہوں، کہ بہ سبب (ضعف) مرض کے زمین پر گھسٹتے ہوئے جاتے تھے، پس ابوبکرؓ نے چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں، نبی کریم علیہ السلام نے انہیں اشارہ کیا کہ تم اپنی جگہ پر رہو، پھر آپ لائے گئے، یہاں تک کہ ابوبکرؓ کے پہلو میں آپ بیٹھ گئے، اعمش سے پوچھا گیا، کہ کیا نبی کریم علیہ السلام نماز پڑھتے تھے، اور ابوبکر آپ کی نماز کی اقتداء کرتے تھے اور لوگ ابوبکرؓ کی نماز کی اقتدا کرتے تھے، تو اعمش نے اپنے سر سے اشارہ کیا کہ ہاں! اور ابومعاویہ نے اتنے لفظ زیادہ روایت کئے کہ آپ ابوبکرؓ کے بائیں جانب بیٹھ گئے، اور ابوبکرؓ کھڑے ہوئے نماز پڑھتے تھے۔

۶۳۰: حدثنا ابراهیم بن موسیٰ قال اخبرنا هشام بن یوسف عن معمر عن الزهری قال اخبرنی عبیدالله بن عبدالله قال قالت عائشة لما ثقل النبی صلی الله علیه وسلم واشتدوجعه' استاذن ازواجه' ان یمرض فی بیتی فاذن له' فخرج بین رجلین تخط رجلاه الارض وکان بین العباس و بین رجل اٰخر قال عبیدالله فذکرت ذٰلک لا بن عباس ماقالت عآئشة فقال لی وهل تدری من الرجل الذی لم تسلم عآئشة قلت لاقال هو علی بن ابی طالبؓ

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جب نبی کریم علیہ السلام بیمار ہوئے اور مرض آپ کا بڑھ گیا، تو آپ نے اپنی بیبیوں سے اجازت مانگی کہ میرے گھر میں آپ کی تیمارداری کی جائے سب نے اجازت دے دی، پس آپ دو آدمیوں کے درمیان میں (سہارا لے کر نماز کو) نکلے، آپ کے دونوں پیر زمین پر گھسٹتے جاتے تھے، اور آپ عباسؓ کے اور ایک اور شخص کے درمیان میں (سہارا) لگائے ہوئے تھے، عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھ سے جو کچھ حضرت عائشہؓ نے بیان کیا تھا، اس کا ذکر ابن عباسؓ سے کیا، انہوں نے کہا، تم جانتے ہو کہ وہ دوسرا شخص کون تھا، جس کا نام حضرت عائشہؓ نے نہیں لیا، میں نے کہا، نہیں انہوں نے کہا، وہ حضرت علی بن ابی طالبؓ تھے۔

تشریح: معلوم ہوا کہ جب تک اتنی بھی طاقت باقی ہو کہ کسی آدمی کے سہارے مسجد میں جا سکے، اس وقت تک اس کو جماعت نہ چھوڑنی چاہئے۔ تاہم حالاتِ مرض و مریض مختلف ہوتے ہیں کوئی قاعدہ اس سلسلہ میں بنانا مشکل ہے، حضور علیہ السلام ایسی حالت میں بھی دو کے سہارے مسجد میں تشریف لائے، مگر اس کو واجب نہیں قرار دے سکتے، اور خود حضور علیہ السلام بھی کئی روز تک علیل رہے اور بہت سی نمازوں میں شرکت نہیں فرمائی، اگر وجوب ہوتا تو آپ ہر نماز میں شرکت فرماتے۔

علامہ بیہقی نے لکھا کہ آپ سترہ نمازوں میں شریک نہ ہو سکے، پانچ روز علالت کا سلسلہ رہا جیسا کہ حدیثِ مسلم سے معلوم ہوتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک ان دنوں میں چار نمازوں کی شرکت ثابت ہے۔ جن میں سے ایک پہلے دن جمعرات کی عشاء اور دوسری فجر دوشنبہ کی ہے۔

''اسیف'' کا ترجمہ حضرتؒ نے فرمایا نرم دل جو مغموم رہتا ہو۔ صواحب یوسف نے فرمایا کہ حضرت عائشہ ظاہر میں تو حضرت ابوبکرؓ کے اسیف ہونے کا عذر کر رہی تھیں اور دل میں یہ کھٹکا تھا کہ کہیں لوگ ان کی امامت سے بدفالی نہ لیں (کہ یہ اچھے امام ہوئے تھے کہ حضور علیہ السلام اچھے نہ ہوئے اور وفات ہوگئی۔ وجہ تشبیہ یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام والی عورتیں بھی دل میں کچھ بات رکھتی تھیں اور ظاہر دوسری بات کرتی تھیں۔ وکذا فی فتح الباری ص ۲/۱۰۵

باب الرخصة فى المطر والعلة ان يصلى فى رحله

بارش اور عذر کی بنا پر گھر میں نماز پڑھ لینے کی اجازت کا بیان

۶۳۱: حدثنا عبداللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک عن نافع ان ابن عمر اذن بالصلوٰة لیلة ذات برد وریح ثم قال الاصلوا فی الرحال ثم قال ان رسول الله صلے الله علیه وسلم کان یامر المؤذن اذاکانت لیلة ذات برد ومطریقول الاصلوا فی الرحال

۶۳۲: حدثنا اسمٰعیل قال حدثنی مالک عن ابن شهاب عن محمود بن الربیع الانصاری ان عتبان ابن مالک کان یؤم قومه، و هو اعمیٰ و انه، قال لرسول الله صلے الله علیه وسلم یارسول الله انها تکون الظلمة والسیل وانارجل ضریرالبصر فصل یا رسول الله فی بیتی مکانا اتخذه مصلی فجآء ه، رسول الله صلے الله علیه وسلم فقال این تحب ان اصلی فاشار الیٰ مکان البیت فصلی فیه رسول الله صلے الله علیه وسلم

ترجمہ ۶۳۱: حضرت نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک سرد اور ہوادار شب میں نماز کی اذان دی، جس میں یہ بھی کہہ دیا، کہ لوگو! اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو، اس کے بعد کہا کہ رسولِ خداعلیہ موذن کو حکم دیتے تھے، جب رات سرد اور بارش کی ہو، تو کہہ دے الا صلوا فی الرحال:۔

ترجمہ ۶۳۲: حضرت محمود بن ربیع انصاری روایت کرتے ہیں، کہ عتبانؓ اپنی قوم کی امامت کیا کرتے تھے (چونکہ) وہ نابینا تھے انہوں نے رسول خداعلیہ سے عرض کیا، کہ یارسول اللہ (کبھی) اندھیرا ہوتا ہے، اور پانی (بہتا) ہوتا ہے، اور میں اندھا آدمی ہوں، (اس وقت نہیں آسکتا) تو یارسول اللہ آپ میرے گھر میں کسی جگہ نماز پڑھا دیجئے، تا کہ میں اس کو مصلے بنالوں، پس رسولِ خداعلیہ (ان کے ہاں) تشریف لائے اور فرمایا، جہاں تم کہو، نماز پڑھ دوں، انہوں نے گھر کے ایک مقام کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہاں رسول خداعلیہ نے نماز پڑھی۔

تشریح: معلوم ہوا کہ بارش میں جب راستہ خراب ہو جائے تو جماعت کا ترک کر دینا جائز ہے، لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بارش زیادہ ہو تو وہ حنفیہ کے یہاں نماز جمعہ کے لئے بھی عذر بن سکتی ہے، اور اس کا فیصلہ اپنے دل سے کرنا چاہئے کہ وہ اس وقت عذر بننے کے لائق ہے یا نہیں، کیونکہ انسان کا ضمیر اپنا حال زیادہ صحیح جاننے کی وجہ سے درست ہی فیصلے کرتا ہے، اگرچہ ظاہر میں وہ کیسے ہی حیلے حوالے کرے۔

قولہ الا صلوا فی الرحال پر فرمایا کہ غالباً یہ اعلان اذان پوری کرنے کے بعد ہی ہوگا، پھر یہ کہ حضور علیہ السلام نے حضرت عتبان نابینا کو ترکِ جماعت کی اجازت دی اور حضرت ابن ام مکتومؓ کو نہیں دی، اس کی ایک وجہ تو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ حضور نے ایک کے لئے رخصت پر عمل کو پسند فرمایا اور دوسرے کے لئے عزیمت کو، میرے نزدیک یہ فرق ہے کہ ایک اذان کو سن سکتے ہوں گے، دوسرے نہیں، جس کا ذکر حدیث میں بھی ہے، پھر یہ کہ اعذار کے بھی مراتب ہوتے ہیں، شاید حضرت ابن ام مکتومؓ کا عذر حضرت عتبانؓ کے عذر سے کم درجہ کا ہو۔ اس لئے ایک کو رخصت دی اور دوسرے کو نہ دی ہو، اگلے باب کی ایک حدیثِ بخاری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے اپنے زیادہ بھاری جسم والے ہونے کی وجہ سے حضور علیہ السلام سے عذر کیا کہ میں آپ کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتا، تو آپ نے اس کے گھر پر نماز پڑھی، صاحبِ فیض الباری نے اس روایت کو بھی یہاں تائیداً پیش کیا ہے، مگر وہ محلِ نظر ہے، کیونکہ اس رجل سے حضرت عتبان کو مراد لینا احتمالِ بعید ہے، چنانچہ محقق عینیؒ نے بھی حافظ کے اس احتمال پر نقد کیا ہے۔ اور صاحبِ فیض کی عبارت ''فی ہذا الباب'' اور قال

الحافظ وہوعتبان' ان کی حسبِ عادت مسامحت ہے۔ کیونکہ حدیث مذکور اگلے باب میں ہے اور حافظ نے خود جزم نہیں کیا، بلکہ قیل سے کسی دوسرے کا قول نقل کیا ہے، اور نام بھی ظاہر نہیں، جس سے اس قول کا وزن معلوم ہوسکتا۔ حافظ عینیؒ نے حدیثِ مذکور کے تحت فائدہ نمبر ۶ میں زیادہ موٹے ہونے کو بھی اعذار ترکِ جماعت میں شامل کیا ہے اور صاحبِ صحیح ابن حبان سے دس اعذار ثابتہ من الحدیث نقل کئے، (۱) مرض مانع ہو (۲) حضورِ طعام بوقتِ مغرب (۳) بھول بعض احوال میں (۴) زیادہ مٹاپا (۵) شدید ضرورت مانع ہو (۶) مسجد کے راستہ میں خوفِ ضیاع جان و مال ہو (۷) شدید سردی (۸) زیادہ بارش (۹) زیادہ تاریکی جس میں چلنا دشوار (۱۰) لہسن پیاز وغیرہ بدبودار چیز کھائی ہو۔ (عمدہ نمبر ۳۵\۲۷)

باب هل يصلى الامام بمن حضر وهل يخطب يوم الجمعة فى المطر

(جس قدر لوگ موجود ہیں' ان ہی کے ساتھ نماز پڑھ لے اور کیا جمعہ کے دن بارش میں بھی خطبہ پڑھے)

۶۳۳: حدثنا عبدالله بن عبدالوهاب قال حدثنا حماد بن زيد قال حدثنا عبدالحميد صاحب الزيادى قال سمعت عبدالله بن الحارث قال خطبنا ابن عباس فى يوم ذى ردغ فامر المؤذن لما بلغ حى على الصلوة قال قل الصلوة فى الرحال فنظر بعضهم الىٰ بعض كانهم انكروا فقال كانكم انكرتم هٰذا ان هٰذا فعله' من هو خير منى يعنى النبى صلے الله عليه وسلم انها عزمة وانى كرهت ان اخرجكم وعن حماد عن عاصم عن عبدالله بن الحارث عن ابن عباس نحوه' غير انه' قال كرهت ان اؤ ثمكم فتجيّؤن تدوسون الطين الىٰ ركبكم

۶۳۴: حدثنا مسلم قال حدثنا هشام عن يحيىٰ عن ابى سلمة قال سالت اباسعيد الخدرى فقال جآء ت سحابة فمطرت حتىٰ سال السقف و كان من جريد النخل فاقيمت الصلوٰة فرايت رسول الله صلے الله عليه وسلم يسجد فى المآء والطين حتى رايت اثر الطين فے جبهته

۶۳۵: حدثنا اٰدم قال حدثنا شعبة قال حدثنا انس بن سيرين قال سمعت انسايقول قال رجل من الانصار انى لآ استطيع الصلوٰة معک و كان رجلاً ضخماً فصنع النبى صلے الله عليه وسلم طعاماً فدعاه' الىٰ منزله فبسطله حصيراً ونضح طرف الحصير فصلىٰ عليه ركعتين فقال رجل من ال الجارود لانسؓ اكان النبى صلے الله عليه وسلم لصلى الضحىٰ قال مارايته' صلاها الا يومئذ

ترجمہ ۶۳۳: حضرت عبداللہ بن حارثؒ کا بیان ہے کہ (ایک مرتبہ بارش کی وجہ سے) کیچڑ ہوگئی تھی، حضرت ابن عباسؓ نے اس دن خطبہ فرمایا، اور موذن سے کہہ دیا تھا کہ جب حى على الصلوٰة پر پہنچے تو یہ کہہ دے کہ اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو (یہ سن کر) لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، گویا کہ انہوں نے (اس کو) برا سمجھا، تو ابن عباسؓ نے کہا، کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس کو برا سمجھا، بے شک اس کو اس نے کیا ہے، جو مجھ سے بہتر تھے، یعنی نبی کریم علیہ السلام نے، یہ یقینی امر ہے، کہ اذان (سے مسجد میں آنا) واجب ہوجاتا ہے اور میں نے یہ اچھا نہ سمجھا کہ تمہیں تکلیف میں ڈالوں حضرت عاصم نے بھی حضرت ابنِ عباسؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے، صرف اتنا فرق ہے، کہ انہوں نے کہا کہ مجھے اچھا نہ معلوم ہوا کہ تمہیں گنہگار کروں، یا تم مٹی کو گھٹنوں تک روندتے آؤ۔

ترجمہ ۶۳۴: حضرت ابوسلمہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابوسعید خدریؓ سے پوچھا، تو انہوں نے کہا، کہ ایک (مرتبہ) ابر آیا، اور وہ برسنے لگا، یہاں تک کہ چھت ٹپکنے لگی، اور چھت (اس وقت تک) کھجور کی شاخوں سے (پٹی ہوئی) تھی، پھر نماز کی اقامت ہوئی، تو میں نے رسولِ

خدا علیہ السلام کو دیکھا کہ پانی اور مٹی میں سجدہ کرتے تھے، یہاں تک کہ مٹی کا اثر میں نے آپ کی پیشانی میں دیکھا۔

ترجمہ ۶۳۵: حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص نے (نبی کریم علیہ السلام سے) عرض کیا کہ میں (معذور ہوں) آپ کے ہمراہ نماز نہیں پڑھ سکتا، اور وہ فربہ آدمی تھا (اس کے بعد، اس نے نبی علیہ السلام کے لئے کھانا تیار کیا، اور آپ کو اپنے مکان میں بلایا، اور آپ کے لئے چٹائی بچھادی، اور چٹائی کے ایک کنارے کو دھو دیا، اس پر آپ نے دو رکعت نماز پڑھی، اتنے میں آل جارود میں سے ایک شخص نے انسؓ سے پوچھا، کہ کیا نبی کریم علیہ السلام نماز چاشت پڑھا کرتے تھے، انسؓ نے کہا کہ میں نے سوائے اس دن کے کبھی آپ کو پڑھتے نہیں دیکھا۔

تشریح: مقصد ترجمہ واحادیث مذکورہ واضح ہے کہ عذر کی حالت میں اگر رخصت سمجھ کر کچھ لوگ مسجد میں جا کر نماز نہ پڑھیں بلکہ گھروں میں پڑھ لیں اور دوسرے لوگ عزیمت پر عمل کر کے مسجد میں آ جائیں تو جو لوگ آ جائیں، ان ہی کے ساتھ امام جماعت کرا دے گا۔

باب اذاحضر الطعام واقيمت الصلوٰة وكان ابن عمر يبدأ بالعشآء وقال ابو الدردآء من فقه المرء اقباله على حاجته حتىٰ يقبل علىٰ صلوٰته و قلبه فارغ

۶۳۶: حدثنا مسدد قال حدثنا يحيىٰ عن هشام قال حدثني ابي سمعت عآئشة عن النبي صلے الله عليه وسلم انه قال اذا وضع العشآء واقيمت الصلوٰة فابدء وا بالعشآء

۶۳۷: حدثنا يحيى بن بكير قال حدثنا الليث عن عقيل بن شهاب عن انس ابن مالك ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اذ قدم العشاء فابدء وابه قبل ان تصلوا صلوٰة المغرب ولاتعجلوا عن عشآئكم

۶۳۸: حدثنا عبيد بن اسمٰعيل عن ابي اسامة عن عبيدالله عن نافع عن ابن عمر قال قال رسول الله صلے الله عليه وسلم اذا وضع عشآء احدكم و اقيمت الصلوٰة فابدء وابالعشآء ولايعجل حتىٰ يفرغ منه و كان ابن عمر يوضع له الطعام و تقام الصلوٰة فلاياتيها حتىٰ يفرغ و انه ليسمع قرآءة الامام وقال زهير و وهب ابن عثمان عن موسى بن عقبة عن نافع عن ابن عمر قال قال النبي صلى الله عليه وسلم اذا كان احدكم على الطعام فلايعجل حتىٰ يقضى حاجته منه و ان اقيمت الصلوٰة قال ابوعبدالله وحدثني ابراهيم بن المنذر عن وهب بن عثمان و وهب مدني

ترجمہ ۶۳۶: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم علیہ السلام سے راویت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا جب کھانا (سامنے) رکھ دیا جائے، اور نماز کی اقامت ہو، تو پہلے کھانا کھالو۔

ترجمہ ۶۳۷: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا علیہ السلام نے فرمایا کہ جب کھانا سامنے رکھ دیا جائے، تو مغرب کی نماز پڑھنے سے پہلے کھانا کھالو، اور اپنے کھانے میں عجلت نہ کرو۔

ترجمہ ۶۳۸: حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا علیہ السلام نے فرمایا، کہ جب تم میں سے کسی کا کھانا سامنے رکھ دیا جائے اور نماز کی اقامت بھی ہو جائے تو پہلے کھانا کھالے اور جلدی نہ کرے، یہاں تک کہ اس سے فارغ نہ ہو جائے حضرت ابن عمرؓ کی عادت تھی کہ جب ان کے سامنے کھانا رکھ دیا جاتا اور جماعت بھی کھڑی ہو جاتی، تو جب تک کھانے سے فارغ نہ ہو جاتے، نماز میں نہ آتے، حالانکہ وہ یقیناً امام کی قراءت سنتے ہوتے تھے، اور زہیر اور وہب بن عثمان نے یہ سند موسیٰ بن عقبہ، نافع ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کھانے پر (بیٹھ گیا) ہو، تو جلدی نہ کرے، یہاں تک کہ اپنی اشتہا اس سے پوری کر لے، اگرچہ جماعت کھڑی ہو گئی ہو، امام بخاری نے کہا، کہ مجھ سے ابراہیم بن منذر نے وہب بن عثمان سے روایت کیا، اور وہب مدینہ کے رہنے والے تھے۔

تشریح: حضرت گنگوہی قدس سرہ، نے فرمایا کہ ترجمۃ الباب میں حضرت ابوالدرداءؓ کا قول امام بخاریؒ نے اس لئے نقل کیا تا کہ مختلف روایات میں جمع کی صورت نکل آئے، کیونکہ بعض میں کھانا مقدم رکھنے کا حکم ہے جو یہاں درج ہیں اور بعض میں یہ ہے کہ نماز کو کھانے وغیرہ کی وجہ سے موخر نہ کیا جائے (کمافی ابی داؤد وغراہ صاحب المشکوٰۃ الی شرح السنۃ) پھر حاشیہ لامع میں یہ تفصیل بھی ہے کہ علامہ شوکانی نے کہا:۔ظاہر احادیث تقدیم کی وجہ سے کھانے کو ہی ہمیشہ مقدم کیا جائے خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، اور خواہ وہ کھانا کم ہو یا زیادہ، اور کھانے کے خراب ہونے کا خطرہ ہو یا نہ ہو۔ابن حزم اور ظاہریہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، امام ترمذی نے بھی بعض صحابہ وتابعین سے تقدیم طعام ہی کو نقل کیا ہے، امام غزالیؒ نے قید لگائی کہ کھانے کے فاسد یا بے مزہ ہونے کا ڈر ہو تو نماز کو مؤخر کرے ورنہ نہیں، شافعیہ نے احتیاج کی قید رکھی، امام مالک نے فرمایا کہ کھانا ہلکا ہو یعنی کم مقدار میں تو نماز کو مؤخر کر کے کھالے ورنہ نہیں:۔جمہور کا مسلک یہ ہے کہ وقت میں گنجائش ہو تو پہلے کھانا کھالے اور دل کو فارغ کر کے نماز اطمینان سے ادا کرے اور اسی لئے امام اعظم نے فرمایا کہ نماز کو کھانا بنادوں کہ اس میں دل پڑا رہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ کھانے کو نماز بنادوں کہ کھاتے ہوئے بھی نماز کا ذکر ودھیان رہے، لیکن اگر نماز کے وقت نکلنے کا ڈر ہو تو پہلے نماز ہی پڑھے، اور اس وقت نماز کی تاخیر کھانے وغیرہ کی وجہ سے جائز نہیں اور یہی حدیث ابی داؤد مذکورہ بالا کا منشاء ہے۔

لہٰذا ابن حزم اور بعض شافعیہ کا یہ مسلک صحیح نہیں کہ کھانے کو ہی مقدم کیا جائے خواہ نماز کا وقت بھی نکل جائے اور شوکانی نے جو امام احمدؒ کی طرف یہ قول منسوب کیا کہ وہ کھانے پر نماز کو مقدم کرنے سے نماز کو فاسد بتلاتے ہیں یہ انتساب بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ موفق نے کھانا مقدم کرنے کو صرف مستحب لکھا ہے، واجب وفرض نہیں لکھا۔علامہ ابن عبدالبرؒ نے اس امر پر اجماع نقل کیا ہے کہ کھانے کی موجودگی میں اگر نماز کامل طریقہ پر پڑھ لی جائے تو وہ درست ہو جائے گی۔

امام طحاویؒ نے مشکل الآثار (ص۲/۴۰۲) میں تقدیم طعام کی روایات کو روزہ دار کے لئے خاص کیا ہے اور نماز سے نماز مغرب کو متعین کیا ہے۔گویا دوسری نمازوں کے اوقات کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔(لامع الدراری ص۱/۲۵۳)

حافظؒ نے علامہ محقق ابن دقیق العید سے نقل کیا کہ احادیث میں سب نمازیں مراد نہیں بلکہ مناسب ہے کہ ان کو صرف مغرب کی نماز پر محمول کیا جائے، لقولہ علیہ السلام **فابدؤا بالعشاء** اور دوسری روایت **فابدؤا به قبل ان تصلوا المغرب** سے بھی یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے، اور ایک حدیث دوسری حدیث کی تفسیر کرتی ہے۔ایک صحیح حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب کھانا سامنے آجائے اور کوئی تم میں سے روزہ دار ہو تو کھانے کو مقدم کرو۔

علامہ فاکہانیؒ نے کہا کہ ''حدیث کو عموم پر رکھنا چاہیے کیونکہ علت عام ہے یعنی تشویش قلب کہ بھوک میں خشوع صلوٰۃ حاصل نہ ہوگا اور نماز مغرب کا ذکر حصر کے لئے نہیں ہے اس لئے کہ بعض مرتبہ غیر روزہ دار کھانے کا روزہ دار سے بھی زیادہ خواہش مند ہوتا ہے''۔پھر حافظ نے خود بھی لکھا کہ عموم پر محمول کرنا معنی ومقصد کے لحاظ سے بھی مناسب ہے کیونکہ بھوکا روزہ دار کی طرح ہے' اور شام کا وقت صبح کی طرح ہے' لہٰذا حدیث کے لفظ ماثور پر انحصار ضروری نہیں معلوم ہوتا' علامہ عینی اور حافظؒ نے اور بھی تفصیل کی ہے۔مطالعہ کرلی جائے۔ہم نے خلاصہ دے دیا ہے۔ (فتح الباری ص۲/۱۰۹)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فقہی بات تو وہی ہے، جو سب کہتے ہیں، مگر میرے نزدیک اس قسم کے مسائل میں زیادہ توسع کرنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ انسان کو اپنے دین کی اصلاح وترقی کی فکر زیادہ چاہیئے، بہ نسبت دنیوی امور کھانے، پینے، راحت وآسائش وغیرہ کے لئے تا کہ اعمال خیر کل کے لئے ذخیرہ ہوں، اور کوتاہیوں وغفلت میں قیمتی وقت ضائع نہ ہو جائے **لقوله تعالى ولتنظر نفس ما قدمت لغد** ط (ہر شخص کو سوچنا چاہیئے کہ اس نے کل کے لئے کیا ذخیرہ کیا ہے)

کل سے مراد آخرت ہے۔یعنی آج کی دنیوی محدود زندگی کی راحت وعیش میں پڑ کر کل کی آخرت والی ابدی زندگی سے غفلت نہ برتنی چاہئے اور وہاں کی زندگی سنوارنے کی واحد صورت نیک اعمال کا ذخیرہ ہے۔

باب اذادعی الامام الصلوٰۃ وبیدہ مایاکل

(جب نماز کے لئے امام کو بلایا جائے اور اس کے ہاتھ میں وہ چیز ہو جو کھا رہا ہو)

۶۳۹: حدثنا عبدالعزیز بن عبداللہ قال حدثنا ابراھیم بن سعد عن صالح عن ابن شھاب قال اخبرنی جعفر بن عمرو بن امیة ان اباہ قال رایت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یاکل ذراعاً یحتز منھا فدعی الی الصلوٰۃ فقام فطرح السکین فصلی ولم یتوضأ

ترجمہ: حضرت جعفر بن عمرو بن امیہ، عمرو بن امیہؓ سے روایت کرتے ہیں، کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو ایک شانہ کھاتے ہوئے دیکھا، آپ اس میں سے گوشت کاٹ لیتے تھے، اتنے میں آپ کو نماز کے لئے بلایا گیا، تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور چھری آپ نے نیچے رکھ دی۔ پھر آپ نے نماز پڑھی اور وضو نہیں فرمایا (یعنی گوشت کھانے کے بعد)

تشریح: حسب تحقیق حافظؒ اس باب میں یہ بتلایا کہ پہلے باب میں حکم تقدیم طعام کا کا بطور استحباب تھا، وجوب کے لئے نہ تھا' اور بعض حضرات نے یہ تفصیل کی کہ اقامت صلوٰۃ قبل کھانا شروع کرنے کے ہو یا بعد کو ان دونوں کا حکم الگ الگ ہے' یا امام بخاری نے امام اور غیر امام کا مسئلہ جدا جدا سمجھا ہو' علامہ ابن المنیر نے کہا شاید حضور علیہ السلام نے خاص اپنے لئے عزیمت کو اختیار کیا ہو' اس لئے نماز کو کھانے پر مقدم کیا اور دوسروں کو رخصت پر عمل کرنے کا موقع دیا' کیونکہ آپ خواہش طعام پر قابو رکھنے کی دوسروں سے زیادہ قوت رکھتے تھے' اور آپ کی برابر کون اپنی خواہشات پر کنٹرول کر سکتا تھا؟ لیکن اس استدلال پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے حضور علیہ السلام جتنا کچھ کھانا چاہتے تھے وہ کھا چکے ہوں اور اس لئے باقی کو چھوڑ کر جماعت کے لئے تشریف لے گئے ہوں واللہ اعلم (فتح الباری ص ۱۱۱ ج ۲)

ہمارے حضرت شاہ صاحب نے ایک توجیہ پر پیش کی کہ کھانا چونکہ خراب یا بے مزہ ہو جانے والا نہیں تھا' ممکن ہے حضور علیہ السلام نے اسی لئے اس کو درمیان میں چھوڑ کر جماعت میں شرکت کی ترجیح دی ہو۔

باب من کان فی حاجة اھلہ فاقیمت الصلوٰۃ فخرج

(جو شخص گھر کے کام کاج میں ہو' اور نماز کی تکبیر کہی جائے' تو نماز کے لئے کھڑا ہو جائے)

۶۴۰: حدثنا ادم قال حدثنا شعبة قال حدثنا الحکم عن ابراھیم عن الاسود قال سالت عائشة ماکان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یصنع فی بیتہ قالت کان یکون فی مھنة اھلہ تعنی خدمة اھلہ فاذا حضرت الصلوٰۃ خرج الی الصلوٰۃ

ترجمہ: حضرت اسودؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے! وہ بولیں کہ اپنے گھر والوں کی مہنت یعنی خدمت میں (مصروف) رہتے تھے' جب نماز کا وقت آجاتا تو آپ نماز کے لئے چلے جاتے۔

تشریح: علامہ عینی اور حافظ نے فرمایا کہ امام بخاری نے ترجمۃ الباب سے یہ اشارہ کیا کہ کھانے کی طرح دوسرے امور نہیں ہیں کہ ان میں بھی جٹے رہو اور جماعت کی پرواہ نہ کرو' اسی لئے حضور علیہ السلام کا تعامل ذکر کیا گیا کہ آپ فارغ اوقات میں گھر کے اندر گھر والوں کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے تھے' مگر جماعت کے وقت اس کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ (عمدہ ص ۲۸۷ ج ۲ و فتح ص ۱۱۱ ج ۲)

علامہ عینی نے یہ بھی لکھا کہ خود حضور علیہ السلام کے اپنے ذاتی کام اور معمولات بھی اس میں داخل ہیں، کیونکہ شمائل ترمذی میں ہے کہ آپ اپنے کپڑوں کی صفائی بھی کر لیتے تھے، اپنی بکری کا دودھ بھی دوہ لیتے تھے وغیرہ، امام احمد وابن حبان کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اپنا کپڑا سی لیتے تھے، ڈول درست کر لیتے تھے، حاکم نے اکلیل میں یہ بھی اضافہ کیا کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے کبھی کسی عورت یا خادم کو نہیں مارا (عمدہ ص ۲۹۷ ج ۱)

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: حضرت زرارۃ بن ابی اوفی ایک تابعی تھے لوہار، ان کا حال بھی یہ تھا کہ ہتھوڑا اٹھاتے ہوئے بھی اگر اذان کی آواز سن لی تو اسی طرح ہتھوڑے کو رکھ کر نماز کے لئے چل دیتے تھے۔

پھر فرمایا کہ حدیث الباب کی سند میں حضرت اسود بھی ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اخص تلامذہ میں سے تھے، حضرت عائشہؓ سے اہم مسائل میں رجوع کرتے اور ان کی خدمت میں ہدایا بھی پیش کرتے تھے، رواۃ کوفہ میں سے ہیں، اور ان کا مسلک بھی ترک رفع یدین تھا، اس سے خیال کرو کہ کیسے جلیل القدر عالم تھے اور ان کے اساتذہ کتنے بڑے مرتبہ کے تھے اور اسی سے ان کے اختیار کردہ مسائل ترک رفع وغیرہ کی شان بھی سمجھو۔

باب من صلے بالناس و ھو لایرید الآن یعلمھم صلوٰۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم و سنتہ

(اس شخص کا بیان جو لوگوں کو صرف اس لئے نماز پڑھائے کہ انہیں رسول اللہ کی نماز اور ان کی سنت سکھائے)

۶۴۱: حدثنا موسی بن اسمٰعیل قال حدثنا وھیب قال حدثنا ایوب عن ابی قلابۃ قال جآء نامالک بن الحویرث فی مسجد ناھٰذا قال انی لاصلی بکم وما اریدالصلوٰۃ اصلی کیف رایت النبی صلے اللہ علیہ وسلم یصلی فقلت لابی قلابہ کیف کان یصلی قال مثل شیخنا ھٰذا وکان الشیخ یجلس اذارفع راسہ' من السجود قبل ان ینھض فی الرکعۃ الاولیٰ

ترجمہ: حضرت ابوقلابہؒ روایت کرتے ہیں کہ ہمارے پاس مالک بن حویرثؓ ہماری اسی مسجد میں آئے، اور انہوں نے کہا، کہ میں تمہارے سامنے نماز پڑھتا ہوں، میرا مقصود نماز پڑھنا نہیں ہے، بلکہ جس طرح میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا ہے، اسی طرح (تمہارے دکھانے کو) پڑھتا ہوں، ایوب کہتے ہیں کہ میں نے ابوقلابہ سے کہا، کہ وہ کس طرح نماز پڑھتے تھیں؟ وہ بولے کہ ہمارے اس شیخ کی مثل اور شیخ (کی عادت تھی کہ) پہلی رکعت میں جس سجدہ سے اپنا سر اُٹھاتے تھے، تو کھڑے ہونے سے پہلے بیٹھ جاتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحب: نے فرمایا کہ اس باب سے یہ بتلانا ہے کہ نماز پڑھ کر اگر دوسروں کو عملی طور پر تعلیم دی جائے تو وہ نماز بھی خدا کیلئے ہی ہے اور درست ہے، وہ لغیر اللہ نہیں ہوگی، جس طرح تحیۃ المسجد کہ وہ نام سے بھی مسجد کیلئے معلوم ہوتی ہے اور تحیۃ مسجد کہلاتی ہے مگر وہ بھی خدا کیلئے ہے۔

قولہ وکان الشیخ یجلس

اس پر فرمایا کہ اس سے جلسہ استراحت مراد ہے، یعنی پہلی اور تیسری رکعت کے سجدہ سے اٹھ کر کھڑے ہونے سے قبل بیٹھنا جو امام شافعیؒ کے نزدیک مستحب ہے، مگر امام ابوحنیفہ، امام مالک وامام احمدؒ وغیرہم اس کے قائل نہیں،[1] اور منتقی الاخبار (للشیخ مجد الدین ابی البرکات ابن تیمیہ جد ابن تیمیہ

[1] علامہ عینی نے بھی امام احمد کا یہ قول ذکر کیا ہے، اور نعمان بن ابی عیاش سے یہ بھی نقل کیا کہ میں نے بہت سے اصحاب رسول اللہ علیہ کو دیکھا کہ وہ نہیں بیٹھتے تھے۔ امام ترمذی نے کہا کہ اسی پر اہل علم کا عمل ہے۔ ابوالزناد نے کہا کہ یہی سنت ہے اور ان حضرات نے حدیث مالک ابن الحویرث بخاری کا یہ جواب دیا کہ حضور علیہ السلام سے جلوس بوجہ ضعف کے ہوا ہے۔ اور ابوعبدالملک نے کہا کہ حضور علیہ السلام نے مدینہ میں دس سال نمازیں پڑھیں اور پھر حضرت ابوبکرؓ، عمر، عثمان، اور دوسرے صحابہ وتابعین نے بھی، اگر وہ جلسہ استراحت کرتے تو کیا وہ اہل مدینہ سے پوشیدہ رہ سکتا تھا؟ الخ (عمدہ ص ۳۰۷/۲)

المعروف) میں ہے امام احمد سے کہ اکثر احادیث سے ترک جلسہ استراحت ثابت، اور بخاری ص ۱۱۳ میں "باب المکث بین السجدتین" میں ان ہی مالک بن الحویرث کے تیسری رکعت کے بعد بیٹھنے پر ایوب کا یہ ریمارک بھی نقل ہوا ہے کہ وہ ایسا فعل کرتے تھے، جو ہم نے دوسروں کو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تقلیل کے لئے یہ کیا کم ہے کہ ایک صحابی کہہ رہا ہے کہ عمر بن سلمہ کے سوا کسی کو کرتے نہیں دیکھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس سے میں یہ سمجھا ہوں کہ یہ جلسہ استراحت بھی ضرور ہے، مگر پھر ترک وخمول میں آ گیا ہوگا، اسی لئے ایوب وغیرہ نے انکار کیا ہے، جس طرح فرض مغرب سے قبل دو رکعات بھی ثابت ہوئیں مگر پھر محمول میں آ گئیں اسی لئے حضرت ابن عمرؓ نے ان پر نکیر کی ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ پھر بھی میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف صرف افضلیت کا ہے، جیسا کہ علامہ حلوائیؒ کی رائے ہے میرا طریقہ ہے کہ اختلاف کو جتنا بھی ہو سکے کم کرتا ہوں، اور کبیری میں جو جلسہ استراحت کی وجہ سے سجدہ سہو واجب کہا ہے وہ میرے نزدیک اس حالت میں ہے کہ وہ مقدار سنت سے زیادہ ہو جائے نہ جب کہ مقدار سنت ہو، اس وقت سجدہ سہو نہیں ہے، دیوبند میں مجھ سے پوچھا تو میں نے یہی بتلایا اور اگر معارض بھی ہوتا تو شارح منیہ کو حلوائی سے نسبت ہی کیا ہے؟ پھر فرمایا کہ میرے نزدیک امام طحاوی کا یہ جواب کہ وہ عذر کی وجہ سے تھا، قوی نہیں ہے۔

باب اهل العلم و الفضل احق بالامامة

(علم وفضل والا امامت کا زیادہ مستحق ہے)

۶۴۲: حدثنا اسحٰق بن نصر قال ثنا حسين عن زآئدة عن عبدالملک بن عمير قال حدثني ابوبردة عن ابي موسىٰ قال مرض النبي صلے الله عليه وسلم فاشتدموضه' فقال مروّا ابابكر فليصل بالناس قالت عائشة انه' رجل رقيق اذا قام مقامک لم يستطع ان يصلي بالناس قال مريَ ابابكر فليصل بالناس فعادت فقال مريَ ابابكر فليصل بالناس فانكن صواحب يوسف فاتاه الرسول فصلي بالناس في حيوٰة النبي صلے الله عليه وسلم

۶۴۳: حدثنا عبدالله بن يوسف قال اخبرنا مالک عن هشام بن عروة عن ابيه عن عآئشة ام المؤمنين انها قالت ان رسول الله صلے الله عليه وسلم قال في مرضه مروآابابكر يصلي بالناس قالت عآئشة قلت ان ابابكر اذاقام في مقامک لم يسمع الناس من البكآء فمرعمر فليصل بالناس من البكآء فمر عمر فليصل للناس ففعلت حفصة فقال رسول الله صلے الله عليه وسلم ......انكم لانتن صواحب يوسف مروّا ابا بكر فليصل للناس فقالت حفة لعآئشة ما كنت لا صيب منک خيراً

۶۴۴: حدثنا ابواليمان قال اخبرنا شعيب عن الزهري قال اخبرني انس ابن مالک ن الانصاري وكان تبع النبي صلے الله عليه وسلم وخدمه' و صحبه' ان ابابكر كان يصلي لهم في وجع النبي صلے الله عليه وسلم الذي توفي فيه حتىٰ اذاكان يوم الاثنين وهم صفوف في الصلوٰة فكشف النبي صلے الله عليه وسلم ستر الحجرة ينظراليناوهوقآئم كان وجهه' ورقة مصحف ثم تبسم يضحک فهممنا ان تفتتن من الفرح برؤية النبي صلے الله عليه وسلم فنكص ابوبكر علىٰ عقبيه ليصل الصف وظن ان النبي صلے الله عليه وسلم خارج الى الصلوٰة فاشار الينا النبي صلے الله عليه وسلم اتمواصلوٰتكم و

ارخی الستر فتوفی من یومہ صلے اللہ علیہ وسلم

۶۴۵ : حدثنا ابومعمر قال حدثنا عبدالوارث قال حدثنا عبدالعزیز عن انس قال لم یخرج النبی صلے اللہ علیہ وسلم ثلثا فاقیمت الصلوٰۃ فذھب ابوبکر یتقدم فقال نبی اللہ علیہ وسلم بالحجاب فرفعہ' فلما وضح وجہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما نظرنا منظراً کان اعجب الینا من وجہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین وضح لنا فاوماالنبی صلے اللہ علیہ وسلم بیدہ الیٰ ابی بکرؓ ان یتقدم و ارخی النبی صلے اللہ علیہ وسلم الحجاب فلم یقدرعلیہ حتیٰ مات

۶۴۶ : حدثنا یحیی بن سلیمان قال حدثنی ابن وھب قال حدثنی یونس عن ابن شھاب عن حمزۃ بن عبداللہ انہ' اخبرہ عن ابیہ قال لما اشتدبرسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وجعہ' قل لہ' فی الصلوٰۃ فقال مروآ ابابکر فلیصل بالناس قالت عآئشۃ ان ابابکر رجل رقیق اذاقرأ غلبہ البکآء قال مروہ فلیصل فعاودتہ فقال مروہ فلیصل انکن صواحب یوسف تابعہ الزبیدی وابن اخی الزھری واسحٰق بن یحییٰ الکلبی عن الزھری وقال عقیل و معمر عن الزھری عن حمزۃ عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم.

ترجمہ۶۴۲: حضرت ابوموسیٰؓ روایت کرتے ہیں، کہ جب نبی کریم ﷺ بیمار ہوئے، اور آپ کا مرض بڑھ گیا، تو آپ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھاویں، حضرت عائشہؓ نے کہا، کہ (حضرت) وہ نرم دل آدمی ہیں۔ جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگوں کو نماز نہ پڑھا سکیں گے۔ حضور نے فرمایا، نہیں، تم ابوبکر سے ہی کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں لیکن حضرت عائشہؓ پھر لوٹ کر آ گئیں تو حضور نے فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھاویں اور تم تو وہ عورتیں (معلوم ہوتی ہو) جنھوں نے یوسف کو (گھیر رکھا تھا) پس ابوبکرؓ کے پاس حضور کا قاصد (یہ حکم لے کر) آیا اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھائی:۔

ترجمہ۶۴۳: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے اپنی بیماری میں فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھاویں، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں، میں نے حفصہؓ سے کہا کہ تم حضور سے عرض کرو کہ ابوبکرؓ جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے، تو رونے کی وجہ سے لوگوں کو (اپنی قراءت) نہ سنا سکیں گے۔ لہٰذا آپ عمرؓ کو حکم دیجئے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھاویں، پس حفصہؓ نے عرض کر دیا تو رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ ہٹو! تم تو وہ عورتیں ہو جو یوسف کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ابوبکرؓ کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھادیں، تو حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا، کہ تم سے مجھے کوئی بھلائی ملنے کی امید نہیں۔

ترجمہ۶۴۴: حضرت انس بن مالکؓ جو رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنے والے، آپ کے خادم اور صحابی تھے، روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے مرض وفات میں حضرت ابوبکرؓ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے، یہاں تک کہ جب دوشنبہ کا دن ہوا اور لوگ نماز میں صف بستہ تھے تو نبی کریم ﷺ نے حجرہ کا پردہ اٹھایا اور ہم لوگوں کی طرف کھڑے ہو کر دیکھنے لگے، اس وقت آپ کا چہرہ مبارک گویا مصحف کا صفحہ تھا، پھر آپ بشاشت سے مسکرائے۔ ہم لوگوں نے خوشی کی وجہ سے چاہا کہ نبی ﷺ کے دیکھنے میں مشغول ہو جائیں اور ابوبکرؓ اپنے پچھلے پیروں پیچھے ہٹ آئے تا کہ صف میں مل جائیں وہ سمجھے کہ نبی کریم ﷺ نماز کے لئے آنے والے ہیں، لیکن آپ نے ہماری طرف اشارہ کیا کہ اپنی نماز پوری کرلو، اور آپ نے پردہ ڈال دیا، اسی دن آپ نے وفات پائی۔ صلی اللہ علیہ وسلم

ترجمہ ۶۴۵: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں، کہ (مرض وفات میں) نبی کریم ﷺ تین دن باہر نہیں نکلے، ایک دن نماز کی اقامت ہوئی اور ابوبکرؓ آگے بڑھنے لگے، اتنے میں نبی کریم ﷺ نے پردہ کو اٹھا دیا، پس نبی ﷺ کا چہرہ نظر آتے ہی ہمارے سامنے ایسا خوش کن منظر آ گیا کہ اس سے زیادہ کبھی میسر نہ آیا تھا، پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ابوبکر کو اشارہ کیا، کہ آگے بڑھ جائیں اور نبی کریم ﷺ نے پردہ گرا دیا، پھر اس پر آپ کو قدرت نہ ہوئی یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی۔

ترجمہ ۶۴۶: حضرت حمزہ بن عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب رسول خدا ﷺ کا مرض بڑھ گیا، تو آپ سے نماز کی (امامت کے) بارے میں عرض کیا گیا، آپ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو، کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں، حضرت عائشہؓ بولیں، کہ ابوبکرؓ ایک نرم دل آدمی ہیں۔ جب (نماز میں قرآن مجید) پڑھیں گے، تو ان پر رونا غالب آ جائے گا، آپ نے فرمایا، ان ہی سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں، پھر دوبارہ حضرت عائشہؓ نے وہی کہا، پھر آپ نے فرمایا کہ ان ہی سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں، تم تو یوسف کے زمانے کی عورتوں کی طرح (معلوم ہوتی ہو) زبیدی اور زہری کے بھتیجے نے اس کے متابع حدیث روایت کی ہے اور عقیل اور معمر نے یہ سند زہری و حمزہ، رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے۔

تشریح اور بحث ونظر: قوله فانكن صواحب يوسف: یعنی جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام سے مصر کی عورتیں ان کے خلاف مرضی گفتگو کرتی تھیں یا یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کسی اور خیال میں تھے اور عورتیں کسی دوسرے خیال میں، یا یہ کہ تم عورتیں تو اپنی ہی بات چلایا کرتی ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام بخاریؒ نے اس باب میں حنفیہ کا مسلک اختیار کیا ہے کہ اعلم کو اقرأ پر مقدم کیا ہے۔ اور ایک روایت امام شافعیؒ سے بھی اس کے موافق ہے، لیکن مشہور قول ان کا اقرأ کی تقدیم ہے اعلم پر اور حنفیہ میں سے امام ابو یوسف سے بھی یہ منقول ہے۔ امام بخاری نے اپنے مسلک پر امامت سیدنا ابوبکرؓ سے استدلال کیا ہے، کیونکہ وہ اعلم تھے، یعنی اگر اقرأ کی تقدیم ہوتی تو حضرت ابی بن کعبؓ امامت کے مستحق زیادہ ہوتے کہ وہ بنص حدیث اقرأ تھے۔ امام بخاری نے حدیث مسلم کی روایت بھی اپنی صحیح میں نہیں لی ہے، جس سے تقدیم اقرأ نکلتی ہے، اور جو شافعیہ کا مستدل ہے، اس کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ حدیث مسلم اس زمانہ کے رواج وعرف پر وارد ہوئی تھی، نہ بعد کے عرف پر، اس دور میں سب سے بڑا قاری وہ تھا جس کو قرآن مجید زیادہ یاد تھا، کیونکہ وہ سب اہل زبان تھے، ان کو تصحیح حروف ومخارج کی ضرورت ہی نہ تھی، جتنا یاد کرتے تھے، اس کو صحیح ادا کرتے تھے اور سمجھ کر پڑھتے تھے، اس لئے اس کے عالم بھی ہوتے تھے، پھر جب اسلام اطراف کی طرف پھیلا اور عجم نے بھی قرآن مجید کو پڑھا تو وہ تصحیح حروف کے محتاج ہوئے لہٰذا حدیث مسلم ہمارے محل نزاع سے خارج ہے، اس میں جس اقرأ کی تقدیم ہے وہ اعلم بھی ہوتا تھا، البتہ بعد کو اصطلاح وعرف بدل گئی اور فقہاء کے تجوید سے پڑھنے والے کو قاری کہا، تو اختلاف کھلا، اور امام شافعی نے قاری کو عالم پر ترجیح دی، امام صاحب وامام بخاری وغیرہ نے عالم کو ترجیح دی، یعنی جو بقدر ضرورت صلوٰۃ صحیح حروف ادا کرسکتا ہے اور مسائل نماز سے بھی واقف ہے وہ اس سے زیادہ امامت کا مستحق واہل ہے جو صرف مجود قاری تو ہے مگر مسائل سے واقف نہیں ہے، چنانچہ صاحب ہدایہ نے صحیح دعویٰ کیا کہ پہلے اقرأ اعلم بھی ہوتا تھا، کیونکہ صحابہ صحیح بھی پڑھتے تھے اور قرآن مجید کے سارے معانی ومبانی سے واقف بھی ہوتے تھے، پھر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں باہم علم میں فضیلت نہ تھی، وہ بھی ضرور تھی، مثلاً حضرت ابن عباسؓ کی شان علم تفسیر قرآن میں سب سے بڑھی ہوئی تھی، اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ حدیث مسلم میں اگرچہ ظاہر الفاظ سے اقرأ کو مقدم کیا گیا ہے، مگر اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وجہ ترجیح علم ہی ہے کیونکہ دوسرا جملہ حدیث مسلم کا یہ ہے کہ اگر قراءت میں سب برابر ہوں تو وہ مقدم ہوگا جو اعلم بالسنہ ہوگا۔ یعنی پہلے تو جس کو قرآن مجید زیادہ یاد ہوگا اور ساتھ ہی معانی جاننے کی وجہ سے اعلم بالقرآن بھی ہوگا (کیونکہ اس وقت سب ہی ایسے تھے کہ جتنا یاد ہوتا سب کو سمجھتے تھے) وہ سب سے زیادہ امامت کا مستحق ہوگا، اس کے بعد وہ ہوگا جو علم قرآن و مسائل میں بڑھا ہوا ہو خواہ اس کو قرآن مجید دوسرے سے کم یاد ہو۔ اس سے صاف واضح ہوا کہ اصل ترجیح زیادتی حفظ قرآن کے لئے نہیں بلکہ

زیادتی علم کے لئے ہے۔ پھر یہ بات الگ ہے کہ حفظ وعلم کے لئے بھی لانہایت مراتب ہیں، غرض ہمارے فقہاء نے الفاظِ حدیث سے زیادہ معانی ومقاصدِ حدیث کی رعایت کی اوران کو سمجھا ہے۔ وہ سمجھے کہ حدیث میں اقرأ کی تقدیم اس لئے کی گئی کہ اس زمانہ میں اقرأ اعلم بھی ضرور ہوتا تھا یہ بات نہ تھی کہ اسے قرآن مجید تو زیادہ یاد ہوتا تھا، مگر وہ اس کے معانی ومقاصد کو نہ سمجھتا تھا، اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیثِ نبوی میں سنت سے مراد وہ مسائل ہیں جو حضور علیہ السلام کے طریق نماز اوراس کے بارے میں ہدایات کے علم ومشاہدہ سے حاصل ہوئے تھے۔ اوراعلم بالسنہ سے یہ مراد ہے کہ وہ بقدرِ ضرورتِ صلوٰۃ قرآن مجید صحیح طور سے پڑھنے کے ساتھ مسائل متعلقہ نماز کا علم بہ نسبت دوسروں کے زیادہ رکھتا ہو، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ صحابۂ کرام میں سے سب سے زیادہ علم، فہم، تقویٰ، تعلق مع اللہ، خوف وخشیت والے تھے، وقال تعالیٰ انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء وقال علیہ السلام انا اتقاکم للّٰہ واخشاکم (میں تم سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ کا خوف وخشیت رکھتا ہوں) ظاہر ہے تقویٰ وخشیت خداوندی کا تعلق علم سے ہے، تجوید وقراءت سے نہیں، لہٰذا جن اوصافِ فاضلہ میں حضور علیہ السلام اور سب سے بڑھے ہوئے تھے، اسی طرح حضرتِ ابوبکرؓ بھی ان اوصافِ نبویہ میں اور سب صحابہ پر ممتاز تھے، اور اسی لئے وہ امت میں سے امامت کے مستحق بھی پہلے درجہ پر قرار پائے، اگر وجہ ترجیح بجائے علم کے حفظ کے لئے ہوتی تو حضرت ابوبکرؓ کی جگہ امامت کے مستحق حضرات ابی بن کعبؓ ہوتے جن کو حضور علیہ السلام نے امت کا اقرأ واحفظ فرمایا تھا۔

حضرتؒ نے مزید ارشاد فرمایا کہ علم کے مقابلہ میں حفظ کی شان تو حدیث میں بھی کم ہے، کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ صحابہ میں سے سب سے بڑے حافظِ حدیث تھے، مگر علم وفہم حدیث کے لحاظ سے یہاں بھی حضرت ابوبکرؓ ہی کا درجہ سب سے اوپر ہے حدیث نمبر ۶۴۴ میں ان نفقتین کا ترجمہ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ ہم نے خیال کیا کہ فرطِ خوشی سے ہم میں کھلبلی پڑ جائے گی۔

افادۂ انور: مغازی موسیٰ بن عقبہ میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک رکعت ابوبکر کے پیچھے مسبوقانہ پڑھی ہے اور میرا گمان ہے کہ جہاں سے پردہ اٹھایا تھا وہیں سے بیٹھ کر اقتداء کی ہوگی۔ پھر انتقالات ہوتے رہے، حضور علیہ السلام نے ظہر۔ مغرب۔ عشاء اور فجر کی نمازیں حالتِ مرض میں پڑھی ہے، عصر کا ذکر نہیں ہے (راجع المغازی الخ) حضور علیہ السلام عشا کے وقت بھی نکلے ہیں اور خطبۂ پڑھا ہے۔ اس طرح چار وقت نکلے ہیں اور بخاری کے الفاظ سے بھی ۵۔۶ جگہ سے یہ نکلتا ہے۔ مگر حافظ نے کہیں بول کر نہیں دیا اور صرف ایک ظہر کو مانتے ہیں، باقی کا انکار کرتے ہیں نیز فرمایا کہ جس وقت حضور علیہ السلام کے اوپر مشکیں ڈالی گئی ہیں وہ عشا کا ہی وقت تھا اور مغرب کے وقت بھی نکلے ہیں اور صبح کے وقت بھی ایک رکعت میں مسبوق ہو کر شرکت کی ہے (کما فی البخاری) پس چار اوقات میں شرکت ثابت ہے۔

باب من قام الى جنب الامام لعلة

کسی عذر کی بنا پر مقتدی کا امام کے پہلوں میں کھڑے ہونے کا بیان

۶۴۷: حدثنا زکریا بن یحییٰ حدثنا ابن نمیر قال اخبرنا هشام ابن عروة عن ابیه عن عائشة قالت امر رسول الله صلی الله علیه وسلم ابابکر ان یصلی بالناس فی مرضه فکان یصلی بهم قال عروة فوجد رسول الله صلی الله علیه وسلم من نفسه خفة فخرج فاذا ابوبکر یؤم الناس فلما راٰه ابوبکر استاخر فاشار الیه ان کما انت فجلس رسول الله صلی الله علیه وسلم حذآء ای بکر الیٰ جنبه فکان ابوبکر یصلی بصلوٰة رسول الله صلی الله علیه وسلم والناس یصلون بصلوٰة ابی بکر

ترجمہ: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے اپنی بیماری میں حکم دیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں چنانچہ وہ لوگوں کو نماز پڑھانے

لگے، عروہ (راوی حدیث) کہتے ہیں، کہ رسول خدا ﷺ نے اپنے جسم میں (مرض کی) کچھ خفت دیکھی تو باہر تشریف لائے، اس وقت ابوبکرؓ لوگوں کے امام تھے، لیکن جب ابوبکرؓ نے آپ کو دیکھا، تو پیچھے ہٹنا چاہا، آپ نے انہیں اشارہ فرمایا کہ تم اسی طرح رہو، پھر رسول خدا ﷺ ابوبکرؓ کے برابر ان کے پہلو میں کھڑے ہو گئے، پس ابوبکرؓ رسول خدا ﷺ کی نماز کی اقتدا کرتے تھے، اور لوگ ابوبکرؓ کی نماز کی اقتداء کرتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام محمدؒ کے نزدیک امام کے ساتھ اگر صرف ایک مقتدی ہو تو وہ امام کی برابری سے کچھ پیچھے کو ہٹ کر داہنی طرف کھڑا ہوگا، تاکہ امام سے آگے ہونے کا احتمال نہ رہے کہ اس سے نماز باطل ہو جائے گی، اور اگر دو مقتدی ہوں تو ان کی جگہ امام کے پیچھے ہے، لیکن اگر ایک مقتدی داہنی طرف اور دوسرا امام کے بائیں کھڑا ہو کر اقتدا کرے تو وہ بھی امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے، ہم مکروہ کہتے ہیں، مگر جگہ تنگ ہو کہ پیچھے کھڑے نہ ہو سکیں تو ہمارے نزدیک بھی مکروہ نہیں ہے۔

قولہ لعلّہ: پر فرمایا کہ علت کے معنی اصل لغتِ عرب میں عرف مرض کے ہیں، اگر چہ پھر اس کا استعمال وجہ وسبب کے لئے بھی ہونے لگا ہے۔ صاحب قاموس کی بھی یہی تحقیق ہے۔

باب من دخل ليؤم الناس فجآء الامام الاول فتاخر الاول اولم يتاخر جازت صلوٰة فيه عآئشة عن النبى صلے الله عليه وسلم

(اگر کوئی آدمی لوگوں کی امامت کے لئے جائے' پھر امام اول آجاوے' تو پہلا شخص پیچھے ہٹے یا نہ ہٹے، اس کی نماز ہو جائے گی' اس مضمون میں حضرت عائشہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کی ہے)

۶۴۸: حدثنا عبدالله بن يوسف قال اخبرنا مالک عن ابی حازم بن دينار عن سهل بن سعدالساعد ان رسول الله صلے الله عليه وسلم ذهب الىٰ بنى عمرو بن عوف ليُصلح بينهم فحانت الصلوٰة فجآء المؤذن الىٰ ابى بكر فقال اتصلى بالناس فاقيم قال نعم فصلى ابوبكر فجاء رسول الله صلے الله عليه وسلم والناس فى الصلوٰة فتخلص حتىٰ وقف فى الصف فصفق الناس و كان ابوبكر لايلتفت فى صلوته فلما اكثر الناس التصفيق التفت فرأى رسول الله صلى الله عليه وسلم فاشار اليه رسول الله صلے الله عليه وسلم ان امكث مكانک فرفع ابوبكر يديه فحمد الله علىٰ مآامره رسول الله صلے الله عليه وسلم من ذٰلک ثم استاخر ابوبكر حتىٰ استوىٰ فى الصف وتقدم رسول الله صلى الله عليه وسلم فصلى فلما انصرف قال يآابابكر مامنعک ان تثبت اذا مرتک فقال ابوبكر ما كان لابن ابى قحافة ان يصلى بين يدى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال رسول الله صلے الله عليه وسلم مالى رايتكم اكثرتم التصفيق من تابه' شئ فى صلوته فليسبح فانه' اذاسبح التفت اليه وانما التصفيق للنساء

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ روایت کرتے ہیں، کہ رسول خدا ﷺ بنی عمرو بن عوف میں باہم صلح کرانے کے لئے تشریف لے گئے، اتنے میں نماز کا وقت آگیا تو موذن ابوبکرؓ کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ اگر تم لوگوں کو نماز پڑھا دو تو میں اقامت کہوں، انہوں نے کہا اچھا، پس ابوبکرؓ نماز پڑھانے لگے، اتنے میں رسول خدا ﷺ آگئے اور لوگ نماز میں تھے، پس آپ (صفوں میں) داخل ہوئے، یہاں تک کہ (پہلی) صف میں جا کر ٹھہر گئے، لوگ تالی بجانے لگے، چونکہ ابوبکرؓ نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھتے تھے، لیکن جب لوگوں نے زیادہ تالیاں بجائیں، تو انہوں نے دز دیدہ نظر سے دیکھا تو رسول خدا ﷺ نے انہیں اشارہ کیا کہ تم اپنی جگہ پر کھڑے رہو تو ابوبکر نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کے

حضور انور علیہ السلام کے اس ارشاد کا شکریہ ادا کیا، پھر پیچھے ہٹ گئے، یہاں تک کہ صف میں آ گئے، اور رسولِ خدا علیہ السلام آگے بڑھ گئے، آپ نے نماز پڑھائی، پھر جب آپ فارغ ہوئے، تو فرمایا کہ اے ابوبکرؓ جب میں نے تم کو حکم دیا تھا، تو تم کیوں نہ کھڑے رہے؟! ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ ابو قحافہؓ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں ہے، کہ رسولِ خدا علیہ السلام کے آگے نماز پڑھائے، پھر رسولِ خدا علیہ السلام نے (لوگوں سے) فرمایا کہ کیا سبب ہے کہ میں نے تم کو دیکھا تم نے تالیاں بکثرت بجائیں (دیکھو) جب کسی کو نماز میں کوئی بات پیش آئے تو اسے چاہئے، کہ سبحان اللہ کہہ دے، کیونکہ جب وہ سبحان اللہ کہہ دے گا، تو اس کی طرف التفات کیا جائے گا اور ہاتھ پر ہاتھ مارنے کا اشارہ صرف عورتوں کے لئے رکھا گیا ہے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے قولہ فصلے ابوبکر پر فرمایا:۔ مجھے مصنف عبد الرزاق میں روایت ملی ہے جس سے ثابت ہوا کہ یہ واقعہ تیسرے سال ہجری کا ہے، اور روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بہت پرانا ہے، کیونکہ اس میں تصفیف کا بھی ذکر ہے، جو پہلے دنوں میں تھی، اس کے بعد تسبیح کے حکم سے وہ منسوخ ہوگئی، لہٰذا بخاری کی اس حدیث الباب سے مسائل اخذ کرنا درست نہ ہوگا۔ مثلاً صفِ اول تک پہنچنا بغیر اس کے کہ وہاں جگہ خالی رہ گئی ہو، تب تو دوسری صفوں کو چھوڑ کر آگے جانا درست ہے، یا نماز کے اندر ہاتھ اٹھانا، یا حمد کرنا، کہ یہ سب امور خصوصیت پر محمول ہوں گے اور ان پر اب عمل درست نہ ہوگا، علامہ ابن الجوزیؒ نے بھی کہا کہ ایسی باتوں پر فقیہ کو عمل نہیں کرنا چاہئے نہ ان کو سنت سمجھنا چاہئے جن پر عمل کا توارث ثابت نہ ہو، لہٰذا شافعیہ کا اس واقعہ کو متاخر قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

قولہ فرفع ابوبکر یدیہ: پر فرمایا:۔ نماز کے درمیان میں ہاتھ اٹھانا فعلِ مستحسن ہے یا نہیں؟ اس جیسے فعل کے لئے ضابطہ وقاعدہ کلیہ یاد رکھو، جو بہت سے مواضع میں کام آئے گا، کبھی تو حضور اکرم علیہ السلام کی جانب سے بھی تصویب وتقریر کسی فعل کی ہوتی ہے اور کبھی کسی کی اچھی نیت کی۔ ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ خاص طور سے وہ تصویب وتقریر اس فعل کی ہی ہے، تب تک اس کو سنت قرار نہیں دے سکتے کیونکہ بعض اوقات وہ فعل خود پسندیدہ نہیں ہوتا بلکہ جس نیت صالحہ سے وہ کیا گیا ہے صرف وہ نیت قابلِ تحسین وتصویب ہوتی ہے۔ البتہ اگر کسی فعل پر تعاملِ سلف منقول ہو تو وہ بھی اس فعل کی تقریر وتصویب کی دلیل بن سکتا ہے، مثلاً مروی ہے کہ حضرت کلثوم بن ہدمؓ نماز میں ہمیشہ سورۂ اخلاص پڑھا کرتے تھے، کسی صحابی نے اس بارے میں حضورِ اکرم علیہ السلام سے استفسار کیا کہ ان کا یہ فعل کیسا ہے؟ اور حضور علیہ السلام کے سوال پر حضرت کلثوم نے جواب دیا کہ حضور! مجھے اس سورت سے محبت ہے کیونکہ اس میں صفت رحمان ہے، اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی محبت نے تجھے جنت کا مستحق بنا دیا۔ تو باوجود حضور علیہ السلام کی اتنی مدح وتصویب کے بھی سورۂ اخلاص کے ہر نماز میں تکرار کے فعل کو مستحسن یا مسنون ومستحب قرار نہیں دیا جا سکتا کہ آپ نے تو صرف اس کی نیت کی تعریف کی ہے۔ یہی بات حضرات صحابہؓ نے سمجھی ہے، جو سارے امتِ محمدیہ میں سے سب سے زیادہ ذکی ودانشمند تھے، ان میں سے کسی نے بھی تکرارِ سورت پر عمل نہیں کیا، اور اس کو صرف ایک شخص کے لئے بشارت خیال کیا، ورنہ اس پر تعامل وتوارث ہو جاتا، اور خود حضور علیہ السلام کا سوال کرنا ہی اس فعل کے ناپسندیدہ ہونے کے لئے کافی ہے (فرمایا کہ غیر مقلد یہ سمجھے کہ قل ھو اللہ ہی پڑھنی چاہئے، چنانچہ صبح کی نماز میں بھی پڑھتے ہیں) اسی طرح بہت سے امور میں جہاں حضور علیہ السلام نے سوال فرما دیا ہے وہاں یہی صورت پیدا ہوگی، ایک صحابی نے نماز میں چھینک آنے پر دعا پڑھی حضور علیہ السلام نے فرمایا من المتکلم فی الصلوٰۃ؟ اور پھر تصویبِ نیت بھی کی۔ ایک صحابی نے نماز میں اللہ اکبر کبیرا کہا تو آپ نے فرمایا کہ اس کلمہ کو بارہ فرشتے اچک کر لے گئے۔ (اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے بعینہ اعمال کو اٹھا کر لے جاتے ہیں) پھر بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ نے سوال کے بعد، فاعل کا پیچھا نہیں کیا، اور اس کے فعل سے صرفِ نظر فرمالی، جیسے پہلے گزرا کہ صبح کی نماز کے وقت یا اقامت کے بعد آپ نے سنتیں پڑھنے والے کو ٹوکا کیا صبح کی چار رکعت پڑھو گے؟! مگر پھر اس کے فعل پر تعقب یا نکیر بھی نہیں کی، فقط سوال یا ٹوکنے سے ہی اس فعل کا بے محل ہونا ظاہر ہو گیا۔

بعض اقسام رفع یدین بھی حضور علیہ السلام کے سوال اور ٹوک کی زد میں آ چکے ہیں، اس لئے ہر رفع یدین کو بھی مرضیات شارع علیہ

السلام میں داخل کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرت ابو بکرؓ کا فعل بے محل تھا، اور حضور علیہ السلام نے تقریر صحت نیت کی کی ہے نہ کہ یہ تصویب فعل ہے۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ قراءتِ فاتحہ خلف الامام وغیرہ بھی اسی زمرہ میں آ جائیں گے، کیونکہ وہاں بھی سوالِ نبوی ہوا ہے۔ تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ ان شاء اللہ

قولہ ما کان لابن ابی قحافۃ ان یصلی بین یدی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: فرمایا: امت کے کسی فرد کے لائق نہیں کہ وہ نبی و رسول کا امام بن سکے، اسی لئے حضرت مہدی بھی صرف ایک نماز میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے امام بنیں گے، وہ بھی اس لئے کہ اقامت ان کے لئے ہو چکے گی اور اقامت کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام اتریں گے اور مسند احمد میں یہ بھی ہے کہ نبی کی وفات سے قبل اس کے کسی امتی نے اس کی امامت کی ہے، اور حضور اکرم ﷺ نے بھی کئی مواقع میں اپنے کسی امتی کی اقتدا کی ہے، مثلاً غزوۂ (۱) تبوک سے واپسی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کی اور آپ نے اقتدا فرمائی (ابوداؤد ص۲۰ و مسلم ص۱۳۴ باب المسح علی الخفین) (۲) دو جماعتوں میں صلح کرانے کے لئے قبا تشریف لے گئے، تو اس وقت بھی ایسا پیش آیا۔ (۳) مرضِ وفات میں حضرت ابو بکرؓ کی اقامت تو بہت ہی مشہور ہے، پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں حضرت ابو بکرؓ نے یہ بات بھی سمجھی کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد امامت کے لئے بطور لزوم نہ تھا، اور نماز پڑھاتے رہنے کا حکم بھی بابِ اکرام وقدر افزائی سے تھا اسی لئے حضرت ابو بکرؓ نے بھی بطریق ادب و تواضع پیچھے ہٹ آنا ہی مناسب خیال کیا، برخلاف اس کے جو مرضِ وفات نبوی میں پیش آیا کہ وہاں حضرت ابو بکرؓ پیچھے نہیں ہٹے، بلکہ نماز پوری پڑھائی، اور حضور علیہ السلام نے دوسری رکعت نمازِ صبح میں آپ کی اقتدا فرمائی، جیسا کہ مغازی موسیٰ بن عقبہ میں ہے، گویا نماز کا بڑا حصہ ہو جانے پر حضرت ابو بکرؓ نے نماز میں استمرار و مشغولیت کو ترجیح دی اور جب تھوڑی پڑھانے پر ہی حضور علیہ السلام تشریف لے آئے تو آگے نماز پڑھانا آپ کی موجودگی میں مناسب نہ سمجھا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بھی اسی طرح عمل کیا تھا جبکہ صبح کی ایک رکعت پڑھانے کے بعد حضور علیہ السلام نے ان کے پیچھے اقتدا کی تھی، یہی فرق اور تفصیل حافظ نے بھی ذکر کی ہے۔ دیکھئے فتح الباری ص۱۱۴\۲

تفرد الحافظ والامام البخاری: حافظؒ نے حدیث الباب کے تحت کچھ فوائد ذکر کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ امام سے قبل مقتدی کا احرامِ صلوٰۃ جائز ہے، اور جو شخص اکیلے نماز شروع کرے، پھر اقامت ہو جائے تو وہ شخص نمازِ جماعت میں اسی طرح داخل ہو جائے گا، نماز توڑ کر پھر سے امام کے بعد تکبیر تحریمہ کہہ کر شرکتِ جماعت کی ضرورت نہیں ہے، جو جمہور کا مذہب ہے۔ حافظ نے کہا کہ حدیث الباب کے قصہ سے یہی مسئلہ طبری نے بھی استنباط کیا ہے۔ (فتح ص۱۱۵\۲)

حافظ عینیؒ نے حافظ کا یہ مسئلہ نقل کر کے اس کا رد کیا ہے، اور فرمایا کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ حدیث نبوی میں **اذا کبر الامام فکبروا** وارد ہے، یعنی امام تکبیر کہے تب تم بھی تکبیر کہو۔ اس سے ترتیب و بعدیت ثابت ہوتی ہے، لہٰذا امام سے قبل تکبیر کیسے جائز ہوگی، علامہ ابن بطالؒ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے بھی ایسی بات کہی ہو کہ امام سے پہلے تکبیر کہے تو اس کی نماز جائز ہو جائے گی، البتہ امام شافعیؒ کے مذہب پر یہ بات اس لئے درست ہو سکتی ہے کہ ان کے نزدیک مقتدی کی نماز امام کی نماز کے ساتھ مرتبط نہیں ہے، باقی دوسرے سب ہی فقہاء اس کو جائز قرار نہیں دیتے۔ پھر علامہ عینیؒ نے طبری کے استدلال کو بھی رد کیا اور فرمایا کہ حدیث الباب سے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام نے اس نماز میں شرکت فرمائی جس کا کچھ حصہ حضرت ابو بکرؓ پڑھ چکے تھے اور ان کی اقتداء صحابہ کرام کر چکے تھے۔ لہٰذا حضور علیہ السلام نے درمیانِ صلوٰۃ میں اپنی نماز شروع کی ہے اور قوم نے دونوں کے پیچھے اپنی نماز پوری کی ہے۔ اس سے مقتدیوں کی تحریمہ امام سے قبل کیونکر ہوئی جبکہ پہلے سے امام حضرت ابو بکرؓ تھے، اور ان ہی کی تحریمہ سے شروع کی ہوئی نماز کو حضور علیہ السلام کے ساتھ پورا کیا ہے۔ (عمدہ ص۴۰۷\۲)

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے ابتداء کتاب الصلوٰۃ میں بوقت درس بخاری شریف فرمایا تھا کہ ہمارے حنفیہ کے نزدیک تو اتحادِ

صلاتین شرائطِ اقتداء میں سے ہے، امام شافعیؒ کے یہاں اختلافِ صلاتین فرضاً ونفلاً ووقتاً کی صورت میں بھی اقتدا درست ہے، لیکن امام بخاریؒ نے شافعیہ سے بھی زیادہ توسع کیا ہے، چنانچہ انہوں نے تقدیم تحریمۂ مقتدی کو بھی جائز قرار دے دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقدیم مذکور کا جواز شافعیہ کا مسلک نہیں ہے۔ اور ادھر حافظ نے امام بخاریؒ ہی کے مسلک کی طرف اشارہ کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

راقم الحروف نے اپنی کسی یادداشت میں امام بخاریؒ کے تفردات کو یکجا کیا ہے، کسی موقع پر ان سب کو پیش کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

باب اذااستووافی القرآء ة فلیؤمهم اکبرهم

(اگر کچھ لوگ قرأت میں مساوی ہوں تو جوان میں زیادہ عمر والا ہو وہ امامت کرے)

۶۴۹: حدثنا سلیمان بن حرب قال اخبرنا حماد بن زید عن ایوب عن ابی قلابة عن مالک بن الحویرث قال قدمنا علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و نحن شببة فلبثنا عندہٗ نحوا من عشرین لیلة وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رحیماً فقال لورجعتم الیٰ بلادکم فعلمتموھم مروھم فلیصلوا صلوٰة کذافی حین کذاوصلوٰة کذافی حین کذافاذاحضرت الصلوٰة فلیؤذن لکم احدکم ولیؤمکم اکبرکم.

ترجمہ: حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ہم چند جوان تھے، ہم لوگ تقریباً بیس یوم تک مقیم رہے۔ نبی کریم ﷺ بڑے رحم دل تھے) (لہٰذا آپ نے (ہمارا گھر بار سے جدار ہنا پسند نہ کیا اور) ہم سے فرمایا کہ اگر تم اپنے وطن کو لوٹ کر جاؤ، تو انہیں دین کی تعلیم کرنا، ان سے کہنا، کہ وہ اسی طریقے سے اس وقت میں، اور اس طریقے سے اس وقت میں نماز پڑھیں، اور جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے۔ اور جو عمر میں بڑا ہو وہ امامت کرے۔ ف:۔ یہ حدیث پہلے دو یا تین مقام پر گزر چکی ہے۔

تشریح: حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا:۔ ترجمۃ الباب میں اس طرف اشارہ ہے کہ حدیث الباب میں جو بڑی عمر والے کو امامت کے لئے آگے بڑھانے کی بات ہے وہ اس وقت ہے کہ وہ سب قراءت میں مساوی ہوں، ورنہ بڑی عمر والے کی تقدیم نہ ہوگی، حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے فرمایا کہ گویا ترجمۃ الباب سے حدیث کی شرح کی گئی ہے، اور جمہور کے نزدیک جن میں ائمۂ ثلاثہ اور امام محمدؒ بھی ہیں مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ علم والے کو زیادہ قراءت والے پر ترجیح ہے، امام احمد وابو یوسف کہتے ہیں کہ زیادہ قراءت والے کو مقدم کرو۔ (الابواب ص ۲۶۷\۲)

باب اذازارالامام قوماً فامهم

(اگر امام کچھ لوگوں سے ملنے جائے، تو ان کا امام ہو سکتا ہے)

۶۵۰: حدثنا معاذ بن اسد قال اخبرنا عبداللہ قال اخبرنا معمر عن الزھری قال اخبرنی محمود بن الربیع قال سمعت عتبان بن مالک الانصاری قال استاذن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاذنت لہٗ فقال این تحب ان اصلی من بیتک فاشرت لہٗ الی المکان الذی احب فقام وصففنا خلفہٗ ثم سلم و سلمنا

ترجمہ: حضرت محمود بن ربیع، عتبان بن مالک انصاریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (میرے گھر میں آنے کی) اجازت طلب فرمائی، تو میں نے آپ کو اجازت دی، پھر آپ نے فرمایا کہ تم اپنے گھر میں کس مقام پر نماز پڑھوانا چاہتے ہو، جس مقام کو میں چاہتا تھا، اس مقام کی طرف میں نے اشارہ کر دیا۔ پس آپ کھڑے ہو گئے۔ اور ہم نے آپ کے پیچھے صف باندھ لی (اس کے بعد آپ نے اور ہم نے نماز پڑھ کر) سلام پھیرا۔

تشریح: حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا:۔ اس باب کا مقصد یہ ہے کہ حدیث میں جو ممانعت آئی ہے کہ کسی کے گھر پر دوسرا جائے تو امامت نہ کرے، وہ گھر والے کی عدم اجازت کے ساتھ مقید ہے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی اپنی تراجم الابواب میں اسی کو اختیار کیا ہے، دوسری

رائے حافظ ابن حجرؒ کی ہے کہ امام اعظم (خلیفہ وقت وغیرہ) اس سے مستثنیٰ ہے کہ اس کو اجازت کی ضرورت نہیں، تیسری رائے محقق عینیؒ کی ہے کہ امام اعظم کو بھی حدیث نبوی کی وجہ سے اجازت کی ضرورت ہے الخ (الابواب ص ۳۲۷/۳)

راقم الحروف کے نزدیک واضح صورتیں دو ہی بنتی ہیں، تیسری سمجھ میں نہیں آئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب انما جعل الامام لیؤتم به وصلے النبی صلے الله علیه وسلم فی مرضه الذی توفی فیه بالناس و هو جالس وقال ابن مسعود اذارفع قبل الامام یعود فیمکث بقدرما رفع ثم یتبع الامام وقال الحسن فیمن یرکع مع الامام رکعتین ولایقدرعلی السجود یسجدللرکعة الأخرة سجدتین ثم یقضی الرکعة الاولیٰ بسجودها و فیمن نسی سجدةً حتیٰ قام یسجد (امام اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض وفات میں لوگوں کو بیٹھ کر نماز پڑھائی اور لوگ کھڑے ہوئے تھے، اور حضرت ابن مسعود کا قول ہے کہ اگر کوئی مقتدی امام سے پہلے سر اٹھائے تو اسے چاہیے کہ پھر لوٹ جائے اور بقدر اس مدت کے جس میں وہ سر اٹھائے رہا وہاں توقف کرے اس کے بعد امام کا اتباع کرے اور حسن بصری نے اس شخص کے بارے میں جو امام کے ساتھ دو رکعتیں پڑھے، اور (لوگوں کی کثرت کے سبب سے) سجدہ کرنے پر قادر نہ ہو، یہ کہا ہے، کہ اخیر رکعت میں دو سجدے کرلے، بعد اس کے پہلی رکعت مع اس کے سجدوں کے ادا کرے، اور جو شخص کوئی سجدہ بھول کر کھڑا ہو جائے، اس کے بارے میں کہا ہے کہ وہ سجدہ کرلے)

۱۵۱: حدثنا احمد بن یونس قال اخبرنا زآئدة عن موسیٰ بن ابی عائشة عن عبیدالله بن عبدالله بن عتبة قال دخلت علیٰ عآئشة فقلت الاتحدثینی عن مرض رسول الله صلے الله علیه وسلم قالت بلیٰ ثقل النبی صلے الله علیه وسلم فقال اصلی الناس قلنا لاوهم ینتظرونک یا رسول الله قال ضعوالی مآءً فی المخضب قالت ففعلنا فاغتسل فذهب لینوءَ فاغمی علیه ثم افاق فقال اصلی الناس قلنالاهم ینتظرونک یا رسول الله قال ضعوالی ماءً فی المخضب فقعد فاغتسل ثم ذهب لینوٓء فاغمی علیه ثم افاق فقال اصلی الناس قلنالاهم ینتظرونک یارسول الله والناس عکوف فی المسجد ینتظرون النبی صلے الله علیه وسلم لصلوٰة العشآء الأخرة فارسل النبی صلے الله علیه وسلم انی ابی بکربان یصلی بالناس فاتاه الرسول فقال ان رسول الله صلے الله علیه وسلم یامرک ان تصلی بالناس فقال ابوبکر وکان رجلاً رقیقاً یاعمر صل بالناس فقال له' عمر انت احق بذٰلک فصلی ابوبکر تلک الایام ثم ان النبی صلے الله علیه وسلم وجدمن نفسه خفةً فخرج بین رجلین احدهما العباس لصلوٰة اظهروابوبکر یصلی بالناس فلمارا٥ ابوبکر ذهب لیتأخر فاومیٰ الیه النبی صلی الله علیه وسلم بان لایتأخر فقال اجلسانی الیٰ جنبه فاجلساه الیٰ جنب ابی بکر قال فجعل ابوبکر یصلی وهو یاتم بصلوٰة النبی صلے الله علیه وسلم والناس بصلوٰة ابی بکروالنبی صلے الله علیه وسلم قاعد قال عبیدالله فدخلت علیٰ عبدالله بن عباس فقلت له' الااعرض علیک ماحدثتنی عآئشة عن مرض النبی صلے الله علیه وسلم قال هات فعمرضت علیه حدیثها فماانکرمنه شیئاً غیرانه' قال اسمت لک الرجل الذی کان مع

العباس قلت لاقال هو علیٰ

۶۵۲: حدثنا عبد اللّٰه بن یوسف قال اخبرنا مالک عن هشام بن عروة عن ابیه عن عآئشة ام المؤمنین انها قالت صلے رسول الله صلی الله علیه وسلم فی بیته و هوشاک فصلی جالساً وصلے وراء ہ قوم قیاماً فاشارالیهم ان اجلسوا فلما انصرف قال انما جعل الامام لیؤتم به فاذارکع فارکعوا واذا رفع فارفعوا واذاقال سمع الله لمن حمده فقولوا ربنا ولک الحمد واذا صلے جالساً فصلوا جلوساً اجمعون

۶۵۳: حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابن شهاب عن انس بن مالک ان رسول الله صلے الله علیه وسلم رکب فرساً فصرع عنه فجحش شقه الایمن فصلی صلوة من الصلوات وهو قاعد فصلیناوراء ہ قعوداً فلما انصرف قال انما جعل الامام لیؤتم به فاذاصلے قآئماً فصلوا قیاماً واذا رکع فارکعوا واذارفع فارفعوا واذا قال سمع الله لمن حمده فقولوا ربنالک الحمد واذاصلے جالساً فصلوا جلوساً اجمعون قال ابوعبدالله قال الحمیدی قوله واذاصلے جالساً فصلوا جلوساً هو فی مرضه القدیم ثم صلے بعد ذٰلک النبی صلے الله علیه وسلم جالساً والناس خلفه قیام لم یامرهم بالقعود وانما یؤخذبالاٰخر فالاٰخرمن فعل النبی صلے الله علیه وسلم

ترجمہ ۶۵۱: حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہؒ روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس گیا، اور میں نے کہا کہ آپ مجھ سے رسول خدا ﷺ کی (اخیر) مرض کی کیفیت کیوں نہ بیان کریں، انھوں نے کہا، اچھا (سنو) میں بیان کرتی ہوں، رسول اللہ ﷺ بیمار ہوئے، پھر آپ نے پوچھا، کیا لوگ نماز پڑھ چکے، ہم لوگوں نے عرض کیا، کہ نہیں یارسول اللہ! وہ آپ کے منتظر ہیں، آپ نے فرمایا کہ میرے لئے طشت میں پانی رکھ دو (میں نہاؤں گا) حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم لوگوں نے ایسا ہی کیا، آپ نے غسل فرمایا پھر کھڑا ہونا چاہا، مگر آپ بے ہوش ہو گئے، اس کے بعد ہوش آیا، تو آپ نے پھر فرمایا، کہ کیا لوگ نماز پڑھ چکے؟ ہم نے عرض کیا نہیں یارسول اللہ! وہ آپ کے منتظر ہیں، آپ نے فرمایا کہ میرے لئے طشت میں پانی رکھ دو، چنانچہ رکھ دیا گیا پس آپ نے غسل فرمایا پھر کھڑا ہونا چاہا مگر بے ہوش ہو گئے، پھر فرمایا کہ کیا لوگ نماز پڑھ چکے؟ لوگوں نے عرض کیا، نہیں یارسول اللہ! وہ آپ کے منتظر ہیں، اور لوگ مسجد میں نبی کریم ﷺ کا عشاء کی نماز میں انتظار کر رہے تھے (مجبوراً نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے پاس (کہلا) بھیجا تا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، چنانچہ قاصد ان کے پاس پہنچا، اور اس نے کہا کہ رسول خدا ﷺ آپ حکم دیتے ہیں کے آپ لوگوں کو نماز پڑھائیں حضرت ابوبکرؓ بولے (اور وہ نرم دل آدمی تھے) کہ اے عمر، تم لوگوں کو نماز پڑھا دو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ تم اس کے زیادہ حق دار ہو، تب حضرت ابوبکرؓ نے ان دنوں میں نماز پڑھائی، اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنے آپ میں (مرض کی) کچھ خفت پائی، تو آپ دو آدمیوں کے درمیان میں سہارا لے کر نماز ظہر کے لئے نکلے، ان میں سے ایک عباس تھے، اس وقت ابوبکرؓ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے، جب آپ کو ابوبکر نے دیکھا تو پیچھے ہٹنے لگے مگر آپ نے انہیں اشارہ فرمایا کہ پیچھے نہ ہٹیں، پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے ان کے پہلو میں بٹھا دو، چنانچہ ان دونوں آدمیوں نے آپ کو ابوبکر کے پہلو میں بٹھا دیا۔

عبیداللہؓ کہتے ہیں کہ اس وقت، ابوبکرؓ اس طرح نماز پڑھنے لگے، کہ وہ تو نبی کریم ﷺ کی نماز کی اقتداء کرتے تھے اور لوگ ابوبکر کی نماز کی اقتدا کرتے تھے نبی کریم ﷺ بیٹھے ہوئے (نماز پڑھ رہے) تھے، عبیداللہ کہتے ہیں، پھر میں عبداللہ بن عباس کے پاس گیا اور ان سے یہ کہا میں تمہارے سامنے وہ حدیث پیش نہ کروں جو مجھ سے حضرت عائشہؓ نے نبی کریم ﷺ کے مرض کے متعلق بیان کی ہے، انھوں نے کہا لاؤ (سناؤ) میں نے ان کے سامنے حضرت عائشہؓ کی حدیث پیش کی، حضرت ابن عباسؓ نے اس میں سے کسی بات کا انکار نہیں کیا۔ صرف

اتنا کہا کہ حضرت عائشہؓ نے تمہیں اس شخص کا نام بھی بتایا جو حضرت عباسؓ کے ہمراہ تھا، میں نے کہا نہیں، ابن عباس نے کہا، وہ علیؓ تھے۔

ترجمہ ۶۵۲: حضرت ہشام بن عروہ، اپنے والد عروہ سے وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بحالت مرض اپنے گھر ہی میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ اور لوگوں نے آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی تو آپ نے (یہ دیکھ کر) ان سے ارشاد فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، پھر جب آپ (نماز سے) فارغ ہوئے، تو آپ نے فرمایا کہ امام اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، لہٰذا جب وہ رکوع کرے، تو تم بھی رکوع کرو، اور جب وہ (سر اٹھائے تو تم بھی اٹھاؤ، اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے، تو تم ربنا لک الحمد کہو، اور جب وہ بیٹھ کر پڑھے، تو تم سب بھی بیٹھ کر پڑھو۔

ترجمہ ۶۵۳: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (ایک مرتبہ) گھوڑے پر سوار ہوئے، اور اس سے گر گئے، تو آپ کے جسم مبارک کا داہنا پہلو اس سے کچھ زخمی ہو گیا۔ اس وجہ سے آپ نے نمازوں میں سے ایک نماز بیٹھ کر پڑھی، پھر جب آپ فارغ ہوئے، تو آپ نے فرمایا امام اسی لئے مقرر کیا گیا ہے، کہ اس کی اقتدا کی جائے، پس اگر وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر پڑھو، اور جب رکوع کرے، تو تم بھی رکوع کرو، اور جب وہ (سر) اٹھائے تو تم بھی اٹھاؤ، اور جب وہ بیٹھ کر پڑھے، تو تم سب بیٹھ کر پڑھو، امام بخاری کہتے ہیں، حمیدی نے کہا ہے کہ یہ قول آں حضرت ﷺ کا کہ ''جب امام بیٹھ کر پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو'' آپ کی پہلی بیماری میں تھا۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ! مرض وفات کے موقع پر۔ بیٹھ کر نماز پڑھی اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے، آپ نے انہیں بیٹھنے کا حکم نہیں دیا، اور یہ طے شدہ امر ہے، کہ نبی کریم ﷺ کے آخری سے آخری فعل پر عمل کیا جاتا ہے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حدیث الباب ص ۶۵۱ میں حضور علیہ السلام کا مرض وفات میں ٹب میں بیٹھ کر غسل کرنے کا ذکر ہے اور نماز عشاء مسجد نبوی میں پڑھنے کی بھی صراحت ہے، اور بخاری کے الفاظ سے بھی ۵ یا ۶[1] جگہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضور علیہ السلام عشا کے وقت حجرہ شریفہ سے مسجد کی طرف نکلے ہیں اور خطبہ پڑھا ہے مگر حافظ نے کہیں بول کر نہیں دیا، اور وہ صرف ایک ظہر کے لئے نکلنے کو مانتے ہیں باقی کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ حضور علیہ السلام نے اپنے مرض وفات میں چار پانچ دن کے اندر چار بار مسجد نبوی کی نماز میں شرکت فرمائی ہے اور تین نمازوں کی شرکت کو تو امام ترمذی نے بھی مانا ہے، میں چار مانتا ہوں، جبکہ امام شافعی اور حافظ صرف ایک نماز کی شرکت مانتے ہیں، پھر ان دونوں میں بھی اختلاف ہے کہ امام شافعی صبح کی نماز میں کہتے ہیں اور حافظ ظہر میں۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بخاری کی حدیث ص ۳۲ کے تحت بھی ضروری تفصیل انوار الباری ص ۱۴۷/۵ میں آچکی ہے، وہ بھی اس کے ساتھ دیکھ لی جائے۔

اب حضرتؒ نے سابق باب اہل العلم والفضل احق بالامامۃ کی حدیث انسؓ میں قولہ فنکص ابو بکر الخ پر یہ بھی فرمایا کہ اس کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام اس نماز میں داخل نہیں ہوئے، کہ ایسا ہوتا تو راوی اس کو ضرور ذکر کرتا، تاہم امام بیہقی نے شرکت پر اصرار کیا ہے اور دو روایتوں سے استدلال کیا ہے، میرے پاس بھی دس وجوہ یا زیادہ ایسی ہیں جو شرکت نماز فجر (یوم الاثنین یوم وفات نبوی) پر دلالت کرتی ہیں، اور میرا خیال ہے کہ آپ نے اقتدا حجرہ شریفہ سے کی ہے۔ مسجد میں تشریف نہیں لے جا سکے، جس طرح عورتیں جمعہ کے دن حجروں سے اقتدا کرتی تھیں (کمافی المدونہ لیکن میرے پاس اس کی نقل نہیں ہے) اور نسائی سے معلوم ہوتا ہے کہ صف تک پہنچ گئے تھے۔

امام شافعیؒ بھی نماز صبح کی شرکت کے قائل ہیں اور غالباً وہ پیر کے دن کی ہی ہے۔ حافظ نے صبح کی نماز کی شرکت سے انکار کیا ہے اور

[1] مثلاً ص ۳۲ باب الغسل والوضوء فی المخضب، اور ص ۹۹ میں باب الرجل یأتم (یہی زیر بحث باب) اور ص ۵۱۲ میں نماز و خطبہ کا ذکر اور ص ۶۳۹ باب المغازی اور ص ۸۵۱ میں ثم خرج الی الناس، نماز خطبہ کا ذکر اور حافظ کا انکار۔ ''مؤلف''

شرکت صرف ظہر میں مانی ہے۔ پہلے یہ بات بھی آ چکی ہے کہ ایک نماز ظہر کی شرکت کو سب ہی مانتے ہیں، علاوہ امام شافعی کے خواہ وہ سنیچر کی ہو یا اتوار کی، جمعہ کی تو ہو نہیں سکتی، جمعرات کی شام سے علالت شروع ہوئی تھی، جمعہ، سنیچر، اتوار تین روز پورے علالت میں گذرے، پیر کے دن ظہر کے قبل وفات ہوئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اہم بحث: حافظ نے نماز عشاء کی شرکت سے بھی انکار کیا ہے جبکہ ابھی بخاری کی ۵۔۶ روایات سے بھی حضور علیہ السلام کے حجرہ شریفہ سے نکلنے اور نماز کے علاوہ خطبہ تک کا بھی ثبوت موجود ہے، مگر بڑا مغالطہ حدیث احمد بن یونس ص ۱۵۱ سے ہی لگا ہے جو اس وقت سامنے ہے کیونکہ اس کے بھی شروع میں نماز عشاء کا ذکر صراحۃ موجود ہے لیکن آگے اسی حدیث میں راوی نے نماز ظہر کا بھی ذکر کر دیا ہے، اس سے حافظ نے عشا کی شرکت ہٹا کر ظہر کی ثابت کر دی ہے۔ اور علامہ عینی بھی یہاں چوک گئے کہ انھوں نے بھی غسل کے اس واقعہ میں ظہر کی نماز تسلیم کر لی، حالانکہ اس واقعہ کا کوئی تعلق نماز ظہر سے نہیں ہے۔ پھر عجیب بات ہے کہ ہمارے حضرت گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم وغیرہ کسی نے بھی اس اشکال کی طرف توجہ نہیں کی، جبکہ فیض الباری میں حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق بھی حضرت شیخ الحدیث کے سامنے تو آ ہی چکی تھی، کہ وہ حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق کا ذکر ضرور اہم مباحث میں کیا کرتے ہیں۔ پھر زیادہ تعجب اس پر ہے کہ صاحب فیض الباری نے ص ۲/۲۱۰ پر حاشیہ بھی لکھ دیا اور حدیث مسلم کا حوالہ دے کر حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق انیق کو بالکل ہی بے وزن کر دیا، پھر اتنی اہم بات کا حضرت شاہ صاحبؒ سے استفسار بھی نہ کرنا، جبکہ ان کا کمرہ جامعہ ڈابھیل میں حضرت کے کمرہ سے بالکل متصل تھا اور ہر وقت رجوع واستفادہ کے مواقع میسر تھے، اور حدیث مسلم پر حوالہ کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی کہ خود یہاں بخاری میں بھی بعینہ وہی حدیث احمد بن یونس والی موجود ہے۔

آخر یہ سوچنا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ ایسی اہم تحقیق پیش کر رہے ہیں، جس طرح بڑوں کی توجہ بھی نہ ہو سکی تھی، مثلاً علامہ عینی وغیرہ کی، اور بات اتنی واضح تھی کہ اس کا انکار ہو بھی نہیں سکتا، چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ خود ہی فرماتے ہیں کہ حدیث بخاری ومسلم وغیرہ کے الفاظ **ثم خرج الی الناس** سے بہت ہی واضح اور کھلی حقیقت ثابت ہو رہی ہے کہ غسل کے بعد آپ کا نکلنا نماز عشاء ہی کے لئے تھا، جس کا ذکر اسی حدیث میں پہلے موجود بھی ہے کہ وہ وقت عشا کا تھا، اور یہ مرض کا پہلا دن تھا (یعنی شب جمعہ کی عشاء کا وقت) تو اس خروج کو سنیچر یا اتوار کی ظہر کے لئے خروج کس طرح کہا جا سکتا ہے اور خود بخاری ص ۵۱۲ میں باب **قولہ تعالی کما یعرفون ابناء ھم** سے کچھ قبل حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ مرض وفات میں ہماری طرف نکلے، چادر لپیٹے ہوئے اور سر کو کالی پٹی باندھے ہوئے، حتی کہ آپ منبر پر بیٹھے اور حمد وثنا کی پھر **اما بعد** الخ خطبہ دیا اور یہ آپ کی منبر پر آخری مجلس تھی۔

پھر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ بخاری ص ۳۲ میں بعد غسل معہود کے صرف لوگوں کی طرف نکلنے کا ذکر ہے کسی نماز یا خطبہ کا ذکر نہیں، ص ۵۱۲ میں غسل کے بعد نماز وخطبہ دونوں کا ذکر ہے مگر ظہر کا تذکرہ نہیں، ص ۶۳۹ میں بھی غسل کے بعد نماز وخطبہ کا ذکر ہے، ظہر کی صراحت نہیں ص ۸۵۱ میں بھی غسل کے بعد نماز وخطبہ کا تذکرہ تو ہے مگر ظہر کا ذکر نہیں، صرف ایک روایت ص ۹۵ میں راوی نے پہلے نماز عشاء کا ذکر کیا اور پھر نماز ظہر کو بھی اس کے ساتھ جوڑ دیا، حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ صورت واقعہ وہ نہیں تھی جو حافظ نے سمجھی ہے، بلکہ یہ تھی کہ راوی نے پہلے تو حضور علیہ السلام کے حکم سے حضرت ابوبکرؓ کی ایام علالت کی امامت کا ذکر کیا جس کے ضمن میں یہ بات آ گئی کہ حضور نمازوں میں شریک نہیں ہو سکے اس لئے راوی کا ذہن اس طرف بھی منتقل ہو گیا کہ ان ایام میں جو نمازیں آپ نے جماعت کے ساتھ ادا کیں ان کو بھی بتلا دے، اور اس سلسلہ میں اس نماز کا بھی ذکر آ گیا جو غسل کے بعد آپ نے پڑھی ہے اور خطبہ بھی دیا ہے یعنی نماز عشاء اور ساتھ ہی ظہر کی نماز بھی ذکر میں آ گئی، اور چونکہ وہی سب سے زیادہ مشہور تھی، اور اکثر کو معلوم، اس لئے اس کو اہتمام سے بیان کر گئے۔ یہ غرض نہ تھی کہ غسل کے بعد

آپ نے ظہر کی نماز پڑھی ہے، یا یہ کہ عشاء کی پڑھی ہی نہیں، جو حافظ وغیرہ نے سمجھ لیا، رواۃ حدیث کو ایسے تجوزات اور بیانی تسامحات پیش آتے رہتے ہیں، اور اسی بیانی تسامح راوی سے حافظ وغیرہ مغالطہ میں پڑ گئے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر ایسے مواقع پر بہت گہری تھی اور آپ سارے طرق و متون حدیث کو جمع کر کے پھر کوئی فیصلہ کیا کرتے تھے، اسی لئے یہاں آپ نے خدا کے فضل و توفیق سے وہ بات پیدا کی جس تک دوسرے اکابر نہ پہنچ سکے چنانچہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ صحیح بخاری کی باقی ۵۔۶ جگہ کی روایات میں غسل کے بعد ہی کی نماز کا ذکر کیا گیا ہے، جو عشاء کی تھی، اور پہلے ہی دن آپ نے شدید بخار اور غفلت و بے ہوشی کے بعد غسل خاص کے ذریعے طبیعت ہلکی ہونے پر پڑھی تھی، اس کے بعد تو آپ کے مرض میں اور بھی زیادہ شدت بڑھتی گئی، اور کئی روز تک شدید علالت کا سلسلہ قائم رہا، حتی کہ آخری نماز پیر کی صبح کو جو آپ نے پڑھی ہے، وہ حسب تحقیق اکابر آپ نے حجرہ شریفہ سے اقتداء کر کے حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں ادا فرمائی ہے، یعنی آپ اس وقت شدید علالت و ضعف کے باعث مسجد نبوی تک بھی تشریف نہ لا سکے تھے۔ واللہ تعالے اعلم

اس پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ کسی بھی اہم مسئلہ کی تحقیق و تنقیح نہایت دشوار ہے۔ اور کسی ایسے مسئلہ کو سلجھانا حضرت شاہ صاحبؒ ایسے محقق و مبصر ہی کا حصہ تھا، خیال کیجئے جہاں امام ترمذی ایسا محدث اعظم تین نمازوں کی شرکت حدیث نقطہ نظر سے تسلیم کر چکا ہے، وہا ں امام شافعی نے صرف فجر کی اور حافظ الدنیا نے صرف ظہر کی تسلیم کی ہو، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بطور احتمال چوتھی نماز مغرب کا اضافہ فرمایا، اور اس کے لئے بخاری و مسلم کی حدیث ام الفضلؓ پیش کر دی کہ میں نے رسول اکرم ﷺ نے مغرب کی نماز میں سورۂ مرسلات سنی اور آپ نے اس کے بعد وقت وفات تک ہمیں اور کوئی نماز نہیں پڑھائی۔ (الخ انوار الباری ص ۱۷۵/۵)

یہ معمولی تحقیق نہیں ہے شارح مسلم علامہ عثمانیؒ بھی اس حدیث احمد بن یونس پر خاموشی سے گذر گئے اور عینی بھی خاموش رہے غسل کے بعد صلوٰۃ ظہر کے ذکر کی کوئی توجیہ کسی سے بھی میری نظر میں نہیں گذری ہے۔ حضرتؒ نے اس کو حل فرمایا تو صاحب فیض فرماتے ہیں و فی النفس منه قلق الخ **فیاللعجب!** حضرتؒ کے علوم سے اتنی دوری اور وہ بھی اس قدر قرب جسمانی اور مدتوں درس بخاری دینے کے بعد،

حضرت شاہ صاحب کے علوم کس طرح ضائع ہوئے؟

افسوس صد افسوس کہ باوجود حضرتؒ کے بےنظیر علم و فضل و تبحر کے اور آپ کی عالمی شخصیت ہونے کے ارباب دارالعلوم دیوبند نے ان سے کما حقہ استفادہ نہ کیا، بلکہ معمولی اختلاف پر تو ایسی بےقدری و ناحق شناسی کا برتاؤ کیا، جس کی مثال نہیں مل سکتی، پھر جتنا عظیم ذخیرہ ۳۰۔۴۰ سال کی محنت شاقہ سے حضرتؒ نے تین بکس یادداشتوں کی صورت میں چھوڑا تھا، وہ گھر والوں کی غفلت سے ضائع ہو گیا، آخر میں ایک شکل آپ کے تلامذہ کے ذریعہ آپ کی گرانقدر علمی تحقیقات کی اشاعت کی ہو سکتی تھی تو اس کا اندازہ بھی العرف الشذی و فیض الباری کے ذریعہ ہو سکتا ہے، کچھ بہتر کام مولانا محمد صدیق صاحب نجیب آبادی مرحوم نے انوار المحمود کی شکل میں انجام دیا تھا۔ اور سب سے بہتر رفیق محترم مولانا سید محمد یوسف بنوری دام فیضہم نے معارف السنن کی صورت میں کیا ہے، خدا اس کو پورا کرا دے، اس کام کی ابتداء احقر ہی نے مجلس علمی ڈابھیل کے زمانہ میں موصوف سے کرائی تھی، اس وقت فیض الباری کے بارے میں بہت خوش گمانی تھی، ورنہ اب افسوس ہوتا ہے کہ مولانا سے امالی بخاری شریف ہی کا کام کیوں نہ کرایا گیا۔ باقی راقم الحروف جو کچھ کام کر رہا ہے اس کی حیثیت ظاہر ہے کہ طفل تسلی سے زیادہ نہیں ہے۔ من آنم کہ من دانم۔ البتہ اس پر عمل ہوگا۔

اندریں رہ مے ترش و مے خراش تادم آخر دمے فارغ مباش

کچھ مخلص احباب اور بزرگوں کی نیک دعاؤں کی وجہ سے بھی گاڑی یہاں تک کھنچ گئی اور خاص طور سے محترم مولانا اسماعیل یوسف گار ڈی افریقی (تلمیذ حضرت شاہ صاحبؒ) اور محترم الحاج ایم ایس ڈ ڈکرات والحاج موسیٰ بوڈھانیہ وغیرہ احباب افریقہ کے اصرار و حوصلہ افزائی

کے باعث بھی اس کام میں لگا ہوا ہوں، اللہ تعالیٰ آسان فرمائے کہ تکمیل کرسکوں۔آمین

احقر مجلس علمی کے سلسلہ میں دو سال حضرتؒ کی خدمت میں رہا، امالی درس بخاری شریف کے علاوہ حضرتؒ کے ملفوظات گرامی اور مواعظ بھی لکھ لیا کرتا تھا۔ یہ سب کام ضمنی تھا، بڑا کام حضرتؒ کی یادداشتوں کی نقل و ترتیب و تخریج حوالات وغیرہ تھی۔حق تعالیٰ کی تقدیر غالب آئی، ورنہ زیادہ کام ہوسکتا تھا، اور حضرتؒ خود بھی فرماتے تھے کہ یہ صاحب اگر ہمیں پہلے سے مل جاتے تو بڑا کام ہوجاتا، وہی کچھ حضرتؒ کی نظر کرم و شفقت تھی جس کے طفیل میں اب بھی اس کام میں دل پھنسا ہوا ہے۔ **واللہ ذوالفضل العظیم.**

اب آپ کے سامنے بخاری کے ترجمہ و حدیث الباب ص۶۵۱ کے متعدد اہم جملوں کی انوری تشریح بھی مزید فائدہ کے لئے پیش ہے۔فیض الباری ص۲/۲۱۰ میں قولہ فوجد رسول اللہ ﷺ کا موقع بھی بجائے ص۲۱۴ کے ترتیباً غلط ہوگیا ہے، ہم سب جملوں کو صحیح ترتیب سے لکھیں گے۔ **واللہ المعین:**.

(۱) قولہ وقال ابن مسعود الخ: حضرتؒ نے فرمایا کہ جو جواب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے سائل کو دیا ہے (اور امام بخاری کا بھی یہی مختار ہوگا کہ اس کو ذکر کیا ہے) یہی مسلک حنفیہ کا ہے۔

(۲) قولہ وقال الحسن الخ: یہ بھی حنفیہ کا مسلک و مختار ہے، اور ان مسائل کو''مسائل السجدات'' کہا جاتا ہے شیخ ابن ہمام نے فتح القدیر میں ان کو مستقل فصل میں ذکر کیا ہے، اور قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے بھی مالا بدمنہ میں لکھا ہے۔

(۳) قولہ فارسل النبی ﷺ الخ:۔حضرتؒ نے فرمایا کہ حافظ نے یہ رائے قائم کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے غسل کے بعد عشاء کی نماز کے لئے مسجد نبوی میں تشریف لانے کا ارادہ فرمایا تھا۔مگر قدرت نہ ہوئی، تب حضرت ابوبکرؓ کو امامت کے لئے حکم فرمایا۔لیکن یہ بات متعدد روایات کے خلاف ہے جس کی تفصیل اوپر گذری ہے، اور ص۹۹ بخاری میں تو اس امر کی بھی صراحت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نماز شروع کرا چکے تھے، پھر حضور علیہ السلام نے مرض میں خفت محسوس کی اور مسجد کی طرف نکلے ہیں، اور نماز پڑھائی اور خطبہ بھی دیا۔

(۴) فجعل ابو بکر یصل وھو قائم بصلوٰۃ النبی علیہ السلام: راوی کا مقصد یہ ہے کہ حضور علیہ السلام امام ہوئے اور حضرت ابوبکرؓ بطور مبلغ کے تکبیر کہتے تھے، حضرتؒ نے فرمایا کہ علامہ عینی نے بخاری کی طرف تسلسل قدوہ کا مسلک منسوب کیا ہے، جو سلف میں سے شعبی اور ابن جریر کا بھی مختار ہے، کہ پہلی صف والے امام کے مقتدی ہیں، دوسری والے پہلی صف والوں کے اور اسی طرح آخری صفوف تک۔لیکن جمہور کا مسلک یہ نہیں ہے، ان کے نزدیک سارے مقتدی بلاتوسط کے امام ہی کی اقتدا کرتے ہیں۔ثمرۂ خلاف جب ظاہر ہوگا کہ کوئی شخص جماعت کو پہنچا اور امام اور مقتدی رکوع سے سر اٹھا چکے تھے، البتہ آخری صفوں میں کوئی ابھی رکوع میں تھا کہ اس شخص نے اسی کی اقتدا کر لی اور اس کے رکوع میں شریک ہوگیا تو اس کو شعبی وغیرہ کے نزدیک رکعت مل گئی، مگر جمہور کے نزدیک نہیں ملی۔

(۱) قولہ ان رسول اللہ ﷺ رکب فرسا حدیث ص۶۵۳: فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا یہ واقعہ گھوڑے سے گرنے کا حسب تحقیق ابن حبان پانچویں سال ہجرت کا ہے اور حافظ نے غلطی سے اس کو نویں سال کا بتلایا ہے۔مغالطہ بعض راویوں کی تعبیری مسامحت سے ہوا ہے کہ انھوں نے اس قصہ کو اور ایلاء کے قصہ کو ایک ہی سیاق میں ذکر کیا ہے، کیونکہ دونوں وقت حضور علیہ السلام نے مشربہ (بالاخانہ) میں قیام فرمایا تھا، علامہ زیلعی حنفی نے اس پر تنبیہ کی ہے مگر حافظ سے تعجب ہے کہ وہ اس اشتراک کے سبب سے غلطی میں پڑ گئے، حالانکہ راوی یہ بھی بتلاتے ہیں کہ قصہ جحوش مذکورہ میں تو حضور علیہ السلام تکلیف کی وجہ سے نیچے اتر ہی نہیں سکتے تھے، برخلاف اس کے قصہ ایلا میں کوئی جسمانی معذوری نہ تھی۔

(۲) قوله فصلينا وراءه قعودا: حضرتؒ نے فرمایا کہ ایک واقعہ تو سقوط نبوی والا ہے اور اس کے بارے میں جو حدیث وارد ہے، وہ الگ ہے، اور دوسرا واقعہ بہت بعد کا ہے اور اس کی حدیث بھی دوسری ہے، جس میں خاص طور سے اقتدا کے احکام بتلائے گئے ہیں، اور اس میں یہ بھی ہے کہ جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو، بعض حضرات نے دونوں حدیث کو ایک قرار دے کر چاہا کہ دوسری حدیث کے اس حکم کو زائد بتلا کر اولی بالحذف قرار دیدیں، حالانکہ اس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ بھی ہیں جو ۵ھ کے بہت بعد کو اسلام لائے ہیں، لہٰذا اس حدیث کے زائد الفاظ مذکورہ کی صحت میں صرف ان ہی لوگوں نے شک کیا ہے جو قراءۃ خلف الامام کے قائل ہیں اور ان کی فقہ حدیث پر غالب آ گئی ہے، حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ حدیث کو متبوع بنا کر فقہ کو اس کے تابع کیا جائے۔ اس کی مزید تفصیل و بحث مسئلہ قراءت خلف الامام میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حضرتؒ نے اس کو اپنے رسالہ قراءت خلف الامام میں بھی کئی جگہ لیا ہے۔

(۳) قوله انما يؤخذ بالآخر فالآخر: حضرتؒ نے فرمایا کہ امام بخاری نے بھی بعد والی حدیث نبوی کو ناسخ قرار دے کر امام ابوحنیفہ امام شافعی، امام ثوری و جمہور سلف کا مسلک اختیار کیا ہے کہ امام کسی عذر سے بیٹھ کر نماز پڑھائے تو بے عذر کے مقتدیوں کو بیٹھ کر نہیں بلکہ کھڑے ہو کر اقتدا کرنی چاہئے امام احمد واہل ظاہر کا مذہب یہ ہے کہ مقتدیوں کو عذر نہ ہو تب بھی وہ امام قاعد معذور کے پیچھے بیٹھ کر ہی پڑھیں گے۔ ابن حزم نے اہل ظاہر کی تائید میں بہت کچھ مبالغہ آرائی کی ہیں جو خلاف واقعہ ہیں۔ کیونکہ خطابی نے معالم میں اور قاضی عیاض نے اکثر فقہاء سے اس کے خلاف نقل کیا ہے، علامہ ابن دقیق العید وعلامہ نووی نے بھی جمہور سلف سے، ابن حزم کے خلاف نقول پیش کی ہیں اور ان کے دعوائے اجماع وغیرہ کا پورا رد کر دیا ہے۔ امام بخاری سے بھی اس مسئلہ میں امام احمد واہل ظاہر کا رد ثابت ہوا۔ اس مسئلہ کو فتح الملہم ص ۲/۵۳ میں بھی پوری تفصیل کے ساتھ مع دلائل ذکر کیا گیا ہے۔

باب متے يسجد من خلف الامام وقال انس عن النبى صلے الله عليه وسلم فاذا سجد فاسجدوا

(جو لوگ امام کے پیچھے ہیں، وہ کب سجدہ کریں، اور حضرت انسؓ نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ جب امام سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو)

۶۵۴: حدثنا مسدد قال حدثنا يحيى بن سعيد عن سفيان قال حدثنى ابو اسحاق قال حدثنى عبدالله بن يزيد قال حدثنى البراء و هو غير كذوب قال كان رسول الله صلے الله عليه وسلم اذا قال سمع الله لمن حمده لم يحن احدمنا ظهره' حتىٰ يقع النبى صلے الله عليه وسلم ساجداً ثم نقع سجوداً بعده

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن یزید روایت کرتے ہیں، کہ مجھ سے براء بن عازبؓ نے بیان کیا، (اور وہ سچے تھے) کہ جب نبی کریم ﷺ سمع الله لمن حمده کہتے تو ہم میں سے کوئی شخص اپنی پیٹھ اس وقت تک نہ جھکا تا جب تک کہ نبی کریم ﷺ سجدے میں نہ چلے جاتے، آپ کے بعد ہم لوگ سجدے میں جاتے۔

تشریح: حدیث کے اندر حکم ہوا کہ جب امام سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو، اس سے امام احمد وامام شافعیؒ نے سمجھا کہ امام کے سجدے کے بعد مقتدی کو سجدہ کرنا چاہئے کہ فا تعقیب کے لئے ہے اور ایسے ہی تمام افعال نماز کو مقتدی امام سے مؤخر کرے۔ امام ابوحنیفہؒ وامام مالکؒ نے فرمایا کہ امام و مقتدی تمام افعال نماز میں ساتھ ہوں، اور امام ابو یوسف وامام محمدؒ تحریمہ وتسلیم کے علاوہ سب افعال میں مقارنت کے قائل ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شرح التسہیل میں ہے کہ فا جزائیہ میں دونوں قول ہیں تعقیب بھی اور مقارنت بھی۔ لہٰذا فا ہمارے مذہب پر

بھی درست ہے، پھر یہ کہ تعقیب ذاتی بھی ہوتی ہے اور بعدیۃ ذاتیہ مقارنت زمانیہ کے منافی نہیں ہے، پس میں اس فا کو تعقیب ذاتی و مقارنت زمانی پر اتارتا ہوں اور امام ومقتدی کے افعال میں تقدم وتاخر ذاتی ہی ہونا چاہئے، امام اعظمؒ کا منشا بھی مقارنت سے یہ ہے کہ امام جب کسی رکن میں داخل ہو تو مقتدی بھی اسی وقت اس میں داخل ہو جائے، یہ انتظار نہ کرے کہ امام اس رکن کو پورا کر لے تب وہ اس رکن میں داخل ہو۔ پس مقتدی امام کے رکوع کے ساتھ ہی رکوع کر لے گا، یہ انتظار نہ کرے گا کہ امام رکوع پورا کر لے، تب یہ رکوع میں جائے۔ گویا امام کا رکوع علت کے طور پر ہوگا مقتدی کے رکوع کے لئے، اور جس طرح علت ومعلول ساتھ ہوتے ہیں، ان دونوں کے افعال بھی ساتھ ہوں گے۔ یہی میرے نزدیک جماعت کا منشا بھی ہے، کہ سب کی حرکت ایک ہو اور سب کی نماز ایک ہو اور سب کی قراءت بھی ایک ہو۔

مقصد شارع امام سے پہلے کسی رکن کو ادا کرنے کی ممانعت ہے، پھر وہ ساتھ ہو یا بعد میں۔ امام صاحب نے ساتھ کرنے کو ترجیح دی ہے، اور امام سے پہلے کرنے کو سب نے بالاتفاق مکروہ قرار دیا ہے، اگرچہ نماز درست ہو جائے گی، حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ صحت کراہت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے، اس کو سب نے مانا ہے، بجز علامہ ابن تیمیہ کے، وہ اس کے مخالف ومنکر ہیں۔

باقی حدیث میں یہ جو صحابہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام جب رکوع سے اٹھ کر **سمع اللہ لمن حمدہ** کہتے تھے، تو ہم اس وقت تک سجدہ کے لئے نہ جھکتے تھے جب تک حضور علیہ السلام سجدہ میں نہ پہنچ جاتے تھے اور حافظؒ نے اس پر لکھا کہ اس سے مقارنت کی نفی واضح طور سے نکل رہی ہے، تو اس کا جواب حنفیہ کی طرف سے یہ ہے کہ ابوداؤد[1]، ابن ماجہ، ومسند احمد کی حدیث نے واضح کر دیا ہے کہ یہ حکم حضور علیہ السلام نے اس وقت دیا تھا، جب آپ کا بدن مبارک بھاری ہو گیا تھا، اور اس وقت یہ ڈر ہو گیا کہ کہیں صحابہ کرام حضور علیہ السلام سے مقدم نہ ہو جائیں۔ لہٰذا یہ حکم مبادرت سے بچانے کے لئے تھا۔ مقارنت کے خلاف نہ تھا۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمیشہ عادت صحابہ کرام کی مقارنت کی تھی، اور اسی لئے حضور علیہ السلام نے جب آپ کا بدن بھاری ہو گیا تو صحابہ کو ہدایت فرمانے کی ضرورت محسوس کی کہ کہیں مقارنت اور حضور کے اتباع کامل کے اشتیاق میں حسب عادت جاری رہنے میں مسابقت ومبادرت کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم (زیادہ تفصیل معارف السنن ص۵۴/۳ میں دیکھیں)

حضرتؒ نے اس موقع پر یہ بھی افادہ کیا کہ "**فاذا رکع فارکعوا**" میں اگر فا کو تعقیب کے لئے بھی مان لیں تب بھی بعدیت ذاتیہ کہیں گے نہ زمانیہ، کیونکہ جزاء شرط ہے۔ پس مقارنت حنفیہ اس معنی پر بھی ثابت ہے، پھر فرمایا کہ میں چہرہ اور آئینہ معاً دیکھ لیتا ہوں، جبکہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر چہرہ دیکھے گا تو آئینہ نہیں دیکھے گا۔ وبالعکس۔ متکلمین وفلاسفہ کا زمانہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ بعدیت ذاتیہ ہے یا زمانیہ؟ یہاں لامع اور حاشیہ سے یہ تفصیل بھی قابل ذکر ہے کہ تحریمہ، تسلیم اور بقیہ ارکان صلوٰۃ کے احکام الگ ہیں،

(۱) ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ تحریمہ میں امام سے تقدم ہوا تو نماز باطل ہوگی، البتہ اس میں امام شافعی کا ایک قول مخالف ہے جس کو ان کے اصحاب نے پسند نہیں کیا، (اور پہلے ہم حضرت شاہ صاحبؒ سے نقل کر چکے ہیں کہ امام بخاری بھی تقدم کو جائز رکھتے ہیں، واللہ اعلم

(۲) امام سے قبل اگر مقتدی سلام پھیر دے تو مالکیہ کے نزدیک تو مقارنت بھی مفسد ہے، لہٰذا تقدم بدرجہ اولیٰ مفسد ہوگا، امام شافعی وامام احمد کے نزدیک بھی تقدم مفسد ہے، لیکن مقارنت مکروہ ہے مع صحت صلوٰۃ کے۔ حنفیہ کے نزدیک سلام میں تقدم مکروہ غیر مفسد ہے۔ لہٰذا مقارنت بھی صرف مکروہ ہوگی، (معارف السنن ص۶۰/۳ میں امام صاحب سے دو روایت نقل کی ہیں)

(۳) باقی ارکان صلوٰۃ کے بارے میں جمہور کا مسلک جن میں ائمہ ثلاثہ بھی ہیں جواز **صلوٰۃ مع کراھۃ التحریم** ہے، امام احمد سے ایک روایت میں تقدم مبطل صلوٰۃ ہے، اور یہی اہل ظاہر کا قول ہے (الابواب للبخاری ص۲۶۸/۲)

---

[1] فیض الباری ص۲۱۶/۲ میں مسلم کا حوالہ درست نہیں معلوم ہوتا واللہ اعلم (مؤلف)

فائدہ: فتح الملہم ص ۲/۵۳ میں حدیث **انما جعل الامام لیؤتم بہ** کے تحت لکھا:۔ اقتدا واتباع امام کی پوری شان یہ ہے کہ نہ اس کے افعال سے سبقت ومبادرت کرے، نہ اس کے برابر یا آگے کھڑا ہو، اور اس کے تمام احوال پر نظر کر کے اسی جیسے افعال ادا کرے۔ اور اس کی کسی فعل میں مخالفت بھی نہ کرے۔ قالہ الحافظ۔ علامہ ابیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث امام مالک وجمہور کے لئے حجت ہے، جن میں امام ابوحنیفہؒ بھی ہیں کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے ساتھ وابستہ ومرتبط ہونی چاہئے، خاص طور سے جبکہ حدیث میں یہ تاکید بھی وارد ہے کہ **فلا تختلفوا علیہ،** یعنی امام کی کسی حال میں مخالفت نہ کرو اور اس سے امام شافعی اور دوسرے محدثین کا رد ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی اقتدا درست ہے، اور عصر پڑھنے والے امام کے پیچھے ظہر والے کی اقتدا صحیح ہے، انھوں نے اختلاف کی ممانعت نبویہ کو صرف ظاہری افعال پر محمول کیا ہے جبکہ امام مالک وغیرہ نے اس کو عام رکھا ہے، اور ظاہر ہے کہ نیتوں کے اختلاف سے بڑا اور کون سا اختلاف ہوسکتا ہے، پھر بھی امام شافعی اور دوسرے ان کے ہمنوا محدثین دو فرض نمازوں یا ایک فرض دوسری نفل نمازوں کے اختلاف کو بھی ممانعت نبویہ کے تحت لانا نہیں چاہتے؟!

باب اثم من رفع راسہ' قبل الامام

(اس شخص کے گناہ کا بیان جس نے امام سے پہلے سر اٹھایا)

۶۵۵: حدثنا حجاج بن منهال قال حدثنا شعبة عن محمد بن زياد قال سمعت اباهريرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اما یخشیٰ احدکم اولایخشیٰ احدکم اذا رفع راسہ' قبل الامام ان یجعل اللہ راسہ' راس حمار اویجعل اللہ صورتہ' صورۃ حمار

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، کہ آپ نے فرمایا:۔ کیا تم میں سے کوئی شخص جو اپنا سر امام سے پہلے اٹھالیتا ہے، اس بات کا خوف نہیں کرتا، کہ اللہ اس کے سر کو گدھے کا (سا) سر بنادے، یا اللہ اس کی صورت گدھے کی (سی) بنادے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث الباب میں گدھے کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ یہ فعل بڑی حماقت کا ہے، کیونکہ اپنے مقام اور امام کے منصب کو بھی نہ سمجھا، پھر حدیث میں صرف خشیت کا لفظ ہے کہ اس کا ڈر ہے، اللہ ایسا نہ کردے، تاہم ملا علی قاریؒ نے واقعہ لکھا ہے کہ کسی نے عمداً امام سے پہلے سجدہ سے سر اٹھایا تھا کہ دیکھے قول نبوی درست ہے؟ تو اس کا چہرہ گدھے کا ہوگیا تھا، پھر عمر بھر نقاب ڈالے رہا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حدیث کا مضمون آخرت سے متعلق ہو، کہ وہاں مسخ ہوجائے گا، والعیاذ باللہ۔ معلوم ہوا کہ امام کی مخالفت ظاہری و باطنی ہر طرح نادرست ہے، اور اس امر کا لحاظ سب سے زیادہ حنفیہ نے کیا ہے، علامہ عینی نے یہاں اچھی تحقیق ذکر کی ہے اور مسخ کے بارے میں لکھا کہ یہ امت مسخ صورت سے محفوظ کردی گئی ہے، اس لئے ظاہری مسخ مراد نہیں ہوسکتا، البتہ آخر زمانہ میں ہو بھی سکے گا جیسا کہ بعض احادیث اشراط ساعت میں آتا ہے، پھر یہ بھی لکھا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ حق تعالےٰ ایسے لوگوں کے لئے کسی دوسرے وقت کے لئے عذاب کو مؤخر کردیں، جیسا کہ بعض ثقات کی نقل سے معلوم ہوا کہ بعض شیعی حضرات جو سب صحابہ کرتے تھے، ان کی صورتیں مرنے کے وقت خنزیر اور گدھے کی ہوگئیں، اور ایسے ہی والدین کی نافرمانی کرنے والی اولاد کے بارے میں نقل ہوا ہے، جنھوں نے اپنے والدین کو گدھا، خنزیر یا کتا کہا تھا۔ (عمدہ ص ۳/۷۵۶)

باب امامة العبدو المولیٰ و کانت عائشة یؤمها عبدها ذکوان من المصحف وولدالبغی والاعرابی والغلام الذی لم یحتلم لقول النبی صلے اللہ علیه وسلم یؤمهم اقرء هم لکتاب اللہ ولایمنع العبد من الجماعة بغیر علة

(غلام اور آزاد کردہ غلام کی امامت کا بیان' حضرت عائشہؓ کی امامت ان کا غلام ذکوان مصحف سے (دیکھ دیکھ کر) کیا کرتا تھا اور ولدالزنا' اور گنوار کی اور اس لڑکے کی امامت جو بالغ نہ ہوا ہو (درست ہے) کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگوں کی امامت وہ شخص کرے جوان سب میں کتاب اللہ کی زیادہ قراءت والا ہو' اور بے وجہ غلام کو جماعت سے نہ روکا جائے)

۶۵۶: حدثنا ابراهیم بن المنذر قال حدثنا انس بن عیاض عن عبیداللہ عن نافع عن عبداللہ بن عمر قال لما قدم المهاجرون الاولون العصبة موضعاً بقبآء قبل مقدم رسول اللہ صلے اللہ علیه وسلم کان یؤمهم سالم مولیٰ ابی حذیفة وکان اکثرهم قراٰناً

۶۵۷: حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا یحییٰ قال حدثنا شعبة قال حدثنی ابوالتیاح عن انس بن مالک عن النبی صلے اللہ علیه وسلم قال اسمعوا واطیعوا وان استعمل حبشی کان راسه' زبیبة

ترجمہ ۶۵۶: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے جب مہاجرین اولین محلہ قبا کے مقام عصبہ میں مقیم تھے، توان کی امامت ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام حضرت سالم کیا کرتے تھے، کیونکہ وہ قرآن کا حفظ سب سے زیادہ رکھتے تھے۔

ترجمہ ۶۵۷: حضرت انس بن مالکؓ، رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں، کہ آپ نے فرمایا، کہ اگر کوئی حبشی (تم پر) حاکم بنادیا جائے، اور وہ ایسابدرو ہو کہ گویا اس کا سرانگور ہے۔ تب بھی اس کی سنو، اور اطاعت کرو۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حنفیہ نے تصریح کی ہے کہ غلام کی امامت میں صرف کراہت تنزیہی ہے۔ حافظ نے لکھا کہ غلام کی امامت جمہور کے نزدیک درست ہے، صرف امام مالک نے مخالفت کی اور کہا کہ غلام، احرار کے امام نہ بنیں البتہ اگر وہ قاری و عالم ہوں اور مقتدی ایسے نہ ہوں تو حرج نہیں، بجز جمعہ کے کیونکہ وہ غلام پر فرض نہیں ہے، علامہ اشہب مالکی نے کہا کہ وہ بھی درست ہے، اس لئے کہ جب وہ شریک جمعہ ہوگا تو اس سے فرض ہی تو ادا ہوگا۔ (فتح ص ۲/۱۲۷)

اعرابی (دیہاتی) کی امامت بھی جمہور کے نزدیک درست ہے، امام مالک نے فرمایا کہ اکثر جاہل ہوتے ہیں، اور تارک جماعت وغیرہ، اس لئے کراہت ہے، لہٰذا ایسا نہ ہو تو وہ بھی مکروہ نہ کہیں گے۔

ولد البغی، یعنی مجہول النسب کی امامت بھی اگر وہ صالح ہو تو درست ہے، اس میں بھی امام مالک کا اختلاف ہے۔

نابالغ کی امامت شافعیہ کے نزدیک درست ہے، حنفیہ فرض نماز کی نابالغ کی امامت نادرست کہتے ہیں، امام مالک وثوری بھی مکروہ کہتے ہیں۔ امام احمد وامام ابوحنیفہؒ سے نوافل کی امامت کے جواز کا قول ہے۔

امام بخاری نے بظاہر شافعیہ کی موافقت کی۔ امام احمد واسحٰق کے نزدیک بھی امام ابوحنیفہ کی طرح فرض نماز کی امامت نابالغ کے لئے جائز نہیں۔

علامہ موفق نے نقل کیا کہ نابالغ کی امامت فرض میں صحیح نہیں، اور یہی قول امام مالک کا ہے۔ (الابواب ص ۲/۲۶۹)

قولہ وان استعمل حبشی: حضرت شاہ صاحب نے فرمایا:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ وقت یا سلطان وقت نے اپنے ماتحت کسی حبشی وغیرہ کو عامل (گورنر وغیرہ) بنادیا (جیسا کہ بعض طرق روایات میں اس امر کی صراحت بھی ہے) تو وہ صحیح ہے، باقی امام اکبر (خلیفہ

وقت یا سلطان اعظم) کے لئے شرعا یہی بات ہے کہ وہ قریشی ہو (الائمۃ من قریش) اور طرابلسی نے امام ابوحنیفہؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ قریشی ہونا شرط نہیں ہے، جبکہ مسئلہ یہی لکھا ہوا ہے کہ قریشی ہونا شرط ہے۔ اور طرابلسی کے علاوہ کسی کی نقل نہیں ملی، پھر فرمایا کہ درحقیقت یہ مسئلہ علم فقہ کا تھا، کہ کون امام اکبر ہو کون نہ ہو، مگر اس کو علم کلام میں داخل کر دیا گیا ہے، اور وہیں اس کے احکام ذکر کرنے لگے ہیں۔

حافظ نے لکھا یہاں حبشی کی امارت کا ذکر کر کے یہ بتلایا کہ جب وہ قابل اطاعت ہے تو اس کی امامت میں نماز بھی درست ہوگی۔ (قالہ ابن بطال)

اس سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ سلاطین اسلام اگر ظلم بھی کریں تو ان کی مخالفت کا جھنڈا نہ اٹھانا چاہئے، کیونکہ مخالفت کے نتیجہ میں اس سے بھی بدتر حالات پیش آسکتے ہیں، وجہ استدلال یہ ہے کہ جب عبد حبشی کی اطاعت ضروری ہے جبکہ ظاہر ہے وہ قہر وغلبہ ہی کے ذریعہ حاکم ووالی بنا ہوگا۔ کیونکہ اصل استحقاق امامت عظمیٰ تو قریش کے لئے ہے، تو اس کی اقتدا بھی درست ہونی چاہئے، مگر ابن الجوزی نے اس کو رد کیا ہے اور کہا کہ یہاں مراد امام اعظم نہیں، بلکہ وہ ہے جو اس کے ماتحت کسی عہدہ پر مسلط ہو گیا ہو۔ اور بعض لوگوں نے جو اس سے جواز امامت غیر قریشی کے لئے استدلال کیا وہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ مجبوری کے جواز اور حقیقی جواز میں تلازم نہیں ہے، اور اس کے مفصل بحث اپنی جگہ کتاب الاحکام میں آئے گی (فتح ص ۲/۱۲۸)

علامہ عینیؒ نے بھی ایسی ہی تشریح کی ہے، اور آخر میں لکھا کہ ایسے متغلب کی اطاعت اسی وقت تک ہے کہ وہ جمعہ، جماعات، عید و جہاد کو قائم رکھے۔ (عمدہ ص ۲/۷۶۰)

باب اذا لم یتم الامام و اتم من خلفه

(اگر امام اپنی نماز کو پورا نہ کرے، اور مقتدی پورا کرلیں)

۶۵۸: حدثنا الفضل بن سهل قال حدثنا الحسن بن موسیٰ الاشیب قال حدثنا عبدالرحمٰن بن عبدالله بن دینار عن زید بن اسلم عن عطآء بن یسار عن ابی هریرة ان رسول الله صلے الله علیه وسلم قال یصلون لکم فان اصابوا فلکم و ان اخطأوا فلکم و علیهم

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ یہ لوگ جو تمہیں نماز پڑھاتے ہیں اگر ٹھیک ٹھیک پڑھائیں گے، تو تمہارے لئے (ثواب) ہے اور اگر وہ غلطی کریں گے، تو تمہارے لئے (ثواب تو) ہے ہی اور ان پر (گناہ) ہے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ اس باب میں امام بخاریؒ نے مسائل اقتداء امام کی طرف اشارہ کیا ہے جو شافعیہ کے یہاں بہت ضعیف ہیں، اور امام بخاری کے نزدیک ان سے بھی زیادہ کمزور و بے حیثیت ہیں، گویا ان کے یہاں اقتدا کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بظاہر ایک جگہ میں امام و مقتدی جمع ہو گئے اور مقتدیوں نے امام کی صرف ظاہری وحسی اتباع کر لی، پھر اگر امام بخاری حدیث الباب سے تعدیل ارکان جیسے افعال کے لئے استدلال کر لیتے، تب بھی کوئی حرج نہ تھا، لیکن جس طرح وہ اہم اعظم ارکان صلوٰۃ کے لئے بھی استدلال کرنا چاہتے ہیں وہ صحیح نہیں، کیونکہ حدیث الباب کا شان ورود تو ائمہ جور کے اعمال خارجی سے تھا، مثلاً وقت مکرہ میں نماز پڑھنا وغیرہ نہ کہ داخلی اعمال واجبات و ارکان صلوٰۃ سے جو اجزاء نماز ہیں، جیسا کہ محقق قاضی عیاض مالکیؒ وغیرہ نے فرمایا ہے اور بہت سی احادیث میں بھی اس کی تصریح موجود ہے، لہٰذا نماز کے داخلی امور وارکان سے اس کو متعلق کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا۔ حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ قولہ علیہ السلام **فان اصابوا فلکم** الخ کے عموم سے امام بخاری کا استدلال نہایت ضعیف ہے، کیونکہ وہ امر مبہم ہے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے مصداق کون سے امور ہیں اور کون سے نہیں، پھر ہمیں کیا حق ہے کہ ان کو ارکان واجزاء نماز پر جاری کر دیں۔ شافعیہ نے اس عموم سے یہاں تک فائدہ اٹھایا کہ اگر امام نے بلا وضو یا حالت جنابت میں نماز پڑھا دی، تب بھی مقتدیوں کی نماز درست بتلاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ صرف امام اپنی لوٹا لے گا۔ مقتدیوں کو اگر

درمیان میں معلوم ہوگیا تو پہلی تو صحیح ہوگئی، باقی کو بغیر نیت اقتدا کے اپنی سمجھ کر پوری کرلیں گے، اور اگر بعد کو معلوم ہوا تو اعادہ کی ضرورت نہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ باطل محض ہے، کیونکہ اس امام نے تو ایسی نماز پڑھائی، جس کو نماز کہہ بھی نہیں سکتے، کہ بنص حدیث نماز بغیر طہارت کے ہوتی ہی نہیں، لہٰذا لکم اور علیہم کا مصداق کم سے کم ایسی نماز پر تو ہونا چاہئے جس کو شرعی نماز کہہ سکیں، اس نماز کو تو نماز نہیں کہہ سکتے جو بلا طہارت والے امام کے پیچھے پڑھی ہے۔ باقی اگر مقتدیوں کو یہ علم ہی نہ ہو کہ امام نے بلا طہارت نماز پڑھادی ہے تو وہ ضرور عذر ہے اور ایسی حالت میں حنفیہ بھی یہی کہیں گے کہ نماز کا اعادہ نہیں کہ وہ بلا علم کے مکلف نہیں ہوسکتے۔ پھر حدیث صحیح میں یہ بھی ہے کہ ائمہ جور کی اطاعت اس وقت تک ہے کہ وہ نماز قائم کریں، جمعہ، جماعات وجہاد پر عامل ہوں، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اطاعت واقتدا اس وقت تک کریں گے کہ ان کی نمازیں تو صحیح ہوں، اور ان پر نماز کا اطلاق درست ہوسکے۔ ابوداؤد میں بھی حدیث ہے باب جماع الامامة و فضلها میں کہ جو نماز پڑھائے تو اگر وقت پر پڑھائے تو اس کو اور مقتدیوں کو ثواب ملے گا، اور جو اس میں کوتاہی کرے تو امام پر گناہ ہوگا مقتدیوں پر نہیں۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ کوتاہیاں برداشت ہیں نہ یہ کہ سرے سے نماز ہی صحیح نہ ہو جیسے بلا طہارت کے امام کی نماز سرے سے ہوگی ہی نہیں غرض حدیث الباب وغیرہ سے صرف مقتدیوں کو تسلی دینا ہے کہ ائمہ جور کے ظلم سے بچنے کے لئے اگر نمازوں میں کوتاہی ہو تو وہ قابل مواخذہ نہ ہوگی، اور سلف سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ وقت پر اپنی کامل نمازیں گھروں میں پڑھ کر جاتے تھے، اور پھر ائمہ جور کے ساتھ بھی رفع فتنہ کے خیال سے اقتداء کر لیتے تھے، چنانچہ اگلے باب میں حدیث بخاری بھی لائے ہیں کہ ہمیں امام فتنہ نماز پڑھاتا ہے، جس سے ہم دل تنگ ہوتے ہیں۔ یہ سب خارجی معاملات نماز کے مکروہ اوقات میں پڑھنے یا ائمہ جور وفساق کے پیچھے نماز مجبوراً پڑھنے کے تھے، یہ غرض نہ تھی کہ وہ بلا طہارت کے نماز پڑھاتے تھے، یا بلا تعدیل ارکان کے، یا نقص ارکان وغیرہ داخلی نقائص کے ساتھ نماز پڑھاتے تھے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ جب حدیث الباب فان اصابوا فلکم کا دوسرے شواہد کے ذریعہ وقت سے متعلق ہونا ثابت ہے تو یہاں امام بخاری کو عام مسائل قدوہ کے ذیل میں لانا ہی سمجھ میں نہیں آتا، اور اگر یہ حدیث ارکان کے بارے میں ہوتی تو حدیث یہ بھی تو بتاتی کہ امام اگر نقص ارکان کرلے تو مقتدی ایسی صورت میں کس طرح کریں،

علامہ عینی نے لکھا کہ حدیث الباب کو جس طرح امام بخاری لائے ہیں، وہ اس میں متفرد ہیں کیونکہ ابن حبان ودارقطنی وابوداؤد نے اسی حدیث الباب کو اور اس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ سے دوسری صورت میں روایت کیا ہے۔ جس میں ائمہ جور کی بے وقت نماز پڑھانے کا بھی ذکر ہے۔ اس طرح مبہم طور سے روایت نہیں ہے جیسی امام بخاری کی ہے۔ (عمدہ ص ۲/۷۶۱)

غرض امام بخاری نے حدیث الباب کو اپنے مقصد سے ذکر کیا اور حافظ نے شرح میں اس سے شافعی نقطہ نظر کو قوت پہنچانے کی سعی کی ہے، اور یہ ہے فقہ سے حدیث کی طرف چلنا اور اس کو اپنی فقہ سے مطابق کرنے کی سعی کرنا، حالانکہ صحیح صورت اس کے برعکس ہے کہ پہلے حدیث کے مفہوم ومصداق کو خالی الذہن ہوکر متعین کرلیا جائے، پھر اسی کے تحت فقہی مسئلہ نکالا جائے۔ واللہ الموفق۔

حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ لفظ تمام سے اشارہ امور زائدہ سنن ومستحبات کی طرف ہوسکتا ہے نہ کہ ارکان وشرائط صلوٰۃ کی طرف کہ ان میں خلل وکمی سے تو نہ امام کی نماز ہوگی، نہ مقتدیوں کی۔ مگر شاید امام بخاری بھی شافعیہ کے مسلک کے قائل ہیں کہ امام کی نماز کے فساد سے مقتدیوں کی نماز فاسد نہیں ہوتی، (لامع ص ۲/۲۶۷)

ایک اہم غلطی کا ازالہ: حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے حاشیہ لامع میں لکھا: قسطلانی نے کہا کہ "اگر امام نماز کو ناقص کرے اور مقتدی کامل کرلیں تو ان کی نماز میں خلل نہ آئے گا، یہ مذہب شافعیہ کا ہے مثل مالکیہ کے اور امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے" حالانکہ مالکیہ وامام احمد کا یہ مسلک نہیں ہے، نہ وہ شافعیہ (اور امام بخاری) کے عام اور پورے مسلک سے متفق ہیں البتہ صرف حدیث کے مسئلہ میں ان کے ساتھ

ہیں، یعنی امام اگر بھول کر بلا طہارت کے نماز پڑھادے، اور نماز کے بعد بتلائے تو مقتدیوں کو نماز لوٹانا ضروری نہ ہوگا۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ سب کو لوٹانی پڑے گی۔ حضرت شیخ الحدیث نے ص ۲۶۷ میں اختلاف کی پوری تفصیل علامہ عینی حنفی اور علامہ موفق حنبلی سے نقل فرما کر واضح کر دیا کہ علاوہ ایک مسئلہ حدیث کے مالکیہ وحنابلہ باقی تمام مسائل میں حنفی کے ساتھ ہیں۔ شافعیہ کے ساتھ نہیں ہیں جزا ھم اللہ خیر الجزاء۔

باب امامة المنفتون والمبتدع وقال الحسن صل وعليه بدعته' وقال لنا محمد بن يوسف حدثنا الاوزاعی قال حدثنا الزهری عن حميد ابن عبدالرحمٰن عن عبيدالله بن عدی بن الخيار انه' دخل علیٰ عثمان بن عفان و هو محصور فقال انک امام عآمة و نزل بک ماتریٰ و يصلی لنآ امام فتنة و نتحرج فقال الصلوٰة احسن مايعمل الناس فاذا احسن الناس فاحسن معهم واذااسآء وافاجتنب اسآء تهم وقال الزبيدی قال الزهری لاتریٰ ان يصلیٰ خلف المخنث الامن ضرورة لابدمنها

(مبتلائے فتنہ اور بدعتی کی امامت کا بیان حسن کا قول ہے کہ بدعتی کے پیچھے نماز) پڑھ لو'اس کی بدعت (کا گناہ) اس پر ہے' ہم سے محمد بن یوسف نے بواسطہ اوزاعی' زہری' حمید بن عبدالرحمٰن' عبیداللہ بن عدی بن خیار سے روایت کی ہے' کہ وہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس اس حالت میں گئے' (جب وہ اپنے گھر میں محصور تھے (باغیوں نے ہر طرف سے محاصرہ کر لیا تھا) ان سے کہا' کہ آپ امام کل ہیں' اور آپ کی یہ کیفیت ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں' ہمیں امام فتنہ نماز پڑھاتا ہے' جس سے ہم تنگ دل ہوتے ہیں' تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ نماز آدمی کے تمام اعمال میں سب سے عمدہ چیز ہے' جب لوگ عمدہ کام کریں' تو تم بھی ان کے ہمراہ عمدہ کام کرو اور جب وہ برا کام کریں' تو تم ان کی برائی سے علیحدہ رہو' اور زبیدی کہتے ہیں کہ زہری کا قول ہے کہ ہم مخنث کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں جانتے لیکن جب کہ لاچاری و مجبوری ہو)

۶۵۹: حدثنا محمد بن ابان قال حدثنا غندر عن شعبة عن ابی التياح انه' سمع انس بن مالک قال قال النبی صلے الله عليه وسلم لابی ذراسمع واطع ولولحبشی كان راسه' زبيبة

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا کہ اگر ایک حبشی (کی اطاعت کے لئے تم سے کہا جائے) جس کا سر انگور کی مثل ہو، جب بھی، اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مفتون سے مراد وہ ہے جو دین کے بارے میں احتیاط اور شرعی آداب وعقائد کا پوری طرح لحاظ نہ کرتا ہو، وہ نہیں کہ جو اچھی طرح نماز نہ پڑھاتا ہو یا اس میں کمی کرتا ہو، لہذا امام بخاری کا استدلال صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ حدیث میں ائمہ جور کے خارجی حالات کے سبب لوگوں کی تشویش وفکر کا حال بیان ہوا ہے نہ کہ ارکان صلوٰۃ میں کمی کی بات تھی۔ حضرتؒ نے اس موقع پر حضرت عثمانؓ کے صحیح حالات پر بھی روشنی ڈالی اور فرمایا کہ اگر چہ انھوں نے اپنے اقارب واعزہ عمال کی شکایات پر ان کو معزول نہیں کیا، مگر ان کی حمایت بھی نہیں کی، نہ ان کے غلط افعال کی تصویب کی، وہ فتنہ، فساد و خوں ریزی سے بچنا چاہتے تھے۔

حضرت علی، حضرت زبیر وحضرت طلحہؓ نے جب حالات زیادہ بگڑتے دیکھے تو اپنی اولاد کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لئے بھیجا اور ان کا خیال یہی تھا کہ باغیوں کی شورش دب جائے گی، مگر پھر اچانک ہی حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر ان کو مل گئی، تو بڑا رنج ہوا، اور حضرت علیؓ بھاگ کر موقع پر گئے، حضرت حسینؓ کو سخت تنبیہ کی کہ تمہارے ہوتے ہوئے یہ حادثہ کیسے ہو گیا؟ انھوں نے کہا کہ ہمیں اس کا بالکل علم نہیں ہوا، کیونکہ باغیوں نے دیوار پر سے گھر میں اتر کر حملہ کیا ہے، دروازہ سے داخل نہیں ہوئے، ہم یہاں پہرہ دے رہے تھے، یہ بھی تاریخ سے ثابت

ہے کہ جولوگ قریب تھے اور انھوں نے مدافعت کرنی چاہی تو ان کو بھی حضرت عثمانؓ نے روک دیا، اور فرمایا کہ مجھے پسند نہیں کہ کسی مسلمان کا خون میری وجہ سے بہایا جائے۔ خود آپ کے غلاموں کی تعداد تقریبا تین ہزار تھی اور انھوں مقابلہ کی اجازت چاہی تو ان کو بھی منع کر دیا جبکہ فرمایا کہ تم میں سے جو بھی اپنی تلوار میان میں رہنے دے گا وہ میری طرف سے آزاد ہوگا۔ اس لئے سب وہاں سے چلے گئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے تو زمانہ کی ساری تاریخ میں یہی دیکھا کہ جو شخص خود اپنی مدد دوسروں سے نہ لینا چاہے اور اس کے وسائل واسباب اختیار نہ کرے، اس کی کوئی مدد نہیں کرتا، اور لوگ اس سے دور ہو جاتے ہیں۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ غالبا اس میں حضرتؒ کا اشارہ اپنی طرف بھی تھا، کیونکہ آپ کے ساتھ بھی ایسے ہی حالات پیش آئے تھے جن کی تفصیلات راقم سے زیادہ شاید ہی کسی کے علم میں ہوں۔ اور ان کو یاد کر کے دل روتا ہے کسی شاعر نے بالکل صحیح کہا ہے **ومن لا یکرم نفسه لایکرم.** اور حضرتؒ سے بارہا سنا کہ میں اپنے آپ کو کتے سے زیادہ ذلیل سمجھتا ہوں، تو ایسا ولی کامل کسی سے اپنا دکھ درد کیا کہتا اور کس طرح اپنے اعوان وانصار کو جمع کر کے مظالم کی مدافعت کرتا؟ تاہم اپنے دلی صدمات کی طرف اشارہ اپنے چند عرب اشعار میں فرمایا تھا، جن کو اہل علم جانتے ہیں۔ **واللہ غالب علی امرہ. ولاراد لقضاۂ.**

مبتدع: اگر علانیہ بدعت کا ارتکاب کرتا ہو کہ لوگ جانیں اور ان کو ترغیب ہو تو اس کے پیچھے بھی مکروہ ہوگی، بلکہ امام احمدؒ کے نزدیک قابل اعادہ ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اہل بدعت کی امامت میں نماز پڑھنا مباح ہے۔ ایسے ہی کسی تارک رکن کے پیچھے خواہ وہ کسی عذر سے ہی ایسا کرتا ہو جیسے لیٹ کر نماز پڑھائے، یا رکوع وسجود سے عاجز نماز پڑھائے تو نماز جائز نہ ہوگی۔ یہی قول امام ابوحنیفہؒ وامام مالکؒ کا بھی ہے (حاشیہ لامع ص۱/۲۶۷)

بحر میں ہے کہ امام اگر مبتدع ہو لیکن اس کی بدعت حد کفر تک نہ پہنچے تو اس کی اقتدا درست ہے اور تنہا نماز پڑھنے سے اس کے پیچھے نماز افضل ہے۔

مخنث: جو عورتوں کے اطوار اپنائے، اس کی اقتداء بھی درست نہیں۔ کیونکہ امامت فضل وکمال کو چاہتی ہے اور یہ رکیک حرکات کرتا ہے۔

باب یقوم عن یمین الامام بحذآئه سوآءً اذا کانا اثنین

(جب دو نمازی ہوں تو مقتدی امام کے دائیں طرف اس کے برابر کھڑا ہو)

۶۶۰: حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا شعبة عن الحکم قال سمعت سعید ابن جبیر عن ابن عباسؓ قال بت فی بیت خالتی میمونة فصلی رسول الله صلی الله علیه وسلم العشآء ثم جآء فصلی اربع رکعات ثم نام ثم قام بجئت فقمت عن یساره فجعلنی عن یمینه فصلی خمس رکعات ثم صلی رکعتین ثم نام حتیٰ سمعت غطیطهٗ اوقال خطیطه' ثم خرج الیٰ الصلوٰة

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں اپنی خالہ میمونہؓ کے گھر میں ایک شب رہا (تو میں نے دیکھا کہ) رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز (مسجد سے) پڑھ کر تشریف لائے اور چار رکعتیں آپ نے پڑھیں پھر سو رہے، اس کے بعد اٹھے (اور نماز پڑھنے) کھڑے ہوئے تو میں آیا اور آپ کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ آپ نے مجھے اپنے داہنی جانب کر لیا، پھر آپ نے پانچ رکعتیں پڑھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں، اس کے بعد سو رہے، یہاں تک کہ میں نے آپ کے خراٹے کی آواز سنی، اس کے بعد آپ نماز (فجر) کے لئے باہر تشریف لے گئے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں بھی مسئلہ اسی طرح ہے جیسے حدیث الباب میں بیان ہوا، البتہ اگر دو مقتدی ہوں تو ان کا امام کے پیچھے ہونا بہتر ہے۔

نیز فرمایا کہ میں نے حدیث کے اس مضمون سے کہ حضور علیہ السلام نے ابن عباسؓ کو نماز میں ہی بائیں سے داہنے کرلیا، یہ استنباط کیا کہ اگر نماز کے اندر کوئی کراہت آجائے تو اس کو نماز کے اندر ہی رفع کردینا چاہیے۔ یہ مسئلہ فقہ والوں نے نہیں لیا۔

باب اذاقام الرجل عن یسار الامام فحوله' الامام الیٰ یمینه لم تفسد صلوتهما

(اگر کوئی شخص امام کے بائیں جانب کھڑا ہو اور امام اس کو اپنے دائیں طرف پھیر دے تو کسی کی نماز فاسد نہ ہوگی)

۶۶۱: حدثنا احمد قال حدثنا ابن وهب قال حدثنا عمرو عن عبد ربه بن سعید عن مخرمة بن سلیمان عن کریب مولی ابن عباس عن ابن عباس قال نمت عند میمونة والنبی صلے الله علیه وسلم عندها تلک اللیلة فتوضأ ثم قام یصلی فقمت عن یساره فاخذنی فجعلنی عن یمینه' فصلیٰ ثلٰث عشرة رکعةً ثم نام حتیٰ نفخ وکان اذانام نفخ ثم اتاه المؤذن فخرج فصلیٰ ولم یتوضا قال عمر وفحدثت به بکیرًا فقال حدثنی کریب بذٰلک

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں ایک رات حضرت میمونہؓ کے ہاں سویا، اور رسول اللہ ﷺ اس شب ان ہی کے یہاں تھے، تو (میں نے دیکھا کہ) آپ نے وضو فرمایا، اس کے بعد آپ کھڑے ہوگئے اور نماز پڑھنے لگے، میں بھی آپ کے بائیں جانب کھڑا ہوگیا، تو آپ نے مجھے پکڑ کے اپنے داہنی جانب کرلیا، اور (کل) تیرہ رکعت نماز آپ نے پڑھی پھر سورہے، یہاں تک کہ سانس کی آواز آنے لگی، اور جب کبھی آپ سوتے تھے سانس کی آواز (ضرور) آنے لگتی تھی، اس کے بعد مؤذن آپ کے پاس آیا اور آپ باہر تشریف لے گئے اور نماز فجر پڑھی۔

تشریح: حافظؒ نے لکھا کہ امام احمد کے نزدیک مقتدی کے امام کی بائیں جانب کھڑے ہونے سے نماز باطل ہوجاتی ہے، جمہور کے نزدیک باطل نہیں ہوتی، اس سے معلوم ہوا کہ یہاں امام بخاری نے امام احمد کا رد کیا ہے۔

قوله فصلے ثلاث عشرة رکعة: حضرتؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے اس رات میں ۱۳ رکعات ہی پڑھی تھیں، راوی نے سابق روایت میں پانچ رکعت ذکر کی تھیں، اور اختصار کر کے باقی کا ذکر چھوڑ دیا تھا۔

پھر فرمایا کہ اس روایت کی سند میں مخرمہ ہیں اور طحاوی میں اس کی جگہ قیس ہیں، مگر مخرمہ ہی صحیح ہے جو یہاں ہے اور ان مخرمہ سے یہ روایت بھی ہے کہ آخر کی پانچ رکعات میں سے دو رکعات تہجد کی اور تین وتر کی تھیں۔ اور اس واقعہ میں لیٹنا حضور علیہ السلام کا تہجد کے بعد اور سنن فجر سے قبل کا ہے۔

باب اذالم ینو الامام ان یؤم ثم جآء قوم فامهم

اگر امام نے امامت کی نیت نہ کی ہو پھر کچھ لوگ آجائیں اور وہ ان کی امامت کرے

۶۶۲: حدثنا مسددقال حدثنا اسمٰعیل بن ابراهیم عن ایوب عن عبدالله ابن سعید ابن جبیر عن ابیه عن ابن عباس قال بت عند خالتی میمونة فقام النبی صلے الله علیه وسلم یصلی من اللیل فقمت اصلی معه' فقمت عن یساره فاخذبراسی واقامنی عن یمینه

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں ایک شب اپنی خالہ میمونہؓ کے ہاں سویا تو (میں نے دیکھا کہ) نبی کریم ﷺ نماز شب پڑھنے کھڑے ہوئے، میں بھی آپ کے ساتھ بائیں جانب کھڑا ہوگیا، آپ نے میرا سر پکڑا، اور مجھے اپنی داہنی جانب کھڑا کردیا۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ امام کا امامت کی نیت کرنا حنفیہ کے نزدیک بھی شرط نہیں ہے، البتہ محاذاۃ کی صورت میں چونکہ حنفیہ کے نزدیک عورت کے برابر والے مقتدی کی نماز فاسد ہوجاتی ہے، اس لئے وہ عورتوں کی اقتدا کے لئے نیت امامت کی شرط کرتے ہیں۔ اگر امام نے

عورتوں کی امامت کی نیت نہ کی ہوگی اور کوئی عورت جماعت میں مرد کے پاس آکر نماز جماعت کی شرکت کرے گی تو مرد کی نماز باطل نہ ہوگی۔ امام مالک وشافعی کے نزدیک کسی کے لئے بھی شرط نہیں ہے۔ امام احمد فرض نماز کے لئے شرط کہتے ہیں نوافل کے لئے نہیں، مردوں عورتوں کی تفریق ان کے یہاں بھی نہیں ہے۔ (الابواب ص ۲/۲۷۰ و فتح الباری ص ۲/۱۳۲)

علامہ عینی نے لکھا کہ حدیث الباب میں صراحت تو نہیں ہے نفی یا اثبات نیت کی، لیکن حضور علیہ السلام کے فعل سے اثبات نکلتا ہے کہ آپ نے حضرت ابن عباسؓ کو اپنے داہنی طرف کرلیا۔ ہمارا (حنفیہ کا) مذہب یہ ہے کہ مردوں کے حق میں نیت امامت شرط نہیں ہے۔ عورتوں کے حق میں ہے کیونکہ عورت کی محاذاۃ سے مرد کی نماز فاسد ہونے کا احتمال ہے امام زفر، اور امالک وشافعی کے نزدیک عورتوں کے لئے بھی شرط نہیں ہے۔ امام ثوری اور ایک روایت امام احمدؒ سے یہ کہ اگر امام نے نیت نہ کی ہو تو مقتدی کو نماز لوٹانی پڑے گی، دوسری روایت یہ ہے کہ فرضوں کے لئے شرط ہے نوافل کیلئے نہیں۔ ابن القاسم سے بھی امام ابوحنیفہؒ کی موافقت منقول ہے (عمدہ ص ۲/۷۶۸)

آگے باب اذا کان بین الامام و القوم حائط (بخاری ص ۱۰۱) کی حدیث پر علامہ عینی نے لکھا کہ مہلب نے اس سے امام کی نیت کے بغیر بھی اقتدا کو جائز ثابت کیا ہے، کیونکہ لوگوں نے حضور علیہ السلام کے پیچھے اقتدا کی اور حضور کو خبر بھی نہ تھی تو امامت کی نیت بھی ظاہر ہے کہ نہ کی ہوگی، اور یہی قول امام مالک وشافعی کا ہے، امام ابوحنیفہؒ کا مذہب بھی یہی ہے، البتہ ہمارے اصحاب نے عورتوں کے حق میں نیت کو ضروری قرار دیا ہے۔ بجز امام زفر کے۔ (عمدہ ص ۲/۸۰۰)

بحث ونظر: امامت کی نیت مقتدی مردوں یا عورتوں کے لئے کس درجہ میں اہم ہے، اس کی طرف شارحین حدیث نے کم توجہ کی ہے اور فقہاء میں سے بھی حنفیہ نے زیادہ توجہ کی ہے، وجہ یہ کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک حدیث "خیر صفوف النساء آخرھا و شرھا اولھا" کی وجہ سے محاذاۃ عورت کی صورت میں مرد کی نماز صرف مکروہ ہوتی ہے، جبکہ حنفیہ (علاوہ زفر) کے نزدیک فاسد ہو جاتی ہے۔ حدیث مذکور کی روایت بجز امام بخاری کے دوسرے سب اصحاب صحاح نے کی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ محاذاۃ کا مسئلہ بھی حنفیہ کے نزدیک اتنا عام نہیں ہے جتنا علامہ عینی نے اوپر بتلایا ہے، کیونکہ اکثر فقہاء حنفیہ کے نزدیک جمعہ وعیدین میں امامت نسواں کی شرط نہیں ہے۔ اور بعض حنفیہ کی رائے یہ بھی ہے کہ اگر محاذاۃ کی صورت پیش نہ آئے تو دوسری نمازوں میں بھی شرط نہیں ہے (ردالمختار ص ۱/۶۰۲) لہٰذا اس کی شرطیت مطلقاً نہیں ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ شرطیت کا سبب مرد وعورت کا اپنے مقام متعین شرعی کو ترک کرنا ہے، اور تعیین مقام کے دلائل شرعیہ یہ ہیں (۱) و للرجال علیھن درجة اس سے معلوم ہوا کہ مردوں اور عورتوں کو اپنے اپنے درجات واقامت کی رعایت رکھنا ہر معاملہ میں ضروری ہے اور خاص طور سے نماز جماعت میں بھی۔ (۲) و لا تبطلوا اعمالکم لہٰذا نماز کو فساد یا کراہت سے بھی بچانا ضروری ہوا (۳) محدث رزین کی روایت ہے "اخروھن من حیث اخرھن اللہ" اس سے بھی علاوہ دیگر امور کے نماز کے اندر عورتوں کو مردوں سے پیچھے رہنا ضروری ہوا خصوصاً جبکہ اس سے نماز کی کراہت پر تو سب ہی متفق ہیں۔ (۴) امام اعظمؒ نے بحوالہ ہیثم وعکرمہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ حضور علیہ السلام نے جماعت پڑھائی، جس میں ایک مرد تھا جو آپ کے پیچھے کھڑا ہوا اور ایک عورت تھی وہ مرد کے پیچھے کھڑی ہوئی۔ (۵) نسائی میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ میں نے حضور علیہ السلام کے پہلو میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور حضرت عائشہؓ نے ہمارے پیچھے نماز پڑھی امام صاحب نے ان دونوں سے استدلال کیا کہ محاذاۃ (یعنی عورت کے مرد کے برابر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے) سے مرد کی نماز فاسد ہو جاتی ہے، ورنہ حضرت عائشہ سب کے پیچھے الگ اور تنہا کھڑی نہ ہوتیں کیونکہ جماعت کی نماز میں الگ اور تنہا کھڑا ہونا سب کے نزدیک مکروہ ہے امام احمد کے نزدیک تو مفسد صلوٰۃ ہے۔ (عقود الجواہر المنیفہ فی ادلۃ مذہب الامام ابی حنیفہ ص ۱/۷۵) (۶) بخاری

ومسلم میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے حضور علیہ السلام کی اقتدا کی تو آپ نے ان کو داہنی طرف کھڑا کرلیا۔ (۷) مشہور حدیث لیلینی منکم اولوا الاحلام والنھی سے بھی مؤکد ہوا کہ جماعت کی نماز میں مردوں کو امام کے قریب اور بچوں وعورتوں کو دور رہنا چاہئے۔ اور چونکہ یہ حکم اولاً مردوں کے لئے اور ثانیاً عورتوں کے لئے ہے، اس رعایت سے حنفیہ کے نزدیک عورت کی محاذاۃ سے مرد کی نماز فاسد ہوتی ہے، عورت کی نہیں اگرچہ گنہگار وہ بھی ہوگی۔ لیکن اسی کے ساتھ فقہاء حنفیہ نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر عورت مرد کے پاس جماعت میں آکر کھڑی ہوئی۔ یا سامنے آگئی اور مرد نے اس کو پیچھے کردیا یا خود آگے بڑھ گیا تو پھر اس مرد کی نماز فاسد نہ ہوگی، اور اگر عورت پھر بھی پیچھے نہ ہوئی تو خود اس کی نماز فاسد ہوگی، مرد کی نہ ہوگی۔

فقہاء حنفیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک عورت کے نماز جماعت میں غلط مقام میں کھڑے ہونے سے تین مردوں کی نمازیں فاسد ہوں گی۔ ایک دائیں طرف برابر والے کی، دوسرے بائیں جانب والے کی اور تیسرے اس کی جو ٹھیک اس کے پیچھے ہو، اور وہ اس کے آگے ہو۔ اس کے علاوہ دوسری شروط بھی فساد صلوٰۃ کی ہیں مثلاً (۱) وہ عورت مشتہاۃ ہو خواہ اس مرد کی اپنی بیوی ہی ہو۔ (۲) امام نے اس کی نیت کی ہو (۳) دونوں کی نماز ایک ہو (۴) دونوں اول رکعت سے جماعت میں شریک ہوں مسبوق ہونے کی صورت میں حکم فساد نہ ہوگا (۵) دونوں ایک مکان میں ہوں (۶) دونوں ایک جہت کی طرف نماز پڑھ رہی ہوں یعنی اگر بیت اللہ کے اندر الگ الگ جہت میں پڑھ رہے ہوں تو نماز فاسد نہ ہوگی (۷) دونوں میں کوئی حائل نہ ہو (۸) دونوں میں کچھ فاصلہ نہ ہو۔ (قوانین التشریع علی طریقۃ ابی حنفیۃ واصحابہ ص ۲/۱۱۵)

ہم نے کتاب مذکور سے کچھ تفصیل مذہب کی نقل کردی ہے، جو بہت اہم ونافع ہے، اس کے ساتھ مؤلف نے ص ۲/۱۱۷ میں شروط صحت اقتداء بھی درج کی ہیں، وہ بھی دیکھ لی جائیں، پہلی اہم شرط حنفیہ کے نزدیک عدم تقدم المقتدی علی الامام لکھی ہے۔ اور یہی قول امام احمد وشافعی کا بھی ہے۔ امام مالک واسحٰق کے نزدیک تقدم کی صورت میں نماز درست ہو جاتی ہے، اور یہ مسلک ان کا بہت عجیب ہے، اور مدینہ طیبہ میں ایام حج میں دیکھا گیا جب نمازیوں کی کثرت ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ مسجد نبوی کی دیوار قبلہ سے بھی آگے دور تک صفیں بنا کر امام کی اقتدا کرتے ہیں، شاید وہ اسی خیال سے جائز سمجھتے ہوں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ امام احمد امام شافعی وامام ابوحنیفہؒ تینوں اماموں کے مسلک کے متبعین کی نمازیں جماعت کے ساتھ اس طرح درست نہیں ہوتیں، اور چونکہ اقتدا صحیح نہ ہوتی، جس پر نماز کی بنا کی تھی، لہٰذا نماز ہی سرے سے صحیح نہ ہوگی۔ لہٰذا مالکیہ کے سوا کسی بھی دوسرے مسلک والے کو اس طرح نماز پڑھنی چاہئے۔ اور ضروری ہے کہ حکومت کی طرف سے بھی ایسے موقع پر اس مسئلہ کا اعلان کردیا جایا کرے تاکہ عام لوگوں اور ناواقفوں کی نمازیں خراب نہ ہوں، معلوم نہیں سلفی حضرات (غیر مقلدین) کا اجتہاد اس بارے میں کیا ہے؟۔

اہمیت تراجم ابواب البخاری

امام بخاری نے یہاں حدیث الباب سے قبل ترجمۃ الباب میں نیت امام کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے جو آپ کے فعل سے ثابت ہوئی اور غالباً اسی لئے آگے ص ۱۰۱ میں ''باب اذا کان بین الامام و بین القوم حائط'' کے تحت جو حدیث لائے ہیں اس سے عدم نیت ثابت نہیں کی، نہ اس پر نیت کا عنوان قائم کیا، لیکن عجیب بات ہے کہ صاحب اعلاء السنن نے ص ۴/۳۱۷ میں اسی حدیث پر عدم نیت کا عنوان قائم کیا ہے۔ اور امام بخاری کی حدیث الباب کا بھی ذکر نہیں کیا۔ چونکہ حضور علیہ السلام سے قولی صراحت نیت وعدم نیت کسی کی نہیں ہے اور جو کچھ استنباط کیا گیا ہے وہ آپ کی جماعت نوافل سے کیا گیا ہے شاید اسی لئے امام احمدؒ نے اس کو نوافل تک محدود رکھا اور فرائض میں نیت امام کو مردوں کے لئے بھی ضروری قرار دے دیا دوسرے ائمہ نے فرض ونفل کا کوئی فرق نہیں کیا، اور حنفیہ نے خاص صورتوں میں بوجوہ دلائل مذکورہ بالا عورتوں کے حق میں نیت امامت کو ضروری قرار دیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب اذاطول الامام وكان للرجل حاجة فخرج وصلى

اگرامام (نماز کو) طول دے اور کوئی شخص اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے (نماز توڑ کر) نکل جائے اور اپنی نماز پڑھ لے

۶۶۳: حدثنا مسلم قال حدثنا شعبة عن عمرو عن جابر بن عبدالله ان معاذ بن جبل كان يصلى مع النبى صلى الله عليه وسلم ثم يرجع فيوم قومه ح وحدثنى محمد بن بشار قال ثنا غندر قال ثنا شعبة عن عمرو قال سمعت جابر ابن عبدالله قال كان معاذ بن جبل يصلى مع النبى صلى الله عليه وسلم ثم يرجع فيؤم قومه فصلى العشآء فقرا بالبقرة فانصرف الرجل فكان معاذ ينال منه فبلغ النبى صلى الله عليه وسلم فقال فتان فتان فتان ثلث مرار او قال فاتنًا فاتنًا فاتنًا وامرة بسورتين من اوسط المفصل قال عمرو لااحفظهما

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ معاذ بن جبل نبی کریم ﷺ کے ساتھ (عشا) کی نماز پڑھتے اس کے بعد (گھر) واپس جاتے، تو اپنی قوم کی امامت کرتے (ایک مرتبہ) انھوں نے عشاء کی نماز پڑھائی تو سورہ بقرہ شروع کردی، ایک شخص چل دیا اس سبب سے معاذؓ کو اس سے رنج رہنے لگا۔ یہ خبر نبی کریم ﷺ کو پہنچی، تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا، کہ فتان، فتان، فتان یا فرمایا کہ فاتن، فاتن، فاتن اور آپ نے ان کو وسط مفصل کی دو سورتوں (کے پڑھنے) کا حکم دیا، عمرو (راوی حدیث) کہتے ہیں، کہ میں ان کو بھول گیا ہوں۔

تشریح: فتان کے معنی لوگوں کو فتنہ میں ڈالنے والا اور فاتن کے معنی بھی یہی ہیں (فرق صرف یہ ہے کہ فتان میں مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس باب اور حدیث کا تعلق بھی مسائل قدوہ سے ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک درست ہے کہ مقتدی حالت نماز میں ہی اقتدا کی نیت کرلے یا چاہے تو اقتدا ترک کر کے منفرد بن جائے، اور حدیث الباب کے واقعہ کو بھی اسی پر محمول کرتے ہیں کہ مقتدی نے حالت نماز میں ہی انفراد اختیار کرلیا تھا۔ حالانکہ مسلم کی حدیث میں صراحت ہے کہ اس نے سلام پھیر کر نماز ختم اور پھر اپنی الگ ایک گوشہ میں جاکر پڑھی۔ جس کی علامہ نووی نے تاویل کردی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک صرف نیت سے نماز ختم نہ ہوگی بلکہ اس کے لئے کوئی عمل مفسد صلوٰۃ کرنا ہوگا اور اس کو چاہیئے کہ سلام پھیر کر نماز ختم کردے، پھر دوسری نماز کی نیت کر کے شروع کرے۔

علامہ عینی نے لکھا:۔ ائمہ کا اس میں اختلاف ہے کہ امام کے ساتھ کچھ نماز پڑھ کر اس کو ترک کرسکتا ہے یا نہیں شافعیہ کے نزدیک اس اقتدا کو منقطع کر کے الگ اپنی نماز پوری کرسکتا ہے۔ امام بخاری بھی اسی طرف مائل ہیں۔ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں، امام احمدؒ سے دو روایتیں ہیں۔ (عمدہ ص ۲/۷۴۷) علامہ عینی نے اور حضرتؒ نے بھی اس موقع پر دوسرے افادات کئے ہیں جو طویل ہیں لہٰذا عمدہ اور فیض الباری میں دیکھ لئے جائیں۔

باب تخفیف الامام فی القیام واتمام الرکوع والسجود

(قیام میں امام کے تخفیف کرنے اور رکوع وسجود کے پورا کرنے کا بیان)

۶۶۴: حدثنا احمد بن يونس قال ثنا زهير قال ثنا اسمٰعيل قال سمعت قيساً قال اخبرنى ابومسعود ان رجلاً قال والله يارسول الله انى لاتاخر عن صلوٰة الغداة من اجل فلان مما يطيل بنا فمارايت رسول الله صلى الله عليه وسلم فى موعظة اشد غضباً منه يومئذ ثم قال ان منكم منفرين فايكم ماصلىٰ بالناس فليتجوز فان فيهم الضعيف والكبير وذاالحاجة

ترجمہ: حضرت ابومسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا، یارسول اللہ خدا کی قسم! میں صبح کی نماز سے صرف فلاں شخص کے باعث رہ جاتا ہوں کیونکہ وہ نماز میں طول دیتا ہے، پس میں نے رسول خدا ﷺ کو کبھی نصیحت (کے وقت) اس دن سے زیادہ غضب ناک نہیں دیکھا، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ تم میں کچھ لوگ (آدمیوں کو عبادت سے) نفرت دلاتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص تم میں سے لوگوں کو نماز پڑھائے تو اس کو ہلکی نماز پڑھانا چاہیئے، کیونکہ مقتدیوں میں ضعیف اور بوڑھے اور صاحب حاجت (سب ہی قسم کے لوگ) ہوتے ہیں۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جو کچھ تخفیف کی جائے وہ قیام میں ہے کہ قراءت مختصر ہو باقی رہا رکوع و سجود کو پوری طرح سے ادا کرنا چاہیے، ان میں قدر مستحب و مسنون سے کم نہ کرے۔ نہ تعدیل ارکان میں کمی کرے۔ فقہ کی کتاب بحر میں تردد کیا ہے کہ جو شخص کھڑے ہو کر مختصر نماز بلا جماعت کے پڑھ سکے اور جماعت کے ساتھ بیٹھ کر تو کون سی افضل ہے، میرے نزدیک دوسری افضل ہے کیونکہ ابوداؤد میں حدیث ہے کہ بیماروں کو حضور علیہ السلام کے زمانہ میں مساجد کی نماز کے لئے لایا جاتا تھا۔

باب اذا صلے نفسه فليطول ماشاء

(جب کوئی شخص (تنہا) نماز پڑھے تو جس قدر چاہے طول دے)

۶۶۵: حدثنا عبدالله بن يوسف قال انا مالك عن ابى الزناد عن الاعرج عن ابى هريرة ان رسول الله صلے الله عليه وسلم قال اذا صلے احدكم للناس فليخفف فان فيهم الضعيف والسقيم والكبير واذا صلے احدكم لنفسه فليطول ماشآء

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو اسے تخفیف کرنا چاہیئے کیونکہ مقتدیوں میں کمزور اور بیمار اور بوڑھے (سب ہی) ہوتے ہیں۔ اور جب تم میں سے کوئی اپنی نماز پڑھے تو جس قدر چاہے طول دے۔

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنی الگ نماز فرض یا نفل کو جتنا چاہے طول دے سکتا ہے، لیکن جب امام ہو کر نماز پڑھائے تو مقتدیوں کی رعایت کرے، کیونکہ ان میں کمزور، بوڑھے اور بیمار ضرورت مند سب ہی ہوتے ہیں۔ اسی لئے چاہیئے کہ امام قراءت کو بھی طویل نہ کرے اور رکوع و سجدہ میں تسبیحات بھی مسنون تین بار سے زیادہ نہ کہے، اور یہی وجہ ہے کہ نماز تراویح میں تین رات سے کم میں قرآن مجید ختم کرنے کو فقہاء نے مکروہ قرار دیا ہے کہ مقتدیوں پر شاق ہوگا۔

اور جتنا قرآن مجید ایک رات میں پڑھنا ہو اس کو بھی بیس رکعات پر مساوی تقسیم کر دے ایسا نہ کرے کہ مثلاً دس پارے پڑھنے ہیں تو پہلی رکعت میں ۸۔۹ پارے مثلاً پڑھ دے کہ یہ بھی ضعیف مقتدیوں پر گراں ہوگا۔

عام طور سے حفاظ ان امور کی رعایت نہیں کرتے حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے نماز جماعت میں ایسی رعایتوں کی خاص طور سے ہدایت فرمائی ہے جیسا کہ اگلی احادیث سے بھی واضح ہوگا۔

باب من شکیٰ امامہٗ اذا طول وقال ابو اسید طولت بنایا بنی

جو شخص اپنے امام کی جب وہ نماز میں طوالت کرتا ہو،اور ابواسید نے (اپنے بیٹے سے ایک مرتبہ) کہا کہ بیٹے تو نے ہماری نماز کو طویل کر دیا

۶۶۶: حدثنا محمد بن یوسف قال ثنا سفین عن اسمٰعیل بن ابی خالد عن قیس بن ابی حازم عن ابی مسعود قال قال رجل یارسول اللہ انی لاتاخر عن الصلوٰۃ فی الفجر مما یطیل بنافلان فیھا فغضب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مارایتہ غضب فی مواعظۃ کان اشد غضباً منہ یومئذ ثم قال یآیھاالناس ان منکم منفرین فمن ام منکم الناس فلیتجوز فان خلفہ الضعیف والکبیر وذاالحاجۃ

۶۶۷: حدثنا ادم بن ابی ایاس قال ثنا شعبۃ قال ثنا محارب بن دثار قال سمعت جابر بن عبداللہ الانصاری قال اقبل رجل بنا ضحین وقد جنح اللیل فوافق معاذاً یصلی فبرک ناضحیہ واقبل الیٰ معاذ فقرأ سورۃ البقرۃ اوالنساء فانطلق الرجل وبلغہ' ان معاذاً قال منہ فاتی النبی صلے اللہ علیہ وسلم فشکاالیہ معاذاً فقال النبی صلے اللہ علیہ وسلم یامعاذ افتان انت اوقال افاتن انت ثلاث مرات فلولاصلیت بسبح اسم ربک الاعلیٰ والشمس وضحٰھا واللیل اذایغشیٰ فانہ' یصلی ورآءک الکبیرواضعیف وذوالحاجۃ احسب ھٰذا فی الحدیث وتابعہ' سعید بن مسروق و مسعروالشیبانی وقال عمرو عبیداللہ بن مقسم وابوالزبیر عن جابر قرأ معاذ فی العشآء بالبقرۃ وتابعہ الاعمش عن محارب

ترجمہ۶۶۶: حضرت ابومسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) ایک شخص نے (آکر کہا، کہ یارسول اللہ ﷺ) میں نماز فجر سے رہ جاتا ہوں، کیونکہ نماز میں فلاں شخص طول دیتا ہے پس رسول خدا ﷺ غضب ناک ہوئے کہ میں نے آپ کو اس دن سے زیادہ غصہ آتے ہوئے کسی نصیحت کے وقت نہیں دیکھا، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ لوگو! تم میں سے کچھ لوگ (آدمیوں کو) عبادت سے متنفر کرتے ہیں۔تو جو شخص لوگوں کا امام بنے، اس کو تخفیف کرنا چاہئے کیونکہ اس کے پیچھے کمزور اور بوڑھے اور صاحب حاجت (سب ہی) ہوتے ہیں۔

ترجمہ۶۶۷: حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص پانی سینچائی والے دو اونٹ لا رہا تھا رات کا اول وقت تھا، اس نے جو معاذ کو نماز پڑھتے پایا تو اپنے دونوں اونٹوں کو بٹھلا دیا اور معاذ کی طرف متوجہ ہوا، معاذ نے سورۂ بقرہ یا سورۂ نساء پڑھنا شروع کی، تو وہ شخص (نیت توڑ کر) چلا گیا پھر اس کو یہ خبر پہنچی کہ معاذ اس سے رنجیدہ ہیں، لہٰذا وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، اور آپ سے معاذ کی شکایت کی، تو نبی ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا، کہ اے معاذ! کیا تو فتنہ (برپا) کرنے والا ہے (اگر ایسا نہیں ہے) تو تو نے سبح اسم ربک الا علی اورو الشمس وضحھا اورو اللیلی اذا یغشی کے ساتھ نماز کیوں نہ پڑھائی، کیونکہ تیرے پیچھے بوڑھے اور کمزور، اور صاحب حاجت (سب ہی طرح کے لوگ) نماز پڑھتے ہیں، اور عمرو اور عبیداللہ بن مقسم اور ابوالزبیر نے جابر سے روایت کی ہے کہ معاذ نے عشاء میں سورۂ بقرہ پڑھی تھی اور اعمش نے محارب سے اس کی متابعت کی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ احادیث الباب سے ثابت ہوا کہ بوقت ضرورت کسی خالص امر خیر کے بارے میں بھی شکایت و شکوہ کرنا جائز ہے، جس طرح یہاں کہ نماز اور اس کے تمام ہی ارکان خیر محض ہیں اور ان میں جتنی بھی زیادتی ہو سکے وہ خیر ہی ہونی چاہئے، مگر جب لوگوں پر وہ زیادتی شاق ہونے لگے تو اس کے لئے بھی گلا و شکوہ کرنے کی اجازت دی گئی۔

پھر فرمایا کہ امام بخاریؒ کی یہ خاص منقبت دقیقہ رسی کی ہے کہ شکوے کا باب قائم کر کے متنبہ فرمادیا، ورنہ عام طور سے یہ خلجان ہی رہتا کہ نماز ایسی عظیم وجلیل عبادت کے کسی رکن کی زیادتی وطوالت کسی مومن مخلص کے لئے وجہ گرانی وشکایت کیوں ہو، اب شارع علیہ السلام کی اجازت ملنے پر وہ خلجان باقی نہ رہا اور امام بخاری کی تنبیہ مذکور کی بڑی اہمیت ظاہر ہوئی۔

امام موصوف نے اسی طرح دوسری جگہ بھی تنبیہ فرمائی ہیں، جہاں دوسرے سے قرآن مجید سننے کی فضیلت آئے گی اور وہاں تلاوت کرنے والے کو تلاوت سے روک دینے کا جواز واضح ہوگا۔ چنانچہ

(۱) تفسیر سورۂ نساء میں امام بخاریؒ "**باب قوله فكيف اذا جئنا من كل امة بشهيد و جئنا بك على هؤلاء شهيدا**" میں آئے گا کہ حضور علیہ السلام نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ارشاد کیا کہ کچھ قرآن مجید سناؤ، انھوں نے سورۂ نساء سنائی اور جب وہ آیت مذکورہ پر پہنچے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ بس اب رک جاؤ اور دیکھا گیا کہ حضور علیہ السلام اس وقت زار وقطار رو رہے تھے اور شاید یہ فرط گریہ ہی روکنے کا سبب بنا ہوگا۔ واللہ اعلم۔ (بخاری ص ۶۵۹)

(۲) **باب من احب ان يسمع القرآن من غيره** میں بھی حدیث لائے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے فرمایا کہ قرآن مجید کی تلاوت کرو، عرض کیا، کیا میں حضور کے سامنے قراءت کروں جبکہ وہ آپ ہی پر نازل ہوا ہے؟ فرمایا ہاں! میرا دل چاہتا ہے کہ دوسرے سے سنوں، تب انھوں نے تعمیل ارشاد کی اور آیت مذکورہ پر پہنچے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا بس اب بس کرو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں، میں نے حضور علیہ السلام کی طرف دیکھا تو آپ رو رہے تھے (بخاری ص ۷۵۵) (۳) **باب البكاء عند قراءة القرآن** قائم کر کے امام بخاری اسی حدیث مذکور کو پھر سے لائے ہیں۔ (بخاری ص ۷۵۶) اس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ کوئی امر کیسا ہی بڑا خیر کا ہو اور اس کو روکنے میں کتنی ہی نفس پر گرانی ہو۔ مگر کسی صحیح ضرورت وسبب کے تحت اس کو بھی روک سکتے ہیں۔

افادۂ انور: حضرتؒ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ حدیث الباب کے رجال روایت میں حضرت قیس بن ابی حازم بھی ہیں، امام احمدؒ نے فرمایا کہ قیس بن ابی حازم اور ابوعثمان مہدی سے زیادہ افضل تابعی میرے علم میں نہیں ہیں۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ تابعین میں سے قیس کے سوا کسی نے عشرہ مبشرہ کی زیارت نہیں کی۔ صرف وہی ایک سب سے بڑے خوش قسمت تابعی تھے اور یہی قیس ترک رفع یدین کی روایت کرتے تھے، جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ تو اگر ترک رفع معدوم محض ہوتا یا زاویہ خمول میں ہوتا جیسا کہ قائلین رفع یدین دعوے کرتے ہیں تو اس کو ایسی عظیم وجلیل شخصیت کیسے اختیار کر سکتی تھی، جس نے اجلہ صحابہ اور ان کے عمل کو دیکھا ہو۔ لہٰذا میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ ترک رفع کی نفی محض قیامت تک بھی ثابت نہیں کی جاسکتی اگر چہ وہ لوگ کتنی بھی طاقت وقوت صرف کرلیں کیونکہ وہ بھی نبی اکرم ﷺ کی سنت ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا، ہماری طرف سے ان لوگوں کی طرح یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ رفع یدین سنت نہیں ہے، یا وہ زاویہ خمول میں ہے، کیونکہ ہم تو دونوں کو سنت نبویہ مانتے ہیں اور اختلاف صرف افضلیت کا ہے۔ یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ مخالفین حنفیہ کا یہ جذبہ اور خواہش صحیح نہیں کہ ان کے سوا دوسروں کو جنت میں جگہ نہ ملے۔

حضرتؒ کا اشارہ امام بخاری وغیرہ کی طرف ہے، جنھوں نے اختلافی مسائل میں حنفیہ کے خلاف نہایت سخت اور غیر موزوں رویہ اختیار کیا ہے۔ ہم نے مقدمہ انوار الباری جلد دوم ہی میں تالیفات حضرت امام بخاریؒ کے ذکر میں امام بخاریؒ کے رسالہ "جزء رفع الیدین" کا بھی تعارف کرایا تھا، اس میں امام بخاریؒ نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے بارے میں جیسے نامناسب کلمات استعمال کئے ہیں، ان کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے۔ خاص طور سے جبکہ امام اعظمؒ ان کے بالواسطہ استاذ بھی ہیں۔ یہاں چونکہ حضرت شاہ صاحبؒ نے مصنف ابن ابی شیبہ کا

حوالہ دیا ہے اس لئے اس امر کا ذکر مناسب ہوگا کہ صاحب مصنف مذکور بھی امام بخاریؒ کے کبار اساتذۂ حدیث میں سے ہیں۔ اور انھوں نے یہ التزام کیا ہے کہ اپنی تالیف مذکور میں احادیث مرفوعہ کے ساتھ صحابہ و تابعین کے آثار بھی ذکر کرتے ہیں، اور اگر کسی مسئلہ میں دو قسم کی روایات ہوں تو ابواب بھی دو قسم کے باندھتے ہیں۔ مثلاً اس موقع پر "باب من كان يرفع يديه اذا افتتح الصلوة" قائم کیا تو پھر دوسرا باب لائے "من كان يرفع يديه في اول تكبيرة ثم لا يعود" اور مرفوع حدیث کے بعد، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت اسود، حضرت علقمہ، حضرت ابن عباس اور افضل التابعین حضرت قیس بن ابی حازم (جن کا حوالہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اوپر دیا ہے) سب سے عدم رفع نقل کیا ہے۔ نیز حضرت علی و حضرت ابن مسعود کے اصحاب کا بھی یہی عمل نقل کیا کہ وہ صرف تکبیر اولی پر رفع یدین کرتے تھے اس کے بعد رکوع وغیرہ کے وقت نہ کرتے تھے۔

راقم الحروف کا خیال یہ بھی ہے کہ حضرت ابن ابی شیبہؒ چونکہ دونوں جانب کی احادیث و آثار صحابہ و تابعین پیش کرتے ہیں اور ان پر ترجمۃ الباب بھی قائم کرتے ہیں۔ اور ایسا ہی محدث عبدالرزاقؒ نے بھی اپنے مصنف میں کیا ہے، اسی لئے امام بخاریؒ ان دونوں کے اس طریقہ سے خوش نہیں معلوم ہوتے، کیونکہ وہ تو صرف اپنے ہی طریقہ کو زیادہ پسند کرتے ہوں گے کہ صرف ایک جانب کو لیں اور دوسری جانب کو بالکلیہ حذف کر دیں۔ اور شاید حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے رسالہ "شرح تراجم ابواب صحیح البخاری" کے مقدمہ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: بسا اوقات امام بخاری کسی امر ظاہر قلیل النفع کے لئے عنوان و ترجمۃ الباب قائم کرتے ہیں، لیکن تامل کے بعد اس کا نفع معلوم ہوتا ہے، مثلاً باب قول الرجل ما صلينا لائے، جو بظاہر کوئی خاص و نفع بخش بات نہیں ہے، مگر وہ اس طرف اشارہ کر گئے، کہ ایک جماعت جو ما صلینا (ہم نے نماز نہیں پڑھی) کہنے کو برا جانتی ہے اس کے خیال کی اصلاح مدنظر ہے لہٰذا ان کا رد کیا گیا، اور امام بخاری کے اکثر تراجم ابواب میں مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق کے تراجم ابواب پر رد و قدح بھی ہے، کیونکہ ان کے تراجم ابواب میں آثار و شواہد سے استدلال کیا گیا ہے۔ ان کو امام بخاری نے رد کیا ہے۔ اس امر کو وہی سمجھ سکے گا، جو بخاری کے ساتھ ان دونوں حضرات کے مصنفوں کا بھی مطالعہ کرے گا۔

لمحہ فکریہ: امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ رفع یدین میں دو جگہ یہ دعوٰے کیا کہ اصحاب نبی اکرم ﷺ میں سے کسی ایک سے بھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ اس نے رفع یدین نہیں کیا۔ اور ان کے برخلاف محدث ابن ابی شیبہ نے مستقل باب عدم رفع یدین کا قائم کر کے نہ صرف متعدد اصحاب نبی اکرم ﷺ سے ان کے عدم رفع کا ثبوت پیش کر دیا، بلکہ مرفوع حدیث بھی عدم رفع کی پیش کر دی، خدا کا شکر ہے امت مسلمہ اور خاص طور سے حنفیہ کی یہ تمنا پوری ہوئی کہ مصنف عبدالرزاق منصۂ شہود پر آ گئی مجلس علمی ڈابھیل و کراچی نے اس کو مکمل شائع کر دیا ہے، اور مصنف ابن ابی شیبہ بھی حیدرآباد میں چھپ رہی ہے۔ سر دست پانچ جلدیں اس کی شائع شدہ ہیں، ان دونوں کو سامنے رکھ کر تراجم ابواب بخاری کا تراجم مصنفین مذکورین سے مقابلہ کریں اور امام بخاری کی مجرد صحیح کے ساتھ احادیث مصنفین کا مطالعہ مع شواہد و آثار صحابہ و تابعین کریں گے تو فقہ البخاری اور فقہ حنفی دونوں اپنے صحیح خد و خال میں رونما ہو جائیں گے۔ مطبوعہ مصنف ابن ابی شیبہ میں باب من كان يرفع يديه في اول تكبيرة ثم لا يعود جلد اول کے ص ۲۲۶ و ص ۲۳۷ پر ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت رفع یدین بھی محدث ابن ابی شیبہؒ نے نقل کی لیکن پھر خود ان کا ہی اپنا معمول عدم رفع کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو ان کی روایت کے مرجوح ہونے پر دال ہے۔ رفع یدین کی بحث اپنے موقع پر مفصل آئے گی۔ ان شاء اللہ

فقہ بخاری یا اجتہاد: امام بخاریؒ بلند پایہ محدث ہونے کے ساتھ بھی، اور اگرچہ وہ حضرت سفیان ثوری یا امام اوزاعی کی طرح صاحب مذہب مجتہد نہ تھے، اور اسی لئے ان کا مذہب مدون نہ ہوا بلکہ ان کے تلمیذ خاص امام ترمذی وغیرہ کسی نے بھی ان کے اقوال کو بطور صاحب مذہب کے نقل نہیں کیا، اسی طرح وہ مجتہد مطلق بھی نہ تھے۔ اسی لئے جلیل القدر محتاط اکابر امت میں سے کسی نے بھی ان کو مجتہد مطلق نہیں کہا۔ ہمارے

حضرت شاہ صاحبؒ بھی یہی فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاری مجتہد مطلق نہ تھے، البتہ ایک درجہ کا تفقہ و اجتہاد ان کو حاصل تھا، جس کی وجہ سے وہ تقلید کے محتاج نہ تھے۔ یہ بھی فرمایا کہ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے استنباط و اجتہاد میں بہت توسع کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ امام بخاری نے بھی کیا کم کیا ہے کہ نصوص کے اشارات وعموم تک سے بھی مسائل نکالے ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے مقدمہ فتح الباری میں ضمن حالات امام بخاریؒ ان کے مجتہد ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا، صرف حدیث وفقہ میں مثل امام مالک نقل کیا ہے۔

ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت شیخ الہندؒ سے یہ مقولہ بھی نقل ہوا ہے کہ امام بخاری مجتہد تھے۔ مگر ان کے اجتہاد میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ وہ مجتہد مطلق مثل ائمۂ مجتہدین (امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ وغیرہ) نہ تھے، علامہ شیرازیؒ نے تو ان کو'' طبقات الفقہاء'' میں بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ بظاہر ان کے رتبہ سے کم معلوم ہوتی ہے۔ محترم مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی عم فیضہم نے حاشیۂ دراسات اللبیب ص ۳۰۱/ ۳۰۷ میں امام بخاریؒ کے تفقہ پر تاریخی اعتبار سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ بھی دیکھی جائے۔

ہم نے گذشتہ صفحات میں کسی مناسبت سے ظاہر یہ اور اصحاب ظواہر کا تذکرہ کیا تھا۔ وہاں بھی امام بخاریؒ کا ذکر ہوا ہے پھر دیکھا کہ شیخ معین سندی نے بھی دراسات اللبیب ص ۳۰۰ میں امام بخاریؒ کو اصحاب الظواہر میں شمار کیا ہے۔ اور ہم نے حافظ ابن تیمیہ کو بھی اصحاب الظواہر میں لکھا تھا پھر دیکھا کہ حضرت شیخ الہندؒ نے بھی تذییل ایضاح الادلہ ص ۷ میں داؤد ظاہری وعلامہ شوکانی وغیرہ کے ساتھ علامہ ابن تیمیہ وابن قیم وغیرہ کا'' عاملین علی الظاہر'' کے زمرہ میں گنایا ہے۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنویؒ نے بھی علامہ ابن تیمیہ کو اہل الظاہر میں سے قرار دیا ہے۔

(حاشیہ موطاء امام محمد ص ۱۲۷/ ۱۲۹) واللہ تعالیٰ اعلم

مدارج اجتہاد: ہمارے نزدیک علوم نبوت کے بکل معنی الکلمہ صحیح حامل ومحافظ ہر نبی ورسول کے جانشین وہ صحابہ رہے ہیں جو درجہ اجتہاد پر فائز تھے اور آخر میں خاتم النبیین ﷺ کے علوم وکمالات کے حامل ومحافظ بھی آپ کے ایسے ہی فقہاء ومجتہدین صحابہ تھے اور ان کے بعد ان کے جانشین اکابر مجتہدین امت محمد یہ نے اس منصب کو سنبھالا ہے، اور ان ہی کی جلیل القدر علمی خدمات کے صدقہ میں اس دین کا کامل تحفظ قیام قیامت تک باقی رہے گا۔ دور رسالت وصحابہ کے بعد سب سے بڑے مجتہد مطلق وکامل ہمارے سامنے امام اعظم ابوحنیفہؒ آتے ہیں، جن کے اجتہادی کمالات وتفوق کی شہادت خود ان کے ہم عصر مجتہد وامام حدیث مالکؒ نے دی اور برسوں ان کے علوم سے استفادہ فرمایا، ان کے بعد تیسرے مجتہد اعظم امام شافعیؒ نے بھی ان کی اعلیٰ اجتہادی شان کا بھرپور اعتراف کیا، اور ان کے تلمیذ امام محمدؒ سے استفادات کئے، پھر چوتھے درجہ کے مجتہد معظم امام احمدؒ نے بھی ان کے تلمیذ امام ابویوسفؒ سے استفادہ فرما کر اجتہادی بصیرت میں کمال حاصل کیا۔ تفسیر وحدیث، فقہ واصول فقہ اور علم اصول وعقائد کی جو کچھ خدمات اب تک کی گئیں اور آئندہ ہوں گی وہ سب ان ہی چاروں اکابر مجتہدین کے فیضان علمی کا کرشمہ ہیں۔ اور ہمارا یقین ہے کہ مجموعی اعتبار سے ان حضرات کے جادۂ اعتدال سے جو بھی جتنا ہٹ گیا وہ اتنا ہی محرومی کا شکار ہوا۔

یہ بھی ایک دنیاوی فتنہ ہے کہ بڑے لوگوں پر حسد کرنے والے بھی بڑے ہو جاتے ہیں، امام اعظم کے حاسدین ومعاندین بھی کم نہ تھے، چنانچہ اسی دور کے امام حدیث وفقہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ (جن کو امام بخاری نے بھی اعلم اہل زمانہ کہا اور سب ہی موافق ومخالف ان کی جلالت قدر کے معترف تھے) لوگوں کے اعتراضات سے تنگ آ کر فرمادیا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے مت کہو، کیونکہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہی تو حدیث نبوی کا منشا ومقصد ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سب سے بڑا اعتراض جو امام صاحب پر تھا وہ ان کے صاحب قیاس ورائے ہونے کا تھا، اور اس کی بڑی وجہ آپ کے مدارک اجتہاد سے ناواقفی اور آپ کے دقیق استنباطات تک نارسائی تھی۔ پھر اس کے ساتھ کچھ لوگوں کا غلط پروپیگنڈہ بھی تھا،

جس سے بڑے حضرات بھی متاثر ہو گئے تھے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ درس بخاری میں بڑے افسوس کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاری وحمیدی ہمیشہ امام صاحب کے مثالب ہی بیان کرتے ہیں حالانکہ ان کو مناقب بھی پہنچے ہیں اور مثالب بھی اور متعدد سے نہیں بلکہ ایک ایک شخص سے بھی ہر دو قسم کے اوصاف پہنچے ہیں مگر انھوں نے اپنار حجان مثالب ہی کی طرف رکھا۔ ایک روز فرمایا کہ ابوداؤد امام ابوحنیفہؒ کی دل بھر کر تعظیم کرتے ہیں، ترمذی نہ تحقیر کرتے ہیں نہ تعظیم، بخاری بہت زیادہ مخالف ہیں، اپنی حدیثیں لاتے ہیں امام صاحب کی موافقت والی احادیث بھی نہیں لاتے، ایک دفعہ فرمایا کہ نعیم بخاری کا راوی ہے جو امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں جھوٹی باتیں گھڑ کر برائیاں بیان کیا کرتا تھا، پھر فرمایا ع عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو کے طور پر کہتا ہوں کہ یہ نعیم ترک رفع یدین کے روایت کرنے والوں میں بھی ہیں، اور اسی وجہ سے شافعیہ نے ان کو گرایا ہے، میں نے کہا جو کچھ بھی ہو مگر وہ ہے تو بخاری کا راوی۔ اس کو کہاں تک گراؤ گے؟۔

اس زمانہ کا ایک فتنہ یہ بھی ہے کہ علماء امت پر اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کا طعنہ دیا جاتا ہے اور ہمارے اہل حدیث بھائی تو بڑی طویل فہرست مجتہدین کی پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن کیا واقعی طور پر ان تمام مجتہدین کو ملا کر بھی چاروں ائمہ مجتہدین میں سے کسی ایک کے بھی برابر کیا جا سکتا ہے؟ کلاثم کلا۔ البتہ تھوڑی بہت استنباطی واجتہادی شان کے ضرور اکابر امت میں تھے اور آئندہ بھی ہوں گے، ان کو بھی مجتہد کہہ لیجئے، مگر وہ ''مجتہد مطلق'' والی نرالی شان کہاں؟!

باب الایجاز فی الصلوٰۃ واکمالها

(نماز کو مختصر اور پورے طور پر پڑھنے کا بیان)

۶۶۸: حدثنا ابومعمر قال حدثنا عبدالوارث قال حدثنا عبدالعزیز عن انس بن مالک قال کان النبی صلے الله علیه وسلم یوجز الصلوٰۃ ویکملها.

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز مختصر اور پوری پڑھتے تھے۔

تشریح: امام بخاریؒ نے یہ ثابت کیا کہ ایجاز واکمال دونوں کا اجتماع ایک نماز میں ہو سکتا ہے اور چونکہ ایسا کرنا حضور علیہ السلام کے فعل سے بھی ثابت ہے، اس لئے یہ مستحب بھی قرار پایا کہ نماز کو طول بھی نہ دے اور ارکان میں نقص بھی نہ آنے دے۔ آگے حدیث آنے والی ہے حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی امام کے پیچھے حضور علیہ السلام کے سوا آپ سے زیادہ ہلکی اور مختصر نماز نہیں پڑھی اور نہ حضور علیہ السلام سے زیادہ کامل ومکمل نماز کسی کے پیچھے پڑھی۔

باب من اخف الصلوٰۃ عند بکآء الصبی

(اس شخص کا بیان جو بچے کے رونے کی آواز سن کر نماز کو مختصر کر دے)

۶۶۹: حدثنا ابراهیم بن موسیٰ قال حدثنا الولید بن مسلم قال حدثنا الاوزاعی عن یحیی بن ابی کثیر عن عبدالله بن ابی قتادة عن ابیه ابی قتادة عن النبی صلے الله علیه وسلم قال انی لاقوم فی الصلوٰۃ ارید ان اطول فیها فاسمع بکآء الصبی فاتجوز فی صلاتی کراهیة ان اشق علیٰ امه تابعه' بشر بن بکر وبقیة و ابن المبارک عن الاوزاعی

۶۷۰: حدثنا خالد بن مخلد قال حدثنا سلیمان ابن بلال قال حدثنا شریک ابن عبداللہ قال سمعت انس بن مالک یقول ماصلیت ورآء امام قط اخف صلوٰۃ ولآاتم من النبی صلے اللہ علیہ وسلم و ان کان لیسمع بکآء الصبی فیخفف مخافتہ ان تفتن امہ'

ترجمہ ۶۶۹: حضرت ابوقتادہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ اس میں طول دوں، لیکن بچہ کے رونے کی آواز سن کر میں اپنی نماز میں اختصار کر دیتا ہوں، اس امر کو برا سمجھ کر کہ میں اس کی ماں کی تکلیف کا باعث ہو جاؤں۔ بشر بن بکر، بقیہ اور ابن مبارک نے اوزاعی سے اس کے متابع حدیث روایت کی ہے۔

ترجمہ ۶۷۰: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے کسی امام کے پیچھے نبی کریم ﷺ سے زیادہ ہلکی اور کامل نماز نہیں پڑھی۔ اور بے شک آپ بچہ کا گریہ سن کر اس خوف سے کہ اس کی ماں پریشان ہو جائے گی، نماز کو ہلکا کر دیتے تھے۔

تشریح: احادیث الباب سے معلوم ہوا کہ امام لمبی نماز پڑھانے کا ارادہ کرنے کے بعد نماز کے دوران میں کسی کی وجہ سے تخفیف کر دے یا شروع سے ہی ہلکی نماز پڑھانے کا ارادہ کرے تو دونوں باتوں کی شرعاً اجازت ہے پھر شافعیہ کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اختصار مذکور کی طرح امام کو تطویل کا بھی اختیار ہے، یعنی کسی کی وجہ سے نماز کو طویل کر دے تو یہ بھی جائز ہے مگر حنفیہ دونوں میں فرق کرتے ہیں، یعنی کسی کی وجہ سے مثلاً رکوع میں طوالت کر دے تو یہ مکروہ ہے، کیونکہ اس طرح عبادت میں زیادتی غیر اللہ کے لئے ہوگی۔ جبکہ عبادت کا کچھ حصہ بھی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں ہے اور امام محمدؒ سے تو یہ بھی نقل ہوا کہ وہ اس پر کفر کا خطرہ بتلاتے تھے۔ تاہم ان کی مراد اس سے کفر عقیدہ نہ ہوگا بلکہ کفر نعمت جیسا مرتبہ ہوگا۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے دل کو تو یہ بات لگتی ہے کہ تطویل کی ممانعت دنیاداری ذی وجاہت لوگوں کے حق میں ہوگی کہ اس میں شرک کا شائبہ ہوسکتا ہے۔ ضرورت مند اور اہل علم وفضل کے لئے نہ ہوگی، اور اختصار کی سابق صورت تو اس لئے بھی باقی نہ رہی کہ فساد زمانہ کے سبب عورتوں کا مساجد کی نماز جماعت میں شامل ہونا ہی ممنوع ہو گیا ہے۔ اور فقہا نے رکوع کی تطویل کو اس رعایت کے لئے جائز قرار دیا ہے کہ لوگ رکوع میں شامل ہو کر رکعت پالیں، بشرطیکہ وہ لوگ امام کے دوست ورفقاء نہ ہوں یا وہ رکوع میں آکر شریک ہونے والوں کو نہ پہچانتا ہو۔ اور بعض فقہاء نے اس کے ساتھ یہ قید بھی لگائی ہے کہ پہلے سے شرکاء نماز کو امام کے تطویل رکوع سے تکلیف بھی نہ ہو۔ کیونکہ ان کا حق بعد میں آنے والوں سے زیادہ ہے اس سے زیادہ تفصیل لامع الدراری ص ۲۷۲/۱ میں دیکھی جائے۔

فیض الباری ص ۲/۲۳۳ قولہ وعن محمد الخ سہوناسخ ہے۔ کیونکہ یہ بخاری کا مقولہ نہیں ہے، بلکہ کتب فقہ سے نقل کیا گیا ہے۔

۶۷۱: حدثنا علی بن عبداللہ قال حدثنا یزید بن زریع قال حدثنا سعید قال حدثنا قتادۃ ان انس بن مالک حدثہ' ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال انی لادخل فی الصلوٰۃ وانا ارید اطالتھا فاسمع بکآء الصبی فاتجوز فی صلوتی مما اعلم من شدۃ وجدامہ من بکآئہ

۶۷۲: حدثنا محمد بن بشار قال انا ابن عدی عن سعید عن قتادۃ عن انس بن مالک عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم انی لادخل فی الصلوٰۃ فارید اطالتھا فاسمع بکآء الصبی فاتجوز مما اعلم من شدۃ وجد امہ من بکآئہ وقال موسیٰ حدثنا ابان قال حدثنا قتادۃ قال نا انس عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم مثلہ

ترجمہ ۶۷۱: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں (جب) نماز شروع کرتا ہوں تو اس کو طول دینا چاہتا ہوں مگر بچہ کا رونا سن کے اپنی نماز میں تخفیف کر دیتا ہوں، کیونکہ میں اس کے رونے سے اس کی ماں کی سخت پریشانی کو محسوس کرتا ہوں۔

ترجمہ ۶۷۲: حضرت انس بن مالکؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، میں نماز شروع کرتا ہوں۔ تو اس کو طول دینا

چاہتا ہوں، مگر بچہ کے رونے کی آواز سن کر مختصر کر دیتا ہوں کیونکہ اس کے رونے سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس کی ماں سخت پریشان ہو جائے گی، اور موسی نے کہا کہ ہم سے ابان نے بہ سند قتادہ عن انسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا۔

باب اذا صلی ثم ام قوماً

(جب خود نماز پڑھ چکا ہو اس کے بعد لوگوں کی امامت کرے)

۶۷۳: حدثنا سلیمان بن حرب و ابوالنعمان قالا ناحماد بن زید عن ایوب عن عمرو بن دینار عن جابر قال کان معاذ یصلی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم یاتی قومہ' فیصلی بھم

ترجمہ: حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاذ نبی ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھ لیتے تھے، اس کے بعد اپنی قوم کے پاس جاتے تھے، اور انھیں نماز پڑھاتے تھے:۔

تشریح: حدیث الباب سے امام شافعیؒ نے استدلال کیا ہے اور کہا کہ حضرت معاذؓ حضور علیہ السلام کے ساتھ عشا کی نماز بہ نیت فرض پڑھتے تھے، پھر جا کر امام بن کر اپنی قوم کو نماز عشا پڑھاتے تھے، لہٰذا فرض پڑھنے والے کی اقتدا نفل والے کے پیچھے جائز ہوئی۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ اور اکثر تابعین کا مذہب یہ ہے کہ اگر مقتدی کی نیت امام کی نیت سے مختلف ہو تو اس کی نماز جائز نہ ہوگی، کیونکہ نیت کے اختلاف سے بڑھ کر اور زیادہ اختلاف کیا ہوسکتا ہے کہ نیت پر ہی اعمال کی صحت کا مدار ہے۔ اور موطا امام مالک میں حدیث ہے کہ ''امام اسی لئے ہے کہ مقتدی اس کا اتباع کریں، لہٰذا اس کی مخالفت نہ کرو'' محدث ابی نے شرح مسلم، میں لکھا کہ یہ حدیث امام ملک اور جمہور کے لئے دلیل وحجت ہے، جو کہتے ہیں کہ امام اور مقتدی کی نماز باہم مرتبط ہونی چاہئیں، اور اس سے امام شافعی ومحدثین کا رد ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض نماز کی اقتداء درست ہے اور کہتے ہیں کہ ظہر کی نماز اس امام کے پیچھے پڑھ سکتے ہیں جو عصر کی نماز عصر پڑھ رہا ہو، وہ ممنوع اختلاف کو صرف ظاہری افعال کے اختلاف پر محمول کرتے ہیں، اور امام مالک وغیرہ کہتے ہیں کہ دو الگ الگ فرضوں یا فرض اور دوسرے نفل کے اختلاف سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے۔ اور یہی ایک روایت امام احمدؒ سے بھی ہے۔ علامہ موفقؒ نے کہا کہ اسی کو ہمارے اکثر اصحاب نے اختیار کیا ہے۔ علامہ ابن عربی نے شرح ترمذی میں لکھا کہ حضرت معاذؓ والی حدیث کے معارض دوسری حدیث ہے **انما جعل الامام لیؤتم به**. اور دوسری حدیث **الامام ضامن** بھی معارض ہے، کیونکہ نفل نماز کم درجہ کی ہے وہ فرض نماز کے لئے کفیل نہیں بن سکتی۔ اور ایسے ہی ایک فرض دوسرے مختلف فرض کے لئے کفیل وضامن نہیں ہوسکتا اور حدیث معاذ میں احتمال ہے کہ وہ حضور علیہ السلام کے پیچھے نفل پڑھتے ہوں، پھر جا کر اپنی قوم کو فرض کی نیت سے پڑھاتے ہوں۔ علامہ ابن عربیؒ نے حدیث معاذ کے پانچ جواب دیئے ہیں، (ملاحظہ ہو اوجز المسالک ص ۲/۲۲)

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک حضرت معاذؓ نے حضور علیہ السلام کے ساتھ بھی عشا ہی پڑھی ہے، لیکن بہ نیت اسقاط فریضہ نہیں پڑھی اور دوسری جو اپنی قوم کے ساتھ پڑھی ہے وہ اسقاط فریضہ کی نیت سے پڑھی ہے، امام محمدؒ کی پانچوں کتابوں میں اور امام طحاوی کی کتاب میں بھی یہ مسئلہ تین جگہ مذکور ہے کہ اگر گھر سے نماز پڑھ کر چلے اور مسجد میں پہنچے اور نماز ہو رہی ہو تو اعادہ ضروری ہے۔ اور یہی متقدمین سے منقول ہے۔ امام طحاویؒ نے تصریح کی ہے کہ اگر پہلی بہ نیت عشا بھی پڑھے لیکن اسقاط فرض کا قصد نہ ہو تو وہ نفل ہوگی، اور اسی طرح اگر دوبارہ، سہ بارہ نماز ظہر کی ہی مثلاً پڑھے تو ان میں ایک فرض ہوگی جو بہ نیت اسقاط فرض ہوگی، باقی سب نفل ہوں گی۔ لہٰذا حضرت معاذؓ نے پہلے بھی عشاء ہی پڑھی ہوگی بہ لحاظ شرکت نبی کریم ﷺ اور دوسری جو پڑھائی ہے وہ فرض کے اسقاط کے لئے ہوگی۔

پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ سب سے پہلے فتح القدیر نے یہ غلطی کی ہے کہ خلاف متقدمین یہ مسئلہ لکھا کہ گھر سے پڑھ کر جب مسجد میں آیا تو

فرض میں شریک ہوااور یہ نفل ہیں۔

اعادہ کے مسئلہ میں شافعیہ کے یہاں یہ ہے کہ پانچوں نمازوں کا اعادہ ضروری ہے اور پہلی نفلیں ہیں خیمہ یا گھر پر پڑھی ہوئی، حنفیہ کے یہاں صرف ظہر وعشاء میں اعادہ ضروری ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگر شافعیہ کی طرف اس مسئلہ کی نسبت درست ہے کہ پہلی نماز نفل ہوتی ہے اور بعد والی فرض، تو حضرت معاذؓ کے لئے پہلی نماز حضور علیہ السلام کے ساتھ پڑھی ہوئی گھر اور خیمہ کے حکم میں ہونی چاہیے کہ ان کے لئے اپنی مسجد جس کے وہ امام تھے وہ بعد والی ہے، اور بظاہر وہ اپنی مسجد میں ہی اسقاط فرض کی نیت سے نماز پڑھتے ہوں گے۔ اوراس سے بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہ زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اقتداء متنفل خلف المفترض کے مسئلہ میں محدثانہ وفقیہانہ ابحاث بہت لمبی ہیں وہ شروح میں قابل مطالعہ ہیں۔ ہم نے یہاں بطور خلاصہ کچھ لکھدیا ہے۔

باب من اسمع الناس تکبیر الامام

اس شخص کا بیان، جو مقتدیوں کو امام کی تکبیر سنائے

۶۷۴: حدثنا مسدد قال نا عبدالله بن داؤد قال ناالاعمش عن ابراهیم عن الاسود عن عائشة قالت لما مرض النبی صلے الله علیه وسلم موضه الذی مات فیه اتاه بلال یؤذنه' بالصلوٰة قال مروآ ابابکر فلیصل بالناس قلت ان ابابکر رجل اسیف ان یقم مقامک یبک فلایقدر علی القرآءة فقال مروآ ابابکر فلیصل فقلت مثله' فقال فی الثالثة اوالرابعة الکن صواحب یوسف مروآ ابابکر فلیصل فصلی و خرج النبی صلے الله علیه وسلم یهادی بین رجلین کانی انظر الیه یخط برجلیه الارض فلمارآه ابوبکر ذهب یتأخر فاشارالیه ان صل فتاخر ابوبکرو قعدالنبی صلے الله علیه وسلم الیٰ جنبه وابوبکر یسمع الناس التکبیر تابعه' محاضر عن الاعمش

ترجمہ ۶۷۴: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مرض وفات میں مبتلا ہوئے، تو آپ کے پاس بلالؓ نماز کی اطلاع کرنے آئے۔ آپ نے فرمایا، ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھادیں، میں نے عرض کیا کہ ابوبکرؓ ایک نرم دل آدمی ہیں، اگر آپ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے تو رونے لگیں گے اور قراءۃ پر قادر نہ ہوں گے، آپ نے فرمایا، کہ ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں، میں نے پھر وہی عرض کیا، تو تیسری بار یا چوتھی بار آپ نے فرمایا، کہ تم یوسف کی عورتوں کی مثل ہوا ابوبکرؓ سے کہو وہ نماز پڑھائیں، تو ابوبکرؓ نے نماز شروع کی (اتنے میں نبی کریم ﷺ کو مرض میں کچھ افاقہ محسوس ہوا) اور نبی کریم ﷺ دو آدمیوں کے بیچ میں سہارا لیتے ہوئے باہر تشریف لے گئے، گویا میں اس وقت بھی آپ کی طرف دیکھ رہی ہوں، کہ آپ کے دونوں پیر زمین پر گھسٹتے جاتے ہیں، جب حضرت ابوبکرؓ نے آپ کو دیکھا تو پیچھے ہٹنے لگے مگر آپ نے ان کو اشارہ فرمایا کہ نماز پڑھو، چنانچہ ابوبکرؓ کچھ پیچھے ہٹ گئے اور نبی کریم ﷺ ان کے پہلو میں بیٹھ گئے اور ابوبکرؓ لوگوں کو تکبیر سناتے جاتے تھے۔

تشریح: مقتدیوں کو امام کی تکبیرات سنانے کے لئے ایک یا زیادہ مکبروں کا بلند آواز سے تکبیرات کہنا جائز ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ بھی رسول اللہ ﷺ کی تکبیرات سنانے کے لئے زور سے کہتے تھے۔

اس بارے میں شیخ ابن ہمامؒ نے یہ لکھدیا کہ اگر ضرورت سے زیادہ بلند آواز سے مکبر تکبیر کہیں گے تو ان کی نماز فاسد ہو جائے گی حالانکہ یہ ان کی غلطی اور اسی لئے ایک حنفی عالم نے ہی مستقل رسالہ میں ان کا رد کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ مقدار ضرورت سے زیادہ بلند آواز سے بھی تکبیرات سنانا موجب فساد صلوٰۃ نہیں ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ امام محمد کے نزدیک قائم کی اقتدا خلف القاعد جائز نہیں ہے۔ اسی لئے حدیث الباب کے مرض وفات کے واقعہ کو امام محمدؒ نے حضور علیہ السلام کی خصوصیت پر اتارا ہے۔ میرے نزدیک تو اس واقعہ میں حضور علیہ السلام کا نمازیوں کے سامنے سے گذرنا، نماز کے بیچ میں سے شروع کردینا پہلے امام کو ہٹا کر، اور ایک مقتدی کو صف کے آگے رکھنا وغیرہ اور بھی خصوصیات میں سے ہیں، اور غالباً امام محمدؒ نے بھی اور سب چیزوں کو خصوصیت پر اتارا ہے۔

فائدہ مہمہ: امام محمد وامام مالک کے نزدیک امامة جالس للقائم کسی حال میں درست نہیں، اور مرض وفات میں حضور علیہ السلام کی امامت خصوصیت پر محمول ہے امام احمد واسحٰق کہتے ہیں کہ کسی وجہ سے بیٹھ کر پڑھائے تو مقتدی کو بھی بیٹھ کر پڑھنی چاہیئے، کیونکہ ایک حدیث میں یہی حکم ہے، لیکن جمہور کے نزدیک یہ جز وحدیث کا منسوخ ہے، اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اگر امام کسی عذر سے بیٹھ کر پڑھائے تو تندرست مقتدیوں کو کھڑے ہوکر اقتدا کرنی چاہیئے، علامہ ابن عبدالبر نے فرمایا کہ یہی مذہب جماعت فقہاء امصار کا ہے، امام شافعی اور ان کے اصحاب کا بھی اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا بھی اور اہل الظاہر وغیرہم بھی اسی کے قائل ہیں۔ جمہور کا استدلال حضور علیہ السلام کی مرض وفات والی نماز سے ہے، الخ (لامع ص ۱/۲۷۶) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنابلہ نے جھگڑا ڈالا ہے اور کہا کہ اس واقعہ مرض وفات میں بھی امام ابوبکر ہی تھے اور حضور علیہ السلام مقتدی تھے، محشی سندی نے بھی حاشیہ بخاری میں اسی کی تائید کردی ہے مگر میرے نزدیک صحیح بخاری سے اس کے لئے استدلال کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

علامہ عینیؒ لکھا کہ ایک جماعت کا قول یہی ہے کہ بخاری ومسلم کی روایات حضرت عائشہؓ کے تحت اس امر کی صراحت ملتی ہے کہ آخر مرض وفات میں نماز کے امام حضور علیہ السلام ہی تھے اور حضرت ابوبکر صرف مبلغ ومکبر تھے۔ اور مزید بحث لامع میں ہے۔

باب الرجل یاتم بالامام و یاتم الناس بالماموم ویذکر عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال ائتموا بی ولیاتم بکم من بعدکم

(اگر ایک شخص امام کی اقتدا کرے اور (باقی) لوگ اس مقتدی کی اقتدا کریں، اور نبی صلی ای علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا، تم لوگ میری اقتدا کرو، اور تمہارے بعد والے تمہاری اقتدا کریں)

۶۷۵: حدثنا قتیبة بن سعید قال نا ابو معاویة عن الاعمش عن ابراھیم عن الاسود عن عآئشة قالت لما ثقل النبی صلے اللہ علیہ وسلم جآء بلال یؤذنہ بالصلوٰة فقال مروآ ابابکر ان یصلی بالناس فقلت یارسول اللہ ان ابابکر رجل اسیف وانہ متیٰ یقوم مقامک لایسمع الناس فلوامرت عمر فقال مروآ ابابکر ان یصلی بالناس فقلت لحفصة قولی لہ ان ابابکر رجل اسیف وانہ متیٰ مایقوم مقامک لایسمع الناس لوامرت عمر فقال انکن لانتن صواحب یوسف مروآ ابابکر ان یصلی بالناس فلما دخل فی الصلوٰة وجد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی نفسہ خفةً فقام یھادیٰ بین رجلین ورجلاہ یخطان فی الارض حتیٰ دخل المسجد فلما سمع ابوبکر حسہ ذھب ابوبکر یتاخر فاوما الیہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فجاء النبی صلے اللہ علیہ وسلم حتی جلس عن یسار ابی بکر فکان ابوبکر تصلی قآئماً وکان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یصلی قاعداً یقتدی ابوبکر بصلوٰة رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم والناس مقتدون بصلوٰة ابی بکر

ترجمہ: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ بیمار ہوئے، تو بلالؓ آپ کے پاس نماز کی اطلاع کرنے آئے، آپؐ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو، وہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں، میں نے کہا یا رسول اللہ! ابوبکرؓ ایک نرم دل آدمی ہیں اور وہ جب آپ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے، تو لوگوں کو نہ سنا سکیں گے، کاش، آپ عمرؓ کو حکم دیتے، پھر آپ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، تب میں نے حفصہؓ سے کہا، کہ تم عرض کرو کہ ابوبکرؓ نرم دل آدمی ہیں، اس لئے جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگوں کو اپنی آوازیں نہ سنا سکیں گے کاش! آپ عمرؓ کو حکم دیتے (چنانچہ حفصہؓ نے عرض کیا) اس پر آپ نے فرمایا کہ تم ان عورتوں کی طرح ہو، جو یوسف کو (گھیرے ہوئے) تھیں، ابوبکرؓ سے کہو، وہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں پھر جب وہ نماز شروع کر چکے تو رسول خدا ﷺ نے اپنے میں کچھ خفت (مرض کی) پائی تو آپ دو آدمیوں کے درمیان میں سہارا دے کر باہر تشریف لے گئے، اور آپ کے دونوں پیر زمین پر گھسٹتے جاتے تھے، یہاں تک کہ آپ مسجد میں داخل ہوئے، جب ابوبکرؓ نے آپ کی آہٹ سنی، تو ابوبکرؓ پیچھے ہٹنے لگے۔ مگر رسول خدا ﷺ نے انہیں اشارہ کیا (کہ ہٹو نہیں) پھر نبی ﷺ آکر ابوبکرؓ کے بائیں جانب بیٹھ گئے، ابوبکرؓ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور رسول خدا ﷺ بیٹھے ہوئے نماز پڑھتے تھے، ابوبکرؓ رسول خدا ﷺ کی اقتدا کرتے تھے، اور لوگ ابوبکرؓ کی نماز کے مقتدی تھے۔

تشریح: امام بخاریؒ نے حدیث الباب سے یہ نکالا ہے کہ اگلی صف والے امام کا اتباع و اقتدا کریں گے اور پچھلی صفوں والے اگلی صفوں کی۔ متقدمین میں سے شعبی اور متاخرین میں سے ابن جریر وغیرہ بھی اسی کے قائل ہوئے ہیں اسی لئے وہ کہتے ہیں اگر بعد میں آنے والے کسی مقتدی نے اگلی صف والے کسی مقتدی کو بھی تحریمہ کر کے رکوع میں پالیا تو اس کو رکعت مل گئی، خواہ امام اور اس سے متصل صفوں والوں نے رکوع سے سر بھی اٹھالیا ہو۔

علامہ عینیؒ نے یہی مسلک امام بخاری کا بھی قرار دیا ہے، مگر میرے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ یہ مسئلہ امام بخاریؒ کا مختار بھی ہو اور ہوسکتا ہے کہ صرف لفظ راوی کا اتباع کر کے انھوں نے ایسا ترجمہ قائم کیا ہو۔

جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جب تک امام رکوع میں ہے اسی وقت تک رکعت مل سکتی ہے، دوسرے مقتدیوں کا اعتبار نہیں اور امام بخاریؒ نے تو جزء القراۃ میں یہ بھی تصریح کردی ہے کہ امام کو رکوع میں پانے سے بھی رکعت نہ ملے گی صرف اقتداء حاصل ہو جائے گی۔

جمہور کے نزدیک حدیث الباب کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم دین کے امور میں تم میری اتباع کرو اور بعد کو آنے والے تمہاری اتباع کریں گے۔ یعنی یہاں نماز کی امامت و اقتدا کا حکم بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ **قولہ فلما دخل فی الصلوٰۃ وجد رسول اللہ ﷺ فی نفسہ خفۃ،** پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں سے صراحت نکلتی ہے کہ حضور علیہ السلام عشا کی نماز میں نکلے تھے، واللہ اعلم۔

قولہ انکن لانتن صواحب یوسف: ۔ صواحب یوسف سے تشبیہ کی وجہ اظہار خلاف مافی الضمیر تھا کیونکہ درحقیقت حضرت عائشہؓ امامت سیدنا ابی بکرؓ سے اس لئے روک رہی تھیں کہ لوگ بعد کو یہ نہ کہہ دیں کہ ان کی امامت ایسی نامبارک ہوئی کہ حضور علیہ السلام وفات پا گئے گویا دل میں تو یہ بات تھی اور ظاہر دوسری بات کی جو حدیث میں ذکر ہوئی ہے۔ جس طرح زلیخا نے بظاہر تو ان عورتوں کا اکرام کیا اور ضیافت کی تھی اور دل میں نیت یہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن و جمال ان کو دکھائیں تا کہ آئندہ وہ ان کو ملامت نہ کریں یا عورتوں کی خاص عادت ضد وہٹ کی طرف اشارہ ہے (ص۹۹ حاشیہ بخاری)

باب هل يأخذالامام اذا شک بقول الناس

امام کو جب شک ہو جائے تو کیا وہ مقتدیوں کے کہنے پر عمل کرلے

۶۷۶: حدثنا عبداللہ بن مسلمة عن مالک بن انس عن ایوب بن ابی تمیمة السختیانی عن محمد بن سیرین عن ابی ھریرة ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم انصرف من اثنتین فقال له' ذوالیدین اقصرت الصلوٰة ام نسیت یا رسول اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصدق ذوالیدین فقال الناس نعم فقام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فصلی اثنتین اخریین ثم مسلم ثم کبرفسجد مثل سجودہ او اطول

۶۷۷: حدثنا ابوالولید قال ناشعبة عن سعد بن ابراھیم عن ابی سلمة عن ابی ھریرة قال صلے النبی صلے اللہ علیہ وسلم الظھر رکعتین فقیل قد صلیت رکعتین فصلے رکعتین ثم سلم ثم سجد سجدتین

ترجمہ ۶۷۶: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ چار رکعت والی نماز کی) دو رکعتیں پڑھ کر رسول خدا ﷺ علیحدہ ہو گئے، تو آپ سے ذوالیدین نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا نماز میں کمی کر دی گئی یا آپ بھول گئے تو رسول خدا ﷺ نے دوسرے لوگوں سے فرمایا کہ کیا ذوالیدین سچ کہتے ہیں، لوگوں نے کہا، ہاں! پس رسول خدا ﷺ پھر کھڑے ہو گئے اور دو رکعتیں اور پڑھ لیں، پھر سلام پھیر کر اپنے معمولی سجدوں کی طرح سجدے کئے، یا اس سے تھوڑے سے طویل ہوں گے۔

ترجمہ ۶۷۷: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھیں، تو آپ سے کہا گیا کہ آپ نے دو رکعتیں پڑھی ہیں، پس آپ نے دو رکعتیں (اور) پڑھ لیں، پھر سلام پھیر کر دو سجدے (سہو کے) آپ نے کئے۔

تشریح: حدیث مذکورہ کا تعلق مسائل سہو سے ہے، جو اپنے موقع پر آئیں گے، چنانچہ بخاری ص۱۶۳ و ص۱۶۴ میں یہی حدیث ابی ہریرہ باب السہو کے تحت ذکر ہوگی، یہاں غالباً اس لئے ذکر کیا کہ امام ومقتدی کے مسائل چل رہے ہیں۔

اس سے قبل ص۶۹ میں بھی ابی ہریرہ باب تشھیک الا صابع فی کالمسجد میں گذر چکی ہے، کیونکہ اس روایت میں تشبیک کا بھی ذکر ہے پھر اس حدیث ابی ہریرہؓ کو ص۸۹۴ میں باب ما یجوز من ذکر الناس نحو قولھم الطویل والقصیر میں لائیں گے، کیونکہ ذوالیدین کا ذکر ہے اور کتاب اخبار الآحاد کے باب ماجا فی اجازة الخبر الواحد ص۱۰۷۷ میں بھی لائیں گے۔ کیونکہ امام بخاری مسائل کے استخراج اور مناسبات کے لحاظ سے ایک ہی حدیث کو متعدد جگہ لایا کرتے ہیں۔ غرض فقہی نقطۂ نظر سے یہاں شک وسہو کے لئے باب قائم کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔

شک وسہو امام کے مسئلہ میں متعدد صورتیں ہیں اور یہ مشہور اختلافی مسائل میں سے ہے، مذہب حنفی کا حاصل یہ ہے کہ اگر مقتدیوں میں اختلاف ہو تو امام کی رائے جس طرف ہوگی وہ معتبر ہوگی خواہ اس جانب ایک ہی مقتدی ہو۔ اگر ایک شخص کو نماز کے پوری ہونے کا یقین ہو اور ایک کو ناقص ہونے کا اور دوسرے لوگ اور امام بھی شک میں ہو تو نماز کا اعادہ صرف یقینی نقص بتلانے والے کے ذمہ ہوگا۔ اگر امام کو نقص کا یقین ہو تب بھی سب پر اعادہ لازم ہوگا بجز اس کے جس کو ان میں سے کامل ہونے کا یقین ہو، اگر کسی کا ایک مقتدی کو نقص کا یقین ہو لیکن امام اور دوسروں کو شک ہو تو سب کے لئے اعادہ اولی ہے احتیاطاً۔ اگر (دو عادل نقص بتلائیں تو اعادہ لازم ہوگا نہ لامع ص۶۷۸ / انا قلاعن البذل)

علامہ لا بن المنیر نے لکھا کہ اختلاف صرف ان صورتوں میں ہے کہ امام کو بھی شک ہو ورنہ اگر امام کو اپنے فعل پر یقین ہو تو پھر کسی

مقتدی کے قول کا اعتبار نہیں ہوگا (فتح الباری ص ۱۴۱/۲)

قولہ وقال عبداللہ بن مقداد الخ اس راوی کے بارے میں حافظ نے لکھا کہ وہ تابعی کبیر تھے۔ جن کو رؤیت کا شرف اور ان کے والد کو صحبت کا شرف حاصل تھا۔ (فتح ص ۱۴۱/۲)

علامہ عینی نے لکھا کہ وہ تابعی کبیر جن کو روایت کا اور ان کے باپ کو صحبت کا شرف ملا تھا (غالبا رؤیت کی جگہ روایت کا لفظ ناسخ کی غلطی ہے، واللہ اعلم) پھر ذہبی سے نقل کیا کہ وہ قدمائے تابعین میں سے تھے، اور ان کی اس تعلیق کو سعید بن منصور نے موصول کیا ہے، (عمدہ ص ۷۸۶/۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ صغیر السن صحابی تھے، حضرت حمزہؓ نے ان کی والدہ سے نکاح کیا تھا، اور وہ حدیث من کان له امام قراءة الامام له قراءة کے راوی بھی ہیں تو اس سے تو کم درجہ نہیں ہے کہ ہم ان کی حدیث کو مرسل صحابی قرار دیں، حالانکہ وہ مرفوعا بھی ثابت ہو چکی ہے جس کی تحقیق ہم نے فصل الخطاب میں کی ہے۔

باب اذابکی الامام فی الصلوٰۃ وقال عبداللہ بن شداد سمعت نشیج عمر وانافی اٰخر الصفوف یقرأ انمآ اشکو ابثی وحزنیٓ الی اللہ

(جب امام نماز میں روئے' عبداللہ بن شداد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کے رونے کی آواز سنی حالانکہ میں سب سے پچھلی صف میں تھا وہ انمآ اشکو ابثی وحزنیٓ الی اللہ پڑھ رہے تھے)

۶۷۸: حدثنا اسمٰعیل قال حدثنی مالک بن انس عن هشام بن عروة عن ابیه عن عائشة ام المؤمنین ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال فی مرضه مروآ ابابکر یصلی بالناس قالت عآئشة قلت له' ان ابابکر اذاقام فی مقامک لم یسمع الناس من البکآء فمرعمر یصلی بالناس فقال مرواٗ ابابکر فلیصل بالناس فقالت عآئشة فقلت لحفصة قولی له' ان ابابکر اذا قام فی مقامک لم یسمع الناس من البکآء فمر عمر فلیصل للناس ففعلت حفصةفقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم مه انکن لانتن صواحب یوسف مروآ ابابکر فلیصل للناس فقالت حفصة لعائشة ماکنت لاصیب منک خیراً

ترجمہ: حضرت عائشہ ام المؤمنینؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے اپنے (اخیر) مرض میں فرمایا کہ ابوبکرؓ سے کہو، وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں حضرت عائشہؓ کہتی ہیں، میں نے آپ سے کہا کہ ابوبکرؓ جب آپ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے تو رونے کے سبب سے لوگوں کو (اپنی قراءۃ) نہ سنا سکیں گے۔ لہٰذا آپ عمرؓ کو حکم دیجئے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، پھر آپ نے فرمایا، کہ ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ لوگوں کہ نماز پڑھائیں، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں، میں نے حفصہؓ سے کہا کہ تم آپ سے عرض کرو کہ ابوبکرؓ جب آپ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے، تو رونے کے سبب سے لوگوں کو (اپنی قراءۃ) نہ سنا سکیں گے، لہٰذا آپ عمرؓ کو حکم دیجئے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، تو حفصہؓ نے (ایسا ہی کیا) اس پر رسول خدا ﷺ نے فرمایا:۔ چپ رہو! تم تو حضرت یوسف علیہ السلام کی (اغوا) کرنے والی عورتوں کی طرح (معلوم ہوتی) ہو ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، پس حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا، کہ میں نے کبھی تم سے کوئی (بھی) بھلائی نہ پائی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ اگر نماز میں رونا کسی تکلیف، درد وغیرہ کے سبب ہو تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر جنت و دوزخ کے ذکر کی وجہ سے ہو تو وہ مطلوب ہے، اس سے فاسد نہ ہوگی کہ وہ حضور علیہ السلام سے بھی ثابت ہوا ہے۔

اس باب میں امام بخاریؒ نے ترجمہ کے مطابق کوئی حدیث ذکر نہیں کی، کیونکہ ان کی شرط کے موافق نہ ہوگی، لہٰذا حضرت عمرؓ کے اثر پر اکتفا کیا ہے۔

یہ توجیہ اس لئے ہے کہ حدیث الباب میں امام حضور علیہ السلام تھے اوران کے رونے کا کچھ ذکر نہیں ہے مگر علامہ عینیؒ نے یہ دقیق بات نکالی کہ حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے قبل تک حضرت ابوبکرؓ ہی امام تھے اوران کے بارے میں حضرت عائشہؓ کا بارہا کا مشاہدہ تھا کہ وہ نماز میں تلاوت کے وقت ضرور رویا کرتے تھے لہٰذا امام کا نماز میں رونا ثابت ہوا، گو یہاں اس خاص واقعہ میں اس کے وقوع کا ذکر نہیں ہوا۔ علامہ عینیؒ نے لکھا کہ اس کے بغیر ترجمۃ الباب سے حدیث کی مطابقت نہیں ہوسکتی (عمدہ ۲/۷۸۷) حافظ نے فتح الباری میں مطابقت ترجمہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے تراجم الابواب میں اور حضرت شیخ الحدیث نے الابواب والتراجم میں بھی کچھ نہیں لکھا۔

باب تسوية الصفوف عند الأقامة وبعدها

(اقامت کے وقت یا اس کے بعد صفوں کے برابر کرنے کا بیان)

۶۷۹: حدثنا ابوالوليد هشام بن عبدالملک قال ناشعبة قال حدثني عمرو بن مرة قال سمعت سالم بن ابي الجعد قال سمعت النعمان بن بشيريقول قال النبي صلى الله عليه وسلم لتسون صفوفكم او ليخالفن الله بين وجوهكم

۶۸۰: حدثنا ابومعمر قال ناعبدالوارث عن عبدالعزيز بن صهيب عن انس ان النبي صلے الله عليه وسلم قال اقيموا الصفوف فاني اراكم خلف ظهري

ترجمہ ۶۷۹: حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں، کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا، کہ اپنی صفوں کو برابر کرلیا کرو، ورنہ اللہ تعالے تمہارے اندر اختلاف ڈال دے گا

ترجمہ ۶۸۰: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: صفوں کو درست کرو، میں تمہیں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے (بھی) دیکھتا ہوں

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: صف کو سیدھا کرنا حنفیہ کے نزدیک واجب ہے کہ بغیر اس کے نماز میں کراہت تحریمی آئے گی اور یہ کام اقامت کے وقت بھی کرسکتے ہیں اور تحریمہ سے قبل اقامت کے بعد بھی، جیسی ضرورت ہو، اگرچہ جائز تحریمہ کے بعد بھی ہے،

امام شافعیؒ کے نزدیک تسویۂ صف سنت ہے، کیونکہ ان کے یہاں واجب کا درجہ نہیں ہے، ابن حزم ظاہری نے اس کو فرض قرار دیا ہے کہ بغیر اس کے نماز جماعت درست نہ ہوگی۔

پھر یہ کہ اگر تسویۂ صف کا نہ ہوا تو کیا جماعت کا ثواب ختم ہوجائے گا۔ علامہ سیوطی شافعیؒ نے شافعیہ سے دو قول نقل کئے ہیں ایک یہ کہ جماعت کا ثواب ملے گا۔ مگر نقصان کے ساتھ، دوسرے یہ کہ بالکل نہ ملے گا۔ ہمارے یہاں بھی مکروہ روزے کے بارے میں ایسی تفصیل موجود ہے۔ میرے نزدیک یوم نحر وفطر میں تو ثواب بالکل نہ ملے گا کہ ان دونوں میں روزہ رکھنا اجماعاً حرام ہے، باقی ایام تشریق میں ثواب کم ہوگا۔ اس لئے نماز میں میری رائے ہے کہ اس میں بھی جماعت کا ثواب تو ملے گا مگر صف سیدھی نہ کرنے والوں کے لئے بقدر کراہت کم ہو جائے گا۔ اور جو لوگ صف کو سیدھا کریں گے ان کا کم نہ ہوگا۔

صف سیدھی نہ کرنے کے ظاہری عمل خلاف کا اثر باطن پر یہ پڑے گا کہ ان لوگوں میں باہمی اختلافات رونما ہوں گے اور مودت و محبت نہ رہے گی حدیث میں اسی سے ڈرایا گیا ہے۔

قوله فاني اراكم پر فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ تم اگر خدا سے شرم نہیں کرتے تو کم سے کم مجھ سے ہی کرو کہ میں تم جس طرح آگے سے دیکھتا ہوں، پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں، امام احمد و جمہور علماء نے کہا کہ ایسا عقلاً ممتنع نہیں ہے، اور وحی سے ثابت ہوا اس لئے اس پر یقین کرنا

چاہیئے اور یہ بطور خرق عادت حضور علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ (عمدہ ص ۲/۷۸۹)

قوله حدثنی عمرو بن مره پر فرمایا کہ یہ راوی بخاری بھی کوفی ہیں اور ان کا مذہب ترک رفع یدین ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ میں یہی ترک تھا، مگر امام بخاری بھی کوفہ میں پہنچے ہیں لیکن کوئی حدیث ترک کی نہیں لائے۔ فالعجب کل العجب۔ ان ہی عمرو بن مرہ کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ کوفہ میں حضرمیوں کی مسجد میں گیا اور وہاں وائل بن حجر کی حدیث رفع یدین سنی تو آ کر حضرت ابراہیم نخعیؒ سے بیان کی، وہ سن کر غضبناک ہوئے اور فرمایا افسوس! کیا انھوں نے دیکھا اور حضرت ابن مسعود نے نہ دیکھا اور نہ ان کے اصحاب نے دیکھا (حاشیہ مولانا عبدالحی علی الموطأ ص ۹۳) اور اسی حاشیہ میں ہے کہ مغیرہ نے بھی ابراہیم نخعیؒ سے وائل کی حدیث کا ذکر کیا تو فرمایا کہ اگر وائل نے ایک دفعہ دیکھا تو ابن مسعودؓ نے پچاس مرتبہ حضور علیہ السلام کو نہ کرتے دیکھا ہے، اور ایک روایت ہے کہ کیا وائل نے ہی دیکھا اور باقی صحابہ نے نہ دیکھا؟!

فتح الملہم ص ۲/۱۵ میں اس طرح نقل ہے کہ ابراہیم نخعی نے حدیث وائل بن حجر کو اوپرا سمجھا اور کہا کیا تمہارا خیال ہے کہ وائل ابن حجر حضرت علی و عبداللہ بن مسعود سے زیادہ علم والے تھے؟!

شرح کتاب الآثار امام محمد ص ۱/۱۹۵ میں حضرت العلامہ مولانا مفتی مہدی حسنؒ نے یہ نقل کیا کہ جب عمرو نے وائل کی حدیث سنائی تو ابراہیم نے فرمایا:۔ میری سمجھ میں نہیں آیا شاید وائل نے ایک ہی دن حضور علیہ السلام کو نماز پڑھتے دیکھا تھا جس کو یاد رکھ کر یہ روایت کی اور اس کو حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے اصحاب نے یاد نہ رکھا، میں نے تو ان میں سے کسی سے بھی یہ بات نہیں سنی اور نہ کسی کو دیکھا کہ وہ نماز میں علاوہ تکبیر تحریمہ کے دوسری کسی تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرتے ہوں۔ چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضور علیہ السلام کے ساتھ سفر و حضر میں رہتے تھے اور آپ کے خصوصی خادم رہے ہیں، اس لئے ابراہیم نخعی نے اس طرح تعجب کا اظہار کیا ہے۔

افسوس ہے کہ فیض الباری ص ۲/۲۳۵ میں صحیح اور پوری بات مع حوالہ کے نہ آ سکی۔ اسی لئے ہم نے تصحیح و تفصیل کر دی ہے۔

باب اقبال الامام على الناس عندتسوية الصفوف

(صفوں کو برابر کرتے وقت امام کا لوگوں کی طرف متوجہ ہونے کا بیان)

۶۸۱: حدثنا احمد بن ابی رجآء قال نامعٰوية بن عمرو قال نازآئدةابن قدامة قال ناحميد ن الطويل قال نا انس بن مالک قال اقيمت الصلوٰة فاقبل علينا رسول الله صلے الله عليه وسلم بوجهه فقال اقيموا صفوفكم وتراصوا فانی اراكم من ورآء ظهری

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نماز قائم کی گئی تو رسول خدا ﷺ نے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا، کہ تم لوگ اپنی صفوں کو درست کر لو، اور مل کے کھڑے ہو، اس لئے کہ میں تمھیں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

تشریح: حدیث الباب میں تو خود حضور علیہ السلام کا متوجہ ہونا مذکور ہے، اور ابوداؤد میں یہ ہے کہ حضورؐ دوسروں کو تسویۂ صفوف کا حکم کرتے تھے، اور خود محراب کے قریب ایک لکڑی کے ستون کے سہارے کھڑے رہتے تھے، جب دیکھتے کہ صفیں برابر ہو گئیں تو نماز کی تکبیر کہتے تھے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ابوداؤد میں ہے کہ نمازیوں کی صفیں آسمانوں کے فرشتوں کی صفوں کے مقابل ہوتی ہیں۔ اسی لئے سیدھی صف کرنے کا اہتمام زیادہ کر دیا گیا اور اچھی طرح مل کر کھڑے ہونے کا بھی حکم ہوا تا کہ مشابہت پوری ہو جائے۔ دوسرے کہ یہ اداء عبادت کا یہی طریقہ صف بندی کرنے کا سب سے زیادہ کامل بھی ہے، اسی لئے یہ امتیاز امت مرحومہ کے حصہ میں آیا، بنی اسرائیل کی عبادت میں حلقہ کا طریقہ تھا، صف بندی نہ تھی۔ نیز فرمایا:۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے بھی آدمی مقرر تھا جو صفوں میں سے "اعتدلوا، استووا" کہتا ہوا گذرتا تھا پھر نماز شروع ہوتی تھی۔

باب الصف الاول

(پہلی صف کا بیان)

۶۸۲: حدثنا ابو عاصم عن مالک عن سمی عن ابی صالح عن ابی هریرة قال قال النبی صلے الله علیه وسلم الشهدآء الغرق والمبطون والمطعون والهدم وقال لویعلمون ما فی التهجیر لاستبقوا الیه ولویعلمون ما فی العتمة والصبح لاتوهما ولو حبواً ولویعلمون ما فی الصف المقدم لاستهموا

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ شہداء (یہ لوگ ہیں) جو ڈوب کے مرے اور جو پیٹ کے مرض میں مرے، اور جو طاعون میں مرے اور جو دب کے مرے اور آپ نے فرمایا کہ اگر لوگ جان لیں، کہ شروع وقت میں نماز پڑھنے میں کیا (فضیلت) ہے تو بے شک اس کی طرف سبقت کریں، اور اگر وہ جان لیں، کہ عشاء اور صبح کی نماز (باجماعت) میں کیا ثواب ہے، تو یقیناً ان میں آ کر شریک ہوں اگر چہ گھٹنوں کے بل (چلنا پڑے) اور اگر وہ جان لیں کہ پہلی صف میں کیا فضیلت ہے، تو بے شبہ (اس کے لئے) قرعہ اندازی کریں۔

تشریح اور بحث: صف اول کی فضیلت میں ابوالشیخ ابوحیان سے نقل ہوا کہ وہ بہ نسبت دوسری صفوں کے شیطانی اثرات سے زیادہ حفاظت کرنے والی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک صف اول شمال سے جنوب تک کی پوری لمبی صف ہے وہ نہیں جس میں امام کے ساتھ اس کے مقصورہ میں چند لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں، اگر چہ یہ بھی بعض کا قول ہے، اور تیسرا قول یہ بھی ہے کہ جو لوگ مسجد میں پہلے داخل ہو گئے وہ سب صف اول والے ہیں خواہ کہیں بھی کھڑے ہوں۔

راوی حدیث الباب ابو عاصم الضحاک النبیل کے بارے میں حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ امام زفر کے تلمیذ ہیں اور ان کے ساتھ آخر عمر تک رہے ہیں۔ نبیل معزز و شریف کو کہتے ہیں اور یہ لقب ان کو امام زفرؒ کی باندی نے دیا تھا، جب دروازے پر جا کر دستک دیتے تو امام زفر کے پوچھنے پر کہ کون ہے باندی جا کر دیکھتی اور آ کر کہتی کہ وہی نبیل ہیں۔ اس کے بعد ان کا یہ لقب ہی پڑ گیا۔

ہم نے مقدمہ انوار الباری ص ۱/۸۰ میں بھی ان کا تذکرہ لکھا ہے کہ وہ امام اعظمؒ کے بھی شاگرد ہیں اور علامہ ذہبیؒ نے ان کو الحافظ (یعنی حافظ حدیث) اور شیخ الاسلام کے القاب سے ذکر کیا ہے۔ یہ امام بخاری کے حدیث میں استاذ ہیں جن سے یہاں روایت کی ہے امام زفر اور امام اعظمؒ کے ایسے تلامذۂ خصوصی سے کیا یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ ''الایمان قول وعمل'' کے قائل ہوں گے؟ جب کہ امام بخاری نے تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں نے کسی ایسے شخص سے روایت نہیں لی، جس کا عقیدہ ''الایمان قول وعمل'' کا نہیں تھا۔ شاید امام بخاریؒ نے ان کو اس بارے میں کچھ نرم پایا ہو، مگر یہ بات تو سب نے تسلیم کر لی ہے کہ امام بخاریؒ کے اس دعوے کا تعلق صرف بلاواسطہ شیوخ سے ہے، کیونکہ اوپر کے شیوخ میں تو یہ دعوے عام طور سے درست نہ ہو سکا۔ ہمارے قریبی دور کے اہل حدیث عالم مولانا عبدالسلام مبارکپوری اعظمی نے ''سیرۃ البخاری'' ص ۱۶۳/۱۶۴ میں لکھا:

''ہم یہ مانتے ہیں کہ امام بخاری کو ''الایمان قول وعمل'' میں خاص قسم کا کد اور تشدد تھا، جس کی شہادت بخاری کی کتاب الایمان سے بھی ملتی ہے، اور امام بخاری کا یہ قول مقدمہ فتح الباری میں نقل ہوا ہے کہ میں نے ہزار سے زائد شیوخ سے حدیث لی لیکن ایسے شیوخ کے پاس نہیں گیا جو ''الایمان قول وعمل'' کے قائل نہ تھے، لیکن یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ اس قول سے امام بخاری کا تشدد ان کے اپنے شیوخ تک محدود معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اوپر کے شیوخ میں اس قسم کی پابندی نہیں اسی وجہ سے شیوخ الشیوخ کیا اور بھی اوپر کے شیوخ ان کے سلسلہ روایت میں ایسے مل سکتے ہیں جن کا قول ''الایمان قول وعمل'' نہ تھا لہٰذا یہ توجیہ امام بخاری کے بلاواسطہ شیوخ میں چل سکتی ہے اوپر کے سلسلہ میں یہ توجیہ بالکل غلط ہو جاتی ہے'' الخ

غرض یہ سب کو معلوم ہے کہ امام بخاری نے باوجود دعوائے مذکور کے ایسے رواۃ سے احادیث روایت کی ہیں'' جن کی نسبت ''مرجی''

کہا گیا ہے، اور جو اعمال کو جزو ایمان نہیں جانتے تھے، جبکہ امام بخاری نے سب سے بڑا الزام امام اعظمؒ پر "مرجئی" ہونے کا لگایا بھی ہے، پھر ایک امام عاصم النبیل موصوف الصدر راوی حدیث الباب ہی پر کیا منحصر ہے محدث اعظم مکی بن ابراہیم بھی امام بخاریؒ کے بلا واسطہ استاذ تھے، جن سے امام بخاری کو صحیح میں ۱۱ ثلاثیات روایت کرنے کا بڑا فخر حاصل ہو سکا ہے۔

یہ مکی بن ابراہیم نہ صرف امام اعظمؒ کے تلمیذ بلکہ بڑے مداحین میں سے تھے، امام صاحب کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم کہا کرتے تھے جبکہ امام صاحب کے زمانہ میں امام مالک، اوزاعی، سفیان ثوری، مسعر اور عبداللہ بن مبارک وغیرہ صدہا محدثین کبار تھے۔

اسی طرح عبداللہ بن ادریس، شعیب دمشقی، علی بن مسہر، وکیع، قاسم بن معن، یزید بن زریع، زہیر بن معاویہ وغیرہ اور سب سے زیادہ نمایاں شیخ المحدثین عبداللہ بن مبارکؒ جن کو امام بخاریؒ نے بھی اعلم اہل زمانہ کہا، یہ سب بھی بلا واسطہ امام بخاری کے استاذ حدیث اور امام اعظم کے تلمیذ حدیث تھے، یقیناً یہ سب بھی "الایمان قول وعمل" کے قائل نہ ہوں گے، پھر اس تاویل بعید سے کیا فائدہ ہوگا کہ امام بخاریؒ نے بلا واسطہ ایسے عقیدہ کے لوگوں سے حدیث کی روایت نہیں کی، اور بالواسطہ والوں سے لی ہے۔ اور اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے، سلسلہ روایت کی کسی کڑی کا راوی بھی غلط عقیدہ کا ہوگا تو وہ ساری ہی روایت گر جائے گی۔

درحقیقت اس بارے میں بھی ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کا ہی فیصلہ زیادہ صحیح ہے کہ امام بخاری نے نہ معلوم کس مصلحت اور جذبہ کے تحت سارا تشدد اور زور صرف کتاب الایمان میں لگایا اور وہاں وہ کسی طرح بھی نرم نہیں ہوئے کہ اعتدال کی صورت بن جاتی لیکن ۲۷ ویں پارہ میں جا کر ص۱۰۰۲ "باب ما یکره من لعن شارب الخمر" قائم کر دیا جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر عقیدہ درست ہو تو کبائر معاصی مشرب خمر وغیرہ کی وجہ سے بھی ملت سے خارج نہ ہوگا کتاب الایمان میں اس کو نہیں لائے تھے،

امام بخاریؒ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ پر سو جان سے قربان ہیں اور ایسے ہی عبدالرحمٰن بن مہدی اور اسحٰق بن راہویہ وغیرہ مگر امام صاحب کی سو مدح میں سے ایک بھی ان میں سے کسی کے دل میں جگہ نہ پا سکی، اس کے برخلاف عبدالرحمٰن بن مہدی، حمیدی، نعیم خزاعی جیسے معاندین امام اعظم کی ایک ایک بات کا اثر قبول کر لیا تھا۔ اور بقول حضرت شاہ صاحبؒ صحیح بخاری میں تو کچھ رعایت بھی کی ہے اپنی دوسری تالیفات (رسالہ رفع یدین ورسالہ قراءۃ خلف الامام وغیرہ) میں تو غیر موزوں کلمات استعمال کئے ہیں۔ واللہ المستعان۔

باب اقامة الصف من تمام الصلوٰة

(صف کا درست کرنا نماز کا پورا کرنا ہے)

۶۸۳: حدثنا عبدالله بن محمد قال نا عبدالرزاق قال انا معمر عن همام عن ابی هريرة عن النبی صلے الله عليه وسلم قال انما جعل الامام ليوتم به فلاتختلفوا عليه فاذا ركع فاركعوا واذاقال سمع الله لمن حمده فقولوا ربنا لک الحمد واذاسجدفاسجدوا واذاصلىٰ جالساً فصلوا جلوساً اجمعون واقيموا الصف فی الصلوٰة فان اقامة الصف من حسن الصلوٰة

۶۸۴: حدثنا ابوالوليد قال ناشعبة عن قتادة عن انس عن النبی صلے الله عليه وسلم قال سووا صفوفكم فان تسوية الصفوف من اقامة الصلوٰة

ترجمہ۶۸۳: حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا امام اسی لئے بنایا گیا ہے، کہ اس کی اقتدا کی جائے، لہٰذا اس سے اختلاف نہ کرو، جب وہ رکوع کرے، تو تم لوگ بھی رکوع کرو، اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم لوگ ربنا لک الحمد کہو اور جب وہ سجدہ کرے، تو تم لوگ بھی سجدہ کرو، اور جب وہ بیٹھ کر پڑھے تو تم لوگ بیٹھ کر پڑھو، اور نماز میں صف کو درست کرو اس لئے کہ صف کا درست کرنا نماز کی خوبی کا ایک جز ہے۔

ترجمہ ۶۸۴: حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:۔اپنی صفوں کو برابر کرو۔ کیونکہ صفوں کو برابر کرنا نماز کے درست کرنے کا جز ہے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔امام بخاریؒ نے حدیث نبوی کے الفاظ ہی سے ترجمۃ الباب بنایا ہےاور امام راغبؒ نے تمام و کمال میں فرق کیا ہے کہ تمام کا اطلاق اجزائے میں ہوتا ہے اور کمال کا اوصاف میں۔اس فرق سے ابن حزم کا استدلال صحیح ہوسکتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اوصاف بھی بعض اوقات اپنی اہمیت کی وجہ سے اجزاء کا حکم لے لیتے ہیں اور یہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ صف ٹیڑھی کرنے والے کی نماز باطل نہیں قرار دی گئی۔اسی لئے اس کو اعادہ کا حکم نہیں دیا، پھر یہ کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اقامت صلوٰۃ نماز کے علاوہ کوئی چیز ہے اسی لئے **صلوا** اور **اقیموا الصلوۃ** میں فرق کیا گیا ہے لہٰذا ابن حزم کا تسویہ صف اور اقامۃ صلوٰۃ کو فرض قرار دینا صحیح نہ ہوا (انہوں نے کہا کہ نماز فرض ہے لہٰذا جو فرض کا جزو ہے وہ بھی فرض ہوا) اس کی پوری وضاحت بیضاوی وغیرہ نے کردی ہے۔

ابن حزم وشوکانی کا ذکر

حافظ نے لکھا کہ ابن حزم نے افراط کی کہ صف ٹیڑھی کرنے والے کی نماز کو باطل ٹھیرایا ہے۔جبکہ بخاری کی حدیث الباب میں **من حسن الصلوٰۃ** کا لفظ ہے اور حسن شئی تمام سے زائد پر دال ہوتا ہے، بلکہ ابن دقیق العید نے کہا کہ عرف میں تمام شئی بھی حقیقت پر زائد ہوتا ہے۔ (فتح ص ۲/۱۴۳) علامہ قسطلانی نے کہا کہ (سب سے الگ ہوکر) ابن حزم نے وعید مذکور کی وجہ سے بھی بطلان کا حکم کیا، حالانکہ یہاں وعید تغلیظ وتشدید کے لئے ہے۔(لامع ص ۱/۶۷۹)

اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ابن حزم اور شوکانی جیسے لوگوں سے، بہت ضرر پہنچا ہے امت کو اور ان سے اغلاط فاحشہ ہوئی ہیں۔

باب اثم من لم یتم الصفوف

(اس شخص کا گناہ جو صفیں پوری نہ کرے)

۶۸۵: حدثنا معاذ بن اسد قال انا الفضل بن موسیٰ قال انا سعید بن عبید ن الطآئی عن بشیرین یسار الانصاری عن انس بن مالک انہ' قدم المدینۃ نقیل لہ' مآانکرت منا منذیوم عھدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما انکرت شینا الاانکم لاتقیمون الصفوف وقال عقبۃ بن عبید عن بشیربن یسار قدم علینا انس ن المدینۃ بھٰذا

ترجمہ ۶۸۵: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ جب وہ مدینہ میں آئے تو ان سے کہا گیا کہ آپ نے ہم میں کون سی بات اس کے خلاف پائی، جو آپ نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیکھی تھی؟ تو انہوں نے کہا کہ میں نے بجز اس کے کوئی چیز خلاف نہیں پائی کہ تم صفیں درست نہیں کرتے ہو، اور عقبہ بن عبید نے بشیر بن یسار سے اس کو یوں روایت کیا، کہ ہم لوگوں کے پاس جب حضرت انسؓ مدینہ آئے الخ

تشریح: حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے حاشیہ لامع ص ۱/۶۷۹ میں لکھا:۔''تسویہ صف ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالک وشافعی کے نزدیک نماز کی سنتوں میں سے ہے، اور شرط صحت صلوٰۃ نہیں ہے اگر اعتراض کیا جائے کہ امر تو وجوب کے لئے ہے، خصوصا جبکہ ترک پر وعید بھی وارد ہو، تو جواب یہ ہے کہ وعید بطور تغلیظ وتشدید کے ہے، **تاکیداً او تحریضاً علی فعلھا قالہ الکرمانی،** اور علامہ عینی نے اس پر تعقب کیا ہے اور کہا کہ **امر مقرون بالوعید** وجوب پر دلالت کرتا ہے۔لہٰذا یہ کہنا چاہئے کہ تسویہ واجب تو ہے مگر واجبات صلوٰۃ سے نہیں ہے کہ اس کے ترک سے فساد صلوٰۃ کا حکم ہو، البتہ اس کے ترک سے گناہ لازم آئے گا، اس لئے حافظ نے بھی کہا کہ وجوب مانتے ہوئے بھی

نماز اس کے ترک پر بھی صحیح ہو جائے گی اور ابن حزم کا دعوائے بطلان صلوٰۃ اور عدم وجوب پر اجماع کو چیلنج کرنا ان کا حد سے بڑھنا ہے۔ اور حضرت عمرؓ کے اور بلال کے تشدد و تعزیر سے بھی ان کا استدلال درست نہیں کیونکہ ممکن ہے وہ ترک سنت پر تعزیر کو جائز سمجھتے ہوں''

علامہ عینیؒ نے حافظ ابن حجر کے اس جواب پر نقد کیا کہ ان کے کلام میں تناقض ہے، کیونکہ انھوں نے گناہ کو صرف ترک واجب پر مانا تھا، لہٰذا ترک سنت پر گناہ نہ ہوگا اور وہ تعزیر کا مستحق بھی نہ ہوگا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ حضرت عمر و بلالؓ کی تعزیر کو ترک امر پر ہی محمول کریں جس کا ظاہر وجوب ہے اور اس طرح ترک پر وعید کا استحقاق بھی درست ہو جائے گا (عمدہ ص ۲/۷۹۳)

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوا کہ علامہ عینیؒ اتمام صف اور تسویہ صف کو نہ صرف سنت مؤکدہ بلکہ قریب واجب کے قرار دیتے ہیں اور حافظ ابن حجر صرف سنت کے درجہ میں رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ کا مسلک متحد ہے۔ واللہ اعلم

افسوس ہے کہ اس موقع پر بعض امالی بخاری کی عبارت متن و حاشیہ میں مطلب خبط ہو گیا ہے اس لئے ہم اس کو منقح کرتے ہیں۔

حضرت انسؓ سے نماز کے بارے میں مختلف اوقات میں تین مرتبہ تنبیہ نقل ہوئی ہے، جن کا ذکر بخاری میں ہے، (۱) ص ۷۸ باب وقت العصر میں اس طرح ہے کہ حضرت ابوامامہؓ نے بیان کیا ہم نے ظہر کی نماز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ساتھ پڑھی، پھر حضرت انسؓ کی خدمت میں گئے تو دیکھا کہ آپ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے، میں نے عرض کیا آپ نے یہ کون سی نماز پڑھی، فرمایا عصر کی اور ایسے ہی وقت پر ہم نے حضور علیہ السلام کے ساتھ بھی نماز پڑھا کرتے تھے؟ گویا تاخیر ظہر پر نکیر کی کہ ایسے وقت پر نہ پڑھی جائے کہ عصر کا وقت آ جائے (حضرت عمر بن عبدالعزیز اس وقت امیر مدینہ تھے)

(۲) ص ۱۰۰ باب **اثم من لم یتم الصفوف** میں ہے کہ حضرت انسؓ بصرہ سے مدینہ طیبہ آئے تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے حضور علیہ السلام کے زمانہ کے لحاظ سے اس زمانہ میں کون سی بات اوپری دیکھی ہے؟ فرمایا اور تو کوئی خاص بات نہیں البتہ یہ کہ تم لوگ صفوں کو سیدھا نہیں کرتے۔

(۳) ص ۷۶ باب **فی تضییع الصلوٰۃ عن وقتہا** میں ہے کہ زہری بیان کرتے ہیں میں حضرت انسؓ کی خدمت میں دمشق حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں، میں نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا جو باتیں میں نے حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں دیکھی تھیں، اب ان میں سے بظاہر نماز رہ گئی ہے لیکن وہ بھی ضائع کر دی گئی (یعنی ناوقت پڑھی جانے کے سبب سے)

اسی باب کی پہلی حدیث میں اس طرح ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ مجھے تو اب کوئی بات حضور علیہ السلام کے عہد مبارک کی باقی نہیں معلوم ہوتی، عرض کیا گیا کہ نماز تو ہے اس پر فرمایا کہ نماز میں بھی تم نے کیا کچھ گڑبڑ نہیں کر دی ہے؟!

علامہ عینیؒ نے لکھا کہ ضائع کرنے کا مطلب مہلب نے تو وقت مستحب سے مؤخر کرنا بتلایا ہے اور کچھ دوسرے حضرات نے بھی ان کے اتباع میں یہی مطلب لیا ہے، لیکن میرے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وقت شرعی سے نکال کر مؤخر کرنا مراد ہے۔ کیونکہ حضرت انسؓ نے یہ بات اس وقت فرمائی تھی جب ان کو معلوم ہوا تھا کہ حجاج اور ولید بن عبدالملک وغیرہ نماز کو وقت سے مؤخر کر کے پڑھتے تھے، پھر علامہ عینیؒ نے اس بارے میں تاریخی واقعات استدلال میں ذکر کئے ہیں اور لکھا کہ حضرت ابن مسعودؓ سے آیت **فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ** کی تفسیر میں وارد ہے کہ ان لوگوں نے نمازوں کو ان کے مقررہ اوقات سے مؤخر کر دیا تھا اور نمازیں غیر وقت میں پڑھتے تھے۔

علامہ عینیؒ نے یہ بھی لکھا کہ حضرت انسؓ نے دمشق کا سفر اس لئے کیا تھا کہ وہ والی عراق حجاج کی شکایت خلیفہ وقت ولید بن عبدالملک سے کریں۔ (عمدہ ص ۲/۵۲۱ و ۲/۵۲۲)

ترتیب زمانہ کے لحاظ سے اور نمازوں میں جو بگاڑ رفتہ رفتہ آتا رہا اور بڑھتا گیا، اس کی رعایت سے بھی ہم نے اوپر نمبر قائم کر دیئے ہیں اگرچہ بخاری میں ابواب و تراجم کے تحت تینوں امور مقدم و مؤخر ہو کر درج ہوئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(نوٹ) واضح ہو کہ یہ پوری تفصیل فتح الباری اور عمدۃ القاری کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ اور ان کے مطالعہ پر ہی واضح ہوا کہ امالی

میں غلطی ہوگئی ہے، اگر تالیف کے وقت ان کا مطالعہ کرلیا جاتا تو نہ غلطی ہوتی، اور نہ استدراک کی ضرورت پیش آتی۔ کما لایخفی.

انوارالباری کا مقصد یہی ہے کہ اکابر امت اور حضرت شاہ صاحب کے افادات عالیہ منقح ہوکر سامنے آجائیں اور حضرتؒ کے امالی میں جو بکثرت اغلاط، قلت حفظ وضبط یا عدم مراجعت اصول کے سبب سے حضرتؒ یا دوسرے اکابر کی طرف منسوب ہوگئی ہیں ان کی تصحیح ہو جائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

باب الزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم فی الصف وقال النعمان بن بشیر رایت الرجل منایلزق کعبه' بکعب صاحبه

(صف کے اندر شانہ کا شانہ سے' اور قدم کا قدم سے ملانے کا بیان' اور نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ہر شخص ہم میں سے اپنا ٹخنہ اپنے پاس والے آدمی کے ٹخنے سے ملا دیتا ہے)

۶۸۶: حدثنا عمرو بن خالد قال نازهیر عن حمید عن انس عن النبی صلی الله علیه وسلم قال اقیموا صفوفکم فانی اراکم من ورآء ظهری و کان احدنا یلزق منکبه' بمنکب صاحبه وقدمه' بقدمه

ترجمہ: حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:۔ اپنی صفوں کو درست کرلیا کرو، کیونکہ میں تمہیں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے (بھی) دیکھتا ہوں، اور ہم میں سے ہر شخص اپنا شانہ اپنے پاس والے کے شانے سے اور اپنا قدم اس کے قدم سے ملا دیتا تھا۔

تشریح: یہ الزاق المنکب کا عنوان جو بخاری میں ہے، ترمذی وغیرہ میں نہیں ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فقہائے اربعہ اور جمہور کے یہاں الزاق سے مراد یہ ہے کہ درمیان میں فرجہ نہ ہو، اور اس کو صرف غیر مقلدوں نے حقیقت پر محمول کیا ہے، اور وہ نماز جماعت میں اس کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، اور اس طرح تکلف کر کے اپنے دونوں پیروں کے درمیان اتنا فاصلہ کر کے کھڑے ہوتے ہیں کہ دوسرے قریبی نمازی کے قدموں سے مل جائیں، اس طرح وہ تکلف وتصنع کر کے اوضاع طبعیہ اور ہیئت وصورت مناسبہ محمودہ کو بگاڑ دیتے ہیں۔ جو نماز کے ظاہری حسن وحالت خشوع کے بھی خلاف ہوتا ہے، اس کو وہ لوگ تمسک بالسنہ کا نام دیتے ہیں، جبکہ اصحاب مذاہب اربعہ اور متقدمین کے یہاں اس طرح کا معمول نہیں تھا اور تعامل سلف وتوارث بہت بڑی حجت ہے۔ اور وہ الزاق کا مطلب صرف ٹخنوں اور مونڈھوں کی برابری اور قرب کو سمجھتے تھے تاکہ صف سیدھی ہو اور دو نمازیوں کے درمیان خالی جگہ نہ رہے۔

رہا یہ کہ خود نمازی اپنے دو قدموں کے درمیان کتنا فاصلہ کرے، یہ نمازی کے حالت پر ہے کہ وہ سہولت کے ساتھ بلا تصنع وتکلف کے اس طرح کھڑا ہو جس سے خشوع وتذلل ظاہر ہو، نسائی باب الصف بین قدمیہ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز میں دونوں قدم ملا کر کھڑا ہے، فرمایا اس نے سنت کو چھوڑ دیا، اگر یہ مراوحہ کرتا تو مجھے اچھا لگتا کہ دونوں پیروں میں کچھ فاصلہ کر کے آرام و اطمینان کے ساتھ کھڑا ہوتا، لہٰذا سنت یہ معلوم ہوئی کہ نہ دونوں پاؤں کو ملا کر کھڑا ہو اور نہ بہت چوڑا کر کھڑا ہو۔

حافظ نے فتح الباری ص۱۴۴/۲ میں لکھا کہ حدیث الباب میں الزاق سے مقصود تعدیل صف وسد الخلل کے لئے مبالغہ ہے۔ چنانچہ دوسری احادیث میں ہے کہ صفوں کو سیدھا کرو اور مونڈھوں کو ایک سیدھ میں رکھو۔ درمیان میں جگہ نہ چھوڑو کہ شیطان دراندازی کریں! عمدہ ص۷/۹۴/۱ (طبع استنبول) میں بھی یہی مضمون ہے۔ غرض دوسری سب احادیث میں چونکہ حکم نبوی صرف تعدیل صف اور سد الخلل ہی کا ہے اس لئے شارحین حدیث نے الزاق کو راوی مبالغہ پر محمول کیا ہے، چونکہ خود حضور علیہ السلام نے الزاق کا حکم نہیں فرمایا، اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے معتدل طریقہ نماز میں کھڑے ہونے کا متعین فرما دیا جو منفرد ومقتدی دونوں کے لئے یکساں ہے۔

فائدہ فقہیہ: ہماری کتب فقہ حنفیہ کبیری وشامی وغیرہ میں دوقدموں کے درمیان فاصلہ چار انگشت کا لکھا ہے کہ اس طرح کھڑے ہونے میں کوئی تکلف وتصنع نہ ہونے کی وجہ سے خشوع ودل جمعی حاصل ہوگی، اور بحر وشامی میں یہ بھی ہے کہ اگلی صف میں جگہ خالی ہوتو اس کو پر کرے خواہ پچھلی صف کے نمازی کے آگے سے گذرنا پڑے یا تخطی رقاب کرنی پڑے کہ اس صورت میں دونوں کا جواز ہے۔ کیونکہ خود ان لوگوں نے ہی اگلی صف پوری نہ کرکے اس مرور وتخطی کا موقع دے کر اپنی نمازوں کا احترام ساقط کردیا ہے۔ (معارف السنن للبنوری ص ۲/۳۰۰)

افادۂ انور: اس موقع پر حضرتؒ نے فرمایا کہ محدثین ہر جگہ اسناد سے بحث کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کس نے کس سے اور تعامل کو بالکل نہیں دیکھتے، یہی بخاری کو پیش آیا کہ اہل کوفہ کا ترک رفع یدین تواتر کو پہنچا مگر اسنادیں وافر نہ ہونے کی وجہ سے ناقابل عمل ٹھیرادیا۔ اس لئے جہاں اسناد میں نفع ہے، نقصان بھی ہے، جہاں تعامل وغیرہ موجود ہو اور اس سے فیصلہ ہوسکے تو وہاں اسناد بے ضرورت ہے۔

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ کعب کو کعب سے ملانا اور وضع یدین علے الصدر ہر دو چیزیں بے اصل ہیں، کیونکہ تعامل سے رد ہیں، ۲۰ سال پہلے یہ حکم لگا چکا تھا کہ نماز میں وضع یدین علے الصدر بدعت ہے۔ اب کتاب المسائل لابی داؤد میں بھی دیکھا کہ ابوداؤد نے امام احمد سے دریافت کیا کہ وضع الیدین علے الصدر کیا ہے؟ تو فرمایا کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اس کتاب میں امام ابوداؤد نے جو امام احمدؒ سے مسائل فقہیہ میں سوالات کئے ہیں وہ اور ان کے جوابات درج ہیں، اتنا لکھنے کے بعد خیال ہوا کہ اس موقع پر سینہ پر ہاتھ باندھنے کے مسئلہ کی بحث بھی دیکھ لی جائے، کیونکہ ہمارے زمانے کے غیر مقلدین کو جہاں پاؤں چوڑا کر۔۔۔۔نماز میں کھڑے ہونے کے مسنون ہونے پر غیر معمولی کد واصرار ہے اور اس کو انھوں نے اپنا امتیازی وصف بنالیا ہے، وہیں وہ سینہ پر ہاتھ باندھنے کو سب سے زیادہ صحیح واحق خیال کرتے ہیں، چنانچہ تحفۃ الاحوذی اور مرعاۃ میں یہ مضمون پڑھا، اوران کے بلند بانگ دعوے بھی پڑھے کہ سینہ پر ہاتھ باندھنے کے دلائل ہی سب سے زیادہ قوی ہیں، کئی ورق میں لمبی بحث کی ہے (ملاحظہ ہو تحفہ ص ۱/۲۱۳ تا ص ۱/۲۱۷) حالانکہ امام ترمذی نے صرف اتنا لکھا تھا کہ اہل علم صحابہ وتابعین اور ان کے بعد کے حضرات ومراعاۃ ص ۱/۵۵۶ تا ص ۱/۵۵۸) میں سے بعض ناف کے اوپر ہاتھ باندھتے تھے اور بعض نیچے، ان دومسلکوں کے علاوہ اور کوئی مذہب ہی نہ تھا لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ صدیاں گذرنے کے بعد ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوگا جو تیسری شکل نکالے گا اور اپنے زعم میں اسی کو حق واحق ثابت کرکے رہے گا، پھر امام ترمذی نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ کوئی اہم، خلاف واختلاف نہیں ہے، ہر صورت کی گنجائش سب کے نزدیک ہے۔

زیادہ بحث وتحقیق تو اپنے مقام پر آئے گی، ایک ضروری بات یہاں بھی عرض کرنی ہے، جو فائدہ سے خالی نہیں کہ نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کی حدیث صحیح ابن خزیمہ میں ہے، جس کے دو راوی ضعیف ہیں، اس لئے صاحب تحفہ ومرعاۃ دونوں نے اس کو صحیح وقوی ثابت کرنے کی پوری سعی کی ہے۔ صحیح ابن خزیمہ خدا کا شکر ہے اب مکہ معظمہ سے شائع ہورہی ہے حیرت ہے کہ سعودی دور حکمت میں مکہ معظمہ سے شائع ہونے والی کتاب میں اس ضعیف حدیث کی نہ صرف صحت بلکہ حاشیہ میں قوت بھی بتلائی گئی ہے جبکہ امام احمدؒ اس کو بے اصل فرما چکے ہیں اور محدث ابن المنذر نے بھی کہا کہ اس بارے میں نبی اکرم ﷺ سے کوئی چیز ثابت نہیں ہے۔ (انوار المحمود ص ۱/۲۶۸) اور علامہ محدث ابو الطیب مدنی نے شرح ترمذی میں فرمایا کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی نے بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کو اختیار نہیں کیا ہے (معارف ص ۲/۴۳۶) اسکا مطلب یہ ہوا کہ دور متقدمین کے لحاظ سے اب ساری قدریں ہی بدل گئیں اور تحقیق کے زاویے بھی نت نئے سانچوں میں ڈھل گئے ہیں، ہر نیا مسلک اپنی برتری واحقیت ثابت کرنے کے لئے کسی بھی صحیح وقوی حدیث کو ضعیف وبے اصل اور بے اصل کو قوی باور کراسکتا ہے۔

واضح ہو کہ امام ابوحنیفہ، سفیان ثوری، اسحٰق بن راہویہ اور ابو اسحٰق مروزی شافعی تحت السرہ ہاتھ باندھنے کے قائل ہیں، امام شافعی فوق السرہ، تحت الصدر کے قائل ہیں، ابن ہبیرہ نے مشہور روایت امام احمدؒ سے بھی امام ابوحنیفہ کے موافق نقل کی ہے، اور دوسرے دلائل کے علاوہ حنفیہ کے لئے مصنف ابن ابی شیبہ کے آثار بھی ہیں۔ اس میں یہ جھگڑا پڑ گیا کہ کسی قلمی نسخہ میں وہ تھے کسی میں نہیں۔ اس لئے اہل احدیث

حضرات کوموقع ملا اورانھوں نے بعض حنفی علماء کے اقوال بھی پیش کر دیئے کہ انھوں نے بھی قلمی نسخہ میں نہیں پائے۔ اس سلسلے میں ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ ابوالطیب سندی نے شیخ عبدالقادر کے مکتبہ کے نسخہ میں اس کوموجود پایا اور علامہ قاسم بن قطاء بغاء نے بھی جو مسلم جلیل القدر حافظ حدیث ہیں بتلایا کہ یہ آثار مصنف کے قلمی نسخہ میں موجود ہیں، لہٰذا ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے (العرف ص۱۶۳) راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ قلمی نسخوں میں حذف والحاق اور کاتبوں و ناقلوں کی اغلاط ومسامحات بہ کثرت رہی ہیں اور اب خدا کا شکر ہے مصنف ابن ابی شیبہ صحیح قلمی نسخوں سے مقابلہ کے بعد پوری صحت کے ساتھ حیدرآباد سے شائع ہورہی ہے اور اس میں ص۳۹۰/ او ص۳۹۱/ا میں تین جگہ تحت السرہ کی تصریح موجود ہے جن میں ایک قول حضرت علیؓ کا بھی ہے جو بحکم مرفوع ہے۔

باب اذا قام الرجل عن يسار الامام وحوله الامام خلفه الیٰ يمينه تمت صلوته

(اگر کوئی شخص امام کے بائیں طرف کھڑا ہوا اور امام اس کو اپنے پیچھے سے اپنے دائیں طرف سے آئے تو اس کی نماز صحیح ہو جائے گی)

۶۸۷: حدثنا قتيبة بن سعيدؓ قال نادٰاؤد عن عمرو بن دينار عن كريب مولى ابن عباس عن ابن عباس قال صليت مع النبی صلے الله عليه وسلم ذات ليلة فقمت عن يساره فاخذ رسول الله صلے الله عليه وسلم براسی من ورآئی فجعلنی عن يمينه فصلی ورقد فجآء ه المؤذن فقام يصلی ولم يتوضأ

ترجمہ۶۸۷: حضرت کریب (ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام) حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک شب نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز (تہجد) پڑھی، تو میں (ناواقفیت کی وجہ سے) آپ کے بائیں جانب کھڑا ہوگیا، رسول خدا ﷺ نے میرا سر میرے پیچھے سے پکڑ کر مجھے (اپنی داہنی جانب کرلیا اور آپ نے نماز پڑھی اور سورہے پھر آپ کے پاس موذن آیا تو آپ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوگئے اور وضو نہیں کیا۔

تشریح: حضرت ابن عباسؓ کی یہ حدیث ص۹۷ میں بھی کچھ فرق کے ساتھ آچکی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ وہاں امام ومقتدی کا اصل مقام بتلانا مقصود تھا اور تحویل کا مسئلہ ضمناً آیا تھا، یہاں یہی مقصود ہے، یا وہاں مقصود عمل قلیل وکثیر کا بیان تھا، اور یہاں یہ کہ نماز پوری ہوگئی، اگرچہ کچھ حصہ نماز کا خلاف ترتیب موضع مقتدی بھی ہوا، امام بخاریؒ تھوڑی تھوڑی باریکیوں کا خیال فرما کر تراجم وعنوانات بدل کر احادیث بکثرت لاتے ہیں۔

باب المراة وحدها تكون صفاً

تنہا عورت (بھی) ایک صف (کی طرح) ہے

۶۸۸: حدثنا عبدالله بن محمد قال ثنا سفيٰن عن اسحاق عن انس بن مالک قال صليت انا ويتيم فی بيتنا خلف النبی صلے الله عليه وسلم و امی خلفنا ام سليم

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے، اور ایک یتیم بچے نے اپنے گھر میں رسول خدا ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، تو میری ماں ام سلیمؓ ہم سب کے پیچھے تھیں۔

تشریح: فقہ میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر نابالغ لڑکا ایک ہو تو وہ بالغوں کے ساتھ صف میں کھڑا ہو، زیادہ ہوں تو بالغوں کی صف کے پیچھے کھڑے ہوں ان کی صف میں کھڑے ہوں گے تو کراہت ہوگی، لیکن عورت کی جگہ خواہ وہ ایک ہو یا زیادہ مردوں کی صف کے پیچھے ہی ہے اور اسی لئے ہمارے امام اعظمؒ نے کہا کہ عورت کا مرد کے برابر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مفسد صلوٰۃ ہے، کیونکہ اس کے لئے مردوں کے برابر کھڑے ہونے کی کوئی مشروع صورت نہیں ہے، حضرتؒ نے فرمایا کہ ایسی چیزوں کا فیصلہ شریعت مطہرہ کا مزاج پہچاننے والے ہی کر سکتے ہیں، و من لم يذق لم يدر خود امام بخاریؒ نے بھی آخر کتاب الاذان (ص۱۲۰) میں باب صلوٰة النساء خلف الرجال قائم کیا ہے اور یہاں سے

بھی معلوم ہوا کہ عورت کا مقام نماز جماعت میں کیا ہے، اسی سے ترتیب سمجھ کر حنفیہ نے اوپر کے مسائل نکالے ہیں۔

یہ تحقیق غالباً حضرت تھانویؒ کے افادات میں کہیں دیکھی ہے۔ لہٰذا مزید تحقیق وتوثیق کردی جائے تو بہتر ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ نزول رحمت بھی اسی ثواب والی ترتیب کے موافق ہو۔ یہ نہ ہو کہ وہ پہلے سارے داہنی طرف والوں کے لئے ہو اور پھر سب بائیں جانب والوں کے لئے۔ کیونکہ قرب امام والی فضیلت بظاہر اس میں بھی مرعی ہوگی۔

غرض رحمت وثواب ہر دو انعامات کی تقسیم مطابق وحی نبوی ہونی چاہیے۔ و الله تعالى اعلم و علمه اتم

باب ميمنة المسجد والامام

(مسجد اور امام کی داہنی جانب کی رعایت)

۶۸۹: حدثنا موسیٰ قال نا ثابت بن يزيد نا عاصم عن الشعبی عن ابن عباسؓ قال قمت ليلة اصلے عن يسار النبی صلے الله عليه وسلم فاخذ بيدی او بعضدی حتیٰ اقامنی عن يمينه وقال بيده من ورآئ

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شب نماز (تہجد) پڑھنے کے لئے میں نبی کریم ﷺ کے بائیں جانب کھڑا ہوگیا، تو آپ نے میرا ہاتھ یا میرا شانہ پکڑ کر مجھے اپنی داہنی جانب کھڑا کرلیا۔ اور اپنے ہاتھ سے میرے پیچھے سے اشارہ کیا۔

تشریح: امام بخاریؒ نے مسجد کی داہنی جانب بھی امام کے اعتبار سے متعین کی ہے، یعنی دونوں کا میمنہ ایک قرار دیا، حضرتؒ نے فرمایا:۔ اس مسئلہ کی طرف فقہاء نے تعرض نہیں کیا کیونکہ اس کی ضرورت نہ تھی البتہ حدیث والوں کو اس کی ضرورت ہے، کیونکہ حدیث میں وارد ہوا رحمت خداوندی نماز کے وقت اولاً امام پر اترتی ہے، پھر ان لوگوں پر جو اس کے دائیں جانب نماز میں ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد بائیں جانب کے نمازیوں پر اترتی ہے۔

یہ تو نزول رحمت کی کیفیت ہوئی، اور ثواب کی زیادتی کوکمی کا انحصار امام کے قریب کے ساتھ دائیں بائیں کی رعایت سے ہوتا ہے، مثلاً سب سے زیادہ ثواب اقرب الی الامام ہونے کی وجہ سے امام کے پیچھے والے مقتدی کے لئے ہوگا۔ پھر اس کے لئے جو اس پیچھے والے کی دائیں جانب ہوگا، کیونکہ دوسرے نمبر پر وہ قریب بھی ہے اور دائیں جانب بھی، تیسرے نمبر پر ثواب اس کے لئے ہوگا جو پیچھے والے کی بائیں جانب ہو گا کیونکہ وہ بہ نسبت ص۲ کے یمین والے کے اقرب الی الامام ہے۔ پھر چوتھے نمبر پر زیادہ ثواب داہنی جانب والے دوسرے مقتدی کے لئے اور پانچویں نمبر پر بائیں طرف کے دوسرے کے لئے۔ اور پھر اسی طرح دائیں بائیں والے مقتدیوں کو کم وبیش ہوکر ملے گا= واللہ تعالیٰ اعلم

باب اذا كان بين الامام و بين القوم حائط اوسترة وقال الحسن لاباس ان تصلے و بينک و بينه' نهر وقال ابومجلز تاتم بالامام وان كان بينهما طريق اوجدار اذا سمع تكبير الامام

اگر امام اور لوگوں کے درمیان کوئی دیوار یا سترہ ہو' اور حسن بصری کا قول ہے کہ اگر تمہارے اور امام کے درمیان نہر حائل ہو تو بھی اقتدا کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور ابومجلز کہتے ہیں کہ امام کی اقتدا کرلے' اگرچہ دونوں کے درمیان میں کوئی راستہ یا دیوار ہو' بشرطیکہ امام کی تکبیر سن لے۔

۶۹۰: حدثنا محمد بن سلام قال نا عبدة عن يحيیٰ بن سعيد الانصاری عن عمرة عن عآئشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلی من الليل فی حجرته وجدار الحجرة قصير فرای الناس شخص النبی صلے الله عليه وسلم فقام اناس يصلون بصلوته فاصبحوا فتحدثوا بذٰلک فقام الليلة الثانية

فقام معه اناس يصلون بصلوته ضعوا ذلك ليلتين او ثلثا حتىٰ اذاكان بعد ذلك جلس رسول الله صلى الله عليه وسلم فلم يخرج فلما اصبح ذكر ذلك الناس فقال انى خشيت ان تكتب عليكم صلوٰة الليل

ترجمہ: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نماز شب اپنے حجرے میں پڑھا کرتے تھے اور حجرے کی دیوار چھوٹی تھی تو لوگوں نے نبی کریم ﷺ کا جسم دیکھ لیا، اور کچھ لوگ آپ کی نماز کی اقتدا کرنے کھڑے ہو گئے، جب صبح ہوئی، تو انھوں نے اس کا چرچا کیا، پھر دوسری رات کو آپ کھڑے ہوگئے دورات، یا تین رات لوگوں نے یہی کیا، یہاں تک کہ جب اس کے بعد رات ہوئی تو رسول خدا ﷺ بیٹھ رہے، اور نہیں نکلے، صبح کو لوگوں نے اس کا ذکر کیا آپ نے فرمایا مجھے یہ خوف ہو گیا کہ (اس التزام کی وجہ سے کہیں) نماز شب تم پر فرض کردی جائے۔

تشریح: امام بخاری حدیث الباب سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر امام ومقتدیوں کے درمیان دیوار یا راستہ حائل ہو تب بھی اقتدا درست رہے گی (یہی مالکیہ کا مذہب بھی ہے) اور اس کی تائید آثار وحدیث الباب سے پیش کی حنفیہ کا مسلک اس میں یہ ہے کہ مسجد ساری ایک مکان کے حکم میں ہے، اگر مسجد کے اندر ایسی صورت پیش آجائے کہ امام اور مقتدیوں کے درمیان دیواریں حائل ہوں تو ایک قول تو یہ ہے کہ منفذ شرط ہے کہ اس میں امام کے انتقالات کو دیکھ کر اقتدا کریں۔ دوسرا یہ ہے کہ منفذ شرط نہیں بلکہ صرف انتقالات امام کا علم ہو سکے اتنا کافی ہے مثلاً اس کی یا مکبر کی آواز سن لیں، اسی قول پر فتویٰ بھی ہے۔ اور صحراء میں جماعت ہو تو امام یا اس سے ملحقہ صف سے جدا شدہ صفوف کا بعد تین صف کی مقدار سے کم ہو، اگر اتنا ہو یا زیادہ تو اقتداء درست نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر جدا صفوں کے درمیان عام راستہ یا نہر حائل ہو جس پر کشتیاں چلتی ہوں تو اس کو الگ مکان سمجھا جائے گا۔ اور اقتدا صحیح نہ ہوگی۔ امام اوزاعی لیث اور اشہب کا بھی یہی قول ہے، اور اس کے لئے ان کا مستدل حضرت عمرؓ کا اثر ہے کہ جب امام ومقتدی کے درمیان راستہ ہو یا نہر یا دیوار تو اقتدا نہ ہوگی (عمدہ ص ۷۹۸/۲)

قوله وجدارا لحجرة قصير، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بعض شارحین نے اس کو مسجد نبوی کا واقعہ قرار دیا ہے اور کہا کہ جدار سے مراد معتکف کی دیوار ہے جو بوریوں کی دیوار تھی، ان کے پاس بھی روایتیں ہیں، (اگلے باب میں ۲-۳ حدیث بعد بخاری میں بھی ہے) میرے نزدیک یہ بہت بڑا مجاز ہے کہ جدار سے مراد بوریوں کی دیوار ہو، اور میری رائے یہ ہے کہ دو واقعے الگ الگ ہوئے ہیں۔

باب صلوٰة الليل
(نماز شب کا بیان)

۶۹۱: حدثنا ابراهيم بن المنذر قال نا ابن ابى فديك قال نا ابن ابى ذئب عن المقبرى عن ابى سلمة بن عبدالرحمٰن عن عائشة ان النبى صلى الله عليه وسلم كان له حصير يبسطه بالنهار و يحتجره بالليل فثاب اليه ناس فصفوا وراءه

۶۹۲: حدثنا عبدالاعلى بن حماد قال ناوهيب قال ناموسى بن عقبة عن سالم ابى النضر عن بسر بن سعيد عن زيد بن ثابت ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اتخذ حجرة قال حسبت انه قال من حصير فى رمضان فصلىٰ فيها ليالى فصلىٰ بصلوته ناس من اصحابه فلما علم بهم جعل يقعد فخرج اليهم فقال قدعرفت الذى رايت من صنيعكم فصلوا ايهاالناس فى بيوتكم فان افضل الصلوٰة صلوٰة المرء فى بيته الاالمكتوبة وقال عفان نا وهيب قال نا موسىٰ قال سمعت اباالنضرعن بسرعن زيد عن النبى صلى الله عليه وسلم

ترجمہ ۶۹۱: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک چٹائی تھی، جس کو آپ دن میں بچھا لیتے تھے اور رات کو اسی کا پردہ ڈال لیتے تھے، تو کچھ لوگ آپ کے پاس جمع ہونے لگے۔ اور انھوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھنا شروع کردی۔

ترجمہ ۶۹۲: حضرت زید بن ثابتؓ روایت کرتے ہیں رسول خدا علیہ نے رمضان میں ایک حجرہ بنایا تھا (سعید کہتے ہیں مجھے خیال آتا ہے کہ زید بن ثابت نے یہ کہا تھا کہ وہ چٹائی کا تھا) اور اس میں چند شب آپ نے نماز پڑھی اس کا علم آپ کے اصحاب کو ہو گیا اس لئے انھوں نے، آپ کی نماز کی اقتدا کی، مگر جب آپ کو ان کا علم ہوا، تو آپ بیٹھ رہے، پھر (صبح کو) ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے تمہارا فعل دیکھا، اسے سمجھ لیا (یعنی تم کو عبادت کا شوق ہے) تو اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھو، کیونکہ فرض نماز کے علاوہ آدمی کی نمازوں میں افضل نماز وہ ہے جو اس کے گھر میں ہو۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں پر امام بخاری کا اس باب کو درمیان میں لے آنا عجیب سا ہے کیونکہ ابھی تو صفت صلوٰۃ کے ابواب آئے بھی نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بخاری کا انجاز ہے، گذشتہ باب میں چونکہ صلوٰۃ اللیل کا ذکر آ گیا تھا، اس لئے یہاں کا مستقل ترجمہ ہی قبل از وقت رکھ دیا کہ ان کی عادت ہے اس طرح ضمنی تراجم وابواب لانے کی۔ اور ممکن ہے گذشتہ باب کی حدیث کے قصہ کی تعیین مقصود ہو کہ یہاں حضور علیہ السلام کے لئے حصیر ہونے کا ذکر ہے، اور شاید بعض شارحین نے اسی سے سمجھا ہو کہ اس واقعہ میں آپ کا حجرہ حصیر (بوریے) کا تھا۔

قولہ فان افضل صلوٰۃ المرء فی بیتہ۔ فرمایا: شریعت نوافل کو مساجد میں اور فرائض کو گھروں میں پسند نہیں کرتی۔ امام طحاوی کا مختار یہ ہے کہ ایک شخص اگر حافظ ہو تو اس کے لئے افضل یہ ہے کہ تراویح گھر پر پڑھے، ورنہ مسجد میں، حضور علیہ السلام عام طور سے سنتیں بھی گھر پر پڑھتے تھے اور صبح کی سنتیں تو مسجد میں ثابت ہی نہیں، حافظ زین عراقی (شیخ ابن حجر) اور حافظ عینی نے ایک روایت ذکر کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھر اور مسجد کے ثواب میں وہی نسبت ہے جو جماعت اور تنہا نماز کے ثواب میں ہے، اس حدیث کی اسناد جید ہے۔ علامہ عینی نے کچھ اور احادیث بھی یہاں ذکر کی ہیں، جو بہ نظر افادہ لکھی جاتی ہیں:۔

فضل صلوٰۃ الرجل فی بیتہ علی صلوٰتہ حیث یراہ الناس کفضل المکتوبۃ علی النافلۃ (محجمہ کبیر طبرانی) عمدہ ص ۲/۸۰۳

صلوٰۃ المرء فی بیتہ افضل من صلوٰتہ فی مسجدی ھذاالا المکتوبۃ و اسنادھا صحیح (ابو داؤد)

فعلی ھذا الو صلی نافلۃ فی مسجد المدینۃ کا نت بالف صلوٰۃ علی القول بدخول النوافل فی عموم الحدیث و اذا صلاھا فی بیتہ کانت افضل من الف صلوٰۃ. وھکذا حکم مسجد مکۃ و بیت المقدس الخ (عمدہ ص ۲/۸۰۳)

آخر میں علامہ عینی نے لکھا کہ حدیث ابن عمرؓ صلوا فی بیوتکم کے سلسلہ میں جمہور کی رائے قاضی عیاض نے یہ نقل کی ہے کہ نفل نماز میں اخفاء محبوب ہے، پھر بعض کی رائے فرضوں کے لئے بھی یہی نقل کی کہ بعض فرائض بھی گھروں میں ادا کئے جائیں تا کہ جو گھر سے باہر نہیں نکلتے ان کے لئے نماز کی ترغیب ہو، جیسے عورتیں، غلام مریض وغیرہ۔

علامہ نووی کی رائے یہی ہے کہ حدیث ابن عمر میں مراد صرف نوافل ہیں۔ فرائض نہیں۔ گھر میں نوافل کا فائدہ علاوہ اخفا کے یہ بھی ہے کہ اس میں ریا سے دوری ہے اور نماز کا ثواب کم کرنے والی بہت سی چیزوں سے حفاظت ہوگی، گھر میں برکت ورحمت اور فرشتوں کا نزول ہوگا اور شیطان اس گھر سے مایوس ونفور ہوگا۔ (عمدہ ص ۲/۸۰۴)

باب ایجاب التکبیر والافتتاح الصلوٰۃ

(تکبیر تحریمہ کے واجب ہونے اور نماز شروع کرنے کا بیان)

۶۹۳: حدثنا ابو الیمان قال انا شعیب عن الزهری قال اخبرنی انس بن مالک ن الانصاری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکب فرساً فحجش شقه الایمن وقال انس فصلی لنا یومئذ صلوٰۃ من الصلوٰۃ وهو قاعد فصلینا ورآء ہ قعوداً ثم قال لما سلم انما جعل الامام لیؤتم به فاذا صلی قآئماً فصلوا قیاماً واذا رکع فارکعوا واذارفع فارفعوا واذاسجدفاسجدوا واذاقال سمع اللہ لمن حمده فقولواربنا ولک الحمد

۶۹۴: حدثنا قتیبة بن سعید قال نا اللیث عن ابن شهاب عن انس بن مالک انه قال خررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن فرس فحجش فصلی لنا قاعداً فصلینا معه قعوداً ثم انصرت فقال انما الامام لیؤتم به فاذا کبرفکبروا واذا رکع فارکعوا واذارفع فارفعوا واذا قال سمع اللہ لمن حمده فقولواربنا ولک الحمد واذاسجد فاسجدوا

۶۹۵: حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب قال حدثنی ابوالزناد عن الاعرج عن ابی هریرة قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انما جعل الامام لیؤتم به فاذا کبرفکبروا واذارکع فارکعوا واذاقال سمع اللہ لمن حمده فقولواربنا ولک الحمد واذاسجدفاسجدوا واذاصلی جالساً اجلوساً اجمعون

ترجمہ۶۹۳: حضرت انس بن مالک انصاریؓ روایت کرتے ہیں، کہ رسول خدا ﷺ (ایک مرتبہ) گھوڑے پر سوار ہوئے (اور گر پڑے) تو آپ کی بائیں جانب کچھ زخمی ہوگئی، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس دن آپ نے کوئی سی نماز ہمیں بیٹھ کر پڑھائی۔ تو ہم نے بھی آپ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی، پھر جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، لہٰذا جب وہ کھڑے ہو کر پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر پڑھو، اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، اور جب وہ (سر) اٹھائے تو تم بھی اٹھاؤ، اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو، اور جب وہ سمع اللہ لمن حمده کہے، تو تم ربنا ولک الحمد کہو:۔

ترجمہ۶۹۴: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں ایک مرتبہ رسول خدا ﷺ گھوڑے سے گر پڑے تو (کچھ بدن آپ کا) چھل گیا، اس وجہ سے آپ نے ہمیں بیٹھ کر نماز پڑھائی تو ہم نے بھی آپ کے ہمراہ بیٹھ کر نماز پڑھی، جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس اقتدا کی جائے، جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، جب وہ (سر) اٹھائے تو تم بھی اٹھاؤ، اور جب وہ سمع اللہ لمن حمده کہے تو تم ربنا ولک الحمد کہو۔ اور جب وہ سجدہ کرے، تو تم بھی سجدہ کرو۔

ترجمہ۶۹۵: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے، کہ اس کی اقتدا کی جائے۔ لہٰذا جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، اور جب وہ سمع اللہ لمن حمده کہے، تو تم ربنا ولک الحمد کہو، اور جب وہ سجدہ کرے، تو تم بھی سجدہ کرو۔ اور جب وہ بیٹھ کر پڑھے، تو تم سب بیٹھ کر پڑھو۔

تشریح: محقق عینیؒ نے فرمایا:۔ امام بخاریؒ احکام جماعت واوقات وتسویۂ صفوف کی ۱۲۲۔ احادیث اور ۱۷۔ آثار صحابہ وتابعین کا ذکر کرنے کے بعد اب نماز کی صفت وکیفیت مع جمیع متعلقات کا بیان یہاں سے شروع کر رہے ہیں۔

یہ پہلا باب تکبیر تحریمہ کا ہے۔ جس کے ساتھ نماز شروع ہوگئی ہے۔ اس تکبیر تحریمہ کو امام ابوحنیفہؒ نے شرط صحت صلوٰۃ قرار دیا ہے، امام مالک،

شافعی واحمدؒ اس کو رکن صلوٰۃ مانتے ہیں،بعض حضرات اس طرف بھی گئے ہیں کہ نماز محض نیت کرنے سے اور بغیر تکبیر تحریمہ کے بھی صحیح ہو جاتی ہے۔

دوسرا اختلاف اس بارے میں یہ ہے کہ کیا تکبیر تحریمہ کا اطلاق صرف ''اللہ اکبر'' پر ہوگا جو امام ابو یوسف، امام مالک، شافعی واحمدؒ فرماتے ہیں۔ یا اس کی جگہ تسبیح، تہلیل وغیرہ کلمات تعظیم بھی کافی ہیں، امام ابوحنیفہ وامام محمدؒ کے نزدیک ہر کلمہ تعظیم کے ساتھ نماز صحیح ہو جائے گی، ان حضرات کا استدلال ان احادیث سے ہے، جن میں ہے کہ حضور علیہ السلام نماز کو تکبیر کے ساتھ شروع کرتے تھے، اور ایک حدیث میں اللہ اکبر کہنے کا بھی ذکر ہے، علامہ عینی نے فرمایا کہ تکبیر تو بمعنی تعظیم ہے، جیسے آیت **فلما راینه اکبرنه** اور **وربک فکبر** وغیرہ میں ہے، لہٰذا جس کلمہ سے حق تعالیٰ کی تعظیم ہوگی، اس سے نماز شروع کر سکتے ہیں، صرف اللہ اکبر کے ساتھ تخصیص کیوں کی جائے، پھر نص قرآنی بھی ہے **و ذکر اسم ربه فصلے**، اس سے بھی معلوم ہوا کہ خدا کے کسی نام سے بھی نماز شروع کر سکتے ہیں لہٰذا **الرحمن اعظم** بھی اللہ اکبر کی طرح جائز ہونا چاہئے۔ دوسری آیت میں ہے **وللہ الاسماء الحسنى فادعوه بها** اور حدیث میں ہے، **امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا اله الا اللہ، یا لا اله الا الرحمان** وغیرہ سے ایمان ثابت ہو جاتا ہے جو اسلام کی اصل ہے تو ان سب سے فروع اسلام نماز وغیرہ کیوں صحیح نہ ہوں گی۔ اور سنن ابن ابی شیبہ میں ہے کہ ابوالعالیہ سے سوال کیا گیا کہ انبیاء علیہم السلام کس چیز کے ساتھ نماز کو شروع کرتے تھے؟ تو فرمایا کہ توحید سے اور تسبیح وتہلیل سے، علامہ شعبی ونخعی نے فرمایا کہ خدا کے جس نام سے بھی نماز شروع کی جائے صحیح ہو جائے گی۔ (عمدہ ص ۲/۳)

غرض دوسرے ائمہ کا استدلال اخبار آحاد سے ہے اور امام اعظمؒ کا استدلال نصوص قرآنی ہے، اسی طرح آیت **وربک فکبر** سے بھی مطلق تعظیم ہی نکلتی ہے، اس سلسلہ میں جو دوسرے امور ضمنا بحث طلب ہیں وہ معارف السنن ص ۵۴/۱ تا ص ۴۷/۱ میں قابل مطالعہ ہیں۔

امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں وجوب تکبیر کا ذکر کیا ہے، اس تکبیر کو بھی بمعنی لغوی تعظیم لے سکتے ہیں، تو حنفیہ کے خلاف نہ ہوگا۔ پھر پہلی حدیث الباب میں تو تکبیر کا بھی ذکر نہیں ہے، تاویل سے ہی مطابقت ترجمہ ہوگی، دوسری وتیسری حدیث میں تکبیر کا حکم ہے، جس سے خاص اللہ اکبر کی فرضیت نہیں نکلے گی۔ البتہ ایجاب وفرضیت سے امام صاحب کے خلاف ہوگا کہ وہ فرض نہیں، شرط کے درجہ میں مانتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ یہاں بھی الفاظ حدیث **انما جعل الامام لیؤتم به** الخ سے اقتداء قائم خلف القاعد کا مسئلہ آئے گا۔ جو دوسری جگہ بھی آیا ہے اور اس مسئلہ میں شافعیہ اور جمہور حنفیہ کے ساتھ ہیں کہ مقتدی تندرست ہوں تو وہ معذور کے پیچھے (جو بیٹھ کر نماز پڑھائے گا) کھڑے ہو کر نماز پڑھیں گے۔ اور ان کے لئے اس امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہوگا۔ اس مسئلہ میں امام احمد یہ کہتے ہیں کہ تندرست مقتدیوں کو بھی امام کے اتباع میں نماز بیٹھ کر پڑھنی ضروری وواجب ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ قاعد امام کے پیچھے اقتدا جائز ہی نہیں نہ کھڑے ہو کر نہ بیٹھ کر۔

حضرتؒ نے درمیان کے حالات پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ وہ سب پہلے کے وقتی احکام تھے، اور مصالح پر مبنی تھے، آخر میں مرض وفات میں جو آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور پیچھے مقتدی سب کھڑے تھے، یہی حضور علیہ السلام کا آخری فیصلہ ہے اور اسی کو امام بخاریؒ اور جمہور و حنفیہ سب نے ناسخ مان کر معمول بہ قرار دیا ہے پوری تفصیل فیض الباری ص ۲/۲۴۳ تا ص ۲/۲۵۱ میں دیکھی جائے۔

باب رفع اليدين فى التكبيرة الاولىٰ مع الافتتاح سوآءً

(پہلی تکبیر میں نماز شروع کرنے کے ساتھ دونوں ہاتھوں کے اٹھانے کا بیان)

۶۹۶: حدثنا عبدالله بن مسلمة عن مالک عن ابن شهاب عن سالم ابن عبدالله عن ابيه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يرفع يديه حذو منكبيه اذا افتتح الصلوٰة واذا كبر للركوع واذا رفع راسه من الركوع رفعهما كذلک ايضاً وقال سمع الله لمن حمده ربنا لک الحمد وكان لا يفعل ذٰلک في السجود

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ جب نماز شروع فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ شانوں کے برابر اٹھاتے، اور جب رکوع کے لئے تکبیر کہتے، اور جب اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تب بھی دونوں ہاتھ اسی طرح اٹھاتے، اور سمع الله لمن حمده ربنا ولک الحمد (دونوں) کہتے (لیکن) سجدے میں یہ (عمل) نہ کرتے تھے۔

تشریح: امام بخاریؒ نے یہاں چار باب قائم کئے ہیں، اور ان کے ماتحت پانچ حدیثیں لائے ہیں، جن میں رفع یدین کا ذکر ہے، اور تین میں ہاتھوں کو پہلی تکبیر پر مونڈھوں تک اٹھانے کا بھی ذکر ہے، پہلے باب میں یہ بھی ثابت کیا کہ تکبیر تحریمہ اور رفع یدین ایک ساتھ ہوں۔

یہاں اگرچہ امام بخاریؒ زیادہ قوت کے ساتھ رفع یدین کا مسئلہ پیش کرنا چاہتے ہیں، اور ضمناً دوسری باتیں بھی آ گئی ہیں، اس لئے ہم پہلے ان ذیلی امور پر روشنی ڈالیں گے، اور آخر رفع یدین پوری بحث لائیں گے۔ ان شاء اللہ

تکبیر تحریمہ اور رفع یدین کا ساتھ

شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک دونوں کی مقارنت اور ایک ساتھ ہونا ہی ہے، حنفیہ تکبیر تحریمہ کی تقدیم کے قائل ہیں اور محدث ابن تیمیہ نے "منتقیٰ" میں شیخین اور ابوداؤد وغیرہ کی طرف، یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ جب حضور علیہ السلام نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو مونڈھوں تک دونوں ہاتھ اٹھاتے اور پھر تکبیر کہتے تھے، اس سے حنفیہ کی ہی تائید ہوتی ہے، اور روایات کے الفاظ مختلف آئے ہیں، یہاں جو حدیث الباب امام بخاریؒ لائے ہیں، وہ مقارنت وغیرہ سے ساکت ہے، (اوجز ص۲۰۲/۱) تاہم حافظ اور عینیؒ نے ظاہر حدیث الباب سے اس کو ثابت مان کر مطابقت تسلیم کر لی ہے۔ حافظ و عینی نے حدیث مسلم کا بھی حوالہ دیا ہے، جس میں "رفع يديه ثم كبر" وارد ہے وہ تقدیم رفع یدین کے لئے صریح ہے۔ جو حنفیہ کا مختار ہے۔

باب رفع اليدين اذا كبروا اذا ركع واذا رفع

دونوں ہاتھوں کے اٹھانے کا بیان جب تکبیر تحریمہ کئے اور جب رکوع کرے اور جب رکوع سے سر اٹھائے

۶۹۷: حدثنا محمد بن مقاتل قال اخبرنا عبدالله بن المبارک قال اخبرنا يونس عن الزهري قال اخبرني سالم بن عبدالله عن عبدالله ابن عمر قال رايت رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قام فى الصلوٰة رفع يديه حتىٰ تكونا حذو منكبيه وكان يفعل ذٰلک حين يكبر للركوع ويفعل ذٰلک اذا رفع راسه من الركوع ويقول سمع الله لمن حمده ولا يفعل ذٰلک فى السجود

۶۹۸: حدثنا اسحاق الواسطى قال حدثنا خالد بن عبدالله عن خالد عن ابى قلابة انه رای مالک بن الحويرث اذا صلى كبر ورفع يديه واذا اراد ان يركع رفع يديه واذا رفع راسه من الركوع رفع يديه وحدث ان رسول الله صلى الله عليه وسلم صنع هٰكذا

ترجمہ ۶۹۷: حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ نماز میں اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں شانوں کے برابر تک اٹھاتے، اور جب آپ رکوع کے لئے تکبیر کہتے یہی (اس وقت بھی) کرتے، اور یہی جب آپ (رکوع سے) اپنا سر اٹھاتے (اس وقت بھی، کرتے، اور سمع اللہ لمن حمدہ کہتے (لیکن) سجدہ میں آپ یہ (عمل) نہ کرتے تھے۔

ترجمہ ۶۹۸: حضرت ابو قلابہ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے مالک بن حویرث کو دیکھا کہ جب وہ نماز شروع کرتے تو تکبیر کہتے وقت اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب رکوع کرنا چاہتے، تو بھی اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے، اور جب رکوع سے اپنا سر اٹھاتے، تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے، اور مالک بن حویرثؓ نے یہ بیان کیا کہ رسول خدا ﷺ نے اسی طرح کیا تھا۔

تشریح: یہاں امام بخاریؒ نے کھل کر ''رفع یدین'' کا باب باندھا ہے، جس کے اثبات اور احقیت کے لئے یہاں سے بھی زیادہ الگ مستقل رسالہ تالیف کر کے پورا زور صرف کیا ہے، اور اس کا نہایت مکمل و مدلل جواب ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی مستقل تالیف میں دیا ہے۔ جس طرح امام بخاریؒ نے ''فاتحہ خلف الامام'' کے مسئلہ پر بھی مستقل رسالہ تالیف کیا اور اس کا بھی نہایت محققانہ ومحدثانہ جواب حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے۔ حضرتؒ کے دونوں رسائل ''نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین'' اور فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب'' علماء امت کے لئے نہایت گراں قدر علمی ذخیرہ ہیں۔

حضرتؒ نے امام بخاریؒ کا پورا ادب واحترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہر جز وکی تحقیق وجواب دہی کی ہے، جو اساتذہ حدیث کے لئے لائق مطالعہ ہے۔ امام بخاریؒ نے اس باب کی پہلی حدیث میں یہ بھی روایت کی کہ حضور علیہ السلام سجود کے ساتھ رفع یدین نہیں کرتے تھے، حالانکہ نسائی میں مالک بن الحویرث سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے سجدہ کو جاتے ہوئے اور سجدہ سے سر اٹھاتے ہوئے بھی رفع یدین کیا ہے۔ حافظ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے اور ابویعلی نے حضرت انسؓ سے حدیث روایت کی کہ حضور علیہ السلام رکوع وسجود دونوں میں رفع یدین کرتے تھے، محدث ہیثمی نے کہا کہ اس کے رجال، رجال صحیح ہیں وغیرہ (اوجز ص ۱/۲۰۴)

امام بخاریؒ اگلے باب کی حدیث میں بھی یہی روایت کریں گے کہ حضور علیہ السلام سجدہ سے پہلے اور اس کے بعد رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ گویا جس طرح امام شافعیؒ نے دو جگہ (رکوع سے قبل وبعد) کے رفع یدین کو معمول بہ بتایا ہے، وہی رائے امام بخاریؒ کی بھی ہے، دونوں نے مذکورہ بالا دوسری احادیث صحیحہ پر عمل ترک کیا ہے البتہ یہ فرق ہے کہ امام بخاری آگے ایک مستقل باب رکعتین سے اٹھتے ہوئے بھی رفع یدین کرنے کا قائم کریں گے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے دو کے علاوہ اس تیسرے رفع کے بھی قائل ہیں۔ اور امام بخاری کی یہ عادت تو پہلے سے معلوم ہے کہ وہ صرف اپنی رائے کے موافق حدیثیں ذکر کرتے ہیں اور اس کے مخالف کو ذکر بھی نہیں کرتے۔ برخلاف دوسرے محدثین مسلم، ترمذی، ابوداؤد نسائی ومصنف ابن ابی شیبہ ومسند احمد وغیرہ وغیرہ کے کہ وہ سب حضرات اپنے مسلک کے موافق و مخالف ساری ہی احادیث صحیحہ ذکر فرماتے ہیں۔

اس باب کی حدیث الباب میں علاوہ رفع یدین کے یہ امر بھی مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام دونوں ہاتھ مونڈھوں تک اٹھاتے تھے، پھر اگلا باب صرف اسی امر کے لئے قائم کریں گے کہ ہاتھ کہاں تک اوپر اٹھائے جائیں،

ہم یہاں اور اگلے باب میں بھی دوسرے فوائد ذکر کریں گے، اور اصل معرکۃ الآراء وبحث رفع یدین کو مفصل طور سے آخری باب کے تحت لائیں گے۔ ان شاءاللہ

رفع یدین کی حکمتیں

اس بارے میں اکابر ملت کی مختلف آراء ہیں، جو درج ذیل ہیں

(۱) ہاتھ اٹھانا، علاوہ خدا کے نفی کبریا ہے اور اس کے بعد تکبیر اثبات وحدۃ للہ تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے، اس کو صاحب ہدایہ نے بھی اختیار کیا اور کہا کہ اسی لئے رفع یدین کو تکبیر پر مقدم کرنا چاہئے۔

(۲) نماز شروع کرنے والے کو جب دوسرا دیکھے گا خواہ وہ بہرا بھی ہو کہ تکبیر نہ سن سکے، یا دور ہو تو وہ بھی نماز شروع کر سکے گا۔

(۳) دنیا کو چھوڑ کر بالکلیہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانے کہ علامت ہے۔

(۴) پوری طرح حق تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرنے کا اشارہ ہے۔

(۵) نماز کی کمال عظمت کا اقرار کرتا ہے جس کو وہ اب شروع کرنے والا ہے۔

(۶) اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ عابد ومعبود اور ساجد ومسجود یا مولی اور بندہ کے درمیانی حجابات نماز میں اٹھ جاتے ہیں۔

(۷) سارے بدن کے ساتھ حق تعالے کی جانب متوجہ ہونے کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

(۸) قیام للہ تعالیٰ کی تکمیل اس سے ہوتی ہے، قالہ الزرقانی

(۹) حق تعالیٰ کی غایۃ تعظیم کے ظاہر کرنے کے لئے ایسا کرتا ہے۔

(۱۰) ابن رسلان نے کہا کہ کفار قریش اور دوسرے مشرک لوگ اپنی نمازوں میں بھی جو حضور علیہ السلام کے ساتھ پڑھتے تھے، اپنے بتوں کو بغلوں میں دبائے رکھتے تھے۔ اسلئے حکم ہوا کہ نماز شروع کرنے کے وقت رفع یدین کیا جائے تا کہ وہ بت گر جائیں۔

(۱۱) بعض صوفیہ نے یہ کہا کہ دنیا کو پس پشت پھینک دینے کی طرف اشارہ ہے۔ (اوجز ص ۲۰۲/۱)

باب الی این یرفع یدیه وقال ابو حمید فی اصحابه رفع النبی صلی الله علیه وسلم حذومنکبیه

(تکبیر تحریمہ میں ہاتھوں کو کہاں تک اٹھائے' اور ابو حمید نے اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر یہ بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں ہاتھ شانوں کے مقابل تک اٹھاتے تھے)

۶۹۹: حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب عن الزهری قال اخبرنی سالم بن عبدالله بن عمر ان عبدالله بن عمر قال رایت النبی صلے الله علیه وسلم افتتح التکبیر فی الصلوٰة فرفع یدیه حین یکبر حتیٰ یجعلهما حذومنکبیه واذا کبر للرکوع فعل مثله' واذا قال سمع الله لمن حمده' فعل مثله' وقال ربنا ولک الحمد ولایفعل ذٰلک حین یسجدولا حین یرفع راسه' من السجود

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے نماز میں تکبیر شروع کی تو تکبیر کہتے وقت آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اتنے اٹھائے، کہ ان کو اپنے دونوں شانوں کے برابر کر لیا اور جب آپ نے رکوع کے لئے تکبیر کہی، تب بھی اسی طرح

کیا، اور جب سمع اللہ لمن حمدہ کہا، تب بھی اسی طرح کیا اور ربنا ولک الحمد (بھی) کہا اور یہ (بات) آپ سجدہ کرتے وقت نہ کرتے تھے، اور نہ اس وقت جب سجدے سے اپنا سر اٹھاتے:۔

تشریح: ہاتھ کہاں تک اٹھائے جائیں؟ امام بخاری نے مونڈھوں تک کی روایت پیش کی ہے اور یہی مذہب امام مالک وشافعی کا ہے، امام احمد سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ میں بھی مونڈھوں تک کے لئے کہتا ہوں، لیکن جو کانوں تک ہاتھ اٹھانے کو کہتے ہیں، وہ بھی میرے نزدیک اچھا ہے۔ حنفیہ مسلم شریف کی حدیث مالک بن الحویرث کے مطابق عمل کرتے ہیں جس میں ہے کہ کانوں تک ہاتھ اٹھائے جائیں۔ قالہ الزرقانی۔ اور مختصر عبدالرحمٰن میں احرام کے وقت رفع یدین کو بھی کانوں تک لکھا ہے، علامہ باجی مالکی نے کہا کہ ہم ہاتھوں کی ہتھیلیاں مونڈھوں تک کے مقابل اور انگلیوں کے سروں کو کانوں کے مقابل کرنے کو اختیار کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ امام مالکؒ حنفیہ کے موافق ہیں، ملا علی قاریؒ نے یہ بھی نقل کیا کہ امام شافعی مصر گئے اور ان سے کیفیت رفع کا سوال ہوا تو فرمایا کہ اس طرح اٹھائے کہ ہاتھ کی ہتھیلیاں مونڈھوں کے مقابل ہو جائیں انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر ہوں اور انگلیوں کے سرے کانوں کے اوپری حصوں کے سامنے ہو جائیں۔ اس طرح منکبین، اذنین اور فروع الاذنین والی تینوں روایات جمع ہو جاتی ہیں اور مذاہب کا فرق بھی ختم ہو جاتا ہے، تاہم اتنا ضرور ہے کہ حنفیہ ہاتھ اوپر اٹھانے میں دوسروں سے کچھ زیادہ مبالغہ کے قائل ہیں اور ان کے یہاں مرد وعورت کے عمل میں فرق بھی ہے، کیونکہ عورت کے لئے وہ صرف سینہ اور ثدیین تک ہی ہاتھ اٹھانے کو کہتے ہیں۔ ابن رسلان نے کہا کہ یہ تفریق صرف حنفیہ کے یہاں ہے، مگر امام احمد سے بھی دو روایت ہیں ایک یہ کہ ہاتھوں کو تھوڑا اٹھائے، یعنی مردوں سے کم، دوسری روایت یہ ہے کہ عورت کے لئے ہاتھ اٹھانا مشروع ہی نہیں ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے التنویر میں طبرانی سے وائل بن حجر کی حدیث پیش کی ہے کہ مرد کانوں تک ہاتھ اٹھائیں اور عورت ثدیین تک۔ لہٰذا علامہ شوکانی کا یہ کہنا کہ حنفیہ کے پاس تفریق کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بڑی غلطی ہے، جس سے ان کی قلت نظر معلوم مطالعہ ہوتی ہے۔ (اوجز ص ۱/۲۰۲)

باب رفع الیدین اذاقام من الرکعتین

دونوں ہاتھوں کے اٹھانے کا بیان؛ جب دو رکعتیں پڑھ کر اٹھے

۷۰۰: حدثنا عیاش بن الولید قال حدثنا عبدالاعلیٰ قال حدثنا عبیداللہ عن نافع ان ابن عمر کان اذا دخل فی الصلوٰۃ کبرورفع یدیہ واذا رکع رفع یدیہ واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ رفع یدیہ واذا قام من الرکعتین رفع یدیہ ورفع ذٰلک ابن عمر الی النبی صلے اللہ علیہ وسلم.

ترجمہ: حضرت نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ جب نماز شروع کرتے وقت تکبیر کہتے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے، اور جب رکوع کرتے (تب بھی اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے، اور جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے (تب بھی) اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے اور جب دونوں رکعت سے اٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے۔ اور اس بات کو ابن عمرؓ نے نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے۔

تشریح: ۔ ترجمہ وحدیث الباب سے امام بخاری نے ثابت کیا کہ دو رکعت پوری کرکے تشہد کے بعد جب کھڑا ہو تب بھی رفع یدین کرے، اور بتلایا کہ حضرت ابن عمرؓ نے نہ صرف اس کو خود کیا بلکہ اس امر کو حضور علیہ السلام کی طرف بھی مرفوع کیا کہ وہ بھی ایسا کیا کرتے تھے، حالانکہ امام بخاریؒ نے اسی صفحہ پر حضرت ابن عمرؓ سے ہی تین حدیث اوپر روایت کی ہیں اور ایک روایت مالک، بن الحویرث کی بھی ذکر کی ہے اور چاروں میں سے کسی میں بھی دو رکعت سے کھڑے ہونے پر رفع یدین نہیں ہے۔ اور اسی لئے بعض محققین کو یہ تصریح کرنی پڑی کہ گو حدیث ابن عمر کی تخریج بخاری ومسلم دونوں میں کی گئی ہے، مگر وہ مواضع رفع کے بارے میں مضطرب ہے، اور شاید اسی وجہ سے امام مالکؒ نے اپنے

مشہور قول و مذہب میں اس کو معمول بہ نہیں بنایا اور اسی وجہ سے مدونہ میں امام مالکؒ کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ ''میں تکبیرات صلوٰۃ میں سے اٹھتے بیٹھتے کسی تکبیر کے ساتھ رفع یدین کو نہیں جانتا بجز تکبیر احرام کے جو شروع نماز میں ہوتی ہے'' اور اسی لئے ابن القاسمؒ کا یہ قول بھی نقل ہوا کہ ''بجز تکبیر احرام کے دوسری جگہوں کے لئے رفع یدین امام مالکؒ کے نزدیک ضعیف تھا''۔ اور علامہ نوویؒ نے تصریح کی کہ یہی امام مالکؒ سے مرویہ روایات میں سے سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے، (اوجزص ۲۰۳)

اس موقع پر موطأ امام مالکؒ کی روایت ابن عمر میں و اذا رفع راسه من الركوع رفعهما كذلك پر اوجز میں جو اضطراب و اختلاف روایات نقل کیا گیا ہے کہ کسی روایت میں رفعهما دون ذلك ہے، کسی میں رفع عند الركوع نہیں ہے وہ بھی قابل مطالعہ ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ائمہ اربعہ تکبیر احرام کے وقت رفع یدین پر متفق ہیں، اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ تین جگہوں کے علاوہ کسی اور جگہ پر رفع یدین مستحب نہیں ہے، یعنی امام شافعی و امام احمد بھی جو رکوع سے قبل و بعد رفع یدین کو ضروری خیال کرتے ہیں، وہ بھی نہ دو رکعت سے اٹھنے کے وقت رفع یدین کو ضروری مانتے ہیں، نہ مابین السجدتین نہ ہر خفض و رفع کے وقت، حالانکہ ان کے لئے بھی صحیح روایات موجود ہیں۔ جیسے کہ دو رکعت سے اٹھنے پر یہاں امام بخاری ہی حدیث صحیح لائے ہیں۔ ممکن ہے یہ خود امام بخاریؒ کا مسلک و مختار ہو اور ایک قول امام شافعی کا بھی اس کے استحباب کا نقل ہوا ہے۔

تفصیل مذاہب: بدایۃ المجتہد ص ۱۱۴/ ا میں ہے کہ اہل کوفہ امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوری اور ان کے سارے فقہاء صرف تکبیر احرام کے وقت رفع یدین کے قائل ہیں اور صاحب مدونہ ابن القاسمؒ[1] نے امام مالکؒ کا بھی یہی مذہب نقل کیا ہے۔ کیونکہ امام مالکؒ نے بھی (حنفیہ کی طرح) حدیث عبداللہ بن مسعود و حدیث براء بن عازبؓ کی وجہ سے اور موافقت عمل اہل مدینہ کے سبب سے اسی کو ترجیح دی ہے۔ امام شافعی، امام احمد، ابوعبید، ابوثور، اور جمہور اہل حدیث و اہل الظاہر رفع یدین علاوہ تکبیر احرام کے رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے ہوئے بھی مانتے ہیں، اور ایک روایت امام مالک سے بھی ایسی ہے مگر اس قول میں بھی یہ فرق ہے کہ وہ لوگ اس کو ضروری قرار دیتے ہیں، امام مالک صرف سنت مانتے ہیں، دوسرے بعض اہل الحدیث سجدہ کو جاتے اور اس سے اٹھتے ہوئے بھی رفع یدین کے قائل ہیں۔ اس کے بعد علامہ ابن رشد نے لکھا کہ اختلاف کا سبب اس بارے میں آثار مرویہ کا اختلاف ہے اور یہ بھی خود مدینہ طیبہ میں بعض آثار مرویہ کے خلاف عمل ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ بعض احادیث مثلاً عبداللہ بن مسعود اور حدیث براء میں تو یہ ہے کہ حضور علیہ السلام صرف تحریمہ کے وقت ایک مرتبہ رفع یدین کرتے تھے، اس سے زیادہ نہ کرتے تھے، دوسری طرف حدیث ابن عمرؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام علاوہ تکبیر تحریمہ کے رکوع کی تکبیر کے وقت اور رکوع سے اٹھتے ہوئے بھی رفع یدین کرتے تھے، یہ حدیث صحیح متفق علیہ ہے، اور ان لوگوں کا گمان ہے کہ اس کو ۱۳ صحابہ نے روایت کیا ہے۔ تیسری حدیث وائل بن حجر کی ہے، جس میں روایت ابن عمر سے بھی یہ امر زائد ہے کہ سجدہ کے وقت بھی رفع کرتے تھے، پس بعض حضرات نے تو حدیث عبداللہ بن مسعود و حدیث براء کو ترجیح دے کر رفع یدین کو صرف تحریمہ کے لئے خاص کر دیا اور یہی مذہب امام مالک کا ہے کیونکہ تعامل (اہل مدینہ) اس کے موافق پایا، اور دوسرے حضرات نے حدیث عبداللہ بن عمرؓ کو ترجیح دے کر رکوع سے قبل و بعد میں بھی رفع یدین کو ضروری سمجھا، اور افتتاح کے وقت کے لئے اس کی شہرت کی وجہ سب کا اتفاق رہا۔

علامہ بنوریؒ: نے معارف السنن ص ۴۵۳/ ۲ میں لکھا: تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین پر سب کا اتفاق ہے، جس طرح جمہور مواضع ثلاثہ مابین السجدتین بعد الركعتين اور ہر خفض و رفع میں یدین کے عدم استحباب پر متفق ہیں۔ اگرچہ ان کے لئے بھی روایات موجود ہیں۔ البتہ رکوع

[1] امام مالکؒ کے مذہب کے سب سے زیادہ معتمد ناقل یہی ہیں، اسی لئے یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ امام مالکؒ کا صحیح و راجح مسلک وہی ہے جو ابن القاسم نے نقل کیا ہے اگرچہ وہ روایات موطاء کے موافق نہ ہو اوجز ص ۲۰۹/ ا میں امام مالک کے روایۃ الباب ترک کرنے کے وجوہ بھی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ اور یہ بہت سے محدثین کا طریقہ رہا ہے کہ بطور سرد روایات متعدد احادیث بیان کر دیتے ہیں۔ خواہ ان میں سے بعض معمول بہا نہ بھی ہوں بوجہ اضطراب و شذوذ وغیرہ واللہ تعالیٰ اعلم (مؤلف)

کے وقت اور بعد الرکوع رفع یدین میں اختلاف ہے، اور اسی کی وجہ سے رفع یدین کے مسئلہ نے مشہور اختلافی شکل اختیار کر لی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور آپ کے اصحاب ترک رفع کے قائل ہیں یہی روایت ابن القاسم نے امام مالک سے بھی نقل کی ہے، اور اکابر مالکیہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ امام شافعی واحمد رفع کے قائل ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر مالکی نے ابن القاسم سے امام مالک کا معمول غیر احرام میں عدم رفع کا ذکر کیا ہے۔ جو سفیان ثوری، نخعی، شعبی وعلقمہ وغیرہ سب کوفیوں کا بھی مذہب ہے۔ اور ابومصعب، ابن وہب، اشہب وغیرہ نے امام مالک سے رفع نقل کیا ہے۔

محمد بن عبدالحکم شافعی نے یہ بھی کہا کہ امام مالک سے ترک رفع صرف ابن القاسم نے نقل کیا ہے، اور ہم حدیث ابن عمر کی وجہ سے رفع کو اختیار کرتے ہیں"۔ علامہ اصیلی نے کہا کہ "امام مالک نے رفع یدین کو اس لئے اختیار نہیں کیا کہ نافع نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت رفع کو موقوفا روایت کیا ہے۔ اور یہ ان چار مواضع میں سے ہے، جن میں سالم و نافع کا اختلاف ہوا ہے۔ پھر علامہ اصیلی نے ان چاروں کو ذکر کر کے فرمادیا کہ "ان سب کو سالم نے مرفوعا اور نافع نے موقوفا روایت کیا ہے"۔ اس کے بعد علامہ زرقانی نے حافظ ابن حجر کے ایک بے جا اعتراض کا رد کیا ہے۔

حافظ ابن حجر کا مالکیہ پر اعتراض اور زرقانی[1] کا جواب

اس سے حافظ ابن حجرؒ کا بے جا جملہ اور غلط اعتراض بھی بے نقاب ہو جاتا ہے کہ "مجھے مالکیہ کے لئے ترک رفع کی کوئی دلیل اور حجت نہیں ملی بجز قول ابن القاسم کے"۔ کیونکہ جب سالم و نافع کا رفع و وقف میں اختلاف موجود تھا تو اسی کی وجہ سے امام مالک نے اپنے مشہور قول میں رفع کو مستحب قرار نہیں دیا کہ نماز جیسی سکون وخشوع چاہنے والی عبادت کے لئے یہی زیادہ مناسب ہے کہ اس کو دوسری حرکات و افعال سے بچایا جائے (زرقانی ص ۱/۱۵۸)

حضرتؒ نے بسط الیدین ص ۶۰ میں استذکار ابن عبدالبر سے یہ بھی نقل کیا:۔ ان کی موافقت ایک مرتبہ کے سوا عدم رفع یدین میں ثوری، حسن بن حی اور دوسرے سب فقہاء کوفہ نے کی ہے اور یہی قول ابن مسعود اور آپ کے اصحاب کا بھی ہے"۔ امام مالک نے ترک رفع کو اس لئے بھی ترجیح دی ہے کہ اہل مدینہ کا تعامل عدم رفع کے موافق تھا۔ کما صرح بہ ابن رشد فی کتابہ بدایۃ المجتہد۔ اور علامہ ماردینی نے الجواہر النقی ص ۱/۱۳۶ میں علامہ ابن عبدالبر مالکی کے یہ الفاظ ان کی "التمہید" سے نقل کئے کہ "میں بھی افتتاح کے سوا رفع نہیں کرتا، روایت ابن القاسم کی وجہ سے" لہٰذا ماردینی نے ابن عبدالبر کو بھی ان حضرات میں شمار کیا جنھوں نے ترک رفع کو اختیار کیا ہے۔ اور شرح مسلم للقرطبی سے نقل کیا کہ یہی عدم رفع مشہور مذہب امام مالک کا ہے، اور "قواعد ابن رشد" میں ہے کہ یہی عدم رفع امام مالک کا مذہب ہے کیونکہ عمل اہل مدینہ کا اس کے موافق ہے۔

حافظ کی دوسری غلطی اور حضرت شاہ صاحبؒ کا انتباہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند کے زمانہ درس ترمذی شریف میں حافظ کی ایک غلطی کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ جو العرف الشذی ص ۱۶۴ میں تردد کے ساتھ نقل ہوا تھا، اور کچھ امالی لکھنے والے طالب علم نے بھی مطلب پوری طرح واضح نہ کر کے گنجلک پیدا کر دی تھی، جس کا ذکر علامہ بنوری مرحوم نے ص ۲/۴۵۴ میں کیا ہے۔ پھر اسی بات کو حضرتؒ نے نیل الفرقدین کے حاشیہ بسط الیدین میں خوب واضح اور مدلل فرمادیا ہے۔

اصل صورت حال یہ تھی کہ علامہ ابن عبدالبر نے محمد بن عبداللہ بن الحکم کی یہ بات نقل کی تھی کہ امام مالکؒ سے ترک رفع صرف ابن القاسم نے روایت کیا ہے اور ہم رفع کو حدیث ابن عمرؓ کی وجہ سے اختیار کرتے ہیں الخ۔ شرح الزرقانی ص ۱/۱۵۷ میں یہ بات واضح طور سے درج ہے مگر حافظ کو مغالطہ ہوا کہ یہ بات خود ابن عبدالبر نے کہی ہے چنانچہ انھوں نے فتح الباری ص ۲/۱۴۹ میں بجائے محمد بن الحکم کے ابن عبد

---

[1] معارف السنن ص ۲/۴۵۳ میں اس موقع پر سطر ۲۱ "ثم قال الشیخ" ناقل کی غلطی سے درج ہو گیا ہے۔ کیونکہ حافظ کا رد علامہ زرقانی نے کیا ہے۔ شاہ صاحب نے نہیں کیا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حافظ کے بے جا جملوں پر صرف حنفیہ نے ہی نہیں بلکہ مالکیہ نے بھی تعقب کیا ہے، اور یہ بھی کہ مالکیہ کا مسلک عدم رفع ہی مشہور و معروف رہا ہے، اسی لئے شافعیہ کے اعتراضات پر مالکیہ نے جوابدہی کی ہے۔ یہ بھی واضح ہو کہ معارف السنن کے ص ۲/۴۵۳ میں سطر ۲ فیما حکاہ ابن عبدالبر کے بعد سے ص ۲/۴۵۴ سطر اول تک ساری عبارت زرقانی ص ۱/۱۵۷ سے نقل ہے۔

البر ہی کی طرف اس کو منسوب کر دیا۔ حالانکہ کسی نے بھی ان کو رفع یدین کرنے والوں میں شمار نہیں کیا ہے، بلکہ تمہید میں خود انھوں نے یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ میں روایت ابن القاسم عن مالک کی وجہ سے رفع یدین صرف افتتاح کے وقت کرتا ہوں، اور اسی لئے علامہ ماردینی حنفیؒ نے الجواہر النقی ص ۱۳۶/ ا میں ابن عبدالبر کو ترک رفع اختیار کرنے والوں میں ذکر کیا ہے۔

افادۂ مزید: حضرتؒ نے اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ یہ محمد بن عبداللہ الحکم اگرچہ اصحاب امام شافعی میں سے تھے۔ لیکن انھوں نے امام شافعیؒ کے انتقاد علی مالکؒ کے جواب میں مستقل رسالہ لکھا ہے، امام شافعی کا نقد و اعتراض یہ تھا کہ امام مالکؒ نے تعامل اہل مدینہ کی وجہ سے آثار کو ترک کر دیا ہے۔ اور ترک رفع کو بھی اسی میں شامل کیا ہوگا۔ (غالباً ابن الحکم نے ہر مسئلہ کے لئے تعامل کے ساتھ آثار بھی پیش کئے ہوں گے)

ابن الحکم کی غلطی: حضرتؒ نے نیل الفرقدین ص ۲۷ میں لکھا کہ امام شافعیؒ نے بھی امام مالک کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ''معانی الاخبار شرح معانی الآثار'' للعینیؒ میں ہے، لہٰذا امام مالک سے ترک رفع کی روایت کرنے والے صرف ابن القاسم نہیں ہیں، بلکہ ان کے متابع امام شافعی ایسے جلیل القدر محدث ہیں۔

مالکیہ کا ترک رفع کے لئے تشدد

کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ص ۱/۲۷۰ میں ہے کہ مالکیہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے وقت مونڈھوں تک ہاتھ اٹھانا مندوب و مستحب ہے، اور اس کے سوا میں مکروہ ہے۔ اس کے برخلاف حنفیہ کے یہاں اتنی شدت نہیں ہے، نہ وہ رفع یدین کو مکروہ بتلاتے ہیں، البتہ وہ ہمارے یہاں غیر معمول بہ اور غیر مندوب ضرور ہے، اور فقہاء حنفیہ میں سے جس نے مکروہ لکھا یا اس کی وجہ سے فساد صلوٰۃ کو کہا یا ایسی کوئی بات امام اعظم کی طرف منسوب کی تو وہ اس کی غلطی ہے کیونکہ کتب معتبرہ حنفیہ مثلاً ''الذخیرہ'' ''الوالجیہ'' وغیرہ میں تصریح کر دی گئی ہے کہ اس سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آتی، مزید تفصیل ''فوائد بہیہ'' میں ضمن ترجمہ مکحول نسفی ملاحظہ ہو۔ علامہ ابوبکر رازی جصاصؒ نے بھی ''احکام القرآن'' میں عدم کراہت کی صراحت کر دی ہے جو اس باب میں بہت موثق ہے اور اس کا مرتبہ علماء مذاہب میں محتاج بیان نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم معارف السنن کے افادات پیش کرتے ہیں:۔

افادۂ انور: ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ رفع و ترک دونوں متواتر ہیں، کسی ایک کا انکار نہیں کیا جا سکتا، البتہ ترک کا تواتر تواتر عمل ہے تواتر اسناد نہیں ہے، رہا یہ کہ امام طحاوی نے نسخ کہا ہے، جس کا مفاد کراہت تحریمی ہوسکتا ہے، تو وہ نسخ بمعنی متعارف نہیں ہے، جس سے عمل بالرفع کو ناجائز کہا جائے۔ لہٰذا رفع و ترک دونوں کے متواتر ہونے کی وجہ سے تین صورتیں بن گئیں۔ رفع کو ترجیح ہو، ترک کو ترجیح ہو، یا دونوں کے لئے اختیار ہو اور ہر ایک کی طرف کچھ نہ کچھ حضرات مائل ہو گئے۔

پھر بعض احادیث میں رفع کی تصریح ہے، بعض سے ترک ثابت ہوتا ہے اور بعض ساکت ہیں۔ اگر ہم صریح ترک والی روایات پر نظر کریں تو ہماری احادیث کی تعداد کم ہے۔ اور احادیث رفع کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم ان احادیث کو بھی ساتھ ملالیں جن میں صفت صلوٰۃ بیان ہوئی ہے اور پھر بھی ان میں رفع کا ذکر نہیں ہے تو ترک رفع کی تعداد بڑھ جاتی ہے کیونکہ ضرورت بیان کے وقت سکوت کرنے کو ترک کی دلیل کہا جائے گا۔

ظاہر ہے جن احادیث صفۃ صلوٰۃ میں سارے افعال صلوٰۃ کا ذکر ہے، ارکان، واجبات، سنن و آداب سب ذکر ہوئے اور صرف رفع یدین کا ذکر ان میں نہیں ہوا اور ہوا تو صرف تکبیر تحریمہ والے رفع کا، رکوع سے قبل و بعد والے کا کوئی ذکر نہیں تو ایسی صورت میں وہ احادیث حنفیہ و مالکیہ کی موافقت میں ہی شمار ہوسکتی ہیں۔ اور اس طرح ان کی احادیث تصریح ترک والی احادیث کے ساتھ مل کے رفع یدین والی احادیث سے کہیں زیادہ ہو جائیں گی۔

غرض یوں بھی یہ اختلاف صرف افضلیت کا ہے یا اس کو اختلاف مباح کہہ لو۔ اور اسی حقیقت کو حافظ ابوعمر (ابن عبدالبر) نے مالکیہ میں سے اور حافظ ابن تیمیہ وابن قیم نے حنابلہ میں سے تسلیم کیا ہے۔

ترک کا تعامل تواتر کے ساتھ رہا ہے، اہل کوفہ تو تقریباً سارے ہی اس پر عامل تھے، بہ کثرت تارکین مدینہ طیبہ میں حضرت امام مالکؒ کے زمانہ میں تھے، جن کی وجہ سے امام مالک نے ترک کو اختیار کیا، اور اسی طرح دوسری بلادِ اسلامیہ میں بھی رافعین کے ساتھ تارکین بھی رہے ہوں گے۔

البتہ ہر جگہ کے بڑوں کا اثر ضرور پڑا ہے، مثلاً مکہ معظمہ میں حضرت ابن الزبیر تھے جو رفع کرتے تھے تو وہاں پر زیادہ رفع کرنے والے ہوئے، اور اسی پر امام شافعیؒ نے بھی رفع کو اختیار کیا، اہل کوفہ نے حضرت ابن مسعود اور حضرت علیؓ کا اثر لیا اس لئے وہاں تقریباً سب ہی تارکین رفع ہوئے، حضرت عمرؓ کے پاس جو آتے جاتے تھے، وہ بھی آپ کے ترک کو دیکھ کر تارک ہو گئے۔

حضرت صدیق اکبر، عمرؓ اور حضرت علی وابن مسعودؓ کے زمانہ میں رفع وترک کی کوئی بحث نہ تھی نہ یہ بات قابل نزاع تھی۔ رافعین بھی تھے اور تارکین بھی، کوئی کسی کو برا بھی نہیں کہتا تھا، (ان کے بعد اس مسئلہ کو نزاعی وجدالی بنالیا گیا، اور آگے امام بخاری کے رسالہ رفع یدین کا ذکر تفصیل سے آئے گا، اس سے اندازہ ہوگا کہ انھوں نے تو حدود اعتدال سے بھی بہت آگے قدم بڑھا دیئے اور شاید ان ہی کی تقلید میں بعد کے سلفی حضرات اور آج کل کے غیر مقلدین نے خوب میدان گرم کیا۔ (یاللاسف)

سلف میں تارکین رفع یدین

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود، اور ان دونوں کے اصحاب، حضرت جابر بن سمرۃؓ، حضرت براء بن عازبؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت ابو ہریرۃؓ، حضرت علقمۃ بن قیس، اسود بن یزید، مغیرہ، سفیان ثوری، ابراہیم نخعی، ابن ابی لیلی، عامر الشعبی، ابواسحق سبیعی، خیثمہ، وکیع، عاصم بن کلیب، امام زفر، وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین۔ امام اعظمؒ، امام ابو یوسف، امام محمد اور دوسرے سب حنفیہ۔ امام مالکؒ اور آپ کے اصحاب کا معمول بھی ترک رفع ہے، محدث علامہ باجی مالکیؒ نے کہا کہ مدونہ میں امام مالک سے روایت کی گئی کہ بجز افتتاح کے رفع یدین ضعیف تھا، امام بخاری کے استاذ حدیث ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں حضرت عمر وعلی اور آپ کے اصحاب سے غیر افتتاح میں ترک رفع روایت کیا ہے۔ حرب بن شداد نے کہا کہ ہمارے اصحاب کے یہاں احرام کے علاوہ کہیں رفع یدین نہیں ہے کذافی ابن رسلان۔ (اوجز ص ۲۰۳/۱)

معارف السنن ص ۴۶۴/۲ میں کعب بن عجرہ کا اضافہ کیا، اور جماہیر اہل کوفہ کے ساتھ کثیر من اہل المدینہ فی عہد مالک پھر لکھا یا اکثریت اہل مدینہ کی بلکہ سارے ہی اہل مدینہ کا تعامل ترک رفع پر تھا جیسا کہ مالکیہ نے نقل کیا ہے اور ابن قیم نے اس کا اعتراف کیا ہے، اگرچہ اس کو حجت نہیں بنایا اور ایسے ہی سارے شہروں میں تھے اگرچہ ان کے نام نہیں معلوم ہوئے، جیسا کہ عام تعامل وتوارث کے لئے عام طور سے سندی سلسلہ نہیں ہوتا، یہ بات بعد کے لوگوں نے پیدا کی کہ وہ سندیں طلب کرنے لگے، اور جب سند نہ ملی تو تواتر عملی کا بھی انکار کر دیا۔ چنانچہ ابن حزم کا بھی "محلی میں یہی طریقہ ہے کہ وہ واقعات وحقائق تاریخیہ کا انکار کر دیتے ہیں گویا ان کے نزدیک جب تک کسی واقعہ کی سند مسلسل نہ بیان کی جائے تو گویا وہ واقعہ دنیا میں ہوا ہی نہیں، اسی طرح وہ اجماعیات منقولہ کا بھی اخبار آحاد کے مقابلہ میں بہ کثرت انکار کر دیتے ہیں، اور تعمیر سے زیادہ تخریب کرتے ہیں، حالانکہ اگر قرآن مجید کی بھی ہر ہر آیت کا تواتر اسنادی طلب کیا جائے تو وہ نہ ملے گا، اور صرف تواتر طبقہ بعد طبقہ ہی سے اس کا ثبوت ہم تک پہنچا ہے۔ اور یہی روش علامہ ابن القیم کی بھی ہے اعلام الموقعین میں الخ۔

امام بخاری کا رفع کے لئے تشدد

مسئلہ رفع یدین میں حنفیہ و مالکیہ کے مقابل شافعیہ نے سب سے زیادہ زور صرف کیا ہے، اور طرفین کے دلائل اکثر کتابوں میں مل جاتے ہیں، لیکن اس مسئلہ میں ایک بڑے معرکہ کی بحث و تحقیق و تدقیق امام بخاری نے بھی کی ہے، اور پوری قوت و شوکت اور شدت وحدت کا مظاہرہ مستقل رسالہ لکھ کر کیا ہے۔ مگر یہ بات عجیب تر ہے کہ انھوں نے جہاں جہاں بھی اپنا لہجہ نہایت تلخ اور بقول حضرت شاہ صاحبؒ دراز لسانی کی حد تک گرم گفتاری اختیار کی ہے اس کا نشانہ صرف امام اعظمؒ بنے ہیں، یہاں تک کہ ان کو جاہل اور غوی اور بھٹکنے والا وغیرہ وغیرہ سب ہی کچھ لکھ دیا ہے حالانکہ اس مسئلہ میں وہ منفرد نہیں ہیں، اور اسی لئے ہم نے اوپر ان کے شریک مسلک بہت سے اکابر امت سلف ہی میں سے گنوادیئے ہیں، اور سلف کے ہزار ہا اکابر کا ذکر اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ امام بخاریؒ کے بعد آئے ہیں اور امام کو کیا خبر تھی کہ بناء ملت حنفی کے جس پتھر کو انھوں نے حقیر و بیکار سمجھ کر نظرانداز کر دیا تھا وہی سب سے زیادہ قیمتی و کارآمد پتھر ثابت ہوگا۔

ذکر امام بخاریؒ کے رسالہ کا

رفع یدین کی تائید اور ترک رفع کی تردید میں امام بخاریؒ کا رسالہ بہت مشہور ہے، اور اس میں اور اپنے رسالہ قراءۃ خلف الامام میں بھی انھوں نے امام اعظمؒ کے خلاف بہت ہی سخت زبان استعمال کی ہے اور شاید اسی لئے ہندوستان کے غیر مقلدین نے ان رسالوں کو بار بار اہتمام کر کے شائع کیا ہے، اور رسالہ رفع یدین کا ایک ایڈیشن تو اردو ترجمہ کے ساتھ بھی شائع کیا ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اصل حقیقت حال کو واشگاف کرنے کے لئے ہم اس کے مندرجات کو ذرا تفصیل سے پیش کر دیں۔ پہلے امام بخاری کے ابتدائی کلمات خطبہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''امام بخاریؒ نے فرمایا کہ یہ رسالہ اس شخص کے رد میں ہے جس نے رکوع کے لئے جھکتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے ہاتھ اٹھانے کا انکار کیا ہے، اور عجم کے رہنے والوں کو اس سنت رسول علیہ السلام سے بے خبر رکھا، اور اپنی لایعنی بات کو خواہ مخواہ ثابت کرنے کے لئے، صحابہ کرام کے ذریعہ ثابت شدہ رسول اکرم علیہ السلام کے فعل کو اور آپ کے اصحاب و تابعین کے تعامل کو نظرانداز کیا اور اس ضمن میں صحیح روایات کی بھی جو سلف سے ذریعہ ثقات خلف کو پہنچی تھیں، پرواہ نہیں کی کیونکہ اس کے سینہ میں کینہ و بغض بھرا ہوا تھا اور دل میں تنگی تھی۔ اور اس کو نبی اکرم علیہ السلام کی سنتوں سے نفرت تھی، اور حاملین سنت سے سخت عداوت تھی، بوجہ اس کے کہ اس کے گوشت پوست اور ہڈیوں و مغز میں بدعت سرایت کر چکی تھی، اور یہ چیز ان کو عجمیوں کے ماحول میں محصور رہنے اور ان سے فریب کھانے کے سبب سے حاصل ہوئی تھی،'' **وقال النبی علیہ السلام لا تزال طائفۃ من امتی الخ''**

اس کے بعد وہ احادیث و آیات ذکر کی ہیں، جن میں مخالفین و معاندین اسلام کے لئے انذار و عید آئی ہے۔ اس کے بعد رفع یدین کی تائید کرنے والی احادیث ذکر کی ہیں۔ اور درمیان درمیان میں اہل علم کی مدح اور امام اعظمؒ کو لاعلمی کے طعنے دیئے ہیں، اور بتلایا کہ اپنے زمانہ کے اہل علم وہی تھے جو رفع یدین کو مانتے اور کرتے تھے، اور ہر زمانہ کے بے علم و جاہل ان کے خلاف تھے۔

ایک جگہ حدیث ام الدرداء (ص۲۲) نقل کر کے لکھا کہ ان تارکین رفع سے تو بعض صحابہ کی بیویاں ہی زیادہ علم والی تھیں کہ وہ نماز میں رفع یدین کیا کرتی تھیں اور جہاں تارکین کی کوئی دلیل نقل کرتے ہیں تو اس عنوان سے کہ بعض بے علم لوگوں نے اس طرح استدلال کیا یا اس طرح ہمارے استدلال پر نقد کیا وغیرہ۔ اور اس کے مقابلہ میں قائلین رفع کے لئے اہل علم و اہل نظر کے القاب اختیار کرتے ہیں۔

حدیث ص۳۲ کے تحت لکھا:۔ ابن المبارک رفع یدین کرتے تھے جو اپنے زمانہ کے سب سے بڑے علم والے تھے، اور جن کے پاس سلف کا علم نہیں تھا۔ وہ بجائے اس کے کہ انھوں نے بے علم لوگوں کی تقلید کی وہ اگر ابن المبارک کا اتباع کرتے تو اچھا تھا۔

حدیث ص ۳۴ کے تحت لکھا کہ بے علم لوگوں نے وائل بن حجر کے بارے میں طعن کیا ہے کہ وہ ابناء ملوک یمن میں سے تھے اور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کا اکرام کیا اور ان کو زمین کا ایک قطعہ دیا اور ان کے ساتھ حضرت معاویہ کو بھیجا، اس جگہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان امور میں سے طعنے کی بات کیا تھی؟

حدیث ص ۳۶ کے تحت لکھا کہ ان بے علم لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ اگر کوئی حدیث حضور اکرم ﷺ سے ثابت بھی ہو جاتی ہے تب بھی کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے بڑوں نے اس کو اختیار نہیں کیا یا یہ ہمارے یہاں معمول بہ نہیں ہے، کیونکہ یہ لوگ تو حدیث کو اپنی رائے کے مقابلہ میں لغو سمجھتے ہیں۔ اور لکھا کہ حضرت معمر کا ارشاد تو یہ تھا کہ اہل علم کے نزدیک پہلے لوگ زیادہ علم والے تھے، لیکن ان لوگوں نزدیک بعد کے لوگ زیادہ علم والے ہیں۔

حدیث ص ۳۷ کے تحت لکھا کہ عبداللہ بن مبارک نے امام صاحب کو لاجواب کر دیا تو وہ متحیر ہو کر چپ ہو گئے، **وھذا اشبہ من الذین ھارون فی غیبھم اذا لم ینصروا۔** جو لوگ گمراہی میں حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور ان کو مدد نہیں ملتی تو وہ اسی طرح حیران ولاجواب ہو جایا کرتے ہیں)

حدیث ص ۶۳ کے تحت لکھا کہ جس نے یہ دعوے کیا کہ رفع یدین بدعت ہے، اس نے صحابہ کرام، سلف اور بعد کے حضرات، اور اہل حجاز و اہل مدینہ و اہل مکہ اور کچھ اہل عراق و اہل شام و اہل یمن اور علماء اہل خراساں جن میں ابن المبارک بھی ہیں سب پر طعن کیا۔ الخ

دعوائے عدم ثبوت ترک رفع یدین: امام بخاریؒ نے دو جگہ اسی رسالہ میں یہ بھی دعویٰ کیا کہ ترک رفع یدین کا ثبوت حضور علیہ السلام یا کسی بھی صحابی سے نہیں ہوا۔ چنانچہ ص ۳۰ کے بعد لکھا کہ ہم نے جن اہل نظر علماء اہل حجاز و اہل عراق کو پایا جن میں عبداللہ بن الزبیر، علی بن عبداللہ بن جعفر، یحییٰ ابن معین، احمد بن حنبل و اسحٰق بن راہوایہ ہیں، یہ سب لوگ اپنے زمانہ کے اہل علم تھے، اور ان میں سے کسی کو بھی حضور ﷺ سے ترک رفع یدین کا علم نہیں ہوا اور نہ کسی صحابی رسول سے بات پہنچی کہ وہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

حدیث ص ۶۳ کے تحت لکھا کہ ''کسی صحابی سے یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ وہ رفع یدین نہیں کرتے تھے اور نہ ترک رفع کی روایات رفع والی روایات سے زیادہ صحیح ہیں''۔

معذرت: جوابی معروضات سے پہلے یہ ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے ساتھ آپ کی عمر کے آخری دو سال میں رہنا ہوا، اور شب و روز میں جو کچھ سنا وہ قلم بند کیا، جو احوال آپ کے دیکھے وہ قلب و نظر کی امانت ہیں، درس بخاری میں فرمایا: ''امام بخاری کا ادب ہمیشہ مانع رہا، مگر اب صبر پر قدرت نہیں رہی، اس لئے کچھ کہہ دیتا ہوں، حنفیہ کے خلاف تعصب یا غلط فہمیوں کے تحت جو کچھ جس نے بھی کہا، اس سے ان کا دل نہایت آزردہ تھا، اس کو اس شعر میں ادا فرمایا تھا۔ **ومن نفشات الصدر ما لا ابثه ومن فجعات الدھر ما قد تھجما**

شاید کچھ ایسا ہی حال میرا بھی آخر وقت میں ہو گیا ہے، کسی کی بھی غلط بات برداشت نہیں ہوتی، اور پھر قلم کچھ نہ کچھ لکھ ہی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے بڑوں کی شان میں کچھ لکھنے سے پہلے دس بار سوچنا پڑتا ہے، اور پھر مجبور ہو کر لکھنا پڑتا ہے۔

جوابی معروضات: معارف السنن ص ۲/۴۶۶ میں لکھا:۔ امام بخاریؒ نے جو عدم صحت ترک رفع عن الصحابہ کا دعویٰ کیا ہے وہ ان کا حسب عادت مبالغہ ہے کہ ان کو جب کسی بات کا یقین و اطمینان نہیں ہوتا تو اسی طرح اس کے خلاف بھرپور دعوے کر دیا کرتے ہیں۔ اور اس کے رد کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کے جلیل القدر تلمیذ حدیث امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں اور ابونصر مروزی وغیرہ نے صراحت کر دی ہے کہ ترک رفع یدین کی حدیث ابن مسعود حدیث حسن ہے۔ اور ترک رفع کے قائل اہل علم اصحاب النبی ﷺ اور تابعین بھی تھے، اور یہی قول و مذہب سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا ہے۔ امام ترمذیؒ نے تو سارے اہل کوفہ کا ہی یہ مسلک بتلا دیا جبکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ڈیڑھ ہزار صحابہ وہاں جا

کر آباد ہو گئے تھے اور ان میں ۲۴ تو وہ تھے، جنھوں نے غزوہ بدر میں حضور علیہ السلام کے ساتھ شرکت کی تھی۔ اگر کسی بھی صحابی متوطن کوفہ پر ترک رفع کا اعتراض کسی نے کیا ہوتا تو کیا وہ نقل نہ ہوتا۔ اور اہل کوفہ کے نزدیک تو ترک رفع ہی حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت علقمہ، شعبی، نخعی اور بہت سے صحابہ وتابعین سے قوی الاسانید روایات کے ذریعہ ثابت ہے۔ اور جو کچھ اہل کوفہ کو نسلا بعد نسل اور طبقہ بعد طبقہ بطور توارث وتعامل ترک رفع کی اجتماعی خصوصیت حاصل ہوئی وہ نا قابل انکار حقیقت ہے۔

پھر حضرت امام مالکؒ اور آپ کے متبعین مالکیہ نے بھی تو ترک رفع ہی کو اختیار کیا، اور ان کے سامنے سب سے بڑی حجت اہل مدینہ کا تعامل تھا، جس پر امام شافعی نے امام مالک پر اعتراض بھی کیا کہ آثار کے مقابلہ میں تعامل اہل مدینہ کو حجت بنا رہے ہیں، اور اس کا جواب اکابر مالکیہ کے علاوہ خود امام شافعیؒ کے جلیل القدر تلمیذ ومقلد محمد بن عبداللہ بن الحکم نے مستقل رسالہ لکھ کر دیا تھا اور امام مالکؒ کی طرف سے پورا دفاع کیا تھا۔ یہ کیا ہے، کیا امام اعظمؒ ترک رفع میں سب سے الگ تھلگ تھے، اور ان کو اکیلا سمجھ کر ہر طرح ان کی تحقیر وتذلیل کوئی موزوں بات تھی؟ کیا عبدالرحمٰن بن مہدی کی طرح امام بخاری بھی اسی خیال پر تھے کہ مسائل شرعیہ کی وسیع وادی میں دوسرے سب ایک طرف ہیں اور صرف امام صاحب ایک گوشہ میں سب سے دور اور منفرد ایک گوشہ میں ہیں۔ حالانکہ معاملہ برعکس ہے امام صاحب کی فقہ بقول محققین شرقا وغربا براو بحرا ساری روئے زمین پر ہمیشہ چھائی رہی، اور ہر زمانہ میں امت محمدیہ کے دوتہائی یا تین چوتھائی افراد ان کے ہی فقہ پر عامل رہے ہیں، اور مجھے امام بخاریؒ کے ممدوح اعظم حضرت عبداللہ بن مبارک کا یہ مقولہ کبھی نہیں بھولتا کہ "امام ابوحنیفہؒ کی رائے مت کہو، بلکہ جو کچھ انھوں نے کہا اور بتلایا وہ سب حدیث نبوی کی مراد اور منشا ہے"، یعنی وہ شارع علیہ السلام کے صحیح ترین ترجمان تھے۔ ان کے مختارات کو ان کی رائے کہہ کر استخفاف کرنا ارشادات نبویہ کے جاں نثاروں کی شان سے بہت بعید ہے۔

راقم الحروف نے یہ پہلے بھی اپنے بڑوں سے نقل کیا تھا کہ ائمہ اربعہ کے اندر حق دائر ہے، اور وہ سب حق پر ہیں اور وہ سب تقریبا تین چوتھائی مسائل شرعیہ میں باہم متفق ہیں، اور ایک چوتھائی میں بھی حلال وحرام یا وجوب وکراہت کا اختلاف بہت ہی تھوڑے مسائل میں ہے۔ پھر اس موقع کی رعایت سے یہ بھی عرض ہے کہ، جس طرح انبیاء واولیائے کرام ایک دوسرے کے ساتھ محبت شفقت اکرام وعظمت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ائمۂ مجتہدین بھی ایک دوسرے کی باوجود فروعی اختلاف کے نہایت قدر ومنزلت کرتے ہیں، اسی لئے امام مالک، امام شافعی وامام احمدؒ سب ہی امام اعظمؒ کے قدر شناس اور مدحت گذار ہیں، جیسا کہ ہونا چاہیئے اس لئے جہاں کہیں اس کے خلاف دوسری قسم کا برتاؤ سامنے آتا ہے تو دل کو سخت تکلیف ہوتی ہے، اور بادل نخواستہ اس کو نقل بھی کرنا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کرے۔ فروعی اختلاف کی بات اس لئے کہی گئی کہ الحمدللہ اصول وعقائد میں کہیں بھی کسی مسئلہ میں ائمہ اربع کی کچھ اختلاف نہیں ہے اور وہ بقول حضرات اکابر "کأسرة واحدة" (ایک کنبہ قبیلہ کی طرح) ہیں۔ رحمهم الله رحمة واسعة و جعلنا ممن يتبعونهم و يعظمونهم. آمین

اس کے بعد امام بخاریؒ کی دوسری تعریضات وتشنیعات کے مختصر جوابات لکھ کر ہم حنفیہ ومالکیہ کے وہ دلائل (احادیث وآثار) ہی ذکر کریں گے جن کی وجہ سے انھوں نے تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے مواضع صلوٰۃ میں ترک رفع یدین کو ترجیح دی ہے، امام بخاری نے الزام لگایا کہ امام صاحب نے عجم کے رہنے والوں کو سنت نبوی سے بے خبر رکھا الخ حیرت ہے کہ اتنی بڑی بات امام صاحب کی طرف منسوب کردی گئی، جس کی جراءت امام بخاری کے سوا کسی نے نہیں کی، جس کو امام بخاری نے ایک وجہ بھی قائم کی ہے کہ وہ عجمیوں میں گھرے ہوئے تھے، گویا اول تو ان کا غلط اثر امام صاحب نے لیا اور پھر ان کو بھی بے راہ کرنا آسان ہوا کہ وہ مرکز شرع شریف حرمین شریفین وغیرہ سے دور تھے، کیا کسی بھی اہل علم کے دماغ میں امام صاحب کے لئے ایسی بات آسکتی ہے؟! اچھا اگر تھوڑی دیر کے لئے امام بخاری کی اس بات کو درست بھی مان لیں تو امام مالکؒ کون سے عجمی ماحول میں تھے، وہ تو مدینہ طیبہ کے ساکن تھے اور انھوں نے جو کچھ اثر لیا تھا وہ تو مدینہ کے ساکنوں سے لیا تھا، وہ ترک رفع

کے قائل وعامل کیوں ہو گئے تھے، پھراس سے بھی زیادہ حیرت اس پر کیجئے کہ امام مالکؒ کا موطأ (جس کوصحیحین کی بھی اصل کہا گیا ہے) اس کا جو نسخہ مروج ہے (بروایت یحییٰ مصمودی) اس میں حضرت ابن عمرؓ کی وہ روایت بھی نہیں ہے، جس میں رکوع کو جاتے ہوئے رفع یدین کا ذکر ہے، بلکہ صرف تکبیر تحریمہ کے علاوہ صرف رکوع سے سر اٹھانے کے وقت کے رفع یدین کا ذکر ہے اور اسی طرح دوسرے راویان موطأ یحییٰ بن عبداللہ، قعنبی، امام شافعی، معن ویحییٰ نیشاپوری وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے، جو امام بخاری وشافعی کے مسلک کے موافق نہیں ہوتا، لیکن امام محمدؒ نے جو امام مالک سے روایت کر کے موطأ مرتب کیا ہے (جو آپ کی ترتیب وروایت اور کچھ اضافات کے باعث موطأ امام محمد کے نام سے مشہور ہوا) اس میں رکوع میں جاتے ہوئے بھی رفع یدین کا ذکر موجود ہے امام بخاریؒ ایسے واسع العلم محدث جلیل کے علم میں وہ امام محمد والی روایت والا نسخہ بھی ضرور آچکا ہوگا، کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جس سنتِ نبویہ کو امام اعظمؒ نے سنت سے دشمنی اور بدعت کی محبت میں یا عجمیوں کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے کے لئے مبہم وپوشیدہ کرنے کی تدبیر کی تھی، اس کو اُن کا ایک تلمیذ رشید اس طرح روایت کر کے واشگاف کر دیتا۔

امام بخاریؒ نے یہ بھی امام معمر کا قول حنفیہ پر تعریض کرنے کے لئے نقل کیا کہ ترجیح الاول فالاول کو ہونی چاہئے اور یہ لوگ الآخر فالآخر کو مقدم کرتے ہیں، کیا ہم اس موقع پر کہہ سکتے کہ امام بخاریؒ سے قبل ایک سو کے قریب احادیث وآثار کے مجموعے تیار ہو چکے تھے، ان کے لکھنے والے امام بخاریؒ، حمیدی، عبدالرحمٰن بن مہدی، اسحٰق بن راہویہ، نعیم بن حماد خزاعی ومحمد بن عرعرہ وغیرہ سے مقدم اور الاول فالاول کے مصداق تھے یا نہیں، اور ان کے لحاظ سے بعد کے محدثین کو الآخرین فالآخر میں داخل کریں گے یا نہیں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ امام بخاری وغیرہ کے اساتذہ حدیث میں کسی نے بھی رفع یدین کے مسئلہ میں امام صاحب پر امام بخاری کی طرح تشنیع نہیں کی، اور حافظ ابوبکر بن ابی شیبہؒ نے تو اپنی عظیم المرتبت کثیر المنفعت تالیف ''مصنف'' میں ۱۲۵ مواضع میں امام صاحب پر نقد کیا ہے کہ ان مسائل میں امام صاحب نے حدیث کے خلاف کیا ہے، لیکن ان مسائل میں رفع یدین کا مسئلہ شامل ہے نہ قراءۃ خلف الامام کا جبکہ امام بخاری نے دونوں پر مستقل رسالے لکھ کر امام صاحب کے خلاف مواد جمع کر کے سخت وکرخت لہجہ میں طعن وتشنیع کو روا رکھا ہے۔

حافظ ابن ابی شیبہ کے جوابات اکابر امت نے لکھے ہیں، مگر اس وقت ہمارے سامنے علامہ کوثریؒ کا رسالہ ''النکت الطریفہ فی التحدث عن ردود ابن ابی شیبۃ علی ابی حنیفہ'' شائع شدہ ہے، جو محدثانہ ومحققانہ طرز پر کافی وشافی جواب ہے، مشتغلین علم حدیث کے لئے اس کا مطالعہ نہایت بصیرت افزا ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ نعیم مذکور امام صاحب کے بارے میں جھوٹی روایات گھڑ کر برائیاں ان کی طرف منسوب کیا کرتے تھے، اور وہ بخاری کے راوی بھی ہیں، اگر چہ وہ معانی الآثار میں ترک رفع یدین کے راوی بھی ہیں۔ (افادہ الشیخ الانورؒ)

موطأ امام محمد وغیرہ میں امام محمدؒ وغیرہ کسی باب میں مختلف احادیث وآثار نقل کر کے یہ بھی لکھدیتے ہیں کہ ان میں سے فلاں حدیث ہماری معمولی بہ ہے یا اس کو ہم لیتے ہیں، یہ تو کسی حنفی عالم نے نہیں لکھا کہ ہم فلاں حدیث واثر کو اپنے بڑوں کے خلاف ہونے کی وجہ سے نہیں لیتے یا اس کو معمول بہ نہیں بناتے، موطأ امام محمد، کتاب الحجج امام محمد، کتاب الآثار امام محمد، کتاب الاثار امام ابو یوسف، مسند امام اعظم، یا جامع المسانید امام اعظم کس میں امام بخاری کے الزام واتہام کا ثبوت مل سکتا ہے؟ کلا ثم کلا

افسوس ہے کہ اسی قسم کی تہمت اب تک بھی حنفی مسلک کو بدنام کرنے کے لئے اہل حدیث وغیر مقلدین اپنی کتابوں میں لکھ کر شائع کرتے رہتے ہیں۔ مولانا آزاد نے تذکرہ ص ۳۷ میں بلا کسی سند وحوالے کے یہ عبارت نقل کی:۔ الاصل ان کل آیۃ و خبر تخالف قول اصحابنا فانہا تحمل علی النسخ او علی الترجیح والاولی ان تحمل علی التاویل الخ یعنی جو آیت وحدیث بھی ہمارے اصحاب کے اقوال کے خلاف ہو، اس کو نسخ یا ترجیح پر محمول کرنا چاہیئے، اور اولی یہ ہے کہ اس کی تاویل کر لی جائے اور یہ بھی نقل کیا کہ ہر

صورت میں اصحاب مذہب کے اقوال کی تصحیح ضروری ہے اور اسی پر ہر حال میں عمل کرنا ضروری ہے۔

یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ایک نیک نام مذہب کے خلاف بے سند باتیں شائع کر کے اس کو بد نام کیا جائے، پھر ہندوستان کا حال تو مولانا آزاد پر خوب روشن تھا کہ عبدالحق محدث دہلوی سے لے کر خاندان شاہ ولی اللہ اور اکابر دیوبند نے جو کتاب وسنت کی روشنی پھیلائی اور ہمیشہ قال اللہ و قال الرسول ہی کا بول بالا کیا۔ کیا وہ اسی قسم کے غلط پروپیگنڈے کے مستحق تھے؟ جس طرح امام شافعیؒ سے یہ منقول ہے کہ صحیح حدیث ہی میرا مذہب ہے، اسی طرح امام اعظمؒ سے بھی ماثور ہے کہ میرے قول ومسلک کے خلاف جب بھی کوئی حدیث واثر سامنے آ جائے تو اس کے مقابلہ میں میرے قول کو چھوڑ دیا جائے اور بدعت وشرک کی مخالفت میں بھی حنفی مسلک سب سے آگے ہے، یوں بدنام کرنے والے بے سند حوالے کے جو چاہیں کہیں۔

''تذکرہ'' میں اور بھی بہت کچھ مسلک حق اور صحیح تاریخی واقعات کے خلاف مواد موجود ہے۔ حضرت امام ابو یوسفؒ وغیرہ کے خلاف بے سند واقعات بھی نقل کر دیئے گئے ہیں، اگرچہ ان کے غیر معتمد ہونے کا بھی اشارہ کر دیا ہے، بھلا ایسے دروغ و بے فروغ کے نقل کرنے کا ہی کیا فائدہ تھا۔ بجز اس کے کہ غیر مقلدوں کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ واللہ المستعان۔

اعلام الموقعین بھی مولانا آزاد کی تحریک پر اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کی گئی، جس میں حنفی مسلک کے خلاف بہ کثرت غیر مستند باتیں درج ہیں۔ اور راقم الحروف نے کسی جگہ لکھا تھا کہ دو بڑوں میں کتنا فرق ہے، علامہ ابن تیمیہ فقہ حنفی سے بڑی حد تک مطمئن نظر آتے ہیں اور اس کے بالکل برعکس ابن القیم اس سے سخت برگشتہ ہیں۔

مولانا آزاد اتنے بڑے سلفی تھے، مگر انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ طلاق ثلاث کا مسئلہ سلف وخلف، متقدمین ومتاخرین میں اور ائمہ اربعہ کے یہاں اور آٹھ سو سال تک کس طرح تھا، اور علامہ ابن تیمیہ وابن قیم نے آ کر اس کو کس طرح بدل دیا، اور ان دونوں کی عقیدت میں ۸ سو سال کی ساری روایات بھلا کر اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' ص۳۱۴/۱ میں یہ لکھ دیا کہ ''طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تین مرتبہ، تین مجلسوں میں، تین مہینوں میں اور ایک کے بعد ایک واقع ہوتی ہے، اور وہ حالت جو قطعی طور پر رشتہ نکاح قطع کر دیتی ہے، تیسری مجلس، تیسرے مہینے، اور تیسری طلاق کے بعد وجود میں آتی ہے، اس وقت تک جدائی کے ارادے سے باز آ جانے اور ملاپ کر لینے کا موقع باقی رہتا ہے''۔

علامہ مودودی نے بھی تفہیم القرآن ص۱۷۴/۱ میں اس بات کو صاف طور سے نہیں بتلایا کہ اگر کوئی شخص خلاف طریقہ مسنونہ ومستحبہ بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاق دے دے تو وہ تینوں طلاق واقع ہوں گی یا نہیں یوں تو وہ ہر جگہ تفصیل مذاہب بھی کیا کرتے ہیں، مگر یہاں گول کر گئے، اور ائمہ اربعہ وسلف وجمہور امت کا فیصلہ نہیں بتلایا کہ تینوں واقع ہو جائیں گی اور یہ کہ حالت حیض میں بھی طلاق دینے سے وہ واقع ہو جاتی ہیں بخلاف ما قال بہ ابن تیمیہؒ۔ شاید وہ بھی مولانا آزاد کی طرح اس مسئلہ میں علامہ ابن تیمیہ وابن القیم سے متاثر ہو گئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

واضح ہو کہ امام بخاری نے مستقل باب ''اذا طلقت الحائض یعتد بذلک'' قائم کیا ہے، اور امام مسلم نے بھی حیض کی حالت میں طلاق واقع ہونے کو حدیث کی وجہ سے تسلیم کیا ہے نیز امام بخاری نے بھی حدیث نبوی سے وہی بات سمجھی ہے جو ساری امت نے سمجھی ہے کہ ایک لفظ سے تین طلاق دینے پر وہ تینوں ہی واقع ہو جاتی ہیں کیونکہ امام بخاری نے ''باب من اجاز طلاق الثلاث'' باندھا ہے اور حدیث ملاعنہ، پھر حدیث عسیلہ اور حدیث عائشہؓ کو روایت کیا ہے، جو تین طلاق دینے کے بارے میں ہیں، پھر امام شافعی وابن حزم نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ جواز ثلاث کے ساتھ کوئی گناہ بھی نہیں ہے، لیکن حنفیہ اور دوسرے اکثر حضرات کے نزدیک یہ وقوع ثلاث گناہ کے ساتھ ہوگا (کما بسطہ ابن عبدالبر فی الاستذکار) پھر بہ کثرت دوسری احادیث بھی مروی ہیں کہ جو ایک لفظ سے بھی تین یا زیادہ طلاق دے گا تو تین واقع ہو جائیں گی، باقی لغو ہوں گی، یہی بات صحابہ وتابعین اور بعد کے حضرات سے ماثور ہے کما فی الموطأ ومصنف ابن ابی شیبہ وسنن البیہقی وغیرہا،

امام ابوبکر رازی جصاص نے احکام القرآن میں آیات، احادیث و اقوال سلف نقل کر کے لکھا کہ کتاب وسنت اجماع سلف کے بموجب تین طلاق ایک لفظ سے دینے پر واقع ہو جاتی ہیں اگر چہ اس طرح طلاق دینا معصیت ہے۔

علامہ ابوالولید باجی مالکی نے المنتقی شرح الموطأ میں لکھا:۔ جو شخص ایک لفظ سے تین طلاق دے گا، وہ واقع ہو جائیں گی یہ جماعت فقہاء کا فیصلہ ہے اور اس کی دلیل اجماع صحابہ ہے کیونکہ حضرت ابن عمر، عمران بن حصین، عبداللہ بن مسعود، ابن عباس، ابو ہریرہ اور حضرت عائشہؓ سے یہی مروی ہے اور ان کی مخالفت کسی نے نہیں کی ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے تمہید واستذکار میں سب سے زیادہ دلائل اس مسئلہ پر ذکر کئے ہیں اور اجماع کو بھی ثابت کیا ہے۔

حافظ ابن رجب حنبلی اپنی صغرسنی سے ہی علامہ ابن تیمیہ وابن القیم کے بڑے معتقد ومتبع تھے، پھر جب بہت سے مسائل میں ان کی غلطی محسوس کی تو عقیدت کم کردی تھی اور مسئلہ طلاق ثلاث میں خاص طور سے ان دونوں کے رد میں رسالہ بھی لکھا "**بیان مشکل الاحادیث الواردة فی ان الطلاق الثلاث واحدة**" اس رسالہ میں آپ نے لکھا:۔ اس کو اچھی طرح جان لو کہ کسی صحابی یا تابعی یا ائمہ سلف سے (جن کا قول فتاوی حلال وحرام میں معتبر ہے، اس بات کی صراحت نہیں ملے گی کہ بعد دخول کے تین طلاق ایک شمار ہوں گی۔

ابوالوفا علامہ ابن عقیل حنبلی نے (جن کے علامہ ابن تیمیہ نہایت مداح ومعتقد ہیں اور ان کے اقوال بڑے اہتمام سے نقل کیا کرتے ہیں) "التذکر" میں لکھا کہ اگر کوئی شخص "**انت طالق ثلاثا الا طلقتین**" کہے تو تینوں طلاق واقع ہو جائیں گی، کیونکہ اس نے اکثر کا استثناء کیا اور ایسا استثناء صحیح نہیں ہے۔"

علامہ ابن تیمیہ کے جد ابوالبرکات مجد الدین عبدالسلام بن تیمیہؒ مؤلف منتقی الاخبار نے اپنے کتاب "المحرر" میں لکھا کہ ایک کلمہ یا دو یا تین سے تین طلاق دے گا تو وہ سب واقع ہوں گی، اگر چہ اس طرح طلاق دینا بدعت ہے۔

علامہ بن حزم بھی جو اکثر مسائل میں جمہور سے الگ ہو جایا کرتے ہیں، وہ بھی اس مسئلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں کہ ایک لفظ سے تین طلاق واقع ہو جائیں گی۔ اس مسئلہ کی تفصیل ودلائل اپنے موقع پر آئیں گے، ان شاء اللہ، یہاں چونکہ استطراداً ترجمان القرآن کا ذکر آ گیا اور یہ معلوم ہوا کہ اس دور کے جاہل حنفی ان کی تفسیر کے اس مسئلہ سے غلط فہمی میں پڑتے ہیں، تین طلاق کو ایک خیال کر کے بغیر حلالہ کے اپنی بیویوں سے رشتہ نکاح کو باقی سمجھتے ہیں اور اس طرح حرام کے مرتکب ہوتے ہیں، اس لئے یہاں کچھ لکھنا پڑا، نیز ملک میں دوسرے بعض تیمی خیال حضرات بھی یہ چاہتے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک تصور کرنے کے ابن تیمیہ والے مسلک کو عام کیا جائے، اس لئے پیش بندی کے خیال سے یہ سطور بڑھادی گئیں۔ واللہ المسئول للہدایۃ، مسئلہ طلاق ثلاث کی بحث مکمل ومدلل "**الاشفاق علی احکام الطلاق**" للکوثریؒ میں شائع شدہ ہے، اردو میں علامہ مفتی مہدی حسنؒ (مفتی دارالعلوم دیوبند) کا رسالہ بھی جامع ومانع اور شائع شدہ ہے۔ اور ہمارے قریبی دوست مولانا عامر عثمانی مرحوم نے تو "تجلی" کے تین نمبروں میں اتنا کچھ مواد پیش کر دیا تھا کہ انصاف پسند اردو داں طبقہ کے لئے اس سے زیادہ مفید مؤثر ومدلل کافی وشافی لکھ دینا سہل ممتنع ہے۔ جزاہ اللہ عنا وعن سائر الامۃ خیر الجزاء

(نوٹ) افسوس ہے کہ عامر صاحب کو علامہ کوثری کا مذکور رسالہ باوجود تلاش بسیار کے بھی دیوبند وغیرہ میں نہ مل سکا تھا، پھر بھی انھوں نے مراجعت اصول کر کے اور بڑی محنت وکاوش برداشت کر کے جتنا کچھ لکھ دیا وہ ان ہی کا حصہ وحوصلہ تھا، کیونکہ انھوں نے بہت سے جماعت اسلامی کے اپنے خصوصی احباب کے دیرینہ تعلقات کی بھی رعایت کلمہ حق کہنے کے مقابلہ میں نہیں کی تھی۔ اب ایسے دل گردے کے انسان کہاں ہیں؟! احقر کا احساس یہ ہے کہ آخر میں انھوں نے یہ مضمون اور قادیانیت کے خلاف جو کچھ لکھا، وہ ان کی آخرت کے لئے عظیم القدر ذخیرہ بنا ہوگا۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز**

رفع یدین کو بدعت کس حنفی نے لکھا؟ ہمارے سب اکابر متقدمین اور اب حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی یہی ثابت کیا کہ رفع یدین بھی سنت نبویہ ہے اور ترک رفع بھی سنت نبویہ وسنت صحابہ وتابعین ہے، اختلاف صرف اولی وافضل کا ہے، مکروہ وغیر مکروہ کا بھی نہیں، ہمارے حضرات میں سے آخری دور میں مولانا اسماعیل شہیدؒ نے رفع یدین شروع کیا تھا، اور ایک رسالہ بھی اس بارے میں لکھا تھا، ان کو خیال ہو گیا تھا کہ یہ سنت مردہ ہو گئی ہے، اس کو زندہ کرنے میں سوشہیدوں کا ثواب ملے گا، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو معلوم ہوا تو انھوں نے حضرت شاہ عبدالقادرؒ سے فرمایا:۔ ان کو سمجھا دیں کہ رفع وترک دونوں ہی سنت ہیں، اور دونوں ہی امت میں معمول بہا ہیں، ان میں سے کسی کو مردہ سنت خیال کر کے اس کو جاری کرنا غلط ہے، تو اس کے بعد مولانا اسماعیل صاحبؒ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا اور رفع یدین کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مولانا کرامت علی جونپوری نے ''ذخیرۂ کرامت'' ص ۲۲۴/۲ میں اس طرح نقل کیا ہے کہ مولانا شہیدؒ نے اپنے مرشد حضرت سید احمد صاحب قدس سرہٗ کے سمجھانے پر رجوع کیا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم (برہان جولائی ۸۷ء)

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شاہ ولی اللہؒ پر ایک زمانہ تک عدم تقلید کی طرف بھی رجحان رہا ہے اور انھوں نے رفع یدین کو بھی ترجیح دی تھی مگر آخر میں وہ حنفیت کی طرف زیادہ مائل ہو گئے تھے اور شاہ عبدالعزیزؒ وغیرہ تو نہایت درجہ مسلک حنفی کے پابند تھے اس لئے میں نے لکھا تھا کہ ہمارے اکابر دیوبند کے فکری ومسلکی امام بکل معنی الکلمہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ امام اعظمؒ کے نہ صرف تلمیذ اعظم بلکہ آپ کے عاشقین صادقین میں سے تھے اور شاید صرف معدودے چند مسائل میں ہی امام صاحبؒ سے الگ رائے اختیار کی ہو گی اور ان میں سے ہی یہ رفع یدین کا مسئلہ ہے، اور یہ اختلاف بھی بہت معمولی نوعیت کا صرف اولویت کا تھا، اور امام صاحبؒ کے ظرف عالی کی داد دینی چاہیئے تھی کہ اپنے شاگرد کی بات پر ذرہ بھر ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا، اس کے برعکس امام ہمام پر یہ ریمارک کیا موزوں تھا کہ وہ گمراہ تھے اور غالی گمراہوں کی طرح جوابدہی کے لئے مدد نہ ملنے پر ساکت وحیران رہ گئے۔ والی اللہ المشتکی۔

امام اعظم پر بے علمی کا طعنہ

آخر میں ہمیں اس پر بھی کچھ لکھنا ہے، کیونکہ اتنی بڑی جسارت بھی امام ہمام کے بارے میں امام بخاریؒ کے سوا کسی نے ہمارے علم میں نہیں کی ہے۔ اور اس کو انھوں نے اپنے رسالہ میں بار بار دہرایا ہے کہنے اور لکھنے میں ہر ایک کو آزادی حاصل ہے، مگر کیا وہ مقتدر ہستی جس نے مسلسل تیس بتیس سال تک درس وتدریس اور افتاء وقانون سازی کا وہ لافانی کام انجام دیا جو مذہب حنفی کی بنیاد ہے، اور جس نے چالیس علماء فحول کی مجلس تدوین فقہ قائم کر کے ساڑھے بارہ لاکھ قانونی مسائل کے جوابات مرتب کرائے، جو ان کی زندگی ہی میں الگ الگ عنوانات کے تحت مرتب ہو کر عباسی، اسلجوقی، عثمانی اور مغل سلطنتوں کا قانون بن گئے تھے اور ان کے سات آٹھ سو تلامذۂ کبار دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں پہنچ کر درس و افتاء کے مسند نشین اور ساری امت مسلمہ کی عقیدتوں کے مرکز بن گئے تھے، ان کے تقریباً پچاس تلامذۂ قانون اسلامی ایسے حاذق و ماہر نکلے کہ جو سلطنت عباسیہ کے قاضی اور جج مقرر ہوئے، اور ہر دور میں امت محمدیہ کے دوتہائی یا تین چوتھائی افراد علماء وعوام ان کے فقہ کی پیروی کرتے رہے ہیں، کیا ایسی عظیم وجلیل شخصیت کے لئے بے علمی کا طعنہ زیب دیتا ہے اور وہ بھی امام بخاری ایسے عظیم المرتبت قابل صد احترام کی جانب سے؟!

ے بخت جان زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

یہاں امام اعظمؒ کی شاندار علمی زندگی اور ان کے زندۂ جاوید علمی کارناموں کا تذکرہ موجب طوالت ہو گا، مقدمۂ انوارالباری میں اور پھر ضمناً بھی کچھ نہ کچھ لکھا ہی گیا ہے، اور آئندہ بھی حسب ضرورت لکھیں گے ان شاء اللہ، قریبی دور میں علامہ کوثریؒ اور شیخ ابوزہرہ مصریؒ نے بھی نئے طرز میں کافی تحقیق سے لکھدیا ہے۔

''خلافت وملوکیت''، میں علامہ مودودی نے بھی باب ہفتم وہشتم میں جو قیمتی ذخیرہ امام اعظمؒ کے بارے میں یکجا کر دیا ہے وہ بھی قابل مطالعہ ہے، یوں ہمیں علامہ کے بہت سے نظریات سے اختلاف بھی ہے مذکورہ بالا کتاب میں بھی ہمارے نزدیک متعدد مقامات مخدوش ہیں، ان کے لئے مولانا محمد تقی عثمانی عم فیضہم کی کتاب ''حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق شائع کردہ الجمعیۃ بکڈپو دہلی کا مطالعہ کیا جائے۔ اور ان کی تفسیر پر بھی ہمارے تقریباً ایک سوایرادات ہیں، مگر انصاف یہ ہے کہ کسی کی بہتر خدمت وسعی کی داد نہ دینا بھی غیر موزوں بات ہے۔ واللہ المسئول للحق والصواب۔

ترجیح ترک رفع یدین کی احادیث

(۱) سب سے پہلی دلیل وحجت تو حدیث عبداللہ بن مسعودؓ ہے، جس کو خود امام اعظمؒ نے بھی امام اوزاعی سے مناظرہ کے وقت پیش کیا تھا، جبکہ امام اوزاعی نے یہی بخاری والی حدیث زہری عن سالم عن ابن عمر پیش کی تھی، اور فرمایا تھا کہ اے امام! آپ کی بات ترک رفع کی کیسے صحیح ہو سکتی ہے جبکہ ایسی عالی سند کے ساتھ ہم رفع کی حدیث پیش کر رہے ہیں؟ اس پر امام اعظمؒ نے جواب دیا تھا کہ ہم سے حماد نے عن ابراہیم عن علقمۃ والاسود عن ابن مسعودؓ روایت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ صرف افتتاح صلوٰۃ کے وقت رفع یدین کرتے تھے پھر نہیں کرتے تھے، امام اوزاعی نے کہا کہ میں تو آپ کے سامنے ایسی عالی سند کے ساتھ زہری عن سالم عن ابیہ والی روایت پیش کر رہا ہوں اور آپ حماد الخ کو مقابلہ میں لا رہے ہیں جبکہ اس کی سند اتنی عالی نہیں ہے، اس پر امام صاحب نے فرمایا کہ آپ نے صرف سند کا علو دیکھا اور یہ خیال نہ فرمایا کہ ہماری روایت کے ایک راوی حماد ہیں جو زہری سے افقہ ہیں، دوسرے ابراہیم ہیں جو سالم سے افقہ ہیں، تیسرے علقمہ ہیں جو فقہ میں ابن عمر سے کم نہیں ہیں۔ اور اگر حضرت ابن عمر کے فضل صحبت پر نظر کی جائے تو علقمہ کے ساتھ اسودؒ بھی ہیں جن کے لئے فضل کثیر ثابت ہے، پھر آگے روایت کرنے والے حضور اکرم ﷺ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں ان کی بڑائی عظمت وفضل کا تو ذکر ہی کیا؟ یہ سن کر حضرت امام اوزاعیؒ خاموش ہو گئے۔

اس مناظرہ کا حال ہمارے شیخ ابن الہمام صاحب فتح القدیر نے لکھ کر فرمایا کہ امام اوزاعی نے تو حدیث رفع یدین کی تائید علو سند سے کی تھی، ہمارے امام صاحب نے حدیث ترک کی تائید فقہ رواۃ سے کی، اور یہی بات زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے (اور شاید اسی لئے امام اوزاعی نے سکوت اختیار فرمایا)

علامہ ملا علی قاریؒ (شارح مشکوۃ شریف) نے لکھا کہ بعض لوگوں نے یہ بات بھی چلتی ہوئی کہہ دی ہے کہ امام صاحب اور آپ کے اصحاب کو بخاری والی روایت نہ پہنچی ہوگی، حالانکہ یہی بخاری والی روایت تو مناظرہ کے وقت پیش کی جا رہی تھی جو بہت بعد کو امام بخاری کو پہنچی، اور اس کو انھوں نے صحیح بخاری میں درج کر دیا ہے اور چونکہ وہ اپنے اختیار کردہ مسلک کے خلاف والی حدیث کی روایت کرتے ہی نہیں، اس لئے عبداللہ بن مسعود کی روایت کو بخاری میں نہیں لیا ہے، علامہ قاری نے اس موقع پر یہ بھی لکھا کہ احادیث نبویہ صحیحہ نصر اللہ امرأ سمع منا شیئا الخ اور رب حامل فقہ غیر فقیہ ورب حامل فقہ الی من ہو افقہ منہ سے بھی امام صاحب ہی کے اصول کی تائید ہوتی ہے کہ راوی غیر فقیہ سے فقیہ وافقہ راوی کی روایت زیادہ قوی ومحکم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام اعظم کے شرعی فیصلے اپنی رائے سے نہیں بلکہ احادیث نبویہ ہی کی روشنی میں ہوتے تھے، اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی یہ بات بالکل صحیح تھی کہ ابوحنیفہؒ کی رائے مت کہو کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ سب حدیث نبوی ہی کے مطالب ومعانی ہوتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو ترک رفع کی ترجیح کے لئے یہ روداد مناظرہ ہی کافی ووافی ہے کیونکہ یہ مناظرہ امام صاحب کا کسی معمولی شخص سے نہیں

۱؎ اسود اخص تلامذہ حضرت ابن مسعودؓ تھے، حضرت عائشہؓ سے مہمات امور شرعیہ میں بہ کثرت سوالات کیا کرتے تھے، برادر علقمہ کے بیٹے تھے کوئی سال نہیں ترک کیا جس میں حج نہ کیا ہو، حضرت عائشہؓ کی خدمت میں ہدایا بھیجا کرتے تھے، رواۃ کوفہ میں سے ہیں اور ان کا مذہب ترک رفع یدین تھا، اس سے ان کی جلالت قدر، اپنے اکابر اساتذہ سے علمی استفادات کے بعد ان کے مختارات کی قیمت پہچانی جائے (افادۂ انور)

ہوا تھا، امام اوزاعی بڑے فقیہ، مجتہد ومحدث ومتکلم تھے، اسی لئے ایک عرصہ تک با قاعدہ ان کا مذہب بھی امت کے اندر جاری رہا تھا۔ اس لئے بعد کے حضرات، سے ان کا کیا مقابلہ جو دوسری صدی میں آئے، اور ان کے مذہب ومسلک کا چلن چندروز کے لئے بھی نہ ہو سکا، اور یہی وجہ ہے کہ وہ امام صاحب کی دلیل سن کر خاموش ہو گئے، جس طرح امام صاحب اپنے تلمیذ ابن مبارک کی بات طیران والی سن کر خاموش ہو گئے تھے، اس کو امام بخاری نے امام صاحب کی غوایت (گمراہی بتلائی) حالانکہ حق بات سن کر خاموش رہنا یا تسلیم ہی صحیح طریقہ ہے امام صاحب جانتے تھے کہ رفع وترک دونوں ہی سنت ہیں اگر شاگرد نے دوسری سنت کو اختیار کر لیا اور اپنی ذہانت سے اس کے لئے ایک توجیہ بھی نکالی تو اس میں کیا مضائقہ ہے، پھر وہ اس لئے بھی خاموش ہوئے ہوں گے کہ عبداللہ بن مبارک کی اس توجیہ کے بعد کوئی یہ نہ کہہ دے کہ حضور علیہ السلام نے تشہد کے بعد سلام پھیرنے کے وقت جو نکیر فرمائی کہ یہ کیا شریر وشوخ گھوڑوں کی طرح ہاتھ اٹھا اٹھا کر اشارے کر رہے ہو۔

نماز میں سکون کو لازم پکڑو یہ حدیث صحیح مسلم شریف وغیرہ کی ہے، جب حضور علیہ السلام نے ختم نماز پر بھی سکون کی تاکید فرمائی، تو کیا نماز کے اندر بار بار ہاتھ اٹھانے کو پسند فرماتے، ہاں حسب تحقیق حضرت استاذ الاساتذہ شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ صحیح صورت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائی دور رسالت میں توسع تھا، ہر تکبیر پر بھی رفع یدین ہوا ہے، جس کے بارے میں امام اوزاعی نے بھی فرمایا تھا کہ یہ پہلی بات تھی، پھر پانچ چھ بار ہاتھ اٹھانے کی بات باقی رہی کہ امام بخاری نے علاوہ قبل الرکوع وبعد الرکوع کے دوسرے رفع بھی حدیث سے ثابت کئے ہیں اور غالباً ان کا مسلک بھی امام شافعی وغیرہ سے زیادہ بار ہی نماز میں رفع یدین کا ہے اس کے بعد یہ دو بار کا باقی رہا، جس کے امام احمد وامام شافعی قائل ہوئے، اور ابن عمر کی مذکورہ بالا روایت سے ثابت ہیں، پھر آخر میں دائرہ اور بھی تنگ کر دیا گیا کہ صرف ابتداء صلوٰۃ میں رفع یدین باقی رہا، اور سب مرجوح ہو گئے اور اسی آخری سنت نبویہ پر اہل مدینہ عامل تھے اور سارے اہل کوفہ بھی جہاں پر سینکڑوں صحابہ جا کر آباد ہوئے تھے۔ اسی لئے حضرت امام مالکؒ وامام ابوحنیفہؒ اور دونوں کے اصحاب وتبعین نے ترکِ رفع کو ترجیح دی، لیکن بدعت رفع یدین کو بھی نہیں کہا، اور امام مالک سے تو ایک قول کراہتِ رفع یدین کا ہے بھی، امام اعظم سے ایسا بھی نہیں ہے، نہ کبارِ حنفیہ میں سے کسی نے اس طرح طعن وتشنیع رافعین پر کی، جس طرح دوسروں نے حنفیہ ومالکیہ پر کی ہے،

حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ بخاری میں فرمایا تھا کہ یہ حدیث جو بخاری لائے ہیں مالک بن حویرثؓ کی ہے جو بصرہ میں تھے اور حدیث ابن عمرؓ کی لائے ہیں جو مدینہ میں تھے، پھر فرمایا کہ مکہ معظمہ کے لوگوں میں رفعِ یدین کے نقل کرنے والے سب کم عمر کے ہیں، اور اہل کوفہ تو سب ہی ترکِ رفع کی روایت کرتے ہیں، پھر صحابۂ کرام میں سے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت براء بن عازبؓ (بڑی عمر کے صحابہ) سب ترکِ رفع کرتے تھے (کمارواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ ص ۲۳۶/۱) ان بڑوں کے مقابلہ میں حضرت ابن عمر وغیرہ کی روایت کو کیسے ترجیح دی جا سکتی ہے۔

امام بخاری نے جزءِ رفع یدین میں اس بات پر بھی خفگی کا اظہار کیا ہے کہ ابن عمر کو لوگ کم عمر کا بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں صغیر تھے، اور جوابی طور سے امام بخاری نے لکھا کہ حضور علیہ السلام نے ان کو رجل صالح کہا ہے، کوئی بتلائے کہ وصفِ صلاح کی وجہ سے ان کے صغیر السن ہونے کی نفی کیسے ہو گئی، اور کیا صلاح کی وجہ سے وہ کبارِ صحابہ کی صف میں شامل ہو گئے؟ اس سے بھی بڑی مشکل یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے استاذِ حدیث محدثِ شہیر ابن ابی شیبہؒ نے (جو امام اعظم کے بڑے مخالفین میں بھی ہیں اگرچہ امام بخاری سے کم ہیں) ایک روایت اپنے مصنف ص ۲۳۷/۱ میں ابوبکر بن عیاش عن حصین عن مجاہد یہ بھی روایت کر دی کہ میں نے حضرت ابن عمر کو نہیں دیکھا کہ وہ بجز افتتاحِ صلوٰۃ کے نماز میں کسی جگہ رفعِ یدین کرتے ہوں،

اس سے معلوم ہوا کہ خود راویٔ حدیثِ بخاری ابن عمرؓ نے بھی عملاً ترکِ رفع کر دیا تھا۔ اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ جو راوی خود اپنی روایت

کے خلاف عمل کرے وہ اس کی روایت کے مرجوح ومتروک العمل ہونے کی علامت ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس کے بعد ملاحظہ کیجئے کہ امام ترمذی نے بھی اس حدیثِ عبداللہ بن مسعود کی روایت کی اور تحسین بھی کی۔ بلکہ ایک نسخۂ ترمذی کے مطابق ان کی حدیث پر ترکِ رفع یدین کا باب بھی باندھا، جو متداول مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہے۔

امام ابوداؤد نے مستقل باب **من لم یذکر الرفع عند الرکوع** قائم کرکے حدیثِ ابن مسعودؓ کو ذکر کیا، پھر دوسری حدیث حسن بن علی سے نقل کی کہ نماز میں ایک ہی بار شروع میں رفع یدین کیا ہے، پھر حضرت براء سے حدیث روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ شروع نماز پر رفع یدین کرتے تھے، پھر نہیں کرتے تھے، اور آخر میں حضرت ابو ہریرہ سے بھی حدیث روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں داخل ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھ دراز کرکے اٹھاتے تھے۔ بذل المجہود میں رفع وترک کی بحث پوری تفصیل ودلائل کے ساتھ قابلِ مطالعہ واستفادہ ہے)

امام نسائی نے باب **رفع الیدین حذو المنکبین عند الرفع من الرکوع** قائم کرکے حدیثِ ابن عمرؓ روایت کی۔ پھر آگے دوسرا باب **الرخصة فی ترک ذلک** لائے، جس میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز میں صرف ایک بار رفعِ یدین تھا۔

اسی طرح محدث ابن ابی شیبہ نے ایک باب "**من کان یرفع یدیه اذا افتتح الصلوة**" قائم کرکے رفعِ یدین کی روایات جمع کیں تو دوسرا باب "**من کان یرفع یدیه فی اول تکبیرة ثم لا یعود**" قائم کیا، جس میں ترکِ رفع کی احادیث ذکر کیں۔ (ص ۱\۲۳۴ تا ص ۱\۲۳۷) ابن حزم نے محلی میں حدیث ابن مسعودؓ روایت کرکے اس کی تصحیح بھی کی۔ مسند احمد میں بھی یہ روایت ہے جو مع تصحیح کے درج ہے۔ دارقطنی نے بھی اس کو مع تصحیح کے روایت کیا۔ ابن القطان ودارقطنی وامام احمد نے تصحیح کے ساتھ لفظ **ثم لم یعد** کو منکر بتلایا اور یہ اس لئے کہ محدثین کی عادت ہے کہ وہ ایک ایک لفظ پر ڈیرے ڈال کر چھان بین کرتے ہیں، اور جب کسی لفظ میں شبہ ہو تو منکر کہہ دیتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ حدیثِ صحیح کا سارا مضمون ہی مشتبہ یا منکر ہوگیا بلکہ صرف اس لفظ کے بارے میں منکر ہونے کا حکم ہوتا ہے، اگرچہ اسی لفظ کے ہم معنی دوسرے الفاظ دوسری احادیث صحیحہ کے معروف اور غیر منکر ہوں، چنانچہ دوسری احادیث میں جو یہ آیا ہے کہ صرف ایک مرتبہ شروع میں رفع یدین ہوا، یا افتتاح صلوٰۃ کے علاوہ نہیں ہوا، وہ الفاظ زیر بحث نہیں آئے ہیں۔

اس کے علاوہ امام محمدؒ نے اپنے موطأ میں، امام طحاوی نے اپنی شرح معانی الآثار میں، امام بیہقی نے سنن میں، سب ہی نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت کو ذکر کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک کا قول جو امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کے بارے میں ذکر کیا وہ بھی اس روایت کے مرفوع ہونے کے بارے میں ہے خود حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فعل ترکِ رفع کے وہ بھی منکر نہیں ہیں، چنانچہ خود ان کی اپنی روایت نسائی میں موجود ہے۔ جو امام نسائی نے ترکِ رفع کے باب میں نقل کی ہے۔ اور جس طرح محدثین نے ایک ایک لفظ پر بحث کی ہے، رفع ووقف کے بارے میں بحث وتحقیق سب نے کی ہے اور جس کو بھی مثلاً رفع کے بارے میں اطمینان نہ ہوا اس نے اس کا انکار کردیا اور جس کو اطمینان ہوا اس نے مرفوع ہونے کی صراحت کردی۔ پھر جبکہ اس امر کو سارے ہی محدثین کبار نے تسلیم کرلیا کہ خود حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ہمیشہ ترک رفع کیا، اور آپ کے اصحاب نے بھی، جن میں بہ کثرت صحابہ بھی تھے، اور سارے اہل کوفہ تارکینِ رفع تھے۔ مدینہ طیبہ کے ساکنین حضرت امام مالک کے زمانہ میں تارکینِ رفع تھے، اور دوسرے بلادِ اسلامیہ میں بھی ضرور حضرت ابن مسعودؓ، حضرت علیؓ وغیرہ کبارِ صحابہؓ کے عمل کو دیکھ کر ترکِ رفع ہی پر عامل ہوں گے، اور بقول حضرت علامہ کشمیریؒ مدینہ میں بھی تعامل ترکِ رفع کی وجہ سے ہی حضرت ابن عمر کو یہ خیال آتا ہوگا کہ کہیں رفع یدین کی سنت بالکل متروک ومنکر ہی نہ بن جائے، اور اسی لئے وہ کچھ لوگوں کو کنکری بھی مار کر توجہ دلاتے ہوں گے۔ اس سے کیا ہوا جبکہ سنت تو رفع وترک ودونوں ہی تھیں، حضرت ابن عمرا پنے اس جذبہ میں سب سے ممتاز تھے ہی کہ حضور علیہ السلام کی کوئی سنت

متروک نہ ہونے پائے، اور وہ ہر ہر سنتِ نبویہ پر بڑی سختی سے عمل کرنے کے عادی تھے۔اس سے بعد کے حضرات نے حنفی مسلک کو گرانے کے منصوبہ کے تحت سندوں کو آڑ بنا کر وہ سب کیا، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور اب تک بھی معاندین حنفیہ ایسے ہی طریقوں کو اپنا کر خلاف پروپیگنڈے کرتے رہتے ہیں۔والی اللّٰہ المشتکی.

امام بخاری کا غیر معمولی تشدد

ان شاء اللہ العزیز اس مسئلہ کی پوری بحث پڑھ کر ناظرین فیصلہ کرلیں گے کہ کیا واقعی امام صاحب احادیث وآثار وسنن نبویہ سے نفرت کرنے والے تھے اور بدعت ان کے لحم ودم میں سرایت کرگئی تھی، جیسا کہ امام بخاری جیسے عالی مرتبت نے ان پر الزام لگایا، اور بخاری میں بھی کتاب الاکراہ ص ۱۰۲۷ وص ۱۰۲۸ میں دوجگہ قال بعض الناس کہہ کر امام صاحب کو مطعون کیا ہے، اسی موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ بخاری میں فرمایا تھا کہ امام بخاری نے یہاں امام اعظمؒ پر تشنیع کی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں فقہِ حنفیہ سے پوری واقفیت حاصل نہ تھی اگرچہ وہ کہتے یہی تھے کہ فقہِ حنفی کا مطالعہ کیا ہے لیکن ان کی کتاب سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انہیں اس کا تحقیقی علم نہ تھا اور کچھ باتیں بے تحقیق بھی سنی تھیں اور ان کا یقین کرلیا تھا، پھر ان پر اعتراضات کرتے رہے جو ان کی شان وجلالتِ قدر کے لئے موزوں نہ تھے، وہ اگر صحیح طور سے جانتے کہ فقہِ حنفی میں اکراہ کی حقیقت کیا ہے تو اعتراض نہ کرتے۔ان مسائل کی تحقیق اپنے موقع پر آئے گی۔ان شاء اللہ

حضرتؒ نے پھر کتاب الحیل میں بھی فرمایا کہ اس کتاب میں ۱۹ جگہ امام صاحب پر حملے کئے ہیں، اور یہاں تک کہہ دیا کہ امام صاحب نے مسلمانوں میں فداع وفریب کو رائج کردیا، ایک جگہ کہہ دیا کہ امام صاحب نے ہبہ کے بارے میں رسولِ اکرم ﷺ کی مخالفت کی ہے اور زکوٰۃ ساقط کردی ہے۔(بخاری ص ۱۰۲۹ تا ص ۱۰۳۲)

حضرتؒ نے فرمایا کہ امام بخاری نے جوازِ حیلہ اور نفاذِ حیلہ میں فرق نہیں کیا، اس لئے جتنے اعتراض قول بالجواز پر ہوسکتے تھے وہ سب قول بالنفاذ پر کرگئے۔حالانکہ دونوں میں واضح فرق ہے کیونکہ ایک چیز کا ارتکاب شرعاً ممنوع وناجائز ہوتا ہے تاہم اس کو کوئی کرگذرے تو اسکو واقع تو ماننا ہی پڑے گا، جس طرح کوئی زمانۂ حیض میں طلاق دے جو شرعاً محظور وممنوع ہے، تو اس کو واقع ونافذ تو ماننا ہی پڑے گا۔الخ حضرت شاہ صاحبؒ نے ہر بعض الناس پر پوری تفصیل کرکے مدلل وشافی جوابات دیئے ہیں جو ان شاء اللہ اپنے موقع پر ذکر کئے جائیں گے۔(یہاں یہ بات ضمناً یاد آگئی، اس لئے اشارہ کردیا گیا)۔

حدیثِ ابن مسعودؓ کی بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بیشتر اکابر محدثین نے اس کو تسلیم کیا ہے اور اس سے تو کسی نے بھی انکار نہیں کیا کہ خود ان کا عمل ترکِ رفع ہی تھا اور ہمیشہ رہا، حتی کہ ابن مبارک بھی اس سے منکر نہیں ہوئے، اس پر بھی امام بخاری کے اس دعوے کو کیا کہیں گے کہ کسی صحابی سے ترکِ رفع ثابت نہیں ہوا۔کیا ابن مسعودؓ صحابی نہیں تھے؟ اور صحابی بھی ایسے کہ برسول حضور علیہ السلام کے ساتھ سایہ کی طرح بطور خادمِ خاص رہے، اور ایسے کمالات کے صحابی کہ حضرت عمرؓ ایسے جلیل القدر صحابی اور دوسرے حضرات نے ان کے علم وفضل کی تعریف بے حد وغایت کی ہے، اس کے باوجود اگر ان سے ساری عمر میں کوئی لغزش ہوگئی ہے یا نسیان کہ وہ معصوم تو بہرحال نہ تھے تو ان کی ترکِ رفع کو بات کو گرانے کے لئے اتنی باتیں نکالی گئیں کہ حد وبس ہے، کیا یہی انصاف کا تقاضہ تھا؟ کیا امام بخاری کا یہ دعویٰ سارے محدثین کی تصریحات اور تاریخی حقیقت کے خلاف نہ تھا؟ اس پر اگر ہم کچھ عرض کریں تو سارے اہلِ حدیث بھائیوں کو شکوہ کہ امام بخاری کا ادب نہیں کیا۔''کوئی بتلائے کہ اب ہم کیا کریں؟'' کوئی یہ نہ سمجھے کہ انہیں امام بخاری کا بڑا ادب ملحوظ ہے، ورنہ سب ہی بڑے ان کی نظر میں ایک ہوتے ان کا مقصدِ وحید تو صرف اپنی مزعومہ سلفیت کی تائید اور ائمۂ مجتہدین کے خلاف اپنے الگ مسلک کی ترویج ہے، چونکہ حسبِ تصریح

صاحب دراسات اللبیب وغیرہ امام بخاری بھی ''اصحاب الظواہر'' میں سے تھے، اوران کے فقہی مسلک اورروایات سے ان کو فائدہ پہنچتا ہے، پھران کی مخالفتِ حنفیہ سے بھی ان کا دل خوش ہوتا ہے، اس لئے ان کے ادب کی آڑ لے کرہمیں مطعون کرنا چاہتے ہیں۔ والعلم عنداللہ

۱۲، حدیث براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو رسولِ اکرم ﷺ جب افتتاحِ صلوٰۃ کی تکبیر کہتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھ اس طرح اٹھاتے کہ ان کے انگوٹھے دونوں کانوں کی لوتک پہنچ جاتے تھے، پھرنہیں اٹھاتے تھے (ابن ابی شیبہ ابوداؤد وطحاوی) ابوداؤد نے اس کے طرقِ روایت میں کلام بھی کیا ہے، جس کا مفصل رد وجواب تنسیق النظام میں دیکھا جائے (معارف واوجز)

نیز معارف السنن ص ۴۸۹\۲ میں لکھا کہ سفیان ثوری، ابن ابی لیلی، ہشیم، شریک، اسماعیل بن زکریا، اسرائیل بن یونس اور حمزہ زیات سب ہی یزید بن ابی زیاد سے بہ لفظ ''ثم لا یعود'' روایت کرتے ہیں اور شعبہ نے بھی اس کے مرادف وہم معنی لفظ کے ساتھ روایت کیا ہے، پھر بھی کیا انصاف کا تقاضہ اس روایت کو ساقط کرنے ہی میں ہے؟ اور سارا جھگڑا اس لئے کھڑا کیا گیا ہے کہ یہ ان کے مسلک کے خلاف ہے، اور حق یہ ہے کہ اس روایت کو ساقط کر دینا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے کلا ثم کلا۔الخ۔

(۳) حدیثِ عباد بن الزبیرؓ مرسلاً کہ رسولِ اکرم ﷺ جب نماز شروع فرماتے تو اولِ صلوٰۃ میں ہاتھ اٹھاتے تھے پھر ختم نماز تک کسی موقع پر نہ اٹھاتے تھے۔ (بیہقی فی الخلافیات کمافی نصب الرایہ ص ۴۰۴\۱) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے اس کے رجالِ سند کی تحقیق کی تو حدیث کو صحیح پایا۔ بعض کتبِ حنفیہ میں غلطی سے اس حدیث کو عبداللہ بن زبیرؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جس پر ابن جوزی نے تشنیع کی ہے، مجمع الزوائد میں بھی غلطی ناسخین سے عبداللہ بن زبیر ہی درج ہو گیا ہے۔ باقی تفصیل نیل الفرقدین ص ۱۲۴ میں ہے (معارف ص ۴۹۶\۲ واوجز)

(۴) حدیثِ ابن عمرؓ مرفوعاً کہ نبی اکرم ﷺ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت رفع یدین کرتے تھے، پھرنہیں کرتے تھے، (بیہقی فی الخلافیات والزیلعی فی نصب الرایہ ص ۴۰۴\۱) حاکم نے اس کو باطل وموضوع کہا، مگر اس کی تخریج زیلعی کی سند صحیح ہے، اور حضرت ابنِ عمرؓ سے فعلاً ترکِ رفع روایتِ مجاہد سے ثابت ہے تو پھر اس روایتِ مرفوعہ کی صحت میں بھی استبعاد نہیں ہے، حاکم کا جواب نیل ص ۱۳۷ میں ہے۔ (معارف ۴۹۷\۲)

(۵) حدیثِ ابنِ عباسؓ (جو ابن عمرؓ سے بھی مروی ہے) کہ حضور علیہ السلام نے سات جگہوں کے علاوہ رفعِ یدین سے منع فرمایا (طبرانی مرفوعاً، ابن ابی شیبہ موقوفاً، جزء رفع الیدین للبخاری تعلیقاً عن ابن عباس ومرفوعاً عن ابن عمرو بزار وبیہقی وحاکم موقوفاً ومرفوعاً عنہما کمافی الزیلعی (اوجز ص ۲۰۶\۱)

(۶) حدیثِ جابر بن سمرةؓ، مالی اراکم رافعی، ایدیکم کانھا اذ ناب خیل شمس، اسکنوا فی الصلوٰۃ (مسلم، ابو داؤد والنسائی) اس کو صرف سلام نماز کے وقت کے لئے قرار دینا غلط ہے کیونکہ الفاظ عام ہیں، دوسرے یہ کہ حدیثِ مذکور دو طریقوں سے مروی ہے، تمیم بن طرفہ کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام تشریف لائے اور آپ نے نماز کے درمیان لوگوں کو ایک کے بعد ایک کو ہاتھ اٹھاتے دیکھا اور منع کی اور نماز میں سکون اختیار کرنے کا بھی حکم فرمایا، دوسری روایتِ عبید اللہ القبطیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ نماز ہورہی تھی، اور آپ نے سلام کے وقت لوگوں کو ہاتھ اٹھاتے دیکھ کر اس سے روکا اور سلام کا طریقہ سمجھایا۔ اس روایت میں اسکنوا فی الصلوٰۃ نہیں ہے۔ اس لئے کہ نماز سے نکلنے کے وقت کیا تھا۔ (اوجز ص ۲۰۶\۱ وفتح الملہم ص ۱۴\۲)

امام بخاری کا نقد اور تشدد

آپ نے جزء رفع الیدین میں لکھا: بعض بے علم لوگوں نے حدیث جابر بن سمرہ سے بھی ترکِ رفع پر استدلال کیا ہے حالانکہ وہ تشہد میں ہے نہ کہ قیام میں۔ لوگ تشہد میں ایک دوسرے کو سلام کیا کرتے تھے، اس کو آپ نے منع فرمایا۔ اس کے بعد امام بخاری نے لکھا کہ اس حدیث سے استدلال وہ شخص نہیں کرے گا جس کو کچھ بھی علم کا حصہ ملا ہو۔ اور اگر اس کی بات صحیح ہوتی تو نماز کی تکبیر تحریمہ کے وقت اور نمازِ عید

کی تکبیرات کے وقت بھی رفع یدین ممنوع ہوتا۔ کیونکہ حدیث میں کوئی استثناء نہیں ہے۔

اس کے بعد امام بخاری نے جابر بن سمرہ کی دوسری حدیث بھی نقل کی اور لکھا کہ اس سے ڈرنا چاہئے کہ رسول اللہ علیہ کی طرف وہ بات منسوب کر دی جائے جو آپ نے نہیں فرمائی، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ اس کے حکم کے خلاف کرتے ہیں ان کو اس سے ڈرنا چاہئے کہ وہ کسی آزمائش وفتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں یا خدا کی طرف سے ان پر عذاب الیم نازل نہ ہو جائے۔

اس کے بعد کم علم لوگوں کے جوابی معروضات ملاحظہ ہوں:۔ امام مسلم نے ''باب الامر بالسکون فی الصلوٰۃ'' میں پہلے تمیم بن طرفہ کی روایت سے جابر بن سمرۃ سے حدیث نقل کی کہ حضور علیہ السلام ہماری طرف نکل کر آئے اور فرمایا کہ یہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں ہاتھ اٹھاتے اس طرح دیکھتا ہوں جیسے کہ گویا وہ بے چین ومضطرب گھوڑوں کی دم ہیں۔ نماز کے اندر سکون اختیار کرو۔ دوسری حدیث عبید اللہ بن القبطیہؒ کی روایت سے جابر بن سمرہ ہی سے اس طرح روایت کی کہ جب ہم لوگ حضور علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، تو ہم ایک دوسرے کو **السلام علیکم ورحمۃ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ** کہا کرتے تھے، (راوی نے دائیں بائیں اشارہ کر کے بتلایا) تو رسولِ اکرم علیہ نے فرمایا:۔ گھوڑوں کی ہلتی ہوئی دموں کی طرح ہاتھوں سے اشارے کیوں کرتے ہو؟ بس اتنا کافی ہے کہ ہاتھ رانوں پر رکھے رہیں اور دائیں بائیں اپنے بھائی کو سلام کہو۔

مسلم میں تیسری حدیث بروایت عبید اللہ ہی جابر بن سمرہؓ سے اس طرح ہے کہ میں نے حضور علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھی پس جب ہم سلام پھیرتے تھے تو اپنے ہاتھوں کے اشارہ کے ساتھ **السلام علیکم ورحمۃ اللہ** کہا کرتے تھے، رسولِ اکرم علیہ نے ہماری طرف دیکھا تو فرمایا:۔ یہ کیا تم گھوڑوں کی ہلتی ہوئی دموں کی طرح ہاتھوں سے اشارے کیا کرتے ہو؟ سلام پھیرتے وقت اپنی بھائی کی طرف رخ کرنا کافی ہے، ہاتھ سے اشارہ نہ کرے۔

ہم نے تینوں حدیث نقل کر دیں تا کہ بات صاف ہو جائے، اور ہر شخص سمجھ سکے کہ سب میں ایک ہی مضمون ہے یا الگ الگ موقع پر حضور علیہ السلام نے جدا جدا ہدایت دی ہے۔ ایک تو یہی فرق ہے کہ حضور نے باہر سے نماز کے اندر لوگوں کو ہاتھ اٹھاتے دیکھا، اور دوسرے موقع پر خود حضور علیہ السلام نے جماعت سے نماز پڑھائی اور سلام کے وقت ہاتھوں کے اشارے دیکھے، نماز کے اندر ہاتھ اٹھانا رفعِ یدین کی صورت بتاتا ہے اور سلام کے وقت ہاتھوں سے اشارہ دوسری طرح ہوتا ہے، اس میں رفع یدین نہیں ہوتا۔

جس موقع پر آپ نے باہر سے دیکھا اور رفعِ یدین کو روکا اس کے ساتھ نماز کے اندر سکون کا بھی حکم دیا، اور جب سلام کے وقت دیکھا تو نماز ختم ہو رہی تھی، اس موقع پر اسکنوا فی الصلوٰۃ کا نہ موقع تھا اور نہ آپ نے فرمایا۔ نہ راوی نے اس کو ذکر کیا۔

بذل المجہود ص ۲/۸ میں زیادہ بہتر طریقہ پر امام بخاری کے نقد کا جواب دیا گیا ہے۔ اس میں مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی ومسند احمد سب کی روایتوں کے حوالے نقل کئے ہیں اور نسائی میں راوی نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ حضور علیہ السلام ہماری طرف نکل آئے تو ہم نماز کے اندر تھے، اور ہم نے اپنے ہاتھ نماز کے اندر اٹھائے تھے، یہاں شوکانی نے بھی کچھ دخل دیا ہے، جس کا جواب ملا علی قاری اور زیلعی نے خوب دیا ہے۔ اور صاحب عون المعبود نے لکھا کہ طحاوی وعینی ایسا جواب دیتے تو تعجب نہ تھا۔ امام زیلعی ایسے محدثِ کبیر ومنصف کے جواب پر بہت تعجب ہے، اور کہا کہ جب راوی جابر بن سمرہ ایک ہے تو حدیث بھی ایک ہی ہونی چاہئے، اس کو نقل کر کے صاحبِ بذل نے لکھا کہ اگر صاحبِ عون المعبود کو علوم نبوۃ سے کچھ حصہ ملا ہوتا تو نہ وہ امام زیلعی کی تحقیق پر تعجب کا اظہار کرتے اور نہ دوسری بات کہتے کیونکہ آج تک کسی بھی اہلِ علم نے وحدتِ راوی سے وحدتِ مرویات پر استدلال نہیں کیا ہے، لیکن چونکہ وہ امام بخاری کے مقلد محض ہیں اور خود کے علم میں کمی ہے، اس لئے ایسی بات لکھ گئے اور امام بخاری کی تائید کر دی۔ رہا امام بخاری کا تکبیر تحریمہ وتکبیراتِ عیدین والا اشکال تو اس کا جواب یہ ہے کہ تکبیرِ تحریمہ

کے وقت کا رفعِ یدین حضور علیہ السلام سے بلا خلاف ثابت ہے (اور وہ نماز کے شروع کے لئے ہے، داخلِ صلوٰۃ بھی نہیں) اور اس کا ترک بھی حضور سے ثابت نہیں جس طرح رکوع کے وقت کا ترک احادیث وآثار سے ثابت ہے۔ اور عیدین کا رفعِ یدین حنفیہ کے یہاں اختلافی ہے، امام ابو یوسف نے اس کا انکار کیا ہے۔ لہٰذا الزام تام نہیں۔ (بذل المجہود ص ۲۱۹)

(۷) حدیث سیدنا علیؓ کہ آپ نماز کی پہلی تکبیر پر رفعِ یدین کرتے تھے، پھر رفع نہیں کرتے تھے، یہ اثر صحیح ہے اور موقوفاً ومرفوعاً دونوں طرح مروی ہے، (طحاوی، ابن ابی شیبہ، بیہقی وکتاب الحج والموطأ للامام محمد) حافظ ابن حجر نے بھی اس کے رجال کی توثیق کی، عینی نے اس کی سند کو شرطِ مسلم پر بتلایا۔ (اوجز ص ۱\۲۰۶)

رجال ورواۃ احادیثِ رفع یدین کی زیادہ بہتر، مفصل ومدلل بحث اعلاء السنن ص ۳\۱۳ وص ۳\۱۵۵ میں اور حضرت شاہ صاحبؒ کے رسائل نیل الفرقدین وغیرہ میں ہے،

ترجیح ترکِ رفع یدین کے آثار

(۱) اثر حضرت عمرؓ (طحاوی وبیہقی وابن ابی شیبہ) سندہ علی شرط مسلم (اوجز ص ۱\۲۰۶) (۲) اصحاب علیؓ (ابن ابی شیبہ) (۳) اصحاب ابن مسعودؓ (ابن ابی شیبہ) (۴) حضرت ابو ہریرہؓ (کتاب الحج من طریق مالک) (۵) حضرت ابن عمرؓ (موطأ امام محمدؒ، طحاوی، ابن ابی شیبۃ وبیہقی فی المعرفۃ وسندہ صحیح) (۶) ابو سعید خدری (بیہقی) (۷) ابوبکر بن عیاش نے (جو رجالِ بخاری میں سے ہیں اور ثوری، ابن مبارک وامام احمد وغیرہم کے مشائخ میں سے ہیں کہ) کہ میں نے کسی فقیہ کو نہیں دیکھا جو رفع یدین کرتا ہو، بجز تکبیر تحریمہ کے۔ (طحاوی) (۸) شعبی (ابن ابی شیبہ) (۹) قیس (〃) (۱۰) ابن ابی لیلیٰ (〃) (۱۱) اسود (〃) علقمہ (〃) (۱۳) ابو اسحٰق (〃) یہ سب صرف افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

نوٹ: ان میں سے حضرت علی وحضرت ابن عمر وغیرہ ایسے صحابی بھی ہیں جن سے مرفوعاً رفع یدین مروی ہے اور خود ان کے عمل سے ترکِ رفع عند الرکوع بھی مروی ہے، تاہم حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعاً بھی اور خود ان کے عمل سے بھی ایک ہی بات نقل ہوئی ہے کہ بجز تحریمہ کے رفع یدین نہیں ہے۔

اصولی اعتبار سے جن صحابۂ کرام سے باوجود روایتِ حدیث کے بھی خود اس کے خلاف عمل ثابت ہو تو وہ اس حدیث کے نسخ کی علامت قرار دیا گیا ہے، پھر حضرت علیؓ اور آپ کے اصحاب سے نیز حضرت ابن مسعودؓ اور آپ کے اصحاب سے بھی ترکِ رفع عملاً ثابت ہوا تو اس سے یہی بات راجح ہوتی ہے کہ انہوں نے حضور علیہ السلام کا آخری عمل ترک ہی دیکھا ہوگا، مگر چونکہ یقینی بات نہیں ہے، اس لئے سنت رفع وترک دونوں کو ہی مانا جائے گا، البتہ ترجیح ترک رفع یدین تعاملِ اہلِ مدینہ واہلِ کوفہ اور آثارِ مرویہ کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

کوفہ کی مرکزیت: حرمین شریفین کے بعد سرزمینِ کوفہ کو ہی یہ شرف حاصل ہوا کہ ہزاراں ہزار صحابہ کا وہاں ورود ہوا اور ڈیڑھ ہزار صحابہ نے تو اس کو اپنا وطن بھی بنالیا تھا، کوفہ کی تعمیر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی تھی، اور آپ نے اہلِ کوفہ کی دینی تعلیم وتربیت کے لئے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ وحضرت عمارؓ کو بھیجا تھا، ان کے وہاں پہنچتے ہی کوفہ کے گوشہ گوشہ میں علمی حلقے بن گئے، اور کتاب وسنت کے دروس جاری ہو گئے تھے، پھر جب حضرت علیؓ نے کوفہ کو دار الخلافہ بنایا تو حضرت ابن مسعود کے حق میں بڑی مسرت کے ساتھ فرمایا کہ اللہ ان پر رحم کرے، انہوں نے اس بستی کو علم کی دولت سے مالا مال کر دیا اور ان کے تلامذہ واصحاب کو سراجہائے امتِ محمدیہ کے لقب سے نوازا، آپ کے تلامذۂ فقہ وحدیث کی تعداد چار ہزار بتلائی گئی ہے، ابن سیرین کا بیان ہے کہ میں جب کوفہ گیا تو بیک وقت چار ہزار طلباء کو حدیث کا علم حاصل کرتے ہوئے پایا۔ امام بخاری نے فرمایا کہ میں شمار نہیں کر سکتا کہ تحصیلِ علم کے لئے کتنی بار کوفہ وبغداد گیا ہوں، اس پر ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاری وحمیدی نے کوفہ وبغداد کے لوگوں سے بہ کثرت امام اعظم کے مناقب وفضائل بھی ضرور سنے ہوں گے، مگر بجز

ان کی برائیوں کے کبھی کوئی منقبت ذکر نہیں کی۔ بات بڑے تعجب وافسوس کی ہے خصوصاً جبکہ امام بخاری کے مشائخ میں بھی اکابر حنفیہ ہیں۔ پھر بقول بعض محققین کے امام بخاری نے رواۃ کی جانچ میں تو بڑی سختی کی ہے، مگر جہاں وہ کسی علمی بحث کے اندر دوسرے واقعات بھی اپنی تائید کیلئے پیش کرتے ہیں کیا ان واقعات کی تصحیح سند ضروری نہ تھی؟ نمبر ۳۷ میں بجائے حدیث کے امام بخاری نے استدلال میں صرف عبد اللہ بن مبارک کا ایک واقعہ پیش کیا ہے اور وہ بھی بلاکسی سند وحوالہ کے جس کے بعد امام اعظمؒ کو غوی وگمراہ لوگوں سے بھی تشبیہ دی ہے، کیا اتنے بڑے مقتدائے اعظم پر بلاسند وحوالہ کے اتنا بڑا ریمارک کر دینا درست تھا؟ نہ قال ابن المبارک کی کوئی سند ہے جبکہ ان کی وفات ۱۸۱ھ میں ہوئی ہے اور امام بخاری ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے، تو انہوں نے امین مبارک کا قول کس سے سنا اس کا ذکر ضروری تھا، تاکہ سند منقطع نہ ہوتی اور اس کڑی کی جانچ ہو سکتی ممکن ہے نعیم خزاعی سے سنا ہو جو امام اعظمؒ کے بارے میں جھوٹی باتیں گھڑ کر پھیلایا کرتے تھے یا اپنے استاد حمیدی سے سنا ہو، وہ بھی امام صاحب کے بارے میں بے سند روایات بیان کیا کرتے تھے۔ اسی قصہ میں آگے امام بخاری نے قال وکیع کہا تو یہاں بھی ضروری تھا کہ بتلاتے کس سے سنا، کیونکہ امام وکیع کی وفات ۱۹۷ھ میں ہوگئی تھی، امام بخاری اس وقت تین سال کے تھے، جس واسطے سے دکیع کی بات سنی تھی، ان کا نام کیوں نہیں بتلایا؟ اول تو ایک حدیثی تحقیقی رسالہ کی شان سے ہی یہ بعید تھا کہ بجائے حدیث کے کسی کے قول یا واقعہ سے استدلال کیا جائے، اگر ہزار لاکھ بھی کسی بڑے سے بڑے کے اقوال وواقعات ہوں تو وہ حدیثِ رسول کی برابر نہیں ہو سکتے، اور پھر وہ اقوال و واقعات بھی بے سند وحوالہ کے ان کی کیا قیمت ہو سکتی ہے کہ ان کی بنا پر امام اعظم جیسی مقتدر ہستی کو گمراہوں سے مشابہ قرار دے دیا گیا۔

اس قسم کے استدراکات امام بخاری کے رسالہ رفع یدین ورسالہ قراءۃ خلف الامام اور تاریخ صغیر وکبیر پر بہت سے ہو سکتے ہیں، جو یہاں موجب طوالت ہوں گے، اگر ضرورت ہوئی اور عمر نے وفا کی تو اس کے لئے مستقل تالیف پیش ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ امام بخاری نے فرمایا کہ میں نے کبھی کسی کی غیبت نہیں کی، لیکن یہ تو غیبت سے بھی کہیں زیادہ ہے کہ امام اعظمؒ کی طرف کتنی ہی بے سند اور غلط سلط سنی ہوئی باتوں پر یقین کر کے ان کو اپنی تاریخ صغیر وکبیر اور اپنے حدیثی رسائل میں نقل کر دیا۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ابن حزم کا طریقہ ہے کہ وہ بے سند باتوں کا طومار باندھ کر اور کہیں اجماع کا دعوے بے دلیل کر کے اور کہیں سخت کلامی اور زورِ بیان کے ذریعے اپنا مدعا ثابت کیا کرتے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ کیا امام بخاریؒ نے امام اعظمؒ وحنفیہ کے خلاف قرآن مجید کی آیاتِ وعید واحادیث اور سخت کلامی وغیرہ کا استعمال نہیں کیا؟ حضرتؒ امام بخاری کیلئے بعض اوقات فرمادیا کرتے تھے کہ ان کا حال وہ ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔

یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ سارے حنفی امام بخاری سے پٹتے رہے اور ادب لحاظ یا ڈر وخوف کے سبب سے کسی نے رونے کی بھی جرأت نہیں کی، لوگ مطعون کریں گے امام بخاری ایسے عظیم المرتبت انسان کے خلاف لب کشائی کرتا ہے مگر یہ نہ دیکھا کہ امام بخاری نے اپنے بڑوں کے بڑوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا تھا۔ آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ اب بوڑھا ہو گیا ہوں اس لئے صبر وضبط نہ رہا، اور امام بخاری کے بارے میں کچھ کہتا ہوں، ورنہ ساری عمر ان کا ادب مانع رہا ہے، راقم الحروف بھی اپنی عمر کے آخری مراحل میں ہے، شاید اسی لئے اپنے شیخ کی سنت پر عمل کر رہا ہے اور حق بات کہنے میں کسی کی رعایت ہونی بھی نہ چاہیے **نحن رجال و هم رجال و الله یرحمنا و ایاهم۔**

ترجیح ترک رفع یدین کے سلسلہ میں دوسرے دلائل کے علاوہ اہل مدینہ واہل کوفہ کا تعامل، اور اصحاب ابن مسعود واصحاب علیؓ کا ترک رفع بھی حنفیہ ومالکیہ کے پاس بہت بڑی حجت ہے۔ اس لئے صرف ترجیح کی وجہ سے ان کو ہدف طعن وتشنیع بنانا انصاف سے بہت بعید ہے۔ اسی لئے ہم نے امام بخاری کے رسالہ کو خاص طور سے سامنے رکھ کر اس مسئلہ کی بحث کو زیادہ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ **و الله یحق الحق و هو خیر الفاصلین. و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین.**

افادات اکابر: بطور تکمیل بحث مناسب معلوم ہوا کہ اپنے اکابر اساتذہ کے بھی چند افادات علمیہ کا اضافہ کر دیا جائے، واللہ المصوب والمدد:۔

حضرت استاذ الاساتذہ مولانا محمود حسنؒ

فرمایا:۔ حدیثی روایات تو اس باب میں مختلف و متنوع ہیں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ کبھی تو صاحب شرع نے بعض احکام میں تدریجی طور سے تضییق و تنگی کے بعد تسہیل و وسعت کو اختیار کیا ہے جیسا کہ کلاب و اوانی خمر کے بارے میں کہ ابتداء میں کتوں کو مار ڈالنے کا حکم تھا اور شراب کے برتنوں کا استعمال بھی ممنوع تھا، پھر ان احکام کو نرم کر دیا گیا، اور بعض احکام میں اس کے برعکس ہوا ہے کہ پہلے توسع ہوا اور بعد کو پھر تنگی آئی، جیسے نماز میں ابتدائی دور کے اندر کچھ اقوال و حرکات مباح تھے، پھر ان کو ممنوع کر دیا گیا، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رفع و ترک کا زیر بحث مسئلہ بھی اس دوسری قسم سے ہے کہ شروع میں ہر رفع و خفض کی تکبیرات کے ساتھ رفع یدین بھی تھا (کما فی روایۃ الطحاوی فی مشکل الآثار و اعترف الاوزاعی انہ کان فی الاول، پھر ۶ جگہ رہا، اس کے بعد تین مواضع میں باقی رہ گیا، جس کو شافعیہ نے اختیار کیا، پھر تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی دو بھی (قبل الرکوع و بعد الرکوع) والے رفع متروک ہو گئے۔

پس اوسع المسالک ان کا ہے جو ہر تکبیر پر رفع یدین کے قائل رہے جیسے ابن حزم ظاہری اور دوسرے بعض اہل الظاہر پھر اس سے کم مواضع میں رفع یدین کے قائل ابن المنذر (و امام بخاری) وغیرہ ہوئے جن کا درجہ ائمہ اربعہ سے اجتہاد میں نازل تھا، پھر امام احمد و شافعی کا مشہور مسلک ہے، اس کے بعد سب سے کم وسعت والا مسلک اس ذات والا صفات کا ہے جس کے بارے میں امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ساری امت کے فقہاء فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کے عیال ہیں کہ فقہائے امت محمدیہؐ کی سرپرستی امام صاحب نہ فرماتے تو وہ سب بے یار و مددگار اور لاوارث و بے کس یتیم کی طرح ہوتے۔ اور اسی مسلک کو امام دار الہجرۃ امام مالکؒ اور آپ کے اصحاب و تلامذہ و متبعین نے بھی اختیار کیا، اور اسی کی موافقت حضرات صحابہ کرام میں سے سیدنا حضرت عمرؓ و سیدنا علیؓ و سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے تعامل سے حاصل ہوئی، جو مجتہدین امت کے سردار اور فقہائے صحابہ کے قائد اعظم تھے امام مسلم نے تابعی جلیل القدر مسروق سے روایت کی کہ میں نے اصحاب الرسول ﷺ کے علوم و کمالات پر نظر کی تو دیکھا کہ ان سب کا علم چھ اصحاب کی طرف منتہی ہوتا ہے کہ وہ تفقہ میں سب سے آگے ہیں، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، کہتے ہیں، پھر میں نے مکرر نظر کی تو دیکھا کہ ان سب میں حضرت علی و عبداللہ بن مسعودؓ کا مرتبہ بلند تر ہے۔ پھر یہ سب بھی مثلاً حضرت ابن مسعودؓ حضرت عمرؓ کے اور حضرت عمر حضرت علی و ابن مسعودؓ کے بڑے قدر دان اور ایک دوسرے کے مداح تھے۔ حضرت علی ابن مسعود کی مدح میں رطب اللسان رہتے تھے۔

شیخ ابن الہمام نے لکھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ شرائع اسلام اور حدود شریعت کے سب سے بڑے عالم تھے، اپنی زندگی میں ہمیشہ احوال نبویہ کا تفقد کرتے رہے، ہر وقت حضور کے ساتھ رہتے تھے اقامت میں بھی اور سفر میں بھی، اور حضور علیہ السلام کے ساتھ لاتعداد نمازیں پڑھی ہیں، لہٰذا تعارض روایات کی صورت میں بہ نسبت دوسروں کے ان ہی کے قول کو ترجیح ہونی چاہیے (فتح الملہم ص ۲/۱۶)

امام بخاری نے اپنے رسالہ میں پورا زور حضرت ابن عمرؓ کی روایات پر دیا اور حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کو کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ ایک طرح سے اس کو گرانے کی صورت نکالی، جس کے جوابات مطولات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی دو جگہ بڑے طمطراق سے دعوے کر دیا کہ کسی بھی صحابی سے ترک رفع ثابت نہیں ہے، جبکہ ہم بتلا چکے ہیں کہ امام مالکؒ نے احادیث و آثار صحابہ و تابعین کے ساتھ تعامل اہل مدینہ پر نظر کر کے ہی ترک کا فیصلہ کیا تھا جو ان کا اور ان کے اصحاب و تابعین کا مشہور مذہب قرار پایا، اور سارے اہل کوفہ کا مذہب ترک رفع کو تو سب ہی محدثین و مورخین اسلام نے تسلیم کیا ہے، مدینہ طیبہ اور کوفہ کے کتنے ہی صحابہ و تابعین کے تعامل کو یکسر نظر انداز کر دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ پھر اگر صرف ابن مسعود ہی کے ترک رفع کو لیا جائے تو کیا وہ صحابی نہ تھے، کہ امام بخاری نے فرما دیا کہ کسی صحابی سے بھی ترک ثابت نہیں

ہے۔ یا وہ بجائے ترک رفع کے رفع یدین کیا کرتے تھے؟ جبکہ علماء امت میں کسی کا بھی قول اس کے لئے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کیا امام بخاری نے یہ سمجھا تھا کہ دنیا میں صرف میری کتاب اور میری تاریخ اور میرے ہی رسائل کا چلن ہوگا اور جو فیصلہ بھی میں نے کر دیا اس کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہوگا، افسوس ہے کہ اس طرح کی بات سواء قال اللہ وقال الرسول کے دنیا کے کسی بھی بڑے کی نہیں چل سکتی کہ اس کو چک نہ کیا جا سکے، ہم نے بطور نمونہ چند باتوں پر نقد کیا ہے اور ان کی جواب دہی ضروری سمجھی تھی اس لئے ان کو درج کر دیا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ایک دوسری بات بھی فرمائی کہ میرے نزدیک قوی رائے یہ ہے کہ یا تو قبول زیادۃ ثقات کے اصول سے اثبات رفع کو ہر خفض ورفع کے لئے مان لیا جائے اور یا بجز تحریمہ کے ہر رفع کے ترک کو راجح سمجھا جائے، کیونکہ وہ نماز کی اصل و بنیاد کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز ہے یعنی خشوع وسکون یا خشیت وانابت جیسا کہ وہ امام صاحب کا مذہب بھی ہے اور عمل بالبعض وترک بعض انصاف کے خلاف معلوم ہوتا ہے (فتح الملہم ص ۱/۱۷/۲)

افادات علامہ کشمیری رحمہ اللہ

فرمایا:۔ حضرت ابن عمرؓ نے جو اپنی روایات میں صرف دو جگہ کے رفع یدین پر زور دیا ہے وہ صرف اس لئے کہ انھوں نے اکثر لوگوں سے ترک رفع دیکھا اور زیادہ لوگ اس کے منکر ہوں گے، کیونکہ بغیر دوسری صفات نماز کے بیان کے صرف اسی طرف ان کی وجہ واصرار اسی لئے ہوا ہوگا کہ تارکین وجادین ومنازعین کی کثرت ہوگی، اور سلف سے اس بارے میں کوئی نزاع واختلاف اس لئے نقل نہیں ہوا کہ ان کے نزدیک دونوں جانب رفع وترک کی برابر تھیں، اس کے بعد جب نزاع واختلاف پیدا ہو گیا تو ضرورت محسوس کی گئی کہ صرف ایک سنت پر اکتفا کیوں ہو اور دوسری بھی کیوں نہ جاری رہے، اور اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ بعد کے زمانہ میں رافعین کی کثرت ہوگئی ہو۔ اور تارکین کم ہو گئے ہوں، اس لئے میری رائے ہے کہ جن امور میں اختلاف ونزاع عہد رسالت میں نہ تھا اور بعد کو پیدا ہوا ہے ان میں فیصلہ صحابہ وتابعین کی قلت وکثرت سے بھی نہ ہونا چاہیئے، بلکہ صرف حضور علیہ السلام کے عمل کی قلت وکثرت پر فیصلہ کرنا چاہئے۔ اور جن امور میں صحیح طور سے آپ کے متعلق عمل کی قلت وکثرت متحقق نہ ہو سکے ان میں دونوں طرح کے عمل کو سنت قرار دینا چاہیئے، اور جس امر کو بھی ترجیح دے کر عمل کر لیا جائے وہ اتباع سنت ہی ہوگا۔ کسی کے بھی عمل پر نکیر وتشنیع یا لعن وطعن کرنا جائز نہیں۔ والامر الی اللہ

یہ میری آخری درجہ پر رائے ہے ورنہ جس طرح امام مالک نے تعامل اہل مدینہ کو دیکھ کر ترک رفع کو راجح قرار دیا اور امام صاحب نے اور آپ کے اصحاب نے اہل کوفہ واہل مدینہ دونوں کے تعامل کی وجہ سے بھی ترک کو راجح کیا۔ اس سے یہ بات نکل سکتی ہے کہ حضور علیہ السلام کے کثرت ترک کو دیکھ کر ہی صحابہ اہل مدینہ اور صحابہ واہل کوفہ نے ترک کو اختیار کیا ہوگا۔ وہ حضرات بدوں اس کے رفع کو ترک نہ کر سکتے تھے، مگر پھر بھی چونکہ یہ چیز یقینی نہیں ہے، اس لے ہم اس پر فیصلہ نہیں کر سکتے۔ واللہ ولی الامور

فرمایا:۔ میرے نزدیک شافعیہ نے جو یہ اختیار کیا کہ وہ رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین کرتے ہیں اور انھوں نے اس کو کھڑے ہونے کے لئے سمجھا اس لئے اس سے پہلے کرتے ہیں وہ غلط ہے، وہ اس وقت ہونا چاہیئے کہ جب بالکل سیدھا کھڑا ہو جائے۔ کتاب المسائل لابی داؤد میں امام احمدؒ سے بھی یہی منقول ہے، کیونکہ وہ سجدہ کے لئے جانے کے واسطے ہے۔ ایسے ہی میری رائے یہ بھی ہے کہ شافعیہ جو مقتدی کے لئے تسمیع وتحمید جمع کرنے کو کہتے ہیں وہ بھی درست نہیں، کیونکہ تحمید مقتدی تسمیع امام کے جواب میں ہے، لہٰذا اس کو کھڑے ہو کر کہنا چاہیئے۔ انتقالی حرکت کے دوران میں نہیں ہے۔ شافعیہ کے طریقہ کے لئے نہ حدیث میں دلیل ہے اور نہ سلف میں کسی نے اس پر عمل کیا بجز ابن سیرین کے۔ امام شافعی کے نزدیک چونکہ امام ومقتدی کا ربط ضعیف ہے، اس لئے ان کا اصول یہ ہوا کہ جو کچھ امام کرے وہ مقتدی بھی کرے، اور چونکہ امام تسمیع وتحمید دونوں کو ایک ساتھ جمع کرتا ہے، اس لئے مقتدی کے لئے وہی حکم سمجھا گیا، حالانکہ تحمید، تسمیع کے جواب میں ہے اور مقتدی کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے،

حضرتؒ نے محدثین کے مبالغات پر بھی اچھی روشنی ڈالی اور مشتغلینِ حدیث کے لئے بہت کام کی باتیں ذکر کیں، ان کا مطالعہ معارف السنن ص ۴۶۳/۲ اور فیض الباری ص ۲/۳۵۸ میں کرلیا جائے۔ مختصر یہ کہ امام بخاری نے لکھا کہ سترہ صحابہ نے رفع کی احادیث روایت کی ہیں، علامہ ابن عبدالبر نے رواۃ رفع کی تعداد ۳۳ لکھی، بیہقی نے ۳۰ لکھی، عراقی نے پچاس تک عدد پہنچادیا۔ حالانکہ ان میں صرف تحریمہ والی بھی ہیں، جن میں مواضع ثلاثہ کا کچھ ذکر نہیں، پھر بیہقی نے خود اقرار کرلیا کہ ۳۰ میں سے ۱۵ کی اسناد صحیح ہیں، حالانکہ ان میں بھی متکلم فیہ حدیث ہیں، غرض عدد گھٹتے گھٹتے پانچ یا چھ کا رہ گیا، یہ محدثین کے مبالغات کا حال ہے۔ اور دوسری جانب بھی ترک رفع کی بھی چھ سات احادیث ہیں، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، ابوہریرہ، ابن عمر، براء اور کعب بن عجرہ کی اور اوپر ان کا ذکر آچکا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر ان کے ساتھ وہ احادیث بھی شامل کرلیں کہ جن میں نماز کی ساری کیفیت بیان ہوئی ہے اور اول تکبیر تحریمہ پر رفع کا ذکر بھی ہے مگر ان میں رفع یدین عندالرکوع کا کوئی ذکر نہیں ہے، تو ہماری احادیث کی تعداد رفع والی احادیث سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ مثلاً دارقطنی **باب ذکر الرکوع و السجود وما یجزی فیهما** ص ۱/۳۴۵ (طبع السید عبداللہ ہاشم یمانی بالمدینۃ المنورۃ) میں حدیث انسؓ میں پوری نماز کی تفصیل اور صرف اول تکبیر پر رفع یدین ہے پھر نہیں ہے۔ اسی طرح التاج الجامع للاصول ص ۱۶۹/ اباب الرکوع والتسبیح فیہ میں ابوحمید الساعدی سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

افادات شیخ الحدیث دامت برکاتہم

آپ نے اوجز ص ۲۰۸/ ا میں لکھا:۔ احادیث صحیحہ مرویہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خود امام بخاری نے فرمایا کہ مجھے ایک لاکھ حدیث صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح یاد ہیں، اور فرمایا کہ میں نے اپنی صحیح میں صرف صحیح درج کی ہیں مگر جو بخوف طوالت ترک کردی ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں اور وہ بھی صحیح ہیں۔ صحیح بخاری میں بحذف مکررات صرف چار ہزار حدیث ہیں، گویا ۲۵/ ا ذکر کی ہیں، امام احمدؒ نے فرمایا کہ صحیح حدیثوں کی تعداد سات لاکھ اور کچھ ہے، علامہ سیوطیؒ نے کہا:۔ اگر بہت تتبع و تلاش کروں تو موجودہ مسانید، جوامع و سنن و اجزاء وغیرہ میں ایک لاکھ یا پچاس ہزار تک بھی تعداد غیر مکرر کی نہ ہو سکے گی۔ پھر رجال میں بھی کلام بہت زیادہ ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ ائمہ کبار کے عمل سے ان کی صحت پہچانی جائے، اور یہاں ترک رفع کی احادیث و آثار صحابہ و تابعین کو بھی ہم نے دیکھا کہ ان کو اکبر الائمہ امام اعظم، آپ کے صاحبین، اور جمیع علماء کوفہ، اور امام مالک وامیر المومنین فی الحدیث ثوریؒ نے معمول بہا بنایا ہے تو اس کے بعد مزید تصحیح و توثیق کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ علامہ شعرانی نے کشف النعمہ میں لکھا کہ میں نے اس کی احادیث کی تخریج اس لئے نہیں کی کہ یہ وہ احادیث ہیں جن کو ائمہ مجتہدین نے اپنے مذاہب کے لئے معمول بہا بنایا ہے۔ لہٰذا ان میں دوسرے محدثین کی جرح بے اثر ہے، اور ہمیں کسی حدیث و اثر کی صحت کے لئے اس سے کسی مجتہد کا استدلال کافی ہے۔

حضرت دام ظلہم نے یہ بھی فرمایا کہ علاوہ احادیث و آثار مؤیدہ ترک رفع کے ہمارے پاس ایک وجہ وجیہ یہ بھی ہے کہ جب کبھی روایات میں اختلاف پیش آتا ہے تو حنفیہ کا طریقہ ہے کہ وہ اپنے عمل کے لئے وہ شکل اختیار کرتے ہیں جو اوفق بالقرآن ہوتی ہے، جس کی نظائر بہ کثرت ہیں مثلاً ادعیہ صلوٰۃ و قنوت وتر میں اوفق بالقرآن کو لیا، یا آیت **و اذا قریٔ القرآن فاستمعوا له و انصتوا** سے مقتدی کے لئے قراءۃ کو مرجوح قرار دیا یا آیت **قبل طلوع الشمس و قبل الغروب** سے تاخیر فجر و عصر کو اختیار کیا۔ چنانچہ یہاں ترک رفع کو بھی ہم نے آیت قرآنی **وقوموا لله قانتین** کے موافق پایا تو اس کو ترجیح دے دی (فتح الملہم ص ۲/۱۴ میں آیت **قد افلح المومنون الذین هم فی صلوتهم خاشعون** کو پیش کیا ہے) ایک وجہ ترجیح حضرت دام ظلہم نے یہ بھی ذکر کی کہ احادیث رفع کی روایت کرنے والے اکثر راویوں کی روایات میں تین جگہ سے زائد میں رفع کا ذکر ہے۔ لہٰذا وہ سب احادیث شافعیہ و حنابلہ کے نزدیک بھی متروک ہوں گی۔ حضرت عم فیضہم نے اسی طرح ۱۲ وجوہ ترجیح ترک ذکر فرمائی ہیں۔ اوجز ص ۲۰۸/ ۲۰۹ جلد اول میں ملاحظہ کی جائیں۔ **ولیکن هذا اختتام الکلام و مسک الختام. و الحمد لله رب العالمین.**

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم صل على محمد وعلى آل محمد

كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم

انك حميد مجيد

اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد

كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم

انك حميد مجيد

كتبه العبد نفيس الحسيني اللاهوري غفر الله ذنوبه وستر عيوبه في رمضان المبارك سنة ١٤١٣



انوار الباری

١٦

اُردو شرح

صحیح البخاری

تقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبعد الحمد والصلوٰۃ گذارش ہے کہ انوارالباری کی مسلسل ۱۳ قسطیں شائع ہونے کے بعد ایک طویل فترت پیش آئی تھی، پھر خدا کا شکر ہے اس کی نشأۃِ ثانیہ کی صورت پیدا ہوئی اور اب یہ سولھویں قسط پیش کی جارہی ہے، قسط نمبر ۱۷ کی بھی کتابت شروع ہو چکی ہے اور توفیقِ خداوندی سے یہ امر بھی مستبعد نہیں کہ یہ سلسلہ اتمام تک پہنچے۔ وبیدہ تتم الصالحات قسط نمبر ۱۳ میں زیارتِ نبویہ اور توسلِ نبوی کی اہم ابحاث پیش ہوئی تھیں۔ قسط نمبر ۱۴ میں متفرق اہم علمی وحدیثی مباحث گذرے، قسط نمبر ۱۵ میں علاوہ دوسرے مسائل کے ''رفع یدین'' کی بحث مفصل دلائل کے ساتھ آئی ہے، اس قسط نمبر ۱۶ میں ''فاتحہ خلف الامام'' کی بحث کو بھی حتی الوسع مکمل کر دیا گیا ہے۔

عاجز کی دھیمی رفتار کے جہاں دوسرے اسباب وعوارض تھے، ایک یہ بھی تھا کہ عاجز نے ہی اپنے ادارت ''مجلس علمی'' ڈابھیل کے زمانہ میں رفیقِ محترم مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کو ڈابھیل بلا کر ''معارف السنن'' کا کام سپرد کیا تھا، اور پوری توقع تھی کہ وہ اس خدمت کو باحسن وجوہ آخر تک مکمل فرمادیں گے، اوران کو اس کے لئے کافی مدت بھی میسر ہوئی، مگر افسوس کہ پاکستان منتقل ہونے کے بعد وہ دوسرے اہم علمی ودینی مشاغل میں ایسے منہمک ہوئے کہ یہ کام بہت تھوڑا کر سکے، کیونکہ چھٹی جلد کا بھی کافی حصہ وہ ڈابھیل میں لکھ چکے تھے، پھر اس کی تکمیل پاکستان میں کی ہے اور یہی جلد آخری ہوگئی۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ بہت سے اہم مباحث پر نظرِ ثانی بھی نہیں کر سکے۔

مولانا بنوریؒ نے خود فرمایا کہ میں نے حضرت علامہ کشمیریؒ سے دورۂ حدیث کے سال ترمذی باب **مس الذکر** تک اور بخاری باب **حسب الانصار من الایمان** تک پڑھی تھی، پھر حضرت شاہ صاحب علیل ہو کر دیوبند تشریف لے گئے، اور ترمذی وبخاری کا درس حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ ومولانا شبیر احمد صاحبؒ نے پورا کرایا تھا اور اسی لئے وہ اپنے کو حضرت شاہ صاحبؒ سے اقل استفادۃ بھی فرمایا کرتے تھے، مگر یہ اقلیت باعتبار درس کے تھی، یوں ان کو حضرت شاہ صاحبؒ کے علومِ حدیث سے بہت ہی بڑی مناسبت تھی اور انہوں نے اپنے وسیع وعمیق مطالعہ کی کثرت سے بہ نسبت دوسرے تلامذہ کے الگ امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا، اسی لئے خدا کی شان کہ جو اقل استفادۃً تھا وہی اکثر افادۃً ہوا۔ جس کا بین ثبوت ان کی ''معارف السنن'' ہے مگر صد افسوس کہ وہ پوری نہ ہو سکی۔ اور میں اب تنہا اس بڑے بار کو محسوس کر رہا ہوں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم وتحقیقات حدیثیہ کو منظرِ عام پر لاؤں، پھر مجھے اس کا بھی نہایت افسوس ہے کہ پاکستان کے ناظرین انوارالباری تک میری کتاب نہیں پہنچ رہی ہے۔ **ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا**۔

انوارالباری کے مباحث کو عام طور سے ارادہ مختصر ہی کر کے لانے کا کر لیا گیا ہے، مگر اہم فروعی واصولی مسائل پر ابحاث مفصل اور مکمل ومدلل ہی آئیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ بھی ناظرین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ہمارے پیشِ نظر زیادہ اہمیت حنفی شافعی وغیرہ ائمہ اربعہ کے باہمی اختلاف کی نہیں ہے، کیونکہ ان حضرات کا اختلاف مہماتِ مسائل میں بہت کم ہے، اور اصول وعقائد کے باب میں تو چاروں ائمہ عظام کے درمیان کوئی اختلاف سرے سے ہے ہی نہیں۔

اس لئے سب سے بڑی اہمیت فتنہ ظاہریت کی ہے، جس کو داؤدِ ظاہری کے بعد علامہ ابن حزم پھر علامہ ابن القیم اور علامہ شوکانی اور بعد

کے سلفی حضرات نے فروغ دیا، جو نہ صرف حنفی مسلک پر ضربِ کاری ہے بلکہ سب ہی ائمہ اربعہ مجتہدین کے خلاف ایک مہم ہے۔ موجودہ دور میں اس کی بڑی اٹھان علامہ رشید رضا مصری اور ان کے تلامذہ و متبعین کے ذریعہ ہوئی، جن کے مقابلہ میں مفتی دیار مصریہ شیخ یوسف دجوی اور علامہ کوثری وغیرہ نے احقاقِ حق کیا، اور خاص طور سے طلاقِ ثلاث کے ایک طلاق ہونے کا مسئلہ مصر میں اٹھایا گیا تو علامہ کوثری نے ''الاشفاق علی احکام الطلاق'' لکھ کر ائمہ اربعہ کے متفقہ مسلک کی پرزور اور مکمل و مدلل تائید کی، اور مصری مجلّات میں مقالات لکھے جن میں ثابت کیا کہ چاروں مذاہب سے الگ راہ اختیار کرنا یا تقلیدِ ائمہ کو شرک بتلا کر عوام کو عدمِ تقلید کی تلقین کرنا بالآخر لادینی کی دعوت دینا ہے، ہندوستان میں بھی اس قسم کے فتنہ کی ابتدا ہوئی تو حضرت شیخ الہندؒ نے ایضاح الادلہ وغیرہ تالیف فرما کر شائع کیں اور دار العلوم دیوبند و مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ کے اساتذۂ حدیث بھی درسِ حدیث و حدیثی تالیفات میں تشغیبات اہلِ حدیث وغیرہ مقلدین کا ردِ وافر کرتے رہے ہیں اسی طرح جب مصر میں سلفی حضرات نے کتاب النقض للدارمی السجزی، کتاب السنہ المنسوب لعبداللہ بن احمد اور کتاب التوحید لابن خزیمہ وغیرہ شائع کیں تو علامہ کوثری نے ان کی شطحیات و شواذ پر مفصل و مدلل تعقب کیا اور ان میں جو عقائد جمہور سلف و خلف اور ائمہ اربعہ کے متفقہ فیصلوں کے خلاف تھے، ان کا ابطال کیا۔ (ملاحظہ ہوں مقالات الکوثری، السیف الصقیل فتح الباری جلد نمبر ۱۳ وغیرہ (حافظ ابن حجرؒ) مع دفع شبہ من تشبہ وتمرد ونسب ذلک الی الامام احمد للامام الحصنی ودفع شبہۃ التشبیہ للامام ابن الجوزی الحنبلیؒ مع تعلیقات الکوثریؒ بوادر النوادر حضرت تھانویؒ ص ۶۳، ص ۱۶۵، ص ۴۴۱، ص ۶۲۴، ص ۶۵۸، ص ۶۸۷، ص ۷۴۱، ص ۷۵۹، ص ۷۶۴ وغیرہ۔ فیض الباری جلد رابع کتاب التوحید، و سید بنوری نمبر ص ۷۱ خدام الدین لاہور) اس وقت ہندوستان میں بھی کچھ چیزیں آچکی تھیں تو ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مدنیؒ نے بھی اپنے درسِ حدیث میں متاخرین حنابلہ اور علامہ ابن تیمیہ و ابن القیم کے تفردات پر مفصل کلام اور نکیر شروع فرمادی تھی۔ وہ ہم انوار الباری میں اپنے مواقع پر پیش کرتے ہیں۔

اس وقت اہم ترین بات اس سلسلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ امام بخاریؒ اپنی صحیح کے آخر میں کتاب التوحید لائیں گے، اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ اسی کے تحت مکمل ابحاث علم کلام و عقائد کے مسائل پر کیا کرتے تھے، اگرچہ ضمناً کچھ ابحاث درمیان میں بھی آجاتی تھیں۔ حضرتؒ کی کچھ تحقیقاتِ انوار المحمود کے آخر میں بھی ذکر ہوئی ہیں اور فیض الباری کی چوتھی جلد میں بھی موجود ہیں۔ اگر یہ عاجز آخر تک نہ پہنچ سکے تو حضرتؒ کے ان دونوں امالی پر اکتفا کیا جائے۔

راقم الحروف نے حضرت شاہ صاحبؒ کے آخری دونوں سال کے درس بخاری شریف میں مکمل شرکت کر کے ملفوظاتِ مبارکہ انور یہ قلم بند کئے تھے، اور بزمانہ قیامِ مصر علامہ کوثریؒ سے بھی استفادات کئے تھے۔

اب تو یہ بات خواب و خیال کی سی ہوتی جارہی ہے کہ اپنی ان آنکھوں نے ایسے ایسے علوم و کمالات کے بحورِ بیکراں بھی دیکھے تھے

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است

بہرحال! یہ بات سب جانتے ہیں کہ چند متاخرین حنابلہ نے جمہور سلف و خلف، ائمہ اربعہ و متقدمین حنابلہ اور اکابر علماء متکلمین متقدمین و متاخرین کے عقائد سے الگ دوسرے عقائد و نظریات اختیار کر لئے تھے (جن کا رد علامہ ابن الجوزی حنبلیؒ م ۵۹۷ھ نے بھی کیا تھا) اور دورِ حاضر کے متبعینِ حافظ ابن تیمیہ وغیرہ بھی اسی الگ ڈگر پر قائم ہیں۔ یهديهم الله الى الصواب.

عاجز کا ارادہ ہے کہ ان اصولی مباحث سے متعلق تمام ذخیرۂ کتبِ علم کلام و عقائد کو سامنے رکھ کر علامہ کوثری اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیقاتِ عالیہ ایضاح و تفصیل کے ساتھ پیش کرے، مولانا بنوریؒ یہ کام کر جاتے تو میرا بڑا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ بظاہر عمر کا کارواں آخری منزل سے بہت قریب ہے، اس لئے بعید نہیں کہ ''وکم حسرات فی بطون المقابر'' والی بات صادق آجائے۔ والامر بيد الله ولله الامر من قبل ومن بعد وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه سيدنا و مولانا محمد واله وصحبه ومن تبعهم الى يوم الدين.

احقر: سید احمد رضا عفا الله عنه. بجنور ۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۹ھ ۳۱، مارچ ۷۹ء

تذکارالحبیب

نقل مکتوبِ گرامی مولانا السید محمود یوسف البنوریؒ ۱۳۹۷ھ

صاحب المآثر والمفاخر محب قدیم وصدیق حمیم زادکم اللہ فضلا وکمالا

تحیۃ وسلاما واشواقا۔ نامۂ گرامہ نے ممنون ومسرور ومطمئن فرمایا، انوارالباری کی تالیف وطباعت کی رفتار سے بہت مسرت ہوئی کل شام کو تیسری جلد بھی پہنچ گئی آنکھوں کو روشن کیا جزاکم اللہ خیرا، تیس ۳۰ چالیس صفحات بہت عجلت میں دیکھے دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ امت کو جلد اس گوہرگراں مایہ سے مستفید فرمائے اور امام العصر حضرت شیخ کے علوم وجواہر سے امت کو اس اردو شرح کے ذریعہ فیضیاب بنائے کاش میں بجنور ہوتا یا آپ کراچی ہوتے تو حضرت شیخ کے انفاس قدسیہ کی خدمت میں اور تشریح وتبییض میں میرا بھی حصہ ہوتا آپ کی جواں ہمتی تو میرے لئے قابلِ رشک ہے۔ افسوس طبیعت جس وقت ذوقِ جستجو سے سرشار تھی اس وقت دماغی پختگی اتنی نہیں تھی اور جس وقت پختگی حاصل ہوگئی بحث وتفتیش کی نہ فرصت اور نہ ہمت نتیجہ دونوں زمانوں میں بجز قصور کیا ہوتا مدرسہ کے غیر علمی مشاغل نے بہت پریشان کر رکھا ہے اور اب تو مخلصین کی آمد ورفت بھی پریشانی کا باعث ہو رہی ہے غیر علمی امور میں سارا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ آپ کی جرأت مندانہ اظہارِ حق سے دل بہت خوش ہوتا ہے آپ سے جتنی پوری ملاقات کی آرزو ہے اتنی نصف الملاقات کی تمنا بھی رہتی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ کسی قریبی فرصت میں ہم کلامی کا موقع ملے گا۔ دعواتِ صالحہ سے فراموش نہ کریں۔ اہلِ بیت وذریۂ طیبہ کو سلام ودعواتِ اخلاص۔ شیخ کوثری کے نفائسِ منتشرہ جمع کرنا بھی بہت مفید رہے گا الحمدللہ کہ آپ خوب توجہ دے رہے ہیں۔ والسلام مسک الختام۔ مخلصکم القدیم ورفیقکم محمد یوسف البنوری عفا اللہ عنہ۔

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی ۲۹، صفر الخیر ۱۳۸۹ھ

باب وضع الیمنیٰ علی الیسریٰ فی الصلوٰۃ

(نماز میں داہنے ہاتھ کا بائیں ہاتھ پر رکھنے کا بیان)

۷۰۱: حدثنا عبداللہ بن مسلمۃ عن مالک عن ابی حازم عن سھل بن سعد قال کان ناس یؤمرون ان یضع الرجل الید المنیٰ علیٰ ذراعہ الیسریٰ فی الصلوٰۃ وقال ابو حازم لآ اعلمہ' الاینمی ذٰلک الی النبی صلے اللہ علیہ وسلم

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ لوگوں کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ نماز میں دایاں ہاتھ بائیں کلائی پر رکھیں، اور ابو حازم نے کہا:۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس حکم کو نبی کریم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ سلف سے فوق السرہ اور تحت السرہ دونوں طرح ہاتھ باندھ کر نماز ثابت ہے، لیکن فوق الصدر (سینے کے اوپر) بے اصل ہے، اس کا ثبوت سلف سے نہیں ہے، اور اس کا وجود دو سو سال سے ہوا ہے۔ صحیح ابن خزیمہ میں علی الصدر کا لفظ ہے، جو ضعیف ہے، اسی لئے کسی مذہب میں بھی اس پر عمل نہیں ہوا۔ نکتہ یہ ہے کہ نماز میں احکم الحاکمین کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا ایسا ہی ہے جیسے نوکر وغلام بطور تعظیم، آقاؤں اور بادشاہوں کے سامنے کمر پر پٹی باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھنا تعظیم کی کوئی صورت نہیں ہے، یہ بھی فرمایا کہ صحیح ابن خزیمہ میں وائل کی روایت ہے، جس کو اور بھی دوسرے راویوں نے روایت کیا ہے مگر کسی میں بھی ''علی الصدر'' کا اضافہ نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ زیادتی ایک زمانہ کے بعد ہوئی ہو، لہٰذا اس پر جمود کرنا صحیح نہیں خصوصا جبکہ سلف

میں کسی نے اس پر عمل نہیں کیا ہے۔ اسی لئے امام ترمذی نے جو اختلاف مذاہب نقل کیا کرتے ہیں، سینے پر ہاتھ باندھنا کسی کا بھی مذہب نہیں نقل کیا۔ انھوں نے لکھا کہ اہل علم صحابہ و تابعین اور بعد کے حضرات بھی نماز میں داہنا ہاتھ بائیں پر رکھتے تھے، اور بعض ناف کے اوپر اور بعض ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک کی گنجائش ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی روایات ہیں، چونکہ بعض قلمی نسخوں میں **تحت السرہ** کا لفظ نہیں ہے، اس لئے بعض علماء حنفیہ بھی متردد ہو گئے تھے، مگر وہ صحیح نسخوں میں ضرور موجود تھی، اسی لئے علامہ قاسم بن قطلوبغا حنفی وغیرہ نے اس کا ذکر کیا تھا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ کے مطبوعہ نسخہ میں تین روایتوں میں یہ لفظ موجود ہے، ملاحظہ ہو ص ۳۹۰/۱ و ص ۳۹۱/۱ اور صحیح ابن خزیمہ کے مطبوعہ نسخہ ۲۴۳/۱ میں وائل کی حدیث مؤمل سے " علے صدرہ" کے اضافہ کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن ابن خزیمہ نے اس کی تصحیح نہیں کی ہے، لہٰذا شوکانی کا نیل الاوطار میں یہ قول غلط ہے کہ ابن خزیمہ نے اس حدیث کی تخریج کی اور تصحیح بھی کی ہے، علامہ بنوریؒ کے سامنے چونکہ مطبوعہ نسخہ نہیں آیا تھا، اس لئے انھوں نے لکھا کہ شوکانی صاحب نیل الاوطار حافظ ابن حجرؒ کی کتابوں سے اخذ کرتے ہیں خصوصا تلخیص و فتح الباری سے، لیکن ان میں کہیں تصحیح کا حوالہ نہیں ہے، اور نہ اس امر کا یقین ہے کہ شوکانی کو صحیح ابن خزیمہ ملی ہوگی، اور اگر ابن خزیمہ نے تصحیح کر بھی دی ہوگی تو اس بارے میں ان کا طریق و مذہب حافظ ابن حجر و سخاوی کے اقوال سے واضح ہو چکا ہے، پھر ان کی تصحیح پر دوسروں کو اعتماد کر لینا بھی ضروری نہیں کیونکہ اکابر امت نے مؤمل بن اسماعیل کے بارے میں اتنا کلام کیا ہے کہ ان کی روایت قابل تصحیح نہیں رہ سکتی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا تعصب

علامہ بنوریؒ نے بطور تنبیہ افادہ کیا کہ حافظ نے فتح الباری ص ۲۰۶/۹ میں لکھا کہ اسی طرح مؤمل بن اسماعیل اپنی روایت حدیث عن الثوری میں ضعیف ہیں، پھر یہاں بھی وہی مؤمل ثوری سے صحیح ابن خزیمہ میں روایت کر رہے ہیں تو حافظ نے ان پر ضعف کا حکم نہیں لگایا، اور خاموشی سے گذر گئے اور یہ ان کا طریقہ ہے کہ جہاں کسی راوی سے اپنے مفید مطلب روایت ملے سکوت کرتے ہیں، اور جہاں اسی راوی سے ان کے خلاف مسلک روایت آئے تو اس کو ضعیف ثابت کرتے ہیں۔ اسی روایت ابن خزیمہ میں مؤمل کے علاوہ عاصم بن کلیب بھی ہیں، جن کی یہاں ان لوگوں نے توثیق کر دی ہے، مگر حدیث ترک رفع یدین میں ان ہی عاصم کی تضعیف کر دی ہے (ذکر ذلک ابن القیم فی اعلامہ) الخ پوری بحث و تفصیل معارف السنن ص ۴۳۵/۲ تا ص ۴۴۵/۲ لائق مطالعہ ہے۔

تفصیل مذاہب: اول تو اس مسئلہ میں اختلاف اولویت و افضلیت کا ہے، اسی لئے امام ترمذی نے بھی توسع کی طرف اشارہ کیا، تاہم جو ہے وہ ذکر کیا جاتا ہے، پہلا اختلاف تو وضع و ارسال کا ہے۔ ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہؒ، امام شافعی و احمد) اور اسحٰق و اکثر اہل علم ہاتھ باندھنے کو مستحب فرماتے ہیں، اور یہی قول حضرت علی، حضرت ابو ہریرہ اور ابراہیم نخعی و ثوری کا ہے اور ابن عبدالحکم و ابن المنذر نے امام مالک سے بھی یہی قول نقل کیا ہے باقی ابن القاسم نے امام مالک سے ارسال نقل کیا ہے اور امام مالک سے ایک قول میں یہ تفصیل بھی ہے کہ فرائض میں ارسال کرے اور نوافل میں ہاتھ باندھے۔ ابن المنذر نے یہ بھی کہا کہ حضور علیہ السلام سے اس بارے میں کوئی چیز (قوت و صراحت کے ساتھ) ثابت نہیں ہے، لہٰذا اختیار ہے جیسے چاہے کرے اور امام احمدؒ سے بھی ایک قول تخییر کا ہے۔

دوسرا اختلاف محل وضع میں ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، ابن راہویہؒ، ابواسحٰق مروزی شافعیؒ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو فرماتے ہیں۔ امام شافعی سینے کے نیچے بتلاتے ہیں جیسا کہ کتاب الام[1] اور الوسیط میں ہے۔ علامہ ابن ہبیرہ نے روایت مشہورہ امام احمدؒ سے مثل مذہب امام ابو

[1] حاشیہ کتاب الام للمزنی الشافعی ص ۷۱/۱ میں تحت الصدر ہی ہے۔ اور کتاب الام امام شافعیؒ کی آخری تصنیف ہے (مؤلف)

حنیفہ نقل کی ہے جیسا کہ تعلیقات الشیخ میں ہے اور لکھا کہ ایسا ہی ''میزان'' میں ہے اور اسی کو خرقی نے اختیار کیا ہے۔ اور علامہ ابوالطیب مدنی نے شرح ترمذی میں لکھا کہ ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کا قائل نہیں ہے الخ (معارف السنن ص ۴۳۶/۲) (ابن القیم کا نقد امام مالکؒ پر)

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف صرف افضلیت کا ہے اور امام مالکؒ سے بھی ایک قول ہاتھ باندھنے کا موجود ہے، پھر بھی حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں حسب عادت امام مالک اور مالکیہ کے خلاف نہایت نامناسب الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آپ نے متعدد احادیث ذکر کیں جن میں ناف کے نیچے اور سینے کے نیچے ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے پھر لکھا کہ ''ان سب احادیث کو مقلدین نے اس لئے چھوڑ دیا کہ ان کے ایک امام مالک نے ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنے کو کہا ہے، لہٰذا سارے مالکی اسی طرح نماز پڑھنے لگے۔ ایسا اندھیرا کہیں نہیں دیکھا گیا اور ایسے لوگ خدا کے یہاں کیا جواب دیں گے وغیرہ۔ (اعلام ص ۲/۶)

اسی طرح علامہ موصوف نے اپنی کتاب مذکور میں جگہ جگہ مقلدین ائمہ مجتہدین پر اعتراضات کئے ہیں، اور سخت زبان استعمال کی ہے حالانکہ ان اعتراضات کے مکمل و مدلل جوابات کتب متقدمین میں موجود چلے آتے ہیں، اور خود ان کے استاذ حافظ ابن تیمیہؒ نے ائمہ مجتہدین کے بے شمار مسائل کی تصویب کی ہے اور وہ ان کے مذاہب کی نقل بھی، حافظ ابن القیم کے برخلاف نہایت ادب واحترام کے ساتھ کرتے ہیں، بجز ان چند مسائل کے جن میں انھوں نے جمہور سلف وخلف سے تفرد اختیار کر کے اپنی الگ راہ بنائی ہے۔ و اللہ یحق الحق و ھو خیر الفاصلین

باب الخشوع فی الصلوٰۃ

(نماز میں خشوع کا بیان)

۷۰۲: حدثنا اسمٰعیل قال حدثنی مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھل ترون قبلتی ھٰھنا واللہ ما یخفیٰ علی رکوعکم ولا خشوعکم و انی لاراکم ورآء ظھری

۷۰۳: حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا غندر قال حدثنا شعبۃ قال سمعت قتادۃ عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اقیموا الرکوع والسجود فواللہ انی لاراکم من بعدی و ربما قال من بعد ظھریٓ اذا رکعتم وسجدتم

ترجمہ ۷۰۲: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں، کہ رسول خدا ﷺ نے (ایک روز ہم لوگوں سے) فرمایا، تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ میرا منہ (قبلے) کی طرف ہے (لیکن) خدا کی قسم! تمہارا رکوع اور تمہارا سجدہ تمہارا خشوع اپنی پس پشت سے بھی، میں دیکھتا ہوں (جیسا سامنے سے)

ترجمہ ۷۰۳: حضرت انس بن مالکؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا رکوع اور سجدوں کو درست طریقہ پر کیا کرو (اس لئے) کہ جب تم رکوع سجدہ کرتے ہو تو میں پشت کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں (جیسے سامنے سے دیکھا جاتا ہے)

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ نماز میں خشوع شرعی فقہی لحاظ سے مستحب ہے، حالانکہ وہ لازمی وضروری ہونا چاہئے کیونکہ روح نماز کی وہی ہے، مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر اس کو شریعت فرض وواجب قرار دے دیتی تو اکثر لوگوں کی نمازیں باطل ہوتیں شریعت کا منشا یہ ہے کہ لوگ اچھی بات اور صحیح راستہ کی اہمیت و قیمت پہچانیں، اور اس پر لگنے کی کوشش کریں، پھر بھی جو کوتاہی ہو اس کو شریعت نظر انداز کرتی ہے۔ اس لئے فقہ نے فیصلہ دیا کہ نماز بغیر خشوع کے بھی ہو جائے گی گو ناقص اور روح سے خالی رہے گی امام غزالی وغیرہ کی نظر چونکہ باطن پر تھی، اس لئے انہوں نے کہا کہ نماز میں خشوع فرض ہے اس کے بغیر نماز صحیح نہ ہوگی۔ انھوں نے اپنے منصب کے لحاظ سے بات کہی۔ فقہاء کا

منصب ظاہر پر حکم کرنا ہے، وہ اپنے منصب کے اعتبار سے فیصلے کرتے ہیں۔

دوسری حدیث الباب میں **اقیموا الرکوع** پر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث مسیئ الصلوٰۃ کا ایک ٹکڑا ہے، اور اس سے معلوم ہوا کہ اس شخص نے رکوع وسجدہ میں بھی کوتاہی کی تھی، چنانچہ حدیث ترمذی میں انتقاص کا لفظ موجود ہے، گویا وہ نماز کے ناقص ہونے کی طرف اشارہ تھا، لہٰذا تعدیل ارکان کے ترک سے نقصان آئے گا، بطلان نہ ہوگا، اور یہی واجب کی شان ہے، جس کو حنفیہ بھی مانتے ہیں۔ مخالفین نے حنفیہ کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ انھوں نے حدیث پر عمل نہیں کیا، جبکہ حنفیہ نے ساری حدیثوں پر نظر کر کے نظر صحیح قائم کی ہے۔ حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ شافعیہ کے یہاں جو چیزیں فرض ہیں مگر وہ شرط صحت صلوٰۃ نہیں ہیں۔ وہی ہمارے یہاں واجب کہلاتی ہیں، لہٰذا صرف نام کا اختلاف برائے نام ہے اور کچھ نہیں فرمایا **ارکعوا** اور **اقیموا الرکوع** میں فرق ہے، دوسرے میں زیادتی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتو چیز ہی نہ رہے گی، لہٰذا اقامۃ کے معنی برپا کرنا ہے اور قائم رکھنا ہے کہ اگر ایسا نہ کریں تو وہ نماز یا رکوع باقی نہ رہے گا جیسے کہیں کہ فلاں شخص دیندار ہے اور فلاں نے دین کو تھام رکھا ہے۔ پس نماز پڑھنا یہ کم درجہ کی چیز ہے بہ نسبت اقامۃ صلوٰۃ کے۔

قولہ فواللہ انی لا راکم الخ پر فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا یہ پیٹھ پیچھے سے دیکھنا بطور معجزہ تھا جیسا کہ امام احمدؒ سے بھی نقل ہوا ہے اور اب جدید سائنس کی تحقیق بھی یہ ہے کہ قوت باصرہ ساری جلد انسانی کے اندر موجود ہے۔ پھر فرمایا کہ معجزہ میں یہ ضروری نہیں کہ وہ مستحیل ہو بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس وقت مقابلہ میں کسی دوسرے سے نہ ہو سکے، خواہ بعد کو وہ ہوا کرے۔

باب مایقرأ بعد التکبیر

(تکبر (تحریمہ) کے بعد کیا پڑھے)

۷۰۴: حدثنا حفص بن عمر حدثنا شعبة عن قتادة عن انس ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم وابابکرو عمر کانوا یفتحون الصلوٰۃ بالحمد للہ رب العٰلمین

۷۰۵: حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل قال حدثنا عبدالواحد بن زیاد قال حدثنا عمارة بن القعقاع قال حدثنا ابوزرعة قال حدثنا ابوھریرة قال کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یسکت بین التکبیر و بین القراءۃ اسکاتةً قال احسبہ قال ھنیةً فقلت بابی انت و امی یارسول اللہ اسکاتک بین التکبیر و بین القرآءۃ ماتقول قال اقول اللھم باعدبینی و بین خطایای کما باعدت بین المشرق والمغرب اللھم نقنی من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس اللھم اغسل خطایای بالمآء والثلج والبرد

ترجمہ ۷۰۴:۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور ابوبکرؓ وعمرؓ نماز کی ابتدا **الحمد للہ رب العالمین** سے کرتے تھے۔

ترجمہ ۷۰۵:۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ تکبیر اور قراءت کے درمیان میں کچھ سکوت فرماتے تھے (ابوزرعہ کہتے ہیں) مجھے خیال ہوتا ہے کہ ابوہریرہؓ نے کہا تھوڑی دیر تو میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، تکبیر اور قراءت کے مابین سکوت کرنے میں آپ کیا پڑھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، میں پڑھتا ہوں اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے درمیان میں ایسا فصل کردے جیسا تو نے مشرق اور مغرب کے درمیان میں فصل کر دیا ہے۔ اے اللہ! مجھے گناہوں سے پاک کردے، جیسے سفید کپڑا میل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو پانی اور برف اور اولہ سے دھو ڈال:

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمارے یہاں اور حنابلہ کے یہاں بھی تکبیر اولی کے بعد **سبحانک اللّٰھم وبحمدک** الخ پڑھنا

مستحب ہے، اور مسلم شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے تعلیم دینے کے لئے نماز کے اندر بھی اسی کو بلند آواز سے پڑھا تھا، امام شافعیؒ نے اس دعا کو اختیار کیا ہے جو بخاری کی حدیث الباب میں سامنے ہے اللھم باعد الخ، اور قوۃ اسناد کے لحاظ سے یہی اولی ہے مگر تعامل پر نظر کرتے ہوئے ہماری دعا اعلیٰ ہے، امام احمدؒ نے بھی ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ جس دعا کو حضرت عمرؓ نے اختیار کیا تھا اسی کو ہم بھی اختیار کرتے ہیں۔

تعامل اور فن اسناد

اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ قوت اسانید پر غرہ کرنے اور تعامل سے صرف نظر کرنے کی وجہ سے دین کو بڑا ضرر پہنچا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسناد کا فن دین کی حفاظت کے لئے تھا تا کہ اس میں باہر کی غیر چیزیں داخل نہ ہو سکیں، لیکن پھر فن اسناد پر اتنا زیادہ زور صرف کیا گیا کہ تعامل نظروں سے اوجھل ہو گیا، حالانکہ وہی دینی احکام کے لئے میرے نزدیک فیصلہ کن چیز تھی حضرتؒ نے یہاں امام ترمذی کی طرف اشارہ کیا کیونکہ انھوں نے حنفیہ وحنابلہ کی دعاء استفتاح والی حدیث ذکر کر کے اس پر سندی کلام کر دیا ہے۔ پوری بحث معارف السنن ص ۳۵۹/۲ میں دیکھی جائے، خلاصہ یہ ہے کہ اس کے رجال بھی ثقہ ہیں اور کلام سے تو بہت کم راوی بچے ہیں۔ پھر حضرت عمرؓ کے صحیح اثر سے بھی یہ بات ثابت ہوگئی کہ آخری عمل حضور علیہ السلام کا انھوں نے وہی دیکھا ہوگا، جس کو اختیار فرمایا، یہ تعامل صحابہ کے شواہد ہی صحت حدیث کے لئے بڑی دلیل ہیں۔

محدث شہیر علامہ تورپشتی حنفی نے لکھا کہ **سبحانک اللھم** والی حدیث استفتاح حدیث حسن مشہور ہے، جس پر خلفاء اور حضرت عمرؓ نے عمل کیا ہے اور اسی کو حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہ فقہائے صحابہ نے اختیار کیا تھا۔ اور علماء تابعین نے بھی۔ پھر اسی کو امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے جلیل القدر علماء حدیث مثل سفیان ثوری، امام احمد واسحق بن راہویہ نے معمول بنایا، اور امام ترمذی نے جس سند میں کلام کیا ہے، اس کے علاوہ دوسری وجوہ روایت بھی ہیں، مثلاً ابوداؤد وغیرہ کی حدیث۔ الخ پھر فرمایا کہ مشہور یہ ہے کہ امام مالکؒ کے یہاں دعاء استفتاح نہیں ہے، مگر ابوبکر بن العربی نے نقل کیا کہ وہ خود پڑھتے تھے، دوسروں کو حکم نہیں کرتے تھے، گویا اس کو امر مستحب خیال کرتے تھے۔

بسم اللہ جزو سورت نہیں

پہلی حدیث الباب میں جو یہ ہے کہ حضور علیہ السلام اور حضرت ابوبکر وعمرؓ نماز کو **الحمد للہ رب العالمین** شروع کرتے تھے، اس سے حنفیہ نے بسم اللہ آہستہ پڑھنے پر استدلال کیا ہے، اور بسم اللہ کے جزو سورۂ فاتحہ نہ ہونے پر بھی خود امام شافعیؒ نے اس کا جواب دیا کہ مراد سورۂ فاتحہ ہے (کتاب الام ص ۹۳/۱) اور یہی جواب دوسرے شافعیہ بھی دیتے ہیں، حافظ زیلعیؒ نے اس جواب دیا کہ پوری آیت الحمد للہ رب العالمین تو سورۂ فاتحہ کا نام نہیں ہے، نام تو صرف الحمد ہے، حضرتؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کا استدلال درست ہے۔ پھر فرمایا کہ ظاہر روایت کی رو سے بسم اللہ پڑھنا ہمارے یہاں سنت ہے مگر ایک روایت وجوب کی بھی ہے اور شیخ سید محمود آلوسیؒ نے وجوب کو ہی ترجیح دی ہے۔

اس موقع پر الحمد سے قبل جہر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے لئے جو خطیب بغدادی نے سب سے زیادہ زور صرف کیا ہے، اس کے جوابات مفصل و مدلل معارف السنن ص ۳۶۳/۲ تا ص ۳۸۲/۲ میں مطالعہ کئے جائیں۔ نہایت بصیرت حاصل ہوگی۔

امام بیہقی کا غلط استدلال

قولہ یسکت بین التکبیر الخ پر فرمایا:۔ اس سے ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہؒ) امام احمد وشافعی) اور جمہور نے دعاء استفتاح پر استدلال کیا ہے لیکن امام بیہقی نے اس سے دوسری عجیب بات نکالی ہے وہ یہ کہ یہاں سکوت تھا اور دعا بھی پڑھی گئی، لہٰذا اسی طرح امام کے پیچھے فاتحہ بھی پڑھی جاسکتی ہے، اور وہ انصات کے خلاف نہ ہوگا اور قراءت سراسر جائز ہوگی۔ حالانکہ یہاں سکوت کا اطلاق قراءت سراپر نہیں

ہوا ہے، بلکہ سکوت سے مراد سکون ہے، جس کا تعلق ماقبل سے ہے کہ تکبیر سے فارغ ہوئے چنانچہ ایک روایت میں بھی ہے کہ اللہ اکبر سے سکوت کیا، اورآیت **ولما سکت عن موسی الغضب** میں بھی سکون ہی مراد ہے، نہ کہ اخفاء، پھر انصات وسکتہ میں یوں بھی فرق ہے، خصوصا جبکہ انصات کے ساتھ استماع بھی ہو، جس کی تفصیل بحث قراءۃ خلف الامام میں آئے گی۔

قولہ اللّٰھم اغسل خطایای بالماء والثلج والبرد پر فرمایا کہ محقق ابن دقیق العید نے کہا کہ لوگ عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا برف اولہ وغیرہ برستا ہے اورزمین پر بیکار ہوکر بہ جاتا ہے، اس لئے دعا اس طرح کی گئی کہ یا اللہ! اس کو میرے گناہوں کے دھونے میں کار آمد کردے، بعض نے کہا کہ مجھے برف اولہ کی طرح صاف وسفید اور گناہوں کی آلائش سے پاک کردے۔ بعض نے کہا ان چیزوں میں ٹھنڈک ہے، ان سے میرے گناہوں کی گرمی وحدت کو مٹادے۔ وغیرہ

باب ۷۰۶: حدثنا ابن ابی مریم قال اخبرنا نافع بن عمر قال حدثنی ابن ابی ملیکۃ عن اسمآء بنت ابی بکر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی صلوٰۃ الکسوف فقام فاطال القیام ثم رکع فاطال الرکوع ثم قام فاطال القیام ثم رکع فاطال الرکوع ثم سجد فاطال السجود ثم رفع ثم سجد فاطال السجود ثم قام فاطال القیام ثم رکع فاطال الرکوع ثم رفع فسجدفاطال السجودثم رفع ثم سجدفاطال السجود ثم انصرف فقال قد دنت منی الجنۃ حتیٰ لواجترات علیھا جئتکم بقطاف من قطافھا ودنت منی النار حتیٰ قلت ای رب او انامعھم؟ فاذا امراۃ حسبت انہ' قال تخدشھا ھرۃ قلت ماشان ھٰذہ قالوا حبستھا حتیٰ ماتت جوعاً لآاطعمتھا ولاارسلھاتاکل قال نافع حسبت انہ' قال من خشیش الارض او خشاش

ترجمہ: حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز کسوف پڑھنے کھڑے ہوئے تو آپ نے طویل قیام کیا، پھر طویل رکوع کیا، اس کے بعد قیام کیا، اور قیام کو (بھی) طویل کیا، پھر رکوع کیا، اور رکوع کو (بھی) بڑھایا۔ پھر سر اٹھایا اس کے بعد (دوسرا) سجدہ کیا۔ اور (اس) سجدہ کو (بھی) بڑھایا، پھر (دوسری رکعت کے لئے) آپ کھڑے ہوئے، اورآپ نے قیام کو بڑھایا اس کے بعد رکوع کیا، اور رکوع کو بڑھایا۔ پھر سر اٹھا کر سجدہ کیا، سجدے کو (بھی) بڑھایا۔ اس کے بعد پھر سر اٹھایا، تو (دوسرا) سجدہ کیا اور (اس) سجدے کو (بھی) بڑھایا اس کے بعد آپ نے (نماز سے) فراغت حاصل کی' اور فرمایا کہ (اس وقت) جنت میرے اتنے قریب ہوگئی تھی کہ اگر میں چاہتا، تو اس کے خوشوں میں سے کوئی خوشہ تمہارے پاس لے آتا، اور دوزخ بھی میرے اتنے قریب ہوگئی تھی کہ میں کہنے لگا کہ اے میرے پروردگار! کیا میں ان لوگوں کے ہمراہ (رکھا جاؤں گا) یکا یک ایک عورت (نظر پڑی) مجھے خیال ہے کہ آپ نے فرمایا، کہ اس کو ایک بلی پنجہ مار رہی تھی، میں نے کہا، اس کا کیا حال ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اس نے بلی کو پال رکھا تھا، نہ اس کو کھلاتی تھی، اور نہ اس کو چھوڑتی تھی تاکہ وہ (از خود) کچھ کھالے، نافع کی روایت میں اس طرح ہے کہ (نہ اس کو چھوڑتی تھی) تاکہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا کر اپنا پیٹ بھرے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ اس حدیث الباب میں صلوٰۃ کسوف کا ذکر کیا گیا ہے، اور بخاری وموطأ امام مالک سے دو رکوع کا ثبوت ہوا ہے، دوسری روایات پانچ تک کی بھی ہیں جیسے ابوداؤد وغیرہ میں۔ مسلم میں تین کی روایت ہے۔ حافظ ابن حجر نے ایک واقعہ مانا ہے۔ علامہ نووی وغیرہ نے اس کو تعدد وقائع پر محمول کیا، لیکن وہ غلط ہے کیونکہ کسوف کا واقعہ حضور علیہ السلام کی زندگی میں صرف ایک ہی بار پیش آیا ہے جیسا کہ محمود شاہ فرنساوی نے اپنے رسالہ میں تحقیق کی ہے، جس میں قمری حساب کو شمسی پر منطبق کیا ہے، البتہ اس نے نسئ عندالعرب سے انکار کر کے غلطی کی ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں لوند لگتا تھا اور ایک سال میں دو ماہ ذی الحجہ کے ہوجاتے تھے، جس طرح ہندوستان میں لوند لگتا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ بھی تعدد کے قائل تھے، کیونکہ وہ رواۃ پر بہت وثوق کیا کرتے تھے اور حتی الوسع ان کی تصحیح کرتے تھے، میں نے اس رسالہ کا ذکر کیا تو خاموش ہوگئے۔

پھر فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے اگرچہ نماز کسوف میں ایک ایک رکعت میں دو دو رکوع کئے تھے، لیکن یہ نہیں فرمایا کہ اسی طرح تم بھی پڑھنا کہ یہ قریب کی تشبیہ ہوتی بلکہ دور کی تشبیہ دے کر فرمایا کہ تم نئی نماز (فجر) کی طرح پڑھا کرنا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے یہ توجیہ فرمائی تھی، پھر بدائع چھپ کر آئی تو اس میں بھی ابوعبداللہ بلخی سے یہی توجیہ نقل ہوئی، جو کبار مشائخ حنفیہ میں سے ہیں، میں نے حضرت سے عرض کیا تو سن کر بہت خوش ہوئے اور پوچھا کہ یہ کون ہیں؟

تعدد رکوع خصیصۂ نبوی

حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے بھی نکات نکالے ہیں حضور علیہ السلام کے دو رکوع کے لئے مگر بہر حال! وہ آپ کی خصوصیت ہی رہے گی، مثلاً یہ کہ آپ نے نماز کے اندر جنت و دوزخ کو قبلہ کی دیوار میں متمثل دیکھا تھا، اور وہ ایک آیت تھی آیات اللہ میں سے جس کا آپ نے خطبہ میں بھی ذکر فرمایا، دوسرا زائد رکوع آیت اللہ کے سبب سے تھا کہ آپ نے اس کے سامنے تضرع و ابتہال کیا۔

نماز کسوف کا طریقہ

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حنفیہ تو حضور علیہ السلام کے فعل مبارک اور واقعہ خاصہ دو رکوع والے کو آپ کی خصوصیت پر محمول کرتے ہیں اور حضور علیہ السلام کے قول کو ترجیح دیتے ہیں کہ ابوداؤد میں حدیث ہے حضور علیہ السلام نے نماز کسوف پڑھا کر فرمایا کہ تم اس کو نئی نماز فرض (فجر) کی طرح پڑھا کرنا۔ اور مالکیہ، شافعیہ و حنابلہ نماز کسوف میں دو دو رکوع کے ہی قائل ہیں۔ جو آپ سے فعلی حدیث میں ثابت ہے۔ پوری بحث العرف الشذی اور معارف السنن جلد پنجم میں ہے قولہ هرة پر فرمایا کہ اس میں تا وحدت کی ہے تانیث کی نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام نے اس عورت کو جہنم میں کیونکر دیکھ لیا؟ جبکہ اس کا دخول جہنم مستقبل ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ گہری نظر والے حال ہی میں مستقبل کی چیزوں کو دیکھ لیا کرتے ہیں خاص کر جبکہ اس آئندہ آنے والی چیز کا کسی نہج سے کچھ وجود بھی ہو۔ جیسے بیج کے اندر درخت کا تصور اور خیالی رویت ممکن ہے۔
نماز کسوف کے بارے میں مکمل اختلافی حدیثی ابحاث اپنے موقع پر آئینگی، فتح الملہم جلد دوم اور معارف السنن جلد پنجم میں بھی دیکھی جائیں۔

باب رفع البصر الى الامام فى الصلوٰة وقالت عآئشة قال النبى صلے الله عليه وسلم فى صلوة الكسوف رأيت جهنم يحطم بعضها بعضاً حين رايتمونى تاخرت

(نماز میں امام کی طرف نظر اٹھانے کا بیان' اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کسوف کے بارے میں فرمایا کہ میں نے جہنم کو دیکھا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو توڑ پھوڑ رہا ہے۔ جب تم نے مجھے دیکھا کہ میں پیچھے ہٹا تھا)

۷۰۷: حدثنا موسىٰ قال حدثنا عبدالواحد قال حدثنا الاعمش عن عمارة ابن عمير عن ابى معمر قال قلنا لخباب اكان رسول الله صلے الله عليه وسلم يقرأفى الظهر والعصر قال نعم فقلنا بماكنتم تعرفون ذاک قال باضطراب لحية

۷۰۸: حدثنا حجاج قال حدثنا شعبة قال انبانا ابو اسحاق قال سمعت عبدالله بن يزيد يخطب قال حدثنا البرآء وكان غير كذوب انهم كانوا اذاصلوامع النبى صلے الله عليه وسلم فرفع راسه' من الركوع قاموا قياماً حتىٰ يروه قدسجد

ترجمہ ۷۰۷: ابو معمرؒ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت خبابؓ سے کہا کہ کیا رسول خدا ﷺ ظہر اور عصر (کی نماز) میں کچھ پڑھتے تھے، خبابؓ نے کہا۔ ہاں! ہم نے کہا، تم نے یہ کس طرح معلوم کر لیا، خبابؓ نے کہا کہ آپ کی داڑھی کے ہلنے سے:۔

ترجمہ ۷۰۸:۔ ابواسحاق روایت کرتے ہیں، کہ میں نے عبداللہ بن یزید کو خطبہ پڑھتے میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم سے براء (بن عازب) نے بیان کیا (اور وہ جھوٹے نہ تھے) کہ صحابہ جب نبی کریم علیہ السلام کے ہمراہ نماز پڑھتے۔ اور جب آپ اپنا سر رکوع سے اٹھا لیتے تو صحابہ کھڑے رہتے تھے یہاں تک کہ جب آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھ لیتے (تب سجدہ کرتے تھے۔

۷۰۹: حدثنا اسماعیل قال حدثنی مالک عن زید بن اسلم عن عطآء بن یسار عن عبدالله بن عباس قال خسفت الشمس علیٰ عهدالنبی صلے الله علیه وسلم فصلی کالوایارسول الله رایناک تناولت شیئاً فی مقامک ثم رایناک تکعکعت فقال انی رایت الجنة فتناولت منها عنقوداً ولو اخذته' لاکلتم منه' ما بقیت الدنیا

۷۱۰: حدثنا محمد بن سنان قال حدثنا فلیح قال حدثنا هلال بن علی عن انس بن مالک قال صلیٰ لنا النبی صلی الله علیه وسلم ثم رقی المنبر فاشار بیدیه قبل قبلة المسجد ثم قال لقد رایت الأن منذصلیت لکم الصلوٰة الجنة والنار ممثلتین فی قبلة هذا الجدار فلم ار کان لیوم فی اخیر والشر ثلاثاً

ترجمہ ۷۰۹:۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام کے زمانے میں آفتاب میں گہن پڑا، تو آپ نے نماز کسوف پڑھی، صحابہ نے عرض کیا کہ ہم نے آپ کو دیکھا کہ کوئی چیز آپ نے اپنی جگہ پر (کھڑے ہوئے) لی تھی پھر ہم نے آپ کو دیکھا، کہ آپ پیچھے ہٹے، آپ نے فرمایا کہ میں نے جنت کو دیکھا تو اس سے ایک خوشہ میں نے لینا چاہا، اگر میں اس کو لے لیتا، تو تم اس میں سے کھایا کرتے، جب تک کہ دنیا باقی رہتی۔ (یعنی وہ کبھی فنا نہ ہوتا)

ترجمہ ۷۱۰:۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم علیہ السلام نے ہمیں نماز پڑھائی، اس کے بعد منبر پر تشریف لائے، اور اپنے دونوں ہاتھوں سے مسجد کے قبلے کی طرف اشارہ کیا، پھر فرمایا کہ میں نے اس وقت جیسے کہ تمہیں نماز پڑھانی شروع کی، جنت اور دوزخ کی مثال اس دیوار کے قبلہ میں دیکھی، میں نے آج کے دن کی طرح خیر اور شر کبھی نہیں دیکھی (یہ آپ نے) تین مرتبہ (فرمایا):۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام بخاری کے پیش نظر چونکہ حالت نماز میں نظر الی السماء کی ممانعت تھی، جو اگلے باب میں آنے والی بھی ہے، اس لئے بتلایا کہ بحالت نماز نظر الی الامام کی اجازت ہے، اور اس پر "حین رایتمونی" سے استدلال کیا ہے اور اس کی اجازت اس لئے بھی ہے کہ امام کی مکمل اتباع کا حکم ہے، اس کی طرف نظر نہ کرے گا تو اتباع نہ ہو سکے گا، پھر یہ امر بھی زیر بحث آگیا کہ نماز کی حالت میں نظر کہاں رکھنی بہتر ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا کہ مالکیہ نے قول باری تعالیٰ **فول وجهک شطر المسجد الحرام** سے استدلال کیا کہ نمازی نظر اپنے سامنے رکھے، نہ سجدہ کی جگہ پر جو امام ابوحنیفہؒ شافعی واحمدؒ کا مختار ہے۔ زیادہ تفصیل لامع ص ۲۹۲/۱ میں ہے۔

قولہ **حتی یروه قد سجد** پر فرمایا کہ یہ بات حضور علیہ السلام کے آخری زمانہ کی ہے جب جسم مبارک بھاری ہو گیا تھا اور ضعف آگیا تھا، تناولت شیئا پر فرمایا کہ بعض راویوں نے اخذت بھی روایت کیا ہے اور یہ سب راویوں کے تجوزات ہیں۔ کیوں کہ آپ نے صرف ارادہ فرمایا تھا، اس کو لیا نہیں تھا۔ چنانچہ بعض روایات میں اردت بھی وارد ہوا ہے۔

عالم مثال کا ثبوت: قولہ **لقد رأیت الآن منذ صلیت لکم الصلوٰة الجنة والنار ممثلتین الخ** اس پر فرمایا کہ امام بخاری کی اس حدیث سے عالم مثال کا ثبوت واضح طور سے ہوتا ہے، نیز اس کو سمجھ لو کہ عالم غیب عالم مثال کے لئے بمنزلہ مبدأ کے ہے، اور عالم مثال عالم اجسام کے لئے بمنزلہ مبدأ کے ہے، اور ہر مبدأ کے اندر بعد میں ہونے والے تطورات وتغیرات رونما ہوتے ہیں اور وہ اپنے وجود کا کسی نہ کسی درجہ میں ثبوت ضرور دیتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ اس تمثل کا ثبوت علاوہ کسوف کے دوسرے واقعہ میں بھی ملتا ہے۔ اور سقراط وافلاطون نے بھی ثبوت عالم مثال کا اقرار کیا ہے، اور ارسطو نے بھی اثولوجیا میں، اور اس میں یہ بھی تحقیق کی کہ انعال باری تعالیٰ معلل بالاغراض نہیں ہیں۔ اور اس کو کماحقہ واضح ومحقق کیا ہے، جس طرح سید جرجانی نے حاشیہ حکمۃ العین میں مسئلہ وحدۃ الوجود کو خوب تر واضح وبیین کیا ہے وہ بھی لائق مطالعہ ومراجعت ہے۔

علامہ قرطبی وشاہ ولی اللہ کا ارشاد

حضرت علامہ عثمانیؒ نے فتح الملہم ص ۲/۴۵۶ میں فتح الباری کے حوالہ سے علامہ قرطبیؒ کا قول نقل کیا کہ بموجب مذہب اہل سنت جنت ودوزخ اس وقت موجود ہیں، اور حق تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے لئے ایک خاص ادراکی قوت عطا فرمادی تھی۔ جس سے آپ نے ان دونوں کا ادراک حقیقۃً فرمایا ہے۔ پھر علامہ عثمانی نے لکھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس قصہ کو رؤیت مثالیہ پر محمول کیا ہے اور باب ذکر عالم المثال میں لکھا کہ احادیث کثیرہ سے یہ امر ثابت ہے کہ اس عالم وجود میں ایک عالم غیر عنصری بھی ہے جس میں معانی اجسام مناسبہ کے اندر متمثل ہوتے ہیں۔ اور وہاں اشیاء کا وجود قبل وجود ارضی ہوجاتا ہے، الخ

باب رفع البصر الی السمآء فی الصلوٰة

نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھانے کا بیان

۷۱۱: حدثنا علی بن عبداللہ قال حدثنا یحیی بن سعید قال حدثنا ابن ابی عروبۃ قال حدثنا قتادۃ ان انس بن مالک حدثھم قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم مابال اقوام یرفعون ابصارھم الی السمآء فی صلوتھم فاشتد قولہ فی ذٰلک حتیٰ قال لینتھین عن ذٰلک او لتخطفن ابصارھم

ترجمہ:۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ لوگ یہ کیا کرتے ہیں کہ اپنی نماز میں اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں، پس اس کے بارے میں آپ کی گفتگو بہت سخت ہوگئی، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کہ اس سے باز آئیں، ورنہ ان کی بینائیاں لے لی جائیں گی۔

تشریح:۔ حدیث الباب میں نماز کے اندر نگاہ آسمان کی طرف اٹھانے کی سخت ممانعت وارد ہوئی، علامہ ابن بطال نے کہا کہ سارے علماء امت کا اس امر کی کراہت پر اجماع ہو چکا ہے، اور نماز کے باہر بھی شریح وغیرہ نے مکروہ ہی کہا ہے، مگر اکثر علماء نے اس کی اجازت دی ہے۔ کیونکہ جس طرح کعبہ معظمہ نماز کے لئے قبلہ ہے، اسی طرح آسمان دعا کا قبلہ ہے، قاضی عیاض نے کہا کہ نماز کے اندر آسمان کی طرف دیکھنے میں ایک قسم کا اعراض ہے قبلہ سے اور نماز کے دائرے اور ہیئت سے گویا باہر نکلنا ہے۔ کذا فی الفتح۔ حافظ نے یہ بھی لکھا کہ ابن حزم نے افراط کی کہ اس کو حرام قرار دیا اور اس کی وجہ سے نماز کو باطل کہا ہے۔

حضرت علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ خارج صلوٰۃ میں دعا کے وقت نظر الی السماء کی اجازت شیخ عابد سندیؒ نے بھی دی ہے جنھوں نے اسی موضوع پر مستقل رسالہ بھی لکھا ہے۔ اور ایسا ہی علامہ دوانی نے بھی کہا ہے۔

حافظ نے لکھا کہ ایک وجہ ممانعت کی یہ بھی کہی گئی ہے کہ یہ نگاہوں پر شفقت کے لئے ہے کہ نمازیوں پر حالت نماز میں فرشتے جو انوار کی بارش کرتے ہیں۔ نظریں آسمان کی طرف کرنے میں شدت انوار کی وجہ سے ان کی روشنی سلب ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث اسید بن حضیر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو فضائل قرآن میں آئے گی۔

حضرت شیخ الحدیث دام ظلہم نے اس پر لکھا کہ ممکن ہے اسی احتمال کے باعث وعید مذکور کو بجائے حرمت کے کراہت پر اتارا گیا ہو گا (لامع ص ۱/۲۹۳) امام ابن ماجہ نے باب الخشوع فی الصلوٰۃ میں حضرت عمرؓ سے حدیث روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اپنی نظریں آسمان کی طرف مت اٹھاؤ۔ ڈر ہے کہ تمہاری بصارتیں اچانک سلب نہ ہو جائیں، یعنی نماز کے اندر (ص ۲۷) اس سے بھی انوار وتجلیات ربانی کے سبب سے سلب بصارت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ واللہ اعلم

ابن ماجہ میں باب مذکور میں دوسری اور تیسری حدیث حضرت انس وجابر بن سمرہ والی روایت کی ہیں اور حضرت انس والی یہاں بخاری نے روایت کی ہے۔ ابن ماجہ میں اضافہ وتفصیل ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا۔ حضور علیہ السلام نے ایک روز اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی۔ اور جب نماز پوری کر چکے تو فرمایا: ۔ لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں، اور پھر غصہ وشدت کے ساتھ فرمایا کہ یا تو وہ ایسا کرنے سے رک جائیں، ورنہ ان کی بصارتیں سلب ہو جائیں گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام نے اپنی نماز کی حالت میں ہی صحابہ کرام کی اس حرکت کو ملاحظہ فرمالیا تھا، جیسا کہ آپ فرماتے تھے کہ میں تم کو اپنے پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسے آگے سے۔

ملا علی قاری اور جہت کا مسئلہ

مسلم شریف میں باب **النهى عن رفع البصر الى السماء** کے تحت ابو ہریرہؓ سے حدیث میں **عند الدعاء فى الصلوٰة** کا بھی اضافہ ہے کہ لوگوں کو نماز میں دعا کے وقت اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آجانا چاہئے، ورنہ ان کی بصارتیں سلب ہو سکتی ہیں۔ اور اس روایت کو صاحب مشکوٰۃ نے ذکر کیا ہے، جس پر علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا: ۔ خاص طور سے دعاء صلوٰۃ میں اس کی ممانعت اور شدید وعید کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حق تعالیٰ شانہ کا جہت علیا میں ہونے کا ایہام ہوتا ہے، حالانکہ وہ تمام جہات سے منزہ ہے ورنہ یوں نماز میں بغیر دعا کے بھی مطلقا **رفع بصر الى السماء** مکروہ ہے۔ اس صورت میں وعید شدید اور نہی اکید کی وجہ اور بھی زیادہ روشنی میں آجاتی ہے۔

حق تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے حضرت شیخ المحدثین ملا علی قاری حنفی (م ۱۰۱۴ھ) کو کہ انھوں نے حدیث مسلم کی زیادۃ مذکورہ کی روشنی میں وہ تحقیق فرمائی، جس کی طرف دوسرے شارحین مسلم نے نظر نہیں کی اور احقر نے اس موقع پر بڑے اشتیاق سے شرح نووی وفتح الملہم کو بھی دیکھا، مگر کچھ نہ ملا۔

احقر نے جہت کے مسئلہ پر انوار الباری جلد ۱۱ میں کافی لکھا ہے اور یہ بھی لکھا تھا کہ ائمہ مجتہدین نے متفقہ طور سے ذات باری عز اسمہ کو جہت سے مبرا قرار دیا ہے، مگر آٹھویں صدی میں علامہ ابن تیمیہ نے آکر اس کی بھی مخالفت کی، اور جہاں ان کے سلف و جمہور امت کے خلاف دوسرے اصول وفروع کے تفردات ہیں، ان میں جہت کا مسئلہ بھی ہے، اور آج کل کے حنابلہ نے جہاں دوسرے بہت سے مسائل امام احمدؒ کو علامہ موصوف کی وجہ سے ترک کر دیا ہے (مثلا طلاق ثلاث وغیرہ) اسی طرح جہت کے مسئلہ میں بھی وہ بے جہت ہو گئے ہیں۔

ہمیں علامہ ابن تیمیہ وعلامہ ابن القیم کے فضل وتبحر اور علمی کمالات وخدمات کا پورا اعتراف ہے، مگر کیا کریں کہ ان کے تفردات اور بہت سے مسائل میں مسلک جمہور سلف وخلف سے ان کا انحراف، نیز اکابر امت کے حق میں ان کی درشت کلامیاں اور تیز لسانیاں وغیرہ ہمارے لئے سخت اذیت وکوفت کا سبب بن گئی ہیں۔ واللہ المستعان۔

یہاں یہ بات بھی اپنے ذہنوں میں تازہ کرلیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے حدیث بخاری "**وان ربه بينه و بين القبلة**" کی شرح کے وقت فرمایا تھا کہ شرح عقائد جلالی میں لکھا ہے کہ حاجات کیلئے آسمان "قبلۂ شرعیہ" ہے۔ پھر حیرت وتعجب کے ساتھ لکھا کہ ایک حنبلی عالم نے اس کو جہت حقیقیہ قرار دیا ہے، حالانکہ اس کو جہت شرعیہ سمجھنا چاہئے تھا حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ حنبلی عالم ابن تیمیہ ہیں۔

لمحہ فکریہ: حکومت سعودیہ ان لحاظ سے ہزار تحسین وتشکر کی مستحق ہے کہ اس نے حرمین شریفین کا نظم ونسق نہایت اعلیٰ پیمانہ پر اور عمدہ کیا ہے، حجاج کرام کے لئے جو آسائشیں اور سہولتیں مہیا کی ہیں وہ بھی لائق صد مبارکباد ہیں، مگر یہ بات قابل اعتراض بھی ہے کہ وہ حجاز ونجد کی دولت کا بیشتر و معتد بہ حصہ صرف نجدی، وہابی وتیمی عقائد کی نشر واشاعت پر صرف کر رہی ہے، حالانکہ اس کے مصرف کا تعین ساری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے مشورہ ومرضی کے مطابق ہونا چاہیئے، کیونکہ دولت سعودیہ سارے دنیائے اسلام کی ایک مرکزی امانت ہیں، ابتداء میں وہاں کی حکومت سعودیہ نے مؤتمر اسلامی منعقد کر کے یہ کوشش کی بھی تھی کہ وہاں کے طرز وطریق حکومت اور دیگر اہم امور کے لئے عالم اسلامی کے اہل حل وعقد کی رائے حاصل کرے، مگر پھر رفتہ رفتہ وہ بجائے ایک عالمی شوروی خلافت یا سلطنت بننے کے ــــــ محض ایک شخصی حکومت بن کر رہ گئی ہے اور حد ہے کہ اس اسلامی مرکزی خطہ میں نجدی وتیمی عقائد کے خلاف کوئی کتاب بھی داخل نہیں ہوسکتی۔ اور اکابر امت کی ایسی کتابوں کے لئے وہاں داخلہ پر بھی سخت پہرہ و پابندی لگی ہوئی ہے۔ نہ وہاں باہر کے مسلمان ہجرت کر کے قیام کر سکتے ہیں، جبکہ شروع تاریخ اسلام سے نجدی حکومت کے زمانی تک برابر ساری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کو ہجرت کر کے حرمین شریفین میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت رہی ہے۔

افسوس ہے کہ اب باہر کے جن اعیان کا رابطہ موجودہ سعودی حکومت کے ارکان سے ہے، وہ ایسے امور کی اصلاح کے لئے کوئی جرأت مندانہ قدم نہیں اٹھاتے۔ ورنہ ہمیں پوری توقع ہے کہ وہاں کی حکومت شریعت مقدسہ کی روشنی میں جو بھی مطالبات واصلاحات پیش کی جائیں گی نہ صرف یہ کہ ان کو ضرور سنے گی بلکہ ان کو منظور کر کے دنیائے اسلام کی رائے عامہ کو ان شاء اللہ مطمئن کرنے کی کوشش کرے گی۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

باب الالتفات فی الصلوٰۃ

نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے کا بیان

۷۱۲: حدثنا مسدد قال حدثنا ابو الاحوص قال حدثنا اشعث بن سلیم عن ابیه عن مسروق عن عآئشة قالت سالت رسول الله صلی الله علیه وسلم عن الالتفات فی الصلوٰة هو اختلاس یختلسه الشیطان من صلوٰة العبد

۷۱۳: حدثنا قتیبة قال حدثنا سفیٰن عن الزهری عن عروة عن عآئشة ان النبی صلی الله علیه وسلم صلی فی خمیصة لها اعلام فقال شغلنیٓ اعلام هٰذه اذهبوا بها الیٰٓ ابی جهم وائتونی بانبجانیته

ترجمہ ۷۱۲:۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ سے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے کی بابت پوچھا، تو آپ نے فرمایا کہ یہ ایک قسم کی چوری ہے، کہ شیطان بندے کی نماز میں سے کر لیتا ہے۔

ترجمہ ۷۱۳:۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک روز) ایسے کپڑے میں نماز پڑھی جس میں نقش بنے ہوئے تھے (نماز سے فارغ ہو کر) آپ نے فرمایا، کہ مجھے اس کپڑے کے نقوش نے (اپنی طرف) متوجہ کر لیا اسے ابوجہم (تاجر) کے پاس لے جاؤ اور مجھے انجانیہ لا دو۔

تشریح:۔ امام بخاریؒ نے باب رفع البصر الی الامام میں یہ ثابت کیا تھا کہ نماز بحالت اقتداء امام کی حرکات وسکنات پر مطلع ہونے کے لئے امام کی طرف نظر والتفات رکھ سکتا ہے، اس سے نماز میں کوئی خلل نہ آئے گا۔ پھر دوسرے باب میں بحالت نماز آسمان کی طرف نظر اٹھانے سے روکا، اور اس سے یہ بھی بعض احادیث کے تحت معلوم ہوا کہ اگر نمازی کا عقیدہ یہ ہو کہ حق تعالیٰ جہت علیا میں یا آسمان پر ہیں، تب تو اس نظر اٹھانے پر سخت وعید بھی ہے، جو خرابی عقیدہ ہی پر ممکن ہے۔ اس کے بعد یہاں امام بخاری ایک تیسری صورت بتلا رہے ہیں کہ نمازی اگر بلا ضرورت کے ادھر ادھر نظر کرتا ہے تو اس کا یہ فعل شیطانی حرکت ہے کہ شیطان اس طرح سے اس کی نماز کو ناقص بنا کر اس کے اجر وثواب کو کم کرتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ میرے نزدیک عالم غیب کی ساری چیزیں حقیقت پرمبنی ہیں ان میں تاویل واستعارہ کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے اگر کسی کو اپنی التفات والی نماز متمثل کر کے دکھا دی جائے تو وہ ضرور اس کو دیکھے گا کہ وہ مختلسہ مجروحہ ہے یعنی جگہ جگہ سے نچی کھسٹی ہوئی، التفات وغیرہ نقائص کی وجہ سے ہے۔

انواع التفات: (۱) نظر سے ملتفت ہونا۔ یہ تو سب کے نزدیک نماز میں جائز ہے اگرچہ خلاف اولی ہے (۲) تحویل وجہ کے ساتھ بلا ضرورت کے سب کے نزدیک مکروہ ہے (۳) سینہ بھی قبلہ سے پھر جائے تو حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک مفسد صلوٰۃ ہے، مالکیہ کے یہاں اگر دائیں بائیں مڑ جائے اور دونوں پاؤں قبلہ کی طرف قائم رہیں تو بلاضرورت مکروہ ہے، حنابلہ کے نزدیک اگر بلاضرورت مرض وخوف وغیرہ التفات ہوتو مکروہ ہے اور بطلان صلوٰۃ کا حکم صرف استدبار قبلہ سے ہوگا۔ (الابواب ص ۲/۲۸۳)

باب هل يلتفت لامرينزل بهٖ اويرٰى شيئاً او بصاقاً فى القبلة وقال سهل التفت ابوبكر فراى النبى صلے الله عليه وسلم

(اگر نماز میں کوئی خاص واقعہ پیش آ جائے یا سامنے تھوک یا کوئی چیز دیکھے تو کیا یہ جائز ہے کہ دزدیدہ نظر سے دیکھے اور سہل کہتے ہیں کہ ابوبکر ملتفت ہوئے تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا)

۷۱۴: حدثنا قتيبة قال حدثنا الليث عن نافع عن ابن عمر انه' قال راى رسول الله صلى الله عليه وسلم نخامة فى قبلة المسجد وهو يصلى بين يدى الناس فحتها ثم قال حين انصرف ان احدكم اذاكان فى الصلوٰة فان الله قبل وجهه فلايتخمن احد قبل وجهه فى الصلوٰة رواه موسى بن عقبة و ابن ابى رواد عن نافع

۷۱۵: حدثنا يحيى بن بكير قال حدثنا الليث عن عقيل عن ابن شهاب قال اخبرنى انس بن مالک قال بينما المسلمون فى صلوٰة الفجر لم يفجاهم الارسول الله صلے الله عليه وسلم كشف ستر حجرة عآئشة فنظر اليهم وهم صفوف فتبسم يضحک و نكص ابوبكر علىٰ عقبيه ليصل له الصف فظن انه' يريد الخروج وهم المسلمون ان يفتتنوا فى صلوتهم فاشار اليهم اتموا صلواتكم وارخى الستر وتوفى من اٰخر ذٰلک اليوم

ترجمہ ۷۱۴:۔ حضرت ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے مسجد کے قبلہ (کی جانب) میں کچھ تھوک دیکھا۔ اس وقت آپ لوگوں کے آگے (کھڑے ہوئے) نماز پڑھ رہے تھے، آپ نے اس کو چھیل ڈالا۔ اس کے بعد جب (نماز سے) فارغ ہوئے تو فرمایا کہ جب کوئی شخص نماز میں ہوتو (یہ خیال کرے کہ) اللہ اس کے سامنے ہے لہٰذا کوئی شخص اپنے منہ کے سامنے نہ تھوکے۔ اس کو موسیٰ بن عقبہ، اور ابن ابی رواد نے نافع سے روایت کیا:۔

ترجمہ ۷۱۵:۔ حضرت انس مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) مسلمان نماز فجر میں (مشغول) تھے، کہ یکایک رسول خدا ﷺ سامنے آ گئے، آپ نے حضرت عائشہؓ کے حجرے کا پردہ اٹھایا، اور مسلمانوں کی طرف دیکھا، اس وقت وہ صف بستہ تھے، پس آپ مسرت کے سبب سے مسکرانے لگے، ابوبکرؓ اپنے پچھلے پیروں ہٹنے لگے، تاکہ آپ کے لئے (امامت کی جگہ خالی کردیں، اور خود) صف میں شامل ہو جائیں، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ آپ باہر تشریف لانا چاہتے ہیں، اور مسلمانوں نے (خوشی کے باعث) یہ قصد کیا، کہ اپنی نمازوں کو توڑ دیں، مگر آپ نے انھیں اشارہ فرمایا کہ تم اپنی نمازوں کو پورا کرلو اور آپ نے پردہ ڈال دیا، اور اسی دن کے آخر میں آپ نے وفات پائی۔

تشریح:۔اس باب میں امام بخاریؒ نے یہ ثابت کیا کہ نماز کی حالت میں کوئی خاص بات نئی پیش آجائے تو اس کی رعایت بھی نماز کی حالت میں کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی عمل منافی صلوٰۃ نہ کرنا پڑے جیسا کہ ترجمۃ الباب میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے امامت صلوٰۃ کی حالت میں خلاف توقع حضور علیہ السلام کو مسجد میں نماز کی شرکت کے لئے آتے ہوئے دیکھا تو اس طرف توجہ کی۔ حدیث ص ۱۵ا ے میں بھی اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، لیکن حدیث ص ۱۴ا ے جو امام بخاری یہاں لائے ہیں وہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ وهو يصلى کی وجہ سے یہ سمجھ کر لائے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے نماز کے اندر تھوک کو دیوار قبلہ سے ہٹایا ہے، حالانکہ بظاہر واقعہ ایسا نہیں ہے، اور حافظ و عینی نے بھی لکھا کہ روایت الباب بخاری کی ترکیب وترتیب جمل سے ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے جو بخاری نے سمجھا ہے، مگر امام بخاری خود ہی ابواب قبلہ میں باب حک البزاق کے اندر ص ۵۸ میں حضرت مالک بن انسؓ، حضرت عائشہ حضرت ابوہریرہ وابوسعید خدری اور حضرت انسؓ کی روایات لا چکے ہیں۔ جن میں سے کسی ایک میں بھی نماز کا ذکر نہیں ہے، اس لئے بظاہر حضور علیہ السلام نے نماز میں نہیں بلکہ خارج صلوٰۃ ہی ایسا عمل فرمایا تھا۔ پھر بقول حضرت شاہ صاحبؒ راویوں کے تجوازات وتسامحات کی بات ہے کہ الفاظ کو مقدم ومؤخر کر دیتے ہیں۔ جس سے مطلب خلاف مقصود دوسرا ہو جاتا ہے اور اسی پر ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ خاص طور سے زور دیا کرتے تھے کہ سارے طرق روایت اور متون پر جب تک نظر نہ ہو مسائل کا فیصلہ نہ کرنا چاہئے۔ اور ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ جو راویوں کے سب متون کو صحیح قرار دینے کی سعی فرمایا کرتے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ ان کے اس خیال کو ہٹانے کے لئے دلائل وشواہد پیش کیا کرتے تھے، جن کو حضرتؒ بڑی توجہ سے سنتے اور اثر لیا کرتے تھے۔

درحقیقت ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی محدثانہ شان اور تحقیقی تدقیقی نظر ہمارے اکابر دیوبند میں سب سے ممتاز تھے اور ان کا طرز بحث وتحقیق اکابر متقدمین محدثین سے بہت اشبہ واقرب تھا۔ اس سے زیادہ میں کہوں تو شاید چھوٹا منہ بڑی بات سمجھی جائے گی مگر مجھے یقین ہے کہ انوارالباری کی تحقیقی محدثانہ ابحاث پڑھ کر ناظرین حقیقت کو پالیں گے۔ اور اب بھی مجھے بعض علماء وقت نے انوارالباری کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے اس قسم کے احساس ووجدان سے مطلع کیا ہے۔

لہٰذا حدیث ص ۱۴ا ے میں ترجمہ کی مطابقت فحبا کے ذریعہ نہ ہو سکے گی، اور نہ نماز کے اندر اتنا عمل کثیر درست ہوگا کہ دیوار قبلہ تک جا کر اس سے تھوک وغیرہ صاف کرے، بلکہ نماز کے بعد اس کو صاف کرے گا، جس طرح حضور علیہ السلام نے بھی خارج صلوٰۃ کیا تھا۔

البتہ اسی حدیث میں آگے یہ بھی ہے کہ اگر نماز کے اندر تھوک بلغم کا غلبہ ہو (جیسا کہ شدت زکام ونزلہ میں ہو جایا کرتا ہے تو حکم یہ ہے کہ سامنے قبلہ کی جانب نہ تھوکے بلکہ نیچے قدموں کی طرف یا کپڑے میں بلا عمل کثیر اس کو لے لے، پھر نماز کے بعد اس جگہ یا کپڑے کو صاف کرے۔ واللہ تعالےٰ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ مناجاۃ، اقبال علی اللہ، اور مواجہہ سب ایک ہی شئی یعنی تجلی ربانی کی طرف مشیر ہیں۔ یعنی حضرت حق جل ذکرہ کی خاص تجلی حالت نماز میں متوجہ ہوتی ہے، اور اسی لئے نماز مومن کے لئے ایک قسم کی معراج ہے۔ والعلم عنداللہ۔

باب وجوب القرآءة للامام والماموم فی الصلوات کلها فی الحضر والسفر و ما یجهر فیها ومایخافت

(تمام نمازوں میں خواہ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں ہوں' سری ہوں' یا جہری' امام اور مقتدی کے لئے قراءت کے واجب ہونے کا بیان)

۷۱٦: حدثنا موسیٰ قال حدثنا ابوعوانة قال حدثنا عبدالملک بن عمیر عن جابر بن سمرة قال شکیٰ اهل الکوفة سعداً الیٰ عمر فعزله' واستعمل علیهم عماراً نشکواحتیٰ ذکروآ انه' لایحسن یصلی فارسل الیه فقال یااباا سحاق ان هٰؤلاء یزعمون انک لاتحسن تصلی قال امااناوالله فانی کنت اصلی بهم صلوٰة رسول الله صلی الله علیه وسلم مااخرم عنها اصلی صلوٰة العشآء فارکدفی الاولیین واخف فی الاخریین قال ذاک الظن بک یااباسحاق فارسل معه' رجلاً اورجالاً الی الکوفة یسأل عنه اهل الکوفة ولم یدع مسجداً الاسأل عنه ویثنون علیه محروفاً حتیٰ مسجد النبی عبس فقام رجل منهم یقال له' اسامة بن قتادة یکنیٰ اباسعدة فقال اما اذنشدتنا فان سعدّ الایسیر بالسریة ولایقسم بالسویة ولایعدل فی القضیة قال سعد اماوالله لادعون بثلاث اللهم ان کان عبدک هٰذا کاذباً قام ریآءً وسمعةً فاطل عمره' واطل فقره و عرضه' بالفتن وکان بعد اذاسئل یقول شیخ کبیرمفتون اصابتنی دعوة سعد قال عبدالملک فانارایته' بعد قد سقط حاجبا علیٰ عینیه من الکبیر وانه' لیتعرض للجواری فی الطرف یغمزهن

۷۱۷: حدثنا علی بن عبدالله قال حدثنا سفیٰن حدثنا الزهری عن محمود بن الربیع عن عبادة بن الصامت ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لاصلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب

۷۱۸: حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا یحیٰ عن عبیدالله قال حدثنی سعید بن ابی سعید عن ابیه عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم دخل المسجد قدخل رجل فصلی فسلم علی النبی صلی الله علیه وسلم فردفقال ارجع نصل فانک لم تصل فرجع فصلی کماصلی ثم جاء فسلم علی النبی صلی الله علیه وسلم فقال ارجع فصل فانک لم تصل ثلاثاً فقال والذی بعثک بالحق مآ احسن غیره' فعلمنی فقال اذاقمت الی الصلوٰة فکبرثم اقرأ ما تیسر معک من القران ثم ارکع حتیٰ تطمئن راکعاً ثم ارفع حتیٰ تعتدل قآئماً ثم اسجد حتیٰ تطمئن ساجداً ثم ارفع حتیٰ تطمئن جالساً وافعل فی صلوتک کلها

ترجمہ۷۱٦: حضرت جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں کہ اہل کوفہ نے حضرت عمرؓ سے سعدؓ کی شکایت کی، تو حضرت عمرؓ نے سعدؓ کو معزول کر دیا، اور عمار کو ان لوگوں کا حاکم بنایا، ان لوگوں نے (سعد کی بہت سی) شکایتیں کیں، یہاں تک کہ بیان کیا کہ وہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے، تو حضرت عمرؓ نے ان کو بلا بھیجا، اور کہا کہ، اے ابو اسحاق! یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے، انھوں نے کہا، سنو! خدا کی قسم ان کے ساتھ میں نے ویسی نماز ادا کی ہے، جیسے حضور علیہ السلام کی نماز ہوتی تھی، چنانچہ عشا کی پہلی دو رکعتوں میں زیادہ دیر لگاتا تھا اور اخیر کی دو رکعت میں تخفیف کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے ابو اسحاق تم سے یہی امید تھی، پھر حضرت عمرؓ نے ایک شخص یا چند شخصوں کو سعدؓ کے ہمراہ کوفہ بھیجا تا کہ وہ کوفہ والوں سے سعد کی بات پوچھیں (چنانچہ وہ گئے) اور انھوں نے کوئی مسجد نہیں چھوڑی، کہ جس میں سعد کی کیفیت نہ

پوچھی ہو، اور سب لوگ ان کی عمدہ تعریف کرتے رہے یہاں تک کہ بنی عبس کی مسجد میں گئے تو ان میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا، اس کو اسامہ بن قتادہ کہتے تھے، کنیت اس کی ابوسعدہ تھی، اس نے کہا کہ سنو! جب تم نے ہمیں قسم دلائی، تو مجبور ہو کر میں کہتا ہوں کہ) سعد لشکر کے ہمراہ (جہاد کو خود) نہ جاتے تھے اور غنیمت کی تقسیم برابر نہ کرتے تھے اور فیصلہ میں انصاف نہ کرتے تھے سعد (یہ سن کر) کہنے لگے کہ دیکھو میں تین بد دعائیں تجھ کو دیتا ہوں اے اللہ! اگر یہ تیرا بندہ جھوٹا ہو، نمود و نمائش کے لئے (اس وقت) کھڑا ہوا ہو، تو اس کی عمر بڑھا دے، اور اس کو فقر میں مبتلا کر، اور اس کو فتنوں میں مبتلا کر دے (چنانچہ ایسا ہی ہوا) اور اس کے بعد جب اس سے (اس کا حال) پوچھا جاتا تھا، تو کہتا کہ ایک بڑی عمر والا بوڑھا ہوں، فتنوں میں مبتلا، مجھے سعد کی بد دعا لگ گئی، عبدالملک (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے اس کو اب دیکھا ہے، اس کی دونوں ابرو اس کی آنکھوں پر بڑھاپے کے سبب سے جھک پڑی ہیں، وہ راستوں میں لڑکیوں کو چھیڑتا ہے، ان پر دست درازی کرتا ہے۔

ترجمہ ۷۱۷: حضرت عبادہ ابن صامتؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔

ترجمہ ۷۱۸:۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ (ایک مرتبہ) مسجد میں تشریف لے گئے، اسی وقت ایک شخص آیا، اور اس نے نماز پڑھی، اس کے بعد نبی کریم ﷺ کو سلام کیا، آپ نے (سلام کا) جواب دیا، اور فرمایا، کہ جا نماز پڑھ، کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی، وہ لوٹ گیا اور اس نے نماز پڑھی، جیسے کہ اس نے (پہلے) پڑھی تھی، اور نبی کریم ﷺ کو سلام کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جا نماز پڑھ، کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی (اسی طرح) تین مرتبہ (ہوا) تب وہ بولا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اس سے بہتر ادا نہیں کر سکتا، لہٰذا آپ مجھے تعلیم کر دیجئے، آپ نے فرمایا کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تکبیر کہو، اس کے بعد جتنا قرآن تم کو یاد ہو، اس کو پڑھو، پھر رکوع کرو، یہاں تک کہ رکوع میں اطمینان سے ہو جاؤ، پھر سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ، پھر سجدہ کرو، یہاں تک کہ سجدہ میں اطمینان سے ہو جاؤ، پھر سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ، اور اپنی پوری نماز میں اسی طرح کرو:

تشریح: قراءت خلف الامام کا مسئلہ زمانہ قدیم سے ہی زیر بحث اور معرکۃ الآراء رہا ہے، اور سب سے پہلے امام بخاری نے اس موضوع پر مستقل رسالہ "قراءۃ خلف الامام" لکھا جو جزء القراءۃ کے نام سے زیادہ مشہور ہوا، اور وہ رسالہ طبع شدہ ہے، ہمارے سامنے بھی ہے، اس کے بعد علماء شافعیہ نے بھی رسائل لکھے، جن میں امام بیہقیؒ کا رسالہ "کتاب القراءۃ" بہت مشہور ہے، اعلاء السنن وغیرہ میں غلطی سے بہ کثرت مواضع میں جزء القراءۃ للبیہقی درج ہو گیا ہے، جبکہ جزء القراءۃ کا انتساب امام بخاریؒ کی طرف اور کتاب القراءۃ کا بیہقی کی طرف معروف و مشہور ہے۔

واضح ہو کہ امام بخاری اور ابن حزم کے علاوہ کسی نے بھی قراءۃ خلف الامام کے وجوب و فرضیت کے لئے اثبات و تشدد کا مظاہرہ نہیں کیا ہے اور ان دونوں کے سوا کوئی بھی متقدمین و متاخرین کبار امت میں سے امام کے پیچھے جہری نماز میں وجوب قراءۃ کا قائل نہیں ہوا ہے۔ اور امام شافعیؒ کی طرف جو اس کی نسبت کی گئی ہے، وہ بھی تحقیق سے غلط ثابت ہوئی ہے، جس کو ہم واضح کریں گے۔

محدثین متقدمین اور مسئلہ قراءت خلف الامام

محدثین متقدمین میں سے ائمہ حنفیہ و امام مالک و احمدؒ سے تو اس لئے بھی وجوب کی نقل نہیں ہے، کہ وہ بھی وجوب کے قائل نہ تھے، محدث کبیر امام ابن ابی شیبہؒ اپنے مصنف میں پہلے باب "من رخص فی القراءۃ خلف الامام" قائم کر کے ۲۱۔ آثار ذکر کئے، جن میں وہ زیادہ ہیں جن سے قراءۃ فاتحہ خلف الامام کا ثبوت مطلقاً ہے، جہری نماز کی صراحت نہیں ہے، اور سری میں جواز سے منکر کوئی بھی نہیں ہے۔ اور وجوب و فرضیت کا ثبوت بھی کسی اثر سے نہیں ہوتا، اس کے بعد دوسرا باب انھوں نے "من کرہ القراءۃ خلف الامام" قائم کر کے ۲۶۔ آثار ذکر کئے ہیں، جن سے امام کے پیچھے قراءت کرنے کی ناپسندگی ملتی ہے یا کہ امام کی قراءۃ مقتدی کے لئے کافی ہے۔

امام ترمذیؒ نے بھی شافعی المذہب ہونے کے باوجود باب القراءۃ خلف الامام کے بعد دوسرا باب ترک القراءۃ کا بھی ذکر کیا، علامہ ابن کثیر شافعی نے اپنی تفسیر میں لکھا کہ مقتدی کا امام کی فاتحہ پر آمین کہنا ہی اس کے لئے قراءت فاتحہ کے قائم مقام ہے غرض شافعیہ کی طرف سے بھی اس معاملہ میں امام بخاری کی طرح شدت نہ تھی، لیکن تقریباً دوسو سال سے جب سے کہ غیر مقلدین نے تقلید وائمہ مجتہدین کے خلاف جھنڈا اٹھایا تو اس قسم کے مسائل کو عوام میں شائع کر کے ان کو مسلک سلف و جمہور سے متنفر بنانے کا محبوب مشغلہ اختیار کیا ہے۔

غیر مقلدین اور حنفیہ

چونکہ ہندوستان میں ہمیشہ حنفی مسلک ہی کی سیادت رہی ہے، اس لئے خاص طور سے اسی کے خلاف پروپیگنڈہ کیا گیا اور قراءۃ فاتحة خلف الامام کے مسئلہ پر بھی مستقل رسائل لکھ کر شائع کرائے، اور عوام کو حنفی مذہب سے بدظن کرنے کی مہم چلائی گئی۔ اسی لئے اکابر حنفیہ کو بھی جواب دہی کرنی پڑی۔

حضرت الشیخ المحقق محمد ہاشم سندی م ۱۱۷۶ھ "تنقیح الکلام" لکھی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ م ۱۲۹۷ھ نے توثیق الکلام لکھی، حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری م ۱۲۹۷ھ (محشی بخاری) نے الدلیل القوی لکھی، حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی م ۱۳۰۴ھ نے امام الکلام اور غیث الغمام لکھی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی م ۱۳۲۳ھ نے ہدایۃ المعتدی لکھی۔ اور آخر میں ہمارے حضرت علامہ کشمیریؒ نے خاتمۃ الخطاب اور فصل الخطاب دو رسالے لکھے، اور اس سلسلہ میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ مولف اعلاء السنن کا رسالہ فاتحۃ الکلام، اور حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صفدر دام ظلہم کا رسالہ احسن الکلام بھی دو حصوں میں اعلیٰ علمی و حدیثی تحقیقات اور مسکت جوابات پر مشتمل ہے۔ جزاهم الله خير الجزاء

تفصیل مذاہب: مجموعی اعتبار سے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جمہور ائمہ کا عدم وجوب قراءۃ خلف الامام پر اتفاق ہے، جبکہ صرف امام بخاریؒ و ابن حزم وجوب پر مصر ہیں۔ دیگر تفصیل ملاحظہ ہو:۔ اوجز ص ۱/۲۳۹ میں ہے کہ تمام ائمہ حنفیہ ابن وہب مالکی، اشہب، اوزاعی (فی روایۃ) ثوری، امام احمد (فی روایۃ) ابن المسیب و دیگر تابعین اور عروہ ابن زبیر، سعید ابن جبیر، زہری، شعبی، نخعی، ابن ابی لیلیٰ، حسن بن حی یہ سب جہری و سری دونوں نمازوں میں امام کے پیچھے عدم قراءت کے قائل ہیں۔ امام مالک جہری میں عدم قراءت اور سری میں استحباب قراءۃ کے قائل ہیں، تاکہ مقتدی کا ذہن غیر اللہ کی طرف نہ جائے جہری میں اگر کوئی قراءۃ کر لے تو نماز باطل نہ ہوگی، امام شافعیؒ سے روایت ہے کہ باطل ہو جائے گی۔ امام احمد سے ایک روایت ہے کہ اگر امام کی آواز سننے میں نہ آرہی ہو تو پڑھ سکتا ہے، امام شافعی کے نزدیک سری و جہری دونوں میں وجوب قراءۃ کا قول مشہور ہو گیا (لیکن یہ غلط ہے، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی)

شیخ محی الدین بن العربی (شیخ اکبر) کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ گو وہ ظاہری تھے، مگر قراءۃ خلف الامام کے مسئلہ میں امام اعظم وغیرہ کے ساتھ ہیں کیونکہ وہ فرماتے ہیں امام اللہ ہے اس کا کلام پڑھا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس کے پیچھے قراءت کیسی؟

حضرت شاہ صاحبؒ کے بعض امالی میں بھی یہی بات ذکر ہوئی ہے کہ امام شافعی کا قول قدیم مثل امام ابوحنیفہؒ مالک واحمد جہری میں عدم وجوب تھا اور اسی پر وہ پچاس سال کی عمر تک رہے، آخر میں جب مصر گئے تو وہاں قراءت کے قائل ہو گئے، پھر نہیں معلوم کہ وجوب کے قائل ہوئے یا صرف استحباب کے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ان کے زمانہ مصر کی کتاب "کتاب الام" ہے جو آخری عمر کی ہے، اور اس کے ص ۱/۸۹ میں ہے کہ ترک قراءت میں عمد و خطا برابر ہے، کیونکہ بغیر فاتحہ کے نماز درست نہ ہوگی، مگر مقتدی کا حکم آگے آئے گا، پھر ص ۱/۹۳ میں ہے کہ منفرد اور امام پر فاتحہ پڑھنا واجب ہے اور مقتدی کا حکم آگے بیان کروں گا، پھر آگے کئی جلدوں میں اس کا بیان نہیں ہے، جس کی وجہ سے مؤلفین نے عدم ذکر د

نسیان وغیرہ کا فیصلہ کیا ہے مگر ساتویں آخری جلد کے ص ۱۵۳ میں امام شافعیؒ کی یہ وضاحت ملتی ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ جس نماز میں امام ایسی قراءت کررہا ہو جو سنی نہ جاتی ہو تو مقتدی اس کے پیچھے قراءت کرلے یعنی امام کے جہر کی صورت میں اگر آواز سنی جارہی ہو تو مقتدی کو قراءت کی اجازت بھی نہیں وجوب تو درکنار رہا اور یہ بعینہ وہی مذہب ہے جو امام احمد سے دوسری روایت میں اوپر بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد امام شافعی کہتے ہیں کہ "امام کے سکتوں کی حالت میں فاتحہ پڑھے" تو، امام پر ایسے بڑے سکتے کا وجوب ماننا پڑے گا، جس میں مقتدی فاتحہ پڑھ سکے اور اس کا ثبوت شارع علیہ السلام سے نہیں ہوسکا۔

علامہ ابن تیمیہ نے فتاوی ص ۲/۱۴۹ اور تنوع العبادات ص ۸۷ میں صراحت کی کہ "امام کی جہری نماز میں مقتدی کے لئے فاتحہ کا وجوب قول شاذ ہے، حتی کہ امام احمدؒ نے اس کے خلاف پر اجماع نقل کیا ہے۔" اگر ان کے نزدیک امام شافعیؒ کا وجوب کا قول صحیح ہوتا تو اس کو شاذ ایسے لفظ سے تعبیر نہ کرتے، البتہ اس سے اشارہ امام بخاری وابن حزم ظاہری کی طرف ہوسکتا ہے۔

ارشاد امام احمد: امام ترمذی نے امام احمدؒ کا قول نقل کیا کہ حدیث نبوی" **لاصلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب** "کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی تنہا ہو تو اس کی نماز بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی، پھر امام احمد نے حضرت جابرؓ کا قول پیش کیا جس میں ہے کہ جو شخص نماز کی کوئی رکعت بغیر قراءت فاتحہ پڑھے تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو، اور اس کو پیش کرکے امام احمد نے فرمایا کہ دیکھو یہ صحابی رسول ہے جس نے حدیث نبوی کا وہی مطلب لیا جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ وہ تنہا نماز والے کے لئے ہے۔ ترمذی (باب ترک القراءة خلف الامام)

اس کے بعد ترمذی نے لکھا کہ امام احمد باوجود اس کے بھی قراءۃ خلف الامام کے قائل تھے، لیکن یہ مطلق طریقہ سے غلط ہے، کیونکہ وہ تو صرف سری میں جواز کے قائل تھے اور جہری میں صرف اس وقت کہ امام کی قراءت کی آواز نہ سنے، اور بڑا اختلافی نقطہ صرف جہری میں ہے، اور سری کا معاملہ تو اور بھی زیادہ اہون ہے۔

جو بات اوپر امام احمد سے امام ترمذی نے نقل کی ہے، وہی ایک راوی حدیث سفیان بن عیینہ "**لاصلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب فصاعداً**" نے کہی کہ یہ حکم نبوی تنہا نماز والے کے لئے ہے (ابوداؤد ص ۱/۱۱۹ باب ترک القراءة) اور محدث اسمٰعیلی نے بھی یہی کہا ہے (عمدہ ص ۳/۶۹) غرض ان تینوں جلیل القدر محدثین نے وہ فیصلہ دیا جو امام بخاری وابن حزم کے اطلاقی وعمومی فیصلہ کے خلاف ہے۔

مغنی ابن قدامہ میں ہے کہ امام احمدؒ نے فرمایا:۔ اس امر پر اجماع ہے کہ آیت استماع وانصات نماز کے بارے میں اتری ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ مقتدی پر خالت جہر میں امام کے پیچھے قراءت کرنا واجب نہیں، اور یہ بھی امام احمدؒ نے فرمایا کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کے بارے میں نہیں سنا کہ وہ یہ کہتا ہو کہ جہر امام کی صورت میں مقتدی کی نماز بلا قراءت کے نہ ہوگی، پھر فرمایا کہ یہ نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس ہے، اور آپ کے سارے صحابہ وتابعین ہیں، اور حجاز کے امام مالک، عراق کے ثوری، شام کے اوزاعی، مصر کے لیث ہیں، ان میں سے کسی نے بھی ایسے شخص کی نماز کو باطل نہیں قرار دیا جس نے اپنے قاری امام کے پیچھے قراءت نہ کی ہو۔ (مغنی لابن قدامہ ص ۱/۲۰۲) (فتح الملہم ص ۲/۲۱)

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ جن احادیث سے مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے واجب وفرض بتایا جاتا ہے وہ امام احمد کے نزدیک صحیح نہیں ہیں اور جو صحیح ہیں وہ منفرد اور امام کے حق میں ہیں۔ مقتدی کے بارے میں نہیں ہیں۔ طرفین کی پیش کردہ احادیث پر جو تفصیلی بحث وانظار اکابر امت نے کی ہے، اس سے بھی امام احمد کے ارشاد کی صحت ثابت ہوتی ہے۔

امام شافعی جمہور کے ساتھ ہیں:۔ اس سے ثابت ہوا کہ امام احمدؒ کے نزدیک امام شافعیؒ بھی آخر تک کسی وقت بھی وجوب قراءۃ فاتحہ خلف الامام کے قائل نہیں ہوئے، امام احمدؒ کا امام شافعیؒ سے بہت ہی قریبی تعلق تھا اور وہ ان کے مذہب سے بھی پوری طرح واقف تھے، اور آپ کی وفات بھی امام شافعی سے ۳۷ سال بعد ہوئی ہے گویا امام احمدؒ کے وقت تک کوئی بھی ایسی قابل ذکر ہستی نہیں تھی، جو اجماع کے خلاف وجوب فاتحہ

خلف الامام کی قائل ہو، لہٰذا امام شافعی کا جو جدید مذہب وجوب کا مشہور کیا گیا، وہ صحیح نہیں تھا، اور یہ مغالطہ صرف اس لئے کچھ بڑوں کو ہوا تھا کہ انھوں نے امام شافعی کی کتاب الام کو قدیم کتابوں میں سے سمجھ لیا تھا۔ پھر بعد والے بھی پہلوؤں کی وجہ سے مغالطہ میں پڑ گئے۔ واللہ تعالے اعلم۔

محترم علامہ ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صاحب صفدر عم فیضہم نے لکھا کہ اصل غلطی امام الحرمین جوینی شافعی م ۴۷۸ھ (استاذ امام غزالی شافعی م ۵۰۵ھ) سے ہوئی کہ انھوں نے کتاب الام کو امام کی کتب قدیمہ میں سے سمجھ لیا۔ پھر دوسرے علماء بھی ان کی وجہ سے مغالطہ میں پڑ گئے، اور نتیجہ میں امام شافعیؒ کا مسلک بھی غلط طور سے نقل ہونے لگا۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ ص ۲۵۲/۱۰ میں یہی بات لکھی ہے، اور علامہ سیوطیؒ نے بھی حسن المحاضرہ ص ۱۲۲/۱ میں کتاب الام کو امام شافعیؒ کے زمانۂ قیام مصر کی تالیف قرار دیا ہے، لہٰذا یہ پوری طرح ثابت ہو گیا کہ فاتحہ خلف الامام کا ترک امام شافعی کا قول جدید ہے قدیم نہیں۔ (احسن الکلام ص ۱/۱۱)

علامہ بنوریؒ نے بھی معارف السنن ص ۱۸۵/۳ میں لکھا کہ امام شافعی کے قول قدیم و قول جدید دونوں سے مقتدی کے لئے عدم جواز فاتحہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ الاملاء بھی بقول نوویؒ امام کی جدید تصانیف میں سے ہے، اور اس میں بھی ترک فاتحہ ہی ہے۔

علامہ بنوریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مجھے کتاب الام میں مقتدی کا حکم نہیں ملا، اس لئے کہ موصوف کا ذہن جلد سابع کی طرف نہیں گیا ہوگا لیکن اس بات پر حیرت ہے کہ صاحب المہذب نے ''الام'' کے حوالہ سے امام شافعی کی طرف وجوب کیسے منسوب کر دیا؟!

غیر مقلدین کا زعم باطل

اوپر کی تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ موجودہ دور کے اہل حدیث حضرات (غیر مقلدین) جو یہ کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے اگر مقتدی نے فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز باطل اور کالعدم ہوگی، جن کے جواب میں احسن الکلام وغیرہ لکھی گئی ہیں، یہ ان کا دعوے بقول امام احمد کے سراسر غلط اور ناقابل قبول ہے، اور اگر ان کو اس دعوے کی صداقت کے لئے کوئی تائید مل سکتی ہے تو ساری امت میں سے صرف امام بخاری اور ابن حزم سے، اور ان کے دلائل کا رد پہلے بھی ہو چکا ہے اور مختصراً ہم بھی یہاں کریں گے۔ ان شاء اللہ

امام بخاریؒ کا دعوے اور دلیل

آپ نے باب قائم کیا کہ ''ساری نمازوں کے اندر خواہ وہ حضر کی ہوں یا سفر کی اور خواہ وہ جہری ہوں یا سری، امام اور مقتدی دونوں پر قراءت کرنا واجب ہے'' اسی طرح ابن حزم نے اپنی ''محلی'' میں دعوے کیا ''سورۂ فاتحہ کی قراءت ہر نماز کی ہر رکعت میں فرض ہے، امام پر بھی اور مقتدی پر بھی، اور اس حکم میں فرض و نفل اور مرد و عورت سب برابر ہیں۔'' (انوار المحمود ص ۲۹۸/۱)

احادیث بخاری: یہاں چونکہ ہم شرح بخاری کر رہے ہیں اس لئے عرض ہے کہ امام بخاری نے اپنے اتنے بڑے دعوے پر دلیل کیا دی ہے، ملاحظہ ہو، پہلی حدیث الباب میں حضرت سعد کے بارے میں اہل کوفہ کی شکایت کا بیان ہے، اس میں حضرت سعد کی قراءت کا بیان ہے، مقتدی کا کچھ نہیں، پھر دعوے سے دلیل کی مطابقت کیا ہوئی؟ دوسری میں ضرور حضرت عبادہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوتی، اور یہ سب کو تسلیم ہے کہ امام و منفرد پر سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، اور مقتدی پر جہری نماز میں کسی کے نزدیک بھی واجب نہیں، اور حسب تحقیق امام احمد، سفیان بن عیینہ و زہری حدیث مذکور کا تعلق صرف امام و منفرد سے ہے۔ مقتدی کو اس حکم میں اس لئے داخل نہیں کیا کہ حضرت جابر بن عبداللہ صحابی سے مرفوعاً و موقوفاً دونوں طرح سے یہ حدیث ثابت ہوئی کہ جو شخص کسی رکعت میں فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہ ہوگی، الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو، (موطا امام مالک۔ ترمذی، طحاوی)

احادیث جزءالقراءۃ

اصل صورت یہ ہے کہ امام بخاری اپنی شرط بخاری سے مجبوری کے باعث یہاں حضرت عبادہ کی محمد بن اسحٰق والی روایت کی پیش نہیں کر سکے اور درحقیقت ان کا مقصد اسی سے حاصل ہو سکتا ہے، کیونکہ اس میں امام کے پیچھے بھی قراءۃ فاتحہ کی گنجائش نکلتی ہے اگر چہ وجوب تو پھر بھی نہیں نکلتا۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے پہلے تو امام کے پیچھے قراءت کرنے والوں کو روکا اور ان کے اس عمل پر ناپسندیدگی ظاہر فرمائی، پھر یہ بھی فرمایا کہ اگر تمہیں قراءت کرنی ہی ہے تو فاتحہ پڑھ سکتے ہو، لیکن چونکہ یہ روایت محمد بن اسحٰق کے واسطہ سے ہے اور وہ بہت ضعیف و مجروح راوی ہیں اس لئے وہ روایت صحیح بخاری کے لئے موزوں نہ تھی، اور امام ترمذی نے بھی حضرت عبادہ کی دونوں روایت نقل کر کے دوسری روایت زہری کو محمد بن اسحٰق والی روایت سے اصح بتلایا ہے اگر چہ امام ترمذی سے یہ غلطی بھی ہوگئی کہ آگے انھوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ امام مالک و ابن مبارک وشافعی واحمد واسحاق کا مذہب بھی خلف الامام قراءت کرنے کا ہے، حالانکہ یہ خلاف واقع ہے، کیونکہ امام مالک جہری میں قراءۃ خلف الامام سے منع کرتے ہیں (موطا ص ۲۸ باب القراءۃ خلف الامام فیما لا یجهر فیه بالقراءۃ) قید لگادی عدم جہر کی۔ اور مدونہ مالکیہ ص ۷۰/۱ میں یہ بھی ہے کہ وہ سریہ میں وجوب کے قائل نہ تھے، ابن مبارک بھی جہریہ میں قراءت کے قائل نہ تھے، اور خود امام بخاری نے جزءالقراءۃ میں ان کا مذہب بھی خارج میں مخالفت کا ہی ثابت ہو چکا ہے، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے کتاب الآثار کی تعلیقات میں ان کا مذہب فقط سریہ میں قراءۃ کا ذکر کیا ہے۔ امام احمد کی مخالفت کا ذکر خود ترمذی کے حوالہ سے بھی آچکا ہے۔ محمد بن اسحٰق کا مذہب بھی خارج میں مخالفت کا ہی ثابت ہو چکا ہے، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے کتاب الآثار کی تعلیقات میں ان کا مذہب امام مالک سے موافق نقل کیا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں امام ترمذی سے نقل مذہب میں تسامح ہوگیا ہے، الا یہ کہ ان حضرات سے فی الجملہ کسی نہ کسی درجہ میں قراءت فاتحہ خلف الامام کا ثبوت مان لیا جائے، مثلاً سریہ میں جواز یا استحباب فاتحہ، یا سکتات میں۔

غرض امام بخاری یہاں تو عبادہ والی روایت ابن اسحٰق والی لا نہیں سکے۔ مگر اس کو اپنے رسالہ جزءالقراءۃ میں بڑے زور شور سے لائے ہیں اور محمد بن اسحٰق جیسے ضعیف و مجروح راوی کی توثیق کی بھی سعی مشکور فرمادی ہے جو امام بخاری کی جلالت قدر سے مستبعد تھی، مگر ان کو تو اپنی ایک الگ اجتہادی رائے کو ثابت کرنا تھا، وہ کر گئے۔

امام بخاری کی تیسری حدیث الباب سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے نماز میں کچھ حصہ قرآن مجید کا پڑھنے کا حکم دیا جتنا بھی آسان ہو، اور وہ بھی ایک منفرد آدمی کے لئے، اس سے امام کی اقتدا میں قراءت کرنے کا اور وہ بھی قراءت فاتحہ کا ثبوت کیونکر ہو گیا، جس کے لئے ساری کوششیں اپنے رسالہ میں کی ہیں، لیکن امام بخاری ماشاءاللہ نہایت ذہین و زیرک اور متیقظ ہیں، انھوں نے یہاں بخاری کے ترجمۃ الباب میں خود ام الکتاب کا ذکر نہیں کیا، اس کو اپنے دل میں ہی رکھا، اور قراءۃ کا لفظ لائے، جس کی مطابقت تیسری حدیث سے ہوگئی۔

لمحہ فکریہ: بخاری ص ۱۰۴ کے حاشیہ ص ۹ میں جو شافعیہ کو اس مسئلہ میں مقابل ٹھیرا کر جواب دہی کی گئی ہے، وہ بے محل ہے، جیسے کہ بات پوری طرح منقح ہوگئی ہے، فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں ہمارے مقابل سابقین میں سے قابل ذکر صرف امام بخاری و ابن حزم ظاہری ہیں (اور ہم نے ثابت کیا تھا اور آگے بھی واضح کریں گے ان شاءاللہ کہ امام بخاری بھی ظاہری ہیں) ان کے بعد اس زمانہ کے اہل حدیث (غیر مقلدین) ہیں، جن کا کام صرف مغالطے دینا اور سب ائمہ کرنا اور تفریق کلمہ مسلمین ہے۔ اللہ یرحمنا وایاهم

ارشاد انور: حضرتؒ نے اس موقع پر درس بخاری شریف میں فرمایا تھا کہ امام بخاری نے اپنے رسالہ جزءالقراءۃ میں کچی پکی حدیثیں ذکر کی ہیں اور سخت کلامی کی ہے اور بعض چیزیں غلط بھی ہیں، مثلاً یہ کہ رکوع میں شامل ہونے والے کو رکعت نہیں ملی، حالانکہ یہ کسی کا بھی مذہب نہیں ہے، اور صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے ادراکِ رکعت وادراک الرکوع پر۔ پھر فرمایا کہ سری نماز میں حنفیہ سے استحباب ہے (کمافی الهدایہ عن الامام محمدؒ) اور شیخ

ابن الہمام نے انکار کر دیا کہ موطأ اور کتاب الآثار میں نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ قول ہدایہ کا ہی درست ہے، کیونکہ اول تو ان دونوں کتابوں پر حصر نہیں ہے، دوسرے یہ ضروری نہیں ہے، کہ ہر بات کتابوں میں بھی ہو، بلکہ محض شہرت ونقل بھی کافی ہے۔ اس کے بعد حضرت نے اپنے رسالہ فصل الخطاب میں سے پڑھ کر سنایا، یہ بھی فرمایا کہ پانچویں صدی کے ہیں (م ۴۸۰ھ) باقی تفصیل فصل ص ۹۴ میں دیکھی جائے۔

پھر فرمایا کہ شیخ ابن الہمام نے سری وجہری میں قراءت کو مکروہ تحریمی کہہ دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت میں انفصال ہے یعنی دونوں کا حکم الگ الگ ہے، اور سری میں مکروہ نہیں ہے نہ تنزیہی نہ تحریمی۔ پس قول ابن الہمام جس پر آج کل کے حنفیہ چل رہے ہیں بمقابلہ قول سلف جس کا حوالہ میرے رسالہ میں ہے۔ میرے نزدیک مرجوح ہے۔ اور مقتدی کے مسئلہ میں جمہور حنفیہ کے ساتھ ہیں۔

تعامل صحابہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ آثار صحابہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نے قراءۃ خلف الامام کو بالکلیہ ترک کیا ہے، اور بعض نے جہری نماز میں ترک کیا ہے اور بعض نے کبھی جہریہ میں قراءت کی اجازت دی ہے اور کبھی نہیں دی جیسے حضرت عمر وابو ہریرہ نے۔ بعض نے اس کو مؤکد طریقہ سے مستحب سمجھا جیسے حضرت عبادہ نے، بعض نے سکتات کے اندر اس کی اجازت دی، اور وہ تو بہت ہی کم ہیں جنھوں نے جہریہ میں اس کو واجب قرار دیا ہو یا مؤکد سمجھا ہو جیسے مکحول نے (ابوداؤد) حاصل یہ کہ سب سے کم تو وہ ہیں جو جہری میں امام کے پیچھے قراءت کرتے تھے، ان سے کچھ زیادہ وہ تھے جو سکتات میں پڑھتے تھے پھر ان سے بھی زیادہ وہ تھے جو سریہ میں پڑھتے تھے، جہریہ میں نہیں پڑھتے تھے، یہی سب سے زیادہ تھے، اور کچھ وہ بھی تھے جو کبھی سریہ میں پڑھتے اور کبھی ترک کرتے تھے۔ (فصل الخطاب ص ۳ وغیرہ)

ذکر احادیث: فرمایا کہ احادیث مرفوعہ میں سے کسی سے وجوب قراءۃ خلاف الامام ثابت نہیں ہوتا، نہ جہریہ میں نہ سریہ میں۔ اور صحابہ سے بھی صرف کسی ایک جانب کی ترجیح ہی ثابت ہو سکتی ہے، پھر یہ کہ شارع علیہ السلام کی جانب سے ابتدائی واصولی طور سے مقتدی کے حق میں نہ قراءت فاتحہ کی تشریع ہوئی ہے نہ کسی سورت کے پڑھنے کی، نہ جہریہ کے اندر نہ سریہ میں۔ بلکہ جب بعض صحابہ کی طرف سے قراءت خلف الامام ظاہر ہوئی تو حضور علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا، گویا آپ اس سے پہلے ان کی قراءت کی طرف سے خالی الذہن تھے، اور جب ان میں سے کسی نے آپ کے پیچھے قراءت کی تو آپ کو نماز کے اندر ہی اس سے خلجان پیش آیا، اور ذہن مبارک میں الجھن پیدا ہوئی (کیونکہ خود آپ کے ارشاد سے ہی ثابت ہے کہ آپ پر آپ کے مقتدیوں کی ہر حرکت روشن ہوتی تھی حتی کہ ان کا قلبی خشوع وخضوع بھی، بخاری ص ۱۰۲ میں بھی حدیث گذری ہے کہ (واللہ ما یخفی علی رکوعکم ولا خشوعکم و انی اراکم من وراء ظهری) پھر ظاہر ہے کہ جس مقتدی صحابی نے آپ کی قراءت کے ساتھ ساتھ قراءت کی ہوگی خواہ سری نماز میں یا جہری میں تو اس سے آپ کی خلش وخلجان ذہنی آپ کے لئے فطری امر تھی۔

سؤال کی شان: اسی لئے آپ نے نماز کے بعد سوال فرمایا کہ کس نے میرے پیچھے نماز کے اندر قراءت کی ہے؟

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کو بہت زیادہ اور خاص اہتمام صرف فاتحہ پڑھنے کا نہ تھا، چنانچہ آتا ہے کہ ایک صحابی نے آپ کی اقتداء کر کے سورۂ سبح اسم ربک الاعلی پڑھی اور بعض نے تشہد پڑھا، گویا خود ہی انھوں نے جو کچھ میں آیا پڑھا، حضور علیہ السلام کی طرف سے نہ فاتحہ پڑھنے کی تلقین وتشریع تھی نہ سبح اسم کی نہ تشہد کی، اور اگر منازعت کی صورت پیش نہ آتی تو سرے سے قراءت خلف الامام کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا، خصوصاً جبکہ یہ بھی ثابت ہے کہ ابتداء اسلام میں جب نماز کے اندر مقتدی بھی قراءت کیا کرتے تھے تو قرآن مجید کی آیت فاذا قرئ القرآن فاستمعوا له و انصتوا نازل ہوئی اور خاص طور سے نماز کے اندر قرآن مجید کی قراءت کے وقت اس کو کان لگا کر سننے اور خاموش رہنے کا حکم آ گیا تھا، امام احمدؒ وغیرہ اکابر امت نے تصریح کی ہے کہ آیت مذکورہ نماز کی قراءت کے بارے میں اتری ہے۔

قراءۃ سے اعتذار: غرض کہ جب حضور اکرم ﷺ[1] کے علم مبارک میں یہ بات آئی کہ اب بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو امام کے پیچھے قراءت

[1] یہ حدیث ابوداؤد باب من ترک القراءة فی صلوٰۃ میں حضرت عبادہؓ سے مروی ہے، اور نسائی میں بھی ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کرتے ہیں تو آپ نے سوال فرمایا کہ کس نے ایسا کیا؟ جواب میں کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم نے قرائۃ کی ہے مگر ہذأ کی ہے یعنی بہت تیزی سے پڑھا ہے، گویا یہ بطور اعتذار کے کہا کہ ہمارا دھیان حضور کی قراءت کی طرف سے زیادہ نہیں ہٹا، بہت ہی معمولی وقفہ لگا جس میں تیزی سے کچھ پڑھ لیا۔ (یہ سمجھ کر کہ بغیر قرائۃ کے یا بغیر فاتحہ کے نماز صحیح نہ ہوگی) حضور علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا کہ اگر تمہیں ضرور ہی پڑھنا ہے تو خیر صرف سورۂ فاتحہ پڑھنے کی اجازت ہے تو آپ کے اس طرح ارشاد فرمانے سے صرف اباحۃ مرجوحہ کی صورت نکل سکتی ہے۔

لہٰذا امام بخاریؒ وابن حزم اور آج کل کے اہل حدیث حضرات کے لئے یہی غنیمت ہے کہ اس سے اباحۃ ثابت ہوگئی، لیکن وجوب وفرضیت ممکن نہیں۔ کیونکہ سوال کی صورت ہی بتلا رہی ہے کہ شارع علیہ السلام کو اس کی اطلاع بھی نہ تھی چہ جائیکہ آپ کے حکم سے ایسا ہوا ہوتا لہٰذا نفس سوال کرنا ہی اس کی ناپسندیدگی کو ظاہر کر رہا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ اباحت مرجوحہ بھی ختم ہوگئی جیسا کہ سنن کی دوسری حدیث ابی ہریرۃؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے استنکار کے بعد فقہائے صحابہ تو سارے ہی جہری نماز میں قراءۃ خلف الامام سے رک گئے، پھر کچھ اقل قلیل رہ گئے ہوں گے۔

امر خیر محض سے روکنا: حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ یہاں ایک دوسرا نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ کسی امر خیر محض سے روکنے کا حق صرف صاحب وحی کو ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کا واقعہ آتا ہے کہ آپ نے عیدگاہ میں ایک شخص کو نفل پڑھتے دیکھا، لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ اس کو منع نہیں کرتے؟ آپ نے فرمایا:۔ میں نے رسول اکرم ﷺ کو تو یہاں نفل پڑھتے بیشک نہیں دیکھا، لیکن اس کو منع اس لئے نہیں کرتا کہ کہیں آیت کریمہ "ارأیت الذی ینھی عبداً اذا صلے" کا مصداق نہ بن جاؤں،

عورتوں کی نماز جماعت میں شرکت

اسی طرح حضور علیہ السلام نے عورتوں کو جماعت کی نمازوں میں شرکت کی رغبت نہیں دلائی تھی، تاہم ان کو اس سے روکا بھی نہیں، اور اسی لئے حضرت عمرؓ نے بھی آپ کے طریقہ کی رعایت فرمائی کہ اپنی بیوی کو جماعت مسجد میں جانے سے نہیں روکا حالانکہ آپ کو ان کا گھر سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) مگر بلا تفصیل وقصۂ مذکورہ کے، نیز نسائی نے دوسرا باب ترک قرائۃ فی الجھریہ قائم کر کے حضرت ابو ہریرۃؓ کی حدیث بھی روایت کی جس میں اسی طرح سوال فرمایا اور ایک شخص نے کہا کہ میں نے قراءۃ کی ہے تو فرمایا اسی لئے تو میں دل میں سوچ رہا تھا کہ مجھ سے قرآن مجید کیوں چھینا جا رہا ہے، حضرت ابو ہریرۃؓ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان سننے کے بعد سب لوگ جہری نمازوں میں حضور علیہ السلام کے پیچھے قراءۃ سے رک گئے۔ ابوداؤد نے بھی اس قول کو حضرت ابو ہریرۃؓ ہی کی طرف منسوب کیا ہے اور دوسرے اکابر محدثین اور علامہ ابن تیمیہ نے بھی یہی کہا ہے، مگر امام بخاری نے اس بات کو کمزور دکھلانے کے لئے جزء القراءۃ ص ۱۳ میں لکھا کہ یہ زہری کا قول ہے (حضرت ابو ہریرۃؓ کا نہیں) مزید بحث ہم آگے کریں گے جب امام بخاری کے رسالہ کی باتوں کا مکمل جواب آئے گا۔ ان شاء اللہ

المعجم المفھرس کا ذکر: یہ کتاب ۳۲ سالہ محنت وریسرچ کے بعد مستشرقین یورپ نے لیدن (ہالینڈ) سے شائع کی ہے، کاغذ طباعت ٹائپ وجلد یں بھی نہایت دیدہ زیب ہیں، سات جلدوں میں حروف تہجی سے ۹ کتب حدیث (صحاح ستہ، دارمی، موطأ مالک ومسند احمد) کے الفاظ حدیث کی نشان دہی کی ہے۔ اس ریسرچ اور طباعت وغیرہ پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ کیونکہ یورپ کے مستشرقین کی تنخواہیں بھی دس بیس ہزار روپے ماہوار فی کس سے کم کیا ہوں گی۔ مگر مراجعت کے بعد اس میں نقائص پائے گئے، مثلاً آج ہی ھذًا کی تلاش کی تو ص ۸۰/ ۷ پر ابوداؤد کے مذکورہ لفظ ھذًا کا حوالہ نہیں ہے۔ شاید ابوداؤد کے اس ھــــذًا کو ہذا ہی سمجھ لیا ہوگا۔ درحقیقت دنیاوی طمع یا دنیا کی نام ونمود کے لئے کوئی کام کرنے اور خلوص وللٰہیت کے جذبہ سے کام کرنے میں بڑا فرق ہے۔ ہمارے مولانا عبدالعزیز صاحب گوجرانوالہ کی "نبراس الساری فی اطراف البخاری" کی صحیح قدر اس معجم کو دیکھنے کے بعد ہوئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

امام بخاری کے جزء القراءۃ ص ۸ میں بھی انا لــھذًا ھذًا روایت کیا ہے، فتح الملہم ص ۲/۲۶ میں ترمذی وغیرہ کی طرف اس کی نسبت کی ہے، مگر مطبوعہ ترمذی اور دوسری کتب صحاح میں نہیں ملی بجز ابوداؤد کے۔ جس کا حوالہ حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی درس میں دیا تھا پس وہی صحیح ثابت ہوا

التاج الجامع الاصول ص ۱۵۷/۱ میں بھی سنن اربعہ کا حوالہ دیا ہے، مگر ابوداؤد کے علاوہ سنن میں نہیں ہے، البتہ مسند احمد میں ہے، ملاحظہ ہو الفتح الربانی ص ۱۹۴/۳ مگر اس میں ھذًا کی جگہ ہذا چھپ گیا ہے۔ واللہ اعلم" مؤلف"

مسجد میں جانا سخت ناپسند تھا، اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ گھر ہی میں نماز پڑھیں، مسجد نہ جایا کریں۔ اور اس بات کو ان کی زوجہ مطہرہ بھی جان چکی تھیں، لیکن ان سے کہتی تھیں کہ آپ مجھے روک دیں تو رک جاؤں گی، حضرت عمرؓ مزاج نبوی کے پوری طرح واقف اور اس کی رعایت و اتباع کرنے والے تھے، چنانچہ زبان سے روکنے سے ہچکچاتے تھے، اور زوجہ محترمہ آپ کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتی رہیں تا آنکہ حضرت عمرؓ نے یہ ترکیب کی کہ ایک روز صبح کی نماز کے لئے جب وہ اندھیرے میں مسجد نبوی جارہی تھیں، ان کے پیچھے ہو لئے، اور کہیں موقع پا کر ان کی چادر پر پاؤں رکھ دیا، اس سے وہ سمجھیں کہ کسی نے بری نیت سے ایسا کیا ہے، چنانچہ انا للہ پڑھتی ہوئی گھر لوٹ گئیں اور کہا کہ واقعی! زمانہ بہت خراب ہو گیا ہے اور حضرت عمرؓ کی رائے صحیح ہے۔

نماز اوقات مکروہہ: اسی طرح اوقات مکروہہ میں نماز پڑھنے کا مسئلہ بھی ہے کہ بعض حضرات فقہاء نے ان اوقات کی کراہت کا خیال کر کے ان اوقات میں نماز سے روک دیا ہے اور دوسرے فقہاء نے نماز ایسی خیر محض سے روکنا پسند نہ کیا اور اجازت دے دی۔

حضرتؒ نے ان مثالوں کے بعد فرمایا کہ ایسا ہی معاملہ قرآن مجید پڑھنے سے روکنے کا بھی ہے کہ وہ خیر موضوع ہے اور اس سے روکنا محل تامل وتردد ہے، اسی لئے جب کہ حضور علیہ السلام نے ان کو امام کے پیچھے قراءت کا کوئی حکم بھی نہیں دیا تھا۔ اور پھر بھی انھوں نے خود سے ہی پڑھا تو آپ اس سے راضی نہ ہوئے اور سوال وغیرہ کر کے اپنی ناپسند کا اظہار بھی فرمادیا مگر ان کو صاف طور سے روکا بھی نہیں، اور اس کا تحمل فرمالیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک قرأتہ خلف الامام (جہریہ نماز) کا مسئلہ حضور جماعات للنساء جیسا ہی ہے اور دونوں کی اباحت بھی ایک ہی درجہ کی ہے۔ پھر جس کا جی چاہے اس کو ترک کرے اور جو چاہے اس میں غلو کرے اور اس سے اقرب واشبہ فقیہ حنفی علامہ حلوانی کا فتویٰ ہے کہ عام لوگوں کو نماز سے نہ روکا جائے خواہ وہ مکروہ اوقات ہی میں پڑھیں، کیونکہ وہ اگر چہ ہمارے مذہب میں مکروہ ہے مگر شافعیہ کے مذہب میں تو جائز ہے، اور ممکن ہے کہ وہ روکنے سے نماز کو بالکل ہی ترک کر بیٹھیں، اس سے تو اچھا ہی ہے کہ اپنی نماز کراہت کے ساتھ پڑھ لیں،

میں کہتا ہوں کہ نمازوں کے بارے میں اس قسم کی سستی اور تہاون حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں نہ ہوا تھا، اس لئے ان کے لئے یہی مناسب تھا کہ اوقات کراہت میں پڑھنے سے روکیں، پھر جب مذاہب کی اشاعت ہوئی اور لوگوں کو دوسرے مذاہب کی رخصتیں بھی معلوم ہو گئیں اور یوں بھی نماز میں غفلت اور تکاسل وغیرہ ہونے لگا، اور دینی امور پر عمل میں سستی آتی گئی تو فقہاء متاخرین نے یہی مناسب خیال کیا کہ عام لوگوں کو نماز وقت مکروہ سے نہ روکیں۔ اور خوف کیا کہ کہیں زیادہ سختی کرنے پر وہ سرے سے نماز ہی ترک نہ کر دیں۔

حاصل یہ ہے کی خیر محض سے روکنے کا موقع صرف وہ ہے کی جب اس کا تحمل کسی طرح ہو ہی نہ سکے، اور اس کا حق بھی صرف شارع علیہ السلام کو ہے، دوسرے کسی کو نہیں، جیسے آپ نے رکوع وسجدے کی حالت میں قرآن مجید پڑھنے سے روک دیا، کیونکہ وہ مناجاۃ ہے، جو اس ہیئت عجز وخشوع کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔ اگر چہ امام بخاری نے اس کا خیال نہیں کیا اور اجازت دے دی۔ اور حدیث صحیح مسلم شریف کو بھی ترک کر دیا، جس میں اس کی صریح ممانعت وارد ہے۔

یہاں بھی تم کہہ سکتے ہو کہ حضور علیہ السلام نے قراءۃ خلف الامام کی اجازت مرجوحہ بادل نخواستہ مرحمت فرمائی ہے، اور چاہو یہ کہو کہ اجازت بطور عزیمت نہیں دی، اور یہ صورت ناحضرات پر زیادہ گراں نہ ہوگی، جو فاتحہ خلف الامام کے وجوب وفرضیت کے مدعی ہیں۔

موجبین کی ایک تاویل

ان لوگوں نے اس کا ایک جواب یہ دیا ہے کہ حضور علیہ السلام کا سوال فرمانا نفس قراءت سے متعلق نہ تھا بلکہ جہر سے تھا کہ آپ کے پیچھے پڑھنے والے نے بلند آواز سے قراءت کی تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ ایسی تاویل ہے جس کے لئے کوئی نقل پیش نہیں جا سکتی، پھر عقلا بھی کسی عاقل صحابی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس اکیلے نے دوسرے تمام صحابہ کو ساکت وصامت دیکھتے ہوئے بھی بلند آواز سے قراءت کردی ہو، اور اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تھا تو حضور علیہ السلام کا سوال تو جہر کے بارے میں نہیں ہوا اور نہ آپ نے اس پر کچھ نکیر فرمائی، بلکہ نفس قراءت پر ہی باز پرس فرمائی ہے پس معلوم ہوا کہ وہی آپ پر گراں گزری تھی۔

ان میں سے کچھ لوگوں نے یہ تاویل نکالی ہے کہ سؤال قراءت فاتحہ سے متعلق نہ تھا بلکہ فاتحہ کے علاوہ جو پڑھا گیا ہوگا اس کے بارے میں تھا، لہٰذا فاتحہ خلف الامام باز پرس کی اور ناپسندیدگی کی زد سے محفوظ ہے، لیکن یہ تاویل بھی باطل ہے، کیوں کہ دار قطنی کی روایت میں حضور علیہ السلام کا سؤال اس طرح مروی ہے:۔ "**هل منكم من احد يقرأ شيأ من القرآن؟**" (کیا تم میں سے کوئی شخص قرآن مجید کا کچھ حصہ میرے پیچھے پڑھتا ہے؟) ظاہر ہے کہ اس عمومی سوال سے قراءت فاتحہ بھی محفوظ نہ رہی ہوگی۔ اور سوال مطلق قراءت قرآن سے تھا، کسی خاص سورت کے بارے میں نہ تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے نزدیک کسی ایک مقتدی پر بھی وجوب شرعی نہ تھا، ورنہ یوں نہ فرماتے کہ تم میں سے کوئی قراءت کرنے والا ہے؟ بلکہ سب ہی سے یوں سوال فرماتے کہ کیا تم قراءت کرتے ہو؟ کہ وجوب کی شان یہی تھی کہ سب پڑھتا اور سب ہی آپ کے خیال میں قراءت کرتے، لہٰذا سب ہی مسئول اور سب ہی جواب دہ ہوتے، نیز معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کے پیچھے قراءت کرنا منصب اقتدا کے خلاف تھا، اسی لئے آپ نے **خلف امامكم** فرمایا، خلفی نہ فرمایا، جو محل وموقع کے منصب تھا، اس سے آپ نے مطلقا منصب اقتدا کو سمجھا دیا کہ امام کے پیچھے قراءت کرنا بے محل ہے۔

وجوب کی دوسری دلیل کا جواب

حضرتؒ نے فرمایا کہ وہ لوگ یہ بات بھی کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے ارشاد **لا تفعلوا الا بام القرآن** " سے تو ہم اباحت یا عدم وجوب تسلیم کئے لیتے ہیں مگر اس کے بعد جو حضور نے تعلیل کے طور پر "**فانه لا صلوٰة الابها**" فرمایا اس سے تو وجوب ضرور ثابت ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بات تو کسی طرح بھی معقول نہیں ہو سکتی کہ ایک وقت میں ایک چیز کو صرف مباح اور وہ بھی بدرجۂ اباحت مرجوحہ کہا جائے، اور پھر اسی کو اگلے جملہ میں واجب کا درجہ دے دیا جائے، اس لئے حدیث نبوی کی معقول شرح اس طرح ہو سکے گی کہ ممانعت اور پھر اباحت کا تعلق تو مقتدی کے ساتھ ہوا اور چونکہ سورۂ فاتحہ کو دوسری سورتوں کے مقابلہ میں ایک بڑا تفوق وامتیاز بھی بخشا گیا ہے کہ وہ متعین طریقہ پر نماز کے لئے ضروری ہے، اور دوسری سورتوں کے لئے یہ وصف نہیں ہے، بلکہ کوئی بھی سورت فاتحہ کے ساتھ پڑھی جا سکتی ہے، اس لئے تعلیل والے جملہ سے سورۂ فاتحہ کے تفوق کو امتیاز اور وصف خاص کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اس کے بغیر دو نمازیں ایسی ہیں کہ وہ صحیح نہیں ہوتیں، ایک منفرد کی دوسرے امام کی لہٰذا تعلیل کا مقصد ایجاب فاتحہ نہیں ہے، بلکہ اس کے وصف خاص کا اظہار ہے اور خاص مقتدی کے حق میں اس کو واجب کرنا مقصود نہیں ہے کہ اس کے واسطے تو صرف اباحت کا درجہ مقرر ہو چکا ہے اور اسی لئے اس کے لئے حکمی ومعنوی طور پر امام کی قراءت ہی کافی قرار دے دی گئی ہے، اور اب حکماً وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے امام یا منفرد ہونے کی حالت میں خود پڑھتا ہے۔ یہاں یہ مجبوری ہے کہ امام کی قراءت کے وقت اس کے لئے انصات وخاموشی ضروری ہے۔

مثالوں سے وضاحت

حضرتؒ نے اس کو بھی مثالوں سے واضح فرمایا کہ ترمذی میں حدیث ہے کہ "مومن کی گم شدہ چیز دوزخ کی آگ ہے" وہاں بھی حکم مذکور باعتبار تحقیق جنسی کے ہے تاکہ لوگ مسلمانوں کی چیزیں اٹھا کر حلال نہ سمجھ لیں، ورنہ اگر بالکل ہی مسلمان کی گم شدہ چیزوں کو نہ اٹھایا جائے گا تو یوں

بھی ضائع ہو جائیں گی۔

دوسری مثال یہ ہے کہ ترمذی باب البر میں ہے کہ ایک روز نبی کریم ﷺ حضرت حسن یا حسین کو گود میں لئے باہر تشریف لائے اور ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم ہی اپنے ماں باپ کو بخل پر مجبور کرتے ہو، تم ہی ان کو بزدل بناتے ہو اور تمہاری ہی وجہ سے وہ جہالت وحماقت کی باتیں کرتے ہیں، اور تم ہی ان کے لئے بمنزلہ روح وریحان بھی ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ صاحبزادے ان اوصاف ثلاثہ مذکورہ کے محل نہ تھے، البتہ ان کی جنس کے بارے میں بات درست تھی، ایسے ہی حدیث فاتحہ کو بھی سمجھنا چاہئے کہ اس کی بھی تعلیل کے ذریعہ ایک جنس کا حکم بتلایا گیا ہے۔ جس کا تعلق منفرد وامام سے ہے، موجودہ مقتدی والی صورت سے اس کا تعلق نہیں ہے اور یہ بتلایا کہ مقتدی کے لئے صرف قراءۃ فاتحہ کی اباحت ہے (دوسری سورتوں کی وہ بھی نہیں) اس لئے کہ وہ اصل وبنیاد صلوٰۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز پوری نہیں ہوتی، اگرچہ اس وصف اصلیت کا تحقق مقتدی کے سوا منفرد وامام کے حق میں ہوگا۔

چنانچہ اس بارے میں امام احمدؒ کی ترمذی میں صراحت بھی ہے کہ حدیث **لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب** منفرد کے حق میں ہے، مقتدی کے لئے نہیں ہے۔ اور ایسی ہی صراحت خود راوی حدیث مذکور حضرت سلیمان بن عیینہ سے ابوداؤد میں وارد ہے۔

موجبین کی بھول: لیکن باوجود ایسے اکابر کی تصریحات کے بھی قرأۃ خلف الامام کے قائلین نے اس حدیث کو نماز جماعت کی طرف بھی منتقل کر دیا، اور جو حکم ایک شخص کے لئے بطور خود تھا اس کو ایسے شخص کے لئے بھی کر دیا جو دوسرے کے ساتھ اقتدا کر کے نماز پڑھ رہا ہے۔

مقتدی کے ذمہ بھی قراءت ہے

حضرتؒ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک شریعت کا یہ فیصلہ نہیں ہے کہ مقتدی پر قراءت نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ امام ہی کی قراءت اس کی قراءت ہے، جو حدیث صحیح سے ثابت ہے، شیخ ابن ہمام نے ایک اسناد مسند احمد بن منیع سے ایسی بھی پیش کی ہے جو شرط شیخین کے مطابق ہے۔ یہ کتاب اب مفقود ہے، شیخ ابوالحسن سندھی کے حاشیہ فتح القدیر میں ہے کہ محقق علامہ قاسم بن قطلوبغا حنفی نے اپنے استاذ شیخ ابن ہمام سے اس حدیث کی اسناد دریافت کی تھی، تو انھوں نے جواب میں لکھ کر بھیجا کہ وہ "**اتحاف الخیرہ بزوائد المسانید العشرہ**" للبوصیریؒ میں ہے۔

علامہ موصوف نے بوصیری کا یہ بیان بھی نقل کیا کہ جب اس اسناد کو حافظ ابن حجرؒ پر پیش کیا گیا تو مسند تمام ہونے سے قبل ہی کہنے لگے کہ اس سے تو حدیث **من کان لہ امام** کی بو آرہی ہے، اور مسکرا کر چپ ہو گئے، بظاہر اس سے خوش نہ ہوئے، مگر اس پر کوئی نقد بھی نہ کر سکے، کیونکہ اس کی سند علی شرط الشیخین تھی۔ اور اپنے مسلک سے مجبور تھے، بلکہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ کے کہ ایسے مواقع میں فرمایا کرتے تھے، اس کی فقہ حدیث کی طرف کو چلی ہے، یعنی برعکس ہوا ہے چلنا تو حدیث سے فقہ کی طرف کو تھا، تاکہ فقہ حدیث نبوی کے تابع ہو، یہاں اگر حافظ ابن حجرؒ کے اس خواب کو بھی ذہن میں تازہ کر لیا جائے تو بہتر ہے، جو پہلے ذکر ہوا ہے کہ فقہ حنفی کے اصول جامعہ وکاملہ سے متاثر ہو کر آپ نے حنفی بن جانے کا ارادہ کر لیا تھا، مگر پھر ایک خواب کی وجہ سے رک گئے تھے۔

فقہ حنفی کے خدام اکابر ملت

حقیقت یہ ہے کہ فقہ حنفی کو اگر امام محمد، امام طحاوی، علامہ زیلعی، اور حضرت علامہ کشمیری ایسے حضرات کی طرح کامل تحقیق ودقت نظر کے ساتھ کتاب وسنت اور تعامل وآثار صحابہ وتابعین کی روشنی میں پیش کیا جاتا اور اس کی اشاعت بھی اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی رہتی تو آج جو اس کی بے قدری وکم مائیگی دوسرے لوگوں کے غلط پروپیگنڈے کی وجہ سے محسوس کی جارہی ہے، یہ صورت ہرگز رونما نہ ہوتی، ہم نے جو پہلے کئی ابحاث تفصیل سے پیش کی ہیں اور یہ بحث بھی سامنے ہے، اس سے ہماری مذکورہ گذارش کی صداقت واضح ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

موجودہ دورانحطاط: بڑی تکلیف و درد کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہم نے اس آخری دور میں حضرت علامہ کشمیریؒ اور حضرت مدنیؒ ایسے محققین وکاملین سے حدیث کا درس لیا تھا، اگرچہ صحیح معنی میں دیکھا جائے تو ہمیں کچھ بھی نہ آیا کیونکہ ہماری استعداد وقابلیت اخذ ہی ناقص تھی، مگر جلد ہی اب تو ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ بیشتر ترمذی و بخاری پڑھانے والے ایسے ہیں جن میں علوم اکابر سلف وخلف کو سمجھنے کی بھی قابلیت نہیں ہے، نہ ان کا مطالعہ ومعلومات وسیع ہیں، بلکہ اس کیلئے ان کے پاس وقت بھی نہیں ہے۔الا ماشاءاللہ۔ **فیا للاسف و لضیعة علم الحدیث.**

تعمیم وتخصیص نہیں ہے

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں تعمیم وتخصیص کی صورت نہیں ہے بلکہ اصل صورت یہ ہے کہ نظر شارع میں قراءت کے بارے میں مطلق نماز کا باب مستقل اور الگ تھا جس کے تحت منفرد وامام آئے اور مقتدی کے احکام دوسرے تھے اس لئے اس کا باب الگ سے تھا جیسے حدیث میں آتا ہے "**البکر تستاذن فی نفسها و اذنها صماتها**" (باکرہ سے اس کے نکاح کے لئے زبانی اجازت لینی چاہئے اور اس کی خاموشی اجازت ہے) تو یہاں **اذنها صماتها** بطور تخصیص کے نہیں ہے، بلکہ وہ مستقل الگ اسکے لئے شریعت ہے، اس لئے اگر کوئی پہلے حکم کو عام قرار دے کر باکرہ کے لئے زبانی اجازت کو شرط قرار دے تو وہ غلطی ہوگی۔البتہ دوسرے جملہ سے جو الگ سے اس کے سکوت کو بمنزلہ زبانی اجازت کے مقرر کیا ہے اجازت ثابت ہوگی، اسی طرح یہاں بھی جب شریعت نے اقتدا کے قواعد واحکام الگ باب میں قائم کئے ہیں، اور غیر اقتدا کے دوسرے باب میں، تو کسی کو حق نہیں کہ ایک کے احکام کو دوسرے باب میں جاری کردے۔

احادیث اقتداء: چنانچہ اقتدا کی احادیث دیکھئے، کسی میں بھی مقتدی کو امامت کے ساتھ قراءت کا حکم نہیں کیا گیا، اور جس حدیث میں اقتدا کی پوری کیفیت بیان کی گئی ہے اور کہا گیا کہ جب امام رکوع کرے تو تم رکوع کرو، سجدہ کرے تو سجدہ کرو وغیرہ وہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ جب امام قراءت کرے تو تم بھی قراءت کرو، حالانکہ قراءت نماز کا بنیادی رکن ہے بلکہ راس الارکان ہے، لہذا اس کا ذکر نہ کرنا اہل حدیث کے لئے جو موجبین قراءت خلف الامام ہیں، اچھا سبق تھا، پھر اس کے بعد یہ بھی وہ دیکھیں کہ ایک دوسری مستقل حدیث میں یہ زیادتی بھی صراحت کے ساتھ مل گئی کہ امام جب قراءت کرے تو تم خاموش رہو، یہ حدیث مسلم شریف کی ہے (باب التشہد فی الصلوٰۃ) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مفصل روایت نماز کے بارے میں ہے، اور امام ابوبکر ابن ابی شیبہ کی روایت میں **و اذا قرأ فانصتوا** بھی ہے، یعنی جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو جو پہلی روایت میں نہ تھا اور عام طور سے دوسرے راویوں نے اس جملہ کو نہیں لیا تھا، اسی لئے ابواسحاق (صاحب مسلم وراوی کتاب) نے امام مسلم کو اس کمزوری کی طرف توجہ دلائی تو وہ بولے کیا تم سلیمان تیمی سے بھی زیادہ حدیث کو یاد رکھنے والا ڈھونڈتے ہو (یعنی کیا اتنے کامل الحفظ وضبط کی روایت زیادۃ پر شبہ کرتے ہو صرف اس لئے کہ دوسروں نے اس کی روایت نہیں کی) پھر سوال کیا گیا کہ کیا حضرت ابوہریرہ والی روایت بھی آپ کے نزدیک صحیح ہے جس میں یہی زیادتی ہے؟ تو اس پر امام مسلم نے فرمایا کہ وہ بھی میرے نزدیک صحیح ہے۔اس پر کہا گیا کہ پھر آپ نے اس کو (مسلم میں) کیوں نہیں لیا؟ آپ نے کہا یہ کیا ضروری ہے کہ جتنی حدیثیں میرے نزدیک صحیح ہیں، وہ سب ہی یہاں جمع کردوں، یہاں تو میں نے وہ جمع کی ہیں جن پر سب نے اتفاق کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس زیادتی کی امام مسلم نے تصحیح بھی کی ہے اور اس کی تصحیح جمہور مالکیہ وحنابلہ نے بھی کی ہے، بلکہ اس کی تصحیح سے احتراز صرف ان حضرات نے کیا ہے جو قراءت خلف الامام کو اپنا مسلک مختار قرار دے چکے تھے اور ان کی فقہی رائے مقدم بن کر حدیث کی طرف چلی تھی۔

امام بخاری وابوداؤد کے دعوے

حضرتؒ نے اس موقع پر نام تو نہیں لیا مگر احقر کے نزدیک اشارہ امام بخاری وابوداؤد کی طرف بھی تھا جنھوں نے اس زیادتی پر کلام کیا ہے، امام بخاری نے تو جزء القراءۃ ص ۲۹ (طبع علیمی) میں سلیمان تیمی کی روایت میں عدم ذکر سماع عن قتادہ کی بات نکالی اور دوسری حدیث ابی ہریرہؓ کو ابو خالد کی عدم متابعت کا دعوے کر کے گرانے کی سعی مشکور فرمائی۔ امام ابوداؤد نے بھی حدیث ابی ہریرہ باب **الامام یصلی من قعود** کے تحت روایت کر کے زیادۃ ابی خالد کو غیر محفوظ قرار دے دیا۔

سلیمان تیمی کے بارے میں ابھی اوپر امام مسلم وغیرہ سے توثیق وتصحیح کا ذکر ہوا ہے اور علامہ عثمانی نے فتح الملہم ص ۲/۲۲ میں اور بھی موثقین ومصححین گنائے ہیں، پوری بحث وہاں پڑھنے کے لائق ہے اور ابو خالد کی عدم متابعت کا جواب مکمل بذل المجہود ص ۳۳۸/۱ تا ص ۳۴۱/۱ قابل مطالعہ ہے، جس سے امام بخاری اور امام ابوداؤد دونوں کے بے دلیل دعوؤں کی مبالغہ آرائی واضح ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم بہت سی محدثانہ تحقیقات یہاں ذکر نہیں کر سکتے۔

اکابر محدثین اور فقہی اراء

اکابر محدثین خصوصا اصحاب صحاح کی نہایت گراں قدر حدیثی خدمات کی تحسین واعتراف ہزاراں ہزار بار اور ہماری گردنیں ان کے علمی احسانات کی گراں باری کے باعث جھکی ہوئی ہیں۔ مگر جن مواضع میں انہوں نے محض اپنی فقہی آراء سے متاثر ہو کر مندرجہ بالاقسم کا کام بھی کیا ہے، یا تراجم ابواب کے ذریعہ اپنی فقہی آراء کے احقاق کی سعی فرمائی ہے وہ لائق شکوہ ہے اور خوردہ کے لئے تھوڑے سے کلے کی گنجائش شاید نکل بھی سکتی ہے، اسی لئے امام بخاری کے رسالہ کی دوسری چیزوں پر بھی آگے بحث آئے گی۔ ہمارا خیال ہے اکابر متقدمین سے ائمہ اربعہ کے بعد (کہ وہ تو فقہاء محدثین کاملین کے سرتاج تھے، اور ہم ان کو بعد کے سارے محدثین اصحاب صحاح، وغیرہم سے بھی علم حدیث میں فائق سمجھتے ہیں) محدث کبیر امام ابن ابی شیبہؒ کا مرتبہ سب سے اوپر ہے جنھوں نے اصحاب صحاح سے قبل ہی احادیث وآثار صحابہ وتابعین کا ایسا بے نظیر مجموعہ تالیف کر دیا تھا، جو سارے انصاف پسند افراد امت محمدیہؐ کے لئے سراج راہ تھا اور ہے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

فقہ وتقلید: فقہ امام اعظمؒ کے مسائل مدونہ میں سے (جن کی تعداد بارہ لاکھ ستر ہزار تک منقول ہے) ۱۲۵ مسائل پر محدث موصوف کا محدثانہ نقد تھا وہ بھی ان کی "**الدین النصیحہ**" کے تحت مخلصانہ خدمت تھی، ان کے کافی وشافی جوابات بھی بار بار دیئے گئے ہیں، پھر بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ "**اذا صح الحدیث فھو مذھبنا**" یعنی جب بھی ہمیں یہ ثابت ہو جائے گا کہ کسی مسئلہ میں ہمارے امام صاحب کی رائے کسی حدیث صحیح نبوی کے خلاف ہے تو ہم اس حنفی مسئلہ کو ترک کر کے اس حدیث پر عمل کریں گے۔ کیونکہ ہمارے امام صاحب اور دوسرے ائمہ مجتہدین نے بھی امت کو اتباع حدیث ہی کی طرف بلایا ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ اعلم بمعانی الحدیث تھے، اس لئے ہم نے ان پر اعتماد کر کے ان کے مسائل **مستخرجہ من الحدیث** پر عمل کیا ہے۔

زیادتی ثقہ معتبر ہے

اس موقع پر عدم متابعت کی بات اس لئے بھی بے محل ہے کہ زیادتی ثقہ کو سب ہی نے معتبر قرار دیا ہے، خصوصا جبکہ وہ مضمون مزید علیہ کے خلاف بھی نہ ہو، چنانچہ حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اس "**واذا قرأ فانصتوا**" کی زیادتی کو زیادۃ ثقہ قرار دے کر معتبر قرار دیا اور کہا کہ یہ معنی مزید کے موافق ومؤید بھی ہے کیونکہ **انصات الی قراءۃ المقتدی** ائتمام امام کا ایک فرد ہے۔ (فتح الملہم ص ۲/۲۳)

تصحیح حدیث انصات: حضرت شاہ صاحبؒ نے فصل الخطاب میں لکھا۔ حدیث انصات کی تصحیح مندرجہ ذیل اکابر محدثین نے کی ہے:۔
امام احمد، الحق، ابوبکر اثرم، مسلم، نسائی، ابن جریر، ابوعمر، ابن حزم، منذری، ابن کثیر، ابن تیمیہ حافظ ابن حجر وغیرہ اور جمہور مالکیہ وحنابلہ۔

پھر لکھا کہ حدیث ابی ہریرہ (اذ اقرأ فانصتوا والی) نسائی وغیرہ میں بھی ہے، اور سب سے زیادہ مکمل مضمون ابن ماجہ باب اذا قرأ فانصتوا میں ہے، ابوبکر ابن ابی شیبہ سے اس میں ہے کہ امام اس لیئے ہے کہ اس کی اقتدا واتباع کی جائے جب وہ تکبیر کہہ کر نماز شروع کرے تو تم بھی تکبیر کہو، جب وہ قراءت کرے تو خاموش رہو، جب غیر المغضوب علیهم و لا الضالین کہے تو تم آمین کہو جب رکوع کرے تو تم رکوع کرو الخ مکمل نقشہ امامت واقتدا کا پیش کیا ہے۔ (فصل ص ۲۷)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام بخاری نے جس لفظ حدیث کو ساقط کرنا چاہا، اسی زیادتی والی حدیث کو امام احمد، امام نسائی وابن ماجہ نے صحیح قرار دیا، حتی کہ ابن حزم نے بھی تصحیح کردی، جبکہ ہم نے اوپر بتلایا کہ ہمیں اکابر امت میں سے صرف دو ہی ایسے ملے جنھوں نے منہ بھر کر قراءت خلف الامام کو فرض وواجب قرار دیا اور اس کے خلاف آیات قرآنیہ واحادیث صحیحہ نهی عن القراءة خلف الامام کی رعایت نہ کی۔ کیونکہ دوسرے بعض حضرات نے تو اتنی رعایت کی تھی کہ امام کی آواز اگر نہ آرہی ہو تو پڑھ سکتا ہے، جیسے امام احمد وشافعی وغیرہ نے، مگر نہی کی رعایت کر کے قراءت خلف الامام کو مطلق طریقہ سے کسی نے بھی ان دو بڑوں کے علاوہ واجب وفرض نہیں کہا ہے، واللہ تعالی اعلم۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ امام ترمذی نے تو ان دونوں احادیث کی روایت ہی نہیں کی۔ شاید اپنے استاذ معظم امام بخاری سے متاثر ہو کر، امام ابوداؤد نے روایت کر کے غیر محفوظ کا نقطہ لگا دیا امام مسلم نے جراءت کر کے روایت بھی کردی اور تصحیح بھی اس شان سے کردی کہ باید وشاید، امام نسائی نے بھی روایت کردی تو گویا تصحیح ہی کردی، اور ابن ماجہ نے اور بھی آگے بڑھ کر مستقل باب ہی "اذا قرأ فانصتوا" کا قائم کر دیا۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا"

امام بخاری وابوداؤد نے حدیث صحیح کے جس قطعہ کو معلول وساقط کرنا چاہا تھا، اس کو اللہ تعالی نے اتنی عظمت بخشی کہ سارے ہی اکابر محدثین نے اس کی تصحیح وتوثیق کردی، حتی کہ ابن حزم نے بھی جو اس مسئلہ میں فرضیت قراءۃ خلف الامام کا جھنڈا اٹھا کر امام بخاری کے ساتھ چلے تھے۔

اب صرف امام بخاری جماعت سے الگ رہ گئے، اور ہمیں درحقیقت ان ہی کے دلائل واعتراضات کا جواب دینا بھی ہے اور بقول ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے ان ہی کی وجہ سے بہت سے شافعیہ وغیرہم نے قراءت خلف الامام کو واجب ثابت کرنے کے لئے زیادہ زور لگایا ہے، شاید حضرت کا اشارہ دار قطنی وبیہقی وغیرہ کی طرف ہوگا، کہ آخر الذکر نے تو امام بخاری کی طرح مستقل رسالہ بھی لکھا ہے "کتاب القراءۃ خلف الامام"

تمام صحیح احادیث بخاری ومسلم میں نہیں ہیں

ابھی امام مسلم نے فرمایا کہ ہم نے مسلم میں ساری صحیح احادیث ذکر کرنے کا التزام نہیں کیا، امام بخاریؒ کو ایک لاکھ حدیث صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح یاد تھیں (مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۸) لیکن ان ایک لاکھ صحیح احادیث میں سے اپنی صحیح بخاری میں غیرہ مکرر موصول احادیث صرف ۲۲۵۳ درج کیں اور خود بھی فرمایا کہ جو میں نے درج نہیں کیں وہ زیادہ ہیں، پھر جو روایات لائے ہیں۔ وہ بھی دوسرے محدثین کے طریقہ سے الگ صرف اپنے اجتہاد ورائے کے موافق لائے ہیں، دوسرے فقہاء مجتہدین کی رعایت نہیں کی۔

امام بخاری کے تفردات

یہی وجہ ہے کہ بہت سے مسائل میں ان کا مسلک جمہور اور اجماع کے خلاف تک ہے مثلاً سب نے اجماع کیا کہ رکوع وسجدہ میں قرآن مجید کی قراءت ممنوع ہے اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں "باب النهي عن قراءة القرآن في الركوع و السجود" کے تحت آٹھ احادیث صحیحہ روایت کی ہیں، پھر بھی امام بخاریؒ نے ان سب سے صرف نظر کر کے اپنا یہ مسلک قائم رکھا کہ رکوع وسجدہ کے اندر قراءت

درست ہے۔ امام احمدؒ نے لکھا کہ میرے علم میں کسی کا بھی ایسا قول نہیں ہے کہ جس نے امام کے پیچھے نماز میں قراءت نہ کی، اس کی نماز نہ ہوگی، لیکن امام بخاری سب سے الگ ہوکر وجوب قرائۃ خلف الامام کے قائل ہوئے، اور جمہور کے خلاف جواز تقدیم تحریمہ علی الامام کے بھی قائل ہوئے، جمہور نے فیصلہ کیا کہ امام کے ساتھ رکوع پالینے سے رکعت مل جاتی ہے، مگر امام بخاری نے فرمایا کہ نہیں ملے گی۔ اس قسم کے تفردات امام بخاریؒ کے بہت ہیں جن کو ہم کسی موقع پر یکجا پیش کریں گے۔

غیر مقلدین زمانہ کا فتنہ

یہاں ذکر کرنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے زمانہ کے غیر مقلد حضرات حنفی عوام کو پریشان کرنے کے لئے اختلافی مسائل میں کہہ دیا کرتے ہیں کہ لاؤ حنفی مسئلہ کے لئے بخاری کی حدیث، اگر وہ ایسے ہی امام بخاری کے بڑے معتقد ہیں تو بجائے شوکانی وغیرہ کے ان ہی کا اتباع کرلیں تو اچھا ہے۔ امام بخاری کا مسلک ہمیں ان کے تراجم سے معلوم ہو چکا ہے، ان سے ہم نمٹ لیں گے، یہ جو غیر مقلدین نئے نئے مسئلے پیدا کر کے نئے نئے جھگڑے نکالا کرتے ہیں ان سے تو نجات ملے گی۔

سیاق استثناء: حضرتؒ نے فرمایا:۔ کہ موجبین قراءت خلف الامام کو چاہئے تھا کہ وہ **فلا تفعلوا لاابام القرآن** جیسا استثناء انصات کے مقابلہ میں بھی پیش کرتے مثلاً **انصتوا الا بفاتحہ**، مگر ایسی کوئی روایت نہیں ہے، تاہم انھوں نے اسی جیسا درجہ دے کر انصات کے حکم کو لغو کر دیا، ہم کہتے ہیں کہ جب قراءت امام کے وقت انصات وخاموشی کا صریح حکم آ گیا اور کوئی استثناء بھی فاتحہ کے لئے وارد نہیں ہوا تو اس سے واضح ہوا کہ فاتحہ اور غیرہ فاتحہ سب برابر ہیں، امر انصات کے تحت صرف خاموشی ہی متعین ہے۔

حضرتؒ نے دوسرے دلائل بھی انصات للمقتدی کے لئے ارشاد فرمائے، پھر آخر میں فرمایا کہ اس مسئلہ میں ہمارے پاس نص قرآنی بھی ہے **اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا**، اور احادیث صحیحہ بھی ہیں، اور مقابل میں دوسروں کے پاس مقتدی کے لئے ایجاب قراءت خلف الامام کے لئے صحیح دلائل کا فقدان ہے، جہریہ میں بھی اور سریہ میں بھی، البتہ ان کے پاس دعاوی ومبالغات ضرور ہیں، جن کو وہ بڑے طمطراق کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

رکنیت فاتحہ کا مسئلہ: فاتحہ خلف الامام کی مزید بحث سے قبل یہ بتلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فی نفسہ صحت نماز کیا قراءت فاتحہ پر موقوف ہے جو امام شافعی وغیرہ کا مذہب ہے یا قرآن مجید کا کوئی حصہ بھی کہیں سے پڑھ دینا صحت نماز کے لئے کافی ہے جو امام ابوحنیفہؒ وغیرہ کا مسلک ہے، امام شافعی ومالک کے نزدیک پوری سورۂ فاتحہ ہی متعین طور سے فرض ورکن صلوٰۃ ہے کہ اس میں سے ایک حرف بھی رہ گیا یا غلط پڑھ دیا تو نماز باطل ہوگی، امام احمد سے دو روایت ہیں۔ مشہور یہی قول ہے جو امام شافعی کا ہے، دوسرا قول امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ہے، جیسا کہ نیل المآرب اور المغنی لابن قدامہ میں ہے، اور امام اوزاعی وثوری بھی امام اعظم کے ساتھ ہیں (اوجز ص ۱/۲۳۷) پھر لکھا کہ اس بارے میں کوئی شدید اختلاف نہیں ہے کیونکہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی واجب ہے کہ عمداً ترک سے گنہگار ہوگا اور اعادہ واجب ہوگا اور سہواً ترک پر سجدۂ سہو واجب ہوگا، اگر سجدۂ سہو نہ کیا تب بھی نماز واجب الاعادہ اور ناقص رہی۔

امام شافعی کے یہاں چونکہ واجب کا درجہ نہیں ہے، انھوں نے فرض کہا، لہٰذا گویا نزاع لفظی ہے۔ اور واجب وفرض کا فرق وفائق حنفیہ میں سے ہے، دوسروں کے یہاں یہ دقت نظر نہیں ہے۔

طرق ثبوت فرض: حنفیہ کے یہاں فرض ورکن کا ثبوت صرف قرآن مجید، یا متواتر احادیث یا اجماع سے ہوتا ہے، اسی لئے صرف قراءۃ قرآن کا ثبوت تو ان کے نزدیک آیت **فاقرؤا ماتیسر من القرآن** اور دوسری آیت **فاقرؤا ما تیسر منه** سے ہوا اور اس ارشاد نبوی سے

بھی جو آپ نے نماز غلط طور سے پڑھنے والے کو فرمایا کہ پھر تم جو آسان ہو قرآن مجید میں سے وہ پڑھنا، اور دوسری حدیث بھی حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نماز بغیر قرآن مجید پڑھنے کے نہیں ہوتی خواہ وہ سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور ہو اور حضور علیہ السلام نے جو مسئ صلوٰۃ کو فرمایا کہ جاؤ پھر نماز پڑھو کیونکہ تمہاری نماز نہیں ہوئی، وہ بھی حنفیہ کے خلاف اس لئے نہیں کہ وہ بھی ایسی نماز کو واجب الاعادہ کہتے ہیں، جس میں واجبات چھوٹ گئے ہوں،

• حنفیہ جواب میں یہ بھی کہتے ہیں کہ عام احادیث و آثار سے کسی چیز کو فرض و رکن قرار دینا فرق مراتب کے خلاف ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ آثار عموم قرآن مجید کے خلاف بھی ہوں، جیسے یہاں ہے کہ قرآن مجید و دیگر آثار سے تو نماز میں صرف قرآن مجید پڑھنے کا حکم ہوا اور ہم صرف آثار کے ذریعہ فاتحہ کو فرض و رکن قرار دے دیں۔ البتہ احادیث متواترہ کے ذریعہ ضرور فرض و رکن کا درجہ ثابت ہو سکتا ہے (اوجز)

نزاع لفظی یا حقیقی

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس اختلاف کو نزاع لفظی کا درجہ دینا تو محل تامل ہے، کیونکہ یہ تو ضرور ہے کہ شافعیہ کے یہاں بھی احکام حج وغیرہ کے سلسلہ میں بعد فرض ایسے ملتے ہیں جو ان کے یہاں بھی واجب کے درجہ میں ہیں کہ ان کا تدارک ہو سکتا ہے، اور فرض و رکن کا درجہ واجب سے اوپر اسی لئے ہے کہ اس کا تدارک نہیں ہو سکتا، اور جس کا ہو سکے وہ درحقیقت فرض و رکن نہیں ہے تاہم عمل کے لحاظ سے فرض و واجب بظاہر یکساں ہوتے ہیں اس لئے بات وہی صحیح ہے کہ فرض و واجب کے فرق دقیق کو صرف حنفیہ نے سمجھا ہے، شافعیہ کے یہاں بعض فرض و رکن ایسے بھی ملتے ہیں جن کو فرض و رکن بکل المعنی الکامہ نہیں کہہ سکتے لیکن تدارک سے یہ بات نکلی کہ وہ ہمارے یہاں کے واجب کے مرتبہ میں ہیں، اس لئے نزاع لفظی کی بات صحیح ہونا مشکل معلوم ہوتی ہے چنانچہ زیر بحث مسئلہ میں بھی ان کے فرض و رکن اور ہمارے واجب میں فرق بین ہے کہ وہ بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز کو کسی طرح بھی درست نہیں مانتے اور حنفیہ صرف ناقص بتلاتے ہیں جس کا تدارک ترک سہواً ہو تو سجدۂ سہو سے اور عمداً ہو تو اعادہ سے ہوتا ہے، اور پہلی نماز بھی اجر سے خالی نہ ہوگی اگر چہ اجر ناقص ہوگا جبکہ شافعیہ کے نزدیک باطل محض ہونے کی وجہ سے اجر صلوٰۃ اس کو کچھ بھی نہ ملے گا یا یوں تسبیحات وغیرہ کا اجر شاید وہ بھی مانتے ہوں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ابن قیم کا اعتراض: حافظ ابن القیمؒ نے اعلام الموقعین (ترجمہ ۴/۸٦) میں اسی مسئلہ پر سخت تنقید کی ہے اور لکھا کہ حنفیہ نے محکم دلائل کو ترک کر دیا، گویا قرآنی آیات کے مقابلہ میں اخبار آحاد کو محکم دلائل قرار دیا، اور جو احادیث حنفیہ کی مستدل ہیں ان کو متشابہ بتلایا، نیز لکھا کہ اعرابی (مسئ صلوۃ) والی حدیث کو حنفیہ کا پیش کرنا بتلاتا ہے کہ وہ حدیثی اعتبار سے بالکل مفلس ہیں، کیونکہ ابوداؤد کی روایت میں حضور علیہ السلام کا حکم سورۂ فاتحہ پڑھنے کا صریح موجود ہے۔

جواب ۱: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ابوداؤد **"باب صلوٰۃ من لا یقیم صلبه فی الرکوع و السجود"** میں ہے اور اس میں چار حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ تین روایتوں میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ قرآن مجید میں سے جتنا آسان ہو وہ نماز میں پڑھا جائے اور صرف ایک روایت میں یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف سورۂ فاتحہ متعین نہیں ہے، ورنہ ابوداؤد ہی کی تین روایتوں میں بغیر ذکر فاتحہ کے **ما تیسر من القرآن** پڑھنے کا ارشاد نہ فرماتے، پھر قصہ بھی ایک ہی ہے اس لئے بھی تعیین فاتحہ میں شبہ پڑ گیا، اور فاتحہ کو واجب حنفیہ بھی کہتے ہیں، صرف رکن نہیں کہتے، کیونکہ رکنیت اور فرض کا درجہ ثابت کرنے کے لئے قطعی ثبوت کی ضرورت ہے۔ اور اخبار آحاد سے ظنی ثبوت ملتا ہے جس سے وجوب کا درجہ ثابت کرتے ہیں جو علم و یقین کے لحاظ سے فرض سے کم مرتبہ ہے، اگر چہ عملاً فرق زیادہ نہیں ہے۔

جواب ۲: یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شافعیہ اور ابن قیم وغیرہ جو رکنیت فاتحہ پر حدیث ابوداؤد مذکور سے استدلال کرتے ہیں اس میں

صرف ام القرآن کا ذکرنہیں بلکہ دو چیزوں کا حکم ہے کہ تم ام القرآن پڑھو اور اس کے ساتھ اور بھی جو کچھ اللہ نے چاہا ہے (ام القرآن کے علاوہ) وہ بھی پڑھو، لیکن شافعیہ اور ابن القیم وغیرہ نے (جو صرف فاتحہ کو رکن وفرض کہتے ہیں اور اس کے علاوہ سورت وغیرہ کو صرف سنت بتلاتے ہیں) آدھی حدیث پر عمل کیا اور آدھی کو چھوڑ دیا۔ اگر اس حدیث ابی داؤد کی وجہ سے ام القرآن فرض ہوئی تو دوسری سورت بھی فرض ہونی چاہیے، مگر وہ اس کو واجب تک کا بھی درجہ نہیں دیتے اور صرف سنت مانتے ہیں جبکہ حنفیہ کے نزدیک حدیث نبوی کی وجہ سے سورۂ فاتحہ بھی نماز میں واجب ہے اور دوسری سورت بھی۔

ائمہ ثلاثہ درجہ وجوب کے قائل ہیں

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حافظ ابن تیمیہ (استاذ علامہ ابن القیم) نے لکھا کہ "ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ وامام احمدؒ) کے نزدیک نماز کی ترکیب، فرائض، واجبات وسنن سے ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی ترکیب صرف فرائض وسنن سے ہے۔" تو جب حنابلہ کے نزدیک بھی وجوب کا درجہ تسلیم شدہ ہے تو حنفیہ پر مرتبہ واجب کی وجہ سے اعتراضات کیوں کرتے ہیں، نیز فرمایا کہ عمدۃ القاری ص۶۴/۳ میں ہے کہ جو امام صاحب کا مذہب ہے وہ امام مالکؒ سے بھی ایک روایت ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جس نے کسی رکعت میں بھول کر فاتحہ ترک کردی اور سجدۂ سہو کرلیا تو نماز صحیح ہوجائے گی، اور ابن الحکم وغیرہ سے بھی اسی طرح امام مالک سے منقول ہے۔ اور وزیر ابن ہبیرہ حنبلیؒ نے بھی ان کے نزدیک عدم رکنیت فاتحہ کی روایت "الاشراف مذاهب الاشراف" میں نقل کی ہے (معارف السنن ص۳۸۲/۲)

افادۂ مزید: حضرتؒ نے فرمایا:۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ "واجب الشیء" میں ہے، "الشیء الواجب" میں نہیں ہے، اور واجب الشی، صرف نماز وحج میں ہے، البتہ الشیء الواجب کا درجہ وہ سب چیزوں میں ہے، پھر یہ کہ جو چیز دلیل قاطع سے ثابت ہوتی ہے اس کے ارکان وشروط دلیل ظنی سے ثابت نہیں ہوسکتے، البتہ جو چیز دلیل ظنی سے ثابت ہو اس کے شروط وارکان دلیل ظنی سے بھی ثابت ہوسکتے ہیں، جیسے نماز استسقاء وغیرہ۔ (العرف الشذی ص۱۳۷)

امام بخاری کے دلائل: امام ہمامؒ نے وجوب قراءۃ خلف الامام ثابت کرنے کے لئے مستقل رسالہ لکھا، جو ۳۲ صفحات میں مطبع علیمی دہلی سے طبع شدہ ہمارے سامنے ہے اس میں ۱۲۵ آثار مرفوعہ وموقوفہ درج کئے۔ جن میں مطلق قراءت کے ۲۹۔ مطلق قراءت فاتحہ کے ۴۷۔ مطلق قراءت فاتحہ خلف الامام کے ۱۵۔ قراءۃ خلف الامام جہریہ کے ۱۳۔ قراءۃ دیگر سور کے ۶ نہی عن القراءۃ خلف الامام کے ۱۱۔ اور آثار غیر مطابق ومخالف ترجمہ امام بخاری ۴ ہیں۔

(۱) مطلق قراءت کی فرضیت سب کے لئے تسلیم شدہ ہے (۲) مطلقا قراءت فاتحہ کا بھی کوئی منکر نہیں، صرف رکنیت ووجوب کا اختلاف ہے (۳) مطلق قراءت فاتحہ خلف الامام کا بھی انکار نہیں کیونکہ سری نمازوں میں سب جائز مانتے ہیں۔ (۴) قراءۃ خلف الامام جہری کی ضرور اختلافی ہے لیکن اس کے لئے ۱۲۵ میں سے امام کے رسالہ میں صرف ۱۳۔ آثار ہیں۔ ہم ان پر بحث کریں گے (۵) دوسری سورت فاتحہ کے ساتھ پڑھنا ہمارے نزدیک واجب ہے اور شافعیہ نیز امام بخاری اس کو صرف سنت مانتے ہیں، لہٰذا وہ ۶۔ آثار ہمارے موافق اور ان کے مخالف ہیں۔ (۶) ۱۱۔ آثار بھی ان کے مخالف ہیں اور خاص طور سے امام بخاری وابن حزم کے مخالف ہیں کہ وہ باوجود ممانعت شرعیہ کے بھی جہری ہیں۔ قراءۃ خلف الامام کو نہ صرف جائز بلکہ واجب وفرض کہتے ہیں، اس کو کیا کہا جائے اور ایسے بڑوں کے لئے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ پھر یہ بات آیت قرآنی اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا اور حدیث مسلم ونسائی وابن ماجہ ومسند احمد وغیرہ "قرا فانصتوا" کے بھی خلاف ہے، امام بخاری نے تو یہ عذر کردیا کہ آیت خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور حدیث کے راوی کو ضعیف بتلا

دیا۔ حالانکہ آیت سورۂ اعراف کی ہے جو مکہ معظمہ میں نازل ہوئی تھی جبکہ جمعہ کی نماز شروع بھی نہ ہوئی تھی تو خطبہ کہاں ہوتا، اور حدیث مذکور کی تصحیح سارے اکابر محدثین نے کی ہے۔ اور ابن حزم نے بھی کی ہے پھر معلوم نہیں انھوں نے اس کی مخالفت سے بچنے کی کیا سبیل نکالی ہوگی۔

(۷) آخر میں امام بخاری نے باب القراءۃ فی الظھر الاربع کلھا قائم کیا (ص ۳۰) اس میں سب سے پہلا اثر نہ صرف ترجمہ وعنوان سے غیر مطابق ہے بلکہ اس میں یہ بھی ہے کہ جس نے کوئی رکعت پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوئی الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔ یہ اثر امام بخاری کے مسلک اور رسالہ کے مقصد سے بھی مختلف ہے۔ پھر آگے بھی ابوالدرداء کا اثر ص ۳۱ میں ہے، جس میں ترجمۃ الباب سے نامطابقت ہے کہ اس میں صرف یہ ہے کہ ہر نماز میں قراءت ہونی چاہئے، نماز ظہر کا کوئی ذکر نہیں، اس کے یہاں ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی اور کون اس کا منکر ہے؟ ص ۳۲ میں عبادہ کا اثر ہے جس کا ترجمۃ الباب سے کوئی تعلق نہیں، اور سب سے آخر میں حضرت ابوہریرۃؓ کی حدیث ہے کہ نماز بغیر فاتحہ اور اس کے ساتھ دوسری آیات یا سورت ملائے بغیر نہیں ہوگی، حالانکہ امام بخاری نے ابتداء رسالہ میں سب سے پہلے صفحہ پر حدیث کے لفظ فصاعدا کو گرایا تھا اور لکھا تھا کہ یہ معمر کی روایت ہے اور عامۂ ثقات نے معمر کی تائید نہیں کی ہے، اب یہاں آخر میں کوئی بھی اعتراض نہیں کیا حالانکہ فصاعدا اور فمازاد کے مقصد اور مطلب میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔

امام شافعی وجوب کے قائل نہ تھے

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ قدمائے شافعیہ امام شافعیؒ کے دونوں قول ذکر کیا کرتے تھے، متاخرین جدید پر اقتصار کیا اور میری رائے یہ ہے کہ امام شافعیؒ آخر تک جہریہ میں اختیار واستحباب ہی کے قائل رہے، ایجاب کے قائل نہیں ہوئے۔

ابن خزیمہ اور بیہقی نے جزءالبخاری کا اتباع کر کے ہر مصلی کے لئے ایجاب فاتحہ کا قول اختیار کیا ہے (معارف ص ۲/۳۸۴ وفصل ص ۳)

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ سلف میں اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ امام کے پیچھے بطور استحباب فاتحہ پڑھیں یا ترک کریں۔ ان کے دور کے بعد ایجاب وعدم ایجاب کا اختلاف بن گیا۔ اور ایسا بہت ہوا ہے کہ سلف میں اختلاف ہلکا تھا، بعد کے حضرات نے اس کو بڑھا دیا اور یہی بات ابن حبان نے کوفیوں سے نقل کی ہے کہ وہ ترک کو اختیار کرتے تھے، یہ نہیں کہ اس کو مکروہ یا حرام کہتے تھے، کمافی فتح القدیر، اگرچہ ابن ہمام کی خود اپنی رائے اس کے خلاف ہے۔ تاہم میری رائے ہے کہ ان کا منشا بعض سلف کے مبالغہ کے الفاظ ہیں، جبکہ مبالغہ بعض اختیار وترک والوں سے بھی ہو ہی جاتا ہے حالانکہ ان کی نیت ایجاب وتحریم کی نہیں ہوتی (فصل ص ۴) ہم نے اوپر یہ بھی کتاب الام سے ثابت کیا ہے کہ امام شافعی کا قول جدید بھی وجوب کا نہیں تھا، بعض حضرات کو کتاب الام امام شافعی کی قدیم تالیف سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط فہمی ہوئی تھی، اور امام احمد سے زیادہ امام شافعی کے مسلک کو جاننے والا کون ہوگا جنھوں نے دعویٰ کیا کہ ان کے زمانہ تک کوئی بھی وجوب فاتحہ خلف الامام فی الجہر یہ کا قائل نہیں تھا۔

اس تمام تفصیل سے معلوم ہوا کہ امت میں سے وجوب وفرضیت مذکورہ کے قائل بڑوں میں سے صرف امام بخاری وابن حزم ظاہری ہوئے ہیں، اور چونکہ ہم شرح بخاری کررہے ہیں، اس لئے مناسب ہے کہ ان کے دلائل پر بحث ونظر کریں۔ واللہ الموفق

اکابر کا شکوہ: ابھی اوپر حضرتؒ کا ارشاد نقل ہوا کہ بعض سلف سے بھی چونکہ کچھ مسائل میں مبالغہ آمیز کلمات نقل ہوئے تھے، اس لئے بعد والوں نے اس کو اور بھی بڑھا چڑھا کر اختلاف کی خلیج میں اضافہ کردیا۔ قراءۃ خلف الامام کے مسئلہ میں درحقیقت اختلاف صرف اختیار وترک کا تھا جس کو امام بخاری نے ایجاب وتحریم کی شکل دے دی، آپ ہی کی روش ابن خزیمہ، دارقطنی، بیہقی وغیرہ نے اپنائی، اور اس زمانہ کے غیر مقلدین نے تو آسمان سر پر اٹھالیا کہ امام کے پیچھے جہری نمازوں میں بھی اگر کوئی قراءت نہ کرے تو اس کی نماز کو باطل اور کالعدم قرار دینے پر تل گئے۔ جن کے جواب میں پاکستان میں مولانا محمد سرفراز خاں صاحب صفدر نے احسن الکلام دو حصوں میں لکھی اور حضرت مولانا ظفر احمد

صاحب عثمانیؒ نے فاتحۃ الکلام لکھی۔ دونوں نے احقاق کا فریضہ بحسن وخوبی ادا کردیا ہے، جزاھم اللہ خیر الجزاء

جب بات مبالغہ آرائی کی آئی، تو امام بخاری کا ذکر خیر بھی ناگزیر ہوگیا، وہ صحیح بخاری میں تو بڑی حد تک محتاط بھی رہے ہیں مگر باہر ان کا طریق دوسرے مبالغہ کرنے والوں سے الگ نہیں ہوا۔ اور راقم الحروف کا حاصل مطالعہ تو یہ ہے کہ امام بخاری کے علاوہ دوسرے بھی متعدد اکابر نے کچھ مسائل میں جو نہایت شدت وعصبیت کا رنگ اختیار کیا، وہ بھی امام بخاری ہی کا اتباع ہے۔ جس کی طرف حضرتؒ نے بھی اشارہ فرمایا ہے، واللہ تعالے اعلم وعلمہ اتم واحکم

مثال کے طور پر حافظ ابن حجر کا شکوہ تو اکثر ہوتا ہی آیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کا طریقہ بھی ہم نے جلد ص ۱۱ میں زیارت وتوسل وغیرہ مسائل کے تحت ذکر کیا ہے، اوران کے تفردات بھی گنائے تھے، حافظ ابن قیمؒ کی اعلام الموقعین بھی سامنے ہے جو ائمہ مجتہدین کے خلاف شدت وحدت میں لاجواب ہے، بلکہ علامہ موصوف کی دوسری تالیفات قیمہ نافعہ کو پڑھنے والا تو مشکل ہی سے یقین کرتا ہے کہ آپ نے ایسی دل آزار کتاب بھی لکھی ہے، اسی لئے ہندوستان کے غیر مقلدین نے تو اس کا اردو ترجمہ ایسے شوق وولولہ سے شائع کیا ہے کہ گویا دین قیم کی انھوں نے اتنی عظیم الشان خدمت ادا کردی ہے، جس سے ان کے لئے جنت کی اعلیٰ درجہ کی سیٹیں ریزرو ہوگئیں حالانکہ مسائل ائمہ مجتہدین خصوصا حنفیہ کے خلاف ان کے دلائل صرف مبالغہ آرائی اور مغالطہ آمیزی پر مشتمل ہیں، ہم نے اسی لئے پہلے کہیں دو بڑوں کا فرق بھی دکھلایا تھا کہ جتنے حافظ ابن تیمیہ فقہ حنفی کے لحاظ سے ہم سے قریب بلکہ اقرب ہیں، اتنے ہی ابن قیم حنفیہ سے بعید اور ابعد ہیں۔

امام بخاریؒ نے حضرت عبادہؓ والی حدیث کا جتنا حصہ اصح تر تھا، وہ صحیح بخاری میں ذکر کردیا، جس کی سند بھی لاکلام ہے، اور اتنے حصہ سے چونکہ صرف قراءت فی الصلوٰۃ کا وجوب نکل سکتا تھا، اسی لئے باب کا ترجمہ بھی وجوب القراءۃ کا قائم کیا، اور تینوں احادیث الباب سے بھی صرف قراءۃ یا سورۂ فاتحہ کی ضرورت ثابت ہوتی ہے، خلف الامام اور وہ بھی جہریہ کا ثبوت مقتدی کے لئے کسی طرح بھی ان سے نہیں ہوتا، جس میں امام بخاری نے سب سے الگ روش اختیار کی ہے۔

لیکن چونکہ امام بخاری کو اس مسئلہ میں بہت ہی کدواصرار تھا، اس لئے الگ سے مستقل رسالہ تالیف فرمایا، جس کا کچھ تعارف ہم نے اوپر کرایا ہے، مزید یہ کہ دلائل کے علاوہ پورے رسالہ میں جگہ جگہ فقہ حنفی پر تنقید بھی بقول حضرت شاہ صاحبؒ کے درازلسانی کی حد تک کر گئے ہیں۔ اور مبالغہ آرائی بھی رسالہ رفع یدین کی طرح کی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاری کی وہ مثال ہے کہ زور والا مارے اور رونے نہ دے، یہ حضرتؒ کا نہایت ہی اعلیٰ وارفع وسیع ظرف تھا، جس کا اظہار اس مثال سے فرمایا اور ہم نے فتنۂ دیوبند میں بھی حضرتؒ کے صبر وتحمل کی بےنظیر شان دیکھی ہے، لیکن عاجز وضعیف راقم الحروف کے قلب میں اتنی قوت وطاقت صبر وتحمل کہاں؟ اس لئے امام اعظم وفقہ حنفی پر امام بخاری کی تعدی وظلم کی تاب نہ لاکر پہلے بھی رویا ہے (دیکھو مقدمہ انوارالباری ص ۲/۲۱) اور اب بھی امام بخاری کی مار کھا کھا کر برابر روؤں گا اور داستان مظلومیت سب کو سناؤں گا۔

نوارا تلخ ترمے زن چو ذوق گریہ کم یابی۔ عدی را تیز ترخاں چو محمل راگراں بینی۔

اور یہ بھی شاید کسی نے احقر جیسے کے لئے ہی کہا ہوگا ؎ ضبط کروں میں کب تک آہ؟۔ چل مرے خامے بسم اللہ

بحث ونظر: (۱) امام بخاریؒ نے جزءالقراءۃ ص ۵ میں حضرت عبادہ ابن الصامتؓ اور عبداللہ بن عمروؓ سے روایت پیش کی کہ نماز فجر میں کسی مقتدی صحابی نے آپ کے پیچھے قراءت کی تو آپ نے فرمایا کہ ہرگز کوئی شخص امام کی قراءت کے وقت قراءت نہ کرے، بجز ام القرآن کے۔ پھر امام بخاری نے فرمایا کہ دو حدیث ہیں ایک یہ اور دوسری من کان له امام فقراء ة الامام له قراء ة تو اگر یہ دونوں صحیح ہیں تو الا بام القرآن کے ذریعہ فاتحہ کو مستثنیٰ قرار دینا چاہیے، جس طرح حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ساری زمین میرے لئے مسجد وطہور بنادی گئی پھر دوسری حدیث میں الا المقبرہ فرما کر اس

کو مستثنی کر دیا۔اسی طرح فاتحہ کو من کان له امام کے عموم سے خارج کرنا چاہیئے۔اگر چہ اس حدیث میں انقطاع کی علت ہے۔

دوسری بات تارکین قراءت خلف الامام سے یہ کہنی ہے کہ اہل علم اور آپ بھی اس سے متفق ہیں کہ امام قوم کے کسی فرض کا متحمل نہ ہو گا۔تو قراءت کو بھی تم فرض مانتے ہو مگر کہتے ہو کہ اس فرض کو امام اٹھالے گا،جہری نماز ہو یا سری،اور یہ بھی کہتے ہو کہ امام سنتوں میں سے کسی کا متحمل نہ ہوگا،جیسے ثناء،تسبیح،تحمید،تو اس طرح تم نے فرض کو نفل سے بھی کم درجہ کا کر دیا،حالانکہ تم بھی عقل و قیاس سے یہی کہتے ہو کہ نفل فرض کی برابر نہیں ہو سکتا،اور فرض کو تطوع سے کم درجہ کا نہ ہونا چاہیئے۔

اور یہ بھی تمہارے نزدیک معقول ہے کہ فرض یا فرع کو اسی قسم کے فرض کے برابر کرنا چاہیئے،لہٰذا یہی بہتر ہے کہ تم قراءت کو رکوع،جود، تشہد کے برابر کر دو جبکہ یہ سب ایک طرح کے فرض ہیں پھر اگر ان میں کسی فرض میں اختلاف ہو تب بھی قیاس والوں کے نزدیک بہتر یہی ہوگا کہ وہ فرض یا فرع کو فرض ہی کے برابر کریں۔

جواب امام بخاری

امام بخاری نے اپنے رسالہ میں سب سے پہلا اثر حضرت علیؓ کا ذکر کیا،جس میں ان کا ارشاد ہے کہ جب امام جہر سے قراءت نہ کرے تو تم سورۂ فاتحہ پڑھو اور اس کے ساتھ ظہر وعصر کی نماز میں پہلی دو رکعتوں میں کوئی سورت بھی ملاؤ،اور باقی دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھو اور مغرب کی آخری اور عشا کی آخری دو رکعت میں بھی اسی طرح پڑھو،ظاہر ہے کہ غیر جہری رکعات میں جواز قراءت سب کے یہاں ہے جس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔اس کے بعد امام بخاری نے حضرت عبادہ والی روایت ذکر کی جو یہاں صحیح بخاری میں بھی دوسری حدیث الباب ہے۔یہ منفرد وامام کے لئے ہے،خلف الامام کا اس میں ذکر نہیں تو یہ بھی کسی کے خلاف نہیں۔پھر آگے حدیث لائے جس میں فصاعدا ہے تو اس کو گرا گئے،حالانکہ اوپر پہلے ہی اثر علیؓ میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملانے کا ثبوت لا چکے ہیں،پھر اس کو تو گرایا اور خود اسی اپنے رسالہ میں فصاعدا کے ہم معنی کلمات گیارہ جگہ احادیث وآثار میں لائے ہیں۔پھر دوسرا کمال آگے یہ دکھائیں گے کہ اسی حدیث عبادہ کو محمد بن اسحاق کی روایت سے لائیں گے جس میں یہ اضافہ ہے کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں بھی سورۂ فاتحہ ضروری پڑھنی چاہیئے (ورنہ نماز صحیح نہ ہو گی) حالانکہ محمد بن اسحٰق نہایت ضعیف راوی ہیں اور اسی لئے ان کی روایت بخاری میں نہیں لائے،ورنہ اپنی شرط پر زد پڑتی۔غرضیکہ باوجود سخت ضرورت کے بھی کہ ترجمۃ الباب میں دعوئے وجوب قراءۃ خلف الامام کا جہری نماز کے لئے بھی کر چکے تھے،اس روایت محمد بن اسحٰق کو نہیں لا سکے،پھر ایک نکتہ ملاحظہ ہو کہ ص ۵ میں بھی پوری سند ذکر نہیں کی،کیونکہ مجروح راوی محمد بن اسحٰق سامنے آجاتے،اور ص ۱۸ پر جا کر ان کو ظاہر کیا اور اپنی بات پختہ کرنے کے لئے ان کی شان میں شعبہ کا قول ''امیر المحد ثین'' کا نکال لائے۔

معلوم نہیں ایسے بڑے ''امیر المحد ثین'' سے امام بخاری نے اپنی صحیح میں کیوں اجتناب کیا کہ کہیں بھی ساری بخاری میں ایک حدیث بھی ان سے روایت نہیں کی،اگر احکام شرعیہ کی روایات میں وہ ضعیف یا ضعیف تر تھے جیسا کہ سب کہتے ہیں تو سیر ومغازی میں تو وہ معتبر مانے گئے ہیں،امام بخاری نے تو ان سے مغازی میں بھی کوئی روایت نہیں لی۔فیاللعجب؟!

علامہ تاج الدین سبکی نے ابوطاہر فقیہ کو امام المحد ثین والفقہاء لکھا تھا۔جس پر صاحب تحفۃ الاحوذی نے ص ۷۵/۲ میں لکھا کہ امام المحد ثین ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ثقہ اور قابل احتجاج بھی ہو اور محقق نیموی نے ابوعبداللہ فنجویہ دینوری کو کبار محد ثین میں لکھا تو صاحب تحفہ نے ص ۷۵/۲ میں لکھا کہ ان کے کبار محد ثین میں سے ہونے سے یہ ضروری نہیں کہ وہ ثقہ بھی ہوں۔

محمد بن اسحٰق کو ائمہ جرح وتعدیل نے جب کذاب اور دجال تک کہا ہے تو شعبہ کے امیر المحد ثین کہنے سے کیونکر توثیق ہو جائیگی؟

امام احمد ان سے سنن میں احتجاج نہیں کرتے تھے، اور کہا کہ وہ تدلیس کرتے تھے، اور وہ حجۃ نہیں تھے (جن کی حدیث سے استدلال کیا جاسکے) یحیٰ بن معین نے کہا کہ وہ ثقہ تھے، مگر حجت نہیں تھے، امام مسلم نے ان سے صرف متابعات میں روایت لی ہے، امام مالک نے ان کو دجال جیسا جھوٹا کہا۔ ایک روایت میں ہے کہ شعبہ سے سوال کیا گیا آپ محمد بن اسحٰق کی امیر المومنین فی الحدیث کیوں کہتے ہیں تو جواب دیا کہ ان کے حفظ کی وجہ سے (تہذیب ص۴۸/۹)، مگر امام ترمذی نے لکھا کہ بعض محدثین نے ان میں کلام حافظ کی خرابی کی وجہ سے کیا ہے۔ (کتاب العلل ص۲/۲۳۷) غرض متضاد باتیں بھی ہیں۔

حافظ ابن حجر نے بھی محمد بن اسحٰق کی توثیق کے لئے سعی کی ہے، اور یہ بھی کہا کہ امام مالکؒ نے رجوع کر لیا تھا، حالانکہ خطیب بغدادی نے لکھا کہ امام مالک نے جو محمد بن اسحٰق میں کلام کیا ہے، وہ کسی بھی فن حدیث کے واقف سے مخفی نہیں ہے (تاریخ خطیب ص۲۲۴/۱)

امام بخاری نے علی بن المدینی سے بھی توثیق نقل کی ہے، جبکہ ان سے یہ بھی نقل ہوا کہ لوگوں نے محمد بن اسحٰق کی تضعیف اس لئے کی ہے کہ وہ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) سے روایات لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ (تہذیب ص۴۵/۹)

رہی یہ بات کہ بعض مسائل میں حنفیہ نے بھی ان کی روایات ذکر کی ہیں تو وہ بطور استشہاد اور متابعات کے لی گئی ہیں۔

ان کی روایات پر حنفیہ کے مسلک کا مدار کسی مسئلہ میں بھی نہیں ہے، اور اگر کسی حنفی نے ایسا کیا بھی ہو تو یہ اس کی غلطی ہے۔

امام بخاری نے حدیث من کان له امام فقراء ة الامام له قراء ة میں انقطاع کی علت بتلائی، جبکہ اس کی تصحیح کبار محدثین نے کی ہے وہ ہم آگے لکھیں گے۔ اور امام بخاری نے جو عقل وقیاس والے اعتراضات کئے ہیں وہ اس لئے بے محل ہیں کہ امام کے پیچھے جہری نمازوں میں قراءت سے روکنے کی وجہ قرآن مجید اور حدیث نبوی کا اتباع ہے، امام نفل یا فرض کا متحمل ہوگا یا نہ ہوگا یا کس چیز کا تحمل اسکے لئے عقلا درست ہے اور کس کا نا درست، یہ سب موشگافیاں نقلی وشرعی احکام میں لا یسمن و لا یغنی من جوع کے قبیل سے ہیں۔ واللہ تعالےٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

امام بخاری کے قیاسی وعقلی اعتراضات

صاحب نصب الرایہ علامہ محدث محقق زیلعیؒ نے امام بخاریؒ کے عقلی اعتراضات درج شدہ جزء القراءۃ کا ذکر ایک جگہ کر دیا ہے (نصب الرایہ ص۱۹/۲ تا ص۲۱/۲) اور یہ بھی صراحت کر دی کہ یہ اعتراضات حنفیہ اور دوسرے غیر موجبین قراءت خلف الامام پر عائد کئے گئے ہیں۔ مگر جوابات کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ اور سب سے آخر میں امام بخاری کا یہی اعتراض نقل کیا کہ امام جب سنن کا تحمل نہیں کرتا تو اس کو فرض (قراءت) کا بھی تحمل نہ کرنا چاہئے، ورنہ فرض کا درجہ سنن سے بھی کم ہو جائے گا۔ ہمارے دوسرے اکابر نے بھی زیادہ جوابات بخاری کا رخ تحقیقی محدثانہ ہی رکھا ہے، البتہ حضرت اقدس نانوتویؒ نے قیاسی وعقلی جوابات پر بھی توجہ فرمائی ہے۔ جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

حضرت نانوتویؒ کے عقلی جوابات

(۱) امام اور مقتدی کی نماز متحد (ایک) ہے یعنی جماعت سے پڑھی جانے والی نماز عرض (چوڑائی) میں ایک نماز ہے، اور نماز کے ساتھ حقیقۃً امام متصف ہے، اور مقتدی اس کے واسطہ سے نماز کے ساتھ متصف ہے، یعنی مقتدیوں کے وصف نماز کے ساتھ متصف ہونے کے لئے امام واسطہ فی العروض ہے۔

(۲) نماز کی اصل حقیقت قراءت قرآن ہے اس لئے وہ صرف امام کے ذمہ رہے گی، اور جو چیز بالعرض نماز کے ساتھ متصف ہونے کے لئے ضروری ہے، یعنی اقتداء کی نیت اس کی حاجت صرف مقتدیوں کو رہے گی، کیونکہ وہی موصوف بالعرض ہیں البتہ حضوری دربار خداوندی کے لحاظ سے جو چیزیں ضروری ہیں مثلاً رکوع، سجدے، قیام، ثناء وغیرہ ان کی حاجت دونوں کو ہوگی۔

(۳) نماز کو "صلوۃ" اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کی اصل حقیقت دعا ہے، اور دوسری چیزیں قیام، رکوع سجدے وغیرہ اس کے متعلقات

وملحقات ہیں اور دعاء سورۂ فاتحہ میں ہے، جس کا جواب دوسری سورت میں ہے، جو فاتحہ کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ پس یہی دونوں چیزیں نماز کی اصل حقیقت ٹھیریں۔ جو صرف اس شخص کے ذمہ رہیں گی جو نماز کے ساتھ حقیقۃً متصف ہے، یعنی صرف امام کے ذمہ۔

(۴) عبادت نام ہے معبود کی مرضی کے موافق کام کرنے کا، اس لئے شوق عبادت کا تقاضہ یہ ہے کہ معبود ہی سے درخواست کی جائے کہ وہ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرمائے، لہٰذا یہی نماز کی اصلی غرض ہے، یعنی معبود حقیقی کی تعریف اور عظمت و بڑائی بیان کر کے درخواست ہدایت پیش کرنا اور اس کا جو جواب ملے اس کو غور سے سننا۔ اور اسی کے لئے یہ افضل عبادات (نماز) مقرر ہوئی ہے۔

(۵) قیام وغیرہ کو اس طرح سمجھو کہ قیام درخواست حالی ہے کہ نمازی دست بستہ غلاموں کی طرح قیام کی حالت میں سراپا سوال و درخواست بن جاتا ہے، اور ساتھ ہی زبان قال سے بھی اللہ اکبر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا اعتراف کرتا ہے، پھر سبحانک اللھم الخ سے اس کے وصف بے عیبی، اور بابرکت و عالی شان ہونے کا ذکر کرتا ہے، یہ گویا سلام دربار ہے، پھر شیطان سے استعاذہ کر کے، اللہ تعالے کا نام لے کر الحمد شریف پڑھتا ہے، جس میں اول اللہ تعالیٰ کی تعریف، اس کی تربیت عامہ و رحمتِ خاصہ کا تذکرہ کرتا ہے، اس کی مالکیت اور جزاء وسزاء کے اختیار مطلق کا اعتراف کرتا ہے، اس کے بعد ہدایت کی درخواست پیش کرتا ہے، اور اس کا جو جواب ملتا ہے، اسے غور سے سنتا ہے، پس فاتحہ کے بعد قرآن مجید کی دوسری آیات وسورت کا پڑھنا ہی درخواست کا جواب ہے۔ پھر درخواست منظور ہونے کے شکریہ میں نمازی آداب و نیاز بجالاتا ہے، یعنی رکوع و سجدہ کرتا ہے۔

(۶) رکوع کو ایک لحاظ سے سوال حالی بھی کہہ سکتے ہیں کہ نمازی کا اس سے حضرت حق کی طرف میلان اور جھکاؤ ثابت ہورہا ہے، جو ایک سراپا احتیاج کا غنی و مغنی کی طرف ہونا ہی چاہیئے اور اس کے بعد سجدہ میں گر کر اپنے کامل انقیاد و امتثال کو ظاہر کررہا ہے، کہ منقاد کا زیر حکم منقادلہ ہونا اس ذات باری کے ترفع اور اس کے تسفل پر اور اس کے تعزز اور اس کے تذلل پر دلالت کرتا ہے۔

(۷) اگر مقتدی امام کو رکوع کی حالت میں پائے تو مقتدی سے فریضۂ قیام (جو نماز کے اہم ارکان میں سے ہے) ساقط ہو جاتا، اس لئے مقتدی کو چاہیے کہ قیام کی حالت میں صرف تکبیر تحریمہ کہہ کر فوراً امام کے ساتھ رکوع میں جا ملے۔

یہ مسئلہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ مقتدی مجازاً مصلی ہے اور چونکہ اس پر امام کے پیچھے قراءت[1] واجب نہیں ہے، اس لئے رکوع سے پہلے

---

[1] اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام جو بروئے حدیث صحیح ترمذی وابوداؤد وابن ماجہ و مسند احمد (الامام ضامن) اپنے سارے مقتدیوں کا ضامن و کفیل ہے، وہ اصل حقیقت نماز قراءت فاتحہ وسورت کی وجہ سے ہے اسی لئے اس کی قراءت کی وجہ سے مدرک رکوع کو نہ قراءت کی ضرورت رہی نہ قیام کی، اور یہ مسئلہ سب کا متفقہ اجماعی ہے، بجز امام بخاری کے کہ صرف ان کے نزدیک مدرک رکوع مدرک رکعت نہیں ہوتا اور انھوں نے اپنے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ کو بھی ملانا چاہا اور ص ۷ اجزء القراءۃ میں لکھا کہ ادراک رکعت بادراک رکوع کے قائل صحابہ میں سے وہ حضرات تھے جو قرائۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے، لیکن قراءت خلف الامام کے قائل حضرت ابو ہریرہؓ کی رائے یہی ہے کہ رکوع پانے والے مقتدی کی وہ رکعت جب تک محسوب نہ ہوگی کہ وہ امام کو قیام کی حالت میں نہ پالے۔

اس بارے میں گذارش ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی رائے صرف یہ ہے کہ امام کو رکوع سے قبل پالینا چاہیئے، یعنی جھکنے سے قبل شریک ہو جانا ضروری ہے، یہ نہیں ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے قراءت فاتحہ بھی کرلے، تو اس سے حضرت ابو ہریرہؓ کا قائلین وجوب قراءۃ فاتحہ خلف الامام میں شامل کرنا کیسے درست ہو گیا؟ دوسرے یہ کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے جو یہ ثابت ہوا کہ آپ نے فرمایا "اقرأ بھا فی نفسک یا فارسی!" اس کی مراد میں اختلاف ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے فاتحہ کی نہایت اہمیت کا خیال فرما کر یہ چاہا کہ نمازی دل میں ہی ان مضامین کا خیال و دھیان قائم رکھے جو فاتحہ کے ہیں۔ اور حسب تحقیق حضرت نانوتویؒ حقیقت نماز ہی فاتحہ وسورت کی قراءت ہے، اور حدیث صحیح قسمت الصلوۃ الخ سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ نماز کی روح فاتحہ ہی ہے۔ غرض حضرت ابو ہریرہؓ کی بھی سارے اکابر صحابہ سے الگ یہ رائے بظاہر نہیں تھی کہ جہری نماز میں مقتدی امام کے پیچھے قراءت کریں۔ پھر مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۷۷/ا باب من کرہ القراءۃ خلف الامام میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی یہ مرفوع روایت بھی مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: "امام اسی لئے ہے کہ اس کی اتباع کی جائے لہٰذا جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔"

امام بخاری نے اپنے جزء القراءۃ ص ۵ میں حضرت عائشہؓ کی طرف بھی یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ قراءت خلف الامام کے لئے حکم کرتی تھیں، حالانکہ ان کا قول مذکور بھی صرف غیر جہری نماز کے لئے ہے، جہری کے لئے نہیں ہے (اور سری میں سب کے نزدیک گنجائش ہے) (دیکھو فصل الخطاب ص ۳۶)

اس کے لئے قیام بھی فرض نہ رہا۔ قیام قرأتہ ہی کی وجہ سے تھا، جب قراءت اس کے ذمہ نہیں تو قیام کا مطالبہ بھی ختم ہوگیا، پھر باقی رکعتوں میں جو وجوب قیام ہوگا وہ بحکم حضور دربار خداوندی ہے، بحکم صلوٰۃ نہیں۔

(۸) بعض حضرات یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اگر امام موصوف بالذات ہے اور اس وجہ سے امام اور مقتدیوں کی نماز واحد ہے تو مقتدیوں کے ذمہ طہارت، ستر عورت، استقبال کعبہ، رکوع وسجدہ بھی نہ ہونا چاہیئے۔ اس بار کا تحمل بھی قراءت کی طرح صرف امام کے ہی سر رہتا، بلکہ سبحانک، تسبیحات، التحیات، درود و دعا اور تکبیر کو تسلیم بھی جس درجہ میں مطلوب ہیں، امام سے ہی مطلوب ہوتیں، اس کا جواب یہ ہے کہ نماز کی ادائیگی بصورت حضوری دربار خداوندی ہوتی ہے، اور یہ بات اس کے ہر قول وفعل سے ظاہر ہوتی ہے، سبحانک میں کاف خطاب، اہدنا میں صیغۂ خطاب، اور دست بستہ کھڑا ہونا، پھر کبھی جھکنا، کبھی سر زمین پر رکھ دینا، اور نماز سے فارغ ہونے پر دائیں بائیں سلام پھیرنا کہ بوقت نماز گویا اس عالم امکان اور عالم ظلماتی سے باہر عالم وجوب یعنی بارگاہ ذی الجلال والاکرام میں چلا گیا تھا، یہ سب امور بتلاتے ہیں کہ نماز نام ہے حضوری دربار خداوندی کا پھر نماز جماعت میں چونکہ امام واسطہ بنتا ہے خالق ومخلوق کے درمیان، اور اسی لئے وہ سب سے آگے اور قبلہ کی دیوار سے قریب کھڑا ہوتا ہے اور سارے مقتدی اس کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں تو گویا اس وقت امام ومقتدی سب دربار خداوندی میں حاضر ہیں، تو جس طرح احکام دنیا کے دربار میں حاضری کے لئے صفائی پاکی، لباس کی درستگی، بوقت حاضری ان کی طرف توجہ اور آداب دربار کی بجا آوری ضروری ہوتی ہے، اسی طرح دربار خداوندی میں حاضری کے لئے یہ سب امور ضروری ہوں گے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب امور وصف صلوٰۃ (نمازیت) کے تقاضے سے نہیں ہیں، ورنہ **لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب** کے پیش نظر لازم ہوتا کہ شروع سے آخر تک صرف فاتحہ ہی فاتحہ ہوتی، دوسرا کوئی امر نہ ہوتا، پس ثابت ہوا کہ یہ سب دوسرے امور حضوری دربار کے تقاضے سے ہیں، نماز کے مقتضیات نہیں ہیں کہ نماز کی حقیقت اور مقتضی صرف قراءت ہے،

اس کے بعد یہ سمجھنا چاہئے کہ حضوری دربار میں امام ومقتدی سب مشترک ہیں تو اس کے مقتضیات میں بھی سب مشترک رہیں گے، اور نماز کی حقیقت مذکورہ کے لحاظ سے امام تنہا ہے، تو قراءت صرف اس کے ذمہ رہے گی۔

اس تفصیل سے امام بخاریؒ کا یہ اعتراض ختم ہوگیا کہ ثناء، دعاء اور تسبیحات جو چنداں ضروری نہیں ہیں وہ تو مقتدیوں کے ذمہ رہیں اور قراءت بالخصوص فاتحہ (جو نماز کا اہم رکن ہے) مقتدی کے ذمہ نہ رہے، یہ عجیب بات ہے۔

خلاصہ یہ کہ آداب دربار وسلام وغیرہ تو سب ہی حاضران دربار بجالایا کرتے ہیں اور عرض مطلب واستماع جواب کے لئے کسی ایک ہی کو آگے بڑھایا کرتے ہیں، اور وہ بھی جس کو سب سے لائق وفائق خیال کرتے ہیں۔ اس لئے اگر ثناء، تسبیحات، التحیات اور تکبیرات سب ہی بجالائیں، اور قراءت جو درحقیقت عرض مطلب ہے، یہ ادھر کا جواب، وہ فقط امام ہی کے ذمہ پر رہے تو کیا بے جا ہے؟!

آخر میں حضرت نانوتویؒ نے لکھا کہ نماز جماعت کی ایسی معقول ومقبول صورت کے باوجود اگر امام ابوحنیفہؒ پر طعن کئے جائیں اور غیر موجبین قراءت خلف الامام پر الزامات دھرے جائیں تو یہ انصاف کی راہ نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم حضرت گنگوہیؒ کے نقلی جوابات کا بھی خلاصہ پیش کرتے ہیں:۔

حضرت گنگوہیؒ کے نقلی جوابات:

حضرتؒ نے جو مستقل رسالہ (ہدایۃ المعتدی فی قراءۃ المقتدی) زیر بحث مسئلہ پر لکھا تھا، اس کا جو خلاصہ اعلاء السنن ص ۴/۱۱۵ میں نقل کیا گیا ہے اس کو یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

(۱) قراءت خلف الامام ابتداء اسلام میں تھی، محدث بیہقیؒ نے روایت پیش کی کہ صحابہ کرام حضور علیہ السلام سے تلقی کرتے تھے کہ

جب آپ قراءت فرماتے تو وہ بھی آپ کے ساتھ قراءت کرتے تھے، حتی کہ سورۂ اعراف کی آیت اتری و اذا قریٔ القرآن فاستمعوا له وانصتوا، اس کے بعد آپ پڑھتے تھے تو وہ خاموش رہتے تھے۔

دوسری روایت بیہقی وعبد بن حمید وابوالشیخ نے نقل کی کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھتے اور قراءت کرتے تو آپ کے اصحاب بھی قراءت کرتے تھے، پھر آیت فاستمعوا له وانصتوا اتری تو سب لوگوں نے سکوت اختیار کیا اور صرف حضور علیہ السلام پڑھتے تھے۔

نیز بیہقی، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے روایت کی کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی تو کچھ لوگوں کو سنا کہ وہ آپ کے پیچھے قراءۃ کرتے تھے، آپ نے نماز کے بعد فرمایا:۔ کیا تمہارے لئے وقت نہیں آیا کہ تم آیت قرآنی و اذا قریٔ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کا مطلب سمجھو۔

(۲) مذکورہ روایات سے ثابت ہوا کہ قراءۃ خلف الامام شروع زمانہ میں تھی، پھر آیت مذکورہ سے منسوخ ہوگئی۔ اور جس نے یہ کہا کہ آیت مذکورہ خطبہ کے بارے میں اتری تھی، وہ ہرگز صحیح نہیں ہے، کیونکہ اول تو جمعہ کی فرضیت مدینہ طیبہ میں ہوئی، اور جو لوگ مکہ معظمہ میں کہتے ہیں، وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ حضور علیہ السلام اس کو مکہ معظمہ میں قائم نہ کرسکے تھے، اور جب وہاں جمعہ نہیں پڑھا گیا تو خطبہ کیسے ہوا اور کس طرح صحابہ نے اثناء خطبہ میں کلام کیا، جس پر آیت مذکورہ اتری؟ اگر کہا جائے کہ صرف یہ آیت مدینہ طیبہ میں اتری ہوگی، تو یہ بھی غلط ہے، کیونکہ سارے محدثین ومفسرین نے پوری سورۂ اعراف کو بلا کسی آیت کے استثناء کے مکیہ کہا ہے، پھر یوں بھی حکم عموم لفظ پر ہوتا ہے خصوص مورد پر نہیں، لہٰذا قرآن مجید کی تلاوت کے وقت استماع وانصات کا حکم عام ہی رہے گا، اور جن بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ، نماز وخطبہ دونوں کے بارے میں اتری ہے ان کا مطلب بھی یہ ہے کہ آیت کا حکم دونوں کو شامل ہے۔

(۳) غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ قراءۃ مقتدی آیت مذکورہ کے ذریعہ مکہ معظمہ ہی میں منسوخ ہوگئی تھی، اور اس سے مہاجرین سابقین واقف بھی ہوگئے تھے، جیسے عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ، پھر جب حضور علیہ السلام نے مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی، اور نماز جماعت کبیرہ کے ساتھ ہونے لگی۔ جس میں نسخ قراءت خلف الامام سے واقف مہاجرین سابقین بھی تھے، اور اس سے ناواقف دوسرے حضرات بھی تھے، لہٰذا کچھ لوگوں نے آپ کے پیچھے قراءت کی، اور وہ آپ پر بھاری ہوئی اور وہ تھی بھی بغیر آپ کے حکم وعلم کے۔ اسی لئے حسب روایت حضرت عبادہؓ آپ نے نماز کے بعد فرمایا:۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنے امام کے پیچھے پڑھتے ہو، دوسری روایت میں ہے کہ شاید تم پڑھتے ہو، ایک اور روایت میں بطور سوال فرمایا کیا تم پڑھتے ہو؟ تو اگر ان کی قراءت آپ کے علم وحکم سے ہوتی تو ظاہر ہے اس طرح استفسار نہ فرماتے۔ بلکہ آپ کے علم میں یہ ہوگا کہ آیت اعراف کی وجہ سے سب ہی صحابہ نے قراءت ترک کردی ہوگی، اور جب ان کی قراءت کا علم واحساس ہوا تو وہ آپ پر گراں ہوئی اس لئے استفسار فرمالیا، اور ان کے اعتراف کے بعد منازعت امام سے ان کو روک دیا جس سے سکتات کے اندر ان کو قراءۃ بلا منازعت کی اجازت پھر بھی باقی رہ گئی۔

(۴) بعض حضرات سے حکم مذکور کی رعایت نہ ہوسکی، اور مکرر حضور علیہ السلام پر ان کی قراءۃ بارخاطر ہوئی تو آپ نے پھر ان کو قراءۃ سے روکا اور صرف فاتحہ پڑھنے کی اجازت سکتوں کے اندر باقی رکھی۔ کیونکہ اس میں منازعت کم تھی کہ وہ اکثر لوگوں کو یاد تھی، سہولت سے اس کو سکتوں کے اندر تیزی سے پڑھ سکتے تھے۔

(۵) پھر جب نماز جماعت میں اور بھی زیادہ اجتماع ہونے لگا، اور ان کی محتاط سری قراءت سے بھی تشویش کی صورت پیدا ہوئی تو آپ نے ان کو اذا قرأ فانصتوا اور من کان له امام فقراء ته له قراء ۃ فرما کر بالکل ہی قراءت سے روک دیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(نوٹ) صاحب اعلاء السنن نے حضرت گنگوہیؒ کے ارشادات ختم کر کے لکھا کہ توجیہ مذکور بہت اچھی ہے جس سے ساری روایات

جمع ہو جاتی ہیں، لیکن اس میں بعض احادیث کے تقدم کا اور بعض کے تاخر کا دعوے، بغیر تاریخی معرفت و وثوق کے محل تامل ہے البتہ ہمارے حنفی اصولیین کا یہ قاعدہ یہاں چل سکتا ہے کہ جہاں تقدم و تاخر کا یقینی علم نہ ہو سکے تو ممانعت والی احادیث احادیث مبیحہ کے لئے ناسخ ہوتی ہیں۔ واللہ تعالےٰ اعلم (۔۔۔۷/۱۱۷/۴)

حضرت گنگوہیؒ نے اپنے رسالہ میں منقولات وقرائن کے ذریعہ یہ بھی ثابت فرمایا کہ اکثر صحابہ کرام کا مذہب مطلقا ترک قراءۃ خلف الامام تھا اور یہ بھی محقق کیا کہ قراءۃ خلف الامام والی روایات الباب سے وجوب قراءۃ ثابت کرنا صحیح نہیں ہے۔ وغیرہ پورا رسالہ پڑھنا چاہیے۔(امام بخاری کا استدلال صحابہ وتابعین سے) ص ۵ جزء القراۃ میں امام بخاری نے بہت سے صحابہ وتابعین کے نام لکھے اور ان کو قائلین قراءت خلف الامام کے زمرے میں شامل کیا، حالانکہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مطلقا اس کے قائل نہ تھے، بلکہ سری نمازوں میں یا جہری میں سکتات کے اندر پڑھنے کے قائل تھے، جس کا کوئی مخالف نہیں ہے، حضرت حسن بصری اور سعید بن جبیرؒ سے بھی سکتۂ امام کے وقت یا دل میں پڑھنے کی قید ہے، اور مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۷۶/۱ میں حضرت عمرؓ حضرت علیؓ، حضرت زید بن ثابت وغیرہ صحابہ سے قراءت خلف الامام کی مخالفت ثابت ہے، اور امام بخاری نے حضرت عائشہؓ کی طرف بھی امر قراءۃ خلف الامام کی نسبت غلط کی ہے، کیونکہ ان کا قول بھی غیر جہری کے لئے ہے۔

امام بخاری اور سکتات کی بحث

جزء القراءۃ ص ۶ میں امام بخاریؒ نے بعض آثار سے یہ ثابت کیا کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں قراءۃ فاتحہ سکتات کے اندر ہونی چاہیے، چونکہ اسی بات کو امام بخاری آگے ص ۲۹ میں مستقل باب قائم کر کے لائیں گے، اس لئے یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ حافظ ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ وغیرہ میں اس کی تضعیف کے لئے بہت کافی لکھدیا ہے، جس کو غالباً اس زمانہ کے غیر مقلدین بھی ضرور تسلیم کریں گے۔

پھر اس کے بعد امام بخاری نے امام اعظمؒ پر سخت لہجہ میں اعتراضات کئے ہیں، مثلاً یہ کہ انھوں نے قراءت بالفارسی کی اجازت دی حالانکہ یہ مسئلہ رجوع شدہ ہے، اور یہ کہ انھوں نے فرض کو تطوع سے کم درجہ میں کر دیا، اور بعض امور شرعیہ میں حضور علیہ السلام کے ارشادات کے برعکس حکم کر دیا ہے، ان سب اعتراضات کی حقیقت اور جوابات ہم الگ سے ایک جگہ کر کے تحریر کریں گے، ان شاء اللہ۔

اثر حضرت عمرؓ وغیرہ: ص ۷ میں امام بخاریؒ نے حضرت عمرؓ کا اثر ذکر کیا کہ وہ امام کے پیچھے بھی قراءت کی اجازت دیتے تھے اور حضرت ابی بن کعب سے بھی ایسا ہی نقل کیا، لیکن ان دونوں اثر میں جہری کی صراحت نہیں ہے، اور سری میں سب جواز کو مانتے ہیں، پھر حضرت علیؓ سے نقل کیا کہ وہ ظہر وعصر میں قراءتِ فاتحہ وسورت پڑھنے کو اچھا سمجھتے تھے، تو یہاں تو جہری کی خود ہی نفی موجود ہے دوسرے یہ کہ امام بخاری وغیرہ فاتحہ کی طرح سورت پڑھنے کے قائل نہیں ہیں، تو یہ ان کی تحقیق فصاعداً والی کے خلاف ہوگا۔

روایت محمد بن اسحٰق وغیرہ: ص ۸ میں امام بخاریؒ نے وہی حضرت عبادہ والی روایت محمد بن اسحٰق کے واسطہ سے نقل کی، جس کے کمال ضعف کا حال ہم پہلے لکھ چکے ہیں، پھر ص ۹ میں روایت ابو قلابہ عن محمد بن ابی عائشہ عن من شھد ذلک نقل کی، اس میں یہ بڑی کمزوری ہے کہ ابو قلابہ اگرچہ ثقہ تھے، مگر نمبر ایک کے مدلس تھے، کہ بقول علامہ ذہبی ان سے بھی تدلیس کرتے ہیں جن سے ملے ہیں اور ان سے بھی جن سے نہیں مل سکے، (میزان ص ۲/۳۹)

علماء اصول حدیث کا یہ فیصلہ ہے کہ حدیث صحیح کی صفت یہ ہے کہ اس میں حضور علیہ السلام سے روایت ایسے صحابی کے ذریعہ ہو، جس کے نام وغیرہ میں کوئی جہالت نہ ہو، یعنی وہ پوری طرح معلوم ومشخص ہو (معرفۃ علوم الحدیث) مقدمہ مسلم وغیرہ) علامہ جزائری نے اس کی وجہ بھی بیان کی کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں منافق بھی تھے اور مرتد بھی، جب تک راوی صحابی کا نام نہ بتلائے گا اور اس کا صحابی ہونا معلوم نہ ہوگا اس

کی روایت قابل قبول نہ ہوگی۔الخ پوری تفصیل اور استدلال بخاری وبیہقی کا جواب احسن الکلام ص۸۹ تاص ۹۳ جلد دوم میں قابل مطالعہ ہے۔

حدیث سیدنا حضرت ابو ہریرہؓ: ص۱۰ وص۱۱ میں امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی آٹھ روایات درج کی ہیں ان میں سے کسی میں یہ ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی، یہ سب ہی کو تسلیم ہے، کیونکہ حنفیہ بھی بغیر فاتحہ کی نماز کا اعادہ ضروری بتلاتے ہیں البتہ اس حدیث کو سارے ائمہ نے صرف منفرد کے لئے قرار دیا ہے، ترمذی شریف میں خود راوی حدیث اور حضرت امام احمدؒ سے نقل ہوا کہ یہ حکم تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے ہے یا امام کے لئے۔مقتدی کے لئے نہیں ہے۔

اور کسی حدیث میں ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز ناقص ہوگی، یہ بھی سب کو تسلیم ہے، اور مقتدی کے لئے جہری نماز میں سب یہ کہتے ہیں کہ امام کی قراءت مقتدی کے لئے کافی ہے، لہٰذا اس کی نماز بھی بغیر فاتحہ کے نہ ہوئی۔

حدیث قدسی: ایک حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:۔ میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے درمیان نصفا نصفی کر کے تقسیم کر دیا ہے، جب وہ **الحمد للّٰہ رب العالمین** کہتا ہے تو اس نے میری حمد کی، اور اس کو جو چاہے گا ملے گا، پھر وہ **الرحمن الرحیم** کہتا ہے تو اس نے میری ثناء کی اور اس کو جو چاہے گا ملے گا، پھر وہ **مالک یوم الدین** کہتا ہے تو اس نے میری بڑائی بتلائی، پھر وہ **ایاک نعبد وایاک نستعین** کہتا ہے تو یہ آیت آدھی میری ہے اور آدھی بندے کے لئے، پھر وہ عرض کرتا ہے۔**اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین**۔ یہ سب بندے کے لئے ہیں، اور میرے بندے کو وہ سب ملے گا جس کی اس نے خواہش کی۔ درحقیقت یہ حدیث البخاری کامل ومکمل طور سے ہماری حجت ہے، کیونکہ اس میں پوری نماز کی حقیقت سورۂ فاتحہ بتلائی گئی ہے، اور اس کی قراءت نماز میں سب کے نزدیک منفرد وامام کے لئے ضروری ہے، اور پہلے مقتدی بھی امام کے ساتھ پڑھا کرتے تھے جیسا کہ اوپر بیان ہوا لیکن جب سے آیت مکیہ "**واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا**" نازل ہوئی، مقتدیوں نے امام کے پیچھے قراءت کو اب قراءۃ امام کے خلاف سمجھا اور تعمیل ارشاد خداوندی میں صرف استماع وانصات کو اختیار کر لیا، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قراءت مقتدی کا ترک کسی اور وجہ سے نہیں ہے کہ غیر موجبین پر عقلی اعتراض کیا جائے کہ انھوں نے فرض کو تطوع سے کم درجہ میں کر دیا وغیرہ۔

اثر عطاء کا جواب: امام بخاریؒ نے ص۱۴ میں حضرت عطا کا اثر ذکر کیا کہ امام جب جہری قراءت کرے تو اس سے پہلے یا بعد اس کے سکوت کے سورۂ فاتحہ پڑھ لے، لیکن جب امام قراءت کر رہا ہو تو خاموش رہے **لقوله عزوجل واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا**۔ حضرت عطاء کا فتویٰ مذکورہ بھی امام بخاری اور غیر مقلدین کے موافق نہیں ہے، بلکہ حنفیہ وغیرہم کے موافق ہے، کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ آیت مذکورہ حضرت عطا کے نزدیک بھی قراءت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے خطبہ کے بارے میں نہیں جو امام بخاری کا خیال ہے، اور ہم بھی اس سے منع نہیں کرتے کہ کوئی موقع مل سکے تو پڑھ لے، جیسے سری میں جواز ہے، مگر وجوب نہیں مانتے، نہ امام بخاری وابن حزم کے علاوہ اکابر امت میں سے کوئی امام کے پیچھے اس کا قائل ہوا ہے۔

حدیث حضرت انسؓ سے استدلال: ص۲۸ جزء القراءۃ میں امام بخاریؒ نے حدیث انسؓ سے استدلال کیا، حالانکہ یہ روایت بھی ضعیف ہے کیونکہ اس میں ابوقلابہ مدلس موجود ہیں اور مدلس کا عنعنہ مقبول نہیں ہوتا۔اس روایت میں ابوقلابہ نے عن انس روایت کی ہے، دوسرے اس کی سند میں اضطراب بھی ہے یہاں بھی جزء القراءۃ کے اندر کسی میں عن انس اور کسی میں عن النبی ﷺ ہے، اور دار قطنی وبیہقی وغیرہ میں عن محمد بن ابی عائشہ عن رجل من اصحاب رسول اللہ ﷺ ہے، اور متن میں بھی اضطراب ہے کہ یہاں جزء القراءت کی ایک روایت میں **ولیقرأ احدکم بفاتحة الکتاب فی نفسه** اور دوسری میں صرف **لیقرأ بفاتحة الکتاب** ہے کتاب القراءۃ کی ایک روایت میں یہ عبارت **فلا تفعلوا** پر ختم ہوگئی ہے دوسری میں جملہ استثنائیہ بھی ہے، پھر فی نفسہ کا مطلب دل میں پڑھنے کے بھی ہیں یا دھیان کرنے کے، لہٰذا اس سے قراءت خلف الامام

کا ثبوت نہ ہوگا۔ نیز حضرت انسؓ سے بسند صحیح یہ روایت مروی ہے کہ جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو (کتاب القراءۃ ص ۹۲)

اثر سعید بن جبیر کا جواب

امام بخاریؒ نے جزء القراءۃ ص ۲۹ میں حضرت سعید بن جبیرؒ کا فتوے نقل کیا ہے کہ ان سے عبداللہ بن عثمان بن خثیم نے سوال کیا کہ کیا میں امام کے پیچھے قراءت کروں؟ فرمایا ہاں! اگرچہ تم اس کی قراءت بھی سنتے ہو، لوگوں نے نیا طریقہ نکالا ہے جو سلف نہیں کرتے تھے، سلف کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی امام ہوتا تو وہ تکبیر کہہ کر خاموش رہتا تھا یہاں تک کہ اس کے خیال میں مقتدی فاتحہ پڑھ لیتے تھے، پھر وہ قراءت کرتا اور مقتدی خاموش رہتے تھے۔

اس سے حالت سکتہ میں قرائۃ کا ثبوت ہوا، جن سے کسی کو اختلاف نہیں، اور وجوب کی کوئی دلیل نہیں، کیونکہ امام پر سکتہ طویلہ کا واجب ہونا کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہوا، حافظ ابن تیمیہ بھی یہی کہتے ہیں، پھر یہ کہ تکبیر تحریمہ کے بعد کا سکتہ تو ثنا کے لئے ہے، جس میں امام بھی ثنا پڑھتا ہے، اور یہ مختصر وقفہ ہوتا ہے اور دونوں سورتوں کو جدا کرنے کے لئے امام کے ساتھ آمین کا توافق ہونا چاہئے، اور اس طرح یہاں مقتدیوں کی آمین ان کی فاتحہ سے قبل ہو جائے گی جو قلب موضوع ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۷۷/۱ میں حضرت سعید بن جبیرؒ کا فتوی دوسری طرح ہے کہ ان سے قراءت خلف الامام کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ امام کے پیچھے قراءت نہیں ہے۔ اس کے سب راوی ثقہ ہیں جن سے اصحاب صحاح نے احتجاج کیا ہے لہٰذا ان کا جو فتوے نص قرآنی **واذا قرئ القرآن فاستمعوا له و انصتوا** اور حدیث صحیح **واذا قرأ فانصتوا** اور حدیث صحیح **من کان له امام فقراء ته له قرائة** کے موافق ہوگا وہی راجح و صحیح ہوگا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا:۔ جب تم امام کی قراءت نہ سن رہے ہو تو اگر چاہو اپنے دل میں پڑھ لیا کرو۔ (مصنف ص ۳۷۴/۱)

ایک روایت امام ابن جریر نے عبداللہ بن مبارک کے طریق سے روایت کی کہ ثابت بن عجلان نے حضرت سعید بن جبیرؒ سے سنا کہ آیت **اذا قرئ القرآن** خطبہ، جمعہ اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت کی ممانعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے (تفسیر ابن کثیر ص ۲۸۳/۲)

آخر میں یہ امر بھی امام بخاری کے استدلال کے سلسلہ میں قابل ذکر ہے کہ ان کی اس روایت میں ایک راوی عبداللہ بن رجا مکی ہے جس کے لئے امام احمد و اوزاعی نے کہا کہ اس کی روایت میں نکارت ہوتی ہے، ساجی نے ''عندہ مناکیر'' کہا (میزان ص ۳۷/۲ و تہذیب ص ۲۱۱/۵) دوسرا راوی عبداللہ بن عثمان بن خثیم ہے، امام رجال یحیی بن معین نے کہا کہ اس کی احادیث قوی نہیں ہیں۔

ابو حاتم نے کہا کہ قابل احتجاج نہیں۔ امام نسائی نے اس کو لین الحدیث کہا (میزان الاعتدال ص ۵۶/۲) ابن حبان نے صاحب خطا کہا، ابن المدینی نے منکر الحدیث بتلایا، (تہذیب ص ۳۱۵/۵) دار قطنی نے کہا کہ دوسرے محدثین نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ (نصب الرایہ ص ۳۵۳/۱)

امام بخاریؒ کے دلائل نمبر ۲ اور اعتراضات رسالۂ جزء القراءۃ میں

اوپر ہم نے امام بخاریؒ کے دلائل نمبرا جہریہ نمازوں میں وجوب قراءۃ خلاف الامام کے مع جوابات ذکر کئے ہیں، ان کے علاوہ یا تو انہوں نے وہ احادیث و آثار پیش کئے ہیں جن سے مطلقاً قراءۃ فاتحہ کا ثبوت ہوتا ہے۔ یا مطلقاً قرائۃ خلف الامام کا، کہ جہری وسری کی تعیین کچھ نہیں ہے اور ہم نے اوپر بتلایا ہے کہ نماز کے لئے ہمارے سب کے نزدیک بھی نہ صرف مطلق قرائۃ قرآن مجید ضروری، بلکہ تعیین کے ساتھ سورۂ فاتحہ کے ساتھ چند آیات یا سورت کا پڑھنا بھی ضروری ہے، ورنہ نماز قابل اعادہ ہوگی۔ اختلاف صرف اقتدا کی صورت میں ہے کہ سارے صحابہ و تابعین، ائمۂ مجتہدین، محدثین و مفسرین جہری نماز میں امام کے پیچھے وجوب قرائۃ فاتحہ کے منکر ہیں، حتیٰ کہ امام شافعیؒ کا بھی

آخری فیصلہ یہ ہے کہ صرف اس صورت میں کہ امام کی آواز مقتدی کو نہ آرہی ہو تو فاتحہ پڑھ لے۔ اس قید سے معلوم ہوا کہ، اگر آواز آرہی ہو تو بغیر پڑھے بھی نماز صحیح ہو جائے گی۔

امام بخاری وغیرہ کے خلاف امام احمد کا اہم فیصلہ

اور یہی مذہب امام احمد کا بھی ہے، اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ اہل اسلام میں سے کوئی بھی یہ کہتا ہو کہ جس نے امام کے پیچھے قرائۃ فاتحہ نہ کی۔ اس کی نماز نہ ہوگی چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ و تابعین اور اہل حجاز میں امام مالک، اہل عراق میں سفیان ثوری، اہل شام میں اوزاعی، اہل مصر میں لیث بن سعد، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جب امام قرائۃ کر رہا ہو اور مقتدی قراءت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہے۔ (مغنی ابن قدامہ ص ۱۱۶۰۶)

اس سے معلوم ہوا کہ جہری نماز میں امام احمدؒ کے زمانہ تک کوئی بھی اس امر کا قائل نہ تھا، جس کے قائل امام احمد کے بعد سب سے پہلے امام بخاری ہوئے اور ان کی وجہ سے کچھ شافعیہ بھی وجوب کے قائل ہوئے، مثلاً ابن خزیمہ و بیہقی وغیرہ (کما حققہ الشیخ الانورؒ) اور کچھ شافعیہ بھی اس لئے وجوب کے قائل ہو گئے کہ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ امام شافعی کا جدید قول وجوب کا تھا، حالانکہ کتاب الام کی آخری جلد نمبرے میں امام شافعی کا قول عدم وجوب کا آچکا تھا، اور امام احمد کی تصریح بھی یہی بتلا رہی ہے جو امام شافعیؒ کے مذہب سے بھی پورے واقف تھے، مگر کچھ لوگ اس مغالطہ میں پڑ گئے کہ کتاب الام امام شافعی کی طرف منسوب قدیم تالیف ہے۔ حالانکہ وہ جدید اور زمانۂ قیام مصر کی ہے۔

امام بخاری اور غیر مقلدینِ زمانہ

امام بخاری کے بعد جہری میں وجوب کے قائل ابن حزم ظاہری ہوئے ہیں اور ان کے بعد ہندو پاک کے غیر مقلدین، جو دعوے کرتے ہیں کہ اگر جہری نماز میں امام کے پیچھے مقتدی نے فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز باطل اور کالعدم ہوگی جیسے اس نے نماز پڑھی ہی نہیں۔ اور اپنے اس غلط دعوے کو ثابت کرنے کے لئے پوسٹر اور رسالے لکھ کر شائع کرتے ہیں اور عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔

مخالفین امام احمد کے لئے حنابلہ کی سرپرستی

بڑی حیرت اس پر ہے کہ امام احمد کے مذکورہ بالا صریح فیصلے کے خلاف کرنے والوں کو سعودی حکومت کی سرپرستی اور بڑی بڑی امدادیں مل رہی ہیں، جس حکومت کے علماء داعیان کا مذہب حنبلی ہے۔

مسئلہ طلاق ثلاث اور غیر مقلدین کا فتنہ:

اسی طرح یہ غیر مقلدین جو اپنے کو سلفی بھی کہتے ہیں امام احمدؒ کے صریح فیصلہ کے خلاف ایک ساتھ تین طلاق دینے والے کا نکاح فسخ نہیں مانتے اور سارے ہندو پاک کے مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ ایسے آدمی اپنی بیویوں سے بدستور تعلق رکھیں، اور امام احمد و دیگر سارے ائمۂ مجتہدین، اور سلف و خلف کے خلاف حرام کو حلال بتلاتے ہیں۔ مولانا عامر عثمانی مرحوم نے ان لوگوں کے اس فتنہ سے متاثر ہو کر "تجلی" کے تین نمبر ضخیم نکالے تھے جن میں غیر مقلدین اور ارکان جماعتِ اسلام کے ان تمام مضامین کا جو یہاں شائع ہوئے تھے، مکمل و مدلل رد کیا تھا، اور پوری تحقیق و مطالعہ کے بعد سلف و جمہور اہلِ سنت کی نہایت موثر انداز میں تائید کی تھی۔ مرحوم نے اس سلسلے میں راقم الحروف سے بھی رابطہ قائم کیا تھا اور کچھ معلومات طلب کی تھیں۔ وہ تینوں نمبر جو بھی پڑھے گا، یقیناً مسلک جمہور کی حقانیت کا قائل ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے غیر مقلد بھائیوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر اپنی ریشہ دوانیوں میں مشغول رہتے ہیں۔

سعودی حکومت سارے عالم اسلامی کی نمائندہ مرکزی حکومت ہے، اس لئے وہاں کے اعیان وعلماء کو سارے ہی صحیح الخیال مسلمانانِ عالم سے رابطہ رکھنا چاہئے اور ان کو اپنے یہاں نمائندگی دینی چاہئے تا کہ اس کا کوئی اقدام غلط نہ ہو، وہاں کا مسلک حنبلی ہے اور رد شرک و بدعت کے سلسلے میں ان کے لئے سب سے قریب تر حنفی مسلک ہے، اور ہندو پاک کے علماء دیو بند اس کے صحیح ترجمان ہیں۔ اس لئے ان کے مفید علمی و مذہبی مشورہ سے سعودی اعیان وعلماء کو مستفید ہونا چاہئے۔ واللہ الموفق۔ اب جزء القرائۃ کی تحقیقات ملاحظہ ہوں:۔

بغیر فاتحہ کے عدمِ جوازِ صلوٰۃِ مقتدی

امام بخاری نے ابتداء سے ہی یہ ثابت کرنے کی سعی فرمائی کہ بغیر فاتحہ کے کسی کی نماز نہیں ہوتی، جو آج کل غیر مقلد بھی دعوے کے ساتھ کہتے ہیں اور شروع صفحہ میں ہی یہ بھی فرمایا کہ جس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نماز کے لئے فاتحہ کے ساتھ کچھ اور بھی قرائۃ قرآن مجید میں سے کرنی چاہئے، وہ زیادتی فصاعداً کے لفظ سے ناقابلِ ثبوت ہے، حالانکہ خود ہی سب سے پہلے جو اثر حضرت علیؓ کا پیش کیا ہے اس میں انہوں نے بھی غیر جہری نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ کے ساتھ پہلی دو رکعتوں میں سورت ملانے کو فرمایا ہے، اور بعد کی رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھنے کو فرمایا۔ ظاہر ہے کہ جب حضرت علیؓ نے امام کے پیچھے بھی غیر جہری میں فاتحہ کے ساتھ سورت پڑھنے کو فرمایا تو بغیر امام کے منفرد کے لئے تو بدرجۂ اولیٰ یہ حکم ہوگا، اور حنفیہ تو امام و منفرد کے لئے پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ وسورت دونوں کو واجب مانتے ہیں جبکہ دوسرے سب حضرات شافعیہ وغیرہ دوسری سورت ملانے کو صرف مسنون یا مستحب کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ امام بخاری نے لفظِ فصاعداً کو تو گرایا ہے مگر اگلے ہی صفحہ پر ما زاد اور ما تیسر کی احادیث کو بغیر نقد کے مان لیا ہے، اور اسی طرح اپنے رسالہ میں گیارہ جگہوں میں اس کے مرادف الفاظ کو مان لیا ہے اور مطلب سب کا ایک ہی ہے، لیکن سب کا زور فاتحہ کے اثبات اور زائد کے اسقاط پر ہے، کیونکہ حنفیہ کے سوا ان سب نے سورت ملانے کو واجب ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

سری وسکتات میں جوازِ قرأت

یہ بات پہلے بھی واضح کر دی گئی ہے کہ امام کے پیچھے سری نمازوں میں یا جہری نمازوں میں سکتات کے اندر مقتدی فاتحہ پڑھ سکے، تو اس کو حنفیہ بھی منع نہیں کرتے، صرف حالتِ جہرِ امام بالقرائۃ میں خاموش رہ کر اس کی قرائۃ سنے گا، اور یہاں تک امام بخاری وابن حزم کے سوا ساری امت متحد ہے، نہ کسی کے نزدیک امام کے پیچھے جہری نماز میں قرائۃِ فاتحہ واجب ہے نہ ثابت ہے، اسی لئے امام احمد نے اوپر کا فیصلہ دوٹوک کر دیا ہے، مگر امام بخاری کو نہایت اصرار ہے کہ سب کے اجماعی فیصلہ کے خلاف مقتدی پر فاتحہ پڑھنے کو واجب ضرور ثابت کر کے رہیں گے اور اگر چہ اس بارے میں ساری امت کے اکابر متفق ہیں، مگر شاید انہوں نے اپنے زعم میں سب سے زیادہ کمزور امام اعظمؒ اور ان کے تبعین کو سمجھا تھا، اس لئے نزلہ صرف اسی عضوِ ضعیف پر گرانے کی سعی کی ہے، چنانچہ ص۴ وص۵ پر اعتراضات کی بھرمار کر دی ہے، تفصیل ملاحظہ ہو۔

دعویٰ وجوبِ قرأۃ للمقتدی

ص۴ میں باب وجوب القرائۃ باندھا جس میں امام ومقتدی پر کم سے کم کتنی قرائۃ فرض ہے، وہ بتلائی ہے، پہلے آیت لائے ''فاقروا ما تیسر منه (جتنی قرائۃ آسان ہو وہ پڑھو) پھر دوسری آیت اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا ذکر کی اور لکھا کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس کو مکتوبہ وخطبہ کے لئے بتلایا ہے، پھر ابوالدرداء کی حدیث نقل کی کہ ہر نماز میں قرائۃ ضروری ہے، یہاں تک تو نماز کے لئے قرآن وحدیث سے خود امام بخاری کے ہی اقرار سے صرف قرائۃِ قرآن ضروری تھی۔ جو ترجمۃ الباب سے بھی مطابق ہے، آگے امام بخاری

اپنے خصوصی مسلک کی طرف بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خبرِ متواتر سے ثابت ہوا کہ نماز بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی۔ اور امام اعظم پر تعریض کی کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پہلی دو رکعتوں میں فارسی زبان میں صرف ایک ایک آیت کا ترجمہ کافی ہے اور آخر کی دو رکعت میں کچھ نہ پڑھے، حالانکہ ابوقتادہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ چاروں رکعت میں قرائۃ کرتے تھے، اور بعض لوگ (امام اعظمؒ) یہ کہتے ہیں کہ چاروں میں کچھ بھی نہ پڑھے تو نماز ہو جائے گی، حالانکہ یہ بات ارشادِ نبوی کے خلاف ہے کہ نماز بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی۔

شبہ وجواب: پھر امام بخاری نے فرمایا کہ اگر یہ بعض لوگ اس امر سے استدلال کریں تو نبی کریم ﷺ نے تو لاصلوٰۃ فرمایا ہے، لایجزی تو نہیں فرمایا کہ بالکل صحیح ہوگی ہی نہیں کیونکہ نماز نہیں کا مطلب تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کامل نماز بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی، جیسے حدیث میں ہے کہ مسجد سے قریب رہنے والے کی نماز بغیر مسجد کے نہیں ہوتی، حالانکہ ہو جاتی ہے صرف کمال کی نفی ہے یا حدیث میں ہے کہ کھانا سامنے آجائے تو بغیر کھائے نماز نہیں، حالانکہ ہو جاتی ہے، البتہ کامل جب ہی ہے کہ پہلے کھانا کھا کر پھر اطمینان سے دل جمعی کے ساتھ پڑھے، بھوک کی حالت میں اور وہ بھی کھانا سامنے آجانے پر، اگر نماز پڑھے گا تو دل بجائے نماز کے کھانے میں رہے گا اور اس نوع کی اور بھی احادیث وارد ہیں۔ امام بخاری نے فرمایا کہ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی حدیث ثابت ہو جائے تو اس کا حکم اس کے الفاظ اور عموم پر ہی رکھنا چاہئے، الا یہ کہ دوسری حدیث ہی کی وجہ سے دوسرے معنی خاص لئے جائیں اور حضرت جابرؓ نے یہ الفاظ بھی روایت کئے ہیں کہ نماز بغیر فاتحہ کے جائز ہی نہ ہوگی، اور اگر وہ اس سے استدلال کریں کہ (اجماعی مسئلہ ہے) رکوع میں شامل ہونے والے مقتدی کی وہ رکعت ہو جاتی ہے تو جس طرح یہ رکعت بغیر فاتحہ کے جائز ہوگئی، باقی رکعتیں بھی ہو جائیں گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رکوع میں شامل ہو جانے سے رکعت مل جانے کا مسئلہ بھی صرف ان حضرات نے تسلیم کیا ہے جو قرائۃ خلف الامام کے قائل نہیں ہیں، مثلاً حضرت ابن عمرؓ اور زید بن ثابت وغیرہ، لیکن جو حضرت امام کے پیچھے بھی قرأت کو ضروری سمجھتے ہیں مثلاً ابو ہریرہؓ وہ کہتے ہیں کہ رکعت جب ہی مانی جائے گی کہ وہ مقتدی مذکور اپنے امام کو قیام کی حالت میں پالے (یعنی رکوع میں جھکنے کے بعد امام کے ساتھ ملنا رکعت پالینے کے لئے کافی نہ ہوگا) اور حضرت ابوسعید و حضرت عائشہؓ کا بھی ارشاد ہے کہ فاتحہ پڑھنے سے پہلے رکوع نہ کرنا چاہئے، لہٰذا اول تو جس مسئلہ کو وہ لوگ اجماعی بتلاتے ہیں، وہ اجماعی نہیں ہے، اور اگر ہے بھی تو ہم اس ادراک رکعۃ بادراکِ الرکوع والی صورت کو حکمِ عام سے مستثنیٰ جزئی کے طور پر مانیں گے۔

استدلالِ امام بخاری کا جواب

رکوع پالینے سے رکعت مل جاتی ہے، یعنی بغیر فاتحہ پڑھنے کے بھی وہ رکعت صحیح مانی گئی ہے اور یہ مسئلہ اجماعی ہے، حضرت ابو ہریرہ کو جہری نماز میں قرائۃِ مقتدی کا قائل سمجھنا یا ادراکِ رکعت والے مسئلہ میں ان کا قرائۃِ فاتحہ نہ کرنے کی وجہ سے مدرکِ رکعت نہ ماننا بھی غلط ہے، کیونکہ وہ تو دوسروں سے صرف اس امر میں مختلف ہیں کہ امام کو رکوع میں جھکنے سے قبل قیام میں پالے، یہ وہ بھی نہیں کہتے کہ اتنا پہلے امام کو قیام میں پائے کہ فاتحہ پڑھ سکے، یا ضرور پڑھے تب مدرکِ رکعت ہوگا۔ یہ سب تفصیل کہیں سے بھی ثابت نہیں کی جاسکتی۔

یہاں امام بخاری نے صرف اپنے الگ مسلک کی بات ظاہر کی ہے کہ ادراکِ رکوع سے رکعت نہ ملے گی کیونکہ اس کو فاتحہ نہیں ملی، جو ہر رکعت کے لئے خواہ امام کے پیچھے ہو اور خواہ جہری نماز ہو یا سری، ہر حالت میں مقتدی کو فاتحہ پڑھنی فرض و واجب ہے، اس کے بغیر کوئی رکعت یا نماز صحیح نہ ہوگی، اور اس مسلک کے لئے حضرت ابو ہریرہؓ کو انہوں نے اپنا ہم نوا بنانا چاہا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات تو خود امام بخاری ہی کے اعتراف سے ثابت ہوگئی کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے نزدیک اگر امام کے رکوع میں جھکنے سے قبل مقتدی امام کے ساتھ مل کر رکوع میں بغیر فاتحہ پڑھے چلا گیا تو اس کی وہ رکعت صحیح ہو جاتی ہے اور موطأ امام مالک میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ قول بھی مروی ہے کہ جس نے

رکعت (رکوع) کو پالیا اس نے سجدہ کو بھی پالیا، (رکعت پوری ہوگئی) البتہ قرأۃ فاتحہ کے فوت ہونے سے بڑی خیر سے محروم ہوئی۔ (اوجزص ۱۱۹)
مگر امام بخاری کے نزدیک وہ رکعت صحیح نہیں ہوتی، پھر ایک صورت خاص طور سے امام بخاری کے لئے یہ نکل سکتی تھی کہ مقتدی امام کے پیچھے رکوع میں فاتحہ پڑھ لے تو اس طرح وہ اجماع کے ساتھ ہو جاتے، ان کے یہاں رکوع وسجدے میں قرآن پڑھنا جائز بھی ہے، جبکہ یہ صریح وصحیح احادیثِ ممانعت کے خلاف ہے، اور بقول ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے امام بخاری نے اس مسئلہ میں مسلم شریف کی احادیثِ صحیح کو ترک کر دیا ہے، (مسلم شریف کے باب النہی عن قرائۃ القرآن فی الرکوع والسجود میں آٹھ احادیث کے اندر صریح ممانعت مروی ہے (فتح الملہم ص ۲/۹۱)

شیخ اکبر نے فرمایا کہ نماز کے اندر صرف قیام کی حالت میں قرائۃ جائز ہے، کیونکہ نمازی کو بوجہ صورتِ مناجاۃ وحاضری در بارِ خداوندی کے حق تعالیٰ کی شانِ قیومت کے ساتھ ایک گونہ نسبت حاصل ہو جاتی ہے، اور رکوع وسجدہ چونکہ تذلل وخضوع اور تسفل کی حالتیں ہیں، اسلئے وہ قرائۃِ کلامِ معظم کیلئے موزوں محل نہیں ہیں، اسی لئے انکے مناسب صرف تسبیح وتقدیس ہوئی۔ (فتح الملہم ص ۲/۹۲)

لیکن امام بخاری کے لئے حضرت ابوسعید وحضرت عائشہؓ کا قول رکاوٹ بن گیا کہ کوئی شخص قرائۃِ فاتحہ سے پہلے رکوع نہ کرے حالانکہ ان کا یہ ارشاد ظاہر ہے کہ مسبوق ومقتدی کے لئے نہیں ہے، تاہم امام بخاری نے ان کا قول اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔

فارسی میں قرائۃ کا اعتراض وجواب

امام بخاریؒ نے امام اعظمؒ پر یہ تعریض بھی کی کہ وہ فارسی زبان میں ایک ایک آیت کی ہر رکعت کے لئے قرائۃ کو کافی اور جائز کہتے ہیں، حالانکہ حسب تصریح کتب فقہ حنفی فارسی وغیرہ زبانوں میں قرائۃ کے جواز سے امام صاحبؒ نے رجوع فرما لیا تھا، اور پھر وہی مذہب اختیار کر لیا تھا جو امام ابو یوسف، امام محمد وامام شافعی وغیرہ کا ہے کہ قرائۃ عربی زبان میں ہی ضروری ہے، اگرچہ امام صاحب کے قول کے بھی نقلی وعقلی دلائل کافی تھے، تاہم رجوع کے بعد طنز وتعریض کا کوئی موقع نہیں تھا، اور یہ امر قرینِ قیاس نہیں کہ امام بخاری کو امام صاحب کے رجوع کی خبر نہ پہنچی ہو۔ اور ایک آیت کا اعتراض اس لئے صحیح نہیں کہ وہ بھی قرآن ہے اور حکم یہی ہے کہ قرآن پڑھو جتنا آسان ہو، اور کم سے کم قرآن کا اطلاق ایک آیت پر ہی ہو سکتا ہے۔

امام صاحب کی طرف مسئلہ کی غلط نسبت

آگے جو امام بخاری نے امام صاحب کی طرف یہ بھی منسوب کیا کہ وہ پہلی دو رکعتوں میں ایک ایک آیت پڑھنے پر دوسری دو رکعتوں میں کچھ بھی نہ پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں، یہ غلط ہے، کیونکہ کتب فقہ حنفی (ہدایہ وغیرہ) میں تفصیل اس طرح ہے:۔

پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ مع دوسری سورت کے وجوباً پڑھے گا، یا دوسری سورت کی جگہ ایک بڑی آیت یا تین چھوٹی پڑھے گا، پھر دوسری آخری رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھے گا، کیونکہ حضور علیہ السلام[1] سے بھی ایسا ہی ثابت ہے۔ لیکن امام صاحب کے نزدیک دوسری آخری رکعتوں میں بجائے فاتحہ کے تین بار تسبیح بھی کافی ہے، اگرچہ فاتحہ افضل ہے، کیونکہ پہلی دو رکعتوں کی قرائۃِ فاتحہ دوسری دو رکعتوں کے لئے کفایت کرتی ہے کہ فرض نماز کے لئے قرائۃِ فاتحہ واجب وضروری ہے، اور وہ پہلی دو رکعت میں ادا ہوگئی لہٰذا بعد والی میں افضل فاتحہ اور کافی تسبیح ہوگی۔ لیکن اگر فرض کی پہلی دو رکعتوں میں کسی نے صرف سورت پڑھی اور فاتحہ نہ پڑھی تو آخری دو رکعت میں فاتحہ وجوباً پڑھے گا، کیونکہ پوری نماز فاتحہ سے خالی نہ ہونی چاہئے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کی طرف عدم قرائۃ فی الاخریین کی نسبت صحیح نہیں، جبکہ وہ اس کو افضل فرماتے ہیں، اور حضور علیہ السلام

---

[1] بخاری ومسلم میں حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ظہر وعصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ دو سورتیں ملا کر پڑھتے تھے، اور آخری دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی آپ زور سے پڑھتے تھے، تو ہم نے ایسا ہی سن رکھا ہے۔ ''مولف''

سے جو چاروں رکعت میں قرائۃ کا ثبوت ہوا یہ اس کے بھی منافی نہیں ہے، کیونکہ آپ نے بھی آخری دونوں رکعت میں قرائۃ استحباباً پڑھی ہوگی۔

نماز بلاقرائۃ کا اعتراض

اس کے بعد امام بخاری نے یہ اعتراض کیا کہ حضور علیہ السلام نے تو فرمایا کہ نماز بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی، مگر بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر چاروں رکعتوں میں بھی قرائۃ نہ کرے تو نماز درست ہو جائے گی۔

جواب: یہ بھی مغالطہ آمیز بات ہے کیونکہ امام صاحب ہی نہیں بلکہ امام احمد و مالک وغیرہ سب ہی یہ کہتے ہیں کہ حدیث مذکور تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے ہے، مقتدی کے لئے نہیں۔

امام احمد کا ارشاد: ترمذی شریف باب ترک قرائۃ خلف الامام میں امام احمد سے نقل کیا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد **لاصلوٰۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب** منفرد کے لئے ہے، جس کی دلیل دوسری حدیث جابرؓ کی ہے کہ جس نے کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے پڑھی، اس کی نماز نہ ہوگی الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو، امام احمد نے فرمایا کہ یہ حضرت جابرؓ صحابی رسول اللہ ﷺ ہیں جنہوں نے مذکورہ بالا حدیث رسول کا یہی مطلب سمجھا کہ وہ تنہا نمازؔ والے کے لئے ہے، اس کے بعد امام ترمذی کا یہ نقل کرنا کہ خود امام احمد کا یہ عمل تھا کہ وہ قرائۃ خلف الامام کے قائل تھے، مطلقاً صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ صرف سری نماز میں اس کو کہتے تھے، وہ بھی وجوباً نہیں، اور یہ کہ جہری میں جہاں تک امام کی آواز مقتدی کو پہنچتی ہو وہ بھی قرأت نہ کرے البتہ جس کو نہ پہنچتی ہو اس کے لئے قرائۃ جائز بتلاتے تھے، واجب اس کے لئے بھی نہیں، کیونکہ خود فرمایا کہ اہل اسلام میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ امام کے پیچھے قرائۃ نہ کرنے والے کی نماز باطل ہوگی۔

عبداللہ بن مبارک کا ارشاد

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا قول بھی اسی باب میں امام ترمذی نے نقل کیا کہ میرے نزدیک جو شخص امام کے پیچھے قرائۃ نہ کرے اس کی نماز جائز ہوگی، اور بعض لوگوں نے اس بارے میں سختی کی ہے کہ یہ حکم لگا دیا کہ بغیر فاتحہ کے کسی کی نماز نہیں ہوتی خواہ وہ تنہا ہو یا مقتدی ہو۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کا ارشاد یہاں ذکر کرنا اس لئے بھی مناسب ہوا کہ ہم امام بخاری کا جواب لکھ رہے ہیں جو عبداللہ بن مبارک کے بڑے مداحین میں ہیں، ان کے اعلم اہلِ زمانہ نے بھی زیر بحث مسئلہ میں امام صاحبؒ ہی کی تائید کر دی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کی ضرورت نہیں اور امام اعظم کی رائے ہی درست ہے کہ امام کے پیچھے چاروں رکعتوں میں قرائۃ نہ کرنے سے بھی نماز صحیح رہے گی، اور جو لوگ اس بارے میں تشدد کرتے ہیں، وہی غلطی پر ہیں۔ (یعنی امام بخاری وغیرہ)

ثنا پڑھنے کا اعتراض

امام بخاریؒ نے ص ۲۸ ہی میں ایک اعتراض یہ بھی کیا کہ یہ لوگ ترکِ قرائۃ خلف الامام کے لئے قول باری تعالیٰ **فاستمعوا له وانصتوا** سے بھی استدلال کرتے ہیں، حالانکہ خود ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ امام کی قرأت کے وقت ثنا پڑھنی جائز ہے۔ تو انہوں نے ثنا کو جو ان کے نزدیک بھی صرف تطوع ہے، اور اس کے مقابلہ میں قرائۃ واجب ہے، اس کو تو ساقط کر دیا اور ثنا کو ساقط نہ کیا جو کم درجہ کی تھی، اس طرح فرض کا درجہ نفل سے بھی گرا دیا۔

جواب: اس بارے میں حنفیہ کا صحیح قول یہ ہے کہ جہری نماز میں امام کی قرائۃ کے وقت مقتدی کو **سبحانک اللّٰھم** پڑھنا جائز نہیں، بلکہ تکبیر کہہ کر خاموش رہے اور موقع ملے تو سکتات میں ثناء پڑھ لے، اور سکتات میں فاتحہ بھی پڑھ سکتا ہے اگرچہ دشواری یہ ہے کہ امام پر سکتہ طویلہ کرنا جس میں فاتحہ پڑھی جا سکے، کسی بھی دلیل شرعی سے اس پر واجب ثابت نہیں ہو سکا ہے اور سری نمازوں میں حنفیہ بھی قرائۃ فاتحہ کو جائز سمجھتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سنتِ فجر کا اعتراض: ان لوگوں (حنفیہ) نے یہ بھی کہا کہ جب کوئی مسجد میں جائے اور امام فجر کی نماز پڑھا رہا ہو تو یہ دو رکعت سنت پڑھنے لگے، نہ امام کی قرأت سنے نہ اس کی آواز کی طرف کان لگائے، جبکہ یہ بات حدیثِ نبوی ''اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ'' کے بھی خلاف ہے، اور یہ لوگ جواب میں حدیث ''من کان لہ امام فقرائۃ الامام لہ قراءۃ'' پیش کرتے ہیں، حالانکہ یہ حدیث حجاز و عراق وغیرہ کے اہلِ علم کو تسلیم بھی نہیں، اور مرسل و منقطع بھی ہے کیونکہ ابن شداد نے براہِ راست (یعنی واسطہ حذف کر کے) حضور علیہ السلام سے روایت کر دی ہے۔

جواب: حافظ ابن ہمامؒ نے لکھا:۔ صحیح مذہب حنفیہ کا یہ ہے کہ مسجد کے علاوہ کوئی جگہ ہو تو وہاں سنت پڑھے، ورنہ جماعتِ صبح ہوتے ہوئے مسجد کے اندر سنتیں پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ ترکِ مکروہ، فعلِ سنت پر مقدم ہے، پھر یہ تو بہت ہی شدید طور سے مکروہ ہے کہ جماعت کی صفوں سے قریب پڑھے جیسا کہ بہت سے جاہل پڑھ لیا کرتے ہیں (فتح القدیر ص ۱\۳۴۱ طبع مصر) ہم نے اس کی مفصل بحث پہلے بھی کی ہے۔

حدیث ابن خزیمہ: وہاں ہم نے صحیح ابن خزیمہ کی وہ حدیث بھی پیش کر دی ہے، جس کی وجہ سے حنفیہ نے صبح کی دو سنتوں کے مسجد سے باہر ادا کرنے کا فیصلہ ارشادِ نبوی کی روشنی میں حاصل کیا ہے، یہ حدیث چونکہ ایسی صراحت کے ساتھ دوسری کتبِ حدیث کے پورے ذخیرہ میں نہیں ہے، اس لئے بہت سوں کو حنفیہ کا مذکورہ فیصلہ اوپرا معلوم ہوتا رہا ہے، اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی شک ہی رہا تھا کہ یہ حدیث واقعی صحیح ابن خزیمہ میں موجود ہے یا نہیں۔ بہر حال! امام شافعیؒ وغیرہ کے اس فیصلہ کے مقابلہ میں کہ صبح کے فرضوں کی جماعت شروع ہو جانے کے بعد مسجد یا مسجد سے باہر کہیں بھی دو سنتیں نہ پڑھی جائیں لقولہ علیہ السلام اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ جس کا حوالہ یہاں امام بخاری نے بھی دیا ہے اور حنفیہ پر اعتراض وارد کر دیا ہے، حنفیہ کا فیصلہ اور صحیح حدیثِ ابن خزیمہ کی وجہ سے مسجد کی قید لگانا نہایت ہی صحیح فیصلہ ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے خود ہی رہنمائی فرما دی کہ صبح کی دو سنتیں جماعت شروع ہونے پر مسجد کے اندر نہ پڑھی جائیں۔

طعن امام بخاری کی وجہ

بظاہر یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے سامنے بھی حدیث مذکور نہ ہوگی ورنہ وہ یہ اعتراض نہ کرتے، اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ امام بخاری کو بہت سے مسائل حنفیہ کے صحیح طریقے سے نہیں پہنچے، یا حمیدی یا ابن مہدی وغیرہ نے ان کو مغالطہ میں ڈال دیا تھا، اگرچہ ان کا دعویٰ تو حنفی مسلک کے جاننے کا ہی ہے اور انہوں نے خود بھی فرمایا کہ پہلے جب میں نے (اپنے وطن ہی میں) حضرت عبداللہ بن مبارک اور امام وکیع کی مصنفات کو ازبر کر لیا اور اہل الرائے کے کلام کو خوب سمجھ چکا تو پھر میں نے حجاز کا سفر کیا۔ تو ایسی صورت میں ان کو واقعی پوری طرح حنفی مسلک سے واقفیت ہو بھی جانی چاہئے تھی۔ مگر ان کے بہت سے اعتراضات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی مذکورہ بالا رائے ان کے بارے میں درست تھی، ورنہ بدگمانی کرنے والے تو یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جان بوجھ کر حنفی مسلک کو گرانے کی سعی کی ہے، مگر ہمارے نزدیک یہ بات امام عالی مقام کے مرتبہ سے بعید ہے، جس طرح محدثِ کبیر امام ابن ابی شیبہؒ نے بھی بہت سے مسائل غلط طور سے حنفی مسلک کی طرف منسوب سمجھ کر مصنف میں بہت سے اعتراض کر دیئے تھے، اور ہندوستان کے غیر مقلدوں نے ان سے حنفیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے میں مدد حاصل کی تھی۔

امام اعظم رحمہ اللہ امام المحدثین واعلمہم بالناسخ والمنسوخ

بہر حال! جب بات یہاں تک آئی تو یہ بھی عرض کر دوں کہ امام المحدثین امام اعظمؒ نے جو حسبِ اعتراف غیر حنفی اکابر محدثین بھی سب سے پہلے علم حدیث کی تالیف و تدوینِ فقہ کے بانی تھے، اور سارے محدثین عظام کے اندر ان کا ایک نہایت ممتاز وصف یہ بھی تھا کہ وہ

احادیث کے ناسخ ومنسوخ ہونے کے علم پر بہت بڑی دسترس رکھتے تھے۔

امام صاحب کی مجلس تدوین فقہ

پھر بھی انہوں نے صرف اپنے علم پر اعتماد نہیں کیا بلکہ چالیس محدثین مفسرین وفقہاء کی ایک جماعت قائم کر کے برسہا برس تک حدیثی و فقہی بحثیں کیں اور کرائیں، اور لاکھوں مسائل کے فیصلے کتاب وسنت نہ تعامل صحابہ وتابعین کی روشنی میں طے کرا کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کی کسی تحقیق کو بھی اتنی آسانی سے نہیں گرایا جا سکتا، جس طرح امام بخاری اور ان کے اتباع نے خیال کیا تھا۔ **واللہ علے ما نقول وکیل. ان شاء اللہ وبہ نستعین.**

امام بخاری کا دعویٰ

امام بخاری کا یہ ارشاد موجب حیرت ہے کہ حدیث **من کان لہ امام** کو حجاز وعراق کے اہل علم نے تسلیم نہیں کیا۔ جبکہ اس کی روایت امام محمد نے موطأ میں امام مالک سے بھی کی ہے، اگر چہ الفاظ کا کچھ فرق ہے اس طرح کہ حضرت ابن عمرؓ سے جب پوچھا جاتا تھا کہ کیا کوئی امام کے پیچھے قرأت کرے؟ وہ جواب میں فرماتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی امام کے ساتھ نماز پڑھے تو اس امام کی قرائۃ کافی ہے۔ اور حضرت ابن عمر خود بھی امام کے پیچھے قرائۃ نہیں کرتے تھے (نصب الرایہ ص۲\۱۲) اور امام احمدؒ کی مسند ص۳\۳۳۹ میں بعینہ الفاظ بھی یہی ہیں جو امام اعظمؒ وغیرہ کی روایت میں ہیں، کیا بغیر تسلیم کئے ہی امام مالک نے حدیث مذکور روایت کر دی تھی اور اپنا عمل بھی ترک قرائۃ خلف الامام کا بنالیا تھا، یا وہ حجازی نہ تھے یا حجاز میں ان کا شمار اہل علم میں سے نہیں تھا؟ اور کیا امام احمد عراق کے اہل علم میں سے نہ تھے، اور انہوں نے بھی بغیر تسلیم ہی حدیث مذکور کی روایت کر دی تھی اور اپنا مسلک بھی ترک قرائۃ بنالیا تھا؟ افسوس ہے کہ امام بخاری ایسے دینی نازک مواقع میں بھی مبالغوں سے کام لیتے رہے، اس کے بعد حدیث مذکور پر مرسل ومنقطع ہونے کا بھی نقد کیا ہے۔

مرسل ومنقطع کی بحث

اول تو جمہور کے نزدیک مرسل حجت ہے، خاص طور سے جبکہ ارسال کرنے والا راوی صحابی ہو، اور یہاں بھی ایسا ہی ہے کیونکہ عبداللہ بن شداد صغیر السن صحابی ہیں۔ اور جلیل القدر تابعین میں سے ہیں، پھر ایسی مرسل جو فتاوی صحابہ سے مؤید ہو سارے محدثین کے یہاں حجت ہوتی ہے اور ترک قرائۃ خلف الامام کے بارے میں بہ کثرت صحابہ کے فتاوے منقول ہیں، ملاحظہ ہو مصنف ابن ابی شیبہ ومعارف السنن ص۳\۲۰۷ واعلاء السنن وغیرہ۔

مرسل کی مقبولیت

امام شافعیؒ بھی کبار تابعین کے مراسیل قبول کرتے تھے جبکہ وہ کسی مسند سے مؤید ہوں، یا کسی صحابی کے قول یا فتویٰ اہل علم سے مؤید ہوں۔ اور انقطاع کی بات بھی درست نہیں، جس کی تفصیل معارف السنن واعلاء السنن میں ہے۔

فتاویٰ ابن تیمیہ میں ہے کہ اس مرسل کی تائید ظاہر قرآن وسنت سے ہو رہی ہے اور اس کو جمہور اہل علم صحابہ وتابعین نے قبول کر لیا ہے وار اس کا ارسال کرنے والا راوی اکابر تابعین میں سے ہے، اس قسم کا مرسل باتفاق ائمۂ اربعہ وغیرہم حجت وقابل استدلال ہے۔ (فصل الخطاب ص۹۷)

ناظرین نے ملاحظہ کیا کہ حدیث **من کان لہ امام** چونکہ امام بخاری کے مسلک کے خلاف تھی، اس کو گرانے کی کتنی سعی فرمائی، لیکن ان کے برعکس حافظ ابن تیمیہ نے بھی اسی مرسل کو اونچا اٹھانے کی پوری کوشش کردی ہے۔

امام احمد بھی وجوب کے قائل نہ تھے

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فصل ص ۹۷ میں فتاوی ابن تیمیہ کے حوالہ سے یہ بھی نقل کیا کہ امام احمدؒ کا مشہور مذہب سریہ میں بھی امام کے پیچھے صرف استحبابِ قرائۃ فاتحہ تھا، وجوب نہیں تھا، جبکہ امام بخاری نے جمہور سلف وخلف سے الگ ہوکر اپنا یہ مسلک بنایا کہ نہ صرف سری میں بلکہ جہری نماز میں بھی امام کے پیچھے قرأت فاتحہ فرض وواجب ہے، اس کے بغیر نماز نہ ہوگی حتی کہ رکوع میں ملنے سے اجماع امت کے خلاف یہ فیصلہ دے دیا کہ رکعت نہ ملے گی، کیونکہ اس سے فاتحہ رہ گئی جو ہر رکعت میں امام کے پیچھے بھی ضروری ہے۔

غیر مقلدوں کا تشدد

اسی رائے مذکور کا اتباع غیر مقلدین نے بھی کیا ہے، اسی لئے وہ ساری امتِ مسلمہ متبعینِ ائمہ اربعہ کی نمازوں کو باطل وکالعدم بتلاتے ہیں جو امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے، سوال یہ ہے کہ جب کسی مذہبِ ائمۂ مجتہدین میں بھی قرائۃ خلف الامام واجب وضروری نہیں ہے نہ سری میں نہ جہری میں، تو وہ اس کا التزام واجب وفرض کی طرح کیوں کریں گے۔ اور جب امام احمدؒ نے یہ تصریح کردی کہ حضور علیہ السلام کے زمانے سے اب تک اہلِ اسلام میں سے کوئی بھی اس امر کا قائل نہیں ہوا کہ امام کے پیچھے قرائۃ فاتحہ نہ کرنے سے نماز درست نہ ہوگی، تو اول فالاول کا فیصلہ نہ امام بخاری کی تائید میں ہے اور نہ اس زمانے کے غیر مقلدوں کی حمایت میں۔ امام بخاری تو فرما چکے کہ پہلوں کے مقابلہ میں بعد والوں کا فیصلہ قابل رد ہے، معلوم نہیں غیر مقلدین کیا ارشاد فرمائیں گے؟ آخر میں یہ بھی عرض ہے کہ حدیث **من کان له امام** طرق کثیرہ سے مروی ہے اور وہ معنی ومضمون کے لحاظ سے نہایت قوی وصحیح ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

تکبیر تحریمہ کا اعتراضِ بخاری

امام بخاری نے ایک اعتراض حنفیہ پر یہ بھی کیا ہے کہ یہ لوگ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ امام کی قرائۃ کے وقت خاموش رہو مگر حال یہ ہے کہ جب امام کے پیچھے نماز شروع کرتے ہیں تو بتلاتے ہیں کہ تکبیر کہہ کر نماز شروع کی جائے اور امام کی قرائۃ کی طرف توجہ نہ کرے کیونکہ تکبیر کہنا فرض ہے بغیر اس کے نماز نہ ہوگی مگر یہ نہیں سوچتے کہ جتنی دیر میں اس نے تکبیر کہی امام کی قرأت تو نہیں سنی کیا یہ اجتماع مامور کے خلاف نہ ہوا؟ اگرچہ یہ اعتراض جزء القرائۃ کے ص ۱۹ میں ہے مگر یہاں کے لئے زیادہ مناسب ہے، اس لئے اس کا جواب بھی ہم اسی جگہ لکھتے ہیں۔

جواب: یہی اعتراض اور دوسرے بھی امام بخاری کے اتباع میں اس زمانہ کے غیر مقلدین نے بھی کئے ہیں، کیونکہ ان کو امام بخاری جیسا جلیل القدر وکیل امت میں سے دوسرا کہاں میسر ہوسکتا تھا، اور غیر مقلدین کے کسی اعتراض میں بھی اگر کچھ تھوڑی بہت جان یا وزن ہے تو صرف اس ہی میں ہے جو امام بخاری وغیرہ اکابر امت کر گئے ہیں، اور ان کے جوابات بھی ہمیشہ دیئے گئے ہیں کتابیں بھری ہوئی ہیں، مگر وہ عربی میں ہیں، آج کل جیسے پڑھنے پڑھانے والے محروم المطالعہ اور کم استعداد لوگ ہیں، ان کو اور عوام کو گمراہ کرنے اور مذاہب اربعہ سے بد ظن کرنے کا جو بھی طریقہ ان کو ملتا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر غیر مقلدی کے لئے فضا بناتے رہتے ہیں۔ اور اردو زبان میں چونکہ تحقیقی حدیثی مباحث بہت کم آئے ہیں، اس لئے ہندوپاک کے غیر مقلدین اردو زبان میں اپنا پروپیگنڈہ زیادہ کامیابی سے کر لیتے ہیں۔ اور اب بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ گیا ہے کہ سعودی حکومت کو اپنے فیور میں لینے کے لئے یہ باور کراتے ہیں کہ سارے ہندوپاک میں مسلمان نام کے مشرک آباد ہیں، اور یہ سارے قبر پرست ہیں حتیٰ کہ دیوبندی مشرب کے مسلمانوں کے بارے میں بھی یہ باور کرایا گیا ہے کہ یہ بھی قبوری ہیں کیونکہ یہ لوگ قبرِ معظم نبوی علی صاحبہا الف الف تحیات کی زیارت کے لئے سفر کو جائز بتلاتے ہیں اور حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ

توسل کو جائز کہتے ں تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی شریف میں علامہ مبارک پوریؒ نے بھی سب ہی کو قبوری لکھا ہے فلیراجع الیہ اور صرف یہ دونوں مسئلے ہی ان کو ایسے مل گئے ہیں کہ موجودہ سعودی حکومت کے اعیان وعلماء کو ہم سے بدظن کرانے کے لئے کافی ووافی ہیں۔ کیونکہ غیر مقلد یت کی بات کا اثر ان پر اتنا زیادہ نہیں ہوسکتا کہ وہ خود بھی حنبلی مسلک کے ہیں اور ہندو پاک کے غیر مقلدوں کے مسلک سے بمراحل دور ہیں۔

امام احمد اور نجدی علماء

دوسری بات ان غیر مقلدوں کی ہی خوئی قسمت سے یہ بھی ہوگئی کہ نجدی علماء نے کئی بڑے مسائل میں امام احمدؒ کا مسلک ترک کر کے حافظ ابن تیمیہ وابن قیمؒ کے تفردات کو اپنالیا ہے، اور انہوں نے ان ہی تفردات پر امام احمد اور اکابر حنابلہ کے فیصلوں کے خلاف جمود کرلیا ہے، پھر بڑی تکلیف دہ بات یہ بھی ہے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے بعد اکابر دیوبند میں سے کسی نے بھی نجدی علماء سے قریب ہو کر تبادلۂ خیالات کر کے احقاقِ حق کی سعی نہیں کی، الا یہ کہ حضرت مولانا عثمانی نے فتح الملہم میں یا مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے معارف السنن میں کچھ لکھا، یا حضرت شاہ صاحبؒ کے امالی درس میں کچھ آیا ہے، ہمارے استاذِ محترم حضرت مولانا مدنیؒ بھی درسِ بخاری شریف میں بہت کچھ فرمایا کرتے تھے، مگر ان کے علوم وتحقیقات بھی پوری طرح سامنے نہ آسکیں۔ اور آج کل کے حضرات جن کا رابطہ سعودی عرب سے ہے، وہ بظاہر کچھ کمی وسعتِ مطالعہ کے سبب سے اور کچھ اپنی مصالح کی وجہ سے خاموش معلوم ہوتے ہیں واللہ اعلم۔

الزامی اعتراض کی حقیقت

امام بخاریؒ کا مذکورہ بالا الزامی اعتراض جتنا بے وزن ہے وہ ظاہر ہے، اول تو یہ کہ تکبیر تحریمہ شرطِ دخولِ صلوٰۃ ہے اور شرطِ شئی اس سے خارج ہوتی ہے، لہٰذا ابھی مقتدی امام کے ساتھ شریک بھی نہیں ہوا تو اس پر امام کی قرأۃ سننے کا فریضہ کیسے لاگو ہو گیا؟ دوسرے وہ ایک لحہ کا کام ہے۔ اس کی وجہ سے قرأۃ نہ سننے کا بڑا چارج اس پر کیسے لگ سکتا ہے۔ پھر اس پر تو سب ہی علماءِ امت متفق ہیں کہ امام کی قرأۃ سنتے ہوئے بھی تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز میں شریک ہونا درست ہے، خاص طور سے حنفیہ کو مطعون نہیں کیا جاسکتا۔ اور قرأۃِ امام کے وقت خاموش رہنے کا مسئلہ بھی سب کا اتفاقی واجماعی ہے اوپر بتلایا گیا کہ امام شافعی جن کو بعض لوگوں نے بڑے شدومد کے ساتھ موجبینِ قرأۃ خلف الامام میں سمجھا تھا وہ بھی دوسرے سب ائمہ ہی کے ساتھ ہیں اور وہ قرأۃ خلف الامام کو نہ واجب کہتے ہیں نہ انہوں نے یا کسی بھی امام نے یہ کہا کہ امام کی قرأۃِ جہری کے وقت تکبیر کہہ کر نماز میں شرکت نہ کرو۔

تکمیل البرہان کا ذکر

پاکستان کے کسی غیر مقلد عالم نے ''تکمیل البرہان فی قرأۃ ام القرآن'' لکھی ہے، جس میں قرأتِ فاتحہ خلف الامام کو فرض ولازم ثابت کرنے کی سعیٔ ناکام کی ہے اور اس کو اجماعی مسئلہ بتلایا ہے، اس کے جواب ورد میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ نے رسالہ فاتحۃ الکلام لکھ کر شائع کیا ہے۔ اس میں ص ۱۱۹ میں مذکورہ مسئلہ کے رد وجواب کے بعد لکھا کہ ''صاحب تکمیل کو اپنی فہم ودانش کا ماتم کرنا چاہئے؛'' مگر یہ اعتراض بھی تو سب سے پہلے اب سے گیارہ سو سال قبل امام بخاری کر چکے ہیں۔ اس کی طرف مولانا مرحوم کا ذہن نہیں گیا۔ البتہ مولاناؒ نے اسی موقع پر ایک دوسرا اعتراض امام بخاری کا جزء القرأۃ سے نقل کیا ہے کہ مدارس ومکاتب میں استاد ایک بچہ کو سبق دیتا ہے اور باقی بچے بھی قرأۃ کرتے ہیں وہاں آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کی بنا پر بچوں کو خاموش نہیں کیا جاتا۔ پھر مولانا نے لکھا کہ اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو اوپر ذکر ہوا کہ یہ آیت مقتدی کے حق میں ہے، غیر مقتدی کے بارے میں نہیں ہے، دوسرے بچوں کو بڑوں پر قیاس

کرنا بھی غلط ہے، بچے تو بے وضو بھی قرآن مجید پڑھتے ہیں اوران کو مرفوع القلم قرار دیا گیا ہے۔

غیر مقلدین کے فتنے

دوسری ایک کتاب کراچی سے ''فصل الخطاب فی قرائۃ ام الکتاب'' کے نام سے مفتی صاحب کلانوری نے شائع کی تھی، جو بارہ ہزار کی تعداد میں طبع کرا کر علماء و جہلاء کے ہاتھوں میں پہنچائی۔ اس میں بھی یہ دعویٰ کیا کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے اور بیکار و باطل ہے۔ اس کا مکمل و مدلل جواب مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صاحب صفدر عم فیضہم نے دو جلدوں میں لکھ کر گجرانوالہ سے شائع کیا وہ اس وقت ہمارے سامنے ہے، اس میں بھی ص ۱۰۶/۱ میں جزء القرائۃ امام بخاری، تحقیق الکلام علامہ مبارکپوری اور فصل الخطاب مفتی کلانوری صاحب یہی اعتراض والزام نقل کر کے جواب دیا کہ آیت کا مخاطب مقتدی ہے اور امام المفسرین ابن جریر طبری شافعی کا قول نقل کیا کہ جو آدمی امام کی اقتدا کر چکا ہے، اس کو امام کی قراءت سننے کے لئے خاموش رہنا واجب ہے (دوسرے اس کے مکلف نہیں ہیں) اور تکبیر تحریمہ حنفیہ کے نزدیک شرط صلوٰۃ ہے رکن نہیں (قانیہ ص ۴۰/۱، سراجیہ ص ۱۰ وہدایہ ص ۸۲/ اوشرح وقایہ ص ۱۶۰/ اوغیرہ) لہٰذا اقتدا سے قبل مقتدی بھی مکلف نہیں، البتہ اقتدا کے بعد اس کا قراءت کرنا ضرور ممنوع ہوگا۔ (احسن الکلام ص ۱۰۶/۱) کیونکہ آیت **فاستمعوا له و انصتوا** کا شان نزول قراءت خلف الامام ہی ہے۔ خطبہ وغیرہ پر اس کا اجراء عموم حکم کے تحت ثانوی درجہ میں ہوتا ہے، ایسا نہیں کہ وہ خطبہ کے بارے میں اتری تھی، تاکہ قراءت خلف الامام سے اس کا تعلق ہی نہ ہو یا ہو تو ثانوی درجہ میں۔ واللہ اعلم۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے دعاوی ومبالغات

جس طرح مسئلہ رفع یدین میں مبالغات کا ذکر ہوا ہے، یہاں قراءت خلف الامام کے مسئلہ میں ایسا جگہ جگہ اور بار بار رسالہ جزء القراءۃ میں ہوا ہے، مثلاً ص ۵ پر پہلے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث ذکر کی کہ بغیر فاتحہ کے نماز ناقص ہوتی ہے، اور اس سے کسی کو انکار بھی نہیں اگرچہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ امام ترمذی نے امام احمد کا قول نقل کیا کہ یہ حدیث منفرد کے لئے ہے امام کے لئے نہیں، پھر اس کو یہاں بار بار مختلف طرق ومتون سے پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ مقصد امام کے پیچھے قراءۃ فاتحہ کا اثبات ہے۔

پھر حضرت عمرؓ کا ارشاد ذکر کیا کہ امام کے پیچھے قراءت کی جائے، اس میں جہری نماز کا ذکر نہیں ہے، اور سری میں کوئی منکر نہیں ہے اور جس اثر میں جہری کا ذکر ہے وہ نہایت ضعیف ہے اور غالباً اسی لئے امام بخاری نے اس جملہ والی روایت کو اختیار نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

پھر لکھا کہ حضرت ابی بن کعب، حذیفہ اور عبادہؓ اور ایسے ہی حضرت علی، عبداللہ بن عمرو ابوسعید خدریؓ اور کئی دوسرے صحابہ سے بھی قراءۃ خلف الامام روایت کی گئی ہے، یہاں بھی جہری کی صراحت نہیں ہے،

پھر لکھا کہ قاسم بن محمد نے کہا کہ رجال ائمہ قراءت خلف الامام کرتے تھے، یہاں بھی جہری کی تصریح نہیں ہے، پھر ابومریم کا قول نقل کیا کہ میں نے سنا ہے حضرت ابن مسعودؓ قراءت خلف الامام کرتے تھے۔ یہاں بھی جہری کا ذکر نہیں ہے آگے لکھا کہ ابووائل نے حضرت ابن مسعودؓ کا ارشاد نقل کیا کہ ''امام کے لئے خاموش رہو''، اور ابن مبارک نے کہا کہ اس سے مراد جہری نماز معلوم ہوتی ہے اور حضرت ابن مسعودؓ امام کے پیچھے صرف سکوت امام کی حالت میں قراءت کرتے تھے۔ یہاں خود امام بخاریؒ کے ممدوح اعظم نے ہی ان کے خلاف فیصلہ دے دیا ہے، ہم کیا کہیں؟ آگے امام بخاریؒ نے لکھا کہ حسن، سعید بن جبیر، میمون بن مہران اور تابعین واہل علم میں سے اتنے لوگ جن کا میں شمار بھی نہیں کر سکتا، وہ سب یہی کہتے تھے کہ امام کے پیچھے، جہری نماز میں بھی قراءت کی جائے۔ اور حضرت عائشہؓ بھی قراءت خلف الامام کا حکم کیا کرتی تھیں۔

حضرت عائشہ وحضرت ابو ہریرہؓ جہری میں قائل قراءۃ نہ تھے: امام بخاریؒ نے یہاں حضرت عائشہؓ کا ذکر کیا اور ص ۴ وص ۱۷ میں

حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں بھی لکھا کہ وہ دوسرے صحابہ حضرت ابن مسعود وزید بن ثابت وابن عمر وغیرہ کے خلاف قراءت خلف الامام کے قائل تھے اوران دونوں کا ذکر امام بخاری ایسے مواقع پر لائے ہیں کہ جیسے وہ دونوں جہری میں قراءت خلف الامام کے قائل تھے، حالانکہ اس کے خلاف سنن کبریٰ بیہقی ص ۱۷۱/۲ میں صراحت موجود ہے کہ ابو ہریرہؓ وحضرت عائشہؓ دونوں غیر جہریہ یعنی سری نماز میں قراءت کا حکم کرتے تھے، دوسری جگہ سنن بیہقی کے اسی صفحہ پر ہے کہ وہ دونوں امام کے پیچھے ظہر وعصر کی پہلی دو رکعت میں فاتحہ اور کچھ قرآن پڑھنے کو فرماتے تھے، اور حضرت عائشہؓ آخری دو رکعت میں صرف فاتحہ پڑھا کرتی تھیں۔ ان دونوں روایتوں سے واضح ہوا کہ حضرت عائشہ وحضرت ابو ہریرہؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت کے قائل نہ تھے اور وہ دونوں فاتحہ کے ساتھ اور کچھ بھی قرآن پڑھنے کا حکم کرتے تھے۔ جس پر صرف حنفیہ کا عمل ہے، ورنہ سارے ہی دوسرے حضرات نے فاتحہ کا ساتھ سورت ملانے کو صرف سنت کا درجہ دے دیا ہے، کتنی ہی احادیث میں فاتحہ کے ساتھ ما زاد اور امائیسر وغیرہ آیا ہے۔ خود امام بخاری نے بھی اپنے اسی رسالے جزء القراءۃ میں گیارہ جگہ یہ کلمات روایت کئے ہیں مگر سب ہی نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ صرف سورۂ فاتحہ تو فرض ورکن کے درجے میں ہے اور سورۃ ملانا یا کچھ اور قرآن مجید سے پڑھنا صرف سنت یا مستحب ہے۔

مسئلہ قراءت: امام اعظم اور حنفیہ نے قرآن مجید سے نفس قراءت کو تو فرض ورکن قرار دیا اور پورے ذخیرہ احادیث وآثار اور تعامل صحابہ و تابعین پر نظر کر کے فاتحہ وسورت دونوں کو واجب قرار دیا ہے، حیرت ہے کہ نہ صرف حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ کے مذکورہ بالا ارشاد کو بلکہ اس بارے میں دوسری احادیث وآثار کو بھی اپنی منشا پر ڈھال لیا گیا ہے۔ اور بدنام حنفیہ ہوئے کہ یہ احادیث وآثار کو نظر انداز کر کے اپنی رائے اور منشا پر عمل کرتے ہیں، ؎ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

سنن کی اوپر کی نقل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ ظہر وعصر کی آخری دو رکعت میں امام کے پیچھے قراءۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے، کیونکہ صرف حضرت عائشہؓ کا عمل ذکر کیا گیا ہے۔

امام بخاری کے اعتراض کا جواب

اس سے امام بخاری کے ص ۲ والے اس اعتراض کا جواب بھی ہو گیا کہ بعض الناس (امام اعظمؒ) پہلی دو رکعتوں میں تو ایک ایک آیت پڑھنے کو کافی بتلاتے ہیں۔ اور دوسری بعد کی دو رکعتوں میں کچھ نہ پڑھے تو حرج نہیں ہے، یہ صورت ظاہر ہے کہ امام صاحب کی طرف صرف امام کے پیچھے بن سکتی ہے جیسا کہ ہم پہلے عرض بھی کر چکے ہیں (منفرد یا امام کی نماز کے لئے حنفیہ کے نزدیک بھی پہلی دو میں فاتحہ وسورت دونوں واجب ہیں اور آخر دو میں بھی امام صاحب کے ایک قول سے فاتحہ واجب ہے، دوسری میں مستحب ہے) تو اگر سری نماز خلف الامام (ظہر وعصر) میں مقتدی پہلی دو میں کچھ پڑھ لے اور دوسری آخر میں کچھ نہ پڑھے تو اس سے کیا قباحت ہوئی، جبکہ یہی طریقہ حضرت ابو ہریرہؓ ایسے صحابی جلیل القدر کا بھی تھا، جو نماز وغیرہ کے احکام بیشتر صحابہ سے زیادہ جانتے تھے۔

صحابہ وتابعین کا مسلک

اس کے بعد ہم یہاں مزید وضاحت اس امر کی کرتے ہیں کہ صحابہ وتابعین یا سلف وخلف کی رائیں قراءت خلف الامام کے لیے کیا تھیں؟ حافظ ابن تیمیہؒ نے ''تنوع العبادات'' ص ۸۵/۸۶ میں لکھا:۔

امام کے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد سکوت کو (تاکہ مقتدی فاتحہ پڑھ لیں) امام احمدؒ پسند نہیں کرتے تھے، اور نہ امام مالک وابوحنیفہ نے اس کو مستحب سمجھا ہے، اور جمہور نے اس امر کو مستحب نہیں قرار دیا کہ امام سورۂ فاتحہ کے بعد سکوت کرے تاکہ مقتدی قراءت کر لے، اس لئے کہ ان کے نزدیک مقتدی کی قراءت جہری نماز میں نہ واجب ہے نہ مستحب ہے، بلکہ وہ ممنوع ہے، بلکہ امام احمد کے مذہب میں ایک قول پر

اس کی قراءت مبطل صلوٰۃ بھی ہے''۔

نیز لکھا کہ''جمہور سلف نے جہری نماز میں قراءت خلف الامام کومکروہ قراردیا ہے اوراکثر ائمہ فاتحہ کے بعد امام کے سکوت طویل کے قائل نہ تھے اور جو حالت جہر میں قراءت کرتے تھے وہ کم تعداد میں تھے اور یہ کتاب وسنت سے ممنوع بھی ہے، اور اسی نہی وممانعت کے قائل جمہور سلف وخلف تھے۔

پھر اس کی وجہ سے نماز باطل ہو جاتی ہے یا نہیں، اس میں اختلاف ہوا ہے اور بعض علماء اس طرف بھی گئے ہیں کہ حالت جہر میں مقتدی فاتحہ پڑھے، اور اگر نہ پڑھے گا تو اس کی نماز صحیح ہو جائے گی یا باطل ہوگی، اس میں ان کا اختلاف ہوا ہے غرض نزاع طرفین سے ہے، لیکن جو حضرات قراءت مع الامام سے منع کرتے ہیں وہ جمہور سلف وخلف ہیں اور ان کے ساتھ کتاب وسنت صحیحہ ہے، اور جنھوں نے مقتدی پر قراءت کو واجب کہا ہے ان کے پاس ابوداؤد کی حدیث ضعیف ہے جس کو ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے، اور حدیث ابی موسیٰ میں (جو جمہور کا مستدل ہے) جملہ **و اذا قرا فانصتوا** کو امام احمد واسحاق وامام مسلم وغیرہم نے صحیح قرار دیا ہے، امام بخاری نے اس کی تعلیل کی ہے مگر ان کی تعلیل سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بخلاف حدیث ابی عبادہ کے (جس میں **لا تفعلوا الا بام القرآن** ہے) کہ وہ صحیح میں شامل نہیں کی گئی ہے اور اس کا ضعیف ہونا چند وجوہ سے ثابت ہو چکا ہے اور درحقیقت وہ حضرت ابو عبادہؓ کا قول ہے''۔ (یعنی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہے) بحوالہ اعلاء السنن ص ۴/۱۱۵)

افادۂ انور: معارف السنن ص ۳/۱۹۱ میں عنوان''بیان مذاہب الصحابۃ والتابعین'' کے تحت تفصیل وتحقیق بھی قابل مطالعہ ہے، جس میں اسی (۸۰) صحابہ کبار سے قراءۃ خلف الامام کی ممانعت نقل ہے، اور صحابہ عشرہ مبشرہ سے بھی اور حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ سلف میں سے اقل قلیل وجوب کی طرف گئے ہیں، ہیں، جیسے مکحول۔ اور امام کے پیچھے قراءت کرنے والے بھی اقل قلیل ہی تھے، البتہ سکتات میں پڑھنے والے ان سے زیادہ تھے اور صرف سریہ میں قراءت کرنے والے ان سے زیادہ تھے، اور ان میں ہی وہ بھی تھے کہ کبھی سریہ میں پڑھ لیتے اور کبھی ترک کرتے تھے، پھر فرمایا کہ یہ سب تفصیل سارے آثار صحابہ وتابعین کی تلاش ومراجعت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یوں ہی (امام بخاری کی طرح سے) ایک جانب اختیار کر کے اور ایک ذہن بنا کر اپنے موافق آثار نکال لینے سے کچھ نہیں ہوتا، اور حافظ علاؤ الدین ماردینیؒ نے''الجواہر النقی'' میں اسانید صحاح سے حضرت جابر، حضرت ابن مسعود، زید بن ثابت اور حضرت ابن عمرؓ کا تعامل عدم قراءت خلف الامام کا محدث کبیر ابن ابی شیبہ، محدث شہیر عبدالرزاق اور حافظ حدیث بزار سے نقل کر دیا ہے۔ ص ۳/۱۹۵ تک تفصیل قابل مطالعہ ہے، پھر حضرت شاہ صاحب کا ارشاد نقل کیا کہ امام بخاریؒ نے بہت سے تابعین کے نام لکھ دیئے ہیں کہ وہ سب بھی قراءت کے قائل تھے، مگر اجمال کر گئے، یہ نہ بتلایا کہ ان میں سے کون جہریہ میں قراءۃ کا قائل تھا اور کون سریہ میں؟ اور علامہ ماردینی نے حضرت اسود علقمہ اور ابراہیم نخعی سے قراءت خلف الامام کے لئے جو نہی اور نکیر شدید مصنف عبدالرزاق ومصنف ابن ابی شیبہ سے بہ اسانید قویہ نقل کی ہے، ان اسانید قویہ واقوال کے بارے میں چونکہ امام بخاری کوئی طعن بھی نہیں کر سکے اس لئے طعن کا دوسرا طریقہ اختیار کیا کہ یہ مضامین جو ان آثار میں ذکر ہوئے ہیں یہ اہل علم کے شایان شان نہیں ہیں، کیونکہ حدیث میں ہے کہ کسی پر لعنت نہ بھیجو، کسی کو آگ کا عذاب مت دو، اور کسی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اصحاب نبی کریم ﷺ کے لئے اس طرح کہے کہ اگر وہ امام کے پیچھے قراءت کرے گا تو اس کے منہ میں خاک بھر جانا اس سے بہتر ہے وغیرہ اور یہ بھی کہ حدیث نبوی (بابۃ قراءۃ فاتحہ خلف الامام) ثابت ہو جانے کے بعد اسود وغیرہ کے اقوال سے استدلال کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ (جزء القراءۃ بخاری ص ۷)

افادۂ بنوری: اس پر علامہ بنوریؒ نے لکھا کہ عمل اور ڈرانے میں تو بڑا فرق ہے، لہٰذا ممانعت تو آگ سے جلانے کی ہے یا کسی کے منہ میں مٹی بھرنا تو ضرور برا ہے مگر اس سے ڈرانا بھی اسی درجہ میں کیسے ہو جائے گا؟ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت علقمہ، حضرت اسود اور حضرت ابراہیم نخعی ایسے جلیل القدر اکابر امت رسول اکرم ﷺ کے ارشادات کا مطلب بعد کے لوگوں سے زیادہ جانتے اور سمجھتے تھے۔ اور وہ احوال صحابہ کرام سے بھی زیادہ واقف تھے۔

ائمہ وتابعین کا مسلک: نیز محقق ابن قدامہؒ نے ''المغنی'' ص۶۰۴/۱ میں لکھا کہ جب مقتدی قراءۃ امام سن رہا ہو تو اس پر قراءت واجب نہیں ہے نہ مستحب ہے، یہی قول مندرجہ ذیل حضرات کا ہے:۔ امام احمد، زہری، ثوری، امام مالک، ابن عیینہ، ابن مبارک، اسحٰق، سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، سعید بن جبیر اور جماعت سلف کا نیز دوسرا قول امام شافعی کا بھی یہی ہے۔ الخ مذکورہ تفصیل سے امام بخاری کے مبالغات کی نوعیت واضح ہوگئی ہے۔

تفریق مجموع وجمع مفرق کا اعتراض

امام بخاریؒ نے جزء القراءۃ ص۶ میں پھر اپنے سابقہ اعتراض کو دہرایا کہ امام ابوحنیفہؒ نے فرض وواجب کو نفل سے بھی کم درجہ کا کر دیا کہ مقتدی کو ثنا کی تو اجازت دیدی جو بدرجہ نفل تھی بلکہ بعض حضرات (مالکیہ) کے نزدیک تو نہ وہ امام پر ہے نہ مقتدی کے لئے بلکہ تکبیر تحریمہ کے بعد وہ فوراً قراءت کے قائل ہیں، اور قراءت فاتحہ جو مقتدی پر بھی فرض تھی اس سے روک دیا گیا، اس طرح گویا ان حضرات نے دو الگ الگ چیزوں کو جوڑ دیا یعنی نفل وفرض کو یکساں کر دیا۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ظہر، عصر وعشا کی کسی دو رکعت میں قراءت کرے اور باقی دو میں نہ کرے تو نماز ہو جائے گی، لیکن اگر چار رکعت نفل کی نماز میں کسی ایک رکعت میں بھی قراءت نہ کرے گا تو وہ نماز درست نہ ہوگی، اسی طرح اگر فرض مغرب کی تیسری رکعت میں قراءت نہ کرے تو نماز درست رہے گی اور وتر کی تیسری میں نہ پڑھے تو نماز نہ ہوگی، حالانکہ رسول اکرم علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ کوئی رکعت بھی بغیر فاتحہ کے درست نہ ہوگی، آپ نے ہر نماز نفل وفرض کی رکعات کا حکم ایک کیا تھا، امام ابوحنیفہؒ نے الگ الگ کر دیا۔ گویا امام ابوحنیفہؒ اس بات پر بڑے ہی حریص اور ''مولع'' تھے کہ جن چیزوں کا حکم شارع نے ایک کیا ہے، ان کو الگ الگ کر دیں، اور جن کا حکم الگ الگ تھا ان کا حکم ایک کر دیں۔

جواب: ہدایہ وغیرہ تمام کتب فقہ حنفی کی تفصیلات ودلائل سے جو حضرات واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ امام اعظمؒ نے اوپر کے سارے مسائل کا فیصلہ صرف شارع علیہ السلام ہی کی ہدایات کے تحت کیا ہے، اپنی رائے سے کچھ نہیں کیا، اور اگر خدانخواستہ وہ ایسے ہی مخالفت شریعت کے حریص ومشتاق ہوتے جیسا امام بخاریؒ نے خیال کر لیا تھا، تو کیا ہزارہا اکابر امت محمدیہ ان کے علم وتفقہ کے مداح ہوتے اور ہمیشہ ہر دور میں دو تہائی امت محمدی کے افراد ان کے پیرو ہو سکتے تھے؟

افسوس ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی اور حمیدی ونعیم خزاعی جیسے حضرات اساتذۂ امام بخاری نے ان کو امام صاحبؒ سے سخت بدظن کر دیا تھا، اور نعیم خزاعی تو جھوٹ باتیں گھڑ کر بھی امام صاحب کی طرف منسوب کیا کرتے تھے، عبدالرحمٰن بن مہدی کا واقعہ بھی ہم نے نقل کیا تھا کہ امام صاحب کے فقہ کا نقشہ اس طرح کھینچا کرتے تھے کہ گویا ساری امت کے فقہاء ایک وادی میں ہیں اور امام صاحب سب سے الگ اور تن تنہا اپنا اونٹ چرا رہے ہیں۔ اس سے بڑا افتراء امام صاحب پر کیا ہو سکتا ہے؟

فقہ حنفی شوروی واجتماعی ہے

جس امام اعظمؒ کی فقہ شوروی واجتماعی تھی اور چالیس اکابر محدثین وفقہاء کی تدوین کردہ۔ اس کی پوری تفصیل ہم نے مقدمہ انوار الباری حصہ اول میں کی ہے اور اس کا بہترین خاکہ مولانا المرحوم بنوریؒ نے معارف السنن ص۲۶۴/۳ تا ص۲۶۸/۳ میں پیش کیا ہے، اس کی فقہ کو مطعون کیا جائے، بڑا ظلم ہے، اور جس مسئلہ کی بحث اس وقت ہمارے سامنے ہے، یعنی جہری نمازوں میں فاتحہ خلف الامام اس کو ہی دیکھ لیا جائے کہ امام اعظمؒ نے جو فیصلہ کیا تھا اسی کو امام مالک، امام شافعی وامام احمد اور دوسرے سارے اکابر امت نے بھی اختیار کیا، اور ان سب سے الگ رہنے والے صرف امام بخاری وابن حزم یا اس دور کے غیر مقلد اہل حدیث ہیں جو امام کے پیچھے جہری نماز میں بھی قراءت فاتحہ کو

واجب وفرض بتلاتے ہیں اوراس کے بغیر نماز مقتدی کو کالعدم اور باطل محض قرار دیتے ہیں۔ پھر جس طرح امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ جزء القراءۃ میں امام اعظمؒ کے خلاف سخت غضب وغصہ کا اظہار کیا ہے اور طرح طرح سے مطعون کیا ہے، وہی طریقہ غیر مقلدوں کا بھی ہے، آگے امام بخاری ۱۳ صفحہ کے بعد ص ۱۹ میں یہ بھی لکھیں گے کہ امام اعظمؒ خنزیر بری کو حلال کہتے تھے، اور امت مسلمہ میں باہم قتل وخونریزی کو جائز بتلاتے تھے، اور نماز کو ذمہ مسلم پر لازم نہیں سمجھتے تھے، اور برخلاف نص کلام اللہ مدت رضاعت ڈھائی سال قرار دیتے تھے۔

سبب طعن وتشنیع: ان سب مطاعن کا جواب بھی آگے آئے گا، اور پہلے بھی بارہا دیا گیا ہے، غرض یہ ہے کہ امام بخاریؒ معاندین امام اعظمؒ کے غلط پروپیگنڈے سے اس درجہ متاثر ہو گئے تھے کہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ صحیح بخاری میں تو احتیاط کی ہے، اس کے علاوہ اپنی دوسری تالیفات میں سخت کلامی اختیار کی ہے، اور غیر معمولی برہمی کا اظہار کیا ہے، اسی طریقہ کو غیر مقلدوں نے بھی اپنایا اور یہ نہ دیکھا کہ امام بخاری وغیرہ چند حضرات کے علاوہ ساری امت کے اکابر سلف وخلف نے کیسی کیسی مدح سرائی امام صاحب کی شان میں کی ہے، پھر جن مسائل میں امام صاحب کے ساتھ دوسرے ائمہ مجتہدین اور اکابر امت بھی ہیں ان میں بھی صرف امام صاحب اور حنفیہ ہی کو مطعون بنانا کہاں کا انصاف ہے؟!

ائمہ اربعہ کا اتفاق: ہم پہلے لکھا تھا کہ پوری فقہ اسلامی کے تین چوتھائی مسائل میں سارے ائمہ فقہ کا اتفاق ہے اور باقی چوتھائی میں بھی بڑا اختلاف حلال وحرام یا ممنوع وواجب کا بہت ہی تھوڑے مسائل میں ہے۔ اور عقائد واصول میں تو کسی ایک مسئلہ میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے، واللہ تعالےٰ اعلم۔

مطاعن مذکورہ امام بخاریؒ کا جواب

ہم نے مقدمہ انوارالباری میں امام بخاریؒ کے متعدد بڑے مطاعن کا ذکر کر کے جوابات لکھے تھے، وہاں دیکھے جائیں، مثلاً امام صاحب کو مرجی قرار دینا، حالانکہ امام صاحب کا مسلک وہی ارجاء اہل سنت تھا، جو تمام اکابر امت اور سلف وخلف کا ہے، وہ اس بارے میں جمہور اہل سنت کے ساتھ ہیں، مگر چونکہ مرجۂ کی ایک قسم اہل بدعت بھی تھے، اس لئے مطلقاً مرجیٔ نام دھر کر قدر گرائی گئی۔

دوسری بڑی منقصت امام بخاریؒ نے امام صاحب کے حالات بیان کرتے ہوئے یہ لکھی کہ ان کی رائے اور حدیث سے لوگوں نے سکوت کیا، صاحب ذب ذبابات الدراسات علامہ محدث محمد ہاشم سندیؒ (م ۱۱۸۹ھ) نے یہ جملہ دیکھا تو بڑے تذبذب میں پڑ گئے، انھوں نے لکھا کہ خاتمۃ المحدثین نے اپنی ''عقود'' میں اور دوسرے حضرات نے اپنی مصنفات میں جو امام اعظمؒ کی محدثانہ شان واضح کی ہے، اس سے یہ بات بہ صراحت ثابت ہوتی ہے کہ دوسرے اکابر محدثین نے امام صاحب کی حدیث اور رائے دونوں کو قبول کیا ہے، لہٰذا امام بخاری کے حکم بالسکوت کو اگر طعن کے طور پر تسلیم کرلیں تو امام بخاری پر کذب صریح کی بات آتی ہے، جو ان کے شایان شان نہیں، لہٰذا میرے نزدیک ان کے جملہ مذکورہ بالا کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ لوگوں نے ان کی حدیث ورائے میں جرح نہیں کی اور اس سے سکوت اختیار کیا ہے۔ اس کے سوا دوسرا مطلب امام بخاری کی طرف منسوب کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ہم ان کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے۔ (ذب ص ۳۰۷/۲)

اس پر ہمارے مولانا المحقق نعمانی دام فیضہم نے حاشیہ میں استدراک کیا کہ یہ توجیہ درست نہیں ہوسکتی، کیونکہ امام بخاری کا ان جملوں سے جو مقصد ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے، حافظ ابن کثیرؒ نے الباعث الحثیث ص ۳۴ میں لکھا کہ خاص لوگوں کی خاص اصطلاحات ہیں ان سے واقفیت ضروری ہے، مثلاً امام بخاری جب کسی کے لئے ''سکتوا عنہ'' لکھیں گے یا ''فیه نظر'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ان کے نزدیک کم تر اور ادنی مرتبہ کا ہے، چونکہ وہ جرح میں اپنا ایک خاص لطیف مزاج رکھتے ہیں، اس لئے یہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں، اور اس کو جاننا چاہیے،

علامہ محدث سیوطیؒ نے تدریب الراوی ص ۱۲۷ میں لکھا کہ امام بخاری فیه نظر یا سکتوا عنه ان لوگوں کے لئے کہتے ہیں جن کی حدیث کو لوگ قبول نہیں کرتے۔

پھر علامہ نعمانی نے لکھا: جولوگ امام بخاری کی تصانیف میں امام ابوحنیفہؒ کا تذکرہ مطالعہ کریں گے، مثلاً آپ کی تینوں تاریخوں میں یا الضعفا والمتروکین میں اوران تعریضات سے بھی واقف ہوگا جوانھوں نے جامع صحیح اور جزءالقراءۃ خلف الامام اور جزءرفع الیدین میں امام صاحب پر کی ہیں، تو وہ ان کے امام صاحب کے لئے شدت تعصب اور سخت حملوں پر تعجب وحیرت کئے بغیر نہ رہے گا۔ اللہ تعالے ان کی مغفرت فرمائے اور مسامحت کا معاملہ کرے۔

حضرت علامہ محمد انورشاہ کشمیریؒ نے بسط الیدین میں لکھا:۔ امام ابوحنیفہؒ کے مناقب اور مثالب دونوں ہی لوگوں کی زبانوں پر تھے مگر امام بخاریؒ نے سارے مناقب کوتو نظرانداز کردیا اور مثالب جمع کردئے۔

علامہ حافظ ابن رشیدؒ نے لکھا:۔ امام بخاریؒ حنفیہ کی بہ کثرت مخالفت کرنے والے تھے (اتحاف شرح احیاء الغزالی ص ۹۴/۴) علامہ زیلعیؒ (صاحب نصب الرایہ) جن کے بارے میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اتحاف النبلاء ص ۳۶ میں حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا کہ وہ کثیر الانصاف تھے، انھوں نے نصب الرایہ میں جہر بسم اللہ کی بحث کرتے ہوئے دارقطنی کی پیش کردہ احادیث موضوعہ وضعیفہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:۔ اپنے مختار مسلک کو ثابت کرنے کے لئے ضعیف کو صحیح قرار دینا یا صحیح کو ضعیف ومعلول دکھانے کی سعی کرنا اہل علم وانصاف کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے، بلکہ اہل علم ودین کی شان تو یہ ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں کسی قسم کا بھی تعصب اور بےانصافی روانہ رکھیں پھر لکھا:

''احادیث جہر کے ضعیف اور نا قابل عمل ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کی روایت سے اصحاب صحاح وسنن ومسانید مشہورہ نے اعراض کیا ہے، اور امام بخاریؒ بھی جن کا مسلک امام ابوحنیفہ کے خلاف شدید تعصب اور فرط تحمل (جارحیت) سب کو معلوم ہے کوئی ایک حدیث بھی جہر بسم اللہ کی اپنی صحیح میں نہیں لائے، اور امام مسلم بھی کوئی حدیث نہیں لائے، بلکہ حدیث انسؓ لائے جو اخفاء پر دال ہے اگر کہا جائے کہ ان دونوں نے ساری احادیث صحاح لانے کا التزام ہی کب کیا ہے؟ اور ممکن ہے کہ متروکہ احادیث صحاح میں احادیث جہر بھی ہوں، لیکن یہ بات ایسے موقع پر کوئی کٹ حجتی ہی کہہ سکتا ہے کیونکہ جہر بسم اللہ کا مسئلہ اعلام مسائل اور مشکلات فقہ میں سے ہے، جن پر مناظرے اور مباحثے جاری رہے ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے خاص طور سے امام ابوحنیفہؒ کے رد میں بڑا تتبع وریسرچ کی ہے، چنانچہ ایک حدیث ذکر کریں گے، پھر امام صاحب پر تعریض کریں گے کہ رسول اکرم ﷺ کا تو یہ ارشاد ہے اور بعض الناس (امام صاحب) ایسا ایسا کہتے ہیں۔ (یعنی حدیث مذکور کے خلاف) اس طرح امام صاحب پر مخالفت حدیث کا طعن اور تشنیع وملامت کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کوئی حدیث بھی جہر بسم اللہ کی ان کی نظر میں صحیح ہوتی تو وہ ضرور اپنی صحیح بخاری میں لاتے۔

امام بخاریؒ نے شروع بخاری میں باب الصلوٰۃ من الایمان قائم کیا پھر احادیث الباب لائے اوران کا ارادہ امام صاحب کے قول ''ان الاعمال لیست من الایمان کا رد تھا، حالانکہ یہ مسئلہ تو دقیق تھا اور صرف فقہاء کے سمجھنے کا تھا، جبکہ جہر بسم اللہ کے مسئلہ کو عوام وجہال بھی جانتے تھے، لہٰذا یہ بات تو میرے نزدیک واللہ باللہ ناممکن بلکہ محال ہے کہ امام بخاری کے نزدیک کوئی بھی صحیح حدیث جہر بسم اللہ کی ان کی شرط کے موافق یا اس سے کچھ قریب بھی ہوتی اور وہ اس کو بخاری میں نہ لاتے'' (نصب الرایہ ص ۳۵۵/۱)

علامہ محدث سخاوی شافعیؒ نے الاعلان بالتوبیخ میں لکھا کہ شیخ ابوحیان نے کتاب السنہ میں جو کلام بعض ائمہ مجتہدین (امام ابوحنیفہؒ) پر کیا ہے، اور ایسے ہی ابن عدی نے اپنی کامل میں اور خطیب نے اپنی تاریخ میں اور دوسروں نے اس سے پہلے جیسے ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں اور بخاری ونسائی نے بھی جن کو ایسی باتوں سے دور رہنا ہی زیادہ بہتر تھا، میرے نزدیک اس بارے میں ایسے حضرات کا اتباع ہرگز نہ کیا جائے۔ (ذب ص ۲۹۸/۲)

حافظ حدیث علامہ صالحی شافعیؒ مؤلف ''السیرۃ الکبری الشامیہ'' نے عقود الجمان فی مناقب ابی حنیفۃ النعمان'' میں لکھا:۔ میرے عزیز

بھائی! ہرگز ہرگز ان کتابوں کا مطالعہ نہ کرنا جو بعض لوگوں نے کسی امام مجتہد کے مثالب اور برائیوں میں لکھی ہیں، کہ اس سے تمہارے دلوں میں سے ان اکابر کی عظمت نکل جائے گی، اور تمہارا قدم ہدایت کے راستے پر مستقیم ہو جانے کے بعد پھر سے پھسل جائے گا، اور تم خطیب بغدادی کی ان نقول پر بھی بھروسہ نہ کرنا جو امام ابوحنیفہ کی شان رفیع کے خلاف درج کردی ہیں، انھوں نے اگرچہ مادحین کے اقوال بھی ذکر کئے ہیں مگر اس کے بعد مذمت کرنے والوں کے ہفوات بھی نقل کردیئے ہیں جن سے ان کی کتاب کو بڑا بٹہ لگ گیا ہے اور ہر ایک بڑے چھوٹے کو ان کی تاریخ پر اعتراض کا موقع مل گیا ہے۔ درحقیقت انھوں نے یہ مثالب کا باب درج کتاب کر کے ایسی گندگی پیدا کردی ہے کہ وہ سات سمندروں کے پانی سے بھی نہیں دھل سکتی (۔۔ص ۲/۲۹۹)

علامہ ابن حجر مکی شافعیؒ نے ''الخیرات الحسان فی مناقب النعمان'' میں مستقل فصل قائم کر کے خطیب کی چیزوں کا رد کیا ہے اور ان کی اسانید ساقط وضعیفہ کی پول کھول دی ہے۔ اور پھر یہ بھی لکھا کہ اجماعی واتفاقی مسئلہ ہے کہ اس طرح کسی معمولی مسلم کی آبروریزی بھی جائز نہیں تو ائمہ مسلمین میں سے کسی امام کی توہین وتحقیر کیونکر جائز ہوسکتی ہے؟! الخ (۔۔ص ۲/۳۰۰)

علامہ محمد ہاشم سندیؒ نے لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں دارقطنی وخطیب کی جرح متعصب کی جرح کہلائے گی، اور وہ اس میں تعصب کی وجہ سے متہم ہو گئے۔ لہٰذا وہ مقبول نہیں ہوسکتی۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کچھ لوگوں نے امام بخاری پر بھی جرح کی ہے۔ جس طرح متہمین بالتعصب کی جرح کو ہم ان کے حق میں قبول نہیں کرتے، امام صاحبؒ کے بارے میں بھی متہمین بالتعصب کی جرح کو قبول نہیں کریں گے (ص ۲/۲۸۴)

اس کے بعد ہم جزء القراءۃ کے مطاعن کا مختصر جواب بھی عرض کرتے ہیں:۔

خنزیر بری کی حلت: علامہ کوثریؒ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے امام اعظمؒ پر ارجاء کا تعن اور خنزیر بری کی حلت کا الزام غسان مرجئی اور شمزی معتزلی کے اتباع میں لگایا ہے، حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط اور بے اصل ہیں:۔

ارجاء کی بحث تو کئی جگہ اور تفصیل سے آچکی ہے، خنزیر بری کی حلت کے بہتان پر حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا:۔

اگرچہ امام ابوحنیفہؒ کی لوگوں نے کچھ مسائل میں مخالفت کی ہے، مگر انکے علم وفہم اور فقہ سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، اور بعض لوگوں نے انکی طرف ایسی باتیں بھی منسوب کردی ہیں جن سے مقصود ان پر تشنیع ہے، حالانکہ وہ قطعاً جھوٹ اور ان پر بہتان ہیں مثلاً خنزیر بری کی حلت وغیرہ (منہاج السنہ ص ۱/۲۵۹)

شمزی وابن عبید کا ذکر

عمرو بن ابی عثمان الشمزی بقول سمعانی معتزلہ کا سردار تھا، جس نے عمرو بن عبید اور واصل ابن عطا سے روایت کی ہے، علامہ نعمانی نے لکھا کہ تعصب کا بھی عجیب معاملہ ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی یہ بھی نہیں دیکھتا کہ جو بات کسی بڑے شخص کی طرف منسوب کی جارہی ہے، اس میں انقطاع، عدم ضبط، تہمت کذب، جہالت، بدعت، حسد، بغض، عصبیت وغیرہ میں سے تو کوئی نقص یا علت نہیں ہے۔ جبکہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی روایت کو گرانے کے لئے کافی ہے، مگر ایسی کوئی روایت جو امام ابوحنیفہؒ کے مثالب میں ہاتھ آجائے تو اس کو ضرور معتبر ومعتمد روایت کی طرح بے تامل نقل کردیا جاتا ہے۔

کیا اتنے بڑے امام اعظمؒ کے حق میں یہی بات موزوں تھی؟ جس کو ہمیشہ سے امت کے دو ثلث افراد نے اپنے دین اور عقائد واعمال کے لئے مقتدا اور رہبر تجویز کیا ہے؟ ان کے بارے میں ہر گری پڑی روایت خواہ وہ کسی کذاب، مرجئی اہل بدعت یا افتراء پرداز معتزلی ہی نے گھڑ کر چلائی ہو، قبول کرنا اور اس کو نقل کر کے آگے بڑھانا علم وانصاف کی شان سے بہت بعید ہے۔

یہ رئیس المعتزلین شمزی عمرو بن عبید (عابد شیوخ الاعتزال) کا شاگرد تھا، اس کا بہتان وافتراء قبول کرلیا گیا حالانکہ خود اس کے استاذ

مذکور کی حیثیت بھی امام اعظم کی وجاہت وجلالتِ قدر کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی، علامہ آجری نے امام حدیث ابوداؤد سے نقل کیا کہ" ابوحنیفہ ہزار عمرو بن عبید جیسوں سے افضل وبہتر ہیں۔ (تہذیب ص ۷۰\۸ ترجمہ عمرو بن عبید)

قابلِ غور وفکر ہے یہ بات کہ امام بخاری تعصب کی وجہ سے کہاں تک پہنچ گئے کہ شمزی کی بات پر امام اعظمؒ کے خلاف اعتماد کرلیا، اور امام ابوداؤد صاحب سنن ابی داؤد امام اعظمؒ کا کتنا بڑا مرتبہ وعظمت مانتے ہیں کہ ہزاروں عمرو بن عبید کو بھی ان کے مقابلہ میں نظر انداز کرتے ہیں، جو شمزی کے استاذ تھے، اور وزیر یمانی جیسے بابصیرت نے پھر بھی دھوکہ کھایا کہ ایک جگہ "تنقیح الانظار" میں یہ لکھ دیا کہ عمرو بن عبید حفظ واتقان میں امام ابوحنیفہؒ سے کم نہ تھے۔ بہر حال! اگر انہوں نے اس بات کو صحیح سمجھ کر ہی کہا تب بھی امام ہمام ابوداؤد کے مقابلہ میں ان کی رائے کا کیا وزن ہوسکتا ہے؟!

امام بخاری وابوداؤد کا فرق

امام ابوداؤد سے یہ بھی نقل ہے کہ امام ابوحنیفہ کے ذکر پر فرماتے تھے رحم اللہ اباحنیفۃ کان اماما (اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ پر رحمتیں نازل فرمائے کہ وہ امامت کے مرتبہ پر سرفراز تھے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ صحیح فرماتے تھے کہ اصحابِ صحاح میں سے امام ابوداؤد امام صاحب کی منہ بھر کر تعریف کرتے تھے، نہایت افسوس ورنج ہوتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں امام بخاری کذابین ووضاعین کی جھوٹی خبروں پر بھروسہ کر کے ان کی طرف غلط باتیں منسوب کر گئے۔

امام بخاری نے شمزی معتزلی کی بات پر یقین کرلیا، اور یہ نہ دیکھا کہ امام ابوحنیفہؒ نے معتزلہ کے عقائدِ باطلہ کا رد کیا تھا، اور ان کو اہل اہواء میں قرار دیا تھا اس لئے وہ لوگ عناد وحسد کی وجہ سے امام صاحب کے دشمن تھے اور جھوٹے الزامات امام صاحب پر لگایا کرتے تھے، یہ بھی انہوں نے ہی مشہور کیا تھا کہ امام صاحب اور عمر بن عثمان شمزی مکہ معظمہ میں ایک جگہ ملے اور ان کے مابین ایمان کے بارے میں مناظرہ ہوا یہ بھی سراسر جھوٹی روایت امام صاحب کو بدنام کرنے کے لئے گھڑی گئی تھی، جس کا ذکر علامہ زبیدیؒ نے اتحاف السادہ میں کیا ہے۔

علامہ زبیدیؒ نے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ امام صاحب پر ایسے لوگوں کا جھوٹ کیسے چل سکتا ہے جبکہ ان کے معاصر امام مالک، سفیان، اوزاعی وغیرہ اور پھر امام شافعی، امام احمد، اور ابراہیم بن ادہمؒ جیسے بڑوں نے امام صاحب کی مدح وثنا کی ہے، اور ان کے معتقد، ان کی فقہ، ورع وزہد، علوم شریعت میں مہارت اور اجتہاد واحتیاطِ امور دین کے بارے میں بہت کچھ تعریف کی ہے جو کتابوں میں ثابت ہے۔

مناظرہ امام صاحب وجہم بن صفوان

امام صاحب نے جو مناظرہ جہم بن صفوان سے کیا تھا وہ بھی مشہور ومسطور فی الکتب ہے، وہ صرف تصدیق قلبی کو ایمان کہتا تھا، امام صاحب نے اس کے ساتھ اقرار باللسان کا ضروری ہونا ثابت کیا تھا، لہٰذا جن حضرات نے امام صاحب یا امام ابو یوسف کو جہمی سمجھا یا امام بخاری نے امام محمد کو جہمی کہا، یہ سب ان حضرات پر افتراء ہے، ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین سب کے عقائد ایک تھے، اس بارے میں ان کے اندر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ (حاشیہ ذب ص ۵۲\۲۱۷)

مسئلہ خلق قرآن اور امام بخاری کا جواب

امام بخاریؒ نے جزء القرائۃ ص ۱۹ میں الزام قائم کیا کہ امام صاحب کا عقیدہ امر اللہ من قبل و من بعد کے مخلوق ہونے کا تھا، اس کے بارے میں محشی علام نے لکھا:۔ امام اعظم کی شانِ رفیع اور ان کا علم وفہم عظیم اس سے کہیں ارفع ہے کہ وہ کلامِ نفسی باری تعالیٰ کو مخلوق کہیں یا حروف واصوات اور حافظوں کے دماغوں میں حادث ہونے والے حروف کو غیر مخلوق قرار دیں، اور یہ قرآن مجید تو خدائے تعالیٰ کے اوامر

نواہی کا ہی مجموعہ ہے، امام بیہقی نے اپنی کتاب ''الاسماء والصفات'' میں امام محمدؒ سے نقل کیا کہ وہ فرماتے تھے ''جو قرآن کو مخلوق کہے اس کے پیچھے نماز مت پڑھو'' اور محمد بن سابق نے امام ابو یوسفؒ سے سوال کیا کہ کیا امام ابوحنیفہ قرآن مجید کو مخلوق کہتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا:۔ معاذ اللہ! نہ وہ یہ بات کہتے تھے اور نہ میں کہتا ہوں، دوسرا سوال کیا کہ کیا امام صاحب کی رائے جہم کے موافق تھا؟ جواب دیا:۔

معاذ اللہ! اور نہ میری رائے یہ ہے، اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔

اسکے بعد دوسری روایت ذکر کی کہ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا میں نے ایک دفعہ امام صاحب سے قرآن مجید کے مخلوق و غیر مخلوق ہونے کے بارے میں گفتگو کی تو ہم دونوں کی رائے اس امر پر متفق ہوگئی کہ جو قرآن کو مخلوق کہے وہ کافر ہے (کتاب الاسماء والصفات ص ۲۵۰\۲۵۱ طبع مصر)

امام ابوحنیفہ کے بارے میں حافظ ابن تیمیہ حنبلی کی رائے

حافظ ابن تیمیہؒ نے کتاب الایمان میں لکھا:۔ خدا کی بڑی رحمت و فضل ہے اپنے مسلمان بندوں پر کہ سارے وہ ائمہ جن پر امتِ مسلمہ کا مکمل اعتماد واطمینان ہے اوران کی بات مانی جاتی ہے، ائمہ اربعہ وغیرہم جیسے امام مالک، ثوری، اوزاعی، لیث ابن سعد، اور جیسے امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابوعبید، امام ابوحنیفہ، ابو یوسف ومحمد، یہ سب ہی فرقۂ جہمیہ کے اہلِ کلام پر نکیر ورد کرتے رہے ہیں، ان کے عقیدۂ خلقِ قرآن کے بارے میں بھی اور ایمان وصفاتِ باری کے متعلق بھی۔ اور یہ سب ہی حضرات ان امور پر متفق تھے جو سلف سے منقول تھے۔ (ص ۱۶۳\۱۶۴ طبع مصر)

امام ابوحنیفہ اور امام احمدؒ

پھر خود امام احمدؒ جو مسئلہ خلق قرآن کے فتنہ میں مبتلا ہوئے اور حکومتِ وقت سے سخت تکالیف بھی اٹھائیں، ان کے حالات سب کو معلوم ہیں اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ جو قرآن کو مخلوق کہتا تھا امام احمدؒ اس کے شدید مخالف تھے، لیکن وہ بھی امام ابوحنیفہ کو امام بخاری والے اوپر کے اتہام سے بری سمجھتے تھے اور یوں بھی امام صاحبؒ کی نہایت تعظیم کرتے تھے افسوس ہے کہ امام بخاری نے اپنے استاذِ معظم امام احمدؒ کا بھی اس بارے میں کچھ خیال نہیں کیا۔ علامہ طوفی حنبلی نے شرح مختصر الروضہ میں اصولِ حنابلہ کے ذکر میں لکھا:۔

امام ابوحنیفہ کے لئے علامہ طوفی حنبلی کا خراجِ عقیدت

''امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں جو کچھ لوگوں نے کہا اور ان کو بہت سے امور کے ساتھ متہم کیا، واللہ میں ان کو ایسی تمام باتوں سے بری اور منزہ سمجھتا ہوں، اور امام صاحب کے بارے میں میری قطعی رائے یہ ہے کہ انہوں نے کسی مسئلہ میں بھی جان بوجھ کر یا عناداً سنتِ نبویہ کی مخالفت نہیں کی ہے، اگر کہیں مخالفت ہوئی ہے تو وہ اجتہادی مسائل میں اور وہ بھی واضح حجتوں اور صالح وروشن دلائل کے ساتھ ہوئی ہے، اور ان کی حجج و دلائل سب لوگوں کے سامنے موجود ہیں، لیکن ان کے مخالفین میں کم ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے انصاف سے کام لیا ہو، جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہ صورتِ خطا بھی امام صاحب کے لئے ایک اجر ہے اور صواب میں دو اجر ہیں، ان کے بارے میں طعن کرنے والے یا تو حاسد ہیں یا ان کے مواقعِ اجتہاد سے ناواقف و جاہل ہیں، پھر لکھا کہ امام احمدؒ سے جو آخری رائے اور فیصلہ امام صاحبؒ کے بارے میں ہمیں پہنچا ہے وہ ان کی شان میں بہتر اور مدح وثناء ہی کا ہے، جس کو ہمارے اصحاب میں سے ابوالورد نے کتاب اصول الدین میں ذکر کیا ہے۔ (حاشیۂ ذب ص ۵۷\۲۱)

علامہ کوثریؒ نے بھی تانیب ص ۱۴۴ میں اس کو نقل کیا ہے اور یہ بھی لکھا کہ امام احمدؒ نے مسائل کتب ابی حنیفہ میں سے صرف چند مسائل سے اختلاف کیا ہے جو امام شافعیؒ وغیرہ کے اختلاف سے بہت کم ہے۔ اور لکھا کہ شواہد اس پر دال ہیں کہ امام احمدؒ نے امہاتِ مسائل خلافیہ میں امام ابوحنیفہؒ کی متابعت کی، علامہ خوارزمیؒ نے جامع المسانید ص ۱۶۷\۱ میں یہ بھی لکھا کہ اصول المسائل میں سے میں نے ایک سو پچیس

مسئلے ایسے جمع کئے ہیں، جن میں امام احمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی موافقت کی ہے اور امام شافعیؒ نے ان میں مخالفت کی ہے (اس کے باوجود دور حاضر کے حنابلہ کا مخالفینِ امام احمد (غیر مقلدین) سے قرب اور ہم سے بُعد موجب حیرت ہے)

علامہ کوثریؒ نے لکھا کہ مغنی ابن قدامہ بھی اس کے لئے کافی دلیل وشاہد ہے اور الانصاح لابن ہبیرہ وزیر حنبلی بھی باوجود مختصر ہونے کے اس کا اچھا ثبوت ہے۔ پھر علامہ کوثریؒ نے یہ بھی حوالہ دیا کہ میں نے بلوغ الامانی میں امام احمد سے امام صاحب کے بارے میں مختلف روایات کے اسباب و وجوہ پر بحث کردی ہے اور الاختلاف فی اللفظ کے حاشیہ میں بھی ان کو واضح کیا ہے۔

علامہ محمد ہاشم سندیؒ نے ابوبکر مروزی سے نقل پیش کی کہ میں نے امام احمدؒ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ ہمارے نزدیک یہ بات صحت کو نہیں پہنچی کہ امام ابوحنیفہؒ قرآن کو مخلوق کہتے تھے۔ اس پر میں نے کہا کہ ایسا ہے تو خدا کا بڑا شکر ہے۔ وہ (امام ابوحنیفہؒ) علم کے بھی بڑے مرتبہ پر فائز تھے، امام احمدؒ نے فرمایا سبحان اللہ! کیا کہنا، وہ تو علم و ورع، زہد و ایثار دار آخرت، کے اعتبار سے ایسے مقام پر تھے، جس کو دوسرا کوئی نہیں پہنچ سکتا، ان کو کوڑوں سے مارا گیا تاکہ خلیفہ ابوجعفر منصور کی طرف سے پیش کی ہوئی قضا کو قبول کرلیں مگر انھوں نے اس کو رد کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور رضوان ان کو حاصل ہوں (ذب ص ۶۰/ ۲/۷)

علامہ سندیؒ نے یہ بھی لکھا کہ یوں تو امام بخاری کی کتاب الایمان کے طور وطریق کے ظاہر سے متاثر ہو کر ان کو بھی بعض لوگوں نے اہل اعتزال میں شمار کر دیا ہے، حالانکہ وہ ان سے اور ان کے مسلک سے قطعاً بری و بعید تھے، اور ایمان وغیرہ کسی مسئلہ میں بھی معتزلہ کے ہمنوا و ہم عقیدہ نہیں تھے۔

اسی طرح ہم اہل سنت والجماعت کی تعداد کثیر کے سردار و امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں بھی یقین رکھتے ہیں کہ ان کے کسی کلام سے اگر کسی نے غلط فہمی کی وجہ سے، بلاتحقیق کے کوئی بات منسوب کر دی ہے، مثلاً ارجاء وغیرہ، تو امام صاحب بھی یقیناً امام بخاری کی طرح بری ہیں۔

حنفی و حنبلی مسالک کا تقارب

آگے بڑھنے سے قبل ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین انوارالباری کے ذہنوں میں یہ بات تازہ کر دیں کہ جیسا اوپر بھی اشارہ ہوا حنفی مسلک امام احمدؒ کے مسلک سے قریب تر ہے، اور رد بدعت و شرک کے بارے میں تو شافعی و مالکی مسالک کے اعتبار سے بھی زیادہ موافقت و مرافقت حنبلی مذہب کے لئے حنفی مسلک کو حاصل ہے، اور حنبلی مسلک کے بعد مالکی ہم سے زیادہ قریب ہیں، پھر شافعی کہ وہ فروع میں کچھ زیادہ ہم سے الگ ہوئے ہیں، لیکن اصول وعقائد کے باب میں چاروں مسالک متحد و متفق ہیں، اور اس وقت جو علماء نجد نے باوجود حنبلی المسلک ہونے کے علامہ ابن تیمیہؒ کے تفردات اصول و فروع کو اختیار کر کے امام احمدؒ کے مسلک اور ارشادات سے اعتراض کی صورت اختیار کر لی ہے وہ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے بااحساس اور متیقظ علمائے اسلام و عوام کے لئے سخت تکلیف و تشویش کا موجب بن گئی ہے۔ **ولعل الله يحدث بعد ذلك امرا. و بيده ازمة الامور. عليه نتوكل و اليه نينب. وما توفيقنا الابالله العلى العظيم. هو حسبنا و نعم الوكيل.**

امام صاحب کی مدت رضاعت پر اعتراض کا جواب

امام بخاریؒ نے جزء القراءت ص ۱۹ میں لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ نے مدت رضاعت ڈھائی سال قرار دے کر نص قرآنی کا خلاف کیا ہے۔

امام مجتہد ابوبکر جصاص نے اپنی تفسیر ''احکام القرآن'' میں اس کا جواب یوں دیا کہ لفظ اتمام مانع زیادت نہیں ہے کیونکہ نص قرآنی نے ایک آیت میں **و حمله و فصاله ثلاثون شهرا** بتلایا اور دوسری میں **وفصاله فی عامين** ارشاد کیا، دونوں نے صراحت کر دی کہ مدت حمل ۶ ماہ ہے، حالانکہ زیادہ بھی ہوتی ہے اور ۶ ماہ کم سے کم مدت بتلائی ہے، تو جس طرح یہاں ۶ ماہ کی نص قرآنی پر زیادتی جائز ہے۔ اسی طرح مدت رضاعت کی زیادتی بھی ممنوع ہوگی۔

دوسرے یہ کہ یہاں مقصود اجرت رضاعت کا بیان ہے کہ دوسال سے زیادہ پر شوہر کو مجبور نہیں کر سکتے، لیکن وہ خود دونوں زیادتی پر فیصلہ کرلیں تو وہ بھی جائز ہوگی جو آیت فان ارادا فصالا اور دوسری آیت وان اردتم ان تسترضعوا سے ثابت ہوئی لہٰذا مدت رضاعت وہی شرعاً ثابت ہوگی، جس پر زیادہ کی حد تک متفق ہوں، اور وہ ڈھائی سال ہے اس سے زیادہ کسی کے یہاں بھی نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ حق تعالے نے فان ارادا فصالا فرمایا، اگر فصال کی مدت دوسال تک محدود ہوتی تو وہ متعین تھی، دوسال کے بعد ان کے ارادہ پر کیوں رکھا جاتا، اور فصال کو نکرہ لائے، الفصال نہیں فرمایا، جس دوسال پر فصال معہود شرعی مراد ہوتا، اس سے بھی ظاہر ہوا کہ دوسال رضاع کی مدت مقررہ شرعیہ نہیں ہے۔ اس سے آگے ڈھائی سال تک جا کر شرعی مدت ختم ہوگی۔

امت پر تلوار کا اعتراض و جواب

امام بخاریؒ نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ امت میں قتل و قتال اور خون ریزی کرانے کا قائل تھے۔ جواب یہ ہے کہ امام صاحب کا مسلک یہ ضرور تھا۔ اہل حق کو اہل باطل کے خلاف تلوار ضرور اٹھانی چاہیئے تاکہ باطل پر جمود کرنے والے حق کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوں، علامہ ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں لکھا کہ "امام صاحب کا مذہب ظالموں اور ائمہ جور سے قتال کرنے کا مشہور تھا"۔

اسی لئے امام اوزاعی نے کہا کہ ہم کو امام ابوحنیفہ نے ہر بات پر آمادہ کرلیا تھا، تا آنکہ وہ تلوار تک بھی آ گئے، یعنی ظالم حاکموں سے قتال کے لئے حکم دیا تو ہم اس کا تحمل نہ کر سکے۔ وہ فرماتے تھے کہ امر بالمعروف و نهی عن المنکر اولا زبان سے فرض ہے، پھر اگر وہ لوگ نہ مانیں تو تلوار سے ان کو درست کیا جائے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے۔

امام صاحب نے جو معاملہ حضرت زید بن علیؓ کے ساتھ کیا وہ بھی مشہور ہے کہ ان کی خفیہ طور سے نصرت کی اور ان کی مالی امداد بھی کی، اور ایسے ہی حضرت عبداللہ بن حسن کے صاحبزادے حضرت محمد و ابراہیمؒ کی بھی نصرت کی تھی۔

ابواسحٰق فرازی کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے کہا آپ نے میرے بھائی کو ابراہیم کے ساتھ نکلنے کا مشورہ کیوں دیا کہ وہ قتل کیا گیا؟! امام صاحب نے فرمایا کہ تمہارے بھائی کا ان کے ساتھ نکلنا تمہارے نکلنے سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ کیونکہ یہ ابواسحٰق قتال ظلمہ سے بچنے کے لئے بصرہ چلے گئے تھے۔

اس کے سوا بھی امام صاحب کی تلقین قتال ظلمہ و اہل جور کے واقعات نقل کر کے آخر میں لکھا کہ درحقیقت اس دور میں امام صاحب کے خلاف "یری السیف علی الامة" کا اعتراض ان بھولے بھالے غیر سیاسی شعور والے اہل حدیث نے چلایا تھا، جنھوں نے امر بالمعروف و نهی عن المنکر کا فریضہ ترک کردیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اسلامی معاملات پر ظالموں نے غلبہ حاصل کرلیا۔ کیونکہ ان کی مقاومت و مقابلہ مفقود ہوگیا تھا۔ (۔۔۔ص ۱/۸۱)

(۱) ادراک رکوع سے رکعت نہ ملے گی:۔ امام بخاریؒ نے ص ۱۹ میں لکھا کہ ایسے لوگ جو مدت رضاعت کا تعین نص قرآنی کے خلاف کرتے ہیں اور خنزیر بری کو حلال کہتے ہیں اور امت مسلمہ کے درمیان قتل و قتال اور خوں ریزی کو محبوب رکھتے ہیں اور خلق قرآن کے قائل ہیں اور ان سب چیزوں کو اجماعی و اتفاقی مسائل بتلاتے ہیں، اور اپنے مقابلہ میں قول رسول اللہ ﷺ پر اعتماد کر کے قراءت فاتحہ کو ضروری و فرض قرار دینے والوں کو غلطی پر بتلاتے ہیں کیا واقعی ایسے لوگوں کی باتوں پر اعتماد کرنا صحیح ہوسکتا ہے، خاص طور سے جبکہ وہ لوگ مسلمانوں کی عزت و جان و مال وغیرہ کے ضائع کرنے کو بھی مباح جانتے ہیں؟! اور یہ لوگ اس مسئلہ کو بھی اجماعی و اتفاقی بتاتے ہیں کہ بغیر قراءت کے امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہونے سے وہ رکعت مل جاتی ہے، اور جو یہ کہتا ہے کہ رکوع کا اعتبار جب ہی ہے کہ قراءت کے بعد امام کے رکوع میں شریک ہو،

ورنہ وہ رکوع رکعت نہ بنائے گا تو اس کو کہتے ہیں کہ وہ اہل نظر میں سے نہیں ہے، حالانکہ حضرت ابو ہریرہ اور ابوسعید بتلاتے ہیں کہ کوئی رکوع نہ کرے جب تک فاتحہ نہ پڑھ لے، اور سب اہل صلوٰۃ کا سارے اسلامی شہروں میں بسنے والوں کا اجماعی فیصلہ ہے کہ نماز بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی، اور قرآن مجید میں بھی صراحت ہے کہ جتنا آسان ہو وہ ضرور پڑھو، ہر منصف کا فرض ہے کہ وہ انصاف سے فیصلہ کرے کہ اٹکل سے باتیں کرنے والے جو اپنے کو اہلِ علم سمجھتے ہیں، صحیح راستے پر ہیں، یا یہ جو قرآن وحدیث اور سارے مسلمانوں کے نزدیک تسلیم شدہ حقیقت پر عامل ہیں؟!

(۲) خطبہ کے وقت نماز کا جواز: ۔ اس کے بعد امام بخاری نے ص۱۹ میں ہی لکھا کہ وہ کہتے ہیں کہ آیتِ قرآن مجید "فاستمعوا له کی وجہ سے امام کے پیچھے قرائۃ جائز نہیں، پھر یہ سکتات امام کی بھی نفی کرتے ہیں، تو ان سے ہم کہیں گے کہ حضرت ابن عباس وسعید بن جبیر سے تو یہ نقل ہوا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے جبکہ جمعہ کے دن امام خطبہ دے رہا ہو، دوسری طرف حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی ہے کہ کوئی نماز بغیر قرائۃ کے صحیح نہ ہوگی، پھر یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے خطبہ کی حالت میں کلام کرنے سے بھی روک دیا اور فرمایا کہ امام کے خطبہ کی حالت میں تم اگر دوسرے کو یہ بھی کہو گے کہ چپ رہو تو یہ بھی لغو ہوگا لیکن ان سب کے باوجود حضور علیہ السلام نے خطبہ کی حالت میں مسجد آنے والے کو دو رکعت پڑھنے کا بھی حکم فرمایا ہے۔ جب ایسا ہی ہے تو ہم بھی قرائۃ خلف الامام کو نہیں روک سکتے۔ اور حضور علیہ السلام نے اپنے عمل سے بھی بتلادیا کہ خطبہ کی حالت میں نماز جائز ہے کیونکہ سلیک غطفانی کو دو رکعت پڑھنے کا حکم دیا تھا۔

(۳) احادیث اتمام سے وجوب قرائۃ خلف الامام کا ثبوت

امام بخاریؒ نے ص۲۰ میں لکھا کہ متعدد اہلِ علم کا قول ہے کہ ہر مقتدی اپنے فرائض ادا کرے گا، اور قیام، قرائۃ، رکوع وسجود سب فرض ہیں اسی لئے ان کے نزدیک بھی رکوع وسجود مقتدی سے کسی حال میں ساقط نہ ہوگا لہٰذا قرائۃ کا بھی یہی حکم ہونا چاہئے کہ وہ کسی حال میں بھی مقتدی سے ساقط نہ ہو الا یہ کہ کتاب وسنت ہی سے اس کا ساقط ہونا ثابت ہو، اور حدیثِ نبوی سے یہ ثابت ہوا کہ جب تم نماز کو پہنچو تو جتنی امام کے ساتھ پالو وہ پڑھ لو اور جو رہ جائے اس کو خود پورا کرلو۔ لہٰذا جب کسی سے قرائۃ یا قیام کا فرض رہ جائے تو اس کو بھی خود پورا کرے گا، جیسا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

اسکے بعد امام بخاری نے ص۲۳ تک احادیث وآثار ذکر کئے ہیں، جن میں سے کسی میں یہ ہے کہ جو امام کے ساتھ رہ گیا اس کو پورا کرے اور کسی میں ہے کہ جو رہ گیا اسے بعد کو ادا کرلے۔

امام بخاری ان آثار سے اپنا خاص مسلک یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی رکوع میں ملا تو اس کی رکعت نہیں ہوئی، کیونکہ اس سے قیام وقرأت رہ گئی، لہٰذا اس رکعت کے لئے قیام وقرائۃ بعد کو کرے گا، تب رکعات پوری ہوں گی، اس کے لئے انہوں نے کئی جگہ حضرت ابو ہریرہؓ کو بھی ہمنوا ثابت کیا ہے، حالانکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ رکوع امام سے قبل اس کے قیام میں ملنے سے رکعت ملے گی خواہ قرائۃ نہ بھی کر سکے۔ ان کے سوا سب کے نزدیک بالاتفاق بغیر قیام کے شمول کے بھی صرف رکوع میں شامل ہونے سے رکعت مل جاتی ہے۔

(۴) من ادرک رکعۃ سے استدلال بخاری

ص۲۴ میں امام بخاریؒ نے حدیثِ ابی ہریرہ **من ادرک رکعة من الصلوٰة فقد ادرک الصلوٰة** سے استدلال کیا اور اس کو مختلف طرق ومتون کے ساتھ نقل کیا اور اس ضمن میں دوسری چیزیں بھی ثابت کیں مثلاً یہ کہ حضرت ابو ہریرہ کی مراد رکعت سے رکوع نہ تھی، اور جس روایت میں ایسا کوئی جملہ نقل ہوا ہے وہ بے وجہ وبے معنی ہے، یہ بھی لکھا کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کی بہت سی روایات اس لئے نقل کی ہیں کہ بقول خلیل بار بار اور زیادہ کلام سے بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے، اور کسی بات کی اگر غرض وغایت بھی بیان کردی جائے تو وہ

بات خوب یاد رہتی ہے، پھر یہ کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد تو رکعت کے لئے ہے رکوع کے لئے نہیں ہے۔ نہ آپ نے رکوع، سجود و تشہد کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ جس نے ان کو پالیا اس نے رکعت پالی، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کی زبان سے نماز خوف کی ایک رکعت فرض کی ہے، اور حضور علیہ السلام نے کچھ لوگوں کو نماز خوف کی ایک رکعت پڑھائی، پھر دوسروں کو دوسری رکعت پڑھائی پس جو شخص امام کے ساتھ نماز خوف کے صرف رکوع وسجود کو پائے گا اور وہ رکعت ہوگی تو اس نے اپنی نماز میں پوری طرح قیام نہیں کیا اور نہ اس نے قرائۃ کا کچھ حصہ پایا، حالانکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد تو یہ ہے کہ جس نماز میں فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ''خِداج'' ہے۔ اور آپ نے کسی ایک نماز کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں فرمایا۔ اور ابوعبید نے کہا کہ ''اخرجت الناقة'' کہا جاتا ہے جبکہ وہ اونٹنی بچہ ڈال دے، اور ڈالا ہوا بچہ مردہ **کسی کام کا نہیں**۔ (یعنی اسی) طرح بغیر فاتحہ کے نماز باطل و بے سود ہوگی (جیسا کہ اس زمانہ کے غیر مقلدین بھی امام بخاری کی زبان میں **باطل و کالعدم کہتے ہیں**)۔

آگے لکھا کہ وتر میں بھی ایک ہی رکعت ہے، جیسا کہ اہلِ مدینہ کے فعل سے ثابت ہے، لہٰذا جس کو وتر کی رکعت کا قیام و قرائۃ نہ ملے گی اس کی نماز بھی بلا قرائۃ کے ہوگی اور وہ بھی حضور علیہ السلام کے ارشاد ''لاصلوٰة الا بفاتحة الكتاب'' کی وجہ سے صحیح نہ ہوگی۔ الخ تا ص ۲۸ آگے نمبر وار جواب ملاحظہ ہوں:۔

(۱) ادراک رکوع سے ادراکِ رکعت کا مسئلہ اور امام بخاری کا جواب

تمام حضرات صحابہ و تابعین، ائمہ اربعہ مجتہدین اور جمہور محدثین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ امام کے ساتھ رکوع ملنے سے وہ رکعت مل جاتی ہے لیکن امام بخاریؒ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے، لہٰذا سارے رسالے قرأت خلف الامام میں جگہ جگہ اس کی چکی پیسی ہے، اور طرح طرح سے نقلی و عقلی استدلال کر کے اپنی بات منوانے کی سعی کی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویہ احادیث من ادرک رکعۃ سے بھی استدلال کیا، اور ایک روایت ان سے ص ۳۰ میں قبل باب القراءة في الاربع كلها یہ بھی لائے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا جب تم قوم کو رکوع میں پاؤ تو تمہاری یہ رکعت محسوب نہ ہوگی، لیکن یہ روایت قابلِ استدلال نہیں، اولاً:۔ اس روایت میں ایک راوی معقل بن مالک ہیں، جس کو علامہ ابوالفتح ازدیؒ نے متروک قرار دیا (میزان ص ۳/۱۸۵ و تہذیب ص ۱/۲۳۴) ثانیاً:۔ اس کی سند میں محمد بن اسحٰق ہے، جس پر علماء رجال نے سخت نقد و جرح کی ہے۔ اور حدیثِ عبادہ بھی اسی راوی ضعیف کی وجہ سے گری ہے۔

جس کی بحث بہت مشہور ہے اور خود امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس کی حدیث لا کر استدلال نہیں کیا، حالانکہ جیسا طویل وعریض دعویٰ امام بخاری نے خاص طور سے جہری نماز کے لئے بھی وجوبِ قرائۃ خلف الامام کا کیا ہے، اس دعوے کے ثبوت میں امام بخاری کو یہ حدیث ضرور لانی تھی، مگر انہوں نے صحیح کا معیار قائم رکھا کہ ایسے ضعیف راویوں سے احادیث نہیں لائے، یہ امام بخاریؒ کی بہت ہی بڑی منقبت و مزیت ہے، اگرچہ ان جیسے امام المحدثین اور عظیم و جلیل شخصیت سے صحیح بخاری سے باہر بھی دوسرے رسالوں میں گری پڑی اور ضعیف و ساقط روایات سے اپنی الگ مجتہدانہ رائے ثابت کرنا اور امام اعظم و اکابر حنفیہ پر تعریضات کرنا اور غلط باتیں بھی بے سندِ صحیح و قوی ان کی طرف منسوب کر دینا کسی طرح بھی ان کے شایانِ شان نہ تھا۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کا معمول تھا کہ غیر حنفی اکابر پر بھی نقلِ مذہبِ حنفی میں اعتماد فرما لیتے تھے، اب اگر کوئی شخص امام بخاریؒ کی عظیم و جلیل شخصیت پر اعتماد کر کے یہ باور کرے کہ واقعی امام اعظم ابوحنیفہؒ نے خنزیر بری کے لئے لا باس به کہہ دیا ہوگا، جیسا کہ امام بخاری نے بلا تحقیق اس کو اپنے رسالہ جزء القرائۃ میں نقل کر دیا، تو اس کا کتنا بڑا ضرر امتِ مسلمہ کو پہنچ سکتا ہے جبکہ اس بات کو ایک معتزلی عقیدہ والے

چھوٹے مفتری نے امام اعظم کو بدنام ورسوا کرنے کے لئے گھڑا تھا۔
ثالثاً: محمد بن اسحٰق مدلس ہیں اور مدلس کا عنعنہ مقبول نہیں ہوتا، یہاں امام بخاری کی پیش کردہ روایت میں ان سے عنعنہ بھی موجود ہے۔
رابعاً: یہ روایت حضرت ابو ہریرہؓ پر موقوف ہے، اور موقوفِ صحابی جب کسی مرفوع حدیث کے خلاف ہو تو وہ بھی نا قابلِ عمل ہوتی ہے۔

حدیث ابی بکرہ بخاری

اس کے مقابلہ میں حضرت ابو بکرہؓ کی مرفوع روایت خود صحیح بخاری کی موجود ہے، جس کو دوسرے محدثین نے بھی روایت کیا ہے اور بخاری میں اسی زیرِ بحث باب سے دو ورق بعد ص ۱۰۸ میں حدیث نمبر ۷۴۴ حضرت ابو بکرہ ہی کی ہے، اور خود امام بخاری نے اس کا باب **اذا رکع دون الصف** باندھا ہے۔ یعنی کوئی صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کر کے جماعت میں شامل ہو تو اس کا کیا حکم ہے۔

اس میں ہے کہ حضرت ابو بکرہؓ مسجد نبوی میں پہنچے، حضور علیہ السلام رکوع میں جا چکے تھے (حضرت ابو بکرہؓ نے سوچا ہوگا کہ صف تک پہنچنے میں حضور رکوع سے سرِ مبارک اٹھالیں گے لہٰذا) صف سے پہلے ہی رکوع کر لیا، حضور علیہ السلام نے نماز کے بعد ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسی نیکی پر حریص کرے۔ مگر پھر ایسا نہ کرنا۔ (کیونکہ نماز کا ادب یہی ہے کہ اطمینان سے صف تک پہنچ کر امام کے ساتھ جس حالت میں بھی وہ ہو اس کے ساتھ شامل ہو جائے)۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکرہؓ بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے، رکوع میں شامل ہوئے تھے اور ان کے رکوع کو رکعت کے لئے صحیح مان لیا گیا، اگر وہ صحیح نہ ہوتا اور امام بخاری کی بات درست ہوتی تو حضور علیہ السلام حضرت ابو بکرہ سے اس رکعت کا اعادہ کراتے۔

اس حدیث میں جو حضور علیہ السلام نے آخری کلمہ لا تعد ہے، (کہ پھر ایسا نہ کرنا کہ نماز جماعت کے لئے تاخیر سے آؤ، اور صف سے پہلے ہی رکوع کر لو) یہ کلمہ لا تعد بھی نقل ہوا ہے جیسا کہ امام نووی اور حافظ ابن حجر نے ذکر کیا (حاشیہ مشکوٰۃ نووی و فتح الباری ص ۲/۲۱۴) اس کا مطلب یہ ہوا کہ نماز صحیح ہو گئی، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ تیسری روایت لا تعدی ہے کہ نماز کے لئے دوڑ کر نہ آیا کرو۔

اکابر صحابہ کا مسلک

امام بیہقی نے لکھا کہ حضرت ابن عمرؓ حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابو بکرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ بڑی محنت و مشقت سے رکوع ملنے کی کوشش کیا کرتے تھے، یہ بھی اس کی واضح دلیل ہے کہ رکوع میں شامل ہونے سے رکعت مل جاتی ہے۔

دوسری مرفوع حدیث

امام بیہقی نے ایک مرفوع روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی یہ نقل کی ہے کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس نے رکعت پالی۔ (سنن کبریٰ ص ۲/۹۰) نیز اسی مضمون کی ایک اور حدیثِ مرفوع بھی امام موصوف نے نقل کی ہے اور حضرت ابنِ مسعودؓ اور ان کے اصحاب کا بھی اسی پر عمل تھا (الادب المفرد ص ۱۵۳)

مذکورہ بالا حدیثِ ابی بکرہؓ سے ثابت ہوا کہ مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ کی قرائۃ واجب و ضروری نہیں ہے، اور اسی حدیث سے جمہور اہلِ اسلام اور ائمۂ اربعہ نے مدرکِ رکوع کے مدرکِ رکعت ہونے پر استدلال واحتجاج کیا ہے۔

ابن حزم کی تائید

علامہ ابنِ حزم نے ایک موقع پر حضرت ابو بکرہ کی ایک حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھا کہ یہ فعل اور عمل آں حضرت ﷺ کا

آخری عمل ہے، کیونکہ اس میں ابوبکرہ موجود تھے، اور وہ فتح مکہ اور حنین کے بعد طائف کے دن مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ (محلی ص ۲۲۷\۴)

دوسرا استدلال حضور علیہ السلام کے مرضِ وفات والی حدیث سے بھی بہت قوی ہے کہ وہ بھی حضور علیہ السلام کا آخری عمل تھا، جس میں آپ حجرۂ مبارک سے مسجد نبوی میں تشریف لائے اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے، وہ پیچھے ہٹ آئے اور حضور علیہ السلام نے وہیں سے قرأۃ شروع فرمادی جہاں تک حضرت ابوبکر پڑھ چکے تھے۔ (ابن ماجہ ص ۸۸)

اور مسندِ احمد ص ۲۰۹\۱ میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے سورت کے اسی مقام سے قرأۃ شروع کی جس تک حضرت ابوبکر پڑھ چکے تھے۔ سنن کبری ص ۸۱/۳ میں ہے کہ آپ نے قرآن مجید کے اس حصہ سے قرأۃ شروع کی جس تک حضرت ابوبکرؓ قرأۃ کر چکے تھے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا کہ مسندِ احمد وابن ماجہ کی سند قوی ہے (فتح ص ۱۲۹\۵) ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ فاتحہ پوری پڑھ چکے تھے اور آگے سورت پڑھ رہے تھے کہ حضور تشریف لے آئے، اور بالفرض اگر تھوڑی ہی فاتحہ پڑھ چکے تھے، تب بھی جن کے نزدیک پوری فاتحہ کے بغیر رکعت نہیں ہوتی، حضور علیہ السلام سے پوری فاتحہ یا کچھ رہ گئی، تو وہ اس نماز کے لئے کیا کہیں گے؟ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ حضور علیہ السلام کی نماز بھی خدانہ کردہ کالعدم اور باطل ہوگئی تھی، لہٰذا ان کو بھی مان لینا چاہئے کہ امام کے پیچھے قرأتِ فاتحہ ضروری یا واجب نہیں ہے۔ پھر متبعینِ امام بخاریؒ کو تو اوپر کی دونوں حدیثوں کی وجہ سے فاتحہ خلف الامام کے وجوب سے رجوع کر لینا ہی چاہئے، کیونکہ امام بخاری صحیح بخاری کے **باب انما جعل الامام ليؤتم به** کے آخر میں ص ۹۶ پر فرما چکے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے الآخر فالآخر فعل پر ہی عمل کرنا چاہئے۔

غرض جمہور سلف وخلف کا مسلک جس طرح احادیث نبویہ اور آثارِ صحابہ وتابعین سے ثابت ہوا، حضور علیہ السلام کے آخری فعل وعمل سے بھی مؤید ہوگیا۔ (احسن الکلام ص ۱۵۲)

امام بخاری کے دوسرے دلائل

امام ہمام نے کئی جگہ حضرت ابوہریرہؓ کے موقوف آثار اس بارے میں بھی پیش کئے ہیں کہ ان کے نزدیک رکوع جب ہی رکعت بنائے گا جبکہ امام کے ساتھ رکوع سے قبل قیام کے اندر ہی مل جائے، لیکن ان کی سند میں بھی محمد بن اسحٰق ہے اور عنعنہ بھی ہے، دوسرے یہ کہ خود حضرت ابوہریرہؓ ہی سنن بیہقی ص ۹۰\۲ میں حدیث مرفوع کے راوی ہیں کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس نے وہ رکعت پالی، تو وہ اپنی روایت کردہ حدیثِ مرفوع کے خلاف کیوں کرتے اور قیام میں ملنے کی قید اپنی طرف سے بڑھا دیتے، یہ بات بہت مستبعد ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے رکوع پانے کے لئے قیام کی حالت میں ملنے کی قید کو بطور احتیاط کے فرمادیا ہو، پھر یہ کہ امام بخاری کا مقصد تو ان کی قیدِ مذکور سے بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ سے کوئی قول ایسا کہیں مروی نہیں ہوا کہ رکوع سے پہلے مقتدی امام کے ساتھ اتنا پہلے مل جائے کہ فاتحہ بھی پڑھ لے۔ اور جب یہ نہیں تو بار بار ان کی روایت لانے سے کیا فائدہ ہوا؟ علامہ خلیل نے یہ کب کہا تھا کہ آدھی بات کو بار بار دہراتے رہو تو اس سے تمہارے دل کی ساری بات کسی کے دل میں اتر جائے گی، بغیر اس کے کہ اس پوری کا ثبوت خارج میں موجود ہو۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابوسعید خدریؓ کا قول بھی اپنی تائید میں پیش کیا کہ سورۂ فاتحہ پڑھنے سے پہلے کسی کو رکوع نہیں کرنا چاہئے، مگر اس سے بھی امام کو کچھ فائدہ نہ ہوا، کیونکہ اس میں راوی متکلم فیہ ہیں، اور یہ بھی موقوف اثر ہے، پھر اس میں مقتدی وامام کا کچھ ذکر نہیں، اور اس سے کس کو انکار ہے کہ منفرد پر تو بہرحال یہ لازم ہے کہ وہ پہلے سورۂ فاتحہ پڑھے اس کے بعد رکوع کرے۔

امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ میں حضرت مجاہد کا بھی ایک موقوف اثر پیش کیا کہ کوئی شخص سورۂ فاتحہ پڑھنا بھول جائے تو اس رکعت کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، مگر اس روایت میں لیث ہے جو ضعیف ہے۔ (دارقطنی ص ۱۲۶\۱)

الغرض کتب حدیث میں کوئی صحیح صریح مرفوع روایت ایسی موجود نہیں ہے، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ رکوع میں امام کے ساتھ شامل ہونے والے کی وہ رکعتِ قابلِ اعتبار نہیں ہے، اور اس کے برخلاف صحیح مرفوع احادیث سے اور جمہور سلف و خلف کے متفقہ فیصلہ سے بھی مدرک رکوع کا مدرکِ رکعت ہونا ثابت و محقق ہے اور اس طرح بغیر فاتحہ کے رکعت درست ہوگئی، لہٰذا امام کے پیچھے اور جہری نماز میں وجوبِ قرائۃ کا قول اور یہ دعوٰے بھی کہ وہ رکعت نہیں شمار ہوگی، جس میں قرائۃ فاتحہ نہیں ہو سکی، قابلِ قبول نہیں ہے۔ (احسن الکلام ص ۲/۱۳۴)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد

آپ نے فصل الخطاب ص ۸۲ میں مستقل فصل قائم کر کے لکھا کہ صحابۂ کرام میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو یہ کہتا ہو کہ مدرکِ رکوع بلا قرائۃ کے مدرکِ رکعت نہ ہوگا، آپ نے فتح الباری اور زرقانی شرح موطأ وغیرہ سے بھی اپنی تائید میں اقوال پیش کئے، پھر لکھا کہ یہ گویا سب کے نزدیک بطور بدیہی حکم شریعت کے معلوم تھا کہ ادراکِ رکوع سے ادراکِ رکعت ہوتا ہے اور جب سارے صحابہؓ دیکھتے تھے کہ رکوع تک امام کے ساتھ مل جانے میں رکعت مل جاتی ہے، تو ان کو اس بارے میں بھی کوئی تردد نہیں تھا کہ مقتدی پر قرائۃ فاتحہ واجب نہیں ہے، اور اس میں تردد وہی کر سکتا ہے جو ایک بداہت اور کھلی ہوئی حقیقت کو لغو قرار دے، اور صرف الفاظ کو پکڑ کر بیٹھ جائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس موقع پر صلوٰۃ خوف کو پیش کرنا بھی مفید نہیں (جیسا کہ امام بخاری نے کیا، کیونکہ اس کی صورت سب نمازوں سے الگ ہے، کہ تحریمہ میں سب شریک باوجود آگے پیچھے آنے کے، رکعات و سجدات میں تقسیم ہوگئی، لیکن رکوع میں تعاقب واقع نہیں ہوا، کیونکہ اس سے رکعت رکعت بنتی ہے اور جس نے رکعت پالی اس نے امام کے ساتھ جماعت کو پالیا، یہاں بھی سارا معاملہ عدم وجوب قرائۃ خلف الامام پر ہی مبنی قرار پائے گا۔ لہٰذا اپنے بے سود زبانی احتمالات کو ترک کر دو جن کو تمہارا دل بھی اندر سے تسلیم نہیں کر سکتا۔ ہم بے کار و بے مقصد باتوں میں الجھنے کے لئے فارغ نہیں بیٹھے ہیں۔

نماز بوقت خطبہ کی بحث

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں پہنچے اور خطبہ شروع ہو چکا ہو تو کوئی نماز نہ پڑھے، بلکہ خاموش بیٹھ کر خطبہ سنے، امام کی آوازِ خطبہ نہ آ رہی ہو تب بھی خاموش بیٹھا رہے امام شافعی و احمد کہتے ہیں کہ اس حالت میں بھی تحیۃ المسجد پڑھے، امام صاحب اور امام مالک کے ساتھ جمہور صحابہ و تابعین بھی ہیں، اور حضرت عمر، حضرت عثمان و حضرت علیؓ سے بھی ایسا ہی مروی ہے اور لیث و ثوری سے بھی (کمافی النووی شرح مسلم ص ۱/۲۸۷) ابن قدامہؒ نے "المغنی" ص ۱/۱۶۵ میں حضرت شریح، ابن سیرین، نخعی اور قتادہ سے بھی یہی نقل کیا ہے، محدث ابن ابی شیبہ نے حضرت علی، ابن عمر و ابن عباس، ابن المسیب، مجاہد، عطاء اور عروہ سے بھی امام صاحب و امام مالک کے موافق نقل کیا ہے۔ (شرح التقریب ص ۳/۱۸۳)

حضرت قاضی عیاضؒ نے حضرت ابوبکرؓ سے نقل کیا کہ وہ بھی بوقتِ خطبہ نماز پڑھنے سے منع فرماتے تھے (معارف السنن ص ۴/۳۶۷)
پھر علامہ بنوریؒ نے لکھا:۔ جب کہ خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ و تابعین و فقہائے بلاد کا وہی مذہب ہے جو امام ابوحنیفہؒ کا ہے تو پھر اس میں کیا شک رہا کہ وہی مذہب تعامل و توارث کے لحاظ سے سب سے زیادہ قوی ہے، اور وہی سنتِ سلف رہی ہے اور ایسے معرکۃ الآرا مسائل میں تعاملِ سلف ہی سے فیصلہ ہو بھی سکتا ہے نہ کہ اخبارِ آحاد سے۔ پھر یہ کہ تعامل کا استناد بھی اخبارِ قولیہ پر ہوتا ہے جو مقصود پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتے ہیں، لہٰذا وہ دوسروں کے دلائل سے زیادہ اقوی ہوتے ہیں جیسا کہ ہم آگے اس کی تفصیل کریں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعجب خیز رویہ

علامہ بنوریؒ نے اس موقع پر لکھا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں یہ قول بہت ہی عجیب اور موحش ہے کہ" تم اپنے اہلِ بلد کے تعامل وطریقہ سے دھوکہ نہ کھانا، کیونکہ حدیث صحیح ہے اور اس کا اتباع واجب ہے"۔اس لئے کہ اہلِ بلد کا اتباع دوسرے اہلِ بلاد نے کیا اور ان سب کو خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ وتابعین کے تعامل کو اپنے لئے اسوہ بنانا ہی چاہئے، اور وہی فقیہ الملت امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے اور عالمِ مدینہ طیبہ امام مالکؒ نے بھی علی وجہ البصیرت تعامل وتوارثِ اہلِ بلد کی روشنی میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

علامہ بنوری نے مزید لکھا کہ باوجود جلالت قدر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ان کی تالیفات میں ایسی آراء وافکار ملتے ہیں جن کے ساتھ موافقت وہمنوائی کرنا مشکل ودشوار ہے۔

دو بڑوں کا فرق: مولانا بنوریؒ نے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعض افکار سے ناموافقت کی جانب اشارہ کیا ہے اور فیض الباری نیز معارف السنن میں کئی جگہ اس اجمال کی تفصیل بھی ملے گی، اسی لئے راقم الحروف نے بھی پہلے عرض کیا تھا کہ مکتبِ دیوبند کے ذہنی وفکری امام بکل معنی الکلمہ حضرت شاہ ولی اللہ نہیں بلکہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ہیں کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ علامہ کردی شافعیؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ کے نظریات سے متاثر ہوگئے تھے، اور ان کے یہاں کچھ شطحیات وتفردات بھی ملتے ہیں۔اور محترم مولانا محمد عبدالحلیم چشتی دام فیضہم نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے رسالہ عجالہ نافعہ پر جو فوائد جامعہ لکھے ہیں وہ نہایت مفید علمی تحقیقاتی سرمایہ ہیں۔اس میں آپ نے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے حالات بھی ۴۴ صفحات میں بڑی عمدہ تحقیق سے تحریر کئے ہیں۔اس کا ایک نمونہ برائے ملاحظہ پیش ہے۔

ص ۲۶ پر انہوں نے لکھا:۔ شیخ علی متقیؒ کی مذکورہ بالا ہدایات اور شیخ موصوف کی تصریحات پر غور کیا جائے تو شیخ عبدالحقؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے طریق کار، اندازِ فکر اور طرزِ تالیف میں جو بنیادی فرق ہے وہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے، بالفاظِ دیگر وہ باتیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شیخ محدث دہلوی کو تصوف کی زبان میں گفتگو کی اجازت نہیں اور شاہ ولی اللہ پر اس باب میں کوئی قدغن نہیں۔

(۲) شیخ عبدالحقؒ جمہورِ امت کے مسلک سے سرِ موانحراف نہیں رکھتے، شاہ ولی اللہؒ اپنے افکار میں کہیں کہیں منفرد بھی نظر آتے ہیں۔

(۳) شیخ موصوف وسعتِ نظر میں فائق ہیں تو شاہ ولی اللہ دقتِ نظر میں ممتاز ہیں۔

(۴) شیخ عبدالحقؒ محقق ہیں، اور شاہ ولی اللہ مفکر ہیں، شاہ صاحب موصوف کی نظر ہمہ گیر اور افکار کا دائرہ نہایت وسیع ہے بایں ہمہ فضل وکامل شاہ ولی اللہؒ نے طبقاتِ کتب حدیث کی بحث میں بالغ نظری کا ثبوت نہیں دیا، ان کا دائرۂ فکر اس باب میں محدود ہوگیا ہے، کیونکہ وہ طبقات کتب حدیث کی بحث میں شیخ ابن الصلاح جیسے خوش عقیدہ تنگ نظر، متعصب مقلد کے تابع نظر آتے ہیں، کیونکہ دونوں نے رجالِ سند اور اصول نقد کو نظر انداز کر کے مدارِ صحت کتابوں کو قرار دیا ہے، اور تعارض کے وقت ان ہی کتابوں کی حدیثوں کو قابلِ ترجیح ٹھہرایا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شانِ تحقیق

یہ بات متقدمین ومتاخرین محدثین کے مسلک ہی کے خلاف نہیں بلکہ مسلمہ اصولِ روایت ودرایت کے بھی خلاف ہے۔اس کے برعکس شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی روش اس باب میں مقلدانہ نہیں، محققانہ ہے، کیونکہ انہوں نے محقق ابن ہمام کی طرح مدارِ صحت کتابوں کو قرار نہیں دیا بلکہ صحتِ حدیث کا مدار رجالِ سند اور اصولِ نقد پر رکھا ہے، چنانچہ شیخ موصوف" المنہج القدیم فی شرح الصراط المستقیم" میں فرماتے ہیں:۔

" ترتیب جو محدثین نے صحتِ احادیث اور صحیح بخاری ومسلم کے مقدم رکھنے میں ملحوظ رکھی ہے، زبردستی کی بات ہے۔اس میں کسی کی پیروی جائز نہیں، کیونکہ صحیح اور صحیح تر ہونے کا دارومدار راویوں کا ان شروط پر پورا اترنا ہے جن کا بخاری ومسلم نے بھی اعتبار کیا ہے(اور امام اعظم

کے یہاں تو شرطِ روایت میں ان دونوں سے بھی زیادہ سختی تھی جیسا کہ سب جانتے ہیں، اور جب وہی شروط ان دونوں کتابوں کے علاوہ کسی اور حدیث کے راویوں میں بھی پائی جائیں تو پھران ہی دو کتابوں کی حدیث کو صحیح تر کہنا زبردستی نہیں اور نا قابل قبول بات منوانا نہیں تو کیا ہے؟

اور اس امر میں کوئی شک نہیں کہ بخاری ومسلم کے کسی مخصوص راوی میں ان شروط کے جمع ہو جانے کا حکم کرنے سے اس پر جزم ویقین نہیں کیا جاسکتا کہ یہ حکم واقع اور حقیقت کے مطابق ہی ہے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ واقع اس کے خلاف ہو۔

لہٰذا ان کے حکمِ صحت پر دلیلِ قطعی کا پایا جانا اور اس پر جزم ویقین کرنا محلِ نظر ہے، یہ بات تحقیق سے معلوم ہے کہ مسلم نے اپنی کتاب میں بہت سے ایسے راویوں سے روایت کی ہے جو جرح وقدح سے نہیں بچ سکے ہیں۔ اور اسی طرح بخاری میں بھی راویوں کی ایک جماعت ایسی ہے جس پر کلام ہوا ہے، پس راویوں کے معاملہ میں مدار کار علماء کے اجتہاد اور ان کے صوابدید پر ہوگا۔ اور اسی طرح شروطِ صحت حسن وضعف کا حال ہے الخ''۔

پھر آگے لکھتے ہیں:۔ ''صحیح حدیثیں صحیح بخاری ومسلم میں منحصر نہیں ہیں، کیونکہ بخاری ومسلم نے ان ساری صحیح حدیثوں کا جو ان کے پاس ان کی شرط کے مطابق تھیں احاطہ نہیں کیا ہے، اور ان میں سے ہر ایک نے تمام صحاح کے احاطہ واستیعاب نہ کرنے کا خود بھی صاف صاف اقرار کیا ہے''۔

اسکے بعد بھی علامہ محقق شیخ محدث دہلویؒ کے افادات قیمہ نقل کئے گئے ہیں جو قابلِ مطالعہ ہیں، ہم ان کو بوجہ خوفِ طوالت نقل نہیں کر سکے۔

شرح سفر السعادہ کا ذکر

واضح ہو کہ علامہ مجد الدین فیروز آبادی م ۸۱۷ھ (صاحب القاموس) نے ایک کتاب ''سفر السعادہ فی تاریخ الرسول قبل نزول الوحی و بعدہ'' لکھی تھی جو ''صراط مستقیم'' کے نام سے بھی مشہور ہے، علامہ موصوف چونکہ ظاہری المشرب تھے، اس لئے انہوں نے اکثر مواقع میں ان حدیثوں کو بیان کرنے سے گریز کیا ہے جس پر مجتہدین امت کا عمل ہے، اور زیادہ تر ایسی احادیث نقل کر دی ہیں جو ائمہ مجتہدین کے یہاں معمول بہا نہیں ہیں، اور آخر میں احادیث موضوعہ کے عنوان سے ایک باب کا اضافہ کر کے ابن جوزی وغیرہ ایسے متشدد محدثین کی طرح صحیح حدیثوں کو بھی موضوع کہہ دیا جس سے عوام کے دلوں میں شبہات پیدا ہونے کا قوی احتمال تھا۔

ان امور کی اہمیت کا احساس فرما کر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے کتابِ مذکور کی شرح لکھی، جس میں مصنف مذکور کے پیدا کردہ تمام شبہات کا ازالہ کر دیا اور احقاقِ حق کا فریضہ کامل تحقیق وتدقیق کے ساتھ ادا فرما دیا۔ چونکہ اصل کتاب کے دو نام تھے اس لئے شیخ موصوف نے بھی اس کی شرح کے دو نام رکھے ایک ''المنہج القویم فی شرح الصراط المستقیم''۔ دوسرا ''طریق الافادہ فی شرح سفر السعادہ'' اور موصوف نے اس کا ایک نہایت محققانہ مبسوط مقدمہ بھی لکھا، جو درحقیقت اس شرح کی جان ہے، اس کے ایک باب میں مصطلحات حدیث بتائیں، اور اربابِ صحاح ستہ کا تذکرہ کیا تحقیق وتنقید کے اصول واضح کئے اور مذہبِ حنفی پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کی حقیقت واضح کی، نیز اصولِ مطابقت کو سمجھایا ہے، دوسرے باب میں ائمہ مجتہدین کا تذکرہ کیا ہے۔

شیخ موصوف نے یہ شرح اور مقدمہ لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ ائمہ مجتہدین کا مسلک احادیث صحیح کے خلاف ہرگز نہیں ہے اور خاص طور سے حنفی مسلک پر احادیث سے بُعد کا الزام واتہام سراسر غلط ہے۔

یہ کتاب ۱۲۵۳ھ میں کلکتہ افضل المطابع سے ٹائپ کے ذریعہ بڑی تقطیع کے ساتھ سات سو بیس صفحات پر چھپی تھی پھر نول کشور لکھنؤ سے تین بار شائع ہوئی۔ مگر افسوس کہ اب نایاب ونادر ہے، اور ہم جیسے ضرورت مند بھی اس کی دید کو ترستے ہیں۔ کیونکہ اب تو غیر مقلدیت پھیلانے والی کتابوں کی اشاعت کا دور دورہ ہے، جس کے لئے بعض سرمایہ دار مسلمان حکومتیں لاکھوں روپے سالانہ صرف کر رہی ہیں۔

اشعۃ اللمعات اور لمعات التنقیح کا ذکر

شیخ محدث دہلوی کا دوسرا حدیثی کارنامہ کہ وہ بھی آب زر سے لکھنے کا مستحق ہے، مشکوۃ شریف کی شرح ''اشعۃ اللمعات'' بزبان فارسی ہے، یہ بھی پہلے کلکتہ سے چار ضخیم جلدوں میں چھپی تھی، پھر بمبئی سے، پھر نول کشور سے آٹھ مرتبہ شائع ہوئی۔ مگر افسوس صد افسوس کہ اب وہ بھی نایاب ہے۔

شیخ موصوف نے مشکوۃ شریف کی دوسری شرح عربی میں ''لمعات التنقیح'' لکھی تھی، یہ شرح اگرچہ حجم میں ملا علی قاریؒ کی مرقاۃ شرح مشکوۃ سے کم ہے مگر افادیت وحسنِ انتخاب میں اس سے بڑھ کر ہے، علامہ قاری کے پاس کتابوں کا ذخیرہ کافی زیادہ تھا مگر انتخاب اتنا بہتر نہ ہو سکا، شیخ محدث دہلوی کے پاس کتابوں کا ذخیرہ زیادہ نہ تھا، مگر جن کتابوں سے جو غرر نقول اخذ کی ہیں وہ ان کے سلیقۂ انتخاب اور حسنِ اختیار کی بہترین مثال ہیں۔ پھر کہنے کو تو یہ مشکوۃ کی شرح ہے۔ لیکن اس شرح نے صحاح ستہ کی شروح سے مستغنی کر دیا ہے۔ ہم نے مقدمہ انوار الباری ص ۲/۱۸۲ میں بھی اس کتاب کا تعارف کرایا تھا اور خود مؤلفِ علام کا یہ جملہ مکرر قابلِ ذکر ہے کہ ''اس شرح کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوگی کہ حضرت امام اعظمؒ اپنے مسائل میں احادیث وآثار کا تتبع اس قدر کرتے ہیں کہ ان کو اصحاب الظواہر میں شمار کرنے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے اور ان کے مقابلہ میں امام شافعیؒ کو اصحاب الرائے میں شمار کرنا پڑے گا''۔ اس کا مقدمہ بھی نہایت نافع ہے اور وہ شائع بھی ہوا تھا، مگر شرح مذکور عربی آج تک شائع نہ ہو سکی۔

ہمارے دار العلوم دیو بند کا سب سے پہلا فرض تھا کہ ایسی اہم کتابوں کو شائع کرتا، جس کا سالانہ بجٹ ۲۵-۲۶ لاکھ سالانہ کا بنتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ وہاں تو جدید مطبوعات مصر وشام وغیرہ منگانے کا بھی اہتمام نہیں'' والی اللہ المشتکی۔

حدیث وحنفیت اور تقلید ائمہ کا ذکر

جب بات یہاں تک پہنچی تو اتنا اور بھی عرض کر دوں کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے جو حدیث وحنفیت کی نہایت گراں قدر خدمات انجام دی تھیں، ان کے مقابلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دوسری عظیم القدر علمی خدمات کے ساتھ تقلید وحنفیت کو ضرر بھی پہنچا ہے، آپ نے تو یہاں تک بھی حجۃ اللہ میں لکھ دیا کہ تقلید چوتھی صدی کے بعد کی پیداوار ہے، جس کا جواب نہایت تحقیق وتفصیل سے حضرت المحدث العلام مولانا المفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ۔ صدر مفتی دار العلوم دیو بند نے مقدمۂ شرح کتاب الآثار امام محمدؒ ص ۴ میں تحریر کیا ہے اور کچھ تاویل کر کے ان کی بات کو سنبھالا بھی دیا ہے، علامہ کوثریؒ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم وتحقیقاتِ عالیہ کے اعتراف کے ساتھ جو نقد کیا ہے، وہ ہم نے حضرتؒ کے حالات میں نقل کر دیا تھا، ملاحظہ ہو مقدمہ انوار الباری ص ۲/۱۹۶۔ اور فوائد جامعہ ص ۲۸۶ میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اتحاف النبلاء کے اس جملہ پر نقد بھی قابلِ مطالعہ ہے کہ ''حجۃ اللہ جیسی کتاب بارہ سو سال کے اندر عرب وعجم کے علماء میں سے کسی ایک نے بھی تصنیف نہیں کی ہے'' آپ نے لکھا کہ شاہ صاحبؒ سے بہت عرصہ پہلے حضرت شیخ علی بن احمد المہایمی م ۸۳۵ھ صاحب تفسیر تبصیر الرحمان (مطبوعہ مصر ۲ جلد) نے ''انعام المالک العلام'' علم اسرار شریعت میں لکھی تھی، جس کا ذکر علامہ بنوریؒ نے بھی یتیمۃ البیان مقدمہ مشکلات القرآن میں کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

نماز بوقت خطبہ

بحث یہاں سے چلی تھی، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ بوقتِ خطبہ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی جائیں، اور حدیثِ سلیک سے استدلال کرتے ہیں، حنفیہ ومالکیہ کی طرف سے یہ جواب ہے کہ سلیک کا ایک خاص واقعہ تھا اور اس میں حضور علیہ السلام نے خطبہ جاری بھی نہ رکھا تھا بلکہ ان کی غربت ومسکنت اور ان کا پھٹا پرانا حال لوگوں کو دکھلانے کے لئے ان کو نماز پڑھنے کا حکم دے کر لوگوں سے چندہ جمع کرایا تھا، پھر

دوسرے جمعہ کو بھی ایسا ہی کیا، تیسرے جمعہ کی روایت ضعیف و مشکوک ہے، مگر شافعیہ وحنابلہ کو اصرار ہے کہ قصۂ سلیک کی وجہ سے بوقتِ خطبہ بھی نمازِ تحیۃ المسجد درست ہے۔ ابنِ ماجہ میں جو حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام نے خطبہ کے لئے منبر پر بیٹھے ہوئے ایک آنے والے شخص سے دریافت کیا کہ کیا تم مسجد میں آنے سے پہلے نماز (سنتِ جمعہ) پڑھ کر آئے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ دو رکعت پڑھ لو۔ تو اس پر جو ابن تیمیہ ابوالبرکات مجد بن تیمیہؒ نے اپنی کتاب ''منتقی الاخبار'' میں لکھا کہ قبل ان تجیئ سے ثابت ہوا کہ جن دو رکعت پڑھنے کا حکم حضور علیہ السلام نے فرمایا وہ سنتِ جمعہ تھیں، تحیۃ المسجد نہ تھیں، مگر حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے جدِ امجد کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ نہیں وہ تحیۃ المسجد ہی تھیں اور ابن ماجہ سے غلطی ہوگئی کہ بجائے قبل ان تجلس کے قبل ان تجیئ روایت کر دیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری نے جزء القرائۃ (ص۱۹) میں حضرت جابرؓ کا قول جو نقل کیا ہے کہ ان کو یہ پسند تھا کہ جمعہ کے دن دو رکعت مسجد میں جا کر پڑھا کریں، اس سے بھی سنتِ جمعہ ہی معلوم ہوتی ہیں، نہ کہ تحیۃ المسجد۔ (کیونکہ تحیۃ المسجد تو صرف مسجد ہی میں ہوتی ہیں، ان کو مسجد میں پسند کرنے کا کیا مطلب؟)

اور مسند احمد ص ۳۶۳\۳ میں تو جابر کا قول اس طرح مروی ہے کہ اگر وہ اپنے گھر میں بھی پڑھ لیا کرتے تھے، تب بھی مسجد میں پہنچ کر پڑھنے کو زیادہ پسند کرتے تھے، ظاہر ہے کہ تحیۃ المسجد تو گھر پر نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد سنت جمعہ ہی کے لئے تھا اور اسی لئے حضرت جابر اس بات کو پسند کرتے تھے کہ گھر پر پڑھنے کے باوجود بھی مسجد پہنچ کر سنتِ جمعہ پڑھا کریں تا کہ حضور علیہ السلام کے ارشاد کی تعمیل ہو اور یہ بھی حضور علیہ السلام کے ہی ارشاد کی تعمیل تھی کہ نوافل و سنن گھروں میں پڑھے جائیں لیکن حضرت جابر کے عمل مذکور سے امام بخاری وغیرہ کا یہ خیال کرنا کہ حضرت جابر خطبہ کے وقت بھی دو رکعت پڑھتے تھے یا اس کو پسند کرتے تھے، کسی طرح صحیح نہیں، اور اسی طرح امام بخاریؒ اور شافعیہ وحنابلہ کا حدیثِ شعبہ بخاری و مسلم سے استدلال کرنا بھی مرجوح ہے، جس میں ہے کہ'' جب تم میں سے کوئی آئے اور امام خطبۂ جمعہ دے رہا ہو تو دو رکعت ضرور پڑھ لے''۔

امام دارقطنی کا نقد

محدث دارقطنی نے ایک رسالہ لکھا تھا بنام ''کتاب التتبع علی الصحیحین'' جس میں تقریباً ایک سو احادیثِ صحیحین پر نقد کیا ہے اور وہ سب انتقادات اسانید سے متعلق ہیں، بجز حدیث مذکور شعبہ والی کے، کہ اس کے متن کو بھی معلول قرار دیا ہے اور لکھا کہ اس کے راوی شعبہ نے دوسرے اسی حدیث کے چھ راویوں کی مخالفت کی ہے، جو ابن جریج، ابن عیینہ، حماد بن زید، ایوب۔ ورقاء اور حبیب بن یحییٰ ہیں، یہ سب عمرو بن دینار سے اس طرح سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص مسجد میں آیا، حضور علیہ السلام نے دریافت کیا کہ تم نے نماز پڑھ لی ہے، پھر آپ نے اس کو دو رکعت پڑھنے کا حکم دیا۔ یہ ایک خاص واقعہ تھا، مگر شعبہ نے اس کو حضور علیہ السلام کا عام حکم سمجھ کر اس طرح روایت کر دیا کہ جب بھی کوئی مسجد میں آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو دو رکعت ضرور پڑھ لے۔

نطقِ انور: ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کی عادت ہے کہ جب ان کو کسی حدیث سے استدلال میں تردد ہوتا ہے تو وہ اس کو اس مسئلہ کے باب میں نہیں لاتے، بلکہ کسی دوسری جگہ دوسرے باب میں ذکر کرتے ہیں، اور غالباً ایسا ہی یہاں بھی ہوا ہے کہ وہ جمعہ کے ذیل میں مذکورہ قولی حدیث شعبہ کو نہیں لائے حالانکہ ان کا مسلک اس بارے میں وہی ہے جو شافعیہ کا ہے۔ بلکہ اس کو ''باب ما جاء فی التطوع مثنی مثنی'' میں لائے ہیں، اس لئے خیال ہے کہ اس حدیث سے استدلال کو کمزور سمجھا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ عمرو بن دینار کی روایات میں ابن عیینہ سب سے زیادہ اثبت و اقوی ہیں (کما ذکرہ فی الفتح فی مسئلۃ اقتداء المفترض خلف المتنفل) لہٰذا

ابن عیینہ کی روایت سب سے زیادہ قوی ہوئی، خاص کر جبکہ اس کی متابعت و تائید کرنے والے بھی سارے ثقہ ہیں۔ جیسے ابن جریج، حماد ایوب وغیرہم۔ اور ابن جریج تو عمرو بن دینار کے اجلِ اصحاب میں سے ہیں۔ غرض عمرو بن دینار کے دوسرے سارے ہی چھ راوی بہت بڑے ثقہ ہیں، تو کیا ان سب کی متفقہ روایت معیارِ ترجیح نہ ہوگی۔

حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ امام بخاری کی روایت کے لفظ "**اذا جاء احدکم والامام یخطب او قد خرج**" میں شک والی بات بھی ہے یا اس کو قربِ وقتِ خطبہ پر محمول کریں گے، تب بھی وہ ان کے موافق اور ہمارے مخالف نہ ہوگی۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ہماری تائید میں ایک بات بطورِ معارضہ یہ بھی ہے کہ متعدد احادیثِ صحیحہ میں ایسا وارد ہے کہ حضور علیہ السلام کے خطبۂ جمعہ کے وقت کوئی مسجد میں آیا تو آپ نے اس کو نماز پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا مثلاً:۔

بوقت خطبہ عدم امر بالصلوٰۃ کے واقعات:

(۱) صحیح بخاری "**باب الاستسقاء فی المسجد الجامع**" وغیرہ میں کئی جگہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جمعہ کے دن منبر نبوی کے سامنے والے دروازہ سے مسجد میں داخل ہوا، حضور علیہ السلام اس وقت خطبہ دے رہے تھے، وہ حضور کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگا کہ یا رسول اللہ! اموال میں ہلاکت آ گئی ہے، راستے منقطع ہو گئے، بارش کے لئے دعا فرمائیے! آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی اور اس شخص کو دو رکعت پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا۔

(۲) اسی حدیث کا آگے یہ ٹکڑا بھی ہے کہ اگلے جمعہ کو بھی ایک شخص اسی دروازے سے مسجد میں داخل ہوا اور حضور علیہ السلام خطبہ دے رہے وہ سامنے آ کر کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا:۔ یا رسول اللہ ﷺ! اب دوسری قسم کی ہلاکت و تباہی آ گئی ہے دعا فرمائیں کہ بارش رک جائے، آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، یہ دوسرا واقعہ ہے کہ آپ نے اس آنے والے کو بھی دو رکعت خطبہ کے وقت پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا۔

(۳) نسائی و ابوداؤد "**باب النھی عن تخطی رقاب الناس**" میں حدیث ہے کہ ایک شخص جمعہ کے دن مسجد میں لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آگے آیا، جبکہ حضور علیہ السلام خطبہ دے رہے تھے، تو آپ نے اس کو فرمایا:۔ بیٹھ جاؤ! تم نے لوگوں کو ایذا دی، لیکن اس کو نماز پڑھنے کے لئے نہیں فرمایا۔

(۴) ابوداؤد، "**باب الامام یکلم الرجل فی خطبۃ**" خطبۃ میں ہے کہ آپ جمعہ کے دن منبر پر تشریف لائے، لوگوں سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، حضرت ابن مسعودؓ نے مسجد میں آتے ہوئے آپ کا ارشاد سنا تو اس وقت مسجد کے دروازے میں تھے، وہیں بیٹھ گئے، حضور علیہ السلام نے ان کو دیکھا تو فرمایا عبداللہ! تم یہاں آ جاؤ۔ لیکن ان کو بھی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کو نہیں فرمایا۔

آگے علامہ بنوری کا اضافہ ہے:۔

(۵) امام احمد، نسائی، ابن خزیمہ و بیہقی نے روایت کی کہ ایک شخص جمعہ کے دن حضور علیہ السلام کے خطبہ دینے کی حالت میں مسجد نبوی حاضر ہوا اور حضور سے سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ کہنے لگا اللہ اور اس کے رسول کی محبت، آپ نے فرمایا، اچھا تم آخرت میں اسی کے ساتھ ہو گے، جس سے محبت کی ہے۔ آپ نے اس شخص کو بھی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔

(۶) احادیث میں جو باب غسل الجمعہ میں حضرت عمر و عثمانؓ کا قصہ آتا ہے وہ بھی یہاں پیش ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ان کے صرف وضو کر کے اور دیر سے آنے پر تنبیہ فرمائی، مگر تحیۃ المسجد کے لئے حکم نہیں فرمایا اور نہ اس کے بارے میں سوال کیا۔

(۷) مسند ۷۵/۵ میں عطاء خراسانی کی حدیث ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: مسلم جب جمعہ کے دن غسل کرتا ہے، پھر مسجد کی طرف چلتا ہے اور کسی کو ایذا نہیں دیتا۔ پھر اگر دیکھتا ہے کہ ابھی امام خطبہ ونماز کے لئے نہیں نکلا تو جتنی جی چاہتا ہے نماز پڑھتا ہے، اور اگر دیکھتا ہے کہ امام نکل آیا ہے تو بیٹھ جاتا ہے، خطبہ سنتا ہے اور خاموش بیٹھا رہتا ہے، تا آنکہ امام خطبہ وجمعہ سے فارغ ہو جاتا ہے تو اگر اس کے سارے گناہ اس جمعہ سے اگلے تک کے معاف نہ بھی ہوں تو امید ہے کہ سابق جمعہ تک کا تو گناہوں سے کفارہ ہو ہی جائے گا۔
(الفتح الربانی ص ۷۵/۶ باب التنفل قبل الجمعۃ مالم یصعد الخطیب المنبر)

(۸) اضافہ از راقم الحروف: حضرت قیس بن ابی حازم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اس وقت مسجد نبوی میں پہنچے کہ حضور علیہ السلام خطبہ دے رہے تھے تو دھوپ میں ہی بیٹھ گئے، حضور نے ان کی طرف اشارہ کر کے سایہ میں بیٹھنے کو فرمایا، ان کو بھی آپ نے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم نہیں دیا (الفتح الربانی ص ۶/۷۲)

الفتح الربانی ص ۶/۷۸ میں حنفیہ ومالکیہ اور جمہور سلف صحابہ وتابعین کے مسلک کی دلیل طبرانی کی مرفوع حدیث ابن عمرؓ ذکر کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی مسجد میں ایسی حالت میں آئے کہ امام منبر پر ہو تو اس وقت وہ نہ نماز پڑھے اور نہ کلام کرے حتی کہ امام فارغ ہو جائے۔

(۹) اضافہ از مولانا عبداللہ خاں صاحب عم فیضہم: سنن بیہقی میں ہے کہ اسلام دشمن ابن ابی الحقیق کو قتل کر کے صحابہ کی ایک جماعت حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ اس وقت جمعہ کے خطبہ کے لئے منبر پر تشریف فرما تھے، آپ نے ان کو دعا دی اور قتل والی تلوار کا معائنہ بھی فرمایا، مگر ان لوگوں کو تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔

(۱۰) مسلم، بیہقی، حاکم نے ابواب الجمعہ میں روایت پیش کی کہ حضور علیہ السلام کے خطبہ دیتے ہوئے حضرت ابورفاعہؓ آپ کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ میں ایک پردیسی مسلمان ہوں، اپنے دین کی باتیں پوچھنے آیا ہوں، حضور علیہ السلام نے خطبہ چھوڑ کر ان کو دین کی باتیں سکھا ئیں، پھر خطبہ کو پورا فرمایا، یہاں بھی آپ نے ان کو تحیۃ المسجد پڑھنے کو نہیں فرمایا، اگر ضروری ہوتی تو سب سے پہلے اسی کی تلقین فرماتے۔

یہ سب واقعات حضور علیہ السلام کی حیات مبارکہ کے زمانہ میں پیش آئے ہیں، جن سے صحابہ وتابعین نے خطبہ کے وقت نماز نہ پڑھنے کو ترجیح دی ہے، مگر اس کے باوجود امام شافعی، امام احمد، اور امام بخاری کو اصرار ہے کہ امام کے خطبہ پڑھنے کی حالت میں بھی تحیۃ المسجد پڑھنا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے اور بغیر اس کے بیٹھ جانا مکروہ ہے۔ صرف یہ تاکید ہے کہ مختصر جلدی پڑھ کر پھر خطبہ سننے لگے۔

انوار المحمود ص ۶۹ ۳/ ا تا ص ۳/۷۳ اور فتح الملہم ومعارف السنن واعلاء السنن وغیرہ میں پورے دلائل اور حدیثی ابحاث درج ہوئے ہیں اور ہمارے مولانا عبداللہ خاں صاحب کرتپوری (فاضل دیوبند، تلمیذ رشید علامہ کشمیریؒ) نے مستقل رسالہ بنام ''نماز بوقت خطبہ'' میں مکمل ومدلل بحث اس مسئلہ کی کر دی ہے۔ جو اہل علم کے لئے خاصہ کی چیز ہے، اس میں رجال حدیث اور متون واسناد کی تفصیل خوب کر دی ہے اور حافظ ابن حجرؒ نیز دوسرے مجوزین تحیۃ المسجد عند الخطبہ غیر مقلدین زمانہ کے دلائل کا جواب اچھی طرح دیا ہے۔

دو بڑوں کا فرق: یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ امام بخاریؒ نے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا شعبہ کی عمرو بن دینار سے روایت کو ابواب الجمعہ سے ہٹا کر باب التطوع میں ذکر کیا ہے اور عمرو بن دینار سے جو دوسرے شیوخ حدیث نے دوسری طرح روایت کی ہے، اس کو صحیح بخاری میں کہیں نہیں لائے، برخلاف اس کے امام مسلم نے اپنی صحیح کے ابواب الجمعہ (ص ۲/۴۱۴ فتح الملہم) میں بواسطہ حماد بن زید وایوب وسفیان وابن جریج، عمرو بن دینار سے جو روایات درج کی ہیں، ان میں صرف سلیک کا قصہ اور فعلی حدیث کا ذکر ہے، شعبہ والی حدیث کے قولی الفاظ نہیں ہیں۔ جبکہ عمرو بن دینار ہی ان سب روایات میں حضرت جابر سے حدیث روایت کرنے والے ہیں، اور ص ۲/۴۱۸ میں حضرت ابوالزبیر بھی

حضرت جابر سے صرف سلیک کا واقعہ نقل کر رہے ہیں، اس روایت میں بھی شعبہ والے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ سب قرائن اس بات کے ہیں کہ عام قاعدہ کے الفاظ شعبہ نے سلیک کے قصہ سے خود سمجھ کر روایت کر دیئے ہیں اور دوسری سب روایات مسلم میں ان کا نہ ہونا اسی وہم کو قوت دیتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ شعبہ کے ذہن میں دوسری حدیث "اذا جاء احدکم المسجد فلا یجلس حتی یصلی رکعتین" رہی ہو، جو تحیۃ المسجد کے بارے میں الگ سے مروی و مشہور ہے، اور اس کو یہاں قصہ سلیک کے ساتھ لگا دیا ہو، اور اس میں خطبہ کے وقت بھی سلیک کے خاص واقعہ کی وجہ سے نماز پڑھنے کا حکم عام سمجھ کر روایت میں داخل کر دیا ہو، واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت علامہ عثمانیؒ کے رجحان کا جواب

مولانا عبداللہ خان صاحب دام فیضہم نے حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحبؒ کے رجحان خاص کا جواب بھی دے دیا ہے، جو انھوں نے اس بحث کے سلسلہ میں ص ۲/۴۱۸ پر ظاہر فرمایا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے ابوداؤد کی اس حدیث پر بحث فرماتے ہوئے جس کا ذکر حضرت علامہ عثمانیؒ نے اوپر کے رجحان میں کیا ہے، بذل المجہود کے جواب کو پسند فرمایا ہے لہٰذا ہم اسی کو ذکر کرتے ہیں:۔

صاحب بذل قدس سرہ نے لکھا: یہ حدیث مبیح صلوٰۃ عند الخطبہ ہو سکتی ہے اور حدیث انصات عند الخطبہ محرِّم ہے، لہٰذا محرم کو ترجیح ہونی چاہئے، دوسرے یہ کہ یہ حدیث شافعیہ کے بھی خلاف ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی آخر خطبہ میں مسجد پہنچے اور خطرہ ہو کہ تحیۃ المسجد پڑھنے سے نماز جمعہ کی تکبیر تحریمہ فوت ہو جائے گی تو وہ تحیۃ المسجد نہ پڑھے، (کما فی الاقناع) حالانکہ یہ حدیث ابی داؤد عام ہے، جس کا اقتضا بھی عام ہے کہ خواہ کسی حالت میں بھی خطبہ کے وقت آئے تو تحیۃ المسجد ضرور پڑھے۔ ضرور کا لفظ ہم اس لئے لائے کہ شافعیہ و حنابلہ اس کو مستحب اور ترک کو مکروہ بھی بتلاتے ہیں۔ (بذل ص ۲/۱۹۴)

علامہ نوویؒ نے اس حدیث ابی داؤد کو پیش کر کے لکھا کہ یہ ایسی نص صریح ہے جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں اور اس حدیث کے عام اور صریح الفاظ کے بعد بھی اس کی مخالفت یا تاویل کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا، اس کے جواب میں صاحب بذل نے لکھا کہ تاویل و تخصیص میں بڑا فرق ہے، مانعین نے احکام انصات للخطبہ کی وجہ سے تخصیص کی ہے کہ خطبہ کے وقت صلوٰۃ و کلام وغیرہ کچھ نہ ہو، جس کے لئے دوسرے آثار و تعامل جمہور سلف و خلف بھی مؤید ہے، اور خود شافعی نے بھی تخصیص کا عمل جاری کیا ہے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ آخر خطبہ میں وہ بھی تحیۃ المسجد سے مانع ہیں۔ اس کے لئے انھوں نے کیا تاویل کی ہے، علامہ نووی کے متبعین بتلائیں گے۔

افادۂ انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے صاحب بذل کا جواب مذکور نقل کر کے پھر خود ارشاد فرمایا کہ لفظ مذکور جس کو امام نووی صریح فرمار ہے ہیں، وہ تو حسب تحقیق دار قطنی وہم راوی ہے کہ اس نے حدیث فعلی کو قولی سمجھ کر اور عام حکم خیال کر کے ایسی تعبیر کر دی، چنانچہ دار قطنی نے سارے طرق و متون کا تتبع کر کے یہی فیصلہ دیا کہ یہ جملہ مدرج راوی ہے، اسی لئے دوسرے راویوں نے اس کو ذکر نہیں کیا ہے۔ میرے نزدیک دار قطنی کی یہ تحقیق درست اور صواب ہے اور شاید اسی لئے امام بخاریؒ نے بھی تردد کیا ہے اور اس حدیث کو دوسری جگہ لائے، اور اس میں اوخرج سے شک راوی بھی بتلا گئے، جبکہ ابوداؤد میں یہ بھی نہیں ہے۔ (انوار المحمود ص ۱/۳۷۲)

غرض اس لفظ کے مطابق نہ تو شافعیہ ہی نے پوری طرح عمل کیا ہے اور نہ اس کے مطابق حضور علیہ السلام اور صحابہ و تابعین کے زمانہ میں عمل ہوا ہے، پھر یہ کہ اوپر دس احادیث بیان ہوئیں جن میں حضور علیہ السلام نے کسی میں بھی خطبہ کے وقت آنے والوں کو تحیۃ المسجد پڑھنے کے لئے نہیں فرمایا اور صرف سلیک کو وہ بھی دوسری ضرورت سے اور خطبہ کے قبل یا خطبہ روک کر دو رکعت پڑھنے کو فرمایا، ان حالات میں خاص

طور سے حنفیہ پر طعن وتشنیع کرنا اوران ہی کو ہدف ملامت بنانا کہ وہ تحیۃ المسجد سے روکتے ہیں مناسب وموزوں نہیں ہے۔

احادیث ممانعت صلوٰۃ بوقت خطبہ

محترم مولانا عبداللہ خان صاحب عم فیضہم نے اپنے رسالہ میں سب سے پہلی حدیث عطاء خراسانی کی روایت سے مسند احمد کی پیش کی ہے جس میں ہے کہ مسجد میں نماز جمعہ کے لئے آنے والا امام کے آنے سے پہلے جتنی چاہے نماز پڑھے لیکن اس کے خطبہ کے واسطے نکلنے پر بیٹھ کر صرف خطبہ کی طرف متوجہ ہو اوراس کو خاموش ہو کر سنے۔اس سے اس کے گناہوں کا آئندہ جمعہ تک کے لئے کفارہ ہو جائے گا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ عطاء خراسانی کو سب ہی اکابر نے ثقہ کہا ہے، مگر بڑوں میں سے امام بخاری نے اس کی تضعیف فرمادی ہے اوراس سلسلہ میں ان کے تلمیذ رشید امام ترمذی نے آپ سے بحث بھی کی، اور پھر یہاں تک بھی کہہ دیا کہ میری معلومات میں تو کسی نے بھی متقدمین میں سے عطاء خراسانی کی تضعیف نہیں کی ہے۔ (میزان وتہذیب وغیرہ) اس سلسلہ میں مولانا نے جم کر نقد رجال کی بحث کا حق ادا کر دیا ہے۔ جو اس رسالہ کی خاص چیز اور قابل مطالعہ ہے۔ (۲) حدیث طبرانی مجمع الزوائد بحوالہ فتح الباری ارشاد نبوی کہ امام منبر پر آ جائے تو پھر نہ نماز پڑھی جائے نہ کلام کیا جائے (۳) حدیث بیہقی کہ امام کا خطبہ جمعہ کے لئے نکلنا نماز کو قطع کر دیتا ہے۔اوراس کا کلام (خطبہ) بات چیت کو قطع کر دیتا ہے۔

(۴) حدیث طحاوی شریف کہ امام منبر پر آ جائے تو نماز پڑھنا گناہ ہے۔

(۵) حدیث مسلم شریف کہ جو شخص اچھی طرح وضو کر کے مسجد گیا پھر خطبہ کی طرف کان لگائے۔اور خاموش رہا تو اس کے گناہ اس جمعہ سے دوسرے جمعہ اور مزید تین دن تک کے معاف ہو جاتے ہیں،

(۶) حدیث بخاری شریف کہ جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے پھر تیل وخوشبو لگائے اور دو شخصوں کے درمیان تفریق نہ کرے اور نماز پڑھے پھر جب امام (نماز وخطبہ کے لئے) نکلے تو خاموشی اختیار کرے تو اس کے گناہ اس جمعہ سے اگلے جمعہ تک کے معاف ہو جائیں گے۔

مولانا نے مزید ۱۴ احادیث وآثار پیش کر کے لکھا کہ ان سب سے حضور علیہ السلام کا خطبہ کے وقت نماز کو پسند نہ فرمانا اور خلفاء راشدین وجمہور صحابہ وتابعین وائمہ دین کا بحالت خطبہ نماز کو اختیار نہ کرنا پوری طرح واضح ہو گیا ہے۔ (نماز بوقت خطبہ ص ۵۵) مولانا نے اس موقع پر مسند امام احمد کی حدیث بھی پیش کی کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا'' جو شخص جمعہ کے دن امام کے خطبہ کے وقت کلام کرے وہ مثل گدھے کے ہے، جس پر کتابیں لادی گئی ہوں''۔

علامہ ابن تیمیہ کا ارشاد

علامہ ابن تیمیہ نے فتاوی ص ۱۷۳/۲ میں قراءۃ خلف الامام فی جہریہ کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا: جہر سے مقصود لوگوں کا استماع ہے کہ وہ کان لگا کر قراءۃ امام کو سنیں۔اوراسی لئے ولا الضالین پر آمین بھی کہتے ہیں، پس اگر امام کی قراءت کے وقت مقتدی بھی قراءت میں مشغول ہو جائیں تو گویا حق تعالیٰ نے امام کو ایسے لوگوں کو قراءت سنانے کا حکم دیا جو اسکو نہیں سنتے اور ایسا ہی ہوا کہ کوئی شخص دوسرے سے بات کرے، جس کو وہ نہ سنتا ہو یا امام خطبہ دے ایسے لوگوں کے سامنے جو اس کا خطبہ نہ سنیں، ایسا حکم اول درجے کی حماقت ہے جس سے شریعت مقدسہ منزہ ہے اوراسی لئے حدیث میں وارد ہوا کہ جو امام کے خطبہ کے وقت کلام کرے وہ مثل گدھے کے ہے۔لہٰذا اسی طرح وہ بھی ہوگا جو امام کی قرائۃ کے وقت قرائۃ کرے (معلوم نہیں خطبہ کے وقت لوگوں کا نماز میں مشغول ہو جانا بھی اس کے تحت آتا ہے یا نہیں؟)

بقیہ دو بڑوں کا فرق: ہم نے اوپر اشارہ دیا ہے کہ امام بخاریؒ اپنے مسلک کی رعایت اس حد تک بھی کرتے ہیں کہ ایک ہی حدیث کے کچھ طرق کو لاتے ہیں اور دوسروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جیسا کہ مسئلہ زیر بحث میں حدیث جابر کے لئے، حالانکہ دوسرے سب رواۃ کے

متون، متن روایت شعبہ سے بالکل مختلف ہیں، اور امام مسلم نے ان کو ایک جگہ ذکر کردیا ہے،

اور ایسا تو امام بخاریؒ بہت کرتے ہیں کہ اگر کوئی حدیث متعدد رواۃ سے ہو اور الفاظ روایت بھی الگ الگ ہوں تو معنی واحد ہونے کی صورت میں وہ صرف کسی ایک راوی کے لفظ نقل کرتے ہیں، پھر یہ بہتر ہوتا کہ اس لفظ والے کی تعیین ہی کردیتے، تو امام بخاریؒ یہ بھی نہیں کرتے، البتہ امام مسلم اس کا التزام کرتے ہیں اور یہی بہتر بھی ہے۔

حضرت علامہ عثمانیؒ نے ترجیح کتاب مسلم علی کتاب البخاری کے عنوان سے مقدمۂ فتح الملہم ص ۹۸ میں مذکور بالا کے علاوہ دوسری وجوہ بھی ذکر کی ہیں مثلا:-

(۳) کسی حدیث کو مسلم سے نکال لینا بہت آسان ہے، کیونکہ امام مسلم نے ہر حدیث کے لئے ایک موزوں و مناسب باب اور مقام تجویز کیا ہے، اور اسی جگہ وہ اس کے سارے طرق و اسانید اور الفاظ مختلفہ وارده جمع کردیتے ہیں، جن سے طرق متعددہ اور الفاظ مختلفہ کی معرفت بھی حاصل ہوجاتی ہے اور کسی حدیث کا نکالنا بھی سہل ہوتا ہے بخلاف امام بخاریؒ کے کہ وہ ان وجوہ مختلفہ کو متفرق ابواب میں لاتے ہیں اور بہت سی احادیث تو غیر مظان ابواب میں لاتے ہیں جس کی وجہ سے طرق متعددہ و الفاظ مختلفہ کی معرفت تو درکنار حدیث کو تلاش کرکے نکالنا ہی دشوار ہوجاتا ہے۔ حتی کہ بہت سے حفاظ متاخرین کو تو اتنا دھوکہ ہوا کہ انھوں نے صحیح بخاری میں کسی حدیث کے وجود سے انکار بھی کردیا جبکہ وہ اس میں موجود تھی اور ان کو مظان میں نہ مل سکتی تھی۔

(۴) امام مسلم نے اپنی کتاب کو اپنے شہر میں تمام اصول مرجوعہ کو سامنے رکھ کر اپنے بیشتر مشائخ کی زندگی میں لکھ لیا تھا، اسی لئے الفاظ و سیاق میں وہ پوری احتیاط برتتے ہیں بخلاف امام بخاری کے کہ انھوں نے بسا اوقات احادیث کو اپنے حافظہ سے ذکر کیا ہے۔ اور الفاظ رواۃ کو بھی ممیز نہ کرسکے۔ اسی لئے ان کو شکوک بھی پیش آئے ہیں اور خود بھی فرمایا کہ بہت سی احادیث میں نے بصرہ میں سنی تھیں اور ان کو لکھا شام میں، پھر انھوں نے احادیث سے استنباط احکام کی فکر بھی ساتھ ساتھ رکھی۔ اور ان کے لئے اپنے اجتہاد و استنباط کے مطابق ابواب قائم کئے، اس کی وجہ سے ان کو ایک ایک حدیث کے ٹکڑے کرکے ان کو ابواب میں تقسیم کرنا پڑا بخلاف امام مسلم کے کہ انھوں نے استنباط احکام کی فکر اپنے ذمہ نہیں لگائی اس لئے ایک حدیث کے سارے متون مرویہ اور طرق و اسانید بھی ایک جگہ میں جمع کردیئے۔

(۵) امام مسلم نے امام بخاری کے برخلاف احادیث پر اقتصار کیا۔ موقوفات کو صرف چند مواضع میں لائے ہیں، وہ بھی تبعا لا مقصودا، اور اس لئے شاید ابن مندہ کے شیخ امام حاکم ابوعلی نیساپوریؒ نے کہا کہ "آسمان کے نیچے کتاب مسلم سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے"۔

(۶) بعض شراح بخاری نے باعتبار صحت کے صحیح بخاری کو دوسری کتابوں پر ترجیح دیتے ہوئے لکھا کہ امام مسلم کی صحیح کو صحیح بخاری پر زیادہ فضیلت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ سارے متونِ حدیث کو ایک جگہ جمع کردیتے ہیں اور ان کو امام بخاریؒ کی طرح ابواب متفرقہ میں تقسیم نہیں کرتے، اور یہ بھی ہے کہ امام مسلم حدیث کے متون پورے پورے ایک جگہ ذکر کرتے ہیں اور امام بخاری کی طرح ان کے ٹکڑے ٹکڑے بنا کر تراجم میں نہیں بانٹتے۔ اور یہ بھی ہے کہ امام مسلم احادیث کی روایت باللفظ پر محافظت کرتے ہیں۔ اور روایت بالمعنی نہیں کرتے، اور متون احادیث الگ کرکے لاتے ہیں امام بخاری کی طرح ان کے ساتھ اقوال صحابہ و من بعدہم کو مخلوط نہیں کرتے۔

حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب میں لکھا کہ امام مسلم کو اپنی صحیح کی وجہ سے وہ عظیم و عالی مرتبۂ رفیعہ حاصل ہوا جو اور کسی کو حاصل نہ ہوسکا، اور اسی وجہ سے بعض لوگوں نے اس کو امام بخاری کی صحیح پر بھی فضیلت دے دی ہے، کیونکہ اس کو جمع طرق جودت سیاق۔ محافظت علی اداء الالفاظ کی خصوصیات حاصل ہوگئیں، اور وہ محافظت بھی ایسی کہ نہ صرف روایت بالمعنی سے محترز رہے بلکہ احادیث و متون کی تقطیع سے بھی اجتناب اختیار کیا۔" (مقدمہ فتح الملہم ص ۹۹)

چونکہ صحیح بخاری کی شرح چل رہی ہے، مناسب سمجھا کہ صحیحین کا کچھ فرق و امتیاز بھی ناظرین کے سامنے آجائے، اور دونوں کی عظمت اور جلالت قدر بھی ملحوظ رہے۔

احادیث اتمام سے وجوب قراءۃ خلف الامام کا ثبوت

امام بخاریؒ نے بہت سی احادیث اتمام ذکر کر کے یہ ثابت کیا کہ جب حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے کہ جو کچھ نماز کا حصہ تمہیں مل جائے امام کے ساتھ وہ اس کے ساتھ پڑھ لو اور جو رہ جائے اسے بعد کو پورا کرلو۔ تو جس سے قراءت کا فرض رہ گیا یا قیام کا تو اسے بعد کو پورا کرنا ہے اور صرف رکوع میں ملنے سے قراءت وقیام دونوں رہ گئے، لہٰذا وہ رکعت نہ ہوئی اور مقتدی کوئی رکعت بعد کو پوری کرنی چاہیے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے اتنی بہت سی احادیث میں ذکر فرمایا ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ فاتحہ کی قراءت رکوع میں کر لے گا، جیسا کہ بعض اہل ظاہر اس کو کہتے ہیں اور خود امام بخاری کے یہاں بھی رکوع و سجدے میں قرآن مجید پڑھنے کا جواز ہے (جبکہ سب اس کو ناجائز کہتے ہیں اور مسلم شریف میں بہت سی احادیث ممانعت کی وارد ہیں) تو امام بخاری اس کو بھی رد کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ اس لئے صحیح نہ ہوگا کہ قراءت کا محل رکوع سے قبل کا ہے، اگر ہم اس کو قیام سے مؤخر کر کے رکوع میں جائز کر دیں گے تو یہ حدیث کی مخالفت ہوگی۔ لہٰذا جس طرح سجدہ رکوع سے قبل نہیں ہوسکتا، رکوع بھی قراءت سے پہلے صحیح نہ ہوگا، اور اس رکوع کو جو بے محل ہوا ہے معتبر نہیں سمجھا جائے گا۔

من ادرک رکعۃ سے استدلال

جزء القراءۃ ص۲۴ وص۲۵ میں امام بخاری نے من ادرک رکعۃ من الصلوٰۃ فقد ادرک الصلوٰۃ کے مختلف متون متعدد اسناد سے ذکر کئے اور یہ تاثر دیا کہ ان سب احادیث میں یہ ہے کہ ایک رکعت ملنے سے جماعت کی نماز کا ثواب مل جاتا ہے، یہ نہیں ہے کہ رکوع ملنے سے رکعت مل گئی، کیونکہ کسی حدیث میں ایسا نہیں آیا کہ جس کو رکوع یا سجود یا تشہد مل گیا تو اس کو رکعت مل گئی۔

ص۲۷ میں امام بخاری نے یہ اعتراض بھی غیر موجبین پر کیا کہ یہ جو کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام پہلی رکعت کو طویل کرتے تھے، اور ان لوگوں میں سے بعض نے یہ بھی خیال کیا کہ حضور اس لئے اس کو طویل کرتے تھے تاکہ لوگوں کو رکوع تک امام کے ساتھ ملنے سے رکعت مل جائے مگر یہ بات تو جب صحیح ہوتی کہ وہ کہتے حضور علیہ السلام رکوع کو طویل کرتے تھے، اور وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ لوگوں کے رکوع میں مل جانے کی توقع ہو تو امام رکوع میں دیر لگائے، حالانکہ رکوع میں کسی کا انتظار کرنا نہ کوئی سنت ہے نہ اس میں ثواب ہے۔

پھر امام بخاریؒ نے ایسی روایت پیش کی کہ جس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام قراءت طویل کرتے تھے، اور صحابہ بقیع جا کر ضرورت سے فارغ ہو کر گھر آتے اور وضو کر کے آپ کے ساتھ اطمینان سے شریک ہو جایا کرتے تھے گویا قراءت طویل کرنا اس لئے نہ تھا کہ لوگوں کو رکوع میں ملنے سے رکعت مل جائے گی بلکہ لوگوں کو بسہولت اور ضروریات سے فارغ ہو کر پہلی رکعت ملنے کی غرض سے تھا۔

پہلے ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں کہ جمہور سلف و خلف کا فیصلہ امام بخاریؒ کی اس رائے کے خلاف ہے کہ رکوع ملنے سے رکعت نہیں ملتی مگر امام صاحب برابر اپنی رائے درست ثابت کرنے کے لئے مواقع تلاش کر کے نکالتے ہیں۔

خداج سے استدلال

امام بخاریؒ نے متعدد صفحات میں حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ سے وہ ۱۲۔۱۳ روایات ذکر کیں جن سے معلوم ہوا کہ بغیر قراءۃ فاتحہ کے نماز خداج ہوگی یا غیر تمام ہوگی، اور ص۲۵ میں جا کر خداج کے وہ معنی بھی کھول دیئے جو ان کے ذہن میں تھے، فرمایا:۔ ابوعبید نے کہا اخدجت الناقۃ اس وقت بولتے ہیں جبکہ اونٹنی سقط ڈالے، اور سقط بچہ مردہ ہوتا ہے، جس کا کوئی فائدہ نہیں، گویا اسی طرح بغیر فاتحہ کے نماز بھی مردہ

بے جان، بے فائدہ یا غیر مقلدین کی تعبیر میں باطل وکالعدم ہوگی۔

جواب: حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے حدیث خداج کے تحت لکھا: ۔خداج کے معنی کمی اور نقصان کے ہیں۔امام لغت خلیل وغیرہ نے کہا کہ خدجت الناقۃ اس وقت بولتے ہیں جب اونٹنی پوری مدت حمل سے پہلے بچہ ڈال دے اگر چہ وہ بچہ جسمانی اعتبار سے پورا ہو اوراخدجتہ جب بولتے ہیں کہ وہ بچے کو ناقص الخلقت جنے اگر چہ پوری مدت پر جنے۔اور غیر تمام جن روایات میں آیا ہے۔اس کا مطلب بھی ناقص اور کمی ہے، بہ نسبت کمال کے۔گویا غیر تمام بطور بدل یا تاکید کے ہے اور بظاہر یہ بتلایا ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز میں کمی رہے گی یا نہیں کہ وہ سرے سے باطل اور کالعدم ہو جائے گی۔

حنفیہ بھی یہ ہرگز نہیں کہتے کہ نماز بغیراس کے جائز ہوگی، وہ بھی واجب کہتے ہیں اواگر نہ پڑھے تو نماز کو واجب الاعادہ بتلاتے ہیں، لہٰذا جن حضرات نے یہ سمجھ کر حنفیہ پر تشنیع کی کہ وہ بغیر فاتحہ کے نماز جائز کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، البتہ امام کے پیچھے اور وہ بھی جہری میں مقتدی پر اس کو واجب نہیں مانتے۔اوراس کے عدم وجوب میں ان کے ساتھ اور سب بھی ہیں (بجز امام بخاری وابن حزم کے) لہٰذا حافظ ابن حجر کا تعجب اور علامہ نووی کے تشنیع حنفیہ پر بالکل بے محل ہے۔الخ (اوجز ص ۱/۲۴۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فصل الخطاب ص ۱۹ میں مستقل فصل احادیث خداج پر لکھی ہے اور فرمایا کہ احادیث خداج نے تو یہ بتلایا کہ فاتحہ کے بغیر نماز ناقص ہوگی یہ نہیں بتلایا کہ بالکل باطل ومنفی ہوگی، اور جب صحیح حدیثوں میں پوری بات ہے کہ نماز بغیر فاتحہ اور کچھ مزید قراءت کے بغیر نہ ہوگی۔اس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف فاتحہ بلکہ ضم قراءت یا سورت بھی ضروری ہے، اس لئے حنفیہ صرف قراءت کو نماز کے لئے فرض اور فاتحہ و سورت دونوں کو واجب قرار دیتے ہیں، دوسرے حضرات نے حدیث کے ایک قطعہ (فصاعدا وغیرہ) کو بہت کم درجہ دیا کہ اس سے صرف سنیت و استحباب کا اثبات کیا ہے۔حنفیہ نے احادیث کے لفظ **فصاعدا** اور **فمازاد** اور **وما تیسر** وغیرہ کے اشارات کو بھی پوری اہمیت دی ہے، اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ ان احادیث کی وجہ سے اگر کسی نے نماز میں نہ فاتحہ پڑھی نہ اس کے ساتھ دوسری قراءت کی تو اس کی نماز بالکل نہ ہوگی، حضرتؒ نے فرمایا کہ اس قسم کے اشارات، صراحتوں سے زیادہ مقصد کی طرف مشیر ہوتے ہیں بقول شاعر ۔ **"منازل من تهوىٰ رويدك فانزل"**
(یہی تو تیری محبوبہ کے گھروں کے نشانات ہیں، لہٰذا اپنے سفر کو موخر کر کے یہاں اتر کر کچھ دیر بیٹھ اور گذشتہ باتوں کی یاد تازہ کر)

حضرتؒ نے پوری تفصیل ووضاحت کر کے بتلایا کہ احادیث خداج نے نماز بلا فاتحہ کو محسوس ناقص الخلقۃ بچہ سے تشبیہ دے کر اس کے حکماً ناقص ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، لہٰذا ان احادیث سے بطلان صلوٰۃ کا فیصلہ کرنا احادیث کے منشا کے خلاف ہے۔کیونکہ ان سے صرف وجوب فاتحہ اور مرتبہ واجب کا ثبوت ملتا ہے جو حنفیہ کا مسلک ہے۔آخر میں حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ یہاں غیرہ تمام تمام بالمعنی المشہور سے نہیں ہے، بلکہ تمام عرب کے خاص محاورہ''ولدتہ امہ تمام'' سے ہے۔یعنی پوری مدت پر بچہ ہو مگر ناقص یا کم مدت پر ہو مگر کامل ہو۔ گویا خداج ہی کے دونوں معنی کی تاکید ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے خوب واضح ہو گیا کہ امام بخاریؒ نے جو خداج کے لفظ سے نماز کو باطل محض سمجھا تھا، یا جیسے اب غیر مقلدین بھی دعوی کرتے ہیں کہ بغیر فاتحہ کے نماز باطل اور کالعدم ہوتی ہے۔ یہ دعوی بلا برہان ہے۔اور امام بخاری نے مردہ بچہ ڈالنے اور میت لاینتفع بہ کا اضافہ بھی کیا، وہ لفظ کے معنی اصلی سے زائد بات ہے، اور بقول حضرتؒ کے یہ امام بخاریؒ کے مبالغات میں سے ہے کہ جب ایک شق کو اختیار کر لیتے ہیں تو دوسری جانب کی ساری عمارتوں کو منہدم کر دینے کی سعی کیا کرتے ہیں، جس طرح علامہ ابن تیمیہ (اپنے تفردات کے اثبات میں) صرف اپنی ہی دھنتے تھے اور دوسروں کی نہیں سنتے تھے۔

صاحب احسن الکلام نے دوسری ایسی احادیث بھی اس موقع پر پیش کی ہیں جن میں خداج یا غیر تمام کے الفاظ کسی واجب وفرض کے

ترک پر نہیں بلکہ صرف مکملات وسنن صلوٰۃ کے ترک پر فرمائے گئے ہیں (احسن الکلام ص۴۰/۲) اور لکھا کہ جس طرح موجبین نے فصاعدا وغیرہ الفاظ کو نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ اس کی روایت کرنے والے اکابر امام معمر، سفیان بن عیینہ، امام اوزاعی، شعیب بن ابی حمزہ، عبد الرحمان بن اسحق مدنی، اور صالح بن کیسان ایسے جلیل القدر ائمہ ثقات اور حفاظ ہیں، اسی طرح خداج والی احادیث میں بھی الا صلوٰۃ خلف الامام کی زیادتی ثقات کو نظر انداز کر دیا ہے اور جہاں خود ضرورت پیش آئی تو حضرت عبادہؓ کی حدیث صحیحین میں جہری قرائۃ خلف الامام کا اثبات کرنے کے لئے محمد بن اسحق جیسے ضعیف راوی کے ذریعہ خارج صحیحین سے زیادتی ثابت مان لی ہے۔

صلوٰۃ الی غیر القبلہ کا جواز؟

امام بخاری نے ص ۲۷ جزء القراءۃ میں لکھا کہ حضرت زید بن ثابت سے تو یہ ثابت ہوا کہ انھوں نے غیر قبلہ کی طرف رجوع کیا ہے، مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر رکوع غیر قبلہ کی طرف کیا تو اس کی نماز جائز نہ ہوگی۔ حنفیہ نے جن صورتوں میں تحری یا بغیر تحری کے غیر قبلہ کی طرف نماز کو درست یا نادرست کہا ہے، اس کی پوری تفصیل کتب فقہ میں ہے، اور حلبی کبیر (شرح منیہ) ص ۲۱۷/۲۲۵ میں تمام صورتوں کی تفصیل واحکام ہیں اس لئے مبہم طور سے کسی مسلک کو گرانے کے لئے اس کو احادیث یا آثار کے خلاف کہہ دینا انصاف سے بعید ہے۔

جہر مقتدی بالقراءۃ کی ممانعت؟

امام بخاریؒ نے ص ۲۸ میں مستقل فصل قائم کر کے یہ تاثر دیا کہ دراصل قراءت خلف الامام کی احادیث ممانعت میں نفس قرائۃ کی وجہ سے ممانعت نہیں ہے، بلکہ زور سے پڑھنے کی ممانعت ہے اور پہلی حدیث اس طرح پیش کی کہ لوگ حضور علیہ السلام کے پیچھے زور سے پڑھتے تھے، اس لئے آپ نے منع فرمایا، حالانکہ اسی فصل میں امام بخاریؒ نے جو دوسری احادیث ذکر کی ہیں، اور اس میں ظہر کی نماز کا بھی واقعہ ہے، جس میں ظاہر ہے کہ جب حضور علیہ السلام اور دوسرے صحابہ بھی قراءت زور سے نہ کرتے ہوں گے تو کسی ایک نے ہی کیوں زور سے کی ہو گی۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ہر جگہ کے واقعات میں حضور علیہ السلام نے نماز کے بعد یہی سوال فرمایا کہ تم میں سے کس نے قراءت کی ہے؟ یہ سوال کہیں نہیں ہے کہ کس نے زور سے قراءت کی؟ لہٰذا ان سب احادیث کو جہر مقتدی سے متعلق کر دینا صحیح نہیں ہوسکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

منازعت کی وجہ سے اعادہ کا حکم نہیں ہوا

امام بخاریؒ نے ص ۲۹ میں یہ باب بھی قائم کیا، جس سے ثابت کیا کہ امام کے پیچھے قراءت سے کوئی نقصان نماز میں نہیں آتا، اسی لئے تو حضور علیہ السلام نے منازعت والے کو اعادہ صلوٰۃ کا حکم نہیں فرمایا، اور حدیث مسلم وغیرہ کے الفاظ کہ امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو ان کو زیادتی غیر ثقہ بتلایا، حالانکہ وہ کبار محدثین کے نزدیک زیادتی ثقہ ہے، پھر حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف قراءت فی الجہر یہ کی بات منسوب کی، حالانکہ وہ غلطی ہے اور غیر جہری کی جگہ جہری ہو گیا ہے۔ آخر میں امام بخاری نے دعوی کیا کہ مسلم وغیرہ کی زیادتی جو ابو خالد سے نقل ہوئی ہے، اس کی کسی نے متابعت نہیں کی ہے، حالانکہ اس کی متابعت وتائید دوسرے متعدد ثقہ راویوں نے کی ہے۔ (پوری بحث کتابوں میں دیکھی جائے)

سکتات امام کی بحث

ص ۲۹ میں امام بخاریؒ نے مستقل باب سکتات امام میں قراءت کے لئے ذکر کیا ہے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی فصل الخطاب ص ۸۵ میں سکتات پر تفصیلی بحث کی ہے، آپ نے لکھا:۔ جبکہ شریعت نے جہری نماز میں امام کے پیچھے کوئی محل وموقع فاتحہ کے لئے تجویز نہیں کیا تو امام بخاری نے سکتات میں پڑھنے کی صورت نکالی ہے، اور حضرت سعید بن جبیر سے یہ بھی نقل کیا کہ لوگوں نے نئی نئی باتیں

نکال لی ہیں، سلف میں تو امام تکبیر کہہ کر اتنی دیر تک خاموش ہوتا تھا کہ اس کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ اس کے پیچھے والے مقتدیوں نے فاتحہ پڑھ لی ہوگی۔ پھر وہ قراءت کرتا اور لوگ خاموش رہ کر قراءت سنتے تھے۔

اس پر حضرتؒ نے لکھا کہ یہ ان لوگوں نے خود سے بات بنالی ہے ورنہ کسی مرفوع حدیث سے ایسے بڑے سکوت امام اور قراءت مقتدی خلف الامام کا ثبوت نہیں ہے، اور خود حضرت سعید بن جبیر ہی سے مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ بھی منقول ہے کہ ان سے قراءت خلف الامام کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:۔ امام کے پیچھے کوئی قراءت نہیں ہے، اور دوسرا اثر ان ہی سے کتاب الآثار امام محمد میں بھی ہے، لیکن موجبین کی طرف سے اصرار و مبالغہ یہاں تک ہوا ہے کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں بھی قراءت ضرور کرو خواہ اس کی قراءت سے پہلے ہو یا بعد میں یا اس کے ساتھ ہی ہو کسی حال میں بھی ترک نہ کرو، حالانکہ شارع علیہ السلام نے حدیث انسؓ میں سوال فرمایا کیا تم اپنی نماز میں امام کے پیچھے قرائۃ کرتے ہو جبکہ وہ قراءت کر رہا ہو؟ دوسری حدیث میں ہے کہ شاید تم امام کی قراءت کے وقت بھی قراءت کرتے ہو؟! اور حدیث ابن اکیمہ (جزء القراءۃ بخاری) میں بھی ہے کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرائۃ کی ہے؟ غرض اوپر جیسا اصرار و مبالغہ مناسب نہیں، اور اس کے مقابلہ میں دوسری طرف سے بھی مصنف ابن ابی شیبہ کا اثر حضرت ابراہیم نخعی کا پیش ہو سکتا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ سب سے پہلی بدعت جو لوگوں نے چلائی وہ قراءۃ خلف الامام کی ہے اس سے پہلے لوگ نہ پڑھتے تھے۔

دوسری بات یہ بھی دیکھنی ہے کہ جو شخص امام کی فاتحہ ختم ہونے کے قریب نماز میں داخل ہوا تو وہ امام کے آمین کہنے پر آمین کہہ کر بقیہ اپنی فاتحہ اگر پڑھے گا تو اس صورت میں ''آمین'' طابع نہ رہے گی، کہ ابوداؤد میں اس کو طابع[1] قرار دیا گیا ہے، اور اگر آمین اپنی فاتحہ پوری کرنے کے بعد کہے گا تو امام و ملائکہ کی موافقت نہ رہے گی۔ غرض دونوں فضیلتوں میں سے ایک ضرور فوت ہو جائے گی۔ اور یہ سب غیر موزوں باتیں اس لئے پیش آئیں کہ خود احادیث کے اندر قراءۃ خلف الامام کو کوئی خاص مقام و اہمیت نہیں دی گئی ہے، اور ہم نے التزام مالا یلزم کر کے خود سے کچھ صورتیں تجویز کر لی ہیں۔

پھر فرمایا کہ امام نووی سے تعجب ہے کہ انھوں نے ''الاذکار'' میں سکتات کا مسئلہ اٹھایا ہے اور تیسرا طویل سکتہ آمین کے بعد نکالا جس میں مقتدی فاتحہ پڑھے گا۔ گویا انھوں نے آمین کے بعد اس کو مقتدی کے لئے بطور اصل مطرد کے تجویز کر دیا۔ الخ حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ نے اپنے فتاوی میں سکتات کے اندر قراءت کو پوری طرح سے ضعیف قرار دیا ہے اور کافی ووافی بحث کر دی ہے۔

حافظ ابن تیمیہ کا ارشاد

آپ نے اپنے رسالہ ''تنوع العبادات'' میں لکھا:۔ نماز میں سکتہ کے متعلق لوگوں کے تین قول ہیں، ایک یہ کہ نماز میں کوئی سکتہ نہیں ہے جیسے امام مالکؒ کا مذہب ہے کہ ان کے نزدیک ثناء و تعوذ نہیں ہے، اور قراءت امام کے اندر بھی کوئی سکتہ نہیں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نماز میں صرف ایک سکتہ ثناء و تعوذ کے لئے ہے جیسے امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے کیونکہ حدیث ابی ہریرہ عند الشیخین سے اس کا ثبوت ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ نماز میں دو سکتے ہیں جیسا کہ سنن کی روایات میں ہے، مگر ان میں سے دوسرا سکتہ قراءت سے فارغ ہونے کے بعد رکوع سے پہلے ہے اور یہی صحیح ہے، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام سورۂ فاتحہ سے فراغت پر سکتہ کرتے تھے، امام شافعی اور امام احمد کے اصحاب میں سے بعض لوگوں کا قول اس روایت کی بناء پر یہ ہے کہ نماز میں تین سکتے مستحب ہیں، سورۂ فاتحہ کے بعد والے سکتہ کو امام

[1] بذل المجہود ص۱۰۶/۲ میں ہے:۔ قوله اختمه بآمين فان آمين مثل الطابع على الصحيفة، یعنی اپنی دعا کو آمین پر ختم کیا کرو، کیونکہ آمین ایسی ہے جیسے خط پر مہر لگ جاتی ہے، اور جس طرح شئ عزیز مہر کے ذریعہ محفوظ کر دی جاتی ہے۔ ایسی ہی دعا بھی آمین کی مہر کے ذریعہ محفوظ ہو کر حق تعالیٰ کی جناب میں پہنچا دی جاتی ہے۔ (مؤلف)

شافعی کے اصحاب اور بعض اصحاب احمد نے مقتدی کی قراءت فاتحہ کے لئے قرار دیا ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ صرف دو ہی سکتے مستحب ہیں۔ حدیث صحیح میں اس کے سوا کچھ نہیں ہے، اور ایک روایت دو میں سے غلط ہے، ورنہ تین سکتے ہو جائیں گے۔ اور امام احمدؒ سے یہی منصوص ہے کہ صرف دو سکتے مستحب ہیں اور دوسرا سکتہ قراءت سے فارغ ہونے کے بعد راحت کے لئے اور قراءت و رکوع میں فصل کرنے کے لئے ہے۔

پھر یہ کہ سورۂ فاتحہ کے بعد سکتہ کرنے کو امام احمد اور امام مالک و امام ابوحنیفہؒ مستحب نہیں سمجھتے اور جمہور بھی اس امر کو مستحب نہیں سمجھتے کہ امام اس غرض سے سکتہ طویلہ کرے کہ مقتدی فاتحہ پڑھ لے۔ کیونکہ جب امام جہر سے قراءت کرے۔ اس وقت مقتدی کے ذمہ جمہور کے نزدیک قراءت واجب یا مستحب نہیں ہے بلکہ قراءت کرنا مقتدی کو منع ہے۔

اگر امام کے ساتھ اس حالت میں مقتدی قراءت کرے تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ امام احمد کے مذہب میں اس کے متعلق دو قول ہیں اور عامۂ سلف صالحین جو امام کے پیچھے قرائۃ کو مکروہ کہتے ہیں یہ کراہت اس صورت میں ہے کہ امام جہر سے قراءت کر رہا ہو اور اکثر ائمہ سورہ فاتحہ کے طویل سکوت نہیں کرتے تھے، اور جہری نماز میں امام کے پیچھے قراءت کرنے والے بہت کم لوگ تھے۔

اس سے تو کتاب اللہ میں بھی منع کیا گیا ہے اور حدیث میں بھی، اور جمہور سلف و خلف اسی پر ہیں کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں قراءت مکروہ ہے۔ نیز لکھا: جو لوگ امام کے ساتھ قراءت کرنے سے مقتدی کو منع کرتے ہیں ان کے ساتھ جمہور سلف و خلف بھی ہیں اور کتاب اللہ و سنت صحیحہ بھی ہے، اور جو لوگ اس حالت میں مقتدی پر قراءت کو واجب کہتے ہیں، ان کی حدیث ابی داؤد کو ائمہ نے ضعیف کہا ہے، اور امام احمد و مسلم و اسحٰق بن راہویہ وغیرہم نے جو حدیث میں **واذا قرأ فانصتوا** روایت کیا ہے۔ وہ صحیح قرار دی گئی ہے۔ اور ابوداؤد والی اوپر کی حدیث صحیح کے درجہ میں شامل نہیں کی گئی اور بہت سی وجوہ سے اس کا ضعیف ہونا ثابت ہے اور حقیقت میں وہ حضرت عبادہ کا قول ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہے (تنوع العبادات ص ۸۵/۸۶)

آخری باب اور قراءت خلف الامام

امام بخاریؒ نے باب جزء القرائۃ میں قراءۃ ظہر کا قائم کیا ہے جس میں وہ احادیث ذکر کیں، جن سے ظہر و عصر کی چاروں رکعتوں میں فاتحہ پڑھنے کا ثبوت ہے، اور اس کو سب ہی منفرد کے لئے مانتے ہیں، سوال تو فرضوں میں خلف الامام کی صورت کا ہے اور وہ بھی جہری میں، لیکن اس باب میں امام بخاریؒ نے جو سب سے پہلی حدیث حضرت جابر عبداللہ کی پیش کی ہے، اسی میں یہ مضمون ہے کہ جو کوئی بھی بغیر قراءۃ فاتحہ کے رکعت پڑھے گا تو اس کی نماز نہ ہوگی، الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو، امام بخاریؒ نے اس حدیث پر کوئی کلام بھی نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صحت بھی ان کو تسلیم ہے۔ اور یہی ساری امت کے سلف و خلف کا مسلک بھی ہے کہ ہر شخص پر نماز میں قراءت فاتحہ واجب ہے، مگر یہ وجوب خلف الامام مقتدی پر نہیں ہے، لہٰذا وجوب خلف الامام کا مسلک رد ہو جاتا ہے۔

آگے حضرت ابوالدرداء کی حدیث لائے ہیں، جس سے ثابت ہوا کہ ہر نماز کے لئے قراءت ضروری ہے، اور یہ بعینہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے اور یہ امام بخاری وغیرہ کے خلاف ہے جو ہر رکعت کے لئے فاتحہ کو ضروری کہتے ہیں اور صرف قراءت کو کافی نہیں مانتے۔

آخر سے قبل حضرت عبادہ کی حدیث پھر لائے ہیں **لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب**، جس کے لئے حافظ ابن تیمیہ و دیگر اکابر محدثین کی رائے ہے کہ وہ قول عبادہ ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد نہیں ہے۔ رسالہ کی آخری حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی ہے کہ نماز بغیر فاتحہ اور کچھ زائد قراءت کے درست نہ ہوگی۔ یہ بھی حنفیہ کے مطابق ہے کہ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی سورت یا چند آیات پڑھنا ہر نماز کے لئے ضروری ہے اگر نہ پڑھے گا تو نماز کا اعادہ کرنا پڑے گا، الا یہ کہ امام کے پیچھے ہو تو اس پر قراءت فاتحہ اور ما زاد واجب نہیں ہے، کیونکہ امام کی

قراءت مقتدی کے لئے کافی ہے۔ **لقوله عليه السلام من كان له امام فقراء ة الامام له قراء ة**

امام بخاریؒ کا رسالہ ختم ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاریؒ شریف میں فرمایا تھا کہ امام بخاریؒ نے صحیح میں چند احادیث ذکر کیں مگر وہ کوئی صریح حدیث تعیین فاتحہ خلف الامام کے لئے نہ لا سکے۔ اسی لئے ترجمۃ الاباب میں بھی اس کو نہ لائے اور مطلق قراءت کو لائے ہیں البتہ اپنے رسالہ'' جزءالقراءۃ میں خوب توسع سے کام لیا ہے، بلکہ اس موضوع فاتحہ خلف الامام سے ہٹ کر دوسرے مسائل حنفیہ پر بھی سخت ناقدانہ و جارحانہ کلام کیا ہے، جو ان کی شان رفیع کے مناسب نہ تھا ہم نے اوپر یہ بھی بتلا دیا ہے کہ بہت سے مسائل میں امام بخاری نے جو نسبت امام صاحب یا حنفیہ کی طرف کی ہے، وہ صحیح بھی نہیں ہے۔

دلائل امام بخاری ایک نظر میں

ہم یہاں ان کے خاص دلائل کو ایک جگہ بھی کر دینا چاہتے ہیں، اور بیشتر یہی دلائل و نظریات اس دور کے غیر مقلدین کے بھی ہیں، اس لئے مختصر جواب بھی ساتھ ہی لکھ دیئے ہیں:۔

(۱) **حدیث عبادۃؓ:** بخاری و مسلم میں جو حدیث حضرت عبادۃؓ سے روایت کی گئی ہے وہ بالکل صحیح و قوی ہے، کہ نماز بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی، لیکن اس کو خود راویان حدیث مذکور اور امام احمد وغیرہ نے بھی صرف امام و منفرد کے حق میں قرار دیا ہے۔ مقتدی کو اس حکم میں شامل نہیں کیا ہے کیونکہ حضرت جابرؓ سے مرفوعاً وموقوفاً ثابت ہوا کہ کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی مگر جو امام کے پیچھے ہو (موطا امام مالک ترمذی وطحاوی) پھر ایک اور حدیث صحیح سے بھی ثابت ہو کہ **من كان له امام فقرائة الامام له قرائة** کہ مقتدی کے لئے امام کی قراءت کافی ہے (مصنف ابن ابی شیبہ، موطا امام محمد، مسند احمد ابن منیع وغیرہ) اور جہری میں ممانعت کے لئے سورۂ اعراف کی آیت اور حدیث مسلم **اذا قرأ فانصتوا** موجود ہے۔

حضرت عبادۃؓ کی دوسری حدیث جس میں قراءۃ فاتحہ امام کے پیچھے بھی ثابت کی جاتی ہے، اس کو محمد بن اسحٰق نے روایت کیا ہے جو ضعیف ہے اور ابوداؤد میں مکحول وغیرہ سے روایت کی گئی ہے جو محمد بن اسحٰق سے بھی کم درجہ ہیں۔

(۲) **حدیث ابی ہریرۃؓ:** مسلم وغیرہ میں یہ حدیث ہے کہ نماز بغیر فاتحہ کے ناقص و نا تمام رہتی ہے، اول تو اس سے نماز کا ناقص ہونا ثابت ہے، باطل و کالعدم ہونا ثابت نہیں، اس کو ہم نے پہلے تفصیل سے لکھا ہے۔ دوسرے یہ بھی منفرد و امام کے لئے ہے، تیسرے اس روایت میں بھی ثقہ راویوں نے **الاصلوة خلف الامام** کی زیادتی نقل کی ہے

(۳) **حدیث جابر سے استدلال:** امام بخاری نے فرمایا کہ استماع و انصات کا حکم قراءت نماز و خطبہ دونوں کے لئے ہے اور جب صحیح حدیث فعلی و قولی سے خطبہ کے وقت نماز پڑھنے کا حکم ثابت ہوا تو اسی طرح امام کے پیچھے قراءت کے لیے بھی یہی حکم ہونا چاہئے، اس کا جواب بھی پہلے لکھا گیا ہے اور حضرت مولانا عبداللہ خاں صاحب نے اس کی سند میں بھی کلام نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوداؤد کی روایت میں جو زیادتی محمد بن جعفر غندر نے بطور حدیث قولی روایت کی ہے، وہ ان کا تفرد ہے، جس کی طرف امام ابوداؤد نے زاد کے لفظ سے اشارہ کیا۔ اور امام احمد نے تینوں اشخاص کی سند بیان کر کے غندر کے تفرد کا اظہار کیا ہے، (**قال محمد فی حدیثه ثم اقبل علی الناس**، مسند احمد) اس طرح دو راویوں کے مقابلہ میں یہ صرف ایک کی زیادتی ہے، اور غندر کے بارے میں حافظ ابن حجر نے لکھا کہ ان میں غفلت کی علت ہے (تقریب) دوسرا نقص یہ کہ غندر نے سعید بن ابی عروبہ سے روایت کی ہے جو مدلس ہیں اور انھوں نے عنعنہ کیا ہے جبکہ مدلس کا عنعنہ مقبول نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ کہ سعید مذکور کا حافظہ آخر عمر میں خراب ہو گیا تھا، اور محدث عبدالرحمٰن بن مہدی نے تصریح کر دی ہے کہ غندر نے سعید سے روایت اختلاط و خرابی حافظہ کے زمانہ میں کی ہے۔ چوتھے یہ کہ سعید ولید ابو بشر سے روایت کر رہے ہیں جبکہ یہ تصریح امام احمد ان

کوابو بشر سے سماع ہی حاصل نہیں ہے۔ مولانا عبداللہ خاں نے لکھا کہ اگر حضرت الاستاذ علامہ عثمانیؒ کو ان روایتی اسقام پر تنبہ ہوتا تو وہ فتح الملہم ص ۴۱۸/۲ میں غندر والی قولی حدیث کی تصویب نہ فرماتے (نماز بوقت خطبہ ص ۴۷)

درحقیقت اپنے موضوع پر مولانا موصوف نے روایتی حدیثی تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے، اسلئے رسالہ مذکورہ ہر عالم کے لئے قابل مطالعہ ہے، اسی طرح حضرت شاہ صاحبؒ کا رسالہ فصل الخطاب امام بخاریؒ وغیرہ کے جواب میں محققانہ محدثانہ نقطہ نظر سے شاہ کار کا درجہ رکھتا ہے، نیز مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے اعلاء السنن اور رسالہ فاتحہ میں اور مولانا سرفراز خاں صاحب صفدر دامت فیوضہم نے روایات موجبین و مانعین کا احصاء کر کے مدلل محدثانہ وناقدانہ کلام کیا ہے۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

(۴) اثر مجاہد: امام بخاریؒ نے جزء القراءۃ میں حضرت مجاہد کا اثر پیش کیا کہ اگر امام کے پیچھے قراءت نہ کی تو نماز لوٹائے گا اول تو امام نے اس کی کوئی سند پیش نہیں کی اور بغیر سند کے ایسے اہم معاملہ میں کسی روایت کی کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ خصوصاً کتاب اللہ کی ممانعت اور احادیث کے مقابلہ میں۔ پھر قراءت بھی مجمل ہے، اس سے فاتحہ کیونکر مراد ہوگی؟ اور خود حضرت مجاہد سے ہی مروی ہے کہ آیت **اذا قرئ القرآن فاستمعوا له** نماز کے بارے میں اتری ہے۔ (کتاب القراءۃ بیہقی ص ۷۳) اور یہ بھی وہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے قرأتہ فی الصلوٰۃ کی حالت میں کسی انصاری نوجوان کی قراءت سنی تو یہ آیت **واذا قرئ القرآن** اتری تھی۔ (کتاب القراءۃ ص ۷۲) اس طرح تفصیل سے شان نزول بتلانے کے بعد بھی حضرت مجاہد کیونکر نماز لوٹانے کو فرما سکتے تھے؟! دوسرے یہ کہ امام احمدؒ کا قول المغنی سے نقل کردہ مشہور ہے کہ مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے قراءت کا واجب نہ ہونا اجماعی مسئلہ ہے اور امام احمدؒ یہ بھی فرما چکے ہیں کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں قراءت نہ کرنے سے نماز صحیح نہ ہوگی، (لہٰذا اعادہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اور آپ کا یہ قول بھی پھر تازہ کر لیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ و تابعین اور اہل حجاز میں سے امام مالک، اہل عراق میں سے سفیان ثوری، اہل شام میں سے اوزاعی اور اہل مصر میں سے لیث بن سعد، ان میں سے کسی نے بھی نہیں کہا کہ امام کے پیچھے قراءت نہ کرنے سے نماز باطل ہوتی ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ امام احمدؒ کے نزدیک یا تو مجاہد اور عبداللہ بن زبیر کا مبینہ فتوے بہ سند صحیح ثابت نہ تھا، یا اس کا وہ مطلب صحیح نہیں جو امام بخاری اور دوسرے اہل حدیث نے سمجھا ہے۔

(۵) اثر قاسم بن محمدؒ: امام بخاریؒ نے ان سے نقل کیا کہ بڑے بڑے لوگ امامت کا درجہ رکھنے والے امام کے پیچھے قراءت کرتے تھے، یہ اثر اس لئے حجت نہیں کہ اس کی سند میں اسامہ ہیں، جن کو امام احمد نے لیس بشئی اور نسائی نے لیس بالقوی بتلایا۔ ابو حاتم نے کہا کہ ان سے استدلال درست نہیں، امام یحییٰ بن سعید نے ان کو ضعیف سمجھ کر بالآخر مطلقاً ترک کر دیا تھا، امام یحییٰ بن معین نے فرمایا کہ ان کی احادیث کا محدثین نے انکار کیا ہے۔

امام دارقطنی نے کہا کہ جب انھوں نے عطاء عن جابر یہ روایت مرفوعاً بیان کی کہ ایام منیٰ کے چاروں دنوں قربانی جائز ہے (غیر مقلدین کا عمل اسی پر ہے) تو امام یحییٰ بن سعید نے فرمایا کہ تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے اس کی حدیث بالکل ترک کر دی ہے۔ دارقطنی نے یہ بھی لکھا کہ اسی حدیث کی وجہ سے امام بخاری نے بھی اس کو ترک کر دیا تھا۔ (تہذیب ص ۱/۲۰۹) غالباً امام بخاریؒ نے صرف صحیح بخاری کی حد تک ان کو ترک کیا ہوگا کیونکہ باہر تو وہ ان کی سند لائے ہیں۔ ممکن ہے یہاں ہمارے سب کے خلاف محاذ مضبوط تر کرنے کے لئے اس ضعیف تر راوی سے ہی فائدہ اٹھانا چاہا ہو۔ والعلم عند اللہ

پھر اس روایت میں بھی قراءت مبہم ہے، اس لئے قراءت فاتحہ کے لئے استدلال درست نہ ہوا۔ اور خود قاسم بن محمد سے یہ اثر منقول ہے کہ وہ غیر جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے) موطأ امام مالکؒ) اور سری میں فاتحہ پڑھنے سے کوئی بھی نہیں روکتا۔

(۲) فانتہی الناس من کلام الزہری کا جواب:۔ امام بخاریؒ نے جزاء القراءۃ ص۱۳ میں نقد کیا کہ ''حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد کہ مجھ سے نماز کی قرائۃ میں کیوں منازعت کی جاتی ہے؟ سب لوگ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت سے رک گئے تھے''۔ یہ کلام زہری کا ہے یعنی حضرت ابوہریرہؓ صحابی کا قول نہیں ہے،۔ کیونکہ امام اوزاعی نے کہا کہ امام زہری نے یہ بھی کہا کہ حضور کے ارشاد مذکور کے بعد سب لوگوں نے نصیحت پکڑ لی اور اس کے بعد جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت ترک کر دی۔

سب سے پہلے تو گذارش ہے کہ امام بخاریؒ نے موطأ امام مالک اور ابوداؤد دونوں کی روایت کے خلاف **فقال رجل نعم** کی جگہ **فقلنا نعم** نقل کیا ہے، اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے پیچھے قراءت کرنے والے بہت سے افراد تھے، حالانکہ وہ صرف ایک ہی شخص تھا، اور دوسرے سارے صحابہؓ نے قرائۃ نہیں کی تھی، چنانچہ حدیث مذکور سے محدثین نے چند فوائد اخذ کئے تھے (۱) جو لوگ حضور علیہ السلام کے پیچھے قراءت کرتے تھے، وہ آپ کے امر سے نہ کرتے تھے، اور نہ آپ کو اس کا علم تھا، ورنہ آپ کو اس سوال کی ضرورت نہ ہوتی کہ کیا کسی نے اس وقت میرے پیچھے قراءت کی ہے؟ (۲) سب صحابہ آپ کے پیچھے قراءت نہ کرتے تھے، کیونکہ حضور کے دریافت فرمانے پر صرف ایک شخص نہ بولتا، بلکہ دوسرے بھی کہتے کہ ہم نے قراءت کی ہے (مگر امام بخاریؒ نے **قلنا نعم** کی روایت کر کے اس فائدہ کو مشکوک کر دیا ہے،) (۳) حضور علیہ السلام نے اس ایک شخص کی قراءت کو بھی پسند نہ فرمایا، اور آپ کی نکیر کے بعد سب ہی لوگ جہری میں قراءت خلف الامام سے رک گئے، اس کے بعد صحابہ کرام سری نمازوں میں بھی رک گئے ہوں گے، کیونکہ ایک روایت عبداللہ بن شداد سے اس طرح آئی ہے کہ ایک شخص نے عصر کی نماز میں حضور کے پیچھے قراءت کی، اور اس کو قریب والے صحابی نے اشارہ سے روکا، نماز کے بعد اس نے کہا کہ تو نے مجھے کیوں دبایا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ تیرے آگے تھے تو میں نے اس کو مکروہ سمجھا کہ تو حضور کے پیچھے قراءت کرے، ان دونوں کی گفتگو سن کر حضور علیہ السلام نے فرمایا، کہ امام کی قراءت مقتدی کے لئے بھی ہے۔ یہ روایت مسند احمد بن منیع میں ہے اس کی سند شرط شیخین کے موافق ہے۔ اور کتاب الآثار امام محمدؒ میں بھی یہ روایت مفصلاً موجود ہے۔

غرض ایک بات تو یہی تحقیق طلب ہے کہ **فقال رجل نعم اصح یافقلنا نعم**، واللہ تعالیٰ اعلم، اس کے بعد امام بخاری کا دوسرا نقد ہے کہ لوگوں کے قراءت سے رک جانے کی بات صحابی سے نہیں بلکہ تابعی زہری سے ہے۔

افادۂ انور: ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فصل الخطاب ص۳۳ میں مستقل فصل میں اس کا محدثانہ جواب دیا ہے، آپ نے فرمایا کہ یہ حدیث ابن اکیمہ لیثی والی ان احادیث صحیحہ میں سے ہے جن سے ترک قراءۃ فی الجہر یہ کا ثبوت ہوتا ہے، اس حدیث کی تصحیح ابو حاتم اور دوسروں نے بھی کی ہے، البتہ بعض ان حضرات نے تصحیح سے پہلوتہی کی ہے جو قراءت خلف الامام کو اختیار کر چکے ہیں اور ان کی فقہی رائے حدیث نبوی تک سرایت کر گئی ہے۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ امام بخاریؒ نے جزاء القراءۃ میں اعتراف کیا کہ حضور کی تنبیہ کے بعد لوگ غیر جہری نمازوں میں امام کے پیچھے دل دل میں پڑھنے لگے تھے، لہٰذا معلوم ہوا کہ مقابلہ جہری وسری نماز میں تھا یہ بات نہ تھی کہ حضور نے زور سے قراءت کرنے کو روکا تھا، لہٰذا پھر لوگ آہستہ پڑھنے لگے تھے، اور نہ یہ بات تھی کہ وہ فاتحہ کے علاوہ اور قراءت کرنے سے رکے تھے (وغیرہ تاویلات بعیدہ جو غیر مقلدین کرتے ہیں)

پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ ایک بات اس حدیث کے اثر کو کم کرنے کے لئے یہ بھی کہی گئی ہے کہ **فانتہی الناس** زہری (تابعی) کا کلام ہے، صحابی (ابوہریرہؓ) کا نہیں ہے، حالانکہ ابوداؤد میں معمر سے بہ صراحت منقول ہے کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے اور نیچے کے راوی کا مقصد یہ ہے کہ زہری نے حضرت ابوہریرہؓ سے یہ بات نقل کی ہے۔

حضرتؒ نے اس بات کو اچھی طرح مدلل کیا ہے۔ بحث دقیق ہے مطالعہ کر لی جائے۔ اوجز ص۲۴۹/۱۱ اور بذل ص۵۷/۲ میں بھی

محققانہ بحث ہے، امام بخاری نے امام اوزاعی کی نقل عن الزہری سے فائدہ اٹھانے کی سعی کی ہے، حالانکہ سارے محدثین جانتے ہیں کہ انھوں نے امام زہری سے جتنی روایات کی ہیں وہ سب کمزور ہیں۔ اور معمر جتنی روایات زہری سے کرتے ہیں وہ سب قوی ہیں۔

یحییٰ وابن عبدالبر کا نقد

امام بخاری یحییٰ بن معین کو امام نقد رجال مانتے ہیں، اور یحییٰ نے کہا کہ اوزاعی زہری کے بارے میں لیس بذاک ہیں، یعنی قوی نہیں (تہذیب ص ۲۴۱/۶) علامہ ابن عبدالبرؒ نے لکھا کہ امام اوزاعی کی امام زہری اور یحییٰ بن ابی کثیر سے جملہ روایات ضعیف و کمزور ہیں (کتاب العلم ص ۲۰۱) ان کے مقابلہ میں معمر اثبت الناس فی الزہری ہیں۔ لیکن ان کو امام بخاریؒ نے یہاں نظرانداز کرنا ہی بہتر خیال کیا ہوگا۔

احسن الکلام ص ۱۴۱/ ا میں یہ بھی لکھا ہے کہ امام بخاری نے جو امام اوزاعی کی طرف بات منسوب کی ہے، اس کی سند میں حسن بن صالح ہیں، جن کو امام نسائی نے لیس بالقوی (ضعیف) قرار دیا ہے۔ (میزان ص ۲۳۳/۱) اس کے بعد علامہ ابن تیمیہ کی تحقیق ملاحظہ ہو۔

علامہ ابن تیمیہ کا فیصلہ

اگر بالفرض فانتھی الناس الخ کو امام زہری کا مدرج ہی تسلیم کالیا جائے، تب بھی یہ اس بات کی ایک بہت بڑی وزنی دلیل ہوگی کہ امام کے پیچھے قراءت کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام زہریؒ اپنے وقت میں سنت وحدیث (اور سیر ومغازی واخبار زمانہ رسالت) کے بہت بڑے عالم اور امام تھے، قرائۃ کرنا ضروری ہوتا تو یہ مسئلہ امام زہری سے کیسے مخفی رہ سکتا تھا؟! لہٰذا جب امام زہری یہ فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں لوگوں نے قراءت ترک کردی تھی تو یہ اس بات کی کھلی اور معقول دلیل ہے کہ صحابہ وتابعین امام کے پیچھے قراءت نہیں کیا کرتے تھے، اور اسی پر امام موصوف نے ان کو عامل پایا تھا۔ (فتاویٰ ص ۱۴۵/۲)۔

حدیث بلا زیادۃ زہری بھی حجت ہے

صاحب احسن الکلام نے علامہ ابن تیمیہؒ کی عبارت نقل کر کے آخر میں لکھا:۔ فریق مقابل یہ بات اگر ہم تسلیم بھی کرلیں کہ وہ جملہ امام زہری کا مدرج ہے اور روایت مالی انازع القرآن پر ہی ختم ہوجاتی ہے (جیسا کہ امام لیث بن سعد وغیرہ کی روایت یہیں ختم ہوجاتی ہے) تب بھی یہ حدیث جمہور ہی کی دلیل ہے کیونکہ آں حضرت ﷺ کے پیچھے قراءت کرنے والا صرف ایک ہی شخص تھا، اور اس کو بھی آپ نے گوارہ نہ فرمایا، پہلے تو نماز سے فارغ ہوتے ہی فوراً سوال فرمایا کہ کس نے قراءت کی ہے؟ پھر اس شخص کے اقرار کرنے کے بعد "مالی انازع القرآن" کے جملہ سے اس کی قراءت پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی فرمایا، اس لئے اگر سرے سے جملہ فانتھی الناس نہ بھی ہو تو کیا تنبیہ مذکور کے بعد بھی صحابۂ کرامؓ سے یہ توقع ہوسکتی تھی کہ وہ پھر بھی حضور ﷺ کے پیچھے قرائۃ کرتے رہتے، لہٰذا ظاہر ہے کہ جملہ مذکورہ ہو یا نہ ہو بہرصورت نتیجہ وہی صحیح ہوکر سامنے آتا ہے کہ پھر کسی نے بھی امام کے پیچھے قراءت نہ کی ہوگی۔ وہو المقصود (احسن الکلام ۱۴۲/۱)

دلائل تارکین قراءت خلف الامام ایک نظر میں

(۱) قال تعالےٰ جل ذکرہ:۔ واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا" (اعراف) جمہور اکابر امت کا فیصلہ ہے کہ یہ آیت قراءت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ امام کی قرائۃ کے وقت مقتدیوں کا وظیفہ صرف استماع (کان لگا کر سننا) اور انصات (خاموشی) ہے۔

(۲) حدیث سنن (بروایت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) انما جعل الامام لیؤتم بہ الخ کہ امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔ اس حدیث کو اصحاب السنن نے روایت کیا اور امام مسلم نے اس کی تصحیح کی ہے۔

(۳) حدیث بخاری وبیہقی وغیرہ کہ حضرت ابوبکرہ صحابی مسجد نبوی میں پہنچے تو دیکھا کہ حضور علیہ السلام رکوع میں جا چکے تھے انہوں نے جلدی سے صف میں پہنچنے سے قبل ہی رکوع کر لیا تا کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ رکوع پالیں، اور اس طرح آگے بڑھ کر جماعت میں شرکت کر لی۔ حضور علیہ السلام نے کیفیت معلوم کر کے فرمایا کہ تمہاری دینی حرص اور زیادہ ہو مگر آئندہ اس طرح نہ کرنا۔

حضور علیہ السلام نے ان کے رکوع میں شامل ہو جانے کو رکعت ملنے کے لئے کافی سمجھا اور رکعت لوٹانے کا حکم نہیں فرمایا اور ابوبکرہ نے فاتحہ وغیرہ بھی نہ پڑھی تھی، پھر بھی ان کی رکعت صحیح ہو گئی، اس سے سارے اکابر امت نے یہ بھی سمجھا کہ رکوع میں ملنے سے رکعت مل جاتی ہے، مگر امام بخاری نے ساری امت سے الگ ہو کر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ رکوع میں ملنے سے رکعت نہ ملے گی کیونکہ اس کا قیام اور قراءت رہ گئی ہے۔ حضرت ابوبکرہ آخر میں اسلام لائے تھے۔ اس لئے یہ حضور علیہ السلام کا آخری فیصلہ ہے۔

لمحہ فکریہ: امام بخاری نے بخاری ص۱۰۳۸ کتاب الحیل میں باب الہبۃ کے ایک مسئلہ پر لکھا کہ اس میں بعض الناس (امام ابوحنیفہؒ) نے رسول اکرم ﷺ کے فیصلہ کے خلاف رائے قائم کی ہے، اسی صفحہ پر حاشیہ میں اس طعن کا پورا جواب تحقیق والزامی درج ہے، اور ہم بھی انوار الباری میں اس کے موقع پر لکھیں گے، لیکن یہاں کیا صورت ہے وہ ابھی دیکھ لی جائے (۴) حضور علیہ السلام نے جو آخری نماز پڑھی ہے اور حضرت ابوبکرؓ سورۃ فاتحہ پڑھ کر اگلی سورۃ پڑھ رہے تھے، کہ آپ نے تشریف لا کر امامت فرمائی اور اسی جگہ سے قراءت فرمائی، جہاں تک حضرت ابوبکر پڑھ چکے تھے، یہ حدیث تمام کتب حدیث میں ہے، اس میں خود آپ نے بھی فاتحہ نہیں پڑھی، اور بغیر فاتحہ کے آپ کی رکعت کیسے صحیح ہو گئی، بتایا جائے!! جبکہ امام بخاری اور غیر مقلدوں کا اصرار ہے کہ بغیر فاتحہ کے کوئی رکعت نہیں ہوتی اور جس نماز میں فاتحہ نہ ہو وہ باطل اور کالعدم ہے۔

(۵) حدیث مشہور من کان له امام الخ کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قراءت کی ضرورت نہیں کیونکہ امام کی قراءت اس کے لئے بھی ہے۔ یہ حدیث مختلف طرق سے ثابت وصحیح ہے، موطا امام محمد، مسند احمد بن منیع، مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ سنن کبری بیہقی، ......، کتاب القراءۃ بیہقی، الجوہر النقی میں درج ہے۔ رجال کی ابحاث مطولات میں ہیں۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بحث وتحقیق کے درمیان ص۹۷ فصل الخطاب میں حافظ ابن تیمیہؒ کا حسب ذیل ارشاد نقل کیا:۔ فتاوی ابن تیمیہ میں ہے ''کہ اگر حدیث ''من کان له امام'' مرسل بھی ہے، تو یہ ایسی مرسل ہے جس کی تائید ظاہر قرآن وسنت سے ہو رہی ہے، اور اس کے قائل جماہیر اہل علم صحابہ وتابعین بھی ہیں۔ پھر یہ کہ اس حدیث کا ارسال کرنے والا اکابر تابعین میں سے ہے، اور ایسی مرسل ائمہ اربعہ وغیرہم کے نزدیک بالاتفاق حجت ہوتی ہے''۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید افادہ کیا کہ حافظ ابن تیمیہ نے اپنے فتاوی میں یہ بھی لکھا ہے کہ امام احمدؒ کا مذہب مشہور سری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے صرف استحباب قراءت ہے، وجوب نہیں ہے۔

امام بخاریؒ وغیر مقلدین کا موقف؟

جبکہ امام بخاری وابن حزم اور اس زمانہ کے غیر مقلدین جہری وسری سب ہی نمازوں میں امام کے پیچھے وجوب فاتحہ کے لئے مصر ہیں، اور دعوے کرتے ہیں کہ بغیر اس کے نماز باطل اور کالعدم ہوتی ہے پھر یہ کہ ہمارے زمانہ کے غیر مقلدین جو ہندوستان و پاکستان میں حنفیہ کی نمازوں کو باطل بتلاتے ہیں، ان کو یہ بھی تو کہنا چاہیئے کہ ساری دنیا کے متبعین ائمہ اربعہ کی ہی نمازیں باطل ہیں، اور خاص طور سے سعودی عرب اور حرمین شریفین کے لوگوں کی بھی، کہ نجد والے تو زیادہ تر امام احمد وابن تیمیہ وابن قیم کے متبع ہیں، اور یہ غیر مقلدین اپنے کو ان سے مسلک ومشرب میں قریب تر بتلا کر لاکھوں روپے کی سالانہ امدادیں بھی حاصل کرتے ہیں۔

(۶) حدیث موطا امام مالکؒ وترمذی شریف من صلے رکعة الخ کہ جو کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے پڑھی جائے وہ درست نہ ہو گی۔ البتہ امام کے پیچھے صحیح ہو گی۔

(۷) موطا امام مالک و دار قطنی وغیرہ میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے جب سوال کیا جاتا کہ کیا امام کے پیچھے قراءت کی جائے؟ تو فرمایا کرتے تھے کہ امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کو امام کی قراءت کافی ہے۔ لیکن الگ پڑھے تو قراءت کرے۔ اور خود حضرت ابن عمرؓ بھی امام کے پیچھے قراءت نہ کرتے تھے۔ جس کا اعتراف امام بخاری کو بھی ہے۔

(۸) حدیث صحاح و سنن، قسمت الصلوٰۃ الخ سے بھی ثابت ہے کہ نماز کی حقیقت فاتحہ و قراءت سورۃ ہے اور اس کو پیش کرنے کا حق جماعت کی نماز میں صرف امام کو ہے۔ مقتدی خاموش ہو کر دربار خداوندی کی معروضات کو سنیں گے۔ اس کے بارے میں پوری تحقیق ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے رسالہ میں قابل دید ہے۔ اس کے ساتھ امام اعظمؒ کا مشہور واقعہ بھی تائید میں ہے کہ چند آدمی آپ کی خدمت میں قراءت خلف الامام ہی کے مسئلہ میں بحث و مناظرہ کے لئے پہنچے تھے تو امام صاحب نے فرمایا کہ تم میں سے ایک وکیل ہو کر مجھ سے کلام کرے، انھوں نے ایک کو وکیل بنالیا تو آپ نے فرمایا کہ زیر بحث مسئلہ تو حل ہو گیا، اس نے کہا کس طرح پر؟ آپ نے فرمایا کہ جس طرح تم سب کی طرف سے کلام کے لئے مقرر ہوئے ہو، اسی طرح امام صلوٰۃ بھی سب مقتدیوں کی طرف سے دربار خداوندی میں عرض و معروض کے لئے پیش ہوتا ہے، اور اس کا کلام و قراءت سب کی طرف سے کافی ہوتی ہے۔ اس پر وہ سب لوگ لاجواب ہو کر واپس ہوئے۔

(۹) حدیث ترمذی، ابوداؤد و ابن ماجہ وغیرہ "الامام ضامن و المؤذن موتمن" (امام ضامن و کفیل ہے اور مؤذن امانت دار ہے) سب جانتے ہیں کہ کسی کا ضامن و کفیل جب اس کی طرف سے قرضہ ادا کر دیتا ہے تو قرض دار سبکدوش ہو جاتا ہے، اسی طرح امام صلوٰۃ بھی مقتدیوں کی طرف سے قراءت کا فرض ادا کر کے سب کو سبکدوش کر دیتا ہے، یہی حدیث کا منشاء ہے۔

(۱۰) حدیث ابی داؤد وغیرہ فانتھی الناس عن القرائة والی جس پر امام بخاری کا اعتراض و جواب بھی اوپر گذرا ہے (۱۱) حدیث بخاری (عن ابن عباسؓ) کہ وہ حضور علیہ السلام کی نماز جماعت کے سامنے سے اونٹنی پر سوار گذر گئے، اور کسی نے ان پر نکیر نہیں کی، امام بخاریؒ نے اس حدیث پر عنوان و ترجمۃ الباب باندھا کہ امام کا سترہ مقتدیوں کے لئے کافی ہے۔ علامہ عینی نے لکھا کہ ابن بطال اور ابو عمرؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اسی طرح قراءت کا مسئلہ بھی ہے)

حافظ ابن القیم کا ارشاد

حافظ ابن القیمؒ نے کتاب الروح ص ۱۶۶ میں لکھا:۔ امام کی قراءت مقتدیوں کی قراءۃ ہے اور امام کا سترہ مقتدیوں کا سترہ ہے، اور مسئلہ قراءۃ خلف الامام کی تحقیق کے سلسلہ میں مزید لکھا کہ آں حضرت ﷺ نے مقتدیوں پر سے سجدہ سہو ساقط کر دیا ہے بایں طور کہ امام کے پیچھے مقتدی کی بھول سے اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا، یعنی جب امام کی نماز صحیح ہو گئی تو مقتدیوں کی بھی صحیح ہو گئی، اسی طرح آں حضرت ﷺ نے مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا بھی ساقط کر دیا ہے کیونکہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے (......) ہم نے آثار صحابہ و تابعین کا ذکر بخوف طوالت ترک کر دیا ہے۔

نطق انور: آخر میں ہم حضرت شاہ صاحبؒ کے چند کلمات آخری درس بخاری شریف کے (مورخہ ۱۸۔ جون ۱۹۳۲ء) نقل کر کے بحث کو ختم کرتے ہیں۔

فرمایا:۔ "میں اپنے رسالہ میں اول تو جواز فاتحہ سری میں بتلایا ہے حدیث کی روشنی میں۔ پھر یہ بتلایا ہے کہ نامرضی ہے جو برغبت خاطر عاطر نہیں ہے حضور علیہ السلام سے، لیکن اس درجہ کی بھی نہیں ہے کہ اس کے پیچھے پڑ جائیں جو قرائۃ کرے سری میں۔" پھر فرمایا:۔ "جہری میں دو چار ہی صحابہ سے قرائۃِ فاتحہ خلف الامام منقول ہے، اور سری میں ۲۰۔۳۰ صحابہ سے منقول ہے، اس لئے میں اس میں نرم ہو گیا ہوں"۔

یہ حضرتؒ کے بعینہ الفاظ ہیں جو درس کے وقت احقر نے قلمبند کئے تھے۔ چونکہ حضرتؒ کی تحقیق علوم سلف و خلف کے پورے مطالعہ کے بعد ہوتی تھی، اس لئے آپ کے ایک ایک لفظ کی قدر ہوتی تھی۔ اور بقول حضرت تھانوی قدس سرہ آپ کے ایک ایک جملہ پر ایک رسالہ

لکھا جا سکتا ہے۔

ہم نے قرائۃ فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ پر کافی طویل بحث درج کر دی ہے، صرف اس لئے کہ ایک صحیح مسلک کی تشریح وتحقیق بطور نمونہ کے سامنے آ جائے۔ اور اس لئے کہ مقابل میں امام بخاری تھے ورنہ ہر جگہ اور ہر مسئلہ کی شرح وتحقیق کرنے سے بوجہ خوف طوالت معذوری ہے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

باب القرآءة فی الظهر

نمازِ ظہر میں قراءت کا بیان

۷۱۹: حدثنا ابو النعمان قال حدثنا ابو عوانه عن عبدالملک بن عمیر عن جابر بن سمرة قال سعد کنت اصلی بهم صلوٰة رسول الله صلے الله علیه وسلم صلوٰتی العشی لآ اخرم عنها کنت ارکد فی الاولیین واحذف فی الاخریین فقال عمر ذٰلک الظن بک

۷۲۰: حدثنا ابو نعیم قال حدثنا شیبان عن یحییٰ عن عبدالله بن ابی قتادة عن ابیه قال کان النبی صلے الله علیه وسلم یقرأ فی الرکعتین الاولین من صلوٰة الظهر لفاتحة الکتاب وسورتین یطول فی الاولیٰ ویقصر فی الثانیة ویسمع الأیة احیاناً و کان یقرأ فی العصر بفاتحة الکتاب وسورتین و کان یطول فی الاولیٰ و کان یطول فی الرکعة الاولیٰ من صلوٰة الصبح ویقصر فی الثانیة

۷۲۱: حدثنا عمر بن حفص حدثنا ابی قال حدثنا الاعمش قال حدثنی عمارة عن ابی معمر قال سالنا خباباً اکان النبی صلے الله علیه وسلم یقرأ فی الظهر والعصر قال نعم قلنا بای شیٔ کنتم تعرفون قال باضطراب لحیته

ترجمہ۷۱۹: حضرت جابر بن سمرہ روایت کرتے ہیں، کہ سعد نے (حضرت عمرؓ سے بجواب اپنی شکایت کے) کہا، کہ میں کوفہ والوں کو (بعد دوپہر) شام کی دونوں نمازیں (ظہر وعصر) رسولِ خدا ﷺ کی نماز مثل پڑھاتا تھا، ان میں کسی قسم کا کوئی نقصان نہ کرتا تھا، میں پہلی دو رکعتوں میں دیر لگاتا، اور پچھلی دو رکعتوں میں تخفیف کرتا تھا۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ تمہاری طرف میرا بھی یہی خیال ہے۔

ترجمہ۷۲۰: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ نمازِ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور (کوئی اور) دو سورتیں پڑھتے تھے، پہلی رکعت میں بڑی سورت پڑھتے تھے، اور نمازِ صبح کی پہلی رکعت میں (بھی) بڑی سورت پڑھتے تھے اور دوسری رکعت میں (اس سے) چھوٹی سورت پڑھتے تھے۔

ترجمہ۷۲۱: حضرت ابومعمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے خباب سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ ظہر اور عصر (کی نماز) میں قرآن پڑھتے تھے، انہوں نے کہا، ہاں، ہم نے کہا، کہ تم کس طرح پہچان لیتے تھے، وہ بولے، کہ آپ کی داڑھی کی جنبش کی وجہ سے۔

تشریح: علامہ عینی نے لکھا کہ اس باب کی پہلی حدیث تو وہی ہے جو باب وجوب القرائۃ کے تحت آ چکی ہے، اور امام بخاری کا مقصد اس باب سے بھی یہ تھا کہ قرائۃ کی رکنیت وفرضیت نہ صرف منفرد وامام کے لئے بلکہ مقتدی کے لئے بھی ثابت کر دی جائے، حالانکہ ہم نے وہاں بھی (ص ۳۱۵۷ میں) بتلایا تھا کہ امام بخاری کی بات منفرد وامام کے لئے سب کو تسلیم ہے لیکن مقتدی کے لئے صحیح نہیں، اور نہ احادیث

الباب سے اس کا ثبوت ہوسکتا ہے۔

یہاں بھی وہی بات ہے کہ امام بخاری ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی نماز کا حوالہ دے کر حضرت سعدؓ یہاں بھی وہی پہلی بات کہہ رہے ہیں مگر ان تینوں احادیث الباب سے بھی صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام چاروں رکعت میں قرائۃ کرتے تھے لیکن یہ بات کہ وہ قرائۃ بطور رکن وفرض کے تھی محلِ نظر ہے، اگر یہ کہا جائے کہ جب حضور علیہ السلام ہمیشہ ہی قرائۃ چاروں رکعت میں کرتے تھے، تو یہ صورت بظاہر رکن وفرض ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے امام بخاری کا استدلال درست ہوجانا چاہئے، تو اس سے استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ حضور علیہ السلام سے مداومتِ عمل بہت سی سنن پر بھی ثابت ہے۔ مثلاً اذان واقامت وغیرہ کہ برابر حضور علیہ السلام کی نماز جماعت میں ان کا اہتمام ہوتا رہا ہے، لہٰذا دوامِ عمل وجوب وفرضیت یا رکنیت کے لئے دلیل وحجت نہیں بن سکتا، حضرت گنگوہیؒ نے یہ بھی لکھا کہ رکنیت کا ثبوت تو جب ہوسکتا ہے کہ چار رکعت میں سے مثلاً کسی ایک میں بھی قرائۃ رہ جائے تو نماز فاسد ہو۔ (عمدہ ولامع ص ۱\۲۹۶)

امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ جزء القرائۃ ص ۳۰ میں بھی مستقل **باب القرائة فى الظهر فى الاربع كلها** قائم کیا ہے، اور یہاں بخاری میں بھی ظہر کے بعد عصر ومغرب کی نمازوں کے لئے باب لا رہے ہیں، اور ان تمام روایت کو پیش کر کے یہی تاثر دینا چاہتے ہیں کہ فرضوں کی ہر رکعت میں قرائۃ فرض ورکن ہونی چاہئے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام ہمیشہ پڑھتے تھے، حالانکہ ان کا مقصد اس طرح حاصل نہیں ہوسکتا۔

مذاہب کی تفصیل: حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ امام زفر وحسن فرائض کی ہر رکعت میں قرأت کو فرض بتلاتے ہیں، حنفیہ دو رکعت میں۔ امام مالک تین میں اور امام شافعی چاروں میں فرض کہتے ہیں۔ حاشیۂ لامع میں یہ بھی ہے کہ امام مالکؒ سے متعدد روایات ہیں اور مشہور یہ ہے کہ ہر رکعت میں واجب ہے مگر کسی رکعت میں سہواً رہ جائے تو نماز صحیح ہوجائیگی سجدۂ سہو کرنا ہوگا کما فی الباجی۔ (لامع ص ۱\۲۹۶)۔

علامہ عینیؒ نے لکھا:۔ ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ **مصلی مامور بالقرائة** ہے بقولہ تعالیٰ **فقرؤا ما تیسر منه** اور امر مقتضی تکرار نہیں ہوتا لہٰذا پہلی رکعت اداءِ فرض کے لئے متعین ہوگی، اور دوسری رکعت میں پہلی کی مشاکلت من کل وجہ کے سبب سے قرائۃ ضروری قرار دی گئی ہے۔

علامہ نے مزید لکھا کہ کچھ حضرات نے تو نماز میں قرائۃ کو صرف استحباب ہی کا درجہ دیا ہے، جن میں احمر، اصم، ابن علی وحسن ہیں۔ اور امام مالکؒ سے بھی ایک شاذ روایت ہے کہ نماز بغیر قرائۃ کے صحیح ہوجائے گی، ابن ماجشون نے کہا کہ جس سے صبح کی یا اور کسی وقت کی نماز کی ایک رکعت میں قرائۃ رہ جائے تو نماز سجدہ سہو کرنے سے درست ہوجائے گی۔

امام بیہقیؒ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کی کہ نماز میں قرائۃ سنت ہے، امام شافعی کا قدیم قول یہ تھا کہ اگر بھول سے رہ جائے تو نماز درست ہوگی، مصنف میں بھی ہے کہ حضرت علی وابن مسعودؓ نے فرمایا:۔ پہلی دو رکعت میں قرائۃ کرو اور دوسری دو میں تسبیح۔ (یہ بات حضرت عائشہؓ سے بھی نقل ہوئی ہے) اسود، ابراہیم وثوریؒ سے بھی نقل ہوا کہ آخری دو رکعتوں میں تسبیح تحمید وتکبیر کافی ہے اور افضل قرائۃ ہی ہے۔ (عمدہ ص ۳\۶۲)

افادۂ انور: حضرتؒ نے فرمایا:۔ امام بخاریؒ کو چونکہ کوئی دلیل فاتحہ وسورت کے احکام میں فرق کرنے کے لئے نہیں ملی، تو باب سابق کی طرح یہاں بھی باب کے عنوان میں صرف قرائۃ کا لفظ لائے ہیں، جس میں فاتحہ اور دوسری سورتیں برابر ہیں، پھر فرمایا کہ پہلی اور تیسری حدیث الباب میں تو فاتحہ کا ذکر بھی نہیں ہے۔ تو کیا رکن کی شان یہی ہے کہ امام بخاری بغیر اس کے ذکر وصراحت کے ہی رکن ثابت کردیں گے؟! پھر یہ کہ اضطرابِ لحیہ سے تو قرائۃ بھی ثابت نہیں ہوتی، ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام تسبیح وتحمید فرماتے ہوں گے، لہٰذا ایسے الفاظ سے بھی مدعا ثابت نہیں ہوتا، نہ اس سے کوئی خاص فائدہ؟! اس سے استدلال ہوسکتا تو بڑے طمطراق دکھائے جاتے۔ البتہ ان امور کا فیصلہ تعامل وتوارث سے ہوتا ہے اور ہوا ہے، اور چونکہ اس کے ذریعہ سب ہی کو تسلیم ہے کہ قرائۃ ہوتی تھی، اس لئے اضطراب والی بات پر کوئی بحث ونظر یا قیل وقال کا بھی موقع نہ ہوا۔

غرض الفاظِ رواۃ پر تکیہ کر کے بحثیں اٹھانے سے بہتر یہی ہے کہ فیصلہ کی بات تعامل پر ہی رکھی جائے۔ (حنفیہ کا خاص طریقۂ اثبات بھی یہی ہے کہ کتاب وسنت کے بعد آثار صحابہ وتابعین اور ان کے تعامل پر نظر کرتے ہیں) حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ بات بڑے عجائب میں سے ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف عدمِ قرأۃ فی العصرین منسوب کردی گئی۔ قولہ یطول فی الاولی پر فرمایا: شیخین (امام ابوحنیفہ وامام ابو یوسفؒ) کا مذہب یہ ہے کہ سواء فجر کے سب نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں قرأۃ برابر ہو کہ استحقاقِ قرأۃ میں وہ برابر ہیں (فجر میں اس لئے پہلی رکعت میں قرأۃ زیادہ کرنا بہتر ہے کہ نیند وغفلت کا وقت ہے جتنے زیادہ لوگ جماعت میں شرکت کرسکیں اچھا ہے) امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ پہلی رکعت میں قرأۃ سب ہی نمازوں میں زیادہ ہو تو بہتر ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام سے نقل ہوا کہ آپ سب ہی نمازوں کی پہلی رکعت کو طویل کرتے تھے۔ شیخین کہتے ہیں کہ وہ طوالت بوجہ ثنا تھی، قرأۃ کی وجہ سے نہ تھی۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک امام محمدؒ ہی کے مسلک کو ترجیح ہے کیونکہ ابوداؤد میں احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام صبح اور ظہر وعصر کی بھی پہلی رکعت میں طوالت اختیار کرتے تھے جب تک کہ لوگوں کی آواز آتی رہتی تھی۔ اور حضرت ابوقتادہ نے فرمایا کہ ہم سمجھتے تھے کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو پہلی رکعت مل جائے۔ (بذل المجہود ص ۲\۱۴۳) اس لئے اب بھی اگر لوگوں کے پہلی رکعت میں ملنے کی توقع ہو تو حدیث کے مطابق پہلی رکعت کو طویل کرنا بہتر ہے۔

باب القرآءۃ فی العصر

نماز عصر میں راءت کا بیان

۷۲۲: حدثنا محمد بن یوسف قال حدثنا سفیان عن الاعمش عن عمارۃ بن عمیر عن ابی معمر قلت لخباب بن الارت اکان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الظھر والعصر قال نعم قلت بای شی کنتم تعلمون قرآءتہ قال باضطراب لحیتہ

۷۲۳: حدثنا المکی بن ابراھیم عن ھشام عن یحیی بن ابی کثیر عن عبداللہ بن ابی قتادۃ عن ابیہ قال کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الرکعتین من الظھر والعصر بفاتحۃ الکتاب سورۃ سورۃ ویسمعنا الآیۃ احیاناً

ترجمہ ۷۲۲:۔ حضرت ابو معمرؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خباب بن ارت سے کہا کہ کیا نبی ﷺ ظہر اور عصر (کی نماز) میں قرآن مجید پڑھتے تھے، وہ بولے، کہ ہاں، میں نے کہا، کہ تم کس طرح آپ کا کا پڑھنا معلوم کر لیتے تھے، وہ بولے، کہ آپ کی داڑھی کی جنبش سے۔

ترجمہ ۷۲۳:۔ حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ ظہر اور عصر کی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور کوئی ایک ایک دوسری سورت پڑھتے تھے، ور کبھی کبھی کوئی آیت ہمیں سنائی دی جاتی تھی۔

تشریح: یہ دونوں احادیث الباب پہلے باب میں بھی آچکی ہیں اور ظہر وعصر دونوں کے احکام یکساں ہیں۔ اس لئے مزید تشریح یا بحث کی ضرورت نہیں۔

قولہ ویسمعنا احیانا پر حضرتؒ نے فرمایا کہ ہمارے مشائخ حنفیہ کے اس بارے میں متعدد اقوال ہیں کہ اگر کوئی سری نماز میں جہر کرلے تو سجدۂ سہو کتنی قرأۃ کرنے پر جواب ہوگا، ایک کلمہ کی قرأۃ سے) ایک پوری آیت سے اور کہا گیا کہ ایک سے زیادہ آیت پڑھنے پر واجب ہوگا۔ میرا مختار دوسرا قول ہے۔

پھر یہ کہ حضور علیہ السلام کا سری نمازوں میں کبھی کبھی جہر کے ساتھ کسی آیت کا سنانا تعلیمِ قرأۃ کے لئے تھا، تعلیم جہر کے لئے نہیں تھا

جیسا کہ ظاہر ہے، اور ہمارے نزدیک تسمیہ کا جہر بھی تعلیم ہی کے لئے تھا، لہٰذا وہ بھی سنت نہ ہوگا اور سری میں کسی آیت کا جہر سامنے سے گذرنے والے کو روکنے کے لئے بھی بہتر سمجھا گیا ہے۔

باب القرآءة فی المغرب

مغرب (کی نماز) میں قرآن پڑھنے کا بیان

۷۲۴: حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابن شهاب عن عبیدالله بن عبدالله بن عتبة عن ابن عباس انه قال ان ام الفضل سمعته وهو یقراء والمرسلات عرفاً فقالت یابنی لقد ذکرتنی بقرآءتک هذه السورة انها لآخرما سمعت من رسول الله صلے الله علیه وسلم یقرأبها فی المغرب

۷۲۵: حدثنا ابوعاصم عن ابن جریج عن ابن ابی ملیکة عن عروة بن الزبیر عن مروان بن الحکم قال قال بی زید بن ثابت مالک تقرأ فی المغرب بقصار وقدسمعت النبی صلے الله علیه وسلم یقرأ بطولی الطولیین

ترجمہ۷۲۴:۔ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ (میری والدہ) ام فضل نے (ایک مرتبہ نماز میں) مجھے **والمرسلات عرفاً** پڑھتے سنا تو کہنے لگیں، کہ اے میرے بیٹے، تو نے یہ سورت پڑھ کر مجھے یاددلا دیا کہ یہی آخری سورت ہے، جو میں نے رسول خدا ﷺ سے سنی کہ آپ اس کو مغرب میں پڑھتے تھے۔

ترجمہ۷۲۵:۔ مروان بن حکم روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے زید بن ثابتؓ نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ تم مغرب میں چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھتے ہو حالانکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دو بڑی سورتوں سے بھی بڑی سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا:۔ مغرب کی نماز میں مختصر قرأتہ مستحب ہے، اس لئے یہاں جو سورۂ مرسلات پڑھنے کا ذکر ہے اس کو امام طحاویؒ نے اس پر محمول کیا کہ حضور علیہ السلام نے سورۂ مرسلات کا کچھ حصہ پڑھا ہوگا، پوری نہ پڑھی ہوگی۔

میرے نزدیک اگر پوری سورت بھی مان لی جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ طویل قرأتہ بھی جائز ہے بشرطیکہ مقتدیوں پر بار نہ ہو اور ستارے اچھی طرح نہ نکل آئیں۔

میرا یہ خیال پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حضور علیہ السلام اپنے مرضِ وفات کے دنوں میں مغرب کی نماز کے لئے بھی نکلے ہیں اور اس کی روایت نسائی میں موجود ہے، جس کی حافظ نے تاویل کردی ہے کہ حضور علیہ السلام مسجد میں تشریف نہ لائے تھے بلکہ اپنے بیت اقدس کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ کی طرف نکلے تھے۔

اس موقع پر امام ابوداؤد نے فرمایا کہ مغرب کی نماز میں طویل قرأتہ منسوخ ہوگئی ہے، حالانکہ آپ کی سورۂ مرسلات والی نماز مذکور مرض وفات کی تھی، اس کو منسوخ کیونکر کہہ سکتے ہیں البتہ امام طحاویؒ کی اصطلاحِ خاص کے لحاظ سے منسوخ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن امام طحاوی نے رفع

---

[1] مقدمہ فتح الباری میں مروان سے روایت بخاری کی مدافعت میں حافظ نے حضرت عروہ ابن زبیرؓ کا قول نقل کیا کہ وہ حدیث کے بارے میں مہتم نہ تھا اور یہی بات تہذیب واصابہ میں بھی نقل کی لیکن تاریخِ کبیر بخاری ص ۶۸ ۳\۴ میں ان کا قول یہ نقل کیا ہے کہ (باوجود خاندانی عداوت کے) میرا گمان ہے کہ مروان ہم لوگوں پر کوئی اتہام نہ لگائے گا، اس میں اس کی حدیث کے بارے میں کوئی توثیق نہیں ہے۔ اس پر تاریخ کبیر کے محشی علام نے بجا لکھا کہ دونوں جملوں میں بہت نراذق ہے اور اوپر کا جملہ مطبوعہ تاریخ والا اصلین میں ہے اور مسند احمد میں بھی اسی طرح ہے۔ اور حافظ نے کیا بات تھی اور کیا نقل کردی۔ ''مؤلف'' مقدمہ فتح الباری میں مروان سے روایت بخاری کی مدافعت میں حافظ نے حضرت عروہ ابن زبیرؓ کا قول نقل کیا کہ وہ حدیث کے بارے میں مہتم نہ تھا اور یہی بات تہذیب واصابہ میں بھی نقل کی لیکن تاریخ کبیر بخاری ص ۶۸ ۳\۴ میں ان کا قول یہ نقل کیا ہے کہ (باوجود خاندانی عداوت کے) میرا گمان ہے کہ مروان ہم لوگوں پر کوئی اتہام نہ لگائے گا، اس میں اس کی حدیث کے بارے میں کوئی توثیق نہیں ہے۔ اس پر تاریخ کبیر کے محشی علام نے بجا لکھا کہ دونوں جملوں میں بہت نراذق ہے اور اوپر کا جملہ مطبوعہ تاریخ والا اصلین میں ہے اور مسند احمد میں بھی اسی طرح ہے۔ اور حافظ نے کیا بات تھی اور کیا نقل کردی۔ ''مؤلف''

یدین کو منسوخ کہہ دیا تھا تو ان پر ہر طرف سے رافعین نے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی تھی، حالانکہ ان کا روئے سخن رفع یدین کو واجب قرار دینے والوں کی طرف تھا، اور انہوں نے وجوب کے نسخ کی بات کہی تھی جس سے نسخ جواز لازم نہیں آتا تھا، نیز یہ کہ ان کے نزدیک نسخ بمعنی رفع شروعیت نہیں تھا، بلکہ کسی ایک امر کے بعد دوسرا امر اس کے خلاف ثابت ہونے پر وہ نسخ کا اطلاق کیا کرتے تھے، جیسا کہ بہت سے مواقع میں ان سے ایسا ہی ثابت ہے، تو اسی اطلاق کے مطابق امام ابوداؤد کا نسخ فرمانا بھی درست ہو سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔

صحیح بخاری میں مروان کی روایت

حضرتؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کی حدیث الباب میں مروان سے روایت ہے اور مجھے یہ بات اوپری معلوم ہو رہی ہے کیونکہ مروان فتنہ پرداز، خونریزیوں کا باعث، اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سبب بنا ہے، اس کی غرض ہر جنگ میں یہ ہوتی تھی کہ بڑوں میں سے کوئی نہ رہے تاکہ خود صاحبِ حکومت بنے، جنگِ جمل کے واقعہ میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ کون ہے جو حرم نبی پر دست درازی کرتا ہے؟ پھر کوئی آیا اور اونٹ کے تلوار ماری، جس سے عماری گرنے لگی اور حضرت علیؓ نے دیکھ کر فوراً پہنچ کر حضرت عائشہؓ کو گرنے سے بچایا، اور جنگ ختم ہوگئی۔ اور حضرت طلحہ و زبیر حدیثِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سن کر مدینہ طیبہ کو لوٹ گئے مروان نے پیچھے سے جا کر حضرت طلحہ کو تیر مارا اور زخمی کر دیا جس سے وہ شہید ہوئے، مروان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت علیؓ سے جنگ جاری رہے۔ اور کوئی میدان سے نہ جائے۔

غرض مروان کے اندر حکومت کی طمع اور فتنہ پردازی اس قدر تھی کہ ٹھکانہ نہیں ہے اسی نے حضرت محمد بن ابی بکرؓ کے لئے بجائے **فاقبلوہ** کے **فاقتلوہ** لکھ دیا تھا۔ صرف اتنی بات اس میں تھی کہ حدیث میں اس سے جھوٹ ثابت نہیں ہوا، اسی لئے روایتیں لے لی گئی ہیں، تاہم امام مسلم نے اس سے کوئی روایت نہیں لی، اور حافظ ابن حجر نے جہاں دوسرے متکلم فیہم رواۃِ بخاری کی طرف سے جوابدہی کی ہے ص ۴۴۳ مقدمۂ فتح الباری میں لکھا کہ عروۃ ابن الزبیر نے کہا کہ وہ حدیث کے بارے میں مہتم نہیں تھا۔ اس کی پیدائش یوم خندق یا یوم احد میں ہوئی تھی، امام بخاری نے لکھا کہ اس سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی۔ طلبِ خلافت کے موقع پر مروان نے یہ بھی کہا تھا کہ ابن عمرؓ مجھ سے بہتر نہیں ہیں، لیکن وہ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں اور ان کو شرفِ صحبت حاصل ہے، تہذیب میں حافظ نے لکھا کہ محدث اسماعیلی نے امام بخاری پر مروان سے حدیث لانے کی بنا پر نقد کیا ہے اور مروان کے بدترین کاموں میں سے حضرت طلحہؓ کو تیر مار کر شہید کرنا لکھا ہے جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے، پھر خلافت حاصل کرنے کے لئے خونریزی کی بھی مذمت کی ہے۔ حافظ نے لکھا کہ میں نے تخریج بخاری کے لئے مقدمہ فتح الباری میں معذرت پیش کی ہے کہ وہ حدیث میں مہتم نہ تھا۔ (تہذیب ص ۱۰/۹۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید فرمایا کہ مقبلی نے جو زیدی تھے، کہا کہ امام بخاریؒ نے حنفیہ کے ساتھ فرطِ تعصب کی وجہ سے امام محمد ایسے حضرات سے بخاری میں حدیث نہیں لی اور رجالِ مجہولین سے روایات درج کی ہیں۔ پھر حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اشتغال بالحدیث کی برکت سے مقبلی کی زیدیت ہلکی ہوگئی تھی۔

ہمارے مولانا عبداللہ خاں صاحب دام ظلہم نے اپنے رسالۂ خطبہ میں حافظ ابن حجرؒ کی اس دلیل کا جواب دیتے ہوئے کہ حضرت سلیکؓ کے علاوہ حضرت ابوسعید خدریؓ کے عمل سے بھی نماز بوقتِ خطبہ ثابت ہے، اول تو مولانا نے فرمایا کہ سارے اہلِ مدینہ میں سے صرف ایک شخص کے عمل کو پیش کرنا ہی ان کے مسلک کی مرجوحیت کے لئے کافی ہے، دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں مسجد نبویؐ کا خطیب مروان تھا، جو سلطنتِ نامرضیہ بنی امیہ کی جانب سے والی مدینہ تھا، مروان حکومتِ متسلطہ کا ایک رکن ہونے کے علاوہ خود بھی بڑا ظالم و جابر تھا، صحابۂ کرام کے ساتھ ان بدبخت حکام کا طرزِ عمل بے حد گستاخانہ تھا، حتیٰ کہ خطبوں میں دل آزار کلمات کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اور اپنے امراء کی

قصیدہ خوانی بھی کرتے تھے، اس لئے علماء کرام ان لوگوں کے خطبے سننا بھی پسند نہ کرتے تھے، اور غالباً حضرت ابوسعید خدریؓ نے مروان کا خطبہ سننے کی نسبت سے یہی بہتر سمجھا ہوگا کہ کچھ نماز ہی پڑھ لیں۔

اسی طرح سلیک کی نماز کے وقت تو حضور علیہ السلام نے خطبہ بند فرما دیا تھا، اس لئے ان کی نماز بوقتِ خطبہ نہ تھی اور مروان کے خطبہ کے لئے شرعی خطبہ کا حکم ہی بمشکل دیا جاسکتا تھا، اس لئے حضرت ابوسعید خدریؓ کی اس وقت کی نماز کو بطور دلیل پیش کرنا بے سود ہے۔ (نماز بوقت خطبہ ص ۶)

مولانا نے ص ۲۶ میں امام بخاریؒ کی جرح بابتہ عطاء خراسانی پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ امام بخاری کے یہاں جرح وتوثیق میں قوتِ دلیل کا سوال نہیں بلکہ خود ان کے رجحانِ طبع پر فیصلہ ہے۔ قابلِ اعتماد سمجھ لیں تو مروان بن الحکم کو جس کی پیشانی پر اصحاب نبی علیہ السلام کے خون کا ٹیکہ لگا ہوا ہو، اور جس کو سفاکِ امت کہنا بھی بے جا نہیں، اور ضعیف سمجھ لیں تو راس التابعین حضرت اویس قرنیؒ کو جو ایسے خوش قسمت تھے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ کی وساطت سے ان کو اپنا سلام دیا ہے، حافظ ذہبی نے امام بخاریؒ کے اس فعل پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اس کو ان کی بے تکی حرکت قرار دیا ہے، اور لکھا کہ اگر امام بخاری ان کو ضعفاء میں ذکر نہ کرتے تو میں بھی اپنی اس کتاب میں ان کا ذکر نہ کرتا کیونکہ وہ تو اولیائے صادقین میں سے تھے۔ (میزان الاعتدال)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ مروان کی حدیث کو اگر حدیث کے بارے میں بھروسہ کر کے لے بھی لیا جائے، تب بھی ان کو ثقہ وثبت تو نہیں مانا جاسکتا اور جس نے قبل کو خط میں قتل بنا دیا ہو، وہ کیسے ثقہ ہوسکتا ہے؟ امام اعظمؒ کی یہ عظیم منقبت یہاں یاد میں تازہ کر لی جائے تو اچھا ہے کہ وہ احادیث کی روایت صرف ثقہ متدین اور پرہیزگار لوگوں سے کرتے تھے، امام بخاری نے امام اعظم پر امت کے اندر خونریزی کرانے کا الزام دھرا تھا (کمانی جزء القرأۃ) کیا اکابر حنفیہ مروان سے بھی زیادہ قصوروار تھے، کہ سارے ہی ائمہ حنفیہ اور کبار محدثین حنفیہ کو ترک کر کے مروان جیسوں سے صحیح بخاری میں روایات درج کیں۔ والی اللہ المشتکی. مروان کے بارے میں تاریخ کبیر امام بخاری کے حوالہ سے ایک اہم نوٹ ص ۱۰۱ میں گزر رہا ہے۔

احادیث بخاری سب صحیح ہیں

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا تھا کہ امام بخاری نے جو ضعیف ومتکلم فیہ رواۃ سے صحیح میں احادیث درج کی ہیں، وہ سب بھی اس لئے صحیح وقوی ہیں کہ باہر سے ان کی متابعات ومؤیدات مل گئی ہیں، اور اسی لئے صحیح بخاری کی ساری ہی احادث متلقی بالقبول ہوچکی ہیں۔ اس نقطہ کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

امام اعظم کی روایت کردہ احادیث اور شروطِ روایت

امام صاحبؒ نے اپنی کتاب الآثار کو چالیس ہزار صحیح احادیث میں سے منتخب کیا ہے اور فرماتے تھے کہ میرے پاس حدیثِ صحیح کے صنادیق بھرے ہوئے ہیں مگر میں نے ان میں سے تھوڑی احادیث نکالی ہیں جن سے لوگوں کو نفع ہو (مراد احادیثِ احکام ہیں)۔

امامِ حدیث وکیع کا بیان ہے کہ جیسی احتیاط امام ابوحنیفہؒ سے حدیث میں پائی گئی، کسی دوسرے سے نہیں پائی گئی۔ حافظِ حدیث علی بن الجعد جوہریؒ (استاذِ امام بخاری وابوداؤد) نے کہا کہ امام ابوحنیفہؒ جب حدیث بیان کرتے ہیں تو وہ موتی کی طرح آب دار ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک (ممدوحِ اعظم امام بخاریؒ) اور امام اہل سمرقند ابومقاتل نے امام اعظم کی مدح میں فرمایا کہ "آپ نے روایتِ احادیث وآثار میں ایسی بلند پرواز ی دکھائی کہ جیسے شکاری پرندے بلند مقامات پر پرواز کر رہے ہوں۔ اور آپ نے ایسے معزز ین ثقات سے روایت کی جو بڑے وسیع علم والے اور معتمد مشائخ تھے۔ امام نقدِ رجال یحییٰ بن سعید القطان نے کہا کہ واللہ ابوحنیفہؒ اس امت میں خدا اور اس کے رسول علیہ السلام سے جو کچھ وارد ہے اس کے سب سے بڑے عالم تھے۔

امام ربانی شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے المیزان الکبریٰ میں لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ کسی حدیثِ رسول اللہ ﷺ پر عمل سے پہلے یہ شرط کرتے تھے کہ اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت صحابی رسول سے برابر نقل کرتی آئی ہو، اور خود امام صاحب نے بھی فرمایا کہ میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں۔ اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کی ان صحیح حدیثوں سے لیتا ہوں جو ثقات کے ہاتھوں میں ثقات ہی کے ذریعہ شائع ہوئی ہوں۔ الخ

محدث سفیان ثوریؒ نے امام صاحب کے بارے میں کہا کہ جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور ثقات جن کو روایت کرتے ہیں نیز جو آں حضرت ﷺ کا آخری فعل ہوتا ہے یہ اسی کو لیتے ہیں (امام ابن ماجہ اور علم حدیث اردو۔ ص ۱۶۴) امام اعظمؒ کی شروطِ روایت اور بھی کڑی ہیں، اور ان کو دیکھتے ہوئے، یہ تقریباً ناممکن ہے کہ مروان جیسے متکلم فیہ یا مجہول راویوں سے ان کے یہاں کوئی روایت مل سکے۔ کیونکہ کسی کا صرف صادق اللہجہ ہونا ان کے یہاں کافی نہ تھا، جب تک کہ اس میں زہد و ورع، تقویٰ وغیرہ نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قولہ یقرأ بطولی الطولیین، اس سے مغرب کی نماز میں دو بڑی سورتوں سے بھی بڑی سورت پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے، جو حسب روایت ابوداؤد سورۂ اعراف ہے، اس پر علامہ عینی نے لکھا کہ اس سے امام شافعیؒ کے خلاف دلیل ملتی ہے کہ ان کے نزدیک مغرب کا وقت صرف تین رکعت پڑھنے کی مقدار ہے، ظاہر ہے کہ مغرب میں حضور علیہ السلام نے سورۂ اعراف پڑھی تو اس میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا، علامہ کرمانی نے کہا کہ مراد بعض سورت ہوگی، اور امام طحاوی کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ (عمدہ ص ۳۱۸۱)

باب الجهر فی المغرب

نمازِ مغرب میں بلند آواز سے پڑھنے کا بیان

۷۲۶: حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابن شهاب عن محمد بن جبیر بن مطعم عن ابیه قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم قرأ فی المغرب بالطور

ترجمہ ۷۲۶:۔ حضرت جبیر بن مطعمؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو مغرب میں "والطور" پڑھتے سنا۔

تشریح: آگے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث آ رہی ہے کہ حضور علیہ السلام جن نمازوں میں جہر سے قرأت کرتے تھے ہم بھی کرتے ہیں اور جن میں جہر نہیں کیا ہم بھی نہیں کرتے، لہٰذا معلوم ہوا کہ جہر و اسرار اتباعِ نبوی ہے، اسی لئے اگر امام جہر کی جگہ اسرار کرے یا بالعکس تو پوری ایک آیت یا زیادہ بھول کر پڑھنے پر سجدۂ سہو کرنا چاہئے، اور عمداً ایسا کرے گا تو خلافِ سنت کا مرتکب ہوگا۔

باب الجهر فی العشآء

نمازِ عشاء میں بلند آواز پڑھنے کا بیان

۷۲۷: حدثنا ابوالنعمان قال حدثنا معتمر عن ابیه عن بکر عن ابی رافع قال صلیت مع ابی هریرة العتمة فقرأ اذا السمآء انشقت فسجد فقلت له، قال سجدت خلف ابی القاسم صلے الله علیه وسلم فلاازال اسجدبها حتیٰ القاه.

ترجمہ ۷۲۷:۔ حضرت ابورافعؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے (ایک مرتبہ) حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ عشا کی نماز پڑھی، تو انہوں نے اذا

السمـاء انشقت پڑھی اور سجدہ کیا، میں نے ان سے کہا (کہ یہ آپ نے کیا کیا) بولے کہ میں نے ابوالقاسم ﷺ کے پیچھے (اس سورت کے اس مقام پر) سجدہ کیا ہے۔ لہٰذا میں ہمیشہ اس میں سجدہ کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ ان سے مل جاؤں۔

۷۲۸: حدثنا ابو الولید قال حدثنا شعبة عن عدی قال سمعت البرآء ان النبی صلے الله علیه وسلم کان فی سفر فقرأ فی العشآء فی احدی الرکعتین بالتین والزیتون

ترجمہ ۷۲۸: عدی کا بیان ہے کہ میں نے حضرت براءؓ سے سنا کہ نبی کریم ﷺ کسی سفر میں تھے۔ تو آپ نے عشاء کی کسی ایک رکعت میں **والتین والزیتون** پڑھی۔

تشریح: اس باب میں اور سابق باب کے بارے میں بھی علامہ محدث ابن المنیر نے اعتراض کیا کہ مغرب وعشاء کی نماز میں جہرِ قرأت سب کے نزدیک اتفاقی مسئلہ ہے۔ پھر جب کوئی اختلافی صورت نہ تھی تو امام بخاری نے ان دونوں کے لئے باب کیوں قائم کئے؟ علامہ عینی اور حافظ ابن حجر دونوں نے یہ جواب دیا کہ امام بخاری کا مقصد تو بیانِ احکام ہے اگر اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں، تب بھی حکم بیان کرنا ہی تھا۔ (عمدہ و فتح الباری)

شاید علامہ ابن المنیرؒ نے اعتراض اس وجہ سے کیا ہو کہ انہوں نے دیکھا اکثر جگہ کچھ نہ کچھ اختلافی صورتیں ہی سامنے آئی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی فقہی آراء کے مطابق صحیح کو مرتب کیا ہے، اس میں بہ کثرت مواضع میں دوسرے فقہاء کے خلاف بھی رائے قائم کی ہے، دوسرے یہ کہ اتنا اختلاف تو یہاں موجود ہی ہے کہ کتنے جہر یا اسرار پر سجدۂ سہو ہوگا؟ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ امام بخاری کی اپنی رائے کیا ہے کسی نے اتنی کھوج نہیں لگائی، کیونکہ فقہ البخاری کو کسی نے مدون نہیں کیا، نہ اس کو اہمیت دی گئی۔ دوسری حدیث الباب میں ہے کہ پہلی رکعتِ عشاء میں حضور علیہ السلام نے والتین پڑھی، حافظؒ نے لکھا کہ دوسری میں انا انزلنا پڑھی تھی۔

باب القرآءة فی العشآء بالسجدة

(عشاء میں سجدے والی سورت پڑھنے کا بیان)

۷۲۹: حدثنا مسدد ثنا یزید بن زریع ثنا التیمی عن ابی بکر عن ابی رافع قال صلیت مع ابی هریرة العتمة فقرأ اذا السماء انشقت فسجد فقلت ماهذه؟ قال سجدت فیها خلف ابی القاسم صلے الله علیه وسلم فلا ازال اسجد فیها حتیٰ القاه

ترجمہ ۷۲۹:۔ حضرت ابورافعؓ روایت کرتے ہیں، کہ میں نے (ایک مرتبہ) حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی تو انہوں نے اذا السمآء انشقت پڑھی اور سجدہ کیا، میں نے ان سے کہا، کہ یہ کیا کیا؟ بولے، کہ میں نے اس سورت میں ابوالقاسم ﷺ کے پیچھے سجدہ کیا۔ لہٰذا میں اس میں ہمیشہ سجدہ کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ آپ سے مل جاؤں۔

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۂ اذا السمـاء انشقت میں بھی سجدہ ہے، اس میں امام مالکؒ کے نزدیک سجدہ نہیں ہے، علامہ عینی نے لکھا کہ علامہ ابن المنیر نے جو لکھا کہ اس حدیث کو امام مالک کے خلاف حجت سمجھنا درست نہیں، کیونکہ ان کے مشہور قول سے تو فرض نماز میں کراہت معلوم ہوتی ہے اور یہ حدیث مرفوع نہیں ہے، حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے، علامہ عینی اور حافظ نے بھی دوسری روایات پیش کر کے اس حدیث کا مرفوع ہونا ثابت کیا، اور لکھا کہ یہ سب احادیث امام مالکؒ کے خلاف ہیں۔ (عمدہ وفتح)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں جو یہ فیصلہ ہے کہ سری نماز میں سجدۂ تلاوت سے نماز فاسد ہو جاتی ہے محلِ نظر ہے، کیونکہ سجدہ افعالِ صلوٰۃ میں سے ہے، لہٰذا اس سے نماز فاسد نہ ہونی چاہئے، جس طرح اذکار اگر غیر محل میں ہو جائیں تو ان سے نماز فاسد نہیں

ہوتی، حالانکہ وہ بھی غیر محل وموضع میں غیر مشروع ہی ہیں، اسی طرح سجدہ کا حکم بھی ہونا چاہئے۔

باب القرآءۃ فی العشآء

عشاء (کی نماز) میں قراءت کا بیان

۷۳۰: حدثنا خلاد بن یحییٰ ثنا مسعر ثنی عدی بن ثابت انہ سمع البرآء قال سمعت النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقرأ فی العشآء بالتین والزیتون وما سمعت احداً احسن صوتاً منہ او قرآءۃً

ترجمہ ۷۳۰: حضرت براءؓ روایت کرتے ہیں، کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو عشاء (کی نماز) میں والتین والزیتون پڑھتے ہوئے سنا، اور میں نے آپ سے زیادہ خوش آواز یا اچھا پڑھنے والا نہیں سنا۔

تشریح: اس حدیث الباب کو امام بخاری مکرر لائے ہیں، نمبر ۷۲۸: پر گزر چکی ہے، البتہ اس میں جملہ **وما سمعت احد الخ** زائد ہے، حافظ نے لکھا کہ اس جملہ کی شرح اواخر کتاب التوحید میں آئے گی، مگر وہاں پہنچ کر ص ۱۳۱/۱۳۹۹ (باب قول النبی ﷺ **(لماھر بالقرآن الخ)** میں لکھ دیا کہ اس کی شرح ہم کتاب الصلوٰۃ میں کر آئے ہیں۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایسا حافظ سے بہت جگہ ہوا ہے کہ وعدہ کر گئے ہیں آگے بیان کرنے کا اور پھر ذکر کرنا غالباً بھول گئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب یطول فی الاولیین ویحذف فی الاخریین

پہلی دو رکعتوں کو طویل کرے، اور پچھلی دو رکعتوں کو مختصر کرے

۷۳۱: حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا شعبۃ عن ابی عون قال سمعت جابر ابن سمرۃ قال قال عمر لسعد لقد شکوک فی کل شئ حتی الصلوٰۃ قال اما انا فامد فی الاولیین واحذف فی الاخریین ولاآلو ما اقتدیت بہ من صلوٰۃ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال صدقت ذاک الظن بک او ظنی بک

ترجمہ ۷۳۱: حضرت جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں، کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ سے کہا کہ کوفے والوں نے تمہاری ہر بات میں شکایت کی ہے، یہاں تک کہ نماز میں (بھی) سعدؓ نے کہا سنئے میں پہلی دو رکعتوں میں طول دیتا تھا، اور پچھلی دو رکعتوں میں اختصار کرتا تھا اور میں (ان کی شکایت کی کچھ) پروانہیں کرتا، جب کہ میں نے رسول خدا ﷺ کی نماز کی متابعت کی ہے، حضرت عمرؓ نے کہا، سچ کہتے ہو، تمہاری نسبت ایسا ہی خیال ہے، یا (یہ کہا کہ) میرا خیال تمہاری طرف (ایسا ہی ہے)۔

تشریح: امام بخاریؒ حضرت سعدؓ کے بارے میں سابق الذکر شکایت والی طوالتِ نماز والی حدیث کو یہاں مختصر کر کے اختلاف اسناد وغیرہ کی وجہ سے مکرر لائے ہیں۔

باب القرآءۃ فی الفجر وقالت ام سلمۃ قرأ النبی ﷺ بالطور

۷۳۲: حدثنا ادم قال حدثنا شعبۃ قال حدثنا سیار بن سلامۃ قال دخلت انا وابی علیٰ ابی برزۃ الاسلمی فسالناہ عن وقت الصلوات فقال کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یصلی الظھر حین تزول

الشمس والعصر و يرجع الرجل الىٰ اقصى المدينة والشمس حية ونسيت ماقال فى المغرب ولايبالى بتاخير العشآء الىٰ ثلث اليل ولايحب الموم قبلها ولاالحديث بعدها و يصلى الصبح فينصرف الرجل فيعرف جليسه، وكان يقرأ فى الركعتين اواحدٰهما ما بين الستين الى المائة

۷۳۳: حدثنا مسدد قال حدثنا اسمٰعيل بن ابراهيم قال اخبرنا ابن جريج قال اخبرنى عطآء انه، سمع اباهريرة يقول فى كل صلوٰة يقرأ فما اسمعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم اسمعناكم ومآ اخفىٰ عنا اخفينا عنكم وان لم تزد علىٰ ام القراٰن اجزأت و ان زدت فهو خير

ترجمہ ۷۳۲: سیار بن سلامہ کا بیان ہے کہ میں اور میرے باپ حضرت ابو برزہ اسلمی کے پاس گئے اور ان سے نمازوں کے اوقات پوچھے، توانہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز جب آفتاب ڈھل جاتا تھا اس وقت پڑھتے تھے اور عصر کی ایسے وقت (پڑھتے تھے) کہ آدمی مدینہ کی انتہا تک لوٹ کر جا سکے، اور آفتاب میں زردی نہ آئی ہو (سیار کہتے ہیں) اور میں بھول گیا کہ، مغرب کے بارے میں ابو برزہ نے کیا کہا اور آپ عشاء کی تاخیر میں ایک تہائی رات تک کچھ پروا نہ کرتے تھے، اور عشاء سے پہلے سونے کو اور اس کے بعد بات کرنے کو ناپسند کرتے تھے، اور صبح کی نماز آپ (ایسے وقت) پڑھ لیتے تھے کہ آدمی فارغ ہو کر اپنے پاس والے کو پہچانتا تھا اور آپ دونوں رکعتوں یا ہر ایک میں ساٹھ آیتوں سے لے کر سو ۱۰۰ تک پڑھتے تھے۔

ترجمہ ۷۳۳: حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں، کہ تمام نمازوں میں قرآن پڑھا جاتا ہے، جن (نمازوں) میں رسول خدا ﷺ نے (بلند آواز سے بڑھ کر) ہمیں سنایا (ان میں) ہم (بھی بلند آواز سے پڑھ کر) تم کو سناتے ہیں۔ اور جن میں (آہستہ آواز سے پڑھ کر) ہم سے چھپایا (ان میں) ہم (بھی آہستہ آواز سے پڑھ کر) تم سے چھپاتے ہیں، اور اگر سورۂ فاتحہ سے زیادہ نہ پڑھو، تو کافی ہے، اور اگر زیادہ پڑھ لو، تو بہتر ہے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا قولہ وان لم تزد الخ حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے، اگرچہ وہ بظاہر ان کے نزدیک استحباب سورۃ پر دال ہے، مگر مجھے یہ بات واضح ہوگئی کہ انہوں نے یہ بات مسبوق کے حق میں کہی ہے، کیونکہ موطأ امام مالک میں ہے (اوجز ص ۱\۱۹) حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ جس کو رکعت کا رکوع مل گیا۔ اس کو اس کا سجدہ بھی مل گیا (رکعت پوری ہوگئی) لیکن ام القرآن کی قرائت رہ جانے سے وہ خیر کثیر سے محروم ہوگیا۔

حضرت شیخ الحدیث نے لکھا کہ حضرت ام سلمہؓ کے اثر مذکور ترجمۃ الباب کو امام بخاریؒ نے کتاب الحج باب طواف النساء میں موصول کیا ہے، جس میں ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے حضور علیہ السلام سے اپنی بیماری کا عذر کیا تو آپ نے اجازت دی کہ لوگوں کے طواف کرنے کی جگہ سے باہر باہر سوار ہو کر طواف کر لیں۔ پھر یہ کہ اس میں بھی نماز صبح کا ذکر نہیں ہے مگر اس کے چھے باب کے بعد اذا اقيمت الصلوٰة للصبح وارد ہے، اور ابن خزیمہ نے جو اپنی حدیث میں عشاء کا ذکر کیا ہے، وہ شاذ ہے الخ۔ (الابواب والتراجم ص ۲\۲۸۵)

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ فاتحہ کے ساتھ ضم سورت صرف مستحب و افضل ہے، جو جمہور کا قول ہے اور وجوب کا قول بھی بعض صحابہ سے ثابت ہوا ہے جیسا کہ حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے اور اسی کے قائل بعض حنفیہ و ابن کنانہ بھی ہیں مالکیہ میں سے، اور امام احمدؒ سے بھی ایک روایت ہے۔ (فتح الباری ص ۲\۱۷۱)

علامہ عینیؒ نے لکھا کہ اس حدیث سے شافعیہ نے ضم سورت کے استحباب پر استدلال کیا ہے اور ہمارے اصحاب و ابن کنانہ مالکی و امام احمد سے وجوب نقل ہوا ہے کیونکہ اس بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں، پھر علامہ نے وہ احادیث نقل کیں جن میں فاتحہ کے ساتھ وما

تیسر اور سورۃ معہا وغیرہ الفاظ وارد ہیں۔ (عمدہ ۳/۱۹۱)

باب الجهر بقرآءة صلوٰة الفجر وقالت ام سلمة طفت ورآء الناس والنبی صلے الله علیه وسلم یصلی یقرأ بالطور

۷۳۴: حدثنا مسدد قال حدثنا ابوعوانة عن ابی بشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ قال الطلق النبی صلے الله علیه وسلم طآئفة من اصحابه عامدین الیٰ سوق عکاظ وقد حیل بین الشیاطین و بین خبر السمآء وارسلت علیهم الشهب فرجعت الشیاطین الیٰ قومهم فقالوا مالکم قالوا حیل بیننا و بین خبر السمآء وارسلت علینا الشهب قالوا ماحال بینکم و بین خبر السمآء الاشی حدث فانصرف اولٰئک الذین توجهوا نحو تهامة الی النبی صلے الله علیه وسلم وهو بنخلة عامدین الیٰ سوق عکاظ وهو یصلی باصحابه صلوٰة الفجر فلما سمعوا القراٰن استمعوا له' فقالو اهذا والله الذی حال بینکم و بین خبر السمآء فهنالک رجعوآ الیٰ قومهم قالوا یقومنآ انا سمعنا قراٰناً عجباً یهدیٓ الی الرشد فاٰمنابه ولن نشرک بربنااحداً فانزل اللّٰه علیٰ نبیه صلے الله علیه وسلم قل اوحی الیٰ وانما اوحی الیه قول الجن

۷۳۵: حدثنا مسدد قال حدثنا اسماعیل قال حدثنا ایوب عن عکرمة عن ابن عباسؓ قال قرأ النبی صلے الله علیه وسلم فیما امر وسکت فیمآامر وماکان ربک نسیاً ولقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة

ترجمہ ۷۳۴: حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں، کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ اپنے چند اصحاب کے ساتھ سوق عکاظ کی طرف ارادہ کر کے چلے، اور (اس وقت) شیاطین کو آسمان کی خبریں لانے سے روک دیا گیا تھا، اور ان پر شعلے پھینکے جاتے تھے، پس شیاطین اپنی قوم کے پاس لوٹ کر آئے، قوم نے کہا، تمہارا کیا حال ہے؟ (اب کی مرتبہ کوئی خبر نہیں لائے) شیاطین نے کہا کہ ہمارے لئے آسمان تک جانا ممنوع کر دیا گیا، اور (اب) ہمارے اوپر شعلے پھینکے جاتے ہیں، قوم نے کہا، کہ تمہارے آسمان تک جانے کی رکاوٹ کی (کوئی خاص ایسی نئی) وجہ پیدا ہوئی ہے، جو حال ہی میں ظاہر ہوئی ہے۔ لہٰذا زمین کے مشرق اور مغرب کی تمام جوانب میں سفر کرو اور دیکھو، وہ کیا چیز ہے جس نے تمہارے اور آسمانی خبر کے درمیان رکاوٹ ڈال دی (چنانچہ وہ لوگ اس تلاش میں نکلے) تو جو لوگ (ان میں سے) تہامہ کی طرف آئے تھے، وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ (اس وقت مقام) نخلہ میں سوق عکاظ جا رہے تھے (چنانچہ جب یہ جنات وہاں پہنچے ہیں تو) آپ (اس وقت) اپنے اصحاب کے ہمراہ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے، جب ان جنوں نے قرآن کو سنا، تو اس کو سنتے رہے۔ اور کہنے لگے، کہ خدا کی قسم یہی ہے جس نے تمہارے اور آسمان کی خبر کے درمیان میں رکاوٹ ڈال دی ہے، پس وہیں سے اپنی قوم کے پاس لوٹ کر گئے، تو کہنے لگے، کہ اے ہماری قوم (کے لوگو!) ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے، جو ہدایت کی راہ بتاتا ہے، پس ہم اس پر ایمان لے آئے، اور (اب) ہم ہرگز اپنے پروردگار کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر یہ آیتیں نزل فرمائیں قل اوحی الی، اور آپ پر جنوں کی گفتگو نقل کی گئی۔

ترجمہ ۷۳۵: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جن نمازوں میں (جہر کا) حکم دیا گیا، ان میں آپ نے قرأۃ کی، اور جن میں (خاموشی کا) حکم دیا گیا، ان میں سکوت کیا اور تمہارا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے (کہ بھولے سے کوئی غلط حکم دے دے) اور یقیناً تم لوگوں کے لئے رسول اللہ (کے افعال واقوال) میں ایک اچھی پیروی ہے۔

تشریح: حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ ابن رشید نے کہا حدیثِ ام سلمہ میں جہر کی صراحت نہیں ہے تاہم ان کے اس قول

سے کہ میں نے لوگوں کے پیچھے سے طواف کیا، جہر کی بات نکلتی ہے۔ کیونکہ اگر قرأۃ سری ہوتی تو اتنی دور سے نہ سن سکتی تھیں۔ اسی طرح حدیث ابن عباسؓ میں بھی اگرچہ جہر کی صراحت نہیں ہے مگر جنوں کی قرأۃ سننے سے معلوم ہوا کہ حضور جہری قرأت فرما رہے تھے۔ (الابواب ص ۲/۲۸۶)

افاداتِ انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حضرت ابنِ عباسؓ کی حدیث الباب سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کے اوپر جا کر خبریں لانے پر پابندی اور ارسالِ شہب کا سلسلہ حضور علیہ السلام کی نبوت کے زمانہ میں شروع ہوا ہے، حالانکہ ستاروں سے ان کو مار بھگانے کا سلسلہ شروع زمانہ سے ہی رہا ہے، اس کا جواب جیسا کہ حاشیۂ بخاری میں علامہ کرمانی سے منقول ہے یہ کہ پہلے سے بھی ایسا ضرور تھا مگر کم تھا، اور حضور کے زمانہ میں زیادہ ہوا اور شدید بھی ہوگیا۔ یہ کتب سیر میں بھی ہے کہ شروع بعثت میں کثرت ہوئی ہے رجم شیاطین بالشہب کی۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ بظاہر سیاقِ قصہ سے معلوم ہوا کہ ارسالِ شہب اور جنوں کا زمین میں تلاش و جستجو کے لئے پھیل جانا ایک ہی زمانہ میں ہوا ہے، حالانکہ یہ بات اوائلِ نبوت کی تھی اور ارسالِ شہب اس سے بہت بعد کو ہوا ہے۔

سائنس جدید اور شاہ صاحب رحمہ اللہ

اس کے بعد یہ سوال ہے کہ وہ شہب، نجوم و ستارے ہی ہیں یا دوسری چیز؟ اس میں تحقیق یہ ہے کہ یہ نجوم بعینہا ہیں، اور بطلیموسی ہیئت کی باتیں اب غلط ہو چکی ہیں، کیونکہ جدید سائنس اور ہیئت مشاہدہ پر مبنی ہے اور اجسام اثیریہ میں خرق والتسام بھی ثابت ہو چکا ہے اور مشاہدہ ہوا کہ ستارے بنتے اور ٹوٹتے ہیں، گرتے بھی ہیں اور ان کے ٹکڑے ملے بھی ہیں جو پہلے ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ اب دور بینی مشاہدہ سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ آفتاب کے اندر ہزار ہا فرسنگوں کے اونچے پہاڑ اور ہزار ہا فرسنگوں کے غبشات (گڑھے) بھی ہیں کیونکہ دور بینوں سے کبھی بڑے گڑھے سامنے آئے اور کبھی اونچے پہاڑ۔ یہ سب مشاہدہ کی چیزیں ہیں جواب معلوم ہوئی ہیں۔ اس طرح ارسطو کی ہفوات سب بیکار ہو گئیں، جو آفتاب وغیرہ کے متعلق تھیں۔

حضرتؒ نے جو سائنس جدید کے مشاہدات کا یہاں ضمنی تذکرہ فرمایا، اس سے زیادہ تفصیل سے ان کا ذکر مع دیگر معلوماتِ جدیدہ ''نطقِ انور'' ص ۱/۱۶۴ تا ص ۱/۱۷۰ میں۔ سے ملاحظہ کی جائیں۔ اس میں سورج اور نظام شمسی اور کہکشاں کا بھی ذکر ہے، اور سورج کے اندر ہزار ہا فرسنگوں کے پہاڑ اور غاروں پر حیرت نہ کی جائے، کیونکہ سورج کا قطر ۸ لاکھ ۶۶ ہزار میل کا۔ ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا پورا حجم کتنا ہوگا، کیونکہ وہ زمین سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے، اور زمین سے سورج کا فاصلہ ۹ کروڑ ۲۹ لاکھ میل ہے۔

نظام شمسی اور کہکشاں

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ نظام شمسی ہمارے کہکشاں کا ایک نہایت حقیر جزو ہے، جس کے ساتھ صرف چالیس سیارے ہیں، جن کی وجہ سے نظام شمسی بولا جاتا ہے اور ہمارے کہکشاں کے اندر سورج کی طرح سے تقریباً ایک کھرب ثوابت و سیارے اور بھی ہیں اور ہمارے کہکشاں کے علاوہ اور بھی بہت سے کہکشاں ہیں، جن کی ریسرچ ہو رہی ہے، اور سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس طرح کے لاتعداد کہکشاں خلاء کی لامتناہی وسعتوں میں بکھرے ہوئے ہیں (اور وہ سب زمین و آسمان کے درمیان واقع ہیں)۔

ایک کہکشاں سیدیم اینڈ رومیدہ دریافت ہوا ہے جو ہم سے ۸ لاکھ ۵۰ ہزار نوری سال دور ہے۔ اور اس کا قطر ۴۵ ہزار نوری سال ہے۔

نوری سال: روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے، اس رفتار سے روشنی ایک سال میں جو فاصلہ طے کرتی ہے اسی نوری سال کہتے ہیں۔

سائنس جدید اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ

حضرت استاذ الاساتذہ مولانا نانوتوی قدس سرہٗ نے حجۃ الاسلام میں معجزۂ شق القمر پر بحث فرماتے ہوئے سائنس جدید کی تحقیقات کو مان کر جوابدہی فرمائی ہے اس کی تفصیل بھی نطق انور ۱۵۶ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

قولہ وانما اوحی الیہ قول الجن پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ حضرت ابن عباسؓ کا خیال ہے کہ حضور علیہ السلام کو جنوں کی آمد اور ان کی تلاوت مبارکہ سننے کی خبر اس وقت نہ ہوئی تھی مگر مسلم شریف باب سجدۃ التلاوۃ میں حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ایک درخت نے جو قریب ہی تھا، حضور علیہ السلام کو اس واقعہ کی خبر دے دی تھی۔ یہ بخاری کی تفسیر میں بھی ہے اور مفسرین نے حضرت ابن مسعودؓ کے قول پر اعتماد کیا ہے کیونکہ وہ حضرت ابن عباسؓ سے عمر میں بھی بڑے ہیں اور شاید ابن عباسؓ کی اس واقعہ کے وقت تک پیدائش بھی نہ ہوئی تھی۔

پھر فرمایا کہ اسنادِ مسلم میں حضرت معن بھی ہیں جو حضرت ابن مسعودؓ کے بھتیجے ہیں، اور ان کے بیٹے قاسم امام اعظم ابوحنیفہؒ کی خدمت میں کافی مدت رہے ہیں، اس سے اندازہ کیا جائے کہ امام اعظم کی قدر و منزلت کتنی رفیع تھی کہ حضرت ابن مسعودؓ کے اتنے قریبی عزیز ان سے دینی و علمی استفادہ کرتے تھے۔

علامہ عینی اور وجود جن کی تحقیق

علامہ نے عمدہ ص ۳۱۹۶ میں وجودِ جن پر اکابرِ امت کے افادات اور مکمل تحقیق درج کی ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

باب الجمع بین السورتین فی رکعة والقرآءة بالخواتیم وبسورة قبل سورة وباول سورة ویذکر عن عبدالله بن السآئب قرأ النبی صلے الله علیه وسلم المؤمنون فی الصبح حتیٰ اذاجآء ذکر موسیٰ و هارون اوذکر عیسیٰ اخذته سعلة فرکع وقرأ عمر فی الرکعة الاولیٰ بمائة و عشرین اٰیة من البقرة وفی الثانیة بسورة من المثانی وقرأالاحنف بالکهف فی الاولیٰ و فی الثانیة بیوسف او یونس وذکرانه' صلے عمر الصبح بهما وقرأ ابن مسعود باربعین اٰیةً من الانفال وفی الثانیة بسورة من المفصل وقال قتادة فیمن یقرأ بسورة واحدة فی رکعتین اویردد سورةً واحدةً فی رکعتین کل کتاب الله عزوجل وقال عبیدالله عن ثابت عن انسؓ کان رجل من الانصار یؤمهم فی مسجد قبآء وکان کلما افتتح سورة یقرأبها لهم فی الصلوٰة مما یقرأبه افتتح بقل هو الله احد حتیٰ یفرغ منها ثم یقرأ بسورة اخریٰ معها وکان یصنع ذٰلک فی کل رکعةٍ فکلمه اصحابه وقالوا انک تفتتح بهٰذه السورة ثم لاتریٰ انها تجزئک حتیٰ تقرأ باخریٰ فاماتقرأبها و اما ان تدعها وتقرأباخریٰ فقال مآانا بتارکها ان احببتم ان اؤمکم بذٰلک فعلت و ان کرهتم ترکتکم وکانوا یرون انه' من افضلهم وکرهوآ ان یؤمهم غیره' فلمآ اتٰهم النبی صلے الله علیه وسلم اخبروه الخبر فقال یافلان مایمنعک ان تفعل مایامرک بهٖ اصحابک ومایحملک علیٰ لزوم هٰذه السورة فی کل رکعة فقال انی احبها قال حبک ایاهآ ادخلک الجنة

(ایک رکعت میں دو سورتوں کے ایک ساتھ پڑھنے اور سورتوں کی آخری آیتوں اور ایک سورت کا قبل ایک سورت کے، اور سورت کی ابتدائی آیتوں کے پڑھنے کا بیان، عبداللہ بن سائب سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صبح (کی نماز) میں سورۂ مومنوں پڑھی) یہاں تک کہ جب آپ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر پہنچے تو آپ کو کھانسی آ گئی، اور آپ نے رکوع کر دیا، حضرت عمرؓ نے پہلی رکعت میں ایک سو بیس آیتیں سورہ بقرہ کی اور دوسری رکعت میں

ایک سورت مثانی کی پڑھی، اور احنف نے پہلی رکعت میں سورۂ کہف، اور دوسری میں سورہ یوسف یا یونس پڑھی، اور بیان کیا کہ میں نے حضرت عمرؓ کے ہمراہ صبح کی نماز ان ہی دونوں سورتوں کے ساتھ پڑھی ہے، اور حضرت ابن مسعودؓ نے (پہلی رکعت میں) انفال کی چالیس آیتیں اور دوسری رکعت میں ایک سورت مفصل کی پڑھی، حضرت قتادہؓ نے اس شخص کے بارے میں جو ایک سورت کو (دو حصہ کر کے) دو رکعتوں میں پڑھے، یا ایک ہی سورت پوری پوری دونوں رکعتوں میں پڑھے، یہ کہا، کہ یہ سب اللہ عزوجل کی کتاب ہے (جس طرح چاہو پڑھو) اور عبیداللہ نے ثابت سے انہوں نے حضرت انسؓ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک انصاری شخص مسجد قبا میں انصار کی امامت کیا کرتا تھا، اس کی عادت تھی کہ جن نمازوں میں قرائۃ (بلند آواز سے) کی جاتی ہے، ان میں جب وہ کوئی سورت شروع کرنا چاہتا کہ ان کے آگے پڑھے، تو قل ھو اللہ احد سے شروع کرتا، اس کو پڑھ کر پھر کوئی دوسری سورت اس کے ساتھ پڑھتا، وہ ہر رکعت میں یہی کیا کرتا تھا اس کے ساتھ والوں نے اس سے (اس سلسلہ میں) گفتگو کی، اور کہا، کہ تم اس سورت سے ابتدا کرنے ہو، پھر تم یہ نہیں سمجھتے کہ یہ تمہیں کافی ہے، یہاں تک کہ دوسری سورت پڑھتے ہو، پس یا تو تم اسی کو پڑھو، (دوسری سورت نہ ملاؤ) اور یا اس کو چھوڑ دو، اور دوسری سورت پڑھا کرو، وہ شخص بولا کہ میں اس کو نہ چھوڑوں گا، اگر تم اسی کے ساتھ مجھے اپنا امام بنانا چاہو، تو خیر، ورنہ میں تم لوگوں کی امامت چھوڑ دوں گا، اور وہ ان سب سے افضل ہے، اور وہ اس بات کو اچھا نہ سمجھے، کہ کوئی اور ان کا امام بنے، پس جب نبی کریم ﷺ (حسب معمول) ان کے پاس تشریف لے گئے، اور ان لوگوں نے یہ کیفیت آپؐ سے بیان کی، آپؐ نے فرمایا کہ اے فلاں تمہیں اس سے کون چیز مانع ہے کہ تم وہی کرو، جو تمہارے اصحاب تم سے کہتے ہیں، اور تمہیں ہر رکعت میں اس سورت کے لازم کرنے پر کس بات نے آمادہ کیا ہے؟ وہ شخص بولا، کہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ اس کی محبت تمہیں جنت میں داخل کر دے گی۔

ف: قرآن مجید کی سورتوں کو باعتبار تعداد آیات کے علماء نے چار قسمیں کردی ہیں، جن میں سو آیتوں سے زیادہ ہیں، ان کو طوال کہتے ہیں، اور جن میں سو یا سو کے قریب ہیں، ان کو ذوات المئین کہتے ہیں، اور جن میں سو سے بہت کم آیتیں ہوں، ان کو مثانی کہتے ہیں، اور سورۂ حجرات سے آخر قرآن تک جو سورتیں ہیں ان کو مفصل کہتے ہیں۔

۷۳۶: حدثنا ادم قال حدثنا شعبة قال حدثنا عمرو بن مرة قال سمعت اباوائل قال جآء رجل الی ابن مسعود فقال قرأت المفصل اللیلة فی رکعة فقال هذاً لهذا الشعر لقد عرفت النظائر التی کان النبی صلے اللہ علیه وسلم یقرن بینهن فذکر عشرین سورةً من المفصل سورتین فی کل رکعةً

ترجمہ: حضرت ابووائلؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کے پاس ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ میں نے رات کو مفصل کی سورتیں ایک رکعت میں پڑھیں اور کہا کہ میں نے اس قدر جلد پڑھیں جیسے شعر جلد پڑھا جاتا ہے، میں ان ہم شکل سورتوں کو جانتا ہوں جنہیں نبی کریم ﷺ ساتھ پڑھ لیا کرتے تھے، پھر انہوں نے مفصل کی بیس سورتیں ذکر کیں (کہ ان میں سے) دو دو سورتیں، ہر رکعت میں (آں حضرت ﷺ پڑھا کرتے تھے)۔

تشریح: امام بخاریؒ نے یہاں ایک بڑا عنوان و ترجمۃ الباب قائم کر کے متعدد مسائل کا حل کیا ہے، چار مسائل کا حل تو ابتدائی سرخی میں ہی کر دیا ہے اور دو مسئلے درمیان میں ضمناً ذکر کئے ہیں۔

علامہ عینیؒ نے نہایت عمدگی سے ہر مسئلہ کی مع اس کی دلیل کے وضاحت فرمادی ہے، علامہ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے ان چار مسائل میں سے دوسرے نمبر یعنی قرائۃ بالخواتیم کی دلیل پیش نہیں کی ہے اور لکھا کہ حافظ ابن حجر نے جو یہ کہا کہ شروع سورتوں کے پڑھنے سے اس کی دلیل بن جاتی ہے، کیونکہ ہر ایک میں سورت کا کچھ ہے تو اس تاویل سے یہ بہتر ہے کہ قول قتادہؓ کو اس کے لئے دلیل بنایا جائے، جس میں ہے

کہ سب ہی کتاب اللہ ہے، جہاں سے بھی پڑھ لو کوئی حرج نہیں ہے۔ (عمدہ ص ۳\۱۹۸)

(۱) پھر لکھا کہ امام بخاری نے جو چوتھا مسئلہ عنوان میں ذکر کیا ہے کہ سورت کا ابتدائی حصہ پڑھا جائے تو اس کے لئے سب سے پہلی ذکر کردہ دلیل ہے یعنی حضور علیہ السلام کا فعل مبارک۔ اس میں مسئلہ فقہی یہ ہے کہ کچھ حصہ سورت کا پڑھ کر قطع کر کے رکوع کر دینا سارے فقہا کے نزدیک بلا کراہت کے جائز ہے۔ اگر کسی عذر سے ایسا کرے، البتہ بلا عذر کے بھی بلا کراہت جمہور کے نزدیک جائز ہے، صرف امام مالک کا مشہور مذہب کراہت کا ہے۔ (عمدہ ۳\۱۹۹)

(۲) حضرت عمرؓ کا فعل، علامہ عینی نے لکھا کہ اس کی مطابقت ترجمہ کے کسی جز سے نہیں ہے کہ اس سے صرف تطویلِ قرائۃ کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اور نمبرا سے مطابقت اس احتمال پر ہوسکتی ہے کہ حضرت عمر پہلی رکعت میں بقرہ کی ایک سو آیات کے ساتھ مفصل کی بھی سورت ملاتے ہوں، اور دوسری میں بھی اسی طرح۔ تو جمع بین السورتین فی رکعۃ والی صورت بنے گی، اور دوسرے احتمال پر کہ پہلی میں صرف بقرہ اور دوسری میں سورتِ مثانی پڑھتے تھے، کوئی مطابقت نہ بنے گی۔ (عمدہ ۳\۱۰۰)

(۳) قرأ الاحنف، اس سے ترجمہ کے تیسرے جزو سے مطابقت ہوگی کہ سورتوں میں ترتیبِ مصحف کی رعایت ضروری نہیں۔ علامہ نے لکھا کہ اسکو ہمارے اصحاب نے مکروہ کہا ہے، شرح ہدایہ میں بھی مکروہ لکھا اور یہی جمہور علماء کا قول ہے جن میں امام احمد بھی ہیں کیونکہ ترتیبِ مصحف عثمانی کی رعایت مستحب ہے، اور بعض نے اسکو فرائض میں مستحب قرار دیا ہے اور نوافل میں وسعت دی ہے کیونکہ ان کی ہر رکعت مستقل نماز ہے، امام مالک نے بھی اس میں کوئی حرج نہیں بتلایا۔

محقق قاضی عیاض کی تحقیق

آپ نے لکھا کہ ترتیب سور جیسا کہ باقلانی نے کہا اصح القولین میں اجتہادِ مسلمین سے ہے، حضور علیہ السلام سے نہیں ہے، اور منکوساً تلاوت سے ممانعت کو پورے قرآن مجید کو اس طرح پڑھنے پر محمول کیا ہے البتہ ترتیبِ آیات جس طرح مصحف میں ہے، اس کو سب نے بالاتفاق توقیف من اللہ قرار دیا ہے۔ (عمدہ ص ۳\۱۰۰)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بعض حضرات نے ترتیبِ سور کو بھی باستثناءِ انفال وتوبہ، توقیفی قرار دیا ہے اور میرا مختار بھی یہی ہے لیکن چونکہ صحابہ کرام کے نزدیک یہ حدِ وجوب تک نہ پہنچی تھی اور صرف محسنات میں سے شمار کی گئی، اس سے یہ خیال عام طور سے کر لیا گیا کہ وہ ان کے نزدیک اجتہادی ہے۔

حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ کبیری شرح منیہ میں امام بخاری کی چاروں ذکر کردہ صورتوں کو مکروہ لکھا ہے، اور امام طحاوی نے جائز لکھا ہے، میرے نزدیک طحاوی کو ترجیح ہے۔ صاحبِ بحر نے ترتیبِ سور کو ضروری لکھا ہے۔ ملا نظام الدین نے بھی تحسین کی بحر کی کہ بیشک واجبات سے ہے کیونکہ صحابہؓ نے ترتیب دی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اکثر علماء کے نزدیک ترتیبِ آیات تو توقیفی ہے بالاجماع، اور ترتیبِ سور توقیفی نہیں ہے۔ نوافل میں حنفیہ نے قرائۃ کے حق میں ہر رکعت کو مستقل قرار دیا ہے (اگرچہ ویسے شفعہ بنایا ہے دو دو رکعت کو) اس لئے ان میں ترتیبِ سور بھی نہیں ہے۔ اور سنن وفرائض میں ترتیب ضروری ہے۔

(۴) قرأ ابن مسعودؓ، اس کی مطابقت بھی چوتھے جزو سے ہے، جس طرح فعلِ نبوی کی تھی۔ کیونکہ دوسری روایات سے ان کا ابتداءِ سورت سے پڑھنا متعین ہوگیا ہے۔ (عمدہ ۳\۱۰۰)

(۵) قال قتادۃ: علامہ عینی نے لکھا کہ قولِ قتادہ کی کوئی مطابقت اجزاءِ ترجمۃ البخاری کے ساتھ نہیں ہے، گویا اس کو امام بخاریؒ صرف اس لئے لائے ہیں کہ اس سے بھی چاروں اجزاء ترجمہ کا ثبوت ہوسکتا ہے، کیونکہ انہوں نے کتاب اللہ کے ہر طرح پڑھنے کو بلا کراہت

جائز کہا ہے۔ (عمدہ ص۱۰۱\۳)

حافظ نے لکھا کہ ابن رشید نے کہا شاید امام بخاری تردید سورت کو نہ مانتے ہوں، اور اس لئے ترجمہ میں نہ لائے ہوں کیونکہ بعض علماء سے اس کی کراہت منقول ہے، مگر میرے نزدیک ان کی یہ بات محل نظر ہے کیونکہ صحتِ دلیل کے بعد امام بخاری ایسی رعایت نہیں کیا کرتے، اس کے بعد حافظ نے علامہ زین بن المنیر کا قول نقل کیا ہے کہ "امام مالکؒ ہر رکعت میں ایک سورت پڑھنے کے قائل تھے جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ ہر سورت کے لئے رکوع وسجود میں حصہ مقرر ہے (کہ ہر رکوع وسجود یا رکعت کے لئے ایک سورت کامل ملنی چاہئے) اور فرمایا کہ ایک سورت کو دو رکعت پر تقسیم نہ کیا جائے اور کسی سورت کے کچھ حصہ پر اکتفانہ کرنا چاہئے کہ باقی کو ترک کردیا جائے، اور نہ کسی سورت کو پڑھ کر پھر اس سے قبل کی سورت پڑھی جائے کہ یہ ترتیب مصحف کے خلاف ہے، اگر ایسا کرے گا تو نماز تو فاسد نہ ہوگی، مگر خلاف اولیٰ ہوگا، پھر علامہ نے لکھا کہ امام بخاری نے جو استدلال کئے ہیں وہ امام مالک کے خلاف نہیں ہیں، کیونکہ وہ بیانِ جواز پر محمول ہیں"۔ (فتح الباری ص۱۷۷\۲)

علامہ عینی نے لکھا کہ قولِ قتادہ کے تحت ۲ مسئلے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک سورت کو دو رکعت میں پڑھا جائے جیسے کہ حضور علیہ السلام نے نمازِ مغرب میں سورۂ اعراف دونوں رکعت میں پڑھی، اور حضرت ابوبکرؓ نے سورۂ بقرہ فجر کی دو رکعت میں پڑھی، یا حضرت عمرؓ نے عشاء کی پہلی دو رکعت میں آلِ عمران پڑھی، دوسرا مسئلہ یہ کہ ایک ہی سورت کو دونوں رکعت میں پڑھا جائے، جیسا کہ حضور علیہ السلام نے ایک بار نماز صبح کی دونوں رکعتوں میں اذا زلزلت پڑھی۔ معلوم نہیں کہ بھول کر یا عمداً، اسی لئے ہمارے بعض اصحاب نے کہا کہ عمداً ایسا کرنا مکروہ ہے اور بعض نے کہا کہ مکروہ نہیں ہے، مبسوط میں لکھا کہ ایسا کرنا مناسب نہیں ہے، لیکن اگر کرلیا تو حرج نہیں، اور افضل یہی ہے کہ فرضوں کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور کوئی سورت پوری پڑھے۔ (عمدہ ص۱۰۱\۳)

(۶) حدیث الباب حضرت انسؓ:

اس سے بھی امام بخاری نے ثابت کیا کہ ایک رکعت میں دو سورت پڑھنا درست ہے۔ لہٰذا اس کی مطابقت بھی ترجمہ کے جزو اول سے ہے۔ علامہ عینی نے کہا کہ یہی مذہب امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا (ایک روایت میں) اور دوسرے اکابر کا بھی ہے، البتہ کچھ حضرات شعبی وغیرہ نے کہا کہ ایک رکعت میں علاوہ فاتحہ کے ایک سورت سے زیادہ پڑھنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ مصنف عبدالرزاق میں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے ایک شخص نے کہا، کہ میں نے ایک رکعت میں مفصل کی سب سورتیں پڑھیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم لوگوں نے ایسا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ اگر چاہتے تو مفصل کی سب سورتوں کی جگہ ایک ہی سورت بنا کر نازل فرمادیتے۔ لہٰذا تم ہر سورت کو اس کا حصہ رکوع و سجود سے دو۔ (واخرجہ الطحاوی ایضاً)

ائمہ اربعہ وغیرہم کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے خلاف حضرت عائشہ وحضرت حذیفہؓ کی احادیث وارد ہیں جن سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام نے ایک رکعت میں سورۂ بقرہ، آلِ عمران ونساء پڑھیں۔ اور آپ مفصل کی کئی کئی سورت ملا کر پڑھا کرتے تھے۔ (عمدہ ص۱۰۳\۳)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث الباب میں لا تری انھا تجزئک سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بھی ضمِ سورت کو واجب سمجھتے تھے۔

عدم اشتراطِ فاتحہ: علامہ عینیؒ نے لکھا کہ حدیث الباب بخاری میں سورۂ فاتحہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ بھی صراحت ہے کہ وہ صحابۂ کرام کے امام صاحب جوان سب میں سب سے افضل بھی تھے اور اسی لئے ان کی امامت سے وہ حضرات صرف نظر بھی نہیں کرسکتے تھے، وہ ہر رکعت کی قرأۃ میں افتتاح سورۂ قل ھو اللہ احد سے کرتے، پھر دوسری سورت اس کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ پھر نہ خود ان تمام صحابہ کو ان کے فاتحہ نہ پڑھنے پر کوئی اعتراض ہوا اور نہ حضور علیہ السلام نے تنبیہ فرمائی کہ تم فاتحہ کیوں نہیں پڑھتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی صحت کے

لئے قرائۃ فاتحہ کی شرط لگانا صحیح نہیں کہ بغیر اس کے نماز ہی صحیح نہ ہوگی خواہ وہ کتنا ہی قرآن مجید پڑھ لے۔ (عمدہ ص ۳\۱۰۳)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا نقد

آپ نے فرمایا کہ بظاہر اگرچہ حدیث الباب میں ترکِ فاتحہ ہے، مگر خیال ہے کہ فاتحہ بھی پڑھتے ہوں گے، ورنہ جہاں اس سے اشتراط ورکنیتِ فاتحہ کی نفی ہوتی ہے، ایجابِ فاتحہ کی بھی تو نفی ہوگی، جو مسلکِ حنفیہ کے بھی خلاف ہے۔

تحقیق لفظ اجزاء وصحت

حضرتؒ نے فرمایا کہ عام طور سے فقہاء کی عبادتوں میں یہ دونوں لفظ آتے ہیں۔ اور کہہ دیتے ہیں کہ نماز صحیح ہوگئی یا جائز ہوگئی حالانکہ وہ ان کے نزدیک بھی کراہت کے ساتھ ہوتی ہے لیکن چونکہ ان الفاظ سے بظاہر کراہت کی نفی معلوم ہوتی ہے، اس لئے مخالفوں کو اعتراض کا موقعہ مل جاتا ہے کہ ان کے نزدیک مکروہ بھی نہیں ہے، اس لئے بہتر ہوتا کہ فقہاء ان دونوں لفظوں کی جگہ دوسرے الفاظ استعمال کرتے، جن سے اعتراضات وارد نہ ہوتے اور مخالفوں کو توحش بھی نہ ہوتا۔

پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ درحقیقت صح کا لفظ صح المریض سے نہیں ہے، جو صحت باعتبارِ اوصاف پر دلالت کرتا ہے، بلکہ صرف اجزاء کے اعتبار سے ہے، یعنی اجزاء تو پورے ہیں اگرچہ اوصاف میں نقص اور کمی ہے، اور کبھی ایک لفظ لغت میں ایک معنی کے لئے وضع ہوتا ہے، پھر عرف میں اس معنی سے نکل جاتا ہے اور بلغاءِ لسان اس کو معنی اول ہی کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں تو عوام کو پریشانی ہوتی ہے کیونکہ وہ دوسری طرف کے لحاظ سے پہلے معنی کو بھول جاتے ہیں اور اس سے معانی کا تعدد بھی بلکہ موارد ومواقع کا تعدد ہوتا ہے جیسے لفظ مسح کو پیروں کے لئے پانی بہانے کے معنی ہیں اور سر کے لئے تر ہاتھ پھیرنے کے واسطے ہوتا ہے اور نضح البحر کا لفظ سمندر کی امواج کے لئے اور نضح النواضح اونٹنیوں کے پانی ڈھونڈنے کے واسطے ہوتا ہے اور نضح الانسان پانی چھڑکنے کے لئے ہوتا ہے، اسی طرح ایک ہی لفظ کے اختلاف موارد کے ساتھ معنی بدل جاتے ہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے عربی سے فارسی میں ترجمہ سید علی ہمدانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے زیادہ اچھا کسی کا نہیں دیکھا، بعینہ عربی کو فارسی کردیتے ہیں بغیر تقدیم وتاخیر کے۔ اور میرے نزدیک آج کل کے فقہ وغیرہ کے ترجمے قطعاً ساقط ہیں میرے نزدیک جازت کا ترجمہ رواشد نہیں بلکہ رواں شد ہے کہ چل گئی، یعنی مثلاً نماز تا کہ اس کے نقص وکمی کی طرف اشارہ ہوجائے اجزاء کا ترجمہ یہ ہونا چاہئے کہ کچھ ہوگئی۔ جیسے کہ ابھی حضرت ابو ہریرہؓ کا قول گزرا ہے فان لم تزد علی ام القرآن اجزأت کہ یہاں بھی اجزأت کا لفظ نقص پر دال ہے۔

قولہ حبک ایاھا الخ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس میں نیت کی تصویب ہے، عمل کی نہیں، کیونکہ اس سے پہلے حضور علیہ السلام نے مایمنعک الخ سے اس پر اعتراض کیا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی نماز کے لئے کسی سورت کا تعین کرلینا بہتر نہیں، جیسا کہ کنز میں ہے، البتہ ابن نجیم نے ان سورتوں کی تعیین کو جائز بلا کراہت بتلایا ہے جو حضور علیہ السلام سے مروی ہیں۔

امام بخاری کے توسعات

اوپر کی پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ نے حضور علیہ السلام اور صحابہؓ کرام کے کبھی کبھی کے عمل سے جواز ثابت کیا ہے اور حضرت قتادہ کا یہ قول بھی پیش کردیا کہ سب قرآن مجید ہے خدا کا کلام ہے جس طرح بھی پڑھ دو نماز ہوجائے گی مگر ہم نے اوپر حضرت ابن عمرؓ کا قول بھی پیش کیا ہے کہ انہوں نے کئی سورتوں کو ناپسند کیا ہے، امام بخاریؒ نے اس کو پیش نہیں کیا، کیونکہ وہ تو توسعات کے درپے ہوگئے، حالانکہ حضور علیہ السلام کا اکثری تعامل وہی تھا جس کی طرف حضرت ابن عمرؓ نے اشارہ فرمایا ہے، کہ ترتیب مصحف کے خلاف بھی نہ ہو، ہر رکعت کے

لئے ایک ہی سورت کامل ہو (خواہ چھوٹی ہی ہو) ایک سورت کو دو رکعتوں پر بھی تقسیم نہ کیا جائے، اور نہ ناقص سورت پڑھی جائے۔ وغیرہ ہم کچھ نہیں کہتے، حضرت ابن عمرؓ ایسے جلیل القدر صحابی کی تصریحات ہی حضرت قتادہؓ کے قول سے معارض ہیں۔ یاد ہوگا اسی طرح امام بخاری نے مساجد کے اندر سارے وہ کام جائز ثابت کئے تھے جو حضور علیہ السلام کے دورِ مبارک میں احیاناً یا کسی ضرورت کے تحت انجام پائے تھے۔

باب يقرأفي الاخريين لفاتحة الكتاب

آخری دونوں رکعتوں میں (صرف) سورہ فاتحہ پڑھی جائے

۷۳۷: حدثنا موسیٰ بن اسماعیل قال حدثنا همام عن یحییٰ عن عبدالله ابن ابی قتادة عن ابیه ان النبی صلے الله علیه وسلم کان یقرأفي الظهرفي الاولین بام الکتاب وسورتین و فی الرکعتین الاخرین بام الکتاب ویسمعنا الآیة ویطول فی الرکعة الاولیٰ مالایطیل فی الرکعة الثانیة وهکذا فی العصر وهکذا فی الصبح

ترجمہ ۷۳۷: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور دو سورتیں اور (اس کے ساتھ) پڑھتے تھے اور پچھلی دونوں رکعت میں (صرف) سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے، اور ہم کو کوئی آیت (کبھی کبھی) سنائی دیتی تھی۔ اور پہلی رکعت میں اس قدر طول دیتے تھے کہ دوسری رکعت میں نہ دیتے تھے، اور عصر اور صبح میں بھی یہی صورت تھی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ دوسری دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ ضمِ سورت کے بارے میں ہمارے تین قول ہیں، ایک یہ کہ اس سے سجدہ سہو آئے گا، دوسرا یہ کہ نہیں آئے گا، تیسرا یہ کہ نہ وہ مسنون ہے نہ مکروہ ہے، یہ قول فخر الاسلام کا ہے اور اسی کو میں اختیار کرتا ہوں۔ ورنہ مشہور مذہب حنفیہ پر احادیثِ صحیحہ صریحہ کا جواب نہ ہو سکے گا۔ فافہم۔

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک آخری دو رکعتوں میں ضم سورت مکروہ ہے، الحدیث الباب، امام شافعی کا قدیم قول جمہور کے ساتھ ہے اور جدید میں فاتحہ کے ساتھ سورتیں ملانے کا استحباب ہے۔ (کمافی الاوجز) لہٰذا امام بخاری کا ترجمۃ الباب ان پر رد کے لئے ہوگا۔ (الابواب ص ۷ ۲\۲۸)

باب من خافت القرآءة في الظهر والعصر

جس نے ظہر اور عصر کی نماز میں آہستہ قراءت کی۔ اس کا بیان

۷۳۸: حدثنا قتیبة قال حدثنا جریر عن الاعمش عن عمارة بن عمیر عن ابی معمر قال قلنا لخبابؓ اکان رسول الله صلے الله علیه وسلم یقرأفي الظهر والعصر قال نعم قلنا من این علمت قال باضطراب لحیته

ترجمہ ۷۳۸: حضرت ابومعمر روایت کرتے ہیں کہ ہم نے خبابؓ سے کہا کہ کیا رسولِ خدا ﷺ ظہر اور عصر میں قرائۃ کرتے تھے؟ خبابؓ نے کہا، ہاں! ہم نے کہا، تم نے کس طرح پہچانا؟ خبابؓ نے کہا کہ آپ کی داڑھی کی جنبش سے۔

تشریح: الابواب ص ۷ ۲\۲۸ میں ہے کہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے، سب کے نزدیک یہی ہے اور حافظؒ نے لکھا کہ حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے واضح ہے۔

باب اذاا سمع الامام الآیة

۷۳۹: حدثنا محمد بن یوسف قال حدثنا الاوزاعی قال حدثنی یحیی بن ابی کثیر قال حدثنی عبداللہ بن ابی قتادۃ عن ابیہ ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم کان یقرأ بام الکتاب وسورۃ معھا فی الرکعتین الاولیین من صلوٰۃ الظھر وصلوٰۃ العصر ویسمعنا الآیۃ احیانا وکان یطیل فی الرکعۃ الاولیٰ

ترجمہ ۷۳۹: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور اس کے ہمراہ ایک سورت اور پڑھا کرتے تھے، اور کبھی کبھی کوئی آیت ہمیں سنا دیتے تھے اور پہلی رکعت میں (زیادہ) طول دیتے تھے۔

تشریح: سری نماز میں اگر کوئی آیت جہر سے پڑھ دی جائے تو اس سے نماز مکروہ نہ ہوگی، حافظ نے لکھا کہ یہ ان کے خلاف ہوگا جو سہو کی وجہ سے پڑھنے پر یا بغیر سہو کے بھی سجدہ کرنے کو کہتے ہیں۔ (الابواب ص ۲۸۷\۲)

باب یطول فی الرکعۃ الاولیٰ

پہلی رکعت کو طویل کرے

۷۴۰: حدثنا ابونعیم قال حدثنا ھشام عن یحیی بن ابی کثیر عن عبداللہ ابن ابی قتادۃ عن ابیہ ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم کان یطول فی الرکعۃ الاولیٰ من صلوٰۃ الظھر ویقصر فی الثانیۃ ویفعل ذٰلک فی صلوٰۃ الصبح

ترجمہ ۷۴۰: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز ظہر کی پہلی رکعت طویل ادا فرماتے، اور دوسری رکعت (پہلی کے اعتبار سے) کم ہوتی تھی، اور یہی صبح کی نماز میں (بھی) کرتے تھے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیث الباب کی اسناد میں ابونعیم فضل بن دکین م ۲۱۸ھ حنفی ہیں اور امام اعظمؒ کے تلمیذ۔ ان کا نام عمرو بن حماد ہے رواۃ صحاح ستہ میں ہیں۔ ولادت ۱۳۰ھ میں ہوئی تھی، ۸۸ سال کی عمر میں انتقال فرمایا، سب ہی ناقدین رجال نے ان کی توثیق ومدح کی ہے۔ میمونی نے امام احمد سے نقل کیا کہ وہ ثقہ، متیقظ وعارف بالحدیث تھے۔ پھر امتحان میں بھی ایسے ثابت قدم نکلے کہ ان جیسا دوسرا نہ ہوسکا۔ (امانی الاحبار ص ۸\۱۳۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے انکے حفظ وتثبت کا عجیب واقعہ بھی درس بخاری میں ذکر کیا تھا۔ جو فیض الباری ص ۲\۲۹۰ میں بھی ہے، دیکھ لیا جائے۔

باب جھر الامام بالتامین وقال عطآء اٰمین دعآء امن ابن الزبیر ومن ورآءہ حتیٰ ان للمسجد للجۃ وکان ابوھریرۃ ینادی الامام لاتفتنی باٰمین وقال نافع کان ابن عمر لایدعہ ویحضھم وسمعت منہ فی ذٰلک خبراً

۷۴۱: حدثنا عبداللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابن شھاب عن سعید بن المسیب وابی سلمۃ بن عبدالرحمٰن انھما اخبراہ عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال اذا امن الامام فامنوا فانہ من وافق تامینہ تامین الملٰئکۃ غفرلہ ماتقدم من ذنبہ قال ابن شھاب وکان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول اٰمین

ترجمہ ۷۴۱: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا، جب امام آمین کہے، تو تم بھی آمین کہو اس لئے کہ

جس کی آمین ملائکہ کی آمین سے مل جائے گی، اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے ابن شہاب کہتے ہیں کہ رسول خدا علیہ آمین کہا کرتے تھے۔

تشریح: آمین کے جہر واخفاء کا مسئلہ بھی معرکۃ الآراء مسائل میں سے ہے، اس میں بڑا اختلاف شافعیہ کا ہے اور بقول حضرت شاہ صاحبؒ قدیم قول امام شافعیؒ کا یہ تھا کہ امام ومقتدی سب آمین کا جہر کریں اور جدید قول یہ ہے کہ صرف امام جہر کرے اور مقتدی اخفا کریں۔ شافعیہ نے امام شافعیؒ کے قولِ جدید کو اختیار نہ کر کے نزاعی صورت کو بڑھوادیا ہے، حالانکہ امام کے آخری قول کو ہی ترجیح دینی چاہئے تھی، اور امام بخاریؒ بھی چونکہ ان ہی کے ساتھ ہیں۔ اس لئے وہ بھی حسبِ عادت مبالغانہ تراجم قائم کررہے ہیں، یہاں حدیث الباب میں جہر کی کوئی صراحت نہیں ہے، اور صرف "اذا من الامام" کے لفظ سے جہر کا اثبات مشکل ہے، جیسا کہ ہم تفصیل کریں گے۔ لیکن ترجمہ وعنوانِ باب میں لجہ کے لفظ سے یہ تاثر دیا ہے کہ ساری مسجد لوگوں کی آمین کی وجہ سے گونج جاتی تھی۔ حالانکہ ہلکی آواز بھی اگر مجمع کی ہو تو اس کی خاص کیفیت بن جاتی ہے۔ وار دوسرا نسخہ جلبہ کا بھی ہے، جس کے معنی مختلف آوازوں کی ملی جلی کیفیت ہے، جس کے لئے صوتِ مرتفع ضروری نہیں ہے۔

استدلالِ جہر آمین پر نظر

امام بخاریؒ نے ترجمہ کے اندر حضرت ابو ہریرہؓ کا قول بھی پیش کیا ہے کہ وہ ایک وقت میں جب موذن تھے تو امام سے فرماتے تھے کہ دیکھنا فاتحہ اتنی جلد ختم نہ کر دینا کہ میری آمین رہ جائے، کیونکہ مقتدی کی آمین کا امام اور فرشتوں کے ساتھ بیک وقت ہونا مغفرتِ ذنوب کا موجب ہے، لیکن اثر، سے بھی جہر کا اثبات نہیں ہوتا۔

اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے بطورِ مزاح یہ بھی فرمایا کہ امام بخاری یہاں جہرِ آمین ثابت کرنے کی فکر میں ایسے مشغول ہوئے کہ فاتحہ کی فرضیت ورکنیت بھی بھول گئے، کیونکہ اس سے تو معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو امام کے پیچھے فاتحہ کی فکر نہ تھی بلکہ صرف آمین کی فکر تھی، اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی پہلوان اپنے کپڑے اتار کر اور لنگر لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اتر جائے اور وہ کشتی جیتنے کے خیال میں ایسا محو ہو کہ اس کو اپنے کپڑوں کا بھی خیال نہ رہے خواہ ان کو کوئی اٹھا کر ہی لے جائے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا اثر

حضرتؒ کا ارشاد گرامی اس لئے بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ جزء القرائۃ خلف الامام ص ۷ میں اپنے مسلک کی تائید میں خاص طور سے حضرت ابو ہریرہؓ کا اسم گرامی پیش کیا ہے کہ وہ قرائۃ خلف الامام کو ضروری وفرض سمجھتے تھے۔

یہاں تو صاف طور سے ثابت ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ امام کی قرائۃِ فاتحہ کو مقتدی کے لئے کافی سمجھتے تھے، اور وہ صرف اس امر کا اہتمام فرماتے تھے کہ امام کے ساتھ آمین میں شرکت فرمائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اگر کہا جائے کہ حضرت ابو ہریرہؓ اقامتِ صفوف وغیرہ کے کام میں مصروف ہوتے تھے، اس لئے وہ امام کے ساتھ فاتحہ نہ پڑھ سکتے تھے، تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ وہ عذر کر دیتے کہ مجھے تکبیر کے بعد کے وقفہ میں فاتحہ پڑھنی ہے، بغیر اس کے میری نماز امام کے پیچھے نہ ہوگی، لہٰذا اقامتِ صفوف وغیرہ کا کام ایسے حضرات کے سپرد کرادیتے جو امام کے پیچھے قرائۃ فاتحہ کو رکن وفرض نہیں سمجھتے تھے، اور ایسے صحابہ کی تعداد زیادہ بھی تھی کیونکہ خود امام بخاری نے ہی ص ۷ میں اسی مقام پر کئی صحابہ کے نام ذکر کئے ہیں جو امام کے پیچھے قرائۃ کو ضروری نہ سمجھتے تھے (حضرت ابن عمر وغیرہ) اور ضروری سمجھنے والوں میں صرف حضرت ابو ہریرہؓ کا نام پیش کیا ہے، اور ان ہی کا یہ حال تھا کہ خود امام بخاریؒ کے اقرارِ مذکور ہی سے ثابت ہوگیا کہ ان کو امام کے پیچھے فاتحہ کی نہیں بلکہ صرف آمین کی فکر تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے امرت سر اور کلکتہ میں بڑے مجمع میں برسرِ منبر اعلان کر دیا تھا کہ ذخیرۂ نقل میں کہیں بھی

مقتدیوں کے لئے جہر کا حکم ثابت نہیں ہے۔

ایک ہزار برس کا اشکال اور جواب

حضرتؒ نے فرمایا:۔اتنی مدت سے یہ اشکال حل نہ ہو سکا کہ **اذا امن الامام** کی صحیح غرض کیا ہے؟ امام مالکؒ نے فرمایا کہ حدیث **اذا قال الامام ولا الضالین قولوا آمین** سے مقتدیوں کے لئے آمین کا مقام ووقت بتلا دیا گیا ہے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقسیم ہے، لہٰذا امام امین نہ کہے گا جس طرح خارجِ خارج صلوٰۃ میں بھی امام یا مقتداء دعائیں کرتا ہے اور سب لوگ ان پر آمین کہتے ہیں۔ دعائیں پیش کرنا امام کا کام ہے اور آمین کہنا سننے والوں کا کام ہے۔

حنفیہ میں سے امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ امام پر آمین نہیں ہے (**کمافی موطأ الامام محمدؒ**) مالکیہ نے حدیث **اذا امن الامام فامنوا** کا جواب یہ دیا جب امام آمین کی جگہ پہنچے تو تم آمین کہو، جیسے انجد، ایمن، اعرق اتہم وغیرہ بولتے ہیں کہ نجد، یمن، عراق یا تہامہ کے قریب پہنچا، شافعیہ نے دوسری حدیث (**اذا قال الخ**) میں پس وپیش کیا ہے اور حافظ نے فتح الباری میں خاصی تقریر کی ہے مگر شفا نہیں ہے، میں نے فصل الخطاب وغیرہ میں کشفِ حقیقت کی ہے اور جواب اشکال دیا ہے،

خلاصۂ تحقیق انور: ایک حدیث ہے **انما جعل الامام لیؤتم به** اور اس کو راوی حدیث کہیں پوری نقل کرتے ہیں اور کہیں اس کے کچھ ٹکڑے لاتے ہیں اور دوسرے ذکر نہیں کرتے، امام مسلم نے باب **ایتمام الماموم بالامام** کے تحت حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث نقل کی حضور علیہ السلام ہمیں نماز سکھاتے تھے، جس میں یہ بھی فرماتے تھے کہ امام سے پہلے کوئی رکن ادا نہ کرو، جب وہ تکبیر کہے، تم بھی کہو، جب وہ **ولا الضالین** کہے تو تم آمین کہو، جب رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، اور جب وہ **سمع اللّٰه لمن حمده** کہے تو تم **اللهم ربنا لک الحمد** کہو،

نیز امام مسلم نے اس سے پہلے باب **التسميع والتحميد والتامين** میں بھی حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث نقل کی کہ جب قاری **غیر المغضوب علیهم ولا الضالین** کہے اور اس کے پیچھے مقتدی آمین کہیں، اور ان کی آمین آسمان والوں کے ساتھ ہو جائے تو ان کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔

امام بخاری بھی آگے باب **جهر الماموم بالتامين** میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث نمبر ۷۴۳ ان الفاظ سے لائیں گے کہ جب امام **غیر المغضوب علیهم ولا الضالین** کہے تو تم آمین کہو کیونکہ جس کا قول (آمین) فرشتوں کے قول آمین کے ساتھ موافق ہو جائے گا تو اس کے گذشتہ گناہ سب معاف ہو جائیں گے۔

اس سلسلہ کی تمام روایات سے معلوم ہوا کہ ان میں جہاں نماز کے سارے طریقے سکھائے گئے ہیں وہاں آمین کی جگہ بھی بتلائی گئی ہے، ان احادیث میں امام کی آمین کا حوالہ دینا غیر ضروری تھا، بس اتنا ہی بتلانا تھا کہ سورہ فاتحہ ختم ہو گئی، اب موقع ہے آمین کہنے کا۔

دوسری حدیث آئی ہے **اذا امن الامام فامنوا** چونکہ یہ اسی قدر ٹکڑا ہے، اور کسی بڑی حدیث کا اوپر والی حدیث کی طرح جزو نہیں ہے اور یہ حدیث صرف آمین کی فضیلت بتلانے کے لئے ہے اس لئے یہ بتلانا ضروری ہو گیا کہ آمین کس وقت کہو، اور اشارہ کیا امام کی آمین کی طرف۔ پہلی کا مقصد بیانِ موضع ہے کہ آمین کا تلفظ کس وقت کرو۔ یہ حقیقت ہے دونوں الگ الگ حدیثوں کی، جن کی وجہ سے اختلاف مذاہب پیدا ہوا جس کی تفصیل اوپر گزری ہے مگر دونوں حدیثوں میں جہر نہیں ہے، کسی نے کہا کہ اگر امام جہر نہ کرے تو پتہ کیسے چلے گا؟ میں کہتا ہوں کہ جب یہ بتلا دیا گیا کہ امام کے **ولا الضالین** کے بعد آمین کہنی ہے تو اس کے جہر کی کیا ضرورت باقی رہی؟

اس کے علاوہ ایک حدیث اور ہے **اذا امن القارئ فامنوا** جس کو امام بخاری کتاب الدعوات میں لائیں گے بظاہر وہ ان دونوں

کے ایک ہونے کا فیصلہ نہ کر سکے، اس لئے حسبِ عادت دو جگہ لائے ہیں، حالانکہ یہ دونوں سنداً ومتناً ایک ہی ہیں، میرے نزدیک ایک پیغمبر علیہ السلام کا قول ہے اور دوسری میں روایت بالمعنیٰ ہے، امام بخاری نے وہ سمجھ کر داخلِ صلوٰۃ اور خارجِ صلوٰۃ کا حکم عام ظاہر کیا ہے۔ اور اذا امن الامام کو صرف داخلِ صلوٰۃ کے لئے سمجھا ہے۔

پھر یہ کہ میرے نزدیک اذا امن الامام سے اتحادِ وقت بتلایا گیا ہے کہ سب ساتھ کہیں امام، مقتدی وملائکہ حدیث میں ہے کہ احب الکلام عنداللہ وہ ہے جو اس نے اپنے بندوں فرشتوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ سبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم اور سبحان الملک القدوس، معلوم ہوا کہ ملائکہ کی نماز بھی حنفیہ کے موافق ہے اور وعدۂ مغفرت بھی وہیں جہاں حنفیہ کے موافق چیز ہے ''اذا وافق تامینہ ...... غفر لہ ما تقدم من ذنبہ'' اور امام کی آمین بمدِ امامت نہیں ہے، بلکہ وہ بمدِ مصلی ہے، وہ بھی مقتدیوں کے درجہ میں ہو کر ان کے ساتھ کہتا ہے۔

احادیث جہر کا جواب

ابوداؤد وترمذی میں جو یہ آیا ہے کہ جہر بہا صوتہ اس کے بارے میں حنفیہ نے کہا کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے، تعلیم وغیرہ کے لئے، جیسا کہ محدث ابن جریر نے بھی کہا کہ اکثر صحابہ وتابعین کا عمل آمین کا اخفاء ہی تھا۔ (الجوہر النقی ص ۱۷۳۲) جو امام مالک کے مسلک سے بھی ثابت ہوا ہے، کیونکہ وہ حتی الامکان تعامل صحابہ وتابعین کو ہی لیا کرتے ہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے کشف الستر میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جہاں جہر ہوا ہے وہ بھی خفیف ہوا ہے، جو اخفاء ہی کے حکم میں ہے کہ کسی پاس والے نے یا صفِ اول والوں نے سن لیا۔ جیسا کہ نسائی میں ہے اور پوری بات نہ شعبہ نے نقل کی نہ سفیان نے، شاید اسی لئے بخاری ومسلم نے ان کی روایت کو نہیں لیا۔ اور امام شافعیؒ کا مذہب متون میں ہے کہ جہرِ قرائۃ سے جہرِ آمین کو پست کرے۔

حضرت ابو ہریرہ کی جس حدیث میں ہے کہ مسجد گونج اٹھتی تھی اور اس سے غیر مقلد استدلال کرتے ہیں، وہ حدیث ضعیف ہے، دوسرے اس میں بھی یہ ہے کہ پہلی صف والے سنتے تھے، (ابوداؤد)

ابن ماجہ میں جو حتی یسمع بہا اھل الصف الاول ویرتج بہا صوتہ. اس میں دونوں بے جوڑ لفظوں کو جمع کر دیا ہے، یہ راوی ضعیف ہے اور شاید وہ آج کل کے عامل بالحدیث کی طرح ہوگا۔

وائل کی حدیث میں یہ لفظ بھی ہے ''فسمعناھا منہ'' جس سے معلوم ہوا کہ کبھی سن پایا ہے۔

حاصل مطالعہ: آخر میں حضرتؒ نے فرمایا کہ خارجِ موضوع سے جو پتے ملتے ہیں، ان سے مجھے یہی سانح ہوا ہے کہ فاتحہ خلف الامام نہیں ہے، نہ رفع یدین ہے یعنی سلسلۂ ارتباط (دائیں بائیں کڑیوں کا) اور تفریع وتاصیل نہیں ہے کہ رفع یدین یا قرائۃ خلف الامام پر کسی نے مسائل کی بنا رکھی ہو۔

رفع یدین کے لئے تو قولی حدیث بھی نہیں ہے البتہ آمین کے بارے میں خارج سے بنا نکلتی ہے، جس میں خارجی حدیث سے غیر قوم کا آمین پر حسد کرنے سے جہر کی بات نکلتی ہے، مسندِ احمد میں ہے کہ یہود نے تم پر کسی بات میں اتنا حسد نہیں کیا جتنا کہ آمین پر کیا ہے لہٰذا اس کی کثرت کیا کرو، میں نے اس کا جواب بھی کشف الستر میں دے دیا ہے۔

ایک استدلال پر نظر: جہرِ آمین کے قائلین نے اذا امن الامام سے استدلال کیا کہ امام کا جہر تو مقتدیوں کو باخبر کرنے کے لئے ہے اور چونکہ مقتدیوں کو بھی اسی لفظ سے حکم ہوا اس لئے وہ بھی جہر کریں گے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اگر یہی اصول ہے تو حدیث میں تو یہ بھی ہے کہ جب موذن اذان دے تو تم بھی اسی طرح کہو جس طرح وہ کہتا ہے، یہاں تو مثل کا لفظ بھی وارد ہوا ہے لہٰذا اس سے یہ حکم نکال لو کہ سارے اذان سننے والے موذن کی طرح مینارہ پر چڑھ کر اذان دیا کریں اور حدیث میں ہے کہ امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، لہٰذا جس طرح وہ زور

سے تکبیر کہتا ہے تم بھی بلند آواز سے کہو، حدیث میں ہے کہ جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو، لہٰذا اس کے جواب میں تم بھی ربنا لک الحمد زور سے کہا کرو۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت سفیان سے روایت جہرِ آمین کی ہے اور شعبہ سے پست آواز سے کہنے کی ہے، حالانکہ حدیث ایک ہی ہے اور خود سفیان کا مذہب بھی اخفاءِ آمین کا ہے، لہٰذا ترجیح اخفاء کے لئے ہی ہوگی۔

پھر قرآن مجید کی آیاتِ مبارکہ بھی یہی تلقین کر رہی ہیں کہ دعا میں اخفاء بہتر ہے، علامہ ابن تیمیہ وابن القیم نے کہا کہ آمین کے جہر و اخفا کے مسئلہ میں اختلاف مباح کا ہے۔ اور بعض مواضع میں جہر کو ترجیح بھی دی ہے، لہٰذا اختلاف زیادہ اہم نہیں ہے

حافظ ابن حجر کی غلطی: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حافظ نے فتح میں جو جمہور کا قول جہرِ آمین کا قرار دیا ہے وہ قابلِ تعجب ہے، کیونکہ امام مالک بھی اور مالکیہ سب ہی اخفا کے قائل ہیں اور جہر کی صراحت کہیں بھی نہیں ہے۔ (معارف ص ۲/۳۹۷)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام شافعیؒ کی آخری تالیف کتاب الام ہے، جیسا کہ پہلے بھی اس کی تفصیل گذر چکی ہے اور اس کے ص ۱/۹۵ میں ہے کہ جب امام سورۂ فاتحہ سے فارغ ہو تو آمین بلند آواز سے کہے تاکہ اس کے پیچھے والے مقتدی اس کو سن کر اقتدا کریں، اور جب امام کہے تو وہ بھی کہیں، لیکن اس طرح پست آواز سے کہ وہ اپنے آپ کو سنائیں، اور مجھے پسند نہیں کہ بلند آواز سے آمین کہیں۔ اور اگر کہہ لیں تب بھی کوئی حرج نہیں۔ حیرت ہے کہ امام شافعیؒ کے جدید اور آخری قولِ فیصل کے باوجود شافعیہ نے ان کے منسوخ شدہ قدیم قول کو اختیار کر کے نزاع کو باقی رکھا، اور امام بخاری نے اس اختلاف کو اور بھی ہوا دی، پھر اس زمانہ کے غیر مقلدین تو ''دیوانہ راہوے بس است'' کے مصداق ہیں ہی۔ ان کو تو مقلدین کے خلاف پروپگینڈہ مشنری تیز کرنے کا بہانہ چاہئے، حالانکہ بقول ان کے امام ابن تیمیہ وغیرہ کے بھی اختلاف صرف مباح کا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح شافعیہ کا امامِ صلوٰۃ مقتدیوں کی صحت وفساد کا ضامن نہیں بلکہ صرف ظاہری اتباع ہے، اسی طرح شاید ان کا اپنے امامِ مذہب کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے کہ جس بات میں چاہا ان کا قولِ قدیم اختیار کر لیا اور جب چاہا قولِ جدید لے لیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ وائل کی حدیث میں بھی اضطراب ہے، اور غالباً اسی وجہ سے امام بخاریؒ اس کو اپنی صحیح میں نہیں لائے، حالانکہ وہ اثباتِ جہرِ آمین کے لئے نہایت حریص تھے، اور امام مسلم نے بھی اسی کی تخریج نہیں کی۔ تاہم وائل نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں سنتِ آمین سکھانے کے لئے جہر کیا ہوگا، (اخرجہ ابو بشر الدولابی فی کتاب الاسماء والکنی ص ۱/۱۹۷) انور المحمود ص ۱/۳۲۰ میں رجال کی بحث بھی قابلِ مطالعہ ہے۔

جمہور کا اخفاءِ آمین: ''الزوائد'' ص ۲/۱۰۸ میں حضرت علی وعبداللہ بن مسعودؓ سے نقل ہوا کہ وہ بسم اللہ، تعوذ اور آمین کا جہر نہ کرتے تھے اور کنز العمال ص ۴/۲۴۹ میں حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ امام چار چیزوں کا اخفا کرے:۔ تعوذ، بسم اللہ، آمین اللّٰھم ربنا ولک الحمد. غرض حضرت عمر، علی، عبداللہ بن مسعود، ابراہیم نخعی، جمہور صحابہ وتابعین اور سارے اہلِ کوفہ کا مذہب اخفاءِ آمین ہے۔ (معارف السنن ص ۲/۴۱۳)

محقق امت حافظ ابو عمر ابن عبدالبر کا ارشاد

آپ نے حدیث اذا امن الامام فامنوا سے استنباط کیا کہ امام کے پیچھے قرائۃ نہیں ہے کیونکہ حدیث نے بتلایا ہے کہ مقتدی امام کے آمین کہنے کا منتظر رہے، اور منتظر کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ خاموش رہے نہ کہ قرأت کرتا رہے۔ (معارف ص ۲/۴۲۶)

افاداتِ علامہ عینیؒ: آپ نے لکھا کہ امام مسلم نے اذا قال احد کم فی الصلوٰۃ کی روایت کر کے فی الصلوٰۃ کی زیادتی بتلائی جو اچھی

زیادتی ہے اوراس پر شیخ عبدالحقؒ نے الجمع بین الصحیحین میں متنبہ کیا ہے، اس سے منفرد بھی فضیلت میں شامل ہو گیا، ورنہ امام بخاری وغیرہ نے اس زیادتی کونہیں لیا ہے، ان کی روایات امام کے لئے یا مقتدی کے لئے یا دونوں کے لئے ہیں۔ پھر لکھا کہ ملائکہ سے کون سے مراد ہیں؟ بعض نے کہا کہ حفاظت کرنے والے، کسی نے کہا صبح وشام کی نمازوں میں آنے والے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ سارے فرشتے مراد ہیں حفاظت کرنے والے بھی اور جوان کے اوپر ہیں وہ بھی حتی کہ ملاء اعلی تک اور آسمانوں میں بھی جتنے ہیں۔ (عمدہ ص ۳/۱۰۹) آگے بخاری کی حدیث میں وقالت الملائکة فی السماء پر عینی لکھا کہ اس سے بھی معلوم ہوا کہ صرف حفظ مراد نہیں ہیں۔ (۔۔ص ۳/۱۱۲)

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا ارشاد

آپ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ کا حدیث الباب سے جہر آمین کے لئے استدلال تو نہایت ہی عجیب وغریب ہے، کیونکہ اس کے کسی لفظ سے بھی ان کا مقصد نہیں ثابت ہوتا، اس پر محشی علام دامت برکاتہم نے لکھا کہ حدیث اذا امن الامام سے تو جہر کا ثبوت کسی طرح ہوتا ہی نہیں نہ دلالۃ نہ اشارۃ۔ (لامع ص ۱/۳۱۲)

باب فضل التامين

آمین کہنے کی فضیلت

۷۴۲: حدثنا عبدالله بن يوسف قال اخبرنا مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اذاقال احدكم امين وقالت الملٰئكة فى السمآء امين فوافقت احدهما الاخرىٰ غفرله' ما تقدم من ذنبه

ترجمہ ۷۴۲: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آمین کہتا ہے، اور ملائکہ آسمان میں آمین کہتے ہیں، پھران دونوں میں (جس کی) ایک دوسرے کے موافق ہوگئی تو اس کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

تشریح: حافظ ابن حجرؒ نے لکھا:۔ یہاں امام بخاریؒ اعرج کے واسطہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث لائے ہیں، جو مطلق ہے، اور حالت نماز کے ساتھ مقید نہیں ہے اور فضیلت کے لئے حسب قول ابن المنیرؒ یہی کافی ہے کہ ایک مختصر سے لفظ کے کہنے پر جس میں کوئی بھی کلفت نہیں ہے۔ مغفرت ذنوب کا وعدہ الٰہیہ حاصل ہو جاتا ہے، اس اطلاق سے یہ ثابت ہوا کہ جو بھی قراءت فاتحہ کے بعد آمین کہے گا، خواہ وہ نماز میں پڑھے یا خارج میں اس کو یہ فضیلت مل جائے گی، مگر مسلم شریف کی اسی سند سے روایت میں "اذا قال احدکم فی الصلوٰۃ آمین و الملائکة فی السماء آمین" ہے جس سے نماز کی قید معلوم ہوتی ہے، لہٰذا مطلق والی روایات کو بھی مقید پر محمول کرنا چاہئے، البتہ ایک روایت ہمام عن ابی ہریرہ امام احمد کے یہاں ہے جس میں اذا امن القارئ فامنوا ہے، اس کو مطلق پر اتار سکتے ہیں اور ہر قاری کی قراءت فاتحہ پر آمین کہنے کی یہ فضیلت ہو جائے گی، خواہ نماز میں ہو یا خارج میں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حدیث مذکور میں قاری سے مراد بھی امام ہی ہو، کیونکہ حدیث ایک ہی ہے، جس کے الفاظ رواۃ کے ذریعہ مختلف ہو کر نقل ہوئے ہیں۔ (فتح الباری ص ۲/۱۸۰)

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ اگر ترجمۃ الباب کو اطلاق پر رکھا جائے تو پھر اس سے روایت ابی داؤد کی تقویت ہوگی، جس میں ہے کہ "آمین" مثل طابع اور مہر کے ہے صحیفہ کے لئے الابواب والتراجم للبخاریؒ ص ۲/۲۸۹)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام ابوداؤد اس حدیث کو باب التامین وراء الامام کے تحت آخر میں لائے ہیں، اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قراءت فاتحہ کے بعد ہی نہیں بلکہ جو دعا بھی کی جائے۔ اس کے بعد آمین کی مہر اس پر ضرور لگانی چاہیے، کہ اس سے بشارت قبولیت ملتی ہے۔ (بذل المجہود ص ۲/۱۰۶)

اسی کے ساتھ یہ بھی گذارش ہے کہ حافظ نے جو کہا کہ مسلم میں اسی سند فی الصلوٰۃ کی روایت ہے، یہ تسامح ہے کیونکہ اس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ سے دوسرے ہیں، نیز یہ کہ امام بخاری کا رجحان بھی اطلاق کی طرف ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ کتاب الدعوات کے باب التامین ص ۹۴۷ میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث لائیں گے کہ جب قاری آمین کہے تو تم بھی آمین کہوالخ وہاں بھی نماز کی قید نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں بھی امام بخاریؒ نے ارادہ مطلق کا ہی کیا ہوگا، غرض اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ حدیثیں دونوں قسم کی ہیں اطلاق والی بھی اور مقید بھی، اور فضیلت دونوں ہی کے واسطے معلوم ہوتی ہے بلکہ حدیث ابوداؤد مذکور کے ذریعہ نہ صرف قراءت کے بعد بلکہ ہر دعاء حاجت پر آمین کہنے سے بشارت قبول ملتی ہے مگر اس کے لئے تامین ملائکہ کی موافقت کی صراحت ابوداؤد میں نہیں ہے۔ واللہ تعالے اعلم

باب جهر الماموم بالتامين

مقتدی کا بلند آواز سے آمین کہنے کا بیان

۷۴۳: حدثنا عبدالله بن مسلمة عن مالک عن سمی مولیٰ ابی بکر عن ابی صالح اسمان عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اذا قال الامام غير المغضوب عليهم و لاالضآلين فقولوا آمين فانه، من وافق قوله، قول الملٰئكة غفر له، ماتقدم من ذنبه

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب امام **غیر المغضوب علیھم و لا الضالین** کہے، تو تم آمین کہو، کیونکہ جس کا کہنا ملائکہ کے کہنے سے مل جائے گا اس کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

تشریح: علامہ عینیؒ نے لکھا:۔ ابن المنیر نے حدیث الباب سے ترجمۃ الباب کی مناسبت اس طرح بتلائی کہ حدیث میں آمین کہنے کو کہا گیا ہے اور قول کا اطلاق خطاب کے ساتھ جب ہوتا ہے تو وہ جہر ہی پر محمول ہوتا ہے کیونکہ اگر اسرار مقصود ہو تو اس کی قید لگا دی جاتی ہے، علامہ عینی نے اس تاویل پر نقد کیا کہ مطلق کا اطلاق تو جہر و اخفاء دونوں پر ہوتا ہے، لہٰذا اطلاق کی صورت میں جہر کی تخصیص بلاوجہ کا فیصلہ ہے، جو کسی طرح درست نہیں۔

ابن رشید نے یہ تاویل کی کہ **اذا قال الامام فقولوا** میں مقابلہ قول کا قول سے ہے اور امام جہراً کہے گا تو ظاہر یہی ہے کہ اس کی موافقت صفت جہر میں بھی ہونی چاہیئے، علامہ عینی نے لکھا کہ یہ تاویل پہلی سے بھی زیادہ بعید تر ہے کیونکہ ظاہر کلام تو یہ ہے کہ امام آمین بھی نہ کہے جیسا کہ امام مالکؒ نے سمجھا کہ یہاں تقسیم کی گئی ہے کہ امام **و لا الضالین** کہے تو تم آمین کہو اور تقسیم شرکت کے منافی ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ امام تو جہراً کہے گا ہی، سرے سے بے محل ہے کیونکہ حدیث کا ظاہر تو یہ کہہ رہا ہے کہ وہ کہے گا ہی نہیں، پھر جہر سے کہنا کیونکر مراد ہوگا؟ اور اس کی صفت جہر میں مقتدی کا اتفاق کیونکر ثابت ہوگا؟ جب کہ ذات قول کا ہی ثبوت نہیں ہے۔

ابن بطال نے کہا کہ پہلے یہ گزر چکا کہ امام جہر سے آمین کہے گا، اور یہ بھی گذرا کہ مقتدی کو امام کی پیروی کرنی چاہئے، لہٰذا اس کو بھی امام کی طرح جہر کرنا چاہئے، علامہ عینی نے فرمایا کہ یہ تاویل پہلی دو سے بھی زیادہ ابعد ہے، اور جو تلازم بتلایا ہے وہ بھی ناقابل تسلیم ہے کیونکہ اس سے تو یہ بھی لازم آئے گا کہ مقتدی امام کی طرح قرأتہ کا بھی جہر کرے، حالانکہ اس کا قائل کوئی بھی نہیں ہے، اور کرمانی نے بھی یہی تاویل کی ہے، شاید انہوں نے اس کو ابن بطال سے ہی لیا ہو اور ان کی تاویل باطل میں شرکت کر لی۔

غرض حدیث الباب سے کسی درجہ میں امام کا آمین کہنا تو نکل سکتا ہے، جس کو امام مالکؒ کے علاوہ حنفیہ وغیرہ نے مانا ہے لیکن جہر کا اثبات نہیں ہوسکتا۔ (عمدہ ص۳/۱۱۲)

حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح ص ۲/۱۸۱ میں ابن بطال کی تاویل پر یہی اعتراض کیا ہے جو علامہ عینیؒ نے کیا ہے اور دوسری تاویل کر کے کچھ بات بنانے کی سعی کی ہے، پوری بحث پہلے آ چکی ہے، اس لئے اس کے جواب کی ضرورت نہیں۔

باب اذا رکع دون الصف

صف میں پہنچنے سے پہلے رکوع کر لینے کا بیان

۷۴۴: حدثنا موسی بن اسمٰعیل قال حدثنا همام عن الاعلم وهو زیاد عن الحسن عن ابی بکرة انه انتهیٰ الی النبی صلی الله علیه وسلم وهو راکع فرکع قبل ان یصل الی الصف فذکر ذٰلک للنبی صلی الله علیه وسلم فقال زادک الله حرصاً ولاتعد

ترجمہ: حضرت ابوبکرہؓ روایت کرتے ہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کے قریب اس حالت میں پہنچے کہ آپ رکوع میں تھے تو انھوں نے اس سے قبل کہ صف میں شامل ہوں رکوع کر دیا، پھر اس کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا، آپ نے فرمایا:۔ اللہ تمہاری شوق زیادہ کرے، مگر اب ایسا نہ کرنا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام بخاریؒ کے نزدیک چونکہ مدرک رکوع مدرک رکعت نہیں ہوتا، کیونکہ اس نے فاتحہ نہیں پڑھی، اس طرح انھوں نے تواتر سلف کے خلاف اپنی الگ رائے بڑی سختی کے ساتھ قائم کر لی ہے، لہٰذا یہاں حضرت ابوبکرہؓ صحابی کے واقعہ کی حدیث لائے ہیں اور عنوان باب میں حکم کو حذف کر دیا ہے، کہ ایسی رکعت معتبر ہوگی یا نہیں، وہ جانتے تھے کہ سارے علماء سلف معتبر مانتے ہیں، پھر صاف طور سے کیونکر کہہ دیں کہ معتبر نہ ہوگی۔

حافظؒ نے یہاں امام بخاریؒ پر نقد کیا کہ اس بات کو بہت پہلے ابواب امامۃ کے ساتھ لانا تھا، جہاں عورت کو مردوں کی صفوف کے پیچھے الگ سے تنہا کھڑے ہونے کا حکم بھی مستقل باب قائم کر کے بتلایا تھا، علامہ عینیؒ نے لکھا کہ امام بخاری نے کسی کتاب کے بھی ذیلی ابواب میں باہم مناسبت تامہ کی رعایت نہیں کی ہے، اسی لئے ہر باب کو سابق باب سے یک گونہ مناسبت کافی ہے، اور یہاں بھی پہلے باب میں قراءۃ فاتحہ کے بعد آمین کا باب لائے تھے کہ فاتحہ اس پر ختم ہوتی ہے اس کے بعد رکوع کو لے آئے، اتنی مناسبت کافی ہے۔

علامہ عینی نے متعدد احادیث ذکر کر کے حضرت ابوبکرہؓ کا واقعہ تفصیل سے دکھایا ہے اور یہ بھی بتلایا کہ بہت سے صحابہ نے ان کے علاوہ بھی اسی طرح جماعت میں شرکت کی ہے، اور اس رکعت و رکوع کو بغیر فاتحہ کے معتبر سمجھا ہے، بلکہ ایک واقعہ دو صحابی کا یہ بھی ذکر کیا ہے کہ دونوں نے اسی طرح رکوع میں شرکت کی تو ایک یہ سمجھ کر کہ رکوع سے رکعت نہیں ملی، کھڑا ہونے لگا کہ اس رکعت کو پڑھے، دوسرے ساتھی نے اس کو بٹھلا دیا اور کہا کہ تم نے تو رکعت پالی تھی ان سب واقعات کو پڑھ کر امام بخاری کا رسالہ جزء القراءت پڑھا جائے کہ کسی طرح اس رکعت کو معتبر ماننے پر تیار نہیں ہوئے، اور جمہور و سلف کے خلاف اپنی رائے پر مصر رہے۔

اس کے بعد یہ مسئلہ آتا ہے کہ صفوف رجال کے پیچھے اگر کوئی تنہا کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو اس کا حکم کیا ہے، حافظ عینیؒ نے لکھا کہ امام ابوحنیفہ، ابن المبارک، حسن بصری، امام مالک، شافعی، ابو یوسف، محمد، اوزاعی و ثوری وغیرہ کے نزدیک صحیح ہوگی مگر کراہت کے ساتھ، اور جس حدیث میں ہے کہ ایک شخص کی نماز صف کے پیچھے نہیں ہوتی اس کا مقصد یہ ہے کہ کامل نہیں ہوتی جیسے لا وضوء لمن لم یسم اور لا صلوٰة لجار المسجد الا فی المسجد وغیرہ میں کمال کی نفی ہے، اور ابن ماجہ اور وابصہ کی حدیث ضعیف ہے۔ امام شافعیؒ نے بھی فرمایا کہ اگر اس بارے میں کوئی حدیث صحیح ہوتی تو میں اسی پر عمل کرتا۔ علامہ خطابی نے کہا کہ رکوع نماز کا جزو ہے، جب وہ صحیح ہو گیا ساری قوم سے الگ ہو کر تو اسی طرح باقی اجزاء بھی صحیح ہوں گے البتہ نماز مکروہ ہوگی، کیونکہ حضور علیہ السلام نے لاتعد فرمایا، کہ وہ ناپسندیدہ اور غیر افضل ہے۔

امام احمد، اسحٰق وابن المنذر شافعی، ابراہیم نخعی وغیرہ کے نزدیک اس کی نماز باطل ہوتی ہے۔ علامہ عینی نے یہاں دوسری احادیث بھی ذکر کریں، جن سے تنہا صف کے پیچھے نماز صحیح نہ ہونے کا ذکر ہے اور علامہ نے ان کے رجال رواۃ کا ضعف ثابت کیا۔ (عمدہ ص ۳/۱۱۶) اس سے بھی معلوم ہوا کہ بقول امام شافعیؒ اس بارے میں کوئی حدیث صحیح قوی نہیں ہے۔

باب اتمام التكبير فى الركوع قاله ابن عباس عن النبى صلى الله عليه وسلم و فيه مالك بن الحويرث

۷۴۵: حدثنا اسحٰق الواسطى قال حدثنا خالد عن الجريرى عن ابى العلآء عن عمران بن حصين قال صلى مع على بالبصرة فقال ذكرنا هٰذا الرجل صلوٰة كنا نصليها مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فذكر انه كان يكبر كلما رفع و كلما وضع

۷۴۶: حدثنا عبدالله بن يوسف قال اخبرنا مالك عن ابن شهاب عن ابى سلمة عن ابى هريرة انه كان يصلى بهم فيكبر كلما خفض ورفع فاذا انصرف قال انى لاشبهكم صلوٰة برسول الله صلى الله عليه وسلم

ترجمہ ۷۴۵: حضرت عمران بن حصینؓ کا بیان ہے کہ میں نے بصرہ میں حضرت علیؓ کے ساتھ نماز پڑھی، عمران کہتے ہیں کہ انھوں نے (یعنی علی مرتضیٰؓ) نے ہمیں وہ نماز یاد دلادی، جو ہم رسول خدا ﷺ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ پھر عمرانؓ نے کہا کہ وہ جب اٹھتے تھے، اور جب جھکتے تھے، تکبیر کہتے تھے۔

ترجمہ ۷۴۶: ابوسلمہ حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے تو جب جھکتے تھے، اور اٹھتے تھے، تو تکبیر کہتے تھے، اور جب (نماز سے) فارغ ہوتے تھے تو کہتے تھے کہ میں نماز میں رسول خدا ﷺ کے ساتھ تم سب سے زیادہ مشابہ ہوں۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ترجمۃ الباب کے لفظ اتمام میں دو معنی لئے جا سکتے ہیں، ایک یہ کہ تکبیر کو لمبا کر کے پوری حرکت انتقالیہ پر پھیلا دیا جائے، دوسرے یہ کہ تکبیرات صلوٰۃ کا عدد پورا کیا جائے جس میں ایک تکبیر رکوع کی بھی ہے اور اگرچہ لفظ پہلے معنے کے لئے زیادہ مناسب ہے، مگر امام بخاری کی مراد دوسرے معنے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ بنی امیہ کے بارے میں یہ بات شہرت کو پہنچ چکی تھی کہ وہ تمام تکبیرات کا اہتمام نہ کرتے تھے، مثلاً خفض کی حالت کے لئے تکبیر نہ کہتے تھے، اور عام طور سے بنی امیہ کے فسق و فجور پر نظر کرتے ہوئے، ان کے اس فعل کی تاویل بھی ضروری نہیں، مگر حضرت عثمانؓ سے بھی ایسی بات نقل ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی وجہ پیش کرنی ضروری ہوگی۔

حدیث الباب میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت علیؓ کی نماز کا ذکر مدح کے ساتھ کیا گیا ہے، کیونکہ وہ تکبیرات پوری کرتے تھے، اور حضرت ابوہریرہؓ کا بھی ذکر دوسری حدیث میں آیا کہ وہ بھی ہر خفض ورفع کے وقت تکبیر کہا کرتے تھے۔

پھر یہ کہ حدیث میں جو یہ آتا ہے کہ حضور علیہ السلام ہر خفض ورفع پر تکبیر کہتے تھے، حالانکہ قومہ کی حالت میں بجائے تکبیر کے تسمیع وتحمید بھی مروی ہے، اس کی مزید وضاحت بھی حضرت ابوہریرہؓ کے عمل سے آگے کردی گئی ہے کہ وہ پوری (چار رکعت کی) نماز میں ۲۲ مرتبہ تکبیر کہتے تھے۔ یعنی ہر رکعت میں پانچ کے حساب سے بیس اور ایک تکبیر تحریمہ اور ایک دو رکعت کے تشہد سے اٹھنے کی، کل ۲۲ ہوگئیں علاوہ ہر رکعت کی تسمیع و تحمید کے۔ کیونکہ حدیث تکبیر کل خفض ورفع کا عموم غیر مقصود ہے، اس کا مقصد ترک تکبیر عند الخفض کا رد ہے، تسمیع وتحمید کی نفی نہیں ہے۔

افادۂ انور: حضرتؒ نے فرمایا کہ خفض یعنی جھکنے کے وقت ترک تکبیر کی بات حضرت ابن عمرؓ سے بھی نقل ہوئی ہے اور میرا گمان ہے کہ وہ اس وقت رفع یدین بھی نہ کرتے ہوں گے، کیونکہ تکبیر ورفع یدین کا ساتھ ہے، اور غالباً ان کے ترک کا منشأ ابوداؤد کی حدیث جہاد ہے، جس میں

ہے کہ حضور علیہ السلام اور آپ کے ساتھی لشکر والے جب کسی اونچے مقام پر چڑھتے تھے تو تکبیر کہتے تھے، اور کسی وادی میں اترتے تھے تو تسبیح کرتے تھے، پھر راوی نے کہا کہ اسی طریقہ پر نماز بھی مشروع ہوئی ہے۔

میرے نزدیک یہ آخری بات راوی کا اجتہاد ہے، اور جماہیر صحابہؓ کے مخالف ہے۔ نیز فرمایا کہ ایسی صورت میں ان کو اجتہاد نہ چاہئے تھا کیونکہ حضور علیہ السلام کو ۲۳ سال تک نماز پڑھتے دیکھا تھا اسی طرح کرتے ہوئے۔ ٹیلہ کی چوٹی پر پہنچ کر تکبیر کہے اور بار بار کہے، پھر انحدار کے وقت اگر ابتدا اوپر ہی ہوئی ہے۔ عند الاستواء تو اسی کا اعتبار ہے خواہ کچھ حصہ انحدار کا بھی بحالت تکبیر ہو جائے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک نماز میں بھی بعد الرکوع اور بعد السجود اسی طرح ہے، لیکن ابن عمرؓ مخالف سمجھے، یہاں تسلسل ہے اور کڑیاں ہیں جو سفر والی صورت کی کڑیوں سے ملتی ہیں۔ فتامل فیہ' اور بصورت تسلیم ہم کہیں گے کہ انحطاط کے وقت کی تکبیر صلوٰۃ اگر چہ ظاہر وحس کے لحاظ سے تو پستی کے وقت ہے مگر شرعاً وہ بلندی کی ہی ہے، کیونکہ قومہ کی تکبیر مثلاً اس کی ابتدا بھی قومہ کی حالت میں ہو جاتی ہے، اگر چہ وہ پھیل کر انحدار میں بھی پہنچ جاتی ہے۔ تو یہ درحقیقت ابقاء کی کیفیت ہے ابتدا کی نہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرت ابن عمرؓ سے جو ترک رفع بین السجدتین منقول ہے، وہ بھی شاید اسی لئے ہوگا کہ وہ خفض کی حالت میں تکبیر کو بہتر خیال نہ کرتے ہوں گے اس لئے رفع بھی ختم کیا، اگر چہ رفع یدین بین السجدتین کا ثبوت بھی ضرور ہے اور وہ کسی طرح قابل رد نہیں ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ امر تکبیر عند الخفض بھی جب ان کے اپنے اجتہاد کے تحت تھا، ایسے ہی رفع یدین میں بھی ان کا اجتہاد تھا کہ کہیں اختیار کیا اور کہیں ترک کر دیا۔

علامہ بنوریؒ نے معارف السنن ص ۲/۴۴۶ میں تکبیر عند کل خفض و رفع کی مختصر مگر عمدہ بحث کر دی ہے، اس میں بھی امراء بنی امیہ کی طرف ترک تکبیرات عند الخفض کا ذکر کیا گیا ہے، اور لکھا کہ اکابر امت نے بڑوں کے اس فعل کو ترک احیانا اور بیان جواز پر محمول کیا ہے، اور فتح الباری میں جو مسند احمد سے حضرت عثمانؓ کو اول من ترک التکبیر کہا گیا ہے، اس کے مقابلہ میں طبرانی وغیرہ سے اول حضرت معاویہ یا زیاد کو دکھلایا ہے۔ اور لکھا کہ ایک جماعت اہل علم نے اس کو اخفاء پر محمول کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ کنز العمال ص ۴/۲۰۳ میں مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ سے حضرت انس کا ارشاد نقل ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر و عثمان، تکبیروں میں کمی نہ کرتے تھے اور ایک لفظ میں یہ ہے کہ یہ سب تکبیروں کو پورا کرتے تھے، رکوع کے وقت بھی اور جب اٹھتے تھے اور جب بھی جھکتے تھے۔

اور ابو داؤد کی حدیث کو (جس میں حضور علیہ السلام سے تکبیر پوری نہ کرنے کا ذکر ہے) امام طحاوی نے دوسری احادیث و آثار کے مقابلہ میں گرایا ہے، حافظ نے بھی فتح ص ۲/۲۲۳ میں اس کو ضعیف قرار دیا ہے، اور امام بخاری کا قول ان کی تاریخ سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث ہمارے نزدیک باطل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام بخاری یہاں بخاری میں اتمام کی احادیث اسی لئے لائے ہیں کہ ابو داؤد کی حدیث مذکور کا رد ہو جائے۔ اور اس کا ناقابل استدلال ہونا واضح کر دیں۔ پھر بشرط تسلیم علماء نے کہا ہے کہ شاید حضور علیہ السلام نے ایسا بیان جواز کے لئے کیا ہو، یا پوری طرح جہر نہ کیا ہو، یا زیادہ کھینچ کر تکبیر نہ کہی ہو جس کو راوی نے عدم اتمام سے تعبیر کر دیا۔ (فتح ص ۲/۱۸۳)

امام طحاوی کا ارشاد

حافظؒ نے آخر میں یہ بھی لکھا کہ امام طحاویؒ نے نقل کیا کہ کچھ لوگ صرف رفع کے وقت تکبیر کہتے تھے اور خفض کے وقت نہ کہتے تھے، اور بنو امیہ بھی ایسا کرتے تھے، ابن المنذر نے حضرت ابن عمر اور بعض سلف سے بھی اس کو نقل کیا کہ وہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ تکبیرات نہ کہتے تھے، اور بعض نے منفرد و غیر منفرد کا فرق کیا کہ تکبیر مقتدیوں کے خبر دینے کے لئے تھی تاکہ انتقالات میں امام کا اتباع کریں لہٰذا منفرد کو ضرورت

نہیں، لیکن بالآخر مشروعیت تکبیرات عندکل خفض ورفع پر ہی استقرار ہوگیا ہے اسی لئے جمہور کے نزدیک علاوہ تکبیر تحریمہ کے سب تکبیرات مستحب قرار پا گئیں۔صرف امام احمد اور بعض اہل ظاہر نے ان سب کو واجب کہا ہے۔

باب اتمام التکبیر فی السجود

سجدوں میں تکبیر کے پورا کرنے کا بیان

۷۴۷: حدثنا ابوالنعمان قال حدثنا حماد بن زید عن غیلان بن جریر عن مطرف بن عبداللہ قال صلیت خلف علی بن ابی طالب انا و عمران بن حصین فکان اذا سجد کبرواذارفع راسہ' کبرواذا نھض من الرکعتین کبرفلما قضی الصلوٰۃ اخذبیدی عمران بن حصین فقال قدذکرنی ھٰذا صلوٰۃ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اوقال لقد صلے بنا صلوٰۃ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

۷۴۸: حدثنا عمرو بن عون قال اخبرنا ھشیم عن ابی بشرعن عکرمۃ قال رایت رجلاً عندالمقام یکبر فی کل خفض و رفع واذا قام واذاوضع فاخبرت ابن عباسؓ فقال اولیس تلک صلوٰۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم لاام لک

ترجمہ ۷۴۷: مطرف بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اور عمران بن حصین نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو (میں نے ان کو دیکھا کہ) جب وہ سجدہ کرتے تھے، تکبیر کہتے تھے، اور جب اپنا سر (سجدے سے) اٹھاتے تھے، تکبیر کہتے تھے اور جب دو رکعتوں سے (فراغت کرکے تیسری رکعت کے لئے) اٹھتے تھے، تکبیر کہتے تھے، چنانچہ جب ہم نماز پڑھ چکے، تو عمران بن حصین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور (مجھ سے) کہا کہ اس شخص (یعنی علی مرتضیٰؓ) نے مجھے حضرت محمد ﷺ کی نماز یاد دلا دی، یا یہ کہا کہ بے شک انھوں نے ہمیں حضرت محمد ﷺ کی سی نماز پڑھائی:۔

ترجمہ ۷۴۸: حضرت عکرمہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک شخص کو مقام (ابراہیم) کے پاس دیکھا کہ وہ ہر جھکنے اور اٹھنے میں، اور جب کھڑا ہوتا تھا، اور جب بیٹھتا تکبیر کہتا تھا، میں نے حضرت ابن عباسؓ سے بیان کیا (کہ یہ کیسی نماز ہے) انھوں نے کہا، تیری ماں نہ رہے، کیا یہ نبی ﷺ کی (سی) نماز نہیں ہے۔

تشریح: یہاں بھی اتمام تکبیر کی تشریح مثل سابق ہے، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے اس باب اور سابق میں بھی اتمام سے مراد صرف اتیان ہو، کہ نفس تکبیر کا کہنا ہی اتمام ہے اور اس کا ترک تقصیر ہے، لہٰذا دوسری تاویلوں کی ضرورت نہ ہوگی، حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اس پر حاشیہ میں کچھ تائیدی وجوہ بھی پیش کیں، لیکن یہ بھی لکھا کہ ظاہر ہے اتمام کے اپنے اصل معنی ہی امام بخاری کی مراد معلوم ہوتے ہیں، جس کی تفصیل پہلے گذری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم (لامع ص ۱/۳۱۵)

قولہ او لیس تلک صلوٰۃ النبی ﷺ اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا دیکھا جائے کہ حضرت عکرمہ کتنی غلط فہمی میں پڑ گئے تھے کہ ایک امر منکر (ترک تکبیر) کو سنت اور سنت (تکبیر ہر رکن) کو منکر سمجھے ہوئے تھے اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے سختی کے ساتھ اس کا رد کیا اور بتلایا کہ اصل سنت نبویہ تو تکبیرات کو پورا کرنا ہی ہے، تراجم بخاری بھی اسی طرف مشیر ہیں کہ ابوداؤد کی حدیث عدم اتمام تکبیر والی

سے غلط فہمی نہ ہو اور امام بخاری نے اپنا مختار بھی اہتمام ہی بتلایا اور اس کو متعدد تراجم سے ظاہر کیا۔

باب التكبير اذا قام من السجود

سجدوں سے جب (فارغ ہوکر) کھڑا ہو تو اس وقت تکبیر کہنے کا بیان

۷۴۹: حدثنا موسیٰ بن اسماعيل قال حدثنا همام عن قتادة عن عكرمة قال صليت خلف شيخ بمكة فكبر ثنتين و عشرين تكبيرةً فقلت لابن عباسؓ انه احمق فقال ثكلتك امك سنة ابى القاسم صلے الله عليه وسلم وقال موسیٰ حدثنا ابان قال قتادة حدثنا عكرمة

۷۵۰: حدثنا يحيى بن بكير قال حدثنا الليث عن عقيل عن ابن شهاب قال اخبرنى ابوبكر بن عبدالرحمٰن بن الحارث انه سمع اباهريرة يقول كان رسول الله صلے الله عليه وسلم اذاقام الى الصلوٰة يكبر حين يقوم ثم يكبر حين يركع ثم يقول سمع الله لمن حمده حين يرفع صلبه من الركعة ثم يقول وهو قآئم ربنا لك الحمد ثم يكبر حين يهوى ثم يكبر حين يرفع راسه ثم يكبر حين يرفع راسه ثم يفعل ذٰلك فى الصلوٰة كلها حتىٰ يقضيها ويكبر حين يقوم من الثنتين بعد الجلوس وقال عبدالله بن صالح عن الليث ولك الحمد

ترجمہ ۷۴۹: حضرت عکرمہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کے پیچھے نماز پڑھی۔ تو اس نے بائیس ۲۲ تکبیریں کہیں، میں نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ وہ احمق ہے، حضرت ابن عباسؓ بولے، کہ تیری ماں تجھے روئے، ابوالقاسم ﷺ کی سنت یہی ہے، اور موسیٰ نے کہا ہم سے ابان نے بہ سند قتادہ عکرمہ روایت کیا۔

ترجمہ ۷۵۰: حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارثؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول خدا ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو کھڑے ہوتے وقت تکبیر کہتے تھے، پھر جس وقت رکوع کرتے تھے۔ تکبیر کہتے تھے، پھر رکوع سے اپنی پیٹھ اٹھاتے تو سمع الله لمن حمده کہتے تھے، پھر کھڑے ہوتے ہی ربنا لک الحمد کہتے تھے پھر جب (سجدہ کے لئے) جھکنے لگتے، تکبیر کہتے تھے، پھر جب اپنا سر (سجدے سے) اٹھاتے، تکبیر کہتے تھے، پھر جب سجدہ کرتے تھے تکبیر کہتے تھے، پھر جب اپنا سر (سجدے سے) اٹھاتے، تکبیر کہتے تھے، پوری نماز میں اسی طرح کر کے ختم کر دیتے، اور جب دو رکعتوں سے بیٹھ کر اٹھتے تھے، (تب بھی) تکبیر کہتے تھے۔

تشریح: قولہ احمق پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ایسی دو روایات ہیں، ایک میں حضرت ابوہریرہؓ ہیں دوسرے میں کوئی اور ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ حضرت عکرمہ نے احمق کا لفظ حضرت ابوہریرہؓ کے لئے ہی کہا ہو، اور بخاری ص ۱۰۸ بین السطور میں جو خلف شیخ بمکتہ کے نیچے امام طحاوی کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہؓ کو متعین کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ امام طحاوی نے اس کی تصریح نہیں کی ہے۔ پھر کیا مناسب ہے کہ یہ نسبت کی جائے، اور حضرت ابوہریرہؓ ایسے جلیل القدر صحابی کو احمق کہلوایا جائے۔

ایک لفظ میں یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کا تذکرہ کیا گیا حضرت ابن عباسؓ کے پاس تو فرمایا او لیس تلک صلوٰة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم اور سارو ایت میں احمق کا لفظ نہیں ہے، دوسری حدیث خلف شیخ والی ہے اور اس میں احمق کا لفظ ہے، مگر امام طحاویؒ نے تصریح نہیں کی کہ وہ شیخ کون تھے۔

قوله ویکبر حین یقوم من الثنتین. حضرتؒ نے فرمایا کہ امام مالکؒ کے یہاں قاعدۂ اولیٰ کے لئے تکبیر نہیں ہے بلکہ مثل رکعت اولیٰ کے کھڑے ہو کر ہے، ممکن ہے امام بخاری نے یہاں اسی کی طرف اشارہ کیا ہو اور ثابت کیا کہ یہاں بھی تکبیر ہے۔

قوله فکبر ثنتین وعشرین تکبیرة پر الابواب ص۲/۳۹۱ میں قسطلانی سے لکھا:۔ ہر رکعت میں پانچ تکبیر ہیں لہٰذا چار رکعت والی نماز میں ۲۰ ہوئیں علاوہ تکبیر تحریمہ وتکبیر قیام من التشہد الاول کے اور تین رکعات والی میں سترہ دو والی میں گیارہ ہوئیں اور پانچوں وقت میں ۹۴ چورانوے تکبیر ہوئیں۔

اذا قام من السجود تحقیق انیق

حضرت شاہ صاحبؒ نے جو فرمایا کہ جس نے امام طحاویؒ کی طرف یہ نسبت کی کہ انہوں نے شیخ ابو ہریرہؓ کو قرار دیا، وہ صحیح نہیں ہے، اس کی گرہ عمدۃ القاری ص۳/۱۲۳ سے کھلتی ہے، کیونکہ اصل مغالطہ علامہ عینی ہی کو ہوا ہے، انہوں نے قولہ خلف شیخ پر لکھ دیا کہ اس کو امام طحاوی نے اپنی روایت میں ابر ہریرہ بیان کیا ہے۔ اور پھر ان کی روایت بھی نقل کی مگر اس میں شیخ کا لفظ نہیں ہے۔ بلکہ حضرت ابو ہریرہؓ کے پیچھے نماز پڑھنے کا ذکر ہے اوران کے لئے عکرمہ نے احمق کا لفظ نہیں کیا ہے غرض روایات دو ہیں اور اس طرح کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ **فللّٰه در الشیخ الانورؒ.**

دوسری روایت مذکورہ کا حوالہ عینی وحافظ دونوں نے طحاوی کے علاوہ مسند احمد وطبرانی کا بھی دیا ہے۔ (فتح ص۲/۱۸۴)

باب وضع الاکف علی الرکب فی الرکوع وقال ابو حمید فی اصحابه امکن النبی صلے الله علیه وسلم یدیه من رکبتیه

۷۵۱: حدثنا ابو الولید قال حدثنا شعبة عن ابی یعفور قال سمعت مصعب ابن سعد صلیت الیٰ جنب ابی فطبقت بین کفی ثم وضعتهما بین فخذی فنهانیؔ ابی وقال کنا نفعله' فنهیناعنه' وامرنآ ان نضع ایدینا علیٰ الرکب

ترجمہ: حضرت مصعب بن سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ کے پہلو میں (ایک مرتبہ) نماز پڑھی، تو میں نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر اپنی رانوں کے درمیان میں دبالیا، مجھے میرے باپ نے منع کیا، اور کہا کہ ہم ایسا کرتے تھے، تو ہمیں اس سے منع کردیا گیا، اور ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم اپنے ہاتھ (رکوع میں) گھٹنوں پر رکھ لیا کریں۔

تشریح: امام بخاریؒ نے اس باب میں رکوع کے وقت ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھنے کی سنیت بتلائی ہے، اور تطبیق کا رد بھی کیا ہے جو حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے، امام ترمذیؒ سے نقل ہوا کہ تطبیق اہلِ علم کے نزدیک منسوخ ہوگئی ہے اس میں کوئی خلاف نہیں بجز اس کے کہ حضرت ابن مسعودؓ اور آپ کے بعض اصحاب ایسا کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ شاید حضرت ابن مسعودؓ کو نسخ کی خبر نہیں ہوئی۔ لیکن یہ بات حضرت ابن مسعودؓ سے مستبعد ہے کیونکہ وہ قدیم الاسلام ہیں اور حضور اکرم ﷺ کی خدمتِ مبارکہ میں اکثر اوقات گزارتے تھے اور آخر تک حضور علیہ السلام کے ساتھ رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کو نسخ کی خبر نہ ہوئی ہو۔ اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے یہ تھی کہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے میں سہولت تھی اور اس کی اجازت بطور رخصت بعد کو دے دی گئی تھی جب لوگوں پر تطبیق شاق ہونے لگی تھی۔ اور حضرت ابن مسعودؓ بجائے رخصت کے عزیمت پر عامل تھے، کیونکہ عبادت میں جتنی مشقت زیادہ اتنا ہی ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے حضرت ابن مسعودؓ پر اس بارے میں طعن کیا ہے، وہ افراط فی التعصب ہے،؛ (کیونکہ حنفیہ کے بہت سے مسائل میں ان کی تائید دیکھ کر وہ ان کے ساتھ بھی تعصب برتنے لگے تھے، واللہ اعلم)۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ تطبیق کا ثبوت تو حضرت علیؓ سے بھی ہے، مصنف ابن ابی شیبہ میں آپ کا ارشاد مروی ہے کہ جب تم رکوع کرو تو

چاہے تطبیق کرو، چاہے گھٹنوں پر ہاتھ رکھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ بھی دونوں کو برابر سمجھتے تھے، لہٰذا تطبیق کو مکروہ بہ کراہت تنزیہ بھی نہیں کہہ سکتے، نیز علامہ عینیؒ نے لکھا کہ حضرت عمرؓ نے بھی تطبیق کرنے والوں کو نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔ (عمدہ ص ۳\۱۲۶)

باب اذالم یتم الرکوع
اگر کوئی شخص رکوع کو پورا نہ کرے

۷۵۲: حدثنا حفص بن عمر قال حدثنا شعبة عن سليمان قال سمعت زيد بن وهب قال رای حذيفة رجلاً لا يتم الركوع والسجود وقال ماصليت ولومت مت علىٰ غير الفطرة التى فطر الله محمداً صلے الله عليه واله وسلم

ترجمہ ۷۵۲: حضرت زید بن وہب کا بیان ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ رکوع اور سجدوں کو پورا نہ کرتا تھا، انہوں نے (اس سے) کہا کہ تو نے نماز نہیں پڑھی، اور اگر تو مرے گا، تو اس دین کے خلاف پر مرے گا، جس پر اللہ نے محمد ﷺ کو پیدا کیا تھا۔

تشریح: یہاں سے امام بخاریؒ نے متعدد ابواب تعدیلِ ارکان کی ضرورت و اہمیت بتلانے کے لئے باندھے ہیں، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جس قدر تاکید تعدیلِ ارکان کی نماز میں ہے اور کسی کی نہیں ہے، تقریباً پچاس حدیثیں اس میں وارد ہیں، اور اس کو فطرۃ نبی بتایا ہے، جو اظہارِ اہمیت کے لئے کافی ہے۔

تعدیلِ ارکان یہ ہے کہ بدن ہیئت طبعی پر پہنچ جائے اور حرکت انتقال مبدل بہ سکون ہو جائے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا کہ طمانینتِ مطلوبہ فی الصلوٰۃ یہ ہے کہ حرکت جاتی رہے، جیسا کہ اس کی تفسیر حدیث ابی حمید (ص ۲\۱۹۵) میں آنے والی ہے (فتح ص ۲\۱۸۷) **باب الطمانينة حين يرفع راسه من الركوع** میں ابوحمید نے کہا کہ حضور علیہ السلام اپنا سر مبارک اٹھا کر مستوی ہو جاتے حتیٰ کہ ہر عضو اپنی جگہ قرار پکڑ لیتا تھا۔ (فتح ص ۲\۱۹۵)

قوله ما صليت پر حافظ نے لکھا کہ یہ حضور علیہ السلام کے ارشادِ مسیئی للصلوٰۃ کی نظیر ہے، آپ نے اس کو فرمایا تھا کہ تم نے نماز نہیں پڑھی (فتح ص ۲\۱۸۶) علامہ عینیؒ نے حافظ کا قولِ مذکور نقل کر کے پھر علامہ تیمی کا قول نقل کیا کہ مراد صلوٰۃِ کاملہ کی نفی ہے، لہٰذا نفی کمالِ صلوٰۃ کی ہوئی، حقیقتِ صلوٰۃ کی نہیں، اور یہی مذہب امام ابوحنیفہ و امام محمدؒ کا ہے کہ رکوع میں طمانینت فرض نہیں ہے، بخلاف امام ابو یوسفؒ کے (عمدہ ص ۲\۱۲۶) (کیوں کہ وہ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ وغیرہ کے ساتھ ہیں) حنفیہ کے نزدیک اگر تعدیلِ ارکان نہ کرے تو اس کا یہ فعل مکروہ تحریمی ہوگا کیونکہ دوسری حدیث سے نماز کا درست ہونا مع نقصان کے ثابت ہوا ہے، جس سے وجوب کا درجہ نکلتا ہے اور ترکِ واجب سے اعادہ واجب ہوتا ہے، نہ کرے گا تو ترکِ واجب کا گناہ ہوگا۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ نماز ہی سرے سے نہیں ہوتی۔

باب استوآء الظهر فى الركوع وقال ابو حميد فى اصحابه ركع النبى صلى الله عليه وسلم ثم هصر ظهره

(رکوع میں پیٹھ کر برابر کرنے کا بیان) اور ابوحمیدؓ نے اپنے دوستوں کے جلسہ میں یہ بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع فرمایا، اس کے بعد اپنی پیٹھ کر جھکا دیا۔

تشریح: علامہ عینی نے لکھا کہ استواء ظہر سے مراد یہ ہے کہ بیٹھ کر رکوع میں سیدھا کر لے، اور سر کو بھی اس کے برابر کر لے نہ اونچا کرے نہ نیچا کرے۔ اس تعلیق کو امام بخاری آگے باب سنته الجلوس فی التشهد میں موصولاً بھی لائیں گے۔ (عمدہ ص ۱۲۷\۳)

باب حد اتمام الرکوع و الاعتدال فیه و الطمانینة

رکوع کے پورا کرنے اور اس میں اعتدال واطمینان کی مد کا بیان

۷۵۳: حدثنا بدل بن المحبر قال حدثنا شعبة قال اخبرنی الحکم عن ابن ابی لیلیٰ عن البرآء قال کان رکوع النبی صلی الله علیه وسلم وسجوده و بین السجدتین واذا رفع من الرکوع ماخلا القیام والقعود قریباً من السوآء

ترجمہ ۷۵۳: حضرت براء روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ کا رکوع اور آپ کے سجدے اور سجدوں کے درمیان کی نشست اور (وہ حالت) جب کہ آپ رکوع سے اپنا سر اٹھاتے تھے، تقریباً برابر ہوتے تھے بجز قیام اور قعود کے (کہ یہ طویل ہوتے تھے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ راوی نے یہاں چار چیزوں کا برابر ہونا بتلایا رکوع، سجود، قومہ وجلسہ، اور قیام وقعود کو مستثنیٰ کیا کیونکہ حضور علیہ السلام کے قیام میں تو تنوع ثابت ہوا ہے کبھی بہت طویل بھی کیا ہے اور کبھی بہت مختصر بھی۔ حسب موقع وضرورت چنانچہ کبھی آپ نے صبح کی نماز میں معوذتین بھی پڑھی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ طویل قرائۃ شروع فرمائی اور کسی بچہ کے رونے کی آواز سنی تو رکوع کر دیا۔ یہ سب کچھ ثابت ہے، مگر رکوع وسجود میں غطر بود کہیں ثابت نہیں ہے، یعنی ان کا پیمانہ تقریباً یکساں ہی رہا ہے، اور مسلم شریف میں جو قیام وقعود اور ان چاروں کی برابر والی روایت ہے وہ بظاہر مسامحت ہے، اور تسویہ صرف چار ہی میں ہے۔

میرے نزدیک مرادِ شارع ظاہر ومتعین ہو جانے کے بعد راویوں کے الفاظ پر جمود کرنا مناسب نہیں، نہ ان میں تاویل کی ضرورت اور جس نے تاویل کی اس نے تناسب کی بات نکالی ہے کہ اگر قرائۃ طویل ہوتی تھی تو باقی افعال میں بھی طوالت ہوتی تھی اور اگر وہ مختصر ہوتی تو باقی افعال میں بھی اختصار ہوتا تھا لیکن میرے نزدیک راجح وہی ہے جو بخاری میں ہے۔ حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حدِ اتمام غیر منضبط ہے ترجمۃ الباب میں الطمانینۃ کے لفظ کے جو صحیح بخاری کے حوض میں ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے غلط بتلایا، اور فرمایا کہ صحیح طمانینت ہے۔ جو اوپر بطور نسخہ دیا ہے۔

حضرتؒ درسِ بخاری شریف میں فرمایا کرتے تھے کہ اکثر مواضع میں حوض کے لفظ سے حاشیہ کا لفظ زیادہ صحیح اور راجح ہوتا ہے اور بعض اہم مواضع میں اس پر خاص طور سے تنبیہ فرمادیا کرتے تھے، جیسے کہ یہاں فرمائی۔

حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ تلمیذ علامہ کشمیریؒ نے تقریباً چالیس سال بخاری شریف مراد آباد میں دیو بند میں پڑھائی ہے، ان کو ایسے مواضع خوب یاد تھے، اور حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات پر نہایت اعتماد فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کی صدارتِ دار العلوم دیو بند میں مراد آباد سے دیو بند آئے اور حضرتؒ کے درس بخاری شریف میں شرکت کی، حضرتؒ صحیح اور تیز قرائۃ کرنے کو بہت پسند فرماتے تھے، مولانا فخر الدین صاحب سے قرائۃ کے لئے ارشاد فرمایا، اور اس روز مولانا نے ہی قرائۃ کی۔ مولانا کو اس میں بڑی مہارت حاصل تھی کہ جو صحیح یا راجح لفظ ہوتا وہی پڑھتے تھے خواہ وہ حوض میں ہو یا حاشیہ پر، اور بڑی روانی سے پڑھ جاتے تھے، چنانچہ قرائۃ کے درمیان کئی جگہ مولانا نے حاشیہ کا لفظ پڑھا، حضرتؒ نے ٹوکا تو کہا کہ میرے نزدیک یہی لفظ زیادہ صحیح ہے، اس لئے یہی پڑھوں گا۔ رحمهم الله رحمة واسعة.

باب امر النبی صلے اللہ علیه وسلم الذی لایتم رکوعه' بالاعادة

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک شخص کو جو رکوع کو پورا نہ کرے' نماز کے دوبارہ پڑھنے کا حکم دینے کا بیان)

۷۵۴: حدثنا مسدد قال حدثنا یحیی بن سعید عن عبیداللہ قال حدثنی یحیی بن سعید عن عبیداللہ قال حدثنی سعید المقبری عن ابیه عن ابی هریرة ان النبی صلی الله علیه وسلم دخل المسجد فدخل رجل فصلی ثم جآء فسلم علی النبی صلے الله علیه وسلم فرد علیه النبی صلے الله علیه واله وسلم السلام فقال ارجع فصل فانک لم تصل فصلی ثم جآء فسلم علی النبی صلے الله علیه وسلم فقال ارجع فصل فانک لم تصل ثلاثاً فقال والذی بعثک بالحق مآاحسن غیره' فعلمنی فقال اذاقمت الی الصلوٰة فکبر ثم اقرأ ماتیسر معک من القران ثم ارکع حتیٰ تطمئن راکعاً ثم ارفع حتیٰ تعتدل قآئماً ثم اسجد حتیٰ تطمئن ساجداً ثم ارفع حتیٰ تطمئن جالساً ثم اسجد حتیٰ تطمئن ساجداً ثم افعل ذٰلک صلوٰتک کلها

ترجمہ ۷۵۴: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے، اتنے میں ایک شخص آیا، اور اس نے نماز پڑھی، اس کے بعد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے سلام عرض کیا تو نبی کریم ﷺ نے اسے سلام کا جواب دے کر فرمایا، کہ جا نماز پڑھ اس لئے کہ تو نے نماز نہیں پڑھی، اس نے پھر نماز پڑھی، اس کے بعد پھر آیا اور نبی کریم ﷺ کو سلام کیا۔ آپ نے فرمایا، جا نماز پڑھ، اس لئے کہ تو نے نماز نہیں پڑھی، اسی طرح تین مرتبہ (آپ نے) فرمایا، تب اس نے کہا، جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اس ذات کی قسم! میں اس سے بہتر نہیں پڑھ سکتا لہٰذا آپ مجھے تعلیم فرما دیجئے! تو آپ نے فرمایا کہ جب تو نماز کے لئے کھڑا ہو، تو تکبیر کہہ، بعد اس کے جس قدر قرآن تجھے یاد ہو پڑھ اس کے بعد رکوع کر جب اطمینان سے رکوع کر لے تو اس کے بعد سر اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو جا، اس کے بعد سجدہ کر، جب اطمینان سے سجدہ کر چکے تو سا کے بعد سر اٹھا کر اطمینان سے بیٹھ جا، اس کے بعد (دوسرا) سجدہ کر، جب اطمینان سے سجدہ کر چکے تو اپنی پوری نماز میں اسی طرح کر۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ قوله علیه السلام ارجع فصل سے معلوم ہوا کہ نماز میں کسی مکروہ تحریمی کا ارتکاب ہو جائے تو اس

---

[۱] نماز جماعت کی شرعی حیثیت: ہدایہ میں جماعت کو سنت مؤکدہ لکھا ہے اور حلبی کبیر ص ۵۰۸ میں یہ تفصیل ہے:۔ امام احمدؒ کے نزدیک فرض عین ہے بغیر عذر ترک سے نماز نہ ہوگی، اور بعض نے فرض کفایہ قرار دیا۔ امام محمدؒ نے الاصل میں کہا کہ جماعت سنت موکدہ ہے، بغیر عذر مرض وغیرہ کے اس کے ترک کی اجازت نہیں، ہمارے اکثر مشائخ نے جماعت کو واجب کہا ہے:۔ المفید میں بھی واجب قرار دیا ہے اور اس کو سنت کہنا اس لئے ہے کہ اس کا وجوب سنت سے ثابت ہوا ہے، بدائع میں بھی عقلاء بالغین قادرین علی الجماعۃ پر واجب لکھا اور عذر کی حالت کو مستثنیٰ کیا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کے یہاں اس کا درجہ سنت مؤکدہ قریب بوجوب کا ضرور ہے۔

اوجز ص ۲۱۴ میں علامہ ابن رشد سے نقل کیا کہ جمہور کے نزدیک جماعت کی نماز سنت یا فرض کفایہ ہے اور ظاہریہ فرض عین کہتے ہیں۔ علامہ عینیؒ سے نقل کیا کہ سنت موکدہ ہے، جیسا کہ قدوری میں ہے اور شرح ہدایہ میں ہمارے اکثر مشائخ سے وجوب نقل ہوا ہے، اور بعض نے فرض کفایہ کہا جو امام طحاوی وکرخی وغیرہ کا بھی مختار ہے۔

حافظ نے لکھا کہ امام احمد اوزاعی وغیرہ کے نزدیک فرض عین ہے، اور امام احمد کا ایک قول واجب غیر شرط کا ہے، امام شافعی فرض کفایہ کہتے ہیں اور اسی پر ان کے جمہور متقدمین اصحاب ہیں۔ اور اسی کے قائل کثیر حنفیہ و مالکیہ بھی ہیں، باقی حضرات کا مشہور مذہب سنت موکدہ کا ہے۔

اوجز ص ۲۱۵ میں لکھا:۔ مالکیہ کا ظاہر مذہب سنت فی البلد وفی کل مسجد وفی حق کل مصلی ہے اور شہر کے لوگ جماعت مسنونہ قائم کرنے میں سستی کریں تو ان سے قتال کیا جائے۔ ابن رشد وابن بشیر نے کہا کہ شہر کے لوگوں پر جماعت کا قائم کرنا فرض کفایہ ہے اور ہر مسجد میں سنت ہے اور ہر شخص کے حق میں مستحب ہے۔

جمہور نے بہت سی احادیث سے استدلال کیا ہے، جن میں دو یہ ہیں ایک تفاضل والی، کیونکہ نماز جماعت اور اس میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نماز کا اعادہ واجب ہے اور اس کا مقتضایہ ہے کہ اگر نماز جماعت سے رہ جائے تو گھر میں تنہا پڑھ لے تو اس کا بھی اعادہ ہونا چاہئے، کیونکہ جماعت بھی واجب[1] ہے۔ ترکِ واجب کی وجہ سے اعادہ ہونا چاہئے۔ جیسا کہ یہاں واجب تعدیلِ ارکان کے ترک کے سبب سے حضور علیہ السلام نے نماز کا اعادہ کرایا ہے، علامہ شامی کو اس میں تردد ہوا کہ کیا حکم ہو کیونکہ نماز کا اعادہ کرائیں تو اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں، دوبارہ بھی تنہا ہی پڑھے گا، اور اگر اعادہ کا حکم نہ کریں تو کلیہ مذکورہ ٹوٹتا ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھے کوئی تردد نہیں ہے بلکہ جزم ویقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اعادہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ کلیہ مذکورہ اس صورت کے لئے ہے کہ اعادہ سے فائدہ ہو یا اس کے تلافی ہو سکے، اور یہاں اعادہ بے سود ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ حدیث الباب کی وجہ سے تعدیل کو فرض کے درجہ میں بھی نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ اعادہ کا حکم تعدیل کی فرضیت پر مبنی نہیں ہے، جیسا کہ امام بخاری نے خیال کیا ہے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ حکمِ اعادہ بطور ایک قسم کی تعزیر وتنبیہ کے ہو، اور یہی بظاہر ہے بھی کیونکہ حضور علیہ السلام نے اس شخص کو باوجود غلطی کے بھی اسی عمل کے پھر اعادہ کا حکم دیا۔ تاکہ وہ متنبہ ہوکر اصلاح کر لے، اور اگر سرے سے وہ عمل باطل محض ہی ہوتا جیسا کہ ترکِ فرض کی صورت میں ہونا چاہئے تو اس کو اعادہ کا حکم نہ دیتے، ناقص کے اعادہ کا حکم تو معقول ہو سکتا ہے، باطل محض کا نہیں۔ لہٰذا تعدیل کو فرض قرار دینے والوں کے لئے حدیث میں کوئی حجت نہیں ہے۔

حنفیہ کی ایک غلطی پر تنبیہ

حضرتؒ نے فرمایا کہ مسئی الصلوٰۃ والی حدیث الباب کو حضرت ابو ہریرہؓ نے بھی روایت کیا ہے اور حضرت رفاعہ ابن رافع نے بھی اور حضرت ابو ہریرہؓ کے تمام طرقِ روایات میں ''ثم اقرأ ما تیسر من القرآن'' ہے، اور اس سے حنفیہ نے عدمِ رکنیتِ فاتحہ پر استدلال کیا ہے، میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ فاتحہ اگرچہ حنفیہ کے نزدیک رکن وفرض کے درجے میں نہیں ہے مگر پھر بھی وہ واجب تو ہمارے یہاں بھی ہے۔ اور یہاں تعلیم کا موقع ہے، اگر ہم مان لیں کہ حضور علیہ السلام نے اس شخص کو فاتحہ کی تعلیم نہیں دی تو اس سے لازم آئے گا کہ کراہتِ تحریم کی (جو ترکِ واجب کو لازم ہے) تعلیم دی گئی، جو شارع علیہ السلام کی طرف کسی طرح بھی منسوب نہیں کی جا سکتی۔

دوسرے یہ کہ فاتحہ پڑھنے کا حکم اگرچہ ترمذی وغیرہ کی حدیثِ رفاعہ میں نہیں ہے، مگر وہ روایتِ ابی داؤد میں تو بہ صراحت موجود ہے، اس کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے، بلکہ میرے نزدیک وہ اجمالی طور سے حدیثِ ابی ہریرہ میں بھی موجود ہے کیونکہ اصل تیسیر کا حکم جو قرآن مجید میں ہے وہ بہ اعتبارِ حصصِ شب وطولِ قیام کے ہے، فاتحہ کے لحاظ سے نہیں ہے اور یہاں بھی بدوی کو سہولت اس لئے دی گئی کہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کچھ بھی قرآن مجید پڑھ سکتا ہے یا نہیں، اسی لئے یہ بھی روایت میں ہے کہ یہ بھی نہ ہو سکے تو تحمید وتکبیر کر لے۔ غرض ایسی کچی باتوں سے استدلالِ حنفیہ صحیح نہیں ہے۔

حضرتؒ کی وسعتِ نظر اور انصاف

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) جو نماز ہی نہ ہو تفاضل نہیں ہو سکتا، دوسری درجات والی حدیث کیونکہ اگر منفرد کی نماز کا کوئی درجہ ہی نہ ہوتا تو نماز جماعت سے اس کو ۲۵ یا ۲۷ درجہ کم بتانا کیسے صحیح ہوتا؟ اور تقدیم عشاء (طعام شب) نماز عشاء پر، اور سکینت واطمینان کے ساتھ شرکتِ جماعت کے حکم سے بھی عدمِ فرضیت کا ثبوت ہوتا ہے کیونکہ واجبات و فرائض ایسی چیزوں کی وجہ سے ترک نہیں کئے جا سکتے وغیرہ۔ اوجز میں مکمل ومدلل بحث قابلِ دید ہے۔ پھر اعذارِ ترکِ جماعت جو شامی میں ۲۰ تک لکھے ہیں، ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کی نمازِ سنتِ موکدہ یا واجب وفرضِ کفایہ کے قریب تو ہو سکتی ہے مگر شرطِ صحتِ صلوٰۃ یا فرضِ عین نہیں ہو سکتی۔ کیا کسی فرضِ عین کو بارش یا مرض وغیرہ کی وجہ سے ترک کر سکتے ہیں؟ اعذارِ ترکِ جماعت میں سے ہم چند کو یہاں درج کرتے ہیں:۔ بیماری، بارش۔ سخت سردی۔ بڑھاپے کی کمزوری ومعذوری، قصدِ سفر، کھانے کی زیادہ خواہش، رات کی تند وتیز ہوا، تاریکی، کسی بیمار کی خدمت، بول وبراز کا تقاضہ، دینی فقہی مشغولیت۔ بدائع وبحر میں یہ بھی ہے کہ کسی کی جماعت رہ جائے تو اس پر دوسری مسجد میں جا کر نمازِ جماعت ادا کرنے کی کوشش واجب نہیں ہے، اگر چلا جائے بہتر ہے ورنہ اپنی مسجد میں ہی تنہا پڑھ لے۔ (معارف ص ۱۴۷۰)

ایسے مواقع میں حضرتؒ کی وسعتِ نظر اور محدثانہ بالغ نظری اور انصاف پسندی کی داد دینی پڑتی ہے، کہ کہیں بھی اور کسی سے بھی کوئی غلطی ہو، خواہ اپنوں سے یا دوسروں سے، حضرتؒ اس کو برداشت نہ کرتے تھے، اور واضح فیصلہ صادر کر دیتے تھے اور حضرتؒ اس پر بھی سختی سے عامل تھے کہ بغیر سارے طرق واسانید ومتونِ احادیث پر نظر کئے ہوئے کوئی فیصلہ نہ کرتے تھے۔

خیال ہوتا ہے کہ شاید علامہ کوثری نے جو خود بھی بے نظیر متبحر حنفی عالم تھے، حضرت شاہ صاحبؒ کے مؤلفہ رسائل کا مطالعہ کر کے یہ فیصلہ صحیح ہی دیا تھا کہ شیخ ابن ہمام کے بعد سے اس پانچ سو برس کے عرصہ میں ایسا محقق محدث عالم پیدا نہیں ہوا۔

خدا کا شکر ہے راقم الحروف کو علامہ موصوف سے بھی تلمذ کا شرف حاصل ہوا ہے، اور ۹-۱۰اماہ کے قیامِ مصر میں ان کی بیشتر علمی مجالس میں شرکت کا موقع میسر ہوا، وہ بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی طرح کبھی کسی کی غلط تعریف نہ کرتے تھے، اور مدح وذم کا معیار دونوں کا یکساں تھا، اس لئے کوئی یہ خیال ہرگز نہ کرے کہ علامہ نے یوں ہی تعریف کردی تھی۔ اور حضرتؒ کے علوم وکمالات کا ایک ادنیٰ ثبوت خود انوارالباری آپ کے سامنے ہے۔

حضرتؒ نے اس موقع پر شیخ ابن الہمام کی ایک تحقیق پر اصولی وحدیثی نقد بھی کیا ہے، جو اہلِ علم کے لئے نہایت قیمتی علمی تحفہ ہے، وہ فیض الباری ص ۳۰۰\۲ میں بھی ہے اور اس کی تفصیل فصل الخطاب میں ہے وہاں دیکھی جائے۔

ایک دفعہ فرمایا کہ امام ابن ہمام جیسا حاذقِ فن چاروں مذاہب میں نہیں ہے۔ نیز فرمایا کرتے تھے کہ اصولِ فقہ میں امام ابن ہمام کی نظیر نہیں ہے چاروں فقہ میں علامہ قاسم سے بھی بڑھ کر ہیں۔

باب الدعآء فی الرکوع

(رکوع کی حالت میں دعا کرنے کا بیان)

۷۵۵: حدثنا حفص بن عمر قال حدثنا شعبة عن منصور عن ابی الضحیٰ عن مسروق عن عآئشة قالت کان النبی صلی الله علیه وسلم یقول فی رکوعه وسجوده سبحٰنک اللهم ربنا وبحمدک اللهم اغفرلی

ترجمہ: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے رکوع اور اپنے سجدوں میں کہا کرتے تھے **سبحانک اللّٰهم ربنا وبحمدک اللّٰهم اغفرلی**۔ (اے اللہ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اے ہمارے پروردگار میں تیری تعریف بیان کرتا ہوں، اے اللہ مجھے بخش دے) جب تک **سبح اسم ربک الاعلیٰ** اور **سبح اسم ربک العظیم** کا نزول نہ ہوا تھا، اس وقت تک حضور انور ﷺ اس قسم کی ادعیہ پڑھتے تھے، اس کے بعد **سبحان ربی العظیم** اور **سبحان ربی الاعلیٰ** مقرر ہوگیا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے رکوع میں دعا کی شرعاً اجازت ہے۔ اور حدیث الباب سے بھی ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام نے دعاءِ مغفرت کی۔ امام بخاریؒ کی نظر حدیثِ مسلم پر ہوگی جس میں ہے کہ رکوع میں تعظیمِ رب کرو، اور بندہ سب سے زیادہ قریب خدا سے سجدہ میں ہوتا ہے، اس لئے زیادہ امید ہے کہ تمہاری دعا سجدہ میں قبول ہو، لیکن تعظیمِ رب دعا کے منافی نہیں ہے، اس لئے رکوع میں تعظیمِ رب بھی کرے گا اور مختصر دعا بھی کر سکتا ہے۔ تاہم اگر امام بخاری کا ارادہ صحیح مسلم کی حدیث کا اسقاط ہو تو وہ صحیح نہیں، کیونکہ اس میں تقابل مقصود نہیں ہے کہ ایک چیز ہو تو دوسری نہ ہو لہٰذا اگر صرف دفعِ وہم مقصود ہے تو ٹھیک ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

علمی وحدیثی فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے جس حدیثِ مسلم کا حوالہ دیا ہے، اس کی ابتداء میں یہ بھی ہے کہ رکوع وسجود کی حالت میں تلاوتِ قرآن مجید کی ممانعت کی گئی ہے اور علامہ ابن رشدؒ نے لکھا کہ یہی سارے فقہاءِ امصار کا مذہب ہے، لیکن کچھ تابعین نے اس کا جواز کہا ہے اور امام بخاری کا مذہب بھی یہی ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس کیلئے صحیح حدیث نہیں ہے، علامہ نے لکھا کہ اس کیلئے حضرت علیؓ کی حدیث

بھی ہے اور وہ بھی بقول طبری حدیثِ صحیح ہے۔ اور مسلم میں مستقل باب قائم ہوا نہی وممانعت قرآن کا رکوع وسجود میں، اور آٹھ احادیثِ صحیحہ درج کی ہیں اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاری نے مسلم کی صحیح احادیث کو سا بارے میں ترک کر دیا ہے۔

علامہ ابن رشدؒ نے اسی موقع پر ص ۱۱۰\۱ میں مزید لکھا کہ اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ رکوع میں دعا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ ایک جماعت نے اس کو جائز کہا ہے اور امام بخاری بھی اسی کے قائل ہیں۔ لیکن امام مالک نے اس کو مکروہ کہا ہے (ممکن ہے یہاں امام بخاری نے امام مالک کا رد کیا ہو) پھر لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ نماز کے اندر صرف اس دعا کی اجازت دیتے ہیں جو الفاظِ قرآن مجید میں ہو، امام مالک وشافعی بغیر الفاظِ قرآن کے بھی دعا کو جائز کہتے ہیں، واضح ہو کہ امام مالک رکوع کے علاوہ نماز کے اندر تمام حالتوں میں اور ہر قسم کی دینی ودنیوی حاجات کے لئے دعا کو جائز فرماتے ہیں۔ (کمافی الابواب ۲\۲۹۳)

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ مبسوط سرخسی میں فرض نمازوں کے اندر اذکار وادعیہ سے روکا ہے، مگر میرے نزدیک ابن امیر الحاج کا قول راجح ہے کہ فرض نمازوں میں اور جماعت میں بھی اذکار وادعیہ جائز ہیں بشرطیکہ مقتدیوں پر ان سے گرانی نہ ہو، اور فرمایا کہ ''مواہب لدنیہ'' میں نماز کے مواضعِ ادعیہ کی تفصیل خوب ہے۔ اس کی مراجعت کی جائے۔

باب مایقول الامام ومن خلفه' اذا رفع راسه' من الركوع

۷۵۶: حدثنا ادم قال حدثنا ابن ابی ذئب عن سعید المقبری عن ابی هريرة قال كان النبی صلے الله علیه وسلم اذاقال سمع الله لمن حمده' قال اللهم ربنا ولک الحمد وكان النبی صلے الله علیه وسلم اذاركع واذارفع راسه' یکبر واذاقام من السجدتين قال الله اكبر

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ جب **سمع الله لمن حمده** کہتے تھے، تو (اس کے بعد) **اللّٰهم ربنا ولک الحمد** (بھی) کہتے، اور جب رکوع کرتے اور (رکوع سے) اپنا سر اٹھاتے تکبیر کہتے تھے، اور جب دونوں سجدوں سے (فارغ ہو کر) کھڑے ہوتے تھے، تو اللہ اکبر کہتے تھے۔

تشریح: حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اس موقع پر لامع ص ۳۱۶\۱ اور الابواب ص ۲۹۳\۲ میں مفید علمی تحقیقات جمع فرمادی ہیں، ضروری واہم یہ ہے کہ حدیث الباب سے ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام نے سمع اللہ لمن حمدہ بھی کہا اور **اللّٰهم ربنا ولک الحمد** بھی، اور جب آپ نے جمع کیا تو آپ کے مقتدی صحابۂ کرام نے بھی جمع کیا ہوگا۔ اور امام ابوحنیفہؒ سے بھی ایک روایت جمع کی ہے، لیکن چونکہ اکثر احادیث میں تقسیم وارد ہے، تو آپ کا مشہور مذہب بھی تقسیم ہی ہے، اور منفرد کے لئے تو ائمہ اربعہ سے جمع منقول ہے، حافظ نے لکھا کہ امام طحاوی وابن عبدالبر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، امام کے لئے یہ ہے کہ امام احمد، شافعی، ابو یوسف ومحمد جمع کے قائل ہیں، امام ابوحنیفہ وامام مالک کہتے ہیں کہ امام فقط **سمع اللّٰه لمن حمده** کہے اور مقتدی عند الجمہور فقط **ربنا لک الحمد** کہے صرف امام شافعی اس کے لئے جمع کے قائل ہیں اور امام بخاری نے بھی اکثر شارحین کے نزدیک امام شافعی کی موافقت کی ہے الخ یہ عجیب بات ہے کہ امام شافعی کے قولِ جمع کو نقل کر کے حافظ ابن حجر نے لکھا کہ اس بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے (فتح ص ۱۹۳\۲) اس طرح حافظ نے امام شافعی وامام بخاری دونوں کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔ **والحق احق ان يقال.** (مؤلف)

دوسری بحث یہ ہے کہ تحمید کن الفاظ میں افضل ہے، اوجز ص ۲۱۰\۱ سے تفصیل ملاحظہ ہو:۔

(۱) حنفیہ: علامہ شامی نے کتبِ حنفیہ سے لیا کہ سب سے افضل **اللّٰهم ربنا ولک الحمد** ہے۔ پھر **اللّٰهم ربنا لک الحمد**

(بحذف واوٗ) پھر ربنا ولک الحمد (بحذف اللہم واثباتِ واو) پھر ربنا لک الحمد (بحذف اللہم وواو) یعنی ان چاروں کلمات میں افضلیت اسی مذکورہ ترتیب سے ہے۔ (غالبًا سہولت کے خیال سے مختصر کلمہ کو اختیار کرلیا گیا ہے)

(۲) حنابلہ: صاحب المغنی نے حنابلہ کے نزدیک افضل ربنا ولک الحمد لکھا (جو امام مالک سے بھی منقول ہے) دوسرا اللّٰھم ربنا لک الحمد۔

(۳) مالکیہ: میں سے ابن القاسم نے افضل اللھم ربنا ولک الحمد کو قرار دیا جو حنفیہ کے یہاں بھی نمبر ایک پر ہے، اور مدونہ میں ہے کہ ابن القاسم نے بیان کیا کہ مجھے امام مالک نے ایک دفعہ اللھم ربنا لک الحمد کہا اور ایک مرتبہ اللھم ربنا ولک الحمد کہا اور فرمایا کہ یہ دوسرا کلمہ مجھے زیادہ محبوب ہے۔

(۴) شافعیہ: امام شافعیؒ نے ربنا لک الحمد کو اختیار کیا۔ اور فرمایا کہ واوٗ عطف کے لئے ہوتی ہے اور یہاں کوئی صحیح چیز نہیں ہے جس پر عطف کیا جائے، اس بات کا ''درایت وروایت دونوں کے اعتبار سے رد کیا گیا ہے کہ اول تو یہ روایات میں ثابت ہے، دوسرے یہ کہ عطف مقدر پر بھی جائز ہے اور خود علامہ نووی شافعی نے لکھا کہ ولک بالواو کی صورت میں وہ ماقبل سے متعلق ہوگا، یعنی ''سمع اللّٰہ لمن حمدہ'' ''ربنا فاستجب دعائنا ولک الحمد علی ھدایتنا''. حافظ نے نقل کیا کہ محقق ابن دقیق العید مالکی شافعیؒ نے کہا کہ ''اثباتِ واو سے معنی زائد نکلتے ہیں کیونکہ تقدیرِ عبارت مثلاً اس طرح ہوگی:۔ ربنا استجب ولک الحمد، لہٰذا اس میں دعا اور خبر دونوں کا مضمون آجائے گا''۔ اور یہ صورت واو عاطفہ کے لئے ہے، اور باب التکبیر اذا قام من السجود میں اس کو حالیہ قرار دینے کا قول بھی گذر چکا ہے، اور اکثر حضرات نے ثبوت واو ہی کو راجح قرار دیا ہے، اور اثرم نے کہا کہ میں نے امام احمدؒ سے سنا کہ وہ ربنا ولک الحمد میں واو کو ثابت مانتے تھے، اور کہتے تھے کہ اس میں متعدد احادیث ثابت ہیں:۔ (فتح الباری ص ۲/۱۹۲) اور ابن الاثیر نے واو حالیہ کے سوا دوسری صورتوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔ غرض امام شافعیؒ ایسے عالمِ عربیت سے یہاں واو کا انکار بہت ہی عجیب ہے۔

علامہ ابن القیم کا تفرد: آپ نے الھدیٰ میں کہا کہ ربنا لک الحمد، یا ربنا ولک الحمد اور اللّٰھم ربنا لک الحمد یہ تین صورتیں تو حدیثِ صحیح سے ثابت ہیں، باقی اللھم ربنا ولک الحمد والی صورت اللہم اور واو کو جمع کر کے صحیح نہیں ہے۔

اول تو اسی حدیث الباب بخاری میں حضور علیہ السلام ہی سے ثابت ہوا کہ آپ اللّٰھم ربنا ولک الحمد کہتے تھے۔ پھر آگے بھی باب فضل اللّٰھم ربنا ولک الحمد میں خود ترجمہ میں بھی بخاری میں واو پر اصیلی، کشمیہنی، اور مستملی تین کا تینِ صحیح بخاری کے نشانات نسخوں کے لگے ہوئے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان تینوں کے نسخوں میں واو موجود ہے اور اللہم بھی۔ پھر اسی باب کی حدیث الباب میں بھی ''اللھم ربنا ولک الحمد'' کی واو پر اصیلی کے نسخہ کا نشان ہے، غرض یہاں بخاری میں ہی تین مواضع میں اللہم اور واو کا اجتماع موجود ہے، اور علامہ ابن القیم نے فرمادیا کہ یہ اجتماع صحیح نہیں ہے یا صحیح میں نہیں ہے۔

اوپر بھی ہم نے بیانِ مذاہب کے ذیل میں معتبر حوالوں کے ساتھ واضح کیا ہے کہ امام اعظمؒ اور امام مالک کے نزدیک سب سے زیادہ شرف فضیلت کلمۂ اللّٰھم ربنا ولک الحمد ہی کو حاصل ہے۔ جس میں واو بھی ہے اور اللہم بھی۔

حافظ ابن حجرؒ نے قولہ باب فضل اللھم ربنا لک الحمد پر لکھا کہ کشمیہنی کی روایت میں ولک الحمد ہے واو کے ساتھ، اور اس سے ابن القیم کا رد ہوا کیونکہ انہوں نے یقین کے ساتھ دعویٰ کردیا کہ اللہم اور واو کے جمع کے ساتھ کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی۔ (فتح ص ۲/۱۹۲۰)

علامۂ محدث زرقانی شارح موطا امام مالکؒ نے لکھا کہ اللھم ربنا لک الحمد میں ایک روایت واو کے ساتھ بھی ہے جس سے ابن القیم کا رد ہوا کہ انہوں نے جزم کے ساتھ اس جمع کو غیر ثابت کہہ دیا ہے۔ (شرح الزرقانی ص ۱/۱۸۲)

التاج الجامع للاصول ص۱۱۷۰۷ میں بخاری کی روایت وکان النبی ﷺ اذا قال سمع اللّٰہ لمن حمدہ قال اللّٰھم ربنا ولک الحمد نقل کی، اورروایت اذا قال الامام سمع اللّٰہ لمن حمدہ فقولوا اللّٰھم ربنا ولک الحمد فانہ من وافق الخ بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤ دوترمذی پانچوں ائمۂ حدیث سے نقل کی۔

علامہ محدث باجی مالکیؒ نے لکھا کہ روایتِ سعید عن ابی ہریرہؓ میں اللّٰھم ربنا ولک الحمد وارد ہےاورامام مالک سے نقل ہوا کہ وہ اسی طرح کہا کرتے تھے۔اوراسی کو ابن القاسم مالکی نے بھی اختیار کیا ہے۔ (اوجزص۱۱۲۵۳)

دیکھا جائے کہ حافظ ابن حجر، حافظ زرقانی، علامہ باجی اور صاحب التاج ایسے اکابر محدثین جس کلمۂ تحمید کا ثبوت صحیح بتلاتے ہیں اور صحیح میں مان رہے ہیں، علامہ ابن قیم نے دعویٰ کے ساتھ اس کا انکار کر دیا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ان کے استاذِ محترم حافظ ابن تیمیہؒ اورخود انہوں نے بھی دعویٰ کیا تھا کہ کسی صحیح حدیث میں درود شریف کے کلمات میں لفظ ابراہیم وآلِ ابراہیم ایک ساتھ جمع ہو کر مروی نہیں ہوئے ہیں، حالانکہ خود بخاری جیسی اصح الکتب میں بھی یہ دونوں لفظ جمع ہو کر آئے ہیں اور اسی غلط دعا کی تردید حافظ ابن حجر نے بھی کی ہے ملاحظہ ہو فتح الباری ص۱۱۱۲۴، پوری تفصیل اس سلسلہ کی انوار الباری ص ۱۱۱۸۹ تا ص۱۱۱۹۳ میں شائع شدہ ہے اور حافظ نے بھی آٹھ احادیثِ صحاح نقل کر کےان دونوں حضرات کا رد کیا ہے۔اور یہاں بھی حافظ ابن حجر کا ردِ ابن القیم آپ کے سامنے ہے۔

ہم نے انوارالباری ص۱۱۱۰۹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رجالِ حدیث سے کما حقہ واقف نہ تھے، ورنہ وہ حدیث ثمانیۃ اوعال جیسی احادیثِ منکرہ شاذہ پر اعتماد کر کے عقائد واصول کا اثبات ان سے ہرگز نہ کرتے۔اور یہ بھی لکھا تھا کہ حافظِ حدیث ابوبکر صامتی حنبلیؒ نے مستقل رسالہ حافظ ابن تیمیہ کی اغلاط فی الرجال پر تالیف کیا تھااور حافظ ابن القیم کے ضعف وعدم حذاقت فی معرفۃ الرجال کی تصریح تو حافظ ذہبیؒ نے بھی المعجم المختص میں کی ہے جبکہ وہ ان دونوں حضرات کے بڑے مداح ومعتقد بھی تھے۔

اعلام الموقعین کا ذکر

افسوس ہے کہ باوجود اس حدیثی ضعف کے بھی حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین لکھی، جس میں ائمۂ مجتہدین (امام اعظم وامام مالک و شافعیؒ) پر الزامات ترکِ احادیث کے لگائے ہیں، اور یہ خیال نہ کیا کہ ان اکابرِ امت کے پاس ان کی پیش کردہ احادیث سے زیادہ قوی وصحیح احادیث موجود تھیں، جن پر انہوں نے اپنے مسائل مختارہ کی بنیاد رکھی ہے، اوران حضرات کی حدیث دانی اور محققانہ بصیرت اور علم بالرجال کی شہادت ساری دنیائے اسلام کے محدثینِ کبار نے دی ہے، حافظ ابن تیمیہ اس بارے میں ابن القیم سے غنیمت تھے کہ انہوں نے اعلام الموقعین والی لمبی اڑان سے پرہیز کیا۔اورانہوں نے ائمہ مجتہدین کی بڑی حد تک عزت بھی کی ہے، یہ اور بات ہے کہ بقول حضرت علامہ کشمیریؒ کے جب وہ کسی مسئلہ میں اپنی الگ دھنتے ہیں تو دوسروں کی نہیں سنتے۔اور جن مسائل میں تفرد اختیار کیا ہے، ان میں وہ ساری امت سے الگ ہو کر رہ گئے ہیں اس اجمال کی تفصیل بہت ہے اور ہم نے کچھ زیارتِ نبویہ اور توسلِ نبوی کی بحث میں لکھا بھی ہے، ملاحظہ ہو انوارالباری جلد یازدہم۔

اکابرِ امت پر جرح وتنقید

خدا کی شان کہ جو خود معرفتِ رجال میں ضعیف اور غیر معتمد تھے، انہوں نے ائمۂ مجتہدین پر مخالفتِ حدیث کا طعن کیا حالانکہ معرفتِ رجال وعللِ حدیث کا علم، علمِ حدیث کا نصف مانا گیا ہے۔اور جب تک کوئی اس فن میں کامل دستگاہ نہ رکھتا ہو۔اس کو ایسے اکابرِ امت پر حرف گیری کسی طرح بھی موزوں نہیں، جن کی حدیثی وفقہی بلند وبرتر شان کو سارے اکابر محدثینِ امت نے تسلیم کر لیا ہے۔

حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی کو دیکھئے کہ بمشکل کوئی اہم اختلافی مسئلہ ایسا ہوگا جس میں وہ امام طحاوی حنفی یا ابن عبدالبر مالکیؒ کی حدیث یا

رائے کا حوالہ نہ دیتے ہوں، اور ابھی آپ نے دیکھا کہ حافظ ابن قیم کی حدیث دانی پر کیسی کڑی تنقید کی ہے، اور اسی طرح فتح الباری میں کتنی ہی جگہ حافظ ابن تیمیہ پر بھی نقد کیا ہے، اور یہ بھی ابھی گزرا کہ خود حافظ ابن حجر ایسے متعصب شافعی المسلک نے اپنے عظیم مقتدا امام شافعیؒ کے اختیار کردہ ایک مسئلہ پر (جس میں امام بخاری بھی ساتھ ہیں) کہہ دیا کہ اس کے لئے ان کے پاس کوئی صحیح حدیث نہیں ہے، لیکن ان ہی جیسوں کو یہ حق پہنچتا بھی ہے، ہر ایک کو نہیں، انہوں نے تو ایک مرتبہ علی وجہ البصیرت فقہ حنفی کے اصول استنباطات کی احقیت کا اعتراف کر کے یہ بھی ارادہ کر لیا تھا کہ حنفی بن جائیں، مگر پھر ایک خواب کی بنا پر اس حقیقت کو بھی خواب میں بدل دیا تھا۔ ولا راد لقضانه.

حافظ ابن تیمیہ وابن القیمؒ کی جلالت قدر

ہم حافظ ابن تیمیہ وابن القیم کی جلالتِ قدر اور علمی خدمات کا تہِ دل سے اعتراف کرتے ہیں اور امتِ مرحومہ پر جو ان کے احسانات ہیں ان کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتے، مگر ان دونوں کے لئے اکابر امت کی مخالفت اور نقد و جرح کا حق ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور ان میں بڑی کمی ہے تو یہی کہ جن مسائلِ اصول و فروع میں انہوں نے جمہور سلف و خلف اور خود اپنے مقتدا امام احمدؒ کا بھی خلاف کیا ہے، وہ ان کے لئے موزوں نہ تھا، اور ہمارے نزدیک ان کے دلائل خلاف میں کوئی قوت و جان نہیں ہے۔ بس صرف اتنا سا ہمارا ان سے اختلاف ہے جس پر ہم آخر تک قائم رہیں گے ان شاء اللہ۔ کیونکہ کسی بھی خوف و طمع کے تحت ابن الوقتی اختیار کر لینا ہمارے نزدیک بدترین کردار کا مظاہرہ ہے واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل.

باب فضل اللهم ربنا ولک الحمد (اللهم ربنا ولک الحمد کہنے کی فضیلت کا بیان

۷۵۷: حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن سمی عن ابی صالح عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اذاقال الامام سمع الله لمن حمده فقولو اللهم ربنا ولک الحمد فانه من وافق قوله قول الملٰئکة غفرله ماتقدم من ذنبه

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے، تو تم اللّٰھم ربنا ولک الحمد کہو، کیونکہ جس کا قول ملائکہ کے قول سے موافق ہو جائے گا اس کے گذشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

تشریح: اس مسئلہ پر کافی بحث اوپر آ چکی ہے، یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ ارشاد لائق ذکر ہے کہ امام کے لئے تسمیع و تحمید کا جمع کرنا امام ابوحنیفہؒ سے بھی ایک روایت میں ثابت ہے۔ اور بعض اکابر فقہائے حنفیہ نے اس پر فتویٰ بھی دیا ہے مثلاً حلوانی، فضل بن محمد اور ابوعلی نسفی نے۔ اگرچہ مشہور روایت تقسیم ہی کی ہے۔

قولہ من وافق قولہ قول الملائکہ

قول الملائکہ اس لئے فرمایا گیا کہ فرشتوں کے یہاں قرآن مجید کی قرأۃ نہیں ہے اور ان کیلئے صرف اذکار واوراد کا باب ہے فقط۔ (قالہ الشیخ الانورؒ)

۷۵۸: حدثنا معاذ بن فضالة عن هشام عن یحییٰ عن ابی سلمة عن ابی هریرة قال لاقربن صلوٰة النبی صلی الله علیه وسلم فکان ابوهریرة یقنت فی الرکعة الأخرة من صلوٰة الظهر وصلوٰة العشآء وصلوٰة الصبح بعد مایقول سمع الله لمن حمده فیدعو للمؤمنین ویلعن الکفار

۷۵۹: حدثنا عبدالله بن ابی الاسود قال حدثنا اسمٰعیل عن خالد الحذآء عن ابی قلابة عن انس قال کان القنوت فی الفجر والمغرب

۷۶۰: حدثنا عبدالله بن مسلمة عن مالک عن نعیم بن عبدالله المجمر عن علی بن یحیٰ بن خلاد الزرقی عن ابیه عن رفاعة بن رافع الزرقی قال کنا یوماً نصلی ورآء النبی صلے الله علیه وسلم فلما رفع راسه' من الرکعة قال سمع الله لمن حمده قال رجل ورآء ه' ربنا ولک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیه فلما انصرف قال من المتکلم قال انا قال رایت بضعةً وثلثین ملکاً یبتدروها ایهم یکتبها اول

ترجمہ ۷۵۸: حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میں تمہاری نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے قریب کردوں گا، چنانچہ ابوہریرہؓ نماز ظہر اور نمازِ عشاء اور نمازِ فجر کی آخری رکعتوں میں سمع الله لمن حمده کے بعد دعاءِ قنوت پڑھتے تھے۔ مومنوں کے حق میں دعائے خیر اور کفار پر لعنت کرتے تھے۔

ترجمہ ۷۵۹: حضرت انسؓ نے فرمایا کہ (نبی کریم ﷺ کے زمانے میں) فجر اور مغرب (کی نماز) میں قنوت پڑھی جاتی تھی۔

ترجمہ ۷۶۰: حضرت یحییٰ بن خلاد روایت کرتے ہیں کہ رفاعہ بن رافع زرقی نے کہا کہ ہم ایک دن نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے، تو (ہم نے دیکھا کہ) جب آپ نے اپنا سر رکوع سے اٹھایا، تو فرمایا سمع اللّٰہ لمن حمدہٗ، ایک شخص نے آپ کے پیچھے کہا کہ اے ہمارے پروردگار تیرے ہی لئے تعریف ہے، بہت تعریف پاکیزہ جس میں برکت ہے، تو آپ نے فارغ ہو کر فرمایا، کہ یہ کلمات کہنے والا کون تھا، اس شخص نے عرض کیا کہ میں تھا، آپ نے فرمایا کہ میں نے کچھ اوپر تیس فرشتوں کو دیکھا کہ وہ ان کلمات کے لکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ ولی اللہؒ نے الابواب والتراجم میں لکھا کہ اکثر نسخوں میں اسی طرح یہ باب بلا ترجمہ ہے، اور بعض میں باب القنوت ہے، چونکہ پہلے باب میں بعد رکوع تسمیع وتحمید کا ذکر آیا تھا، یہاں اس کے بعد قنوت کا ذکر مناسب ہوا کہ وہ بھی بعد رکوع کے اور تسمیع وتحمید کے بعد ہوتی ہے، حضرت علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک دعاءِ قنوت تو صبح کی نماز میں پورے سال ہوتی ہے اور نمازِ وتر میں فقط آدھے رمضان میں ہے، لیکن یہاں حدیث الباب میں ذکر قنوتِ نازلہ کا ہے اور یہ حنفیہ کے نزدیک جہری نماز میں ہے، اور یہی قول امام احمد وثوری کا بھی ہے، دوسرا قول حنفیہ کا نمازِ فجر کے لئے ہے اور چونکہ احادیثِ صحیح قویہ میں یہ قبل الرکوع بھی ہے اور بعد الرکوع بھی اس لئے اس میں بھی حنفیہ کے دونوں قول ہیں، شافعیہ کے یہاں قنوتِ نازلہ سب نمازوں میں جائز ہے، اور سب ہی میں قنوت کا جہر ہے، حضرتؒ نے فرمایا کہ سری نمازوں میں جہرِ قنوت کی بات بہت ہی عجیب وغریب ہے، اور اس کے لئے انہوں نے جس حدیثِ ابی داؤد سے استدلال کیا ہے وہ ضعیف ہے۔

حافظ نے قولہ فکان ابوھریرۃؓ الخ پر لکھا کہ کہا گیا بخاری کی حدیث الباب کے مرفوع حصہ سے صرف قنوت کا وجود ثابت ہوا، مذکورہ ساری نمازوں میں وقوع ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ موقوف ہے حضرت ابوہریرہؓ پر، اور اس کی وضاحت تفسیر نساء میں آئے گی جس میں مرفوع کی تخصیص ہے نمازِ عشا کے ساتھ۔ اور ابوداؤد کی روایتِ اوزاعی عن یحییٰ میں بھی ایک ماہ تک عتمہ کی نماز میں قنوت کا ذکر ہے اور اس جیسی روایت مسلم میں بھی ہے۔ الخ (فتح الباری ص ۲/۱۹۳)

مزید تفصیل کے لئے فتح الملہم معارف السنن اور معانی الآثار دیکھی جائے۔ امام بخاری کا رجحان سری وجہری سب نمازوں میں قنوتِ نازلہ جائز ہونے کا معلوم ہوتا ہے، جو امام شافعی اور دوسرے بعض اہلِ حدیث کا بھی مذہب ہے، مگر ساری احادیثِ قنوت پر نظر کرنے پر اس کی تائید نہیں ہوتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام طحاوی نے جو کلام قنوتِ نازلہ کے بارے میں کیا ہے، اس سے متوہم ہوتا ہے کہ وہ اس کے نسخ کے قائل ہیں، مگر وہ صحیح نہیں کیونکہ علامہ عینیؒ نے شرح ہدایہ میں امام طحاوی سے مسئلہ فقہیہ نقل کیا ہے کہ قنوت نازلہ حنفیہ کے یہاں بھی ہے۔ اور فرمایا کہ ہمارے

یہاں قنوتِ نازلہ جہریہ میں ہے جیسا کہ شرح ہدایہ امیر اتقانی میں ہے، اور شرح شمس الدین نروی میں مطلقا نمازوں کے اندر جواز نقل ہوا ہے۔

قولہ رأیت بضعة و ثلاثین پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک روایت میں ۱۲ فرشتوں کا ذکر ہے، میرے نزدیک دو واقعات الگ الگ ہیں۔

تجسّدِ معانی: قولہ ان یکتبھا: فرمایا کہ مسلم میں **ایھم یصعد بھا** اول ہے۔ میرے نزدیک معانی کا تجسّد (جسد کی صورت اختیار کر لینا) اور اعراض کا تجوہر (جوہر کی صورت اختیار کرنا) عقل ونقل سے ثابت ہے، لہٰذا کلماتِ مذکورہ کا آسمانوں کی طرف چڑھنا کوئی مستبعد امر نہیں ہے۔

نفی علم غیب نبوی کی دلیل

نیز فرمایا کہ نبی کریم ﷺ پر جوامت کے درود شریف پیش ہونے کی حدیث آتی ہے کہ فرشتے مقرر ہیں وہ حضور کی خدمت میں اس کو لے جا کر پیش کرتے ہیں، اس سے بعض لوگوں نے نفی علم غیب نبوی کے لئے استدلال کیا ہے، مگر میرے نزدیک وہ صحیح نہیں، اگر چہ یہ بات اپنی جگہ طے ہے اور مسئلہ بھی یہی ہے کہ حضور علیہ السلام کے علم کی نسبت علم الٰہی کے لحاظ سے ایسی ہی ہے جیسی ایک متناہی کو غیر متناہی سے ہوتی ہے، کیونکہ فرشتوں کے پیش کرنے کا مقصد بعینہ ان کلمات کو بطور تحفہ کے بارگاہِ نبوت میں پیش کرنا ہے خواہ آپ کو ان کا علم پہلے سے ہو یا نہ ہو، جیسا کہ بارگاہِ رب العزت میں ہمارے اعمال فرشتوں کے ذریعہ پیش کئے جاتے ہیں، اور اس سے حق تعالیٰ کے علم کی نفی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کبھی تو پیش کرنے کی غرض علم ہوتی ہے اور کبھی دوسرے مقاصد ہوتے ہیں۔ اس فرق کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے اور موقع استدلال میں کچی بات نہیں اختیار کرنی چاہئے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے نفی علم غیب نبوی کے لئے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ علم غیب جزئی تو پاگل ومجنوں کو بھی ہوتا ہے یہ بھی ایک بے محل منطقی طریقہ کا استدلال تھا، جس کے جواب میں دوسری طرف سے یہ بات سُنی پڑی کہ علمِ غیب ذاتی، اور کلی تو ہم بھی حضور علیہ السلام کے لئے نہیں مانتے، صرف جزئی اور وہبی ہی مانتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ وہ لوگ ایسا علمِ جزئی مانتے ہیں جو حضور علیہ السلام کے لئے منقصت کا پہلو رکھتا ہے اور ہم وہ مانتے ہیں جو آپ کے لئے منقبت کا درجہ بنتا ہے۔

غرض حق تعالیٰ عزاسمہ کے علمِ غیب کلی وذاتی کا مسئلہ ہو، یا اس کی قدرتِ کاملہ غیر متناہیہ کا بیان ہو، یا امکانِ کذب امکانِ نظیر وامتناعِ نظیر کی بحث ہو وغیرہ وغیرہ، کسی کے لئے بھی موقع استدلال وبحث میں ایسا طریقہ اختیار کرنا جس سے حقائق ثابتہ پر غیر مقصود اور غلط اثرات وارد ہوں موزون ومناسب نہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ امکانِ کذب کی تعبیر مضر ہے، عوام کیا سمجھیں گے کہ امکانِ ذاتی اور وقوعی میں کیا فرق ہے، وہ تو یہی خیال کریں گے کہ خدا جھوٹ بول سکتا ہے۔ نعوذ باللہ۔ امکانِ نظیر کو بھی عوام کیسے سمجھیں گے کہ وہ امتناع بالغیر کے ساتھ جمع ہونے والا امکان ہے۔ اسی طرح حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبوت بالذات اور بالعرض کی تعبیر بھی مجھے اوپری لگتی ہے۔ مشکلات القرآن میں بھی اس پر کلام کیا ہے۔

وفقنا اللّٰہ تعالیٰ لما یحب ویرضی

باب الطمانینة حین یرفع راسه من الرکوع وقال ابو حمید رفع النبی صلے اللہ علیه وسلم واستوی حتی یعود کل فقالیه مکانه

۷۶۱: حدثنا ابو الولید قال حدثنا شعبة عن ثابتؒ قال کان انس ینعت لنا صلوٰة النبی صلے اللہ علیه وسلم فکان یصلی فاذا رفع راسه من الرکوع قام حتیٰ نقول قدنسی

۷۶۲: حدثنا ابوالولید قال حدثنا شعبة عن الحکم عن ابن ابی لیلےٰ عن البرآء قال کان رکوع النبی صلے اللہ علیہ وسلم وسجودہٗ واذارفع راسہٗ من الرکوع و بین السجدتین قریباً من السوآء

۷۶۳: حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا حماد بن زید عن ایوب عن ابی قلابة قال کان مالک بن الحویرث یرینا کیف کان صلوٰۃالنبی صلے اللہ علیہ وسلم وذاک فی غیروقت صلوٰۃ فقام فامکن القیام ثم رکع فامکن الرکوع ثم رفع راسہ فانصب ھنیة قال فصلی بناصلوٰۃ شیخنا ھذا ابی یزید و کان ابویزید اذا رفع راسہٗ من السجدۃ الأخرۃ استویٰ قاعداً ثم نھض

ترجمہ۷۶۱: حضرت انسؓ ہمارے سامنے نبی کریم ﷺ کی نماز کی کیفیت بیان کرتے تھے، تو وہ نماز پڑھ کر بتاتے تھے پس جس وقت وہ اپنا سر رکوع سے اٹھاتے، تو اتنے کھڑے رہتے کہ ہم کہتے، کہ یقیناً یہ (سجدے میں جانا) بھول گئے۔

ترجمہ۷۶۲: حضرت براءؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا رکوع، اور آپ کے سجدے اور جب کہ آپ اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تھے، اور دونوں سجدوں کی درمیانی نشست تقریباً (سب ہی) برابر ہوتے تھے۔

ترجمہ۷۶۳: حضرت ابوقلابہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، کہ مالک بن حویرثؓ ہمیں نماز کے وقت کے علاوہ یہ دکھایا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی نماز اس طرح ہوتی تھی، ایک دن وہ کھڑے ہوئے، اور انہوں نے پورا قیام کیا، اس کے بعد رکوع کیا اور پورا رکوع کیا، اس کے بعد سر اٹھایا اور تھوڑی دیر سیدھے کھڑے رہے، ابوقلابہ کہتے ہیں، کہ (اس وقت) مالک بن حویرث نے ہمیں ہمارے اس شیخ یعنی ابویزید کے مثل نماز پڑھائی، اور ابویزید جب اپنا سر دوسرے سجدے سے اٹھاتے تھے تو سیدھے بیٹھ جاتے تھے، اس کے بعد کھڑے ہوتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ احادیث الباب سے نماز کے اندر ہر رکن کو پوری طرح کرنے کا ثبوت ہے کہ جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر سکون سے ہو جائے، گویا شریعت کی نظر میں طولِ قیام کی اتنی اہمیت و اعتناء نہیں جتنا کہ مواضع اربعہ میں تعدیل کا ہے۔ اسی لئے قیام کی مقدار حالات و حاجات کے اقتضاء کے موافق قصیر و طویل ہر قسم کی وارد ہوئی ہے، لیکن مواضعِ اربعہ میں حضور علیہ السلام کا معمول ہمیشہ یکساں رہا ہے۔

اس پر میں نے کشف الستر میں بھی لکھا ہے۔ **قولہ "حتی نقول قد نسی"** پر فرمایا کہ اس سے جہاں قومہ کا طول معلوم ہوا یہ بھی مفہوم ہوا کہ یہ عام عادت حضور علیہ السلام کی نہ تھی۔ پھر حضرتؒ نے ذکر کیا کہ ایک عالم دیوبند آیا کرتے تھے، جو کسی کے یہاں کھانا نہ کھاتے تھے، (لعلہ لشدۃ ورعہ) اور نماز بھی کسی کے پیچھے نہ پڑھتے تھے، اور بخاری کی حدیث الباب سے استدلال کرتے تھے کہ مروجہ قومہ سے نماز نہیں ہوتی، میں نے کہا کہ لفظِ نسی دلالت کرتا ہے کہ بہت کم ایسا پیش آیا ہے، عام عادتِ مبارکہ اس کی نہ تھی، لہٰذا حدیث تو اس کے خلاف بتلا رہی ہے جو وہ سمجھے تھے۔

جلسۂ استراحت: قولہ استوی قاعدا۔ پر فرمایا کہ میرا وجدان نہیں کہتا کہ جلسۂ استراحت سنتِ راتبہ ہو، بلکہ احیاناً بوقتِ حاجت ایسا ہوا ہے، جس کو مستقل سنت سمجھ لیا گیا۔ امام طحاویؒ نے بھی اس کو ضرورت ہی پر محمول کیا ہے۔

میں نے شافعیہ کے مسلک پر یوں بھی کلام کیا ہے کہ نماز کے اندر تکبیرات کا شمار تو ۲۲ نقل ہوا ہے، پھر اگر جلسۂ استراحت کو مان لیں تو یا تو تکبیرات بڑھ جائیں گی، یا تکبیر کا ترک لازم آئے گا، حالانکہ حضور علیہ السلام کا معمول ہر خفض و رفع کے لئے تکبیر کہنے کا تھا، اور شافعیہ نے جو تاویل کی ہے وہ بھی دیکھ لی جائے کس درجہ کی ہے کہ ایک ہی تکبیر کو جو سجدہ سے اٹھنے کے وقت ہوتی ہے اس کو ہم اتنا لمبا کر دیں گے کہ وہ جلسۂ استراحت پر بھی حاوی ہو اور دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہونے تک بھی چلتی رہے۔

حضرتؒ نے مزاحاً فرمایا کہ یہ اتنی لمبی چکر والی تکبیر شاید مصری لہجہ کی ہوگی؟! میرے نزدیک یہ بالکل منشأِ شریعت کے خلاف ہے۔ پس اگر جلسہ کرنا ہی ہے تو قیام و جلسہ کو خالی رکھو تکبیر سے، کیونکہ دو تکبیریں نہیں آئیں۔ اور نہ اس قدر تطویل مشروع ہے تکبیر میں۔

قولہ فانصبّ هنية: فرمایا اس کے معنی یہ ہیں کہ بہ گئے تھوڑی دیر کے لئے، یعنی جس طرح تھوڑا پانی بہہ کر رک جاتا ہے، اسی طرح رکوع سے سر اٹھا کر اطمینان سے کھڑے ہو گئے، دوسرا نسخہ **فانصت** کا بھی ہے جو کان لگا کر خاموشی سے دوسرے کی بات سننے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس کو راوی نے یہاں سکونِ اطراف کے لئے استعمال کیا۔

علمی فائدہ: علامہ عینیؒ نے لکھا:۔ کرمانی نے کہا کہ روایت لفظِ **فانصت** کا مطلب یہ ہوگا کہ فوراً ہی سجدہ میں جانے اور جھکنے کے لئے تکبیر نہیں کہی اور کچھ دیر خاموش رہے اس پر حافظ نے نقد کیا اور کہا کہ اس سے بہتر یہ ہے کہ انصات کو سکون اعضاء کے لئے کنایہ مان لیا جائے عدمِ حرکت کو انصات سے تعبیر کر دیا گیا، جو طمانینت پر دال ہے، میں کہتا ہوں کہ کرمانی کی توجیہ زیادہ معقول ہے، کیونکہ خود تکبیر کی تاخیر ہی دلیلِ طمانیت بن جاتی ہے، اس لئے اس کو سکونِ اعضاء کیلئے کنایہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں، اور قاعدہ کے مطابق مجاز کو صرف اسی وقت اختیار کر سکتے ہیں جبکہ حقیقت پر محمول کرنا ممکن ہو۔ (عمدہ ص۱۴۰\)

باب يهوى بالتكبير حين يسجدوقال نافع كان ابن عمر يضع يديه قبل ركبتيه

۷۶۴: حدثنا ابو اليمان قال اخبرنا شعيب عن الزهري اخبرني ابوبكر بن عبدالرحمٰن بن الحارث بن هشام وابو سلمة بن عبدالرحمٰن ان اباهريرة كان يكبر في كل صلوٰة من المكتوبة وغيرها في رمضان وغيره فيكبر حين يقوم ثم يكبر حين يركع ثم يقول سمع الله لمن حمده، ثم يقول ربنا ولك الحمد قبل ان يسجد ثم يقول الله اكبر حين يهوى ساجداً ثم يكبر حين يرفع راسه، من السجود ثم يكبر حين يسجد ثم يكبر حين يرفع راسه، من السجود ثم يكبر حين يقوم من الجلوس في الاثنتين ويفعل ذٰلك في كل ركعة حتىٰ يفرغ من الصلوٰة ثم يقول حين ينصرف والذي نفسي بيده اني لاقربكم شبهاً بصلوٰة رسول الله صلى الله عليه وسلم ان كانت هٰذه لصلوٰة، حتىٰ فارق الدنيا قالا وقال ابوهريرة وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم حين يرفع راسه يقول سمع الله لمن حمده، ربنا ولك الحمد يدعولرجال فيسميهم باسمآئهم فيقول اللهم انج الوليد بن الوليد وسلمة بن هشام وعياش بن ابي ربيعة والمستضعفين من المؤمنين اللهم اشد دوطأتك علىٰ مضرواجعلها عليهم سنين كسني يوسف واهل المشرق يومئذ من مضرمخالفون له،

ترجمہ ۷۶۴: حضرت ابو ہریرہؓ ہر نماز میں تکبیر کہتے تھے، فرض ہو یا کوئی اور، رمضان میں (بھی) اور غیر رمضان میں (بھی) پس جب کھڑے ہوتے، تکبیر کہتے، پھر جب رکوع کرتے تھے، تکبیر کہتے پھر سجدہ کرنے سے پہلے **سمع اللّٰه لمن حمده** کہتے، اس کے بعد **ربنا ولك الحمد** کہتے، اس کے بعد جب سجدہ کرنے کے لئے جھکتے، اللہ اکبر کہتے، پھر جب سجدہ سے اپنا سر اٹھاتے، تکبیر کہتے، پھر جب (دوسرا) سجدہ کرتے، تکبیر کہتے، پھر جب سجدوں سے اپنا سر اٹھاتے، تکبیر کہتے، پھر جب دو رکعتوں میں بیٹھ کر اٹھتے تکبیر کہتے (خلاصہ یہ کہ) اپنی ہر رکعت میں اسی طرح کر کے، نماز سے فارغ ہو جاتے، اس کے بعد جب نماز ختم کر چکتے تو کہتے کہ اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ بلاشبہ میں تم سب میں رسولِ خدا ﷺ کی نماز سے زیادہ مشابہت رکھتا ہوں، بلاشبہ آپ کی نماز اس وقت تک بالکل ایسی ہی تھی۔ جب

کہ حضور پرنور علیہ السلام نے دنیا کو چھوڑا، عبدالرحمٰن اور ابوسلمہ (راویانِ حدیث) کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ رسولِ خدا علیہ السلام جب اپنا سر (رکوع سے) اٹھاتے تھے تو سمع اللہ لمن حمدہ (اور ربنا ولک الحمد (دونوں) کہتے تھے (اور) کچھ لوگوں کے لئے دعا کرتے تھے، اور ان کے نام لیتے (اور فرماتے تھے کہ اے اللہ ولید بن ولید کو اور سلمہ بن ہشام کو اور عیاش بن ابی ربیعہ اور کمزور مسلمانوں کو (کفارِ مکہ کے پنجۂ ظلم سے) نجات دے۔ اے اللہ اپنی پکڑ (قبیلہ) مضر پر سخت کر دے، اور اس کو ان پر قحط سالیاں بنا دے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام (کے زمانے) کی قحط سالیاں۔ اور اس زمانے میں (قبیلہ) مضر کے مشرقی لوگ آپ کے مخالف تھے۔

۷۶۵: حدثنا علی بن عبدالله قال حدثنا سفیٰن غیرمرة عن الزهری قال سمعت انس بن مالک یقول سقط رسول الله صلی الله علیه وسلم عن فرس وربما قال سفیٰن من فرس فجحش شقه' الایمن فدخلنا علیه نعوده' فحضرت الصلوٰة فصلی بنا قاعداً و قعدنا وقال سفیٰن مرةً صلینا قعوداً فلما قضی الصلوٰة قال انما جعل الامام لیؤتم به فاذا کبرفکبروا واذا رکع فارکعوا واذا رفع فارفعوا واذاقال سمع الله لمن حمده' فقولو ربنا ولک الحمد واذاسجدفاسجدوا و کذاجآء به محمدٌ قلت نعم قال لقد حفظ کذا قال الزهری ولک الحمد حفظت من شقه الایمن فلما خرجنا من عندالزهری قال ابن جریج وانا عنده' فجحش ساقة الایمن

ترجمہ ۷۶۵:۔ زہری روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک کو فرماتے ہوئے سنا کہ (ایک مرتبہ) رسولِ خدا علیہ السلام گھوڑے سے گر پڑے اور آپ کی داہنی جانب چھل گئی، ہم لوگ آپ کی خدمت میں عیادت کے لئے حاضر ہوئے، اتنے میں نماز کا وقت آ گیا، تو آپ نے ہمیں بیٹھ کر نماز پڑھائی، اور ہم بیٹھ گئے (اور سفیان نے ایک مرتبہ یہ کہا کہ ہم نے بیٹھ کر نماز پڑھی) جب آپ نماز پڑھ چکے، تو فرمایا کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، لہٰذا جب وہ تکبیر کہے، تو تم تکبیر کہو، اور جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو، اور جب وہ (سر) اٹھائے، تو تم (سر) اٹھاؤ، اور جب وہ **سمع اللّٰہ لمن حمدہ** کہے، تو تم (**ربنا ولک الحمد** کہو، اور جب وہ سجدہ کرے، تو تم سجدہ کرو۔

تشریح: حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ حضرت ابن عمرؓ جو رکوع کے بعد سجدہ کو جاتے ہوئے اپنے ہاتھ گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا بدن بھاری تھا، اگر پہلے گھٹنے زمین پر رکھتے تو بدن کا توزان بمشکل صحیح رہ سکتا تھا۔ اور اسی لئے وہ تشہد میں بھی جوزانو ہو کر بیٹھ سکتے تھے۔ (لامع ص ۱/۳۱۹)

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ بھی ایسے آثار کو جن میں ہاتھ پہلے زمین پر ٹیک کر سجدہ کرنے کی بات مروی ہے، حالتِ عذر پر محمول فرماتے تھے، کیونکہ بیماری، کمزوری یا بدن بھاری ہونے کی صورت میں بغیر ہاتھوں کے پہلے زمین پر ٹیکنے کے سجدہ میں جانا دشوار ہوا کرتا ہے۔ اور حضرتؒ نے حدیث ابی ہریرہ ترمذی والی کو بھی اسی پر اتارا ہے، اور فرمایا کہ نماز میں بروک جمل اونٹ کی نہ ہونا چاہئے، کیونکہ نماز کے اندر کسی بھی جانور کی مشابہت نہ آنی چاہئے، لہٰذا ارشادِ نبوی کا منشا یہ ہے کہ اونٹ کی طرح اگلا دھڑ سارا گرا کر باقی پچھلا دھڑ کھڑا رکھ کر سجدہ میں نہ جاؤ، بلکہ معذوری کی حالت میں ایسا کرو کہ زمین پر ہاتھ ٹیک کر سارا دھڑ ساتھ ہی نیچے لے جاؤ، حضرتؒ نے فرمایا کہ ترمذی میں تو حدیث مختصر ہے۔ نسائی وغیرہ میں یہ بھی ہے کہ سجدہ میں جاتے ہوئے اونٹ کی طرح بروک نہ کرو، اور ہاتھوں کو ٹیک کر گھٹنے بھی زمین پر رکھ دو۔ اس طرح حدیث ابی ہریرہؓ کا مطلب لیا جائے تو اس کا مقصد ہاتھوں یا گھٹنوں کا مقدم و موخر کرنا نہ ہوگا، بلکہ صرف بروک ابل کی نفی ہوگی۔ یا دوسرا احتمال یہ ہے کہ گھٹنوں کو زمین پر رکھنے سے قبل ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔ اس صورت میں بھی ترتیب یا تقدیم و تاخیر کا بیان نہیں ہوتا، بلکہ نفی ہوگی سقوط بلا اختیار کی کہ اونٹ کی طرح نہ گر جاؤ، ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر احتیاط کے ساتھ سجدہ میں جاؤ۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ''النہایہ'' اور ''التاج'' کی مراجعت کی جائے اور فرمایا کہ بیٹھتے وقت اونٹ اپنے دونوں ہاتھ، پیرو سے پہلے زمین پر ٹیکتا ہے اگر چہ اس کے دونوں گھٹنے بھی سا کے ہاتھ میں ہی ہوتے ہیں۔

ردِ ابن القیم: علامہ بنوریؒ نے معارف السنن ص ۳\۱۳۰ میں حضرت شاہ صاحب سے ابن القیم کے اس دعویٰ کا رد بھی نقل کیا کہ لغت میں اونٹ کے لئے رکبتین فی الیدین کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اور کتب لغتِ معتبرہ سے ثابت کیا کہ یہ بات تو اہلِ لغت کے یہاں بہت معروف ہے، عربی کی مشہور کتاب لغت ''اللسان'' (ص ۱\۱۴۱۷) میں ہے کہ اونٹ کا گھٹنا اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہ کہ ہر چوپایہ کے گھٹنے اس کے دونوں ہاتھوں میں اور ایڑیاں اس کے پیروں میں ہوتی ہیں۔

حدیث ابی ہریرہ ترمذی

معارف السنن ص ۳\۱۳۱ میں لکھا کہ ترمذی کی حدیث الباب سے امام مالکؒ نے استدلال کیا ہے کیونکہ ان کا مسلک جمہور کے خلاف سجدہ کو جاتے ہوئے گھٹنوں سے پہلے ہاتھ ٹیکنا ہے، لیکن یہ حدیث معلول ہے، امام ترمذی نے اس کو غریب کہا اور امام بخاری نے اس کے راوی محمد بن عبداللہ بن الحسن کے لئے لا یتابع علیہ کہا، دارقطنی نے دراوردی کا تفرد بتلایا۔ الخ

امام ترمذی نے اس سے پہلے باب میں حدیثِ وائل ہی ذکر کی ہے، جس میں گھٹنے پہلے ٹکانے کا ہی ثبوت ہے، اور وہی مذہب امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام احمد، ثوری، اسحاق، عامۂ فقہاء اور تمام اہلِ کوفہ کا ہے، اور ایک روایت امام مالک سے بھی ایسی ہے۔ پھر یہی حضرت عمرؓ حضرت ابن مسعود وغیرہ کا بھی مختار ہے (معارف ص ۳\۱۲۷) امام مالک سے ایک روایت میں اور امام احمد سے بھی ایک قول تخییر کا بھی ہے، کہ دونوں میں سے جو صورت چاہے اختیار کرے کوئی حرج نہیں (فتح ص ۲\۲۴۱)

معلوم نہیں امام بخاری ترجمۃ الباب میں حضرت ابن عمرؓ کا اثر ان سب کے خلاف کیوں لائے ہیں، ممکن ہے کہ ان کا مختار وہی ہو، واللہ تعالیٰ اعلم، مگر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ان کا عمل بدن بھاری ہونے کی معذوری پر محمول ہوسکتا ہے اور یوں بھی حضرت عمرؓ کا عمل ان کے مقابلہ میں ارجح ہے۔

قولہ وکان یکبر فی رمضان وغیرہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ راوی نے رمضان کا ذکر اس لئے کیا کہ رمضان کی وجہ سے کچھ زیادات کا احتمال تھا، اس کو رفع کیا کہ بابِ تکبیرات میں کوئی اضافہ مشروع نہیں ہوا۔

قولہ یدعو لرجال: فرمایا کہ ''بحر'' میں مسئلہ ہے اگر نماز کے اندر کسی شخص کا نام لے لیا جائے تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، لیکن کسی کا نام لے کر اس کے لئے دعا کی جائے تو نماز فاسد نہ ہوگی، یہ بات بطور معمہ اور چیستان کے ہے کہ جز ومفسد ہے اور کل مفسد نہیں ہے، جس طرح اطراف کی دیت نفس کے دیت سے بڑھ جاتی ہے، اس کا حل صدر الشریعۃ نے شرح الوقایہ میں کیا ہے۔

باب فضل السجود

سجدہ کرنے کی فضیلت کا بیان

۷۶۶: حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب عن الزھری قال اخبرنی سعید بن المسیب وعطآء بن یزید اللیفی ان اباھریرۃ اخبرھما ان الناس قالوا یارسول اللہ صلی اللہ ھل نری ربنا یوم القیمۃ قال ھل تمارون فی القمر لیلۃ البدر لیس دونہ سحاب قالوا لایارسول اللہ قال فھل تمارون فی الشمس لیس دونھا سحاب قالوالا قال فانکم ترونہ کذلک یحشر الناس یوم القیامۃ فیقول من کان یعبد شیئاً فلیتبعہ فمنھم من

يتبع الشمس ومنهم من يتبع القمر ومنهم من يتبع الطواغيت وتبقىٰ هذه الامة فيها منافقوها فياتيهم الله فيقول انا ربكم فيقولون هذا مكاننا حتىٰ ياتينا ربنا فاذا جآء ربنا عرفناه فياتيهم الله عزوجل فيقول انا ربكم فيقولون انت ربنا فيدعوهم و يضرب الصراط بين ظهراني جهنم فاكون اول من يجوز من الرسل بامته ولايتكلم يومئذ احدالاالرسول وكلام الرسل يومئذ اللهم سلم سلم وفى جهنم كلاليب مثل شوک السعدان هل رايتم شوک السعدان فقالوانعم فانها مثل شوک السعدان غيرانه' لايعلم قدر عظمها الاالله تخطف الناس باعمالهم فمنهم من يوبق بعمله' و منهم من يخردل ثم ينجوحتىٰ اذا ارادالله رحمة من اراده من اهل النار امرالله الملٰئكة ان يخرجونهم ويعرفونهم باثار السجود و حرم الله على النار ان تاكل اثرالسجود فيخرجون من النار فكل ابن ادم تاكله النارالا اثرالسجود فيخرجون من النار قدامتحشوا فيصب عليهم مآء الحياة فينبتون كماتنبت الحبة فى حميل السيل ثم يفرغ الله من القضآء بين العباد و يبقىٰ رجل بين الجنة والنار وهواٰخر اهل النار دخلوا الجنة مقبلاً بوجهه قبل النار فيقول يارب اصرف وجهى عن النار فقد قشبنى ريحهاواحرقنى ذكائها فيقول هل عسيت ان فعل ذٰلک بک ان تسئل غير ذٰلک فيقول لاوعزتک فيعطى الله عزوجل مايشآء من عهدوميثاق فيصرف الله وجهه' عن النار فاذا اقبل به على الجنة راى بهجتها سكت ماشآء الله ان يسكت ثم قال يارب قدمنى عندباب الجنة فيقول الله له' اليس قداعطيت العهود والميثاق ان لاتسأل غيرالذى كنت سالت فيقول يارب لااكون اشقىٰ خلقک فيقول فماعسيت ان اعطيت ذٰلک ان لاتسال غيره' فيقول لاوعزتک لااسالک غيرذٰلک فيعطى ربه' ماشاء من عهد و ميثاق فيقدمه' الىٰ باب الجنة فاذا بلغ بيها فراى زهرتها ومافيها من النضرة والسرور فيسكت ماشآء الله ان يسكت فيقول يارب ادخلنى الجنة فيقول الله عزوجل و يحک ياابن ادم ما اغدرک اليس قداعطيت العهدوالميثاق ان لاتسأل غيرالذىٓ اعطيت فيقول يارب لاتجعلنى اشقىٰ خلقک فيضحک الله منه ثم ياذن له' فى دخول الجنة فيقول تمن فيمتنى حتىٰ اذا نقطع امنيته' قال الله عزوجل زد من كذاوكذا اقبل يذكره' ربه' حتىٰ اذاانتهت به الامانى قال الله لک ذٰلک و مثله' معه' وقال ابوسعيد الخدرى لابى هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال قال الله عزوجل لک ذٰلک وعشرة امثاله قال ابوهريرة لم احفظه' من رسول الله صلى الله عليه وسلم الاقوله' لک ذٰلک ومثله' معه' قال ابوسعيد انى سمعته' يقول ذٰلک لک وعشرة امثاله

ترجمہ ۲۶۷۷:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا، کہ ایک مرتبہ لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے پروردگار کو دیکھیں گے، آپ نے فرمایا، کیا تم کو شب بدر یں چاند (کے دیکھنے) میں جب کہ اس کے اوپر ابر نہ ہو، کچھ شک ہوتا ہے، ان لوگوں نے کہا، کہ یارسول اللہ! نہیں، آپ نے فرمایا، تو کیا تم کو آفتاب (کے دیکھنے) میں جب کہ اس کے اوپر ابر نہ ہو کچھ شبہ ہوتا ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ نہیں آپ نے فرمایا بس تم اسی طرح اپنے پروردگار کو دیکھو گے، قیامت کے دن لوگ اٹھائے جائیں گے، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا کہ جو (دنیا میں) جس کی پرستش کرتا تھا، وہ اس کے ساتھ ہو جائے، چنانچہ کوئی ان میں سے آفتاب کے ساتھ ہو جائے گا، اور کوئی ان میں سے چاند کے ساتھ ہو جائے گا، اور کوئی ان میں سے بتوں کے پیچھے ہو لے گا، اور یہ (ایمانداروں کا) گروہ باقی رہ جائے گا، اور اسی میں اس

کے منافق (بھی) شامل) ہوں گے، اللہ تعالیٰ (اس صورت میں جس کو وہ نہیں پہنچانتے) ان کے پاس آئے گا، اور فرمائے گا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں تو وہ کہیں گے (ہم تجھے نہیں جانتے) ہم اسی جگہ کھڑے رہیں گے، یہاں تک کہ ہمارا پروردگار ہمارے پاس آجائے، اور جب وہ آئے گا، ہم اسے پہچان لیں گے، پھر اللہ عزوجل ان کے پاس (اس صورت میں) آئے گا (جس کو وہ پہنچاتے ہیں) اور فرمائے گا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں تو وہ کہیں گے کہ ہاں تو ہمارا پروردگار ہے، پس اللہ، انہیں بلائے گا، اور جہنم کی پشت پر (پل بنا کر) ایک راستہ بنایا جائے گا، تمام پیغمبر جو اپنی امتوں کے ساتھ (اس پل سے) گزریں گے، ان میں پہلا میں ہوں گا، اور اس دن سوائے پیغمبروں کے کوئی بول نہ سکے گا، اور پیغمبروں کا کلام اس دن **اللّٰھم سلم سلم** ہوگا، جہنم میں سعدان کے کانٹوں کے مشابہ آنکڑے ہوں گے کیا تم لوگوں نے سعدان کے کانٹے دیکھے ہیں، صحابہ نے عرض کیا، ہاں! آپ نے فرمایا، کہ وہ سعدان کے کانٹوں سے مشابہ ہوں گے البتہ ان کی بڑائی کی مقدار سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، وہ آنکڑے لوگوں کو ان کے اعمال کے موافق اچکیں گے، تو ان میں سے کوئی اپنے اعمال کے سبب (جہنم میں گر کر) ہلاک ہو جائے گا، اور کوئی ان میں سے (مارے زخموں کے) ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، اس کے بعد نجات پائے گا، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں میں سے جن پر مہربانی کرنا چاہے گا، فرشتوں کو حکم دے گا کہ جو اللہ کی پرستش کرتے تھے، وہ نکال لئے جائیں۔ اور فرشتے انہیں سجدوں کے نشانوں سے پہچان لیں گے، اللہ تعالیٰ نے (دوزخ کی) آگ پر حرام کر دیا ہے کہ وہ سجدے کے نشان کو کھائے، چنانچہ سجدوں کے مقام کے علاوہ جہنم کی آگ ابنِ آدم کے تمام جسم کو کھا جائے گی (اسی نشان سجدہ کی علامت سے) جب لوگ نکالے جائیں گے، اس وقت بالکل سیاہ (کوئلہ) ہو گئے ہوں گے، پھر ان کے اوپر آبِ حیات ڈالا جائے گا تو (اس کے پڑنے سے) وہ ایسے نکل آئیں گے، جیسے دانہ سیل کے بہاؤ میں اگتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان میں فیصلہ کرنے سے فارغ ہو جائے گا، اور ایک شخص جنت اور دوزخ کے درمیان میں باقی رہ جائے گا اور وہ جنت میں سب دوزخیوں سے آخر میں داخل ہوگا، اس کا منہ دوزخ کی طرف ہوگا، کہے گا کہ اے میرے پروردگار! میرا منہ دوزخ (کی طرف) سے پھر دے، کیونکہ مجھے اس کی ہوا نے زہرآلود کر دیا ہے، اور مجھے اس کے شعلہ نے جلا دیا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کہ کیا تو (ایسا تو نہ کرے گا، کہ) اگر تیرے ساتھ یہ احسان کر دیا جائے، تو تو اس کے علاوہ اور کچھ مانگے، وہ کہے گا، کہ تیری بزرگی کی قسم نہیں، پھر اللہ عزوجل (اس بات پر) جس قدر وہ چاہے گا، اس سے پختہ وعدہ لے لے گا (اس کے بعد) اللہ تعالیٰ اس کا منہ دوزخ (کی طرف) سے پھیر دے گا، پھر جب وہ جنت کی طرف منہ کرے گا اور وہ اس کی تروتازگی دیکھے گا، تو جس قدر مشیتِ الٰہی ہوگی، وہ چپ رہے گا، اس کے بعد کہے گا کہ اے پروردگار! مجھے جنت کے دروازے کے قریب کر دے، تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ کیا تو نے اس بات پر قول وقرار نہ کئے تھے، کہ اس کے سوا جو تو مانگ چکا، اور کچھ سوال نہ کرے گا، وہ عرض کرے گا، کہ اے میرے پروردگار! مجھے تیری مخلوق میں سب سے زیادہ بدنصیب نہ ہونا چاہئے اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کہ ہوسکتا ہے، کہ اگر تجھے یہ بھی عطا کر دیا جائے، تو تو اس کے علاوہ اور کچھ سوال کرے، وہ عرض کرے گا کہ قسم تیری بزرگی کی نہیں، میں اس کے سوال سوال نہ کروں گا۔ پھر اپنے پروردگار کو جس قدر قول وقرار چاہے گا دے گا، تب اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے دروازے کے قریب کر دے گا، جب اس کے دروازے پر پہنچ جائے گا، اور اس کی شگفتگی اور وہ تازگی اور سرور جو اس میں ہے دیکھے گا، تو جتنی دیر مشیتِ الٰہی ہوگی، چپ رہے گا، اس کے بعد کہے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھے جنت میں داخل کر دے اللہ عزوجل فرمائے گا کہ اے ابنِ آدم تیری خرابی ہو، تو کس قدر عہد شکن ہے، کیا تو نے اس بات پر قول وقرار نہ کئے تھے، کہ اس کے سوا جو تجھے دیا جا چکا اور کچھ نہ مانگے گا، وہ عرض کرے گا، کہ اے میرے پروردگار! مجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ بدنصیب نہ کر، پس اللہ تعالیٰ اس (کی باتوں) سے ہنسنے لگے گا، اس کے بعد اس کو جنت میں لے جانے کی اجازت دے گا، اور فرمائے گا کہ (جہاں تک تجھ سے

ہو سکے) طلب کر، چنانچہ وہ خواہش کرنے لگے گا، یہاں تک کہ اس کی خواہشیں ختم ہو جائیں گی، تو اللہ بزرگ و برتر فرمائے گا، کہ یہ یہ چیزیں اور مانگ، اس کا پروردگار اسے یاد دلانے لگے گا یہاں تک کہ جب اس کی خواہشیں تمام ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تجھے یہ بھی (دیا جاتا) ہے، اور اسی کے مثل اس کے ساتھ اور بھی، (یہ حدیث سن کر) ابوسعید خدری نے ابوہریرہؓ سے کہا، کہ رسول خدا ﷺ نے (اس مقام پر) یہ فرمایا تھا، کہ اللہ عزوجل نے فرمایا کہ تجھے یہ اور اس کے (ساتھ اس کے) مثل دس (گنے دیئے جاتے ہیں) ابوہریرہؓ نے جواب دیا کہ مجھے اس حدیث میں رسول خدا ﷺ سے صرف آپ کا یہی ارشاد یاد ہے کہ تجھے یہ بھی (دیا جاتا) ہے اور اسی کے مثل اس کے ساتھ اور (بھی) ابوسعید نے کہا، کہ میں نے خود آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تجھے یہ اور اسی کے دس مثل (اس کے ساتھ دیئے جاتے) ہیں۔

تشریح: امام بخاریؒ نے سجدہ کی فضیلت میں وہ حدیثِ ابی ہریرہؓ پیش کی ہے، جس میں سجدہ کی وجہ سے سجدہ کرنے والے کے جسم کے کچھ حصہ پر دوزخ کی آگ حرام ہوگی یعنی اس پر کچھ اثر نہ کرے گی، تمام بدن اس کی آگ میں جلے گا مگر وہ حصہ محفوظ رہے گا، اور یہ صرف سجدہ اور نماز کی برکت سے ہوگا، حافظ نے لکھا کہ یہ حدیث آگے کتاب الرقاق میں بھی آئے گی، اور ہم وہاں تفصیل سے بحث کریں گے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ بخاری میں فرمایا کہ یہاں ایک مسئلہ میں امام نووی اور قاضی عیاض کا کچھ اختلاف بھی ہے، جس پر حافظ نے اچھا کلام اور تبصرہ کیا ہے، وہ دیکھ لیا جائے، چونکہ بعض امالی میں ضبط و تحریر کی غلطی ہوگئی ہے، اس لئے ہم یہاں اس کو صحیح طور سے اور حافظ کی بات کو بھی مختصر کر کے لکھتے ہیں۔ وبہ نستعین:۔

حافظ نے لکھا کہ اس بارے میں اختلاف ہوا کہ دوزخ کی آگ سے کون سا حصہ محفوظ رہے گا، علامہ نووی شارحِ مسلم شریف کی رائے یہ ہے کہ ساتوں اعضاءِ محفوظ رہیں گے، جن پر ٹکا کر سجدہ ہوتا ہے، یعنی پیشانی، دونوں ہاتھ دونوں گھٹنے اور دونوں قدم۔ قاضی عیاض نے کہا کہ صرف پیشانی جس سے سجدہ ہوتا ہے وہی محفوظ ہوگی، کیونکہ مسلم وغیرہ میں یہ بھی مروی ہے کہ گنہگار لوگوں میں کچھ لوگ آدھی پنڈلی تک آگ میں رہیں گے، کچھ گھٹنوں تک، کچھ کمر تک۔ تو ظاہر ہے کہ قدم اور گھٹنے بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے، اس لئے صرف پیشانی کو محفوظ کہہ سکتے ہیں، اور حافظ نے لکھا کہ ایک دوسری حدیثِ مسلم سے بھی قاضی عیاض کی تائید ہوسکتی ہے، جس میں ہے کہ کچھ لوگوں کو دوزخ میں عذاب ہوگا، مگر ان کے چہروں کے دائرے اس سے محفوظ ہوں گے۔

علامہ نووی کا جواب حافظ نے ذکر کیا کہ یہ تو خاص لوگوں کا حال حدیثِ مسلم میں بیان ہوا ہے، باقی عام طور سے تو عموم حدیث الباب کے تحت گنہگار مومنوں کے تمام ہی اعضاءِ سجود محفوظ ہوں گے، لہٰذا دوزخ میں ایک مدت تک گناہوں کی پاداش اٹھانے والے مومنوں کی دو قسم ہوگئیں۔ لہٰذا دونوں قسم کی احادیث کے مورد الگ الگ ہیں۔

پھر حافظ نے قاضی عیاضؒ کے دوسرے استدلال کا جواب یہ دیا کہ آخرت کے احوال کا یہاں کے احوال پر قیاس نہ کرنا چاہئے ہوسکتا ہے کہ وہاں کمر تک جلنے والے کے بھی گھٹنے اور قدم دوزخ کی آگ سے بالکل متاثر نہ ہوں اور اتنے حصے جن پر سجدہ ہوتا ہے وہ محفوظ رہیں۔

پھر لکھا کہ دارات الوجوہ والی حدیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف پیشانی بلکہ چہروں کے پورے دائرے سجدہ کی برکت سے عذاب سے محفوظ رہیں گے لہٰذا اس لئے بھی صرف پیشانی کے استثناء والی بات قاضی عیاض کی محلِ نظر ہے۔ (فتح الباری ص ۱۱۹\۲ و ص ۳۶۶\۱۱)

اس پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ اصل اختلاف تو علامہ نووی اور قاضی عیاض کا ہے، اور حافظ نے کلام و استدلال کر کے اپنا میلان علامہ نوویؒ کی طرف ظاہر کر دیا ہے اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کا اشارہ بھی اسی کی تصویب کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بے نمازی کا عذاب

حافظؒ نے علامۂ محدث ابن ابی جمرہ کا ایک نہایت مفید ارشاد بھی نقل کیا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازیوں کو عذاب کے بعد

حق تعالیٰ کی رحمت ومغفرت دوزخ سے نکلوالے گی، لیکن جولوگ نماز کی نعمت سے دنیا کے اندر بالکل ہی محروم رہے ہوں گے، ان کی عذاب سے خلاصی کیونکر ہوگی کہ ان کے جسم پر تو سجدہ کے آثار وعلامات بھی نہ ہوں گی، جن سے پہچان کر فرشتے نکالیں گے، لہٰذا وہ ہمیشہ ہی دوزخ کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

علامہ نے فرمایا البتہ ان کے لئے بھی ایک حدیث نبوی ہے کہ سب سے آخر میں کہ تمام انبیاء فرشتوں اور مومنوں کی شفاعتوں کے طفیل میں لوگ دوزخ سے نکل چکیں گے، اور جنت میں داخل ہو جائیں گے، تب حق تعالیٰ فرمائے گا کہ اب میری شفاعت رہ گئی ہے اور حق تعالیٰ مٹھی بھر کے ایک قوم کو دوزخ سے نکالیں گے، جس کے پاس بجز ایمان کے کوئی بھی نیک عمل نہ ہوگا (وہ حدیث بخاری کتاب التوحید ص ۱۱۰۷ میں آئے گی)

فتح الباری کی اغلاط

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فتح الباری کا جو نسخہ اب چھپ کر آیا ہے وہ غلطیوں سے بھرا ہوا ہے، پانچ سو تو میں صحیح کر چکا ہوں، باقی کتنی ہیں اللہ جانتا ہے۔

تجلیاتِ ربانی: قوله فیاتیهم الله

حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرت الٰہیہ کے بارے میں جو افعالِ لازمہ استعمال ہوئے ہیں ان سے مراد تعلق ہوتا ہے اس صفت کا محل وقوع کے ساتھ اور جو افعالِ متعدیہ وارد ہوئے ہیں، ان سے مراد اس محل کا پیدا کرنا ہوتا ہے جیسے **قوله تعالیٰ خلق السموات والارض**۔ چنانچہ اتیان، نزول واستواء سارے افعال لازمہ ہیں اور مراد ان صفات کا تعلق ہے محل کے ساتھ اور **استوی علی العرش** کا معنی یہ ہے کہ تعلق ہوا صفتِ استواء کا عرش کے ساتھ۔ اور یہ سب تجلیاتِ باری عز اسمہ ہیں۔ دوسرے موقع پر فرمایا کہ استواء، قرب ومعیت میرے نزدیک سب ایک ہی نوع کی چیزیں ہیں، ہم ان کی کیفیات کا ادراک نہیں کر سکتے، اور نہ ہم تشبیہ وتجسیم کے قائل ہیں جیسے کہ اہلِ زیغ قائل ہیں، اور ائمہ اربعہ کے نزدیک اس نوع کی تمام چیزیں بلا تاویل کے اپنے ظاہر پر محمول ہیں۔ اسی طرح میرے نزدیک نماز میں مواجہۂ خداوندی اور وصلۂ مناجات بھی ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ یہ سب تجلیات ہیں حق تعالیٰ جل مجدہ کی۔

قوله والکلالیب: فرمایا کہ یہ علائق نفس ہیں جو آخرت میں متجسد ہو جائیں گے۔ یعنی یہاں کے معاصی وشہواتِ نفسانیہ کانٹوں اور کنڈوں کی طرح گنہگاروں اور کافروں ومشرکوں کو پل سراطِ جہنم پر سے گذرنے کی حالت میں اچک اچک کر دوزخ میں گرالیں گے تاکہ اس میں اپنے برے اعمال وعقائد کی سزا پائیں۔

عبادات ومعاصی کا دخولِ جنت وجہنم

حضرتؒ نے فرمایا کہ بظاہر حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ گنہگاروں کے ساتھ ان کی عبادتیں بھی جہنم میں ساتھ ہوں گی اگر بیگار رہیں گی، اور ایک قول علماء کا یہ بھی ہے کہ اعمالِ صالحہ اس زمانہ میں باہر ہی رہیں گے، اور یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ معاصی جنت میں نہ جائیں گے۔

باب یبدی ضبعیه ویجافی فی السجود

(مرد کو چاہئے کہ) سجدہ میں اپنے دونوں پہلو کھول دے اور پیٹ کو زانو سے جدا رکھے

۷۶۷: حدثنا یحیی بن بکیر قال حدثنی بکر بن مضر عن جعفر بن ربیعة عن ابن هرمز عن عبدالله بن

مالک ابن بحسینة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا صلے فرج بین یدیہ حتیٰ یبدوابیاض ابطیہ وقال اللیث حدثنی جعفر بن ربیعة نحوہ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مالک بن بحینہ روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان میں اس قدر کشادگی رکھتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سپیدی ظاہر ہوتی تھی، اور لیث نے کہا کہ مجھ سے جعفر بن ربیعہ نے اس کے مثل روایت کی۔

تشریح: یہ باب اور حدیث الباب اسی سند سے بخاری ص ۵۶ میں بھی گزری ہے، وہاں یہ بتلایا تھا کہ بغل اور اس سے ملے ہوئے ہاتھوں کے حصے نماز میں کھلے رہیں تو وہ عدم تستر میں داخل نہیں ہے، یہاں یہ بتلایا کہ سجدہ کے وقت بازو کو پہلو سے جدا رکھا جائے، تا کہ وہ بھی آزادی سے مستقلاً سجدہ کریں، پہلو سے بازوؤں کو ملا لیا تو ان کا سجدہ الگ سے متصور نہ ہوگا جبکہ منشاءِ شارع یہ ہے کہ نماز کے سارے اعضاءِ سربسجود ہوں اور اسی لئے آگے آئے گا کہ سجدہ میں پاؤں کی انگلیاں بھی قبلہ رخ ہوں کہ وہ بھی سجدہ گزار ہوتی ہیں۔ مگر قیام وقوعد میں بھی ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رخ ہی رکھنا چاہئے، حنفیہ کے یہاں قعدۂ تشہد میں بھی افتراش کی جو شکل ہے، اس میں بھی بہ نسبت تورک کے پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رخ رکھنے کی حمایت زیادہ ہے۔ ان دونوں کی تشریح آگے آئے گی۔

حافظ نے لکھا کہ حدیث الباب سے بازو جدا کر کے سجدہ کرنے کا وجوب معلوم ہوتا ہے اور حدیث ابی داؤد سے اس کا استحباب مفہوم ہوتا ہے، جس میں ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے طوالتِ سجدہ کی صورت میں مشقتِ سجدہ کی شکایت کی تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ گھٹنوں سے مدد لو یعنی ان پر کہنیاں ٹیک کر۔ حالانکہ یہ صورت پہلی سے الگ ہے اور بازوؤں کو بحالتِ سجدہ عام حالات میں جدا رکھنے کا حکم کیا گیا۔ اور یہ خاص صورت ہے کہ طوالتِ سجدہ کے وقت تھکن رفع کرنے کے لئے گھٹنوں سے مدد لی جائے، یہ گویا خاص صورت حالتِ عذر کی ہے۔ امام ترمذی نے استعانت بالرکب کا حکم سجدے سے قیام کے لئے اٹھنے کے وقت مراد لیا ہے، اور امام طحاویؒ نے قومہ کے بعد سجدہ کو جاتے ہوئے استعانت بالرکب کو لیا ہے۔ غرض یہ چاروں صورتیں الگ الگ ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے یہاں سجدے کی صحیح اور مشروع و مسنون صورت عام حالت کے لئے بیان کی ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

واضح ہو کہ ص ۵۶ کی طرح یہاں بھی بُحینہ مالک کی ماں نہیں ہیں، بلکہ عبداللہ بن مالک کی والدہ ہیں۔ اور ابن بُحینہ عبداللہ کی صفت ہے مالک کی نہیں، لہٰذا صحیح بخاری ص ۵۶ میں مالک ابن بُحینہ صحیح طبع ہوا ہے، اور یہاں ص ۱۱۲ میں ابن کا الف غلطی سے رہ گیا ہے۔

باب یستقبل باطراف رجلیہ القبلة قالہ ابو حمید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(سجدے میں اپنے پیروں کو انگلیاں قباء رُخ رکھے) اس کو ابوحمیدؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے

باب اذالم یتم سجودہٗ

(اگر کوئی شخص اپنا سجدہ پورا نہ کرے)

۷۶۸: حدثنا الصلت بن محمد قال حدثنا مهدی عن واصل عن ابی وآئل عن حذیفة انہٗ رای رجلاً لایتم رکوعہٗ ولاسجودہٗ فلما قضیٰ صلوتہ قال لہ حذیفة ماصلیت واحسبہٗ قال لومت مت علیٰ غیر سنة محمد صلے اللہ علیہ وسلم

ترجمہ۷۶۸:۔ حضرت حذیفہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنا رکوع پورا کرتا ہے، اور نہ اپنا سجدہ، جب وہ اپنی نماز ختم کر چکا، تو اس سے حذیفہؓ نے کہا، کہ تو نے نماز نہیں پڑھی، اور (ابو وائل کہتے ہیں) کہ مجھے خیال ہے کہ حذیفہؓ نے یہ بھی کہا کہ اگر تو مر جائے گا۔ تو محمد ﷺ کے خلاف طریقے پر مرے گا۔

تشریح: پہلے ایک باب اذا لم یتم الرکوع گزرا ہے، وہی تشریح یہاں سجود کے لئے بھی ہے۔ (فتح ص ۲۰۰\۲)

باب السجود علیٰ سبعة اعظم
اگر کوئی شخص اپنا سجدہ پورا نہ کرے

۷۶۹: حدثنا قبیصة قال حدثنا سفیان عن عمرو بن دینار عن طاؤس عن ابن عباسؓ قال امر النبی صلے الله علیه وسلم ان یسجدعلیٰ سبعة اعضآء ولایکف شعراً ولاثوباً الجبهة والیدین والرکبتین والرجلین

۷۷۰: حدثنا مسلم بن ابراهیم قال حدثنا شعبة عن عمرو عن طاؤس عن ابن عباس عن النبی صلی الله علیه وسلم قال امرنا ان نسجد علیٰ سبعة اعظم ولانکف شعراً ولاثوباً

۷۷۱: حدثنا اٰدم قال حدثنا اسرآءیل عن ابی اسحٰق عن عبدالله بن یرید قال حدثنا البرآء بن عازب وهو غیر کذوب قال کنا نصلی خلف النبی صلے الله علیه وسلم فاذاقال سمع الله لمن حمده' لم یحن احد مناظهره' حتی یضع النبی صلے الله علیه وسلم جبهته' علی الارض

ترجمہ۷۶۹: طاؤس حضرت ابن عباسؓ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا، کہ نبی ﷺ کو سات اعضاء کے بل سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور یہ کہ بالوں کو نہ سنوارے، اور نہ کپڑے کو روکے (وہ سات اعضا یہ ہیں) پیشانی، دونوں ہاتھ دونوں گھٹنے، دونوں پیر۔

ترجمہ۷۷۰: حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سات ہڈیوں کے بل سجدہ کریں، اور نہ بالوں کو روکیں اور نہ کپڑے کو۔

ترجمہ۷۷۱: حضرت براء بن عازبؓ نے بیان کیا، اور وہ جھوٹے آدمی نہیں تھے، وہ کہتے ہیں، کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، تو جب **سمع الله لمن حمده** کہتے، تو کوئی شخص ہم میں سے پیٹھ نہ جھکاتا تھا، جب تک کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی پیشانی زمین پر رکھتے نہ دیکھ لیتا تھا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حاصل اس باب اور اس کی احادیث کا یہ ہے کہ سجدہ کرنے والے ساتوں اعضاء مصلی ہیں نہ یہ کہ ساجد تو نمازی ہے اور یہ اعضاء اس کے سجدہ کے لئے صرف معاون اور ذریعہ ہیں، اور خارج سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نمازی کے بال بھی سجدہ کرتے ہیں اسی لئے بندھے ہوئے بالوں کے ساتھ نماز کی ممانعت کی گئی۔ اور آثار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازی کے کپڑے بھی سجدہ کرتے ہیں، اسی لئے ان کو بھی نماز کے اندر روکنے سنبھالنے سے منع کیا گیا ہے، جب کپڑوں اور بالوں کا یہ حال ہے تو ظاہر ہے کہ اعضاءِ سجود کے لئے سجدے کی شان ضرور ہی مدنظر ہوگی، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ دونوں ہاتھ سجدہ کی طرح رکوع بھی کرتے ہیں، اس وقت وہ معطل نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ مشہور قول حنفیہ کا اگرچہ یہ ہے کہ سجدہ کے وقت صرف پیشانی اور ایک پاؤں کا زمین پر ٹکنا واجب ہے، باقی اعضاءِ سجود کا سنت ہے، مگر شیخ ابن ہمامؒ نے سب ہی کے وجوب کا قول اختیار کیا ہے شاید حنفیہ کے مشہور قول کی وجہ یہ ہو کہ پیشانی زمین پر رکھنے کو بہ نسبت دوسرے اعضاء کے حقیقتِ سجود سے زیادہ اقرب سمجھا گیا جیسا کہ بعض ان دعاؤں سے بھی مفہوم ہوتا ہے جو سجدہ کے وقت کی ماثور ہوئی ہیں، لیکن بظاہر یہ ان کا صرف فکری و نظری خیال ہوگا، باقی عمل کے لحاظ سے سارے اعضاءِ کا حکم یکساں وجوب ہی کا ہونا چاہئے واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس مسئلہ میں اختلاف کی نوعیت تاحش کوکب سے اس طرح نقل کی گئی ہے شافعیہ کے اظہر القولین میں اورامام زفر کے نزدیک نیز امام احمد سے ایک روایت میں اعضاءِ سبعہ پر سجدہ واجب ہے، امام احمدؒ سے دوسری روایت میں اور امام مالک وحنفیہ کے نزدیک بجز پیشانی کے دوسرے اعضاء کے لئے وجوب نہیں ہے۔ (الابواب ص ۲۹۶\۲)

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر ہمیشہ یہ رہتی تھی کہ حنفیہ کے لئے اقرب الی الحدیث توجیہ کوترجیح دیا کرتے تھے، اور حافظ ابن ہمامؒ کا مزاج بھی یہی تھا، اسی لئے اوپر جوتوجیہ اور وجہِ ترجیح حضرتؒ نے بیان کی ہے وہ ہمارے خیال کی تائید کرتی ہے، حضرتؒ نے اپنی عمر کے چالیس سال اسی فکر وسعی میں گزارے ہیں کہ حنفی مسلک کا اقرب الی الحدیث ہونا ثابت کریں، اور فرمایا کرتے تھے کہ معدودے چند مسائل کے علاوہ مجھے اس میں کامیابی ہوگئی ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ امام محمد، امام طحاوی، امام زیلعی، اور شیخ ابن الہمام کے بعد ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی اس طرف کامل ومکمل توجہ مبذول ہوئی ہے جو بڑی حدتک کامیابی سے بھی ہمدوش ہوئی، یوں تو اکابر کی بہت بڑی تعداد نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، ان سے انکارنہیں ہوسکتا۔ مگر افسوس ہے کہ حضرتؒ کے افادات وتحقیقاتِ عالیہ کا اکثر وبیشتر حصہ ضائع ہوگیا۔ اور تعلیقاتِ آثار السنن کی صورت میں جتنا وہ موجود ہے، وہ بھی ابھی تک نا قابلِ انتفاع ہے۔ والامر بیداللہ

قولہ لم یحن احد: فرمایا کہ یہ صورت اس وقت پیش آئی کہ حضور علیہ السلام کا بدنِ مبارک بھاری ہوگیا تھا اور یہ خطرہ تھا کہ کہیں مقتدی آپ سے پہلے سجدہ میں نہ پہنچ جائیں، حالانکہ امام سے قبل کسی رکن میں جانا ممنوع ہے، لہٰذا صحابہؓ کرام اس امر کا بہت خیال رکھتے تھے، اوراسی لئے یہ مسئلہ بھی ہے کہ مقتدی ایک ہوتو اسے امام سے کچھ پیچھے رہنا چاہئے، تاکہ آگے ہوجانے کا احتمال نہ رہے کیونکہ آگے ہوجانے سے مقتدی کی نماز فاسد ہوجاتی ہے۔

ضروری نوٹ: کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ص ۱\۳۰۹ مبحث تقدم الماموم میں لکھا کہ برخلاف دیگر مذاہب ائمہ کے مالکیہ کے نزدیک اقتدا کے لئے تقدمِ امام شرط نہیں ہے۔ لہٰذا اگر مقتدی امام سے آگے ہوکر بھی نماز پڑھے گا تو اس کی نماز جماعت سے درست ہو جائے گی البتہ بلاضرورت ایسا کرنا مکروہ ہے۔ کثرتِ زائرین کے وقت دیکھا گیا کہ بہت سی صفتیں مسجد نبوی سے آگے سمتِ قبلہ میں بھی ہو جاتی ہیں لہٰذا یادرہے کہ بجز مالکیہ کے دوسروں کی نمازیں درست نہ ہوں گی۔

باب السجود علیٰ الانف

ناک کے بل سجدہ کرنے کا بیان

۷۷۲: حدثنا معلیٰ بن اسدثنا وھیب عن عبداللہ بن طاؤس عن ابیہ عن ابن عباس قال قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم امرت ان اسجد علیٰ سبعۃ اعظم علی الجبھۃ واشار بیدہ الیٰ انفہ والیدین والرکبتین واطراف القدمین ولا نکفت الثیاب والشعر

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں کے بل سجدہ کروں، پیشانی کے بل اور آپ نے اپنے ہاتھ سے اپنی ناک اور دونوں ہاتھوں اور دونوں گھٹنوں اور پیروں کی انگلیوں کی طرف اشارہ کیا، اور (یہ بھی فرمایا، کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نماز میں) کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹیں۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام اعظمؒ سے جو روایت پیشانی کے بغیر صرف ناک پر سجدہ کرنے کے جواز کی ہے، اس سے

رجوع بھی ثابت ہوا ہے، لہٰذا صاحبین کی طرح امام صاحب کا بھی یہی مسلک ہوا کہ بغیر کسی عذر کے اس طرح کرنے سے نماز نہ ہوگی، علامہ عثمانیؒ نے لکھا کہ تینوں اکابر حنفیہ میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ امام اعظم بھی اقتصار علی الانف کو مکروہ تحریمی فرماتے ہیں جو کہ ترکِ واجب کی صورت میں ہوتا ہے اور صاحبین کا قول عدم جواز کا مطلب بھی عدم حلت ہے جو کراہتِ تحریمی کو مقتضی ہے لہٰذا پیشانی پر سجدہ کرنا بالاتفاق واجب ہوا اور وہی حدیث وآثار کا بھی مقتضیٰ ہے۔

حافظؒ نے جو ابن المنذر سے اجماع نقل کیا صرف انف پر عدمِ جوازِ سجدہ کا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ معتد بہ طریقہ پر نماز درست نہ ہوگی۔(فتح الملہم ص ۲\۹۸)

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا ارشاد

آپ نے لامع میں فرمایا:۔ حدیث میں آتا ہے کہ سات اعضاء پر سجدہ کیا جائے جن میں پیشانی کی صراحت ہے لیکن حدیث الباب میں سات کے بعد پیشانی کیساتھ اشارہ ناک کی طرف بھی فرمایا، اور پیشانی پوری زمین پر رکھی جائے گی تو ناک بھی ضرور اس کے ساتھ ٹکے گی، نہ ٹکے گی تو پیشانی کا بھی کچھ حصہ ٹکنے سے باقی رہ جائے گا، لہٰذا اشارہ سے یہ بتلایا گیا کہ پیشانی پر سجدہ کی تکمیل جب ہی ہوگی کہ ناک بھی ساتھ رکھی جائے۔

محقق ابن دقیق العید نے فرمایا کہ حدیث الباب کے بارے میں کہا گیا کہ اس سے پیشانی اور ناک کا بمنزلہ عضو واحد ہونا ثابت ہوا، ورنہ اعضاءِ سجود آٹھ ہو جاتے، لیکن اس میں نظر ہے کیونکہ اس سے لازم آئے گا۔ کہ سجدہ میں ناک پر بھی اکتفا کرنا جائز ہو جیسا کہ پیشانی کے کچھ حصہ پر بھی جائز ہے، اور اس سے امام ابوحنیفہؒ کے لئے استدلال کیا گیا ہے، لیکن جمہور کا مسلک اگرچہ پیشانی پر جوازِ اکتفا کا ہے، تاہم امام احمد واسحٰق وغیرہم پیشانی وناک ایک ساتھ دونوں ہی پر سجدہ کو واجب کہتے ہیں، اور یہ امام شافعی کا بھی ایک قول ہے۔(الابواب ص ۲\۲۹۶)

قولہ ولا نکفت الثیاب:۔ ممانعت نے بتلایا کہ کپڑے اور بال بھی سجدہ کرتے ہیں، اور آگے امام بخاری ایک باب عقد الثیاب کا بھی لائیں گے، تا کہ اس ممانعت کو عام اور مطلق نہ سمجھا جائے، کیونکہ انکشافِ ستر کا اندیشہ ہوگا تو کپڑے کو روکنا بھی پڑے گا۔

باب السجود علیٰ الانف فی الطین

(ناک کے بل سجدہ کرنے کا بیان)

۷۷۳: حدثنا موسیٰ ثنا ھمام عن یحییٰ عن ابی سلمة قال انطلقت الیٰ ابی سعید الخدری فقلت الاتخرج بنآ الی النخل نتحدث فخرج قال قلت حدثنی ماسمعت النبی صلے اللہ علیه وسلم فی لیلة القدر قال اعتکف رسول اللہ صلے اللہ علیه وسلم العشر الاول من رمضان واعتکفنا معه' فاتاہ جبریل فقال ان الذی تطلب امامک فاعتکف العشر الاوسط واعتکفنا معه' فاتاہ جبریل فقال ان الذی تطلب امامک فقام النبی صلے اللہ علیه خطیباً صبیحة عشرین من رمضان فقال من کان اعتکف مع النبی فلیرجع فانی رایت لیلة القدر وانی نسیتھا وانھا فی العشر الاواخر فی وتر وانی رایت...... کانی اسجد فی طین ومآء وکان سقف المسجد جرید النخل ومانریٰ فی السمآء شیئاً فجآءت فزعة فامطرنا فصلی بنا النبی صلے اللہ علیه وسلم حتیٰ رایت اثر الطین والمآء علیٰ جبهة رسول اللہ صلے اللہ علیه وسلم وارنبته تصدیق رؤیاہ

ترجمہ۷۷۳:۔ حضرت ابوسلمہ روایت کرتے ہیں کہ میں (ایک روز) حضرت ابوسعید خدریؓ کے پاس گیا، اور میں نے ان سے (کہا کہ آپ ہمارے ساتھ (فلاں) درخت کی طرف کیوں نہیں چلتے، تاکہ ہم ذکر و تذکرہ کریں، پس وہ نکلے، ابوسلمہ کہتے ہیں، میں نے کہا کہ مجھ سے بیان کیجئے کہ نبی کریم ﷺ سے آپ نے شبِ قدر کے بارے میں کیا سنا ہے وہ بولے کہ رسولِ خدا ﷺ نے (ایک بار) رمضان کے پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا، اور ہم لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ اعتکاف کیا (اس عرصہ میں) جبریل آپ کے پاس آئے اور کہا کہ جس کی آپ کو تلاش ہے (یعنی شبِ قدر) اس عشرہ کے آگے ہے۔ لہٰذا آپ نے درمیانی عشرہ میں اعتکاف فرمایا، اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ اعتکاف کیا۔ پھر جبریل آپ کے پاس آئے اور کہا کہ جس کی تمہیں تلاش ہے وہ اس عشرہ کے آگے ہے، پس بیسویں رمضان کی صبح کو آپ خطبہ پڑھنے کھڑے ہوئے اور فرمایا، کہ جس نے نبی (ﷺ) کے ساتھ اعتکاف کیا ہو، وہ دوبارہ پھر کرے، کیونکہ میں نے شبِ قدر کو دیکھ لیا، لیکن میں اسے بھول گیا، اور اب صرف اتنا یاد ہے کہ وہ آخر عشرہ میں طاق رات میں ہے، اور میں نے (خواب میں) یہ دیکھا کہ گویا میں مٹی اور پانی میں سجدہ کر رہا ہوں، اور (اس وقت تک) مسجد کی چھت کھجور کی شاخوں سے پٹی تھی، اور (اس وقت) ہم آسمان میں کوئی چیز ابر وغیرہ نہ دیکھتے تھے، اتنے میں ایک ٹکڑا بادل کا آیا، اور ہم پر پانی برسا تو نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی، یہاں تک کہ میں نے کیچڑ کا نشان رسولِ خدا ﷺ کی پیشانی، اور آپ کی ناک پر دیکھا، یہ آپ کے خواب کی تصدیق تھی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کیچڑ یا دلدل ایسی ہو کہ اس میں چہرہ دھنس جائے تو سجدہ صحیح نہ ہوگا، لہٰذا نماز کو مؤخر کر دے۔

علامہ عینی اور حافظ نے لکھا کہ یہ ترجمہ پہلے ترجمہ سے اخص ہے، اور اس سے ناک پر سجدہ کے تاکد کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود عذر کے بھی اس کو حضور علیہ السلام نے ترک نہیں کیا۔ بظاہر ترجمہ کی غرض یہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر سابق ترجمہ میں امام بخاری نے اختلاف کی طرف اشارہ کیا تھا، اس لئے ممکن ہے یہ بتلانا ہو کہ باوجود اختلاف کے بھی سجدہ علی الانف امرِ مؤکد ہے، تاکہ بلا عذر کے ترک نہ کیا جائے واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب عقدالثیاب و شدھا و من ضم الیه ثوبه' اذاخاف ان تنکشف عورته'

۷۷۴: حدثنا محمد بن کثیر انا سفیان عن ابی حازم عن سھل بن سعد قال کان الناس یصلون مع النبی صلی اللہ علیه وسلم وھم عاقدوا ازرھم من الصغر علیٰ رقابھم فقیل للنسآء لاترفعن رء وسکن حتیٰ یستوی الرجال جلوساً

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد روایت کرتے ہیں کہ لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور وہ اپنے تہبندوں کو چھوٹے ہونے کے سبب سے اپنی گردنوں پر باندھے ہوئے ہوتے تھے اور عورتوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ جب تک مرد سیدھے ہو کر بیٹھ نہ جائیں، اس وقت تک تم اپنے سر (سجدے سے) نہ اٹھانا۔

تشریح: حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا:۔ امام بخاریؒ یہاں دو باب لائے ہیں، جن کا تعلق ابوابِ ثیاب سے تھا اور ابوابِ ثیاب میں دو باب صفۃِ صلوٰۃ کے لائیں گے باب اذا لم یتم السجود اور باب یبدی ضبعیه، بعض نے کہا کہ لکھنے والوں کی غلطی سے ایسا ہو گیا، مگر میرے نزدیک یہ لطائفِ بخاری میں سے ہے کہ وقتِ نظر اور ذہنوں کی تیزی و تربیت کے لئے وہ ایسا کیا کرتے ہیں، اس کے بعد

توجیہ اور مناسبت نکال لینا آسان ہے، اور یہاں عقدِ ثیاب کا جواز بتلانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ دوسری حدیث میں کفِ ثیاب کی ممانعت وارد ہے، جو اس لئے ہے کہ وہ بھی سجدہ کرتے ہیں اور ان کے روکنے سمیٹنے میں دھیان بھی بٹتا ہے جو خشوع وخضوع صلوٰۃ کے منافی ہے اور عقدِ ثیاب کا جواز کشفِ عورت سے بچنے کے لئے ہے کہ ایسی نوبت بھی نہ آجائے۔

پھر یہ کہ امام بخاری نے کفِ شعر کو تو مطلق رکھا اور کفِ ثیاب کو نماز کے ساتھ مقید کیا، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حسب تصریح علامہ عینی داؤدی اس کے قائل ہیں کہ حدیث سے کفِ شعر وثیاب کی ممانعت نماز کے اندر کی ہے، جس کو قاضی عیاض نے رد بھی کیا اور جمہور بھی اس کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ دونوں باتیں مکروہ ہیں خواہ پہلے کر کے نماز پڑھے یا نماز کے اندر کرے (عمدہ ص ۳\۱۵۵) امام بخاری نے بظاہر داؤدی کی بات ثیاب کے بارے میں اختیار کر لی ہے، تاہم اس بارے میں سب متفق ہیں کہ ان دونوں کے نماز میں کرنے سے بھی نماز فاسد نہیں ہوتی۔ (الابواب ص ۲\۳۹۷)

قولہ لا ترفعن: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ ستر میں شرعاً اعتبار فی نفسہٖ تستر کا ہے، لہٰذا اگر کوئی دوسرا اس کے باوجود بھی غور وتعمق کر کے کسی کا ستر دیکھ لے تو وہ گنہگار ہوگا، یا نہ ہوگا، اور یہ مسئلہ کپڑوں کی وسعت وفراخی کے وقت کے لئے ہے، ورنہ حدیث میں جو ذکر ہے وہ تو بہت تنگی وکمی کا دور تھا جیسا کہ راویٔ حدیث مسلم نے اس کی صراحت کی ہے۔

باب لایکف شعرًا

(نماز میں) بالوں کو نہ روکے

۷۷۵: حدثنا ابوالنعمان ثنا حماد بن زید عن عمرو بن دینار عن طاؤس عن ابن عباس قال امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یسجد علیٰ سبعة اعظم ولایکف شعرہ' ولاثوبہ

ترجمہ: حضرت ابنِ عباسؓ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کو (خدا کی طرف سے) یہ حکم دیا گیا تھا، کہ سات ہڈیوں کے بل سجدہ کریں (اور نماز پڑھنے میں) نہ اپنے بالوں کو روکیں اور نہ کپڑا (سنبھالیں)۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بالوں کو اس لئے نہ روکے کہ وہ بھی سجدہ کرتے ہیں، چونکہ اس کے لئے حدیث امام بخاری کی شرط پر نہ تھی، اس لئے سجود علی سبعۃ اعظم اور کفِ شعر کی حدیث لائے، جس سے اشارہ کیا کہ یہ ساتوں اعضاء بھی سجدہ کرتے ہیں لہٰذا یہ نہیں کہ انسان تو سجدہ کرے گا اور یہ اعضاءِ سجود صرف ذریعۂ سجود ہوں گے۔ لہٰذا سر کے بال بھی سر کے ساتھ سجدہ کریں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا کہ نماز ہیئت مقادہ مستحسنہ کے اندر ہونی چاہئے، اور عرب کے لوگ بال چھوڑے رکھتے تھے، اس لئے بالوں کو سر پر باندھنے کی صورت ان کے یہاں بھی مستحسن نہ تھی، لہٰذا اس سے روکا گیا۔ (شرح تراجم ابواب البخاری ص ۲۵) مگر جب بالوں کو چھوڑے رکھنے کا استحسان اس لئے ہوا کہ وہ بھی سجدہ کرتے ہیں، تو اگر کسی وقت لوگ بالوں کے باندھنے کو بھی مستحسن سمجھنے لگیں تب بھی شرعی استحسان تو ارسال ہی رہے گا، لہٰذا نماز کے معاملہ کو خارجی عادات واستحسان کے ساتھ مرتبط نہ کیا جائے تو زیادہ اچھا ہے۔

باب لایکف ثوبہ' فی الصلوٰۃ

(نماز میں کپڑا نہ سمیٹے)

۷۷۶: حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل ثنا ابوعوانة عن عمرو عن طاؤس عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال امرت ان اسجد علیٰ سبعة اعظم لا اکف شعرًا ولاثوباً

ترجمہ ۷۷۶: حضرت ابن عباسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، کہ آپ نے فرمایا:۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں اور نہ بالوں کو سمیٹوں نہ کپڑے کو۔

تشریح: ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ ضرورتِ ستر وغیرہ کے لئے کپڑوں کو روکنے اور سمیٹنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ سترِ عورت فرض ہے، اس کی رعایت مقدم ہے، یہاں بتلایا کہ دوسرے حالات میں کپڑوں کو اپنی حالت پر ہی رہنے دیا جائے، اور ان کو روکنے سمیٹنے کی طرف خیال و توجہ صرف نہ کی جائے۔

باب التسبیح والدعآء فی السجود

سجدوں میں دعا اور تسبیح کا بیان

۷۷۷: حدثنا مسدد قال ثنا یحییٰ عن سفیٰن قال حدثنی منصور عن مسلم عن مسروق عن عآئشةؓ قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یکثر ان یقول فی رکوعه وسجوده سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی یتأول القرآن

ترجمہ ۷۷۷: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اکثر اپنے رکوع اور اپنے سجود میں کہا کرتے تھے **سبحانک اللھم وبحمدک ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی** آپ قرآن کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حضورِ اکرم ﷺ سے متعدد مواضع کے اندر دعائیں ثابت ہیں، تحریمہ کے بعد قراءت سے قبل، قراءت کے بعد رکوع سے پہلے، رکوع میں، قومہ میں، سجدہ میں، دونوں سجدوں کے درمیان تشہد کے بعد سلام سے قبل، طبرانی کی روایت سے معلوم ہوا کہ فاتحہ کے بعد آمین تین بار کہی، اور ایک طرح یہ وارد ہوا کہ آمین کے بعد آپ نے **اللّٰھم اغفرلی** کہا۔ پھر یہ کہ اگر کوئی مواضعِ مشہورہ کے علاوہ بھی دعا کرے تو اس کی بھی شارع نے تحسین کی ہے، اور کوئی ناپسندیدگی اس پر ظاہر نہیں کی، ہمارے فقہاء میں سے محقق ابن امیر الحاج نے لکھا کہ ادعیہ واذکار سب نمازوں میں درست ہیں، اور فرائض میں بھی بشرطیکہ مقتدیوں پر گرانی نہ ہو، اور فرض نمازوں میں چونکہ تخفیف کی رعایت کی گئی ہے جیسا کہ حضرت معاذؓ کے واقعہ سے معلوم ہوا، اس لئے ادعیہ واذکار کا اجراء ان میں نہیں ہوا۔ حتی کہ ان کا ذکر بھی کتبِ فقہ میں ترک ہوگیا اور صرف نوافل میں ان کا ذکر رہ گیا، کیونکہ وہ متنفل کی مرضی پر ہیں، جتنا چاہے ان کو طول دے سکتا ہے، اسی سے ترقی کر کے ایسا بھی ہوا کہ بعض کتبِ فقہ میں مکتوبات وفرائض کے اندر اذکار وادعیہ کو مکروہ یا ناجائز بھی لکھ دیا گیا۔ حالانکہ وہ صرف اس وقت ہے کہ قوم پر بار ہوں۔ ورنہ نہیں چونکہ اس سے حنفیہ کے یہاں ادعیہ واذکار کا باب بہت محدود اور تنگ ہو جاتا ہے، اور یہ حدیث کے بھی خلاف ہے، اس لئے تنبیہ کی ضرورت ہوئی۔ حضرتؒ نے اس تقریب سے یہ بھی فرمایا کہ ہمارے حضرات میں سے شیخ ابن ہمامؒ کی مطرد عادت ہے کہ وہ حنفیہ کے اقوال میں سے اس قول کو اختیار کرتے ہیں جو احادیث کے موافق ظاہراً۔

شیخ ابن الہمام اور شاہ صاحبؒ کی مماثلت

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی بھی ہو بہو ایسی ہی عادت تھی، وہ بھی ہر وقت حدیثِ نبوی صحیح وقوی کا قرب ڈھونڈتے تھے، اور کسی تاویلِ بعید کو پسند نہ کرتے تھے، کاش! ہمارے زمانہ کے حضرات اساتذہ وشیوخِ حدیث بھی اسی روش کو اپنائیں کہ یہی طریقہ احق واسلم بھی ہے۔ حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ میرے نزدیک منفرد کے لئے رکوع وسجود میں دعا کی بھی اجازت ہے۔

قولہ یتاول القرآن: فرمایا سورۂ نصر میں جو حضور علیہ السلام کے لئے استغفار کا حکم ہوا تھا، یہ اسی کی تعمیل تھی کہ حسب روایت حضرت عائشہؓ حضور علیہ السلام نے تسبیح واستغفار کی آخر زمانہ میں رکوع وسجود میں بھی بہت کثرت کی تھی، اور ہر وقت اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے بھی اس کا وظیفہ کرتے تھے، کیونکہ اس میں حضور علیہ السلام کو قربِ وفات کی خبر دی گئی تھی، اور اب بھی کوئی آخر عمر میں اس طرح کرے تو یہ اتباعِ سنت ہوگا، اور کوئی اگر یہ کہے کہ ایسا حکم صرف حضور علیہ السلام کے لئے تھا، ہمارے لئے نہیں تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔
بعض امالی میں سورۂ نصر کی جگہ سورۂ فتح لکھا گیا ہے، وہ صحیح نہیں کیونکہ سورۂ فتح ۲۶ویں پارہ میں ہے۔

باب المكث بين السجدتين

دونوں سجدوں کے درمیانی ٹھہرنے کا بیان

۷۷۸: حدثنا ابو النعمان قال حدثنا حماد عن ایوب عن ابی قلابة ان مالک ابن الحویرث قال لاصحابه الاانبئكم صلوٰة رسول الله صلے الله عليه وسلم قال وذاک فی غیر حین صلوٰة فقام ثم رکع فکبر ثم رفع رأسه هنیةً فصلی صلوٰة عمرو بن سلمة شیخنا هٰذا قال ایوب کان یفعل شیئاًلم ارهم یفعلونه' کان یقعد فی الثالثة اوالرابعة فاتینا النبی صلے الله علیه وسلم فاقمنا عنده' فقال لو رجعتم الیٰ اهالیکم صلوا،صلوٰة کذافی حین کذاصلوٰة کذافی حین کذا فاذاحضرت الصلوٰة فلیؤذن احدکم ولیؤمکم اکبرکم

۷۷۹: حدثنا محمد بن عبدالرحیم قال حدثنا ابو احمد محمد بن عبدالله الزبیری قال حدثنا مسعر عن الحکم عن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ عن البراء قال کان سجود النبی صلے الله علیه وسلم ورکوعه' وقعوده' بین السجدتین قریباً من السوآء

۷۸۰: حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا حماد بن زید عن ثابت عن انس بن مالک قال انی لاآلوان اصلی بکم کمارایت النبی صلے الله علیه وسلم یصلی بناقال ثابت کان انس بن مالک یصنع شیئالم ارکم تصنعونه' کان اذارفع راسه' من الرکوع قام حتیٰ یقول القآئل قدنسی وبین السجدتین حتیٰ یقول القآئل قدنسی

ترجمہ ۷۷۸:۔ حضرت ابوقلابہ روایت کرتے ہیں کہ مالک بن حویرث نے اپنے دوستوں سے کہا کہ کیا میں تمہیں رسولِ خدا ﷺ کی نماز (کی کیفیت) بتلاؤں، ابوقلابہ کہتے ہیں، وہ وقت کسی فرض نماز کا نہ تھا، لہٰذا وہ کھڑے ہو گئے، پھر انہوں نے رکوع کیا اور تکبیر کہی اس کے بعد اپنا سر اٹھایا، اور تھوڑی دیر کھڑے رہے اس کے بعد سجدہ کیا، پھر تھوڑی دیر کھڑے رہے اس کے بعد سجدہ کیا، پھر تھوڑی دیر اپنا سر اٹھائے رکھا، اس کے بعد سجدہ کیا، پھر تھوڑی دیر اپنا سر اٹھائے رکھا، اس کے بعد سجدہ کیا، پھر تھوڑی دیر اپنا سر اٹھائے رکھا، پس انہوں نے ہمارے اس شیخ یعنی عمرو بن سلمہ کی جیسی نماز پڑھی، ایوب کہتے ہیں کہ وہ ایک بات ایسی کرتے تھے کہ ہم نے اور لوگوں کو اسے کرتے ہوئے نہیں دیکھا تیسری یا چوتھی رکعت میں بیٹھتے تھے (مالک بن حویرث) کہتے ہیں کہ ہم اسلام لانے کے بعد نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ کی خدمت میں قیام کیا، تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم اپنے اہل وعیال میں واپس جاؤ، تو اس طرح ان اوقات میں نماز ادا کیا کرنا، لہٰذا جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی اذان کہہ دے، اور تم میں کا بڑا تمہاری امامت کرے۔

ترجمہ ۷۷۹:۔ حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کا سجود اور آپ کا رکوع، اور آپ کا بیٹھنا دونوں سجدوں کے درمیان میں

(ٹھہرنا) تقریباً برابر ہی ہوتا تھا۔

ترجمہ ۷۸۰: حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا کہ میں اس بات میں کمی نہ کروں گا کہ تمہیں ویسی ہی نماز پڑھاؤں جیسی کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو پڑھاتے دیکھا ہے، ثابت کہتے ہیں کہ انس بن مالک ایک بات ایسی کرتے تھے کہ میں نے تم لوگوں کو وہ عمل کرتے نہیں دیکھا وہ جب اپنا سر رکوع سے اٹھاتے اتنا کھڑا رہتے کہ کہنے والا کہتا کہ وہ (سجدہ کرنا) بھول گئے اور دونوں سجدوں کے درمیان میں (اتنی دیر تک بیٹھے رہتے تھے) کہ دیکھنے والا سمجھتا کہ وہ (دوسرا سجدہ) کرنا بھول گئے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ قال ایوب الخ سے معلوم ہوا کہ جلسۂ استراحت درجۂ خمول میں آ گیا تھا اور اس پر عمل بہت کم ہو گیا تھا، تاہم روایات میں اس کے ثبوت سے انکار بھی نہیں ہو سکتا، علامہ حلوانی نے اس کا جواز بھی تسلیم کیا ہے اور ہم نے جس نے اس کو مکروہ کہا ہے وہ طوالت پر محمول ہے کہ قدرِ معتاد سے زیادہ دیر تک کیا جائے، ورنہ کراہت یا عدم جواز کا قول حدیث ہوگا۔ شافعیہ سے بھی تطویلِ اعتدال کی ممانعت منقول ہے بلکہ انہوں نے اس کو مفسدِ صلوٰۃ بھی کہا ہے۔ (الابواب ص۲\۳۹۲)

حضرتؒ نے فرمایا:۔ امام احمدؒ کا قول ہے کہ اکثر حدیثوں میں جلسۂ استراحت نہیں ہے، حافظ نے کہا کہ بعد کو امام احمد نے اس سے رجوع کر لیا تھا، میں کہتا ہوں کہ آخر عمر میں امام احمدؒ نے ضعف کے باعث جلسۂ استراحت کیا ہوگا، جس کو حافظؒ نے رجوع بنا لیا۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ جلسۂ استراحت سنتِ راتبہ نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات میں بوقتِ ضرور ایسا ہوا ہے۔

باب لایفترش ذراعیه فی السجود وقال ابو حمید سجد النبی ﷺ ووضع یدیه غیر مفترش ولاقابضهما

۷۸۱: حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا محمد بن جعفر قال حدثنا شعبة قال سمعت قتادة عن انس بن مالک عن النبی صلے الله علیه وسلم قال اعتدلوا فی السجود ولایبسط احدکم ذراعیه انبساط الکلب

ترجمہ ۷۸۱:۔ حضرت انس بن مالکؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، سجدوں میں اعتدال کرو، اور کوئی شخص اپنی دونوں کہنیاں (زمین پر) جس طرح کہ کتا بچھالیتا ہے، نہ بچھائے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ابوداؤد میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ دونوں ہاتھ بھی سجدہ کرتے ہیں اور ان کے سجدہ کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اوپر سے اٹھے ہوئے ہوں اور نیچے سے پست ہوں، افتراش کی صورت میں ظاہر ہے کہ یہ صورت نہ رہے گی تو ان کا سجدہ بھی متصور نہ ہوگا، دوسرے یہ بھی ہے کہ حدیث سے نماز میں بری ہیئت اور حیوانات کے ساتھ تشبہ کو ناپسند کیا گیا اور افتراش (کہنیاں بچھا کر سجدہ کرنے) سے کتنے کی مشابہت ہوتی ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص تعب وتھکن کی وجہ سے تراویح کی نماز میں ایسا کرے تو اس کیلئے گنجائش ہے۔

باب من استویٰ قاعداً فی وتر من صلوته ثم نهض
(نماز کی طاق رکعت میں سیدھے بیٹھنے پھر کھڑے ہونے کا بیان)

۷۸۲: حدثنا محمد بن الصباح قال اخبرنا هشیم اخبرنا خالد ن الحذآء عن ابی قلابة قال اخبرنی مالک بن الحویرث اللیثی انه' رای النبی صلے الله علیه وسلم یصلی فاذاکان فی وتر من صلوته لم ینهض حتیٰ یستوی قاعداً

ترجمہ۷۸۲: حضرت لیثی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا تو (کیا دیکھا کہ) جب آپ اپنی نماز کی طاق رکعت میں ہوتے تھے تو جب تک سیدھے نہ بیٹھ جاتے تھے۔ کھڑے نہ ہوتے تھے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا:۔ اب امام بخاریؒ نے صراحت کے ساتھ جلسۂ استراحت کا عنوان قائم کر دیا ہے، اور حافظ نے سمجھا کہ یہی امام کا مختار بھی ہے اور ان کے نزدیک سنت ہے، میرے نزدیک سنت ہونے کا حال تو اوپر ایوب کے قول سے معلوم ہو چکا ہے اور امام احمدؒ کے اس قول سے بھی کہ احادیث میں اس کے لئے بہت کم ثبوت ہے، اور خود امام احمد بھی اس پر عمل نہیں کرتے تھے، اگرچہ آخر عمر میں بوڑھاپے کے عذر کی وجہ سے کیا ہے، اور یہ امام بخاری کا بھی مختار ہونا ضروری نہیں، نہ انہوں نے اس کی صراحت کی اور نہ کوئی اور دلیل اس پر ہے، بلکہ باب من استوی کے من سے تو اشارہ اس طرف ہوا کہ دوسرے لوگوں کے مختار کی دلیل پیش کرنا چاہتے ہیں، اور جب کسی مسئلہ میں نظر دائر وسائر ہوتی ہے تو امام بخاری اسی طرح عنوان قائم کیا کرتے ہیں اور اپنے اوپر اس کی ذمہ داری نہیں لیتے۔

دوسرے ہم پہلے بھی بتلا چکے ہیں کہ جلسۂ استراحت کو اختیار کرنا اس لئے بھی محلِ تامل ہے کہ جلسہ کے بعد اگر اٹھتے ہوئے تکبیر نہ کہے گا تو خلاف سنتِ معہودہ ہوگا کیونکہ ہر رفع وخفض میں تکبیر ہے، اگر کہے گا تو تکبیراتِ مقررہ سے تعداد بڑھ جائے گی اور اگر سجدہ سے اٹھتے ہوئے جو تکبیر کہی تھی اسی کو اتنا طویل کرے گا کہ وہ جلسہ میں بھی رہے اور اس سے اٹھنے کے وقت تک بھی چلتی رہے تو اس میں دشواری ہے، یہ سب بے اصولی کا ارتکاب محض اس لئے ہوگا کہ نماز کا جلسۂ استراحت خمول میں رہا ہے اور جو چیز خامل ونادر ہوتی ہے اس کے لئے بحث وتمحیص، اور تاصیل وتفریع نہیں ہوا کرتی، جیسے کہ قراءۃ فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین کے مسائل میں بھی یہی صورت پیش آئی ہے۔

تفصیل مذہب وتحقیق مزید

امام ترمذیؒ نے سجدہ سے اٹھنے کی کیفیت بتلانے کے لئے باب قائم کیا اور اس کیلئے مالک بن الحویرثؓ کی حدیث الباب بخاری پیش کی پھر لکھا کہ اسی پر بعض اہلِ علم اور ہمارے اصحاب کا عمل ہے، پھر دوسرا باب قائم کر کے حدیث ابی ہریرۃؓ ذکر کی جس میں حضور علیہ السلام کے سجدہ کے بعد بغیر جلسۂ استراحت کے کھڑے ہونے کا ثبوت ہے اور لکھا کہ اس پر بھی اہلِ علم کا عمل ہے، مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔

امام بخاری نے چونکہ عنوان باب من استوی سے قائم کیا ہے، اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ کا رجحان ہے کہ یہ ان کے اختیار ورجحان کی دلیل نہیں، کیونکہ وہ عام طور سے اس طرح جب کرتے ہیں کہ خود اپنا مختار نہ ہو لہٰذا دوسروں کا مختار نقل کرتے ہیں۔ معارف السنن میں جوہر نقی اور تمہید ابن عبدالبر سے نقل کیا کہ امام مالک، امام ابوحنیفہ ان کے اصحاب اور اوزاعی کا مذہب یہ ہے کہ سجدہ کے بعد دوسری اور چوتھی رکعت کے لئے بغیر جلوس کے کھڑا ہو جائے اور یہی حضرت ابن مسعود، ابن عمر وابن عباس وابوسعید وابن زبیر کا مختار ہے، ابوالزناد اور نعمان بن ابی عیاش نے کہا کہ میں نے بہت سے صحابۂ کرام کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔ اور یہی امام احمد وابن راہویہ کا مذہب ہے۔ امام احمد نے فرمایا کہ اکثر احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے، اثرم نے کہا کہ میں نے امام احمد کو دیکھا کہ سجدہ کے بعد اپنے پیروں کے پنجوں پر اٹھ جاتے تھے، اور اٹھنے سے قبل جلوس نہیں کرتے تھے۔

ان سب حضرات کی دلیل حدیثِ ابی حمید وحدیث رفاعۃ بن رافع ہے اور ابن نبت نعیم کی ''نوادر الفقہاء'' میں اس پر اجماع نقل کیا اور صرف امام شافعی کا اختلاف بتلایا۔ علامہ موفق حنبلی نے المغنی ص ۱۵۷۱ میں حضرت عمر وعلی سے بھی جلسۂ استراحت کا ترک نقل کیا۔ حضرت علامہ کشمیریؒ نے اپنی تعلیقاتِ آثار السنن میں بحوالہ ''سعایہ'' مجد الدین ابن تیمیہ (جد تقی الدین ابن تیمیہؒ) سے صحابہ کا اجماع ترکِ جلسۂ استراحت پر نقل کیا۔ غرض یہی امام ابوحنیفہؒ ومالک وجمہور کا مختار ہے اور امام احمد سے بھی مشہور روایت وعمل ترک ہی کا منقول ہے اور جن

حضرات نے ان کا رجوع نقل کیا وہ بوجہ عذر آخری عمر کا فعل ہوگا جیسا کہ مالک بن الحویرث کی روایت کے لئے بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے کسی بیماری کے وقت یا اخری عمر وضعف کے وقت حضور علیہ السلام کا فعل دیکھ کر روایت کیا ہے، کیونکہ وہ صرف بیس ۲۰ دن حضور کی خدمت میں رہے تھے، اسی لئے ان کی تائید میں شواہد بھی، ترک کے شواہد سے کم ہیں۔

علامہ عینی نے عمدہ ص ۳۰۷\۳ میں علامہ سفاقسی کے حوالہ سے ابوعبدالملک کا قول نقل کیا کہ امام شافعیؒ کے جلسۂ استراحت والی بات کیا اہلِ مدینہ سے مخفی رہتی جبکہ انہوں نے دس سال تک حضور علیہ السلام کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں، اور حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور دوسرے صحابہ وتابعین نے بھی ان کو نمازیں پڑھائی ہیں، ایسی بڑی بات ان سب سے چھپی رہتی، یہ بہت ہی مستبعد امر ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر امام احمد کا رجوع صحیح ہوتا تو ان کے اصحاب کیوں جلسۂ استراحت کو ترک کرتے؟ البتہ اتنی بات ممکن ہے کہ انہوں نے حدیثِ مالک بن الحویرثؓ کی وجہ سے اس کی کراہت سے رجوع کر کے اباحت کا قول اختیار کرلیا ہو، لہٰذا سنیتِ جلسہ کی طرف رجوع پھر بھی نہ ہوگا۔ (معارف ص ۷۸\۳)

علامہ شوکانی کا استدلال وجواب

آپ نے لکھا کہ مالک بن الحویرث سے جلسۂ استراحت کی مشروعیت نکلتی ہے، امام شافعی کا مشہور مذہب یہی ہے اور امام احمد سے دو روایت ہیں، خلال نے کہا کہ انہوں نے جلسہ کی طرف رجوع کرلیا تھا، اور اکثر حضرات نے اس کو مستحب نہیں سمجھا، ان کی دلیل نعمان بن ابی عیاش کا قول ہے کہ میں نے بہت سے صحابہ کو دیکھا کہ وہ بغیر جلسہ کے سیدھے کھڑے ہوجایا کرتے تھے، لیکن یہ قول اس کے سنت ہونے کے خلاف نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے حضور علیہ السلام نے اور صحابہ نے بھی بعض حالات میں ترک کیا ہوگا، جس سے صرف وجوب کی نفی ہوگی اور سنیت باقی رہے گی۔ (بستان الاحبار ص ۱\۲۴۷)

اعلاء السنن ص ۱۵۱\۳ میں علامہ شوکانی کا نیل الاوطار ص ۱۶۴\۱ سے یہ قول نقل کیا:۔ ہم نے شرح حدیث مسیئ الصلوٰۃ میں بتلایا تھا کہ جلسۂ استراحت کا ذکر بخاری وغیرہ میں بھی ہے (اور علامہ نووی کا اس سے انکار کرنا غلط ہے، اس لئے ذکرِ روایتِ بخاری سے وجوب پر بھی ہم استدلال کر سکتے ہیں مگر چونکہ خود امام بخاری نے ہی اس کے ذکر کو وہم بھی قرار دے دیا ہے، اور ہم یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ وجوب کا قائل کوئی بھی نہیں ہوا ہے، اس لئے وجوب کا قول نہیں کر سکتے، یعنی سنیت پھر بھی باقی رہی۔

مگر ظاہر ہے کہ ایسے معاملات میں جو زمانۂ نبوت وبعد نبوت میں رات دن بہ کثرت پیش آئے ہیں، اختلاف کے موقع پر سب سے بہتر فیصلہ تعاملِ صحابہ وتابعین وسلف سے ہی ہوسکتا ہے اور وہ جمہور کے حق میں ہے۔

صاحب عون المعبود کا استدلال وجواب

اعلاء السنن ۱۵۲\۳ میں صاحب عون کا کلام بابتہ حدیثِ ابن عمرؓ نقل کر کے ان کے قلتِ علم بالرجال اور متعدد غلطیوں کو ثابت کیا گیا۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔

صاحب تحفۃ الاحوذی کا نقد وجواب

آپ نے شرح ترمذی شریف مذکور ص ۱\۲۳۷ میں لکھا کہ امام احمد سے دو روایتیں ثابت ہیں جن کو صاحب المغنی اور صاحب شرح کبیر ابوالفرح شمس الدین مقدسی نے نقل کیا اور ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا کہ خلال نے بیان کیا کہ امام احمد نے جلسۂ استراحت کے مسئلہ میں حدیثِ مالک بن الحویرث کی طرف رجوع کرلیا تھا پھر لکھا کہ ''بعض حنفیہ نے تعلیقات ترمذی میں حافظ ابن حجر وابن القیم سے امام

احمدؒ کے رجوع کی بات نقل کر کے کہا کہ میرا گمان ہے انہوں نے رجوع نہ کیا ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ ان کے گمان مذکور کا منشأ محض تقلید ہے کیونکہ جب وہ کسی کے دل میں گھر کر جایا کرتی ہے تو اس سے ایسے ہی ظنونِ فاسدہ پیدا ہوا کرتے ہیں''۔ (واضح ہو کہ یہ تعریض حضرت علامہ کشمیریؒ اور العرف الشذی کی طرف ہے) اس پر صاحب معارف السنن نے لکھا کہ علامہ مبارکپوری نے عبارت مغنی وشرح کبیری نقل میں خیانت کی کہ ان کا کچھ حصہ نقل کر دیا اور کچھ چھوڑ دیا تا کہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ امام احمد نے اثباتِ جلسۂ استراحت کو ہی اختیار کر لیا تھا اور موفق و ابوالفرج و ماردینی سے نقل کیا کہ وہ سب حدیث مالک بن الحویرثؓ کو حالتِ عذر پر محمول کرتے تھے، جیسا کہ حدیث انی بدنت اور تربع ابن عمرؓ حالتِ عذر پر محمول ہیں۔ اور موفق نے یہ بھی لکھا کہ جمع بین الاخبار اور توسط بین القولین کے لئے یہی بہتر ہے۔ پھر لکھا کہ ابن القیم نے بھی رجوع کی بات ضرور نقل کی ہے مگر ساتھ ہی انہوں نے امام احمد کے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور وہ عبارت بھی صاحب تحفہ نے چھپا دی ہے، (کیا یہی اہلِ علم کا شیوہ ہے، جو اپنے آپ کو بڑے فخر کے ساتھ سلفی بھی کہتے ہیں) علامہ ابن القیم کی زاد المعاد میں پوری عبارت یہ ہے:۔

''سجدہ کے بعد حضور ﷺ سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے، اسی طرح وائل اور ابوہریرہؓ نے نقل کیا ہے، البتہ مالک بن الحویرث کی روایت سے جلسۂ استراحت معلوم ہوتا ہے، اس لئے فقہا میں اختلاف ہوا کہ آیا یہ نماز کی سنتوں میں سے ہے جس کو ادا کرنا چاہئے یا صرف عذر والے بوڑھوں، ضعیفوں، بیماروں کو ایسا کرنا چاہئے۔ ضرورت کی وجہ سے۔ امام احمد سے دو قول منقول ہیں۔ ایک ہی بھی ہے کہ انہوں نے مالک بن الحویرث کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا، لیکن ان تمام حضرات نے جنہوں نے نماز کی پوری کیفیت وطریقہ نقل کیا ہے انہوں نے جلسۂ استراحت کو نقل نہیں کیا ہے، صرف ابوحمید و مالک بن الحویرثؓ کی حدیثوں میں اس کا ذکر آیا ہے، اور اگر حضور علیہ السلام کی عادتِ مبارکہ ہمیشہ جلسۂ استراحت کرنے کی ہوتی تو ہر شخص نماز کی صفت بیان کرنے والا اس کا ذکر بھی ضرور کرتا، باقی صرف آپ سے اس کا ثبوت یہ نہیں بتلاتا کہ وہ سنن نماز میں سے ہے الا جبکہ اس کا فعل بطور سنتِ مقتدیٰ بہا کے ثابت ہو۔ لہٰذا اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کو آپ نے کسی ضرورت کے تحت کیا ہے تو اس کا سننِ صلوٰۃ میں سے ایک سنت بن جانا محقق نہ ہوگا۔ یہی اس مسئلہ میں تحقیقِ مناط ہے''۔ (معارف السنن ص ۳۱۷/۶)

آگے معارف میں یہ بھی ہے کہ جلسۂ استراحت کا ثبوت حضور علیہ السلام سے بہت ہی کم ہوا ہے اور یہ کہ وہ آپ کی عادتِ مستمرہ عامہ نہ تھی جو ہر نقی میں لکھا ہے کہ بخاری میں یہ بھی ہے کہ ایوب نے کہا کہ انہوں نے ایسی نماز پڑھائی کہ تم لوگ اس طرح نہیں پڑھتے وہ تو تیسری یا چوتھی رکعت پر بیٹھتے تھے (یہ حدیث بخاری ص ۱۱۳ باب المکث بین السجدتین میں گذر چکی ہے) اور طحاوی میں ہے کہ عمرو بن سلمہ ایسا کام کرتے ہیں جو تم نہیں کرتے، وہ سجدۂ اولیٰ و ثالثہ سے اٹھ کر جس رکعت میں قعدہ نہیں تھا بیٹھ کر پھر کھڑے ہوتے تھے، علامہ طحاوی نے فرمایا کہ قول ایوب سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اور لوگوں کو ایسا کرتے نہیں دیکھا، حالانکہ انہوں نے اجلۂ تابعین کی ایک جماعت کو دیکھا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ یہ صورت (جلسۂ استراحت کی) سنتِ صلوٰۃ نہ تھی۔ الخ (معارف السنن ص ۳۱۷/۶)

علامہ مبارکپوری کا ریمارک

اوپر جو ریمارک ہم نے تحفۃ الاحوذی سے نقل کیا ہے، ایک محدث کی شان سے بہت بعید ہے، ان کو سوچنا چاہئے تھا کہ وہ کتنے بڑے حافظِ حدیث، علامۂ محقق کے بارے میں ایسی بات لکھ رہے ہیں، جس نے ہر مسئلہ میں نہایت انصاف سے اور صرف محدثانہ تحقیق پیش کی ہے، مقلدانہ نہیں۔ اور اگر تقلیدِ ائمہ ایسی ہی بری چیز ہے کہ اس کو اختیار کر کے ایک بڑے سے بڑا عالم بھی صرف ظنونِ فاسدہ کا مورد بن جاتا ہے، تو یہ ہزاروں ہزار بلکہ لاکھوں اکابر علماءِ امت محدثین وفقہا پر طعن ہے، جنہوں نے ائمہ اربعہ کی تقلید کی ہے اور رجال وحدیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں، جن میں کسی کو حنفی کسی کو مالکی، کسی کو حنبلی وشافعی بتایا گیا ہے، اور اس وقت جو سعودی حکومت کے اکابر داعیان ہیں۔ وہ بھی سب امام

احمدؒ کے مقلد ہیں، کیا وہ اس طعن وتشنیع سے بچ جائیں گے، جن کی مالی امداد سے تحفۃ الاحوذی وغیرہ عربی ٹائپ سے مزین ہوکر چھپ رہی ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ آئندہ اِن سلفی حضرات کی کتابوں کی اشاعت کے لئے امداد کو ایسی مضر عبارتیں کتابوں میں سے نکال دینے کی شرط کرنی چاہئے، پھر صاحب تحفہ نے یہ بھی نہ سوچا کہ جن اکابر حنابلہ نے امام احمدؒ کے پہلے ہی قول وعمل کو ترجیح دی ہے، اور اسی کو اختیار بھی کیا ہے، اور خود ابن القیم نے بھی (جن کی ناقص عبارت نقل کر کے صاحب تحفہ نے اپنے ظن کی تائید دکھلائی ہے پوری تفصیل کر کے جلسۂ استراحت کو صرف ضرورت وعذر پر ہی محمول کردیا ہے، کیا یہ سب حضرات بھی ظنونِ فاسدہ میں ہی مبتلا ہو گئے تھے؟! بینوا توجروا.

ہمارا جہاں تک علم ہے موجودہ علماء واعیانِ سعودیہ بھی امام احمدؒ کے قولِ اول پر ہی عمل کرتے ہیں، سلفی حضرات کو چاہئے کہ ان کے بھی ظنونِ فاسدہ کی اصلاح کریں اور امام احمدؒ کے رجوع شدہ مسلک پر عمل کرائیں۔

صاحب مرعاۃ کا غیر معمولی تعصب اور درازلسانی

صاحبِ مرعاۃ کے استاذِ محترم علامہ مبارک پوریؒ تو پھر بھی غنیمت تھے، ان کے تلمیذ نے اور بھی آگے قدم بڑھا دیا، شاید یہ سمجھا ہو کہ اسی ذریعہ سے حقیقت کو غیر مقبول بنانے کی مہم کامیاب ہوسکتی ہے۔ اور حکومتِ سعودیہ کی مزید سرپرستی اور امدادیں مل سکتی ہیں۔

آپ نے مرعاۃ شرح مشکوۃ ص ۱\۳۶۷ میں ابن عبدالبر کے حوالہ سے امام اعظمؒ کو سیئی الحفظ لکھا، حالانکہ یہ حوالہ قطعاً غلط ہے، ابن عبدالبر نے تو اس بات کو اہلِ حدیث کی طرف منسوب کیا ہے اور یہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا ہے کہ اہلِ حدیث تو گویا اعداءِ امام ابوحنیفہ ہیں، (افسوس کہ اب وہ گویا کا پردہ بھی ختم ہوگیا ہے اور کھلی عداوت ہے)۔

ص ۱\۵۸۷ میں العرف الشذی ص ۱۴۵ کے حوالہ سے حضرت علامہ کشمیریؒ پر اعتراض کیا، مگر اس کے جواب کو نظر انداز کر دیا جو ص ۱۴۶ میں موجود ہے۔ ص ۱\۶۲۰ میں لکھا کہ "علامہ کشمیریؒ کی فصل الخطاب کا رد شیخ عبداللہ امرت سری کا ضرور پڑھنا چاہئے تا کہ حنفیہ کی تشغیبات اور ان کے مراوغاتِ جدلیہ وسائسِ خبیثہ واہیہ، اور تمویہاتِ باطلہ مزخرفہ منکشف ہوں"۔

ہم نے ابھی چند ورق پہلے مسئلہ فاتحہ خلف الامام کے لئے حضرتؒ اور دیگر اکابرِ امت کی تحقیقات ذکر کی ہیں، ان کو پڑھ کر انصاف کیا جائے کہ مذکورہ بالا درازلسانی اور دریدہ دہنی کا کیا جواز ہے؟!

مرعاۃ ص ۲\۳۹۹ میں "توسلِ نبویؐ" کے مجوزین کو "قبوریین" کے لقب سے نوازا۔ اور بار بار اسی لقب سے ان کو مطعون کر کے تنابز بالالقاب کا ارتکاب کیا ہے۔ جوازِ زیارت وتوسل کی پوری بحث ہم نے انوار الباری جلد یازدہم میں ذکر کردی ہے، اور سلفی حضرات کی تنبیہ کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ مسئلۂ توصل وزیارۃِ نبویہ میں ان کے مقتدا علامہ شوکانی بھی ان کے خلاف ہیں۔ (انوار ص ۱۱\۱۵۷) اور مسئلۂ زیارتِ نبویہ میں ان کے مقتدا ابنِ حزم ظاہری ہمارے ہمنوا ہیں وہ کہتے ہیں کہ "سفر کسی مسجد کی طرف تو علاوہ مساجد ثلاثہ کے حرام ہے، لیکن آثارِ انبیاء علیہم السلام کی طرف سفر مستحب ہے"۔ (الرد علی الاخنائی لابن تیمیہ۔ بحوالۂ ذب الذبابات ص ۲\۱۵۹) اس لئے اگر ہم سب مجوزینِ زیارت وتوسل قبوری ہیں تو علامہ شوکانی اور ابن حزم ظاہری بھی قبوری ہیں۔ وللہ الحمد۔

بڑوں کا ادب واحترام

صاحبِ تحفہ ومؤلفِ مرعاۃ کی عبارتیں اس لئے بھی نقل کی گئی کہ ان کا رویہ اکابرِ امت کی تنقیص کا دکھلا کر اس سے اجتناب کی طرف توجہ دلائی جائے، ہمارے بڑے خواہ کسی بھی مسلک سے متعلق ہوں، ہمارے لئے ان سب کا ہی احترام ضروری ہے، کیونکہ انہوں نے دینِ قیم کی

گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہؒ تو تمام محدثین صحاح وغیرہم کے استاذ الاساتذہ کے درجہ میں ہیں، ہم نے مقدمہ انوار الباری میں اس کو ثابت کیا ہے اور علامہ ذہبی شافعی نے بھی لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ سے محدثین وفقہاء کو اتنی بڑی تعداد نے حدیث کی روایت کی ہے کہ جن کا شمار نہیں ہوسکتا (مناقب ابی حنیفہ از ذہبی ص ۱۱ طبع مصر) اور حافظ جمال الدین مزیؒ نے تہذیب الکمال میں امام اعظم کے ترجمہ میں سے روایتِ حدیث کرنے والے پچانوے محدثینِ کبار کو نام بنام ذکر کیا ہے۔ احقر کے پاس ان کی نقل موجود ہے۔

محدثِ شہیر علامہ سیوطی شافعیؒ نے لکھا: ''امام ابوحنیفہؒ کے ان خصوصی مناقب میں سے کہ جن میں وہ منفرد ہیں ایک یہ بھی ہے کہ وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے علمِ شریعت کو مدون کیا اور اس کی ابواب پر ترتیب کی پھر امام مالک بن انسؒ نے موطا کی ترتیب میں ان ہی کی پیروی کی، اور اس بارے میں امام ابوحنیفہ پر کسی کو سبقت حاصل نہیں'' (تبییض الصحیفہ فی مناقب الامام ابی حنیفہ ص ۳۶ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)۔

کتبِ تاریخ معتبرہ میں یہ بھی صراحت ہے کہ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے، اور اس کے برعکس جو تذکرۃ الحفاظ ذہبی میں نقل ہوا (جس کی وجہ سے علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بھی مغالطہ ہوا) وہ غلط ہے۔ پوری تفصیل مولانا عبدالرشید نعمانی نے دے دی ہے (امام ابن ماجہ اور علم حدیث اردو ص ۱۶۱)۔

بہر حال! مقصدِ گزارش یہ ہے کہ اکابرِ امت کے واجب احترام کے خلاف کوئی بات چلانے کی مہم دین وعلم کے لئے سخت مضر ہے اور اس سے احتراز لازم ہے، واللہ الموفق۔

باب کیف یعتمد علی الارض اذاقام من الرکعة

۷۸۳: حدثنا معلی بن اسد قال حدثنا وھیب عن ایوب عن ابی قلابة قال جآء نامالک بن الحویرث فصلی بنافی مسجدنا ھٰذا فقال انی لاصلی بکم وما ارید الصلوٰة لکنی ارید ان اریکم کیف رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی قال ایوب فقلت لابی قلابة وکیف کانت صلوته قال مثل صلوٰة شیخنا ھٰذا یعنی عمر بن سلمة قال ایوب وکان ذٰلک الشیخ یتم التکبیر فاذا رفع راسه' عن السجدہ الثانیة جلس و اعتمد علی الارض ثم قام

ترجمہ: ابوقلابہ بیان کرتے ہیں کہ مالک بن حویرث ہمارے پاس آئے، اور ہماری مسجد میں ہمیں نماز پڑھائی، اور انہوں نے یہ کہہ دیا کہ میں تمہیں نماز پڑھاتا ہوں، لیکن میں نماز پڑھنا نہیں چاہتا، بلکہ میں تمہیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کس طرح نماز پڑھتے دیکھا، ایوب کہتے ہیں کہ میں نے ابوقلابہ سے کہا، کہ مالک بن حویرث کی نماز کیسی تھی، وہ بولے، کہ ہمارے ان شیخ یعنی عمرو بن سلمہ کی نماز کی طرح ایوب کہتے ہیں، کہ وہ شیخ پوری تکبیر کہتے تھے، اور جب اپنا سر اپنے سجدے سے اٹھاتے تھے تو بیٹھ جاتے تھے، اور زمین پر ٹیک جاتے تھے، اس کے بعد کھڑے ہوتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس باب پر لکھا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک زمین پر ٹیک لگا کر اٹھنا سنت ہے، حنفیہ کے نزدیک یہ سنت نہیں ہے، معارف السنن ص ۳۱۷/۲ میں یہ تفصیل ہے کہ اعتماد کی دو قسم ہیں، ایک تو سجدہ کے اندر کہنیوں کو گھٹنوں یا رانوں پر رکھنا، جو امام ترمذی نے باب الاعتماد فی السجود میں مراد لیا ہے، دوسری یہ ہے کہ دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہونے کو دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر اٹھے، جو شافعیہ کے یہاں سنت ہے، علامہ نووی نے شرح المہذب ص ۳/۴۴۲ میں لکھا کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک سجدہ یا جلسہ اور تشہد اولی سے اٹھنے کے وقت مسنون یہ ہے کہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر کھڑا ہو۔ اس میں قوی وضعیف اور مرد وعورت برابر ہیں۔ پھر ص ۳/۴۴۴ میں لکھا کہ ''یہی مذہب امام مالک واحمد کا بھی ہے''۔

علامہ بنوریؒ نے لکھا کہ یہ صرف امام شافعی و مالک کا مذہب ہے، اور امام احمدؒ کا مذہب وہی ہے جو امام ابوحنیفہؒ کا ہے، (کمافی المغنی ص ۱۵۷۲ والشرح الکبیر ص ۱۵۷۱) بلکہ حافظ ابن عبدالبر مالکی نے "التمہید" میں امام مالک کا مذہب بھی امام صاحب کی طرح نقل کیا ہے، جبکہ وہ اس کے زیادہ جاننے والے ہیں، (عمدہ ص ۳\۱۶۳) اور ایسا ہی قواعد ابن رشد میں بھی ہے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے شافعیہ کے قولِ سنیت کے لئے کوئی دلیل نہیں ملی۔ البتہ امام بخاری بیہقی ونووی نے مالک بن الحویرثؓ کی حدیث پیش کی ہے، جس کا جواب ابن قدامہ حنبلی اور علامہ عینی حنفی وغیرہ نے یہ دیا کہ یہ حضور علیہ السلام کی کبرسنی اور مشقتِ قیام کے سبب سے ہوا ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے خود بھی فرمایا تھا کہ اب میرا بدن بھاری ہوگیا ہے لہٰذا رکوع وسجود کے وقت مجھ سے سبقت نہ کرو۔ اور امام صاحب وامام احمد کے لئے نسائی شریف وغیرہ کی حدیث وائل حجت ہے، جس میں گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے، اور ایک ہی گھٹنوں کے بل پر اٹھنے کا ذکر ہے، اور ابوداؤد میں حدیثِ ابن عمرؓ بھی ہے، جس میں رسولِ اکرم ﷺ نے نماز میں اٹھنے کے وقت ہاتھوں پر ٹیک لگا کر اٹھنے کی ممانعت فرمائی ہے، اور ترمذی میں ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام پاؤں کے سروں پر زور دے کر اٹھتے تھے، لہٰذا ہمارے نزدیک گھٹنوں پر ہی اعتماد کر کے اٹھنا مسنون ہے، اور یہی مذہب امام احمد، امام مالک، اوزاعی ثوری واسحٰق بن راہویہ (شیخ البخاری) کا بھی ہے، اور حضرت ابن مسعود، ابن عمر وابن عباس سے بھی یہی منقول ہے، نعمان بن ابی عیاش نے یہ بھی بتلایا کہ میں نے بہت سے اصحابِ رسول اکرم ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔ ابوداؤد نے بھی مختارِ حنفیہ ہی کی تائید کی ہے، کیونکہ انہوں نے نماز کے اندر ہاتھوں پر ٹیک لگانے کی کراہت پر مستقل باب قائم کیا ہے، جس کے تحت مذکورہ بالا حدیثِ حضرت ابن عمرؓ کو مرفوعاً وموقوفاً روایت کیا ہے واللہ اعلم۔

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا:۔ علامہ موفق نے امام احمد سے جلسۂ استراحت کے بارے میں دو قول ذکر کر کے لکھا کہ دونوں روایت پر کھڑے ہونے کی صورت پاؤں کے سروں پر ہی اور گھٹنوں پر اعتماد کر کے اٹھنا متعین ہے، قاضی نے کہا کہ امام احمد سے اس کے بارے میں دوسرا قول نہیں کہ زمین پر اعتماد (ٹیک) نہ کرے گا، خواہ جلسۂ استراحت کے لئے بیٹھے یا نہ بیٹھے۔ (الابواب والتراجم ص ۲\۲۹۹)

حافظ نے علامہ ابن رشید سے اعتماد علی الارض کا مطلب تمکن کے ساتھ بیٹھنا لیا ہے، جو یکدم کھڑے ہونے کے مقابل ہے، لہٰذا ان کے نزدیک بخاریؒ نے بابِ سابق کے ترجمہ میں مشروعیت کے لئے اشارہ کیا تھا۔ جلسۂ استراحت کی، اور یہاں اس کا طریقہ بتلایا کہ تمکن کے ساتھ ہو، اس کو ذکر کر کے حافظ نے پھر بھی ہاتھوں کو ٹیک کر ہی اٹھنے کی بات اپنے مذہب کی نکالنے کی سعی کی ہے اور حضرت ابن عمرؓ کا فعل بھی عبدالرزاق کی روایت سے پیش کیا ہے۔ (فتح ص ۲\۲۰۵)

ہم بتلا چکے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے بھی یہ صورت اپنے بدن کے بھاری ہونے اور عذر کی وجہ سے اختیار کی تھی، اس لئے اسی کو بار بار پیش کرنا بے سود ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

اجتہادِ حضرت ابنِ عمرؓ اور افادۂ انور

آپ نے فرمایا:۔ ابوداؤد باب کراهة الاعتماد على اليد في الصلوة میں جو حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے وہ ہماری مؤید ہے، کہ ہم حالتِ قعود ونہوض میں ہاتھوں کو گھٹنوں پر ٹیکتے ہیں اور شافعیہ ان کو زمین پر ٹیکتے ہیں، وہ حضرت ابن عمرؓ کے فعل سے تائید لیتے ہیں، میرے نزدیک وہ ان کا اپنا اجتہاد تھا، جس کے مطابق وہ عمل کرتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ سجدے کو جاتے ہوئے یہی ہونا چاہئے کہ ہاتھوں کو سجدے میں سیدھے لے جائیں اور گھٹنوں پر ٹیک کر لے جانے کو تجویدِ یدین کا انقطاع ونقص خیال کرتے تھے، اور پھر اسی طرح سجدے سے اٹھتے ہوئے بھی بغیر گھٹنوں پر ٹیکنے کے سیدھے اوپر لانے کو بہتر خیال کرتے تھے تا کہ دونوں صورتیں ایک طرح سے ادا ہوں۔ لیکن جب بوڑھے ہوگئے اور بدن

بھی بھاری ہو گیا تو بغیر گھٹنوں پر ہاتھ ٹیکنے کے مشقت و دشواری پیش آئی، اس لئے ہاتھوں کو زمین پر رکھنے کے لئے مجبور ہو گئے۔اور ایسا پیش آجایا کرتا ہے کہ جب ایک جانب کو بطور اصل کے مان لیا جاتا ہے تو فروع میں بھی اس کو چلانے کی سعی کی جاتی ہے، اور میرے نزدیک یہی معنی ہیں اجتہاد کے، کبھی ایک جزئی پر بہت کلیات صادق ہو سکتی ہیں اور اسی طرح ایک جزئی بہت سے قواعد وضوابط میں داخل ہو سکتی ہے، لہٰذا اس میں نظر کرنا ہی اجتہاد ہے کہ کون سی جزئی کس قاعدہ سے اقرب ہے تا کہ اس پر اس کا حکم جاری کر دیں۔ یہ وظیفہ صرف مجتہد کا ہے، دوسرا جس میں شرائطِ اجتہاد پوری نہ ہوں، اس میں غلطی کرتا ہے۔ اگر چہ غلطی مجتہد سے بھی ہو جاتی ہے، معصوم وہ بھی نہیں ہے۔ حضرت نے فرمایا میرے نزدیک اعتماد والی صورت میں بھی ایسی ہی شکل ہوئی ہے۔ اور میرے نزدیک وہ سنتِ نبویہ سے ثابت نہیں ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله واعتمد على الارض

حضرتؒ نے فرمایا یہ عمرو بن سلمہ کا فعل ذکر ہوا اور مجھے پورے ذخیرۂ حدیث میں یہ نہیں ملا، بلکہ اس میں صرف **استعينوا بالركب يا امسوا بالركب** ہے، اور امام ترمذی نے اس پر الاعتماد فی السجود کا باب باندھا ہے، اور اس میں لفظ سجود کا اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے اور حافظ علاؤ الدین مغلطائے کی ''تلویح'' میں ترمذی کے نسخہ سے **باب ما جاء في الاعتماد اذا قام من السجود** نقل ہوا ہے۔

غرض یہ کہ ترمذی کے باب مذکور کے تحت حدیث **استعينوا بالركب** مروی ہے، جو عام ہے، اس میں صفتِ رکوع اور صفتِ قیام **الى الركعة من السجود** سب ہی شامل ہیں اور سب ہی حالتوں کے لئے گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے کا حکم وارد ہے، لہٰذا اس کو صرف حالتِ سجود کے لئے خاص کیوں کر کر سکتے ہیں؟ البتہ یہ بات نکل سکتی ہے کہ جو کسی عذر سے گھٹنوں کی استعانت سے کام نہ چلا سکے، وہ مجبوری میں ہاتھوں کو ٹیک کر بھی اٹھ سکتا ہے لہٰذا اس کو مسنون و مستحب قرار دینے کے لئے ذخیرۂ حدیث میں کوئی صراحت نہیں ملتی واللہ تعالیٰ اعلم۔

علامہ عینیؒ نے علامہ کرمانی شافعی شارحِ بخاری کا قول نقل کیا کہ فقہاء (شافعیہ) نے کہا کہ جس طرح خمیر کے لئے آٹا گوندھنے والا بیٹھتا ہے، اس طرح بیٹھے، یا ہاتھوں پر ٹیک لگا کر سجدہ سے اٹھے، جس طرح حضرت ابن عمرؓ کرتے تھے، (عمدہ ص ۱۶۳\۳) معلوم نہیں فقہاءِ شافعیہ نے یہ ہیئت مذکورہ عاجن والی کہاں سے استنباط کی؟ حاشیۂ بخاری ص ۱۱۴ میں عاجن غلط چھپ گیا ہے۔

باب يكبر وهو ينهض من السجدتين
وكان ابن الزبير يكبر في نهضته

۷۸۴: حدثنا يحيى بن صالح قال حدثنا فليح بن سليمان عن سعيد ابن الحارث قال صلى لنا ابوسعيد فجهر بالتكبير حين رفع راسه من السجود وحين سجد وحين رفع و حين قام من الركعتين وقال هكذا رايت النبى صلے الله عليه وسلم

۷۸۵: حدثنا سلمان بن حرب قال حدثنا حماد بن زيد قال حدثنا غيلان بن جرير عن مطرف قال صليت انا عمران بن الحصين صلوٰة خلف علىٰ بن ابى طالب فكان اذا سجد كبرواذا رفع كبرواذا نهض من الركعتين كبرفلما سلم اخذعمران بيدى فقال لقد صلى بنا هٰذا صلوٰة محمد صلے الله عليه وسلم اوقال لقدذكرنى هٰذا صلوٰة محمد صلے الله عليه وسلم

ترجمہ ۷۸۴: سعید بن حارث کہتے ہیں کہ ہمیں ابوسعید نے نماز پڑھائی تو جس وقت انہوں نے اپنا سر (پہلے) سجدہ سے اٹھایا اور جب

سجدہ کیا۔اور جب انہوں نے (دوسرے سجدے سے) سر اٹھایا، اور جب دو رکعتوں سے (فراغت کر کے) اٹھے تو بلند آواز سے تکبیر کہی اور کہا کہ میں نے نبی کریم علیہ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔

ترجمہ ۷۸۵: مطرف روایت کرتے ہیں کہ میں نے اور عمران بن حصین نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پیچھے ایک مرتبہ نماز پڑھی، تو (ہم نے ان کو دیکھا کہ) جب وہ سجدہ کرتے تھے، تکبیر کہتے تھے، اور جب دو رکعتوں سے اٹھتے تھے، تکبیر کہتے تھے، سلام پھیرنے کے بعد عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ اس شخص نے ہمیں سیدنا محمد علیہ کی سی نماز پڑھائی یا یہ کہا، کہ اس شخص نے سیدنا محمد علیہ کی نماز یاد دلا دی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔شارع علیہ السلام کا منشا یہ ہے کہ جب نماز میں ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہو تو اس پوری انتقالی حالت کو ذکرِ خداوندی سے معمور ومبروک کرے، لہٰذا امام بخاری نے اس باب میں ثابت کیا کہ سجدوں سے اٹھنے کے ساتھ ہی تکبیر شروع کر دے، اور راوی کے تکبیر جہر سے کہنے کا بھی ذکر ہوا، تا کہ بنی امیہ کے دور میں جو تکبیرات کم کر دی گئی تھیں، ان کی طرف بھی تعریض ہو جائے۔اور امام بخاری نے شاید مالکیہ پر بھی تعریض کی ہے جو کہتے ہیں کہ سجدوں سے اٹھنے کے وقت ساتھ ہی تکبیر نہیں ہے بلکہ جب سیدھا کھڑا ہو جائے گا جب تکبیر کہے، تا کہ پہلی رکعت کی تکبیر کی طرح ہو جائے کہ اس میں بھی پہلی تکبیر کھڑے ہو کر کہی تھی، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس سے دونوں رکعتوں کا باہم تناسب وتشاکل تو ضرور پایا جائے گا، مگر امورِ شرعیہ کے اندر فقط تناسب وتشاکل پر مدار مناسب نہیں، بلکہ اس کے لئے سلف کا تعامل واختیار رکھنا چاہئے۔

باب سنة الجلوس فی التشهد و کانت ام الدردآء تجلس فی صلٰوتها جلسة الرجل و کانت فقیهةً

(تشہد کے لئے بیٹھنے کا طریقہ'ام درداء اپنی نماز میں مرد کی طرح بیٹھتی تھیں'اور فقیہہ تھیں)

۷۸۶: حدثنا عبدالله بن مسلمة عن مالک عن عبدالرحمٰن ابن القاسم عن عبدالله بن عبدالله انه' اخبره' انه' کان یریٰ عبدالله بن عمر یتربع فی الصلوٰة اذا جلس نفعلته' وانا یومئذ حدیث السن فنهانی عبدالله بن عمر وقال انما سنة الصلوٰة ان تنصب رجلک الیمنیٰ وتثنی الیسریٰ فقلت انک تفعل ذٰلک فقال ان رجلای لاتحملانی

۷۸۷: حدثنا یحیی بن بکیر قال حدثنا اللیث عن خالدعن سعید عن محمد بن عمرو بن حلحلة عن محمد بن عمرو بن عطآء ح قال وحدثنی اللیث عن یزید بن ابی حبیب ویزید بن محمد عن محمد بن عمرو بن حلحلة عن محمد بن عمرو بن عطآء انه' کان جالساً مع نفرمن اصحاب النبی صلے الله علیه وسلم فذکرنا صلوٰة النبی صلے الله علیه وسلم فقال ابوحمید ن الساعدی انا کنت احفظکم لصلوٰة رسول الله صلے الله علیه وسلم رایته' اذا کبر جعل یدیه حذومنکبیه واذا رکع امکن یدیه من رکبتیه ثم هصر ظهره' فاذارفع راسه استویٰ حتیٰ یعود کل فقار مکانه 'واذا سجدوضع یدیه غیر مفترش ولا قابضهما واستقبل باطراف اصابع رجلیه القبلة فاذا جلس فی الرکعتین جلس علیٰ رجله الیسریٰ و نصب الیمنیٰ فاذا جلس فی الرکعة الأخرة قدم رجله الیسریٰ و نصب الاخریٰ وقعد علیٰ مقعدته وسمع اللیث یزید بن ابی حبیب ویزید من محمد بن حلحلة وابن حلحلة من ابن عطآء وقال ابوصالح

عن الليث كل فقار مكانه' وقال ابن المبارك عن يحيىٰ بن ايوب قال حدثنى يزيد بن ابى حبيب ان محمد بن عمرو بن حلحلة حدثه' كل فقارة

ترجمہ ۷۸۶: حضرت عبداللہ بن عمر کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں کہ وہ عبداللہ بن عمر کو دیکھتے تھے کہ جب وہ نماز میں بیٹھتے تھے، تو چار زانو بیٹھتے تھے، لہٰذا میں نے بھی ایسا ہی کیا، اور میں اس زمانے میں کم سن تھا، تو مجھے عبداللہ بن عمر نے منع کیا اور کہا کہ نماز کا طریقہ تو یہی ہے، کہ تم اپنا داہنا پیر کھڑا کرو، اور بایاں دوہرا کرلو، میں نے کہا آپ جو ایسا کرتے ہیں، بولے، کہ میرے پیر (کمزور ہو گئے ہیں) میرا بار برداشت نہیں کر سکتے۔

ترجمہ ۷۸۷: محمد بن عمرو بن عطاء روایت کرتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے چند اصحاب کے پاس بیٹھا ہوا تھا، تو ہم لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی نماز کا ذکر کیا، ابوحمید ساعدی بولے کہ مجھے تو سب سے زیادہ رسول خدا ﷺ کی نماز یاد ہے، میں نے آپ کو دیکھا کہ جب آپ نے تکبیر (تحریمہ) پڑھی تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں شانوں کے مقابل تک اٹھائے، اور جب آپ نے رکوع کیا، تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر جمائے، اپنی پیٹھ کو جھکا دیا جس وقت آپ نے اپنا سر (رکوع سے) اٹھایا، تو اس حد تک سیدھے ہو گئے کہ ہر ایک عضو (کا جوڑ) اپنے اپنے مقام پر پہنچ گیا اور جب آپ نے سجدہ کیا تو دونوں ہاتھ اپنے زمین پر رکھ دیئے، نہ ان کو بچھائے ہوئے تھے، اور نہ سمیٹے ہوئے تھے اور پیر کی انگلیاں آپ نے قبلہ رخ کر لی تھیں، پھر جس وقت آپ دو رکعتوں میں بیٹھے تو اپنے بائیں پیر پر بیٹھے، اور داہنے پیر کو آپ نے کھڑا کر لیا۔ جب آخری رکعت میں بیٹھے تو آپ نے اپنے بائیں پیر کو آگے کر دیا اور دوسرے پیر کو کھڑا کر لیا، اور اپنی نشست گاہ کے بل بیٹھ گئے۔ اور لیث نے یزید بن ابی حبیب سے، اور یزید نے محمد بن حلحلہ سے، اور ابن حلحلہ نے عطاء سے سنا ہے۔ اور ابوصالح نے لیث سے **کل فقار مکانه** نقل کیا ہے اور ابن مبارک نے یحییٰ بن ایوب سے روایت کیا، کہ مجھ سے یزید بن ابی حبیب نے بیان کیا، ان سے محمد بن عمرو بن حلحلہ نے کل فقارۃ کے لفظ کے ساتھ روایت کیا۔

تشریح: اس باب میں امام بخاریؒ نماز میں بیٹھنے کا مسنون طریقہ بتلانا چاہتے ہیں، اور عنوان میں ام الدرداء کا اثر بھی ذکر کیا جس سے ثابت کیا کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح بیٹھیں گی، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ امام بخاری اسی کو صحیح سمجھتے ہوں گے، مگر اس دعوے کے لئے کوئی حدیث نہیں پیش کر سکے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک ان دونوں میں فرق ہے، مرد کے لئے افتراش ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا کر کے بائیں کو بچھائے گا اور اس پر بیٹھے گا، عورت کے لئے تورک ہے کہ اپنے دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر بائیں ران و سرین زمین پر رکھ کر بیٹھے گی، اور یہی اس کے لئے زیادہ ستر والی صورت بھی ہے، اس کے لئے ہمارے پاس مراسیل ابی داؤد میں ایک مرسل حدیث بھی ہے، امام احمدؒ نے فرمایا کہ عورت رکوع و سجدے کے وقت اپنے دونوں ہاتھ نہ اٹھائے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ مرد اور عورت کی نمازوں میں طرق ادا کا فرق ہے، ہم نے انوار الباری میں پہلے اس فرق کی طرف اشارہ کیا ہے۔

امام بخاری اور آثارِ صحابہ کی حجیت

اول تو ام الدرداء دو ہیں، ایک صحابیہ ہیں، دوسری تابعیہ، اور یہاں اختلاف ہوا کہ کونسی مراد ہیں۔ اگر صحابیہ بھی ہوں تو امام بخاری کے نزدیک آثار صحابہ حجت نہیں ہیں، پھر ان کے اثر سے استدلال کیوں کیا؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اپنا مختار و پسندیدہ مسلک ثابت کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کسی صحابی یا تابعی کے اثر سے بھی حجت پکڑ لی جائے، اور وہ خلاف ہوں تو نظر انداز کر دیئے جائیں۔

یاد ہوگا کہ کتاب العلم میں امام بخاری نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مکتوب گرامی کا ذکر کر کے اپنی طرف سے یہ عبارت بڑھا دی تھی کہ

حدیثِ نبوی کے سوااور کچھ قبول نہ کیا جائے، اس پر ہم نے متنبہ بھی کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے قاضی ابوبکر بن حزم کو یہ بھی لکھا تھا کہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کے پاس جو علم موجود ہے، اس کو لکھ کر ان کے لئے بھیج دیں۔ (تہذیب ترجمہ ابوبکر حزمی)

علامہ سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں امام زہری سے نقل کیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سالم بن عبداللہ کو لکھا تھا کہ صدقات کے بارے میں حضرت عمرؓ کا جو معمول رہا ہے وہ ان کو لکھ کر بھیجیں، اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ گذشتہ سنت اور طریقوں کا زہری سے بڑھ کر کوئی عالم باقی نہیں رہا، (تذکرۃ الحفاظ ترجمہ امام زہری) حضرت شاہ ولی اللہؒ نے الانصاف اور حجۃ اللہ میں لکھا کہ دورِ اول کے علماء کا طرزِ عمل ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی حدیث سے خواہ وہ مرسل ہو یا مسند دونوں سے استدلال کیا جائے۔ نیز صحابہ و تابعین کے اقوال سے بھی استدلال کیا جائے کیونکہ ان کے علم میں یہ اقوال یا تو خود آں حضرت ﷺ کی ہی احادیثِ منقولہ تھیں جن کو انہوں نے مختصر کر کے موقوف بنالیا تھا، اور بہت سے حضرات مثلاً ابراہیم نخعی اور شعبی وغیرہ تو احادیثِ مرفوعہ کو بھی بطور موقوفہ ہی نقل کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم کو یہ زیادہ محبوب ہے کہ پیغمبر ﷺ کے بعد کے کسی شخص سے ان کو نقل کریں تا کہ روایت میں کچھ کمی بیشی ہو تو وہ بعد کے شخص پر ہی رہے، اور جب کسی مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث مختلف ہوتیں، تب بھی اقوالِ صحابہ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، اور جب صحابہ و تابعین کے مذاہب بھی کسی مسئلہ میں مختلف ہوتے تو ہر عالم کے نزدیک اپنے شہر کے عمائد اور اپنے اساتذہ کا مذہب پسندیدہ ہوتا تھا۔ (مزید بحث و تفصیل علامہ نعمانی دام فضلہم کی تالیفِ قیم ''امام ابن ماجہ اور علم حدیث'' اردو میں دیکھی جائے)۔

غرض یہ کہ متقدمین میں سے امام بخاری نے اس بارے میں بھی اپنی راہ الگ ہی بنائی تھی کہ وہ آثارِ صحابہ و تابعین کو حجت نہ سمجھتے تھے، اور اسی لئے مجردِ صحیح کا مجموعہ صحیح بخاری کو قرار دیا۔ لیکن جیسا کہ اس باب زیر بحث میں ہے خود امام بخاریؒ نے حدیثِ مرسل ابی داؤد کے مقابلہ میں ایک صحابیہ یا تابعیہ کے اثر سے استدلال کرلیا ہے، اور دوسرے مواضع میں بھی جب اپنے مسلک کی تائید کے لئے ضرورت سمجھتے ہیں تو ترجمۃ الباب کے اندر اقوال و آثارِ صحابہ کو لاتے ہیں اور رسالہ رفع یدین و قرائۃ خلف الامام میں تو بڑا حصہ آثار ہی کا ہے۔

برخلاف اس کے امام اعظمؒ کی کتاب الآثار میں جو حسبِ اعتراف علامہ سیوطیؒ سب سے پہلی اثری تالیف ہے اور ان کے مسانید میں بھی احادیثِ مرفوعہ کے ساتھ آثارِ صحابہ بھی مذکور ہیں اور ان ہی کا اتباع امام مالک نے بھی کیا کہ موطاً میں احادیث کے ساتھ اقوال صحابہ و فتاوی تابعین و تبع تابعین بھی موجود ہیں۔

عورت کا جلوس وغیرہ مرد کی طرح نہیں ہے

ابن جریج کا بیان ہے کہ میں نے عطا سے پوچھا کیا عورت بھی مرد کی طرح تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھائیگی؟ کہا نہیں وہ مرد کی طرح ہاتھ نہ اٹھائے گی، پھر اپنے دونوں ہاتھ بہت پست کر کے اور اپنے بدن سے خوب ملا کر اشارہ سے بتلایا کہ اس طرح کرے گی، اور فرمایا کہ عورت کی نماز کا طریقہ مرد کی طرح نہیں ہے۔ (باب الیٰ این ترفع یدیہا مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۲۳۹ا)

دوسری روایت میں عطاء نے فرمایا کہ عورت صرف اپنے سینہ تک ہاتھ اٹھائے گی۔ حضرت حماد سے بھی ایسا ہی منقول ہے، حضرت حفصہ بنت سیرین سے نقل ہوا کہ عورت تکبیر کے وقت اپنی چھاتی تک ہاتھ اٹھائے، البتہ ام الدرداء سے نقل ہوا کہ نماز شروع کرتے وقت وہ اپنے مونڈھوں تک ہاتھ اٹھاتی تھیں۔ (مصنف =) پھر محدث ابن ابی شیبہ نے ایک باب فی المرأۃ کیف تکون فی سجودہا باندھا اور حضرت علیؓ سے نقل کیا کہ عورت جب سجدہ کرے تو سمٹ جائے اور اپنی رانوں کو پیٹ سے ملالے)۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ عورت اکٹھی ہو کر اور سمٹ کر نماز پڑھے، حضرت مجاہد مرد کے لئے عورت کی طرح پیٹ سے رانوں کو

ملا کر سجدہ کو مکروہ سمجھتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ عورت سجدے کے وقت اپنے پیٹ کو رانوں سے ملالے اور سرین نہ اٹھائے، اور نہ مرد کی طرح اعضاء جسم کو الگ الگ کرے۔ (مصنف ص۱۲۶۹/۱) پھر باب المرأۃ کیف تجلس فی الصلوٰۃ قائم کیا جس میں حضرت خالد سے نقل کیا کہ نماز میں عورتوں کو چارزانو بیٹھنے کا حکم ہوا تھا اور یہ بھی کہ وہ مردوں کی طرح سرینوں پر نہ بیٹھیں۔ حضرت نافع سے نقل ہوا کہ حضرت ابن عمرؓ کے گھر کی عورتیں نماز میں چارزانو بیٹھتی تھیں۔ ابراہیم نے کہا کہ عورت نماز میں ایک جانب پر بیٹھے، بعض حضرات نے کہا کہ جس طرح چاہے بیٹھے مگر سمٹ کر اکٹھی ہو کر بیٹھے۔ (=ص۱۲۷۰/۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ عورت کی نماز میں کئی طریقوں پر فرق ہے، اور بیٹھنا بھی مرد کی طرح نہیں ہے اور مراسیلِ ابی داؤد کی تو مرسل حدیث بھی یہی بتلا رہی ہے، پھر اس سب کے خلاف ام الدرداء کے فعل سے استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟! مگر امام بخاری کی عادت ہے کہ اپنے مختار کے خلاف احادیث و آثار کو نہ ذکر کرتے ہیں نہ ان کا اثر لیتے ہیں۔

اس کے بعد امام بخاری نے جو دو حدیث روایت کی ہیں، ان میں سے ایک سے تو حضرت ابن عمرؓ کا فعل تربع فی الصلوٰۃ کا ثابت ہوا جس کو خود انہوں نے ہی عذر پر محمول کر دیا، پھر جو سنتِ صلوٰۃ بتلائی وہ افتراش اور تورک دونوں پر محمول ہو سکتی ہے کیونکہ بائیں پاؤں کا موڑنا پھیرنا یا بچھانا دونوں میں ہوتا ہے، فرق یہ ہے کہ افتراش کی صورت میں اسی پاؤں پر بیٹھتے ہیں اور تورک میں زمین پر بیٹھتے ہیں، اور حضرت ابن عمرؓ سے ہی نسائی شریف میں یہ تفصیل ہے کہ سنتِ صلوٰۃ یہ ہے کہ داہنا پاؤں کھڑا کر کے اس کی انگلیوں کو قبلہ رخ کیا جائے اور بائیں پاؤں پر بیٹھا جائے۔ اور دوسری حدیثِ بخاری میں پہلا تشہد تو اسی طرح ہے، البتہ دوسرا تورک والا ہے۔ حدیثِ مرفوع قولی یہ بھی نہیں ہے، صرف ابوحمید ساعدی کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام کی نماز اسی طرح تھی۔ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے اور بظاہر امام بخاری نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

تفصیل مذاہب: اوجز ص۱۲۵۴/۱ میں اس طرح ہے:۔ حنفیہ کے یہاں افتراش مسنون ہے، امام ترمذی نے لکھا کہ یہی قول ثوری ابن مبارک اور اہلِ کوفہ کا ہے اور اسی پر اکثر اہلِ علم کا عمل ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ افتراش مردوں کے لئے ہے اور ہر جلسہ کے لئے ہے خواہ وہ سجدوں کے درمیان کا ہو یا تشہدِ اول یا ثانی کے لئے ہو، اور عورتوں کے لئے ہر جلسہ میں تورک مسنون ہے، مالکیہ کے نزدیک ہر جلسہ کے لئے تورک ہے اور مرد و عورت کا بھی کوئی فرق اس بارے میں نہیں ہے۔ البتہ بعض مالکیہ نے دونوں تشہد کے جلسوں میں حنفیہ کی طرح مردوں کے لئے افتراش کو اختیار کیا ہے۔ حنابلہ کے یہاں تورک صرف دوسرے تشہد میں ہے، باقی میں حنفیہ کی طرح افتراش ہے۔ شافعیہ کے نزدیک تمام جلسوں میں حنفیہ کی طرح افتراش ہے، صرف آخری تشہد میں تورک ہے، یعنی نمازِ صبح و جمعہ کے جلسۂ تشہد میں مثلاً ان کے یہاں تورک ہو گا کیونکہ وہ آخری ہے اور حنابلہ کے یہاں چونکہ وہ دوسرا نہیں ہے، اس لئے وہ افتراش کے قائل ہیں۔

حنفیہ کے دلائل: (۱) مسلم شریف کی روایتِ حضرت عائشہؓ کہ حضور علیہ السلام داہنا پاؤں کھڑا کر کے بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھتے تھے (۲) طحاوی سنن سعید بن منصور، ابوداؤد، نسائی، ترمذی و ابن ماجہ میں وائل بن حجر سے بھی ایسی روایت ہے، (۳) نسائی میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ سنتِ صلوٰۃ داہنا پاؤں کھڑا کر کے اس کی انگلیاں قبلہ رخ کرنا اور بائیں پاؤں پر بیٹھنا ہے (۴) ابوداؤد و مسندِ احمد میں حدیثِ رفاعہ سے بھی یہی طریقہ حضور علیہ السلام سے روایت کیا گیا، اور اس پر علامہ شوکانی نے لکھا کہ ''اس حدیث کی سند میں کوئی کلام نہیں ہے، اور اس کو محدث ابن ابی شیبہ و ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے، پھر لکھا کہ ان روایات سے استدلال اس طرح ہے کہ ان میں ایک ہی طریقہ تشہد میں بیٹھنے کا ذکر ہوا ہے اور کسی نے اس کو تشہد اول کے ساتھ خاص نہیں بتلایا، اس سے معلوم ہوا کہ یہی صورت دونوں تشہد کے لئے مسنون ہے، اگر وہ صرف اول کے لئے ہوتی اور دوسرے کے لئے نہ ہوتی تو اس کے ذکر و تفصیل کو وہ ترک نہ کرتے، کیونکہ وہ تو حضور علیہ السلام کی نماز کی پوری ہیئت و صورت بیان کر رہے تھے، لہٰذا یہی ثابت ہوتا ہے کہ تشہد میں بیٹھنے کا بیان کردہ طریقہ صرف اول کے لئے نہیں

بلکہ دونوں ہی کے لئے تھا''۔ (کذا فی النیل)

اعلاء السنن ص ۳\۱۰۳ میں نیل الاوطار شوکانی سے یہ بھی نقل ہوا کہ انہوں نے لکھا:۔ خاص طور سے حضرت عائشہؓ والی حدیث سامنے رکھی جائے کہ اس میں ہر دو رکعت کے جلوس اور اس کے تحیہ کا بیان ہوا ہے اور اس کے بعد جلوس کی ہیئت ذکر کی ہے، لہٰذا یہ مستبعد ہے کہ جو طریقہ آخر میں بیان ہوا ہے وہ صرف ایک جلسۂ تشہد کے لئے مانا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ انہوں نے دوسرے کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ (نیل ص ۲\۱۶۸)

صاحب اعلاء السنن نے دوسروں کی متدل احادیث پر بھی سند و متن کے لحاظ سے سیر حاصل کلام کیا ہے وہ بھی قابلِ مطالعہ ہے۔

(۵) اعلاء السنن ص ۳\۱۰۲ میں مستدرک حاکم اور سنن بیہقی کی یہ حدیث بھی استدلال میں ذکر کی گئی ہے کہ حضور علیہ السلام نے نماز کے اندر اقعاء اور تورک سے منع فرمایا ہے، جس سے ثابت ہوا کہ مردوں کے لئے تورک فی الصلوٰۃ مکروہ ہے اور دونوں تشہد کے جلسوں میں کوئی فرق اس بارے میں نہیں ہے۔ کیونکہ نماز کا لفظ عام ہے۔ لہٰذا جس طرح اقعاء (کتے کی طرح بیٹھنا) نماز میں سب کے نزدیک مکروہ ہے، اسی طرح تورک بھی مردوں کے لئے مکروہ ہونا چاہئے اور جس حدیث سے تورک ثابت ہوا اس کو عذر پر محمول کرنا چاہئے، کیونکہ جب ممانعت واباحت دونوں ایک ہی چیز کے لئے وارد ہوں تو ممانعت کو ترجیح ہوا کرتی ہے، اور اباحت کو کسی ضرورت یا عذر کی حالت پر محمول کرنا بہتر ہوتا ہے۔

بدایۃ المجتہد کا ذکر

علامہ ابن رشدؒ نے ہیئت جلوس فی الصلوٰۃ کے بارے میں اختلافِ مذاہب و دلائل کا ذکر کر کے لکھا کہ یہ ساری ہیئات نماز میں جائز ہیں، اور نماز سب سے ہو جاتی ہے، لہٰذا اس کو جواز و عدم جواز کا اختلاف نہ سمجھا جائے۔ (ص ۱\۱۱۵)

مسئلہ تعدیلِ ارکان اور علامہ ابن رشد کی غلطی

علامہ کی یہ منقبت خاص طور سے لائق ذکر ہے کہ اختصار کے ساتھ سب کے دلائل انصاف کے ساتھ ذکر کر دیا کرتے ہیں، اور بیانِ مذاہب میں بھی ان کا قلم محتاط ہے، مگر بعض مواقع میں ان سے غلطی ہوتی ہے، مثلاً اسی (ص ۱\۱۱۵ میں اعتدال کی بحث میں یہ لکھ گئے کہ امام ابو حنیفہؒ رکوع وغیرہ میں اعتدال کو واجب نہیں کہتے، حالانکہ یہ غلط ہے اور ہم نے اسی جلد کے ص ۱۴۵\۱۴۶ میں حضرت شاہ صاحبؒ سے نقل کیا ہے کہ امام صاحب اور امام محمد صرف فرضیت کے قائل نہیں ہیں کیونکہ اس کے لئے دلیلِ قطعی چاہئے، لیکن وہ اس کے وجوب سے منکر نہیں ہیں، اور حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ تقریباً پچاس احادیث تعدیل و اعتدالِ ارکان کے مؤکد ہونے کی مروی ہیں، اس لئے نماز میں اس کی ضرورت و وجوب سے کون منکر ہو سکتا ہے؟ البتہ فرض کے درجہ میں اس کو پہنچا دینا مشکل ہے۔ اور بدایۃ المجتہد ہی کی طرح کتاب الفقہ علی المذاہب الخمسہ (محمد جواد مغنیہ) ص ۱۳۸ میں بھی غلطی ہوئی ہے، اس میں لکھا کہ حنفیہ کے نزدیک رکوع میں صرف جھکنا کافی ہے اور طمانیت واجب نہیں ہے، اور بقیہ مذاہب میں طمانیت و استقرار واجب ہے، پھر ص ۱۳۹ میں لکھا کہ حنفیہ کے یہاں دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا واجب نہیں ہے، اور باقی سب مذاہب میں واجب ہے۔

البتہ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ (شائع کردہ وزارۃ الاوقاف مصر) ص ۱\۱۶۸ میں واجباتِ صلوٰۃ کے بیان میں جو نقل ہوا ہے وہ صحیح ہے۔ اس میں حنفیہ کے نزدیک ۱۹ واجباتِ صلوٰۃ ذکر کئے ہیں، جن میں نمبر ۴ پر اطمینان کا ارکانِ اصلیہ رکوع و سجود وغیرہ میں واجب کہا ہے، اور آخر میں رفع من الرکوع اور تعدیلِ ارکان کو بھی واجب بتلایا ہے۔ اور لکھا کہ یہ سب حنفیہ کے یہاں واجب ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام سے ان سب پر مواظبت ثابت ہے، لہٰذا جو کوئی ان میں سے کسی ایک کو بھی بھول کر ترک کرے گا تو اس پر سجدۂ سہو واجب ہوگا۔ اور عمداً ترک کرے گا تو اس پر نماز کا اعادہ واجب ہوگا۔

اعلاء السنن ص ۳\۱۹ میں لکھا کہ حنفیہ کے نزدیک طمانیت واعتدال رکوع، سجود، قومہ وجلسہ چاروں میں واجب ہے، اور یہی راجح فی المذاہب ہے جیسا کہ ردالمختار ص ۱\۴۸۳ میں ہے، بحر میں بھی ہے کہ دلیل کا مقتضیٰ ان چاروں میں وجوب ہے اور قول بالوجوب ہی محقق ابن الہمام اوران کے تلمیذ ابن امیر الحاج کا بھی مختار ہے، قاضی صدرشہید نے اپنی شرح میں تعدیلِ ارکان کے بارے میں پوری شدت اختیار کی ہے اور لکھا کہ ہر رکن کو کامل کرنا امام صاحب اور امام محمد کے نزدیک واجب ہے، اگر ترک کرے گا تو شدید کراہت کا مرتکب ہوگا، اور اس نماز کا اعادہ لازم ہوگا۔ (ص ۱\۳۸۴) امام محمد سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ ان سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کی نماز جائز نہ ہوگی، علامہ سرخسی نے بھی لکھا کہ ترکِ اعتدال کی وجہ سے نماز لوٹانا لازم ہوگا۔ (فتح القدیر ص ۱\۲۶۲)

غرض یہ بڑا مغالطہ ہے کہ حنفیہ کی طرف تعدیلِ ارکان کے عدمِ وجوب کا قول منسوب کردیا گیا، یا کسی نے اس کو صرف مسنون ومستحب لکھ دیا، اور علامہ ابن رشد ایسے محقق سے بھی اس بارے میں غلطی ہوگئی ہے۔ فلیتنبہ لہ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب من لم یر التشہد الاول واجباً لان النبی صلے اللہ علیہ وسلم قام من الرکعتین ولم یرجع

۷۸۸: حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب عن الزہری قال حدثنی عبدالرحمٰن بن ہرمز مولیٰ بنی عبدالمطلب وقال مرۃ مولیٰ ربیعۃ ابن الحارث ان عبداللہ بن بحینۃ قال وھو من ازدشنوءۃ وھو حلیف لبنی عبدمناف وکان من اصحاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم صلے بھم الظھر فقام فی الرکعتین الاولیین لم یجلس فقام الناس معہ حتیٰ اذا قضی الصلوٰۃ وانتظر الناس تسلیمہ کبر وھو جالس فسجد سجدتین قبل ان یسلم ثم سلم

ترجمہ: نبی اکرم ﷺ نے (ایک دن) لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی، تو (بھولے سے) پہلی دو رکعتوں (کے ختم) پر کھڑے ہوگئے۔ اور قعدہ نہیں کیا تو لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہوگئے، یہاں تک کہ جب آپ نماز تمام کرچکے، اور لوگ آپ کے سلام پھیرنے کے منتظر ہوئے تو آپ نے بیٹھے ہی بیٹھے تکبیر کہی، اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کئے، اور کے بعد سلام پھیرا۔

تشریح: حافظؒ نے اس باب پر بسیط کلام کیا ہے اور امام بخاریؒ پر علامہ زین بن المنیر کے اعتراض کا بھی ذکر کیا ہے فتح الباری ص ۲\۳۰۹ میں دیکھا جائے۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اس باب سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ تشہد رکنِ صلوٰۃ یا فرض نہیں ہے، جس کے ترک سے نماز باطل ہوجائے، البتہ ترکِ واجب ہوا جس سے سجدۂ سہو لازم ہوا۔

امام بخاری نے قولہ ولم یرجع سے یہ بھی بتلایا کہ اگر تشہد فرض ورکن ہوتا تو حضور علیہ السلام کھڑے ہونے کے بعد بھی اس کی طرف لوٹ جاتے۔ جیسا کہ قعدۂ اخیرہ کے ترک سہواً پر لوٹنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ وہ فرض ہے، دوسری حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام نے حضور علیہ السلام کو بلا تشہد کے کھڑے ہونے پر توجہ بھی دلائی، مگر آپ نہ لوٹے، لہٰذا یہ ترکِ واجب ہی کی متعین صورت تھی۔ نیز معلوم ہوا کہ متعدد واجب بھی ترک ہوجائیں تب بھی سجدۂ سہو ایک ہی کافی ہوگا، کیونکہ یہاں قعدۂ اولیٰ بھی واجب تھا اور تشہد بھی، دو واجب حضور علیہ السلام سے سہواً ترک ہوگئے تھے، مگر آپ نے ایک ہی سجدۂ سہو کیا۔

علامہ موفقؒ نے لکھا کہ اگر دو سہو یا زیادہ ایک جنس کے ہوں تو سب کے نزدیک ایک ہی سجدۂ سہو کافی ہوگا، لیکن اگر وہ مختلف جنس کے

ہوں تو ابن المنذر نے ایک قول امام احمد سے ایک ہی سجدۂ سہو کافی ہونے کا نقل کیا اور یہی قول اکثر اہل علم کا بھی ہے، جن میں امام مالک، ثوری، شافعی اور اصحاب الرائے ہیں۔

بعض حضرات نے ہر سہو کے لئے الگ سجدہ قرار دیا ہے، لیکن ان کی دلیل حدیث ابی داؤد و ابن ماجہ ''لکل سہو سجدتان'' کی سند میں کلام ہے، دوسرے اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر نماز کے لئے سجدہ ہے خواہ وہ ایک نماز میں متعدد بھی ہوں۔ الخ (لامع ص ۱۳۳۳)۔

افادۂ انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ کے یہاں واجب کا مرتبہ نہیں ہے، اس لئے واجب بدل کر فرض مراد لیا ہے، امام بخاری نے دیکھا کہ ترکِ تشہد کی تلافی حضور علیہ السلام کے سجدۂ سہو سے کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ فرض نہ تھا، ورنہ اس کے ترک سے نماز باطل اور کالعدم ہو جاتی، اور بعینہٖ یہی شان حنفیہ کے یہاں واجب کی ہے، کہ وہ سنت سے اوپر اور فرض سے کم درجہ ہے، اگر بھول سے کوئی سنت نماز میں رہ جائے تو اس کی وجہ سے سجدۂ سہو نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ مرتبہ دوسروں کے یہاں نہیں ہے اس لئے ان کے مسائل کی نوعیت عجیب ہو جاتی ہے، چنانچہ حنابلہ نے تو فرض کی دو قسم کر دیں ایک وہ جو شرطِ صحت بھی ہو، دوسرا جو ایسا نہ ہو، حالانکہ یہ دوسرا ہی بعینہٖ حنفیہ کا وجوب ہے، مالکیہ نے وجوبِ سنت اور وجوبِ افتراض دو قسم بنائیں۔ اور وجوبِ سنت میں وہ سجدۂ سہو کے قائل ہوئے ہیں، جبکہ وہ بھی حنفیہ کے وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ شافعیہ کو باب الحج میں وجوب کا درجہ ماننا پڑا، کیونکہ انہوں نے جنایات کی تلافی مان کر حج کو مکمل مان لیا ہے، ہمارے نزدیک جس ضروری و اہم رکن غیر فرض کی تلافی ممکن ہو خواہ جزاء سے جیسے حج میں یا سجدۂ سہو سے جیسے نماز میں، اسی کو ہم واجب کا درجہ دیتے ہیں، جو فرض و سنت کے درمیان ہے۔ پھر حضرتؒ نے شئی واجب اور واجب الشئی کا فرق واضح کیا، جو حضرتؒ کی مشہور تحقیق ہے۔

باب التشهد فی الاولیٰ

(پہلے قعدہ میں تشہد پڑھنے کا بیان)

۷۸۹: حدثنا قتيبة قال حدثنا بكر عن جعفر بن ربيعة عن الاعرج عن عبدالله بن مالک ابن بحينة قال صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم الظهر فقام و عليه جلوس فلما كان فی آخر صلوته سجد سجدتين وهو جالس

ترجمہ: عبداللہ بن مالک ابن بُحینہ روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) ہمیں رسولِ خدا ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی، تو (دوسری رکعت کے سجدوں کے بعد) کھڑے ہو گئے، حالانکہ آپ کو بیٹھنا ضروری تھا، لیکن جب آپ نے نماز کا آخری قعدہ کیا، تو دو سجدے (سہو کے) کئے۔

تشریح: پہلے باب میں امام بخاریؒ نے یہ بتلایا تھا کہ تشہد فرض نہیں ہے، یہاں یہ بتلایا کہ اگر وہ سہواً ترک ہو جائے تو سجدۂ سہو کرنا چاہئے، لہٰذا اس کو ترک کرنا جائز نہیں اور اس کی تلافی نہ کرے گا تو نماز قابلِ اعادہ ہوگی۔

باب التشهد فی الآخرة

(آخری قعدہ میں تشہد پڑھنے کا بیان)

۷۹۰: حدثنا ابو نعيم قال حدثنا الاعمش عن شقيق بن سلمة قال قال عبدالله كنا اذا صلينا خلف النبی صلى الله عليه وسلم قلنا السلام علىٰ جبريل وميكائيل السلام علىٰ فلان وفلان فالتفت الينا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ان الله هو السلام فاذا صلى احدكم فليقل التحيات لله

والصلوات والطيبات السلام عليک ايهاالنبی و رحمة الله وبركاته' السلام علينا وعلیٰ عبادالله الصالحين فانكم اذاقلتموها اصابت كل عبدالله صالح فی السمآء والارض اشهد ان لااله الا الله واشهد ان محمداً عبدالله و رسوله'

ترجمہ ۷۹۰: حضرت عبداللہ (بن مسعود) روایت کرتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم ﷺ کے پیچھے (نماز کے (قعدہ میں) یہ پڑھا کرتے تھے، کہ السلام علی جبریل ومیکائیل السلام علی فلان و فلان تو (ایک مرتبہ) رسول خدا ﷺ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا، کہ اللہ تو خود ہی سلام ہے (اس پر سلام بھیجنے کی کیا ضرورت) لہٰذا جب کوئی تم میں سے نماز پڑھے تو کہے التحیات للّٰہ والصلوات والطیبات السلام علیک ایہا النبی ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ السلام علینا وعلیٰ عباد اللّٰہ الصالحین ﴿ کیونکہ جس وقت تم کہہ دو گے، تو (یہ دعا) اللہ کے ہر نیک بندے کو پہنچ جائے گی، خواہ وہ آسمان میں ہو یا زمین میں ﴾ اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشہد ان محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ.

تشریح: اوپر کے باب میں درمیانی تشہد کا حکم بیان ہوا تھا، یہاں آخری تشہد کا بیان ہے، جو پہلے سے زیادہ اہم وضروری ہے۔ اس طرح امام بخاری نے تینوں باب میں درجہ بدرجہ احکام کی نوعیت دکھلائی ہے۔

قولہ ان اللّٰہ ھو الاسلام اس کا تعلق دوسری مفصل حدیث سے ہے جو آگے آرہی ہے اس میں ہے کہ صحابۂ کرام السلام علی اللّٰہ بھی کہتے تھے۔

قولہ علی جبریل پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا جبر کے معنی وقت کے ہیں اور ایل اللہ ہے لہٰذا جبریل کے معنی خدا کا قوی بندہ۔ ایسے ہی میکا کے معنی دوست کے ہیں۔ لہٰذا میکائیل معنی خدا کا دوست۔ اسراف کے معنی مصطفٰی کے ہیں میکائیل خدا کا برگزیدہ بندہ۔ عزرا کے معنی ناصر کے ہیں، عزرائیل خدا کا ناصرومددگار بندہ۔

قولہ التحیات پر فرمایا کہ تحیات سے عباداتِ قولیہ مراد ہیں، صلوٰت سے مراد عباداتِ فعلیہ اور طیبات سے مالی عبادات مراد ہیں۔ یہ کلمات تو حضور علیہ السلام کی طرف سے شبِ معراج ہی میں جناب باری میں بطورِ تحیہ پیش کئے گئے تھے جس کے جواب میں حضرت باری جل ذکرہ کی جانب سے السلام علیک ایہا النبی ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ ارشاد ہوا اور نبی اکرم ﷺ نے السلام علینا الخ سے اس کی تکمیل فرمائی ہے۔

شاہ اسمٰعیل رحمہ اللہ کی تحقیق

حضرتؒ نے فرمایا کہ شاہ صاحبؒ نے ''الایضاح'' میں اس سے استدلال کیا کہ جمع معرف باللام مفید استغراق ہوتی ہے، میں کہتا ہوں کہ ادعیہ، نذور ایمان کے بارے میں تو یہ قاعدہ مسلم ہے، کیونکہ ان سب کا مبنیٰ فقط الفاظ پر ہوتا ہے، لیکن ان کے سوا دوسری چیزوں میں قطعیتِ عموم واستغراق کی بات تسلیم نہیں ہے۔

اختلاف مذاہب

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اوجز ص ۱۲۶۲ میں لکھا: اہلِ نقل نے حکمِ تشہد میں علماء کا کافی اختلاف ذکر کیا ہے، اس لئے تفصیل ضروری ہے امام مالکؒ سے اس کی سنیت مطلقاً منقول ہے، جیسا کہ زرقانی وغیرہ نے کہا اور اصحابِ متون بھی اس کو سننِ صلوٰۃ ہی سے قرار دیتے ہیں، جیسا کہ مختصر الخلیل اور مختصر عبدالرحمٰن وغیرہ میں ہے، لیکن ابن عربی نے کہا کہ وہ رکنِ صلوٰۃ ہے مگر واجب نہیں نہ اس کا محل واجب ہے۔

امام احمدؒ سے زرقانی، حافظ اور نووی نے دونوں تشہد کا وجوب نقل کیا، اور صاحب نیل المآرب حنبلی نے اول کو واجب دوسرے کو رکن

قرار دیا ایسے ہی صاحب المغنی نے بھی دوسرے تشہد کوارکان میں بتلایا اور اول کو واجبات میں۔

امام شافعیؒ سے زرقانی نے دوسرے میں وجوب نقل کیا، اول میں نہیں اور نووی نے بھی اول کو سنت کہا۔ حنفیہ سے بھی ان حضرات نے امام مالک کے موافق نقل کیا، مگر ہماری کتابوں میں دوسرے تشہد کو واجب لکھا ہے، حافظ نے لکھا کہ معروف عندالحنفیہ وجوب ہے، فرض نہیں۔ بخلاف اس کے کہ جو ان کے مخالفین کی کتابوں میں ہے۔

علامہ عینی نے لکھا کہ شرح ہدایہ میں امام صاحب کے نزدیک قعدۂ اولیٰ کا تشہد واجب لکھا ہے اور یہی مختار صحیح ہے، بعض نے سنت کہا جو قیاس کا مقتضیٰ ہے لیکن وہ ظاہر روایت کے خلاف ہے۔ اوپر کی تفصیل سے اتنی بات بقدر مشترک نکلی کہ جمہور کے نزدیک دوسرا تشہد زیادہ مؤکد ہے اول سے۔ الخ۔

باب الدعآء قبل السلام

(سلام پھیرنے سے پہلے دعا کرنے کا بیان)

۷۹۱: حدثنا ابوالیمان قال اخبرنا شعیب عن الزهری اخبرنا عروة ابن الزبیر عن عآئشة زوج النبی صلے الله علیه وسلم اخبرته' ان رسول الله صلے الله علیه وسلم کان یا عو فی الصلوٰة اللهم انی اعوذبک من عذاب القبر واعوذبک من فتنة المسیح الدجال واعوذبک من فتنة الممات اللهم انی اعوذبک من المائم والمغرم فقال له' قآئل مااکثر ماتستعیذ من المغرم فقال ان الرجل اذا غرم حدث فکذب واذاوعداخلف وعن الزهری قال اخبرنی عروة بن الزبیر ان عآئشة قالت سمعت رسول الله صلے الله علیه وسلم یستعیذ فی صلوته من فتنة الدجال

۷۹۲: حدثنا قتیبة بن سعید قال حدثنا اللیث عن یزید بن ابی حبیب عن ابی الخیر عن عبدالله بن عمرو عن ابی بکر ن الصدیق رضی الله عنه' انه' قال لرسول الله صلی الله علیه وسلم علمنی دعآءً ادعوبه' فی صلوتی قال قل اللهم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً ولا یغفر الذنوب الاانت فاغفرلی مغفرة من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم

ترجمہ۷۹۱: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نماز میں یہ دعا کیا کرتے تھے اللّٰھم انی اعوذبک من عذاب القبر واعوذبک من فتنة المسیح الدجال واعوذبک من فتنة المحیا والممات اللّٰھم انی اعوذبک من المائم والمغرم تو آپ سے کسی نے عرض کیا کہ آپ قرض سے بہت پناہ مانگتے ہیں (اس کی کیا وجہ ہے؟) آپ نے فرمایا کہ جب آدمی قرضدار ہو جاتا ہے، تو جب وہ بات کہتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، اور جب وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے، اور زہری نے بیان کیا کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو نماز میں فتنۂ دجال سے پناہ مانگتے ہوئے سنا۔

ترجمہ۷۹۲: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول خدا ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی دعا تعلیم فرمایئے جو میں اپنی نماز میں پڑھ لیا کروں، آپ نے فرمایا کہ یہ پڑھا کرو، اللّٰھم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً ولا یغفر الذنوب الا انت فاغفرلی مغفرةً من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: - جو دعائیں حضور اکرم ﷺ سے مروی وثابت ہیں وہ تو نماز کے اندر سب جائز ہیں جیسا کہ بحر میں

اس کی تصریح ہے، اور جو نمازی خود سے دوسری کرے اس میں تفصیل ہے کہ قرآن مجید وادعیۂ ماثورہ حدیث کی طرح کی دعائیں جائز ہیں، اور جن امور کا سوال عام طور سے لوگوں سے بھی کیا جاتا ہے۔ ایسی دعا نماز میں نہ کرنی چاہئے کہ ان سے فسادِ صلوٰۃ کا اندیشہ ہے۔ تاہم ابن بطال اور دوسرے لوگوں نے جو امام ابوحنیفہؒ کی طرف یہ بات منسوب کردی ہے کہ ان کے نزدیک صرف قرآن مجید کی ذکر کردہ دعائیں نماز میں جائز ہیں، یہ نقل صحیح نہیں ہے، کیونکہ کتبِ حنفیہ میں قرآنی ادعیہ کے ساتھ ادعیۂ حدیث اور دوسری ماثور ادعیہ کا جواز موجود ہے، اور یہی حنابلہ کا بھی مذہب مغنی میں ہے کہ اگر تشہد میں ایسی دعائیں کرے جو احادیث میں ثابت ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ الخ او جز ص ۲۷۴ میں مزید اچھی تفصیل وتحقیق ہے۔

تشہد کے بعد درود شریف اور امام بخاری

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ۔ مجھے بہت تعجب ہے کہ امام بخاریؒ نے تشہد کے بعد دعاؤں کے ابواب شروع کر دیئے اور درود شریف کو ترک کر دیا، نہ اس پر باب قائم کیا نہ اس کا کچھ حکم بتلایا، حالانکہ ان کے پاس اس کے لئے صحیح حدیث بھی ان کی شرط پر موجود تھی، جس کو وہ کتاب الدعوات میں لائیں گے اور باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ قائم کریں گے (یہ حدیث بخاری ص ۹۴۰ پارہ نمبر ۲۶ میں آئے گی)۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ نماز کے اندر آخری تشہد کے بعد درود شریف کا پڑھنا امام شافعیؒ کے نزدیک تو فرض ہے مگر جمہور کے نزدیک سنت ہے، اس لئے اس سے کم درجہ تو کسی طرح بھی نہیں ہے، اگر یہ کہا جائے کہ امام شافعیؒ کے رد کے واسطے امام بخاری نے ایسا کیا ہے، تب بھی اس کا بالکل ترک کر دینا مناسب نہیں تھا، اور میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ امام بخاری کے لئے اس کے ترک کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ اگر امام بخاری نے درود کو صرف دعا کے طور پر خیال کیا اور نماز کے اندر اس کو داخل نہ سمجھا تو اس کے مقابلہ میں وہ حدیثِ ابن مسعودؓ ہے جس میں نماز کے اندر درود پڑھنے کا سوال اور حضور علیہ السلام کا جواب بھی اسی کے لئے ہے، پھر حدیث کو اس زیادۃ کے ساتھ محدث بیہقی، حاکم، ابن حبان، ابنِ خزیمہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور سب نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔ لہٰذا درود کا محلِ صلوٰۃ ہونا متعین ہو گیا۔ (اعلاء السنن ص ۱۵۲\۳)

حضرت شیخ الحدیث دامت فیوضہم السامیہ نے لکھا: ۔ شاید امام بخاری نے یہاں اس لئے ذکر نہیں کیا کہ اس سے وجوب کا توہم ہوتا اور اس کا وجوب ان کے نزدیک صحیح نہ ہوگا، اسی لئے مطلق دعاء کے ضمن میں لائے، تاکہ اس میں یہ بھی شامل ہو جائے (لامع ص ۳۳۷\۱)

لیکن یہ توجیہ اس لئے بے سود ہے کہ امام بخاری نماز کے سنن ومستحبات، واجبات وفرائض سب ہی بتلا رہے ہیں، اگر ان کے نزدیک یہ سنت کے درجے میں ہوتا تو اس کی اہمیت متقاضی تھی کہ جو بھی اس کی حیثیت ان کے نزدیک تھی اسی کے مطابق باب قائم کر کے اس کو بتلاتے، دوسرے یہ کہ یہاں بھی تشہد کے بعد دعا کا باب قائم کیا ہے، جبکہ دعا کو کوئی بھی واجب نہیں کہتا، اگر باب قائم کرنے سے وجوب کا توہم ہوتا ہے تو کیا دعاء کے لئے یہ توہم نہ ہوگا؟ اور کیا وہ باب من لم یر التشہد واجبا کی طرح ہی باب من لم یر الصلوٰۃ علی النبی ﷺ واجبا نہیں لا سکتے تھے؟! بہر حال! جیسا کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا امام بخاری کے اس فعل کی کوئی بہتر اور مناسب توجیہ سمجھ میں نہیں آتی، اور نہ اکابرِ امت میں سے کسی کی مناسب توجیہ ہماری نظر سے گذری واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام مسلم وغیرہ اکابر محدثین کا طریقہ

امام بخاری کے بعد امام ترمذی کے طریقہ سے ہمیں تعجب در تعجب ہے کہ انہوں نے بھی ارکان وسننِ صلوٰۃ کے ضمن میں تشہد کے بعد درود شریف کا باب چھوڑ دیا ہے، اور آخر میں ابوابِ وتر کے بعد ابواب الجمعہ سے قبل اس کو لائے ہیں، حالانکہ ان کو امام شافعیؒ کی رعایت سے بھی اس کا باب تشہد کے ساتھ لانا چاہئے تھا، شاید انہوں نے ابرادِ ظہر وغیرہ چند مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی امام شافعی کا مسلک کمزور اور مرجوح قرار دیا ہوگا، تاہم سنیت یا استحباب کے قائل تو وہ بھی ضرور ہوں گے، اس لئے کوئی معقول وجہ ان کے ترک کی بھی ہم نہیں سمجھ سکے۔ اس کے بعد ہم نے امام

مسلم کی طرف رجوع کیا تو دیکھا کہ انہوں نے باب التشہد فی الصلوٰۃ کے بعد باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ بعد التشہد بھی قائم کیا ہے، اور وہی حدیثِ کعب بن عجرہ پیش کی ہے جس کو امام بخاری آخر میں باب الدعوات ص ۹۴۰ میں لائیں گے۔ اور ابوحمید الساعدی کی حدیث بھی لائے ہیں، اور امام بخاری وہاں حدیثِ ابی سعید خدری بھی لائے ہیں، اور ان سب ہی میں درود شریف پڑھنے کی کیفیت اور طریقہ تعلیم کیا گیا ہے۔

پھر امام نسائی کی طرف رجوع کیا تو انہوں نے باب التشہد کے بعد باب التسلیم قائم کیا پھر باب **التمجید والصلوۃ علی النبی** ﷺ **فی الصلوٰۃ** کے بعد دوسرا باب **الامر بالصلوٰۃ علی النبی** ﷺ بھی ذکر کیا۔ پھر باب **الفضل فی الصلوٰۃ علی النبی** ﷺ، لائے اور بہت سی احادیثِ صحیحہ ان ابواب میں ذکر کیں۔ ان کے بعد باب تخییر الدعاء صلوٰۃ علی النبی ﷺ ذکر کیا (نسائی ص ۱\۱۸۹) جبکہ امام بخاری و ترمذی نے تشہد کے بعد کے سارے ابواب صلوٰۃ علی النبی والے حذف کر کے نماز کی آخری دعاؤں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ اسی طرح ہم نے دیکھا کہ امام ابوداؤد نے بھی باب التشہد کے بعد باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ قائم کیا ہے اور امام ابن ماجہ نے بھی باب التشہد کے بعد باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ قائم کیا ہے، (ص ۶۴) اس کی حدیث الباب کے قول قد عرفناہ پر حاشیہ بھی قابلِ ذکر ہے، جس میں امام بیہقی کی سنن سے نقل ہوا کہ اس میں اشارہ سلام فی التشہد کی طرف ہے، لہٰذا فکیف الصلوٰۃ میں بھی مراد تشہد صلوٰۃ کے ہی درود کی طرف ہونا چاہئے، (قالہ السیوطی فی الزجاجہ)

درودِ نماز کے بارے میں اقوالِ اکابرؒ

ہم یہاں نوعیتِ مسئلہ کی مزید وضاحت اکابرِ امت کے ارشادات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں، واللہ الموفق:۔ واجز ص ۲\۱۶۳ میں اس طرح ہے:۔ نماز کے اندر درود شریف کے بارے میں علامہ ابن عبدالبر نے نقل کیا کہ امام مالک، ثوری واوزاعی کے نزدیک تشہدِ اخیر کے بعد مستحب ہے اور تارک خطا کار ہے، باوجود اس کے نماز درست ہے، امام شافعی نے کہا کہ اگر تشہدِ آخر کے بعد اور، سلام سے پہلے درود شریف نہ پڑھے گا تو نماز لوٹائے گا، ابن قدامہ نے المغنی میں لکھا کہ صحیح مذہب کی رو سے وہ واجب ہے اور یہی قول امام شافعی واسحق کا ہے امام احمد کے نزدیک وہ غیر واجب ہے۔

مروزی نے نقل کیا کہ ابوعبداللہ سے کہا گیا کہ ابن راہویہ تارک صلوٰۃ فی التشہد کی نماز کو باطل کہتے ہیں تو کہا کہ انہوں نے کتنی جرأت کی؟! اور ایک موقع پر اس کو شذوذ بتلایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اس کو واجب نہیں سمجھتے تھے، اور یہی قول امام مالک، شافعی واصحاب الرائے واکثر اہلِ علم کا ہے۔

ابن المنذر نے کہا کہ یہ قول امام شافعی کے سوا سب اہلِ علم کا ہے۔ امام احمدؒ کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ پہلے قول سے رجوع کر کے آخر میں وہ وجوب کے قائل ہو گئے تھے، اور نیل المآرب میں قول اللہم صلی علی محمد کو ارکان میں شمار کیا ہے۔

اصحاب امام شافعیؒ سے یہ بھی نقل ہوا کہ درود شریف کی فرضیت نماز میں منحصر ہے، اور نماز سے باہر وہ بھی اس کو واجب نہیں کہتے۔ علامہ ابوعمر ابن عبدالبرؒ نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ فرائض صرف ایسی دلیل سے ثابت ہو سکتے ہیں جس کا کوئی معارض نہ ہو یا ایسے اجماع سے جس کا کوئی مخالف نہ ہو، اور یہ بات اس مسئلہ میں معدوم ہے، اسی لئے امام شافعی کی دلیل کو ضعیف سمجھتا ہوں اور درود کو ہر نماز میں واجب وفرض نہیں سمجھتا، اور اس کے ترک کو بھی کسی کے لئے پسند نہیں کرتا۔

درمختار میں ہے کہ امام شافعی نے لفظ "**اللّٰھم صلی علی محمد**" کو فرض کہا، جس پر ان کو شذوذ اور مخالفتِ اجماع کا الزام دیا گیا، ابن عابدین نے کہا کہ ان الزام دینے والوں میں امام طحاوی، رازی، ابن المنذر، خطابی، بغوی اور طبری بھی ہیں، حالانکہ یہ بات جو امام شافعی نے کہی وہ بعض صحابہ اور تابعین سے بھی نقل کی گئی ہے۔ (کذا قال الحلبی فی الکبیری) اور امام احمد سے بھی وہ قول نقل ہوا جو امام شافعی کا ہے۔

امام شافعیؒ کا استدلال حدیث ابن ماجہ "لا صلوٰۃ لمن لم یصل علی فی صلاتہ" سے ہے، جس کو سارے اہل حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے، اور آیت قرآنی یاایھا الذین امنوا صلوا علیہ سے ہے کہ مطلق امر فرضیت کے لئے ہوتا ہے، دوسرے حضرات نے اس امر کو استحباب کے لئے کہا ہے کیونکہ حضرت عمر و ابن مسعودؓ سے درود شریف کا نماز میں مسنون ہونا مروی ہے۔ الخ۔

نماز کے علاوہ درود شریف کا حکم

امام طحاوی حنفی اور ایک جماعت حنفیہ نے اور علامہ حلیمی اور ایک جماعت شافعیہ نے نیز قاضی ابوبکر مالکیؒ نے کہا کہ جب بھی حضور اکرم ﷺ کا نام نامی اسم گرامی بولا جائے یا سنا جائے تو آپ پر درود شریف پڑھنا ضروری ہے خواہ وہ مختصر الفاظ میں ہی ہو، یہی قول احوط ہے، وکذا قال الزمخشری اور محدث ابن العربی نے شرح ترمذی میں لکھا کہ اس بارے میں امت میں سے کسی کا بھی اختلاف نہیں کہ عمر میں ایک بار تو حضور علیہ السلام پر درود بھیجنا فرض کے درجہ میں ہے، اور یہی درمختار کا بھی مختار ہے، لہٰذا جس کسی نے یہ کہا کہ اس کے استحباب پر اجماع ہے، اس نے خلاف اجماع بات کہی، اس کے بعد علامہ کرخی اور امام طحاوی کا اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک جب بھی حضور اکرم ﷺ کے اسم گرامی کا ذکر مبارک آئے گا تو درود پڑھنا واجب ہوگا، خواہ ایک مجلس میں کتنی ہی بار مکرر ہو۔ اصح یہی ہے کیونکہ امر مقتضی تکرار ہے، اور جب بھی سبب مکرر ہوگا، وجوب بھی مکرر ہوگا، اور ترک سے دین رہے گا، کہ اس کی قضا ضروری ہوگی، کیونکہ یہ حق عبد ہے، جیسے کہ تشمیت عاطس بخلاف ذکر باری عزاسمہ کے اور مذہب استحباب تکرار کا ہے، جس پر فتویٰ ہے اور معتمد قول امام طحاوی کا ہے، کذا ذکرہ الباقلانی متبعا لما صححہ الحلبی وغیرہ ورجحہ فی البحر باحادیث الوعید کرغم والبعاد وشقاء وبخل وجفاء۔ حافظؒ نے فتح الباری میں لکھا کہ جن حضرات نے آپ کے سرذکر مبارک پر درود کو واجب قرار دیا ہے اس لئے کہ درود نہ پڑھنے پر رغم، ابعاد وشقاء وغیرہ کی وعید میں وارد ہیں، اس کے جواب میں دوسرے حضرات (کرخی وغیرہ) نے جوابات دیئے ہیں مثلاً یہ کہ صحابہ وتابعین کے عمل سے اس کی توثیق نہ ہوسکی کیوں کہ اذان واقامت اور دوسرے مواقع میں کسی سے ثابت نہ ہوا کہ وہ کلمۂ شہادت کے ساتھ درود بھی پڑھتے ہوں، یا صحابہ نے حضور علیہ السلام سے خطاب کے وقت یا رسول اللہ کے ساتھ صلی اللہ علیک کہا ہو وغیرہ، دوسرے اس میں بڑی مشقت بھی ہے، جبکہ نص قرآن کے ذریعہ امت مرحومہ سے حرج ومشقت کی نفی آچکی ہے، تیسرے یہ کہ ایسا ہوتا تو دوسرے کاموں اور عبادتوں کے لئے وقت فارغ نہ ہوسکتا، اور احادیث وعید کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ تاکید وترغیب کے لئے ہیں۔ ایجاب وفرضیت کے لئے نہیں ہیں، یا ان لوگوں کے لئے ہیں جو ترک درود شریف کے عادی ہیں، بہرحال ایک ہی مجلس میں تکرار اسم مبارک کی صورت میں بوجوہ مذکورہ بالا تکرار وجوب کی بات مرجوح قرار دی گئی ہے۔

علامہ طبری نے باوجود صیغۂ امر کے بھی عدم وجوب پر بطور اصل شرعی کے اس امر سے استدلال کیا کہ علماء امت کے سارے متقدمین ومتاخرین نے بالاتفاق یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ ہر بار ذکر اسم مبارک کے وقت درود پڑھنا ایسا لازم وفرض کے درجہ میں قطعاً نہیں ہے کہ اس کا تارک عاصی ونافرمان قرار پائے، لہٰذا اس سے یہی ثابت ہوا کہ امر استحباب ہی کے لئے ہے۔ یہ ساری تفصیل اوجز ص ۲\۱۶۲ سے نقل کی گئی ہے۔

ذکر باری پر تقدیس کا حکم

معارف السنن ص ۴\۲۹۳ میں یہ اضافہ ہے کہ ایسا ہی اختلاف ذکر معظم اسم باری جل مجدہ کے بارے میں بھی ہے کہ جب بھی حق تعالیٰ جل ذکرہ کا اسم معظم لیا جائے یا سنا جائے تو کیا ایک ہی مجلس میں ہر بار جل ذکرہ، عزاسمہ، تعالیٰ جدہ وغیرہ کہہ کر تقدیس کرنا واجب وضروری ہے یا نہیں ہے؟

علامہ زاہدی نے لکھا کہ ایک مجلس میں یا کئی مجالس میں حق تعالیٰ کا نام سن کر ہر مجلس کے لئے الگ الگ ثنا کا کلمہ کہنا چاہئے لیکن اگر نہ

کہہ سکا تو وہ دین قابلِ ادائیگی نہ ہوگا کیونکہ باری تعالٰی کی نعمتوں کی بارش ہر لحہ ہوتی رہتی ہے (اور اس کے ساتھ اس کا اسم گرامی اور یاد بھی متجدد ہوتی رہتی ہے) لہٰذا ہر لحہ اور ہر آن اس کی ثناء تقدیس بھی ہونی چاہئے، جس کے لئے بندہ فارغ نہیں ہو سکتا اور اس لئے رحمت باری سے عفو و درگزر کی توقع پر ہر وقت ثنا و تقدیس لازم نہ ہوئی اور نہ دین کے طور پر اس کی قضا ضروری ہوئی! بخلاف اس کے کہ حضور علیہ السلام کے ذکرِ مبارک پر مختصر کلمۂ درود دشوار نہیں ہے، لہٰذا علیہ یا علیہ السلام کہنا ہی چاہئے، اگر کسی مجلس میں نہ کہہ سکا تو وہ دین رہے گا، جس کی قضا ضروری ہوگی۔ (شرح المنیہ نمبر ۳۳۴)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس موقع پر حلبی کبیر (شرح المنیہ) کی طرف مراجعت کی گئی تو فرق پایا کچھ لفظ طباعت میں رہ گئے ہیں اور باقی اضافہ ضروری سمجھا گیا۔

صلعم کی ممانعت: یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانہ میں متساہل طبع عوام یا طلبہ یا بعض علماءِ زمانہ بھی جو حضور اکرم ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ صرف ؐ یا صلعم لکھ دیتے ہیں، یہ سخت ممنوع اور غیر پسندیدہ فعل ہے، معارف السنن ص ۲۹۳ میں التدریب ص ۱۵۴ سے نقل کیا گیا کہ لکھنے میں حضور علیہ السلام کے لئے ؐ یا صلعم سے اشارہ کرنا مکروہ ہے اس لئے پورا درود ﷺ یا علیہ السلام وغیرہ لکھنا چاہئے۔ اور نقل ہوا کہ جس شخص نے پہلے ایسا کیا تھا، اس کا ہاتھ شل ہو گیا تھا یا کٹ گیا تھا۔

علامہ عراقی نے اپنے الفیہ میں لکھا کہ رمز و حذف سے اجتناب کرو، خواہ مختصر ہی لفظوں سے ہو صلوٰۃ و سلام واضح طور پر بھیجو علامہ سخاوی نے بھی ابناءِ عجم اور عوامِ طلب کے اس فعل پر تشنیع کی ہے، اور حضرت علامہ کشمیریؒ نے امام احمدؒ سے بھی اس پر تشنیع نقل فرمائی ہے۔ لیکن بعض ناواقف آپ یا جناب پر بھی ؐ لگا دیتے ہیں یہ بے محل ہے۔ اسی طرح جہاں عبارت و حکایت میں یا قرأتہ حدیث کے وقت لفظ یا رسول اللہ آئے تو وہاں بھی صلی اللہ علیہ وسلم یا علیہ السلام لکھنا یا کہنا بے محل ہے، نہ صحابہؓ سے ایسا منقول ہے کہ وہ یا رسول اللہ! کے ساتھ صلی اللہ علیک کہتے ہوں۔ اسی لئے ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ درسِ بخاری میں قرأتہ کرنے والا طالب علم اگر یا رسول اللہ آنے پر صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتا تو آپ ﷺ اس کو روک دیتے تھے کہ تم سے زیادہ علم و ادب والے صحابہؓ سے بھی ایسا ماثور نہیں ہے۔ غرض ان امور کو سمجھنے اور برتنے کے لئے علم و ادب، فہم و دانش سب ہی کی ضرورت ہے۔

اکثارِ استغفار یا درود شریف

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ اکثر فرماتے تھے اور معارف السنن ص ۲۹۹\۴ میں بھی نقل ہوا کہ عفوِ معاصی کے لئے تہلیل و استغفار کی کثرت کرنی چاہئے، اور حضور علیہ السلام کی شفاعت کے لئے درود شریف کی کثرت کی جائے۔

درود میں لفظ سیدنا کا استعمال

بعض علماءِ نجد درود شریف میں لفظ ''سیدنا'' کے اضافہ کو بدعت بتلاتے ہیں، اس کی تردید مختصراً ہم نے انوار الباری ص ۱۱\۱۹۲ میں بھی کی تھی، بغرض علمی افادہ اوجز وغیرہ سے یہاں اس کی مزید وضاحت کی جاتی ہے: اسمِ گرامی محمد کے اول میں لفظ سیادۃ کے اضافہ پر اختلاف ہوا ہے، ابن رسلان نے کہا کہ ادبِ نبوی کے لحاظ سے تو یہ بہتر ہی ہے، درمختار میں ہے کہ سیادۃ کا اضافہ مندوب ہے کیونکہ واقعی امور کا اضافہ تقاضائے عینِ ادب ہے، لہٰذا وہ ترک سے افضل ہے، رملی شافعی وغیرہ نے بھی یہی کہا، اور حضور علیہ السلام سے **لا تسودونی فی الصلوٰۃ** کی نقل جھوٹ ہے، اور بفرضِ صحت احتمال ہے کہ آپ نے ایسا تو اضعاً فرما دیا ہو، یا اس لئے کہ مشافۂ تعریف کو ناپسند کیا ہو یا اس لئے کہ وہ جاہلیت کا تحیہ تھا، قربِ عہد جاہلیت کے باعث ناپسند فرمایا ہو، اور اس کے مقابلہ میں یہ ہے کہ خود حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمام اولادِ آدم کا سید ہوں، اور آپ نے حضرت حسنؓ کے بارے میں فرمایا کہ میرا یہ بیٹا سید ہے۔ اور حضرت سعدؓ کے لئے صحابہ کو ارشاد فرمایا کہ اپنے سید

کے لئے کھڑے ہو جاؤ، اور حدیثِ نسائی میں ہے کہ سہل بن حنیفؓ نے حضور کو یا سید کہہ کر خطاب کیا، اور حضرت ابن مسعود کے درود میں اللّٰھم صل علی سید المرسلین وارد ہے۔اور علامہ سیوطی نے درمنثور میں بواسطہ،عبدالرزاق،عبد بن حمید، ابن ماجہ وابن مردویہ حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا کہ آپ نے لوگوں کو یہ درود تلقین کیا:۔ اللّٰھم اجعل صلواتک و رحمتک حضرات کے امتثالِ امر نبوی سے تادباً باز رہنے کو گوارہ فرمایا، اس سے ان کے فعل کی اولویت ثابت ہوتی ہے۔(اعلاء السنن ص ۱۷\۳۱۷)

سلطان عبدالعزیز اور حضرت مولانا خلیل احمدؒ کا واقعہ

حضرت مولاناؒ نے مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی تھی، اور وہ سعودی حکومت کا ابتدائی دور تھا، آپ نے نجدی علماء پر بہت سے مسائل میں اتمامِ حجت کی تھی، جن میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے جس کو ہم تذکرۃ الخلیل سے نقل کرتے ہیں۔ آپ روضۂ نبوی میں حجاز کے قاضی القضاۃ امیر ابن البلیہد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اور سلطان عبدالعزیز ان کے برابر۔ اس زمانہ میں جو شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی کے ساتھ لفظ سیدنا استعمال کرتا، نجدی لوگ اس کو مشرک کہتے تھے، اور چار طرف حرم نبوی میں یہی صدا کان میں پڑتی تھی، حضرتؒ نے موقع پا کر قاضی صاحب سے سوال فرمایا کہ آپ لفظ سیدنا کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ قاضی صاحب نے کچھ سکوت کے بعد کہا کہ حدیث میں کہیں نہیں آیا، حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیث میں تو آیا ہے۔ قاضی صاحب نے حیرت سے پوچھا کہاں آیا ہے؟ آپ نے فرمایا حدیث صحیح میں ''انا سید ولد آدم ولا فخر'' وارد ہے قاضی صاحب نے کہا ہاں! اس طرح تو آیا ہے مگر نام مبارک کے ساتھ کہیں نہیں آیا، حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کے ساتھ جو تعالیٰ لگاتے ہیں، وہ بھی کہیں قرآن مجید میں آیا ہے، قاضی صاحب نے کہا نہیں، حضرت نے فرمایا کہ کون کہا کرتا ہے کہ ہمارے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ کا استعمال کرو۔ ایک جگہ حدیث میں آ گیا وہ کافی ہے۔ سلطانِ حجاز ونجد اس مکالمہ کو غور سے سن رہے تھے، اب انہوں نے قاضی صاحب سے سوال کیا کہ کہیں اس لفظ کی ممانعت آئی ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ ممانعت تو نہیں آئی۔ سلطان نے کہا کہ ایک جگہ آ گیا اور ممانعت کہیں آئی نہیں۔ تو اس پر تشدد کیوں کیا جاتا ہے؟! اس کے بعد لوگوں میں اس مکالمے کا بڑا چرچا ہوا، اور پھر مشرک مشرک کی صدا کبھی کان میں نہیں آئی۔ (تذکرۃ الخلیل ص ۲۰۴)

اس قسم کے واقعات اور بھی منقول ہیں کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے علماءِ نجد سے تبادلۂ خیال کر کے ان کو متاثر کیا، اور ہم لوگ جب ۱۹۳۷ء میں حجاز حاضر ہوئے تھے، اور وہاں کے طویل قیام میں شیخ سلیمان الصنیع رئیس ہیئۃ الامر، المعروف والنہی عن المنکر سے بہ کثرت ملاقاتوں میں اختلافی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا تو وہ بھی اکثر مسائل میں تشدد کی راہ چھوڑ کر اعتدال کو پسند کرتے تھے، اس کے بعد رفیق محترم مولانا السید محمد یوسف البنوریؒ بھی اپنی ملاقاتوں میں اور معارف السنن کے ذریعہ بھی علماءِ نجد وحجاز کے سامنے جرأت مندانہ احقاقِ حق کرتے رہے اور اس کے بہتر اثرات بھی رونما ہوئے، مگر افسوس ہے کہ اب یہ سلسلہ ختم ہوتا نظر آتا ہے اور عام طور سے مصلحت بینی اور مداہنت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے واللہ المستعان۔

حافظ ابن تیمیہ وابن القیم اور درود شریف کے ماثور الفاظ کی بحث

ہم نے اس کے بارے میں انوار الباری ص ۱۹۰\۱۱ میں بھی لکھا تھا اور یہ بھی واضح کیا تھا کہ نہ صرف ابن القیم بلکہ ان کے شیخ حافظ ابن تیمیہ نے بھی ایسا ہی غلط دعویٰ کیا ہے اب دوسرے افادات پیش ہیں۔ اوجز ۲\۱۵۷ میں ہے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں لکھا کہ حافظ ابن القیم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''درود شریف والی اکثر احادیث میں محمد و آل محمد کا ذکر ہے، اور ان کے ساتھ صرف ابراھیم یا صرف آل ابراھیم کا ذکر ہے (علیہم السلام) اور کسی حدیث صحیح میں لفظ ابراھیم و آل ابراھم ایک جگہ ساتھ وارد نہیں ہوا ہے، البتہ بیہقی نے بہ طریق یحییٰ عن رجل روایت کی ہے، جبکہ یحییٰ مجہول ہے اور اس کا شیخ مبہم ہے، لہٰذا اس کی سند ضعیف ہے۔ اور ابن ماجہ میں ضرور سندِ قوی سے

روایت ہے۔مگر وہ موقوف ہے، حافظ نے اس پر لکھا کہ ابن القیم صحیح بخاری کی روایت صحیح تو یہ بھی غافل ہو گئے جو کتاب الانبیاء ترجمہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام میں ہے، کہ اس میں کما صلیت علی ابراهم و علیٰ آل ابراهیم اور ایسے ہی کمابارکت میں بھی ابراهیم و آل ابراهیم ایک جگہ ساتھ ہیں، اور ایسے ہی طبری کی روایت میں بھی ہے۔ پھر حافظ نے دوسری روایات صحیحہ بھی ذکر کیں، جن میں دونوں لفظ ساتھ جمع ہیں۔

فتح الملہم ص ۲\۴۸ میں بھی "تنبیہ" کے عنوان سے یہی بات لکھی گئی ہے، اور غالباً حافظ کی طرح صاحب اوجز اور صاحب فتح الملہم بھی اس امر پر مطلع نہیں ہو سکے کہ بعینہ یہی دعویٰ علامہ ابن تیمیہ نے بھی اپنے فتاویٰ میں کیا ہے، ملاحظہ ہو فتاویٰ ص ۱۹۰\۱ از یر تحقیق مسئلہ نمبر ۱۵۳ (انوار الباری ص ۸۹\۱۱ تا ص ۹۱\۱۱ میں پوری تفصیل آ چکی ہے) معارف السنن ص ۲۹۷\۴ میں دونوں حضرات کے غلط دعاوی کا حوالہ دے کر رد وافر کیا گیا ہے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔ اس تفصیل کے ساتھ حسب تجویز و اصطلاح حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری "تیممین" کے اس مشہور و معروف دعوے کو بھی حافظہ میں تازہ رکھئے کہ جس حدیث کو حافظ ابن تیمیہ صحیح قرار دیں وہ صحیح ہے اور جس کو وہ کہیں کہ صحیح نہیں ہے تو وہ واقع میں بھی صحیح نہیں ہے۔" اور اب تو دونوں حضرات نے دعویٰ فرما دیا کہ لفظ ابراھم و آل ابراھیم ایک جگہ ساتھ ہو کر کسی صحیح حدیث میں وارد نہیں ہوا ہے، تو پھر خواہ صحیح بخاری میں بھی کئی جگہ موجود ہوا کرے، سمجھنا یہی چاہئے کہ وہ واقع میں موجود یا صحیح نہیں ہے! والی اللہ المشتکی۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعہ و ارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابہ. آمین.

وبارک علی سید المرسلین و امام المتقین الحدیث، یہ سب دلائل اختیار لفظ سید کے لئے کافی ووافی ہیں اور علامہ شوکانی نے بھی نیل الاوطار میں اس کی اولویت کی طرف میلان ظاہر کیا ہے، علامہ ابی نے بھی شرح مسلم شریف میں لکھا کہ لفظ سید اور مولی کا استعمال بہتر ہے، اگرچہ وہ خاص طور سے درود کے الفاظ میں حضور علیہ السلام سے روایت بھی نہیں ہوا، کیونکہ اس بارے میں مستند حدیث صحیح "انا سید ولد آدم" وارد ہے۔ (اوجز ص ۲\۱۵۷) اعلاء السنن میں ہے کہ ابن عبدالسلام نے سید کے اضافہ کو باب سلوکِ ادب سے قرار دیا۔ اور یہ اس قاعدہ پر مبنی ہے کہ طریق ادب کی رعایت امتثالِ امر سے بھی زیادہ محبوب اور راجح ہو جاتی ہے، جس کی تائید حضرت ابوبکرؓ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ان کو اپنی جگہ قائم رہنے کا حکم دیا مگر انہوں نے نہ مانا اور عرض کیا کہ ابن ابی قحافہ کی کیا مجال کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ہو کر کھڑا ہو، اور ایسا ہی واقعہ حضرت علیؓ کا بھی ہے کہ صلح حدیبیہ کے صحیفہ میں حضور علیہ السلام نے کاتب صحیفہ حضرت علیؓ کو حکم فرمایا کہ اس کو کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھ دو، حضرت علیؓ نے عرض کیا واللہ! میں آپ کا اسم گرامی ہرگز نہیں کاٹوں گا، اس پر حضور علیہ السلام نے اس کو خود کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھوایا (بخاری ص ۶۱۰) دونوں حدیثیں صحیح بخاری میں ہیں، اور حضور علیہ السلام نے جوان دونوں حضرات کے امتثالِ امر نبوی سے تادباً باز رہنے کو گوارہ فرمایا، اس سے ان کے فعل کی اولویت ثابت ہوتی ہے۔ اعلاء السنن ص ۳\۱۷۱۔

سلطان عبدالعزیز اور حضرت مولانا خلیل احمدؒ کا واقعہ

حضرت مولاناؒ نے مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی تھی، اور وہ سعودی حکومت کا ابتدائی دور تھا، آپ نے نجدی علماء پر بہت سے مسائل میں اتمامِ حجت کی تھی، جن میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے جس کو ہم تذکرۃ الخلیل سے نقل کرتے ہیں۔ آپ روضۂ نبوی میں حجاز کے قاضی القضاۃ امیر ابن البلیہد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اور سلطان عبدالعزیز ان کے برابر۔ اس زمانہ میں جو شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی کے ساتھ لفظ سیدنا استعمال کرتا، نجدی لوگ اس کو مشرک کہتے تھے، اور چار طرف حرمِ نبوی میں یہی صدا کان میں پڑتی تھی، حضرتؒ نے موقع پا کر قاضی صاحب سے سوال فرمایا کہ آپ لفظ سیدنا کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ قاضی صاحب نے کچھ سکوت کے بعد کہا کہ حدیث میں کہیں نہیں آیا، حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیث میں تو آیا ہے۔ قاضی صاحب نے حیرت سے پوچھا کہاں آیا ہے؟ آپ نے فرمایا حدیثِ صحیح میں "انا سید ولد آدم ولا فخر" وارد ہے قاضی صاحب نے کہا ہاں! اس طرح تو آیا ہے مگر نامِ مبارک کے ساتھ کہیں نہیں آیا، حضرت نے فرمایا کہ اللہ

تعالیٰ کے نام مبارک کے ساتھ جو تعالیٰ لگاتے ہیں، وہ بھی کہیں قرآن مجید میں آیا ہے، قاضی صاحب نے کہا نہیں، حضرت نے فرمایا کہ کون کہا کرتا ہے کہ ہمارے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ کا استعمال کرو۔ ایک جگہ حدیث میں آ گیا وہ کافی ہے۔ سلطان حجاز ونجد اس مکالمہ کو غور سے سن رہے تھے، اب انہوں نے قاضی صاحب سے سوال کیا کہ کہیں اس لفظ کی ممانعت آئی ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ ممانعت تو نہیں آئی۔ سلطان نے کہا کہ ایک جگہ آ گیا اور ممانعت کہیں آئی نہیں۔ تو اس پر تشدد کیوں کیا جاتا ہے؟! اس کے بعد لوگوں میں اس مکالمے کا بڑا چرچا ہوا، اور پھر مشرک کی صدا کبھی کان میں نہیں آئی۔ (تذکرۃ الخلیل ص ۲۰۴)

اس قسم کے واقعات اور بھی منقول ہیں کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے علماءِ نجد سے تبادلۂ خیال کر کے ان کو متاثر کیا، اور ہم لوگ جب ۱۹۳۷ء میں حجاز حاضر ہوئے تھے، اور وہاں کے طویل قیام میں شیخ سلیمان الصنیع رئیس ہیئۃ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر سے بہ کثرت ملاقاتوں میں اختلافی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا تو وہ بھی اکثر مسائل میں تشدد کی راہ چھوڑ کر اعتدال کو پسند کرتے تھے، اس کے بعد رفیق محترم مولانا السید محمد یوسف البنوریؒ بھی اپنی ملاقاتوں میں اور معارف السنن کے ذریعہ بھی علماءِ نجد وحجاز کے سامنے جرأت مندانہ احقاقِ حق کرتے رہے اور اس کے بہتر اثرات بھی رونما ہوئے، مگر افسوس ہے کہ اب یہ سلسلہ ختم ہوتا نظر آتا ہے اور عام طور سے مصلحت بینی اور مداہنت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے واللہ المستعان۔

حافظ ابن تیمیہ وابن القیم اور درود شریف کے ماثور الفاظ کی بحث

ہم نے اس کے بارے میں انوار الباری ص ۱۱۱۹۰ میں بھی لکھا تھا اور یہ بھی واضح کیا تھا کہ نہ صرف ابن القیم بلکہ ان کے شیخ حافظ ابن تیمیہ نے بھی ایسا ہی غلط دعویٰ کیا ہے اب دوسرے افادات پیش ہیں۔ اوجز ۲۱۱۵۷ میں ہے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں لکھا کہ حافظ ابن القیم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ "درود شریف والی اکثر احادیث میں محمد وآل محمد کا ذکر ہے، اور ان کے ساتھ صرف ابراہیم یا صرف آل ابراہیم کا ذکر ہے (علیہم السلام) اور کسی حدیث صحیح میں لفظِ ابراہیم وآل ابراہم ایک جگہ ساتھ وارد نہیں ہوا ہے، البتہ بیہقی نے بہ طریق یحییٰ عن رجل روایت کی ہے، جبکہ یحییٰ مجہول ہے اور اس کا شیخ مبہم ہے، لہٰذا اس کی سند ضعیف ہے۔ اور ابن ماجہ میں ضرور سندِ قوی سے روایت ہے۔ مگر وہ موقوف ہے، حافظ نے اس پر لکھا کہ ابن القیم صحیح بخاری کی روایت صحیح تو یہ بھی غافل ہو گئے جو کتاب الانبیاء ترجمہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام میں ہے، کہ اس میں کما صلیت علی ابراھم وعلیٰ آل ابراھیم اور ایسے ہی کما بارکت میں بھی ابراہیم وآل ابراہیم ایک جگہ ساتھ ہیں، اور ایسے ہی طبری کی روایت میں بھی ہے۔ پھر حافظ نے دوسری روایات صحیح بھی ذکر کیں، جن میں دونوں لفظ ساتھ جمع ہیں۔

فتح الملہم ص ۲۱۴۸ میں بھی "تنبیہ" کے عنوان سے یہی بات لکھی گئی ہے، اور غالباً حافظ کی طرح صاحب اوجز اور صاحب فتح الملہم بھی اس امر پر مطلع نہیں ہو سکے کہ بعینہٖ یہی دعویٰ علامہ ابن تیمیہ نے بھی اپنے فتاویٰ میں کیا ہے، ملاحظہ ہو فتاویٰ ص ۱۱۱۹۰ زیر تحقیق مسئلہ نمبر ۱۵۳ (انوار الباری ص ۱۱۱۸۹ تا ص ۱۱۱۹۱ میں پوری تفصیل آ چکی ہے) معارف السنن ص ۴۱۲۹۷ میں دونوں حضرات کے غلط دعاوی کا حوالہ دے کر رد وافر کیا گیا ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔ اس تفصیل کے ساتھ حسب تجویز واصطلاح حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری "تیمیین" کے اس مشہور ومعروف دعوے کو بھی حافظہ میں تازہ رکھئے کہ جس حدیث کو حافظ ابن تیمیہ صحیح قرار دیں وہ صحیح ہے اور جس کو وہ کہیں کہ صحیح نہیں ہے تو وہ واقع میں بھی صحیح نہیں ہے۔" اور اب تو دونوں حضرات نے دعویٰ فرما دیا کہ لفظ ابراہم وآل ابراہیم ایک جگہ ساتھ ہو کر کسی صحیح حدیث میں وارد نہیں ہوا ہے، تو پھر خواہ صحیح بخاری میں بھی کئی جگہ موجود ہوا کرے، سمجھنا یہی چاہئے کہ وہ واقع میں موجود یا صحیح نہیں ہے! والی اللہ المشتکی۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔ امین۔

تمت